داغ نمبر سالنامہ ۱۹۵۳ء



دسمبر ۱۹۵۳ء

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کردینے والی انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔
ضخامت ۶۰۲ صفحات مجلد نو روپیہ لٹھ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات کا مجموعہ

[illegible] امور میں وکالت کی نیاز نے روشنی ڈالی ہے [illegible] فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت [illegible] مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس و رہبان کی [illegible] حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا۔ توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود و [illegible]
ضخامت ۴۶۲ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے
قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشائے لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنہیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے روکنے کی کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

(سالنامہ ۵۳

داغ کا فن

(نیاز فتحپوری)

اب سے تقریباً ۵۲ سال پہلے کی بات ہے۔ میرے والد [illegible] ہیں اور میرا قیام بھی بسلسلۂ تعلیم وہیں ہے۔ داغ ابھی زندہ ہیں لیکن حیدر آباد میں، امیر مینا[illegible] سال ہوئے انتقال ہو چکا ہے۔ نواب حامد علی خاں کا دورِ حکومت ہے، اساتذہ میں امیر اللہ تسلیم، جلال لکھنوی وغیرہ زندہ ہیں اور دربارِ رام پور سے وابستہ — نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں جو شاعرانہ فضا رام پور کی تھی وہ تو خیر نہیں ہے، پھر بھی شعر و شاعری کا کافی چرچا ہے، عام مشاعروں کے علاوہ سرکاری مشاعرے بھی گاہ گاہ ہوتے رہتے ہیں جن میں نواب خود بھی شریک ہوتے ہیں، شعراء کے کلام کی داد دیتے ہیں اور اپنے کلام کی بھی دوسروں سے بے پناہ داد لیتے ہیں۔ مشاعرہ کے دوران ہی میں نواب خاصہ بھی کھاتے ہیں (رات کا خاصہ وہ عموماً بہت دیر میں کھاتے تھے) چائے کا دور بھی چلتا ہے اور شام سے صبح تک یہ چہل پہل قائم رہتی ہے۔ میں خود بھی بعض مشاعروں میں تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا ہوں

فارسی کہنے والے شعراء میں مولوی فرخی (نواب صاحب کے استاد) سنجر ایرانی اور میرے والد کے درمیان (جنھیں امام بخش صہبائی سے تلمذ حاصل تھا) اکثر فارسی شعر و سخن کا چرچا رہتا اور اس صحبت میں عرب محمد طیب (جو مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل اور غیر معمولی قابلیت و ذہانت کے انسان تھے) اور حکیم محمد اجمل خاں بھی شریک ہوتے ہیں

رام پور کا یہ وہ دور تھا جب شعراء کے علاوہ اچھے اچھے علماء و فضلاء بھی وہاں موجود تھے اور اکثر علمی و ادبی صحبتیں برپا رہتی تھیں۔ امیر مینائی سے میرے والد کو بڑی عقیدت تھی، غالباً اس لئے کہ وہ بڑے زاہد و متقی تھے، شاہ مینا کی اولاد میں سے تھے اور ہر چند اس وقت ان کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کے بلندیِ اخلاق اور زہد و ورع کی داستانیں عام تھیں۔ میرے والد نے بھی فارسی میں شاعری کی اور وہ بھی صرف نعت و منقبت کے قصائد تک۔ غزل انھوں نے کبھی نہیں کہی، لیکن اردو شاعری میں امیر مینائی کے وہ بڑے مداح تھے اور "صنم خانۂ عشق" کا مطالعہ کبھی کبھی کر لیتے تھے

میرا عنفوانِ شباب تھا، اور کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا تھا، لیکن شعر کہنے سے زیادہ مجھے سننے کا شوق تھا اور جب کبھی کسی صحبت میں داغ و امیر کا ذکر آ جاتا تھا (اور یہ ذکر اکثر آتا) تو میں ہمیشہ داغ کی طرفداری کیا کرتا تھا، جس کا علم میرے والد کو بھی تھا۔ رام پور میں اس وقت بڑی جماعت مداحین امیر ہی کی تھی اور داغی بہت کم تھے

میرے والد داغ کے متعلق بڑا بُرا خیال رکھتے تھے۔ پُرانی وضع کے صاف گو پٹھان تھے اس لئے جب کبھی داغ و امیر کا ذکر آتا وہ نہایت آزادی سے گرم لہجہ میں کہہ دیا کرتے تھے کہ "داغ اوباش تھا، اسے شعر و شاعری سے کیا تعلق" میں ان سے یہ تو نہ کہہ سکتا [illegible] غزل اوباش ہی اچھی کہہ سکتا ہے، لیکن دبی زبان سے یہ ضرور کہہ دیتا کہ "آپ صنم خانۂ عشق کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی گلزارِ داغ کو بھی دیکھ لیجئے، ممکن ہے کوئی شعر آپ کو پسند آ جائے" فرماتے "میں عامی و جاہل کا کلام نہیں دیکھتا"

میرے والد صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند تھے۔ اوراد و وظایف سے بھی دلچسپی تھی اور عموماً بہت تڑکے اپنے تمام فرایض ادا کر کے نماز کی چوکی پر قبل طلوع آفتاب کھانا کھا لیتے اور اس کے بعد مطالعہ یا نوشت و خواند میں مصروف ہوجاتے

ایک صبح وہ حسب معمول چوکی پر بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے اور میں سامنے ہی چارپائی پر گلزار داغ کھولے شہر آشوب مطالعہ کر رہا تھا۔ اچانک ان کی نگاہ اٹھی اور میرے ہاتھ میں کتاب کھلی ہوئی دیکھ کر بولے "کونسی کتاب ہے؟" میں نے کہا "گلزار داغ" پیشانی پر ہلکی سی شکن ڈال کر خاموش ہوگئے، لیکن فوراً اس کے بعد ہی فرمایا کہ "کون سی غزل پڑھ رہے ہو" میں نے کہا "غزل نہیں اس کا "شہر آشوب" پڑھ رہا ہوں"۔ فرمایا "سناؤ" میں نے پڑھنا شروع کیا :۔

فلک جناب و ملایک جناب تھی دلّی — بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلّی
جواب کا ہیکو تھا لاجواب تھی دلّی — مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلّی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

یہ شہر وہ ہے کہ انسان و جان کا دل تھا — یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدر داں کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا — یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا
رہی نہ آدھی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

یہاں کی شام تھی مانند صبح نورانی — یہاں کے ذرے میں تھی مہر کی درخشانی
یہاں کے سنگ سے تھا تیرہ لعل رمانی — یہاں کی خاک سے ہوتا تھا آئینہ پانی
یہ شہر وہ ہے کہ سایہ بھی نور تھا اس کا
چراغ رشک تجلی طور تھا اس کا

میں تین بند پڑھ کر سانس لینے کے لئے رکا ہی تھا کہ وہ بے اختیار بول اٹھے۔ " حرامزادہ اچھا کہتا ہے، پوری نظم سناؤ" میری زندگی میں یہ بالکل پہلا موقع تھا کہ داغ کی اتنی اچھی داد میں نے کسی سے سنی ہو۔ وہ اگر "حرامزادہ" نہ کہتے تو میں اتنا خوش نہ ہوتا لیکن اس بے اختیار داد نے میرے حوصلے بڑھا دئے اور میں نے پورا مسدس لہک لہک کر سنایا۔

اس تمہید سے مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ امیر کے مقابلہ میں داغ کی شاعری کو میں شروع ہی سے پسند کرتا تھا لیکن کیوں اس کا جواب میں شاید اسوقت نہ دے سکتا

داغ کی شاعری کی طرف میرا رجحان اس لئے نہ تھا کہ میں اسے بہترین غزل گو سمجھتا تھا، میر، غالب، مومن اور اساتذۂ قدیم میں متعدد شعراء ایسے تھے جن کے ذکر کے ساتھ داغ کا نام لینا بھی مناسب نہ سمجھتا تھا، لیکن جس وقت امیر و داغ کا سوال آتا (اور اکثر آتا) تو میں داغ ہی کو ترجیح دیتا۔ یوں میں امیر کے علم و فضل اور ان کی اخلاقی بلندیوں کا ضرور معترف تھا لیکن شاعری میں ان کا کیا ناسخی سلسلے اور خاندان امیر کے کسی شاعر کا قایل نہ تھا۔ لوگ گلزار داغ کے جواب میں امیر کے صنمخانۂ عشق کو پیش کرتے، حالانکہ میرے نزدیک امیر کی کمزوری یہی تھی کہ انھوں نے داغ کی مقبولیت دیکھ کر خود بھی وہی رنگ اختیار کرنا چاہا جو ان کے مذاق کے کسی طرح موزوں نہ تھا

الغرض جس فضا میں اول اول مجھے داغ کے مطالعہ کرنے کا موقع ملا وہ وہی تھی جس میں داغ اور امیر کا نام ساتھ ہی ساتھ لیا جاتا تھا اور اسی لئے اس فضا کے ذکر میں مجبوراً مجھے یہ ظاہر کرنا پڑا ورنہ میرا مقصود اس وقت در اصل داغ و امیر کا موازنہ نہیں

اُس وقت تو نہیں لیکن بہت دنوں کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ داغ کا کلام مجھے کیوں پسند آتا تھا۔ میں یقیناً داغ کو بلند غزلگو نہ جانتا تھا، بلکہ سچ پوچھئے تو عامیانہ شاعری کے سلسلہ میں انھیں میں جرأت سے بھی کم سمجھتا تھا، لیکن باوجود اس کے میں ان کے بعض شعروں سے کافی لطف اُٹھاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ناسخی رنگ، لکھنؤ میں تو خیر مقبول تھا ہی، دلّی میں بھی ٹکسال باہر نہ سمجھا جاتا تھا اور مجھے اس رنگ سے طبعی نفرت تھی، لیکن اسی کے ساتھ یہ ضرور تھا کہ اگر کسی شعر میں زبان کی سلاست و صفائی کے ساتھ ساتھ کوئی تیور بھی ہوتا تھا تو وہ میری توجہ حاصل کر لیتا تھا اور داغ کے کلام میں مجھے یہ چیز اکثر مل جاتی تھی

داغ کی شاعری کا نشو و نما یقیناً دہلی اسکول کی فضا میں ہوا، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی مع اپنی تمام خصوصیات کے اُجڑ چکا تھا اور غالب و مومن کے ساتھ شاعری کی بساط محفل بھی ہمیشہ کے لئے الٹ چکی تھی۔ اس لئے داغ کو کچھ زمانہ تک غالب و مومن کا ماحول تو میسر آیا، لیکن وہ اس سے کوئی فایدہ نہ اُٹھا سکے، کیونکہ ان کی پرورش قلعہ کے اندر ہو رہی تھی جہاں باوصف تاراجی خزاں کے بہار کے کچھ کچھ نشانات باقی تھے اور چنگ و رباب ہنوز ہاتھ سے نہ چھوٹا تھا۔ قلعہ کی بیگمات، قلعہ کی خواصیں اور مغلانیاں، ان کی زبان اور چوچلے، قلعہ کی رنگ رلیاں، یہ تھی وہ فضا جس میں داغ کی شاعری کی بنیاد پڑی پھر لطف یہ کہ اسی کے ساتھ استاد ملا انھیں ذوق ایسا شاعر جو زبان اور محاورات ہی کا شاعر تھا، اس لئے داغ کی شاعری کو زبان کی شاعری ہونا ہی تھا اور اس میں شک نہیں کہ اس باب میں ان کی خدمات بڑی گرانقدر ہیں

جب دہلی اُجڑنے کے بعد وہ رامپور پہونچے تو خوش قسمتی سے یہاں بھی شاعری کا وہی دور تھا جس میں زبان کے چوچلوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ سازگار فضا ان کے لئے اور کیا ہو سکتی تھی۔ اس لئے وہ یہاں جلد جم گئے اور خوب پھلے پھولے۔

داغ نے اپنی جس رنگ کی شاعری سے شہرت حاصل کی وہ صرف داغ کے لئے مخصوص نہ تھا، اس وقت کے تمام شعراء ایک ہی حمام کے نہانے والے تھے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ داغ سے زیادہ کوئی دوسرا شاعر مقبول نہ ہو سکا۔ کوچہ و بازار اور محافلِ رقص و سرود میں ہر جگہ داغ ہی کا سکہ چلتا تھا اور انھیں کی غزلوں پر دنیا سر دھنتی تھی

داغ کے ہمعصر شعراء میں اس وقت علاوہ امیرؔ کے منیرؔ شکوہ آبادی، جلالؔ لکھنوی اور تسلیمؔ لکھنوی بھی زندہ تھے، لیکن داغ سے زیادہ قبولِ عام کسی کو حاصل نہ ہو سکا اور اس کے کچھ اسباب بھی تھے

منیر اس میں شک نہیں بڑے پُرگو شاعر تھے، لیکن ان کے کلام میں تکلف و آورد کے سوا کچھ نہ تھا اور ان کی دور از کار تشبیہات و استعارات سے عوام کیا خواص کو بھی کوئی دلچسپی نہ تھی، زبان و بیان کا کوئی لطف ان کے یہاں نہ تھا اور سطحی و عامیانہ قسم کے جذبات محبت بھی ان کے کلام میں پائے جاتے تھے۔ اس لئے داغ کے سامنے ان کو کون پوچھتا، جلال اور تسلیم بیشک بڑے خوش فکر و خوشگو شاعر تھے، لیکن داغ کے سامنے ان کا چراغ بھی نہ جل سکا۔ کیونکہ تسلیم کی شاعری بڑی حد تک دہلی اسکول کی جذباتی شاعری تھی اور اس کی مانگ اُس زمانہ میں نہ تھی۔ جلال بیشک فن کا بڑا ماہر تھا اور اس حیثیت سے داغ اس سے بہت فروتر تھے لیکن جس حد تک زبان و بیان کا تعلق ہے داغ ان کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب تھے اور اسی لئے وہ جلال سے بھی بازی لے گئے، حالانکہ استاد اور ماہرِ فن ہونے کی حیثیت سے جلال بڑے مرتبہ کا شاعر تھا

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا داغ کے کلام میں زبان و بیان کے لطف کے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے جس نے اسے مشہور کر دیا اور وہ اس کا تیور ہے۔ تیور سے کیا مراد ہے، اس کی صراحت ضروری ہے

شاعری میں تیور کا تعلق دو چیزوں سے ہے، لب و لہجہ اور اظہار خیال کا ڈرامائی طریقہ۔ لب و لہجہ کا تعلق زبان و محاورہ سے ہے اور اظہار خیال میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہوتی ہے الفاظ کی نشست اور ان کی سلاست و روانی سے۔ اور ان دونوں باتوں کیلئے

ایک خاص ذوق درکار ہے، جو موقع و محل کے لحاظ سے اظہار خیال کے لئے مناسب زاویہ کے انتخاب کی طرف رہبری کرے گا اور داغ میں بہ نسبت اپنے ہمعصر شعراء کے یہ ذوق و سلیقہ زیادہ پایا جاتا تھا

غزل میں قافیہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس کے نباہنے کے مختلف طریقے ہوسکتے ہیں، بعض بالکل سامنے کی بات لیکر قافیہ کا صرف کرتے ہیں، بعض اس کے لئے نیا خیال، نیا زاویۂ اظہار ڈھونڈھتے ہیں لیکن الفاظ ایسے تلاش کرتے ہیں کہ بات بالکل عامتہ الورود نظر آنے لگتی ہے

داغ کو اس بات میں بڑا ملکہ حاصل تھا، بات خواہ وہ کیسی ہی معمولی کہے لیکن اس میں ایسی بے تکلفی، ایسا تیور اور تیکھا ہوتا تھا کہ قافیہ جاگ اٹھتا تھا اور پورا شعر بیچ کر رہ جاتا تھا

داغ کی ایک غزل ہے جس میں ردیف و قافیہ دونوں غیر شگفتہ ہیں — "سم کی طرح – دم کی طرح" — ایسی زمین میں رواں وسلیس اشعار نکالنا مشکل ہے، لیکن داغ نے اپنے رنگ کی خصوصیت اس میں بھی قائم رکھی۔ مثلاً اسی زمین میں ارم قافیہ کو لیجئے اس سلسلہ میں باغِ ارم بالکل سامنے کی چیز ہے جو ہر شخص کے ذہن میں آسکتی ہے اور پھر اس کے ساتھ ایک باغ کی جو خصوصیات ہوسکتی ہیں وہی سامنے آنا چاہئے، لیکن داغ نے اس قافیہ کو نظم کرنے کے لئے ایک ایسا زاویہ تلاش کیا جو ہر شخص کے ذہن میں نہ آسکتا تھا اور اس کو یوں نظم کیا :-

کوچۂ دشمن کو وہ جنت کہیں !
مٹ نہ گیا باغِ ارم کی طرح

دوسرے مصرعہ کو اسی تیور سے پڑھئے جس تیور سے کہا گیا ہے تب آپ سمجھ سکیں گے کہ ایسی غیر شگفتہ زمین ایسے خشک قافیہ کو اس خوبی اور ایسے دلکش تیور سے نظم کرنا ہر شاعر کا کام نہ تھا

داغ کی ایک اور غزل ہے — "کام نہیں، قیام نہیں" — اس زمین میں کلام کا قافیہ بالکل سامنے کا ہے اور اسکو نظم کرنے کی صورتیں بھی مختلف ہوسکتی ہیں، لیکن داغ نے جس پہلو سے اسے صرف کیا وہ انھیں کا حصہ تھا، لکھتے ہیں :-

سنائی جاتی ہیں در پردہ گالیاں مجھ کو
کہوں جو میں تو کہیں "آپ سے کلام نہیں"

اس قافیہ کے نظم کرنے میں داغ کا خیال محبوب کی جس تیکھی ادا کی طرف منتقل ہوا ہے اگر وہ عملی زندگی میں اس سے دوچار نہ ہوا ہوتا تو قیامت تک اس پہلو سے یہ قافیہ نظم نہ کرسکتا

اسی زمین کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے :-

الٰہی تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا
کچھ ان کی ذات سے دنیا کا انتظام نہیں

پہلا مصرعہ نہایت معمولی ہے، لیکن دوسرے مصرعہ میں قافیہ نے خاص لطف پیدا کر دیا۔ بجائے یہ کہنے کے کہ "ان کی ذات سے دنیا میں فتنہ و فساد برپا رہتا ہے" صرف یہ کہنا کہ "کچھ ان کی ذات سے دنیا کا انتظام نہیں"۔ بڑی لطیف بات ہے

بالکل اسی طرح کا بلکہ اس سے زیادہ کامیاب شعر داغ کا ایک اور ملاحظہ ہو :-

چلے جو وہ تو قیامت بپا تھی چار طرف
ٹھہر گئے تو زمانہ کو انقلاب نہ تھا

دوسرے مصرعہ کا انداز بیان ملاحظہ ہو۔ اگر یوں کہا جاتا کہ "زمانہ میں سکون ہی سکون تھا" تو یہ لطف پیدا نہ ہوتا، داغ کا

یہ وہ اندازِ بیان ہے جسے میں اس کا تیور یا تیکھا پن کہتا ہوں

داغ کی اس خصوصیت کا پتہ اس وقت زیادہ چل سکتا ہے جب ایک ہی ردیف و قافیوں میں دوسروں کے اشعار کے ساتھ داغ کے اشعار کا مقابلہ کیا جائے۔ پروفیسر نفیس سندیلوی کے ایک مضمون سے جو اسی پرچے میں "داغ اور ان کے معاصرین" کے عنوان سے شایع ہوا ہے، ہم چند اشعار لیکر بتاتے ہیں کہ داغ کا زاویۂ فکر دوسروں سے کسقدر مختلف، اچھوتا اور دلکش ہوتا تھا۔

ایک زمین ہے — "آہ میں — چاہ میں"۔ اس میں نگاہ کے قافیہ کو داغ، امیر اور جلال سبھی نے نظم کیا ہے۔

امیر کا شعر ہے :-

آنکھ اپنی فتنہ ہائے قیامت پہ کیا پڑے
جس کے یہ فتنے ہیں وہ ہے اپنی نگاہ میں

علاوہ اس کے کہ دوسرے مصرعہ میں "ہیں" اور "ہے" کے قرب کی وجہ سے پڑھنے میں صوتی تنافر پیدا ہوگیا ہے، یوں بھی قافیہ سے ایک پیش پا افتادہ مضمون کو ظاہر کیا گیا ہے

جلال کہتے ہیں :-

شوخی، فریب، سحر، فسوں، لاگ، شعبدہ
کتنے کرشمے دیکھے تری اک نگاہ میں

شعر میں تکلف ہی تکلف ہے۔ تاہم امیر کے شعر سے اچھا ہے گو کوئی خاص بات نہیں، برخلاف اس کے داغ کی اپج ملاحظہ ہو کہتے ہیں :-

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

داغ نے جس زاویۂ نگاہ کو سامنے رکھ کر اس قافیہ کو نباہا ہے وہ بالکل نیا اور اچھوتا ہے

اسی زمین میں راہ کے قافیہ کو امیر نے اس طرح نظم کیا ہے :-

اٹھتا نہیں ہے اب تو قدم مجھ غریب کا
منزل سے کہدو دوڑ کے لے مجھ کو راہ میں

امیر کا زاویۂ نظر اس قافیہ میں ضرور نیا ہے لیکن خود منزل کا دوڑ کر کسی کو راہ میں لینا، حقیقت سے متباعد اور یکسر تکلف و تصنع ہے، برخلاف اس کے داغ کو دیکھیے کہتے ہیں :-

آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار،
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

پورا شعر سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور ایک ایسے تجربہ کو پیش کر رہا ہے جو محبت میں اکثر پیش آتا ہے۔ امیر کو چونکہ محبت اور بیقراری محبت کی سعادت کبھی نصیب نہ ہوئی تھی اس لئے ان کا ذہن اس طرف منتقل ہو ہی نہ سکتا تھا

ایک زمین ہے — "رواں کی طرح، جہاں کی طرح"۔ اس میں خزاں کے قافیہ کو امیر و داغ دونوں نے نظم کیا ہے لیکن داغ کے یہاں یہ قافیہ شعر کی جان ہے اور امیر کے یہاں بے جان — امیر کا شعر ہے :-

نویدِ وصل مٹاتی ہے دل کے داغوں کو　　بہار لوٹتی ہے باغ کو خزاں کی طرح

داغ کہتے ہیں :-　　جلا کے داغِ محبت نے دل کو خاک کیا　　بہار آئی مرے باغ میں خزاں کی طرح

آخری مصرعہ دونوں کے یہاں قریب قریب ایک سے ہیں، لیکن داغ کا مصرعہ بہت صاف ہے اور امیر کے یہاں قافیہ بیکار سا ہوگیا ہے۔ کیونکہ جب لوٹنے کا ذکر پہلے کر دیا گیا تو پھر خزاں کی قید کے کیا معنی، داغ کے یہاں یہ عیب نہیں ہے۔ اس نے لوٹنے کا اظہار کہیں نہیں کیا، بلکہ صرف اندازِ بیان سے یہ مفہوم پیدا کر دیا

داغ

(تاریخ ولادت سے ورود رامپور تک)

(کلب علی خاں فائق رام پوری)

نواب[1] مرزا خاں داغ دہلوی بتاریخ ۱۲[2] ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء بدھ کے دن دو بجے دہلی محلہ چاندنی چوک میں پیدا ہوئے، والد کا نام نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروز پور جھرکہ کہا جاتا ہے۔

احسن[3] مارہروی کا بیان ہے:۔

"جبکہ آپ کے والد کا انتقال ہوا تو اُس زمانہ میں مرزا صاحب اتنے خورد سال تھے کہ آپ کو اُن کے متعلق اُس وقت کی کوئی بات بھی یاد نہیں، بہرحال اس پریشانی کے عالم میں مرزا صاحب کی والدہ ماجدہ نے صاحب عالم مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر ولی عہد شاہ دہلی کے دامن عاطفت میں پناہ لی اور اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ محل شاہی میں گزارا، اور نواب شوکت محل بیگم صاحبہ خطاب پایا، مرزا صاحب اپنی والدہ کے ساتھ قلعہ شاہی میں پہونچے اور گویا وہیں آپ کی تعلیم کی بسم اللہ ہوئی، اگرچہ تعلیم کا سلسلہ اس سے پہلے شروع ہوچکا تھا اور رام پور میں مولوی غیاث الدین صاحب غیاث اللغات سے فارسی کی کتابیں پڑھی تھیں مگر پھر قلعہ میں آکر مستقل طور سے مولوی سید احمد حسین ولد میر غلام حسین شکیبا جو میر تقی میر کے شاگرد تھے، آپ کے معلم مقرر ہوئے۔ فارسی کی درسی کتابیں مرزا صاحب نے انھیں بزرگ سے تمام کیں ۔۔۔۔ شاعری کا چرچا دیکھ کر مرزا صاحب کو شوق ہوا تو صاحب عالم مرزا ولی عہد نے حضرت ذوق کا شاگرد کیا، اُس وقت آپ کا سن گیارہ یا بارہ برس کا تھا مرزا صاحب نے پہلے پہل نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے مشاعرہ میں غزل پڑھی تھی۔"

یہ حالات مرزا صاحب کے بیان کردہ ہیں جو احسن مارہروی مرحوم نے قلمبند کئے، لیکن بیان واقعات میں عمداً ایسا اُلجھاؤ اختیار کیا گیا ہے کہ اگر اس بیان کو ہم صحیح مان لیں تو نہ تو مرزا صاحب کے حالات سے باخبر ہوسکیں گے اور نہ اُن کے حالات سے وہ نتائج برآمد کرسکیں گے جو اُن کی شاعری پر آیندہ زندگی میں اثر انداز رہے اس لئے مجبوراً ہم اُن کے ماحول کے اُن گوشوں کو بے نقاب کر رہے ہیں جس کے باعث نواب مرزا صاحب فصیح الملک نے غزل گوئی میں انفرادی مقام پیدا کیا۔ اور قیام رام پور کے زمانہ میں وہ اپنے اصلی روپ میں نمایاں ہو گئے، اُن کی والدہ کا اثر اُن کے کردار میں بہت نمایاں نظر آتا ہے اسلئے تذکرہ نگاروں کی رائے ثبوت میں پیش ہے۔

مولوی عبدالغفور نساخ صاحب سخن شعرا[4] لکھتے ہیں:۔

"داغ تخلص، نواب مرزائے دہلوی ولد چھوٹی بیگم شاگرد شیخ محمد ابراہیم ذوق ملازم نواب رام پور، راقم نے اس شخص کو دہلی میں دیکھا ہے"

---

[1] اصل نام نواب ابراہیم تھا شادی کے بعد اُن کے احباب نے نواب مرزا سے ان کو ملقب کیا اور آگے چل کر اسی نام سے مشہور ہوئے۔ آئینۂ داغ ص۱۹

[2] جلوۂ داغ ص۴ ۔[3] جلوۂ داغ صفحات ۱ تا ۱۳ ۔ [4] سخن شعرا۔ طبع نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۴ء

ناسخ سے داغ کے خصوصی تعلقات سفر کلکتہ ۱۸۲۹ء کے بعد بڑھے، ناسخ نے دہلی کی عام روایت کو سادگی سے ظاہر کر دیا ۔ یعنی نواب شمس الدین احمد خاں کو فصیح الملک کا والد نہ لکھا۔ چھوٹی بیگم کا اصل نام وزیر بیگم اور عرف چھوٹی بیگم ہے، باپ کا نام محمد یوسف کشمیری سادہ کار تھا۔ کشمیری النسل ہونے کے باعث قدرت نے اُن کے حسن و جمال غیر معمولی عطا کیا تھا۔ اسی باعث نواب شمس الدین احمد خاں والیٔ فیروز پور جھرکہ کی پہلی نظر انتخاب ان پر پڑی، یہ واقعہ ۱۲۴۵ھ یا آغاز ۱۲۴۶ھ کا ہوسکتا ہے۔ اس تعلق کی یادگار نواب مرزا خاں داغ تھے لیکن اسی عہد میں مسٹر فریزر ایجنٹ گورنر جنرل دہلی میں تعینات ہوا یہ حُسن پرست واقع ہوا تھا غالبًا وہ بھی چھوٹی بیگم کے دامِ حُسن میں اسیر ہوگیا نواب شمس الدین احمد خاں کی ہندوستانی غیرت اس رقابت کو برداشت نہ کرسکی اور یہ کانٹا راہ سے ہٹا دیا گیا، اس واقعہ کو مولوی بشیر الدین احمد اس طرح لکھتے ہیں[1] :-

"۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء (مطابق ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۵۰ھ) مسٹر فریزر ایجنٹ گورنر جنرل متعینہ دہلی قتل ہوئے۔ اور اسی سال بہ ماہ اکتوبر ۱۸۳۵ء (۸ یا ۱۰ مطابق ۱۵ یا ۱۷ جمادی الآخر ۱۲۵۱ھ) فیروز پور کے نواب صاحب کو بہ سازش قتل مذکورۂ بالا پھانسی دی گئی۔"

فریزر کے مارے جانے کا واقعہ یوں ہے کہ فیروز پور جھرکہ کے نواب شمس الدین احمد خاں سے اور فریزر صاحب سے رنجش ہوگئی تھی رنجش کے دو وجوہ بیان کئے جاتے ہیں انگریز تو کہتے ہیں کہ نواب اول درجے کا بدچلن شخص تھا اور فریزر صاحب چونکہ ہمیشہ صلاح و مشورہ سے اُس کی روک تھام کرتے رہتے تھے یہ اُسے ناگوار تھا، ہندوستانی اس واقعہ کی بنا یہ بتلاتے ہیں کہ فریزر صاحب نواب کی کسی رشتہ کی بیگم سے جو خواجہ نواب (لفظ خواجہ کے بجائے خود ہوگا) کی منظورِ نظر تھی ناجائز تعلقات رکھتے تھے چنانچہ یہ بات بچے بچے کی زبان پر ہے بلکہ لوگوں نے اس کا ایک گیت بھی بنایا ہے جو طوائف گاتی ہیں۔

اس سلسلہ میں ریاست فیروز پور جھرکہ ضبط ہوگئی مگر نواب ضیاء الدین احمد خاں اور امین الدین خاں برادران نواب شمس الدین احمد خاں صاحب کی ریاست لوہارو کی برقرار رہی خاندانی شرافت کا تقاضا تو یہ تھا کہ دونوں چچا اپنے یتیم ساڑھے چار سالہ بھتیجے کی سرپرستی کرتے، مگر اُن کی پہلو تہی سے اس شبہ کو تقویت پہونچتی ہے کہ وہ نواب مرزا خاں داغ کو اپنانے پر طیار نہ تھے، صاحبِ گلستانِ سخن جو اُن کے خصوصی دوست تھے وہ بھی والد کا نام نہیں لیتے، اور صرف نواب مرزا داغ کی تعریف پر اکتفا کرتے ہیں، نواب شمس الدین احمد خاں کی پھانسی پانے کے بعد ۱۸۳۵ء سے ۱۸۴۴ء تک یہ یقینی نہیں کہا جاسکتا کہ چھوٹی بیگم اس یتیم بچے کو لے کر کس کس کی سرپرستی میں رہیں لیکن جلوۂ داغ سے اس مسئلہ پر روشنی ضرور پڑ رہی ہے قلعہ میں داخلہ سے پہلے رام پور میں مولوی غیاث الدین رام پوری، صاحب غیاث اللغات سے تعلیم حاصل کرنا ظاہر کر رہا ہے (۱۸۳۵ء سے ۱۸۴۴ء تک دہلی میں رہے) کہ ۱۸۴۰ء سے ۱۸۴۴ء تک ضرور رام پور میں رہے۔

نثار علی شہرت مصنف سوانح عمری داغ[2] کا یہ بیان معنی خیز ہے :-

"جب نواب یوسف علی خاں بہادر والیٔ رام پور دہلی میں بہت عرصہ رہے تھے حضور ممدوح سے داغ صاحب نے سکندر نامہ پڑھا تھا"

---

[1] واقعات دارالحکومت دہلی حصۂ اول صفحہ ۶۹۳ و حصۂ دوم صفحات ۴۹۲ و ۴۹۳ ۔ از مولوی بشیر الدین احمد دہلوی

[2] سوانح عمری داغ المعروف آئینۂ داغ جلد اول مطبوعہ ۱۹۰۵ء

قیام دہلی کے سلسلہ میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی صاحب[۱] مکاتیب غالب تحریر فرماتے ہیں :-

نواب فردوس مکان (یوسف علی خاں) اپنے والد کی تخت نشینی سے پہلے دہلی میں قیام پذیر ہوئے تھے طالب علمی کا زمانہ ان کے چچا نواب سید عبداللہ خاں بہادر صدر الصدور میرٹھ اور نواب سید عبدالرحمٰن خاں بہادر، میرزا صاحب (غالب) کے محب تھے ان دونوں کے حسب ارشاد نواب فردوس مکاں نے میرزا صاحب سے فارسی کی تعلیم پائی، علوم عربیہ و حکمیہ میں مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خاں خیرآبادی سے تلمذ تھا۔

نواب غلام محمد خاں کے خاندان کے بہت سے افراد دہلی میں مقیم تھے نواب کریم اللہ خاں خلف نواب فیض اللہ خاں اپنے روزنامچہ[۲] میں لکھتے ہیں :-

"چہارم ربیع الاول ۱۲۴۸ھ ایں ماہ برخورداران راہی شاہجہاں آباد شدند، مظفر علی خاں و جعفر علی خاں ابنائے نواب نظام علی خاں - عبدالعلی خاں، حفیظ اللہ خاں اخلاف نواب غلام محمد خاں و عنایت اللہ خاں"۔

صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب بن صاحبزادہ عبدالعلی خاں کا قیام دہلی ۱۲۵۰ھ سے قبل شیفتہ[۳] کے بیان سے ثابت ہے :-

"جوانیست نیکو منظر، زیبا شمائل، مدتے در لکھنؤ گذر افگندہ، اکنوں چند سالست کہ مایۂ نازش جہاں آباد وارم تزئین است"۔

صاحب گلستان سخن[۴] کا بیان ہے کہ :- نواب محمد سعید خاں کی تخت نشینی پر بیتاب رام پور چلے گئے - نواب یوسف علی خاں کی ولادت ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۳۱ھ مطابق ۵ مارچ ۱۸۱۶ء میں ہوئی، وہ ۱۲۵۰ھ میں مقیم دہلی تھے - نواب یوسف علی خاں کے اعزا مقیم دہلی کے تعلقات وہاں کے ارباب علم و فضل سے خصوصی تھے - نواب یوسف علی خاں اور ان کے چچا زاد بھائی عباس علی خاں بیتاب وغیرہ نوجوان تھے داغ کو نواب یوسف علی خاں کا سکندر نامہ پڑھانا اُن روابط کو ظاہر کرتا ہے جو چھوٹی بیگم اور عمدہ خانم اُن کی بہن سے تھے عمدہ[۵] خانم کو ایک سو روپیہ نواب یوسف علی خاں اپنی تخت نشینی (اپریل ۱۸۵۵ء تا اپریل ۱۸۶۵ء) کے بعد سے دیا کرتے تھے اور یہ سلسلہ پرورش نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں بھی جاری رہا، اس طرح دہلی کے قیام کے زمانہ میں بھی نواب یوسف علی خاں نے داغ کی تربیت میں یک گونہ حصہ لیا۔ جب ۲۰ اگست ۱۸۴۰ء کو نواب محمد سعید خاں تخت نشین ہوئے تب نواب یوسف علی خاں وغیرہ رام پور چلے گئے فصیح الملک داغ بھی اپنی خالہ عمدہ خانم کے ساتھ رام پور روانہ ہوئے اور تقریباً چار سال رام پور رہے جس کے وہ خود بھی معترف ہیں (مولوی غیاث الدین رام پوری سے سلسلۂ تلمذ)۔ خاندان نواب غلام محمد خاں کی روانگی رام پور کے بعد اگست ۱۸۴۰ء (۱۲۵۶ھ) کے بعد ہی چھوٹی بیگم نے آغا تراب علی کا گھر بسا لیا، ان کی یادگار محبت آغا مرزا شاغل رہے جو ۱۸۴۱ء ۱۲۵۷ھ میں پیدا ہوئے۔ انتخاب[۶] یادگار میں امیر مینائی ۱۲۹۰ھ میں نواب مرزا خاں داغ کی عمر چوالیس[۴۴] سال اور شاغل کی عمر تینتیس[۳۳] سال بیان کرتے ہیں یعنی گیارہ سال داغ سے شاغل چھوٹے تھے۔

---

[۱] مکاتیب غالب طبع اول حاشیہ ص۴ (۱) و ص۵
[۲] سیر کریمی فارسی مخطوطہ۔
[۳] گلشن بے خار - نولکشور پریس ۱۸۷۴ء ص۳۴
[۴] گلستان سخن - مرزا قادر بخش صابر - مطبع مرتضوی ص۱۶۲
[۵] مکاتیب غالب ص۱۰ حاشیہ (۲) و مکتوب ۱۱ و ۱۲ بنام خلد آشیاں ۱۰۳ و ۱۰۴ انشائے داغ احسن مارہروی و خمخانۂ جاوید ج ۳ ص۱۰۲
[۶] انتخاب یادگار صفحہ ۱۲۸ و ۱۷۷ -

آغا تراب علی کے بعد سپہر تقدیر نے یاوری کی اور اب کے مرزا فخرو خلف شاہ ظفر نے ۱۲۶۵ھ میں انتخاب کرلیا اس تقریب کا نقشہ مولانا محمد حسین[1] آزاد نے کھینچا ہے :-

"مرزا فخرو شاہزادے اواخر سلطنت میں ولی عہدی کے حق دار ہوئے تھے وہ بھی اُستاد سے اصلاح لیتے تھے شہر میں چھوٹی بیگم[2] نام ایک حسین صاحبِ جمال، اپنے ہنر کی باکمال تھیں عمر کی دوپہر ڈھل چکی تھی اور کتنے ہی امیروں کو مار کر ہضم کرچکی تھیں، اس پر بھی لڑکپن کی کلیاں چٹکتی تھیں، مرزا فخرو کی ۲۴-۲۵ برس کی عمر تھی رنڈی کو نوکر رکھ کر غلام ہوگئے، مرزا نے ایک دن استاد کو بلا بھیجا، یہ گئے اُنھوں نے غزل عنایت کی اور کہا اُستاد اسے یہیں اصلاح دیدیجئے، استاد غزل بنانے لگے، مرزا نے ایک تصویر صندوقچہ سے نکالی اُسے دیکھا اور کہا کہ استاد ذرا اسے دیکھئے، استاد سمجھ گئے کہ اُسی کی تصویر ہے کہا بہت خوب، مرزا کی خاطر جمع نہ ہوئی پھر کہا دیکھئے تو سہی........"

مرزا فخرو کے بارے میں اسی زمانہ کا ایک اور بیان قابلِ ملاحظہ ہے :-

رمز صاحب عالم مرزا فتح الملک شاہ بہادر ان کو مرزا فخرو بہت لوگ کہتے ہیں۔ شعر گوئی کا ان کو بہت شوق ہے عمر قریب بیس یا بائیس[3] برس کے ہوگی .... گانا بجانا سننے کا اور رقص دیکھنے کا بہت ذوق ہے ....

بائیس تاریخ ماہ شوال (۱۲۶۱ھ) کو یہ غزل اُن کی پڑھی گئی :-

اُس بے وفا سے دیدہ و دانستہ چاہ کی　　ہم نے تو اپنی آپ ہی حالت تباہ کی

اس طرح قلعہ میں باریاب ہوکر نواب مرزا خاں کی یاد بھی آئی چنانچہ یہ بھی[4] ۱۸۴۴ء میں قلعہ معلی (تیرہ چودہ سال کی عمر) میں داخل ہوگئے۔ مرزا فخرو سے ۱۲۶۱ھ میں "مرزا خورشید عالم" پیدا ہوئے"۔

اب نواب مرزا خاں کی زندگی آرام سے گزرنے لگی رقص و سرود کے جلسوں اور بزم شعر و ادب سے قلعۂ معلی کی فضا گونج رہی تھی ایسے میں کون خاموش رہ سکتا تھا اور اس محفل عیش و طرب سے کیا کچھ نہ سیکھا جاسکتا تھا، چنانچہ نواب مرزا صاحب نے بھی شاعری میں حصہ لیا مرزا فخرو کی بدولت ذوق کی شاگردی کا امتیاز پایا جو مرزا فخرو اور ظفر شاہ دہلی دونوں کے اُستاد تھے ذوق کی نسبت تلمذ اور مرزا فخرو کے رشتہ نے شہرت میں بہت جلد چار چاند لگا دئے، صہبائی و آزردہ اور غالب اور شاہ ظفر دادِ سخن دینے لگے، غدر سے قبل نوجوان شعرا میں نواب مرزا خاں داغ مقام امتیاز پیدا کر رہے تھے۔ ظہیر دہلوی کا

---

[1] دیباچہ دیوان ذوق صفحہ ۴۱ محبوب المطابع دہلی ۱۹۳۲ء۔

[2] مرزا فخرو ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو انتقال کرگئے، چھوٹی بیگم کی عمر اس وقت قریب تینتالیس یا چوالیس سال تھی دس ماہ بعد غدر ہوگیا، معلوم ہوتا ہے کہ ابھی حُسن کی چمک دمک باقی تھی، چنانچہ اسی ہنگامۂ غدر میں حاکم قوم کے ایک فرد کے ساتھ بھی انھیں زندگی گزارنا ہی پڑی اور اس کی نشانی ایک لڑکی ہوئی، تذکرہ ماہ درخشاں میں ابوالقاسم محتشم اس لڑکی کا ذکر کرتے ہیں :"خفی تخلص مسیح جان عرف پادشاہ بیگم نام۔ دختر بلاک صاحب انگریز، صاحبِ وقار است و مادرش بنت محمد یوسف کشمیری ساده کار، علاوہ شعر گوئی و لطیفہ سنجی، خط خفی و جلی خوب می نگارد و فارسی و انگریزی نیز مہارتِ کامل دارد ایں ہمشیرہ اخیافی نواب مرزا خاں داغ است"۔ غدر کے ہنگامہ میں کچھ حسین مسلمان عورتیں انگریزوں کے گھروں میں بیٹھ گئی تھیں۔ عروج عہد سلطنت انگلشیہ صفحہ ۱۲۰ مولوی ذکاء اللہ

[3] تذکرہ شعرائے اُردو۔ کریم الدین و ڈاکٹر فیلن مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء صفحہ ۴۱۶۔

[4] خمخانۂ جاوید جلد سوم صفحہ ۱۰۳ و صفحہ ۷۹۔ از سری رام۔

بیان[1] ہے :-

"جب سر جان لارنس دہلی آئے تو انھوں نے مارچ ۱۸۵۸ء میں دہلی میں مسلمانوں کے آباد ہونے کا حکم دیا سرٹیفکٹ آباد ہونے کے گھروں میں دئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۸۵۹ء تک مسلمانوں کے مکانات سرکاری ضبطی سے چھوٹے نہیں اور نہ ان کے اخراج کا حکم منسوخ ہوا وہ شہر میں بغیر کسی افسر کے پاس کے نہیں آسکتے تھے۔"

متذکرہ بالا حوالے اس لئے دئے گئے ہیں کہ دہلی میں قیام شاہ ظفر کی حکومت جاتے رہنے کے بعد ناممکن ہوگیا تھا اور ۱۸۵۹ء تک بھی عام اجازت مسلمانوں کو آباد ہونے کی نہ تھی تاوقتیکہ سرٹیفکٹ حاصل نہ کرلیں اب سوال یہ رہتا ہے کہ داغ دہلوی اس ہنگامہ غدر میں کہاں رہے۔

نثار علی شہرت کا بیان ہے کہ وہ اس ہنگامۂ غدر میں حکیم ولایت علی خاں صاحب خلف حکیم سعادت علی خاں جنرل افواج ریاست رام پور کے پاس آنولے پہونچ گئے اور وہاں میہمان رہے اور سفارشی خط حاصل کرکے وہ دہلی جاکر رام پور پہونچے اور نواب یوسف علی خاں کے مہمان رہے اور بعدہٗ مصاحب ولیعہد ریاست نواب کلب علی خاں کے ہوگئے۔

یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا نواب مرزا خاں اپنی خالہ عمدہ خانم کا سفارشی و تعارفی خط لےکر رام پور پہونچے اور نواب یوسف علی خاں کے مہمان ہوئے رہی مصاحبت ولیعہد ریاست (نواب کلب علی خاں) تو یہ درست معلوم ہوتی ہے، چونکہ مصاحبت ان کو تاقیام رام پور ہمیشہ حاصل رہی اب سوال یہ رہتا ہے کہ نواب مرزا خاں کب رام پور آئے اس سلسلہ میں ظہیر دہلوی کا بیان تاریخ غدر میں کافی اہمیت رکھتا ہے نیز داغ دہلوی کے مسئلۂ داخلۂ رام پور کو بھی واضح کرتا ہے اور وہ یہ ہے :-

"دہلی سے[3] جھجر، سونی پت، پانی پت، نجیب آباد، مراد آباد ہوکر بریلی پہونچے پندرہ روز بریلی میں رہے یہاں فیروز شاہ اور دوسرے سردار جمع تھے رام پور جانے والے راستوں کی ناکہ بندی ریاست کی طرف سے تھی رام پور کے تیس ہزار سوار فوج باغی میں ملازم تھے میر غلام عباس دہلوی کے مشورے پر آنولے چلے وہاں احمد خاں جرنیل جھجر سے ملاقات ہوئی دوسرے دن شاہ آباد (تحصیل رام پور) پہونچے وہاں مقیم تھے کہ مغرب سے فوج آتے دیکھی آبادی کے باہر ٹھہری فوج کے آدمی آئے اور گاؤں والوں پر تشدد کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس دن وہاں رہ کر صبح کو فوج آنولہ چلدی، اور ہم رام پور کو چل نکلے ۔ ۔ ۔ ۔ قریب شام رام پور پہونچے دروازے شہر کے بند تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چور دروازے سے داخل شہر ہوئے ۔ ۔ ۔ پھر میر ابراہیم دہلوی (ظہیر دہلوی کے رشتہ دار تھے) کے توسط سے نواب فصیح اللہ خاں خلف نواب نصر اللہ خاں کے یہاں مہمان رہے اور اُن کی سفارش پر نواب یوسف علی خاں نے رام پور میں رہنے کی اجازت دیدی اور معافی نامہ انگریزوں سے دلانے کا اقرار کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غرض اس کے بعد ہم کو اطمینان کلی حاصل ہوگیا اور اپنے بے خوف و خطر رہنے لگے ۔ داغ صاحب کو خبر ہوئی وہ اُس روز آکر ملے انھوں نے یہ حُسنِ سلوک کیا کہ مجھے اور میرے چھوٹے بھائی امراؤ مرزا انور کو صاحبزادہ محمد رضا خاں داماد نواب یوسف علی خاں بہادر مرحوم کی سرکار میں نوکر رکھوا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عرصۂ چار سال کے قریب ہم رامپور میں رہے۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ ظہیر دہلوی کون سی تاریخ رام پور آئے ۔ فیروز شاہ ۲۲ اپریل ۱۸۵۸ء مطابق ۷ رمضان ۱۲۷۴ھ

---

[1] داستان غدر مطبوعہ مصنفہ ظہیر دہلوی صفحہ ۹۸ و ۱۲۶ و ۱۱۸

[2] مکاتیب غالب - مولانا امتیاز علی خاں عرشی - [3] داستانِ غدر - مطبوعہ صفحات ۱۳۲ تا ۱۵۰

[4] اخبار الصنادید جلد دوم مؤلفہ نجم الغنی خاں رام پوری صفحات ۸۲ و ۸۴ و ۸۵ و ۸۹ -

مراد آباد میں داخل ہوگیا شہر کو لوٹ لیا رامپوری فوج بھاگ آئی ۲۳ر اپریل ۱۸۵۸ء کو سات آٹھ ہزار فوج رام پور سے گئی بعد مغرب آدھے تو راستہ میں سے لوٹ آئے ۔۔۔۔۔ ۲۴ر اپریل ۱۸۵۸ء کو لڑائی ہوئی رامپوری فوج نے شکست کھائی، جنرل جونس کی خبر پاکر فیروز شاہ بھاگ نکلا ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵ر اپریل ۱۸۵۸ء کو جنرل جونس مراد آباد آگیا، ریاست کی فوج نے انتظام سپرد کردیا نواب مجو خاں مقابلہ میں مارے گئے"۔

بریلی[1] میں ۵ر مئی ۱۸۵۸ء کو خان بہادر خاں سے افواج انگریزی کا مقابلہ ہوا چھ گھنٹے کی لڑائی میں ہزاروں غازی مارے گئے، ۶ر مئی ۱۸۵۸ء کو خان بہادر خاں کچھ سپاہ لے کر بھاگ گیا شہر میں جنرل جونس توپیں مارتا داخل ہوا ۷ر مئی ۱۸۵۸ء کو مکمل قبضہ ہوگیا"۔

ظہیر دہلوی نے شاہ آباد میں جس فوج کو آنولہ کی طرف جاتے دیکھا وہ انگریزی فوج ہی ہوگی جو ۲۵ر اپریل ۱۸۵۸ء کو مراد آباد میں داخل ہوچکی تھی اور بریلی کی کمشنری میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ ۳۰ر اپریل کو بدایوں کے نواح میں انگریزی فوج کی مڈبھیڑ ہوئی تھی، ۲۶ر اپریل ۱۸۵۸ء کو غالباً یہ فوج شاہ آباد سے گزری اس طرح ظہیر دہلوی ۲۷ر اپریل ۱۸۵۸ء کو رام پور میں داخل ہوئے اور یہاں داغ صاحب کی سفارش سے نواب یوسف علی خاں کے داماد صاحبزادہ محمد رضا خاں کے یہاں ملازمت بھی مل گئی، اس سفارش سے اندازہ ہوتا ہے کہ داغ ستمبر ۱۸۵۷ء میں جب دہلی سے روانہ ہوئے تو سیدھے رام پور آئے یا آنولہ ہوکر رام پور آئے ہوں جس طرح ظہیر دہلوی راستوں کی ناکہ بندی کے باعث بریلی آنولے ہوکر رام پور آئے، لیکن اُنکی آمد کو اتنی مدت گزرچکی تھی کہ وہ نواب صاحب کے خاندان میں کافی بارسوخ تھے۔

احسن صاحب کا یہ بیان[2] درست ہے کہ:۔ "نواب صاحب موصوف (نواب یوسف علی خاں) اپنی حیات تک ہمیشہ بطور مہمانوازی کے سلوک کرتے رہے۔ اب وہ رام پور میں اطمینان سے رہنے لگے جب قدرے سکون ہوا تو وہ ماہ مارچ ۱۸۵۹ء میں دہلی گئے"۔

غالب تحریر[3] فرماتے ہیں:۔

"نواب مرزا نے دلی آکر پہلے نوید بزم آرائی سنائی چاہتا تھا کہ اُس کی تہنیت لکھوں کل اُس نے از روئے خط آمد رام پور حضرت جناب عالیہ کے انتقال کی خبر سنائی"۔

غرض کبھی دلی رہے اور کبھی رام پور۔ ۱۷ر مارچ[4] ۱۸۶۰ء کے مکتوب داغ بنام نواب یوسف علی خاں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دہلی میں تھے اور نواب صاحب کے حسب ارشاد سنگ باسی تلاش کر رہے تھے ۲ر نومبر ۱۸۶۰ء کے خط سے بھی قیام دہلی پایا جاتا ہے، ۲۱ر اپریل ۱۸۶۵ء کو نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہوگیا اب نواب کلب علی خاں (خلد آشیاں) تخت نشین ہوئے لیکن اس زمانہ میں بھی وہ بطور مہمان ریاست ہی رام پور میں رہے اُن کے خصوصی تعلقات کا اندازہ مکتوب غالب نمبر ۵۱ مورخہ ۱۳ر اگست ۱۸۶۵ء و مکتوب نمبر ۶۰ مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۸۶۶ء بنام نواب کلب علی خاں سے ہوسکے گا:۔

---

[1] تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ تتمہ حصہ سوم صفحات ۸۷ و ۸۸ و ۸۹

[2] جلوۂ داغ صفحہ ۲۰

[3] مکاتیب غالب طبع اول ص۱۸ مکتوب غالب بنام یوسف علیخاں (فردوس مکاں) ۲۸ر مارچ ۱۸۵۹ء مکتوب ۱۵ و مکتوب ۲۰ ص ۱۹۵ و ۱۹۹

[4] انشائے داغ۔ احسن مارہروی صفحات ۱ تا ۶

...برخوردار نواب مرزا خاں اپنے مشاہدہ کے مطابق جو میری حقیقت عرض کرے وہ مسموع و مقبول ہو۔"
انشائے داغ میں پہلا خط جو بنام خلد آشیاں (نواب کلب علی خاں) پایا جاتا ہے وہ ۸ر فروری ۱۸۶۶ء کا
وہ اس وقت تک ملازم نہیں ہوئے تھے اُن کا تقرر بزمرۂ ملازمان ۱۴ر اپریل ۱۸۶۶ء کو ہوا مصاحبت کے ساتھ
... خانہ و اصطبل وغیرہ کی داروغگی سے اختصاص پایا اور ۱۲۸۹ھ میں خلد آشیاں کے ساتھ شرفِ حج بھی
...ل کیا۔ ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں سفر کلکتہ اختیار کیا اور حجابؔ کی محبت میں لے حجاب ہو گئے۔ مارچ ۱۸۸۱ء کے
بے نظیر میں منی بائی حجابؔ آئی، اور نواب مرزا خاں کے زہد و تقویٰ نے شکست کھائی پچاس برس کی
...ں عشق و محبت کی داستان دوسروں کی نظر میں حیرت انگیز ہو لیکن جو کھیل اُس عہد میں نواب و راجہ
...کنار صوفی و عالم تک روا رکھ رہے تھے اُسے غیر مہذب اور سوقیانہ نہیں کہا جا سکتا۔ داغؔ کی زندگی اسی
... میں گزری تھی نواب کلب علی خاں اور نواب یوسف علی خاں کے دربار سے طوائفیں اور دوسرے ارباب
... وابستہ چلے آتے تھے میلۂ بے نظیر اول سال جلوس ۱۸۶۵ء سے نواب کلب علی خاں نے رائج کیا،
میں مقامی اربابِ نشاط کے علاوہ باہر سے بھی طوائفیں وغیرہ بلائی جاتی تھیں، غرض اب رقیب کی رقابت
بھی واسطہ پڑا۔ اور منتِ دربان بھی کرنی پڑی، احباب کے طعنے اور محبوب کا ستم اور جور کیونکر نہ
...شت کرتے، غرض رفتہ رفتہ طبیعت بھر گئی اور چڑھی ندی اُتر گئی۔"
رام پور میں جس عیش و عشرت سے گزری تھی یکایک اُس میں رخنہ اندازی ہوئی نواب کلب علی خاں
(خلد آشیاں) نے ۲۳ر مارچ ۱۸۸۷ء کو رحلت کی اور دربار رام پور کی سجی سجائی محفلِ علم و ادب منتشر
... چنانچہ جولائی ۱۸۸۷ء کے قریب وہ رام پور سے استعفیٰ دے کر چلے گئے۔"
قیام رامپور کی مدت بقول احسن مارہروی چالیس پینتالیس سال رہی اور مختلف اوقات میں بارہا سفر کا
... ہوا جن میں اکثر بکارِ سرکار جانا پڑا اور کبھی کبھی اپنی ضرورتوں سے بھی سفر کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
نواب فردوس مکاں کے بعد خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر نے اپنی قدر دانی اور لطفِ خسروانی سے
...صاحب کو ریاست میں باقاعدہ ملازم فرما کر اپنی مصاحبت میں رکھا اور بطور معتمد کار خانہ جات اصطبل و گاڑی خانہ

---

۱ مثنوی فریادِ داغ صفحہ ۸ سے

آ گیا بے نظیر کا میلہ
دلِ پابندِ وضع کھل کھیلا

اخبار الصنادید جلد ۲ صفحہ ۱۳۹

جلوۂ داغ ـ صفحہ ۳۴ و ۳۵ و ۲۰ تا ۲۲

جلوۂ داغ صفحہ ۳۴ بالآخر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حساب کتاب ۲۸ر دسمبر ۱۸۶۶ء اور تحویل دو چار مہینوں میں سمجھا بجھا کر رام پور کو خیر آباد کہا۔

انشائے داغ ـ مکتوب ۲۲ر ستمبر ۱۸۹۶ء بنام محمود علی خاں محمود رام پوری

:- میر قطب الدین اشک جلیسری ۔ ۔ ۔ کہا کرتے تھے کہ رام پور میں چند اشخاص خصوصاً نواب حیدر علی خاں (برادر نواب کلب علی خاں) ایسے تھے جن سے حجابؔ کے معاملات میں مرزا صاحب سے رقیبانہ آویزش رہا کرتی تھی۔

وفراش خانہ وکنول خانہ وشتر خانہ سپرد کیا، مرزا صاحب نے ۴۴ برس تک مصاحبت کے ساتھ ان سب کاموں کو نہایت خوبی اور عمدگی و دیانت سے سرانجام دیا اور بڑے نیک نام اور بے لوث رہے ...... ہمیشہ کلام کرتے وقت بھائی نواب مرزا خاں کہکر خطاب کیا کرتے تھے ...... بسلسلۂ ممبری کونسل کلکتہ کے سفر[1] میں مرزا صاحب کو اپنے پاس رکھا اور فرمایا میرا محافظ سوائے تمھارے کون ہے"۔

قیام رامپور کی مدت چالیس پنتالیس سال مبالغہ ہے البتہ قریبًا ۴۴ سال رام پور میں رہے سنہ ۱۸۸۴ء تا ۱۸۴۴ء بچپن کے چار سال اور آخر سال ۵۷ء تا جولائی ۱۸۸۷ء تیس سال، اس طرح چونتیس سال رام پور میں مہمان و ملازم رہکر گزارے۔

---

[1] اخبار الصنادید جلد ۲۔ صفحہ ۱۴۰ - ۲۰ر شعبان ۱۲۸۳ھ رامپور سے روانہ سفر کلکتہ ہوئے۔

داغ کی بعض غزلوں کی شانِ نزول

(۱) ایک وقت ایک صاحب نے ان کے سامنے ایک تصویر پیش کی جس میں ایک نازنین جانے کا قصد کر رہی ہے اس کا عاشق ایک ہاتھ سے اس کا دامن پکڑے ہوئے ہے اور ایک ہاتھ سے اپنے دل کو سنبھال رہا ہے، یہ تصویر آجکل بھی بازاروں میں فروخت ہوتی ہے۔ اور کہا کہ اس کیفیت کو آپ اپنے کسی شعر میں ظاہر کیجئے، داغ نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد کہا ؎

ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے — دل کو تھاما ان کا دامن تھام کے

مطلع کہنے کے بعد انھوں نے غزل کی تکمیل کرلی۔

(۲) نواب عزیز یار جنگ بہادر بیان فرماتے ہیں کہ داغ کے یہاں ایک طوائف ملازم تھی۔ عمر میں کوئی بیس بائیس برس کی ہوگی ایک دفعہ داغ نے اس کو اپنے کسی آدمی کے ذریعہ سے بلا بھیجا۔ اس نے آدمی سے یہ کہا کہ ان سے کہدے "میری بلا بھی نہیں آتی"۔ ملازم نے یہی جملہ داغ سے آکر دہرا دیا۔ داغ لطف اندوزی کی خاطر بار بار اس سے دریافت کرتے تھے کہ اس نے کیا کہا اور وہ اسی جملہ کو دُہراتا جاتا تھا اسی کیفیت میں انھوں نے نواب صاحب سے کہا لکھو:-

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی — کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

اور تھوڑی دیر میں غزل کہدی۔

(۳) داغ کے پاس ایک وقت مولوی ابوالحمید آزاد بیٹھے ہوئے تھے ان کو پیاس لگی اور انھوں نے پانی منگوایا۔ ایک چھوکری جسکی عمر بارہ تیرہ برس کی ہوگی پانی لے آئی اور ہوا کے زور سے اس کا دوپٹہ شانہ پر سے سرک گیا اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ داغ کی نظر بھی اس سماں سے لطف اُٹھا رہی تھی انھوں نے آزاد سے کہا کہ قلم لو اور لکھو:-

بادِ صبا نے بھی نہ کیا مجھ کو بے حجاب — سینے پہ ہاتھ آگئے جب شانہ کھل گیا

داغ — ترجمان و رہنمائے دور

(ڈاکٹر اعجاز حسین)

ادب میں بھی ایسے اہلِ قلم کم ہی ہوتے ہیں جو اپنی گوناگوں صلاحیتوں سے زمانہ کو اتنا متاثر کر سکیں کہ لوگ ان ہی کے دل و دماغ سے سوچنے لگیں، ان ہی کی آنکھ سے دیکھنے لگیں، درحقیقت یہ بھی بڑی زبردست فتح ایک فرد کی ہے۔ خواہ آگے چل کر حالات بدل جائیں اور اس کا کارنامہ اپنی اہمیت کھودے مگر ایک دور کو اپنا کلمہ پڑھا دینا ہی کیا کم کامیابی ہے؟ اس کی وقتی کامیابی بھی شاندار اور قابلِ ذکر ہوتی ہے چنانچہ داغ کو آپ جو چاہے سمجھیں مگر وہ مقبولیت جو ان کو اپنے دور میں نصیب ہوئی متقاضی ہے کہ ان پر بہت کچھ لکھا جائے اور غور کیا جائے کہ ان کی اس کامیابی کے راز کیا تھے۔

اُردو شاعری میں دورِ جدید سے پہلے جو لوگ ترجمان و ادبی رہنما کہے جا سکتے ہیں ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ وَلی، مِیر، ناسخ، انیس و داغ کے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا۔ غالب کا نام ہم قصداً نہیں لے رہے ہیں کیونکہ وہ اپنے دور کو اپنی راہ پر نہیں چلا سکے بدقسمتی یا خوش قسمتی سے وہ ذہنی لحاظ سے اپنے دور کے بہت آگے تھے ان کا شاعرانہ اقدام ان کے زمانہ میں اتنا مقبول نہیں ہوسکا کہ زیادہ تعداد میں شعراء ان ہی کی طرح سوچنے اور کہنے لگتے۔ اُن کی قدردانی کو جدید دور کا انتظار تھا جب ان کا کلام نہ صرف عہد آفریں ثابت ہوا بلکہ قابلِ پرستش بھی سمجھا گیا۔ ان کے دیوان کو الہامی کتاب سے تعبیر کیا گیا اور ان کو اُردو کے ممتاز ترین شعرا میں شمار کیا گیا۔

"داغ بھی ہمارے خیال سے زبردست ترجمان و ادبی رہنما تھے انھوں نے اپنے دور کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اُردو ادب کے مزاج کو پوری طرح پرکھ لیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ہی کی طرح دوسرے شعرا بھی سوچنے لگے ان ہی کے رنگ میں غزلیں کہنے لگے یہاں تک کہ ان کے ادبی نقشِ قدم پر چلنا باعثِ فخر سمجھنے لگے اپنے زمانہ میں محفلِ ادب کو جتنا انھوں نے متاثر کیا شاید ہی کسی ایک شاعر نے کیا ہو اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کے ہمعصر اور زبردست حریف امیر مینائی بھی ان ہی کے نقشِ قدم پر چلنے کی سعی نامشکور کرنے لگے تھے۔ امیر کا مبلغِ علم، داغ کے علم سے کہیں زیادہ تھا فنی محاسن بھی کم نہ تھے لیکن داغ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ باوجود مولویت و مخالفت کے امیر مینائی آخر آخر میں داغ ہی کے نقشِ قدم پر گامزن نظر آتے ہیں داغ کی اس کامیابی کے اسباب کیا تھے اس کو سمجھنے کے لئے تھوڑی دیر اس زمانہ کی رفتار، گفتار، طرزِ معاشرت اور سماجی تاریخ کو دیکھنا پڑے گا تب اندازہ ہوگا کہ نصف صدی تک داغ نے اُردو زبان پر کیوں حکومت کی؟"

داغ کی پیدائش ۱۸۳۱ء اور وفات ۱۹۰۵ء میں ہوئی گویا وہ ۷۴ - ۷۵ سال تک زندہ رہے۔ یہ زمانہ، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے کچھ عجیب سا تھا فتنۂ افرنگ سے دِلّی کی مرکزی حکومت لرزہ براندام تھی۔ بادشاہِ وقت شاہ شطرنج کی حیثیت سے لال قلعہ میں پڑا تھا ایک بڑے انقلاب کے بادل امنڈ رہے تھے عوام کا تو ذکر ہی کیا، امراء اور نام نہاد شہزادے اپنی دولت و قسمت کی ناپائداری سے گھبرا رہے تھے، اُردو کا مرکز بجائے دہلی کے لکھنؤ ہو رہا تھا۔ جہاں کسی قدر سکون تھا

گرزوال پذیر، نوابوں کا دربار مغل بادشاہوں کے نمونے پر سج رہا تھا - آرائش کے لئے علم و فضل کا بھی رجحان تھا، تعیش و تعشق کا بھی زور تھا - جابجا مخصوص افراد خوش حال تھے مگر بڑی تعداد لوگوں کی خستہ حال و دست نگر تھی، مغلیہ خان کے آخری دور یعنی اورنگ زیب کے بعد کے تماش بینی اور لا ابالی پن روسا کی زندگی کا جزو لاینفک ہوگیا تھا اور لوگ آنکھ بند کرکے ان ہی رئیسوں کی تقلید کر رہے تھے گویا عیاشی و سرمستی کسی قدر علمیت کا پہلو لئے ہوئے تفریح کا سب سے بڑا مرکز بن گئی تھی اور اس مرکز میں طوائف یا اسی قسم کی عورتوں کا خاص درجہ ہوگیا تھا ان سے دلچسپی لینا ہر رئیس کے لئے باعث فخر ہوگیا تھا، جیسے آج موٹر کار اہل دول کے لئے ضروری ہوگئی ہے اسی طرح زمانے میں طوائف بھی ضروری ہوگئی تھی ایک سے زیادہ طوائفیں یا اس قبیل کی دوسری عورتیں حرم کی زینت ہوتی تھیں کوئی محفل بغیر ارباب نشاط کے محفل نہیں ہوسکتی تھی، پورے دور کا جنسی و جمالیاتی ذوق اسی قسم کی عورتوں اور محفلوں سے متاثر تھا - اُن سے دلچسپی لینا، ان کے متعلق گفتگو کرنا ان کے لئے مقابلہ میں سب کچھ لٹادینے کی ہمت قابلِ داد سمجھی جاتی تھی غرض کہ جنسی بھوک کی آسودگی اور شانِ امارت کی نمایش زیادہ تر اسی طوائف سے ہوتی تھی - یہ روسا پڑھے لکھے ہوتے گھٹی میں ایک خاص تہذیب پڑی ہوتی - لوگ طوائفوں کو گھر بُلاتے یا ان کے بالا خانوں پر جاتے، بہر حال کہیں نہ کہیں صحبتِ رازو نیاز ہوجاتی، شعر و شاعری کا بھی چرچا رہتا - نیاز مندوں کو مسخر کرنے کے لئے طوائفیں بھی شعر و شاعری سے دلچسپی لیتی تھیں، اکثر ان میں پڑھی لکھی ہوتی تھیں بعض بعض شعر بھی کہتی تھیں اور سخن فہم بھی ہوتی تھیں - حُسن و نغمہ کے ساتھ شعریت ضرورت سے زیادہ لطف انگیز ہوجاتی اور چونکہ حسن و عشق غزل کا محور بھی ہے اس لئے، اس لئے اور باتوں کے ساتھ علمی مذاق بھی آسودہ ہوجاتا -

اس ماحول کے ساتھ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ داغ کا زمانہ آج کا زمانہ نہ تھا - حُسن کا بازار اور جنسی خواہشات کا مرکز ہر جگہ نہیں بنتا تھا - پردہ کی رسم، مغربی طرز و تعلیم کی کمی نے اُس زمانہ میں عورتوں کو آج کی طرح گھومنے پھرنے کا موقع نہیں دیا تھا، یہ ممکن نہ تھا کہ اہلِ نظر ایک خاص سہولت کے ساتھ مختلف مقامات پر اپنی پیاس بجھا سکیں انکی اس خواہش کے لئے زیادہ تر طوائفوں کا گھر مخصوص تھا نتیجہ یہ تھا کہ ہر شخص بقدر توفیق ان ہی سے ملنے کی کوشش کرتا تھا اور اس زندگی و وابستگی کو عشق سے تعبیر کرتا تھا - طوائفوں کی حرکات و سکنات کو اپنی شاعری کا مرکز بناتا - جو واقعات اپنے مزاج کے خلاف پاتا ان کو جور و جفا کے خانہ میں لکھدیتا اور اپنی خواہشات کے تحت میں جو کچھ خود کرتا اس کو وفا، ایثار وغیرہ سے تعبیر کرتا، اسی طرح بوالہوسی اور عشق کی سرحد ہمارے ایک دور کی شاعری میں ملتی نظر آتی ہے - چنانچہ اگر آپ بے لوث ہوکر ذرا غور کے ساتھ اُردو شاعری کے اس دور کا جایزہ لیں جو داغ سے ذرا پہلے اور کچھ بعد تک تھا تو آسانی سے یہ محسوس ہوگا کہ اس دور کا معشوق، طوائف ہے اور عاشق تماش بین ہے - وفا، جفا کی حکایتوں میں معشوق کے برتاؤ میں، لباس میں، طرزِ معاشرت میں، غرض کہ اکثر باتوں میں آپ کو اس کے تائیدی ثبوت مل جائیں گے -

ہمارا یہ مطلب نہیں کہ طوائف یا کسی بازاری عورت سے عشق نہیں ہوسکتا یا اگر کسی کو ہوگیا ہو تو اس کو بُرا سمجھا جائے نہیں برخلاف اس کے ہمارے نزدیک جہاں اور جس کسی سے بھی عشق ہو قابلِ احترام ہے - میر نے بہت پہلے کہدیا تھا

کیا عاشقی میں پوچھتے ہو ذات کے تئیں سید ہو یا چمار ہو اس جا وفا ہے شرط

جس دور کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں اس میں معشوق بازاری تھا یا نہیں اس سے بحث نہیں کہنا یہ ہے کہ لوگوں کا عشق بازاری تھا، اس زمانہ میں "خواہش کا نام عشق، نمایش کا نام حسن" تھا، جن لوگوں کو واقعی عشق نہ تھا ان کی تعداد زیادہ تھی لیکن خیالات کے جواز اور ناکردہ گناہ کی داد ان ہی شعرا کے کلام میں ڈھونڈھتے تھے جو شاعری اور عاشقی کی سند لیکر بازار عام اور کبھی کبھی دربار خاص میں بھی جگہ پاتے تھے -

ان تمام حالات و بیانات کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت سماج جس سرچشمۂ حیات سے اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کر رہا تھا وہ وہی تھا جو آخری دور میں اورنگ زیب کے بعد محمد شاہ اور جہاندار شاہ وغیرہ چھوڑ گئے تھے۔ اسلاف کے دم سے کمالات بھی اخلاف میں تھے اور معائب بھی۔ طرزِ تخیل وہی تھی، محسوسات وہی تھے، استطاعت کی کمی اور بدلے ہوئے حالات کے اثر نے کچھ فرق پیدا کر دیا تھا ورنہ معاشرت اور نظریات وہی تھے کہیں کہیں اگر سیلاب میں کوئی فرق نظر آتا ہے تو اس کو صرف انفرادی سمجھئے اسے سماج کا مجموعی رجحان نہیں کہہ سکتے۔ ہم کو جس رجحان سے اسوقت سروکار ہے ——— اس کا بھی رنگ ڈھنگ یہی تھا اس طرز معاشرت اور سماجی زندگی کے ساتھ زبان و طرز بیان کا بھی جایزہ لینا ضروری ہے تاکہ داغ کی شاعری پوری اہمیت کے ساتھ سامنے آسکے۔ دور زیر بحث میں طرز بیان کی کئی لہریں ہمارے ادب میں نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہ انداز بیان تھا جو ناسخ و آتش کا اسکول پیش کر رہا تھا جس میں فارسی الفاظ کی بھرمار تھی ہندی الفاظ کم ہو رہے تھے تشبیہ و استعارہ ضرورت سے زیادہ زبان پر آرہے تھے بیان میں بھونڈا اور طرزِ تخیل میں رنگینی کے بجائے سادگی جگہ پا رہی تھی خیالات سے زیادہ قافیہ پیمائی پر توجہ تھی، اس انداز بیان کا اثر شاہ نصیر اور ذوق بھی لے رہے تھے۔ دوسری وہ لہر ہے جو غالب کی ذات سے وابستہ تھی جس میں خیالات کی بلندی اور بیان کی ندرت اگلے پچھلے تمام شعرا سے زیادہ تھی اس کا اثر محدود تھا، چند وجوہ سے اس کا دائرہ اس وقت وسیع نہیں ہو سکا مگر رفتہ رفتہ اس کی جگہ ادب میں مستقل ہو رہی تھی تیسری لہر وہ تھی جو میر نے پیدا کی تھی اس کی مستقل جگہ دلوں میں تھی کیونکہ اس کے اتحاد اثر اور طرز بیان دونوں اردو شاعری میں بے مثال سمجھے جاتے تھے مگر حالات بدل چکے تھے زبان جوان ہو گئی تھی، رعنائی کا آنا ضروری تھا اس لئے باوجود اثر کے ماحول کی رنگینی سے متاثر ہو کر لوگ زیادہ تر میر کی زبان و بیان کو تبرک کی جگہ دیتے تھے اس کو عام کرنے کی طرف مایل نہ تھے۔ ان اسلوب کے علاوہ اس غزل کی دنیا سے الگ ایک وہ لہر تھی جو میر انیس کے گھر سے اٹھی تھی اور جس کو انیس نے معراج کمال پر پہونچا دیا تھا۔ جس میں زبان و بیان کی اتنی ہم آہنگی تھی کہ اس سے دنیا متاثر نظر آئی مگر انیس کا موضوع غزل کے موضوعات سے اتنا علحدہ تھا کہ غزل والوں نے باوجود پسندیدگی کے اس بیان و زبان کو اپنے کام کی چیز نہ سمجھی اور حقیقتاً مرثیہ کی زبان اور غزل کی عام زبان میں ان کو ایک تصادم نظر آیا کیونکہ لکھنؤ اسکول زبان میں رنگینی، بیان میں رنگینی غرض کہ ہر چیز میں رنگینی دیکھنا چاہتا تھا اور انیس کی زبان میں سادگی، صفائی اور بیان میں خلوص اور ابھار تھا بہ ہیأت وضاحت کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔ یہاں تصنع سے کام نہ لیا گیا تھا، رعایتِ لفظی سے بھی کوئی خاص سروکار نہ تھا وہ لاتے کے لئے بہت کم لائی گئی تھی اس لئے اس وقت کی غزلوں میں شعرا نے اس انداز بیان کو لانے کی بہت کم کوشش کی۔

ان سب انداز بیان و زبان کو سامنے رکھ کر یہ دیکھنا ہے کہ داغ کس سے زیادہ متاثر ہوئے اور انھوں نے اس کشمکش میں کون سا راستہ اختیار کیا۔ داغ کی ابتدائی نشو و نما دہلی میں ہوئی، قلعۂ معلی میں رہے جہاں ٹکسالی زبان کا سکہ رائج تھا سیدھی سادی زبان اور سلجھا ہوا بیان عام طور سے مرغوب خاطر تھا۔ استاد ذوق کی رہنمائی میں داغ کو اسی زبان و بیان کا سامنا کرنا پڑا۔ سیدھی سادی باتوں کو صاف زبان میں بیان کر دینا ان کی گھٹی میں پڑ گیا اور اسی زبان کو لے کر وہ آگے بڑھے اور اس کو اپنے انداز بیان کی چاشنی دیکر ایک انفرادیت حاصل کر لی، اس سیدھی سادی زبان کو عوام کی پسندیدگی کا سہارا بہت پہلے سے مل رہا تھا اور اب مغربی تعلیم نے اس طرز گفتار کو اور زیادہ سراہنا شروع کیا، رنگینی اور تصنع سے انگریزی تمدن سے متاثر ہونے والے گریز کرنے لگے۔ تعلیم کا سلسلہ رفتہ رفتہ مکتب سے اسکول میں آ رہا تھا، زبان کو آگے بڑھانے اور مذاق کو سدھارنے کی ذمہ داری نئے مذاق کے لوگوں سے وابستہ ہو رہی تھی۔ یہ طبقہ بھی سادگی پسند تھا عوام بھی یہی چاہتے تھے، ثبوت کے لئے ہم میر امن کی 'باغ و بہار' میں زبان کا بہاؤ دیکھیں اور غالب کی زبان ان کے

خطوط میں اور سرسید کی زبان تہذیب الاخلاق میں دیکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیدھی زبان تیزی سے مقبول ہورہی تھی برخلاف اس کے رجب علی بیگ سرورؔ کی زبان جو 'فسانۂ عجائب' میں ہے اور دیگر اہلِ قلم کی زبان جو تقریظا وغیرہ کے سلسلہ میں ملتی ہے وہ ناپسندیدہ و زوال آمادہ تھی' بہرحال داغ نے ایک دور اندیش فنکار کی طرح مستقبل کا مذاق اور اپنے زمانے کے بڑھتے ہوئے رجحان کو مدنظر رکھ کر زبان کو صاف اور بیان کو سلجھا رکھا لیکن اس کو پُرکار بنانے کے لئے فن کاری کے دوسرے حربے بھی استعمال کئے۔ یہ تھا اس زمانہ کا سماجی اور ذہنی ماحول اور ادبی رجحان جس میں داغ کی ذہنی نشو و نما ہورہی تھی' ادب کو تلاش تھی ایک ایسے فن کار کی جو زبان کے مختلف راستوں میں سے ایک ایسا راستہ نکال لے جو شاہراہ بن جائے اور زمانہ کے مذاق کو پوری طرح آسودہ کرسکے، دقت یہ تھی کہ زبان کے مختلف راستے ایک دوسرے سے کبھی کبھی اتنا علٰحدہ نہ تھے کہ نمایاں فرق محسوس ہوتا، طرزِ تخیل میں البتہ نمایاں فرق تھا، ضلع جگت تصنع غلو یہ سب ایک اسکول کے خاص جوہر تھے اور دوسرا اسکول سادگی' متانت' اور اخلاقیات کا دلدادہ تھا، جو لوگ انگریزی پڑھ رہے تھے ان کا ذہنی جھکاؤ موخرالذکر کی طرف تھا، لیکن کسی قدر ترمیم بھی چاہتا تھا، کلام میں جو پھیکا پن اور مبالغہ آگیا تھا اس کے بجائے واقعات کی چاشنی تلاش کرتا تھا اور خارجی پہلو کے بجائے داخلی پہلو کو ادب میں لانا چاہتا تھا، داغ نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی کو مناسب سمجھا کہ اپنی شاعری کو رعایت لفظی و مبالغہ سے حتی الامکان بچالیں اور سیدھی سادی زبان میں واقعات یا محسوسات کو قلم بند کردیں اس طرح انھوں نے اس وقت کے خاص اسکول ہی کو نہیں اپنایا بلکہ مستقبل قریب کے ادیب یعنی انگریزی داں طبقہ کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا، لیکن اگر اتنے ہی پر داغ رک جاتے تو انفرادیت مقبولیت سے ہمکنار نہ ہوتی، کیونکہ اس قسم کا اقدام اور شعراء بھی کرچکے تھے مگر کوئی خاص نام نہ حاصل کرسکے تھے زمانہ کے مذاق کو پوری طرح آسودہ کرنے کے لئے ایک چابکدست فن کار اور بیباک شاعر کی ضرورت تھی اور ساتھ ہی ساتھ ایک تجربہ کار انسان کی بھی' جب تک یہ ساری خصوصیات بہم نہ ہوتیں ادبی دنیا پر حکمرانی ممکن نہ تھی، اتفاق سے داغ میں یہ سارے کمالات بیکوقت موجود تھے، فن کی تعلیم وہ استاد ذوقؔ سے حاصل کرچکے تھے، اپنے بچپن میں اُردو کے مشہور و ممتاز شعرا اور قابل ترین استاد سے کسب کمال کرچکے تھے، جوانی میں نوابوں اور امرا کے یہاں وہ رنگ رلیاں دیکھ چکے تھے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی تھیں، ایک جگہ خود بھی اس کا اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

حضرتِ داغ کو دلّی کی ہوا خوب لگی　　رات دن عیش ہے جلسوں میں بسر کرتے ہیں

وہ خود بھی حساس دل لے کر آئے تھے بارہا دل پر چوٹ کھا چکے تھے، خود بھی اسی خیال کی تائید ایک جگہ کرتے ہیں کہتے ہیں

داغ نے دیکھے ہیں ہزاروں حسیں　　آپ نے کس شخص سے دعویٰ کیا

اتفاق سے ان کو قدر داں بھی ایسے مل گئے کہ ان کے تجربات و بیانات کو صدق دل سے سراہ سکتے تھے اس موقع سے انھوں نے بھی جی بھر کر فایدہ اُٹھایا۔ مثالی اخلاقیات اور فرسودہ روایات سے مغلوب ہوکر محسوسات قلم بند کرنے میں وہ جھجکے نہیں، اس زمانہ کے واقعات اور حسن و عشق کے اصلی و عملی پہلوؤں کو اشعار میں صاف صاف بے دھڑک نظم کرنا شروع کردیا، اس وقت کے لوگ چاہتے بھی یہی تھے کہ کوئی دل کا چور نکال دے جو کچھ بزم نشاط میں گزرتی ہے اس کو سماج کے رعایتی خوف سے نظر انداز نہ کرے بلکہ روز مرہ کی روداد کو شاعرانہ انداز میں پیش کردے۔ واقعات کو مخرب اخلاق سمجھ کر چھوڑے نہیں بلکہ اصلیت کو بے محابا ایک حسن کے ساتھ غزل بنادے۔ داغ نے اس نفسیاتی پہلو کو محسوس کرلیا اور اپنی غزلیں اس انداز سے کہنے لگے کہ جس میں لوگوں کے صحیح جذبات کی ترجمانی ہو اس اقدام میں انھوں نے اندازِ بیان پر خاص توجہ کی، تیور، تیکھا پن سب سے زیادہ شوخی کو اپنی غزلوں کا جوہر قرار دیا اور ان خصوصیات پر اتنا زور دیا کہ اُردو شاعری میں عدیم المثال سمجھے گئے۔

اُردو شاعری کے لئے تیور، تیکھاپن، طنز یا شوخی کوئی بھی نئی بات نہ تھی، ابتداءِ آفرینش سے یہ سب چیزیں ادائے دلبر کی طرح غزلوں میں آ رہی تھیں اور لوگوں کے علاوہ جراَت و انشاؔ وغیرہ کے کلام میں یہ عناصر کافی پائے جاتے ہیں مگر داغؔ یہاں یہ سب جزو لاینفک ہو گئے ہیں، اور اس حُسن کے ساتھ کہ نہیں معلوم ہوتا کہ محض آرائش کے لئے یہ باتیں لائی گئی مثال کے لئے سب سے نمایاں عنصر یعنی "شوخی" لے لیجے۔ جراَت و انشاؔ اپنی شوخی کے لئے بدنام یا مشہور ہیں مگر ان کے یہ شوخی اشعار میں اتنی گھل مل نہیں گئی تھی کہ اور کا احتمال نہ ہو، صاف معلوم ہوتا ہے کہ عموماً لانے کے لئے یہ شوخی لائی گئی ہیں برخلاف اس کے داغؔ کے یہاں یہ خصوصیت ان کی شخصیت اور زندگی سے وابستہ نظر آتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے شوخی ان کی فطرت میں شامل ہو گئی تھی وہ جو کچھ کہتے ہیں وہی سوچتے بھی ہیں اور وہی ان کا مطلب بھی ہوتا ہے اس میں نہ بناوٹ ہے نہ نمایش۔ مثال کے لئے جراَت اور انشاؔء کے چند اشعار دیکھئے اور پھر داغؔ کا کلام ملاحظہ فرما کر حقیقت کا فیصلہ کیجئے اور یہ بھی سوچئے کہ شعریت کس کے یہاں زیادہ ہے۔

جراَت :- میرے گھر میں جو وہ آیا تو بگڑ کے یوں بولا — یہ جاتا تھا کہاں میں اور ہوا میرا کدھر جانا

حرفِ مطلب کو میرے سن کے یہ بصد ناز کہا — ہم سمجھتے نہیں بکتا ہے تو سودائی ہے

جراَت و انشاؔ کے اشعار پر ہم یہاں کوئی تنقید پیش نہیں کرنا چاہتے۔ ان کی شوخی یا طنز اپنی نوعیت کے لحاظ سے اتنی واضح ہے کہ کچھ کہنے سننے کی گنجایش نہیں اس کے مقابلہ میں آپ داغؔ کے مختلف دیوان اُٹھا کر دیکھ لیجئے فرق خود معلوم ہو جائے گا۔ احتیاطاً داغؔ کے بھی چند اشعار جابجا سے ہم اس ضمن میں پیش کئے دیتے ہیں کہ اگر چاہیں تو اندازہ کر سکیں۔

انکار سے کشی نے مجھے کیا مزہ دیا — سینہ پہ چڑھ کے اس نے مے خم پلا دیا

چاہ کا نام جب آتا ہے بگڑ جاتے ہو — وہ طریقہ تو بتاؤ تمھیں چاہیں کیونکر

دیکھو ادھر اُٹھاؤ نظر ہو چکی حیا — کیا جانتا نہیں کوئی اس بات کا لحاظ

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں — صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

ملے مجھ سے تو فرمایا تم ہی کو داغؔ کہتے ہیں — تمھیں ہو ماہ کامل میں تمھیں رہتے ہو ہالے میں

یہ جا کر پوچھ آ تو ان سے قاصد — کہ وہ خانہ خراب آئے نہ آئے

حضرت دل آپ ہیں جس دھیان میں — مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں — آپ گھبرائیں نہیں داغؔ کا حال اچھا ہے

غزل کے بعض اجزاء کو داغؔ نے اس طرح اسلوب بیان سے لذت آشنا کر دیا کہ ان سے پہلے یہ بات نہ پیدا ہو سکی تھی۔ ان کے زمانہ کے لوگوں کو یہ چیز نئی نظر آئی کیونکہ اس میں ادبیت، اصلیت، اور نشتریت سب کچھ شامل تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اُس وقت کی ساری غزل پسند دُنیا داغؔ کی طرف سمٹ آئی۔ اس کی توجہ کا مرکز داغؔ کی شاعری بن گئی۔ علمی ادبی صحبتوں میں اس کا تذکرہ ہوتا۔ بزمِ نشاط میں طوائفیں زیادہ تر داغؔ کی غزلیں گاتیں۔ غرض کہ ہر جگہ داغؔ کی شاعری کا تذکرہ تھا۔ ہزاروں شاعر داغؔ کے شاگرد ہو گئے باقاعدہ رجسٹر کھل گیا۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو داغؔ کے کلام کو مخرب اخلاق اور مبتذل کہہ کر اپنی نفرت کا اظہار کرتے تھے لیکن زمانہ یہ کہہ کر آگے بڑھتا ہی رہا کہ ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

اس ڈھب سے کیا کیجے ملاقات کہیں اور — دن کو تو ملو ہم سے رہو رات کہیں اور

ذرا تو بیٹھئے نزدیک، گر کہوں اس سے — تو کس ادا سے وہ کہتا ہے چل یہاں سے دور
یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا — چمپئی رنگ اور بدن اس کا وہ گدرایا ہوا
ثواب ہے یہ جو کہئے کسی کا خوش کرنا — تو کیا کہے ہے کہ باز آئے اس ثواب سے ہم
محبت مجھ سے تم رکھتے ہو توبہ، — چلو کھاؤ نہ بس جھوٹی قسم تم،
مجھ کو رسوائے خلق کرنا ہے — اب ترے چاہنے کو آگ لگے

انشاء کی شوخی اور طنز پر تو عموماً ریختی کا گمان ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:-

انشاء:- اختلاط آپ سے اور مجھ سے کہاں کا ایسا — واہ جی جان نہ پہچان یہ گالی دینا
ہوئے وعدے پر جو جھوٹے تو نہیں ملاتے تیور — اے لو اور بھی تماشا یہ سنو حجاب اُٹھا
مجھے چھیڑنے کو ساقی نے دیا جو جام اُلٹا — تو کیا بہک کے میں نے بھی اسے سلام اُلٹا
دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا — جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا
میں نے جو کہا ہوں میں ترا عاشقِ شیدا اے کانِ ملاحت — فرمانے لگے ہنس کے سنو اور تماشا یہ شکل یہ صورت
شیخ سے عید کو کیوں آپ ہم آغوش ہوئے — کوئی جاتا ہے بھلا ایسے بھی کھوسٹ سے لپٹ
یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پر — بے تاب ہو کے گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر

داغ کو زبان و بیان کی صفائی و صناعی سے وہ مقبولیت ہوئی کہ ان کے زمانہ کے زیادہ تر شعراء ان ہی کی روش پر چلنے لگے حتیٰ کہ امیر مینائی سا مقدس و پُرگو شاعر اسی کوشش میں مصروف نظر آنے لگا لیکن چونکہ شوخی امیر مینائی کی فطرت میں نہ تھی، رندی و سرمستی سے بالطبع ان کو کوئی سروکار نہ تھا، ان کے تجربات زیادہ تر رسمی تھے مشاہدات رسمی تھے، ان کو حسن و عشق کے ان مراحل سے نہیں گزرنا پڑا تھا جن کو وہ داغ کی تقلید میں نظم کرنا چاہتے تھے اس لئے باوجود زبان و شاعری پر عبور ہونے کے وہ اس رنگ میں ناکامیاب رہے مگر داغ کی مقبولیت کی سند وہ بھی اپنے اس سعیٔ نامشکور سے دے گئے۔ ان ہی پر کیا منحصر ہے اس زمانہ کے کسی ممتاز شاعر کا کلام اٹھا کر دیکھئے آپ کو داغ کی جھلک نظر آئے گی، جلال، اکبر، منیر وغیرہ سب ہی کے یہاں شعوری یا غیر شعوری تقلید داغ کی نظر آتی ہے۔

زبان و بیان کے علاوہ داغ کے یہاں ایک اور چیز تھی جس نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا، اُردو شاعری ابتداء ہی سے غم و پر جان دئے ہوئے تھی اس سلسلہ میں اتنا زیادہ مواد اکٹھا ہو گیا تھا کہ لوگ گھبرانے لگے تھے، غم و الم برحق سہی اقبال کا فرمانا درست سہی کہ "ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتاب زندگی" انسان پھر بھی انسان ہے۔ بقول غالب کے پیالہ و ساغر نہیں ہے وہ کبھی کبھی غم غلط کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے اس کا جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر ہنس بھی لے۔ داغ کا کلام اس مطالبہ کو پورا کرتا تھا۔ ان کے یہاں انحلال و قنوطیت بہت کم ہے زیادہ تر دل بہلانے کی باتیں ہیں اس لئے بھی زمانہ نے ان کے کلام کو دل میں جگہ دی۔

کچھ عجیب اتفاق ہے کہ جن باتوں کو آج، لوگ داغ کی شاعری پر بدنما دھبہ سمجھتے ہیں وہی ان کی کامیاب شاعری کا ذریعہ بن گئی، عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ داغ کے کلام میں غیر معمولی شوخی ہے، متانت و سنجیدگی کا خون بہتا نظر آتا ہے، فلسفیانہ اشعار میں نہیں، تصوف سے غزلیں معرا ہیں، مخرب اخلاق اشعار سے اُردو زبان کو نقصان پہونچا، یہ اور اس قسم کی دوسری باتوں سے ایک طبقہ اپنے کو خوش کر لیتا ہے۔ ان اعتراضات پر جستہ جستہ مضامین کی ضرورت ہے، یہاں اس کی گنجائش نہیں اور نہ ہمارے موجودہ مضمون کا اس سے کوئی تعلق ہے۔ ان اعتراضات کی مہملیت یا اہمیت سے فی الحال گزر کر ہم کو یہ کہنا ہے کہ جس زمانہ کے رجحانات کی ترجمانی داغ کر رہے تھے اس کے محسوسات صرف اسی شاعری سے آسودہ ہو سکتے تھے جو داغ

حصہ تھی، اس لئے کہ مذاق اور روز مرہ کی زندگی اس تفریح یا تعشق سے وابستہ تھی جو مثالی عشق سے کوسوں دور تھی، لوگ اپنے عملی زندگی کا نقشہ کسی باکمال شاعر کے یہاں دیکھنا چاہتے تھے فلسفہ یا گہرائی سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی جس کا ثبوت صرف یہی نہیں ہے کہ داغ کے پیشرو شعرا، مومن، ذوق، آتش، ناسخ وغیرہ کے یہاں بھی یا یہ اجزا کمیاب ہیں بلکہ اس زمانہ کا سب سے بڑا شاعر اسداللہ خاں غالب بھی لوگوں کو اپنی فلسفیانہ کاوشوں سے خوش نہیں کرسکا جس کے معنی یہ ہیں کہ لوگ عام طور سے ایسی باتوں کو پسند نہیں کر رہے تھے وہ چاہتے تھے سیدھے سادے الفاظ میں واردات عشق بیان ہوجائے کچھ زبان کی چاشنی ہو کچھ بیان کا لطف ہو مگر واقعات پر پوری روشنی پڑجائے یہ مطالبہ صرف داغ پورا کرسکے شوخی کی زیادتی اور اخلاق کے خراب ہونے کی شکایت اور تصوف سے بیگانگی کا شکوہ اسوقت کی زندگی نہیں کرنا چاہتی صرف چند نفوس ایسے رہے ہوں گے جنھوں نے کسی وجہ سے ان باتوں کو تیر ملامت بنادیا تھا اگر خدا نخواستہ یہ وبا عام ہوتی تو داغ کو مقبولیت اس وسیع پیمانے پر نصیب نہ ہوتی، زمانہ ان کے بعد تک ان کی تقلید پر فخر نہ کرتا۔

داغ کے زمانہ میں جس عشق کو غلبہ حاصل تھا اس کا بھی تقاضا تھا اور واقعاتی لحاظ سے بھی عشق میں کبھی کبھی انسان کا خفا ہوجانا اور معشوق کو بُرا بھلا کہنا ناگزیر ہے، عاشق بہرحال انسان ہے اس زمانہ کے لوگ بھی اسے محسوس کرتے تھے، معشوق کی دھمکی، یا ان حرکات سے بیزاری جو خود داری و شرافت نفس کے خلاف ہوں دلوں میں موجود تھی مگر رسم و روایت کی وجہ سے زبان نہ کھلتی تھی داغ نے اس نفسیاتی کشمکش کو محسوس کرلیا اور جابجا اپنے کلام میں معشوق سے ناراضی اور اپنی خود داری کا ثبوت بڑے تیور سے دیا۔ مثال کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

ایسی کیا بو سما گئی تم کو، ـــــ ہم سے جو اس قدر دماغ ہوا
بلا سے جو دشمن ہوا ہے کسی کا ـــــ وہ کافر صنم کیا خدا ہے کسی کا
کیا نزاکت کی شکایت ہے غنیمت جانو ـــــ ہم نے لپٹا کے گلے وقت سحر چھوڑ دیا
کیا ملے گا کوئی حسیں نہ کہیں ـــــ جی بہل جائے گا کہیں نہ کہیں
دباؤ کیا ہے سنے وہ جو آپ کی باتیں ـــــ رئیس زادہ ہے داغ آپ کا غلام نہیں
نہ پوچھ دل کی حقیقت مگر یہ کہتے ہیں ـــــ وہ بے قرار رہے جس نے بے قرار کیا،
در پردہ تم جلاؤ جلاؤں نہ میں جو خوش ـــــ میرا بھی نام داغ ہے گر تم جواب دو

یہ اشعار آئینہ دار ہیں اس زمانہ کے رویہ اور مذاق کے جن کو متشکل کرنے کے لئے ایک بڑے فن کار اور بیباک اہل نظر کی ضرورت تھی۔ داغ نے اس قسم کے محسوسات کو اپنے اشعار میں ہو بہو پیش کرکے خراج تحسین وصول کرلیا۔ اسی دوراندیشی و فنکاری کی طرف اقبال نے مرثیہ داغ میں اشارہ کیا ہے۔

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٰ یہ یعنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

ہمارے مضمون کا مفہوم یہ نہیں کہ ہم داغ میں صرف محاسن ہی پاتے ہیں، نہیں بلکہ ہم کو ان کے کلام میں کمیاں و کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں، ہم کو اس کا بھی احساس ہے کہ داغ کے یہاں ہر جگہ وہ خصوصیات نہیں ہیں جو انکی کامیابی کا راز ہیں۔ بلکہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے یہاں فرسودہ، رسمی، مثالی، عناصر بھی کافی ہیں اور جو زبان و طرز بیان داغ دے گئے ہیں وہ اپنے ماحول کے لئے نہایت مناسب سہی لیکن اتنی جاندار نہیں کہ ہر زمانہ میں اتنا ہی کارگر ہوسکے مگر باوجود ان باتوں کے کہنا پڑتا ہے کہ ان میں ایسی انفرادیت بھی ہے جو ان کو رسمی و روایتی طرز تخیل سے الگ کردیتی ہے اور

اسی انفرادیت کا سہارا ہے کہ داغ نے اپنے عہد کی پوری ترجمانی کی۔ بیباکی و صناعی سے اس کو پرکار بنادیا، جس مذاق کو انھوں نے پیش کیا اس کے لئے ان کا بیان، زبان سے بالکل ہم آہنگ تھا۔ فی الحال اس سے بحث نہیں کہ وہ مذاق اچھا تھا یا برا تھا، جیسا بھی تھا اس کی ترجمانی کے لئے ایک زبان کی ضرورت تھی ایک صاحبِ دل کی احتیاج تھی، اور ایک نکتہ رس و تجربہ کار طباع کی، داغ میں یہ جملہ صفات بیک وقت مجتمع ہوگئی تھیں جن کو کام میں لاکر انھوں نے ماحول کی سرگزشت بیان کردی، چونکہ ان کے محسوسات میں بڑی صداقت تھی، ان کے تجربات وسیع تھے وہ حسن و عشق کے مختلف مراحل سے گزر چکے تھے اس لئے خاطرخواہ کامیابی بھی ان کو نصیب ہوئی، ان کے زمانہ میں اور دور جدید کے پہلے تک اُردو میں ان ہی کا سکہ چلتا رہا انھوں نے ایک عہد کو شاعرانہ انداز سے اتنا جاندار بنادیا کہ ان کے مرنے کے بعد بھی کافی عرصہ تک اس کا اثر اُردو کے دل و دماغ پر رہا۔

نواب یوسف علی خاں ناظم کی ایک مشہور غزل

اور

داغ کی تضمین

کہتے تھے وہ بشر کو جو دل دے بشر غلط — دیوانہ جو کسی کا کوئی سربسر غلط
شامت جو آئی اُن کا بیاں جان کر غلط — میں نے کہا کہ دعوئے اُلفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

یا لب پہ کوئی قطرۂ مے جم کے رہ گیا — یا کچھ عیاں ہوا اثرِ گرمیِ غذا
یا جھوٹ موٹ بوسے کی ضد نے یہ دی سزا — سوزِ جگر سے ہونٹ پہ تبخالہ افترا
شور و فغاں سے ہے جنبشِ دیوار و در غلط

اک آہ سرد بھر کے کیا طورِ بیخودی — اُس کو دیا یہ دم کہ تجھے جان نذر کی
لو دینے والے ہوتے ہیں ایسے ہی تو سخی — مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی
جانِ عزیز پیشکشِ نامہ بر غلط

اُجرت پہ رونے والے مقرر ہیں جابجا — میت کو ڈھونڈھئے تو عدم تک نہیں پتا
ہاں اس خیال سے کہیں ٹھہرے نہ بیوفا — ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا
مرنے کی اپنی روز اُڑائی خبر غلط

جو عرض کی تھی داغ نے آخر وہی ہوا — کوئی خفا ہو آپ کو ہے چھیڑ کا مزا
دیکھا نہ آخر آج وہ بدخو برس پڑا — یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کیا
یہ کیوں کہا کہ دعوئے اُلفت مگر غلط

فصیح الملک حضرت داغ دہلوی

(جناب نوح ناروی)

قبل اس کے کہ میں حضرت داغ دہلوی کے کچھ حالات لکھوں یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اب سے بہت پہلے کئی صاحب اُن کے حالات لکھ کر کتابی صورت میں شایع کر چکے ہیں لیکن جلوۂ داغ کے نام سے جو حالات بھائی احسن صاحب مرحوم مارہروی نے لکھے ہیں اُن میں کسی طرح شک و شبہ کی گنجایش نہیں سب سے بڑی خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ جو حالات لکھے گئے ہیں وہ خود حضرت داغ سے پوچھ پوچھ کر لکھے گئے یہ کتاب اُن کی زندگی میں شایع ہوئی اور لوگوں نے جو کچھ لکھا وہ اسی کتاب کو دیکھ کر صرف دوسرے الفاظ میں لکھا اب جو باتیں میں لکھوں گا وہ یقینی دوسری کتابوں میں نہ ملیں گی اور سب سے نئی ہوں گی۔

حضرت داغ کب اور کہاں پیدا ہوئے اُن کا تعلق دلّی کے کس خاندان سے ہے، وہ قلعہ میں کیونکر پہونچے خاقانی ہند ذوق سے کیونکر اصلاح لی غدر ۱۸۵۷ء میں اُن پر کیا کیا حادثے گزرے وہ کہاں کہاں گئے، کہاں کہاں رہے یہ باتیں اور لوگ لکھ چکے ہیں لہذا میں نہیں لکھتا ہوں۔

شاعرانہ لحاظ سے میں نے انھیں کی آغوش میں آنکھ کھولی جو کچھ مجھے فیض پہونچا انھیں سے پہونچا جو کچھ میں نے سیکھا انھیں سے سیکھا جن دنوں وہ حیدر آباد میں تشریف رکھتے تھے، میں بہت دنوں تک اُن کی خدمت میں رہا پہلے وہ محبوب گنج میں رہتے تھے پھر ترپ بازار عابد شاپ کے متصل ایک عالی شان کوٹھی میں اُٹھ آئے اور آخر وقت تک یہیں رہے اس میں کوئی شک نہیں کہ جیسے وہ شاعر تھے ویسی ہی اُن کو تقدیر بھی ملی اور ویسا ہی انھوں نے قدر داں بھی پایا ان باتوں کو مفصل کیفیت آیندہ ذیل کی سطروں میں ملے گا۔

رام پور — رام پور کا زمانہ تو میری نظروں سے نہیں گزرا لیکن کچھ واقعات میں نے سنے بھی اور کتابوں میں دیکھے بھی اُن بزرگوں کے دیکھنے والے تو شاید اب زندہ نہ ہوں گے لیکن موجودہ حضرات نے اپنے بزرگوں سے سنا ہوگا کہ حضرت داغ کا کلام وہاں جتنے شعرا موجود تھے سب پر مقبولیت کے لحاظ سے فوقیت حاصل کرتا تھا مجھ سے رامپور کے اُس مشاعرہ میں جو نمائش کے موقع پر ہوا تھا ایک سن رسیدہ صاحب نے ذکر کیا کہ نواب خلد آشیاں یعنی نواب کلب علی خاں صاحب کا معمول تھا کہ مشاعرے کے وقت کچھ لوگوں کو مشاعرے کے باہر محض اس خیال سے بٹھا دیتے تھے کہ بعد ختم مشاعرہ لوگ کس کا شعر پڑھتے ہوئے مشاعرے سے باہر نکلتے ہیں، چنانچہ ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ داغ صاحب کا شعر پڑھتے ہوئے لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاتے تھے۔

ایک بار منشی منیر شکوہ آبادی نے سرِ دربار حضرت داغ کا دامن تھام کر کہا کہ کیا تمھارے شعر میرے شعر سے اچھے ہوتے ہیں مگر اس کا کیا سبب ہے کہ تمھارے شعر لوگوں کی زبانوں پر رہ جاتے ہیں اور میرے شعروں پر لوگوں کی خاص توجہ نہ ہوتی

ہے نہ کوئی یاد رکھتا ہے اس پر جناب امیر مینائی نے فرمایا یہ خدا داد مقبولیت ہے اس پر کسی کا بس نہیں -

میری پہلی حاضری پہلی بار جب میں حیدر آباد اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو روز کے حاضر باشوں میں نواب میر حسن علی خاں صاحب امیر تخلص جاگیر دار امراء مرزا صاحب نادان، مستجاب خاں صاحب خلق، میر منصب علی خاں صاحب عالم، مرزا خورشید عالم صاحب، مرزا مجاہدین صاحب شاہی، احسن مارہروی، افتخار عالم صاحب آزاد مارہروی، نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز، معتمد صرف خاص آغا صاحب شاعر دہلوی، مرزا منیر الدین صاحب، ضیا، عبدالحمید صاحب آزاد، مرزا مظفر حسین صاحب بارق، حافظ محی الدین صاحب محفوظ، ڈاکٹر مہدی حسن صاحب الم مولف گلبن تاریخ وغیرہ وغیرہ تھے چوتھے پانچویں حافظ جلیل حسن صاحب جلیل مانک پوری اور اختر صاحب خلف امیر مینائی صاحب بھی سلام کرنے کو آجاتے تھے یہ دونوں صاحب اُسوقت مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب شاد وزیر سلطنت کے وابستگانِ دولت میں تھے -

فصیح اللغات احسن مارہروی اُس وقت فصیح اللغات مکمل کر رہے تھے چونکہ مجھے استاد کے بیشتر اشعار یاد تھے اس لئے الفاظ کی سند میں بیشتر میں نے اُنھیں اشعار بتائے اور جن الفاظ کے متعلق کوئی شعر نہ تھا ان کی سند میں نئے شعر استاد کہہ دیا کرتے تھے یادگار داغ مرتبہ احسن میں جو اشعار متفرقات آخر میں ہیں یہ وہی ہیں جو سند میں کہے گئے تھے اسی موقع پر استاد نے فرمایا تھا کہ دیوان حافظ تو دیکھا تھا مگر حافظ دیوان نوح کو پایا اس لغت کے مکمل نہ ہونے کا انھیں بہت افسوس رہا احسن صاحب کچھ دنوں کے لئے اجازت لے کر مکان آئے لیکن پھر نہ جاسکے، حضور نظام نے لغت کا حال کئی بار دریافت کیا اور مہاراجہ نے تو اچھی خاصی رقم تدوین کے سلسلہ میں دی اور آیندہ طبع ہونے کے امداد کا بہت کچھ وعدہ بھی کیا۔

سائل صاحب اور معیار الانشاء دوسری بار میرے حاضر ہونے پر احسن صاحب اور افتخار عالم صاحب آزاد مارہرہ جاچکے تھے اور نواب مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی مع لاڈلی بیگم صاحبہ اور مرزا ناصر الدین صاحب، آگئے اسی زمانہ میں ایک ماہوار رسالہ معیار الانشا، سائل صاحب نے جاری کیا اس میں بیشتر تلامذۂ داغ کی ہم طرح غزلیں بعد اصلاح کے شایع ہوتی تھیں مگر کچھ دنوں تک یہ رسالہ جاری رہکر سائل صاحب کی بے توجہی سے ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا اس کے بعد فصیح اللغات کے متعلق سائل صاحب نے رائے دی کہ ایک ایک حرف ایک ایک شاگرد کے تعلق کر دیا جائے کہ وہ شعر لکھے اور آپ (یعنی داغ صاحب) دیکھیں، اور بعد اصلاح و ترمیم کتابی صورت میں مکمل ہونے پر لغت شایع کر دیا جائے لیکن اس کو داغ صاحب نے نہیں مانا اور متعدد خطوط یاد دہانی اور طلبی میں احسن صاحب کو لکھوائے مگر وہ وطن جاکر اپنے ضروری کاموں میں کچھ ایسے اُلجھے کہ ان کا آنا پھر نہ ہوسکا، میرے خیال میں سائل صاحب کی رائے بہت درست اور مناسب تھی اس صورت میں لغت بھی شایع ہوجاتا اور بہت سے شاگردوں کی خاص طور پر شہرت بھی ہوجاتی -

چھان بنان اور چھان بین ایک بار مرزا خورشید عالم صاحب اور سائل صاحب میں چھان بنان اور چھان بین کے متعلق بڑی دیر تک بحث رہی، قریب تھا کہ بحث بڑھکر بے لطفی کی حد تک پہونچ جائے میں نے دونوں صاحبوں سے کہا کہ آپ لوگ ناحق جھگڑا کر رہے ہیں استاد سے کیوں نہیں پوچھ لیتے مرزا خورشید عالم صاحب فرما رہے تھے کہ چھان بنان بھی ہے سائل صاحب کا کہنا تھا کہ چھان بنان غلط ہے چھان بین درست ہے. غرض میرے کہنے پر دونوں صاحب داغ صاحب کے پاس گئے اور اپنی اپنی بحث پیش کی حضرت داغ نے فرمایا کہ لال قلعہ میں چھان بنان کا لفظ چھان بین کے علاوہ بولا جاتا تھا لیکن قلعہ سے باہر یہ لفظ مقبول نہیں ہوا اس کی زندگی صرف قلعہ تک محدود رہی اور چھان بین عام طور سے زبانوں پر ہے گو کوئی شخص چھان بنان کو استعمال شاعری میں کرے تو غلط نہیں کہا جاسکتا۔

زندہ دلی اور رنگین مزاجی داغ صاحب کی زندہ دلی اور رنگین مزاجی اور حسن پرستی کے بہت سے واقعات مجھے معلو

لیکن ادب کے خیال سے میں لکھ کر اُن کی روح کو صدمہ نہیں پہونچانا چاہتا حجاب کے واقعات بہت پہلے کے ہیں الٰہی جان علیگڑھ
کا وقت بھی میں نے نہیں دیکھا لیکن اُسے علی گڑھ داغ منزل میں دیکھا۔ اختر جان کو البتہ میں نے دیکھا ہے غرض وہ حسن کو
دیکھ کر بہت متاثر ہوتے تھے، انشائے داغ میں احسن صاحب نے ایک خط کی نقل شایع کردی ہے جو انھوں نے نبی جان
آبادی کو لکھا تھا اس خط کی نقل میں بھی کسی موقع سے لکھدوں گا جس سے اُن کی طرز تحریر اور رنگین مزاجی کا حال معلوم
ہوسکتا ہے۔

ن لطیفے ایک روز مستجاب خاں صاحب تحلق جو شاگردوں میں تھے شام کو آئے داغ صاحب کو انھوں نے دیکھا کہ مغرب کی
نماز پڑھ رہے ہیں وہ واپس جارہے تھے کہ انھوں نے سلام پھیرا اور مجھ سے فرمایا کہ انھیں بلاؤ وہ آئے تو کہنے لگے
آکر واپس جانے کی کیا ضرورت تھی میں نماز پڑھ رہا تھا لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا اس لطیفے پر حاضرین کو ہنسی آگئی اور وہ
ت شرمندہ ہوئے۔

ایسے ہی مرزا مظفر حسین صاحب بارق ایک موقع پر استاد سے فرمانے لگے کہ آپ بڑی آسانی سے شعر کہہ لیتے ہیں مجھے تو
کہنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے پان بنوا کر دہنے بائیں خاصدان رکھتا ہوں چار پانچ چلمیں حقہ کی بھری جاتی ہیں پلنگ پر
لیٹ کر کروٹیں بدلتا ہوں تو شعر کہتا ہوں یہ سُن کر ہنستے ہوئے داغ صاحب نے فرمایا کہ آج معلوم ہوا تم شعر نہیں کہتے بلکہ شعر
جنتے ہو۔

اسی طرح ایک دن میں شاگردوں کا رجسٹر دیکھ رہا تھا ۱۰۰۵ میرا نمبر تھا میرے بعد اور بہت سے لوگ اُن کے شاگرد ہوئے
ین تعداد ۲۰۰۰ ہزار سے کم کسی طرح نہ تھی میں نے کہا کہ جناب والا قیامت میں ایک امت آپ کی بھی ہوگی سُن کر ارشاد کیا جسکی امت
نوح جیسے پیمبر ہوں اُس کی امت کا کیا کہنا۔

مصارف حضرت داغ اگرچہ معقول تنخواہ پاتے تھے مگر مہینے میں کچھ پس انداز نہ ہوتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ داد و دہش میں اُنکا
ہاتھ کبھی نہ رُکتا تھا بہت سے اعزا اور مساکین کو پابندی کے ساتھ منی آرڈر کے ذریعہ سے مختلف مقاموں پر روپئے
روانہ فرماتے تھے علاوہ اس کے باورچی خانہ اور روز مرہ کا خرچ آنے جانے والوں کی امداد مہمانوں کی خاطر مدارات خیرات مبرات
ن سب صرف ہوجاتا تھا باورچی خانہ میں انا لطیفن، سجن جھپیا، صاحب جان چار پانچ عورتیں نوکر تھیں جمال صاحب چھوٹے بڑے
محبوب اجنا عبدالحمید وغیرہ دس بارہ خدمت گار، رحمت اللہ قوال، غلام رسول کاتب، دیوان منشی عبدالغنی صاحب تحویل دار عبدالعزیز صاحب
وغیرہ اچھی اچھی تنخواہیں پاتے تھے کپڑا بدلنے کا روزانہ معمول تھا عطر سے خاص رغبت تھی بالخصوص سہاگ زیادہ پسند فرماتے تھے
وہ مدراس سے آتا تھا چار گھوڑے دو گاڑیاں پھر سائیس کوچبان دانہ گھاس کے مصارف تھے غرض بچت کی کوئی صورت نہ
تھی بلکہ اکثر مہینوں میں دیکھا گیا ہے کہ جب روپیہ نہیں رہا تو نواب میر حسن علی خاں صاحب امیر کے ہاں سے منگوایا گیا اور تنخواہ
ملنے پر سب سے پہلے اُن کا مطالبہ ادا کردیا گیا۔

حضور نظام کے کلام پر اصلاح نواب میر محبوب علی خاں صاحب آصف تخلص علاوہ سخن سنجی اور قدر دانی کے بڑے زود گو
اور قادر الکلام تھے باوجود مصروفی امور سلطنت کے بشیتر دیکھا گیا ہے کہ ایک ایک دن میں
کئی کئی غزلیں کہہ ڈالی ہیں جس دن وہ شعر کہنے کو آمادہ ہوتے تھے شاہی چوب دار متعدد بار آتا تھا جب غزل ختم ہوتی فوراً اُس کی مثنی
استاد کے پاس اصلاح کے لئے سربمہر لفافے میں روانہ فرماتے اور یہ سو کام چھوڑ کر اپنے دست خاص سے اصلاح فرما کر پھر سربمہر
لفافے میں واپس کرتے لیکن باوجود کوشش کے کسی کو یہ نہ معلوم ہوسکا کہ نظام نے کیا لکھا اور انھوں نے کیا اصلاح دی ایکبار
ننا ضرور فرمایا کہ بادشاہوں کے مصرعے یا الفاظ کاٹے نہیں جاتے بلکہ اصلاحی مصرعہ یا اصلاحی الفاظ اوپر لکھدئے جاتے ہیں۔

ممتاز شاگردوں کے نام یوں تو شاگردوں کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی لیکن ذیل کے شاگرد امتیازی درجہ رکھتے تھے بہت سے انتقال کر گئے چند حضرات ابھی زندہ ہیں خدا ان کو سلامت باکرامت رکھے۔

آصف حضور نظام دکن مرحوم ۔ احسن صاحب مارہروی مرحوم ۔ سید قطب الدین صاحب اشک مرحوم ۔ علامہ سر اقبال صاحب مرحوم ۔ ڈاکٹر مہدی حسن صاحب الم حیدر آبادی ۔ سید محمد اختر صاحب اختر مرحوم نگینوی ۔ آزل لاہوری ۔ عبد المجید صاحب آزاد حیدر آبادی ۔ نواب میر حسن علی خاں صاحب امیر مرحوم حیدر آبادی ۔ مرزا مظفر حسین صاحب بارق علی گڑھی ۔ بشیر رامپوری مرحوم ۔ منشی فضل رب صاحب باغ مرحوم سنبھلی ۔ سید حسین احمد میاں صاحب ۔ بیباک شاہجہاں پوری مرحوم ۔ سید حامد حسین صاحب بیدل مولوی عبد الحیٔ صاحب مرحوم بیخود بدایونی ۔ حاجی سید وحید الدین احمد صاحب بیخود دہلوی ۔ سید بشارت علی صاحب جالب مرحوم ۔ محمد علی صاحب جوہر مرحوم رامپوری ۔ پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی ۔ مولوی حسن رضا خاں صاحب حسن مرحوم بریلوی ۔ مستجاب خاں صاحب خلق حیدر آبادی ۔ سید امیر حسن صاحب دلگیر مارہروی ۔ نشی حیات بخش صاحب رسا مرحوم مصطفےٰ آبادی ۔ منشی حب لال صاحب رعد ۔ پنڈت تربھون ناتھ صاحب زتشی زار دہلوی ۔ نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی مرحوم منشی عاشق حسین صاحب سیماب مرحوم اکبر آبادی ۔ آغا مظفر بیگ صاحب شاعر مرحوم دہلوی ۔ مشرف یار خاں صاحب شرف مرحوم جاورہ ۔ یوسف حسن صاحب طپش مرحوم مارہروی ۔ نانک پرشاد صاحب طالب مرحوم ۔ صولت حیدر آبادی ۔ مولانا مظفر علی خاں صاحب ظفر ۔ مرزا منیر الدین صاحب ضیا دہلوی مرحوم ۔ نواب عزیز یار جنگ صاحب عزیز حیدر آبادی ۔ حاجی عطا محمد صاحب عطا مرحوم بدایونی ۔ عیش بھوپالی ۔ نشی عبد الوحید صاحب فدا گلاوٹھوی ۔ فیروز خاں صاحب فیروز مرحوم رامپوری ۔ محمد الدین صاحب فوق لاہوری ۔ سید رضی الدین صاحب کیفی مرحوم حیدر آبادی ۔ نشی دیبی پرشاد صاحب مایل مرحوم مین پوری ۔ منشی عبد الغفار خاں صاحب مرحوم مفتوں دہلوی ۔ نشی نارائن پرشاد صاحب مہر مرحوم گوالیاری ۔ ممتاز علی خاں صاحب ممتاز مرحوم ۔ محمود علی خاں صاحب محمود مرحوم رامپوری ۔ حافظ محی الدین صاحب محفوظ مرحوم حیدر آبادی ۔ مولوی متین الدین احمد صاحب متین مچھلی شہری ۔ ڈاکٹر مبارک حسین صاحب مبارک عظیم آبادی ۔ مولانا ابو الحسن صاحب ناطق گلاوٹھوی ۔ نشی شبیر حسن صاحب نسیم مرحوم بھرت پوری ۔ امداد مرزا صاحب نادان مرحوم دہلوی ۔ نوح ناروی ۔ وجاہت حسین صاحب وجاہت مرحوم جھنجھانوی ۔ نواب ناظم علی خاں صاحب تجبر شاہجہاں پوری ۔ جو لوگ انتقال کر چکے ہیں اُن کے اسمائے گرامی محض اس خیال سے لکھے گئے ہیں کہ کم سے کم اُن کا ذکر تو اس سلسلہ میں آجائے ورنہ کچھ دنوں میں لوگ انھیں بھول جائیں گے مرنے کے بعد کون کس کو یاد کرتا ہے اور کون کس کو یاد رکھتا ہے ان میں سے بیشتر صاحب تصانیف ہیں اور بہت سے لوگوں کا کلام کتابی یا دیوان کی صورت میں شایع نہیں ہوا۔

روزانہ مشاغل حضرت داغ نماز صبح پڑھنے کے بعد آفتاب نکلتے نکلتے گرمی کے زمانے میں معمولاً اپنی کوٹھی کے پھاٹک کے قریب اندرونی جانب آرام کرسی پر بیٹھ جاتے تھے پندرہ بیس کرسیاں اُٹھنے بیٹھنے والوں کے لئے اور ڈال دیجاتی تھیں میز پر قلم دوات لفافہ سادہ کاغذ رکھا جاتا تھا اکثر نواب میر حسن علی خاں صاحب ۔ سید حامد حسین صاحب بیدل شاہجہانپوری اور بیش تر میں اُن غزلوں کو سنا کر اصلاح لیتا جو باہر سے ڈاک پر آتی تھیں پڑھنے والا پڑھتا تھا اور استاد اسی وقت برجستہ اصلاح دیتے جاتے تھے دورانِ اصلاح میں اگر کوئی لفظ یا مصرعہ سنانے والے کے ذہن میں آتا تو وہ بلا تامل عرض کرتا پسند ہوتا تو وہی رکھدیا جاتا ورنہ خود درست فرماتے جب غزل ختم ہوتی تو لفافے میں بند کرکے روانہ کردی جاتی ان غزلوں کا اوسط روزانہ کسی طرح بیس بائیس سے کم نہ تھا اور یہ شغل بغیر ناغہ دس بجے دن تک رہتا تھا پہلے میرا خیال وطن میں تھا کہ مبتدی شاگردوں کا کلام داغ صاحب کیا دیکھتے ہوں گے ممتاز شاگردوں کے حوالے کردیا جاتا ہوگا لیکن یہاں آنے پر دیکھا کہ

ہر شاگرد کا کلام خواہ وہ کسی درجے کا ہو خود سنتے اور خود اصلاح فرماتے تھے، اس دوران میں اتفاقاً اگر کوئی مقامی شاگرد آ گیا تو اُس کے کلام کی بھی اصلاح ہوجاتی ورنہ مقامی لوگوں کے لئے بعد ظہر کے وقت مقرر تھا وہ لوگ آتے اور خود اپنا کلام سُنا کر خود اصلاح لیتے اِن اصلاحوں کے لکھنے سے مجھے یا نواب میر حسن علی خاں صاحب یا بیدل صاحب کو کوئی واسطہ نہ تھا گیارہ بجے دن کے قریب کوٹھی کے اندرونی حصّے میں دسترخوان بچھتا جو لوگ موجود ہوتے سب کھانے میں شریک کئے جاتے کھانے میں کئی قسم کی چیزیں ہوتیں بعض بعض دن فرمایش کردینے سے وہ چیز بھی پکتی جس کے لئے حکم دیا جاتا، تناول طعام کے بعد حضرت داغ کے سامنے پیچوان (حقہ) لگا دیا جاتا نواب میر حسن علی خاں صاحب کے لئے گڑگڑی حاضر کی جاتی پھر استاد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ آرام کے بعد ظہر کی نماز ادا کرتے اور شطرنج کی دو ایک بازی کھیلتے یا احباب جمع ہوجاتے تو اُن سے گفتگو کرتے یا مقامی شاگردوں کی غزل پر اصلاح فرماتے عصر کی نماز کے بعد دسویں پندرھویں ہوا خوری کے لئے جوڑی پر سوار ہوکر نہایت تزک و احتشام کے ساتھ نکلتے اور زیادہ تر سکندر آباد، حسین ساگر یا باغ عام کی طرف تشریف لے جاتے گاڑی پر داہنی طرف صدر میں خود بیٹھتے بائیں طرف برابر میں نواب میر حسن علی خاں صاحب کو بٹھاتے سامنے کی نشست گاہ میں سید حامد حسین صاحب بیدل اور میں ہوتا کچھ دیر تک تفریح فرماکر واپس تشریف لاتے اور مغرب کی نماز پڑھتے فریضہ ادا کرنے کے بعد کبھی رحمت اللہ قوال کبھی اور کسی سے اور کبھی اختر جان سے گانا سنتے پھر رات کو کھانا تناول فرماتے، عشا کی نماز کے بعد خود شعر کہتے اشعار کہنے کی یہ صورت تھی کہ وہ بولتے جاتے تھے اور ایک آدمی مسودہ کی کتاب میں لکھتا جاتا تھا، لکھنے والا ایک شعر نہ لکھنے پاتا تھا کہ دوسرا شعر موزوں ہوجاتا تھا اسی طرح بہت جلد غزل طیار ہوجاتی تھی ایک مصرعہ کبھی اُن کی زبان مُبارک سے نہیں سنا گیا جب کہا پورا شعر کہا یہ معلوم ہوتا تھا خط لکھا رہے ہیں اُن کا یہ بھی معمول تھا کہ پہلے مطلع فرماتے تھے اور نئی زمین نکالتے تھے جس قدر شعر کہنے ہوتے وہ کہہ کر سوتے بعض دن تھوڑی دیر تک سو کر جاگ اُٹھتے چونکہ میرا کمرہ قریب تھا اس باعث سے مجھ کو فوراً جگواتے اور میرے جاگنے سے قریب کے اور سونے والے بھی جاگ اُٹھتے حقّہ بھرا جاتا اور بڑی دیر تک دلّی وغیرہ کے واقعات بیان فرماتے پھر سو رہتے اور علی الصباح بیدار ہوتے۔

نظام کا استفسار اور حضرت داغ کا جواب

ایک بار اعلیٰ حضرت نے داغ صاحب سے بذریعہ خط کے دریافت کیا کہ آپ کے شاگردوں میں سب سے کون اچھا ہے اس کا جواب بھی انھوں نے لکھ دیا جو متعدد شاگرد اپنے کو اس کا حق دار سمجھتے تھے اب اُنھیں فکر ہوئی کہ کس کا نام لکھا گیا لیکن دریافت کرنے کی جسارت کسی کو نہ ہوتی تھی آخر جب نہ رہا گیا تو نواب میر حسن علی خاں صاحب نے پوچھا پہلے تو داغ صاحب خاموش رہے مگر دریافت کرنے پر فرمایا کہ میں نے ترا کو دیکھنے کی طرح دیکھا ہے لال قلعہ میں پرورش ہوئی بہت دنوں تک نواب کلب علی خاں صاحب کی دربار داری رام پور میں کی اور اتنے دنوں سے حیدر آباد میں ہوں میں نے حضور نظام کو لکھ دیا کہ آپ سے بہتر میرا کوئی شاگرد نہیں آخر وہ بھی تو میرے شاگرد ہیں: معقول جواب سن کر سب اپنی جگہ خاموش ہوگئے۔

داغ صاحب کا احترام

حضرت داغ چونکہ شاہی اشاف میں تھے اس لئے سفر حضر سیر و شکار میں اعلیٰ حضرت کے ہمراہ رہتے تھے میر محبوب علی خاں صاحب کی عادت تھی کہ جس سے مخاطب ہوتے تھے گھنٹوں کھڑے کھڑے اُس سے باتیں کرتے تھے ایک بار داغ صاحب سے کچھ دیر تک کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہے کچھ دیر تک تو یہ متحمل ہوسکے آخر میں گر پڑے اُس وقت سے یہ اعزاز بخشا گیا کہ ہم چاہے جس حال میں ہوں داغ صاحب کے لئے کرسی رکھ دی جایا کرے چنانچہ اس وقت سے یہی ہوتا رہا کہ انھیں کو بیٹھنے کو کرسی مل جاتی تھی۔

فقراء اور بزرگانِ دین سے عقیدت

حضرت داغ کو فقرا سے بے حد عقیدت تھی جو سائل آجاتا اُس کو خالی ہاتھ کبھی نہ جانے دیتے حیدر آباد میں بیش تر عرس ہوتے رہتے تھے وہ ہمیشہ پہونچنے کی کوشش فرماتے

امیر مینائی صاحب کے عرس میں اُن کے ساتھ جانے کا مجھے بھی اتفاق ہوا ہے تیسرے چوتھے روز کسی نہ کسی بزرگ کی فاتحہ ضرور دلوائی جاتی تھی اور خاص اہتمام ہوتا تھا اجمیر شریف کا وہ بہت احترام کرتے رہے کئی بار وہاں حاضر بھی ہوئے اور پھر جانا چاہتے تھے کئی بار مجھ سے ذکر کیا اور نارے تشریف لانے کا بھی وعدہ فرمایا لیکن اتفاق وقت سے نہ اجمیر شریف پہونچ سکے اور نہ نارہ تشریف لائے یہ حسرت اُنکے اور میرے دل میں رہ گئی۔

انعام واکرام وخطابات

علاوہ معقول تنخواہ کے ہمیشہ نظام انعام و اکرام سے اُن کو سرفراز فرماتے تھے بیش ترمیش قیمت چیزیں اُن کو عنایت فرمائیں قصیدوں پر مالا مال کیا ایک گاؤں بھی دیا میرے سامنے کی تو بات نہیں ہے لیکن سنتا ہوں کہ مرزا ناصرالدین صاحب کی تسمیہ خوانی کے موقعہ پر جو ہار حضور نے آکر پہنایا تھا اُس کی قیمت سوا لاکھ تجویز کی گئی بلبلِ ہند دبیرالدولہ ناظم یار جنگ استاد جہاں فصیح الملک جیسے مہتم بالشان خطابات بھی دربار سے اُنھیں ملے۔

حضور نظام کا مکان پر تشریف لانا

ایک بار قریب گیارہ بجے رات کو دربان نے آکر داغ صاحب کو اطلاع دی کہ ایک عرب کے صاحب پھاٹک پر کھڑے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں چونکہ ناوقت ہے اس لئے پوچھنے آیا ہوں نواب میر حسن علی خاں صاحب نے کہا کہ اُن سے جاکر کہو یہ وقت ملنے کا نہیں صبح کو تشریف لائے یہ جواب سُن کر دربان چلا گیا اور فوراً پھر واپس آکر کہنے لگا کہ انھوں نے کچھ تحکمانہ لہجے سے کہا ہے کہ جاکر کہو ہم اسی وقت ملیں گے غرض وہ صاحب تشریف لائے، داغ صاحب دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہم لوگوں کو اشارے سے ہٹا دیا بڑی دیر تک وہ صاحب بیٹھے رہے جب جانے لگے تو داغ صاحب کچھ دور تک اُن کو پہونچانے آئے معلوم ہوا کہ تبدیل لباس نواب میر محبوب علی خاں صاحب تھے یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے سُنا ہوا نہیں ہے

حضرت داغ کے دو خط

میرے لڑکے ابوالحسن مرحوم کے نام

برخوردار نورچشم راحت جان سلمہ اللہ تعالیٰ دُعائے ترقی عمر و دولت کے بعد مدعا نگار ہوں تمھارے والد ماجد کے یہاں آنے سے مجھے ایسی خوشی ہوئی جیسے اپنے بچھڑے ہوئے فرزند کے ملنے سے ہوتی ہے مگر ایک بات سے سخت حیرت ہے کہ وہ اپنی اشتہا وہاں فروخت کر آئے ہیں یا گردی کر آئے ہیں یا خیرات میں نے جو امتحان لیا تو مینا سے بھی وہ کم کھاتے ہیں نہیں معلوم میرے گھر کا کھانا اُنھیں پسند نہیں آتا یا بھوک ہی گھٹ گئی ہے یا نارے والے سب اتنا ہی کھاتے ہیں اگر کہتا ہوں کہ کچھ فرمائش کرو تو وہ نہیں سنتے، تم صاف صاف لکھو کہ وہاں ان کو کون کون سا کھانا پسند تھا کون سی چیز مرغوب تھی کہ یہاں بھی وہی پکوائی جائے میرا قصد مصمم ہے کہ جب میں اجمیر شریف کی زیارت کو جاؤں گا تو نارے بھی تمھیں دیکھنے آؤں گا مگر بے خبر آؤں گا اور فوراً تمھیں دیکھ کر اُسی دن اور اُسی وقت واپس آؤں گا، بیٹا روپیہ یوں ہی جمع ہوتا ہے کہ تمام گھر پاؤ بھر کھانا کھا لیا کرے نارے میں زیادہ اس واسطے نہیں ٹھہرنے کا کہ میرا کھانا دیکھ کر وہاں کے لوگ مجھے کھا جائیں گے، میرے ساتھ سات آٹھ آدمی ہوں گے، اپنی خیریت سے اطلاع دو اپنی بہن کو بہت بہت دُعا کہنا تمھارا والد بفضلہ خیریت سے ہیں اس کا جواب کسی سے لکھوا کر بھجواؤ۔ فصیح الملک داغ دہلوی - ۱۳ر ستمبر سنہ ۱۹۰۴ء

یہ خط انشائے داغ مولفہ احسن صاحب صفحہ ۹۳ پر ہے اور اس خط کے نیچے ذیل کی عبارت درج ہے:۔

مرزا داغ کے بزرگانہ اشفاق و الطاف یوں تو اپنے تمام شاگردوں کے ساتھ عام تھے مگر وہ تلامذہ جو اُن کی خدمت میں حاضر رہتے اور اپنے خلوص وخصوصیت سے حاضر و غائب جاں نثار رہے اُن پر خصوصی مہربانی رہتی برادرم نوح بھی اُنھیں خصوصی تلامذہ میں ہیں جب سنہ ۱۹۰۴ء میں دوبارہ خدمت استاد میں حاضر ہوئے ہیں اُس وقت یہ خط اُن کے فرزند کے نام لکھوایا گیا جو اُس وقت بہت کم سن تھا اور افسوس ہے کہ اب وہ دُنیا میں نہیں مرحوم کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنی شفقت بزرگانہ و مربیانہ سے اپنے شاگردوں کے ایسے خانگی حالات پوچھا کرتے تھے جس سے واقفیت کے بعد مختلف قسم کی ہمدردیاں قایم ہو جاتی تھیں اور خصوصیتوں کا پتہ چلتا تھا وہ کھانے کے بہت شوقین تھے اور ذرا ذرا بہانہ ڈھونڈ کر کھانا پکواتے تھے کسی چیز کے کھانے کا جی تو خود ہوتا مگر دوسروں پر رکھ کر فرمائشیں کی جاتی تھیں

کہ آج فلاں صاحب کے لئے فلاں چیز پکے گی ۔ باتیں بالتفصیل اُن کی سوانح عمری میں لکھنے کے لائق ہیں یہاں مختصراً اشارہ کر دیا گیا ہے ۔

نبی جان طوایف الہ آبادی کے نام انشائے داغ مولفہ جناب احسن صفحہ ۲۲

"حور کی صورت نور کی مورت خوش رہو اور ہم سے ملو، کل محمد نوح صاحب تشریف لائے، آج بر سبیل تذکرہ تمہاری طرف سے ہمارا ایک ہدیہ پیش کیا یعنی تمہاری تصویر تصویر نہیں بلکہ تیرا نام پوچھا تو سُن کر خواہ مخواہ ایمان لانا پڑا (نبی جان بتقدیم نون) بار خدا یا ایسی صورت بھی تو نے پیدا کی ہے سیرت کی تعریف سنی تو صورت سے بڑھ کر خوش آواز خوش مزاج پھر اُس پہ پڑھی لکھی زمانہ ایسے لوگوں کی جتنی قدر کرے بجا ہے ۔

بت ہی پتھر کے کیوں نہ ہوں اے داغ　　اچھی صورت کو دیکھتا ہوں میں ،

کیوں جی تم سے کیونکر ملیں تم کو کیونکر دیکھیں کیوں کر سنیں اور نہ دیکھیں تو کیونکر جئیں جو شخص ازلی عاشق مزاج ہو خیال کرو اُس کا کیا حال ہوگا تم سے یہ امید نہیں کہ خواب میں بھی کبھی آؤ، ہائے مجبوری وائے مجبوری میں نے سُنا ہے کہ مہتاب داغ تمہارے پاس نہیں ہے بطور ہدیہ بھیجا جائے گا اگر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہے تو غنیمت ہے ہم نے جو تحریر میں سبقت کی یہ خلاف عادت ہے

دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی

سوئے ادبی کے خیال سے تمہارے نام میں ایک نقطے کا تغیر و تبدل کر دیا ہے (نون) کا نقطہ (بے) کی جگہ اور (بے) کا نقطہ (نون) کی جگہ یعنی بجائے نبی جان بنی جان تمہاری تصویر کی شان میں ایک رُباعی کہی ہے :۔

کیا بات ہے کیا گھات ہے اللہ رے شریر　　سوجھی ہے نئی طرح کی تجھ کو تدبیر
کب دیکھنے والوں پہ کھلا دل کا جال،　　کھنچوائی ہے کیا سینہ چھپا کر تصویر :

فصیح الملک داغ دہلوی"

اس خط کے نیچے احسن صاحب کی لکھی ہوئی یہ عبارت ہے ۔

برادر بجان برابر حضرت نوح ناروی جو دنیائے شاعری میں مشہور و معروف ہیں وہ ۲۲ جنوری ۱۹۰۲ء کو استاد مرحوم کے پاس حیدر آباد آئے اور یہ تصویر پیش کی جس کے جواب میں تحریر مذکور لکھوائی گئی ان خطوط میں یعنی انشائے داغ میں یہی ایک خط ایسا ہے جس کی شوخی و ظرافت مرزا داغ کی طبیعت خاص کا پتہ دیتی ہے اسی طرح دو ایک اور طوائفوں سے کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی تھی خصوصاً منی جان حجاب کو اکثر خطوط بھیجے گئے مگر اس وقت تک ہمیں اُن کی نقلیں نہ مل سکیں ورنہ اُن کے مطالعہ سے مرزا صاحب کی شوخی ذہانت اور جودت و ذکاوت کے جوہر اچھی طرح نمایاں ہوتے ۔

اس موقع پر احسن صاحب ایک خاص بات لکھنے کو بھول گئے یعنی جب یہ خط بیل بوٹے والے لفافے میں رکھ کر مجھ سے پتہ لکھنے کو کہا گیا تو میں نے تھوڑی دیر تک کچھ نہ لکھا ارشاد ہوا پتہ کیوں نہیں لکھتے میں نے کہا گستاخی معاف ہو ڈاک خانے کی مہریں پڑ کر اس لفافے کے کام کو خراب کر دیں گی اگر حکم ہو تو اس لفافے کو اور ایک دوسرے بڑے لفافے میں رکھ کر بڑے لفافے پر پتہ لکھ دوں لیکن اس لفافے پر کوئی شعر ہونا چاہئے پہلے تو استاد مسکرائے پھر فوراً یہ مطلع کہا :۔

شوق کھلنے نہ دیا عشق کا پردہ رکھا　　اس لئے ہم نے لفافے میں لفافہ رکھا

اور یہ مطلع میناکار لفافے پر لکھ کر خط ڈاک میں ڈلوا دیا گیا ۔

جناب ظہیر دہلوی و جناب داغ جناب سید ظہیر الدین صاحب ظہیر دہلوی شاگرد رشید حضرت خاقانی ہند ذوق دہلوی یعنی خواجہ تاش جناب داغ دہلوی مع اپنے نواسہ سید اشتیاق حسین صاحب شوق کے مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب بہادر شاد تخلص یمین السلطنت کے وابستگان دولت میں تھے ان کے فضل و کمال کے متعلق کچھ لکھنے

کی ضرورت نہیں بڑے بڑے لوگوں کی صحبتیں اُٹھا چکے تھے، دلّی کا بنتا بگڑنا ان کی نگاہوں کے سامنے ہوا اور ان مشاعروں میں شریک رہے جن میں ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ، آشفتہؔ، آزردہؔ، صہبائیؔ، سالکؔ، مجروحؔ، انورؔ، نیرؔ، شیفتہؔ، حالیؔ، نسیمؔ وغیرہ وغیرہ جیسی شخصیت کے لوگ موجود تھے شہرت دوسری چیز ہے ورنہ باعتبار مشق و معلومات فن کے ان کا درجہ داغؔ صاحب سے کم نہ تھا وہ جس دن یہاں تشریف لاتے عجیب لطف رہتا آپس میں اکثر غزل خوانیاں ہوتیں دلّی کے قدیم زمانے کے تذکرے چھڑتے گزشتہ دور پر اظہار تاسف کیا جاتا مگر اس بے تکلفی پر بھی اتنا لحاظ تھا کہ اختر جان وغیرہ ان کے سامنے نہ آسکتی تھیں۔

جناب امیر مینائی اور حضرت داغ

امیر و داغؔ کو خدا بخشے اپنے زمانۂ حیات میں باوجود ہمعصر ہونے کے ایک دوسرے کے معترف و مداح رہے، درمیانی لوگوں نے آپس میں لڑاکر تماشا بہت کچھ دیکھنا چاہا لیکن دونوں کے باہمی ارتباط میں آخری وقت تک کوئی فرق نہ آیا، میرے دوست، جناب منشی حکیم ضمیر حسن خاں صاحب دلؔ شاہجہاں پوری نے جو منشی صاحب کے ایک ممتاز شاگرد اور اس وقت ان کے جانشین اور جیتی جاگتی یادگار ہیں ایک واقعہ اپنے سامنے کا بیان کیا کہ ہمارے سامنے ایک صاحب نے منشی صاحب کے خوش کرنے کو داغؔ صاحب کی کچھ برائی کی وہ اس کی تاب نہ لاسکے اور بگڑ کر ناخوشی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ میرے سامنے جو داغؔ کو بُرا کہتا ہے میرا جی چاہتا ہے کہ میں اُس کا منھ نوچ لوں اس کے بعد انھوں نے داغؔ صاحب کا مطلع یہ کہہ کر پڑھا کہ ایسا کون کہہ سکتا ہے کوئی کہہ کر تو دکھائے:-

خارِ حسرت بیان سے نکلا   دل کا کانٹا زبان سے نکلا

منشی صاحب حیدر آباد تشریف لے گئے اور داغؔ صاحب کے مہمان ہوئے اس وقت کے واقعات میرے پیشِ نظر ہیں آپس میں کوئی فرقِ مراتب کا سوال ہی نہ تھا دونوں بزرگ اپنا اپنا کلام سناکر آپس میں داد لیتے تھے اور ایک دوسرے کی مدح و ثنا کرتے تھے وہ دن بھی کیا دن تھے اب وہ زمانہ کاہیکو دیکھنے کے لئے ملے گا ایک خواب تھا جو کچھ دنوں تک دیکھا گیا۔

ابھی کچھ دنوں کی بات ہے کہ میرے بے تکلف دوست جناب ماہر القادری صاحب نے اپنے رسالۂ فاران میں کچھ خطوط امیر و داغؔ کے شایع کئے اور اُنھیں خطوط کی نقل نگار لکھنؤ میں چھپی اِن خطوں میں داغؔ صاحب کی کمزوریاں دکھاکر منشی صاحب کی فضیلت دکھائی گئی اور یہاں تک ثابت کیا گیا کہ داغؔ صاحب سے اپنے شعروں میں مشورہ فرماتے تھے۔

اِن خطوں کے متعلق میرا ایک لمبا چوڑا مضمون ماہ نامہ رسالہ احسن رامپور اپریل نمبر ۱۹۰۱ء میں شایع ہوچکا ہے اُس کا دُہرانا میں فضول سمجھتا ہوں چونکہ ان خطوں کا ذکر آگیا ہے لہذا چند اقتباس اختصار کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔

جناب احسن اللہ ثاقب جو خطوط منشی امیر احمد صاحب کے مولف اور منشی صاحب کے ممتاز شاگرد بھی ہیں اپنی کتاب صفحہ ۴۴ سطر ۱۰ میں لکھتے ہیں:-

آخر عمر میں استاد یعنی منشی صاحب نے داغؔ کے رنگِ کلام اور مقبول عام کو دیکھ کر زباں کی صفائی اور تاثیر کے پیدا کرنے میں کوشش کی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہوئے تاہم صنم خانۂ عشق کی جلوہ آرائی گلزار داغ کی شادابی کو نہ پہونچی۔

خود منشی صاحب اپنے خط میں داغؔ صاحب کو لکھتے ہیں اسی کتاب کا صفحہ ۲۵۰ سطر ۱۰

ملک کو آپ کی قدر ہو یا نہ ہو میری نظر میں تو جس قدر ہے اُس کو آپ کا دل بخوبی جانتا ہوگا۔

پھر اسی کتاب کا صفحہ ۲۵۸ سطر ۱۸

آپ نے جو لکھا ہے کہ اصلاح کی وجہ سے فرصت نہیں ملتی جان غضب میں ہے اس کا مجھے یقین ہے کیونکہ مجھ پر بھی یہی گزر رہی ہے۔

پھر اسی کتاب کا صفحہ ۲۵۷ سطر ۱

"ع حمید آپ کا ملازم میرے پاس آیا مجھے اُس کے دیکھتے ہی وہ زمانہ یاد آگیا جب آپ یہاں تھے اور اس یاد کی لذت میں میں نے

سے لگالیا اور اس کی اُن آنکھوں کو جن سے وہ دس بارہ دن بیشتر آپ کے جمال جہاں آرا کو دیکھا کرتا تھا میں دیر تک حسرت کی
ہ سے دیکھا کیا اور بار بار آپ کے حالات اور ضبط اوقات کی کیفیات پوچھا اور سنا کیا۔

پھر اسی کتاب کا صفحہ ۲۵۹ سطر ۱۲

اس کی امید کہاں کہ آپ کے سہرے کے سامنے میرے سہروں کے شعر نظر کیمیا اثر میں جچیں ہوں۔

پھر اسی کتاب کا صفحہ ۲۶۰ سطر ۱۸

آپ کی ذات سراپا صفات اس طبقہ نام ور کی شہرت اور غایت مشاقی سے بہت غنیمت ہے کہ غزل کہہ دینا آپ کے بائیں ہاتھ کا
بل ہے لہذا درخواست ہے کہ اپنی طبع نازک پر جبر کرکے کچھیں کے لئے بالالتزام غزل دینے کا وعدہ کیجئے مگر یہ پہلے سے کہہ رکھتا ہوں کہ
ے ایسی کہا کیجئے گا کہ ہم سے غریبوں کو بھی کہنے کی گنجایش ہے یہ نہ ہو کہ پہلے ہی سے دُنیا بھر کے قلم توڑ دئے جائیں۔

الغرض اِن خطوں کی عبارت ثاقب کی ذاتی رائے اور داغ صاحب کے ممتاز شاگردوں کی تعداد دیکھ کر کس کے منھ میں زبان ہے
ہے کہ داغ صاحب منشی امیر مینائی صاحب سے اپنے کلام میں مشورہ فرماتے تھے کیا لوگوں کے ذہن میں منشی صاحب کے یہ
عار نہیں ہیں:-

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہو بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کہاں ہم اے امیر اب اور کہاں داغ وہ جلسے ہوچکے خلد آشیاں تک
جب سے سُنا امیر کہ ہیں داغ دردمند لاکھوں پڑے ہیں سینۂ اہلِ سخن میں داغ

ناب جلال و جناب داغ حیدر آباد کے قیام میں داغ صاحب سے میں نے اکثر سنا تھا کہ جناب جلال کے مزاج میں غصہ بہت ہے اور وہ ذرا ذرا سی بات پر برہم ہوجاتے ہیں مجھے ایک بار اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا
اق ہوا وہ منصور نگر لکھنؤ میں رہتے تھے تین در کا کمرہ تھا دو دروازے بند تھے تیسرے دروازے کا نصف حصہ کُھلا ہوا تھا
نے جھانک کر دیکھا وہ سیتل پاٹی پر ایک تکیہ کی آڑ لئے ہوئے کسی شاگرد کی غزل پر اصلاح فرما رہے تھے ان کے غیظ وغضب
ڈر سے میں نے دیکھ کر فوراً سر باہر کرلیا اسی طرح کبھی جھانکتا تھا اور کبھی سر باہر کرلیتا تھا ایک بار مجھے انھوں نے دیکھ لیا اور
ت زور سے بولے کون ہے میں نے کہا میں الٰہ آباد سے قدمبوسی کے لئے حاضر ہوا ہوں چند منٹ کے بعد حکم ملا اندر چلے آؤ میں نے
تے ڈرتے قدم کمرے میں رکھا اور نہایت ادب و خاموشی کے ساتھ ایک گوشے میں بیٹھ گیا وہ دیر تک اصلاح فرماتے رہے اور
رسے مخاطب نہ ہوئے جب غزل کی اصلاح ختم ہوچکی تو میں نے قدم بوس ہونے کے بعد کہا دو حسرتیں لے کر میں حاضر خدمت ہوا
اکہ قدم بوسی حاصل کروں اور کچھ آپ کی زبان مبارک سے سنوں کہ مجھے کہنے کو ہوجائے کہ میں نے جناب کی زبان مُبارک سے جناب
کلام سننا ہے پہلی تمنا قدمبوسی کی تو پوری ہوگئی دوسری آرزو کا پورا ہونا آپ کی شفقت و عنایت پر منحصر ہے۔ یہ سن کر وہ خاموش
ہے پھر میں نے کہا شاید میری التجا قبول نہیں ہوئی غرض بڑی بے توجہی کے ساتھ انھوں نے بیاض اُٹھائی اور "مکاں آتے آتے
ال آتے آتے" اس زمین پر جو غزل تھی وہ سنانے لگے میں اپنی سمجھ کے مطابق داد دیتا رہا "ہچکیاں آتے آتے" جب یہ شعر انھوں نے
ایا تو اتفاقاً شامتِ اعمال سے میرے منھ سے یہ نکل گیا کہ اس قافیے کو داغ صاحب نے بھی خوب کہا ہے، کہنے لگے انھوں نے کیا
ہے، میں نے یہ شعر سُنایا:-

مجھے یاد کرنے سے یہ مدعا تھا نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

اس شعر کا پڑھنا تھا کہ وہ نہایت برہم ہوئے اور کہا "نکل جاؤ زمانے کی ناقدری ہے کہ جلال لکھنؤ میں خاک پھانکے اور داغ
ن میں جاکر نظام کا استاد ہوجائے" میں خاموش رہا اور قبل اس کے کہ میں اپنی گستاخی کی معافی چاہوں انھوں نے کہا تم اب تک

نہیں گئے میری نگاہوں سے دور ہو میں کمرے سے نکل کر کچھ دور پر جا کھڑا ہوا کہ شاید رحم کھاکر پھر مجھے بلائیں لیکن انھوں نے نہ بلایا بلکہ نکل کر انھوں نے مجھے دیکھا اور زور سے جو دروازہ کھلا ہوا تھا اس کو بند کردیا اور میں بادلِ ناشاد واپس آیا۔

جناب تسلیم وجناب داغ

نواب حامد علی خاں صاحب کے مشاعرہ رام پور میں مجھے ایک بار شریک ہونے کا اتفاق ہوا اُس وقت منشی امیراللہ صاحب تسلیم زندہ تھے ختم مشاعرہ کے بعد چونکہ وہ پیرانہ سالی کے سبب سے شریک مشاعرہ نہ ہوئے تھے میں اُن کی خدمت میں پہونچا وہ چار پائی پر آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹے تھے میں جاکر پاؤں دابنے لگا انھوں نے آنکھیں کھول دیں اور میرے حالات پوچھنے لگے جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں داغ صاحب کا شاگرد ہوں تو فرمایا تم نے انھیں دیکھا بھی ہے یا خط و کتابت کے ذریعہ سے شاگرد ہوئے ہو میں نے کہا میں بہت دنوں تک اُن کی خدمت میں رہا ہوں یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ ذرا مجھے سہارا دیکر بٹھادو میں نے سہارا دیا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے میری اُنگلیوں کو اپنی آنکھوں پر رکھو میں نے اُن کی اُنگلیاں اپنی آنکھوں پر رکھیں دو تین منٹ کے بعد وہ اپنی اُنگلیوں کو میری آنکھوں سے ہٹاکر چومنے لگے اور فرمایا تمھاری ان آنکھوں نے میرے دوست کو دیکھا ہے اس باعث سے میں نے بوسہ لیا اور یہ کہکر اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لائے اس کے بعد میرے چند اشعار سنے اور تعریف فرمائی میں نے وہی التجا جو جلال صاحب کے روبرو پیش کی تھی انکے سامنے بھی پیش کی کہنے لگے میاں نہ سماعت ہے نہ بصارت ہے اتنے ہوش وحواس کہاں کہ میں تمھیں کچھ اشعار سُناؤں تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر فرمایا کہ ایک مطلع یاد آگیا وہی سُنائے دیتا ہوں میں نے اسی کو غنیمت سمجھا وہ مطلع یہ ہے:۔

جب رُکے پائے جنوں پھرنے لگا سر میرا ۔۔۔ نہ ہوا کم کسی تدبیر سے چکّر میرا

حضرت داغ کا کلام

حضرت داغ کے کلام پر بہت سے تنقیدی مضامین لوگوں نے لکھے کسی نے اُن کی مذمت کی کسی نے اُن کو سراہا یہ اپنی اپنی پسند اور اپنی اپنی رائے ہے طبیعتیں چونکہ مختلف ہوتی ہیں اس لئے ضروری نہیں کہ جو شعر ایک کو پسند آئے اُسے دوسرا بھی پسند کرے اُن کے زمانۂ حیات میں بہت سے حاسدوں اور رشک کرنے والوں نے مخالفت میں بہت کچھ زہر اُگلا لیکن ویسا شعر اور ویسی غزلیں کوئی کہکر دکھا نہ سکا ہمیشہ اُن کے مقابلہ میں مخالفوں کو شرمندگی ہوتی رہی فی الحقیقت ایک وہبی اور ایک کسبی دو طرح کے شاعر ہوتے ہیں وہبی تو وہ ہیں جن کو قدرت نے شاعر پیدا کیا کسبی کا اُن میں شمار ہے جو بزور علمیت و قابلیت کے شاعر ہوئے غور کرنے سے ظاہر ہوگا کہ کس کے کیا مراتب ہیں اور دونوں میں امتیازی فرق کس قدر ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت داغ وہبی شاعر تھے اور اُن کو قدرت نے شاعر پیدا کیا تھا پھر اُن کی نشو و نما لال قلعہ دلّی میں ہوئی سلطنت کا عروج و زوال انھوں نے اپنی نگاہوں سے دیکھا غرض اُن کی زبان ہر اعتبار سے ٹکسالی ہے سند میں اُن کے شعر انھیں کے بقول ایسی پتھر کی لکیر ہیں جن کا مٹانا آسان نہیں۔

سمجھو پتھّر کی تم لکیر اُسے
جو ہماری زبان سے نکلا

تفصیلی بحث اس موقع پر کرکے میں اس مضمون کو اب طول دینا نہیں چاہتا ان دو تین آخری فقروں پر ختم کرتا ہوں کہ وہ صرف شاعر نہ تھے بلکہ شاعر گر تھے اور اُن کا جس قدر بھی کلام ہے وہ اور شعرا کے لئے ایک درس اور دستور العمل ہے اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے اور اُن کے زندہ شاگردوں کو توفیق عطا کرے کہ وہ استاد کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرتے رہیں اور اپنے کو ادب جدید سے دور رکھیں۔

داغ کی شاعری میں لب ولہجہ کی اہمیت

(پروفیسر اختر اورینوی)

داغ غزل گو شاعر ہے ۔ یوں تو چند مخمس، قصاید اور رُباعیات بھی اس کے دواوین میں ملتی ہیں، مگر داغ اصلاً غزل کا شاعر ہے ۔ وہ اُردو غزل کی بہترین روایات کی نمایندگی نہیں کرتا بلکہ وہ اس کے انحطاطی دور کی ترجمانی کرتا ہے ۔

جب اُردو غزل نگار سنگلاخ زمینوں میں گُل کھلانے کی کوشش کرتے اور عجیب ردیفوں کا سحر باندھتے ہیں تو رسمیت، خارجیت، کھوکھلے پن، سطحیت کا رنگین گورکھ دھندا پیدا ہوجاتا ہے ۔ صداقتِ تجربہ، اخلاصِ جذبہ، ندرتِ تخیل، فن کا رانہ اختراع اور ہنرمندانہ توازن تعمیر کی بجائے فرسودگی، نقالی، تصنع، پھیکے پن، بے کیفی، رعایتِ لفظی، قافیوں اور ردیفوں کی بازی گری، ترکیبوں کا کرتب اور مضامین کی نظربندی آنکھوں کو خیرہ اور ذوق کو مسموم کرتی ہے ۔ صناعت اور الفاظ کی بٹّہ بازی کا فرق، تخیل کی پرداز اور مضامین کی دُم دار پتنگ اڑانے کا امتیاز، جذبہ کے سوز اور گرم گفتاری کے پٹاخے چھوڑنے کا اختلاف، رنگین بیانی اور محاوروں کے بُلبلے اُڑانے کا فصل، معنی آفرینی اور مُلمّع دار سخن سازی کا بُعد صاحبانِ ذوق پر ظاہر ہے ۔ امیر مینائی کا ایک شعر ہے :-

رُخ سے دلِ پُرداغ مِرا زلف میں پہونچا　　گلشن سے گیا اُڑ کے خُتن میں پرِ طاؤس

اور سپر کفن میں پرِ طاؤس، اور دہن میں پرِ طاؤس ۔ اسی طرح اور غزلیں ہیں ۔ مثلاً رفتار سبز، دلدار سبز، بازار سبز وغیرہ وغیرہ ۔ حضرت داغ کے یہاں بھی اس رنگ کے غبارے بہت اُڑتے ہیں ۔ ملاحظہ ہو :-

توڑ اس طرح سے اے نالۂ دل ساتوں فلک،　　کہ گریں ٹوٹ کے یہ خانہ خراب ایک پر ایک

اور اسی طرح ایک پر ایک ۔

درد سے ہو ہم اسیروں کی خبر کیوں کر اُسے　　صورتِ زنجیر کب کرتے ہیں نالے ہاتھ پاؤں

اس زمین میں بھی داغ نے کیا کیا ہاتھ پاؤں نکالے ہیں، بس دیکھا کیجئے ۔

داغ، ذوق (استادِ داغ) اور نصیر دہلوی کی شاعری میں، نیز دبستانِ لکھنؤ کے اکثر شعراء کے یہاں رسمیت اور خارجیت کے مختلف نمونے ملتے ہیں ۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اُردو غزل کے سارے سرمایہ میں رسمیت کا خاصہ حصہ پایا جاتا ہے ۔ غزل کی یہ سنفی کمزوری ہے ۔ دورِ زوال میں یہ کمزوری اور بڑھ جاتی ہے ۔ صحت مند روایتیں کم سے کم ہوتی جاتی ہیں اور غزل سُرخ و صالح خون سے محروم ہوکر پیلی پڑجاتی ہے ۔ شاعری مضمحل ہوکر قافیہ پیمائی اور ردیف بازی کی صورت اختیار کرلیتی ہے (اُمّ الصبیان) کے مریض بچے بے ہنگم طور پر لانبے اور بہت دُبلے پتلے ہوتے ہیں ۔ اسی طرح دورِ انحطاط کی غزلیں لانبی مگر سوکھی ساکھی ہوتی ہیں ۔ داغ کی اکثر غزلیں بھی اس مرض کی شکار ہیں ۔ ہاں اس مریض کو ریشمی لباس ضرور پہنایا گیا ہے ۔

داغ کی شاعری واقعیت اور رسمیت کا اَن مِل بے جوڑ آمیزہ ہے ۔ لیکن اپنی خامیوں کے باوجود یہ اپنے اندر کچھ زندہ عناصر ضرور رکھتی ہے اور اسی حصّہ سے اُس کی انفرادیت بھی ظاہر ہوتی ہے ۔ داغ کی انفرادیت کئی اداؤں پر منحصر ہے ۔ لیکن اُس کے لب ولہجہ کی

بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ داغ کی شاعری کا لب و لہجہ اس کی انفرادیت کے مزاج کے تعین میں غالب حصہ لیتا ہے۔

شاعری میں اور عناصرِ حُسن کے ساتھ لب و لہجہ کا عنصر بھی ہوتا ہے۔ صرف الفاظ اور ترکیب الفاظ سے ہی معنی پیدا نہیں ہوتے بلکہ لب و لہجہ سے بھی اثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ مطالب کے نئے پہلو نکلتے ہیں اور معنی کی وسعتیں بڑھتی ہیں۔ داغ کے یہاں لب و لہجہ کا برتاؤ اکثر و بیشتر نہایت فن کارانہ ہوتا ہے، لہذا پُرتاثیر اور اس میں اتنی بلوغت، بالیدگی، استواری اور اختصاص پایا جاتا ہے کہ داغ کی آواز منفرد طور پر پہچانی جاسکتی ہے۔ داغ کے لب و لہجہ میں بڑی انفرادیت پائی جاتی ہے۔

شاعری میں لب و لہجہ کئی چیزوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ لب و لہجہ پر شاعر کی شخصیت کی گونج اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے زندگی کرنے کا انداز (Attitude) اثر ڈالتا ہے۔ اخلاصِ تجربہ اور کمال زباندانی دونوں مل کر جاندار و پختہ لب و لہجہ پیدا کرتے ہیں۔ اگر ہم لب و لہجہ کا مزید تجزیہ کریں تو ہم یہ محسوس کریں گے کہ لب و لہجہ منحصر ہے اندازِ بیان، عشوۂ اظہار اور طرزِ ادا پر، لفظوں کے رکھ رکھاؤ، فقروں کے موڑ اور کن پر جملوں کے تیور، کلام کی روانی اور آہنگ پر اور زبان کی آنچ پر۔ داغ کے لب و لہجہ میں بھی یہ سب عناصر ترکیبی پائے جاتے ہیں۔

غالب کا ایک شعر ہے :-

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے،

داغ کہتا ہے :-

وہ عیادت کو مرے آتے ہیں لو اور سُنو، آج ہی خوبیِ تقدیر سے حال اچھا ہے

غالب کے بعد اُسی مضمون میں پُر اثر شعر کہنا آسان تو نہیں تھا۔ مگر داغ نے اپنے لب و لہجہ کے سہارے ایک پُرکیف شعر نکال ہی لیا۔ 'لو اور سُنو' کا فقرہ اور 'خوبیِ تقدیر' کی طنزیہ ترکیب نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ "ہی" کا لفظ بھی کتنا منجھا ہوا ہے!

آیئے اب داغ کے لب و لہجہ کا تجزیہ کریں اور اس کے کلام سے مثالیں لیں۔

داغ کی شخصیت میں بڑا مردانہ پن تھا۔ اُس کی آواز ایک مرد کی آواز ہے۔ اُس کی غزلوں کے لب و لہجہ میں جارحانہ انداز نمایاں ہے۔ رسمی شاعری کے حصہ کو اگر الگ کردیا جائے تو پھر ہم معاملاتِ محبت میں داغ کے یہاں 'اقدامیت' پائیں گے۔ بلکہ ذرہ سختی اور کھردرے پن بھی :-

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں، آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا،

یہ عورت کے عشوۂ گریز کے مقابل مردانہ ردِ عمل ہے۔ مگر منعکس، مقصد، گریز گُستن۔ روزِ اول۔ یہ سرزنشِ محبت ہے۔ داغ معاملاتِ عشق میں کسی قسم کی رقت پسندی، حماقت یا مہملات کو برداشت کرنا نہیں چاہتا۔ عشق کو طربناک بنانے کا یہ بہت بڑا گر ہے۔ داغ کی شاعری مادی شاعری ہے اور اسی کی محبت کی بنیادیں واضح طور پر جنسی ہیں۔ نیز ارتفاعِ محبت کے عالم میں بھی وہ جنسی لذتوں سے دور نہیں جاتا۔ اُس کے یہاں کسی قسم کی ماورائیت نہیں۔ قافیہ کے استعمال میں کچھ ایسے مضمون بندھ گئے تو اور بات ہے۔ داغ کا ایک شعر ہے :-

کہاں کہاں دلِ مشتاق دید نے یہ کہا وہ چمکی برقِ تجلی، وہ کوہِ طور آیا

یہ نہایت ہی اچھا شعر ہے، جس میں جذبی کیف و حال کے ساتھ، فکری گہرائی اور محاکاتی نور و رنگ بھی موجود ہیں۔ لیکن داغ کے دلِ مشتاق دید کے لئے برقِ تجلی کیا ہے اور کوہِ طور کہاں یہ کوئی راز و رمز کی بات نہیں۔ 'طور' کی علامت کو ریاض خیرآبادی نے کچھ اس طرح استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو :-

نہ روکے طور، تو ہم جائیں عرش سے اونچے ہماری راہ سے پتھر ذرا ہٹا دینا !

اور ؎　ہم اُڑ کر بھی نہ پہونچیں، ہم سے اتنی دور ہو جانا　　مُبارک شاخِ گل کو شاخِ نخلِ طور ہو جانا

اور پھر ؎　تمھارے کوچے میں کچھ طور والے بیٹھے ہیں　　ذرا تم آ کے لبِ بام مسکرا دینا'

ریاض نے کوچۂ حبیب کو طور سے بڑھا دیا ہے۔ یوں تو اس شعر کے معانی میں بڑی وسعت اور گنجایش ہے۔ داغ کا 'کوہِ طور' اور 'برقِ تجلی' بھی کوچۂ حبیب میں ہے۔ ویسے داغ کے شعر کو داغ کی شخصیت سے الگ کر کے معرفت و روحانیت کا شعر بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اور بہرحال وہ بہت ہی پُرکیف اور اثر خیز شعر ہے۔ وسیع المعانی اور نفسیاتِ تمنّا کو پیش کرنے والا۔ داغ کی رجائیت و پُرامید ذہنیت کا بھی اس سے پتہ چلتا ہے۔ آپ اسے فریبِ تمنا بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر بقول جمیل مظہری ؎

اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

داغ کا اپنا تجربۂ محبت ارضی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

معرکہ ہے آج حسن و عشق کا　　دیکھئے وہ کیا کریں، ہم کیا کریں

لب و لہجہ میں صاف مردانہ پن اور اعتماد ہے۔ معرکہ آرائی ہے، سپردگی و ربودگی نہیں۔ غالب کا انداز خاص تو ترکاد ہے مگر مندرجۂ ذیل شعر کو داغ کے شعر سے ملایئے:۔

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے　　کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

داغ کہتا ہے ؎

نہیں ہوتی بندے سے طاقت زیادہ　　بس اَب خانہ آباد دولت زیادہ'

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی　　کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

یہ ہے داغ کا پندارِ عشق جس کے ڈانڈے غالب کی خود بینی سے جا ملتے ہیں۔ ؏

اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

دوسرے شعر میں 'یہ کیا کہا' کا تیکھا تیور دیکھئے۔ مرنے میں بھی شکستہ ہے۔ چند اشعار معاملات عشق کے ملاحظہ ہوں:۔

نہ دلاسا، نہ تسلی، نہ تشفی، نہ وفا،　　دوستی اُس بُتِ بدخو سے نباہیں کیونکر

چاہ کا نام جب آتا ہے بگڑ جاتے ہو　　وہ طریقہ تو بتا دو تمھیں چاہیں کیونکر

شرم سے آنکھ ملاتے نہیں دیکھا اُن کو　　پار ہوتی ہیں کلیجے کے نگاہیں کیونکر

بگڑ بیٹھے عبث ذکرِ عدو پر　　سُنا کیا آپ نے، میں نے کہا کیا

داغ بات بنانی بھی جانتا ہے اور محبوب کو منانے کا نیا ڈھنگ بھی اُسے آتا ہے ؎

رنگِ دشمن بھی گوارا لیکن　　تجھکو مضطر نہیں دیکھا جاتا

داغ کی غزل کے لب و لہجہ میں جوش، تازگی، چہک اور لہک پائی جاتی ہے۔ اس کی خوش گفتاری میں ظرافت کے مختلف رنگ ملتے ہیں۔ مزاح، طنز، طعنہ، چٹکی، گدگدی، پھبتی کے رنگ۔ داغ کے یہاں عشق بازی کی رنگینی، مستی اور انبساط ہے اُس کی رندانہ شوخی کا ترنگ مزہ دار ہوتا ہے۔ داغ کی زبان دانی اُس کے لب و لہجہ میں تنوع اور پختگی پیدا کرتی ہے۔ وہ بڑی نفاست سے بیان کی نوک پلک درست کرتا ہے۔ محاوروں کا استعمال بڑے سلیقہ اور قرینہ کا ہوتا ہے۔ وہ بڑا فقرہ باز اور شیوہ بیان ہے۔ اس کے کلام میں چٹخارہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ؏

بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

اسی طرح داغ کے لب و لہجہ میں انگنت نیرنگی پائی جاتی ہے۔　شاعر کہتا ہے کہ:۔

بھر دیں عجب ادائیں اُس شوخ سیم تن میں — اِک ٹیڑھ سادگی میں، اک سیدھ بانکپن میں
مطلب کی چھیڑ اُن سے پنہاں سخن سخن میں — سچ یہ کہ داغ پُرفن یکتا ہے اپنے فن میں

داغ کے طرزِ ادا میں، اس کے لب و لہجہ میں شوخ سیم تن کی اداؤں کی طرح ٹیڑھ اور سیدھ دونوں ہیں۔

اِک ٹیڑھ سادگی میں، اِک سیدھ بانکپن میں

داغ پر دوسرا شعر بھی پورے طور پر صادق آتا ہے۔ اس کے سخن سخن میں چھیڑ ہے اور وہ بہت ہی بڑا پُرفن ہے۔

سچ یہ کہ داغ پُرفن یکتا ہے اپنے فن میں!

داغ تکرار الفاظ سے کیفیت پیدا کرتا اور سماں باندھ دیتا ہے۔ ذرا لب ولہجہ ملاحظہ فرمائیے ؎

ترے ظلم پنہاں ابھی کون جانے — فقط آسماں آسماں ہو رہا ہے

دوسرا مصرع پوری فضا کی تعمیر کرتا ہے اور صرف لب و لہجہ کے سہارے۔

آئیے اب ہم داغ کے فن کے چند نمونے پیش کریں اور جابجا اس کی فن کاری کا ناقدانہ جایزہ لیتے چلیں۔

خیر گزری کہ رہا تا بہ مژہ سیل سرشک — رہ گیا پردہ ترے کوچہ کی دیواروں کا
اتنا تو بتا دے مجھے اے ناصحِ مشفق — دیکھا ہے کہ اُس ماہ لقا کو نہیں دیکھا
آج راہی جہاں سے داغ ہوا — خانۂ عشق بے چراغ ہوا
دل لیکے اُس کی بزم میں جایا نہ جائے گا — یہ مدعی بغل میں چھپایا نہ جائے گا
اِک حرفِ آرزو پہ وہ مجھ سے خفا ہوئے — اتنی سی بات کہکے گنہگار ہوگیا
سو حسرتیں تو آئیں گیا اِک دل گیا — ملنا تھا جو مجھے مری قسمت کا مل گیا

دوسرے شعر میں 'دیکھا' کی تکرار اور مقابلے کی ٹکر کا لطف اُٹھائیے۔ اسی طرح آخری شعر میں 'گیا' کی تکرار اور ٹکراؤ کا مزہ لیجئے۔ تیور اور لب ولہجہ کی تیزی اور شوخی ہر جگہ موجود ہے۔ 'جایا نہ جائے گا' کے ٹکڑے کی داخلی و خارجی تصویر کشی ملاحظہ ہو۔ پانچویں شعر میں محاورہ اور زبان دانی کی لہک دیکھئے۔ آگے چلئے:-

تمھیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع یہ ترکیب — ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا
ہوئی تھیں دیدۂ مشتاق سے گستاخیاں کیا کیا — بھلے کو رُخ نہ تھا میری طرف اُن کے نگہباں کا
کیا ہے وعدۂ فردا انھوں نے دیکھئے کیا ہو — یہاں صبر و تحمل آج ہی سے ہو نہیں سکتا
ضبط کر دردِ عشق کو اے دل، — اس تری آہ آہ نے مارا
تلوار بے تکان اُٹھاؤ نہ ہاتھ میں — خلقت کہے گی نازو نزاکت کو کیا ہوا
ہم اب سے لیں گے بوسۂ گل تیرے سامنے — کیا ایسا لعل ہے ترے لب میں لگا ہوا

محاورے کے برتنے پر ذرا معشوق سے سخن سخن میں چھیڑ دیکھئے۔ اور 'اس تری آہ آہ نے مارا'، کے درد انگیز تیور کو محسوس کیجئے۔ اب نفسیاتِ محبت ملاحظہ ہو ؎

یہ دل کو تاب کہاں ہے کہ ہو مآل اندیش — اُنھوں نے وعدہ کیا اس نے اعتبار کیا

کیسا بے ساختہ پن ہے!

یہ پوری غزل مرصّع ہے:-

غضب کیا ترے وعدے پر اعتبار کیا — تمام رات قیامت کا انتظار کیا

ہنسا ہنسا کے شبِ وصل اشکبار کیا — تسلیاں مجھے دے دے کے بے قرار کیا
لی جو یار کی شوخی سے اس کی بے چینی — تمام رات دلِ مضطرب کو پیار کیا
بھلا بھلا کے جتایا ہے اُن کو رازِ نہاں — چھپا چھپا کے محبت کو آشکار کیا
ہم ایسے محوِ نظارہ نہ تھے جو ہوش آتا — مگر تمھارے تغافل نے ہوشیار کیا
ہمارے سینہ میں کچھ رہ گئی تھی آتشِ ہجر — شبِ وصال بھی اُس کو نہ ہمکنار کیا

آخری شعر میں کتنا نادر مگر سچا تجربہ ہے۔ محبت میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ داغؔ عشق میں صاحبِ تجربہ شاعر ہے:۔

تری نگہ کے تصور میں ہم نے اے قاتل — لگا لگا کے گلے سے چھری کو پیار کیا

لگا لگا کے گلے سے' کے فقرہ کی بے چینی کو محسوس کیجئے۔ اس شعر میں واقعیت کی کیسی عمدہ تصویر کشی ہے۔ متحرک، محاکاتی گویا۔ شعر کے لب و لہجہ سے وہ کام ہوتا ہے جو نہ مصوری سے ہو سکتا ہے نہ فلم بندی سے۔ داخلی کیفیات و واردات کی مصورانہ طور پر صرف شاعری کے واسطۂ اظہار سے ممکن ہے ؎

فسانۂ شبِ غم اُن کو اِک کہانی تھی — کچھ اعتبار کیا، کچھ نہ اعتبار کیا

اس شعر میں صنعت تقابل (تضاد یا طباق) بڑی کامیابی سے برتی گئی ہے۔ ایک ہی مصدر کے دو فعل ہیں ایک مثبت منفی۔ داغؔ صنائع لفظی و معنوی کا استعمال عموماً کامیابی کے ساتھ کرتا ہے۔ مثلاً صنعتِ تکرارِ لفظی، صنعتِ بازگشت، رد العجز علی الصدر) صنعتِ تبدیل، صنعت مرعات النظیر، صنعتِ طباق، تجاہلِ عارفانہ، لف و نشر وغیرہ کا۔

تری اُلفت کی چنگاری نے ظالم اک جہاں پھونکا — اِدھر چمکی، اُدھر سُلگی، یہاں پھونکا، وہاں پھونکا
بجھے کب عندلیبِ سوختہ دل کی لگی تجھ سے — چراغِ گل کو کیا پھونکا جو اے بادِ خزاں پھونکا
کہاں صیاد، کیسا باغباں، کس پر گری بجلی — چمن میں آتشِ گل نے ہمارا آشیاں پھونکا
ہمارے دل کے ہوتے طورِ سینا کو جلانا تھا — تری برقِ تجلی نے کسے پھونکا، کہاں پھونکا

غ کی شاعری کا داخلی رنگ کہیں کہیں پر خوب چمکتا ہے۔ لیکن یہ اُنکا اپنا رنگ نہیں۔ تاہم داغؔ ہر جگہ اپنے لب و لہجہ سے پہچانا جاتا اور اس کا لب و لہجہ بہت ہی گویا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

'کہاں صیاد، کیسا باغباں، کس پر گری بجلی،' اور 'کسے پھونکا، کہاں پھونکا،' کا پُر تاثیر لب و لہجہ ایک داستاں دیتا ہے۔ ایک اور غزل کے چند اشعار سنئے:۔

نگاہِ شوق پر الزام ہے بے قراری کا — تمھارے برقِ تجلی کو اضطراب نہ تھا
وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چار طرف — ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا
کہا اُنھوں نے شبِ غم کا ماجرا سُن کر — ترے مزاج کی شوخی تھی اضطراب نہ تھا

اور اب چند متفرق اشعار:۔

کیونکر اُس کی نگہِ ناز سے جینا ہوگا — زہر دے اُس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا
جلوہ دیکھا تری رعنائی کا — کیا کلیجا ہے تماشائی کا
کوئی بھولا ہوا اندازِ ستم یاد آیا — کہ تبسم تجھے ظالم دمِ بیداد آیا
کہا ظالم نے میرا حال سُن کر — وہ اس جینے سے مر جائے تو اچھا
مبارک خضر کو یہ عمرِ جاوید — یہ تھوڑی سی گزر جائے تو اچھا

تم تو سو بار مان جاؤ گے، — دل ہمارا بہل نہیں سکتا،
دمِ رخصت یہ چھیڑ تو دیکھو، — مجھ سے کہتے ہیں کب ملیں گے آپ
کٹ گئے لاکھوں گلے اس تیزیِ رفتار سے — اب تو چل نکلے زیادہ اپنے بھی خنجر سے آپ
حضرتِ زاہد نکل آیا فلک پر آفتاب، — پیرومرشد اب تو اٹھیے میکدہ کے در سے آپ
کچھ تذکرۂ عشق رہے حضرتِ ناصح، — کانوں کو مزہ دیتی ہے گفتارِ محبت

کتنا ملیح مذاق ہے۔ ناصح کے دل کا چور داغ نے پکڑ لیا ہے۔ ناصح کی تلملاہٹ کا تصور فرمائیے۔ ایک نفسیاتی نکتہ بیان ہوا ہے:-

ہجرِ بُت اور صحبتِ زاہد، — خلد میں بھی تو ہیں عذاب بہت
دیکھنا پیرِ مغاں حضرتِ زاہد تو نہیں — کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پسِ خم مجھ کو،
میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ، — ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں

اب آپ داغ کو میخانہ کی طرف لے جائیے یا مسجد کی طرف۔ شعر کا ابہام اور تیور بڑا پُرلطف ہے۔ اب ذرہ دوسرا رنگ دیکھیے:-

برسوں سے لگ رہی تھی لبِ بام ٹکٹکی، — تھک تھک کے گر پڑی نگہِ انتظار آج
ہمارے جذبِ محبت کو دیکھنا قاتل، — کہ رہ گیا ترا خنجر رگِ گلو ہوکر،
تھی نہ تابِ ستم تو حضرتِ دل، — عاشقی کو سلام کرنا تھا
جھکی ذرا چشمِ جنگجو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی — بڑا مزا اُس ملاپ کا ہے جو صلح ہوجائے جنگ ہوکر
نگہ کو بیباکیاں سکھاؤ حجابِ شرم و حیا اُٹھاؤ — بھلا کے مارا تو خاک مارا لگاؤ چوٹیں جتا جتا کر
فتنہ پرداز، دغا باز، فسوں گر، عیار — ہائے افسوس دل آیا بھی تو آیا کس پر
ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں، — ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رو آپ گو ہوئے لیکن — لطفِ سوز و گداز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں اب تک — وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے — آپ بندہ نواز کیا جانیں

ذرا 'بندہ نواز' کے ٹکڑے کی نشتر سامانی ملاحظہ ہو:-

ایسی وحشت نہیں اپنی کہ ہو محتاجِ بہار — پہلے ہی چاک گریبان کئے بیٹھے ہیں
آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے — سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں
جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں — مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں
لعنت ہے تجھ سے کیا کہوں زاہد — ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں،
کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں — اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں
مے پی تو سہی تو، بھی ہوجائے گی زاہد — کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی
اُلجھنا زلف سے لڑنا نگہ سے — سبنے ہیں حضرتِ دل کبھی بلا کے،
لگ چلی بادِ صبا کیا کسی مستانے سے — جھومتی آج چلی آتی ہے میخانے سے
روح کس مست کی پیاسی گئی میخانے سے — مے اُڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے

کتنے پُرکیف اشعار ہیں! لب و لہجہ جذبی تجربہ کے ساتھ گھل مل کر کس قدر پُرتاثیر ہوگیا ہے!

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں، ادھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے،
کیا ادائے خاص ہے!

ترے وعدے کو بُت حیلہ جو نہ قرار ہے نہ قیام ہے　　کبھی شام ہے کبھی صبح ہے، کبھی صبح ہے، کبھی شام ہے

غرض جہان سے کیا اے فلک برے ہوتے　　غریب خانہ ہے موجود ہر بلا کے لئے،

ملے تو حشر میں لے لوں زبانِ ناصح کی　　عجیب چیز ہے یہ طولِ مدعا کے لئے

جب کوئی فتنہ زمانہ میں نیا اُٹھتا ہے　　وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمھارا کیا ہے　　آنکھ نرگس کی، دہن غنچے کا، حیرت میری

کیا کہئے کس طرح سے جوانی گزر گئی　　بدنام کرنے آئی تھی بدنام کر گئی

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور　　کیا چیز حرام ہو گئی ہے!

دوسرے مصرع میں لب و لہجہ کا سحر دیکھئے:-

اللہ اللہ رے تری شوخ بیانی اے داغ!

کچھ آہ کے حوصلے نکلتے　　نیچا مگر آسماں بہت ہے!

کس قیامت کا شعر ہے! سادگی اور پُرکار تخیل!

کچھ تازگی ہو لذتِ آزار کے لئے　　ہر دم مجھے تلاش نئے آسماں کی ہے

بنے ہو بزم میں ساقی تو یہ خیال رہے　　کسے سرور نہ آیا کسے سرور آیا

غمزہ بھی ہو سفاک نگاہیں بھی ہوں خوں ریز　　تلوار کے باندھے سے تو قاتل نہیں ہوتا

دلِ پُر اضطراب نے مارا　　اسی خانہ خراب نے مارا

ملتا نہیں ہم کو دلِ گم گشتہ ہمارا　　تو نے تو کہیں اے غمِ جاناں نہیں دیکھا

کیسا بھولا پن ہے مگر ہوشیار! تجاہلِ عارفانہ کی لطافت اثر خیز ہے۔ خدا بھلا کرے آزار دینے والوں کا!

لوگ کہتے تھے چُپ لگی ہے تجھے　　حالِ دل بھی سُنا کے دیکھ لیا

جاؤ بھی کیا کرو گے مہر و وفا　　بارہا آزما کے دیکھ لیا

'جاؤ بھی' کے ٹکڑے کا کَن دیکھئے۔ کتنا تیز ہے!

عالمِ یاس میں گھبرائے نہ انسان بہت،　　دل سلامت ہے تو حسرت بہت ارمان بہت

ایک معنویت کا شعر ملاحظہ ہو۔ نفسیاتِ محبت کا ماہر شاعر کہتا ہے:-

کھٹکا ہوا ہوں خارِ تمنّا سے اس قدر　　ڈرتا ہوں یاس سے بھی کہیں آرزو نہ ہو

تم کو چاہا تو خطا کیا ہے بتا دو مجھ کو　　دوسرا کوئی تو اپنا سا دکھا دو مجھ کو

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں　　آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

بیٹھے اُداس، اُٹھے پریشاں، خفا چلے　　پوچھے تو کوئی آپ سے کیا آئے کیا چلے

وہ دیتے ہیں تسلّی اور پھر تسکین نہیں ہوتی　　کبھی بے چین یہ کافر طبیعت ایسی ہوتی ہے

ہجر کی یہ رات کیسی رات ہے　　ایک میں ہوں اور خدا کی ذات ہے

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی　　اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

داغ اِک آدمی ہے گرما گرم خوش بہت ہوں گے جب ملیں گے آپ

داغ واقعی گرما گرم آدمی تھا اور اُس کا گرما گرم لب و لہجہ نہایت خوش کُن ہوتا ہے ۔ جب یہ آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہو گیا تو اقبال نے کہا :-

اب کہاں وہ بانکپن ! وہ شوخیِ طرزِ بیاں !
آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں !

اور سے

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون ؟
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون ؟

داغ کے لب و لہجہ کا بانکپن اور شوخی مسلّم ۔ اُس کے تجرباتِ محبّت کی واقعیت بھی تسلیم ۔ اس کے جذبات کی گرما گرمی اور جوشِ اظہار کی ناوک فگنی قبول ۔ لیکن نری واقعیت سے کیا ہوتا ہے اگر اُس میں شعریت پیدا کرنے والے دوسرے عناصر موجود نہ ہوں ۔ صرف جذبہ کے جوش سے بھی کچھ نہیں بنتا اور خالی خولی لب و لہجہ سے بھی اثر پیدا نہیں ہوتا۔ داغ کہتا ہے :-

غمزہ بھی ہو سفاک ، نگاہیں بھی ہوں خوں ریز
تلوار کے باندھے سے تو قاتل نہیں ہوتا !

شاعری بھی ایک طرح داری اور محبوبی ہے ۔ صرف خارجی بَرتَش سے قتالگی پیدا نہیں ہوتی ۔ شاعری میں غمزہ اور نگاہ کی با اثری کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔ خارجی اور داخلی محاسن کے امتزاج سے شاعری اثر خیز ہو جاتی ہے ۔ داغ کا لب و لہجہ پختہ تو ہے مگر ہمیشہ جاندار نہیں ۔ اس کے یہاں رسمیّت بہت ہے ۔ عام طور پر داغ کی شاعری میں تخیل اور درد و سوز کی کمی ہے ۔ امیر مینائی کے یہاں نسبتاً تخیل کی پرواز اور درمندی زیادہ ہے ۔ داغ کی شاعری میں جذبہ، جوش اور تیور نمایاں ہیں ۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ داغ کی شاعری میں جذبہ، جوش اور تیور نمایاں ہیں ۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ داغ کی شاعری میں لب و لہجہ ہی سب کچھ ہے مگر بہت کچھ ضرور ہے ۔ امیر مینائی کی شاعری میں رسمیّت اور سپاٹ پن داغ کی شاعری سے زیادہ ہی ہے اور اس کے لب و لہجہ میں نہ ویسی پختگی ہے نہ کاٹ ۔ اس مضمون میں داغ اور امیر کا مقابلہ و موازنہ مقصود نہیں ۔ غرض یہ ہے کہ داغ کی شاعری میں لب و لہجہ کی اہمیت اور اس کی انفرادیت ظاہر ہو جائے ۔ داغ کی ایک مخصوص فنکاری ہے ۔ جس کی منفرد اور منجھی ہوئی ٹکنیک بھی ہے ۔ اس کے رنگ کے کامیاب و پُر اثر اشعار میں نے اوپر پیش کر دئے ہیں ۔ داغ اپنے محدود اُفق میں اور متعین سطح پر کامیاب فن کار ہے ۔ ۶

سچ یہ کہ داغ پُرفن یکتا ہے اپنے فن میں !

رامپور اور داغ

(محمد علی خاں اثر رامپوری)

اس سے پہلے کہ مرزا داغ کے متعلق کچھ لکھا جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مدت قیام رامپور پر سب سے پہلے روشنی
ی جائے۔ تذکرۂ خمخانۂ جاوید داغ کا قیام رامپور میں کم وبیش چالیس سال ظاہر کرتا ہے اور احسن مارہروی جلوۂ داغ میں ۴۰-۴۵
ی مدت قیام ظاہر کرتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں داغ کا مولوی غیاث الدین صاحب رامپوری سے رامپور میں فارسی کی تعلیم کا حاصل کرنا بھی دونوں نے تحریر
ہے اور اس کے ہمنوا محمد نثار علی شہرت مصنف آئینۂ داغ بھی ہیں۔ خمخانۂ جاوید نے اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ جب داغ مولوی غیاث الدین
۱۲۶۰ھ) سے فارسی کی تعلیم حاصل کرکے قلعہ میں مستقل طور پر آئے تو مولوی سید احمد حسین شکیبا تخلص شاگرد میر تقی میر ان کے معلم
ئے۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں ذوق کے شاگرد ہوئے اور جب نواب سید یوسف علی خاں ناظم تخلص مرزا ولی عہد کے مصاحب تھے تو
ن میں مرزا داغ اور نواب سید کلب علی خاں کا عرصے تک ساتھ رہا۔

لیکن میری تحقیقات سے نہ مندرجۂ بالا مدت قیام صحیح ہے نہ مولوی غیاث الدین سے رامپور میں داغ کا فارسی پڑھنا ثابت اور
اب یوسف علی خاں کی مصاحبت ولی عہد ثابت۔

اب آپ نواب عبداللہ خاں صاحب مرحوم برادر نواب سید محمد سعید خاں بہادر کی بیان کی ہوئی خاندانی روایات ملاحظہ فرمائیں
درجۂ استناد رکھتی ہیں اور یہ صاحبزادہ محمود علی خاں صاحب، نواب عبداللہ خاں صاحب کے پرپوتے سے مجھ تک پہونچی ہیں۔

نواب سید غلام محمد خاں بہادر دوجوڑا کی مشہور جنگ میں جن کے مقابل انگریزی اور آصف الدولہ کی فوجیں تھیں، مصالحت
کے ۱۷۹۴ء میں پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ گئے اور وہاں سے ذریعہ جہاز بغرض حج حجاز پہونچے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد براہ
ی وکشمیر نادون کے راجہ کے مہمان ہوگئے جس نے انتہائی اخلاص و مدارات کا برتاؤ کیا۔ آخر ان کا انتقال وہیں ۱۲۳۹ھ میں بعمر
۰ سال ہوگیا۔ "رضوان مقام" مادہ تاریخ ہے۔

نواب غلام محمد خاں جب حج کو جانے لگے تو اپنے چھ بیٹوں کو جن کے رئیس خاندان نواب محمد سعید خاں تھے پانچ پانچ لاکھ روپے
ر اپنے خزانہ سے جو ان کے ساتھ بزمانۂ جنگ تھا دے گئے تھے۔ اور تحت شرائط معاہدہ اپنے بیٹوں کے گزارے کے لئے دو سو پچاس
پے ماہانہ فی کس وظیفہ ریاست سے جاری کرا گئے تھے۔ نواب غلام محمد خاں کے بعد انگریزوں نے نواب احمد علی خاں کو جن کی عمر ۹ برس
تھی فرمانروا بنادیا تھا اور تا بلوغ نواب نصراللہ خاں کو ریاست کے کل نظم ونسق کا مختار بنادیا تھا۔ چنانچہ کل بھائی بنارس ہوتے
ہوئے دلی کے محلہ روشن پورے میں مقیم ہوگئے۔ نواب محمد سعید خاں کی عمر اسوقت ۱۸ سال کی تھی۔ نواب یوسف علی خاں ۵ مارچ
۱۸۱۶ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم کا سلسلہ مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی سے شروع ہوا۔ بعد میں شاہ عبدالعزیز صاحب
ے مدرسے میں داخل ہوگئے۔ نواب کلب علی خاں ۱۹ اپریل ۱۸۳۵ء کو دلی کے محلہ روشن پورے میں پیدا ہوئے۔ داغ کی ولادت

۱۸۳۵ء میں ہوئی۔ اس طرح داغ نواب خلد آشیاں سے چار برس بڑے تھے۔

جب نقد سرمایہ ختم ہو چکا تو نواب محمد سعید خاں، نصیرالدین حیدر شاہ اودھ سے ملے۔ اور ان کے ایک کارِ خاص کے سلسلہ میں انھیں کلکتہ جانا پڑا۔ جب وائسرائے سے ملاقات ہوئی تو موقع پاکر انھوں نے اپنی زبوں حالی کا بھی ذکر کر دیا۔ وائسرائے نے جواب دیا کہ اگر تم ملازمت کرنا چاہو تو تمھارا تقرر ڈپٹی کلکٹری پر کیا جا سکتا ہے۔ وہ رضامند ہو گئے اور بحیثیت ڈپٹی کلکٹر بدایوں میں تعینات کئے گئے۔ نواب عبداللہ خاں عرصے تک مین پوری اور میرٹھ میں بحیثیت صدرالصدور ملازم رہے۔

جب نواب احمد علی خاں والی رامپور کا انتقال ۲۶ر جولائی ۱۸۴۰ء کو ہوا تو نواب محمد سعید خاں ۲۰ر اگست ۱۸۴۰ء کو مسند نشین ریاست ہوئے۔ اس لئے کہ نواب احمد علی خاں کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ جب نواب محمد سعید خاں نے ریاست کے انتظامات پر قابو پا لیا تو کچھ مدت کے بعد اپنے اہل و عیال کو دلی سے رامپور بلا لیا اور مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی کو طلب کر کے محکمۂ نظامت اور اس کے بعد مرافعۂ عدالتین پر مامور کیا۔

چونکہ نواب محمد سعید خاں کے خاندان کے لوگ مرزا رحیم الدین حیا دہلوی کے مکانات میں بھی مقیم تھے اس لئے مرزا حیا سے بھی تعلقات ہو گئے۔ اُدھر نوابان لوہارو سے تعلقات کے باعث نواب شمس الدین احمد خاں پدر مرزا داغ سے بھی تعلقات رہے۔ رہا نواب یوسف علی خاں کی مصاحبت کا مسئلہ تو وہ مصاحبت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ البتہ یہ قرینِ قیاس ہے کہ نواب یوسف علی خاں کی مرزا ولی عہد سے بھی بزمانہ قیام دہلی وقتاً فوقتاً ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا ہو۔ جس کو بعض تذکروں نے مصاحبت کے لقب سے یاد کیا۔

تذکروں سے یہ ثابت ہے کہ داغ اپنے والد کے انتقال کے بعد ۶-۷ برس کی عمر میں اپنی ماں کے ساتھ قلعہ میں آ گئے وہیں تعلیم پائی۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا انتقال ہوا۔ ماں کے ساتھ یہ بھی قلعے سے نکلے۔ ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا۔ غدر کا ہنگامہ فرو ہونے پر داغ مع خاندان رامپور آئے اور نواب یوسف علی خاں کے زیر سایۂ عاطفت رہے۔

رہا مولوی غیاث الدین سے تعلیم کا وہ مسئلہ تو ظاہر ہے کہ ۱۸۴۰ء سے پہلے داغ کے رامپور آنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا البتہ نواب نواب یوسف علی خاں کے ۱۸۵۵ء میں تخت نشین ہونے پر مرزا رحیم الدین حیا بوجہ تعلقات دہلی رامپور میں ۱۸۵۵ء ہی میں مقیم ہو گئے تھے۔

داغ کی آمد رامپور کے سلسلہ میں محمد نثار علی شہرت لکھتے ہیں کہ جب قلعہ خالی ہوا اور بادشاہ رنگون بھیجے گئے تو داغ حکیم سعادت علی خاں جنرل افواج رامپور کے بیٹے حکیم ولایت علی خاں کے پاس آ نوٹے گئے اور اُن سے سفارشی چٹھی لے کر رامپور آئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔

لیکن میری رائے میں داغ کی آمد رامپور کے سلسلہ میں زیادہ مستند روایت یہ ہے کہ عمدہ خانم، داغ کی خالہ نے نواب یوسف علی خاں صاحب کو داغ کی پرورش کے سلسلہ میں سفارشی خط بھیجا تھا۔ نواب یوسف علی خاںصاحب عمدہ خانم کو ایک سو روپے ماہانہ بطور وظیفہ بھیجا کرتے تھے۔ جو تا حیات جاری رہا۔ اس طرح داغ کی آمد و رفت کا سلسلہ رامپور میں جاری ہوا۔ داغ کے خطوط سے جن میں دو خط ۱۸۶۱ء میں نواب یوسف علی خاں کو بھیجے گئے ہیں۔ اور ۱۸۶۶ء میں نواب کلب علی خاں کو تین خط ملازمت سے قبل بھیجے گئے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ تعلقات مستحکم ہو گئے تھے اور آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا۔

جناب داغ کا قیام رامپور میں مستقل نہیں رہا۔ تقاریب کے مواقع پر عارضی قیام کا سلسلہ بیشک جاری رہا۔ مستقل قیام بزمانہ ملازمت یوم تقرر ۱۴ر اپریل ۱۸۶۶ء سے ہوا جو خلد آشیاں کی وفات ۱۸۸۷ء تک جاری رہا۔ جس کو ۲۱ سال ہوتے ہیں

اگر ۱۸۵۷ء سے جون ۱۸۵۸ء تک غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کی مدت کا لحاظ کیا جائے تو ایک سال ۲ ماہ مزید ہوتے ہیں۔ اور نواب یوسف علی خاں کی وفات اور نواب خلد آشیاں کی تخت نشینی کے سلسلہ میں نیز تقاریب کے مواقع پر جس قدر قیام رہا ہو اکی مدت بھی زیادہ سے زیادہ ایک یا دو سال ہوسکتی ہے اس لئے کل مدت قیام رامپور زیادہ سے زیادہ تقریباً ۲۲ یا ۲۴ سال ہوتی ہے نہ کہ ۴۰ اور ۴۵ سال۔ احسن مارہروی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا داغ نے ۲۴ سال مصاحبت کے ساتھ اصطبل و فراش خانے کی خدمات انجام دیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ اصطبل وغیرہ ان کے سپرد ۱۸۶۶ء میں وقت تقرر ہوئے تھے اس لئے ان خدمات کی مدت ۱۲ سال ہوتی ہے نہ کہ ۲۴ سال۔

جب ۱۸۶۳ء میں نواب یوسف علی خاں صاحب والی رامپور کو گورنر جنرل کشور ہند کی کونسل واضع قانون کا ممبر بنایا گیا تو ان کی اور ان کے ولی عہد نواب کلب علی خاں صاحب کی کلکتہ سے واپسی پر داغ نے رامپور آکر خود قطعۂ تہنیت پیش کیا۔ جس کے چند شعر یہ ہیں:-

کیا ولی عہد اور نواب آئے آج	برج صد حشمت کے دو کوکب یہ آئے
دو مسیحا آئے بہرِ دردِ ہجر	خاطر طالب کے دو مطلب یہ آئے
دو قمر اک بار آئے ہیں نظر	تھا زبانوں پہ یہی جس شب یہ آئے
گوش بر آواز لب پر یہ دعا	مجھ کو سنوا دے کہیں یارب یہ آئے
بہرِ استقبال میں پہونچا مگر	کون جانے کون آئے کب یہ آئے
داغ نے بھی پیشکش تاریخ کی	شان و شوکت جاہ و اقبال اب یہ آئے

۱۲۸۰

نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کی تخت نشینی کے جشن میں جو ۱۰ جون ۱۸۶۵ء کو ہوا تھا۔ مرزا داغ نے ۱۱ شعر کا ایک تاریخی قطعہ لکھا ہے جس کے ہر مصرع کے عدد (۱۲۸۲) ہوتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:-

بھر کر شرابِ صاف پلا آج جام میں	ساقی ہے انجمن کی زباں پر ترانہ آج
پریوں کا جمگھٹ اور حسینوں کا جلسہ ہے	کیا ایک رنگ پر ہے یہ جشن شہانہ آج
فانوس، جھاڑ، آئینے، تصویر لمپ بھی	چمکا ہے بزم جشن سے دیوانخانہ آج
سارا ہے جلوہ کلب علی خاں کے دم سے آج	عہد سرور آج ہے جشن شہانہ آج
یہ سروری کہ داد و دہش اس قدر کہ بس	کیا کیا دیا ہے دولت و مال و خزانہ آج
پیدا کہاں ہے لعل خوش آب آج کوہ میں	یکتا رہا صدف میں نہ گوہر کا دانہ آج
پیہم ہے سجدہ ریز نہاں فرق فرقداں	کیا کیا ہوا بلند ترا آستانہ آج

داغ مدح سنج مداح نواب

۱۲۸۲

حضرت داغ بحیثیت افسر اصطبل نواب خلد آشیاں کی عام عادت تھی کہ وہ ملازمین کو تنخواہ تو بہت کم دیتے تھے لیکن خاطر و مدارات، دلدہی اور انعام و عنایات میں کبھی دریغ نہ کرتے تھے، اس لئے سب کی نگاہیں

تنخواہ سے زیادہ انعامات اور صلوں پر لگی رہتی تھیں جو وقتاً فوقتاً کسی خاص تقریب یا اظہار کار گزاری کے وقت انھیں عطا ہوتے رہتے تھے اور ہر مصاحب کے متعلق کوئی نہ کوئی خدمت بھی کی جاتی تھی۔ چنانچہ نواب مرزا خاں داغ کے سپرد مصاحبت کے علاوہ اصطبل و فراشخانہ بھی کئے گئے تھے، تنخواہ سعتہ ر ماہانہ تھی۔ اس زمانہ میں اصطبل اس عمارت میں تھا جہاں اب فراشخانہ ہے۔ جب اہل رامپور کو حضرت داغ کے افسر اصطبل ہونے کی اطلاع ہوئی تو رنگ کی سیاہی اور اصطبل کی رعایت سے کسی ستم ظریف نے ایک شعر لکھ کر اصطبل کے دروازے پر لگا دیا جو آج تک بچے بچے کی زبان پر ہے :-

شہر دہلی سے آیا اک مشکی　　　　آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

جب مرزا داغ کی نظر اس شعر پر پڑی تو شعر کی رعایتوں کی داد دی اور اعلان کر دیا کہ میں اس شاعر سے ملاقات کا آرزومند ہوں وہ بے خوف ہو کر مجھ سے ملیں میں ان کی قدر کروں گا۔ لیکن اس شاعر کا پتہ آج تک نہ چلا۔ حالیہ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ وہ شعر میر احمد علی رسا رامپوری شاگرد شیخ علی بخش بیمار نے لکھا تھا۔ اور کسی شاگرد کے ذریعہ اصطبل کے دروازے پر چسپاں کرا دیا تھا

داغ کی قیامگاہ داغ کی قیامگاہ کوچہ ہمیشر پاس میں تھی جو جامع مسجد سے مغرب کی طرف واقع ہے اس تنگ گلی میں داہنی طرف پیشاب گھر کے پاس جو دوسرا دو منزلہ مکان ہے اسی میں داغ ہمیشہ مقیم رہے۔ اسی میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اس مکان سے اصطبل صرف ایک فرلانگ پر واقع تھا سرکاری قلعہ قیامگاہ کے سامنے تھا اور مرزا رحیم الدین حیا دہلوی کا مکان کوچہ لنگر خانے میں تھا جو نواب مرزا کی قیامگاہ سے بہت قریب تھا۔

داغ کے ہمعصر شعراء نواب مظفر علی خاں اسیر لکھنوی۔ منشی امیر احمد صاحب مینائی۔ سید ضامن علی جلال لکھنوی۔ منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی۔ سید محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی۔ شیخ امداد علی بحر لکھنوی۔ خواجہ ارشد علی خاں قلق۔ حسین علی خاں شاداں نبیرہ مرزا غالب۔ خواجہ محمد بشیر بشیر لکھنوی۔ صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا دہلوی۔ مرزا معین الدین حیدر غیض لکھنوی۔ آغا علی نقی غنی لکھنوی۔ آغا محمد شیرازی نثار۔ سید احمد علی رسا رامپوری۔ میر محمد زکی زکی بلگرامی۔ میر یار علی خاں صاحب ریختی گو لکھنوی۔ سید زین العابدین عرف سید منصور علی رامپوری منصور و علی تخلص۔ سید صابر حسین سہسوانی صبا۔ منشی احمد حسن خاں عروج کانپوری۔ سید ابو محمد بدر ابن منیر شکوہ آبادی۔

رامپور کے چند مشاعرے مولانا عبدالرزاق خاں صاحب طالب رامپوری مرحوم سابق پروفیسر فارسی مدرسۂ عالیہ رامپور میرے استاد تھے۔ انھوں نے ایک دن ایک مشاعرے کا ذکر فرمایا کہ میں شیخ احمد علی صاحب احمد رام پوری فارسی کے مسلم الثبوت استاد سے فارسی پڑھا کرتا تھا۔ اسی طالب علمی کے زمانے میں ایک طرحی مشاعرے کی شرکت کا اتفاق ہوا۔ "قامت کے قیامت کے" قافیہ و ردیف تھا۔ میری غزل اسوقت ہوئی جبکہ مشاعرہ سرد پڑ چکا تھا اور مرزا داغ ۲ بجے شب کے تکان کی وجہ سے اندرونی ہال میں گاؤ تکیے کا سہارا لیکر نیم دراز ہو چکے تھے۔ جب میں نے یہ شعر پڑھا :-

ہاتھ میں جام مے لئے میکش　　　　منتظر ہیں خدا کی رحمت کے

یہ شعر سنکر داغ باہر آ گئے اور فرمایا مولانا تم نے مشاعرہ ختم کر دیا۔ پھر کیا تھا داد و آفرین کے ہر طرف نعرے لگنے لگے اور مشاعرہ جاگ گیا۔

ایک اور مشاعرہ میں محمد شاہ خاں کاوش رامپوری شاگرد جلال نے غزل پڑھی جس کا آخری مصرع معلوم ہو سکا۔

خود کنوئیں میں گر پڑے جو روئے دل بر دیکھکر

داغ خاموش نہ رہ سکے۔ فرمایا یوں کہو :-

جو کنوئیں میں گر پڑے خود روئے دل بر دیکھکر

ں نے "جورو" کے لفظ کی گرفت کرکے بیچارے کو شرمندہ کردیا اور قہقہہ بلند ہوا۔

احسن مارہروی نے جلوۂ داغ میں لکھا ہے کہ مرزا نے غدر کے بعد پہلے پہل صاحبزادہ محمد رضا خاں رامپوری کے مشاعرے
یہ غزل پڑھی تھی :۔

بھولے بھٹکے جو ترے گھر میں چلے آتے ہیں ۔۔۔ اپنی تقدیر کے چکر میں چلے آتے ہیں
داغ جاکر نہ پھرے سوئے عدم اپنے رفیق ۔۔۔ ہم یہ سمجھے تھے کہ دم بھر میں چلے آتے ہیں

ب مرزا خاں داغ کے کلام کی داد

احمد علی خاں عرف امن خاں بیخود مرحوم رامپوری نے داغ کے کلام کی داد کا حال اس طرح بیان کیا کہ جب داغ مشاعرے میں اپنی غزل سناتے تھے تو رامپور کے ن انھیں سیکڑوں گالیاں دیتے تھے۔ دریافت کیا گیا کہ گالیوں کا کیا موقع تھا۔ جواب دیا کہ کلام کی تاثیر اور حسن قبول کا یہ تھا کہ پٹھان بے ساختہ چیخیں مار مار کر کہتے تھے۔ اُف ظالم مار ڈالا۔ اُفوہ گلا حلال کردیا۔ اُف۔ اُف۔ کم بخت نے دل کا کام ا۔ اُف اُف ستم کردیا۔ غضب ڈھا دیا۔

ایک دن نواب خلد آشیاں نے نواب عبداللہ خاں سے پوچھا کہ داغ کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے۔ جواب دیا کہ :۔ ڑے میں گلاب بھرا ہوا ہے"۔ مقصد یہ تھا کہ صورت تو کالی ہے لیکن باطن گلہائے معانی کی خوشبوؤں سے مہک رہا ہے۔

پڑھنے کا عجیب انداز تھا جس طرف ہاتھ اُٹھا دیتے پورے مشاعرے کی نظریں اسی طرف اُٹھ جاتیں۔ ایک بار عربی مدرسے لبہ کا ایک گروہ بھی داغ کے کلام کی شہرت سُن کر ایک مشاعرے میں شریک ہوا۔ اور سب کے سب ایک ہی گوشے میں بیٹھ گئے۔ داغ دور ہی سے دیکھ کر "تاڑ گئے"۔ جب انھوں نے غزل پڑھی تو لمبی لمبی داڑھی والوں کی طرف ہاتھ اُٹھاکر شعر کے مصرعِ ثانی کی بار بار تکرار کی۔

کسی کی نرگسِ مخمور کچھ کہ دے اشاروں میں
مزہ ہے رات دن چلتی رہے پرہیزگاروں میں

یا تھا مشاعرہ دیوار قہقہہ بن گیا اور پورے مشاعرہ کی نظر طلبہ کی طرف پھر گئی۔ آخر بیچارے کچھ خفت کے ساتھ اُٹھکر اپنے پر خود ہی ہنستے ہوئے گھروں کو چلے گئے۔

یہ مشہور ہے کہ داغ کی غزل کے بعد مشاعرہ اُکھڑ جاتا تھا۔ اور مشاعرے کے باہر سوائے داغ کے اشعار کے کسی شاعر کا ردِ زبان نہ ہوتا تھا۔ امیر کا مقولہ ہے کہ وہ کلام پسندیدہ ہے جو مشاعرے سے باہر جائے۔ فرماتے تھے کہ میں نے باہر جانے والوں اکثر مرزا داغ کا شعر باہر نکلتے دیکھا ہے۔ مرزا میں گو اعلیٰ علمی استعداد کم ہو لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ محاورہ بندی۔ زبان۔ روز پابندی فصاحت و بلاغت اور صفائی بیان کے وہ حاکم تھے۔ ان کا ہر شعر دل میں اترتا اور حافظے میں محفوظ ہوجاتا تھا۔

ہتے ہیں :۔

غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہے داغ ۔۔۔ اُردو ہی وہ نہیں جو ہماری زباں نہیں
نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو ۔۔۔ کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے
داغ سا بھی کوئی شاعر ہے ذرا سچ کہنا ۔۔۔ جس کے ہر شعر میں ترکیب نئی پاتے ہیں
نہیں ملتا کسی مضموں میں ہمارا مضموں ۔۔۔ طرز اپنا ہی جدا سب سے جدا رکھتے ہیں
داغ ہی کے دم سے تھا لطفِ سخن ۔۔۔ خوش بیانی کا مزہ جاتا رہا
داغ معجز بیاں ہے کیا کہنا ۔۔۔ طرز سب سے جدا نکالی ہے
اللہ اللہ تری شوخیِ بیانی اے داغ ۔۔۔ سست اک شعر نہ دیکھا ترے دیواں میں کبھی

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ　　ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

آخر وہ وقت بھی آگیا کہ نواب خلد آشیاں نے ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء کو دُنیا سے کوچ کیا اور اہلِ

محفل علم و شعر کی برہمی کمال کا مجمع درہم برہم ہوگیا۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو پرنم نہ ہو کوئی دل ایسا نہ تھا جو وقفِ غم نہ ہو۔ کچھ دن پہلے یہ چمن طرح طرح کے پھولوں سے آباد تھا۔ بلبلوں کی نغمہ سرائی دل و دماغ کو مست کئے دیتی تھی لیکن دم بھر میں بادِ صرصر نے ویران کردیا۔ ایک شمع تھی جس کے گرداگرد پروانوں کا ہجوم تھا۔ کچھ ختم ہوگئے کچھ سسکتے ہوئے ادھر اُدھر بکھر گئے۔ نہ علماء رہے نہ شعراء۔ نہ داستان گو اور نہ دیگر فنون کے اہلِ کمال۔

وہ گلرخانِ سمن بر کے قہقہے نہ رہے

وہ بلبلانِ خوش الحاں کے چہچہے نہ رہے

اس حادثے نے داغ کا دل بھی توڑ دیا اور خلد آشیاں کی قدر دانی کی یاد نے انھیں آٹھ آٹھ آنسو رُلا دیا۔

نواب نے کی جو قدر دانی میری　　لے داغ گزر گئی جوانی میری

لیکن یہ خبر نہ تھی کہ وقت پیری　　مر مر کے کٹے گی زندگانی میری

رئیس مصطفےٰ آباد کے نوکر ہوئے جب　　کہیں کیا داغ ہم آرام ہم نے کسقدر پایا

آخر یہ کہہ کر رخصت ہوگئے :-

رہے کیا مصطفےٰ آباد میں داغ　　وہ سارے لطف تھے خلد آشیاں تک

پھر کہتے ہیں :-　　رہے گا مصطفےٰ آباد میں داغ　　غریب و عاجز و مسکیں کہاں تک

جب مرزا داغ رامپور سے ۱۸۸۷ء میں قطع تعلق کرکے رخصت ہوئے تو پہلے دلّی گئے۔ وہاں سے مختلف شہروں لاہور۔ اجمیر اور آگرہ وغیرہ ہوتے ہوئے ۱۳۰۵ھ میں حیدر آباد پہونچے۔ "ملے داغ سلطان سے" (۱۳۰۵) مادۂ تاریخ ہے۔ ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ سے نظام کی اصلاح کا سلسلہ شروع ہوا۔ دو ہزار کی تنخواہ ہوئی۔ متعدد خطابات سے نوازے گئے۔ لیکن خود داری کو نہ چھوڑا۔ نہ کسی کی خوشامد کی نہ بغیر بلائے نظام کے پاس گئے :-　　میں وضع کا پابند ہوں گو جان بھی جائے　　جب کوئی بلانے نہیں آتا، نہیں جاتا

لیکن باوجود ان مناصب و اعزاز کے رامپور کی صحبتوں کو بھی فراموش نہ کیا۔ حیدر آباد سے ایک غزل رامپور میں امیر مینائی کو بھیجی تھی جس کے دو شعروں میں دلی تڑپ کا اظہار کیا گیا ہے۔

یاد آتے ہیں وہ اشخاص مصاحب منزل　　دو گھڑی جلسہ وہ احباب کے شامل اپنا

نہیں اکثر کا پتہ اور جو کچھ باقی ہیں　　ان سے ملنے کو تڑپتا ہے بہت دل اپنا

اس کے بعد امیر مینائی کا دل بھی اُچاٹ ہوگیا اور کہنا پڑا :-

کہاں ہم لے امیر اور اب کہاں داغ　　وہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

چنانچہ وہ بھی حیدر آباد پہونچے لیکن قضائے قیام کی زیادہ مہلت نہ دی ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو انتقال کرگئے۔ تو داغ کے زخم پھر ہرے ہوگئے فرماتے ہیں :-　　داغ اس صنعف نے کی اپنی تو منزل کھوٹی　　ہم رہے جاتے ہیں سب یار چلے جاتے ہیں

لیکن ذیل کے شعر میں جن تمناؤں کا اظہار کیا گیا تھا ان میں صرف ایک تو پوری ہوئی یعنی امیر مینائی سے ملاقات ہوگئی۔ لیکن جلال کی آرزو باقی ہی رہی۔

لے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ　　ملتے امیر احمد و سید جلال سے

رامپور میں ایک امیر اللہ تسلیم رہ گئے تھے جن کی حالت ان کے شعر سے ظاہر ہے :-

ہماری شاعری تسلیم تھی کلب علی خاں تک　　ذلیل و خوار ہم پھرتے ہیں وہ سوتے ہیں مدفن میں

داغ کے غیر مطبوعہ خطوط

(پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

امیر و داغ ہماری قدیم شاعری کا آخری ورق ہیں، ان کا ذہن اور کردار انیسویں صدی کی پیدا وار ہے۔ اسوقت ہادی و زاہد میں، وہ تضاد نہیں تھا جو آج ہے، مومن کوچۂ رقیب میں سر کے بل جانے کے لئے طیار ہے اور شب وصلِ غیر کاٹنے کے لئے آمادہ۔ لیکن وہ اس سطح سے بلند ہوکر انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کی ترغیب بھی دیتا ہے اور کہتا ہے:-

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں　　مری جاں فدا ہو تری راہ میں

امیر مینائی نیک طینت اور پاک سرشت بزرگ تھے بقول مولانا ثاقب۔ ایک عالمِ نور۔ مجسم شفقت و محبت اور پیکر تہذیب و متانت۔ ان کے تقدس اور بے ریائی کی شہرت لوگوں میں اسی قدر تھی جتنی اُن کے علم و فضل اور کمالات شاعری کی ـــ لیکن ایسا زاہد و عابد زمانہ کے اثر سے مجبور ہوکر شعر کہتا ہے تو یہی:-

شرم کہی جائے تو میں جانوں کہ تنہائی ہوئی!

امیر کے خطوط اُن کی شاعری سے مختلف ہیں۔ یہ ان کی ذاتی پاکیزگی اور نکوکرداری کا آئینہ اور لفظی، بیانی اور عروضی دقائق و نکات کا گنجینہ ہیں۔ لیکن ان میں وہ رنگینی اور شگفتگی نہیں ہے جو شخصیت کی بوقلمونی اور ہمہ گیری سے پیدا ہوتی ہے اور جس کی سب سے اعلیٰ مثال مرزا غالب کے خطوط ہیں۔

امیر کے ہمعصر یعنی مرزا داغ کے خطوں کے تیور کچھ اس قسم کے ہیں "چناں کہ می نمایم ہستم" لیکن وہ اُن کا ادبی کارنامہ نہیں ہیں ان میں عبارت کی دلآویزی اور عشوہ پردازی تقریبًا مفقود ہے۔ بعض خطوں کی عبارت ٹھیلی اور معمولی ہے اور ان میں کسی قسم کی ادبی یا منشیانہ شان نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ داغ صرف شاعر تھے، ملٹن، سعدی، ظہوری اور غالب کی سی سعادت بہت کم لوگوں کو ملتی ہے کہ وہ نثر اور نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہوں۔ اس کے باوجود اگر انشائے داغ کے گلستانِ خزاں منظر کو شروع سے آخر تک دیکھا جائے تو اس میں بھی چند ایسے گلہائے خوش رنگ ملجائینگے جو امیر کے یہاں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ داغ اور امیر کی طبیعتیں مختلف تھیں۔ امیر، متقی، پرہیزگار اور سادہ مزاج تھے اور داغ بذلہ سنج۔ خوش طبع اور رنگیں مزاج۔ کوچہ گردی کی بو جو ان کی شاعری میں ہے، وہ خطوں میں بھی کہیں کہیں ہے جہاں نگارانِ عشوہ فروش کا ذکر کیا ہے، وہاں یہ شراب دو آتشہ ہوگئی ہے۔

داغ کے خطوں میں جو رنگینی ہے وہ خمارِ چشمِ ساقی کی بدولت ہے ممکن ہے بعض طبائع کو یہ بات ناگوار گزرے کہ ان میں طوائفوں کا ذکر ہے۔ لیکن اُس زمانہ میں عشق و محبت کے لوازم گھر کے بجائے بازار ہی میں نشو و نما پاسکتے تھے۔ بیوی صرف خاندان چلانے کا ذریعہ تھی اور طوائف جذباتی دُنیا کی مالک۔ غالب بالعموم دن بھر میں صرف ایک دفعہ گھر کے اندر جاتے تھے۔ عورت ہماری سوسائٹی سے غائب تھی۔ اس کا وجود حرم سرا کے اندر تھا اور بہو بیٹیاں جنسی صحبت سے نا آشنا، محض تھیں۔ مرزا شوق

لکھنوی نے انیسویں صدی کے اس ماحول کی ترجمانی بڑی کامیابی کے ساتھ کی ہے جب زندگی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس کا سارا رس نچوڑ لیا گیا تھا۔ مہ لقا کے یہ الفاظ صرف اس کے دکھے ہوئے دل کی پکار نہیں بلکہ عصری معاشرت کا مرثیہ بھی ہیں :-

نہیں واللہ دسترس اپنا — قیدی بندی ہے کیا ہے بس اپنا
دن بھر ایک ایک منہ کو تکتا ہے — بات کرنے میں عیب لگتا ہے
ناک میں دم ہے، اشکباری ہے — زندگی تک سے جان عاری ہے

اس شعر میں اس زمانہ کی پوری جنسی زندگی سمٹ آئی ہے :-

عشق کا حال بیسوا جانیں — ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ طوائف جو ہمارے جذبات پر چھائی ہوئی تھی، اس نے ادب میں بھی مرکزی جگہ حاصل کر لی غزل میں جو معاملہ بندی، ہوس پرستی اور عاشق پیشگی ہے وہ بھی اسی کی نگاہ شوخ کی بدولت ہے۔

داغ کے سب سے دلچسپ خطوں کی مخاطب حمیدن بائی نقاب اور منی بائی حجاب ہیں۔ اس زمانہ میں ہندوستانی طوائف، قدیم یونان کی طرح ایک تہذیبی ادارہ تھی۔ دماس تھنیس اور پرکلیز علی الترتیب سیس اور اسپاسیا سے محبت کرتے تھے اور یہ دونوں طوائفیں تھیں۔ روم کے حمام قحبہ خانے تھے اور وہاں جانا تہذیب کے منافی نہیں تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان کی طوائف بھی رقص و موسیقی، علم مجلسی، لباس کی تراش خراش اور شعر و شاعری سے اچھی طرح واقف ہوتی تھی۔ اسی لئے شرفا اپنے بچوں کو وہاں تہذیب سیکھنے کے لئے بھیجتے تھے۔

حجاب سے داغ کے تعلقات کی ابتدا کلکتہ سے ہوتی ہے، انھوں نے واجد علی شاہ کے مصاحب حامد الدولہ بہادر کو ۲۹ر اگست ۱۸۸۵ء کے ایک غیر مطبوعہ خط میں لکھا ہے :

"یہ چلن تیرے نئے اے گردش دوراں ہوئے — حامد الدولہ بہادر داغ کے پرساں ہوئے

...... میں ایک مرنج و مرنجاں آدمی۔ کھونے کو گیا۔ کچھ کمانے کو نہیں گیا تھا۔ دل لگی کا یار، جلسوں سے سروکار اہل سخن کا مشتاق، میں رنج کی باتوں کو کیا جانوں۔ ... جس دن سے کلکتہ چھوڑا۔ آٹھ دن اچھا نہ رہا کئی بار تو مر ہی چکا تھا۔ بلکہ اب بھی صاحب فراش ہوں۔"

داغ نے کلکتہ کے متعلق لکھا ہے (وہاں) کھونے کو گیا (تھا) کچھ کمانے کو نہیں گیا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل سید رفیق مارہروی کے الفاظ میں یہ ہے کہ :-

"قیام رامپور کے زمانہ میں کسی کام سے حضرت داغ کلکتہ تشریف لے گئے وہاں ایک پرکالۂ آتش سے ملاقات ہوئی۔ نام اس کا منی بائی تھا۔ داغ اسے اپنا دل دے بیٹھے ...... مثنوی فریاد داغ اسی زمانہ کی پیداوار ہے اور خالصتاً منی بائی کے ہجر و فراق کا نتیجہ ہے۔ اس کے پڑھنے سے داغ کے سوز عشق اور ان کی محبت و گرویدگی ...... کا پتہ چلتا ہے، منی بائی ایک تعلیم یافتہ طوائف تھی۔ شاعری بھی کرتی تھی حجاب تخلص تھا یہ چیز متنازعہ فیہ ہے کہ آیا وہ فیض داغ سے شاعرہ ہوئی یا پہلے سے شعر کہا کرتی تھی۔ جس زمانہ میں داغ اس سے ملے وہ ایک شخص کی پابند و ملازم تھی۔ داغ کی پذیرائی نہ ہوسکی۔ اس چیز نے سوز عشق پر وہ کام کیا جو آگ پر تیل کا کام کرتا ہے محبت کی جو چوٹ داغ نے دل پر کھائی تھی، زخم بنی اور بالآخر ناسور ہو گئی۔"

داغ نے اپنے اور حجاب کے معاملات کا اکثر خطوں میں ذکر کیا ہے۔ مہاراجہ یوراج بیریہ ٹھاکر ہرکشن بہادر بیدار کو ایک

بر مطبوعہ خط میں لکھتے ہیں :-

"تمھارا استاد بوڑھا ہے - مگر ہزار جوانوں سے بہتر - کبھی دل میں آتا ہے - اپنا عاشق آپ ہوجاؤں - راجہ صاحب ہمارے عاشق تم ہوجاؤ - خدا کے لئے ہوجاؤ - بھگوان کے لئے ہوجاؤ - منی بائی حجاب تخلص جو صاحب مثنوی فریادِ داغ ہیں، ہر چند بلاتا ہوں - نہیں آتیں - وہ مجھ کو بلاتی ہیں - مجھے حضور پُرنور نہیں جانے دیتے - اور بالفعل تو میرے دم ہی پر بنی ہوئی ہے - سخت علیل ہوں ...... آپ بھی دعا کیجئے اور میری علالت اخبارات پنجاب میں چھپوا دیجئے کہ سب احباب کو خبر ہوجائے - کلکتہ کے اخباروں میں تو چھپ گئی - راجہ صاحب آپ اپنی طرف سے ایک خط منی بائی حجاب کو ضرور بھیجئے بدیں مضمون .... تعجب ہے کہ باوصف اس علالتِ شدیدہ کہ جس کا صدمہ تمام ہندوستان کو ہے اور خلقِ خدا دست بدعا ہے آپ رامپور نہ جائیں - اگر ہزار روپئے کی نوکر ہوتیں تو اس وقت میں نوکری چھوڑ دیتیں۔"

داغ نے ۵ ستمبر ۱۸۹۸ء کے ایک غیر مطبوعہ خط میں حمیدن بائی نقاب کو حجاب کے متعلق لکھا ہے :-

"کاش اس قدر میں دیدارِ حق کا مشتاق ہوتا! ..... میں نے پہلے سنا تھا کہ قرآن اٹھ گئے ہیں - عہد و پیمان ہوگئے ہیں مجھ سے نہ ملنے کے - اب یقین ہوا ..... بائی جی کو لگا لینا آتا ہے - لگا رکھنا نہیں آتا۔"

کئی مہینے کے بعد کامیابی کی ایک صورت نظر آئی - داغ ۱۸ نومبر ۱۸۹۸ء کے ایک غیر مطبوعہ خط میں منی بائی حجاب کو لکھتے ہیں :

"لو مبارک ہو - واہ! میں بھی کیا خود غرض ہوں - اپنا مطلب نکلے اور دوسرے کو مبارکباد دی - جی تو چاہتا تھا نہ لکھوں کہ سناٹا گزر جائے گا - خدا جانے کون کون اس رشک سے مرجائے گا مگر کیا کروں - بغیر لکھے بھی تو بن نہیں آتی - وہ آرزو کہ سوا تین برس سے دل میں تھی الحمد للہ کہ اب برآئی - بگاڑ کر جانا تمھارے پاس دشوار نہ تھا - مگر نہ یہ میری آدمیت، نہ تمھاری اجازت - حضور پُرنور دام اقبالہ نے جان لیا کہ اس کی جان مُفت میں جاتی رہے گی - پرسوں بطیبِ خاطر فرمایا کہ تم جلد کلکتہ چلے جاؤ بغیر وہاں کے جائے اور ہوا کھائے سنبھلتے نظر نہیں آتے - وہاں جاکر دو تین مہینے میں آسکتے ہو، عدم کو جاؤگے تو میں کہاں پاؤں گا۔"

لیکن سید رفیق مارہروی کا بیان ہے کہ حیدر آباد کے قیام سے پہلے داغ کو حجاب کے حصول میں کامیابی نہیں ہوئی - انھوں نے مولوی مختار عالم کے روزنامچہ سے ایک خط بھی نقل کیا ہے جو حجاب کے نام ہے اور ۱۰ دسمبر ۱۹۰۱ء کا لکھا ہوا ہے :-

"دشمنِ جانی ..... تم لکھتی ہو کہ مجھے بھول جاؤ اور اگر نہ بھولو تو بدل جاؤ - یہ کرو گے جب ہی تمھارے پاس آؤں گی ..... اچھا تم یہاں آجاؤ - پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو بھولنے کی کوشش کریں گے۔"

بالآخر ۱۹ جنوری ۱۹۰۲ء کو منی بائی حجاب حیدر آباد پہونچ گئیں لیکن اب وہ زاہد مناجاتی بن گئی تھیں - داغ نے قاضی عبدالحمید کو لکھا ہے :-

"بی فرشتن مع بابو خدا بخش کے پہونچیں - میرا مکان بھی آسمان ہے کہ فرشتوں کا نزول ہے - میں رند خراباتی اور وہ زاہد مناجاتی - دیکھئے کیا ہو - ابھی مجھے اس پردے میں یہ نہیں معلوم کہ وہی ہیں یا کوئی اور۔"

مولانا احسن مارہروی نے داغ کی رندی و ہوسناکی کی وجہ جواز ڈھونڈی ہے اور اس کا مقابلہ علامہ شبلی کی زندگی سے کرکے تحریر فرمایا ہے :-

"مرزا داغ ہوں یا مولانا شبلی - فطری اور پیدایشی جذبات و احساسات کے حمام میں سب ہی عریاں نظر آئیں گے - یہ بات دوسری ہے کہ کسی کا تہ بند کھاروے کا ہو اور کسی کی لنگی تنزیب کی۔"

احسن مرحوم نے جو طریقہ اس معاملہ پر پردہ ڈالنے کا اختیار کیا ہے، وہ بدیہی طور پر اتنا قابلِ اعتراض اور غلط ہے کہ ہم

اس سے بحث کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن اگر اس طرح شبلی کی برائی ثابت بھی ہوجائے تو بھی اس سے داغ کی اچھائی لازم نہیں آتی۔
داغ کے رنگِ تغزل سے ادبستانِ شعر و سخن کا بچہ بچہ واقف ہے لیکن نثر میں بجز خطوط کے ان کی اور کوئی یادگار نہیں ہے ان کے مکاتیب کی حیثیت، ایک بڑے شاعر کی یادگار اور باقیات کی ہے۔ کہیں کہیں داغ کی شوخی و شگفتگی، رندی و شاہد بازی، ادبی آگہی و گرویدگی، کے نقوش بھی ملجاتے ہیں، جن سے داغ کی زندگی کی ایک مکمل تصویر طیار کی جا سکتی ہے لیکن بذاتِ خود یہ خطوط اعلیٰ پایہ کے نہیں ہیں۔ ان کو صرف اس وجہ سے اہمیت حاصل ہے کہ وہ مرزا داغ کے نام سے منسوب ہیں۔

داغ کی یہ عادت تھی کہ وہ حضور نظام اور امرائے عظام کے علاوہ زیادہ تر خطوط کسی حاضر باش سے لکھوا دیا کرتے تھے۔ اسی لئے ان کے خطوں میں بے ربطی اور سہوی اور املائی غلطیاں ملتی ہیں۔ اکثر مراسلے جلوت میں لکھوائے ہیں۔ مرزا صاحب بولتے جاتے تھے اور لکھنے والا لکھتا جاتا تھا اور اس حالت میں اور اور باتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ اسی لئے ان مراسلوں میں آبداری اور رنگینی جیسی داغ کے خطوں میں ہونے کی توقع ہوتی ہے وہ تقریباً مفقود ہے۔ تاہم اس آئینے میں ان کے سوانح اور سیرت کے تمام خط و خال نظر آسکتے ہیں۔ یہ مکاتیب گویا مکمل دستاویزیں ہیں جن سے ہم کو ان کے مذاق و کردار، میلان و رجحان، عادات و خصائل اور حیات و جذبات کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ ہم نے اُن کے صرف چند غیر مطبوعہ خطوں پر اکتفا کیا ہے جو نقاب اور حجاب سے متعلق ہیں اور نسبتاً سب سے زیادہ دلکش ہیں۔ لیکن تلاش سے ان کے اور خطوط بھی ملیں گے جن کو جمع کرنا اور شائع کرنا یقیناً ادب کی خدمت ہے۔[۱]

[۱] اس مضمون کی طیاری میں مجھے محترم مولانا امتیاز علی خاں عرشی سے بہت مدد ملی ہے اور میں اُن کی اس عنایت کا ازبس ممنون ہوں۔

نواب یوسف علی خاں ناظم کی ایک مشہور غزل

اور

داغ کی تضمین

مدعی کون وہاں دخل کسی کا کیسا اپنے سائے سے بھی بچتا تھا وہ کیسا کیسا
دیکھتے دیکھتے پلٹا ہے زمانا کیسا، جلد جم جاتا ہے ہر شخص کا نقشا کیسا
سادہ دل ہے وہ بت آئینہ سیما کیسا

لوگ ہمسائے کے ہیں جمع پریشاں خاطر لاش پر روتے ہیں ہوتا نہیں قاتل ظاہر
اُن کی سنیئے تو حقیقت ہے نہایت نادر کرکے خون ایک کا جا بیٹھے ہیں گھر میں اور پھر
پوچھتے ہیں کہ مرے در پہ ہے غوغا کیسا

جو دکھاتا ہے دکھا کل کے عوض آج شتاب ہیں نہیں وہ کہ جو موسیٰ کی طرح لاؤں نہ تاب
مجھ سے دیدار طلب ہوں گے جہاں میں کمیاب ذوقِ دیدار میں بیخود ہوں نہ کر مجھ سے حجاب
اُٹھ گیا بیچ سے جب میں ہی تو پردہ کیسا

داغ اور ان کے معاصرین

(پروفیسر نفیس سندیلوی)

داغ کے معاصرین میں، منشی محمد اسماعیل منیر شکوہ آبادی، ملک الشعراء مفتی امیر احمد امیر مینائی، منشی امیراللہ تسلیم اور حکیم ضامن علی جلال خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر اور ہمہ گیر شہرت کے مالک ہیں اس کے علاوہ ظہیر دہلوی، مرزا حیا دہلوی اور راسخ دہلوی بھی ان کے معاصرین میں استادانہ درجہ رکھتے ہیں لیکن ان حضرات کو بہت زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

سید ظہیرالدین حسن ظہیر زیادہ تر الور، جے پور اور ٹونک وغیرہ ریاستوں میں رہے آخر زمانے میں حیدر آباد چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ ان کی شہرت اسی نواح میں زیادہ ہوئی ان کے تلامذہ کی تعداد بھی ان ریاستوں میں زیادہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا کلام دہلی کی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے، پختگی، صفائی، متانت و سنجیدگی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں سوز و گداز بھی پایا جاتا ہے اور مومن خاں کا رنگ جھلکتا ہے اور خود بھی فرماتے ہیں :۔

طرز مومن سے نہ آگاہ تھے جب تک کہ ظہیر
سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

ان کے دو دیوان شائع ہو چکے ہیں اور تیسرا دیوان ان کے حقیقی نواسے شوق دہلوی کے پاس محفوظ تھا جو شرمندۂ طباعت نہ ہوا۔ ان کے تلامذہ میں ثاقب بدایونی مشہور بہ "پہلوانِ سخن" زیادہ مشہور ہوئے۔

ظہیر کے چھوٹے بھائی سید شجاع الدین حسن "انور" بھی داغ کے معاصر شاعر خوش فکر و نغزگو تھے، غدر کے بعد جے پور چلے گئے تھے اور وہیں ۳۸ سال کی عمر میں انتقال ہوا ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے :۔

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینا پونچھئے اپنی جبیں سے

میرزا محمد تقی بیگ مائل دہلوی ان کے مشہور شاگرد اور نہایت خوش فکر و مشاق استاد تھے جن کے ارشدِ تلامذہ میں مولانا محمد منظور احمد کوثر سندیلوی نبیرۂ ملا حمداللہ شارحِ مسلم سندیلوی مقیم جے پور اور منشی چند بہاری لال ماتھر صبا جے پوری ہیں۔

مرزا رحیم الدین حیا، دلی کے شہزادے نہایت خوش فکر اور صاحبِ فن شاعر تھے ان کو زیادہ شہرت نہیں ہوئی انکا ایک قلمی دیوان میری نظر سے گزرا ہے ان کی یہ غزل بہت مشہور ہے :۔

دی ہے کس بت کی محبت یہ خدایا مجھکو وہ مجھے دل سے بھلا دے میں بھلا بھی نہ سکوں

عبدالرحمٰن راسخ دہلوی کی شہرت و مقبولیت دہلی اور نواحِ دہلی تک محدود رہی، کہنہ مشق استاد تھے ان کے تلامذہ میں قمر بدایونی زیادہ مشہور ہوئے۔

منیر، امیر مینائی، جلال اور تسلیم کو خاص طور سے اس لئے داغ کے معاصرین میں خیال کیا جاتا ہے کہ مدت تک یہ

حضرات رام پور میں ہم صحبت رہے قبل اس کے کہ میں داغ کے کلام کے ساتھ ان کا کلام پیش کردں یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مختصر حالاتِ زندگی سے بھی قارئین کو متعارف کراؤں ۔ ذیل میں ان کی پیدائش اور وفات اور عمر کا ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے جس سے ایک ہی نظر میں یہ اندازہ ہوجائے گا کہ کس نے کتنی عمر پائی اور ایک دوسرے کی عمر میں کتنا فرق تھا

	نام شاعر	پیدائش	وفات	عمر
۱ -	منیر شکوہ آبادی	۱۲۲۳ھ	۱۲۹۷ھ	۷۴ سال
۲ -	تسلیم لکھنوی	۱۲۳۵ھ	۱۳۲۹ھ	۹۴ سال
۳ -	امیر مینائی	۱۲۴۴ھ	۱۳۱۸ھ	۷۴ سال
۴ -	داغ دہلوی	۱۲۴۶ھ	۱۳۲۲ھ	۷۶ سال
۵ -	جلال لکھنوی	۱۲۵۰ھ	۱۳۲۴ھ	۷۴ سال

۱ - **منیر شکوہ آبادی :-** محمد اسماعیل نام منیر تخلص، شکوہ آباد ضلع مین پوری کے رہنے والے سید احمد حسین شاد کے صاحبزادے تھے ۔ عنفوانِ جوانی میں شاعری کا شوق پیدا ہوا، ابتدا میں شیخ ناسخ سے اصلاح لی پھر ان ہی کے ایما سے میر علی اوسط رشک کو اپنا کلام دکھانے لگے ۔ مرثیہ گوئی میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے ۔ "حیات دبیر" میں ان کے حالات تفصیل سے ملتے نیز انھوں نے خود بھی اپنے حالات لکھے ہیں ۔ ابتدا میں لکھنؤ، مرشد آباد، فرخ آباد میں قیام رہا اس کے بعد نواب علی بہادر رئیس باندہ نے ان کو بلالیا اور اپنے کلام کی اصلاح ان کے سپرد کی اُسی زمانے میں کسی قتل کے مقدمہ میں قید ہوکر کالے پانی بھیج دئے گئے اور چند سال بے گناہ کالے پانی میں رہے اور طرح طرح کے مصائب و آلام برداشت کئے سب سے زیادہ تکلیف افیون کی تھی اس لئے کہ وہ افیون کھاتے تھے انھوں نے اپنے یہ واقعات نظم بھی کئے ہیں ۔ اس زمانہ میں ان کے سرپرست اور تلامذہ نے ان کو بالکل فراموش کردیا ان کی بے مروتی و کج خُلقی کی انھوں نے بہت شکایت کی ہے ۔ چند سال کے بعد جب وہاں سے آئے تو نواب کلب علی خاں نے جو ان کے بڑے قدر داں تھے رام پور بلاکر رکھا اور آخر وقت تک وہیں رہے ان کا کلیات "ثمرِ ہند" کے نام سے طبع ہوچکا ہے جس میں ان کے تین دیوان ۱ - منتخب العالم (۱۲۶۳ھ) - ۲ - تنویر الاشعار (۱۲۶۹ھ) - ۳ - نظم منور (۱۲۸۲ھ) ایک مثنوی "معراج المضامین" شامل ہے ۔

منیر کو تمام اصنافِ سخن پر قدرتِ کامل حاصل تھی بہت پرگو تھے ؛ دیوان میں طویل غزلیں پائی جاتی ہیں جو ۷۰، ۷۵ اور اس سے بھی زاید اشعار پر مشتمل ہیں ۔ کلام میں دور از کار تشبیہات و استعارات اور رعایت لفظی کی وہ بھرمار ہے کہ خدا کی پناہ ۔ تمام کلام بے مزہ ہے اور ابتذال سے گزر گیا ہے اور بعض بعض اشعار نہایت عریاں اور فحش ہیں منیر بہت صابر و شاکر اور مصائب کا مقابلہ کرنے والے شخص تھے ۔

ان کے تلامذہ میں، مرزا عاشق حسین بزم اکبر آبادی جو ان کے نواسے بھی ہیں اور شہیر مچھلی شہری بہت مشہور ہیں ۔

۲ - **تسلیم لکھنوی :-** احمد حسین نام امیر اللہ عرف اور تسلیم تخلص تھا، مولوی عبدالصمد انصاری کے بیٹے موضع منگلسی نواحِ فیض میں ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے ۔ فارسی تعلیم اپنے والد ماجد سے اور عربی تعلیم اپنے بھائی مولوی عبداللطیف سے حاصل کی ۔ فن خوش نویسی منشی عبدالحی سندیلوی سے حاصل کیا ۔ عرصے تک نول کشور پریس لکھنؤ میں ملازم رہے ۔ شاعری کا شوق ہوا تو نواب اصغر علی خاں نسیم دہلوی شاگردِ مومن خاں کے شاگرد ہوئے ۔ نسیم کا یہ شعر بہت مشہور ہے :-

نسیم دہلوی ہم موجدِ بابِ فصاحت ہیں   کوئی اُردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

مطبع نول کشور میں ملازم تھے کہ نواب کلب علی خاں نے تار بھیج کر از راہِ قدر دانی رام پور یاد فرمایا، تیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر فرمائی اور دو سو روپے عید کے موقع پر ملتے رہے۔ مطبع سرکاری آپ کے سپرد ہوگیا پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوگئے اور تنخواہ میں بیس روپے کا اور اضافہ ہوگیا۔

نواب صاحب نے بڑی عزت افزائی فرمائی ہر قسم کا عیش میسر تھا۔ خرچ زیادہ تھا ہر سال کئی سو روپے کے مقروض ہوجاتے۔ نواب صاحب کو خبر ہوتی اظہار افسوس کرتے اور قرض ادا کر دیتے۔ نواب جب انگلستان کے سفر سے واپس ہوئے تو آپ نے سفرنامہ نظم کرکے پیش کیا اور چالیس روپے پنشن مقرر ہوگئی۔ لکھنؤ چلے گئے۔ جب نواب حامد علی خاں سریر آرائے سلطنت ہوئے تو دوا دا جان کے وقت کا شاعر سمجھ کر یاد فرمایا۔ ہوم سکریٹری سے پوچھا ان کی پنشن کیا معنی یہ کوئی سپاہی ہیں بندوق نہیں چلا سکتے ہیں یہ تو شاعر ہیں۔ آخر کار ۲۹ مئی ۱۹۱۰ء کو ۵ بجے شام کو انتقال فرمایا۔

مولانا اطہر ہاپوڑی جن کو امیر و جلال و تسلیم کی ہم نشینی و صحبت کا فخر حاصل ہے فرماتے ہیں "میں حضرت تسلیم کی خدمت میں ۱۰، ۱۲ سال حاضر رہا وہ مطبع سرکاری کی پشت پر ایک مکان میں رہتے تھے نہایت نیک طینت، خوش مزاج، با وضع بزرگ تھے ثقل سماعت کے باعث بہت اونچا سنتے تھے۔

تلامذہ — ان کے تلامذہ میں مولانا حسرت موہانی، عرش گیاوی، حاجی محمد اسماعیل صبر اور مولانا اصغر گونڈوی بہت مشہور ہوئے، کلام میں عجب کیف و لطافت اور زبان میں ایک شیرینی و حلاوت پائی جاتی ہے۔

ان کے تین دیوان نظم ارجمند، ۲۔ نظم دل افروز ۳۔ دفتر خیال اور متعدد مثنویاں ہیں۔

۳۔ **مفتی منشی امیر احمد امیر مینائی**:۔ امیر احمد نام امیر تخلص، مولوی کرم احمد کے صاحبزادے اور لکھنؤ کے باشندے تھے، سلسلۂ نصب حضرت مخدوم شاہ مینا سے ملتا ہے۔ آپ نے درسی کتب مفتی سعد اللہ مرحوم سے اور تکمیل علم علماء فرنگی محل سے کی۔ شعر و شاعری کا شوق ہوا امیر مظفر علی خاں اسیر لکھنوی کے شاگرد ہوگئے۔ بعض فنون، طب، جفر اور نجوم وغیرہ سے بھی واقف تھے۔ سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں ان کو حضرت امیر شاہ سے بیعت و خلافت حاصل تھی ۱۲۶۹ھ میں واجد علی شاہ اودھ کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور آپ نے دو کتابیں، ارشاد السلطان اور ہدایۃ السلطان ان کے سامنے پیش کیں اور خلعتِ فاخرہ سے سرفراز ہوئے۔ غدر کے بعد انگریزی ملازمت کا ارادہ کیا پھر بعد میں خود ہی ترک فرما دیا۔ ۱۲۷۴ھ میں نواب یوسف علی خاں ناظم والی رام پور نے ان کی شہرت اور قابلیت کا غلغلہ سن کر رام پور یاد فرمایا اور حاکم دیوانی مقرر کر دیا اور آخر میں اسیر کے انتقال کے بعد ان سے مشورۂ سخن بھی کرنے لگے۔ نواب یوسف علی خاں کے بعد جب نواب کلب علی خاں تخت نشین ہوئے تو ان کی فیاضی اور قدر دانی نے تمام مشہور شعراء، علماء، اور اطباء کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ نواب کلب علی خاں نواب تخلص کرتے اور منشی صاحب سے مشورۂ سخن کرتے۔ ان کی یہ غزل مشہور ہے اور خوب ہے:۔

میں نے کہا کہ دعوئے الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

رام پور میں تقریباً ۴۳ سال قیام رہا لیکن نواب کلب علی خاں کے انتقال اور جنرل عظیم الدین خاں کے قتل کے بعد انھیں رام پور چھوڑنا پڑا، جنرل عظیم الدین خاں ان کے خاص عقیدت مند اور پرستارانِ کمال میں سے تھے اور انھوں نے امیر اللغات کی سرپرستی قبول فرمائی تھی۔ اس کے بعد داغ کے اصرار پر آغاز ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد تشریف لے گئے اور وہیں چند ماہ علیل رہ کر مرضِ ذیابیطس میں ۱۳۱۸ھ میں عالمِ بقا کی طرف رحلت فرمائی۔

منشی صاحب مرحوم کی وضع عالمانہ و درویشانہ تھی، نہایت نیک طبع، مہذب و متین، فرشتہ خصلت پابندِ صوم و صلوٰۃ

اور عالمِ باعمل تھے۔ کبھی آج تک کسی کی غیبت نہیں کی، احباب سے انکساری سے ملتے اور شاگردوں سے نہایت شفقت سے پیش آتے۔ مولانا اظہر فرماتے ہیں کہ "میں منشی صاحب کی خدمتِ اقدس میں اکثر آتا جاتا، نہایت منکسر المزاج، متواضع، متین و سنجیدہ بزرگ تھے، شام کو ان کے مکان پر احباب اور تلامذہ کا مجمع رہتا، منشی صاحب پیرانہ سالی کے سبب چھپر کھٹ پر تشریف رکھتے اور ان کے چاروں، مونڈھے اور کرسیاں بچھی ہوتیں جن پر ہر شخص قرینے سے بیٹھا ہوتا۔ چھپر کھٹ کے قریب ایک چھوٹی میز اور کرسی بچھی ہوتی جس پر حافظ جلیل حسن جلیل مان پوری بیٹھتے اور میز پر غزلیات کا بستہ ہوتا جو اصلاح کے لئے آتیں، وہ غزل پڑھتے جاتے اور منشی صاحب سنتے جاتے اور اصلاح دیتے، مشکل سے کسی غزل میں ۵، ۶ منٹ صرف ہوتے، اصلاح بہت عمدہ اور جلد دیتے۔"

تلامذہ :- ان کے تلامذہ کی تعداد بے شمار ہے جو بہت زیادہ مشہور ہیں ان میں ان کے دو صاحبزادے منشی محمد احمد صریر مینائی منشی لطیف، محمد اختر مینائی اور منشی سید ریاض احمد ریاض خیرآبادی، فصاحت جنگ جلیل مان پوری، سید محمد عسکری وسیم، خیرآبادی، حکیم افتخار حسین جگر بسوانی، مولوی محمد محسن کاکوروی، بینظیر شاہ، راز رام پوری، سید زاہد حسین زاہد سہارنپوری، حافظ محمد علی حفیظ جون پوری، پنڈت رتن ناتھ سرشار، حکیم عابد علی کوثر خیرآبادی، احسان اللہ خاں ثاقب بدایونی، نواب سلیمان خاں اسد، حکیم ضمیر حسن خاں دل شاہجہاں پوری کثیر التلامذہ اور مشہور شاعر اور صاحبِ دیوان مضطر خیرآبادی ثم سندیلوی نے بھی چند غزلیں ان کو دکھائیں۔

تصانیف :- دو عاشقانہ دیوان، مراۃ الغیب اور صنم خانۂ عشق اور نعت میں محامدِ خاتم النبین اور نثر میں سرمۂ بصیرت۔ بہار ہند انتخاب یادگار۔ نورِ تجلی اور ابرِ کرم مثنویاں ہیں، اس کے علاوہ اور کئی ایک تصانیف ہیں۔
امیر اللغات، جلد اول و دوم۔ ان کا مشہور کارنامہ ہے۔
کلام میں، مضمون آفرینی، نزاکت، صفائی اور شاعرانہ لطافت پائی جاتی ہے۔

۴۔ فصیح الملک، داغ کی سوانح حیات کی ضرورت اس لئے نہیں سمجھتا ہوں کہ ان کے حالات آپ اسی شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں گے

۵۔ **حکیم ضامن علی جلال لکھنوی :-** حکیم ضامن علی جلال، حکیم اصغر علی کے صاحبزادے اور خاص لکھنؤ کے باشندے تھے۔ حکیم صاحب کے والد نواب یوسف علی خاں ناظم کے یہاں داستان گوئی کے عہدہ پر ممتاز تھے اور دادا حکیم سید حسن خاں بزمرۂ اطبار شاہی شفاخانہ لکھنؤ ملازم تھے۔ مدرسۂ شاہی میں تعلیم حاصل کی۔ عربی میں میبذی اور فارسی میں متعدد کتابیں پڑھیں۔ ابتدائے سنِ شعور سے شعر کا شوق پیدا ہوا، ابتداً امیر علی خاں ہلال تلمیذ میر علی اوسط رشک کے شاگرد ہوئے، اس کے بعد رشک کو اپنا کلام دکھایا جب رشک کربلائے معلیٰ گئے تو مرزا محمد رضا برق سے اصلاح لینے لگے۔ جب غدر ہوا تو حکیم صاحب رام پور چلے گئے اور نواب یوسف علی خاں کی سرکار میں ملازم ہو گئے جب ان کا انتقال ہوگیا تو کلب علی خاں جن کو اردو زبان کی خدمت ملحوظ تھی اچھے اچھے اردو شعراء کو جمع کیا چنانچہ ان میں حکیم جلال بھی تھے ان کی رام پور میں بہت قدر ہوئی۔ جب نواب صاحب کا انتقال ہوگیا تو وہ نواب منگرول کے دربار سے وابستہ ہوگئے آخر زمانہ لکھنؤ میں بہت پریشانی میں بسر ہوا۔ حکیم صاحب کی دو بیویاں تھیں انھوں نے اور جان ضیق میں کر دی تھی۔ حکیم صاحب کو اپنے فن او زبان اور تحقیق پر بڑا ناز تھا اور اسی وجہ سے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ نواب صاحب کے دربار میں جب تما شعراء جمع ہوتے اور الفاظ کی تحقیق پر بحث ہوتی تو حکیم جلال جس لفظ پر اڑ جاتے اس سے ہرگز نہ ہٹتے، نواب صاحب جب کسی لفظ کے متعلق غیاث کا حوالہ دیتے تو حکیم صاحب فرماتے "ملا غیاث کیا جانے" منشی امیر اللہ تسلیم کے حوالہ سے مولانا اظہر ہاپوڑی ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ کسی لفظ کے متعلق بحث چھڑی ہوئی تھی، نواب صاحب نے حکیم

سے فرمایا کہ ملا غیاث تو یوں فرماتے ہیں، حکیم صاحب نے کہا کہ "غیاث اُلّو کا پٹھا کیا جانے" نواب صاحب یہ سنتے ہی آگ بگولا ہوگئے اس لئے کہ ملا غیاث نے نواب صاحب کو پڑھایا تھا۔ انھوں نے ایک چوب دار کو اشارہ کردیا اور خود غصہ میں اندر تشریف لے گئے پھر جو ناگوار واقعہ پیش آیا وہ نا قابلِ بیان ہے۔ امیر، داغ و تسلیم وغیرہ سب موجود تھے ایک شور و غل بلند ہوا۔ نواب صاحب باہر آگئے اور بے خبر بن کر اس واقعہ پر بہت افسوس کیا اور چوب دار کو بہت سخت و سست کہا اور سزا دی۔

حکیم صاحب کہا کرتے کہ "امیر مینائی امیٹھی کے رہنے والے زبان کیا جانیں اور تسلیم فیض آباد میں پیدا ہوئے، میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں، زبان میری ہے، داغ کو فن و تحقیق سے کیا واسطہ وہ سطحی قابلیت کے آدمی ہیں" چنانچہ مولوی ظہیرالدین احسن شوق نیموی شاگردِ تسلیم نے ان کے غرور کو خاک میں ملانے کے لئے ایک رسالہ اصلاحِ شوق مع ایضاح طیار کیا جس میں ان کی غلطیوں کو منظرِ عام پر لاکر ان کی اچھی طرح خبر لی، یہ رسالہ حکیم صاحب ہی کے زمانہ میں چھپ گیا تھا دوسرا اڈیشن مولانا حسرت موہانی نے شایع کرایا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عروض اور فن تحقیق کے امام تھے۔ مولوی امیراللہ تسلیم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے غدر کے زمانہ میں مسجد میں بیٹھ کر عروض یاد کیا مگر یاد نہیں ہوا، اس کو ہم میں جلال سے بہتر کوئی نہیں جانتا ہے جلال ہمچو منِ دیگرے نیست، قسم کے آدمی تھے مگر زبان اور فن پر ان کا بہت بڑا احسان ہے۔

تصانیف :- ان کے چار دیوان ۱- شاہد شوخ طبع، ۲- کرشمہ نگاہ سخن معروف بہ زبان حال، ۳- مضمون ہائے دلکش خیالات بے مثال، ۴- نظم نگاریں حسنِ مقال شایع ہوچکے ہیں۔

نثر اور فن پر ۱- سرمایۂ زبانِ اُردو، ۲- قواعد المنتخب، ۳- مفیدالشعراء، ۴- دستور الفصحا وغیرہ موجود ہیں۔

۱۹۰۹ء میں بعارضہ تنفس انتقال ہوا۔

تلامذہ میں خود ان کے صاحبزادے حکیم مہدی حسن کمال، میر ذاکر حسین یاس لکھنوی اور ان کے صاحبزادے انور حسین آرزو لکھنوی۔ سردار اودہم سنگھ۔ احسان علی خاں احسان شاہجہاں پوری بہت مشہور ہوئے۔

اب مجموعی طور پر ان شعراء کی ہر صنف سخن پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

نعت :- بجز امیر مینائی کے اس صنفِ سخن کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا ان کا ایک مستقل دیوان "محامد خاتم النبین" نعت میں موجود ہے لیکن وہی لکھنوی آرٹ کا نمونہ ہے۔

قصیدہ :- ان تمام حضرات نے قصیدے کہے ہیں۔ داغ اور جلال کے قصیدوں میں وہ ادبی شان اور زور نہیں جو ہونا چاہئے، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صرف خوشنودی مزاج کے لئے کہے گئے ہیں۔

امیر مینائی اور تسلیم کے قصیدوں میں بلاغت، مضمون آرائی اور رنگینی ضرور ہے مگر وہ شکوہ الفاظ اور زور جو قصیدہ کی جان ہے مطلق نہیں بلکہ غزل کا رنگ غالب ہے۔

منیر نے ان میں سب سے زیادہ قصیدے کہے ہیں اور ان کے قصیدوں میں شکوہِ الفاظ، طمطراق اور جملہ ادبی شان پائی جاتی ہے۔ مگر رعایت لفظی، تشبیہات اور استعارات کی بھرمار ہے، بہر حال ذوق کے بعد ان کے قصاید قابلِ قدر ہیں اور اس صنف میں ان کے معاصرین میں ان کا درجہ بلند ہے۔

مرثیہ :- داغ، امیر، جلال اور تسلیم نے مرثیے نہیں کہے۔ منیر نے کچھ مراثی کہے ہیں وہ چنداں قابلِ ذکر نہیں۔

تاریخ و قطعات :- جلال نے کثرت سے تاریخ و قطعات کہے ہیں ان کو اس میں بڑا ملکہ تھا کیوں نہ ہوتا اس لئے کہ انکے استاد میر رشک کو اس صنعت پر کمال اور یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ باقی حضرات نے جو تاریخیں لکھی ہیں وہ صرف فرمایشی ہیں

مثنوی :- داغ نے صرف ایک مثنوی "فریادِ داغ" لکھی ہے جس میں اپنے عشق کا واقعہ نظم کیا ہے۔ یہ مثنوی ۸ سو سے کچھ زائد اشعار پر مشتمل ہے۔ چونکہ اس واقعہ کا تعلق خود ان ہی کی ذات سے ہے اس لئے اس میں زیادہ سوز و گداز ہونا چاہئے مگر کوئی تاثیر نہیں ہے بلکہ سادگی و صفائی ضرور ہے جو ان کا فطری رنگ ہے اس کے بعض بعض اشعار تبذل بھی ہیں۔

امیر مینائی نے نورِ تجلی اور ابرِ کرم دو مثنویاں لکھی ہیں جو اخلاقی حکایات و روایات پر مشتمل ہیں اور ان میں کوئی خاص بات نہیں، جلال نے کوئی مثنوی نہیں لکھی، منیر نے ایک مثنوی "معراج المضامین" ضرور لکھی ہے مگر قابلِ ذکر نہیں۔

تسلیم کو مثنوی پر خدا داد قدرت حاصل تھی اور وہ اس صنفِ سخن پر اپنے معاصرین پر فضیلت و برتر رکھتے ہیں انھوں نے متعدد مثنویاں لکھی ہیں، جن میں زبان کی خوبی اور دلآویزی اور کیف و اثر پایا جاتا ہے۔ نالۂ تسلیم اور شامِ غریباں انکے پہلے دیوان کے ساتھ طبع ہو چکی ہیں، اس کے علاوہ مجِ خزاں، دل و جاں، نغمۂ بلبل، شوکت شاہ جہانی وغیرہ انکی قابلِ قدر مثنویاں ہیں۔

غزل :- غزل ان شعراء کی خاص اور محبوب صنفِ سخن رہی ہے جس میں ان حضرات نے اپنی عمریں گزار دیں اور اپنی قوتِ فکر اور طبع رسا سے اس صنف کو ترقی ہی نہیں دی بلکہ اس صنف کو معراجِ کمال پر پہونچا دیا۔

۱- **اعلیٰ جذبات و خیالات :-** امیر مینائی اور تسلیم کے یہاں بہ نسبت داغ، جلال اور منیر کے زیادہ اعلیٰ خیالات ملتے ہیں۔

۲- **سوز و گداز :-** سوز و گداز نہ داغ کے یہاں ہے نہ امیر کے یہاں لیکن خال خال ایک آدھ شعر مل جاتا ہے۔ تسلیم کے یہاں کچھ کیفیتیں ملتی ہیں وہ شاید مومن کے سلسلہ کا اثر ہے۔
جلال اور منیر کے کلام میں مطلق سوز و گداز نہیں شاید یہ پُرگوئی اور فن کا سبب ہے۔

۳- **روز مرہ و محاورات و لطفِ زبان :-** اس میں داغ کو سب پر فوقیت و برتری حاصل ہے اور کوئی ان کا ہمسر نہیں۔
جلال بھی محاورہ کو بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں مگر داغ کے برابر نہیں۔

۴- **لوچ اور شیرینیِ زبان :-** سب سے زیادہ امیر و تسلیم کے یہاں ہے۔

۵- **نزاکت اور دلآویزی :-** اس میں امیر کو سب پر فضیلت حاصل ہے بعد کو تسلیم کا نمبر ہے۔

۶- **سادگی و صفائی :-** اس میں داغ سب سے آگے ہیں۔

۷- **بندش کی چستی :-** سب سے زیادہ جلال کے یہاں ہے اور یہ چیز اُن کو اپنے معاصرین میں ممتاز کرتی ہے۔

۸- **فارسی ترکیب و الفاظ :-** داغ فارسی تراکیب سے بالکل کام نہیں لیتے ہیں اس کے بعد امیر کا نمبر ہے وہ بھی بہت کم فارسی تراکیب کا استعمال کرتے ہیں، جلال اور تسلیم فارسی تراکیب اور الفاظ سے ضرور کام لیتے ہیں اور بڑے سلیقے سے تسلیم نے جہاں فارسی ترکیب اور الفاظ سے کام لیا ہے وہاں بڑی خوبی کے ساتھ کام لیا ہے کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے مثلاً

۱- کام اپنا کر چکی بیماریِ عشقِ بتاں ۔۔۔ میں فریبِ نسخۂ تاثیرِ درماں ہی رہا

۲- اللہ رے اضطرابِ تمنائے دیدیار ۔۔۔ فرصت میں اک نگاہ کی سو بار دیکھنا

منیر شکوہ آبادی بھی کثرت سے فارسی تراکیب و الفاظ استعمال کرتے ہیں مگر بھونڈے پن سے۔

۹- **متانت و سنجیدگی :-** داغ کے یہاں متانت و سنجیدگی اگرچہ بہت کم ہے مگر لطفِ زبان اور اسلوبِ بیان اس کو کسی حد تک سنبھالے ہوئے ہے۔

انفرادی خصوصیت :- داغ فطری شاعر تھے وہ غزل کیلئے پیدا ہوئے تھے غزل انکے لئے۔ انکی زبان غزل کی جان ہے حُسن و عشق کی چاشنی اور معاملہ بندی کی سرور انگیز کیفیتیں جو اُن کے یہاں ہیں وہ کسی کے یہاں نہیں، سلاست، سادگی، صفائی، بے ساختگی اور شوخی

ان کو جملہ معاصرین میں ممتاز کرتی ہے۔
امیرؔ مینائی، صاحبِ علم و فن، تمام اصنافِ سخن پر قادر اور استاد ہی نہیں بلکہ استادگر تھے۔
تسلیمؔ، مضامین کی دل آویزی اور فارسی تراکیب میں سب سے آگے ہیں۔
جلالؔ، استادِ فن و تحقیق، ماہرِ زبان و محاورات اور زبردست عروضی تھے۔
منیرؔ، ان کو پرگوئی میں کمال حاصل تھا۔

اب حسبِ ذیل ہم طرح کلام سے داغؔ اور ان کے معاصرین کی قوتِ فکر، جدتِ خیال، اسلوبِ بیان اور لطفِ زبان کا اندازہ لگا کے خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کون سا شعر اچھا ہے؟ میں نے صرف وہی اشعار پیش کرنے کی سعی کی جو کسی حد تک متحد المضامین ہیں، ورنہ سیکڑوں اشعار ہم طرح ہیں مگر تخیل کے اعتبار سے الگ الگ ہیں۔

داغؔ :- یاں امتحانِ برقِ تجلی ضرور تھا، کیا میں نہ تھا اس آگ میں جلنے کو طور تھا
امیرؔ :- اے برقِ حسنِ یار! یہ اچھا ظہور تھا دیدار کو کلیم تھے۔ جلنے کو طور تھا
جلالؔ :- میں اک جھلک سے ہوں گا نہ غش وہ کلیم تھے میں اک شرر سے خاک نہ ہوں گا وہ طور تھا

داغؔ :- ہم بوسہ لے کے ان سے عجب چال چل گئے یوں بخشوا لیا کہ یہ پہلا قصور تھا
امیرؔ :- لپٹا میں بوسہ لے کے تو بولے کہ دیکھئے یہ دوسری خطا ہے وہ پہلا قصور تھا
جلالؔ :- رکھا خطائے یار کو پوشیدہ عشق نے تشہیر ہونے کے لئے میرا قصور تھا

داغؔ :- کرنی پڑیں فراق میں بیمار داریاں ہاتھوں میں ساری رات دلِ ناصبور تھا
امیرؔ :- فرقت میں کیوں نہ تھا کسی کروٹ مجھے قرار کیا دونوں پہلوؤں میں دلِ ناصبور تھا
جلالؔ :- ٹالا جہاں کو وعدۂ فردا پہ یار نے مانا نہ ایک جس نے وہ میں ناصبور تھا

داغؔ :- منزل پہ جو پہونچے تو ملے قیس کو لیلیٰ ناقے سے جدا کیا کبھی محمل نہیں ہوتا
امیرؔ :- اڑتا کبھی ہوا سے ہے تو اڑتا ہے ادھر ہی لیلےٰ سے الگ پردۂ محمل نہیں ہوتا
تسلیمؔ :- اے قیس حزیں آہ کے جھونکوں سے اُلٹ دے کچھ بارِ گراں پردۂ محمل نہیں ہوتا
جلالؔ :- اے قیس اٹھے پردۂ غفلت تو ذرا دیکھ ہوتا بھی ہے یا پردۂ محمل نہیں ہوتا

داغؔ :- فرقت میں ہم نے اپنی تسلی کے واسطے رکھا ہے شوخ نام دلِ بے قرار کا
امیرؔ :- آئینہ دیکھتے ہی وہ خود لوٹ ہوگئے آخر پڑا ہے صبر دلِ بے قرار کا
جلالؔ :- قابو سے اپنے ہم تو نکلنے نہ دیں کبھی جب تھامنا بھی آئے دلِ بے قرار کا

داغؔ :- کوئی فتنہ تا قیامت نہ پھر آشکار ہوتا ترے دل پہ کاش ظالم مجھے اختیار ہوتا
امیرؔ :- مرے بس میں یا تو یارب وہ ستم شعار ہوتا یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا

داغؔ :- ترے وعدہ پر ستم گر ابھی اور صبر کرتے اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا
امیرؔ :- میں زباں سے تم کو سچا کہو لاکھ بار کہہ دوں اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا

داغؔ :- کیا سرزمین کوچۂ قاتل ہے فتنہ خیز، اڑنے لگے ہوا کی طرح ہوشِ نقشِ پا
امیرؔ :- اس گرم رو کی شوخیِ رفتار سے امیرؔ اڑتے ہیں رنگِ رخ کی طرح ہوشِ نقشِ پا
منیرؔ :- انداز تیری چال کی ہرگز نہ پا سکا مثلِ غبارِ راہ اڑے ہوشِ نقشِ پا

داغ :- خدا نے بخش دئے حشر میں بہت عاشق — خیالِ یار میں کوئی نہ بے قصور آیا
جلال :- سُنا جو اس نے کہ مرتے ہیں ہم تو خوش ہوکر — وہ بخشوانے کو کیا اپنے سب قصور آیا
تسلیم :- بڑی امید تھی محشر میں سامنا ہوگا — وہاں بھی کام نہ میرے، مرا قصور آیا

داغ :- جاں نثاروں کو نہ دیکھا یہ بہانہ رکھ کر — جان پر کھیلنے والوں کا تماشا کیسا
جلال :- دیکھو ڈر جاؤ گے، دم توڑتے دیکھو نہ مجھے — جان پر کھیلنے والوں کا تماشا کیسا

داغ :- ہم نے ان کے سامنے اول تو خنجر رکھدیا — پھر کلیجہ رکھدیا، دل رکھدیا، سر رکھدیا
امیر :- شوق سے میں نے جو خنجر کے تلے سر رکھدیا — چھیڑنے کو ہاتھ سے قاتل نے خنجر رکھدیا
جلال :- دوڑ کر ہم نے جو ان کے پاؤں پر سر رکھدیا — بولے ٹھکراکر کہاں پھوٹا مقدر رکھدیا

داغ :- اس قدر ناز ہے کیوں آپ کو یکتائی کا — دوسرا نام ہے وہ بھی مری تنہائی کا
امیر :- شوق۔ خلوت میں بھی ہے انجمن آرائی کا — آئینہ خانہ ہے گوشہ مری تنہائی کا
جلال :- جلوہ جب اس کا نہ دیکھا تو دکھایا مجھ کو، — روزِ محشر نے بھی عالم شبِ تنہائی کا
منیر :- بے کسی آپ سے باہر نہیں جانے دیتی — مجھ سے آباد ہے عالم شبِ تنہائی کا

داغ :- چھوٹ کر کنجِ قفس سے بھی یہ کھٹکا نہ گیا — جب صبا آئی تو جانا، وہی صیاد آیا
جلال :- کہتے ہیں مرغِ چمن ہم کو یہی لے نہ اُڑے — شک ہے جھونکے پہ صبا کے بھی کہ صیاد آیا
منیر :- اس چمن میں ہوسِ قید بھی نکلی نہ کبھی — پتے کھڑکے جو مرے خواب میں صیاد آیا

داغ :- دین و دُنیا کے مزے جب تھے کہ دو دل ہوتے — ایک میں کفر مگر ایک میں ایماں ہوتا
امیر :- حلقہ زلف میں وہ رُخ جو جھلک دکھلاتا — جلوہ گر کفر کی آغوش میں ایماں ہوتا

داغ :- حشر کے روز تجھے پاسِ عدالت ہوگا — بخش دیتا جو یہیں جرم۔ تو احساں ہوتا
امیر :- جب وہی حور نہیں خلد میں تو لے داورِ حشر — جھونک دیتا مجھے دوزخ میں تو احساں ہوتا

داغ :- ایک ہی شکوہ میں ساماں، وصل کا برہم ہوا — کیا ہنسی میں رنج پھیلا، کیا خوشی میں غم ہوا
تسلیم :- شب گھٹی ہر بر دارِ عشق محوِ غم ہوا — رُک گئیں آہیں مزاجِ آرزو برہم ہوا

داغ :- بے اثر ہو تو بھی طوفاں ہو، نہیں دریا تو ہو — حسرت اُس آنسو پہ ہے جو قطرۂ شبنم ہوا
جلال :- رات گزری تھی چمن میں صبح ہوتے اُٹھ گیا — آب و دانہ بلبلوں کا قطرۂ شبنم ہوا

داغ :- بنا کس دن تنِ مجنوں میں یہ رشتہ رگِ جاں کا — جنوں تیرے ہی سر سہرا رہا تارِ گریباں کا
امیر :- مرے ہی سامنے دامن اُٹھاکر ناز سے چلنا — مجھی سے پھر گلہ اٹھا مرے چاکِ گریباں کا
جلال :- فراغت اے جنوں سب کو ملی تھی ہم کو دل تنگی — کچھ اس میں سے بھی حصہ ہوگیا اپنے گریباں کا
منیر :- اگر چھوڑ وا دی آزادی علاقہ بند و زنداں کا — الف کھنچوائے ماتھے پر جنوں چاکِ گریباں کا

منیر نے ۳، اشعار کی غزل کہی ہے جس میں صرف گریباں کا قافیہ، عطف و اضافت کے ساتھ نظم کیا ہے، نہیں نکلا چنانچہ فرماتے ہیں :-

منیر افسردہ ہوں پابندیٔ عطف و اضافت کا — نہیں تو لطف دکھلاتا مضامینِ گریباں کا

داغ :- اس بزم میں شریک تو جایا نہ جائے گا — میں جاؤں گا اگر مرا سایا نہ جائے گا

امیر :- گھر میں تمھارے غیر سے جایا نہ جائے گا — آغوشِ نقد میں کبھی سایا نہ جائے گا
داغ :- دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں آگیا یقیں، — تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا
امیر :- ملاؤں میں اس سے دل میں کدورت محال ہے — یہ لعل خاک میں تو ملایا نہ جائے گا
داغ :- کیا ذوق ہے کیا شوق ہے، سو مرتبہ دیکھوں — پھر بھی یہ کہوں جلوۂ جاناں نہیں دیکھا
امیر :- آنکھوں نے جو دیکھا اسے تو دل نے پکارا — میں نے ابھی اسے جلوۂ جاناں نہیں دیکھا
داغ :- اب کئی دن سے وہ رسم و راہ بھی موقوف ہو — ورنہ برسوں نامہ بر آتا رہا جاتا رہا
امیر :- آنے والا، جانے والا، بےکسی میں کون تھا — ہاں مگر اک دم غریب آتا رہا جاتا رہا
داغ :- نگاہِ شوق پہ الزام بےقراری کا — تمھاری برقِ تجلّی کو اضطراب نہ تھا
جلال :- مری تڑپ نے نہ آنے دیا قریب انھیں — کہ برق گرتی تھی اندازِ اضطراب نہ تھا
داغ :- نہ پوچھ مجھ سے مرے جرم داورِ محشر — مرے گناہوں کا دنیا میں بھی حساب نہ تھا
جلال :- گناہ بولے جو گھبرا گیا میں محشر میں، — ابھی تو پرسشِ اعمال تھی حساب نہ تھا
داغ :- لن ترانی کی صدا حضرتِ موسیٰ نے سنی — یوں نہ چھپتے، جو کوئی دیکھنے والا ہوتا
امیر :- جس نے بےپردہ سرِ طور پکارا آکر — چھپتے جب ہم کہ کوئی دیکھنے والا ہوتا
داغ :- بدگمانی نے نہ چاہا اسے تنہا چھوڑوں — میں نے قاصد کو الگ راہ میں چلنے نہ دیا
جلال :- لاکھ احسان جنازے پہ گرانباری کے — دو قدم کوچۂ محبوب سے چلنے نہ دیا
داغ :- شوخی سے ٹھہرتی نہیں قاتل کی نظر آج — یہ برقِ بلا دیکھیے گرتی ہے کدھر آج
امیر :- شوخی سے ہے بےچین وہ بجلی سی نظر آج — کہتی ہے حیا دیکھیے گرتی ہے کدھر آج
منیر :- کیا جانیے کیا لطف ہے چلمن کے ادھر آج — جاتی ہے تو پھر کر نہیں آتی ہے نظر آج
داغ :- روکا ہی کیا رشک بٹھاتا رہی ضعف — بےتابیِ دل لے ہی گئی غیر کے گھر آج
امیر :- گو جاتے ہیں آہستہ نزاکت سے وہ لیکن — دوڑی ہوئی جاتی ہے خوشی غیر کے گھر آج
جلال :- اے تاب و تواں آپ میں کہدوں گا کہ رخصت — پہونچا دو اٹھا کر درِ دلدار سے گھر آج
داغ :- جلا کے داغِ محبت نے دل کو خاک کیا — بہار آئی مرے باغ میں خزاں کی طرح
امیر :- نویدِ وصل مٹاتی ہے دل کے داغوں کو — بہار لوٹتی ہے باغ کو خزاں کی طرح
داغ :- نہ صید گاہِ عشق سے ٹھہرائیے نگاہ — صیاد مضطرب ہے نہ ہوگا شکارِ دل
امیر :- ترچھی نظر نشانے پہ پڑتی نہیں کبھی — اے ترک اس ادا سے نہ ہوگا شکارِ دل
داغ :- پوچھتے کیا ہو کہ دیکھا شبِ وعدہ کیا کیا — تم سے تعبیر بن آئے وہ مرا خواب نہیں
جلال :- غفلتِ عشق کے عاشق ہی تماشا بیں ہیں — غیر کی آنکھ جسے دیکھے یہ وہ خواب نہیں
منیر :- سببِ مرگ ہے آسایشِ دل اے ناداں — جیتے جی دیکھے کوئی جس کو یہ وہ خواب نہیں
داغ :- آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار — کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں
امیر :- اٹھتا نہیں ہے اب تو قدم مجھ غریب کا — منزل سے کہدو دوڑ کے لے مجھ کو راہ میں
داغ :- دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں — دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

میر :- آنکھ اپنی فتنہ ہائے قیامت پہ کیا پڑے — جس کے یہ فتنے ہیں وہ ہے اپنی نگاہ میں
جلال :- شوخی، فریب، سحر، فسوں، لاگ، شعبدہ — کتنے کرشمے دیکھے تری اک نگاہ میں
داغ :- دستِ گل چیں سے چھٹا آیا کفِ صیاد میں — میں گل بازی ہوں کیا اس گلشنِ ایجاد میں
امیر :- پڑگئی کیا لوٹ یارب گلشنِ ایجاد میں — دستِ گل چیں میں ہے گل بلبل کفِ صیاد میں
داغ :- کسی کا دل تو کیا شیشہ نہ ٹوٹا بادہ خواروں میں — یہ توبہ ٹوٹ کر کیوں جا ملی پرہیزگاروں میں
امیر :- بہار آئی لنڈھاتے خم کے خم ہم بادہ خواروں میں — کہو توبہ سے چندے جا رہے پرہیزگاروں میں
داغ :- خوشی مرگِ عدو کی لاکھ غم سے ہوگئی بدتر — مری آنکھوں نے دیکھا ہے کسی کو سوگواروں میں
امیر :- جگر روتا ہے دل کو دل جگر کو۔ طرفہ ماتم ہے — وہ اس کے سوگواروں میں یہ اُس کے سوگواروں میں
جلال :- وہ ماتم بزم شادی ہے تمھاری جس میں شرکت ہو — وہ مزا زندگی ہے تم جہاں ہو سوگواروں میں
داغ :- راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں — اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں
امیر :- ہائے وہ دن کہ گزر جاتی تھی شب باتوں میں — اب نہ باتوں میں مزا ہے نہ ملاقاتوں میں
داغ :- اور سنئے ابھی رندوں سے جنابِ واعظ، — چل دئے آپ تو دو چار ہی صلواتوں میں
امیر :- واعظ اب چھیڑ کے رندوں کو سُنا کرتے ہیں — کچھ مزا ملنے لگا ہے انھیں صلواتوں میں
داغ :- ابرِ رحمت ہی برستا نظر آیا زاہد — خاک اُڑتی کبھی دیکھی نہ خرا باتوں میں
امیر :- مسجدوں میں ہیں یہ ہو حق کے کہاں ہنگامے — رنگِ توحید اُچھلتا ہے خرا باتوں میں
داغ :- صاف کب امتحان لیتے ہیں — وہ تو دم دیکے جان لیتے ہیں
امیر :- آزمائش میں جان لیتے ہیں — خوب آپ امتحان لیتے ہیں
داغ :- ضد ہر اک بات پر نہیں اچھی — دوست کی دوست مان لیتے ہیں
امیر :- میری ہر بات پر ہیں سو سو عذر — غیر کی خوب مان لیتے ہیں
داغ :- دلوں پر سیکڑوں سکّے ترے جوبن کے بیٹھے ہیں — کلیجوں پر ہزاروں تیر اس چتون کے بیٹھے ہیں
امیر :- وہ دل کی تاک میں جب شوق سے بن ٹھن کے بیٹھے ہیں — تو سو غمزوں سے دل پر تیر اُس چتون کے بیٹھے ہیں
داغ :- نگاہِ شوخ چشمِ شوق میں در پردہ چھنتی ہے — کہ وہ چلمن میں ہیں، نزدیک ہم چلمن کے بیٹھے ہیں
امیر :- نگاہِ شوق ایسی پردہ در ہے کچھ نہیں کھلتا — کہ چلمن کے اِدھر یا وہ اُدھر چلمن کے بیٹھے ہیں
داغ :- عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو، — اور پھر ڈھونڈھتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو
جلال :- شوق کی بے خودیوں نے یہ کیا گم مجھ کو — ڈھونڈھتا ہوں میں تمھیں ڈھونڈھتے ہو تم مجھ کو
داغ :- دیکھنا پیرِ مغاں حضرتِ واعظ تو نہیں — کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پسِ خم مجھ کو
امیر :- میں جو مرجاؤں تو اسے پیرِ مغاں کہدینا — مغبچے کھینچکے ڈال آئیں پسِ خم مجھکو،
...ل :- یارب آباد رہیں زیرِ فلک بادہ پرست — لا کے مے خانے میں گاڑا ہے تہِ خم مجھکو،
:- معجزہ حضرتِ عیسیٰ کا غلط بھی تو نہیں — درد اُٹھتا ہے وہ کہتے ہیں اگر قم مجھکو
...ل :- کشتہ اِک رشکِ مسیحا کے تغافل کا ہوں — جو قیامت بھی اُٹھائے تو کہے قم مجھکو
...ر :- زندہ کرنے مجھے شاید وہ مسیحا آیا — ہوگئے کان کھڑے کس نے کہا قم مجھکو

اغ :-	اپنے رونے پہ کچھ آیا جو تبسم مجھ کو،	یاد نے اس کی کہا بھول گئے تم مجھ کو
لال :-	گریہ کیا جانے مرا زخم - میں کیا جانوں ہنسی	اس کو رونا میں بتا دوں، یہ تبسم مجھ کو
نیر :-	خنجرِ ناز سے جب چھیڑتے ہو تم مجھ کو	دہنِ زخم سکھاتے ہیں تبسم مجھ کو
اغ :-	غیر کے مذکور پر میرا بگڑنا تھا بجا،	ٹھہرو ٹھہرو، سنبھلو سنبھلو کیا سے کیا ہونے لگے
سلیم :-	وقتِ آخر ہے انھیں رخصت کرو تسلیم اب	کون جانے کیا ہو دم میں، کیا سے کیا ہونے لگے
اغ :-	داغ میں پرچا ہی لوں گا باتوں باتوں میں انھیں	شرط یہ ہے میرا ان کا سامنا ہونے لگے
سلیم :-	چاہتا ہوں اتنی میں تاثیر اپنے عشق میں،	شرم کے اٹھ جائیں پردے سامنا ہونے لگے
غ :-	آشوبِ حشر اس بتِ خود سر سے کیا کہیں	محشر کا حال فتنۂ محشر سے کیا کہیں
یر :-	اس بت کے جورِ خالقِ اکبر سے کیا کہیں	آپس کی چھیڑ داورِ محشر سے کیا کہیں
غ :-	یہ تو پوچھیں مرے مرقد پہ گزرنے والے	کیا گزرتی ہے تری جان پہ مرنے والے
یر :-	اِک ذرا دیکھ تو کیا کہتے ہیں مرنے والے	او غریبوں کے مزاروں پہ گزرنے والے
ل :-	ترے سب ناز ہیں گو - زندہ ہی کرنے والے	ڈھونڈھ رکھتے ہیں بہانہ کوئی مرنے والے
بر :-	گزرے جائیں گے یوہیں جیسے گزرنے والے	تم سلامت رہو - جیتے رہیں مرنے والے
غ :-	خوش نوائی نے رکھا ہم کو اسیر اے صیاد	ہم سے اچھے رہے صدقے میں اترنے والے
بر :-	بت بنے بیٹھے ہیں کس واسطے مرنے والے	کس کے صدقے میں یہ پتلے ہیں اترنے والے
غ :-	یار کا پاسِ نزاکت دلِ ناشاد رہے	نالہ رکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے
ال :-	زندگی بھر مزۂ ضبطِ فغاں یاد رہے	کوئی چٹکی بھی تو لے دل میں جو فریاد رہے
بر :-	ہڈیوں میں گزرِ نالہ و فریاد رہے	نیستاں نعرۂ شیرانہ سے آباد رہے
غ :-	کچھ نرالا ہے جوانی کا بناؤ	شوخیاں زیور ہیں اس سن کے لئے
بر :-	ہے جوانی خود جوانی کا سنگار	سادگی گہنا ہے اس سن کے لئے
غ :-	فیصلہ ہو آج میرا آپ کا	یہ اٹھا رکھا ہے کس دن کے لئے
بر :-	وصل کا دن اور اتنا مختصر	دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے
غ :-	وہ نہیں سنتے ہماری کیا کریں	مانگتے تھے ہم دعا جن کے لئے
بر :-	ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا	میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے
غ :-	بعد میرے کیوں نویدِ وصل یار آنے کو تھی	وہ چمن ہی مٹ گیا جس میں بہار آنے کو تھی
ل :-	باغ سے کر لے گیا صیاد کب مجھ کو اسیر	جب خزاں جانے کو تھی فصلِ بہار آنے کو تھی
م :-	وائے قسمت کب کیا صیاد نے قیدِ قفس	ایضاً
- :-	کہاں تھے رات کو ہم سے ذرا نگاہ ملے	تلاش میں ہو - کہ جھوٹا کوئی گواہ ملے
ر :-	دل و جگر کی تڑپ دیکھ کر وہ کہتے ہیں	کہ مدعی سے بھی چالاک یہ گواہ ملے
ل :-	پکار اٹھوں جو دوبارہ تری نگاہ ملے	کہ دل کو لے گئی آنکھ اس کی دو گواہ ملے
- :-	سب اہلِ حشر جب اپنے کئے کو پائیں گے	بڑا مزا ہو جو مجھ کو مرے گناہ ملے

امیر :- درِ کریم پہ محشر میں تاکہ راہ ملے — گنا ہگاروں میں چھپ چھپ کے بے گناہ ملے
جلال :- ہر ایک حشر میں ملتا تھا دوست سے اپنے — مجھے بھی ڈھونڈھ کے مجھسے مرے گناہ ملے

داغ :- دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے — جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے
امیر :- گھبرا نہ ہجر میں بہت اے جانِ مضطرب — تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

داغ :- تیرا غصہ ہو کہ ہو میری طبیعت ظالم — یہ بلائیں نہیں آئیں کبھی ٹلنے کے لئے
جلال :- ہم ازل ہی پکارے جو ملا بخت سیاہ — یہ بلا آئی ہے سر پہ سے نہ ٹلنے کے لئے

داغ :- خاک ٹھہرے ترے کوچے میں کوئی اے قاتل — مستعد نقشِ کفِ پا بھی ہے چلنے کے لئے
جلال :- رہبرِ جلوۂ گہ یار جو تو ہو اے شوق — ابھی موجود ہیں آنکھیں مری چلنے کے لئے

داغ :- بد دعا لگ گئی کیا تیرے مریضِ غم کی — چارہ گر مرتے ہیں، بیمار کا حال اچھا ہے
امیر :- میزباں مرتا ہے مہمان مزا کرتا ہے — دل کی حالت ہے بری، درد کا حال اچھا ہے
منیر :- ہے بگڑنا ہی سنبھلنا ترے بیماروں کا — لوگ سمجھے ہیں برا، اس کو جو حال اچھا ہے

داغ :- یا دکھا دو مجھے تم پاؤں کا ناخن اپنا — یا یہ کہدو مرے ناخن سے ہلال اچھا ہے،
امیر :- کہتے ہیں آج تو ناخن سے مرے دی تشبیہ — کل کہو گے مرے ابرو سے ہلال اچھا ہے

داغ :- بنا ہوں میں نفسِ واپسیں نقاہت سے — نہ آکے جانے کی طاقت نہ جا کے آنے کی
امیر :- نہ چوک وقت کو پا کرکے ہے یہ وہ معشوق — کبھی امید نہیں جس سے جا کے آنے کی
جلال :- ٹھہر رہی ہے جو آنکھوں میں جانِ وقت اخیر — یہ منتظر ہے کسی بے وفا کے آنے کی

امیر :- نہ سنے دردِ دل مرا نہ سُنے — میں کہوں گا ستے وہ یا نہ سُنے
داغ :- میری فریاد دوسرا نہ سُنے — تم سنو اے بتو! خدا نہ سُنے
امیر :- کسی نا آشنا کا کیا شکوہ — آشنا کی جب آشنا نہ سُنے
داغ :- دوستی کیا اسی کو کہتے ہیں — آشنا کی جو آشنا نہ سُنے

داغ :- دیدہ و دل میں اس لئے ہے فرق — ایک کا ایک ماجرا نہ سُنے
امیر :- حال پھولوں کا جو خزاں نے کیا — کہیں بلبل وہ ماجرا نہ سُنے
جلال :- شکوۂ غیر تو وہ سن لے گا — نہ سُنے میرا ماجرا نہ سُنے

داغ :- راز اپنا کبھی کہا نہ کہے — حال میرا کبھی سُنا نہ سُنے
امیر :- لاکھ دل چپ رہی مرا قصہ — مگر اس نے کبھی سُنا نہ سُنے

داغ :- ہجر میں جو دعائیں مانگی ہیں، — کوئی اللہ کے سوا نہ سُنے
امیر :- آہیں کرنا کہیں تو یوں اے دل — کوئی میرے ترے سوا نہ سُنے

داغ :- چور ہو جاؤں مگر جاؤں نہ میخانے سے — عہد شیشے سے تو پیمان ہے پیمانے سے
امیر :- ساقیا جاتے ہیں پیاسے ترے میخانے سے — گھونٹ دو گھونٹ چھلکتے ہوئے پیمانے سے

داغ :- دلِ برباد میں آباد ہوئے عشق و جنوں — کون بستی نہیں بہتر مرے ویرانے سے
امیر :- مرے ہی دل سے پڑی خانہ خرابی کی بنا — گھر تباہی کا ہے آباد اسی ویرانے سے

طرزِ داغ میں رنگِ مومن کی جھلکیاں

(پروفیسر وقار عظیم)

روایت کی مستحکم بنیاد اور شخصیت کے پرتو کی رنگینی ــ یہ دو عناصر ہیں جن کے صحیح امتزاج کے بغیر نہ کوئی فنی تخلیق ا
اتی ہے اور نہ با معنی بنتی ہے ۔ با معنی بننے سے میری مراد اس فنی تخلیق کے اُس حسن سے ہے جس کی بدولت اس فن
، روایت کے تسلسل میں ایک حیثیت حاصل ہوتی ہے، ایک مقام اور درجہ ملتا ہے ۔ روایت کی جو زنجیر ان گنت کڑ
رنے سے بنتی ہے اُس کا حصہ صرف وہی چیزیں بن سکتی ہیں جن میں روایت کا رچاؤ اور شخصیت کی گھلاوٹ میں مل ج
ل کرتے ہیں ۔ دونوں میں سے کسی کی قوت میں بھی کمی ہوتی ہے تو نتیجہ کسی ایسی تخلیق کی صورت اختیار کرتا ہے جو
کے تھپیڑوں کی تاب نہیں لاسکتی ۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم کسی فن کار کے تخلیقی سرمایہ کا جایزہ لینے کی طیاری کرتے ہ
بہت سے معیاروں میں سے یہ دو معیار خاص کر ہماری رہنمائی کرتے ہیں ۔

داغ کی غزلوں کو ان دو معیاروں کی کسوٹی پر کسا جائے تو دو چیزیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں ــ ایک یہ
ہیں حرف بہ حرف غزل کی روایت کی ہم رنگی میں ڈوبی ہوئی ہیں اور دوسرے شاعر کی شخصیت کی انفرادیت اور توانا
روایت کے رنگ پر اپنا رنگ چڑھا کر غزل کو ایسی صورت دی ہے جو اس سے پہلے اُسے نہیں ملی تھی ۔ لیکن یہی بات
ل گو شاعر کے متعلق کہی جاسکتی ہے، یا کم از کم ہر اچھے غزل گو کے متعلق کہی جاسکتی ہے ۔ ہر اچھے غزل گو کی غزل کہ
، انداز سے روایت کی اس ہم رنگی اور شخصیت کی انفرادیت کا امتزاج اور عکس ہے ۔ اس لئے ایک غزل گو اور دور
و میں امتیاز کرنے کے لئے جہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کس نے ہم رنگ روایت کے کسی پہلو سے تاثر قبول کیا ہے و
، جاننے کی ضرورت ہے کہ اس خاص شاعر کی شخصیت کے انفرادی پہلو کیا کیا ہیں اور ان کی پرورش کسی خاص م
حول اور فضا میں ہوئی ہے ۔ گویا شخصیت کی انفرادیت کا جایزہ ہمیں لازمی طور پر ماحول کے جایزہ کی طرف رجوع
نا ہے ــــــ داغ کی غزل میں روایت کے عناصر کی تلاش میں ہمیں زیادہ دیر سرگرداں نہیں رہنا پڑتا ۔ اپنے سفر کی پہل
ہی میں ہمارے سامنے کچھ ایسے غزل گو آجاتے ہیں جن کے نغموں کی گونج خود داغ نے بھی سُنی تھی، اُس کے مزے لئے اور ا
کا جزو بنایا تھا ۔ میرا اشارہ غالب، مومن، ذوق، ظفر اور شیفتہ کی طرف ہے ۔ ہماری غزل ولی، میر، درد، مصحفی
مصحفی کے ہاتھوں بنتی، سنورتی اور نکھرتی جب ان شاعروں کے دور تک پہونچی تو ان میں سے بعض نے اس
ت کو اپنی قوی، توانا اور موثر شخصیتوں ــــ کے رنگ میں رنگ کر اُسے نئی صورتیں دیں اور غزل جو اب
نہ تخیل اور ندرتِ اظہار کو یکجا دیکھنے کی عادی نہیں تھی غالب کی بدولت اس نئے انداز سے آشنا ہوئی جس غزل نے ا
کا شرف صرف عورت کو دینے سے اجتناب کیا تھا مومن کی بدولت تغزل کے اُس مفہوم کی سرمایہ دار بنی جو مومن ۔
زل کو کسی اور نے نہیں دیا تھا ۔ ذوق کی زبان دانی اور ظفر کی دردمندی سے بھی غزل کو کچھ نہ کچھ ایسا ملا کہ جو کو

اس دور کی غزل پر نظر ڈالتا ہے، اُسے اس میں کچھ امتیازی باتیں صاف دکھائی دیتی ہیں - یہی امتیازی باتیں ہیں جو اور بہت سی چیزوں کے ساتھ داغ کے پاس غزل کی روایت کا قصہ بن کر پہونچی ہیں - داغ نے ان سے اثر قبول کیا اور اس اثر کا عکس اُن کی غزلوں میں بہت سے پردوں کے باوجود جھلکتا ہے لیکن جو رنگ تمام رنگوں سے زیادہ شوخ اور نمایاں ہے وہ مومن کا تغزل ہے - مومن کے تغزل میں بنیادی طور پر کچھ ایسی باتیں ہیں جن سے داغ کو طبعی مناسبت ہے - یہ مناسبت کبھی کبھی تو ایسی صورت میں جلوہ ریز ہوتی ہے کہ مومن اور داغ میں فرق کرنا دشوار ہوجاتا ہے لیکن اکثر اس تاثر کو داغ کے منفرد مزاج نے اپنا بنا لیا ہے - لیکن مومن کی عظیم تر شخصیت اور فن کار کی حیثیت سے اُنکا بلند تر مقام دونوں ایسی چیزیں ہیں کہ داغ کی انفرادیت کے گہرے پردے بھی اُس کے جلووں کو چھپنے سے نہیں روک سکتے اور داغ کی غزل جہاں کہیں مومن سے متاثر ہوئی ہے زبانِ حال سے اس کا اظہار کرنے لگتی ہے -

مطالعہ کی یہی منزل ہے جہاں آکر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ مومن کا تغزل کیا ہے اور اُس میں بنیادی طور پر کون سی ایسی باتیں ہیں جن سے داغ کو طبعی مناسبت ہے -

مومن کے تغزل کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ تغزل کو روایت کا ایک عنصر اور جزو سمجھ کر کبھی رسمی انداز سے نہیں برتتے - اُنھوں نے ایک عورت کو اپنا محبوب بنایا ہے اور محبت کے اس رشتہ کی مختلف کڑیوں سے اپنے اندازِ تغزل کو حسن و دل فریبی دی ہے - جس طرح اُن کے عشق میں خلوص اور اُن کے محبوب کی دلبری و دلستانی کی ساری صفات کے باوجود ایک خاص طرح کا رکھ رکھاؤ اور روک تھام ہے اور یہی خلوص، یہی رکھ رکھاؤ اور یہی روک تھام اکثر جگہ اُن کے رنگِ تغزل میں نمایاں ہے - عورت کو بلا شرکت غیرے محبوبی کا یہ شرف دینے میں جرأت اُنکے پیش رو ہیں لیکن چونکہ جرأت کا عشق محبوب کی فطری شانِ بے نیازی کے احساس اور احترام سے نا آشنا اور محروم ہے اس لئے اُس عاشقی اور اُس محبوبی نے جس تغزل کی تخلیق کی ہے اُس پر بوالہوسی کی عریانی و بے باکی ہے - وہ حقیقت اور صداقت سے قریب ہوکر بھی شدت تاثیر سے خالی ہے - اس تغزل کو دوست رکھنے والا مسرت کی لطیف کیفیتوں کے بجائے اکثر شرمساری و خجالت سے اپنا دامن بھرتا ہے - مومن کے تغزل میں صحت مندی کا جو گہرا پرتو ہے وہ نہ صرف اُسے عشق و عاشقی کی دُنیا میں عالی مرتبہ بناتا ہے بلکہ شاعری کے نقطۂ نظر سے بھی اُس میں ایک ایسی کشش پیدا کرتا ہے جو مومن سے پہلے کسی کے حصہ میں نہیں آئی - مومن کے بعد البتہ بہت سوں نے اس سے اپنی جھولیاں بھری ہیں - مومن کے عشق کا یہی مخلصانہ انداز اور اس کے محبوب کا یہی غیر رسمی لیکن دل آویز تصور ہے جس نے مومن سے تغزل کے ایسے شعر کہلوائے ہیں :-

خواہشِ مرگ ہو اتنا نہ ستا نا ورنہ — دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

کیونکہ امید وفا سے ہو تسلّی دل کو — فکر ہے یہ کہ وہ وعدہ سے پشیماں ہوگا

پشیماں آئے ہیں وہ لاش پر اب — تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

خدا کی یاد دلاتے ہیں ہجر میں احباب — ہزار شکر کہ اس دم وہ بدگماں نہ ہوا

زانوئے بت پہ جان دی دیکھا، — مومن انجام و اختتام مرا،

گر نہ تھی اے دل اُس کے رنج کی تاب — کیوں شکایت گزار ہوتا تھا،

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں — تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

خنجر تو نہ توڑ سخت جانی، — پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

ٹھانی تھی جی میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ان شعروں کو پڑھ کر عشق و عاشقی کے جس رشتہ کا تصور سامنے آتا ہے اُس میں محبوب کا تصور اُس تصور سے بالکل مختلف ہے جو مومن سے پہلے کے شاعروں نے ہمیں دیا ہے۔ اس میں محبوب کے روایتی حسن و محبوبی کو چھوڑ کر شاعر اُس کا ذکر اس اندازِ خاص سے کرتا ہے کہ اُس کے دل کی دھڑکن ہر لفظ میں صاف سنائی دیتی ہے۔

داغ کا محبوب بھی اُردو شاعری کے روایتی محبوب سے مختلف ہے۔ لیکن مومن اور داغ کے محبوب میں اس بنیادی اشتراک کے علاوہ اور کوئی چیز مشترک نہیں۔ مومن کا محبوب پردہ نشین ہے اور اُسے وہ بہرصورت پردہ میں رکھنا چاہتے ہیں داغ کے محبوب کا شیوہ بے نقابی اور بے حجابی ہے۔ مومن کا محبوب اُنھیں کا محبوب ہے، وہ اگر دشمن کی طرف مایل بھی ہوتا ہے تو صرف اس لئے کہ محبت کی چنگاری اور تیز ہو، عشق کا شعلہ اور بھڑکے۔ اپنی دولتِ حسن کو ہر ایک کی دولت بنانا داغ کے محبوب کا شیوۂ خاص ہے۔ اس محبوب کے متعلق داغ بڑی بے تکلفی سے اس طرح کی باتیں کہ دیتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ محبوب جیسا ہے سب پر روشن ہے۔ اُن کے چھپانے نہ چھپانے سے آخر فرق ہی کیا پڑے گا:-

چاہنے والے ہوں بُرے کہ بھلے اُن کے دفتر میں نام ہے سب کا

خود محبوب کی دیدہ دلیری بھی ملاحظہ کیجئے:-

پوچھتے کیا ہو کیوں لگائی دیر اک نئے آدمی سے ملنا تھا

جب محبوب ایسا ہو تو عاشق کی آزادی کا کیا کہنا۔ وہ کسی پر کیوں بند ہو اور کوئی اُس پر کیوں بند ہو:-

اک نہ اک ہم لگائے رکھتے ہیں تم نہ ملتے تو دوسرا ملتا،

جیسے کو تیسا ہرجائی ہونا ایک کے حسن کا زیور ہے اور دوسرا بھی اسے اپنے عشق کی شان سمجھتا اور اسے اپنی زندگی کا لائحۂ عمل بناتا ہے۔

مومن اور داغ کے محبوب میں اور اس لئے دونوں کے اندازِ محبت میں جو فرق ہے اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے (اور ہوا بھی ہے) کہ محبوب کے متعلق، تصورِ عشق کے متعلق، عشق و محبت کی مختلف منزلوں اور نسبتوں کے متعلق دونوں شاعر جو کچھ کہیں وہ کسی طرح بھی ایک دوسرے کے مطابق نہ ہو۔ لیکن داغ کی شاعری کے مطالعہ سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ عشق اور محبوب کے متعلق اُن کا جو تصور اور جو نقطۂ نظر ہے اُس نے اُن کی شاعری کے پورے لہجہ کو متاثر کیا ہے اور یہ لہجہ اُن کا اپنا منفرد لہجہ ہے جو نہ داغ سے پہلے کسی اور شاعر کے کلام میں ہے اور نہ داغ کے اُن ہمعصروں میں سے کسی کے یہاں جنھوں نے داغ کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی ہے اور دوسری یہ کہ اس منفرد لہجہ کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری کا ایک لہجہ اور ہے جو انھوں نے مومن کے تغزل سے متاثر ہو کر اپنایا اور اختیار کیا ہے۔ اور اس کا اظہار اُن کی شاعری میں طرح طرح سے ہوتا ہے۔

داغ کے لہجہ کا یہ عکس اُن شعروں میں بہت نمایاں ہے جن میں داغ محبوب سے مخاطب ہیں۔ کچھ شعر ملاحظہ کیجئے:-

تم سلامت ہو تو ہر روز قیامت ہوگی ___ ہم بھی دیکھیں گے تماشا یہ تماشا کیسا

تمھارے واسطے میں غیر کو تنہا نہ چھوڑونگا ___ سمجھ لینا کہ دو مردے گڑیں گے ایک مدفن میں

تھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو ___ اور ہوتی ہے خطا وار کی صورت کیسی

ہاتھ باندھے ہوئے اغیار کے ساتھ آؤگے ___ ہم دکھا دیں گے مزا روزِ جزا ہونے دو

چاہت کا مزا بعد ہمارے نہ ملے گا ہر شخص سے تم آپ کہو گے ہمیں چاہو

کہو کیا کروگے مرے وصل کی — جو مشہور جھوٹی خبر ہوگئی

اب اس کے مقابلہ میں محبوب سے مومن کا اندازِ تخاطب دیکھئے:-

وقتِ وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے — یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج وعذاب تھا

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے — اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا،

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمھارے سوا نہیں ہوتا

تم بھی رہنے لگے خفا صاحب — کہیں سایہ مرا پڑا صاحب

کیوں لگے دینے خطِ آزادی — کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب

ستم، آزار، ظلم وجور وجفا — جو کیا سو بھلا کیا صاحب

کبھی کبھی داغ کے اندازِ تخاطب میں بھی مومن کے عجز، انکسار اور نیاز مندی کی جھلک نظر آجاتی ہے:-

نہیں ہوتی بندے سے طاعت زیادہ — بس اے خانہ آباد دولت زیادہ

دل کہ ویرانہ ہوگیا بالکل، — اب بھی ہے تیری آرزو اس میں

مجھ سے بہتر مرا ملال رہا — کہ ترے دل میں مہ جمال رہا

تونے جس دن سے کی مسیحائی — کوئی اچھا نظر نہیں آتا

سب مجھے دیوانہ بنانے لگے — لو وہ تمھارا ہی کہا ہوگیا

شوق نے آوارہ کیا تھا مجھے — خیر ہوئی میں ترے در پر گرا

کہو جب تم کہ ہے بیمار مرا — تو کیوں کر دور ہو آزار مرا

دل لینے کی تم کو آرزو تھی — اب جان سے اپنی لو گئے ہم

کچھ ترا شوق کچھ تری حسرت — اور رکھا ہی کیا ہے اب ہم میں

ایک داغ وہ ہیں کہ جو محبوب کو یہ کہکر دھمکی دیتے ہیں کہ اگر تم نے رقیب سے اپنا ربط ضبط کم نہ کیا اور مجھ پر یوں ہی ظلم وستم ہوتے رہے تو سمجھ لو میں تو اس ظلم وستم کے ہاتھوں جان سے جاؤں گا لیکن رقیب کو بھی جیتا چھوڑ کر نہ جاؤنگا کہ تم اُس سے اپنے دل کے ارمان نکالو یا یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کرتے کہ تم روزِ جزا آنے دو ہم تمھیں ایسا مزا چکھائیں گے کہ تم اور اغیار سب ایک ساتھ ہاتھ باندھے ہوئے آؤ گے۔ اُس سے وہ بڑی بے باکی سے وہ اس طرح کی باتیں بھی کر لیتے ہیں:-

کہو کیا کروگے مرے وصل کی — جو مشہور جھوٹی خبر ہوگئی

یا سہ

تھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو — اور ہوتی ہے خطاوار کی صورت کیسی

محبوب کے ساتھ اس اندازِ تخاطب میں جو دریدہ دہنی، ہیکڑی اور پست درجہ کی غرض مندی ہے اُسکی حدیں ہر جگہ آوارہ مزاجی اور اوباشی سے ملتی ہیں۔ محبوب سے مخاطب ہوتے وقت داغ کا لہجہ عموماً ایسا ہی رہا ہے۔ وہ بظاہر ایک غلط قسم کے احساس برتری میں مبتلا ہیں اور محبوب کو محض اپنی آتشِ ہوس بجھانے کا ایک وسیلہ جانتے ہیں لیکن محبوب کا ہرجائی پن اس میں مخل ہوتا ہے تو اُن کے لہجہ میں بڑے سستے قسم کی طنز اوچھی وضع کی دھمکیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے ـــ اس کے برخلاف مومن کا عشق بوالہوسی کے باوجود محبوب کو محبوب ہی جانتا ہے اور شنہ

کے تیروں سے اُس کا کلیجہ چھلنی کرتے وقت بھی حفظ مراتب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ سخت سے سخت بات بھی نرم لہجہ میں کہی جاتی ہے اور محبوب کی شان بے نیازی کے آگے اپنے عشق کی کمتری کا احساس اس درجہ غالب رہتا ہے کہ وہ کبھی کبھی مجبوری اور بے بسی بن کر زبان پر آتا ہے۔ یہ سب کچھ داغ کے مزاج کے خلاف ہے۔ لیکن مومن کی دی ہوئی روایت نے اُنھیں کبھی کبھی یہ راستہ اختیار کرنے کی طرف بھی مائل کیا ہے اور اس لئے وہ کبھی کبھی ایسے لہجہ میں بات کہتے ہیں کہ سننے والے کو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ خاص کر جب وہ داغ کو یہ کہتے ہوئے سنتا ہے کہ ؎

سب مجھے دیوانہ بنانے لگے ـــــــ لو وہ تمھارا ہی کہا ہوگیا

یا ؎

دل لینے کی تم کو آرزو تھی ـــــــ اب جان سے اپنی لو گئے ہم

لہجہ کی یہ نرمی مومن کا فیض اثر ہے۔

بات سے بات نکلتی ہے اور محبوب سے اندازِ تخاطب میں مومن اور داغ میں جو زمین آسمان کا فرق ہے وہ ہمارے ذہن کو خود بخود حُسن و عشق کے دوسرے کاروبار کی طرف منتقل کرتا ہے اور اس سلسلہ میں ہماری نظر ایک بار پھر مومن اور داغ کے اُن تصورات پر پڑتی ہے جن کا اظہار دونوں کی غزلوں میں محبوب کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔ مومن کے محبوب کے متعلق اب اس بات کے دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اُن کا محبوب غزل کے روایتی محبوب سے الگ ایک ایسا "پردہ نشین" ہے جسکی نبض پر ہاتھ رکھتے ہی عاشق کا دل اُس کے ہاتھوں سے رخصت ہوجاتا ہے۔ مومن آخر عاشق ہیں اس لئے اُنھیں بھی عاشقوں کی طرح محبوب سے طرح طرح کے گلے ہیں اور یہ گلے اُنھوں نے کبھی کبھی بڑے تیز لہجہ میں کئے ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے اُنھیں اپنے محبوب کی دلداری اور پاسِ خاطر اس قدر عزیز ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنے لئے ناگوار سے ناگوار بات کو بھی گوارا بنانے سے اجتناب نہیں کرتے۔

ے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی ـــــــ تو مجھے آزمائے گا کب تک

اُس کی پشیمانی کے منظر کی تاب نہیں لاسکتے تو گئی ہوئی زندگی کے چلے جانے پر نادم و پشیمان ہوتے ہیں اور جیسے بے بس ہوکر رہ جاتے ہیں ؎

پشیماں آئے ہیں وہ لاش پر اب ـــــــ تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

ایسی ہی یا اس سے ملتی جلتی بعض کیفیتوں کا اظہار ان شعروں میں ہے ؎

اگر نہ تھی اے دل اُس کے رنج کی تاب ـــــــ کیوں شکایت گزار ہونا تھا،
دل میں اُس شوخ کے جو راہ نہ کی ـــــــ ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی،
بس کہ اک پردہ نشیں کے عشق میں ہو گفتگو ـــــــ بات بھی کرتے نہیں جُز صنعتِ ایہام ہم
ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم ـــــــ پر کیا کریں کہ ہوگئے لاچار جی سے ہم

یا ایک مشہور غزل کے چند شعر ؎

اگر نہ ہاتھ میں اُس دل ربا کے دل دیتے ـــــــ تو دل پہ ہاتھ سدا دھر لیا نہ کرتے ہم
اگر نہ دام میں زلفِ سیہ کے آجاتے ـــــــ تو یوں خراب و پریشاں رہا نہ کرتے ہم
اگر نہ لگتی چپ اس بدگماں کی شوخی سے ـــــــ تو بات بات میں مضطر ہوا نہ کرتے ہم
اُس آفت دل و جاں پر اگر نہ مرجاتے ـــــــ تو اپنے مرنے کی ہر دم دُعا نہ کرتے ہم
اگر نہ آنکھ تغافل شعار سے لگتی ـــــــ تو بیٹھے بیٹھے ہی یوں چونک اُٹھا نہ کرتے ہم

نہ ہوش کھوتے اگر اُس پری کی باتوں پر   تو آپ ہی آپ یہ باتیں کیا نہ کرتے ہم
اگر نہ ہنسنا ہنسانا کسی کا بھا جاتا   تو بات بات پہ یوں رو دیا نہ کرتے ہم
اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ   تو ایک ایک کے منہ کو تکا نہ کرتے ہم

عشق کے خنجر نے گھایل داغ کو بھی کیا ہے لیکن اُنھیں خنجر چلانے والے پر خود خنجر چلانے میں بھی دریغ نہیں۔ وہ محبوب سے برابر کی چوٹ لڑتے ہیں۔ یہاں ایک کی کمتری اور دوسرے کی برتری کا سوال نہیں۔ اس عشق کا سودا ہمسری اور برابری کا سودا ہے اُنھیں اپنے دل کو ٹھیس لگتی محسوس ہوتی ہے تو وہ محبوب کے کلیجہ تک کو چٹکیوں سے مسل دینے میں تامل نہیں کرتے نہ محبوب کی پشیمانی اُنھیں پشیمان کرتی ہے اور نہ اُنھیں اس کا غم ہے کہ اُن کا محبوب اُن کا ہوکر نہیں رہتا۔ وہ اپنا نہیں تو نہ سہی، اُس جیسے اور بہت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زلفِ سیاہ کا دام اُنھیں پریشان نہیں کرتا، محبوب کی شوخی و بدگمانی اُنھیں مضطر نہیں بناتی اور وہ عشق کے ہاتھوں موت سے کارِ مسیحا کے طالب نہیں ہوتے۔ اُنھیں یہ مرض اور خفقان بھی نہیں کہ بیٹھے بیٹھے چونک اُٹھیں یا بات بات پر اشک فشانی کرنے لگیں، یہاں تو محبوب کے ساتھ روابط کی نوعیت ہی دوسری ہے:-

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں   آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا
یا ؎
غیر کو ساتھ لے کے ہم ڈوبے   آپ نے ضد دلا کے دیکھ لیا
جواب اس طرف سے بھی فی الفور ہوگا   دبے آپ سے وہ کوئی اور ہوگا
چاہت کا مزا بعد ہمارے نہ ملے گا   ہر شخص سے تم آپ کہوگے ہمیں چاہو
ہاتھ باندھے ہوئے اغیار کے ساتھ آؤ گے   ہم دکھا دیں گے مزا روزِ جزا ہونے دو
بُرا ہے شاد کو ناشاد کرنا   سمجھ کر سوچ کر بیداد کرنا

اگر داغ سے پہلے کسی نے اس اندازِ عشق کی طرح ڈال دی ہوتی تو نہ کسی کو جل بھُن کر یہ کہنا پڑتا کہ ؎

سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ   مذہبِ عشق اختیار کیا

——— نہ یوں ہزاروں دین دار بُت پرستی اختیار کرتے اور نہ عشق و عاشقی کے آزار میں ہزاروں خانماں برباد ہوتے اور جانیں کھپاتے۔ داغ کے عشق کی نوعیت اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہاں مجرم کو شبہ کی گنجایش بھی نہیں دی جاتی، اُسے اقبالِ جُرم کرنے یا بریت کی کوئی راہ تلاش کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ یہاں تو عاشق کی جگہ محبوب کو اپنی جان بچانے کی فکر ہوتی ہے اس لئے کہ عاشق کے وار ٹیڑھے ترچھے ہوکر نہیں سیدھے دل پر گرتے اور دوسروں کو بسمل کرنے والوں کو بسمل بناتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ عشق بھی آدمی کی جون میں آجاتا ہے۔ اسے بھی محبوب کو محبوب سمجھنے میں مزا آتا ہے، اسے بھی اُس کی پشیمانی کا خیال آزردہ و افسردہ کرتا ہے، اسے بھی کبھی کبھی تابِ نظارہ نہیں رہتی، اس کا دل بھی کبھی کبھی پگھل کر موم بن جاتا ہے اور پھر اُس کے منہ سے جو کچھ نکلتا ہے اُس میں محبت کا گداز بھی ہوتا ہے اور محبوبی کا دلبرانہ پرتو بھی۔ جس داغ نے محبوب سے یہ کہا تھا کہ "دبے آپ سے وہ کوئی اور ہوگا" اس سے کچھ اور بھی سنئے اور سر دُھنئے ؎

محشر میں وہ نادم ہوں خدا یہ نہ دکھائے   آنکھوں سے کبھی اُس کو پشیماں نہیں دیکھا
دل سے بھی باتیں نہیں کرتا کبھی میں اس لئے   وہ ستم گر بدگماں یہ راز داں ہو جائے گا
جوابِ وصل سے کیونکر نہ ہوں میں شادیٔ مرگ   خوشی بھی اور خوشی دل رُبا کے آنے کی
فکر ہے دوست کو احوال سُناؤں کیونکر   ٹکڑے ہوتا ہے کلیجہ مرے افسانے سے
ذکرِ مہر و وفا تو ہم کرتے   پر تمھیں شرمسار کون کرے

کعبہ کی سمت جا کے مرا دھیان پھر گیا، اُس بُت کو دیکھتے ہی بس ایمان پھر گیا

رشکِ دشمن بھی گوارا لیکن، تجھ کو مضطر نہیں دیکھا جاتا

شوق ایسا کہ تری راہ میں مرکر بھی چلوں ضعف ایسا کہ نہیں جان سے جایا جاتا

بارہا دیکھ لیا ہے اُس کو اور اکثر نہیں دیکھا جاتا

یہ شعر پڑھ کر جتنی داد داغ کو دینے کو جی چاہتا ہے اُس سے زیادہ یہ جی چاہتا ہے کہ حمد و ثنا کے بے شمار پھول مومن کے قدموں پر نثار ہوں کہ اُس کے رنگ نے داغ جیسے کافر کو اپنی دین داری کے رنگ میں رنگا اور جس عاشق کے مُنھ سے کبھی بھول کر بھی محبوب کے لئے خیر کے دو کلمے نہیں نکلتے تھے وہ اُس کی پشیمانی کے خیال کو دل میں جگہ دینے سے گھبراتا ہے، اُس کی بدگمانی کے اندیشہ سے ڈر کر اپنے دل سے بھی باتیں نہیں کرتا، اپنا دردِ دل سنانے سے اجتناب کرتا ہے کہ اس سے محبوب کے شیشۂ دل میں بال پڑجانے کا اندیشہ ہے، اُسی کا جلوہ ہے کہ اُس کا رُخ کعبہ کی طرف سے پھیر دیتا ہے اور پھر اسی کا شوق ہے کہ مرنے کے بعد بھی اُس کی راہ پر چلنے کا آرزو مند ہے۔ یہ سارے مضمون مومن کے ہیں اور اس لئے داغ نے جہاں کہیں انھیں شعر کی شکل دی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مومن کے نغموں کی جھنکار ہے :-

ع وہ ستم گر بدگماں یہ راز داں ہو جائے گا

ع خوشی کبھی اور خوشی دل رُبا کے آنے کی

ع اُس بُت کو دیکھتے ہی بس ایمان پھر گیا

ع تجھ کو مضطر نہیں دیکھا جاتا

ذکرِ مہر و وفا تو ہم کرتے پر تمھیں شرمسار کون کرے

یہ سب کچھ داغ کی خود بینی، خود پسندی، تبختر اور دریدہ دہنی سے مطابقت نہیں رکھتا لیکن داغ پر کسی کا سایہ ہے اور اس لئے وہ اپنی ڈگر چھوڑ کر اُس کی دکھائی ہوئی ڈگر پر چلتے اور اپنے رنگِ خاص میں ایک ایسا رنگ سمو لیتے ہیں جو اپنی بہار الگ دکھاتا ہے۔

عاشق اور محبوب کے اس رشتہ کے تار بہت دور دور پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ رشتہ اس دُنیا میں رقیب کو اپنے پھندوں میں جکڑتا ہے اور یہاں سے بہت دور میدانِ حشر میں عاشق، محبوب، رقیب اسی جال میں جکڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو ان پھندوں میں ایسے پیچ پڑتے ہیں کہ خود داورِ حشر بھی ان میں اسیر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ مومن اور داغ دونوں کے کلام کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ دونوں نے رقیب اور حشر کو طرح طرح سے اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے لیکن اس "طرح طرح سے" میں دونوں کے رنگ کی امتیازی خصوصیتیں صاف جھلکتی نظر آتی ہیں۔ مومن اور رقیب کے رشتہ کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہے :-

سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں، کہ سخت چاہئے دل اپنے راز داں کے لئے

دیکھ لو شوقِ ناتمام مرا غیر لے جائے ہے پیام مرا

وہ حالِ زار ہے میرا کہ گاہ غیر سے بھی تمھارے سامنے یہ ماجرا بیاں نہ ہوا،

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے، پھر ہم بھی کچھ آرزو ہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

تعلقات کی یہ نوعیت بڑی انوکھی ہے۔ یہاں رقیب کو اپنا ہم راز بنانے کے لئے تخلیہ کی تلاش ہوتی ہے، اُسے قاصد کی رشک انگیز خدمت سونپی جاتی ہے، اُسے ہم مزاجی کے سبب سے اپنا دوست

بنایا جاتا ہے۔ عاشق جب اُسے محبوب سے سرگوشیاں کرتے دیکھتا ہے تو اُس کے دل میں رشک کی خلش تو پیدا ہوتی ہے لیکن اس سرگوشی کو کاروبارِ عشق کا ایک معمول سمجھ کر اُس وقت کا انتظار کرتا ہے جب غیر اپنا حالِ دل بیان کر چکے۔ یہاں تک کہ وہ عاشقی کے اس رشتہ میں رقیب کے وصل کو بھی کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں دیتا ؎

لے شبِ وصل غیر بھی کاٹی ۔۔۔ تو مجھے آزمائے گا کب تک

اور شاید اسی روا داری کا صلہ ہے کہ رقیب عاشق کا پیامی بھی بنتا ہے اور اُس کی داستانِ غم محبوب کے سامنے بیان کرنے کی خدمت بھی اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔

داغ ایسے عاشق ہیں جو غم کے بوجھ میں بھی رقیب کو شریک کرنے کے قایل نہیں اور اس لئے شبِ فرقت کو بھی اپنی واحد ملکیت بنانا چاہتے ہیں اور اس لئے محبوب کو اس کی اجازت نہیں دیتے کہ غیر اُن سے سرگوشیاں کرے یا اس سے بھی نہیں بڑھ کر اُس کے وصل سے لذت اندوز ہو۔ اُنھیں سخت سے سخت وقت میں بھی ایسی ترکیبیں سوجھ جاتی ہیں کہ جو وصل اُنھیں میسر نہیں آیا وہ کسی طرح رقیب کو بھی نصیب نہ ہو۔ یہی جذبہ ہے جو اُن سے کہلواتا ہے ؎

تمھارے واسطے میں غیر کو تنہا نہ چھوڑوں گا ۔۔۔ سمجھ لینا کہ دو مُردے گڑیں گے ایک مدفن میں

اِس رقیب کے ساتھ محبوب کو جس طرح کے سلوک کی طرف مایل کرتے ہیں وہ صرف اسی طرح کے "بازاری عاشق" کر سکتے ہیں جن کی نمایندگی داغ نے اپنی غزلوں میں کی ہے۔ ذرا اس منظر کا تصور کیجئے:۔

دیکھی نہ ہوگی سیر کبھی اس شکار کی ۔۔۔ دیکھو رقیب پر سگِ درباں کو چھوڑ کر

اس منظر سے راہ گیروں نے جو لطف لیا ہوگا اُس کی تصویر اور زیادہ رنگین بن جاتی ہے اگر تصور یہ دیکھ سکے کہ سگِ درباں رقیب کو بھنبھوڑ رہا ہے اور "وہ شوخ" آڑ میں کھڑا اس منظر سے محظوظ ہو ہو کر تبسم کی بجلیاں گرا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جیسا عشق ہے ویسا ہی محبوب ہوگا اور اُس کی گلی میں چاہنے والوں کی یہی گت بنے گی جو داغ کے تصور نے ناظرین کے سامنے پیش کی ہے۔ ایک طرف تو رقیب کا یہ تصور دیکھئے اور دوسری طرف داغ کے منہ سے اُس کا ذکر ایسے انداز میں سنئے جو داغ کے مزاج اور فطرت سے ذرا بھی مطابقت نہیں رکھتا:۔

گیا رقیب کے گھر یا رہا شبِ وعدہ ۔۔۔ بہت ذلیل مجھے تیری جستجو نے کیا

اس جگہ مومن کا یہ شعر بھی یاد کر لیجئے:۔

اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل ۔۔۔ میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

مرگِ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھکو ملال ۔۔۔ دشمنی کا لطف شکووں کا مزا جاتا رہا

دشمن کی ندامت نے اُنھیں پیار دلایا ۔۔۔ اے کاش مرے ذمّہ بھی الزام نکلتا

غیر پہ لطف و کرم ہونے لگا ۔۔۔ مہربانی کا مزا جاتا رہا

عشق خانہ خراب جب چاہنے والوں کو "دار العمل" سے "دار الجزا" میں لے جاتا ہے تو اُنھیں بھی دل کی بیقراری چین سے نہیں بیٹھنے دیتی اور جس دل میں محبوب کی سچی لگن اور اُس کے رنج و خوشی کا سچا پاس ہے وہ وہاں بھی اسی آگ میں جلتا اور درد میں گھلتا ہے کہ محبوب کی شانِ محبوبی میں فرق نہ آئے۔ وہ شرمسار نہ ہو، پشیماں نہ ہو، جو دل کبھی درد سے آشنا نہیں ہوا اُس میں درد و غم کا کانٹا نہ کھٹکے۔ اور اس لئے جہاں دوسرے نفسی نفسی میں مبتلا ہیں عاشق صادق اب بھی اپنے انجام و اختتام سے بے خبر اسی خیال میں مدہوش اور اسی کوشش میں سرگرداں ہے کہ محبوب کی فردِ جرم اُس کے سامنے پیش نہ ہو۔ وہ اپنے سارے گلے شکوے بھول کر داورِ حشر کے آگے اُس کی بے گناہی اور معصومی کا پیامبر

بن کے جانا چاہتا ہے - لیکن داغ جیسا عاشق روزِ جزا کا انتظار اس لئے نہیں کرتا کہ اُسے اس دُنیا میں محرومیوں سے دو چار رہنا پڑا ہے یا جو کچھ اُسے یہاں نہیں ملا وہ اُسے دوسری دُنیا میں حاصل کرنے کا طالب ہے - اُس کے نزدیک تو یہ دُنیا بھی ایک تماشا گاہ تھی اور وہ دنیا بھی تماشا گاہ ہوگی' یہاں بھی محبوب سے چھیڑ چھاڑ اور وہاں بھی - بلکہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں طبیعت شوخیوں کی طرف زیادہ مایل ہوگی ــــ کیسے ؟ اس کا اندازہ کچھ شعر سُن کر کیجئے ــ

عرصۂ حشر میں انصاف ہمارا کیسا — دیکھنا یہ ہے کہ ہوتا ہے تماشا کیسا

کہوں گا حشر میں یہ کون میں کون — مزا دے جائے گا انکار میرا

ایسا تو نہ ہو حشر میں تکرار کی ٹھہرے — تو اپنی خطا پر کبھی قایل نہیں ہوتا

رقیبوں کے ہاتھوں سے محشر کے دن — تمھیں چھین کر میں اکڑ رے گیا

دیکھ لینا کہ حشر کا میداں — میرے حاضر جواب نے مارا

محشر میں خلق اپنی مصیبت میں مبتلا — یاں یہ تلاش آئے کوئی خوب رو پسند

محشر میں بعد پرسشِ احوال دیکھنا — ہم دیکھتے پھریں گے تماشا اِدھر اُدھر

داغ جس طرح کے عاشق ہیں، جیسا اُن کا محبوب ہے اور جو حیثیت اُن کے رقیب کی ہے اُس کے اس دنیا میں تو نظر نے ایسے ایسے جلوے دیکھے ہیں کہ کبھی کبھی اُسے اپنے مشاہدہ پر حجاب محسوس ہوا ہوگا لیکن عشق عاشقی کا یہ انداز، محبوبی کی وہ بے باکی اور رقابت کی اوباشی میدانِ حشر میں بھی اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہوتی ہے - ایک طرف تو یہ تصویر ہے کہ میدانِ حشر میں عاشق اور محبوب دونوں بارگاہِ ایزدی میں پیش ہوتے ہیں محبوب کے نامۂ اعمال میں جور و جفا اور ظلم و ستم کی نہ جانے کتنی داستانیں درج ہیں، جو مظلوم اور ستم رسیدہ ہیں وہ داد کے طالب ہیں لیکن جب سوال جواب کی منزل آتی ہے تو عاشق صاحب یا تو صاف مکر جاتے ہیں کہ " اے میرے معبود ! میں نے تو اس کافر کی اس سے پہلے کبھی صورت بھی نہیں دیکھی" محبوب عاشق کے منھ سے یہ غیر متوقع بات سنتا ہے تو ہکا بکا رہ جاتا ہے، چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگتی ہیں اور عاشق صاحب اپنے دل میں خوش ہیں کہ دیکھا کیسا بدلا لیا، دوسری طرف منھ پھیر پھیر کر مسکرا بھی رہے ہیں اور محبوب کی بے چارگی سے لطف و انبساط بھی حاصل کر رہے ہیں - دوسرا منظر وہ ہے کہ جب محبوب کے سامنے فردِ جرم آتی ہے اور وہ حسب عادت اپنی خطاؤں سے انکار کرتا ہے - بھلا عاشق کو اس کی تاب کہاں' وہ برس پڑتا ہے اور پھر دونوں میں وہ تو تو میں میں ہوتی ہے کہ اللہ دے اور بندہ لے - یا پھر یہ تصور کیجئے کہ جب محبوب سے پوچھا گیا کہ کیوں تم نے یہ کیا اور یہ کیا ؟ تو اُس نے وہ لچھے دار تقریر شروع کی کہ داورِ محشر بھی متاثر ہوا اور محبوب صاف بچ کر نکل آیا ــــ یہ منظر تو خیر سب ایسے ہیں جو کچھ زیادہ خلاف توقع نہیں معلوم ہوتے عاشق اور معشوق کی جو حالت جیتے جی دیکھی تھی وہی مرنے کے بعد بھی نظر آئی - یہاں شوخی کا جواب دشنام اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی خو ہے تو وہ بھلا کیسے چھوٹے - لیکن وہاں جہاں ہر فرد بشر آنے والے عذاب کے خوف سے ترساں و ہراساں نفسی نفسی میں مبتلا ہے یہ نانہ سے انوکھے اور نرالے عاشق ایسی حرکتیں کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں جو اس دُنیا میں بھی کی جائیں تو معاملہ تھانہ اور کچہری تک ضرور پہونچے - واقعہ کی تصویر یوں ہے کہ محبوب صاحب جن کا ہرجائی ہونا مسلّم ہے حشر کے میدان میں بھی رقیبوں کا ایک جمِ غفیر اپنے گرد جمع کر لیتے ہیں اور اِن کے سہارے پر اس امید میں وقت کاٹ رہے ہیں کہ مقدمہ پیش ہوگا تو یہ سب ہماری حمایت میں گواہی دیں گے لیکن عاشقِ جاں باز کو ایسی حالت میں بھی بہت دور کی سوجھتی ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے وہ اُس کا ذکر محبوب سے بڑے مزے لیکر اس طرح کرتا ہے کہ ــ

رقیبوں کے ہاتھوں سے محشر کے دن — تمھیں چھین کر میں اکڑ رے گیا

اس کے بعد جو کچھ ہوگا اُس کے تصور سے محبوب گھبرائے یا عاشق مزے لے لیکن ہمیں آپ کو اس جھگڑے میں پڑنے کی ضرورت ہے۔ پھر ایک کو اچھا اور بُرے کو بُرا کہنے کا حق تو آخر ہر ایک کو ہے اور اس حق کی بنا پر داغ اور مومن عاشقی کے سارے عناصر سے متعلق ہم بڑی گھٹیا رائے قایم کرتے ہیں، لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ حشر اور محبوب کے رشتہ کے سلسلہ میں بھی داغ نے کبھی کبھی ایسی باتیں کہی ہیں جو اُن کے عام اندازِ سخن سے مناسبت اور مطابقت نہیں رکھتیں مثلاً ان شعروں میں ؎

محشر میں وہ نادم ہوں خدا یہ نہ دکھائے　　آنکھوں سے کبھی اُن کو پشیماں نہیں دیکھا

(محبوب کی پشیمانی اور اپنی بے بسی کا یہی احساس مومن کو بعد مرگ بھی چین نہیں لینے دیتا ؎

پشیماں آئے ہیں وہ لاش پر اب　　تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

لوگ جانیں گے تصور ان کا نہیں اسکا ہو　　حشر میں آپ دئے جایئے الزام مجھے

اس ترکیب کے سمجھانے میں داغ جیسے عاشق کی فتنہ پردازی کی پوری تصویر ہے لیکن اس ترکیب کے سمجھانے کے پیچھے محبوب کو الزاموں سے بری کرانے کا جو جذبہ کام کر رہا ہے وہ خالص مومن کے تصور سے مستعار ہے۔

خدا ہے حشر کے دن وہ پکارے　　کہاں ہے طالبِ دیدار میرا

یہ وہی داغ ہیں جنھیں حشر کے دن انصاف کی نہیں ایک تماشہ کی توقع اور حسرت ہے۔

کہ دیں گے ہم تو داورِ محشر سے صاف صاف　　اچھوں کو دل نے پیار کیا ہم نے کیا کیا

جانبِ گورِ غریباں وہ نہ آئے　　حشر اے اہلِ عدم بس ہوچکا

یہ تصور کہ حشر صرف محبوب کے "قدومِ میمنت لزوم" کا دوسرا نام ہے داغ کی عاشقی کے لئے بیگانہ سا ہے۔

حال کچھ اے داورِ محشر نہ پوچھ　　حال مجھ میں اب کہاں باقی رہا

"حال کچھ اے داورِ محشر نہ پوچھ" کی بے بسی و بے چارگی داغ کی اپنی بے بسی نہیں بلکہ کسی کا پرتو ہے۔

داورِ محشر کے آگے تو سہی　　لوٹ جاؤ تم مری تقریر پر

اندازِ بیان اور اندازِ فکر میں داغ کی شخصیت نمایاں ہے لیکن جذبہ اور احساس میں مومن کی پاسداری کی جھلک نظر آرہی ہے۔

ڈر ہے کہ بھول جائے نہ سفاک روزِ حشر　　دُنیا میں لکھتے جاتے ہیں اپنی خطائیں ہم

ہم دل کی بات داورِ محشر سے کیا کہیں　　یہ راز کہ کے اُس بُتِ کافر سے کیا کہیں

یارب نہ پوچھ عرصۂ محشر میں رازِ دل،　　کرتا ہوں میں حجاب کی باتیں حجاب میں

یہاں مومن کی صنعتِ ایہام کی جگہ " ذکرِ محبوب" کے لئے کسی گوشۂ حجاب کی تلاش ہے

داغ کی غزلوں میں روزِ جزا اور میدانِ حشر سے متعلق بلا مبالغہ صدہا شعر ہیں لیکن ان سارے شعروں میں داغ کی شخصیت کے صرف دو پہلو اُبھرتے ہیں ایک تو اُن کی وہ شاہد بازی جس کا دامن جابجا اوباشی کے کانٹوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور دوسرے عاشق کی حیثیت سے اُن کا وہ جذبۂ انتقام جو مرنے سے پہلے تصور میں اور مرنے کے بعد روزِ جزا میں بار بار اس چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ داورِ محشر کے سامنے محبوب کو جی کھول کر رسوا کریں اور ناکردہ گناہی کی ساری حسرت وہیں نکال لیں۔ اس وہ سارے انتقام اس زندگی ہی میں مکمل کرلیتے ہیں۔ روزِ جزا آتا ہے اور تصور وہی ساری باتیں سامنے لاکر پیش کر دیتا جن کے منصوبے مدتوں پہلے بنائے گئے تھے، محبوب سے سوال و جواب ہوتے ہیں۔ ایک کہکر دو سُنی جاتی ہیں اور دو سُنکر چار سُنائی جاتی ہیں، طنز، تشنیع، گالی گلوچ غرض کوئی ایسا حربہ نہیں جو استعمال نہ کیا جاتا ہو۔ جب جی بھر کے رسوائی ہو

تو یہ منتقم عاشق سیر کو نکلتا ہے اور جہاں دوسرے اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا ہیں یہ پری رویوں کے جلوے دیکھنے میں مصروف ہے اور اُس ہیجان و اضطراب و انتشار کی گھڑی میں بھی اپنے آپ کو صرف اس مشغلے کے لئے وقف کردیتا ہے کہ چُن چُن کر ایک ایک حسین کو اپنے "تیرِ نظر" کا نشانہ بنائے اور جب کسی مہ وش کو چاہنے والوں کے جمگھٹ میں گھرا دیکھے تو موقع پاکر اُچک کر فرار کی راہ اختیار کرے۔ جن صدہا شعروں کا میں نے ذکر کیا اُن میں سے بعض بعض میں کچھ نئے پہلو بھی ہیں لیکن یہ سارے نئے پہلو اُسی خاص شخصیت کے مظاہر ہیں جسے داغ نے عاشق کے روپ میں اپنی داستانِ غزل کا ہیرو بنایا ہے۔

ایک طرف تو یہ صدہا شعر اور دوسری طرف کہیں کہیں ایسے شعر جن میں معلوم ہوتا ہے کہ کسی نادیدہ طلسم کے اثر سے شاعر کا رنگ روپ بالکل بدل گیا ہے۔ جس نے محبوب کی رسوائی کو اپنا نصب العین بنایا تھا وہ اُس کے ذکر کو بھی بے حجابی کے نشتروں سے مجروح نہیں کرنا چاہتا، اپنی شکایتوں کا دفتر اس لئے باز کرنے سے گریز کرتا ہے کہ محبوب کی پشیمانی کی تاب ممکن نہیں معلوم ہوتی۔ اور اس لئے وہ کہی جانے والی باتوں کے نہ کہنے کے لئے کوئی نہ کوئی جواز تلاش کرتا ہے۔ کبھی اُس کا جی چاہتا ہے کہ حشر کے دن محبوب اُسے "میرا طالبِ دیدار" کہہ کر پکارے اور اِس آواز پہ ہر آرزو قربان۔ کبھی اُس کا تصوّر اُس کے سامنے ایسے امکانات کا دفتر کھول دیتا ہے کہ حشر کا بپا ہونا ہی ممکن نہ رہے، کبھی جب اُس سے حالِ دل پوچھا جاتا ہے تو دل کی بات چھپانے کے لئے صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہے کہ ؎

حال کچھ اے داورِ محشر نہ پوچھ حال مجھ میں اب کہاں باقی رہا

اور پھر جب داورِ محشر کے سامنے ساری داستانِ غم دہرائی جاچکی تو اُس کا دل کسی طرح چاہتا ہے کہ یہ قضیہ یہیں ختم ہوجائے۔ اور وہ اس قضیہ کے ختم کرنے کی صرف ایک معمولی سی جذباتی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے ؎

لوٹ جاؤ تم مری تقریر پر

یا ان سب سے بڑھکر یہ کہ جب روزِ جزا میں محبوب کے ماخوذ ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے تو پیش بندی کے طور پر وہ زندگی ہی میں اُس کی صفائی اور بریت کے لئے مسالہ جمع کرنا شروع کردیتا ہے :-

دُنیا میں لکھے جاتے ہیں اپنی خطائیں ہم

یہ سارے خیالات داغ جیسے عاشق کے لئے بڑے عجیب و غریب ہیں اس لئے قیاس یہی کہتا ہے کہ اس جذبہ کا عکس مومن کی نادانستہ اور غیر ارادی خوشہ چینی کا نتیجہ ہے لیکن شاعر نے اس جذبہ کے اظہار میں اکثر جگہ لہجہ وہی رکھا ہے جو پوری طرح اسکی رگ میں رچا ہوا ہے۔ کہیں کہیں البتہ لہجہ بھی اتنا بدلتا ہے کہ داغ اور مومن ایک معلوم ہونے لگتے ہیں :-

محشر میں وہ نادم ہوں خدا یہ نہ دکھائے آنکھوں نے کبھی اُن کو پشیماں نہیں دیکھا

داغ کے کلام میں شخصیت کی نمایاں انفرادیت کے باوجود ہمیں جابجا مومن کے اندازِ فکر و نظر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اور داغ کے تصورِ حسن و عشق اور اس لئے اندازِ عاشقی و محبوبی میں جو بنیادی فرق ہے وہ دونوں کے رنگِ تغزل میں زمین آسمان کا فرق پیدا کردیتا ہے، لیکن مومن کے طرزِ تغزل میں کچھ ایسی کشش ہے کہ داغ جیسا خود پرست بھی اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا، یہاں تک کہ بعض جگہ اس تاثر نے یہ صورت اختیار کرلی کہ داغ کی شخصیت اور انفرادیت اس کے اندر گم ہوکر رہ گئی لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ عشق، عاشق، محبوب، رقیب اور ان سب کے باہمی رشتہ کے متعلق مومن کے کچھ خاص طرح کے تصوّرات ہیں۔ یہ تصوّرات کچھ تو اُن حالات کے پیدا کئے ہوئے ہیں جن میں رہ کر مومن کو عشق کی کڑی منزلیں طے کرنی پڑی ہیں، کچھ اس لئے ہیں کہ اُن کا محبوب ایک خاص طبقہ سے تعلق رکھتا ہے اور بہت کچھ اس لئے بھی مومن کے مزاج نے اس رشتہ میں ایک تیکھا پن پیدا کیا ہے۔ اس عشق میں خود داری اور رکھ رکھاؤ کی ایک خاص سطح ہے جس سے نیچے مومن کبھی نہیں اُترتے۔

داغ کے یہاں یہ سطح بہت پست ہے اور اس کی وجہ ماحول کا فرق، محبوب کی نوعیت کا فرق اور چاہنے والوں کے مزاجوں اور طبقوں کا فرق ہے۔ اس فرق نے دونوں غزل گویوں کے طرزِ بیان کو بھی ایک دوسرے سے جدا کیا ہے لیکن جس طرح بنیادی تصورات کے اختلاف کے باوجود داغ پر مومن کا عکس ہے اسی طرح طرزِ بیان کے معاملہ میں بھی داغ منفرد ہونے کے باوجود طرزِ مومن سے خاصے متاثر ہیں۔

اس سلسلہ میں مومن کے طرز کی سب سے اہم خصوصیت "طنز" پر ہماری نظر سب سے پہلے جاتی ہے۔ طنز اردو شاعری کی روایت میں فن کے ایک مستقل حربہ کی طرح سب سے پہلے مومن کی وساطت سے داخل ہوئی ہے۔ مومن نے عاشق اور محبوب کے رشتہ کی ساری نزاکتوں کی ترجمانی اسی لطیف وسیلہ سے کی ہے اور عشق کے دشوار سفر کی ساری منزلیں اسی کی رہبری میں طے کی ہیں۔ انھوں نے اردو غزل کو پہلی مرتبہ اس رمز سے آشنا کیا کہ محبوب کے دل میں گھر کرنے کے جتنے آداب عشق نے عاشق کو سکھائے ہیں ان میں طنز سے زیادہ موثر اور دل نشین کوئی نہیں کہ اس میں زہرِ ہلاہل کی تندی و تیزی بھی ہے اور آبِ حیواں کی لذت و حلاوت بھی۔ محبوب سے کڑوی اور میٹھی سے میٹھی بات اسی اندازِ خاص میں کہی جا سکتی ہے۔ طنز اظہارِ جذبات کے نازک سے نازک مرحلہ کو کس طرح طے کرتی ہے اس کا اندازہ مومن کے چند شعروں سے لگائیے:-

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل — تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا
ہنسو نہ تم تو مرے حال پر میں ہوں وہ ذلیل — کہ جس کی ذلت و خواری سے تم کو شان لگی
ہے شرط ہم پہ عنایت میں گونہ گونہ ستم — کبھی محبتِ دشمن کا امتحاں نہ ہوا
غیر ہے بے وفا پہ تم تو کہو، — ہے ارادہ نباہ کا کب تک،
مجھ رمز شناس سے یہ باتیں — کیا خوب، میں غیر سے برا ہوں
رحم فلک اور مرے حال پر — تو نے کرم اے ستم آرا کیا
ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب — غیر اور تم بھلے، بھلا صاحب
ستم، آزار، ظلم، جور و جفا — جو کیا سو بھلا کیا صاحب
آپ مجھ سے نباہیں گے ہم سے — باوفا حسن و بے وفا ہے عشق
میرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو — کہیں دامان تر نہ ہو جائے

یہ شعر مومن کے سیکڑوں طنزیہ نشتروں میں سے چند ہیں۔ لیکن ان چند نشتروں میں مومن کے اندازِ بیان کی بہت سی خصوصیتیں اپنی پوری تیزی اور آب داری کے ساتھ موجود دکھائی دیتی ہیں۔ کہیں عاشق کا لہجہ حد درجہ تند و تلخ ہے اور کہیں درجہ نرم اور شیریں اور کہیں سختی، نرمی، اور تلخی و شیرینی کا بڑا لطیف امتزاج ہے۔ ہر شعر کہنے والے کے جذبہ کی ترجمانی اور مصوری اتنی وضاحت سے کرتا ہے کہ اس کا کوئی پہلو چھپا نہیں رکھتا اس کے باوجود اس پر ایک نازک سا پردہ بھی ہے جو زندگی کی حقیقت کو فن اور شعر کی حقیقت بناتا ہے۔ طنز کا ایک لہجہ یہ ہے کہ ؎

تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

اور دوسرا یہ کہ ؎

جو کیا سو بھلا کیا صاحب

ایک میں تیر اور کمان دونوں عاشق کے ہاتھ میں ہے اور وہ تیر اس مہارت اور مشاقی سے چلاتا ہے کہ سوفار محبوب کے دل میں اتر جاتا ہے، دوسرے میں اس کی حالت ایک ایسے تیر انداز کی ہے جو اپنے سارے تیروں کو ترکش میں رکھ کر صیادی کا منصب اسے سونپتا معلوم ہوتا ہے جسے کبھی صید بنایا تھا۔ لیکن لطف یہ ہے کہ حالات کے اس بدیہی تغیر نے نصب العین کی نوعیت

دی فرق پیدا نہیں کیا۔ مقصود بہرحال محبوب کو اپنی طرف مایل کرنا اور اپنے ناسور کے لئے مرہم کی جستجو ہے۔ مومن کی طنز یہ کام ہر حیلہ سے نکالتی اور بڑی کامیابی سے نکالتی ہے اور اس کامیابی کا راز یہ ہے کہ طنز میں بھی مومن نے ایک خاص سطح سے نیچے اُترنے سے اجتناب کیا ہے۔ اُن کے اندازِ تخاطب میں ابتذال یا سوقیت کی نام نہاد جھلک بھی نہیں۔

مومن کے طرز کی اس خصوصیت کو داغ نے بھی جی کھول کر برتا ہے یہاں تک کہ طنز اُن کے اندازِ بیان کی ایک نمایاں خصوصیت بن گئی ہے۔ لیکن عشق کے دوسرے معاملات کی طرح یہاں بھی داغ کے مزاج نے اپنا راستہ الگ بنایا ہے اور طنز کو طنز کی سطح سے اُتار کر طعن و تشنیع کی سطح پر لاکر کھڑا کردیا ہے اور اس طعن تشنیع میں بھی کبھی بھاری بھرکم پن پیدا کرنے یا قایم رکھنے کی ناحق کوشش ہرگز نہیں کی، اس لئے کہ اُن کے نزدیک اُن کا محبوب اس کا مستحق ہی نہیں کہ اُس سے بات کرتے وقت لطافتوں کا سہارا لیا جائے یا حسنِ بیان کے پردے ڈالے جائیں۔ وہ لگی لپٹی رکھنے کے بجائے ہر بات صاف صاف، کھلم کھلا اور برملا کہتے ہیں اور شاید اس لئے کہتے ہیں کہ اسی کو کارگر جانتے ہیں۔ چند شعر دیکھئے:-

غیر کا حال چھپائے سے کہیں چھپتا ہے — گو کسی وجہ سے میں آپ کے منھ پر نہ کہوں
خوبیاں کل تو بیاں ہوتی تھیں، — آج ہے شکوۂ اغیار یہ کیا،
تھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو — اور ہوتی ہے خطاوار کی صورت کیسی
دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہوگیا یقیں، — تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا
کیوں رنج دئے دل کو جو فریاد کا ڈر ہے — تھی آپ کی مرضی کہ یہ مضطر بھی نہ ہوتا
ہوئی جاتی ہیں کیوں نیچی نگاہیں — کہو تو کیا ہے قربان اس حیا کے
نفرت ہے صرف وصل سے اچھا یوں ہی سہی — لو اور کوئی بات سنو وہ نہیں سہی
بے داد کرکے چاہتے ہو لو جفا کی داد — بہتر، بجا، درست سہی آفریں سہی

ان سارے شعروں میں طنز اپنا ایمائی منصب ترک کرکے کھری کھری سنانے پر اُتر آئی ہے اور اس لئے مومن کے جذبہ کی شدید تلخی کے باوجود اُس میں جو شاعرانہ لطف ہے وہ اس میں باقی نہیں۔ طعن، تشنیع اور جلی کٹی کا یہ انداز اور کہیں موزوں ہو تو شعر کی نزاکت اور لطافت پر یقیناً بار گزرتا ہے اور یہی چیز مومن اور داغ کے رنگ میں فرق پیدا کرتی ہے اور داغ کی غزل کا مطالعہ کرنے والا شدت سے محسوس کرتا ہے کہ مومن سے لی ہوئی جس مخصوص روایت کو داغ اتنی کثرت اور اتنی آزادی سے برتا ہے۔ اپنی ہم نشینی میں اُس کی صورت کتنی مسخ کی ہے لیکن یہ بات کہتے ہی داغ کے کچھ ایسے شعر بھی دماغ میں چکر کاٹنے لگتے ہیں جہاں داغ کی طنز اور مومن کی طنز میں ذرا بھی فرق نہیں معلوم ہوتا ؎

عمر بھر آپ نے مجھ کو کبھی اچھا نہ کہا — خیر اچھا نہ سہی آپ کا بیمار تو ہوں

مومن پہلا مصرعہ شاید کسی اور طرح کہتے ہیں لیکن داغ نے دوسرا مصرعہ یقیناً مومن کے رنگ میں ڈوب کر کہا ہے۔ دو شعر اور دیکھئے:-

سچ ہے تیری ہے آرزو مجھکو، — کہیں جینے دے یوں ہی تو مجھکو،
ہر اک میں عیب نکلیں گے کہاں تک — تمھیں اچھے سہی سارے جہاں سے

پہلے شعر میں ذرا کم اور دوسرے میں پوری طرح مومن کی طنز کی شوخی اور گرمی بھی ہے اور سطح کی وہ ہلکی لیکن نمایاں بلندی بھی جو داغ کی طنز میں عموماً باقی نہیں رہتی۔ چھوٹی بحر کا ایک شعر ہے:-

ذکر مہر و وفا تو ہم کرتے — پر تمھیں شرمسار کون کرے

طنز کا ایمائی انداز خالص مومن کا ہے :-

ہم مٹ گئے تو پرسشِ نام و نشاں ہے اب — اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب

خیال کے طنزیاتی پہلو اور اُس سے بھی زیادہ اس کے خالص طنزیاتی انداز میں مومن کی عاشقانہ اور فن کارانہ شخصیت کا رنگ چھایا ہوا ہے۔

اسی غزل کا ایک دوسرا شعر ہے :-

ظالم کہیں خدا نہ کرے تو نے اُسے — جو کچھ شبِ فراق میں وردِ زباں ہوا ب

شعر میں 'ظالم' کے لفظ کی موزوں ترتیب اور اندازِ تخاطب میں ایک سفاکانہ روا داری سے مومن کے انداز کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ خصوصاً یہ مصرع کہ "ظالم کہیں خدا نہ کرے تو نے اُسے" وہی فضا پیدا کرتا ہے جو مومن کے حسنِ تغزل کے لئے مخصوص ہے۔

دو تین شعر اور سنئے اور غور کیجئے کہ ان کی طنز میں داغ سے کہیں زیادہ مومن کی شخصیت کا پرتو ہے کہ نہیں ـــ

تو نہ کر نخوتِ شباب بہت — ہم نے دیکھے ہیں انقلاب بہت

داغ کو زندگی اور فن دونوں میں پردہ داری سے جو فطری بے تعلقی ہے وہ شاید اُنھیں اس طرح کا شعر ہرگز نہ کہنے دیتی اگر مومن کی طنز نگاری کا سحر اُنھیں اپنا گرویدہ نہ بناتا۔ "ہم نے دیکھے ہیں انقلاب بہت" میں لہجہ کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ طنز کی جو نشتریت ہے اُس سے داغ کا مزاج نا آشنا اور اُن کا فن بیگانہ ہے۔

اُس کو مٹائے دیتی ہے بیدادِ آپ کی — اب کیجئے کرم ستمِ روزگار پر

اُٹھ نہیں سکتی حیا کے بوجھ سے — رحم آتا ہے نگاہِ یار پر

داغ کی طبیعت کا وہ تبختر اور غرور جو کچھ تو اُن کے ماحول کا پیدا کیا ہے اور کچھ قسامِ ازل کی ودیعت ہے نہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ کسی کے احسان مند ہوں اور نہ اس طرف مایل کرتا ہے کہ وہ کسی کے درد و الم سے متاثر ہو کر اُسے دور کرنے کی سبیلیں تلاش کریں۔

ع اب کیجئے کرم ستمِ روزگار پر

اور ع رحم آتا ہے نگاہِ یار پر'

میں کردار کی نرمی اور بیان کی جو گھلاوٹ ہے اُس سے داغ کا کردار قطعی نا آشنا ہے۔ کردار میں یہ انقلاب کسی کی آشنائی کا طفیل ہے ــــ اور یہ آشنائی مومن کے سوا کسی اور کی نہیں۔

مومن کے طرزِ بیان کی ایک اور خصوصیت جس سے اُن کے اندازِ تغزل میں انفرادیت بھی پیدا ہوئی ہے اور امتیاز بھی ملا ہے کہ مومن اپنے محبوب سے اپنے فایدہ کی بات اس طرح گھما پھرا کر کہتے ہیں کہ محبوب کو اُس میں اپنے نفع کا پہلو نظر آنے لگتا ہے اور یوں وہ نادانستہ کوئی ایسی بات کرنے کی طرف مایل ہو جاتا ہے، جس سے عاشق کا بھلا ہو جاتا ہے۔ اُن کے طرزِ ادا کے اس پہلو کا عکس بعض شعروں میں دیکھئے :-

شعلۂ دل کو نازِ تابشِ ہے — اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

خواہشِ مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ — دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا — میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا، — جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں
سرمگیں آنکھوں سے نامہ کو لگاتے کیوں ہو — خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو
درباں کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجے قتل — ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

ان شعروں پر الگ الگ اور پھر ملاکر نظر ڈالئے تو کئی نتیجے نکلتے ہیں :-

(۱) عاشق جن چند باتوں میں محبوب سے التفات و توجہ کا طالب ہے اُن میں سے چند یہ ہیں کہ وہ اُسے جلوہ دکھاتا رہے، یہ اُس کے لئے مخصوص ہو، رقیب اس سے محروم رہیں، محبوب اُس پر ظلم وستم تو کرے کہ یہ اُس کی فطرت ہے لیکن اتنا نہ کرے کہ عا کے لئے اُس کی برداشت ممکن نہ رہے۔

۲- یہ ساری باتیں اگر عاشق محبوب سے صاف صاف کہے تو اُسے یقین ہے کہ وہ ان میں سے کسی ایک کو قابلِ اعتنا نہ سمجھ اس لئے اُس نے سوچا کہ بات اس پیرایہ میں کہی جائے کہ محبوب کے مخصوص میلانات کے باوجود ان پر عمل کرنے پر مجبور ہوجائے

۳- اپنی بات وہ ایسے لفظوں میں ادا کرے کہ وہ محبوب کے مرتبہ کے بھی شایانِ شان ہو اور خود اُس کی محبت کی سطح اُس سے جس سطح پر اُس نے اُسے ہمیشہ رکھا ہے۔

۴- اِن ساری چیزوں میں عاشق (یا شاعر) کی شخصیت اور محبوب کی سماجی حیثیت کو بڑا دخل ہے۔

ع اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا
ع دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا
ع منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو
ع ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا
ع خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

کو ایک مرتبہ پھر اس پورے سیاق و سباق میں دیکھئے تو لہجہ کی "پُرکاری" کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اِن شعروں کے اندازِ خا نظر میں رکھ کر اب داغ کی طرف رجوع کیجئے۔

عاشق کی حیثیت سے داغ کے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ محبوب کے مقابلہ میں کسی طرح کی کمتری احساس کو بھی قریب نہیں آنے دیتے۔ وہ محبوب کو محبوب جان کر بھی خود کو اُس کا ہمسر بلکہ کبھی کبھی عشق کے کاروبار میں غالب سمجھتے ہیں اور اس لئے جب اُس سے کوئی مطالبہ کرتے ہیں تو اُنھیں کسی نازک وسیلۂ اظہار کا محتاج یا دست نگر ہونے ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ ہر بات کھُلی کھُلی کرنے کے عادی ہیں اور اُنھیں معلوم ہے کہ محبوب سے کام نکالنے کا سب سے آسا سب سے موثر طریقہ یہی ہے اس لئے کہ جس طرح کے محبوب سے اُنھیں سابقہ پڑا ہے اُس کا طرزِ زندگی اور اس لئے اندازِ نظر بھی کے کسی مرحلہ کو حُسن یا نزاکت سے طے کرنے کے موافق نہیں۔ لیکن عشق اور محبت کا ظالم رشتہ ہی ایسا ہے کہ عاشق کو ہمیشہ طلب کا غلام رکھتا ہے۔ لیکن داغ نے اس طلب و احتیاج میں بھی اپنے احساسِ برتری کو ٹھیس نہیں لگنے دی اور اس بات میں مومن سے بڑی مدد ملی ہے۔ اُنھوں نے محبوب سے جب کسی بات کا مطالبہ کیا ہے تو اکثر تو بات خوب کھُل کر اور بغیر کسی پردہ کی ہے لیکن بہت سے موقعے ایسے بھی آئے ہیں جب اُنھوں نے سیدھی بات کرنے کے بجائے مومن کی "فن کارانہ کج روی" کی پ کی ہے ؟ اس کا اندازہ کچھ شعر پڑھ کر کیجئے ؎

(۱) بیٹھے ہو بزم میں ساقی تو یہ خیال رہے — کسے سرور نہ آیا، کسے سرور آیا
(۲) کیا ہاتھ اُٹھاتے ہی نہ اُٹھے گی قیامت — بس جان لو تم فیصلہ ہے اب کی دُعا میں

(۳) دیکھی نہ ہوگی سیر کبھی اس شکار کی — دیکھو رقیب پر سگِ درباں کو چھوڑ کر
(۴) جو ہوتی خوبصورت تو نہ چھپتی قیس سے لیلیٰ — مگر ایسے ہی ویسے پردۂ محمل میں رہتے ہیں
(۵) قیامت کی تجلّی ہے تمھارے روئے روشن میں — مجھے ڈر ہے کہ دیکھو آگ لگ جائے نہ چلمن میں
(۶) بُرا ہے شاد کو ناشاد کرنا — سمجھ کر سوچ کر بیداد کرنا
(۷) دیکھو دیکھو مجھ پہ برساتے رہو تیرِ نگاہ — صید جس دم آنکھ سے اوجھل ہوا جاتا رہا
(۸) کیجئے تیغِ تبسم سے ہلاک — جور بھی اچھوں کو اچھا چاہئے

گھما پھرا کر بات کرکے محبوب کو اپنی راہ پر لگانے کی جو تعلیم داغ نے مومن سے حاصل کی ہے اُس کا پرتو اوپر کے آٹھوں شعروں میں ہے (اور یہ آٹھ شعر اُن بے شمار شعروں میں سے چند ہیں جن سے بیان کے اس خاص پہلو کا اظہار ہوتا ہے) لیکن ان سب میں داغ، اُن کے محبوب اور اُن کے رقیب کے منفرد کرداروں کا بڑا واضح عکس موجود ہے۔ دوسرے اور چھٹے شعر میں اپنا مطلب نکالنے کے لئے داغ نے محبوب سے جو کنایہ کی بات کہی ہے اُس میں دونوں جگہ دھمکی کا سا انداز ہے "بس جان لو" اور "سمجھ کر سوچ کر" کا اندازِ تخاطب داغ کو بھی عجیب نہیں معلوم ہوتا اور محبوب بھی اسے خوشی سے گوارا کرلیتا ہے بلکہ اس طرزِ تخاطب سے متاثر ہوکر وہی کرتا ہے جو عاشق کا مدعا ہے۔ عاشق محبوب سے وصل کا طالب ہے اور وہ کسی طرح میسّر نہیں آتا۔ دعائیں بھی ہوتی ہیں تو بے تاثیر رہتی ہیں اور اس لئے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھاکر اور ایک کامیاب ایکٹر کی طرح آنکھوں میں ایک جذب کی کیفیت طاری کرکے عاشق کہتا ہے "بس جان لو تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور محبوب بے چارہ گھبراکر دُعا کے لئے اُٹھے ہوئے ہاتھوں کو پکڑ کر کہتا ہے "خدا کے لئے ایسا نہ کرو۔ اب ہم تمھارا کہا کریں گے"۔ یہی صورت چھٹے شعر کی ہے۔ داغ کا یہ کہنا کہ 'سمجھ کر سوچ کر بیداد کرنا'، محبوب کو نہ جانے کس کس وہم میں مبتلا کرتا ہے اور وہ جفا سے باز آجاتا ہے۔

اب آگے چلئے۔ مومن کہتے ہیں ؎

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

اور ؎

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

داغ بھی اسی طرح کی کوئی چال چلنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی چال کا انداز ہی اور ہے ؎

دیکھو دیکھو مجھ پہ برساتے رہو تیرِ نگاہ — صید جس دم آنکھ سے اوجھل ہوا جاتا رہا

محبوب ان کی طرف دیکھ رہا ہے اور یہ بے حد مسرور ہیں لیکن اتنے میں رقیب آجاتا ہے اور محبوب کی نظر پلٹ کر اُدھر جانے لگتی ہے۔ ابھی اپنا پورا سفر طے نہیں کرسکتی کہ داغ کی عیّاری ایک ڈرامہ کا روپ اختیار کرکے پوری فضا پر چھا جاتی ہے اور ہر طرف ایک شور سنائی دیتا ہے ؎

دیکھو دیکھو مجھ پہ برساتے رہو تیرِ نگاہ

محبوب کی نظریں گھبراکر پھر ادھر پلٹ آتی ہیں اور عیار اس فرصت کو غنیمت جان کر کہتا ہے۔

؎ صید جس دم آنکھ سے اوجھل ہوا جاتا رہا

تماش بینی محبوب کی ایک ایسی کمزوری ہے جس سے داغ نے بار بار فایدہ اُٹھایا ہے۔ لیکن رقیبانہ کردار کا جو عکس اس شعر میں ہے کسی اور میں کم ہوگا ؎

دیکھی نہ ہوگی سیر کبھی اس شکار کی — دیکھو رقیب پر سگِ درباں کو چھوڑ کر

اس مشورہ میں جس مدعا کا حصول مقصود ہے وہ ظاہر ہے لیکن مشورہ کی نوعیت میں عاشق کے کردار اور مزاج کی پستی اور

بوب کی طبیعت کی پستی اُس سے بھی زیادہ ظاہر ہے اور واضح ہے۔

مومن کا محبوب "پردہ نشین" ہے اور وہ اُسے اپنی غرض مندی کی خاطر بھی بے پردہ نہیں کرنا چاہتے لیکن داغ تو ایسے جلووں کے بھوکے ہیں جن میں پردہ داری کو ذرّہ برابر دخل نہ ہو اسی لئے کنایتہً کہتے ہیں کہ ع "مگر ایسے ہی ویسے پردۂ محمل میں رہتے ہیں"

ان سب شعروں کو پڑھ کر بھی اسی طرح کے کچھ بدیہی نتیجے نکال سکتے ہیں جو مومن کے شعروں نے ہمارے ذہن پر مترتب کئے تھے۔

(۱) ان شعروں میں بھی عاشق محبوب سے کچھ چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے، التفات و توجہ کا، جلوۂ عام کا جو اس کے لئے مخصوص ہو، رقیب سے بے تعلقی کا، ظلم و ستم سے باز رہنے کا۔

(۲) ان ساری باتوں کا اظہار وہ بھی اپنی عادت اور اپنے معمول کے خلاف ایسے انداز میں کرنا چاہتا ہے کہ بات محبوب کو اپنے فایدہ کی بات معلوم ہونے لگے اور اس طرح وہ اسے زیادہ قابلِ اعتنا جانے۔

(۳) اس انداز کے اختیار کرتے وقت اُس کا اپنا مزاج اور محبوب کے معاملہ میں اُس کی ماہرانہ مزاج شناسی اُس کی رہبر و رہنما ہو

(۴) اور اس لئے اُس کے تخاطب کا طرز اُسی سطح کا ہے جس سطح کا اُس کا عشق اور اُس کا محبوب ہے۔

داغ کے اندازِ بیان کا ایک پہلو اور ہے جس پر مومن کے طرز کا اثر بہت واضح ہے۔ مومن نے اپنی غزل میں جہاں ایک طرف عاشقی اور محبوبی کے روایتی اور فرسودہ تصور کو چھوڑ کر اُسے اپنی زندگی کا ترجمان بنایا ہے اور عشق کی ایک مریضانہ کیفیت کو احساس کی صحیح تازگی دی ہے دوسری طرف اُس کے اشاروں کنایوں اور علامتوں کو بھی اپنے لئے بیگانہ قرار دیا ہے۔ اُن کی غزل گل، بلبل اور شمع و پروانہ اور یہاں تک بادہ و ساغر کے سہارے کو اپنی بقا کا سہارا نہیں سمجھتی۔ کسی حد تک داغ کا بھی یہی حال ہے لیکن اُن میں چونکہ مومن کی شخصیت کی عظمت نہیں اس لئے وہ کبھی کبھی دریوزہ گری سے بھی اجتناب نہیں کرتے۔ مومن نے نہ صرف روایتی بیان کو ترک کیا ہے بلکہ کچھ ایسے لفظوں کے استعمال کو عام کیا ہے جو اُن کے مفہوم عشق کی وضاحت زیادہ صحیح طریقہ سے کر سکتے ہو۔ رقیب کے لئے دشمن اور غیر کے لفظ کی تخصیص تکرار اور کثرت اس کی ایک مثال ہے۔ داغ اس خاص معاملہ میں مومن کے بہت بڑے پیرو ہیں اور مومن کے "دشمن" اور "غیر" کو انھوں نے اُن کے مخصوص مفہوم سے وابستہ کئے بغیر بھی محض رسماً برتا ہے۔ مثال کے لئے صرف چند شعر دیکھئے:-

احسان مانتا ہوں ستم ہائے غیر کا
بگڑا ہوا مزاج تمھارا بنا دیا

تم غیر کی تعریف کرو قہرِ خدا ہے،
معشوق کو یوں بندۂ احساں نہیں دیکھا

خوبیاں کل تو بیاں ہوتی تھیں
آج ہے شکوۂ اغیار یہ کیا

تم اپنے ہاتھ سے دو پھول غیر کو چن کر
یہ داغ کب ذلِ امید وار سے اُٹھا

غیر بھی میری طرح کرتے ہیں آہیں کیونکر
ہم بھی دیکھیں تو پلٹتی ہیں نگاہیں کیونکر

سراغِ مہر و اُلفت غیر کے دل میں نہ پائیں گے
عبث وہ رات دن اس سعی بے حاصل میں رہتے ہیں

پائی مرے سُراغ سے دشمن نے راہِ دوست
اے بیخودی مجھے نہ رہا ہوشِ نقشِ پا

رشکِ دشمن نے مجھے آنکھیں دکھائیں دور سے
شوقِ نظارہ جو سوئے روزنِ در لے چلا،

دشمن کی ندامت نے اُنھیں پیار دلایا
لے کاش مرے ذمّہ بھی الزام نکلتا

الٰہی کیوں نہیں اُٹھتی قیامت ماجرا کیا ہے
ہمارے سامنے پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں

مرگ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھکو ملال
دشمنی کا لطف شکووں کا مزا جاتا رہا

داغ ان شعروں میں 'غیر' اور 'دشمن' کے الفاظ کو استعمال تو کئے ہیں لیکن ان میں سے کسی میں خیال کا انداز ایسا

نہیں جس کی بنا پر ان میں سے خاص لفظ کے اِس شعر میں ہونے کا جواز ثابت کیا جا سکے۔ جہاں رقیب کو 'غیر' یا 'دشمن' کہا گیا ہے وہاں کچھ اور بھی کہہ دیا جاتا تو شعر کے مفہوم یا اُس کے مجموعی تاثر میں کوئی فرق نہ آتا اس لئے کہ مومن کے یہاں ان لفظوں کے استعمال کے ساتھ معانی کا جو خاص اور نازک مفہوم وابستہ ہوگیا ہے وہ داغ کے استعمال میں نہیں موجود نہیں۔ یہ لفظ تو غزلوں میں اس لئے لائے گئے ہیں کہ مومن نے ان میں ایک دلکشی پیدا کردی تھی۔

یہی حال 'پردہ نشین' اور 'ہم نشین' کے لفظوں کا ہے، یہ دونوں لفظ داغ کے لغت میں داخل نہیں ہیں اُن کے چاروں دیوانوں میں مشکل سے چند شعروں میں ملتے ہیں اور اُن کی ان شعروں میں موجودگی مومن کی اثر آفرینی اور اثرانگیز کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ فرق صرف یہی ہے کہ داغ نے 'دشمن' اور 'غیر' کے لفظ کو پوری آزادی سے اور جی کھول کر برتا ہے ا 'پردہ نشین' اور 'ہم نشین' کے لفظ ان کے مقابلہ میں اپنے شعروں میں کم لائے ہیں۔ اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس طر اُن کا محبوب "پردہ نشینی" کے اوصاف سے بیگانہ ہے اسی طرح اُن کے عشق کو "ہم نشین" کی "ہم نشینی" گوارا نہیں۔

داغ کے کلام پر مومن کے رنگِ تغزل کے جو نقوش ہیں کہیں ہلکے، کہیں گہرے وہ خیال، فکر، جذبہ اور احساس کے علا بیان کے مختلف پہلوؤں میں بھی طرح طرح سے اُبھرتے اور چمکتے ہیں اور اس کی وضاحت اُن بہت سی مثالوں سے ہوتی۔ جو اثر کے اِن پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کے سلسلہ میں اب تک پیش کی گئی ہیں لیکن داغ کی غزل پر مومن کی غزل یا اُن کے مخ انداز غزل کا اثر ان بے شمار جستہ جستہ شعروں میں بھی نظر آتا ہے جن میں داغ نے دانستہ یا غیر ارادی طور پر مومن کے کسی خا مضمون سے خیال اور بیان دونوں کی شمعیں روشن کیں اور دونوں کو جلا دی ہے۔ اس طرح کی تھوڑی سی مثالوں کو ا "حکایتِ لطیف" کی آخری کڑی سمجھ لیجئے۔

مومن کی غزل کا ایک بے حد محبوب اور پسندیدہ مضمون وہ ہے جس میں مومن نے اپنے عشق کے اُس پہلو کو بے نقا کیا ہے جہاں وہ مومن ہوکر بھی بتوں کے پجاری ہیں۔ مومن نے اپنے مقطعوں میں اپنے تخلص کے بے تکلف صرف سے ا ایسے فائدے اُٹھائے ہیں کہ شاعروں کو اُس پر رشک آتا ہے اور شعر سے لطف لینے والے اُس پر سر دھنتے ہیں۔ مومن کا اور اس تخلص کی آغوش میں پرورش پانے والی دین داری ایک طرف اور صنم پرستی کی لذت دوسری طرف — ان دونوں کے تصادم مومن کے مقطعوں میں ہوئے ہیں اُن میں جیت ہمیشہ بتوں ہی کی ہوئی ہے اور یہ جیت کبھی کبھی تو ایسی بڑے بڑے خدا پرست کو کعبہ کا مجاور بننے کے بجائے صنم خانہ کا پجاری بننے کی ترغیب دلاتی ہے۔ مومن کے بارہا سنے شعروں میں سے چند کا اعادہ شاید اس جگہ بے محل نہ ہو۔

ہائے صنم ہائے صنم لب پہ کیوں   خیر ہے مومن تمھیں کیا ہوگیا
رات دن بادۂ و صنم مومن   کچھ تو پرہیزگار ہونا تھا،
عرضِ ایماں سے ضد اُس غارت گرِ دیں کی بڑھی   تجھ سے اے مومن خدا سمجھے یہ تو نے کیا کیا
زانوئے بُت پہ جان دی دیکھا   مومن انجام و اختتام مرا،
چھوڑ بُت خانہ کو مومن سجدہ کعبہ میں نہ کر   خاک میں ظالم نہ یوں قدرِ جبیں سائی ملا
مومنِ دیندار نے کی بُت پرستی اختیار   ایک شیخ وقت تھا سو بھی برہمن ہوگیا
کیوں سنے عرضِ مضطرِ مومن   صنم آخر خدا نہیں ہوتا
ہم بندگیِ بُت سے ہوتے نہ کبھی کافر   ہر جائے گراے مومن موجود خدا ہوتا

ان شعروں پر کسی تبصرہ کے بغیر اب داغ کے کچھ شعر دیکھئے ۔

وہ بُت دل میں مہماں ہوا چاہتا ہے ، نیا دین و ایماں ہوا چاہتا ہے
لو اے سنو سنو کہ وہ داغ صنم پرست مسجد میں جا کے آج مسلمان ہوگیا
ڈرو اللہ سے اے داغ دیکھو ہوش میں آؤ بتوں کی یاد میں غافل خدا سے اس قدر رہنا

چاہئے تو اس جگہ مومن کا یہ شعر ایک بار پھر پڑھ لیجئے ؎

رات دن بادۂ وصنم مومن کچھ تو پرہیزگار ہونا تھا ،
کم ہوگا داغ سا بھی مکار اس جہاں میں اُس بُت پہ شیفتہ ہو اور نام لے خدا کا
ہوئے ہیں داغ کے مذہب سے حیراں کافر و مومن کبھی اس حال میں دیکھا کبھی اُس حال میں دیکھا

مومن کا شعر ہے ؎

دیر و کعبہ یکساں ہے عاشقوں کو لے مومن ہو رہے وہیں کے ہم جی لگا جہاں اپنا
بے نیازی کی ادا ان میں نہ ہوتی ہرگز داغ یہ بُت جو نہ اللہ کے پیارے ہوتے
پھر اُس بُت پر فدا ہیں حضرتِ داغ قسم کھائی تھی کعبہ میں خدا کی
بندۂ عشق ہو ایسے کہ الٰہی توبہ تم تو معشوق کو لے داغ خدا مان گئے

داغ کے ان شعروں میں بندگیِ عشق ، شیفتگیِ بُت اور دینداری اور صنم پرستی کی جو کشمکش ہے اُسے داغ کے مزاج ن کے تصورِ عشق اُن کی شاعری کے مجموعی انداز اور خود اُن کے تخلص سے کوئی مناسبت اور مطابقت نہیں لیکن مومن کے لکِ تغزل سے اُنھیں جو فطری مناسبت اور اس لئے شیفتگی ہے اُس نے اُن سے یہ شعر کہلوائے ہیں۔ اور ایسے شعر تو داغ رے کلام میں سیکڑوں ہیں جنھیں پڑھ کر ذہن فوراً مومن کے کسی نہ کسی مشہور شعر کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ صرف چند شعر سُن لیجئے

محشر میں وہ نادم ہوں خدا یہ نہ دکھائے آنکھوں سے کبھی اُس کو پشیماں نہیں دیکھا (داغ)
پشیماں آئے ہیں وہ لاش پر اب تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے (مومن)
خدا کا ذکر تو اُس بُت کے سامنے کرتے مگر وہ ایک ہی کافر ہے خود پسندوں میں (داغ)
خدا کی یاد دلاتے ہیں ہجر میں احباب ہزار شکر کہ اس دم وہ بدگماں نہ ہوا (مومن)
جوابِ وصل سے کیونکر نہ ہوں میں شادیِ مرگ خوشی بھی اور خوشی دل رُبا کے آنے کی (داغ)
خوشی نہ ہو مجھے کیوں کر قضا کے آنے کی خبر ہے لاش پہ اُس بے وفا کے آنے کی (مومن)
گیا رقیب کے گھر با رہا شبِ وعدہ بہت ذلیل مجھے تیری جستجو نے کیا (داغ)
اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا ذلیل میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بھل گیا (مومن)
کہا ظالم نے میرا حال سُن کر وہ اِس جینے سے مرجائے تو اچھا (داغ)
مر چُک کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے کہتے تو ہیں بھلے کی ولیکن بُری طرح (مومن)
خدا جانے کہے کیا جا کے قاصد ، دل اس سے پیشتر جائے تو اچھا (داغ)
رشکِ پیغام ہے عناں کشِ دل ، نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے (مومن)
بتوں سے عفوِ جرمِ عشق بھی چاہیں تو کہتے ہیں خدا تو ہم نہیں بخشیں گنہ امیدواروں کا (داغ)
مٹنے کیوں عرضِ مضطرب مومن صنم آخر خدا نہیں ہوتا (مومن)
فکر ہے دوست کو احوال سناؤں کیونکر ٹکڑے ہوتا ہے کلیجہ مرے افسانے سے (داغ)

سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں کہ سخت چاہیئے دِل اپنے راز داں کے لئے (مومن)

ان شعروں کی حیثیت ' مشتے نمونہ از خروارے ' کی ہے، ورنہ مومن اور داغ کے کلام کو اس نظر سے پڑھا جائے کہ دونوں کے یہاں سے مشترک مضمونوں کے اشعار کی تلاش مقصود ہو تو ایسے سیکڑوں شعر ملیں گے جس میں داغ نے خیال کی شمع مومن کے چراغ سے روشن کی ہے۔ یہ فرق البتہ ہوگا کہ اس شمع پر فانوس خود داغ نے چڑھایا ہے اور بصورت تاثر کی ان اکثر مثالوں میں موجود ہے جو اب تک پیش کی گئی ہیں۔ داغ، مومن کے ایک خاص انداز سے متاثر ہوئے اور اُن کی شخصیت نے اس انداز کو اپنے خاص رنگ میں رنگ لیا پھر بھی دونوں رنگوں کی آمیزش ایک ایسا رنگ پیدا کرتی ہے کہ اُس میں دونوں کی شوخی صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔ داغ کو لوگ کو اپنی انفرادیت کی وجہ سے پسند کرتے اور سراہتے ہیں، آئندہ بھی ایسا ہوگا لیکن اس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ داغ کو داغ بنانے میں جہاں اور بہت سی چیزوں کا حصہ ہے مومن کے تغزل کو بھی اس میں خاصا دخل ہے اور اس دخل نے بہرحال اچھے نتیجے پیدا کئے ہیں، خیال کے اعتبار سے بھی اور اظہار و بیان کے اعتبار سے بھی۔ یہ ممکن ہے کہ خود داغ کو اس کا احساس نہ ہو۔

گوشوارۂ کلام داغ

نام دواوین	غزلیات تعداد اشعار	رباعیات	مخمسات	مسدس	قصائد	قطعات تاریخی	قطعات غیر تاریخی	سہرا	سلام	اشعار متفرق	اشعار جملہ تعـ
گلزار داغ	۳۸۹ / ۴۹۴۳	۷	۲ / ۷۵ بند	۱ / ۲۳ بند	۲ / ۱۲۰ اشعار	۲ / ۲۰ شعر	۰	۰	۰	۰	۱۲۷۸
آفتاب داغ	۱۲۹ / ۱۷۵۲	۸	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۷۶۸
مہتاب داغ	۲۹۲ / ۴۱۷۶	۱۹	۲ / ۱۷ بند	۰	۶ / ۵۱۰ اشعار	۴۳ / ۳۳۰ شعر	۴ / ۴۶	۳ / ۴۰	۲ / ۲۳	۱۲۰	۱۳۱۸
یادگار داغ	۱۵۶ / ۱۷۷۲	۸	۰	۰	۲ / ۱۹۶ اشعار	۳۴ / ۱۲۹ شعر	۳ / ۵۶	۲ / ۳۳	۱ / ۲۱	۱۰۸۸	۶۱۱
میزان	۹۶۶ / ۱۲۶۴۳	۴۲	۸ / ۹۲ بند	۱ / ۲۳ بند	۱۰	۱۰۹	۷	۹	۳	۱۲۰۸	۹۶۵

(داغ ۔ نوراللہ محمد نوری)

داغ عظیم آباد میں

(ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی)

شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا داغ آیا تو باغ باغ آیا

استادی حضرت داغ مرحوم کے عظیم آباد آنے کا ذکر سرسری طور پر بعض تذکروں میں مذکور ہے ۔ تاریخ ادب اردو مولا
بو سکسینہ مترجمہ میرزا عسکری مرحوم (صفحہ ۳۶۷) میں بھی لکھا ہے کہ لکھنؤ، پٹنہ اور کلکتہ کا بھی سفر کیا ۔ لیکن عظیم آباد
آنے کا سبب، ورود، استقبال و خیر مقدم، جائے قیام وغیرہ کا حال بہت کم لوگوں کو معلوم ہے :
پچیس برس قبل تک ایسے چند اشخاص بقید حیات تھے جو ان کیفیتوں کو بچشم خود دیکھ چکے تھے لیکن اب چشم دید واقعات ب
کرنے والے کوئی موجود نہیں، خود میری عمر چھیاسٹھ برس کی ہے اور ان واقعات کو بہتر برس ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس وقت
عنفوانِ شباب تھا اور سن کے تفاوت کے سبب میں خود اس انجمن میں شریک نہ تھا جس میں شعرائے عظیم آباد پروانہ وار داغ
گرد جمع ہوتے تھے ۔ لہٰذا جو کچھ اِن سطور میں عرض کر دوں گا، اُن میں کچھ تو وہ واقعات ہیں جنھیں میں نے خود میر باقر صاحب مرحوم
(جن کے مکان میں استاد مقیم ہوئے تھے) سنا ہے اور کچھ وہ واقعات ہیں جنھیں اس صوبہ کے مشہور و معروف مورخ فصیح الدین
صاحب (مولف تاریخ بہار مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند) نے میر باقر مرحوم اور اُن کے بعض رفقا سے دریافت کر کے اپنی یادداشت
محفوظ رکھا ہے ۔ بلخی صاحب موصوف کے پاس نادر تاریخی مواد کے علاوہ مشاہیر کے حالات کا جو ذخیرہ ہے اسی میں مجھے حسن ا
سے استاد مرحوم کے عظیم آباد آنے کے متعلق وہ تاریخی قطعات ("تاریخ قدوم" مصنفہ حضرت شاہ محمد یحیٰ صاحب ابوالعلائی
نشین خانقاہِ ابوالعلائیہ محلہ شاہ کی املی پٹنہ) خود مصنف کے دستِ خاص کے لکھے ہوئے مل گئے جن کو شاہ صاحب مرحوم
استاد مرحوم کی ملاقات کے بعد ہی نظم کئے تھے ۔ غرض ان سطور میں جو واقعات مذکور ہیں اُن کی صحت و صداقت میں شک و شبہ
گنجایش نہیں اور اُن کی تصدیق بیشتر خود مثنوی فریادِ داغ کے اشعار سے ہوتی ہے ۔ یہ اشعار جا بجا ذیل میں اپنے اپنے موقع
درج ہیں ۔

تشریف آوری کے اسباب ۔ گلزار داغ کی اشاعت سے استاد مرحوم ہندوستان میں ایک مشہور و معروف سخن گو اور صا
طرز شاعر تسلیم کر لئے گئے تھے ۔ ان کی غزلیں عام طور پر محفلوں میں گائی جاتی تھیں اور بہتیرے اشعار شعرا کے زبان زد تھے ۔
اس زمانہ میں یعنی ۱۲۹۹ھ کے قبل سے استاد مرحوم کے علائی بھائی اور شاگرد مرزا شاہ محمد عرف مرزا شاغل عظیم آبادی
تھے ۔ یہ شاعری اور شطرنج بازی کے دلدادہ تھے ۔ عظیم آباد میں میر محمد باقر تخلص باقر مرحوم ساکن گڑ ہٹہ جو ایک قدیم خاندان
یادگار اور شاعری میں حضرت وحید الہ آبادی کے شاگرد اور خوشنویسی میں استاد تھے ۔ شاعری اور شطرنج بازی سے خاص شغف
تھے ۔ ان کے مکان پر دن بھر شاعری اور شطرنج بازی کے چرچے اور مشغلے رہتے تھے ۔ اس سلسلہ میں میر باقر اور مرزا شاغل کے
بے حد ربط و اتحاد تھا ۔ میرزا صاحب نے میر صاحب ہی کے مکان کو اپنی نشستگاہ قرار دیا تھا ۔ ۱۲۹۹ھ میں استاد مرحوم
سے کلکتہ جانے کا قصد کیا تو مرزا شاغل کو بھی اپنے ارادہ کی اطلاع دی یہاں انھوں نے لوگوں سے اس کا ذکر کیا تو شہر کے رؤسا

مرزا نے باصرار ان سے خط لکھوایا کہ راہ میں کچھ دن یہاں بھی ضرور قیام کیجئے۔ اُستاد مرحوم کو بھی یہاں آنے کا اشتیاق تھا۔ رام پور سے لی پھر لکھنؤ آکر وہاں سے کانپور، الہ آباد ہوتے ہوئے عظیم آباد تشریف لائے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

مل گئی جب حضور سے رخصت — میں ہوا رام پور سے رخصت
چل کے دلّی سے لکھنؤ پہونچا — ہمہ تن شوق و آرزو پہونچا
راہ میں کان پور، الہ آباد — میں نے دیکھے مگر نہ حسب مراد
اتنے میں آگیا عظیم آباد — تھا مجھے اس کا شوق حد سے زیاد

عظیم آباد میں استقبال اور جائے قیام - اُستاد مرحوم نے لکھنؤ ہی سے اپنے آنے کی تاریخ اور وقت کی اطلاع بھیجدی تھی مرزا شاغل نے رؤسا اور شعرا کو اس کی خبر کردی تھی۔ گاڑی پہونچنے کے وقت شعرا کے علاوہ کئی رئیس اپنی اپنی سواریاں لیکر اسٹیشن پر موجود تھے۔ استاد مرحوم اُتر پڑے مجمع سے گھبراکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے ہر ایک رئیس اصرار کررہا تھا کہ میرے ہاں چل کر قیام کیجئے آخر بھیڑ کو چھانٹتے ہوئے مرزا شاغل آئے تو استاد مرحوم نے کہا کہ حضرات کے خلوص و اخلاق کا ممنون ہوں فی الحال مجھے اجازت دیجئے مرزا شاغل کے ساتھ جاؤں پھر آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہوں گا۔ اس کے بعد مرزا شاغل اُن کو میر باقر مرحوم کے مکان پر لے گئے۔ اس واقعہ کو استاد مرحوم نے اس طرح نظم کیا ہے :-

پیشوائی کے واسطے احباب، — آئے تھے شوقِ دید میں بیتاب
بہت اشخاص یک بیک آئے — اپنی اپنی سواریاں لائے
. . . . — . . . .
کوئی کہتا تھا مرے گھر چلئے — اِس طرف آیئے اِدھر چلئے
ہوئی لوگوں کی چپقلش کیا کیا — رہی آپس میں کشمکش کیا کیا
مجھ کو یہ فکر تھی کہ بھیڑ چھٹے — میرزا شاغل آئے جب وہ ہٹے
میر باقر کے گھر قیام ہوا، — خوب دعوت کا اہتمام ہوا

اہلِ شہر سے ملاقاتیں - فسردہ دل کبھی خلوت نہ انجمن میں رہے
بہار ہو کے رہے ہم تو جس چمن میں رہے (داغ)

اُستاد مرحوم کے آتے ہی میر باقر مرحوم کا مکان ایک تماشا گاہ بن گیا۔ دن بھر جوق جوق ہر طبقے اور مذاق کے لوگ اُن سے ملنے آتے تھے اور وہ بھی بعضوں کے گھر بازدید کو تشریف لے جاتے تھے۔ اور دعوتیں شعراء و ادبا کی ہوتی تھیں اور ماہرانِ موسیقی کے جلسے ہوتے تھے۔ استاد مرحوم موسیقی کے بھی شایق تھے اور صوفیانہ طریقت کے بھی دلدادہ۔ اس سلسلہ میں وہ شاہ یحیٰی صاحب مرحوم سجادہ نشین خانقاہِ ابوالعلائیہ محلہ شاہ کی املی عظیم آباد کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ شاہ صاحب مرحوم تاریخ گوئی میں کمال رکھتے تھے اور اپنے زمانہ کے ہر واقعہ کی تاریخ نظم کرکے اپنے سفینے میں لکھ لیا کرتے تھے چنانچہ اس ملاقات کی تاریخ تین قطعوں میں اس طور پر نظم کی ہے۔

"قطعہ تاریخ قدوم نواب مرزا صاحب متخلص بہ داغ از رامپور عظیم آباد"

جناب داغ در شہر من آمد — رسیدند آرزو منداں ز ہر سو
بہ لوحِ دہر تاریخِ قدومش — رقم کردم قدومِ داغ حق گو
۱۲۹۹ھ

ایضاً

جناب داغ عالی جاہ آمد در عظیم آباد   مثالِ گل بہار افزائے دل، چوں ماہ نور افشاں
ہمیں مصراعِ تاریخ از درونِ من بروں آمد   رسیدہ مرہمِ دلہائے رنجوراں، انیسِ جاں
۱۲۹۹ھ

ایضاً

یکتائے زمانہ داغ خوشگو   در ملکِ سخنوری بود شاہ
در وصفِ کمالِ آں سخنور   دامانِ دراز نظم کوتاہ
امروز بہ ارضِ ہند مثلش   نبود یک فرد یعلم اللہ
در پٹنہ برائے سیر آمد   نور افشاں، نور پاش چوں ماہ
شد طبع نیاز مند مسرور   از دیدنِ آں یگانہ دلخواہ
تاریخِ قدوم اگر بہ پرسند   گو۔ مقدم داغِ صاحبِ جاہ
۱۲۹۲ھ

اشخاصِ عظیم آباد کی تعریف ۔ خود اُستاد مرحوم بھی یہاں کے لوگوں سے مل کر بہت محظوظ ہوئے چنانچہ خود فرماتے ہیں :۔

ایسی خلقت کہیں نہیں دیکھی   یہ مروت کہیں نہیں دیکھی
کیسی مہماں نواز یاں دیکھیں   کس قدر جاں نواز یاں دیکھیں
ان کے اخلاق یاد ہیں مجھ کو   ان کے اشفاق یاد ہیں مجھ کو
دیں وہ مہماں کو جسقدر چاہیں   بخشدیں گھر کا گھر اگر چاہیں

تشریف آوری کے اعزاز میں مشاعرے ۔ یوں تو روزانہ بہت اشخاص ملنے کو آتے تھے اور غزلیں پڑھنے کی فرمایش کرتے تھے۔ لیکن خاص طور پر تشریف آوری کے اعزاز میں دو مشاعرے منعقد ہوئے۔ اول مشاعرے کی کیفیت یہ ہے کہ میر باقر مرحوم نے اپنے استاد وحید الہ آبادی کا یہ مطلع سے

اُدھر آئینہ رکھا ہے اِدھر وہ تن کے بیٹھے ہیں   جو اپنا دیکھنا منظور ہے کیا بن کے بیٹھے ہیں

پڑھا تو استاد مرحوم نے بھی اس کی تعریف کی اس پر میر باقر مرحوم کی تحریک اور اہلِ جلسہ کی تائید سے یہ بات قرار پائی کہ ایک اعزازی مشاعرہ منعقد ہو اور اس مطلع کا مصرع اول طرح قرار پائے۔ استاد مرحوم سے بھی غزل کی فرمایش کی گئی۔ گرمی کا موسم تھا آپ صحن میں ٹہل رہے تھے فرمایا بہتر ہے ابھی غزل کہ لوں پھر لوگ ملنے کو آجائیں گے تو مشکل سے موقع ملے گا، دو شخص قلم دوات اور کاغذ لے کر سامنے بیٹھ گئے۔ چند لمحہ تامل کرکے آپ نے کاتبوں سے کہا کہ اچھا یہ مصرعہ لکھ لو ؎

"بھویں تنتی ہیں خنجر ہات میں ہے تن کے بیٹھے ہیں"۔ پھر کچھ دیر تامل کرکے فرمایا ؎ "کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں"

غرض اِس طور پر فی البدیہہ بہت سے اشعار لکھوائے اور اس کے بعد کاتبوں سے مسودہ لیکر خود دیکھنے لگے۔ بعض اشعار کو قلم زد کرکے بعض میں خفیف تبدیلی کی اور منتخب اشعار کو اپنی بیاض میں نقل کرلیا۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ اتنے اشعار قلم زد کیوں فرمائے گئے۔ ہنس کر فرمایا کہ جس کو پسند آئیں وہ لے لے۔ تاریخ مقررہ پر مشاعرہ ہوا تو اول غیر طرح جو غزل پڑھی اُس کا مطلع اس جگہ نقل کرتا ہوں۔ پوری غزل آفتابِ داغ میں موجود ہے :۔

فرقت کی شب یہ کام لیا دل کے داغ سے   ڈھونڈا اجل کو تابہ سحر اس چراغ سے
کھاتے ہیں داغ دوست مرے دل کے داغ سے   سچ ہے چراغ ہوتا ہے روشن چراغ سے

طرح کی غزل کے ایک شعر کو لوگوں نے کئی کئی بار پڑھوایا اور اس قدر داد دی کہ واہ وا اور سبحان اللہ کی صدا سے مکان گونج اٹھا جان علی خاں مرحوم اور منور علی خاں مرحوم دو بزرگ جو اس مجمع میں موجود تھے بلخی صاحب مذکور الصدر سے بیان کرتے تھے کہ اس شعر کو لوگوں نے دس بار سے کم نہیں پڑھوایا ہوگا اور مجمع میں شاید ہی کوئی شخص ہوگا جس کو یہ شعر یاد نہ رہ گیا ہو ؎

بہت رویا ہوں میں جب سے یہ میں نے خواب دیکھا ہے ۔ کہ آپ آنسو بہائے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں،

شاید اس محل پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ حضرت امیر مینائی نے جب اس زمین میں غزل کہی تو مقطع میں استاد مرحوم کی غزل کی یوں داد دی ہے ؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے ۔ بھویں تنتی ہیں خنجر ہات میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

دوسرا مشاعرہ ۔ دوسرا مشاعرہ بھی بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس مشاعرہ کی طرح میں بھی استاد مرحوم نے سیر غزل پڑھی جس کا مطلع یہ ہے ؎ (آفتاب داغ)

طور کے پہلو میں اک تجانہ ایسا چاہئے
شور اٹھے جلوۂ جانانہ ایسا چاہئے

اس مشاعرہ میں بھی استاد مرحوم کی غزل سابق مشاعرہ کی طرح بیحد مقبول ہوئی۔

مدتِ قیام ۔ استاد مرحوم اپنی اول تشریف آوری قیام کے متعلق فریادِ داغ میں یوں تحریر فرماتے ہیں :۔

آٹھ دن دیکھی سیر پٹنے کی ۔ یہ ہوئی وجہ جی اچٹنے کی
کیا قیامت تھی شہر کی گرمی ۔ کاش گنگا میں ڈوبتی گرمی
آگ کی طرح آپ میں گرمی ۔ مثل اخگر حباب میں گرمی
طبع گرمی سے کیوں نہ عاری ہو ۔ جائے نوری وہاں تو ناری ہو
بے جلے کوئی استخواں نہ رہے ۔ عنصر آب کا نشاں نہ رہے
رنگ جل جل کے ہو گئے کاجل ۔ جل گئے لے چلے جو گنگا جل
شعلہ زن ہو تنورِ طوفاں بھی ۔ کانپتا ہے یہاں زمستاں بھی
رنگت آخر طپش سے زرد ہوئی ۔ گرمیِ طبع داغ سرد ہوئی
سوئے کلکتہ میں روانہ ہوا ۔ دور تک ساتھ اک زمانہ ہوا

نظم بالا سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ استاد مرحوم یہاں صرف آٹھ دن ٹھہرے۔ مگر تشریف آوری کے اعزاز میں دو تین مشاعرے ہوئے (جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) اس آٹھ دن کی قلیل مدت میں دو تین طرحی مشاعروں کا منعقد ہونا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ اول مشاعرے کی طرحی غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں :۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

اس مقطع سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ساون سے پہلے آئے اور اتنا پہلے آئے کہ دو تین طرحی مشاعرے منعقد ہو سکے تشریف آوری کس مہینے میں ہوئی اس کا پتہ نہیں چلتا۔ قیاس سے کام لیا جائے تو جیٹھ یا بیساکھ میں تشریف لائے ہوں، گرمیوں کی گرم بازاری کا زمانہ ہو۔ گرمی کی جو شکوہ سنجی کی گئی ہے وہ اس کی تصدیق کرتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کلکتہ نہیں جا سکے وہاں یہاں سے زیادہ گرمی ہوگی۔ اس لئے ساون کے منتظر یہاں رہے۔

یہاں مشہور ہے کہ استاد مرحوم ایک بار اور بھی یہاں تشریف لائے تھے مگر یہ شہرت غلط ہے تحقیقات سے معلوم ہوا کہ استاد مرحوم کے ایک شاگرد تخلص وفا بہار شریف کے رئیسِ اعظم انھوں نے استاد مرحوم کو بہار شریف تشریف لانے کی دعوت دی تھی۔ مگر کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ وفا صاحب مرحوم کے بیٹے، پوتے اور خاندان کا خاندان بہار شریف میں موجود ہے۔ مجھ کو اُن لوگوں سے یہ معلوم ہوا ہے۔ اس سفر کے بارے میں استاد مرحوم کی وہ غزل جو آفتابِ داغ میں ہے اس کا یہ مقطع ہے ؎

اجمیر ہو کے جائیں گے اے داغؔ ہم بہار
اب کے برس سفر کا ارادہ ہی اور ہے

اس مقطع میں بہار سے بہار شریف مراد ہے۔ غرض چمن زار عظیم آباد میں استاد مرحوم کی آمد ایک بہار کی مانند تھی جو غنچہ و گل کو شگفتہ کر کے روانہ ہو گئی۔

داغ کے دو غیر مطبوعہ خط

نواب میر حسن علی خاں کے نام

(مرسلۂ یاسین علی خاں بی۔ اے۔ حیدرآباد)

۱) نواب صاحب تغافل شعار سلمہ اللہ تعالےٰ

تین دن سے خط کا منتظر ہوں، جواب ندارد۔ لفظ بی جو شوق کے واسطے ہے اس پر خفا ہوئیں۔ میں نے خوب جھاڑا ہے۔ کچھ روپیہ لڑکی سے لیا۔ پچاس یہاں سے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ سے مانگتی ہے۔ ذرا ان کو جھاڑئیے گا۔ میں نے جو ان کو خط لکھا ہے وہ انا کے خط میں ہے اس کو انا سے لے کر آپ پہونچائیں تو زہے عنایت، ایک غزل ملفوف اور بھیجتا ہوں۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ پہلی سب غزلیں مبیضہ میں صاف چڑھ گئیں کہ ابھی کوئی باقی ہے۔ یہاں خیریت ہے۔ گرمی کی شدت ہے۔ بچّوں کو دُعا کہئے۔ فقط فصیح الملک داغ دہلوی ۔ ۵ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ

---

۲) نواب صاحب تغافل شعار

کال ایک ہفتہ کے بعد آپ کا خط ملا۔ کیفیت معلوم ہوئی۔ آپ کی استانی کا خط بھی ملا۔ آج تک میں نے کسی کو آپ کا شاکی نہیں پایا۔ بندۂ خدا تم نے اپنی استانی کو ناراض کیا۔ میرے گھر گئے اور بغیر کھانا کھائے وہاں سے چلے گئے۔ وہ تم سے سخت ناراض ہیں۔ تمھاری یہ حرکت مجھے بھی پسند نہیں آئی۔ جلد جائیے اور ان کے راضی کرنے کی کوئی صورت نکالئے ورنہ مجھ پر وبال آئے گا۔ خدا آپ سے جلد ملائے۔ فکرِ قرض کھائے جاتا ہے۔ بچّوں کو دعا فقط

فصیح الملک داغ دہلوی
۱۳ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ

کلامِ داغ میں محبوب کا تصور

(پروفیسر شریف انصاری - لاہور)

انسانی زندگی میں عشق و محبت کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں انسان فطرتاً حُسن پرست واقع ہوا ہے اور حُسن و جمال سے تاثر و تعلق اُس کے خمیر میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حُسن و محبت کی داستان اپنی کہنگی و فرسودگی کے باوجو بہت ہی دلچسپ و بوقلموں ہے۔ غزل درحقیقت اس داستان کا ایک دلفریب اسلوبِ بیان ہے۔ لیکن جس طرح داستانِ محبت کا محور ایک پیکرِ جمال ہونا ضروری ہے اُسی طرح غزل میں محبوب کا تصور بھی ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اُردو غزل کی تا پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صنفِ سخن بھی دیگر اصناف کی طرح انقلاباتِ زمانہ کے ساتھ بگڑتی اور بنتی رہی ہے۔ سوسائٹی کے مذاق اور کلچر کا اثر اس پر بھی ہوا ہے اور اس کے رجحانات میں بھی تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ غزل کے بدلتے ہوئے رجحانات میں بھی تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ غزل کے بدلتے ہوئے رجحانات میں محبوب کے تصور کی تبدیلی بھی ایک امتیازی شان رکھتی ہے جس نے کبھی کبھی اس کی پوری دُنیا ہی بدل ڈالی ہے۔

غزل وہ صنفِ سخن ہے جس کا وجود سوائے شعرائے ایران کے اور کہیں نہیں ملتا۔ ایرانیوں نے اپنے مزاج و ماحول کو اسموکر اسے ایک مخصوص رنگ دیا۔ فارسی کے ذریعہ یہ اُردو میں پہونچی اور اپنے ساتھ کچھ روایات بھی لائی۔ غزل کی ان روایات کو ہندوستان میں تقویت اس لئے پہونچی کہ کم ازکم شمالی ہند میں مسلمانوں کی تہذیب، تمدن، معاشرت اور زبان بالکل ایرانی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ایران میں غزل کو سب سے زیادہ عروج تصوف کی تحریک سے ہوا تھا۔ اس تحریک نے ایک طرف تو برتری و عظمت پیدا کرکے اُسے قربِ الٰہی کا ذریعہ بنایا اور دوسری طرف سچا عشق غیر جنس کے ساتھ کرنا سکھایا۔ ہندوستان میں غزل کا عہدِ زرّیں خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ایسا پُرآشوب زمانہ تھا جس میں لوگوں کے ذہنوں پر پست خیالات چھائے تھے دُنیا کی بے ثباتی، تقدیر کی حد بندی، ایک عام ہراس، نا امیدی اور یاس لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئی تھی۔ ان حالات کا نتیجہ تھا کہ اس دور میں تصوف کا زور ہوا۔ تصوف کے اس زور نے ایرانی روایت کو اور چوکھا کر دیا۔ چنانچہ ہمارے شعرائے متقدمین نے اس رنگ کو اپنایا اور اُردو غزل میں محبوب کے دو تصور قایم ہوئے ایک حقیقی، دوسرا مجازی۔ مجازی معشوق کا اطلاق ایک مرد پر بھی ہوتا ہے اور ایک عورت پر بھی۔

خواجہ میر دردؔ کا کلام عشق حقیقی کے رنگ میں رچا ہوا ہے جس میں اُن کا روئے سخن زیادہ تر ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف ہے اور جہاں کہیں حقیقی و مجازی دونوں رنگوں کی جھلک ہے وہاں انھوں نے اپنے لب و لہجہ نیز ایمائی اندازِ بیان سے ایسا کر دیا ہے کہ یا تو حقیقت ہی کی چھاپ لگ جاتی ہے یا پھر یہ نہیں کھُلتا کہ محبوب کوئی مرد ہے یا عورت۔ البتہ میر تقی میرؔ کے تغزل میں محبوبِ حقیقی سے تخاطب کم اور مجازی سے زیادہ ہے۔ ان کا مجازی محبوب ایک امرد ہے۔

تاہم میرؔ کے کلام کا بیشتر حصہ وہ ہے جہاں محبوب کی جنسیت کا پتہ نہیں چلتا، تغزل کے اس حصہ میں میرؔ نے ا عشق و محبت سے لبریز جذبات کی ایسی سچی تصویریں کھینچی ہیں کہ ناظر اُنھیں دیکھ کر تڑپ اُٹھتا ہے۔ دردؔ کا حقیقی عشق

رت میں بلندی اور روح میں بالیدگی پیدا کرے تو کرے لیکن اُس میں مجاز کی سی دلکشی نہیں پائی جاتی۔ میر کا محبوب مجازی
، مگر اُس سے نباہ میر کے سے سلیقہ شعار عاشقوں کا کام ہے بعد کے متغزلین میں جراُت ، غالب ، مومن اور پھر داغ نے
یں ایک ایسے محبوب سے روشناس کرایا ہے جسے انسان نے ہمیشہ اپنی محبوب ترین چیز سمجھا اور وہ "عورت" ہے۔ محبوب کی
ل میں یہ عورت اپنی ساری دلربائیوں کے باوجود اہلِ نظر کی آنکھ کا سرمہ اور ہر صاحبِ دل کے زخموں کا مرہم ہے۔ یہ ہرجائی
ی ہے اور اکثر جگہ اس کسی شاہدِ بازاری کی شوخی و بے باکی کا پرتو بھی ہے ۔ پرتو ان اساتذہ کے مخصوص احول، رنگِ طبیعت
جذبات کے تحت ہلکا اور گہرا دونوں ہے۔ جراُت اس صحت مند تصور کے بانی ہیں، اور اُن کے کلام کا یہ حقیقت پسندانہ پہلو
یں معاصرین میں ممتاز کرنے کے لئے کافی ہے ۔

جراُت دلی کے تھے مگر ذہنی طور پر وہ بلا شبہ لکھنوی تھے۔ لکھنؤ کے درباروں، راگ رنگ کی محفلوں اور حسینوں مہ جبینوں
صحبتوں میں اُن کا کافی وقت گزرا بنا بریں اُن کے تغزل میں چوچلا پن، ہوس پرستی اور لطیف سی خارجیت ہے۔ اُن کی معاملہ
ی میں کوئی حجاب نہیں۔ اُنھوں نے اشاروں کے بجائے تفصیل سے کام لیکر اپنے کلام میں ایک عیب کو راہ دی ہے جس سے
بچ بھی سکتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ بصارت سے محروم ہوجانے کے بعد اُن میں جو ایک احساس کمتری پیدا ہوا تھا وہ اُن کے
م میں اس عریانی کی شکل میں ظاہر ہوا ہو، بہرصورت اسباب کچھ بھی ہوں اُن کے عشق و محبت میں لگا رکھاؤ نہیں۔ چنانچہ
کا محبوب بھی پست ہے۔ اُس کی رفتار و گفتار، ناز و انداز اور شوخی و شرارت میں ایک چھچھورا اور بازاری پن ہے۔ ذیل کے
اشعار اس کی وضاحت کردیں گے ؎

شب گھر جو رہا مرے وہ مہماں، تھا صبح یہ کس ادا سے کہنا
طاقت نہ رہی بدن میں ہے ہے قربان گیا یہاں کا رہنا،

بیٹھیں کیا دور کہ چاہے ہے یہی کثرتِ شوق آپ کے زانو سے زانو کو بھڑا کے رکھے
کیا ٹک کے وہ کہے ہے جو ٹک اُس سے لگ چلوں بس بس پرے ہو، شوق یہ اپنے تئیں نہیں

مرزا غالب نے "سبزۂ خط" کا دو ایک جگہ تذکرہ تو کیا ہے مثلاً ؎

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا، یہ زمرد بھی حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

یا:- آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست دودِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

مگر یہ محض رسم پوری کی ہے ورنہ اُن کا محبوب بھی اُسی قبیل کا ہے جس قبیل کا جراُت کا محبوب ہے، اُن کے جذبات کے
ہار میں اُن کی ذہانت، طباعی اور شگفتہ مزاجی کو بڑا دخل تھا۔ وہ اپنی وار داتِ قلبیہ کے بیان بڑی پُرلطف باریک بینی سے
لیتے ہیں اُن کے محبوب کی باتوں میں عبارت، اشارت اور ادا کی کار فرمائی ہے۔ اُن کا محبوب کوئی بھی ہو اُن کے عشق میں
وضعداری اور بلندی ضرور ملتی ہے۔ وہ وصل کی آرزو میں مرتے ہیں مگر ہوسناکی میں مبتلا نہیں ہوتے۔

عاشق مزاج مومن بھی غالب کی طرح ایک انفرادیت کے مالک ہیں۔ لیکن دونوں کی انفرادیت میں فرق ہے۔ مومن کی
ن خصوصیات اُنھیں غالب سے ممتاز کرتی ہیں۔ غالب اپنی رند مشربی اور ظرافت کے باعث کہیں کہیں کھل جاتے ہیں اسکے
س مومن نازک خیالی کے ساتھ ساتھ سنجیدہ ہیں۔ غالب نے امرد کا تذکرہ روایتاً سہی کیا ضرور ہے مگر مومن کے کو میں
ڈھونڈے سے بھی ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جو کسی "سبزہ آغاز" کے بارے میں ہو۔ مومن کا محبوب بھی جراُت و غالب
طرح "پری وش" ہی ہے لیکن اُس کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ "پردہ نشین" ہے جس کی طرف مومن نے بار بار
شارے کئے ہیں۔ مومن کو غالب کی طرح فلسفہ و تصوف سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اُن کا عشق خالصتاً مجازی تھا۔ بنابریں

اُن کے کلام میں صرف واردات حسن و عشق کا تجزیہ و تذکرہ ملتا ہے۔ تاہم اس مجاز کے بیان میں اُنھوں نے ایسی جدّت ، نازک خیالی اور طرفگی سے کام لیا ہے کہ پڑھنے والا انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ مومن کا عشق بلند ہے۔ اُن کے تغزل پر جنسی آسودگی نام کو نہیں اور معاملہ بندی میں بھی اک خاص متانت پائی جاتی ہے۔

محبوب کے اِن مختلف تصورات نے داغ کے۔ پس منظر کا کام کیا۔ اُنھوں نے جرأت کی معاملہ بندی اور مومن کی رنگینی میں اپنے مذاق و پسند کا اضافہ کرکے ایک نیا اندازِ تغزل اور پھڑکتا ہوا محبوب پیش کیا۔ یہ محبوب شاہدِ بازاری ہے لیکن اُس کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔ وہ محض روایت یا تخئیل کے پیداوار نہیں، بلکہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کے پُرخلوص اظہار نے داغ کے کلام اور اُن کی زندگی میں بڑی گہری مطابقت پیدا کردی ہے۔ وہ رسم ڈگر سے ہٹ کر اپنے جذبات و احساسات کی پوری پوری ترجمانی کرتے ہیں۔ اُن کا ہر شعر اُن کی زندگی کی بولتی ہوئی تصویر ہے۔ داغ کے اِس رنگِ تغزل اور اِس سہل الحصول محبوب میں کوئی عظمت تو یقیناً نہیں پائی جاتی مگر اُس کی دلکشی و دلربائی کا یہ عالم ہے کہ ؎

زِ فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

اب قبل اس کے کہ ہم اِس کرشمہ ساز کو زیادہ قریب سے دیکھیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس دور کے معاشرہ پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ داغ نے جس پُرآشوب زمانہ در گھن لگتے ہوئے معاشرہ میں آنکھ کھولی اُس میں لوگ اپنی وضعداری کو نباہنا ہی بہت کچھ سمجھتے تھے۔ دلّی کا تاج و تخت لٹ چکا تھا اور اُس کی مرکزی حیثیت بھی خطرے میں تھی۔ نماز روزہ نجات کا ذریعہ اور اخلاق و شرافت کے چند بندھے ٹکے اُصول تھے۔ ایسے زمانہ میں دفع الوقتی ہی زندگی کا نصب العین ہوتی ہے اور اس دفع الوقتی میں شاعری ایک بہت بڑا سہارا۔ چنانچہ داغ کی شاعری نے اُس سماج کو دفع الوقتی کا آلہ فراہم کیا۔ غدر کے بعد وہ دربار رامپور سے وابستہ ہوگئے تو وہاں کی فضا بھی دلّی کی فضا سے مختلف نہ تھی وہی مشاعروں کی کثرت، وہی شعرا کے جھگڑے اور وہی آپس کی نوک جھونک تھی۔ شعرا میں دلّی اور لکھنؤ دونوں جگہوں کے استادانِ فن موجود تھے۔ البتہ لکھنوی شعرا کی کثرت کی وجہ سے رامپور کا مذاق دلّی کے مذاق سے مختلف تھا۔ وقتی عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے عوام و خواص عریاں اور چوچلے بھری باتیں پسند کرتے تھے۔ داغ کا اس رنگ سے متاثر ہونا ناگزیر تھا لہٰذا وہ مقبولِ عام و خاص ہونے کی خاطر اِس رنگ میں رنگ گئے مگر ذوق، ظفر، غالب، مومن، نیّر و شیفتہ کی محفلوں کے نقش بھی اُن کے ذہن سے بالکل نہ دُھل سکے۔ رامپور سے اُکھڑ کر وہ حیدرآباد پہونچے اور وہاں اُنھیں خاص فراغت نصیب ہوئی۔ غرض داغ شروع سے آخر تک درباری ماحول میں زندگی گزاری۔ خود پیدائشی نواب اُس پر طرّہ یہ کہ نوابوں کی صحبت نتیجہ یہ ہوا تعیش پسندی اُن کی فطرتِ ثانیہ بن گئی اور مرتے دم تک تاکنا جھانکنا نہ گیا — یہاں تک کہ یہ شوق میدانِ حشر میں بھی جاری رہا ؎

محشر میں بعد پرسشِ اعمال دیکھنا ہم دیکھتے پھریں گے تماشا اِدھر اُدھر

یوں تو داغ کی شاہد بازی کے بہت سے واقعات ہوں گے جو پردۂ خفا میں ہیں لیکن اُن میں سے ایک واقعہ جو اظہار ہی نہیں ہوا بلکہ جس کا اعتراف خود داغ نے اپنی مثنوی "فریادِ داغ" میں کیا ہے بہت ہی اہم ہے۔ یہ واقعہ اُن کی زندگی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ رامپور کے دورانِ قیام میں داغ "بے نظیر کے میلے" میں کلکتہ کی ایک سخن گو طوائف ماہ منیر متخلص بہ حجاب پر فریفتہ ہوگئے اور اس فریفتگی نے اتنا طول کھینچا کہ اُنھوں نے حجاب کی خاطر لکھنؤ، عظیم آباد اور کلکتہ کے سفر کئے، ان مقامات پر اُن کے اعزاز میں مشاعرے ہوئے اور داغ نے اُن میں شرکت بھی کی — چنانچہ

"جہاں نہیں دیکھا، ارماں نہیں دیکھا" والی غزل جس کا مطلع ہے ؎

کیا تم نے کبھی داغ کا دیواں نہیں دیکھا — کیوں پوچھتے ہو کون ہے یہ کس کی ہے شہرت

عظیم آباد کی بھی ہوئی ہے اور یہیں اُن کی وہ معروف غزل بھی ہوئی جس کا مطلع و مقطع یہ ہے ؎

کسی سے آج بگڑی ہے، جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں — بھویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں — کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں

اسی حجاب کا تذکرہ داغ نے مثنوی کے علاوہ اپنے بعض اشعار میں بھی کیا ہے ؎

در پردہ تم جلاؤ، جلاؤں، میں چہ خوش — میرا بھی نام داغ ہے گر تم حجاب ہو
دیکھ کر جلوہ غش ہوئے موسیٰ — داغ مجھ کو حجاب نے مارا

مولانا احسن مارہروی کے بیان کے مطابق یہی حجاب حیدر آباد بھی بلائی گئیں اور داغ کا بیشتر وقت ان کے ساتھ گزرا — لیکن اس کے علاوہ بھی کئی طوائفیں اُن کی منظور نظر رہیں۔ جن کا تذکرہ عزیز یار جنگ، مولانا احسن اور نواب میر حسن علی خاں جیسے عزیز شاگردوں نے کیا ہے۔ داغ کے سلسلہ میں ان حالات واقعات کا تذکرہ کسی حد تک ضروری اس لئے ہے کہ ان کی واقفیت سے ہمیں داغ کی زندگی، اُن کے محرکات شعری اور ان کے محبوب کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

آیئے اس معلومات کی روشنی میں اُن کے محبوب کی خصوصیات کو دیکھیں۔ داغ نے اپنے محبوب کا تعارف کچھ اس طرح کرایا ہے ؎

چمپئی رنگ پھر اُس رنگ میں بجلی کی چمک — مات کندن ہے ترے رنگ سے سونا کیا ہے
ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی — اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی
چتونیں شوخ، چلبلی تقریر — اُس میں پھر شرم بھی حیا بھی ہو
گلشن میں ترے لبوں نے گویا — رس چوس لیا کلی کلی کا
یہ ناز، یہ نگاہ، یہ چنچل بل، یہ شوخیاں — تم اس سے بھی سوا ہو، قیامت سے کم نہیں
اللہ رے کیا فتنہ گری ہے دمِ رفتار — چھٹتی ہے قیامت ترے دامن کی ہوا سے
وہ دل پہ چھری پھیر گئے ناز و ادا سے — اب کوئی مرے کوئی جئے اُن کی بلا سے
اُن سے بغیر چھیڑ کئے چین ہی نہیں — کتنی شریر طبع ہے کیا چلبلا مزاج

اس مختصر سے تعارف سے معشوق کا جو سراپا ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ ایک ایسے چھلاوے کا ہے جس میں شوخی شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اُس کی رفتار و گفتار، ناز و انداز اور مختلف اعضائے جسمانی سے شباب، مستی اور [illegible] ٹپک رہی ہے، رنگ کا انتخاب بھی نہایت دل آویز ہے۔ اس چمک دمک اور آب و تاب کم از کم شمالی ہندوستان میں [illegible] جواب نہیں رکھتی۔ آخری شعر میں شاعر نے کس قدر بے ساختگی و بے تکلفی کے ساتھ اُس چھیڑ چھاڑ کا تذکرہ کیا ہے جس کا چنچل کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔ — بظاہر داغ کے اس محبوب اور جرأت کے معشوق میں کوئی فرق نظر [illegible] آتا۔ جرأت کو سراپا نگاری سے خاص شغف تھا اور انھوں نے مختلف سراپوں میں اپنے معشوق کا یہی انداز بتایا ہے [illegible] دونوں میں فرق یہ ہے کہ جرأت نے لکھنوی فضا سے متاثر ہو کر محبوب کے لوازم حسن کا تذکرہ بھی کر ڈالا ہے اور گو ہے بے جا عریانی سے بھی کام لیا ہے۔

جرأت کے مقابلہ میں داغ محبوب کے حسن و ادا کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ متعلقاتِ حسن کی بدمزاقی میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اور نہ جرأت کی طرح ڈھکی ہوئی چیزوں کو اس طرح کھولتے ہیں کہ بیان میں ابتذال و رکاکت پیدا ہو جائے۔ حالانکہ نہ وہ کوئی معلمِ اخلاق ہیں اور نہ اُن کی محبوبہ پارسائی کی دعویدار ہے۔ وہ تو مومن کی "راحتِ جان" کی طرح "پردہ نشین" یا گھر کی چہار دیواری میں بیٹھنے والی بھی نہیں محض بازاری عورت ہے اس لئے وہ ہرجائی اور سہل آمیز ہے۔ اُس کی یہ کمزوری یا خوبی بھی داغ ہی کی زبانی سنئے ؎

چاہنے والے بُرے ہوں کہ بھلے ___ اُن کے دفتر میں نام ہے سب کا
لڑتی جاتی ہے غیر سے بھی آنکھ ___ مجھ سے بھی بات کرتے جاتے ہیں
کیا رہیں ہم کہ ترا چال چلن ___ پاس رہکر نہیں دیکھا جاتا
تمھاری طرح بھی ہوگا نہ کوئی ہرجائی ___ تمام رات کہیں ہو کہیں ہو سارا دن
دو دن بھی کسی سے وہ برابر نہیں ملتا ___ یہ اور قیامت ہے کہ مل کر نہیں ملتا
اُس شوخ دغا باز کا کھلتا نہیں کچھ بھید ___ جب تک اُسے باتوں میں ٹٹولا نہیں جاتا
وصل کی اُن سے ہوگئی امید ___ سلسلہ جب کلام کا نکلا

اور یہ کوئی مضمون آفرینی نہیں حقیقت ہے۔ داغ کے محبوب تعلق ہی اُس طبقہ سے رکھتے تھے جس میں آئینہ کی سی پریشان نظری عام ہوتی ہے۔ پسند خاص ہو جائے تو مولا کی دین مگر اس کرم کے یہ معنی نہیں کہ فیضانِ عام بند ہو جائے۔ آپ اس کو بدچلنی کہیں یا اس کی تاب نہ لاسکیں تو بلا سے۔ وہاں تو غیر سے آنکھ لڑتی ہی رہے گی۔ سہل آمیزی کا یہ عالم ہے کہ سلسلۂ کلام نکال لیجئے تو وصل کی امید کا بندھنا کوئی بڑی بات نہیں مگر ایک قباحت یہ ہے کہ اُسکے ربط و تعلق میں استواری نام کو نہیں۔ بس دو چار دن کا ملا ملا پھر طوطے چشمی اور غیروں سے اختلاط۔ جس کے نتیجہ میں رقابت مول لینی پڑتی ہے۔ داغ نے بھی رقابت مول لی ہے اور چونکہ اصلیت ہے اس لئے اُنکے کلام میں رقیب کا تذکرہ بھی دوسرے شعرا کے روایتی تذکرہ کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ محبت کی منزل میں رقیب کی شخصیت بھی بڑی اہم ہوتی ہے۔ عاشق و معشوق کے بعد مثلث کا جو آخری ضلع رہ جاتا ہے اُس کی خانہ پُری اسی ذات سے ہوتی ہے۔ اسی کی بدولت رشک کا اور پھر حسد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی جب ٹھن جاتی ہے تب تو مارنے مرنے کے ڈھنگ بن جاتے ہیں۔ داغ نے اس موقعہ کی تصویر کس قدر ہو بہو اُتاری ہے ؎

تمھارے واسطے میں غیر کو تنہا نہ چھوڑوں گا ___ سمجھ لینا کہ دو مُردے گڑیں گے ایک مدفن میں
غیر کو ساتھ لیکے ہم ڈوبے ___ آپ نے ضد دلا کے دیکھ لیا

لیکن جیسا کہ ابھی کہا گیا یہ کبھی کبھی کی بات ہوتی ہے بالعموم اُس کے نام سے محبوب کے ساتھ اک چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی ہے کبھی عاشق اُس کا تذکرہ کرکے محبوب کو اور کبھی محبوب اُس کا نام دُہرا کر گفتگو کے لئے ایک موضوع فراہم کر دیتا ہے۔ رقیب پر حملے شروع ہو جاتے ہیں۔ اُس کی بُرائیاں جتائی جاتی ہیں اور اپنی خوبیاں دکھا کر محبوب کو زیادہ سے زیادہ اپنانے کی کوشش ہوتی ہے۔ داغ اِس مرحلے سے بھی گزرے ہیں۔ چند شعر سنتے چلئے ؎

افسوس ہے رقیب نے کی آپ سے دغا ___ مجھ کو بھی رنج آپ کے سر کی قسم ہوا
غیر سے مل کے کیا لیا تم نے ___ ہم سے ملتے تو کچھ مزا ملتا
تمھارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا ___ نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا
رشکِ دشمن بھی گوارا لیکن ___ تجھ کو مضطر نہیں دیکھا جاتا

رسمِ تحریر بھی مٹ جائے یہی مطلب ہو اُن کے خط میں مجھے غیروں کے سلام آتے ہیں

ظاہر ہے معشوق کے سامنے اس شکوہ و شکایت میں بھی اک کیف حاصل ہوتا ہے ۔ آہستہ آہستہ رقیب کی دشمنی تکلیف دہ ہونے کے بجائے دلچسپ بن جاتی ہے اور اگر اس حد تک ساتھ دینے کے بعد وہ مرجاتا ہے تو اس کا رنج بھی عاشق کو ہوتا ہے ۔ بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ داغ جیسا طرحدار اور باوضع عاشق ہو ۔ اُن کا یہ شعر کسی ایسے ہی حادثہ کی یاد تازہ کرتا ہے ؎

مرگِ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھ کو ملال دشمنی کا لطف ، شکوؤں کا مزا جاتا رہا ،

اس کوچہ میں قدم رکھنے کے بعد قاصد کی ضرورت ہوتی ہے کچھ اس لئے کہ دو بدو نہ ہونے لگے اور کچھ رقیب کے خیال سے ۔ داغ کے یہاں اس کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ بڑے آن بان والے عاشق تھے ۔ اُنھیں اپنی وضع پاسداری بھی لازم تھی ـــــ چند شعر اس کے متعلق بھی سنئے ؎

چاہئے پیغامبر دونوں طرف لطف کیا جب دو بدو ہونے لگی

کیا قسم کھا کر ہوا ہے منفعل پیغامبر تاڑلی اُس نکتہ چیں نے بات سمجھائی ہوئی

نامہ بر رہ کے وہاں تجھکو خبر لانی تھی چار دن اور مصیبت کے گزارے ہوتے

وہ خط لکھیں مجھے جھوٹا ہے قاصد خدا جانے اُٹھا لایا کہاں سے ،

داغ کے محبوب کی دُنیا وسیع بھی بہت ہے ۔ یہاں " اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو" والا عقیدہ آ نظر ہی نہ آئے گا ، وہ شاہد باز تھے اور اُن کی رنگین طبیعت کسی ایک پر قانع ہو نہیں سکتی تھی ۔ درحقیقت وہ غم دو غم جاناں دونوں کے قایل نہ تھے اُنھوں نے " تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی " کے مصداق ایک معشوق کے بچھڑنے دوسرے سے دل اٹکا لیا اور اندوہِ فراق میں کبھی مبتلا نہ ہوئے ۔ داغ ان حسینوں کی دُنیا میں بہت پیرے ہوئے تھے اُ نے بہت کچھ دیکھا تھا اور بقول شخصے کھل کھیلا تھا ۔ اس خیال کی تائید اُن کے معروف معاشقہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے ۔ دا اور حجاب کا یہ تعلق اُن کی ۵۰ و ۵۵ برس کی عمر کے درمیانی زمانہ کا ہے ۔ ظاہر ہے جب اس عمر میں اُن میں یہ امنگ و تر تھی تو عالم شباب کا کیا کہنا خود ہی کہا ہے ؎

ہائے وہ دن کہ میسر تھی ہمیں رات نئی روز معشوق نیا ، روز ملاقات نئی ،

غرض اُن کی محبوبہ کوئی مخصوص حسینہ نہیں تھی اور نہ ہی جرأت کی طرح اُن کی دُنیا محدود تھی ۔ جرأت تو اپ بصارت کھو بیٹھنے کے بعد یا تو اُس چنچل کے خیال میں مگن رہے جسے اُنھوں نے اس حادثہ سے قبل کبھی دیکھا تھا یا کو فتنۂ روزگار حُسن اتفاق سے ہاتھ لگ گئی اُسے چھو چھا کر ایک لمساتی خط بھی حاصل کیا اور اس کا مزے لے لے کر خاکہ کھینچا ۔ داغ کے یہاں نہ یہ معذوری ہے اور نہ مومن کا سا بلند نظریۂ عشق ، وہ تو ہمیشہ اسی مسلک کے قایل رہے

کیا لے گا کوئی حسین نہ کہیں دل بہل جائے گا کہیں نہ کہیں

عشق کے اس تصور نے کلامِ داغ میں عاشق کے تیور بھی بڑے تیکھے رکھے ہیں ۔ ہماری شاعری میں عاشق اپنے محبو کے مقابلہ میں ایک احساسِ کمتری کا شکار رہا ہے ۔ اور ہمارے متغزلین نے عاشق کا حلیہ اکثر و بیشتر مضحکہ خیز ہی کھینچا داغ نے اس بدعت کو بڑی بُری طرح توڑا اور عاشق کو اُس کی برتری سے روشناس کرایا ہے ۔ یہ شعر دیکھئے ؎

یہ کیا کہا کہ داغ تو ہے کس شمار میں یکتا ہوں میں ہزار میں کیا سو ہزار میں

تری آرزو جن کو ہے اُن کو ہے خدا کی قسم ہم کو حسرت نہیں

جواب اس طرف سے بھی فی الفور ہوگا — دبے آپ سے وہ کوئی اور ہوگا،
ہم لطف کے بندے ہیں خدا کی قسم اے واعظ — ہم سے نہ کبھی ناز ستمگر کے اٹھیں گے
مجھے تم جانتے ہو داغ ہوں میں — کہیں جاتا ہے خالی وار میرا

چوتھے شعر میں داغ نے بڑے مزے کی بات کہی ہے۔ وہ حقیقتاً لطف کے بندے تھے۔ محبوب کے ناز و انداز بھی ایک گوارا حد تک سہتے تھے اور اس کے آگے وہ اس لئے نہیں جانا چاہتے تھے کہ پھر تیر کی سپردگی کی منزل آجانے کا خدشہ تھا جسکے تصور سے وہ گھبراتے تھے چونکہ یہ اُن کے خوش رکھنے کے مقصد کے منافی تھا۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ نواب مرزا بہرصورت قلعۂ معلیٰ میں پروان چڑھے تھے، بنا بریں کچھ شاہانہ بو بھی اُن میں تھی لہذا محبت کی دُنیا میں معشوق کی محکومی اُنھیں گوارا نہ تھی۔ وہ خود شوخ و چلبلے واقع ہوئے تھے اور محبوب بھی طرحدار اور طرار ڈھونڈتے تھے، مگر ایسا معشوق جس کے عشاق کی فہرست میں اُن کا نام کسی شمار و قطار ہی میں نہ ہو۔ داغ اُسے دور ہی سے یہ کہکر سلام کرلیتے تھے کہ ؎

اِک نہ اِک ہم لگائے رکھتے ہیں — تم نہ ملتے تو دوسرا ملتا،

داغ کے محبوب میں اُس کی شوخی و سہل آمیزی کے علاوہ ایک اور خصوصیت بھی ہے جو روایتی محبوب میں تو سرے سے ملتی ہی نہیں لیکن جرأت، غالب و مومن کے معشوق میں بھی نہیں پائی جاتی۔ یہ اُس کی حاضر جوابی ہے، روایتی محبوب میں تو اُسکی غنچہ دہنی اکثر اِک سربستہ معمے کی شکل اختیار کرلیتی ہے اس لئے اُس کے بات کرنے یا جواب دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیکھئے خواجہ صاحب اپنے محبوب کے بارے میں کہتے ہیں ؎

کب دَہن میں ترے سمائے سخن — نہیں تیرے دہن میں جائے سخن

میر صاحب کا ارشاد ہوتا ہے ؎

سچ پوچھو تو کب ہیگا اُس کا سا دہن غنچہ — تسکیں کے لئے ہم نے اک بات بنائی ہے

حرفِ غالب کا سراپا ناز وصول دھپّا تو نہیں کرتا مگر تلخ بہت ہے۔ یا تو عاشقِ نامراد سے تو تکار سے بات کرتا ہے یا پھر اُس کی زبان بندی کردیتا ہے ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے — تمھیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے،
بات پر واں زبان کٹتی ہے، — وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی،

مومن کا دشمن ایمان کچھ تو اپنی پردہ نشینی کے باعث حیادار ہے اور بولتا ہے یا بولتا ہے تو پھر ایک لطیف طنز کے ساتھ

"مر چُک کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے" — کہتے تو ہیں بھلے کی ولیکن بُری طرح

اب رہے جرأت صاحب تو اُن کا محبوب بہت کچھ داغ کے محبوب سے مماثل ہوتے ہوئے بھی اس معاملہ میں ملکیک زیادہ ہے اور اُس کے جواب میں ایک سستا پن ہے۔ اُس کی چرچلے بھری باتوں میں خیالات کی گندگی صاف نمایاں ہوجاتی ہے۔

لیکن داغ کے محبوب میں عاشق کی بات کے جواب کے تیور ہی کچھ اور ہیں۔ اُس کے جواب کی خوبی یہ ہے کہ اُس میں تیکھے پن کے ساتھ ایک لطیف سی وضعداری قایم رہتی ہے اور سبک پن نہیں آنے پاتا۔ وہ بازاری سہی مگر اُس کی ایک خاص سطح ہے جس سے نیچے آنا اُسے گوارا نہیں۔ یا یوں کہئے کہ اُس کی صاف گوئی میں بھی سوقیانہ پن نہیں ہے۔ ذیل کے چند اشعار اس خیال کی توضیح کردیں گے ؎

ہاتھ گردن میں ڈال کر بولے — "کس سے ملئے ترے گلے مل کر"
حشر کا وعدہ بھی کرتے نہیں وہ کہتے ہیں — "فرض کرلو جو کئی بار قیامت آئی"،

وقت ملنے کا جو پوچھا تو کہا "کہدیں گے" غیر کا حال جو پوچھا تو کہا "کہتے ہیں"
غیروں سے التفات پہ ٹوکا تو یہ کہا "دنیا میں بات بھی نہ کریں کیا کسی سے ہم"
وصل کے باب میں کی عرض تو وہ کہنے لگے کیوں مرے جاتے ہو ہو جائے گا، ہو جائے گا

محبوب کی ان چند خصوصیات کے مطالعہ سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ داغ کا محبوب یکسر مجازی ہے۔ اُنکا محبوب سراسر جسم ہے اور ذہنی طور پر کسی حیثیت کا مالک نہیں۔ داغ کا عشق بھی خالص جسمانی ہے اور وہ محبوب کو سوائے جسم کے کسی ذہنی حیثیت کا مالک ہی نہیں سمجھتے۔ اُن کا تعلق ذہنی نہیں جسمانی ہے اور عاشق و معشوق محض جنس کی تشنگی بجھانے کے لئے ایک دوسرے سے ملتے ہیں، اس سے زیادہ اُن میں کوئی ربط و اتحاد نہیں۔ غالب کے یہاں یہ تعلق جسم سے بڑھکر ذہن تک پہونچتا ہے اور عاشق کو فلسفیانہ نکات سمجھاتا ہے۔ پھر غالب کی بے تکلفی میں ایسا ضبط و احتیاط پایا جاتا ہے جو پاس ادب اور فرقِ مراتب کا لحاظ رکھتا ہے اور اُن کی شوخی پھکڑپن کے حدود تک نہیں پہونچتی۔ مومن کا عشق ہی نسبتًا اونچا ہے۔ اُن کی شکوہ و شکایت میں ایک پردہ داری کا پہلو ہے اور اس طرح مومن اپنے محبوب کی بے باکیوں کی روک تھام کرلیتے ہیں، جرأت و داغ کے محبوب بہت کچھ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں لیکن داغ کا محبوب جرأت کے محبوب کے مقابلہ میں ایک رکھ رکھاؤ کا مالک ضرور ہے۔ وہ بازاری ہوتے ہوئے بھی پاسِ وضع کا خیال رکھتا ہے اس کی شوخی اور البیلے پن میں ایک خاص شان ہے۔ جرأت محبوب کے بیان میں اکثر کھل جاتے ہیں اور اُسے جسمانی طور پر عریاں کردیتے ہیں۔ برخلاف اسکے داغ نے رمز و ایما کی کیفیات کو برقرار رکھا ہے۔ وہ اپنی خوبیِ بیان اور حسنِ ادا سے محبوب کو اور چمکا دیتے ہیں۔ داغ کا آرٹ درحقیقت اُن کی زبان ہے جس میں بلا کی نزاکت، لطافت اور لوچ ہے۔ داغ نے اپنے محبوب کی مصوری میں آرٹ کا جادو جگایا ہے اس جادو نے تصویر میں کوئی عظمت یا رفعت تو نہیں پیدا کی البتہ اُسے نازک، نفیس اور روشن کردیا ہے۔ داغ کا یہی کارنامہ اُنھیں زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی سے زیادہ ہے۔

خواجہ میر درد کا غیر مطبوعہ قطعہ جو داغ سنایا کرتے تھے

یارو مرا شکوہ ہی بھلا کیجئے اس سے مذکور کسی طرح کا جا کیجئے اس سے
سو بار یونہی ٹھہر چکی اب کے نہ ملئے یوں بھی تو نہیں بنتی ہے کیا کیجئے اس سے
جوں جوں وہ رکے ہے تو یہی آوے ہے جی میں پھر چھیڑئے اور باتیں سنا کیجئے اس سے
ہم درد میاں کہتے نہ تھے چھوڑ یہ باتیں
پائی نہ سزا اور وفا کیجئے اس سے

(مرسلہ یامین علی خاں بی۔ اے)

داغ

(پروفیسر فراق گورکھپوری)

میرا لڑکپن ہی رہا ہوگا - لیکن نہ جانے کیوں اُس وقت بھی داغ کا کلام پڑھ کر اور سُن کر مجھے غصّہ آجاتا تھا اور کے متعلق توہین اور نفرت کے جذبات میرے اندر اُبال کھانے لگتے تھے - اُردو کے کسی بھی اور شاعر کے کلام کا یہ ردِّ عمل مج نہیں ہوتا تھا - اُس کا یہ مطلب نہیں کہ جو خوبیاں، داغ کے کلام میں ہیں وہ دوسروں کو نظر آئیں اور مجھے نظر نہ آئیں - خوبیوں کا احساس مجھے اُس وقت بھی تھا اور رفتہ رفتہ یہ احساس بڑھتا گیا لیکن غصّہ اور نفرت کا جذبہ اس بڑھتے ہوئ احساس سے نہ کم ہوا نہ کمزور پڑا - میں بیک وقت داغ کو صفِ اول کا شاعر مانتا رہا' ان کی فسطنت ([illegible] قایل رہا اور کلامِ داغ کے متعلق اپنے اندر انتہائی ناپسندیدگی کا جذبہ پاتا رہا -

پینتالیس برس سے برابر میرا یہی حال رہا ہے - کلامِ داغ کے محاسن مجھ سے خراجِ تحسین بھی حاصل کرتے رہے اور غصّہ بھی دلاتے رہے - جھلاّنے کا لفظ میری حالت کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا بلکہ ہماری طرف کا ایک رائج لفظ زیادہ صحیح مصوّ میری حالت کی کرتا ہے - یعنی میں کلامِ داغ پڑھ کر کچکچا اُٹھتا تھا - اب جبکہ "نگار" داغ نمبر نکال رہا ہے تو مجھے اپنے مرا ردِ عمل کو کچھ واضح کرنا پڑے گا - بات کیا ہے ؟ غالب کے مرجانے کے بعد اُردو شاعری بہ استثناء ایک دو شاعروں کے معشوؤ عزت کرنا بھول گئی اور معشوق سے بیگانگی - نرمی - خلوص اور جذباتی قربت محسوس کرنا بھول گئی اور نصف صدی سے زیادہ بھولی رہی - تہذیبِ محبّت مٹ چلی تھی - غالب کے بعد تہذیب محبّت کا چراغ حالی - شیفتہ، شاد عظیم آبادی اور آسی غاز کے کلام میں جھلملاتا رہا - یوں تو پرستاری اور ہم آہنگی' نرمی اور انسانیت کا جو جذبہ میر کے یہاں ملتا ہے وہ جذبہ اُس میں تو غالب کے یہاں بھی نہیں ملتا - لیکن غالب کے یہاں کچھ دوسری اتنی رچی ہوئی خوبیاں ملتی ہیں کہ یہ کمی پوری ہوجاتی غالب کے بعد جن شاعروں کا نام میں نے گنوایا ہے اُنھیں چھوڑ کر دوسرے شعرا کے کلام سچے اور پرخلوص جذباتِ محبت سے عموماً ہے - پھر بھی ان شاعروں کے یہاں ایسے عشقیہ اشعار نہیں ہیں یا عموماً نہیں ہیں جنھیں سُن کر ایک شریف آدمی کے دل آگ سی لگ جائے - غالب کے بعد اس طرح غصّہ دلانے والا عشقیہ کلام صرف داغ کا ہے -

دلّی کے اخلاقی انحطاط کی اِنتہا لال قلعہ کی زندگی اور ہزارہا مُسلمان جاگیرداروں کی زندگی میں نظر آتی ہے - تہذ ظاہری پہلو اس کے تمام ٹیم ٹام تو ان تمام جگہوں اور لوگوں میں ملتے ہیں - لیکن تہذیب کی روح اس زندگی میں مردہ ہو ایک کڑاپن اور خشونت نے تہذیب کی روحانی برکتوں پر غلبہ پا لیا ہے - دل سینوں میں ریجھنا اور پگھلنا بھول چکے ہیں اس انحطاطی دور میں دلّی کی تہذیب کا دل قصّاب کا دل بن گیا ہے - جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اب معشوق سے اور محبت مخصوص کرنے اور برتنے کے بدلے اب اُس کی چٹکیاں لی جاتی ہیں - بجائے اُداس یا غمگین ہونے کے اب ایک بے کھسیاہٹ کا اظہار کیا جاتا ہے - دِل کے معاملے اب کھُلی معرکہ آرائی کی شکل اختیار کرلیتے ہیں - محبت کا جذبہ ایک انتق جذبہ بن جاتا ہے - اب ذہنی طور پر بجائے معشوق کو گلے لگانے کے جذبہ کے اس پر چڑھ بیٹھنے کا جذبہ کارفرما ہے - نرم

ت لہجہ اب چرب زبانی میں بدل جاتی ہے اور ٹھیٹھ کر کے اسے بیان کیجئے تو کہنا پڑے گا کہ محبت کے دل اور زبان پر
بڑھ جاتی ہے۔ دونوں کی لچک مٹ کر ایک خشک کرخت پن میں یا اکھڑ پن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دل اور زبان دونوں
ے بن گئے ہیں یا نہایت سخت و کرخت گوشت کے۔ اب شاعری اپنی گھلاوٹ سے بجائے نرم بول بولنے کے پتھر مارتی ہے۔
ے کلام میں یہ تمام خرابیاں اپنی انتہا کو پہونچ گئی ہیں۔ سپردگی کا جذبہ ڈاکہ زنی کا جذبہ بن گیا ہے۔ بازاری عشق نے
ر ہلا بول دیا ہے۔ ہم آہنگی، مغائرت میں بدل گئی ہے۔

لیکن اس تمام عمل میں ایک ہنگامہ آرائی کی شان ہے اور یہ شان اور آن بان، یہ ہما ہمی جس تیور کے ساتھ داغ کے
ں نظر آتی ہے داغ کے پہلے یا داغ کے بعد اردو شاعری میں کہیں نظر نہیں آتی۔ داغ کی زبان میں فقلتے جرے ہوئے
جو رہ رہ کر چھوٹتے چلے جاتے ہیں۔ دلی کی بھرپور زندگی اور لال قلعہ کی رنگ رلیاں داغ کے کلام میں کچھ اس طرح
ر ہو گئی ہیں کہ دیکھنے سننے والے دیکھتے سنتے رہ جاتے ہیں۔ گالی دینے کا بھی چھیل چھپٹے مارنے کا بھی ایسا سلیقہ سب کو کہاں
۔ دلی کی بولی ٹھولی اپنی پوری موج زنی کے ساتھ داغ کی غزلوں میں لہرا رہی ہے۔ داغ کے متعلق رائے عامہ بالکل
پر تھی کہ یہ شخص زبان کا لاثانی جادوگر ہے۔ اردو شاعری نے داغ کے برابر کا فقرے باز نہ آج تک پیدا کیا ہے نہ آیندہ
سکے گی۔ داغ کے جذبات پر نفرین بھیجتے ہوئے بھی بے اختیار منہ سے واہ واہ نکل جاتی ہے۔ داغ کا تغزل سراسر
ت سہی لیکن اس کی بے پناہ قوتِ اظہار کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ مغلیہ خاندان کی تلوار کی فاتحانہ شان اور چکا چوندھ
دینے والی چمک دمک جب زندگی اور جذبات کی تاریک پستیوں میں اپنے جلوے دکھاتی ہے تو وہ داغ کی شاعری
ا ہے۔

لیکن داغ کو محض غیر شریفانہ اور عامیانہ جذبات کا جادو بیان شاعر سمجھنا پوری سچائی نہیں ہے۔ الفاظ، محاوروں،
فقروں اور بالکل بے لاگ یا فطری بے ساختہ باتوں کا لاثانی شاعر ہونے کے علاوہ داغ کچھ اور بھی ہے۔ مومن
سیاتی۔ تجزیوں کی پرچھائیاں بھی داغ کے بہت سے اشعار پر پڑتی ہیں۔ پھر دلی کی زبان میں جو لطیف اشاریت آگئی
ہ بھی داغ کی غزلوں میں وہ باتیں پیدا کر دیتی ہے۔ جنھیں دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ غالب بھی للچا اٹھے تھے۔ دل کی چٹکیاں
ں بے ساختگی کی ایسی مثالیں اردو کا کوئی دوسرا شاعر آج تک پیش نہیں کر سکا۔ داغ کے ایسے اشعار بیک وقت سامنے
ں بھی معلوم ہوتے ہیں اور جادو بھی۔

بول چال کی زبان پر جیسی قدرت داغ کو تھی ویسی قدرت کسی اور شاعر کے یہاں ڈھونڈھنا سعیِ لاحاصل ہے۔
ں زندگی کا وہ حصہ جو بولی ٹھولی کی شکل میں وجود میں آتا ہے سمٹ کر داغ کی زبان میں جذب ہو گیا تھا۔ اس امر میں
ہمیں شیکسپیر، مولیر وغیرہ مصنفین کی یاد دلاتے ہیں۔ لیکن افسوس داغ کی بولی کے پیچھے جو دنیائے خیال ہے وہ حسین
ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی لیکن صرف کبھی کبھی وہ بہت حسین بھی ہے۔

داغ کے بعد ہندوستان کی زندگی اور شاعری کی نشاۃ ثانیہ شروع ہوتی ہے قومی شعور میں ایک نئی سنجیدگی اور
لی آنا شروع ہوتی ہیں۔ آج داغ کو مرے تقریباً نصف صدی کا زمانہ گزر گیا۔ اس عرصہ میں اردو شاعری کہاں سے
پہونچ گئی یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ عربی، فارسی لغات کا جتنا اثر اس دور کی شاعری پر نظر آتا ہے اتنا اثر پہلے کی
شاعری پر نظر نہیں آتا۔ پھر بھی شاعری کی زمین کو داغ کی خوش خرامیوں نے جس طرح ہموار کر دیا تھا، اس کی مٹی کو
نے جس طرح نرما دیا تھا، زبان کو داغ نے جس طرح ہندی کی چندی کر دیا تھا جو سلجھاؤ، صفائی، سُبک روی داغ
دو شاعری کو عطا کی تھی وہ بھی فارسیت کے ساتھ ساتھ داغ کے بعد کی اردو شاعری کا مستقل جزو بن گئی۔ میر،

غالب اور داغ کی زبانیں آج کی اُردو شاعری کے اجزائے ترکیبی بن گئی ہیں۔ اُردو کی کامیاب شاعری میں جو آج ہمیں سلجھا نظر آتا ہے وہ بہت کچھ داغ کا رہین منت ہے۔ داغ نے مستقل اثر اُردو زبان پر چھوڑا ہے۔ اس باب میں شاعری کی زبان پر داغ کا وہی احسان ہے جو انگریزی زبان پر خاص کر انگریزی نثر پر ڈرائیڈن کے کارناموں کا رہا۔ یوں تو ہر زبان کی شاعری کا آغاز سادہ اور بے تکلف زبان و بیان سے ہوتا ہے لیکن یہ زبان شروع میں توتلی اور ہکلی رہتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس میں پیچیدگیاں اور پیچیدگیوں کے ساتھ بھاری پن پیدا ہونے لگتا ہے۔ بعد کو، بہت بعد کو ایک ایسا شاعر یا ادیب ہر زبان میں پیدا ہوتا ہے جو سادہ اور بے تکلف بیان کے ایسے سانچے زبان کو دیدے جو اس زبان کے خدوخال اور اس کی نوک پلک کو مستقل طور پر متعین کردیں۔ اُردو زبان کے حق میں یہ کام ناسخ نے کرنا چاہا تھا لیکن کامیابی داغ کے ہاتھ رہی۔ داغ نے اُردو زبان کے خدوخال کو اس کے نکھ سکھ کو اور اس کے جسم کی لکیروں کو اس طرح اُبھارا اور چمکایا کہ اب وہ آسانی سے جانی پہچانی جاسکتی ہے ملک میں اُردو اور ہندی کا مسئلہ چھڑا ہوا ہے لیکن ہندی والے بھی رہ رہ کر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اُردو زبان میں جو بے ساختگی ہے جس طرح اُردو سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے اگر یہ صفت ہندی میں نہ آئی تو ہندی کا مستقبل تاریک ہے۔ تو کیا یہ صفت جس حد تک جس خوبی سے جس کامیابی سے داغ نے اُردو زبان کو دی اُس طرح کسی اور نے یہ صفت اور صلاحیت اُردو زبان کو دی؟

داغ اور جلال

داغ کو جلال اور امیر مینائی سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔ چنانچہ داغ کا شعر ہے ؎

اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ ملتے امیر احمد و سید جلال سے

جلال سے باہمی مذاق اور چشمک بھی ہوا کرتی تھی، داغ، جلال کو غلط گو شاعر کہا کرتے تھے، ایک مشاعرے میں داغ نے مطلع پڑھا اور جلال سے داد طلب ہوئے۔ مطلع یہ تھا:۔

یہ تری چشم فسوں گر میں کمال اچھا ہے ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

جلال نے مسکراکر کہا مصرعہ نہیں لگا، جب جلال کی باری آئی تو فوراً دوسرا مصرعہ لگاکر پڑھا ؎

دل مرا آنکھ تری دونوں ہیں بیمار مگر، ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

جلال لکھنوی کو حضور نظام نواب میر محبوب علی خاں کی جانب سے بھی کچھ وظیفہ مقرر تھا، شاید کسی وجہ سے بند ہوگیا تھا، جلال نے ایک درخواست موسومہ مدارالمہام ذیحجہ ۱۳۱۹ھ میں سجادہ (حضرت گنج نشین بیدری) صاحب کے پاس بھیجی تھی، اور سجادہ صاحب اور داغ نے، مولوی عباس علی خانساماں کے ذریعہ کوشش کی تھی۔ یہ درخواست محفوظ ہے گو پارینہ ہوگئی ہے۔

(مرسلہ سخاوت مرزا۔ بی۔اے۔ ال۔ ال۔ بی)

داغ کی عشقیہ شاعری میں رندی اور شاہد پرستی

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور)

اُردو میں بدنام شاعروں کا ایک خاصا طویل سلسلہ ہے، نظیر اکبر آبادی، میر تقی میر، مصحفی، جرأت، رنگین، انشا، واجد علی شاہ اختر، مومن اور داغ ایک طرف ہیں، نظیر اکبر آبادی اس لئے بدنام ہیں کہ طریق راسخہ شعراء سے منحرف تھے اور بقول شیفتہ

"اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقین جاریست و نظر بآن ابیات در اعداد شعرا نشایدش شمرد—"[۱]

گویا اُن کی خطا یہ تھی کہ عوام کی زندگی کی ترجمانی کرتے تھے، میر بیچارے کی یہ خطا بتائی جاتی ہے کہ وہ جس عطار کے لونڈے پر مرتے تھے اسی سے دوا لیتے تھے مصحفی یوں بدنام ہیں کہ ایک طرف امرد پرستی میں مبتلا ہیں اور دوسری طرف عصمت[۲] نام شاہد بازاری کی محبت میں اسیر ہیں، جرأت معاملہ بندی کے ملزم ہیں کہ اُن مضامین کو جو عاشق و معشوق کے درمیان گزرتے ہیں موضوعِ سخن بناتے تھے، ان کے بارہ میں شیفتہ کی رائے سنئے :-

"سخن بر مضامینے کہ میان عاشق و معشوق می گزرد می کرد- - - - - - چوں از اصول و قوانین این فن بہرہ نداشتہ نغمہائے خارج از آہنگ می سرودہ و آوازہ اش کہ چوں طبل دور رفتہ ازانست کہ پذیرائی خاطر دگوارائی طبع اوباش و اواط حرف میزدہ"[۳]

رنگین اور انشاء کو اُن کی ظرافت اور خوش طبعی لے بیٹھی، ریختی اور ہزل انھوں نے بطور تفنن طبع اختیار کی تھی، لیکن سامنے اُن کے تمام ادبی، علمی اور شاعرانہ کمالات محو ہو کر رہ گئے، بیچارہ واجد علی شاہ اپنی لذت پرستی، بیگمات کی کثرت اور راگ و رنگ کے الزام میں ایسا بدنام ہوا کہ آج اس کی پچاس سے اوپر تصانیف[۴] کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، مومن نے بقول ضیاء احمد[۵] اپنی علمیت کا پردہ ڈالا لیکن کسی پردہ نشین کے عشق نے انھیں بھی بدنام کر کے چھوڑا، اسی سلسلہ کی ایک کڑی مرزا خاں داغ ہیں۔ سکسینہ لکھتے ہیں :- "انھوں (جرأت) نے سب سے پہلے بگڑے ہوئے عام مذاق کی پیروی کی اور ایسا رنگ اختیار کیا جس کی تکمیل متاخرین میں نواب مرزا خاں داغ کے ہاتھوں ہوئی"[۶]- - - - - - "بعض جگہ تعیش اور جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں"[۷]- - - - "داغ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ ارباب نشاط کے شاعر تھے اور اُن کے اشعار ہیچ اور مخرب اخلاق ہوتے ہیں"[۸]- - - - داغ کے اشعار صرف ایسے عشق سے تعلق رکھتے ہیں جس کو خلوص اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔[۹]

---

[۱] گلشن بیخار، مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۳۳ — [۲] مصحفی، ابواللیث صدیقی، مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور — [۳] گلشن بیخار — [۳] عندلیب شادانی — [۴] بحوالہ بنی، از واجد علی شاہ اختر — [۵] دیوان مومن، ضیاء احمد — [۶] تاریخ ادب اُردو، رام بابو سکسینہ مترجمہ عسکری نولکشور صفحہ ۴۴ — [۶] تیسرا اڈیشن صفحہ ۱۹۵ — [۷] ایضاً صفحہ ۲۰۰ — [۸] ایضاً صفحہ ۲۰۱ — [۹] ایضاً ۲۰۲

دوسری طرف بدنام شعراء کا ایک اور سلسلہ ہے ۔ یہ لکھنوی اساتذہ ہیں جو لکھنؤ چوٹی اور انگیا محرم میں گرفتار ہیں ۔ ان کی
ی کسی انگیہ کی چڑیا کو ہاتھ میں لانا عنقا کو دام میں لانا سمجھتی ہے ۔ ان کا عشق 'سبزہ خط' سے شروع ہوکر " طائر پیٹ" سے
" اک شئے مخفی" تک جا پہونچتا ہے ، یہ محبوب کے جسم کے رونگٹے رونگٹے سے عشق کرتے ہیں لیکن یہ معشوق جس کا دہن نقطہ اور
موہوم ہے خود بھی دھوکہ ہے ، اور پھر اس معاملہ میں یہاں تک شدت اختیار کی جاتی ہے کہ محبوب کے دروازے کی بلی مرغ جاں
ڈالتی ہے اور محبوب کی ناک کا چوہا 'رختِ تن' کاٹ ڈالتا ہے[۱۵] اور پھر یہ عاشقِ جانباز جب پینے پلانے کی طرف آتا ہے تو
ن کھاتا ہے اور افیون کھاکر ہی خودکشی کرلیتا ہے[۱۶] ۔

ان بدنام شاعروں کی فہرست میں اور اضافہ ممکن ہے لیکن ان سب ناموں کو اُردو شعر و ادب کی تاریخ سے خارج کردیں
ر کیا رہ جاتا ہے اور اگر یہ غور کریں کہ ان بدنام شاعروں نے زبان کی ترقی اور عہد بہ عہد اصطلاح نہ کی ہوتی تو آج ہماری
کہاں ہوتی تو ان شاعروں پر بدنامی کا لیبل لگانے سے پہلے ہمیں ایک مرتبہ ضرور تامل ہوگا اسی فہرست میں سے آج نواب مرزا
داغ دہلوی موضوعِ سخن ہیں ۔

اس مضمون کے عنوان سے شاید شبہ ہو کہ میرے نزدیک داغ کی شاعری میں رندی اور شاہد بازی کے سوا اور کچھ نہیں
لئے میں پہلے اسی کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں ۔ میرے خیال میں داغ کی شاعری کیا بہ لحاظ موضوعات اور کیا باعتبار
بڑی وسعت رکھتی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کے یہاں وہ تمام رسمی مضامین جو غزل میں اُن سے پہلے ادا ہوتے چلے آئے تھے
اُن میں سے بعض ان کے بعد بھی غزل میں اُن سے پہلے ادا ہوتے چلے آئے تھے بلکہ اُن میں سے بعض ان کے بعد بھی غزل
دخیل رہے موجود ہیں لیکن ان کے پہلو بہ پہلو ایسے اشعار بھی بہ کثرت ہیں جو ذاتی واردات اور واقعات پر مبنی معلوم ہوتے
۔ ان میں اُن کی عشق پرستی ، شوقِ وصال ۔ آلامِ فراق ، تلذذ وغیرہ سب کچھ شامل ہیں ، دوسری طرف ایسے عارفانہ مضامین
جو بظاہر ایک رند شاہد باز کی طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتے ۔ ایک طرف شوخی ہے جو کہیں بھی پھیل کر پھکڑ یا فحش تک نہیں
نی لیکن جگہ جگہ طبیعت کی شگفتگی ضرور ظاہر کرتی ہے ۔ اس میں زاہد و واعظ پر پھبتیاں اور طعن ہے لیکن ساتھ ہی شدید قسم
مذہبیت ، رسول اکرم سے محبت ، حج بیت اللہ کے شوق کا اظہار ، اپنی معصیت کا اعتراف اور عفو کی طلب بھی پائی
تا ہے ۔

باعتبار زبان و بیان داغ کی شاعری اُردو زبان کی تاریخ میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ
آحمد کی نثر کی طرح محاورہ بندی کا شوق بھی کہیں کہیں داغ کو لے ڈوبا ہے ۔ ایسے چند اشعار ضرور نکل آئیں گے جن میں
ن محاورہ بندی کے شوق میں تصنع اور آورد پیدا ہوگئی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کے کلام میں بے ساختگی اور برجستگی پائی
تی ہے ۔ اس اعتبار سے داغ کی ایک اہمیت اور ہے ۔ میر اور سودا بیشک اُردو شاعری کے آفتاب و ماہتاب ہیں لیکن
کی زبان دلی کی ٹکسالی زبان ہونے کے باوجود کہیں کہیں کھٹکتی ہے ۔ اس کی وجہ انشاء سے سنئے :۔

" ازیں گفتگو با عدم حفظِ مرتبۂ افصح اُردو در سخن گفتن یعنی مرزا رفیع دہلوی علیہ الرحمۃ ۔ و میر صاحب عالی قدر میر محمد تقی صاحب
باوجود لہجہ اکبرآباد و شمول الفاظ بزرے و گوالیار در وقت تکلم از سبب تولد در مستقر الخلافۃ مذکور خاطر داعی آثم نیست[۱۷]"

---

۵ مرغِ جاں کو توڑے کی بلی ترے دروازے کی رختِ تن کو کاٹے گا چوہا تمھاری ناک کا

۵ بوسۂ خالِ سیاہ دیتے نہیں صاحب اگر ایک دن سنناکہ بندہ کشتۂ افیوں ہوا

۵ دریائے لطافت ، الناظر پریس لکھنؤ صفحہ ۳۳

دہلی کی ٹکسالی زبان کی حدود بھی انشا نے متعین کی ہیں :-

"مکانیکہ در آں مجمع فصحا است قلعہ مبارک بادشاہی است و دو محلہ دیگر یکے بنگلۂ سید فیروز کہ از خانہ مرزا اکمل مرثیہ خوان متوفی تا حویلی اسمٰعیل خاں صفدر جنگی و از آنجا تا حویلی ملکہ آفاق ملکہ زمانیہ بنت فرخ سیر بادشاہ یک ضلع محسوب است بلکہ نزد بعضے کابلی دروازہ و بیرون آں نیز تا تکیۂ شاہ خدا یار، و ایں طرف از حویلی نواب شبیر جنگ مرحوم و چوک نواب سعادت خاں بہادر برہان الملک جنت آرامگاہ تا پھاٹک حبش خاں داخل آں باشد لیکن قدرے درایں مقام تامل است۔ انچہ شک را در آں گنجائش نیست ایں است کہ تا حویلی ملکہ آفاق فصاحت از در و دیوار می بارد و از چتلی قبر تا ترکمان دروازہ یک طرف و تا دہلی دروازہ کہ بہ دلی دروازہ شہرت دارد یک طرف، و تا چوک سعد اللہ خاں طرف دیگر و حویلی و بازار نواب امیر خاں مرحوم و سہ راہہ بیرم خاں کہ بہ ترا ہہ مشہور است و محلہ فولاد خاں و کوچہ چیلہا جزو دہلی دروازہ است"[1]

داغ نے فصاحت کی ان حدود ہی میں آنکھ کھولی، ۱۲۴۶ھ[2] میں چاندنی چوک میں پیدا ہوئے اور ۱۲۵۲ھ میں جب اُن کی والدہ نے صاحبِ عالم مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر سے نکاح کر لیا تو مرزا صاحب بھی قلعۂ شاہی میں پہونچ گئے زباندانی اور شاعری کی مشق اس طرح "مجمع فصحا یعنی قلعہ مبارک" میں ہوئی، صفِ اول کے شاعروں کی فہرست میں داغ کے علاوہ بہت کم لوگوں کو یہ موقع ملا ہوگا اور اس اعتبار سے ان کا سارا کلام ایک تاریخی سند کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن داغ کی شاعری اور زباندانی کے اس "بحرِ بیکراں" کے بیان کے لئے بھی ایک سفینہ درکار ہے، اسی لئے "ظرفِ تنگنائے مضمون" میں صرف دو پہلوؤں یعنی رندی و شاہد پرستی کی تحدید کر لی گئی ہے۔

داغ کی شاہد پرستی کے سلسلہ میں سب سے پہلے مثنوی فریادِ داغ[3] کا ذکر کرنا چاہئے، اس میں کلکتہ کی ایک طوائف حجاب بائی سے داغ نے اپنے معاشقے کا حال نظم کیا ہے۔ مثنوی رام پور میں لکھی گئی اور ۱۳۰۰ھ میں مکمل ہوئی[4] اُس وقت داغ کی عمر ۵۴ سال کی تھی جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں جب طبیعت کا یہ رنگ تھا تو جوانی میں کیا کچھ نہ ہوا ہوگا، حجاب بائی کا ذکر مثنوی میں جابجا کرتے ہیں :-

کس قیامت نے پائمال کیا، سحر بنگالہ نے حلال کیا[5]
شوخیاں ہیں حجاب میں کیسی لنترانی جواب میں کیسی
یا الٰہی نجات غم سے ملے وہ سراپا حجاب ہم سے ملے

داغ کی حجاب سے ملاقات رامپور کے مشہور بے نظیر کے میلے میں ہوئی تھی، صفتِ معشوق کے عنوان سے سراپا لکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں :-

رُخ سے ظاہر تھا نور کا عالم اور اس پر غرور کا عالم

---

[1] ایضاً صفحہ ۲۲-۲۳ — [2] جلوۂ داغ، مطبع شمسی حیدر آباد دکن ۱۹۱۰ء صفحہ ۱۰ — [3] فریادِ داغ، مطبع منشی محمد علی مالک اخبار نیر اعظم مراد آباد ۱۸۸۵ء پہلا اڈیشن — [4] فریادِ داغ صفحہ ۵۳ —

[5] آفتابِ داغ میں بھی ایک شعر دیکھئے :-

مسخر کر لیا آخر کو بنگالے کے جادو نے بڑا بول آگے آیا ہم جو بولے تھے لڑکپن میں

مہتابِ داغ میں اسی طرح کے اشعار موجود ہیں۔

جُٹتی جُٹتی بھوؤں کی وہ تحریر — کیوں نہ دل اس لکیر پہ ہو فقیر
ایسے پتھر وہ دونوں قبۂ نور — شیشۂ دل ہو جن سے چکنا چور
گات بانکی بدن سڈول تمام — فتنہ قد فتنہ چشم فتنہ خرام
نشہ حسن کی ترنگ غضب — نوجوانی کی تھی اُمنگ غضب
اُف رے عہدِ شباب کی مستی — بے پئے ہے شراب کی مستی
رقص طاؤس باغ سے اچھا — شعر کا لطف داغ سے اچھا

سراپا کی تفصیل کے بعد ابتدائی ملاقات کا حال ہے، قدرتی طور پر یہ منزل زیادہ دشوار نہیں تھی۔ داغ بہت جلد کامیاب کامراں نظر آتے ہیں۔

ایک اک دم میں سو مزا راتیں، — لطف کے دن وہ عیش کی راتیں
رات کٹتی ہنسی خوشی کیا کیا — ہوتی رہتی کھُلی ڈھکی کیا کیا
عیش یہ آسماں نہ دیکھ سکا — چار دن شاد ماں نہ دیکھ سکا

اور اس کے بعد:-

آگئی ہجر کی گھڑی سر پہ — یہ بلا جھیلنی پڑی سر پر،
قصد ٹھہرا وطن کے جانے کا — رنگ بدلا نیا زمانے کا،

چلتے وقت راز و نیاز کی باتیں اور عہد و پیمان ہوتا ہے۔ حجاب بائی کلکتہ کی تعریف کرتی ہے پھر بھی :-

جی نہیں چاہتا ہے جانے کو — پر چلے ہیں قلق اُٹھانے کو
ایسے ولیوں سے جی نہیں ملتا — داغ سا آدمی نہیں ملتا

چلتے وقت یوں تسلی دیجاتی ہے :-

آتے جاتے ہیں سب خدائی میں — مر نہ جانا مری جدائی میں
زندگی شرط ہے تو آئیں گے — لطف صحبت کے پھر اُٹھائیں گے
دل سے نزدیک ہم ہیں دور نہیں — اس قدر دور رام پور نہیں،
مصرعۂ میر پڑھ کے فرمایا — پھر ملیں گے اگر خدا لایا،

اس کے بعد داغ نے حالتِ ہجر اور گلہ فلک کج رفتار کے عنوان سے حالتِ فراق اور اپنے رنج و الم کی کیفیت بیا کی ہے :-

دل کی حالت بری ہے سینے میں — سانس چلتی چھری ہے سینے میں
چبھتی ہے کوئی شے کلیجے میں — ہوک سی اُٹھتی ہے کلیجے میں
دل سے پہروں کلام کرتا ہوں — زندگی کو سلام کرتا ہوں
اشک اُمڈے برس گئیں آنکھیں — دیکھنے کو ترس گئیں آنکھیں

اس عرصہ میں نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا اور داغ نے حجاب بائی کو دوبارہ بے نظیر کے میلے میں شرکت کی دعوت بھیجی، اس کا جواب دیکھئے :-

ایسے میلے میں کیوں نہ آئیں ہم — کہ جہاں تم سا شخص پائیں ہم
کیا نہیں ہم کو شوق خوب کہی — کیا نہیں ہم کو ذوق خوب کہی
باغ کی ہم بہار لوٹیں گے، — داغ کی ہم بہار لوٹیں گے

ہوتا ہے کہ درمیان میں اور کوئی حایل تھا اور حجاب بائی کے آنے کی صرف یہ صورت تھی کہ وہ طلب کریں، داغ نے یہ بھی گوارا کیا بقول خود :-

ان کی کس کس طرح اطاعت کی　　پھر انھوں نے بھی یہ عنایت کی
صاف دل سے مراسلا بھیجا　　کہ بنارس انھیں بلا بھیجا

بنارس سے رام پور کی منزل دور نہ تھی، حجاب کی آمد پر گویا عید آگئی۔

تھا یہ اس گلعذار کا آنا،　　یا نسیم بہار کا آنا،
پھر وہی ساعتِ سعید آئی　　کہ برس دن کے بعد عید آئی،
میرے غم خوار جاکے لائے انھیں　　نہ بنی کچھ بغیر آئے انھیں

لیکن آنے کے بعد بھی حجاب قایم رہا اور رقیب روسیہ کے ڈر سے داغ کے دل کا داغ سلگتا ہی رہا۔ آخر :-

چار دن میں یہ اتفاق کی بات،　　اُن سے اُن سے ہوئی نفاق کی بات

اب ان کے لئے میدان صاف تھا۔

گزری اوقات عیش و عشرت سے　　دو مہینے تک ایک صورت سے
دوست اپنا وہ مجھ کو جان گئے　　میرے کہنے کو دل میں مان گئے

حجاب بائی غالباً اپنے پیشے اور تربیت کی مناسبت سے زیادہ دن تک کسی کی پابند ہوکر نہیں رہ سکتی تھی اور بہت جلد رامپور قید خانہ معلوم ہونے لگا۔

بولی میری بلا قفس میں رہے،　　آدمی کیوں پرائے بس میں رہے
قید خانہ ہے رام پور مجھے،　　جلد رخصت کریں حضور مجھے،

ملتے وقت رسمی طور پر ان کی تسلی بھی کی گئی، نامہ و پیام کا سلسلہ بھی جاری رہا یہاں تک کہ حجاب نے داغ کو کلکتہ طلب کیا سفر کا ذکر کرتے ہوئے جلوۂ داغ کے مصنف لکھتے ہیں :-

"ایک مرتبہ بہ ضرورت خاص رامپور سے دلی اور لکھنؤ وغیرہ مقامات میں ہوتے ہوئے کلکتہ تشریف لے گئے تھے اور وہاں کم و بیش تین مہینے قیام کیا تھا"[1]

یہ "ضرورتِ خاص" جسے چھپانے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی سوائے حجاب بائی سے ملاقات کے کچھ اور نہیں۔ آئینۂ داغ مؤلف بھی اس سفر کا حال اس طرح لکھتے ہیں :-

"رام پور میں آپ کا یکایک خیال ہوا کہ کلکتہ چلئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ داغ صاحب نے سیاحتِ کلکتہ کی یادگار میں ایک مثنوی کہی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں ایک شاعرہ حجاب نامی سے آپ کو محبت ہوگئی تھی جس کے فراق میں آپ نے مثنوی فریادِ داغ لکھی"[2]

بہر حال اس سفر کی تفصیل داغ نے خود لکھی ہے۔ پہلے دہلی گئے :-

جاکر اپنے وطن میں جی نہ لگا　　اس بنائے کہن میں جی نہ لگا

وہاں سے لکھنؤ پہونچے، جہاں :-

بہت اُجڑے ہوئے مکاں دیکھے　　مٹنے والوں کے کچھ نشاں دیکھے

---

[1] جلوۂ داغ، مولانا احسن مارہروی، مطبع شمسی حیدرآباد ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۵ — [2] فریادِ داغ، محمد نثار علی شہرت دہلوی، صفحہ ۲

یہاں کی خاطر مدارات اور تواضع سے فرصت پاکر کانپور اور الہ آباد ہوتے ہوئے عظیم آباد پہونچے یہاں قیام زیادہ رہا۔

خوش گلو بھی کئی سنے میں نے خوبرو بھی کئی چنے میں نے

آخر کار منزلِ مقصود پر جا پہونچے، ناخدا کی مسجد کے سامنے بالائے بام قیام کیا اور دل کھول کر دادِ عیش دی۔

بخت بیدار و یار ہے دم ساز اے شبِ وصل تیری عمر دراز
صبح سے شام تک جمال کے لطف شام سے صبح تک وصال کے لطف
عیش و عشرت کی بات بات اچھی رات سے دن تو دن سے رات اچھی
ہر گھڑی نوک جھونک ہوتی تھی دم بدم روک ٹوک ہوتی تھی
رات عیش و نشاط میں گزرے صبح تک اختلاط میں گزرے
مدعی لاکھ ڈر دکھاتے ہیں وہ جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں

عیش و عشرت کا یہ زمانہ بھی مختصر نکلا، داغ کی رخصت کی مدت ختم ہوئی اور رامپور سے طلبی پر انھیں واپس آنا پڑا۔ لیکن مثنوی کے خاتمے تک وہ یہ لگی بجھ نہیں پائی۔

یا الٰہی نجات غم سے ملے وہ سراپا حجاب ہم سے ملے
ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

یہ مثنوی ذاتی اور وارداتی قسم کی ہے اس میں ایک گوشت پوست کا مرد ایک عورت کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے اور یہ محبت بلاشبہ جنسی کشش کی ایک شکل ہے، پڑھنے والوں کو یہ صورتِ حال پہلے ہی تسلیم کرلینا چاہئے، اسے میر حسن کی رموز العارفین سمجھ کر نہیں پڑھنا چاہئے بلکہ سحر البیان سامنے رکھنا چاہئے جس کے متعلق ایک طرف یہ دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر عشقیہ مثنوی اُردو میں نہیں لکھی گئی اور دوسری طرف انشا کہتے ہیں کہ مثنوی نہیں کہی سانڈے کا تیل بیچتے ہیں[1]۔ اس مثنوی میں دو موقعے ایسے آئے ہیں جہاں بقول بعض میر حسن پھسل گئے ہیں۔ ایک سراپا کے بیان میں بعض اشعار جہاں بعض اعضا کی بہت کھلی تشریح کی گئی ہے۔ دوسرے عاشق و معشوق کی ملاقات کا منظر جہاں دو ایک شوخ اشعار میر حسن کے قلم سے نکل گئے ہیں لیکن ان پر بھی پست مذاقی فحش نگاری یا ابتذال کا لیبل لگانا مشکل ہے کیونکہ ان میں بھی مناظر اور جذبات صرف اشاروں اور کنایوں میں ادا ہوئے ہیں، اگر اس بنا پر میر حسن کی سحر البیان فحش ہے تو پھر عاشقانہ شاعری کا بیشتر دفتر غرق آب کرنا پڑے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ نثر میں میر امن کی باغ و بہار سے لے کر شرر اور سرشار کے ناولوں سے گزرتے ہوئے ٹیڑھی لکیر تک سارے ناول دریا برد کردئے جائیں گے اور لے دے کر راہِ نجات اور میلادِ اکبر ہی ہمارے ادبی شہکار ٹھہریں گے۔

جب میر حسن پر اعتراض کی یہ نوعیت تو بیچارے داغ تو بالکل معصوم ہیں۔ انھوں نے وصل کا لفظ بار بار استعمال کیا ہے عیش و عشرت کا جابجا تذکرہ ہے۔ لیکن معاملات درون پردہ کی تشریح یا تفصیل کہیں بیان نہیں کی ہے اور جو کچھ کہا بھی ہے اسے اشاروں اور کنایوں میں ادا کیا ہے۔ شعر کا حسن اگر حسن معنی اور حسن بیان کا مجموعہ ہے تو اس مثنوی کا بیشتر حصہ حسین قرار پاتا ہے۔ اس میں اصلیت اور واقعیت ہے۔ جذبات نگاری اور سراپا نگاری ہے۔ ہجر اور وصل کے عالم کا بیان ہے اور ہر جگہ بات صفائی اور سادگی سے بیان کی ہے۔

اس مثنوی سے ایک بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ داغ کی عشقیہ شاعری محض نقالی یا رسمی نہیں، اگرچہ اس قسم کے

---

[1] دریائے لطافت صفحہ ۵۲

رسمی اشعار انکے یہاں موجود ہیں لیکن یہ داغ کے اصلی رنگ کو ظاہر نہیں کرتے :-

چشم پرشوق میں مژگاں ہیں زباں کے کانٹے　　ہیں جو از بسکہ ترا تشنۂ دیدار رہا
ترے دستِ حنائی میں ہے چور　　کسی کو ہاتھ کا سچا نہ پایا
تصور میں مرے تیری کمر ہے　　اُسے دُنیا سے کچھ عنقا نہ پایا
واں شبِ وعدہ ملی پاؤں میں منہدی اُسنے　　یاں کلیجا کوئی ملتا ہے تمنائی کا
آنسو بہا رہا ہوں خط یار پڑھ کے باربار　　یوں دانہ ڈالتا ہوں کبوتر کے رو برو
بنا حلقۂ زلف آغوش شوق　　گرفتار اُن کی کمر ہو گئی
غبار آلودہ ہیں پائے حنائی　　مٹاکر آئے ہو مدفن کسی کا
وہ اپنا دستِ حنائی بھی رکھتے ڈرتے ہیں　　علاج کون کرے میرے دل کے چھالوں کا
لگائے بیٹھے ہیں منہدی عبث شبِ وعدہ　　تمھیں امید ہے رنگِ حنا کے آنے کی

اس قسم کے اشعار داغ کے یہاں اور بھی مل جائیں گے لیکن یہ داغ کا اصلی رنگ ظاہر کرنے کی بجائے اس عہد کی مقبول طرز کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ناسخ اور آتش کا دور گزر چکا تھا لیکن لکھنویت کے علمبردار امیر، منیر، جلال، تسلیم اور اُن کے بکثرت متبعین موجود تھے۔ ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد ان میں سے اکثر نے دربار رام پور میں پناہ لی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد تو لکھنؤ اور دلی اُجڑ کر جو بستیاں آباد ہوئیں اُن میں ایک رامپور بھی تھا، داغ بھی ان محفلوں میں آکر شریک ہو جن میں امیر، منیر، جلال، امیر، تسلیم وغیرہ شامل تھے، محفلیں جمتی تھیں، مشاعرے ہوتے تھے اور طرحی مصرعوں پر طبع آزمائی کی جاتی تھی، ایسے مشاعروں سے جہاں ایک خاص قسم کی ادبی فضا پیدا ہوتی ہے وہاں چند پہلو ایسے بھی ہیں جو فنی حیثیت سے شاعری کے لئے مفید نہیں، مشاعروں کے لئے جو اشعار مصرعہ طرح پر لکھے جاتے ہیں اُن میں قدرتی طور پر آورد زیادہ ہوتی ہے یا دلی جذبات اور کیفیات کا وفور ہوتا بھی ہے تو ایک مخصوص اور محدود پیمانے میں ان جذبات کو ادا کرنے میں بڑے تکلف اور تصنع سے کام لینا پڑتا ہے۔ مشاعروں میں ایک قباحت یہ ہوتی ہے کہ جو رنگ عام پسند اور مقبول ہوتا ہے مشاعروں میں شرکت کرنے والے اس سے لازمی طور پر متاثر ہوتے ہیں، اعلیٰ درجے کے شعرا کے کلام میں جو بھرتی کے اشعار ملتے ہیں یا جن میں محض رسمی مضامین ادا کئے گئے ہیں اور اسی وجہ سے گلزار داغ[1] اور آفتاب داغ[2] میں زیادہ ہیں جو رامپور میں مرتب ہوئے۔ ان اثرات سے کسی قدر آزاد ہوکر داغ نے حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں جو کلام مرتب کیا ہے جو مہتاب داغ، یادگار داغ اور ضمیمہ یادگار داغ میں شامل ہے وہ ان کے پختہ اور اصلی رنگ کو ظاہر کرتا ہے۔

یہاں داغ کی ہوس پرستی اور رندی کے سلسلہ میں ایک اور نکتہ قابلِ لحاظ ہے۔ داغ نے ۱۳۰۸ھ[3] میں دربار رامپور سے قطع تعلق کیا اور اسی سال حیدر آباد گئے، اس وقت ان کی عمر ساٹھ برس سے صرف ایک سال بلکہ چند مہینے کم تھی، اس عمر میں جوانی کا چڑھتی آندھی اُتر چکی ہوتی ہے اور بقول غالب قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہتا، ان حالات میں یہ نتیجہ نکالنا زیادہ صحیح نہیں ہوگا کہ شاہد پرستی کے جو مضامین اس دور میں داغ کے کلام میں ملتے ہیں وہ اُن کے اس وقت کے ذاتی وارِدات اور واقعات کا بیان ہیں، اُن کی شوخی اور تیزی جو بلاشبہ بھرپور جوانی کے ساتھ ہی ہوسکتی ہے زیادہ سے زیادہ اُن

---

[1] گلزار داغ، مطبع انوار محمدی لکھنؤ تئیسواں اڈیشن، تاریخ طبع اول ۱۲۹۶ھ — [2] آفتاب داغ، مطبع انوار المطابع لکھنؤ، تاریخ طبع اول ۱۳۰۳ھ — [3] جلوۂ داغ، احسن مارہروی، مطبع شمسی حیدر آباد، صفحہ ۴۴، ۴۵۔

شوخی طبع کا نتیجہ ہے یا پھر جوانی کی یاد ہے جو دل میں گدگدی پیدا کرتی رہتی ہے ہمارے اکثر شعرا کی عمر کا آخری حصہ بڑی تنگ دستی عسرت اور معاشی بدحالی میں بسر ہوا ہے۔ میر، مصحفی، انشا، جرأت سے لیکر غالب تک سب کا انجام کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ اسی لئے ان لوگوں کے آخر عمر کے کلام میں حزن و ملال زیادہ ہے۔ داغ کا یہ زمانہ نہایت فارغ البالی اور اطمینان سے بسر ہوا اور طبیعت کی وہ شوخی، چلبلاپن اور رنگینی جو قلعہ معلیٰ میں پیدا ہوئی، دربار رامپور میں پروان چڑھی، حیدر آباد میں بھی قایم اور باقی نظر آتی ہے۔

شاہد پرستی اور رندی کے ان مضامین کا غزل سے خاص تعلق ہے۔ یہاں غزل کی تعریف اور اس کے عناصر کا تجزیہ مقصود نہیں ہے، حسب ذیل دو بیانات پیش نظر رکھنا ضروری ہیں، غیاث اللغات کا مؤلف لکھتا ہے[1]۔

"غزال بفتحتیں ..... بازی کردن از جوانی و حدیث صحبت و عشق زناں"

دریائے لطافت[2] میں اس کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے:۔

"دراں ابیات سوائے ذکر شاہد و شراب و شکوۂ الم مفارقت و بیان جفا و خوسۂ بد معشوق زیبانہ باشد و ہر آنچہ خلاف آنست غزل نبود و تصرفات یاداں اعتبار ندارد و کسانیکہ اشعار غزل برائے اظہار رعب برابلہاں و ملقب شدن بہ صاحب طرز جدید معما ساختہ اند کلام آنہا ہمہ غیر فصیح است و دو راز پایۂ قبول و شہرت در بلید طبعاں ہرگز نزدیک عقلا معتبر نیست"۔

ارتقائی ترتیب سے داغ کی عشقیہ شاعری کے اس عنصر کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک طرف گلزار داغ اور آفتاب داغ کا کلام جو رامپور کی یادگار ہے دوسرا مہتاب داغ اور یادگار داغ جو آخری دور کا کلام ہے اور جس کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ جو رنگ اور جو انداز پہلے دور میں کہیں کہیں جھلکتا تھا اب اس کا جلوہ عام ہوچکا ہے اور وہ شوخی جس میں حیا زیادہ اور شوخی کم تھی اب بدل چکی ہے اب شوخی، شرارت، چلبلاپن، اچپلاہٹ فتنہ قیامت بن چکی ہے، ان میں داغ ایک رند شاہد باز عاشقی کی بہت سی منزلیں طے کرچکا ہے، وہ اس مزہ سے پوری طرح واقف ہے اور اسے مزہ لے لے کر بیان کرتا ہے، بلاشبہ بعض اشعار ایسے بھی آجاتے ہیں جن میں گن گن کر بوسے لینے کا ذکر، اور "زبان میری دہن میں تیرے، زبان تیری دہن میں میرے" قسم کے مضامین ہیں لیکن بڑی تلاش کے بعد بھی ایسے اشعار کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ ہوگی اس اعتبار سے یہ دس بیس اشعار بآسانی نظر انداز کردئے جاسکتے ہیں اور ان کی بنا پر داغ کو اوباش یا ان کی شاعری کو فحش یا مبتذل قرار نہیں دیا جاسکتا جیسا کہ عرض کیا گیا ان اشعار کی خوبی ان کی شوخی اور بانکپن ہے۔ بعض لوگ غزل میں غلو تخیل اور مضمون آفرینی تلاش کرتے ہیں، قطع نظر اس بحث سے کہ اس انداز کا غزل سے واقعی کوئی تعلق بھی ہے، داغ کے یہاں اس کی تلاش سعی لاحاصل ہے کہ ان کا طرز ہی الگ ہے۔ اس طرز میں سیدھی سادی واردات اور واقعات عشق بیان ہوئے ہیں۔ اور عشق بالکل وہی ہے جسے بعض لوگوں نے 'فساد خوردن گندم' کا اثر بتایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ رنگ اس سے ملتا جلتا ہے جو جرأت نے اختیار کیا ہے لیکن جرأت کے یہاں شوخی اور بانکپن کی جگہ ایک طرح کا احساس کمتری ہے جو غالباً ان کی بصارت سے محروم ہونے کے باعث پیدا ہوا ہے۔ اور اس کی تلافی انھوں نے غیر معمولی مزاج اور غیر معمولی انداز بیان اختیار کرکے ایک انفرادیت کی صورت میں ظاہر کرنے سے کی ہے۔ اس لئے یہ تسلیم کرلینا پڑتا ہے کہ کہیں کہیں وہ بہت حد سے بڑھ گئے ہیں یا پھسل پڑے ہیں۔ داغ کے یہاں اس قسم کا احساس کمتری کہیں نہیں ملتا اور غالباً طبیعت کی شوخی شرارت یا چلبلاپن بھی اسی وجہ سے قایم رہا۔ اُن کے تیور نہ رمیدہ خوردہ عاشق کے نہیں ہیں جو محبوب کی ٹھوکروں سے پامال ہوجاتا ہے، جو رقیبوں سے ڈرتا ہے اور محبوب کے سامنے بھی ذکر رقیب کی جرأت نہیں کرتا، داغ کا انداز بالکل دوسرا ہے۔ یہ شعر دیکھئے:۔

جواب اس طرف سے کبھی فی الفور ہوگا　　　دبے آپ سے وہ کوئی اور ہوگا

---

[1] غیاث اللغات، صفحہ ۳۴۴ — [2] دریائے لطافت ص ۲۳۶

یا پھر یہ شعر:- اک نہ اک ہم لگائے رکھتے ہیں، تم نہ ملتے تو دوسرا ملتا،

اور یہ مقطع:- ہر اک سے کہتے ہیں کیا داغ بے وفا نکلا یہ پوچھے ان سے کوئی وہ غلام کس کا تھا

یہ تیور داغ کے سوا اور کہاں مل سکتے ہیں۔

بعض حضرات کا خیال[1] ہے اُردو غزل میں کم لوگوں نے عشق کی سطح کو بلند رکھا ہے، ان میں مومن خاں مومن بھی ہیں۔ اور جن لوگوں نے خاص طور پر اس سطح کو پست کیا ہے اُن میں متوسطین میں جرأت اور متاخرین میں داغ ہیں۔ معلوم نہیں عشق کی بلند و پست سطح سے کیا مراد ہے، ایسا عارفانہ عشق جس میں عاشق محبوب کے حسن و جمال اس کے خد و خال، زلف و عارض، دہن و کمر سے لگاؤ ظاہر نہ کرے، جیسے محبوب سے ملنے، اسے اپنانے اور غیروں کے تصرف نہ آنے دینے کا خیال نہ آئے، جس میں شوق وصال اور ہجر کا سوال نہ ہو یا جس کے محبوب کا اور کوئی چاہنے والا نہ ہو یا ہو تو عاشق کی بلا سے تو ایسا عشق کم ازکم اُردو غزل میں کہیں نہیں ملتا۔ سلطان محمد قلی قطب کی بھاگ متی سے مصحفی کی عصمت اور داغ کی حجاب تک ایک مرد نے ایک عورت سے عشق کیا ہے اور اس پر تقشع یا تکلف کے کتنے ہی پردے کیوں نہ ڈالے جائیں اور پارسائی کی کتنی ہی قسمیں کیوں نہ کھائی جائیں اس عشق کی تہ میں جنسی لگاؤ ضرور پایا جاتا ہے اور ایک ایسے زمانہ میں جب معاشرتی آزادی کا انداز وہ نہ تھا جو آج ہے اور مردوں عورتوں کا ملنا نہ ممکن تھا اور نہ پسندیدہ، یہ بات قطعاً تعجب انگیز نہیں کہ ہمارے شعرا بازاری عورتوں کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ داغ کا قصور اگر ہے تو صرف اتنا کہ انھوں نے اس حقیقت کو ذرا بے جھجک ہوکر بیان کر دیا لیکن اس اعتبار سے بھی وہ کم ازکم اُن غزل کے باکمال استادوں سے زیادہ قابلِ احترام ہیں جنھوں نے اسے چھپانے کے لئے امرد پرستی کا سچا یا جھوٹا پردہ ڈالا ہے جو یقیناً داغ کی صاف گوئی سے زیادہ مکروہ اور نفسیاتی اعتبار سے ایک مریض ذہنیت کا ترجمان ہے۔

داغ نے اُردو غزل کو اس منزل پہ پایا جہاں ناسخ اور آتش کے شاگردوں نے اسے پہونچا دیا تھا، یہاں پہونچکر غزل میں رسمی مضامین، رسمی اشارے اور کنائے، خیالی مضامین اور تلاش الفاظ کے سوا کچھ نہ رہا تھا، داغ نے غزل کو ایک نئے موڑ پر لاکر کھڑا کر دیا اور ان حقیقتوں کو خود بغیر جھجکے بیان کیا، پھر اس کے لئے اندازِ بیان ایسا اختیار کیا جس سے زیادہ رچا ہوا انداز غزل کو اس سے پہلے نصیب نہ ہوا تھا، وہ پہلے غزل گو ہیں جن کی غزل زبان اور محاورے کی تاریخ میں بھی ایک بے مثل شاہکار ہے لیکن اس کی تفصیل اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

کتابیات ۔ گلزارِ داغ ۔ مطبع انوار محمدی لکھنؤ ۱۲۹۶ھ ــــ آفتاب داغ ــ انوار المطابع لکھنؤ ۱۳۰۱ھ۔
مہتاب داغ ۔ مطبع مفید عام لاہور مرتبہ لالہ سری رام ــــ ضمیمۂ یادگار داغ ۔ فریاد داغ ۔ مطبع اخبار نیر اعظم مرادآباد ۱۳۰۲ھ
جلوۂ داغ ــ مولانا احسن مارہروی، مطبع شمسی حیدرآباد دکن ــــ آئینۂ داغ ۔ نثار علی شہرت دہلوی۔
گلشنِ بیخار ۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، مطبوعہ نولکشور ــــ مصحفی ۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور۔
جرأت اس کا عہد اور عشقیہ شاعری ــ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، مطبوعہ سندھ اُردو اکیڈیمی کراچی۔
بنی ۔ مصنفۂ واجد علی شاہ، مطبوعہ مطبع شاہی مٹیا برج ــ تاریخ ادبِ اُردو، رام بابو سکسینہ، مترجمہ مرزا محمد عسکری
دریائے لطافت ۔ انشاء اللہ خاں، مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ۔
غیاث اللغات ۔ غیاث الدین ــــ انتخاب مومن ۔ سید وقار عظیم، مطبوعہ سندھ اُردو اکیڈیمی کراچی۔

---

[1] انتخاب مومن سید وقار عظیم، صفحہ ۱۹

داغ کی شاہد پرستیاں

(یاسین علی خاں بی۔ اے)

داغ کو گانا سننے کا بہت شوق تھا۔ اول اول تو اچھے گانے والیوں کو مہینے میں دو چار مرتبہ بلواکر رات کے کھانے کے بعد گھنٹے دو گھنٹے گانا سن لیا کرتے تھے اور جب تنخواہ بڑھ گئی تو یکے بعد دیگرے دو تین طوائفوں کو ڈیڑھ دوسو ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ انکی نوکری صرف اتنی تھی کہ دوسرے تیسرے روز یا جب بھی طلبی ہو گانا سنادیا کریں۔ ان محفلوں میں گنتی کے لوگ شریک رہتے تھے، جن میں مرزا خورشید عالم عابد۔ ابوالحمید آزاد۔ بارق نواب صاحب اور نواب عزیز یار جنگ اور تجلی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ کبھی ایک دو شاگرد بھی ہوا کرتے مہاراجہ بہادر بھی کبھی کبھی آجایا کرتے تھے۔ سب سے پہلے صاحب جان کو ملازم رکھا۔ یہ آگرہ کی رہنے والی تھی۔ صورت شکل کی زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن گاتی خوب تھی اور چوٹی کا کلام یاد تھا۔ اس کے بعد عمدہ جان کو ملازم رکھا جو میرٹھ کی رہنے والی تھی۔ نہایت شکیل اور بڑی حاضر جواب۔ گاتی بھی خوب تھی۔ وہ کسی سے نکاح کرکے پردہ نشین ہوگئی۔ اس کے بعد آخری زمانہ میں سورت کی رہنے والی اختر جان کو دوسو روپیہ ماہوار پر ملازم رکھا جو ایک نوعمر اور حسین طوایف تھی۔ سال ڈیڑھ سال بعد اس نے داغ صاحب کی ملازمت چھوڑ دی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک لکھنوی صاحب اس وقت منصف تھے اور بعد کو سشن جج ہوگئے تھے۔ وہ اختر جان پر بری طرح فدا تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح اپنے گھر ڈال لیں۔ مگر وہ داغ کی ملازم تھی اور داغ استادِ شاہ تھے، اس لئے چپکے چپکے ریشہ دوانیاں کرتے رہتے تھے۔ بالآخر انھوں نے اختر کو سمجھا بجھا کر اس سے یہ کہلوا دیا کہ اب میں سورت واپس جانا چاہتی ہوں آپ میری مدد کر دیجئے۔ داغ صاحب نے مہاراجہ بہادر سے سفارش کی اسے وہاں سے کچھ روپیہ مل بھی گیا لیکن ترک ملازمت کے بعد وہ اپنے وطن نہیں گئی بلکہ کچھ دنوں کے لئے بمبئی جاکر پھر حیدر آباد واپس آگئی یہ قصہ داغ صاحب کے انتقال سے کوئی پونے دو برس پہلے کا ہے چنانچہ ایک خط مورخہ ۲ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ میں نواب حسن علی خاں صاحب کو لکھتے ہیں:

"جو کچھ مہاراجہ بہادر کے پاس سے اختر کو مدد خرچ ملا ہے مجھ کو معلوم ہے، بلکہ میں نے مہاراجہ بہادر کو لکھا بھی تھا اور سعی بھی کی تھی۔ یہ لوگ صاف نہیں ہیں، مجرا نہیں شراب بھی ہے اور بھنگ بھی۔ یہ آجکل کمانے کے اچھے ہیں ڈھنگ بھی۔ اختر جان کو یہ شعر بھیجئے۔ شاید کل یہ شعر مکان پر کسی کو میں نے لکھ بھیجا ہے۔ دریافت کرنا۔" اس زمانہ میں منی جان حجاب بھی حیدر آباد میں موجود تھیں۔ نواب صاحب فرماتے تھے کہ داغ کو اچھی صورت سے عشق تھا اور جب کسی حسین کی صحبت میسر نہ آتی تو انھیں وحشت سی ہونے لگتی تھی۔ ایک واقعہ اختر جان ہی سے متعلق یاد آگیا۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر اور نواب صاحب دونوں بیان کرتے تھے کہ ایک دن داغ کو ترک ملازمت کے بعد بھی اختر جان کا خیال آیا۔ جمال صاحب ملازم خاص کو بھیجا اور کہا کہ دیکھ ساتھ لیتے آنا جمال صاحب بڑے کمال کے آدمی تھے بہ مشکل دستخط کرسکتے تھے لیکن سلیقہ غضب کا تھا۔ ہر کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ داغ کی اکثر غزلیں یاد کرلی تھیں اور بڑے مزے سے گاکر سنایا کرتے تھے اور نقالی میں استاد تھے۔ یہ گئے اور بہت کچھ ڈورے ڈالے لیکن وہ کب ماننے والی تھی۔ جمال صاحب ناکام واپس ہوئے۔ نواب صاحب نے اختر کی مفارقت میں داغ کا جو

یہ عالم دیکھا تو مہاراجہ بہادر سے اس کا ذکر کیا۔ مہاراجہ بہادر داغ کے شیدائی تھے کسی نہ کسی طرح اختر کو سمجھا کر دوبارہ ملازم کرا دیا اور اپنے پاس سے بھی سو روپیہ ماہوار دیدیا کرتے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ داغ فطرتاً حسن پرست اور عاشق مزاج تھے۔ طبیعت میں بلا کی شوخی تھی۔ جو تادمِ مرگ ان کے ساتھ رہی۔ اور یہی ان کی شاعری کی کامیابی کا راز تھا۔ اسی لئے داغ نے آخر وقت تک مہوشوں سے سابقہ رکھا اور ہمیشہ شگفتہ اور جان دار شعر کہتے رہے۔ چنانچہ دکن میں جو اچھی غزلیں داغ نے کہی ہیں ان میں کے اکثر شعر ایسی ہی محفلوں میں لکھے گئے تھے۔ بعض دفعہ تو یہ ہوتا کہ گانا ہو رہا ہے۔ داغ شعر لکھوا رہے ہیں۔ آمد کا وہ عالم ہے کہ دو شاگرد علحدہ علحدہ لکھتے جاتے ہیں پھر بھی جس تیزی سے داغ صاحب شعر کہتے جاتے اس رفتار سے لکھنا مشکل ہوجاتا اور نتیجتاً ایک آدھ شعر یا دو چار مصرعے چھوٹ جاتے۔

منّی جان حجاب

مثنوی "فریادِ داغ" میں منّی جان حجاب کی جوانی کی تصویر داغ نے یوں کھینچی ہے:۔

سج دھج آفت غضب تراش خراش — کسی اچھے کی دل ہی دل میں تلاش
وہ اٹکتی ہوئی نظر آیا، — وہ لچکتی ہوئی کمر آیا
نشۂ حسن کی ترنگ غضب — نوجوانی کی تھی امنگ غضب
شوخیاں ہیں حجاب میں کیسی — لن ترانی جواب میں کیسی،
گرتے گرتے کبھی سنبھل جانا — ادھر آنا اُدھر نکل جانا
حسن کی آن بان ہائے غضب — بے نیازی کی شان ہائے غضب
رقصِ طاؤس باغ سے اچھا — شعر کا لطف داغ سے اچھا
جس طرف اُٹھ گئی وہ شوخ نگاہ — شور اُٹھا کہ بس خدا کی پناہ

حجاب کے ہونٹ پر تل تھا اس سے فایدہ اُٹھاتے ہوئے داغ نے ایک رُباعی لکھی ہے:۔

تم تو فلکِ حسن پہ ہو ماہِ منیر — سائے کی طرح ساتھ ہے داغِ دلگیر
خالِ لبِ گلفام ہے شاہد اس کا — بے داغ نہ کھنچ سکی تمھاری تصویر

داغ کی زبانی آپ حجاب کی جوانی کی کہانی سُن چکے۔ اب مجھ سے کچھ ان کے بڑھاپے کا حال سنئے۔ داغ نے کچھ ایسی چوٹ دل پر کھائی تھی کہ مدت العمر بھلائی نہ گئی۔ رامپور سے قطع تعلق کے بعد داغ بھی حجاب کو فراموش کر چکے تھے، لیکن دکن کی خوشحالی کے زمانہ میں پھر یاد تازہ ہوگئی۔ ۱۳۱۶ھ میں داغ کی اہلیہ داغ مفارقت دے گئیں جس کا ان کو سخت صدمہ تھا۔ اپنی اہلیہ کے انتقال کے کوئی دو سال بعد نواب بہادر حسین خاں انجم نیشاپوری اور قاضی عبدالحمید ساکن کلکتہ کے توسط سے حجاب سے پھر نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہوا اور حجاب اس شرط کے ساتھ ۱۹۰۱ء کے آخری مہینے میں حیدر آباد آئیں کہ جب تک نکاح نہ ہوجائے گا وہ سامنے نہ آئیں گی —— حجاب کے ساتھ ایک شخص خدا بخش بھی تھا۔ جس کو میں نے بھی دیکھا ہے کیونکہ یہ داغ کے انتقال کے بعد بھی آٹھ دس برس تک زندہ تھا اور حیدر آباد ہی میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔ خدا بخش ستار خوب بجاتے تھے اور پکّا گانا گاتے تھے۔ عمر کوئی ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ اکثر امرا کے پاس جایا کرتے اور گانے کی تعلیم ان کے بچوں کو دیا کرتے تھے اور یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ حیدر آباد ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ حجاب جب حیدر آباد آئیں تو کچھ دن تک پردہ پر اصرار کا سلسلہ جاری رہا، لیکن آخرکار یہ حجاب ٹوٹا اور وہ سامنے ہوگئیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب داغ قدیم مکان واقع محبوب گنج ہی میں رہا کرتے تھے اور ابھی ترپ بازار والی بڑی کوٹھی میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ حجاب کا قیام نیچے کی منزل میں تھا اور داغ اپنا زیادہ تر وقت وہیں گزارا کرتے تھے اور دونوں وقت کا کھانا بھی نئے مہمان کے ساتھ ہی کھایا کرتے تھے۔

نواب میر حسن علی خاں صاحب[1] کا زیادہ تر وقت داغ کے ساتھ گزرتا تھا، لیکن جب انھوں نے یہ صورت دیکھی تو آنا جانا کم کردیا اسی واقعہ کی طرف داغ نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۵ر جنوری ۱۹۰۲ء میں اشارہ کیا ہے۔ وہ خط یہ ہے:۔

"نواب بہادر۔ صاحب عالم بہادر کہتے ہیں کہ کل صبح پتنگوں کے پیچ میں بغیر نواب صاحب کی تشریف آوری کے کچھ نہیں ہوسکتا مجھ کو خبر نہ تھی کہ پیچ وہاں لڑیں گے اور دلوں میں پیچ مجھ سے پڑے گا۔ مرد خدا یہ کیا بات ہے۔ آپ نے محبت یک لخت کم کرکے کیوں ترک کردی میں نے کوئی بات بغیر آپ کے مشورہ کے نہیں کی۔ مصلحتِ وقت نہیں چھوڑی جاتی۔ آپ کو حسب معمول روز آنا چاہئے اور ماحضر بھی تناول فرمانا چاہئے۔ اور اگر تنہا کھانا کھانا گوارا نہیں ہے تو بہتر ہے نہ کھایئے۔ مجھ کو غم بھی نہ کھلایئے۔ آیئے آیئے۔ تشریف لایئے۔ فقط　　　فصیح الملک داغ دہلوی"

واقعہ یہ تھا کہ بی حجاب اور داغ کو بھی پتنگ بازی سے دلچسپی تھی۔ مرزا خورشید عالم بہادر سے وہ بے پردہ ہوچکی تھیں اور حجاب ہی کے ایما سے پتنگوں کے پیچ مقرر ہوئے تھے۔ مرزا خورشید عالم بہادر نے داغ سے کہدیا کہ نواب صاحب مجھ سے بے پردگی اور اُن سے پردہ کرنے پر رنجیدہ ہیں اور ان کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ داغ نے اسی شب تذکرۂ صدر رقعہ نواب صاحب کو لکھا۔ نواب صاحب کہتے ہیں مجھے داغ صاحب سے بے حد محبت تھی اور جب یہ رقعہ مجھے ملا تو میں صبح کے انتظار میں بے چین رہا اور صبح کو نماز کے بعد ہی وہاں پہونچا۔ ملازم نے کہا داغ نیچے ہیں اور خود پکوان کی نگرانی کررہے ہیں، مجھے حیرت ہوئی کہ آج ان کو پکانے کی خوب سوجھی۔ میں اوپر بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر میں ملازم آیا اور کہنے لگا سرکار آپ کو نیچے بلاتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ زنانہ حصۂ مکان ہے۔ اس لئے میں نے ملازم سے کہا مجھے نہیں کسی اور کو بلایا ہوگا۔ وہ چلا گیا اور پھر بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ سرکار کہتے ہیں نواب صاحب کو یہاں بلالو۔ میں نیچے اُترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ داغ ڈیوڑھی کے دروازہ پر میرے انتظار میں کھڑے ہوئے ہیں اور جیسے ہی مجھ کو دیکھا۔ فرمایا۔ زود رنج نواب آگئے۔ اور گلے سے لپٹا لیا۔ اور ہاتھ پکڑ کر اندر لیچلے۔ نواب صاحب کہتے تھے جیسے ہی میں نے صحن خانہ میں قدم رکھا تو ایک قہقہہ کی آواز سنی اور بی حجاب میرے سامنے تھیں اور داغ مسکرا رہے تھے، کوئی ۴۰ - ۴۵ کا سن ہوگا۔ رنگ صاف آنکھیں بڑی بڑی۔ ناک اونچی بالوں پر خضاب چڑھا ہوا۔ پتلے پتلے لب۔ میانہ قد۔ اونچی پیشانی۔ مانگ پھٹی پھٹی سی تنگ اطلس کا پاجامہ مغزی ٹکا ہوا۔ لانبا کرتا اور اس پر سفید اوڑھنی۔ پاؤں میں دہلی کی جوتی اور دونوں ہاتھوں کی پتلی پتلی اُنگلیوں میں انگوٹھیاں۔ میں نے سلام کیا۔ حجاب نے اس کا جواب نہایت ہی خندہ پیشانی سے دیا اور خاموش رہیں۔ داغ بہت خوش تھے کہنے لگے نواب تمھارے لئے آج بریانی پک رہی ہے۔ قسم حیدر آبادی ہے اندر کے دالان میں دو تخت پڑے ہوئے تھے اور اس پر دو بڑے بڑے قالین بچھے ہوئے تھے۔ میں اور داغ تخت پر بیٹھ گئے اور حجاب بھی کچھ دور کرسی پر آکر بیٹھ گئیں۔ اور خاموش رہیں۔ داغ نے امیرن (پروردہ) سے کہا حقہ لا۔ دو حقے آگئے۔ تھوڑی دیر تک سکوت رہا اس کے بعد داغ نے فرمایا۔ آج پتنگوں کے پیچ ہیں۔ آپ ہماری طرف ہوں گے۔ دیکھیں تو مرزا خورشید کیسے پیچ کاٹتے ہیں۔ یہ فقرہ سُن کر حجاب بول اُٹھیں۔ ہاں نواب صاحب ہماری طرف ہوں گے اور داغ سے کہا سامان تو نواب صاحب کو دکھالیں اور اُٹھ کر برابر کے کمرے میں گئیں اور وہاں سے دو چار پتنگ اور مانجھے کی چرخی لئے ہوئے آئیں اور نواب صاحب کے سامنے رکھدیں۔ نواب صاحب نے پتنگ اور مانجھا دیکھا اور کہا بہت اچھا سامان ہے آج صاحب عالم بہادر کی خیر نہیں۔ اس کے بعد حجاب کھلتی گئیں اور کہا آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ روزانہ آپ کا نام سنتی تھی۔ آج ملاقات ہوئی۔ داغ مسکراتے جاتے تھے اور حجاب اور نواب صاحب

---

[1] نواب حسن علی خاں کے پردادا سید محمد صاحب اورنگ زیب کے زمانہ میں حیدر آباد آئے اور صاحب منصب و جاگیر ہوگئے تھے۔ اسی منصب جاگیر کا کچھ حصہ نواب حسن علی خاں کو بھی ملا تھا اور جس وقت داغ حیدر آباد پہونچے تو یہ امیرانہ زندگی بسر کررہے تھے لیکن داغ کے حیدر آباد پہونچنے پر انھوں نے بھی داغ کی شاگردی اختیار کی، لیکن شاگردی سے زیادہ مضبوط رشتہ دوستی و محبت تھا جو آخیر وقت تک باقی رہا۔

کی گفتگو سنتے جاتے تھے۔ داغ نے کہا نواب صاحب صبح کو چائے پیتے ہیں اگر دیر ہوگئی تو خفا ہوجائیں گے۔ حجاب نے زور سے قہقہہ لگایا اور کسی سے کہا کہ چائے جلد لا ورنہ نواب صاحب روٹھ جائیں گے۔ تھوڑی دیر میں اسی تخت پر دسترخوان بچھا۔ صاحب عالم بہادر بھی بلوائے گئے۔ ان کے آتے ہی داغ نے بلند آواز سے کہا۔ صاحب عالم بہادر آج نواب صاحب ہماری طرف ہوں گے اور اُن کا کہنا ہے کہ آج دیکھیں تو آپ کیسے پیچ کاٹتے ہیں۔ صاحب عالم بہادر نے کہا اب دیر ہی کیا ہے خود فیصلہ ہوجائے گا۔ نواب صاحب نے داغ اور حجاب سے متعلق ایک طویل غزل کہی تھی اور اس بے پردگی سے قبل خورشید عالم بہادر کو سنا چکے تھے۔ (یہ غزل انھوں نے اپنے دیوان میں نہیں رکھی۔ اس کا صرف مطلع جو ان سے سُنا تھا مجھے یاد رہگیا) مرزا خورشید عالم بہادر نے داغ سے کہا نواب صاحب نے ایک تازہ غزل کہی ہے اور سننے کے قابل ہے۔ حجاب نے کہا ہاں نواب صاحب سرفراز فرمائیے۔ داغ نے بھی کہا بھئی سناؤ۔ نواب صاحب پریشان تھے کہ پہلی ملاقات میں ایسی غزل کیسے سناؤں۔ بہت عذر کیا لیکن سب کے اصرار پر دو چار شعر اس وقت سنا ہی دئے۔ اس کا مطلع یہ تھا:۔

یہ حجاب آپ کا گو ٹوٹنے والا ہے ضرور　　　روزِ محشر یہ مگر آپ نے ٹالا ہے ضرور

نواب صاحب کہتے تھے کہ یہی ایک ایسی غزل تھی جس پر میں نے اصلاح نہیں لی۔ داغ نیم دراز تھے اُٹھ بیٹھے اور اس شعر کے مزے لینے لگے۔ حجاب بہت خفیف ہوئیں مگر چپ تھیں۔ جب غزل ختم ہوئی تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور اس کے بعد دوپہر کے کھانے سے قبل تک پتنگ بازی ہوتی رہی۔ جب دھوپ تیز ہوچکی تو یہ شغل بند ہوا۔ اور دوپہر کا کھانا کھاکر نواب صاحب اپنے گھر واپس ہوئے اور اس روز سے حسب سابق داغ کے پاس آنے جانے لگے۔ حجاب گرم مزاج تھیں۔ اپنے اور داغ کے بیچ میں کسی کی مداخلت کو پسند نہیں کرتی تھیں اور داغ کے اعزہ کو ان کی یہ باتیں ناگوار تھیں۔ اس کے سوا یہ بھی ہوا کہ حجاب نے اپنے چند لواحقین کو جو تنگ دست تھے حیدر آباد بلالیا تھا۔ داغ ان سب کو اپنے گھر رکھ نہیں سکتے تھے اس لئے ایک کرائے کا مکان تجویز ہوا۔ حجاب کے آگ اس میں ٹھہرا دئے گئے اور اس بات کا داغ کے رات دن کے بیٹھنے والوں میں بھی صرف دو تین ہی کو علم تھا۔ حجاب، داغ ہی کے گھر میں رہتی تھیں اور اپنے لواحقین کی خبرگیری بھی کرتی تھیں۔ مکان کا کرایہ تو معمولی تھا لیکن داغ سارے خرچ کی کفالت کے بعد سو روپیہ ماہانہ دیا کرتے تھے۔ یہ بھی ان کو ناکافی ہونے لگا۔ وہ اِدھر اُدھر سے قرض لینے لگیں چنانچہ داغ کی صاحبزادی سے کبھی لے لیتیں کبھی کسی اور سے اس کی جب خبر داغ کو ہوئی تو وہ بگڑ گئے اور حجاب کرایہ کے مکان میں اُٹھ گئیں چنانچہ اسی کا ذکر داغ نے نواب صاحب سے اپنے ایک خط میں کیا ہے جو ۳ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ کا لکھا تھا۔ لکھتے ہیں:۔

"حجاب کے گھر آپ گئے۔ کیفیت معلوم ہوئی۔ ان کی گزر یوں تو سو روپے مہینے میں بھی نہ ہوگی۔ جب وہ میرے مکان میں تھیں تو گیارہ مہینے بتاتی تھیں۔ مکان دار کو معرفت عبدالحمید (ملازم) کے بلاکر دریافت کرو کہ تمھارا کیا لینا ہے۔ از روئے کاغذ بتاؤ۔ اور نصف کرائے پر فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر لینا ہو تو اس سے زیادہ یہاں سے نہیں ملیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا جواب لے کے مجھے لکھئے"

اس کے بعد ایک اور خط مورخہ ۵ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ میں لکھتے ہیں:۔

"لفظ بی جو شرفا کے واسطے ہے اس پر خفا ہوئیں میں نے خوب جھاڑا ہے۔ فدا ان کو جھاڑے گا۔ میں نے جو ان کو خط لکھا ہے وہ انا کے خط میں ہے اس کو انا سے لیکر آپ پہونچائیں تو بڑی عنایت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ناچاقیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ لیکن نواب صاحب بیچ بچاؤ کرتے رہتے تھے۔ بالآخر معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ چنانچہ اس کے بعد کے خط میں جو ۹ جمادی الاول ۱۳۲۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔ نواب صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"نواب صاحب۔ سلام۔ میں خیر کا طالب ہوں ہر کار منظور نہیں۔ مرمت کی کیا صورت ہوئی۔ اس بارش میں

مشکل ہے۔ بی حجاب کل سے وارد ہیں اور آپ کی مشتاق - ان کا مکان گرا۔ جان بچ گئی - اس کی مرمت ہو رہی ہے - یہاں تو کہیں ٹھکانا نہیں - زیادہ نیاز - فصیح الملک داغ دہلوی "

یہ وہ زمانہ ہے جب داغ ترپ بازار کی بڑی کوٹھی میں منتقل ہو چکے تھے - اسی سال حجاب اپنے وطن واپس چلی گئیں۔ اس کے دو سبب تھے ایک تو یہ کہ داغ سے جو روپیہ انھیں ملتا تھا وہ ان کی نظر میں ناکافی تھا اور دوسرا یہ کہ داغ کو گانا سننے کا بھی شوق تھا اور اس وقت ان کے پاس اختر جان طوائف دوسو ماہوار پر ملازم تھی - یہ امر بھی حجاب کو سخت ناگوار تھا۔ الغرض ناچاقیاں اتنی بڑھیں کہ وہ اپنے وطن چلی گئیں اور داغ بھی خاموش ہورہے۔ نواب صاحب کا بیان ہے کہ اس کے بعد بھی حجاب کو تا دمِ مرگ بھیجتے رہے جس کی خبر داغ اور حسن علی خاں صاحب کے سوا تیسرے کو نہ تھی - حجاب شاعرہ بھی تھیں ان کا نمونۂ کلام یہ ہے :-

امر دشوار تھا اس گھر میں رسائی میری　　کششِ دل نے پتہ ٹھیک بتایا تیرا
آج مجھ سے وہ سرِ بزم ادا سے بولے　　تو شناسا ہے مرا میں ہوں شناسا تیرا
بزمِ دلدار میں اغیار کا مجمع ہے حجاب　　قصد کیا دل میں ہے اب کیا ہے ارادہ تیرا
بس میں اغیار کے ہے یار اپنا　　دل ہے اس غم سے بے قرار اپنا
دل بہت بے چین بے آرام ہے　　کیا محبت کا یہی انجام ہے

داغ کی انصاف پسندی

(نفیس سندیلوی)

محمود علی خاں محمود رامپوری داغ کے نہایت عزیز شاگرد تھے اور اپنے استاد کے رنگ میں خوب کہتے تھے - ان کی حیات ان کے ایک شاگرد رشید رامپوری نے مرتب کی ہے، اس میں ایک واقعہ درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ داغ زبان و شاعری کے باب میں انصاف پسندی کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے -

صاحب حیات محمود لکھتے ہیں :-

" ایک روز استاد داغ نے بیٹھے بیٹھے ایک مطلع کہا :-

کیا کہوں تجھ کو جو بے مہر ستمگر نہ کہوں　　جو زمانہ کہے اس بات کو کیونکر نہ کہوں

جب محمود صاحب کو سنایا تو انھوں نے کہا :- " استاد، قصور معاف " جو زمانہ کہے " یا " جس کو دنیا کہے " اہلِ زبان " زمانہ کہے " نہیں لکھتے -

داغ سنکر چپ ہو گئے، تھوڑی دیر بعد مقطع سنانے لگے :-

حرفِ بد منھ سے نکالا تو تمھیں جانوگے
داغ پھر مجھ کو نہ کہنا جو برابر نہ کہوں

محمود صاحب نے تعریف نہیں کی - داغ نے پوچھا " چپ کیوں ہو " بولے " سخت بے ادبی ہے، مگر زبان نہیں رکتی ہے " حرفِ بد " محاورہ کب ہے - یوں ہونا چاہئے :- " اب کی کچھ منھ سے نکالا تو تمھیں جانوگے "

داغ نے سینے سے لگا لیا اور کہا شاباش، گو یہ ہمارے ہی الفاظ ہیں جو تمھارے کانوں میں پڑے ہیں مگر وقت پر ہم کو یاد نہیں آتے

داغ کی اصلاحیں

(سخاوت مرزا۔ بی اے ال ال بی)

سجادہ صاحب (حضرت گنج نشین پیدری) کا بیان ہے کہ استاد داغ کے پاس تلامذہ کا ایک باقاعدہ رجسٹر رہتا تھا جس میں نام، پتہ، تاریخ وصول خط و جواب بھی درج کی جاتی تھی۔ داغ کے ہزاروں شاگرد تھے۔ میں پہلے داغ کا غائبانہ شاگرد ہوا اس وقت میری عمر ۱۸ سال کی ہوگی۔ کچھ عرصہ کے بعد میں حیدر آباد گیا۔ ایک تقریب میں نواب شمس الملک ظفر جنگ نے میرا داغ سے تعارف کرایا تو داغ نے فوراً ہی پہچان لیا اور کہا کہ آیا آپ وہی ہیں جن کی غزلیں اصلاح کے لئے بیدر سے آتی ہیں بہت خلوص اور محبت سے ملے، اس کے بعد جب کبھی بلدہ آتا تو استاد سے ضرور ملتا۔ بالمشافہ اصلاح بھی لیتا۔ طریقہ یہ تھا کہ شاگرد خود اپنی غزل پڑھ کر سناتا یا کوئی اور ممتاز شاگرد پڑھتا، اکثر احسن مارہروی پڑھا کرتے تھے، تلامذہ وقت مقررہ پر عموماً صبح کے وقت جمع ہوجاتے، یکے بعد دیگرے شاگردوں کی غزلیں پڑھی جاتیں۔ ایک شعر پڑھنے کے بعد جملہ تلامذہ سے سوال ہوتا کہ بتلاؤ اس شعر میں کیا نقص ہے۔ ہر ایک کے اظہار خیال کے بعد اُستاد کی رائے اور اصلاح مسلم سمجھی جاتی تھی اس وقت محاورہ بندی، سلاستِ زبان اور روزمرہ کے استعمال کا زیادہ خیال رکھا جاتا اور تلامذہ کو نہ صرف اس کی سخت تاکید تھی بلکہ اُسی وقت بالمشافہ صحیح استعمال کرنا سکھایا کرتے تھے۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ ہزاروں حیدر آبادی، تلامذۂ داغ زبان کی صفائی اور محاورہ بندی اور سلاست میں اہلِ زبان سے پیچھے نہ رہے۔ گویا حیدر آباد اس وقت جنوبی ہند کا زبردست مرکزِ اُردو بنا ہوا تھا، جہاں نہ صرف حیدر آباد بلکہ صوبہ مدراس و بنگلور وغیرہ کے اشخاص نے داغ کی شاگردی سے فایدہ اُٹھایا۔

افسوس ہے کہ حیدر آباد جیسے مقام میں جہاں داغ کے سیکڑوں شاگرد ہوں داغ کے اصلاحات کا ذخیرہ نہیں ملتا، پروفیسر ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے پاس انوار اللہ خاں انور المخاطب بہ فضیلت جنگ مرحوم استاد موجودہ حضور نظام کی ایک بیاض ہے جس میں داغ کی صرف ایک اصلاح شدہ غزل موجود ہے۔ جس کو ادارے نے شیشے کے فریم میں محفوظ کرلیا ہے (فہرست ادارہ جلد دوم صفحہ ۹۴) اور مولوی کریم الدین تلمیذ داغ، برادر زادہ عباس علی خانساماں مرحوم کے پاس ایسی سیکڑوں اصلاحی غزلیں تھیں جو افسوس ہے تلف ہوگئیں۔ ہم کو خوش قسمتی سے بقیام بیدر غیر مطبوعہ اصلاحات داغ سجادہ صاحب سے ملیں جن کو ہم یہاں پیش کرتے ہیں:۔

سجادہ:۔	اعجاز حُسن سے تری جوں صبح شام غم	ہوتے ہیں روز چاک گریباں نئے نئے
اصلاح:۔	زیبِ بدن وہ دیکھ کے اسکی قبائے چست	- - - - - - - - - - - -
سجادہ:۔	پہلے جو راز داں تھے گئے اُن کو آپ بھول	اب راز داں ہیں آپ کے جاناں نئے نئے
داغ:۔	ـــــــــــــــــ	اب راز داں بنے ہیں میری جاں،

اُس کو خنداں دیکھ خنداں جام خنداں رہ گیا — شیشۂ گریاں بھی مجھ گریاں پہ گریاں رہ گیا

دیکھ کر رہا جام شراب — میرے گریہ پہ ——

سجادہ :- قد بالا سے تیرے یا بنی کیا سرو کو نسبت — قیامت جس کو کہتے ہیں نمونہ ہے ترے قد کا

داغ :- ---------- — کہ طوبیٰ ------- وہ سایہ ہے ——

سجادہ :- راز افشا نہ ہو اسواسطے میں نے نہ کہا، — اُس ستمگر نے عدو کو ہے دکھایا کاغذ

داغ :- ---------- — اور اُس نے تو عدو کو بھی ——

سجادہ :- جناب جھگڑا اگر ہے تو مجھ میں تم میں ہے — خدا کو لاتے ہو کیوں بیچ میں یہ تم ہربار

داغ :- حضور ---------- — ----------

سجادہ :- میری وہ دیدہ نظر پہ تو لگایا الزام، — دلِ عشاق کو پھر آپ چراتے کیوں ہو

داغ :- ---------- — ---- تم بھی ——

سجادہ :- اگر دیکھیں گے اُس کے بانکپن کو، — تو مردے چیر کر نکلیں کفن کو،

داغ :- اگر اُس بت کے دیکھیں ---------- — ----------

سجادہ :- ہجومِ غم سے دل گھبرا رہا ہے، — چلوں کیا خاک پھر سیرِ چمن کو

داغ :- ---------- — ------ میں ------

سجادہ :- گھر سے باہر بھی تو نکلو ابھی ازبہر خدا، — دیکھنے کے لئے ہے عاشقِ ناشاد آیا

داغ :- کہیں نکلو یہ تماشا دیکھو، —— — دل کو تھامے ہوئے اک ——

سجادہ :- دیکھ آتے ہوئے مقتل کی طرف قاتل کو — پھر گئی آنکھ میں تلوار خدا یاد آیا

داغ :- دیکھ کر قتل گہ عام میں اُس قاتل کو — مری آنکھوں میں پھری موت ——

سجادہ :- ہے آج کیا کہ جو نامۂ عتاب آیا — یہ بیوجہ کھلا مجھ پہ کیوں عذاب آیا

داغ :- ---------- — یہ نامہ آیا کہ مجھ پر کوئی ——

سجادہ :- تعجب آتا ہے کیوں یک بیک پھرے مجھ سے — ذرا کہو تو یہ کیا دل میں اے جناب آیا

داغ :- ---------- — یہ کیا خیال تجھے شوخ بے حجاب آیا

رائے استاد ۔ جناب، معشوق کو نہیں کہتے (داغ)

سجادہ :- پیارے آگے ہی سجادہ ہیں یہ سب باتیں — مگر نہ سامنے اُن کے کوئی جواب آیا

داغ :- بڑے زبان کے طرار تھے وہ سجادہ — میرے سوال کا اُن کو نہ کچھ ——

سجادہ :- دیکھیں تو آگے عشق یہ کیا رنگ لائے گا — کم بخت ہی گلے کا میرے ہار ہوگیا

داغ :- ---------- گل کھلائے گا — ---- "اب" ----------

سجادہ :- پیاری صورت ذرا دکھانا تھا — دل کو میرے ابھی لبھانا تھا،

داغ منہ سے گھونگٹ ذرا اُٹھانا تھا — میرے دل کو ذرا جلانا تھا،

سجادہ :- بہرِ قرآن رہے پہلو میں زنار رہے، — زاہدا دیکھ لے میں تو ہوں مسلماں ایسا

داغ :- سرِ قرآن گلے میں میرے زنار رہا — ----- تجھے میں ہوں ------

سجادہ :-	مثالِ وحشیِ ناداں پریشاں حال پھرتے ہیں	کبھی اندر کو آتے ہیں کبھی باہر کو جاتے ہیں
داغ :-	------ مجنوں -------	کبھی ہم گھر میں آتے ہیں کبھی باہر کو جاتے ہیں
سجادہ :-	بھلا رخسارِ جاناں کے مقابل ہو بھی سکتے ہیں	کروں قربان ماہ و خور تیرے روئے درخشاں پر
داغ :-	------ تاباں ------	----------
سجادہ :-	عیادت کو میری بالیں پر آتے ہی قاتل کو	ہنسی کیا آتی ہے بے طور میری چشمِ گریاں پر
داغ :-	----------	---- کھل کھلا کر آئی -----
سجادہ :-	انھیں کیوں دیکھ کر سجادہ تیرا دم نکلتا ہے،	ارے وہ ایسے کیسے ہیں جو ایسا دل مچلتا ہے
اصلاحِ داغ :-	----------	اسے وہ ہیں حسیں کیسے جو تیرا دل مچلتا ہے
سجادہ :-	ذرا دل میں خیال اے شمع، و پروانہ کا بھی لا،	کہ تجھکو دیکھتے ہی دیکھتے کیسے وہ جلتا ہے
داغ :-	ذرا اے شمع تو بھی دیکھ پروانہ کی حالت کو	------ کیسا ------
سجادہ :-	بیانِ ہجرِ جاں کاہ ہے سنا جاتا نہیں ہم سے	تری باتوں سے سجادہ ہمارا دل پگھلتا ہے
داغ :-	بیانِ ہجر ہے جانکاہ ہم سنتے نہیں اسکو	----------
سجادہ :-	باتوں باتوں میں وہ دیوانہ بنا دیتے ہیں	کچھ نئی طرز سے وہ جلوہ دکھا دیتے ہیں
داغ :-	آنکھوں آنکھوں ----------	----------
سجادہ :-	قاصدا کہنا ہے جو کچھ وہ زبانی کہنا،	خط نہ دینا کہ وہ اوروں کو بتا دیتے ہیں
داغ :-	----------	------ غیروں کو سنا -----
سجادہ :-	خیر اتنا تو ہے اے دل کہ تسلی کے لئے	آتے جاتے رخِ روشن تو دکھا دیتے ہیں
داغ :-	---------- ہ	------ وہ ------
سجادہ :-	حضرتِ عشق کی نیرنگیاں اے دل ہیں نئی	گاہے خوش کرتے ہیں اور گاہے رلا دیتے ہیں
داغ :-	----------	گاہ گاہ ------ گاہ -----
سجادہ :-	نہیں ملتے نہ ملو پیارے صنم خوش ہی رہو	بخدا تم کو ہمیشہ یہ دعا دیتے ہیں
داغ :-	------ خوش رہو آباد رہو	----------
سجادہ :-	جب غزل میں میرے نقصان نہیں کچھ پاتے	صاد پھر حضرتِ داغ اُس پہ بنا دیتے ہیں
سجادہ :-	جذبۂ عشق جب اُٹھتا ہے تو سجادہ بہت	صبر کرتے ہیں، مناتے ہیں بٹھا دیتے ہیں
داغ :-	جوش جب جذب کا اُٹھتا ہے تو سجادہ وہیں	----------
سجادہ :-	شکستہ دل دکھائیں گے انھیں یوں،	یہ ٹوٹا کس طرح برتن تو دیکھو
داغ :-	مرا دل توڑ کر کہتے ہیں اُلٹا،	----------
سجادہ :-	میں بے وجہ نہیں ہوں تجھ پہ قرباں	لو آئینہ رخِ روشن تو دیکھو
داغ :-	میں شیدا تم پہ بے وجہ نہیں ہوں	----------
سجادہ :-	لگے مہتاب کا دھوکہ نہ کیوں کر،	ذرا اُس کا رخِ روشن تو دیکھو
داغ :-	لگے کیوں چاند کا دھوکہ نہ تم کو	----------

سجادہ :- بھری محفل میں دیکھو اُٹھ کے منہ ہی چوم لوں گا میں　　دو بارا گر کہیں گے آپ اس منہ سے ترا کیا تھا
داغ :- - - - - - - - - - - - - -　　دو بارہ آپ فرمائیں تو - - - - - - -
سجادہ :- گلے لگتا ہے اب مجھ سے رلا کر مجھ کو محفل میں　　ارے او بیوفا اُس وقت دل میں آگیا کیا تھا
داغ :- - - - - اب ظالم - - - - - - - -　　- - - - - - - - - - - - - -
سجادہ :- حیا سے آنکھ نیچی صبح اُٹھکر ہے غصہ سے　　بہت سر چڑھ گیا تھا رات یہ تجھ کو ہوا کیا تھا
سجادہ :- اُنھیں منظور ہے مجھ کو جلانا ہر طرح ورنہ　　عدو کے ہاتھ نامہ بھیجنے کا مدعا کیا تھا
داغ :- - - - - - - - میرا - - - - - - - -　　- - - - - - - - - - - - - -
سجادہ :- نہ لڑ اے جنگجو مجھ سے تو ہی انصاف سے کہدے　　" " " " " "
" " دکھائی دیکھیے اُن کی مرا دل لیکے کہتے ہیں　　سوا اس لوتھڑے کے آپ نے مجھ کو دیا کیا تھا
" " تمھیں سے پوچھتے ہیں ہم تمھیں انصاف سے کہدو　　نہ تھا دل میرا مٹھی میں تو پھر تم نے لیا کیا تھا
" " اُنھیں خط جب مرا پہونچا تو پوچھا یوں تعجب نے　　ترے صدقہ میری جاں خط میں سجادہ لکھا کیا تھا

داغ کی اصلاحیں

(۲)

(یاسین علی خاں بی اے)

اصلاح کا طریقہ یہ تھا کہ ڈاک سے جو غزلیں آتیں - حاضرالوقت شاگردوں میں سے کوئی سناتا جاتا آپ ہر شعر غور سے سنتے رہتے اور جہاں اصلاح کی ضرورت ہوتی بتاتے جاتے وہی الفاظ سرخی سے بنا دئے جاتے اور غزلیں بعد اصلاح واپس کردی جاتیں - اگر زبان - محاورہ - یا کسی اور چیز کی طرف توجہ دلانا ہوتا تو دو چار مختصر جملے اس امر سے متعلق لکھوا دئے جاتے - آخر میں خود اس پر دستخط کر دیتے - اور مقامی شاگرد زیادہ تر خود اپنی غزل آپ سناتے - داغ صاحب جہاں ضرورت سمجھتے ردو بدل فرما دیتے اور وہ لوگ اسی طرح بنا لیا کرتے - بعض دفعہ - اصلاح کے دوران میں مباحث بھی چھڑ جاتے مباحث بھی چھڑ جاتے - یا تو خود اعتراض کرکے شاگردوں سے اس کا جواب پوچھتے یا شاگردوں کے شکوک اور اعتراضات کا تشفی بخش جواب دیتے اور بعض دفعہ متقدمین کے کلام سے اسناد بھی پیش فرماتے - داغ صاحب کا طریقۂ اصلاح ایسا نہ تھا کہ پورے شعر کاٹ کر دوسرے شعر لکھدئے یا خود اپنی طرف سے شعروں کا اضافہ کر دیا - جو شعر کسی وجہ سے رکھنے کے قابل نہ ہوتا وہ بالکل قلم زد کیا جاتا - اور اس کا سقم یا عیب بیان کر دیا جاتا - ورنہ الفاظ کے تھوڑے تھوڑے ردو بدل کے ساتھ شعر میں جان ڈال دیا کرتے تھے -

ذیل میں داغ کی چند اصلاحیں ملاحظہ فرمائیے :-

حضرت غفراں مکاں آصف سادس :-

آصف :- چہرے سے ان کے رنگ جو ٹپکا عتاب کا　　کیا ہو چلا ہے رنگ گلابی نقاب کا
اصلاح :- چھپتا نہیں چھپائے سے چہرہ عتاب کا　　ہوتا چلا ہے رنگ گلابی نقاب کا

عزیز یار جنگ بہادر حیدر آبادی :-

کیا جانیں آبِ تیغ کی لذت جنابِ خضر — نازاں ہیں وہ تو اپنے ہی آبِ حیات پر

اصلاح :- ------------------ — مرتے ہیں وہ تو چشمۂ آبِ حیات پر

عبدالصمد واصفی حیدر آبادی :-

کیا نہ غیر سے اسے بے وفا حیلہ — ہمارے پاس ہی آنے تجھے بہانہ ہوا

داغ نے اس شعر کو سُن کر فرمایا۔ اس میں اصلاح ہوگی اور ایک نقطہ کی۔ فرمایا دوسرے مصرع میں آنے کو آئے کردو۔

نواب میر حسن علی خاں امیر حیدر آبادی :-

کبھی کچھ ہے کبھی کچھ اور ہے حالت تیری — ہم تو آسان سمجھتے تھے محبت تیری

اصلاح :- کبھی کچھ ہے کبھی کچھ اور طبیعت تیری — ----------

غیر کو جام شراب اور ہمیں کچھ بھی نہیں — یاد رہ جائے گی ساقی یہ عنایت تیری

اصلاح :- غیر کو جامِ شراب اور ہمیں صاف جواب — ----------

نواب میر حسن علی خاں امیر حیدر آبادی :-

بن ٹھن کے جو کل آپ گئے راہ گزر سے — دیکھا کیا تا دیر میں حسرت کی نظر سے

اصلاح :- بن ٹھن کے وہ نکلے ہیں ابھی راہگذر سے — اللہ بچائے انھیں دشمن کی نظر سے

اس نے حالِ دل سنا کب غور سے — کان آخر مدعی بھرے ہی گیا،

اصلاح :- اس نے حالِ دل تغافل سے سُنا — ----------

امیر آیا ترے روضہ پہ یہ کہتا ہوا آیا — مرے حضرت مرے خواجہ معین الدین اجمیری

اصلاح :- امیر آیا جو روضہ پہ تو یہ کہتا ہوا آیا — ----------

اکدم نہیں ہے زیست کی صورت کسی طرح — ممکن نہیں فراق میں راحت کسی طرح

اصلاح :- دیکھی نہ میں نے چین کی صورت کسی طرح — ----------

شگفتہ ہوگی نہ گلشن میں خاطر بلبل — پھریگا باغ میں لیکر کہاں کہاں صیاد

اصلاح :- ہوئی شگفتہ کہیں بھی نہ خاطر بلبل — قفس کو لے کے پھرا ہے کہاں کہاں صیاد

غیر کو دیکھتا ہے وہ ظالم، — کس سے آنکھیں وہ چار کرتا ہے

اس پر یہ بھی نوٹ کرا دیا: دلی والے آنکھیں دو چار کرنا نہیں بولتے۔ آنکھیں چار کرنا محاورہ ہے۔

چھری کو تیری جو رُک رُک کے چلتے دیکھا ہو — اٹک اٹک کے رہی حلق میں فغاں صیاد

اصلاح :- ٹھہر ٹھہر کے قفس میں بنی مرے دم پہ — اٹک اٹک کے رہی حلق میں فغاں صیاد

محمد اکبر علی خاں افسوں :-

میں خاموش بیٹھا ہوں اس بُت کے آگے — عجب طرح مطلب ادا ہو رہا ہے

اصلاح :- ------------------ — نگا ہوں میں مطلب ادا ہو رہا ہے

سید مقصود حسن حیرت :- اقرارِ وصل صاف نہ انکارِ وصل صاف — تم تو کچھ ایسے چپ ہو کہ منہ میں زباں نہیں

اصلاح :- ------------------ — ---------- کہ گویا زباں نہیں ☆

داغ

ایک نظر

(علی کاظمی حیدرآباد دکن)

۱۸۳۱ء — ۲۵ر مئی ولادت، در دہلی۔

۱۸۳۵ء — داغ کے والد شمس الدین احمد خاں کو انگریزوں نے پھانسی دیدی، داغ کی والدہ داغ کو لیکر لوہارو سے دہلی چلی گئیں۔

۱۸۳۹ء — داغ کی والدہ نے مرزا فخرو ولیعہد سے نکاح کیا۔

۱۸۴۶ء — داغ کی شادی۔ خورشید عالم کی ولادت داغ کی والدہ کے بطن سے۔

۱۸۵۶ء — مرزا فخرو کا انتقال (غدر دہلی سے دس ماہ پہلے) اور داغ قلعہ سے نکلے۔

۱۸۵۷ء — غدر، اور داغ رامپور چلے گئے۔

۱۸۶۸ء — گلزار داغ (دیوان اول) شایع ہوا۔

۱۸۶۹ء — حجاب سے پہلی ملاقات

۱۸۸۱ء — حجاب دو بارہ آئی (دوسری ملاقات)

۱۸۸۲ء — حجاب سے ملنے داغ کلکتہ چلے، اپریل میں رامپور سے نکلے جون میں کلکتہ پہونچے، جولائی میں رامپور واپس ہوئے۔

۱۸۸۴ء — آفتاب داغ (دوسرا دیوان) اور فریاد داغ (مثنوی) شایع ہوئی۔

۱۸۸۶ء — رامپور سے دہلی کو واپسی، دہلی میں قیام، اپریل میں حیدر آباد پہونچے، جون میں پھر واپس دہلی ہوئے۔

۱۸۸۸ء — ۷ر اپریل کو دو بارہ حیدر آباد پہونچے اور حضور نظام کے دربار میں باریاب ہوئے۔

۱۸۹۱ء — ۷ر فروری کو دو بارہ باریابی ہوئی ۲۴ر اکتوبر کو ساڑھے چارسو روپیہ تنخواہ تاریخ ورود سے اجرا ہوئی۔

۱۸۹۲ء — مہتاب داغ (دیوان سوم) شایع ہوا۔

۱۸۹۳ء — دہلی میں داماد نے انتقال کیا۔

۱۸۹۴ء — ۷ر اگست کو ساڑھے پانچسو روپیہ تنخواہ میں اضافہ تاریخ ورود سے منظور ہوا اور ایک ہزار روپیہ تنخواہ مقرر ہوئی خطابات سے سرفراز ہوئے داغ نے متعلقین کو دہلی سے حیدر آباد بلالیا۔

۱۸۹۶ء — بیوی کا انتقال۔

۱۸۹۹ء — حضور نظام کے ساتھ سفر کلکتہ۔

۱۹۰۰ء — جنوری میں بنارس پہونچے امیر مینائی کو حضور میں باریاب کرایا اور واپس حیدر آباد آگئے۔

۱۹۰۲ء — افضل گنج کے مکان سے ترپ بازار کے مکان میں منتقل ہوئے اپنی تنخواہ میں سے سات سو روپیہ بیٹی اور نواسے پر منتقل کرائے اور پھر داغ کو سات سو روپے تنخواہ صرفخاص سے اجرا ہوئی، حجاب کلکتہ سے آئی جلوۂ داغ (سوانح) شایع کی۔

۱۹۰۳ء — دہلی گئے دربار دہلی میں شرکت کی۔

۱۹۰۴ء — حجاب کلکتہ واپس چلی گئی۔

۱۹۰۵ء — ۱۷ر فروری کو انتقال کیا عمر (بحساب سن عیسوی (۷۴) سال بحساب سنہ ہجری (۷۶) سال ہوئی (۸) سال لوہارو میں (۱۸) سال دہلی (قلعۂ معلیٰ میں) (۳۰) سال رامپور میں اور ۱۸ سال حیدر آباد رہے۔

داغ کی شخصیت

(پروفیسر شوکت سبزواری)

تنقید میں ادیب کی شخصیت بڑی چیز ہے، بلکہ تنقید کا مقصد ہی بعض لوگوں کے نزدیک شخصیت کی نقاب کشائی ہے۔ نقاد کا کام ہے کہ وہ ادیب کے فکر، فن اور ماحول کا صحیح اور گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس کی شخصیت کے تاریک گوشوں کو روشنی میں لائے۔ یہ کام آسان بھی ہے اور دشوار بھی۔ آسان اس لئے کہ ادیب کی شخصیت اس کے کلام اور تحریرات ہی میں نہیں جھلکتی بلکہ اس کے نقوش اس کے روزانہ اعمال و افعال تک میں صاف ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا سرسری مطالعہ اس کی شخصیت کی تصویر کشی کے لئے کافی ہوتا ہے۔ دشوار اس لئے کہ فنکار کی شخصیت دکھانے والے یہ آئینے کبھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تصویریں پیش کرتے ہیں اور ایک مطالعہ کرنے والے کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں کسی تصویر کو وہ صحیح اور سچا سمجھے اور کسے غلط قرار دیکر نظر انداز کردے۔ اس اختلاف کے اسباب ہیں لیکن میری نگاہ میں بڑا اور اہم سبب یہ ہے کہ ادیب کی شخصیت کے عام طور سے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک فطری افتاد اور اس کا عام کردار۔ ادیب بھی ہماری طرح اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس کی ایک فطرت ہوتی ہے۔ ایک خاص کردار ہوتا ہے جو ایک مخصوص گرد و پیش میں تربیت پانے کی وجہ سے بنتا ہے۔ اس کی یہ فطرت اور اس کا یہ کردار اس کے عام افعال و اعمال میں جھلکتا ہے۔ ادیب کی زندگی کے واقعات اس کی شخصیت کے اس پہلو کے لئے ایک آئینہ ہوتے ہیں جس میں وہ پوری طرح روشن ہوکر سامنے آتی ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو اس آئینہ میں جلوہ فگن نہیں ہوتا۔ یہ ادیب کے ذہن، فکر، اس کے ادبی نظریوں اور زندگی کے قدروں سے متعلق ہوتا ہے۔ ادیب اپنی روزانہ زندگی میں وہ ہوتا ہے جو حقیقت میں نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کے گفتار اور کردار میں کبھی کبھی فرق ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی فطری کمزوری ہوتی ہے۔ لیکن وہ ادیب ہے۔ روشن ذہن اور فکر رسا کا مالک۔ اس کے اپنے نظریے ہیں، مقاصد ہیں، اعلیٰ اخلاقی قدریں ہیں جن کی روشنی میں وہ اپنے عمل کو دیکھتا اور اچھی طرح جانچ پرکھ کر صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ادیب کی شخصیت کا یہ پہلو صرف اس کے کلام میں جھلکتا ہے۔ اس کی اس شخصیت کے اصلی خط و خال صرف اس آئینہ میں جلوہ گر ہوتے ہیں —— کہنے کو تو یہ ادیب کی شخصیت کے دو پہلو ہیں اور کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ادیب کی شخصیت میں اس کے یہ دونوں پہلو شامل ہیں ایک نقاد کا کام ہے کہ وہ ان دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ادیب کی شخصیت نام ہے اس کے دوسرے پہلو کا جس کا تعلق اس کی فنکارانہ صلاحیتوں سے ہے۔ ادیب اس لئے ادیب نہیں کہ وہ کھاتا پیتا، اٹھتا بیٹھتا اور سوتا جاگتا ہے۔ بلکہ وہ اس لئے ادیب ہے کہ سوچتا سمجھتا ہے اچھا شعر کہتا ہے، بے مثال نثر لکھتا ہے، بلند نظریوں کا مالک ہے، اخلاقی قدریں اسے عزیز ہیں، وہ کائنات کو ایک خاص نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے پاس اچھے برے کی پرکھ کے خاص خاص معیار ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی بعض کمزوریوں کے باعث خود اپنے مقررہ معیاروں پر پورا نہیں اترتا۔ وہ بلند ہونا چاہتا ہے لیکن نہیں ہوسکتا۔ وہ خلاق ہے۔ ادب اور فن کا نہیں بلکہ ایک اعلیٰ مثالی زندگی اور صالح و توانا معاشرے کا۔ اس کی شخصیت کا اہم عنصر اس کا

تخلیقی کردار ہے۔ ہمیں یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ہم ایک ادیب کی شخصیت کے جزیا نہیں جو ہنسنے بولنے اور سونے جاگنے والی سے زیادہ حسن، حیات اور اخلاقی قدروں کی خالق ہے۔

لیکن ہر ادیب اور شاعر کی شخصیت کے دو پہلو نہیں ہوتے۔ وہ خاص خاص ادیب ہیں جو دوگونہ شخصیت کے مالک ہیں۔ اُردو میں اقبال اور غالب اس زمرے میں آتے ہیں۔ اقبال کی جدا جدا دو شخصیتیں ہیں۔ ایک گفتاری یا ادبی۔ یہ ہمیں زیادہ عزیز ہے۔ دوسرے کرداری یا عملی۔ اقبال کی پہلی شخصیت جس میں چمک ہے، کشمش اور عظمت ہے اس کے کلام میں جھلکتی ہے۔ دوسری شخصیت کے جلوے ہم اس بڑے شاعر کے ان خطوط میں دیکھتے ہیں جو اس نے مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھے اور جو "شاد و اقبال" کے عنوان سے شایع ہو چکے ہیں۔ اقبال کو خود اپنی شخصیت کے اس تضاد کا احساس تھا۔ چنانچہ اس نے ذیل کے شعر میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے:-

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

قریب قریب یہی کیفیت ہمارے دوسرے بڑے شاعر غالب کی ہے۔ اس کی شخصیت کے بھی دو پہلو ہیں لیکن غالب کو جس چیز نے غالب بنایا وہ اس کی شخصیت کا نظریاتی پہلو ہے جو اس کے فارسی و اُردو کلام میں جھلکتا ہے۔ خودداری، عزتِ نفس پاسِ وضع، غیرت یہ اس کے اصلی جوہر ہیں۔ دوسرا پہلو ہمیں اس کے مکاتیب میں نظر آتا ہے جو اس کے مربی فرمانروائے رامپور اور اس کے عزیزوں کو لکھے گئے۔ یہ پہلے سے مختلف ہی نہیں بلکہ اس کی ضد ہیں۔ پہلی شخصیت غالب کی ہے۔ رند شاہد باز کی دوسری شخصیت اسد اللہ خاں کی ہے۔ نجم الدولہ نظام جنگ کی۔

معلوم نہیں آپ اسے اچھا کہیں گے یا بُرا داغ کی شخصیت اس دو رنگی سے پاک ہے۔ اس کا ایک ہی پہلو ہے جو اس کے کلام میں، خطوط و مکاتیب ہیں، روزانہ اعمال و افعال میں مختصر یہ کہ ہر آئینہ میں صاف جھلکتا اور روشن نظر آتا ہے۔ میں آسانی خیال سے خطوط کے آئینہ میں اس کی جھلک دکھانا چاہتا ہوں۔ اس طرح بحث کو سمیٹا جا سکے گا اور داغ کی شخصیت کے خط خال بھی نمایاں ہو سکیں گے۔ ویسے داغ کے کلام میں داغ کی جو تصویر آپ دیکھ چکے ہیں اس کے تمام نقوش وہی ہیں جو آج آپ اس کے مکاتیب کے آئینہ میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

داغ کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یک رنگی ہے۔ اس کی تعمیر ایک طرح کے خطوط سے ہوا ہے جو کم و بیش ایک ہی طول کے ہیں اور "کجدار و مریز" کی کیفیت سے خالی ہیں۔ اس میں مختلف رنگوں کی آمیزش نہیں۔ داغ کی شخصیت اس لحاظ سے بڑی سادہ اور سلجھی ہوئی شخصیت ہے۔ داغ کا تعلق جس طبقہ سے تھا وہ ہندوستان کا خوش حال اور فارغ البال طبقہ تھا جس کی زندگی "کھاؤ، پیو اور مزے اڑاؤ" کی صحیح اور سچی تعبیر تھی۔ داغ نے جب آنکھ کھولی تو طبقے کے اقتدار کا آفتاب گہنا چکا تھا۔ لیکن اس کے کچھ مٹے ہوئے اور دھندلے آثار باقی تھے۔ رسی جل گئی تھی پر بل نہ گئے تھے۔ داغ کے بچپن اور عنفوانِ شباب کا زمانہ لال قلعہ میں گزرا۔ شاہزادوں کے ساتھ پل کر بڑے ہوئے اور اس ماحول میں پروان چڑھے جہاں عیش و عشرت اور کامرانی کے سارے سامان فراہم تھے۔ ان کی تربیت بڑے چاؤ چونچلوں سے ہوئی۔ داغ کی شخصیت پر ان کے اس ابتدائی زمانہ کا گہرا اثر ہے۔ یہ زمانہ شعر و شباب اور چنگ و رباب کے لئے سازگار تھا۔ "شمشیر" کا زمانہ گزر چکا تھا اور ان کی جگہ طاؤس و رباب اور نقل و کباب لے چکے تھے۔ یوں تو سارے جاگیردار طبقہ کا حال یہی تھا لیکن یہ فضا قلعۂ معلیٰ پر پورے شباب کے ساتھ چھائی ہوئی تھی۔ شمع بجھتی ہے تو ایک دم بھڑک اٹھتی ہے۔ دہلی کے لال قلعہ کی بساط اُلٹنے کو تھی اس لئے اس کی رنگینیاں انتہا کو پہونچ گئیں۔ رامش و رنگ اور کیف و آہنگ کی لو بڑھ گئی۔ داغ

ہی مزاجی اور شوخ طبعی ورثے میں ملی تھی۔ یہ رنگینی اور شوخی قلعۂ معلی کی اس شوخ و شنگ فضا کی پیداوار سمجھئے۔ داغ ، مزاج کی یکسانی و یک رنگی کے باعث میں نے ان کی شخصیت کو سادہ بتایا تھا ورنہ داغ کی شخصیت میں رنگینی اس کی ب سے بڑی خصوصیت ہے۔

داغ خوش باش انسان تھے۔ حسن و جمال کے پرستار ہی نہیں بلکہ طلب گار بھی۔ یوں تو غالب بھی زندگی کو برتنا نتے تھے لیکن غالب کا نقطۂ نظر زیادہ وسیع تھا۔ وہ زندگی کو بہت سے زاویوں سے دیکھتے تھے۔ لیکن داغ وسعتِ نظر ، مالک نہ تھے۔ ان کے نزدیک زندگی خوش باشی سے آگے کچھ نہیں۔ وہ زندگی کو زندہ دلی سمجھتے تھے۔ وہ صحیح معنی میں ندہ دل جیئے۔ ان کی ساری شاعری زندہ دلی کی تفسیر ہے۔ ان کا کہنا ہے ؎

دن گزارے عمر کے انسان ہنستے بولتے ، جان بھی نکلے تو میری جان ہنستے بولتے

داغ نے ہنستے بولتے زندگی گزار دی۔ انھیں ہر اچھی چیز پیاری تھی۔ خوش پوشی، خوش خوراکی، خوش مزاجی داغ ، زندگی تھی۔ نفاست، صفائی اور حسن ادا داغ کا فن تھا۔ داغ کی زندگی ان کے فن میں جھلکتی ہے اور ان کا فن ان کی زندگی کا آئینہ ہے۔

داغ اچھا اور قیمتی کپڑا پہنتے تھے جو بہترین سلا ہوتا تھا اور اس میں صفائی اور نفاست کا خیال رکھتے تھے۔ مولانا حسن مارہروی کا بیان ہے کہ وہ روزانہ سہ پہر کو نیا جوڑا بدلتے تھے۔ تنگ مہری کا پاجامہ اور سفید کرتا معمولی لباس تھا۔ جب باہر جاتے جامہ دار کی شیروانی اور حیدرآبادی دستار یا بے پھندنے کی ترکی ٹوپی پہن لیتے۔ خوش مزاجی ان کی فطرت بن گئی تھی۔ بچوں کی طرح چہلیں کرتے۔ ان کے کلام میں جو ایک طرح کا چلبلا پن ہے وہ ان کی خوش طبعی کی ہی ایک لہر ہے داغ کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پیری کے آثار کبھی نمایاں نہ ہونے پائے۔ عہد پیری کے کلام میں بھی بقول اقبال جوانی کی آگ بھری ہوئی ہے۔ داغ کا کلام پوری طرح ان کی زندگی، شخصیت، اور کردار کا پرتو ہے۔ جس طرح داغ کبھی بوڑھے نہیں ہوئے ان کا کلام کبھی بوڑھا نہیں ہوا۔ اس پر جوانی کا ابھار اور نکھار آخر وقت تک برقرار رہا۔

وقتِ آخر ہوا مگر اے داغ ، ہوس زندگی نہیں جاتی

ان کی خوش مزاجی کی مثالیں بہت ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں۔ نواب بہادر حسین خاں انجم لکھنوی کو لکھتے ہیں:۔

"داغ کو جلا کر خاک میں ملا کر آپ لکھنؤ چلے گئے خیر صبر و شکر۔۔۔۔ اے شخص اللہ رے تیرا داغ! چلتے وقت ملنا اور اس تمکنت اس استغنا کے ساتھ رحم نہ آیا، ترس نہ کھایا کہ ایک کشتۂ تیغ فراق تڑپ رہا ہے اس کی دلجوئی کیجئے۔ یا اس کی تلافی یہ ہوئی کہ لو ہم جاتے ہیں۔ اچھا جاؤ! غارت ہو! دہرا صبر کر لیں گے۔"

ایک دوسرے خط میں انہی کو لکھا ہے:۔

"کئی روز سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ ملاقات سے کیوں کنیاتے ہیں۔ میں رقیب نہیں ہوں۔"

نبی جان طوائف کے نام ایک خط ہے جو پورا کا پورا شوخ طبعی اور ظرافت کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس میں ذیل کا پارہ خاص طور سے پرلطف ہے۔

"کیوں جی! تم سے کیونکر ملیں، تم کو کیونکر دیکھیں، کیونکر رہیں، اور نہ دیکھیں تو کیونکر جئیں۔۔۔۔ تم سے یہ امید نہیں کہ خواب میں بھی کبھی آؤ۔ ہائے مجبوری! وائے مجبوری!"

منی جان حجاب سے داغ کے دیرینہ تعلقات تھے۔ قیام حیدرآباد کے زمانہ میں وہ حیدرآباد آئی مگر اس شان کے ساتھ

کہ جب تک نکاح نہ ہو جائے سامنے نہ آؤں گی، پردہ کروں گی۔ اس کا ذکر داغ نے ایک خط میں کیا ہے جو قاضی عبدالحمید کے نام ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے شوخی ٹپکتی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"بی فرشتن صاحبہ مع بابو خدا بخش کے پہونچیں۔ میرا مکان بھی آسمان ہے کہ فرشتوں کا نزول ہے۔ میں رند خراباتی وہ زاہد مناجاتی۔ دیکھئے کیا ہو۔ ابھی تک مجھ کو اس پردے میں معلوم نہیں ہوا کہ وہی ہیں یا اور کوئی"

سید وحیدالدین بیخود دہلوی داغ کے شاگردانِ خاص میں سے ہیں۔ انھوں نے دیوان طلب کیا ہے۔ داغ نظام کے ساتھ شکار گاہ میں ہیں۔ وہاں سے لکھتے ہیں:-

"دیوان کیا اس جنگل سے تھوڑی سی وحشت کہو تو بھیج دوں"

یہ شوخی، بے حجابی، بے تکلفی اور خوش مزاجی ان کے رقت قلب کی پیداوار ہے۔ داغ فطرت سے ایک درد بھرا دل لیکر آئے۔ اور اگرچہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جو عیش کوشی اور لذت اندوزی کو زندگی کی عزیز ترین متاع سمجھتا ہو اس کے دل میں دوسروں کا درد اور خلوص بھی ہو لیکن داغ کے مزاج میں یہ دونوں عنصر موجود تھے۔ وہ عیش کوش بھی تھے اور دردمند بھی۔ اپنے دکھ درد کو ہنس کر اُڑا دیتے لیکن دوسرے کو دکھی دیکھ کر ان کا دل بھر آتا اور آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ وہ اپنے عزیزوں پر جان دیتے تھے۔ شاگردوں کے فدائی تھے۔ انھوں نے اپنے عزیزوں اور عام احباب و تلامذہ کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں ہمدردی اور دلسوزی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ ہر چھوٹے بڑے کی خلوص و محبت سے خیریت دریافت کرتے ہیں۔ اور بات بات پر دل جوئی کرتے دلاسا دیتے ہیں۔ اپنی چھوٹی بہن عزیز بیگم کو خط لکھا ہے۔ کوئی مقدمہ ان کے خلاف ہو گیا ہے۔ انھیں ان الفاظ میں دلاسا دیا ہے:- "تم کو ہماری جان کی قسم جو تم ذرا بھی فکر کرو۔ اگر تم ذرا سا بھی فکر کرو گی تو ہم کو بہت رنج ہو گا"

اولیا بیگم ایک اور بہن ہیں۔ ان کو خط لکھا ہے:-

"تمہاری منھ کی بیماری کا کیا حال ہے؟ تم نے خط میں نہیں لکھا۔ تم لوگ اپنی والدہ کی قبر پر بھی جاتی ہو؟ ضرور وہاں جاؤ اور قبروں کا حال لکھو"

اس خط کے آخر میں عزیز بیگم کو خطاب کیا ہے:-

"تمہاری بہو کہاں ہے؟ کیا حال ہے؟ غلام قدوس کیسے ہیں؟ ہم تو ان کی خدمت کئے جاتے ہیں مگر وہ کبھی نہیں پوچھتے"

نوح ناروی ان کے عزیز شاگرد ہیں۔ وہ حیدر آباد میں داغ کے ہاں مقیم ہیں۔ داغ ان پر مہربان ہیں اور انھیں کیا کچھ چاہتے ہیں۔ اور جب وہ ان کی خواہش اور توقع کے خلاف نہیں کھاتے تو ان کے صاحبزادے ابوالحسن کو لکھتے ہیں:-

"تمہارے والد ماجد کے یہاں آنے سے مجھے ایسی خوشی ہوئی جیسے اپنے بچھڑے ہوئے فرزند کے ملنے سے ہوتی ہے۔ مگر ایک بات سے سخت حیرت ہے کہ وہ اپنی اشتہا وہاں فروخت کر آئے ہیں یا گرو رکھ آئے ہیں یا خیرات۔ میں نے جو امتحان لیا تو مینا سے بھی کم وہ کھاتے ہیں۔ نہیں معلوم میرے گھر کا کھانا انھیں پسند نہیں آتا یا بھوک ہی گھٹ گئی ہے یا نارے والے سب اتنا ہی کھاتے ہیں۔ اگر کہتا ہوں کہ کچھ فرمائش کرو تو وہ نہیں سنتے۔ تم صاف صاف لکھو کہ وہاں ان کو کون سا کھانا پسند تھا۔ کونسی چیز مرغوب تھی۔ کہ یہاں بھی وہی پکوایا جائے۔ نمکین کون سا کھانا پسند ہے اور شیریں کون سا"

محمود رامپوری بھی ان کے شاگرد ہیں۔ ان کو اپنے پاس بلاتے ہیں:-

"اگر تم کو فرصت ہو اور جی بھی چاہے تو میں بیس روپے کرایہ ریل کے بھجوا دوں۔ تم مجھ سے آکر ملو"

اُن کی پرخواری اور خوش خوراکی کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ مولانا احسن فرماتے ہیں کہ ان کے مطبخ میں مختلف قسم کے کھانے تیار ہوتے تھے۔ پلاؤ، مرغ کباب اور میٹھی چیزیں بہت مرغوب تھیں۔ ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ کبھی تنہا نہیں کھاتے تھے۔ چند

شاگرد اور حاشیہ نشین احباب ضرور شریک ہوتے۔ میر حسن علی خاں ان کے ایک حاضر باش شاگرد ہیں۔ ایک مرتبہ کسی وجہ سے دو روز تک نہیں آئے۔ ان کو دستی رقعہ لکھا:-

"آپ کو حسب معمول روز آنا چاہئے اور ماحضر یہیں تناول فرمانا چاہئے اور اگر کھانا گوارا نہیں ہے تو بہتر ہے نہ کھائیے۔ مجھ کو غم بھی نہ کھلائیے آئیے آئیے! تشریف لائیے!"

بھوک کے بہت کچے تھے۔ جب کھانے میں دیر ہو جاتی تو ان کے مزاج میں جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی تھی۔ میر حسن علی خاں کو ایک خط میں لکھا ہے:-

"جس دن آؤں سبحان خاں بریانی ضرور پکائیں۔"

نوح ناروی کے صاحبزادے کے نام جو خط ہے اس کے آخر میں ہے:-

"میں نارے میں زیادہ اس واسطے نہیں ٹھہرنے کا کہ میرا کھانا دیکھ کر وہاں کے لوگ مجھے کھا جائیں گے۔"

اس پرخواری ہی کا اثر تھا کہ وہ اکثر بیمار رہتے تھے۔ درد نقرس کی تو دیرینہ اور کہنہ شکایت تھی ہی ضعف معدہ بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ گاہے گاہے تخمہ یا بدہضمی کا شکار بھی ہوئے۔ اکثر خطوط میں انھوں نے اپنی بیماری کی شکایت کی ہے اور اس کے باعث انھیں جو تکالیف اُٹھانی پڑی ہیں ان کا رونا رویا ہے۔ کنور اعتماد علی خاں رئیس سعد آباد کو لکھتے ہیں:-

"نواب صاحب! میں نے درد نقرس کی نہایت تکلیف اُٹھائی۔ ابھی صحت نہیں ہوئی مگر تکلیف ہے۔"

اس کے بعد کے خط میں ہے:-

"ایک مہینہ تک درد نقرس کا پابند رہا۔"

انہی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

"شکر ہے بخیریت ہوں، ضعف معدہ کی شکایت ہے۔"

داغ کی شخصیت اور ان کی شاعری کے متعلق عام اہلِ ذوق میں بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ ان کو عام طور سے عیاش بتایا جاتا ہے۔ عیاش کے معنی اگر عیش پسند اور کامرانی دوست کے ہیں تو داغ ضرور عیاش تھے۔ اور اگر وہ اپنے عام عرفی معنی یعنی مے خوار اور دین و دیانت سے بیزار انسان کے معنی میں ہے تو داغ ہرگز عیاش نہ تھے۔ اس کے شاہد مولانا احسن ہیں کہ داغ نے کبھی دختِ رز کو منہ نہیں لگایا۔ وہ ان کے بقول اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں مولوی عبدالحق خیر آبادی اور مفتی امیر احمد امیر مینائی کا مرہون منت ہوں کہ ان دوستوں کی بدولت اس بلا میں مبتلا ہونے نہیں پایا۔ وہ خود کہتے ہیں اور بالکل سچ کہتے ہیں:-

گو ہے عاشق مزاج و شاہد باز　　داغ لیکن شراب خوار نہیں

ان کے خطوط کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند بھی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی یہ پابندی اس درجہ کی نہ تھی جو طہارت پیشہ اور زہد شعار لوگوں کے نزدیک تقویٰ کا معیار سمجھی جاتی ہے۔ کم سے کم ان کے دو خطوں میں روزے کا ذکر ہے۔ صاحبزادہ اشرف یار خاں کو لکھتے ہیں:-

"داغ نواز! تمھارے علاقے میں رمضان نہیں آیا۔ بھاگ کر چلا آیا۔ روزہ رکھتا ہوں۔ انتخاب کی طاقت کہاں۔"

ایک خط مولانا احسن کے نام ہے۔ اس میں بے اصلاح غزلیں واپس کرنے پر عذر پیش کرتے ہیں۔

"مجھ کو بسبب صوم فرصت نہیں۔"

داغ کی شخصیت بڑی تاثراتی شخصیت ہے۔ وہ فطرتاً شاعر تھے اور شاعر بھی غزل کے جو اُردو کی خالص جذباتی شاعری ہے

لئے ان کی شخصیت کی تعمیر میں جذبات کو بڑا دخل ہے۔ داغ کے جذبات میں وہ طہارت تو نہیں جو میر اور حسرت کے یہاں ہے وہ عظمت اور رفعت ہی ہے جو غالب کے یہاں ہے لیکن اس میں بلا کی گرمی ہے، سوز ہے اور دل میں اتر جانے والی نشتری ت ہے۔ داغ نے بڑی لاابالی اور چونچال طبیعت پائی تھی۔ ان کی نظر بے باک تھی۔ افلاطونی محبت کے وہ قایل نہ تھے۔ ان کے لئے بے پناہ کشش رکھتا تھا۔ غالب کی طرح "تماشائے گلشن" اور "تمنائے چیدن" ان کی نگاہ میں گناہ نہ تھا سب کچھ ان کے افتادِ طبع کی وجہ سے تھا۔ جو انسان کو فرشتہ دیکھنا چاہتے ہیں وہ داغ کی قدر نہیں کرسکتے۔ داغ کی میں فرشتہ اور شیطان کی کشاکش نہیں۔ وہ ہر رنگ میں انسان تھے۔ داغ کی شخصیت بھرپور انسانی شخصیت ہے۔ فطرت روری داغ کے نزدیک انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے اور یہی جوہر داغ کی شخصیت میں صرف ہوا ہے۔ وہ انسان اس لئے انسان کے دکھ درد کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ان کی فطرت بچّہ کی طرح ہے جو ہر اچھے کھلونے کو دیکھ کر مچل جاتا اور پھر اس کا بہلنا مشکل ہوجاتا ہے۔

دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی

خود انھوں نے اپنی نظر بازی کا ذکر اس شعر میں کیا ہے۔

بُت ہی پتھر کے کیوں نہ ہوں اے داغ اچھی صورت کو دیکھتا ہوں میں

داغ صحیح معنی میں حُسن پرست تھے۔ اب چاہے اسے رندی کہئے یا ہوسناکی یہ واقعہ ہے کہ وہ حسین صورت دیکھ کر قابو ہوجاتے تھے۔ دل پر کس کا اختیار ہے لیکن داغ خصوصیت کے ساتھ دل کے ہاتھوں ناچار تھے۔ مطلعتوں کو مکر ان کی طبیعت میں بلا کی دل کی آجاتی تھی۔ بیخود دہلوی کا بیان ہے کہ ایک موقع پر فرمانے لگے۔ "تو تو جانتا ہے حسینوں یکھتا ہوں اور خوبصورت شعر کہتا ہوں"۔

داغ کو اپنے وطن دہلی سے بڑا پیار تھا۔ دکن میں ان کی بڑی قدر ہوئی۔ لوگ ان کی روز افزوں ترقی دیکھ کر ان سے گئے تھے لیکن خود ان کا یہ حال تھا کہ ماہی بے آب کی طرح وطن کے لئے بے تاب رہتے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"سب کچھ خدا نے دیا ہے۔ کسی پردیسی کی ایسی عزت اس دربار میں نہیں روٹی کبھی پچاس کو کھلا کر کھالیتا ہوں مگر ئے ہندوستان تیرا ارمان"۔

داغ تمام عمر محسود رہے لیکن حسد سے دور رہے۔ یہ ان کی سیرت کا حسین پہلو ہے کہ وہ اپنے اقران و اماثل کے فضل ں کے ٹوگ معترف تھے۔ لوگ حسد سے انھیں مطاعن کا نشانہ بناتے تھے جیسا کہ خود انھوں نے لکھا ہے:۔

"مجھ پر زمانہ چھری تیز کئے ہوئے ہے۔ خدا دارم چہ غم دارم۔

عشق میں گمنام کیا بدنام ہو میری شہرت نے مجھے رسوا کیا

! محسود رکھے۔ آمین"۔

لیکن وہ سب کے سامنے دوسروں کی تعریفیں کرتے تھے۔ امیر مینائی کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اصل میں یہ زمین منشی امیر احمد صاحب کی نکالی ہوئی ہے۔ ۹ شعر ان کے دوسرے دیوان میں ہیں۔ بہت خوب غزل ہے ستاد ہیں"۔

داغ بڑے نازک مزاج تھے۔ بقولِ غالب ان کا عقیدہ تھا۔

چاہئے اچھوں کو جتنا چاہئے

اس لئے بے وجہ عتاب ان کو گوارا نہ تھا۔ وہ ان کے بے محل ناز اور نکتوڑے برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ حجاب سے خاص

تھا لیکن ان کی اور اس کی طبیعت میں مناسبت نہ تھی اس لئے ان بن رہتی تھی۔ ایک خط میں داغ نے اپنی نازک مزاجی کا ذکر ان
خط میں کیا ہے :۔

" داغ کے مزاج میں بے وجہ عتاب کی تاب نہیں"۔

عقیدے کے لحاظ سے پکّے اور کٹر سنّی تھے۔ اس سلسلہ کا ایک لطیفہ مولانا احسن نے بیان کیا ہے کہ فروری ۱۹۰۲ء تھی کہ
صاحب کے نام ایک کپڑے کی تھیلی میں دو کتابیں پہونچیں۔ ایک کا نام 'جلوۂ خورشید' تھا۔ دوسری کا 'زعفران زار رضا'
ں کتابیں نظم میں تھیں۔ بھیجنے والے کا نام محمد رضا خاں تھا۔ اوپر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔ " یہ کتاب خاص مذہب اثنا عشری
ہے۔ اہلِ سنت ملاحظہ نہ فرمائیں"۔ مرزا صاحب ان کتابوں کو دیکھ کر بہت گھبرائے مجھے مکان سے بلوایا اور فرمایا۔ بھائی فوراً
تابوں کو واپس کرو اور اسی وقت یہ خط لکھوایا :۔

" جناب شیعہ صاحب! آپ کا کلام میرے پاس پہونچا۔ آپ کی یاد آوری کا ممنون ہوا۔ مگر میں اہلِ سنت والجماعۃ
سے حنفی المذہب ہوں۔ آپ کی ہدایت کے بموجب آپ کی کتابوں کو نہ دیکھ سکا"۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ داغ کی طبیعت میں نفاست اور صفائی زیادہ تھی۔ ان کے کلام میں جو رکھ رکھاؤ اور زبان و محاورہ
کا رہ ہے وہ ان کی طبعی نفاست اور صفائی کا مرہون منت ہے۔ داغ کی شاعری زبان اور محاورے کی شاعری ہے۔ خود داغ
زندگی میں ان پر اعتراض ہوا کہ داغ مضمون کہنا نہیں جانتے۔ جلیل مضمون کہنا جانتے ہیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ داغ نے
زبان استعمال کی وہ دہلی کی شستہ رفتہ اور کوثر میں دُھلی ہوئی زبان ہے۔ داغ زبان کی صحت اور صفائی کا بہت خیال رکھتے
۔ شاگردوں کو عام ہدایت تھی کہ کوئی لفظ غلط اور کوئی محاورہ خلاف استعمال اہلِ زبان نہ بندھے۔ صاحبزادہ مشرف یار خاں
لکھتے ہیں :۔

" مجھ کو دیوان دیکھنے کی فرصت کہاں، جو میرے مسلک کے خلاف ہو اس کو خود نکال ڈالو۔ البتہ ایک کھٹکا ہے کہ کوئی
محاورہ خلاف نہ بندھا ہو"۔

رے کی کسی شعر میں بندش سے وہ بہت خوش ہوتے لیکن محاورے کو وہ شعر کی جان نہیں سمجھتے تھے۔ زبان کی ترقی اور بقا ان کے
نظر تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ محاورات شعر میں نظم کر کے محفوظ کر دئے جائیں۔ ناطق گلاوٹھی کو انھوں نے جو خط لکھا ہے اس میں یہ
بیان کیا ہے :۔

" یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ ہر شعر میں کسی محاورے کا استعمال کرتے ہیں اور بیشتر کامیابی کے ساتھ۔ مگر اس کا لحاظ رکھئے
کہ شعر کے لئے محاورہ آجائے۔ محاورے کے لئے شعر میں سقم نہ آنے پائے اور یہ بھی خیال رہے کہ اس میں تصرف جائز نہیں
اگر آسانی کے ساتھ محاورہ بجنسہ بحر میں آجائے تو نظم کر دیجئے ورنہ نہیں۔ اور اس کے لئے حضرت استاد مرحوم کے کلام پر غور
کیجئے کہ انھوں نے کس بے ساختگی سے محاورات کو باندھا ہے"۔

زبان اور محاورے کی بات آگئی تو یہ بھی عرض کر دوں کہ داغ زبان کے رسیا سہی لیکن شعر کے باب میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ اچھا
وہ ہے جو گھلا ملا اور پر اثر ہو چنانچہ انھوں نے لاڈلے صاحب واقف کو لکھا تھا :۔

" تمھاری طبیعت زبردست مضمون آور ہے مگر گھلے ملے شعر پر اثر کم کہتے ہو"

داغ کے کلام کی خصوصیات یوں تو بہت ہیں لیکن ان کا اپنا رنگ، جس میں ان کی انفرادیت جھلکتی ہے شعر کا یہی وصف ہے جسکو
حضرت داغ نے گھلے ملے اور پر اثر ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ گھلا ملا کلام وہ ہوتا ہے جس میں زبان، اسلوب، اور مضمون میں پوری

ہم آہنگی اور لطیف تناسب پایا جائے۔ داغ کے کلام میں یہ ہم آہنگی اعلیٰ درجہ کی ہے۔ داغ نے عام طور سے عوام کے جذبات بیان کئے ہیں اور ان کے لئے جو زبان اور طرز بیان اختیار کیا ہے وہ بھی عوامی ہے۔ اکثر اہل علم سستے بازاری جذبات اور عوام کے جذبات میں فرق نہیں کرتے اسی طرح ان کے نزدیک عامیانہ زبان اور عوام کی زبان ایک چیز ہے۔ اس لئے داغ پر جو لے دے ہوتی ہے اور امیر کے ساتھ ان کی شاعری کو بھی پست کہکر بدنام کیا گیا ہے اس میں اس غلط فہمی کو بھی دخل ہے اور یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ آج کے اچھے اور بلند نظر نقاد تک اس میں مبتلا ہیں۔

میر و نظیر کے بعد اُردو میں داغ عوامی شاعر ہیں۔ اگرچہ وہ میر و نظیر دونوں سے مختلف ہیں۔ میر کا اسلوب بڑا ہی گھلا ملا اور لوچدار ہے۔ اس میں اثر اور خلوص بھی ہے لیکن وہ شوخی، البیلی اور دل لبھانے والی کیفیت نہیں جو داغ کے کلام کی امتیازی شان ہے۔ نظیر نظم نگار ہیں۔ غزل گو کی حیثیت سے ان کا کوئی بڑا مقام نہیں۔ داغ اُردو کے تنہا غزل گو شاعر ہے جس نے معاملات محبت بڑے صاف اور دا شگاف انداز میں بیان کئے۔ ویسے تو جرأت اور مومن بھی اسی کوچے کے ہیں لیکن داغ کی سی گھلاوٹ اور لگاوٹ، داغ کی سی بے تکلفی اور انوٹ یا دل کو مسوس کر رہ جانے والی کیفیت ان کے یہاں کہاں۔

بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ داغ نے دہلی کی ٹکسالی زبان استعمال کی جس میں لاکھوں بناؤ کے باوجود ایک طرح کا الھڑپن ہے داغ دہلی کے تھے۔ دہلی کی زبان پر مٹے ہوئے تھے۔ خود اس کا بڑا اہتمام کرتے تھے کہ وہ دہلی کے خاص خاص الفاظ اور محاورے نظم کرکے ان کو حیات جاوید بخشدیں اور شاگردوں کو بھی ہدایت تھی کہ وہ دہلی کی زبان لکھیں اس زمانہ میں گلدستہ زبان دہلی کے نام سے راسخ نے ایک مجموعہ شائع کرنا شروع کیا تھا جس میں دہلوی شعراء کا کلام چھپتا تھا۔ اس کے بقا کا حضرت داغ کو بہت خیال تھا۔ چنانچہ بیخود دہلوی کو یکے بعد دیگرے دو خط لکھے ہیں اور دونوں میں ان کو تاکید کی ہے کہ وہ اس گلدستہ میں اپنا کلام شایع کرائیں۔ فرماتے ہیں:۔

"گلدستہ زبان اُردو جو راسخ نے نکالا ہے اس کو رونق کلام سے دو کہ زبان دہلی ختم ہوئی جاتی ہے۔"

اور شاید اسی جذبہ کے تحت وہ دہلی کے الفاظ و محاورات کا ایک لغت طیار کرانا چاہتے تھے۔ مولانا احسن اس خدمت پر مامور تھے۔ وہ الفاظ و محاورات کا ایک لغت تیار کرانا چاہتے تھے۔ مولانا احسن اس خدمت پر مامور تھے۔ وہ الفاظ اور محاورے جمع کرتے تھے اور داغ سند کے شعر کہتے تھے۔ مولانا احسن جب تک دکن میں مقیم رہے یہ کام بحسن و خوبی انجام پاتا رہا۔ لغت کے کچھ اجزا "فصیح اللغات" کے نام سے شایع بھی ہوئے، لیکن مولانا احسن کے حیدر آباد سے چلے آنے کے بعد یہ کام جاری نہ رہ سکا۔ مولانا احسن کا بیان ہے کہ استاد کو آخر عمر تک اس کا افسوس رہا۔

داغ کو اپنی زباں دانی پر ناز تھا اور اگرچہ وہ بڑے عالم نہ تھے لیکن زبان کی پرکھ کا فطری مذاق رکھتے تھے۔ زبان کے مسئلے اور ادبی لطیفے اور نکتے جو ان کے مختصر سے مجموعۂ خطوط میں بکھرے ہوئے ہیں ان سے ان کے اس ذوق کا پتا چلتا ہے اس نوع کے اشعار انھوں نے بہت کہے ہیں جن میں زباندانی پر فخر کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً:۔

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے

چند ادبی نکتے اس موقع پر بیان کردئے جائیں تو شاید بے جا نہ ہو۔ مولانا احسن کے خط میں اپنے بعض شاگردوں کی شکایت کی ہے کہ وہ بے اصلاح غزلیں چھپوا دیتے ہیں اور ان میں زبان کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔

"کسی شخص نے لفظ ایجاد اور ارشاد کو مونث باندھا حالانکہ اہل دہلی کی زبان پر دونوں لفظ مذکر ہیں۔ کسی صاحب نے لفظ میت جو بکسر یائے تحتانی ہے اس کو بفتح یا باندھا۔ بو کے قافیہ میں ابرو کو مونث باندھا۔ وہ بھی مذکر ہے۔"

یہ عجیب بات ہے کہ داغ ایجاد کو مذکر بتاتے ہیں حالانکہ امیر مینائی نے اپنے ایک خط میں (مکاتیب امیر صفحہ ۱۴۲) لکھا ہے۔ سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں صاحب داغ کا قول ہے کہ دہلی میں مونث ہے۔ مولانا احسن نے استفسار کیا تھا کہ طرز مونث ہے یا مذکر۔ ٹوپی اوڑھنا صحیح ہے یا ٹوپی پہننا طرز کے بارے میں لکھا مونث ہے۔ ہرگز مذکر نہیں۔ اور اوڑھنے کو قلم زد کردیا اور پہننے کو بحال رکھا۔ اس سے داغ کی سیرت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ داغ بڑی مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے جس کا خمیر رواداری اور لحاظ سے ہوا تھا۔ مولانا طباطبائی کہتے ہیں کہ میں نے ورسے اور پرسے کے باب میں داغ سے تحقیق چاہی تو انھوں نے کہا آپ لوگوں کی خاطر سے میں نے ان لفظوں کو ترک کردیا ہے۔ ٹوپی اوڑھنا دہلی میں آج بھی بولا جاتا ہے اور اس سے پہلے بھی بولا جاتا تھا لیکن لکھنؤ والوں کو ٹوپی پہننے پر اصرار تھا۔ داغ کا اس کو قلم زد کردینا بھی اہلِ لکھنؤ کی خاطرداری کے لئے تھا۔ میت بنتی یا اُردو میں عام ہے۔ دہلی والے اسی طرح بولتے ہیں۔ انشا اور حالی نے بھی اس کو صحیح بتایا ہے لیکن اہلِ لکھنؤ کسریا بولتے اور باندھتے تھے۔ اس میں بھی داغ نے رواداری برتی۔

داغ کا ایک مصرعہ ہے:۔ "میں نے وہ رنج اُٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے" مولانا احسن نے یہ مصرعہ طرح کردیا۔ اس پر انھیں تنبیہ فرمائی اور لکھا کہ مصرع طرح کرنا تم کو نہیں آتا۔ اس میں "جانتا" کا الف دبتا ہے جو مخل فصاحت ہے۔ ایک خط میں شترگربہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔ دوسرا شعر درست ہے۔ حضرت کا لفظ تم کے ساتھ بھی آتا ہے۔ اس میں کوئی عیب نہیں۔

مولانا ابوالحسن ناطق گلاوٹھی ضلع بلند شہر کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے "جوبن" کی تحقیق چاہی تھی۔ اس کا جواب دیتے ہیں۔

"لفظ جوبن کے متعلق میں پھر یہی کہتا ہوں کہ اس کا استعمال بمعنی پستان اہلِ لکھنؤ کا اختراع ہے۔ دہلی والے اس معنی میں نہیں بولتے۔ آپ نے جو مولانا راسخ کا شعر پیش کردیا ہے اُسے میں تسلیم نہیں کرتا۔ خدا جانے وہ کس دُھن میں لکھ گئے۔ مولوی صاحب آپ کے دوست ہیں۔ انہی سے پوچھئے کہ آپ نے دہلی میں اس لفظ کا ایسا استعمال کہاں سنا ہے۔ آخر آپ خود بھی تو نواحِ دہلی کے باشندے ہیں اور میرے نزدیک بڑی حد تک آپ کے قصبات کی زبان مستند ہے۔ غور کیجئے کہ کیا وہاں کے شرفاء یا عوام میں اس لفظ کا یوں استعمال ہے، دہلی کے استعمال میں بھی یہ لفظ ضرور ہے مگر اس طرح

عجب جوبن برستا ہے کسی بات جب وہ لڑتے ہیں ادائیں بھی بلائیں لیتی ہیں جس دم بگڑتے ہیں"

اس میں زبان کے جو نکات اور اس کے مستند ہونے کا جو معیار داغ نے بتایا ہے وہ اصول لسانیات پر کس قدر صحیح ہے اسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ بات بہت بڑھ جائے گی۔

آخر میں داغ کی شخصیت کے ایک اور پہلو کی وضاحت ضروری ہے۔ جو ان کے کلام اور خطوط میں جھلکتا ہے اور داغ کی عام مقبولیت میں بھی اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ آمد اور آورد پر اہلِ علم نے بڑی نازک بحثیں کی ہیں اور نکتے نکالے ہیں۔ لیکن اس پر بھی اس کا صحیح مفہوم آئینہ نہیں ہوا۔ آمد اصل میں بے ساختہ پن ہے اور بے ساختہ پن کے معنی ہیں تکلف، تصنع اور بناوٹ سے کلام کا پاک ہونا۔ فطری سادگی بھی یہی ہے۔ اور اسے آمد اس لئے کہتے ہیں کہ جو لوگ صحیح معنی میں ادیب یا فن کار ہیں۔ یعنی فن اور ادب کا فطری ذوق رکھتے ہیں ان کی طبیعت کو ادب سے خاص مناسبت ہوتی ہے۔ وہ جب فکرِ سخن کرتے ہیں تو جو کچھ فی البدیہہ بلا کاوش اور مشقت کے ذہن میں آتا ہے وہ بڑا ہی گھلا ڈھلا ہوتا ہے۔ اس میں تازگی ہوتی ہے، توانائی ہوتی ہے، اثر اور جادو ہوتا ہے - - - - - - -
- فن کار کے ذہن میں جو کچھ نازل ہوتا ہے اس میں ایک الہامی کیفیت ہوتی ہے۔ اس کو بنانے سنوارنے اور نوک پلک سے درست کرنے کی فن کار کو ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ عالمِ بالا سے خود ڈھل کر آتا ہے۔ یہ کیفیت داغ کے کلام کی ہے۔ وہ بڑا ہی گھلا ڈھلا ہے۔ اس میں سادگی ہے، نکھار ہے، شادابی ہے، صفائی

اور پرکاری سے اس کا کوئی لگاؤ نہیں - اس کی نزاکت اور لطافت کسی تراش خراش کی متحمل نہیں - یہ ریشم کے تار ہیں - بلبلے ہیں چھو نہیں کہ ٹوٹے۔ داغ نے ایک خط میں اپنے فکر سخن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"یہاں جو کچھ میں بکتا ہوں وہ فی البدیہہ ہوتا ہے - یہ دو دو گھنٹے کی فکر ہے جو ملفوف بھیجتا ہوں - حضوری فرمائشات ایسی ہی ہوتی ہیں - زبان کا لطف ہے اور فی الفور اس کی تعمیل کی جاتی ہے"

ان کے خطوط فی البدیہہ لکھے جاتے تھے - مولانا احسن کا کہنا ہے کہ جس طرح شعر کہنے میں وہ زیادہ تامل نہیں کرتے تھے اور عام شعراء کی طرح خط لکھنے یا لکھوانے میں بھی غور و فکر کے عادی نہ تھے - سوچ سوچ کر ایک جملہ نہیں بولتے تھے بلکہ بے تکلف اور بے ساختہ لکھواتے چلے جاتے تھے - یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ بعض لوگوں کی طرح پہلے کوئی فقرہ غلط لکھوا دیا یا جلدی میں بول دیا اور پھر اس کو قلم زد کر دیا گیا - بلکہ وہ جو کچھ بولتے اور لکھواتے وہ سوچ سمجھ کر بولتے اور لکھواتے تھے جس میں پھر رد و بدل کی گنجایش نہیں ہوتی تھی اس مفہوم کو انھوں نے غزل کے ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے :-

سمجھو پتھر کی تم لکیر اسے ، جو ہماری زبان سے نکلا

داغ کی شخصیت میں نظم و ضبط ہے ، پختگی اور سنگینی ہے ، اور یہ بھی شاید اس یک رنگی کا اثر ہے جس کا ذکر میں ابتدائی سطروں میں کر چکا ہوں - وہ بڑے بے جھجک واقع ہوئے تھے - ان میں ذرا جھجک نہ تھی - ان کے دل میں چور نہ تھا - وہ زندگی کو مختلف خانوں میں بانٹنے کے روادار نہ تھے - ان کی خلوت میں بھی جلوت کی شان پائی جاتی تھی - زاہد ریاکار کی طرح "چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند" ان کا شعار نہ تھا - جسے لوگ عریانی بتاتے ہیں وہ ان کے نزدیک عریانی نہیں اس لئے کہ وہ لاگ لپیٹ کے قایل نہ تھے - جو ان کے دل میں ہوتا وہی ان کی زبان پر بے تکلف آجاتا - لوگ خلوت میں جو زبان پر لانے سے ڈرتے تھے داغ جلوت میں کہہ ڈالتے تھے - اب آپ کو اختیار ہے اسے عریانی کہئے یا فحاشی داغ اسے شاعرانہ کمال سمجھتے ہیں - اقبال بھی اسے کمالِ فن سمجھا کئے -

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے ، یعنی یہ لیلیٰ یہاں بے پردہ واں محمل میں ہے

میں اسے داغ کی بے جھجک شخصیت کی ایک جھلک کہتا ہوں -

تری طبیعتِ روشن اک آفتاب ہے داغ
کبھی چھپائے سے یہ جلوہ گر نہیں چھپتی

داغ کے بعض مشہور تلامذہ

(پروفیسر نفیس سندیلوی)

احسن مارہروی - (۱۸۷۶ - ۱۹۴۰ء)

سید شاہ علی احسن اسمِ گرامی - شاہ میاں صاحب عرفیت اور احسن تخلص تھا - وطن قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ تھا۔
مولانا ۱۸۷۶ء میں بمقام مارہرہ پیدا ہوئے - ۱۸۹۵ء میں فصیح الملک کی شاگردی اختیار کی اور کچھ عرصے حیدر آباد میں انکی خدمت میں حاضر رہکر "فصیح اللغات" کی ترتیب میں مصروف رہے آپ ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ میں اُردو لکچرر ہوگئے پھر ۱۹۲۳ء میں مسلم یونیورسٹی میں لکچرر مقرر ہوئے - دو رسالے "ریاضِ خلیل" مارہرہ سے اور "فصیح الملک" ۱۹۰۸ء میں لاہور سے نکالے - مشاعروں کا شوق ہمیشہ رہا - مولانا موصوف نے ۳۰ اگست ۱۹۴۰ء کو بمقام پٹنہ بمرض سرطان انتقال فرمایا۔

تصانیف میں جلوۂ داغ یعنی حیاتِ داغ - ۲ - انشائے داغ یعنی مکتوبات داغ - ۳ - تاریخ نثر اُردو - ۴ کلیات ولی اور یادگارِ داغ یعنی حضرتِ داغ کا آخری دیوان، یادگار ہیں -

ان کے کلام میں داغ کا رنگِ تغزل بہ لحاظ سلاستِ زبان و روانی پایا جاتا ہے اور کہیں کہیں لطافت اور مضمون آفرینی بھی پائی جاتی ہے - مگر کلام میں ہمواری اور سوز و گداز نہیں ہے - نمونۂ کلام یہ ہے :-

نالہ جب تک رسا نہیں ہوتا   بابِ تاثیر وا نہیں ہوتا
غلط ہے کون کہتا ہے کہ بے غفلت سرا دنیا   یہاں تو ہجر کی شب بھی نہ موت آئی نہ خواب آیا
جما ہوا ہے تصور کچھ اس طرح دل میں   کہ خواب میں بھی اسی کا خیال ہوتا ہے

اختر نگینوی :-

سید محمد اختر نام اختر تخلص سادات و روسائے ضلع بجنور میں سے تھے - اُن کے تین دیوان شایع ہوچکے ہیں - پہلا دیوان نظم دل افروز ۱۳۱۹ھ میں داغ کے زمانۂ حیات میں شایع ہوا تھا ——————— جس میں ان کا ایک قطعہ تاریخ بھی ہے - دوسرا دیوان ضیائے اختر داغ کی وفات کے بعد چھپا - تیسرا دیوان انوارِ اختر ۱۳۵۸ھ میں شایع ہوا - آپ کو حضرت داغ کے ساتھ جو محبت و عقیدت تھی وہ بہت کم تلامذہ کو ہوگی - آپ کے پاس حضرت داغ کے بہت کثرت سے غیر مطبوعہ خطوط تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے :-

کیا نہیں کرتے کیا نہیں ہوتا   اُن سے وعدہ وفا نہیں ہوتا
یہی دیوانگی ہے اور کیا دیوانگی ہوگی،   یونہیں بیٹھے بٹھائے قصدِ زنداں کر رہا ہوں میں
ہر چند ظرفِ ساقی و پیمانہ ایک ہے   لیکن مرا بھی مشربِ رندانہ ایک ہے

اشک دہلوی :-

سید قطب الدین احمد اشک ابن سید علیم الدین احمد ساداتِ حسینی سید میر ہاشم فارسی کی اولاد میں تھے اپنے کو دہلوی لکھتے تھے لیکن درحقیقت وہ قصبہ جلیسر ضلع آیٹہ کے قدیم باشندے تھے - مرزا داغ کے دورِ اول کے شاگرد اور بے تکلف

دوست تھے۔ گلزار داغ مطبوعہ ۱۳۰۳ھ میں ان کا ایک قطعۂ تاریخ موجود ہے، انھوں نے داغ کی پوری پوری پیروی کی ہے۔ چُستی، روانی، صفائی اور سادگی ان کے کلام کا جوہر ہے۔ ان کا دیوان چھپا نہیں۔

خوفِ رنجش نہ کچھ اندیشۂ بیداد آیا ــــ لکھ دیا خط میں انھیں وقت پہ جو یاد آیا

جو خوں آلود پیکاں ہو نکالو میرے سینے سے ــــ جو خوں آلود حسرت ہو وہ میرے دل میں رہنے دو

ذیل کا مشہور شعر جو سہل ممتنع کی اچھی نظیر ہے مرزا داغ سے منسوب کیا جاتا ہے درحقیقت اشک کا شعر ہے:۔

انھیں اور ہیں کون بہکانے والے ــــ یہی آنے والے یہی جانے والے

آصف ۔ (۱۲۸۳ھ - ۱۳۲۹ھ) ــ نظام الملک میر محبوب علی خاں، آصف جاہ ششم۔ ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے۔ فن شعر سے خاص شغف تھا۔ کلام میں صفائی، روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ ۱۳۲۹ھ میں وفات پائی۔

ابھی آنسو پلک تک آیا تھا، ــــ ابھی دیکھا تو ایک دریا تھا

انجام دیکھنا دلِ خانہ خراب کا ــــ اس پر پڑے گا صبر مرے اضطراب کا

تحریرِ محبت نے کیا ان کو خفا اور ــــ تدبیر تو کی اور تھی قسمت سے ہوا اور

جھگڑے تو ہزاروں ہیں مگر بات ہے اتنی ــــ ہم تم سے وفا کر کے پشیمان بہت ہیں

سر اقبال ۔ (۱۸۸۳ء - ۱۹۳۸ء) ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنے وطن سیال کوٹ میں ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری کے کئی دور ہیں، پہلا دور جب وہ انگلینڈ نہیں گئے تھے اور قومی نظمیں لکھتے تھے۔

دوسرا دور وہ ہے جب وہ یوروپ میں مقیم تھے۔ اس زمانہ میں فارسی میں زیادہ کہا مگر اسلامی جذبہ اس زمانہ کے کلام پر جھلکنے لگا تھا اور فلسفۂ شاعری پر غالب آگیا تھا۔

تیسرا دور یورپ سے واپسی پر ہوتا ہے جب وطنی جذبے کی جگہ ملّی جذبے نے لے لی۔ تفصیل کے ساتھ ان کی شاعری پر لکھنے کی ضرورت نہیں زندہ جاوید شاعر تھے۔ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو عالمِ بقا کی طرف رحلت فرمائی۔

تصانیف میں بانگِ درا، ضربِ کلیم، بالِ جبریل اُردو میں اور اسرارِ بیخودی، ارمغانِ حجاز، پیامِ مشرق اور جاوید نامہ وغیرہ فارسی میں شایع ہو کر سرمۂ چشمِ بصیرت بن چکی ہیں۔

نمونۂ کلام یہ ہے:۔

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر ــــ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ ــــ سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دورِ پیمانہ ــــ فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ ــــ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے ــــ قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

بیباک، شاہ جہاں پوری:۔ میاں سید احمد حسین ساداتِ شاہ جہاں پور سے تھے، بیباک تخلص فرماتے۔ پہلے خیال شاہجہانپوری سے اصلاح لی پھر فصیح الملک حضرتِ داغ کے شاگرد ہوگئے۔ استاد کے بہت بڑے ارادت مند تھے۔ شعر پوری قوت سے کہتے۔

سید صاحب مرحوم کے کلام میں داغ کے رنگ کے علاوہ کہیں کہیں مومن خاں کا بھی رنگ پایا جاتا ہے:۔

یہاں یہ حال کہ ہم دل کو خاک کر بیٹھے ــــ وہاں یہ فکر کہ اہلِ وفا سے کچھ نہ ہوا

یہ بھی خدا کی شان کہ اک حرفِ آرزو ــــ اس بے وفا کے واسطے افسانہ ہوگیا

عدو پہ صبر تو اربابِ وفا کرتے ہیں — غم اگر حد سے گزر جائے تو کیا کرتے ہیں
قابلِ داد ہے یہ شانِ کرم بھی ان کی — کشتۂ ناز کے جینے کی دعا کرتے ہیں
کرتے ہیں آپ کس سے تغافل کہ ہم نہیں — یہ آخری نگاہ ہے آنکھوں میں دم نہیں
میں جس کو کہہ سکوں وہ نہیں مدعا مرا — تم جس کو سن سکو وہ مرا حالِ غم نہیں

بیخود دہلوی:۔ حاجی مولوی سید وحیدالدین احمد دہلوی ۔ سید صاحب ۱۸۶۹ء میں بمقام بھرت پور پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی ۔ ابتداء میں مولانا حالی کو اپنا کلام دکھایا پھر مولانا نے جاکر داغ کا شاگرد کرا دیا۔ ۱۳، ۱۴ سال کی عمر سے آپ شعر کہتے ہیں ۔ آپ کا کلام دلی کی ٹکسالی زبان کا اعلیٰ نمونہ ہے ۔ غزلیات میں داغ کا پرتو نظر آتا ہے متروکات کے بھی سختی سے پابند ہیں، روزمرہ، روانی اور صفائی بھی ہے مگر پرگوئی کے سبب کیفیت مفقود ہے آپ کے دو دیوان گفتارِ بیخود اور درِ شہوارِ بیخود شایع ہو چکے ہیں۔

اس وقت دلی میں آپ کا دم بہت غنیمت ہے اگرچہ عرصہ سے آپ گوشہ نشین ہو چکے ہیں۔

اور تو تم سے کیا نہیں ہوتا — ایک وعدہ وفا نہیں ہوتا
بات سننے میں کیا قباحت ہے — ہر سخن مدعا نہیں ہوتا
آپ لائے ہیں ہم پیام اپنا — دوسرے سے ادا نہیں ہوتا
چٹکیاں لینے لگی، دل میں کسی کی یاد بھی — جب ہنسی آئی تو لب پر آ گئی فریاد بھی
کیا خبر ہے اس تسلی کا اثر کب تک رہے — تم نے وعدہ تو کیا۔ لیکن رہے گا یاد بھی

جگر مراد آبادی:۔ علی سکندر جگر ابن مولوی علی نظر نظر، ابنِ حافظ مولوی محمد نور، نور، مراد آباد میں اقامت اختیار کر لی ۔ حضرتِ جگر ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے ۔ بقولِ حضرتِ نوح ناروی صرف دو تین غزلیں آپ نے مرزا داغ کو دکھائی ہیں منشی حیات بخش رسا فخر تلامذہ داغ اور منشی امیراللہ تسلیم سے بھی مشورۂ سخن کیا ہے ۔ جناب سیماب کو بھی یہ ادعا ہے کہ حضرت جگر نے مجھ سے بھی اصلاح لی ہے (واللہ اعلم)

حضرت اصغر سے ملنے کے بعد حضرت جگر میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ حضرت جگر نے اکثر اپنے اشعار میں نہایت خلوص و ادب سے ان کا ذکر کیا ہے ۔ حضرتِ جگر کی ابتدائی شاعری کا اندازہ ان کے پہلے دیوان "داغ جگر" سے لگایا جا سکتا ہے ۔ جس میں سادگی، شوخی اور معاملہ بندی پائی جاتی ہے ۔ دوسرے دور میں ان کے کلام میں سرمستی، کیف و رنگینی پیدا ہو گئی ہے اور کہیں کہیں معرفت کی چاشنی بھی ہے، اب ادھر چند سال سے ان کے کلام میں وہ کیف و دل آویزی نہیں رہی ۔ ان کے کلام میں حشو و زواید اور نامانوس تراکیب کے ساتھ فنی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں، پڑھنے کا انداز نہایت دلپذیر ہے ۔ ان کا کلام ان ہی کی زبان سے سننے میں زیادہ لطف ہے ۔ ان کے ترنم نے نوجوان طبقہ پر خاص اثر کیا ہے۔

جوش ملسیانی:۔ آپ کا نام لبھورام اور جوش تخلص ہے، یکم فروری ۱۸۸۲ء کو قصبہ ملسیان ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں حضرتِ داغ کی شاگردی اختیار کی اور بعد میں نسیم بھرت پوری کو بھی چند غزلیں دکھائیں، غزل اور نظم دونوں خوب کہتے ہیں ۔ کلام میں صفائی اور پختگی پائی جاتی ہے ۔ آپ کا مجموعۂ کلام "بادۂ سرجوش" شایع ہو چکا ہے۔

حسن بریلوی:۔ حاجی مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی، حضرتِ شاہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کے چھوٹے بھائی ۔ شعرو سخن کا طبعی و فطری ذوق تھا ۔ غیر معمولی ذہانت و ذکاوت کے مالک تھے ۔ مزاج میں شوخی و شگفتگی اور زندہ دلی تھی ۔ حضرتِ داغ کے ارشدِ تلامذہ میں شمار تھا ۔ نعتیہ کلام میں ان کا دیوان ذوقِ نعت اور عاشقانہ میں ثمرِ فصاحت، یادگار ہے ۔ مولانا حسن مرحوم نے

۸ر شوال ۱۳۴۳ھ مطابق ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۵ء کو رحلت فرمائی۔

چشم خونبار خدا رحم کرے — تیرا رونا نہیں دیکھا جاتا
الفت ان کی نہیں چھوڑی جاتی — حال دل کا نہیں دیکھا جاتا

دادِ شوریدہ سری کس سے ملے گی یارب — جس جگہ میں ہوں وہاں در نہیں دیوار نہیں

رساؔ بلند شہری:۔ منشی سید حیات بخش رساؔ فخر تلامذہ داغؔ، ساداتِ قصبہ کاسنہ ضلع بلند شہر سے تھے، مولوی حامد حسن قادری نے انکو فرخ آباد کا باشندہ لکھا ہے جو غلط ہے یہ ضرور ہے کہ وہ کچھ عرصہ فرخ آباد میں بہ سلسلۂ ملازمت رہے ہیں۔

۱۹۰۸ء میں رام پور میں جو ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا اس میں حضرت مضطرؔ ان کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ رام پور میں ان کی غزل بہت کامیاب رہی۔ مضطرؔ نے نواب صاحب سے ان کی سفارش کی کہ ان کو درباری شعراء میں رکھ لیا جائے چنانچہ نواب صاحب نے ان کو مشاہرہ ۵۰ روپے ملازم رکھ لیا اور عدالت ہائے ریاست میں وکالت کی اجازت بھی دیدی آخر وقت تک وہیں رہے اور شاید مرض فالج میں ۱۹۱۳ء میں انتقال کیا۔

وہ داغؔ کے بہترین مقلد تھے۔ شعر بہت بامزہ، صاف اور شوخ کہتے تھے۔ زبان میں ایک عجیب لوچ اور شیرینی ہے۔ اسلوب بیان میں لطافت اور دل کشی ہے۔ ان کا دیوان نہ چھپ سکا۔ مولانا حسرتؔ موہانی مرحوم نے مختلف جرائد سے ان کا کلام جمع کرکے ایک مختصر مجموعہ غزلیاتِ رساؔ مرتب کیا ہے۔

مہرؔ گوالیاری:۔ منشی نراین پرشاد ورما مہرؔ ریاست گوالیار کے باشندے تھے۔ مرزا داغؔ کے ارشدِ تلامذہ میں شمار تھا۔ شعر بہت بامزہ اور صاف کہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا داغؔ کے ہندو تلامذہ میں ان سے بہتر کہنے والا کوئی شاعر نہیں ہوا۔ ان کا دیوان "شعاعِ مہر" شایع ہو چکا ہے۔

ابھی کچھ اور پروانے گلے ملنے کو باقی ہیں، — ذرا تھمنا ابھی رخصت نہ اے شمعِ سحر ہونا
کچھ کہہ سکے نہ داورِ محشر کے سامنے — آنکھیں بھر آئیں اس کو گنہگار دیکھ کر
جان کر تجھ کو جفا کار۔ وفا کی ہیں نے — جو خدا کی نہیں جاتی وہ خطا کی میں نے
ہاتھ اٹھے تو ادا حرفِ تمنا نہ ہوا — اس دعا گو کو دعا کا بھی سلیقہ نہ ہوا
ان کی خدمت میں رساؔ بھی ہوگا — کبھی یوں حکمِ خدا بھی ہوگا
کھل جائے بھرم ضبطِ محبت کا نہ ان پر — ڈرتا ہوں کہیں آنکھ میں آنسو نہ بھر آئے

سائلؔ دہلوی:۔ نواب مرزا سراج الدین احمد خاں سائلؔ ابن نواب مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ، ابن نواب ضیاء الدین احمد نیرؔ۔ رئیس دہلی اور جاگیردار لوہارو ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ فصیح الملک مرحوم کے شاگرد ہو گئے نیز ان کا دوسرا عقد ان کی بالک صاحبزادی سے ہوا۔ حضرتِ سائلؔ مرحوم دلّی کے آخری یادگار شاعر تھے، نہایت وجیہ، سرخ و سپید رنگ، اس پر چو گوشیہ ٹوپی، مغلی انگرکھا بہترین لباس زیبِ تن فرماتے۔ جامہ زیبی اور خوش الحانی ان پر ختم تھی۔ اور جس انداز و خوش الحانی سے پڑھتے وہ قابلِ دید و شنید تھی۔ مشاعروں میں ترنم سے پڑھنے کے وہ ہی موجد ہیں۔ بڑے حاضر طبع شاعر تھے جو کچھ فکر اول میں موزوں ہو جاتا تھا اس پر نظر ثانی نہیں کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں ایک طرح کی ناہمواری پائی جاتی ہے۔ ان کا کوئی دیوان نہیں چھپا۔ متعدد بیاضوں میں ان کا کلام تھا۔

دو چار مل کے بیٹھ گئے بزمِ عیش ہے — دو چار خُم لنڈھا دئے میخانہ ہوگیا
کل شب کو بزم سے میں، عدو میہماں نہ تھا — بگڑو نہیں، خفا نہ ہو۔ جانے دو۔ ہاں نہ تھا

خموشی میں ہے عرضِ حال کیا کیا ___ کوئی سمجھے ہمارا مدعا کیا
ہمیشہ خونِ دل رویا ہوں میں لیکن سلیقے سے ___ نہ قطرہ آستیں پر ہے نہ دھبہ جیب و دامن پر
یہ بھی کوئی رونا ہے کہ دو اشک بھر آئے ___ آنکھوں میں لہو بن کے دل آئے جگر آئے

سیماب اکبرآبادی - (۱۲۹۹ھ — ۱۹۵۱ء) - عاشق حسین نام - سیمابؔ تخلص، شیخ احمد حسین صدیقی کے صاحبزادے ۱۲۹۹ھ میں پیدا ہوئے تحصیل علم کے بعد کچھ عرصہ ریلوے کے محکمہ میں ملازم رہے - وہاں سے مستعفی ہوکر زبان و ادب کی خدمت کے خیال سے آگرہ میں قصرالادب کی بنیاد ڈالی اور ایک ہفتہ وار پرچہ تاجؔ اور ایک ماہانہ پرچہ شاعرؔ نکالا جس نے ان کی شاعری اور شہرت کو فروغ دیا - مرحوم خود بھی شہرت کے بڑے دلدادہ تھے - ان کا رنگِ سخن داغؔ سے اس قدر مختلف ہے کہ دونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے غزلیں اور نظمیں وغیرہ سب کچھ بہت کہا ہے - مگر بقول حضرتِ نیاز فتحپوری "حضرت سیماب دل سے نہیں دماغ سے شاعری کرتے ہیں"۔

آغا شاعر دہلوی :- آغا مظفر بیگ نام، شاعرؔ تخلص ۱۸۷۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے - شاعری کا شوق پیدا ہوا تو نواب احمد سعید خاں طالبؔ سے مشورۂ سخن کرنے لگے پھر ۲۵، ۳۰ سال کی عمر میں حیدر آباد پہونچکر فصیح الملک مرحوم کی شاگردی اختیار کی اور عرصہ تک ان کی خدمت میں حاضر رہے - ان کو غزل کے علاوہ اور اصنافِ سخن پر بھی قدرت حاصل تھی پڑھنے کا انداز ایسا دلکش تھا کہ بڑے بڑے ترنم والے منھ دیکھتے رہ جاتے تھے اگرچہ ترنم سے نہیں پڑھتے تھے -

اسی رفتار سے اُٹھے گی قیامت اک دن ___ یہ خبر ہم کو ترے نقشِ قدم دیتے ہیں
محبت بھی کیا چیز ہے دیکھنا ___ اِدھر بات کی چشم تر ہوگئی
بزمِ دشمن سے اب آئے ہو مزے لوٹے ہوئے ___ ہوش میں آؤ کہیں جڑتے ہیں دل ٹوٹے ہوئے

طپش مارہروی :- محمد یوسف حسن نام، طپشؔ تخلص - مارہرہ ضلع ایٹہ کے رہنے والے - رام پور کے درباری شاعر تھے - کلام میں روزمرہ پختگی اور سلاست پائی جاتی ہے - آدمی طبیعت دار تھے -

شبِ غم کا۔ مرا۔ اک ساتھ قصہ مختصر ہونا ___ اِدھر دم توڑنا میرا۔ اُدھر پیدا سحر ہونا
نگاہیں ملتے ہی یوں کام کر جانا محبت کا ___ نہ ان کو کچھ خبر ہونا، نہ مجھکو کچھ خبر ہونا
کتنا طویل عمر دو روزہ کا ہے بیاں ___ دو دن کی زندگی کا اک افسانہ ہوگیا
وہاں تو سہل ہے ہر بار جلوہ گر ہونا ___ یہاں تو ہوش میں آنا محال ہوتا ہے

متین مچھلی شہری :- مولوی متین الدین احمد متینؔ مچھلی شہر ضلع جون پور کے رہنے والے - اس وقت تلامذۂ داغؔ میں ایک امتیازی درجہ رکھتے ہیں، بڑا پختہ اور مربوط شعر کہنے والوں میں ہیں، کلام میں روانی اور سنجیدگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے :-

نگاہِ مہر اگر مجھ پر تری اے ماہ رو ہوتی ___ یہ کیوں جورِ فلک ہوتا یہ کیوں دنیا عدو ہوتی
کہوں عشق بتاں کا راز کس سے کون سمجھے گا ___ کلیم اللہ مل جاتے تو ان سے گفتگو ہوتی
اللہ رے بدگمانی انھیں خط میں لکھدیا ___ باتیں نہ کیجئے گا مرے نامہ بر سے آپ

محمود رام پوری :- محمود علی خاں محمودؔ خلف اشرف علی خاں رام پوری نواب مرزا داغؔ کے عزیز ترین شاگرد تھے -
حضرت محمودؔ ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے - مولوی عبدالرحمٰن اور میاں منصور شاہ منصورؔ سے فارسی پڑھی اور منشی عیوض علی سے فنِ خوش نویسی حاصل کیا - شعر کی طرف طبیعت مائل دیکھ کر شاہ صاحب نے داغؔ کا شاگرد کرا دیا، ان کے والد مرزا داغؔ کے خاص دوست تھے - مرزا داغؔ کی طلبی پر حیدر آباد تشریف لے گئے انھوں نے اپنے تلامذہ کی اصلاحات کا کام ان کے سپرد کردیا یہ کئی کئی غزلیں روزانہ بناتے اور واپس کر دیتے - مرزا داغؔ کو ان کی اصلاحوں پر اتنا اعتماد تھا کہ اصلاح شدہ غزلوں کو کبھی ملاحظہ نہ فرماتے

صحت زبان کا بڑا خیال تھا - کلام میں شوخی، روانی سلاست، برجستگی، معاملہ بندی کے ساتھ سوز و گداز بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔

میں مرگیا تو خاک بھی ان کو نہ غم ہوا
بولے کہ ایک چاہنے والا تو کم ہوا

غیر بھی اب متحمل ہیں، دعا دو ہم کو
آگیا تم کو سلیقہ ستم آرائی کا

جب کہا اس نے آج کیوں چپ ہو
پھر شکایت کا حوصلہ نہ ہوا

ناطق گلاؤٹھوی :- آپ کا اسم گرامی سید ابوالحسن - ناطق تخلص - اور گلاوٹھی ضلع بلند شہر وطن ہے - ۱۴-۱۵ سال کی عمر سے شعر کہتے ہیں - مرزا داغ کے آخر زمانہ کے شاگرد ہیں، آپ کے تلامذہ میں مولوی عبدالباری آسی الدنی زیادہ مشہور ہوئے - مرزا داغ کی شاگردی سے پہلے وہ جلال لکھنوی، بیاں میرٹھی اور اطہر ہاپوڑی کو اپنا کلام دکھاتے رہے :-

صبحِ وصال ان کی بلا لے کے مرگئے
ہم مرتے مرتے ایک بڑا کام کرگئے

وہ بیخودی میں خود کو مرا ان سے پوچھنا
اور ان کا مسکرا کے یہ کہنا کہ مرگئے

پریشاں خاطری تو لے دلِ اندوہ گیں نکلی
جگر کی پھانس تھی - اچھا ہوا جانِ حزیں نکلی

وہاں پہونچا دیا ہے ہم کو طوفانِ حوادث نے
جہاں گرداب میں آکر کوئی کشتی نہیں نکلی

نسیم بھرت پوری :- سید شبیر حسن نام - نسیم تخلص پہر سر ریاست بھرت پور کے باشندے - ریاست میں سب انسپکٹر پولیس تھے داغ کے دورِ دوم کے شاگرد تھے اس زمانہ میں وہ ان کے بہترین شاگردوں میں تھے - زبان مرزا داغ کی سی تو نہیں لیکن پھر بھی بہت صاف ہے، کلام میں بلندیِ خیال اور چستی ترکیب نہیں - عین عالمِ جوانی میں انتقال کیا - ان کا ایک مختصر سا دیوان چھپ گیا ہے -

اب حشر میں ہو فیصلۂ ظلم و ستم بھی
اللہ بھی ہے - غیر بھی ہیں - تم بھی ہو - ہم بھی

ہم تھے اور صبح اک قیامت تھی
وہ تو رخصت ہوئے گلے مل کے

جان سے تنگ ہیں دنیا سے گزرنے والے
اے اجل آکہ مرے جاتے ہیں مرنے والے

دل ہو بے چین کہ مضطر ہو جگر کچھ ہو نسیم
ہاتھ سینہ پہ نہیں وہ کبھی دھرنے والے

نوح ناروی :- آپ کا اسم گرامی محمد نوح اور نوح تخلص ہے - آپ ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں بمقام بھوانی پور تحصیل سلون ضلع رائے بریلی پیدا ہوئے - شعر کا شوق پیدا ہوا تو شروع میں میر نجف علی مرحوم سے اصلاح لی پھر فصیح الملک مرحوم کے شاگرد ہوگئے اور استاد کی قدم بوسی کے لئے حیدر آباد تشریف لے گئے، کچھ عرصہ خدمت میں رہنے کے بعد واپس تشریف لے آئے اور اس کے بعد بہت زیادہ مشقِ سخن فرمائی اور غزلیں بغیر اصلاح واپس آنے لگیں - آپ اس وقت داغ کے تلامذۂ ارشد میں سے ہیں - لطفِ زبان، سلاست و روانی، روز مرہ، الفاظ کی تکرار، تقدیم و تاخیر، شوخی، معاملہ بندی آپ کے کلام کی خاص خصوصیت ہے لیکن کلام میں اثر اور سوز و گداز نہیں ہے - روز مرہ اور لطفِ زبان اور اسلوبِ بیان نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے - غرض فصیح الملک مرحوم کی جملہ خوبیاں آپ کے کلام میں پائی جاتی ہیں — آپ کے تین مجموعہ کلام سفینۂ نوح، طوفانِ نوح اور اعجازِ نوح شایع ہو چکے ہیں -

وہ کہتے ہیں آؤ مری انجمن میں، مگر میں نہیں اب وہاں جانے والا
کہ اکثر بلایا - بلا کر بٹھایا، بٹھا کر اٹھایا، اٹھا کر نکالا

سنتے رہے ہیں آپ کے اوصاف سب سے ہم
ملنے کا آپ سے کبھی موقع نہیں ملا

پہلے میرا حال سن - پھر سن کے میرا حال دیکھ
دیکھ کر پھر غور کر پھر غور کر کے دل سے پوچھ

اور تو الفت نہ ہونے کا سبب کوئی نہیں
یا برائی آپ میں ہے یا برائی ہم میں ہے

بدلی بھی اٹھی، بارش بھی ہوئی، شیشے بھی کھلے، ساغر بھی چلے
ہشیار سب اپنے کام سے ہیں - میخانے میں غافل کوئی نہیں

[illegible]ز

[illegible] میں)
[illegible]لار کے تمام وہ خطوط
[illegible]بات نگاری، سلاست بیان
[illegible]لینی اور البیلے پن کے لحاظ
[illegible]فن انشار میں بالکل پہلی چیز
[illegible]ا اور جن کے سامنے خطوط
[illegible]آب بھی پھیکے معلوم ہوتے
[illegible]ں ان اڈیشنوں میں پہلے
[illegible]ڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا
[illegible]یا ہے اور ۳۰ پونڈ کے کاغذ
[illegible]طباعت ہوئی ہو، قیمت ہر
[illegible]ی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخئیل، اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشار عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں بھی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں

قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-
(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ
(۲) مادیین کا مذہب
نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت
ایک روپیہ
علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشار کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوش خط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اسکے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت [illegible] زوال، موت و [illegible]یات صحت بیاری [illegible] پر صحیح پیشین گوئی [illegible]کرسکتا ہے۔

[illegible]قیمت ایک روپیہ
[illegible] محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد

[illegible]نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشار کے لحاظ سے جو رتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے
[illegible]

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید [illegible] عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اسکو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کاغذ طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت
ایک روپیہ آٹھ آنے
[illegible]

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے
ایران [illegible]ستان کا اثر جرمن شاعری پر فارسی زبان کی پیدائش پر سرسری نظر، اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اُردو غزل گوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد فنون ادبیہ حقیقت نگاری
[illegible] علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا۔ اسکے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت
ایک روپیہ
[illegible]

[illegible]

فروری، مارچ سنہ ۱۹۴۲ء

[illegible]

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۴۲ء

[illegible]

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ سنہ ۱۹۴۲ء

[illegible]

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۳۶ء

نگار کا افسانہ نمبر جس میں تقریباً تمام افسانے [illegible] اس سالنامہ [illegible] افسانہ نگاری کے [illegible] افسانہ کا معیار کیسا ہونا چاہیئے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۰ء

[illegible]

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

[illegible]

جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۰ء

[illegible]

قیمت [illegible] علاوہ محصول

سالنامہ سنہ [illegible]

[illegible]

۵۰ سال کے بعد

[illegible]



ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ — سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان

قیمت [illegible] — آٹھ روپیہ ([illegible])

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ ضخامت ۶۰۲ صفحات، مجلد نو روپیہ ۹ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات کا مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف، معجزہ و کرامت، انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل، طوفان نوح، جنت کی حقیقت، مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں، یونس وردہان ہی، حسن یوسف کی داستان، قارون، سامری، علم غیب، دعا، توبہ، لقمان، عالم برزخ، یاجوج ماجوج، ہاروت ماروت، حوض کوثر، امام مہدی، نور محمدی اور پل صراط، آتش نمرود و غیرہ۔ ضخامت ۴۶۲ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ [illegible] نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرتِ خیال اور پاکیزگی بیان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیباتِ جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے روکنے میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

نہایت ضروری اطلاع :-
چونکہ رجسٹری کی فیس اب چھ آنے ہوگئی ہے، اس لئے "نگار" کا سالانہ وی پی آٹھ روپیہ چھ آنے کے بجائے آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں روانہ ہوگا ـــــ آپ اس نقصان سے اس طرح بچ سکتے ہیں کہ سالانہ چندہ آٹھ روپے ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں۔ منیجر

نگار

ایڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۳ | فہرست مضامین مارچ ۵۳ء | شمارہ ۳

معذرت والتماس

اس وقت تک ریویو کے لئے جتنی کتابیں موصول ہوئی ہیں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ان میں سے ہم صرف چند پر اظہار خیال کرسکے ہیں، امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں ہم باقی کتابوں پر بھی اپنا تبصرہ پیش کرسکیں گے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور کہنا ہے وہ یہ کہ اکثر پبلشرز اور مصنفین ریویو کے لئے اپنی مطبوعات کی صرف ایک کاپی روانہ کرتے ہیں، حالانکہ انھیں دو کاپیاں بھیجنا چاہئے۔ امید ہے آئندہ اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

دوسری معذرت

افسوس ہے کہ اس اشاعت میں ہم فرہنگ پارسی کے اوراق کے لئے جگہ نہیں نکال سکے۔ آئندہ اس کی تلافی کی کوشش کی جائے گی۔

من ویزداں

کے متعلق اکثر حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے، حالانکہ وہ ایک ہی جلد میں تمام ہوگئی ہے۔

مذہبی استفسارات وجواب کا مجموعہ بالکل دوسری چیز ہے اور من ویزداں کے کسی مضمون کا تعلق اس سے نہیں ہے، اسی طرح مذہب بھی ایک علاحدہ کتاب ہے لیکن مناسب یہی ہے کہ مذہب کے موضوع پر ان تینوں کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ من ویزداں کا دوسرا ایڈیشن زیر طبع ہے اور اپریل تک غالباً شائع ہوجائے گا۔

پاکستان کے لئے ہمارے ایجنٹوں کے پتے نوٹ کرلیجئے:-

۱۔ ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی۔ ۲۲۲، الٰہی بخش کالونی کراچی
۲۔ ملک دین محمد اینڈ سنز بل روڈ لاہور

آپ ان کو سالانہ چندہ بھیجکر نگار کے خریدار ہوسکتے ہیں اور کتابوں کی قیمت بھیجکر وہ بھی ہم سے حاصل کرسکتے ہیں۔ منیجر

(داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ ختم ہوگیا۔ اپریل کا پرچہ ذریعہ وی۔ پی 8/8 روپیہ میں روانہ ہوگا۔ آپ کا فائدہ اسی میں ہے کہ چندہ /8 روپیہ ذریعہ منی آرڈر روانہ کریں)

ملاحظات

چند تاثرات :

پچھلے سال مجھے دو بار کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ پہلی بار مارچ ۵۲ء میں ایک ادبی صحبت کی شرکت کے لئے۔ دو بارہ نومبر ۵۲ء میں محض احباب و اعزہ سے ملنے کی غرض سے اور ان دونوں زمانوں کے دو بالکل مختلف اثرات لیکر واپس آیا

اول مرتبہ ہرچند میرا وقت زیادہ تر احباب کی دید و باز دید ہی میں صرف ہوا اور پاکستان کے مطالعہ کا زیادہ موقع نہیں ملا، تاہم میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ لوگ فی الجملہ مطمئن ہیں اور بقاء حیات کے لئے جو جدو جہد وہاں جاری ہے وہ لاکھ صبر آزما سہی لیکن مایوس کن نہیں ہے، غلّہ ارزاں تھا، تجارتی کساد بازاری شروع نہ ہوئی تھی، لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے، زندگی کے آثار ہر طرف نمایاں تھے۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں کی وزارت عظمیٰ کے اثرات ہنوز کچھ کچھ باقی تھے اور دستور کی تشکیل و نفاذ میں زیادہ اُلجھنیں پیدا نہ ہوئی تھیں، لیکن آٹھ مہینے بعد ہی جب میں دوسری بار نومبر میں وہاں پہونچا تو دنیا بالکل بدلی ہوئی تھی۔ غلّہ کمیاب تھا، تجارتی کساد بازاری کے ساتھ گرانی بڑھتی جارہی تھی، حکومت کے خلاف مایوسانہ برہمی عام ہوتی جاتی تھی، ملا ازم نے حکومت کے خلاف محاذ قایم کرکے دستور کے مسئلہ میں کافی اُلجھنیں پیدا کر رکھی تھیں، مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے تعلقات میں باہم کشیدگی بڑھتی جارہی تھی اور خواجہ ناظم الدین صاحب کی وزارت عظمیٰ غیر مقبول و نا مطبوع تھی۔

چند مہینوں میں اتنا تغیر، اس قدر ذہنی انقلاب، ایسا نمایاں اضطرار و اضطراب! یقیناً افسوس کی بات تھی، لیکن حیرت کی نہیں، کیونکہ پاکستان کی وہ خصوصیت جس نے اس وقت تک وہاں کی آبادی میں اک کیفیت دلجمعی کی پیدا کر رکھی تھی، غلّہ کی ارزانی تھی اور اسی کے ساتھ یہ یقین کہ چاہے جو کچھ ہو لیکن پاکستان میں رزق کی کمی نہیں ہوسکتی، اس لئے جب دفعتاً اس کی یہ خصوصیت باقی نہ رہی اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ پاکستان میں بھی جو غلّہ کا گھر ہے انسان کسی نہ کسی وقت غذائی مشکلات میں مبتلا ہوسکتا ہے تو ان میں اک نفسیاتی ردعمل شروع ہوا اور چونکہ ان کے نزدیک اس کا تنہا سبب حکومت کی بدنظمی تھی اس لئے انھیں قدرتاً موجودہ وزارت کے خلاف برہم ہونا چاہئے تھا۔

اگر غلّہ کی گرانی و کمیابی کے ساتھ آمدنی کا اوسط بڑھ جاتا یا زندگی کی دوسری ضروریات آسانی سے فراہم ہوسکتیں، تو شاید یہ ردعمل اتنا شدید نہ ہوتا، لیکن بدقسمتی سے چونکہ اس دوران میں ملک کی عام اقتصادی حالت بھی خراب ہوتی جارہی تھی، لوگوں کے ذرایع آمدنی تنگ ہوتے جارہے تھے، تجارتی کساد بازاری بھی بڑھ چلی تھی، اس لئے غلّہ کی گرانی کو اور زیادہ محسوس کیا جانے لگا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ہر وہ آواز جو حکومت کے خلاف بلند ہوئی، عوام اس کا ساتھ دینے لگے، وہاں کے حزب مخالف اور دوسری جماعتوں نے جو حصول اقتدار کے لئے جدو جہد کر رہی ہیں اس موقع سے فایدہ اٹھا کر لوگوں کی ذہنیت کو حکومت کے خلاف زیادہ مسموم کرنا شروع کیا اور مولویوں نے بھی اپنے "مطالبات کتاب و سنت" میں شدت پیدا کرکے تشکیل دستور کی راہ میں ایک سنگ گراں حایل کر دیا۔

ان تمام باتوں کو علحدہ علحدہ دیکھئے تو شاید ان کی اہمیت محسوس نہ ہو، لیکن جب یہ سب کی سب ایک ساتھ جمع ہوجائیں گی

توظاہر ہے کہ راعی و رعایا کے تعلقات پر یقیناً ان کا اثر ناخوشگوار ہوگا ———— حکومت کو ملک کے مزاج میں توازن قایم رکھنے کے لئے بڑی احتیاط سے کام لینا پڑے گا اور عمومی طور پر اس کا جو اثر ملک پر ہوگا وہ نظام حکومت کے لئے بہت سی داخلی و خارجی پیچیدگیاں پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔

ظاہر ہے کہ کسی ملک کی حالت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی، قحط بھی پڑتے ہیں، اقتصادی توازن بھی خراب ہوتا ہے، کساد بازاری سے بھی واسطہ پڑتا ہے، گرانی بھی ہوتی ہے اور اس قسم کی دوسری دشواریاں بھی پیش آتی ہیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ان طبعی یا غیر طبعی حالات کی بناپر حکومت ہمت ہار بیٹھے اور ملک کو تباہ ہوجانے دے۔ اس لئے میں یہ تو نہیں کہتا کہ پاکستان کی موجودہ مشکلات دور نہیں ہوسکتیں اور ان دشواریوں کا کوئی حل نہیں ہے، لیکن یہ یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان کے اربابِ حکومت جن زاویوں سے ان تمام مسایل پر غور کررہے ہیں وہ بنیادی طور پر غلط ہیں۔

مثلاً گرانی غلہ کو لیجئے کہ اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ ہندوستان نے نہروں کا پانی کافی مقدار میں پہونچنے نہیں دیا، اس لئے پیداوار بہت کم ہوئی، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ سندھ اور پنجاب میں غلہ کی کمیابی کا ایک سبب تو یہ ہے کہ وہاں کا موجودہ کاشتکار اتنا محنتی و جفاکش نہیں ہے جتنا پہلے کا تھا، دوسرے یہ کہ وہاں کی بہت سی قابلِ زراعت زمین ہر سال غیر مزروعہ چھوڑ دی جاتی ہے اور تیسرا یہ کہ جو کچھ غلہ وہاں پیدا ہوتا ہے اس کا کم از کم ۳۰ فی صدی حصہ ناجایز طریقہ سے باہر چلا جاتا ہے اور یہ تینوں باتیں ایسی ہیں جو خود پاکستان ہی سے تعلق رکھتی ہیں اور اسی کو ان کا سدِّباب کرنا چاہئے۔

پاکستان کو درآمد برآمد میں بھی کروروں روپیہ کا نقصان ہو رہا ہے کیونکہ جوٹ اور روئی کی لاکھوں گانٹھیں بیکار پڑی ہوئی ہیں اور ان کی مانگ بہت کم ہوگئی ہے، اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ پاکستان کے روپیہ کی قیمت زیادہ ہے اور دوسرے ملکوں کو چیزیں یہاں سے حاصل کرنے میں گراں پڑتی ہیں، دوسرا سبب یہ ہے کہ پچھلے دو سال کے اندر پاکستان نے روئی اور جوٹ کی کاشت کو بہت بڑھا دیا، حالانکہ اسے سمجھنا چاہئے تھا کہ دوسرے ملکوں میں جو اسٹاک ان چیزوں کا محفوظ ہے وہ جنگ کا اندیشہ کم ہوجانے کی وجہ سے بازار میں آجائے گا اور پاکستان سے روئی اور جوٹ کی درآمد قدرتاً کم ہوجائے گی۔ ان حالات میں اسے روئی اور جوٹ کی کاشت کم کرکے صرف غلہ کی پیداوار کو بڑھانا چاہئے تھا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف غلہ کم پیدا ہونے کی وجہ سے گرانی بڑھ گئی اور دوسری طرف اس کی درآمد برآمد کا توازن خراب ہوگیا۔ یہ بات بھی پاکستان ہی کے سمجھنے کی تھی، لیکن اس نے اس پر کبھی غور نہیں کیا۔

تشکیل دستور کے سلسلہ میں جو مشکلات اس وقت وہاں کے ملاؤں نے پیدا کر رکھی ہیں، ان کی ذمہ دار بھی خود پاکستان کی حکومت ہے۔ اس باب میں اس کی سب سے پہلی غلطی تو یہ تھی کہ قیام پاکستان کے بعد اس نے فوراً کوئی دستور مرتب نہیں کیا، حالانکہ اگر قایدِ اعظم کے زمانہ میں دستور بن جاتا تو کوئی چون و چرا کرنے والا نہ تھا اور اس وقت تک وہ ملک میں اپنی جگہ بنا لیتا، اس کے بعد دوسری غلطی جسے میں بہت بڑی اصولی غلطی کہتا ہوں نوابزادہ لیاقت علی خاں نے کی۔ انھوں نے جب کبھی کسی تقریر کے دوران میں دستور کا ذکر کیا تو نہایت صاف الفاظ میں مسلمانوں کو یقین دلایا کہ اس کی بنیاد کتاب و سنت پر ہوگی اور اس بات کو اتنی مرتبہ انھوں نے دہرایا کہ عوام کے دل میں یہ بات جم کر رہ گئی کہ پاکستان کا آیندہ دستور یکسر شریعت اسلامی کے مطابق ہوگا۔ پھر نوابزادہ مرحوم نے کہنے کو تو یہ کہدیا لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ جس وقت دستور عوام کے سامنے آئے گا تو انھیں کیونکر یقین آئے گا کہ دستور واقعی کتاب و سنت کے مطابق مرتب کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس باب میں حکومت سے تو پوچھیں گے نہیں، مولویوں ہی سے استصواب کریں گے اور مولوی یقیناً اس موقع سے فایدہ اٹھاکر اپنے اقتدار کا سودا حکومت سے شروع کردے گا۔

چنانچہ جس وقت یہ اعلان ہوا کہ ۲۲ر نومبر کو دستور کمیٹی کی تجاویز ایوان کے سامنے پیش کردی جائیں گی تو مولویوں نے "مطالبہ کتاب و سنت" کے مظاہرے زیادہ شدت سے شروع کردئے، یہاں تک کہ آخرکار خواجہ ناظم الدین صاحب کو اس کا التوا کرنا پڑا اور

جب ولایت سے لوٹ کر ۲۲ دسمبر کو انھوں نے ان تجاویز کو پیش کیا بھی تو وہ "نگا ازم" کی رعایت سے خالی نہ تھیں، اور فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ دستور کی نوعیت واقعی کیا ہوگی اور طلازم کو خوش کرنے کے لئے پاکستان کس حد تک اپنی بین الاقوامی اہمیت کی قربانی گوارا کرسکے گا۔ اس دوران میں ایک اور نہایت اہم خبر پاکستان کے متعلق یہ سننے میں آئی کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کی دفاعی اسکیم میں شرکت کے مسئلہ پر غور کر رہا ہے۔ ہرچند اس کی تصدیق نہ پاکستان کی طرف سے ہوئی ہے نہ برطانیہ و امریکہ کی طرف سے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ امریکن بلاک اس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لئے بیتاب ہے اور اس کی انتہائی آرزو یہ ہے کہ پاکستان بھی اس پیکٹ میں شریک ہوجائے کیونکہ پاکستان کے شمول سے وہ روس کے خلاف اپنا خط مدافعت و اقدام سرزمین روس سے قریب تر قایم کرسکے گا۔

امریکہ کی یہ اسکیم، اٹلانٹک پیکٹ اور مارشل پلان ہی کی ایک کڑی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اگر وہ مشرق وسطیٰ کو تمام حکومتوں کے ساتھ مصر اور پاکستان کو بھی اس میں شامل کرسکا تو یہ نہ صرف روس کے خلاف اس کی بڑی کامیابی ہوگی بلکہ اس کے اثرات بحرالکاہل اور تمام ایشیا تک پھیل جائیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ حکومتیں جو اس اسکیم میں شریک ہوں گی، ان کا کیا حشر ہوگا، امریکن بلاک کی یہ اسکیم دراصل ایک سودا ہے جو وہ مصر و پاکستان اور مشرقِ وسطیٰ کی حکومتوں سے کرنا چاہتا ہے اور جس حد تک روپیہ کا سوال ہے وہ منہ مانگی قیمت دینے پر آمادہ ہوجائے گا، لیکن اس رشوت کے عوض مشرقی حکومتوں کو کیا دینا پڑے گا، اس کا تصور بھی حد درجہ تکلیف دہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پاکستان کی اقتصادی حالت فی الحال اچھی نہیں ہے، وہاں کا معاشی نظام بھی بہت غیر متوازن ہے، کشمیر کے معاملہ میں وہ امریکن بلاک کی زیادہ سے زیادہ ہمدردی حاصل کرنے کا بھی متمنی ہے، اپنے صنعتی اداروں کو فروغ دینے کے لئے وہ امریکی ڈالر اور امریکی ماہرین فن سے بھی فایدہ اٹھانا چاہتا ہے، لیکن ان تمام قوی محرکات کے باوجود اس کا مشرق وسطیٰ کی دفاعی اسکیم میں شریک ہونا اپنی قومی خود داری اور سیاسی آزادی کو ہاتھ سے دیدینا ہے اور ایسی معمولی قربانی نہیں، جسے پاکستان کی غیرت گوارا کرسکے۔ ظاہر ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے پیکٹ میں شامل ہونے کے بعد پاکستان امریکہ کی ایک کالونی بن کر رہ جائے گا، اور تمام سیاسی و اقتصادی اقتدار امریکہ کو سونپ دینا پڑے گا۔ بالکل اسی قسم کی گفت و شنید امریکن بلاک مصر سے بھی کر رہا ہے اور ہوسکتا ہے کہ سوئز کا مسئلہ جنرل نجیب کی مرضی کے مطابق طے ہوجانے پر وہ اپنی رضامندی ظاہر کردے، لیکن پاکستان کا مصر کی مثال اپنے سامنے رکھکر کوئی فیصلہ کرنا خلاف دانشمندی ہوگا، کیونکہ پاکستان کی جغرافی و سیاسی پوزیشن مصر سے بالکل مختلف ہے اور اس کا اپنے سیاسی موقف کو غیر ایشیائی نقطۂ نظر سے دیکھنا اس کے لئے کسی طرح مفید نہیں ہوسکتا۔

پاکستان کو یہ حقیقت کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ گو وہ جغرافی حدود کے لحاظ سے ہندوستان سے علٰحدہ ہوگیا ہے، لیکن اور تمام حیثیتوں سے پاکستان و ہندوستان اب بھی دونوں ایک ہیں، اور دو مختلف سمتوں کی طرف رُخ کرکے ان کا قدم اُٹھانا دونوں کے لئے یکساں نقصان رساں ہے۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کا اس پیکٹ میں شامل ہونا امکانات جنگ کا حدود ہندوستان سے قریب تر ہوجانا ہے اور ہندوستان اسے کبھی پسند نہیں کرسکتا۔ پھر ہوسکتا ہے کہ پاکستان محض انتقامی جذبہ کی بنا پر یا کشمیر کے مسئلہ کو اپنے موافق طے کرانے کے خیال سے اس پیکٹ میں شامل ہونے کا فیصلہ کرے، لیکن اس کا یہ فیصلہ صحیح نہ ہوگا کیونکہ اب یا آیندہ کسی وقت اگر امریکن بلاک پاکستان یا ہندوستان میں سے کسی ایک کی دوستی اختیار کرنے پر مجبور ہوا، تو وہ ہندوستان کی دشمنی مول لینے کی حد تک پاکستان کا ساتھ کبھی نہ دے گا اور اس کے کھلے ہوئے اسباب ہیں۔ اس وقت دنیا کی سیاست جس محور پر گردش کر رہی ہے وہ اشتراکیت و جمہوریت یا بالفاظ دیگر روس و امریکہ کا اختلاف ہے، اس وقت دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کی بیرونی سطح کھرچنے کے بعد آپ کو اس کے نیچے اسٹالین یا صدر جمہوریہ امریکہ کی تصویر نظر نہ آئے۔ اور اشتراکیت و جمہوریت کی اس ٹھنڈی لڑائی میں (جس میں کسی وقت بھی گرمی پیدا ہوسکتی ہے) امریکہ کو اس کی زیادہ فکر نہیں ہے کہ روس کے اثرات مغربی یوروپ میں وسیع ہوتے جارہے ہیں، بلکہ اس کو زیادہ تشویش اس بات کی ہے کہ سواحل بحرالکاہل تک اس کا سایہ پھیلتا جارہا ہے اور ایشیاء میں اسکے اثرات

چین سے گزر کر برما اور حدودِ ہندوستان تک وسیع ہوتے جا رہے ہیں، چنانچہ اسی لئے صدر امریکہ کے نئے صدر نے فارموسا میں چیانگ کائی شیک کو کوریا کی جنگ میں شریک ہو کر چین کے خلاف اقدام کرنے کی اجازت دیدی ہے اور اس کو ہر قسم کی مدد دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ امریکہ اس حقیقت سے بھی واقف ہے کہ وہ اشتراکیت کے اس سیلاب کو ایشیا میں پھیلنے سے نہیں روک سکتا، جب تک ہندوستان اس کا ساتھ نہ دے اور اس لئے وہ ہندوستان سے کسی صورت میں بگاڑنا پسند نہ کرے گا، خواہ پاکستان کے ساتھ اس کی ہمدردیاں کتنی ہی بڑھتی ہوئی کیوں نہ ہوں۔

ہندوستان اس وقت تک بالکل غیر جانبدار رہنے کی پالیسی پر مضبوطی سے قایم ہے اور روس و امریکہ میں سے کسی کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں، اس لئے اگر پاکستان مشرقِ وسطیٰ کے پیکٹ میں شامل ہوگیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ لڑائی کی صورت میں آتشِ جنگ ہندوستان کی حدود تک پہونچ جائے گی اور ہوسکتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کو مجبوراً اپنی پالیسی بدلنا پڑے اور چین کے ساتھ اپنی قسمت بھی وابستہ کر دے۔ امریکہ بھی اس سے اچھی طرح واقف ہے اور اسی لئے وہ کبھی ہندوستان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے گا۔ اس لئے ان حالات میں پاکستان کا مشرقِ وسطیٰ کے پیکٹ میں شامل ہو کر امریکہ سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کشمیر یا کسی اور مسئلہ میں ہندوستان کے خلاف کوئی قدم اٹھائے گا صحیح نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم بارہا عرض کر چکے ہیں، پاکستان و ہندوستان دونوں کی بقا اسی میں ہے کہ وہ خود اپنی مدد کرنا سیکھیں، دوسروں کے بھروسہ پر جینا ترک کر دیں اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ دونوں کی خارجہ پالیسی بالکل متحد ہو، دونوں مل کر ایک نیوٹرل بلاک بالکل علحدہ قایم کریں اور کسی ایسے پیکٹ میں شریک نہ ہوں جو انھیں کسی فریق کے ساتھ جنگ کرنے پر اپنے ملک کے اندر کسی غیر ملک کو فوجی اڈے بنانے یا صنعتی کارخانے قایم کرنے کی اجازت دینے پر مجبور کرنے والا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان و پاکستان کے درمیان کشمیر کا مسئلہ ایک وسیع خلیج بن کر رہ گیا ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے کھل کر ملنے یا بات کرنے کی اجازت نہیں دیتا، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ جلد یا بدیر اسے کسی نہ کسی طرح طے ہونا ہے اور یہ حالت منتظرہ ابدالآباد تک قایم نہیں رہ سکتی، اسی کے ساتھ دونوں اب یہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ جن کے ہاتھ میں یہ فیصلہ دیدیا گیا ہے وہ خود اس کا فیصلہ کرنا نہیں چاہتے، اور اس وقت تک برابر انتظار کرتے رہیں گے جب تک خود اپنے اغراض و مقاصد کے تحت انھیں جابرانہ مداخلت کے جواز کا بہانہ ہاتھ نہ آجائے۔

اس لئے دانشمندی کا تقاضا صرف یہ ہے کہ دونوں ملک آپس میں مل کر اس جھگڑے کو طے کریں اور ان کے اکابر خلوصِ نیت اور پورے جذبۂ رواداری کے ساتھ باہم کر تبادلۂ خیال کریں اور اگر مفاہمت کی کوئی صورت ایسی پیدا ہوسکتی ہے جس پر دونوں کا اتفاق ممکن ہو تو فریقین کو چاہئے کہ اسے ہاتھ سے نہ جانے دیں خواہ اس کے لئے انھیں کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینا پڑے۔

اس دوران میں کبھی کبھی یہ آواز بھی کانوں میں آئی کہ خواجہ ناظم الدین صاحب اور پنڈت نہرو کے درمیان دوبدو گفت و شنید کی راہیں کھلنے والی ہیں، اگر یہ صحیح ہے (اور صحیح نہیں ہے تو اسے ہونا چاہئے) تو اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہوسکتی کیونکہ باہمی مفاہمت اور آپس کے ناخوشگوار تعلقات دور کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ دونوں آپس میں ملیں اور برابر اس وقت تک ملتے رہیں جب تک آپس کی بدگمانیاں دور نہ ہو جائیں، اور پاکستان کا یہ خیال اس کے دل سے نہ نکل جائے کہ کشمیر یا کسی اور نزاعی مسئلہ کا فیصلہ تیغ و تفنگ سے بھی ہوسکتا ہے۔

ہندوستان نہایت صفائی سے بارہا اعلان کر چکا ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف جنگ کرنے میں کبھی اقدام نہ کرے گا اور پاکستان کے ساتھ وہ اس کا معاہدہ کرنے کے لئے بھی آمادہ ہے، لیکن افسوس ہے کہ پاکستان کی طرف سے اب تک اس تحریک کا خیر مقدم نہیں کیا گیا، حالانکہ اگر وہ آیندہ کسی وقت جنگ پر مجبور ہو تو بھی یہ معاہدہ اس کے حق میں فایدہ سے خالی نہیں۔

یادِ رفتگاں

رام پور کا ادبی مرکز

ہندوستان میں شاعری کے دو بڑے اسکول غدر سے پہلے پائے جاتے تھے، دہلی اور لکھنؤ، دہلی اسکول کے نمائندے شاہ نصیر اور اُن کے شاگرد تھے اور لکھنوی اسکول کے نمائندے ناسخ، آتش اور اُن کے تلامذہ سمجھے جاتے تھے۔ اِن کے علاوہ جو مشاہیر سخن تھے وہ ادبی روابط کی بنا پر انھیں اسکولوں کے ترجمان سمجھے جاتے تھے۔ لیکن کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ دہلی، لکھنؤ کے بعد علم و ادب کا ایک بہت بڑا مرکز رام پور بھی رہا ہے، جسے دہلی و لکھنؤ اسکولوں کا سنگم کہنا چاہئے۔

ریاست رام پور اگرچہ ایک زمانہ میں[۱] (۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء تا ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء) خود مختار ریاست تھی، لیکن نواب شجاع الدولہ کے حملہ کے بعد (۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں) یہ حیثیت جاتی رہی اور وہ اودھ کی حکومت کا جزو قرار پائی۔ قدرتاً اس صورت میں اودھ کی حکومت کا اثر اُس کے ہر شعبۂ حیات پر پڑتا، لیکن پٹھانوں کی جداگانہ قومی خصوصیات اور اختلاف مذہب کے باعث لکھنؤ کے بجائے دہلی کا اثر رام پور میں زیادہ پایا جاتا تھا۔

موجودہ رامپور کی بنیاد ایک گاؤں رام پورہ میں نواب فیض اللہ خاں کے عہد میں پڑی، جامع مسجد رام پور کی بنیاد ۱۱۸۰ھ میں[۲] پڑی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۱۸۰ھ سے پہلے رامپور میں آبادی شروع ہوگئی تھی اگرچہ پایۂ تخت قصبۂ شاہ آباد (موجودہ تحصیل ضلع رامپور) ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء میں بن چکا تھا، نواب فیض اللہ خاں کی نیک نیتی اور داد و دہش سے رام پور علماء و فضلاء و ادبا کا مجمع تھا اور بخارائے ہند کہلاتا تھا۔ ۵۰۰ علماء وظیفہ[۳] پاتے تھے، مولانا بحر العلوم (عبد العلی صاحب) ملا حسن شاگرد ملا کمال الدین برادر زادہ ملا نظام الدین فرنگی محلی۔ مولوی غلام طیب شاگرد ملا کمال الدین۔ حاجی محمد سعید محدث و مولانا جمال الدین صاحب شاگردان شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی۔ مولانا رستم علی شاگرد بحر العلوم۔ مولوی غلام جیلانی رفعت شاگرد و ملا حسن و شاہ عبد العزیز محدث وغیرہ سے درس حاصل کرنے نہ صرف ہندوستان بلکہ ترکستان اور افغانستان وغیرہ سے بھی سیکڑوں علم کے پیاسے آکر پیاس بجھا رہے تھے۔

محمد قایم[۴] قایم شاگرد درد اور سودا، رامپور کو ۱۱۸۵ھ میں اپنا مسکن بنا چکے تھے، حکیم کبیر علی[۵] انصاری کبیر شاگرد حکیم علوی خاں حکیم صدر الدین آزردہ دہلوی، مولوی قدرت اللہ شوق صاحب تذکرہ طبقات الشعراء (اُردو) و تکملۃ الشعراء (فارسی) حکیم میر ضیاء الدین عبرت شاگرد نواب محبت خاں محبت، عنبر شاہ خاں آشفتہ، حافظ عبد الحبیب شیفتہ، عزیز خاں بے جان، اخوند زادہ ہمت خاں ہمت، میر غلام علی عشرت

---

۱ اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ۲۷۴ ——— ۲ تاریخ جامع مسجد:- یک مسجد فیض کعبۂ نو (۱۱۸۰ھ)

۳ اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ۵۰۵ بحوالہ مساکن فلسفی۔ دیوان منولال دہلوی ——— ۴ خلاصۂ طبقات الشعرا صفحہ ۴۰ و تکملۃ الشعراء قلمی صفحہ ۱۸۴ و ریاض الفصحا صفحہ ۱۷۹ و فصل الکلام:- در رام پور بسر می بود ۱۲۰۸ھ ——— ۵ اقتباس العلاج۔ مخطوطہ از حکیم بایزید۔

۶ دیباچہ مثنوی ۱۲۳۵ھ پدومات عبرت و عشرت۔ مبلغ خاص گلشن ادوم ۱۲۴۰ھ ——— ۷ دیوان عنبر شاہ خاں آشفتہ شاگرد قایم مخطوطہ۔

شاگرد لطف تلمیذ سودا وغیرہ ریختہ کو رشک فارسی بنا رہے تھے ۔ حکیم صدرالدین خاں آزردہ دہلوی نے ۱۲۰۰ھ میں بزم مشاعرہ کی بنیاد ڈالی تھی مولوی قدرت اللہ شوق کے مکان پر بعد نماز جمعہ ہفتہ وار مشاعرہ ہوا کرتا ، (۱۲۱۵ھ تک یہ سلسلہ جاری تھا) اگرچہ نواب فیض اللہ خاں کو شعر و سخن سے دلچسپی نہ تھی مگر اس کی تلافی دوسرے امرائے رام پور کر رہے تھے ، انجو خاں (متوفی ۱۲۰۹ھ)[1] کے ملازمین میں حکیم میر ضیاء الدین عبرت ۔ حکیم اصغر علی مروت خلف کبیر وغیرہ تھے ، نواب احمد یار خاں افسر قایم کی مدد کر رہے تھے ، نواب نصراللہ خاں سلطان بھی سخن گو اور سخن فہم تھے وہ بھی شعرا کی سرپرستی میں مصروف تھے ۔

نواب فیض اللہ خاں کے انتقال پر اُن کے بیٹے نواب محمد علی خاں تخت نشین ہوئے لیکن خواص و عوام نے بہت ہی جلد کھلم کھلا اُنکی مخالفت شروع کردی نواب محمد علی خاں ، نواب وزیر علی خاں کی شادی کے موقع پر لکھنؤ گئے اور وہاں کے درباری طریقے پسند آگئے ، زمام حکومت ہاتھ میں آنے پر وہی درباری آداب رائج کرنا چاہے ، پٹھان نواب سے برادرانہ برتاؤ کے متوقع تھے یہ رویہ دیکھ کر کھنچ گئے ۔ اور آخر کار مارے گئے نواب آصف الدولہ نے پہلے تو یہ چاہا کہ معاملہ لین دین سے طے ہو جائے ، نواب غلام محمد خاں خلف نواب فیض اللہ خاں جو بھائی کے بجائے تخت نشین ہوئے تھے مصالحت پر آمادہ تھے لیکن افغانی امرا نے اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کیا اور مصالحت کی بات ٹھکرا دی ، نواب آصف الدولہ انگریزی فوجوں کی حمایت پر لڑنے چلے آئے ، انگریزی فوج آگے تھی ، موضع بھٹورا[2] (فتح گنج غربی) علاقہ بریلی میں مقابلہ ہوا ، پہلے ہی حملہ میں انگریزی فوج کو شکست ہوگئی ، دو ہزار تلنگے اور ڈیڑھ سو انگریز مارے گئے ، لیکن جبکہ رامپوری فوج لوٹ مار میں مشغول تھی ، ایک انگریزی کپتان نے جو گھات میں تھی بندوقوں کی باڑھ پر رکھ لیا ، کچھ مارے گئے باقی بغیر لڑے بھڑے بھاگ کر رامپور پہونچے ، بعد میں نواب آصف الدولہ کی فوج فاتحانہ رام پور میں داخل ہوئی اور نواب احمد علی خاں خلف نواب محمد علی خاں کو نابالغی میں تخت نشین کیا ، نواب نصراللہ خاں مدارالمہام رہے خزانہ پر قبضہ کیا گیا اور آدھے سے زیادہ ریاست رام پور کا علاقہ ضبط کرلیا ، یہ واقعہ ۵ جمادی الاول ۱۲۰۹ھ کا ہے ۔ یہ واضح رہے کہ نواب محمد علی سے نواب آصف الدولہ نے پگڑی بدل کر بھائی چارہ کیا تھا ، نواب غلام محمد خاں جلاوطن ہوئے ، اس واقعہ کو مولوی غلام جیلانی رفعت نے فارسی میں (دُرِ منظوم) اور معظم نے اُردو میں نظم کیا ۔

نواب نصراللہ خاں سلطان کی نیابت سے عوام و خواص بیزار رہے اور ستمبر ۱۸۰۱ء میں رام پور اودھ کی حکومت سے علٰحدہ ہوکر برٹش علاقہ قرار پایا ، نواب احمد علی خاں صاحب کے قتل میں اہلِ رام پور ملوث تھے اُنھوں نے خواص و عوام سے علٰحدگی اختیار کی ، کبھی کبھی محل میں ایام گزارتے ورنہ بیشتر وقت شکار میں گزرتا رامپوری ارباب علم و فضل بیشتر مختلف ریاستوں میں جا بسے مولوی حیدر علی رامپوری شاگرد رشید مولوی غلام جیلانی رفعت اور ان کے بھائی مولوی محمد علی رامپوری خلفائے سید احمد شہید رام پور سے ترک سکونت کر گئے ، مفتی شرف الدین رام پوری کی تشہیر کی گئی اور وہ بھی شہر بدر ہوئے ۔ ان حالات میں علم و ادب کی ترقی دشوار تھی ، پھر بھی مولوی قدرت اللہ شوق کے خانوادہ نے رامپور کی ادبی روایات کو قایم رکھا ، رام پور اپنی آبادی کے لحاظ سے بہت مختصر بستی سہی لیکن اس کی علمی و ادبی شہرت سارے ہندوستان میں تھی ، اخوند زادہ احمد خاں غفلت ، کریم اللہ خاں کرم ، حافظ الہ داد طالب[5] وغیرہ شاگردانِ شوق کے باعث ادبی مجالس برپا ہوتیں اور دادِ سخن دی جاتی ۔ غفلت ، مصحفی[6] سے ملاقات کرنے ۱۲۰۳ھ اور ۱۲۰۳ھ کے درمیان لکھنؤ پہونچے اور وہاں کے مشاعروں میں شریک

---

[1] تذکرہ ہندی ۔ مصحفی —— [2] انتخاب یادگار ۔ صفحہ ۳۹ و اخبار الصنادید جلد اول ۔ صفحات ۲۰۸ و ۲۰۹ بحوالہ اخبار حسن ۔

[3] اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ۲۳۹ تا ۲۰۲ ، —— [4] اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ۴۴ ، ——

[5] ریاض الفصحا ۔ فاضلے است متبحر و عالمے است ؟ مسکنش رام پور ، است عمرش چہل سالہ ؟

[6] ریاض الفصحا صفحہ ۲۴۲ غفلت .... ازاں شہر خود محض برائے ملاقات فقیر در لکھنؤ آمدہ بود در قصاید و مثنوی دادِ معنی بندی می دہد ۔

ہوئے کرم[1] نے دہلی جاکر شاہ نصیر کے مشاعرہ میں (قبل از ۱۲۳۳ھ) شرکت کی اور وہاں کے شعرا سے لوگ جھونک رہی، مولوی عبدالقادر غمگین رامپوری صدرالصدور مراد آباد[2] نے رام پور سے ڈھاکہ تک سفر کیا اور واپسی میں آخر عہد نواب سعادت علی خاں (۱۲۲۹ھ) میں لکھنؤ آکر مصحفی، انشاء، شاہ نصیر وغیرہ سے ملاقات کی دہلی جاکر محمد نظام الدین ممنون سے ۲۸ر فروری ۱۸۲۴ء کو ملے اور مفتی صدرالدین آزردہ[3] وغیرہ سے ملاقاتیں کیں ان دنوں لکھنؤ میں ناسخ وغیرہ ترقی کر رہے تھے اور دہلی میں مومن[4] نوجوان شعرا میں اچھے تھے، ان کے تعلقات خصوصی مرزا اسداللہ خاں غالب سے بھی تھے[5]، اس طرح علمی و ادبی روابط ہندوستان سے رام پور کے ادیبوں نے قائم رکھے۔ ۱۲۹۶ھ میں نواب احمد علی خاں رند کا انتقال ہوگیا، نواب محمد سعید[6] خلف نواب غلام محمد خاں ۲۰ر اگست ۱۸۴۰ء مطابق ۱۲ر جمادی الآخر ۱۲۵۵ھ میں تخت نشین ہوئے، یہ بدایوں میں ڈپٹی کلکٹر رہ چکے تھے رامپور سے نکل کر بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا تھا ان کے دوسرے بھائی عبداللہ خاں، حفیظ اللہ خاں، عبدالرحمان خاں، عبدالعلی خاں دہلی میں مقیم رہے ان کے تخت نشین ہونے پر جملہ افراد خاندان نواب غلام محمد خاں رامپور آگئے ان میں صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب، صاحبزادہ عنایت علی خاں عنایت شاگردان مومن بھی تھے، اب رامپور کی اجڑی بستی پھر بسنا شروع ہوئی، لکھنؤ اور دہلی اور دیگر مقامات سے ارباب علم و ادب جمع ہونے لگے، مرزا حاجی (قمرالدین احمد خاں قمر) رامپور گئے نواب محمد سعید خاں بہت احترام سے پیش آئے ۔۔۔۔۔۔۔ ان کو اپنے پاس نوکر رکھا مرزا علی حسین ان کے بیٹے کو ــــــ افسری پلٹن دی مرزا رامپور سے پھر کانپور آئے۔ قیصر التواریخ صفحہ ۲۰۔

شعرا میں شیخ مہدی علی ذکی[7] مراد آبادی شاگرد ناسخ ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں آئے، مرزا معین الدین حیدر غمیں شاگرد میرزا کلب حسین خاں نوازش تلمیذ سوز آخر ۱۸۴۰ء میں برائے تعلیم صاحبزادہ محمد کاظم علی خاں طلب ہوئے میر حسین تسکین[8] شاگرد رشید مومن اور میر عبداللہ غمگین پسر تسکین دہلی سے آکر باریاب ہوئے، شیخ علی بخش[9] بیمار شاگرد غفلت رامپوری آنولہ سے آکر داخلِ ملازمت ہوئے ابھی غفلت اور طالب وغیرہ شاگردانِ شوق زندہ تھے اور نومشقوں کی ہمت افزائی کر رہے تھے، مولوی عبدالقادر خاں غمگین[10] صدرالصدور مراد آباد بھی طلب ہوکر حاکم عدالت ہوئے اور مولوی فضل حق[11] خیرآبادی بھی نواب یوسف علی خاں کی تعلیم کے سلسلہ میں بلائے گئے، کہنے کو تو رامپور چھوٹی سی بستی تھی لیکن جو مشاہیر ہند یہاں جمع تھے ان کی نظیر دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ کہیں نہیں ملتی، رامپور میں قائم کا سلسلہ بلاواسطہ شاگردانِ شوق سے جاری تھا اور میر محمدی مایل اور شاہ نصیر کے توسط سے شاگردانِ مومن دوسرا سلسلہ قائم کر رہے تھے ــــ حافظ[12] اکرام الدین احمد ضیغم شاگرد و داماد رؤف احمد راحت تلمیذ جرأت سلسلۂ حسرت کی ایک کڑی تھے اور سید جمال[13] شاہ مظلوم و سید منصور علی علی و منصور شاگردانِ نزہت خلف میر ضیاء الدین عبرت اسی سلسلہ کی دوسری کڑی تھے، اس عہد میں بڑا کارنامہ شیخ علی بخش بیمار اور سید احمد علی[14] رسا اور سید[15] نظام شاہ نظام رامپوری کا ہے جنھوں نے پرانی راہوں کو چھوڑ کر ایک نیا راستہ نکالا زبان کی تراش خراش اور

---

[1] کلیات کرم مخطوطہ صفحہ ۲۶۳ - یاد دارم کہ در شہر شاہجہاں آباد نو وارد بودم بسیار شاعران از من عناد می داشتند وقتیکہ در مشاعرہ ۱۲۳۳ھ
میاں نصیر نشستہ بودم وہمہ شعرا جمع بودند

[2] روزنامچہ مولوی عبدالقادر رامپوری ورق (۲۰) - [3] صفحہ ۲۲۳ ــــ [4] و [5] صفحہ ۱۳۸ - روزنامچہ ــــ [6] عود ہندی ولکشور پریس کانپور ۱۸۹۵ء صفحہ ۱۵ - غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ یہ مثنوی وہاں لکھی گئی اور ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی عبدالقادر رامپوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور ان کے امثال اور نظائر کو بھیجی گئی ــــــــ [6] انتخاب یادگار - صفحہ ۹۸ ــــ [7] انتخاب یادگار صفحہ ۱۴۰ ــــ [8] مستغنی التواریخ مخطوطہ - از علی نقی غنی نملث غمیں ورق (۳) ــــ [9] انتخاب یادگار صفحہ ۹

[10] انتخاب یادگار و طور کلیم و بزم سخن و گلستانِ سخن ــــ [11] تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۲۲۳ ــــ [12] مکاتیب غالب ــــ [13] انتخاب یادگار صفحہ ۴۰۶ و سخن شعرا ــــ [14] انتخاب یادگار صفحہ ۲۲۳ و ۲۳۱ ــــ [15] و [16] انتخاب یادگار صفحہ ۱۳۶ و ۲۸۶ -

سلاست کو عملی جامہ پہنا کر وارداتِ عشق و محبت میر نظام الدین ممنون[1] اور جرأت کی لے میں ادا کئے، بیمار کا کلام مدون ہوکر سامنے نہ آسکا اور بیشتر تلف ہوگیا معاصرین اُن کی سحر بیانی کے معترف تھے اور طرزِ نو کا بانی سمجھتے تھے، موجودہ کلام جو ہمارے سامنے ہے اُس سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ وہ غلط راستوں سے بچ کر ایک نیا راستہ تلاش کر رہے تھے اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوچکے تھے، احمد علی رسا نے اُستاد کے رنگ کا نہ صرف پورا پورا تتبع کیا بلکہ اُس کی تکمیل بھی کی لیکن افسوس یہ ہے کہ ان کا کلام بھی ضائع ہوگیا، نظام رامپوری نے ادا بندی اور معاملہ نگاری میں کمال فن دکھایا، وہ جانشین تیر نہ بن سکے لیکن جرأت کے صحیح جانشین ضرور ہوگئے، ۱۳ رجب ۱۲۷۱ھ میں نواب محمد سعید خاں کا انتقال ہوگیا اور بیمار بھی رخصت ہوئے۔

اب نواب یوسف علی خاں کا دور آیا جنھیں ابتدا سے عمر سے شعر و ادب سے دلچسپی تھی اور مومن سے بزمانۂ قیام دہلی مشقِ سخن[2] کی تھی وہ ابھی نظم ریاست سے فرصت نہ پاسکے تھے کہ غدر برپا ہوگیا جو ۱۸۵۸ء تک رام پور کی قوتیں اضلاع ملحقہ کا نظم و نسق سنبھالنے میں مشغول رہیں اس ہنگامہ میں ہزاروں مصیبت زدہ اشخاص نے رام پور میں پناہ لی اور جب امن قائم ہوگیا تب اپنے گھروں کو سدھارے، قاضی محمد ممتاز حسین ممتاز کی رباعی شکریہ اس واقعہ کی یادگار ہے ؎

امروز کہ جاں[3] زتن رواں افتاد است مرگ ارزاں زندگی گراں افتاد است
مارا زحیات روزی ارزانی دار اے یوسف وقت قحطِ جاں افتاد است

نواب یوسف علی خاں ناظم کے عہد میں (۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء تا ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء) جو شاعر رام پور آئے اُن کی فہرست مختصراً یہ ہے :-

	نام شاعر[4]	نام استاد	تاریخ آمد رامپور	تاریخ ملازمت	کیفیت
لکھنوی شعراء	منشی مظفر علی اسیر	شاگرد مصحفی	۱۸۵۹ء / ۱۲۷۵ھ[5]	۱۵ مئی ۱۸۵۹ء	۸ فروری ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۲ء
	منشی امیر احمد امیر	” اسیر	اپریل ۱۸۵۹ء / رمضان ۱۲۷۵ھ		اکتوبر ۱۹۰۰ء متوفی
	میر ضامن علی جلال[6]	” برق	۱۸۵۶ء / ۱۲۷۲ھ		
دہلوی شعراء	منشی امیر اللہ تسلیم	” نسیم دہلوی	نومبر ۱۸۵۵ء	دوبارہ ۱۸۶۳ء / ۱۸۶۹ء	مئی ۱۹۱۱ء
	مرزا رحیم الدین حیا[7]	” نصیر	۱۸۵۵ء		متوفی ۱۸۹۸ء
	نواب مرزا خاں داغ[8]	” ذوق	آخر ۱۸۵۷ء	۱۴ اپریل ۱۸۶۶ء	
	آغا مرزا شاغل	” ذوق	آخر ۱۸۵۷ء		
	سید ظہیر الدین ظہیر[9]	” ذوق	۲۷ اپریل ۱۸۵۸ء		
	سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا انور	شاگرد ذوق	۲۷ اپریل ۱۸۵۹ء		

نواب کلب علی خاں نواب کے عہد میں جو شاعر رام پور آئے (۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۵ء سے ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۷ء) ان کی فہرست یہ ہے :-

	نام شاعر	نام استاد	تاریخ آمد رامپور
لکھنوی شعراء	میر محمد زکی بلگرامی	شاگرد دبیر	۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء
	مرزا محسن علی عرف مرزا جو ہندی	شاگرد مصحفی	۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء

---

[1] گلستانِ سخن ص۳۳ — [2] انتخاب یادگار ص۳ پہلے مومن خاں دہلوی سے مشورہ رہا — [3] تذکرۂ سخن آگرہ ۱۸۹۳ء ۱۳۰۹ھ ص۹ [4] اخبار الصنادید جلد ۲ ص۱۵ و بزمِ شعراء ایک سو روپیہ مشاہرہ — [5] رپورٹ انتظامیہ ریاست رامپور حصہ اول مطبوعہ — [6] سوانح عمری امیر ممتاز علی آہ ص۳ — [7] انتخاب یادگار ص۱ و تذکرہ کاملانِ رامپور ص۳ بارہ سو بتیس ہجری میں نواب یوسف علی خاں نے طلب فرمایا — [8] خمخانۂ جاوید جلد ۲ ص۹ [9] داستانِ غدر ظہیر دہلوی و انتخاب یادگار و اخبار الصنادید — [10] داستانِ غدر ظہیر دہلوی — [11] انتخاب یادگار و کلیات تیر مطبع ثمر ہند لکھنؤ ۱۲۹۶ھ ص۱

میر یار علی جان صاحب ـ شاگرد نواب ناشد علی خاں ۱۲۸۹ھ / ۱۸۶۹ء

سید محمد اسمٰعیل حسین منیر ـ شاگرد ناسخ و آتش ـ رمضان ۱۲۸۹ھ[1] مطابق نومبر ۱۸۶۹ء

منشی[2] احمد حسن خاں عروج ـ ، ایضاً ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء

شیخ[3] امداد علی بحر ـ شاگرد ناسخ ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء

منشی[4] امیر اللہ تسلیم ـ شاگرد نسیم دہلوی ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء

خواجہ[5] ارشد علی خاں عرف خواجہ اسد شاگرد ناسخ و وزیر ـ اگست ۱۸۶۵ء

گوبند لال حیا ۱۸۶۵ء / ۱۲۹۲ھ

دہلی ——— حسین علی خاں شاداں ـ شاگرد غالب ۱۲۸۵ھ ـ ، ستمبر ۱۸۶۸ء مطابق متوفی شوال ۱۲۹۶ھ

نواب یوسف علی خاں ناظم اور نواب کلب علی خاں نواب کے عہد میں جو اجتماع شاعروں کا ہوا اس کو علحدہ نہیں کیا جاسکتا زمانۂ غدر سے نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کے انتقال تک یہ ادبی محفل جمتی رہی اور ان کے انتقال پر ختم ہوگئی، رام پور میں جو مقامی شعرا اس عہد میں تھے اُن کی نہایت مختصر سی فہرست پیش کی جارہی ہے تاکہ مقامی شعرا کی حیثیت واضح طور پر سامنے آجائے ـ

حافظ اللہ داد عرف شبراتی طالب ـ شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق ـ ولادت ۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء ـ وفات ۲۹ رشوال ۱۲۷۵ھ مطابق یکم جون ۱۸۵۹ء

حکیم احمد خاں فاخر ـ شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق ولادت ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۵ء ـ متوفی ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء بعمر نوے سال

میر شرف الدین ششدر ـ شاگرد غفلت ـ ۲۵ ر ذی حجہ ۱۲۷۵ھ مطابق اگست ۱۸۵۹ء

صاحبزادہ فصیح اللہ خاں مفتوں ـ شاگرد غفلت ولادت ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء متوفی ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء

صاحبزادہ امداد علی خاں امداد ـ شاگرد غفلت ولادت ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۲ء متوفی ۱۰ ر صفر ۱۲۸۲ھ مطابق جون ۱۸۶۵ء

صاحبزادہ مہدی علی خاں نحیف ـ شاگرد بیار و رسا ـ ولادت ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء متوفی رمضان ۱۲۷۹ھ مطابق نومبر ۱۸۶۲ء

سید نظام شاہ نظام ـ شاگرد بیار و احمد ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء ـ متوفی ۲۵ ر شعبان ۱۲۸۹ھ مطابق اکتوبر ۱۸۷۲ء

سید احمد علی رسا ـ شاگرد بیار ـ ولادت ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء متوفی محرم ۱۳۰۹ھ مطابق اگست ۱۸۹۱ء

صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب ـ شاگرد مومن ـ ولادت ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء متوفی ۲۹ ر رجب ۱۳۰۱ھ مطابق ۲۶ ر جون ۱۸۸۴ء

حشمت علی خاں موحد ـ شاگرد مومن ـ ولادت ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء آغاز بیسویں صدی تک حیات تھے ـ

فتحیاب خاں اختر ـ شاگرد غالب ـ ولادت ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء ـ ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں حیات تھے ـ

خورشید احمد مجددی خورشید ـ شاگرد غالب ـ ولادت ۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء ـ ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں حیات تھے

حکیم مظہر حسن خاں احسن ـ شاگرد غالب و اسیر ولادت ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۷ء ـ ۱۸ ر مارچ ۱۸۹۱ء

صاحبزادہ امیر اللہ خاں امیر ـ شاگرد شہیدی، بیار، رسا ـ ولادت ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء ـ شعبان ۱۲۸۹ھ مطابق اکتوبر ۱۸۷۲ء

سید محمد امیر شاہ امیر ـ شاگرد آشفتہ تلمیذ قائم ـ ولادت ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۵ء ـ ۲۳ ر صفر ۱۲۹۰ھ ـ اپریل ۱۸۷۳ء

محمد مظفر خاں گرم ـ شاگرد ذوق ـ ولادت ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء ـ ۱۰ ر جمادی الآخر ۱۲۸۵ھ مطابق ستمبر ۱۸۶۸ء ساٹھ سال

---

[1] انتخاب یادگار و کلیات منیر مطبع ثمر ہند لکھنؤ ۱۲۹۳ھ ص[illegible] ـ [2] تذکرہ کاملان رام پور ـ از حافظ احمد علی خاں ص[illegible] ـ [3] انتخاب یادگار ـ
[4] نظم دل افروز مسعود، دیوان تسلیم مطبع نامی لکھنؤ ۱۹۰۳ء عرضداشت بحضور نواب حامد علی خاں ص[illegible] ـ تقریباً دو سال سے بے خلل شوق آپ متصل [illegible]
[5] امیر ـ خواجہ اسد صاحب متخلص بہ قلق کو ہمراہ لائے ـ تاج الاخبار ہفتہ وار رامپور ص[illegible] مطبوعہ ۱۸ ر اگست ۱۸۶۵ء مطابق ۲۴ ر رجب ۱۲۸۲ھ

مولوی محمد حیات خاں حیات - شاگرد ذوق - ولادت ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء - ۲۰ رمضان ۱۳۰۲ھ - دسمبر ۱۸۸۴ء

صاحبزادہ کرامت علی خاں کرامت - شاگرد کرم - ولادت ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء - رمضان ۱۲۸۹ھ مطابق نومبر ۱۸۷۲ء اٹھتر سال

متذکرہ بالا فہرست سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رام پور میں دہلی اسکول کا کامل اثر تھا اور مقامی شعرا دہلوی اور لکھنوی اسکولوں کی انحطاط پذیر شاعری سے بہت حد تک محفوظ تھے۔ مومن عہدِ نواب محمد سعید خاں میں رامپور آچکے تھے، غالب جنوری ۱۸۶۰ء میں بسلسلۂ استادیٔ ناظم پہلی بار رامپور آئے۔

داغ دہلوی اول اول رام پور (آخر ۱۸۵۷ء) میں آئے، دہلی میں غدر سے پہلے اُن کی حیثیت نوخیز شعرا کی تھی، جہاں ذوق، مومن، غالب، آزردہ، شیفتہ وغیرہ کا سکہ چل رہا ہو وہاں نوجوان شعرا کو کون پوچھتا، نوخیز شعرا میں وہ ممیز ضرور تھے مگر ان میں سالک مجروح، ظہیر، انور وغیرہ بھی تھے جب یہ قلعۂ معلی کی حدود سے نکلے تو قلعہ کی زبان اور تہذیب بھی ان کے ساتھ رہی، عوام و خواص میں جلد ہی گھل مل گئے، رام پور میں تنہا داغ ہی پناہ گزیں نہ تھے بلکہ حیا، ظہیر، انور دہلوی اور تسلیم لکھنوی بھی تھے بعد کو اس مجمع شعرا میں اضافہ ہوتا رہا، امیر، اسیر، منیر، عروج، تجر، ذکی، قلق وغیرہ بھی جمع ہو گئے، نواب یوسف علی خاں ناظم[1] ابتدا میں مومن کے شاگرد ہوئے اور بعدہٗ غالب کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے، جب روہیل کھنڈ میں آتشِ غدر فرو ہوئی اور امن و سکون ہوا تو انھوں نے اپنی غزلیں بھی مشاعروں میں بھیجنی شروع کیں،[2] داغ بعد غدر جس مشاعرہ میں شریک ہوئے وہ ناظم کے داماد صاحبزادہ محمد رضا خاں کے مکان پر غالباً آغاز ۱۸۵۸ء میں منعقد ہوا تھا داغ نے یہ غزل پڑھی تھی ؎[3]

بھولے بھٹکے جو ترے گھر میں چلے آتے ہیں — اپنی تقدیر کے چکّر میں چلے آتے ہیں،

اس درمیان میں ناظم نے بعد غدر امیر اور اسیر سے بھی اصلاح لی۔ منشی امیر احمد[4] امیر مینائی رمضان ۱۲۷۵ھ مطابق اپریل ۱۸۵۹ء میں اپنے عزیز مولوی وجیہ الزماں خاں رفیق (خسر امیر مینائی ۱۸۶۰ء میں ہوئے) کی سفارش سے آئے اور مفتی عدالت دیوانی ہوئے۔ ۱۸۶۰ء میں مفتی طالب حسن ان کے بڑے بھائی آکر مفتی عدالت ہوئے اور امیر ۱۸۶۲ء میں رجسٹرار ہو گئے۔ امیر کی سفارش سے اسیر ملازم ریاست ہوئے۔

منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی شاگرد نسیم دہلوی ہنگامۂ غدر میں خیر آباد سے باغی افواج منتشر ہونے کے بعد رام پور آکر دس ماہ مقیم رہے تھے صاحبزادہ بجن خاں صاحب کے مکان پر مشاعرہ دسمبر ۱۸۵۸ء میں منعقد ہوا تھا، صدر مشاعرہ مرزا رحیم الدین حیا دہلوی تھے، حسرت موہانی[5] کا بیان ہے:- آپ رامپور کے سفر اول کے موقع پر۔۔۔۔ مشاعرہ میں شریک ہوئے جس کے صدر مقام پر شہزادہ رحیم الدین خاں دہلوی کو نواب یوسف علی خاں بہادر مغفور کے ہمنشین تھے نظر آئے، غم رکھتے نہیں، کرم رکھتے نہیں، طرح تھی آپ نے جملہ ہی یہ مطلع پڑھا

یادگارِ ہستی موہوم ہم رکھتے نہیں — صورتِ عمرِ رواں نقشِ قدم رکھتے نہیں

شہزادہ صاحب نے بے اختیار دادِ سخن دے کر پوچھا کہ آپ کس کے شاگرد ہیں جب یہ علم ہوا کہ نسیم شاگردِ مومن کے تو صاف کہہ اٹھے کہ وہی تو میں حیران تھا کہ لکھنؤ والے اس رنگ کو کیا جانیں وہاں تو انگیا کرتی کا مضمون خوب کہتے ہیں، نواب یوسف علی خاں ناظم کے عہد میں لکھنوی شعراء کو ترقی کے پورے ذرائع حاصل تھے، امیر اور اسیر نواب کے استاد تھے لیکن ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں ناظم کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں

---

[1] انتخاب یادگار - امیر مینائی ص ۔ پہلے مومن خاں صاحب دہلوی سے مشورہ رہا۔ [2] داستانِ غدر ظہیر دہلوی ص ۔ [3] صاحبزادہ صاحب موصوف کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا اور منشی امیر احمد صاحب مینائی مرحوم آکر نواب (یوسف علی خاں) کی غزل اور اپنی غزل پڑھا کرتے تھے۔ [4] جلوۂ داغ، احسن مارہروی ص ۔ [5] سوانح عمری امیر مینائی - مؤلفہ ممتاز علی آہ ص ۔ و آئینہ حسرت ص ۔ مخطوطہ۔ مفتی طالب حسن مینائی بزرگ امیر ۱۸۶۰ء میں رامپور آنا لکھتے ہیں۔ [6] "نگار" جون ۱۹۵۳ء ص ۔ و عروج عہد سلطنت انگلشیہ جلد تتمہ حصہ سوم ص ۔ ۸ ر نومبر ۱۸۵۸ء جبکہ حسن کو شکست ہوئی دوبارہ رام پور آئے ص ۔

خلد آشیاں تخت نشین ہوئے انھیں اپنے اسلاف سے زیادہ مشاہیر ہند کے جمع کرنے کا شوق رہا۔ اب منیر، عروج، تجر، قلق وغیرہ یہاں جمع ہو گئے۔ شمس العلماء مولوی عبدالحق خیرآبادی، میر عوض علی عدیل خوشنویس، حکیم محمد ابراہیم لکھنوی وغیرہ ہر فن کے باکمال دربار رام پور میں آ گئے، اس سلسلہ میں خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کا بیان[۱] دربار میں لکھنوی تفوق کو ظاہر کرتا ہے:۔

"نواب مخزن الدولہ بہادر فرماتے ہیں کہ نواب کلب علی خاں کے دربار میں ہم مدت تک رہے ہم اس کے برابر علمی اور ادبی حیثیت سے کسی ریاست کو نہیں سمجھتے، حق تو یہ ہے کہ رئیس شریف پرور تھا۔۔۔۔ مچھی بھون کے قلعہ میں دربار ہوتا تھا اور گول گھر میں نواب کا نوازی پلنگ طلائی پاؤں کا بچھا ہوتا تھا اس پر آپ تشریف فرما ہوتے تھے گرمیوں میں محض ابری کے چوکے پر اور جاڑوں میں دری چاندنی، اونی قالین کے فرش پر عہدیداری لوگ بیٹھتے تھے۔ نواب کے داہنی طرف نواب حیدر علی خاں بہادر۔ نواب امداد الدولہ۔ نواب مفتاح الدولہ اور حقیر، اُسکے بعد نادر شاہ خاں صاحب، عبداللہ خاں صاحب، بائیں طرف اصغر علی خاں صاحب بہادر۔ منشی منیر۔ آفتاب الدولہ قلق۔ منشی امیر احمد اور کوتوال شہر دست بستہ چوبدار کھڑے ہوتے تھے ڈیوڑھی کے اندر شاہی قاعدہ کے موافق لال پردہ باناتی پڑا ہوتا تھا سلام کرانے کو مردھا ساتھ آتا تھا۔"

گو یہاں لکھنوی شعرا کو عروج حاصل تھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اُستادانِ لکھنؤ نے نواب کلب علی خاں کی پوری حمایت کے باوجود میدانِ سخن میں شکست تسلیم کر لی، داغ[۲] دہلوی کی یہ جیت رام پوری اسکول شاعری کے باعث ہوئی۔

لکھنوی اور دہلوی اسکولوں کی بحث بڑی دلچسپ ہے، حامیانِ لکھنؤ اپنی فتح بتلاتے ہیں اور دہلوی حضرات اپنی جیت قرار دیتے ہیں۔ رام پوری شعراء اور رام پوری باذوق سامعین دونوں فریقوں کی نظر سے غائب رہے، یہ بحث نواب کلب علی[۳] خاں کے دربار میں بھی ہوتی تھی کہ دہلوی زبان بہتر ہے یا لکھنؤ کی، دونوں فریقوں کے شاگردوں میں بھی نوک جھونک جاری رہتی، بہرحال فیصلہ مشاعرہ میں ہوتا جہاں خواص اور عوام دہلوی اسکول کے نمائندہ داغ دہلوی کو قبولیت عام کا سرٹیفکٹ عطا کرتے۔ اب احسن صاحب کی رائے اس ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:۔

"ہم نے بعض ناواقفوں کے ایسے خیالات فاسد بھی سُنے ہیں کہ مرزا صاحب نے رام پور میں رہ کر اور شعرائے لکھنؤ کی صحبت پاکر اپنے اسلاف اور اپنے شہر کی طرز چھوڑ دی اور بالکل لکھنؤ کے مقلد ہو کر، وہیں کی بندشیں وہیں کے چوچلے، وہیں کے استعارے غرضکہ وہیں کی روش اختیار کر لی ہے۔۔۔۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ جس اہلِ زبان اور زباں داں نے ابتدائے عمر سے ۳۰ - ۳۲ برس تک اپنی جگہ پر مشقِ سخن کی ہو وہ دوسری جگہ جا کر یکایک اپنی مادری زبان سے ایسا ناآشنا ہو جائے کہ اپنے مقلدوں کی تقلید کرنے لگے بفرضِ محال اگر یہ دعویٰ مان بھی لیا جائے تو یہ بات دکھانی چاہئے کہ مرزا صاحب نے اہلِ لکھنؤ کی کیا پیروی کی ہے اور کس قسم کی تقلید فرمائی ہے کہا رام پور جانے سے پہلے جس طرز میں مرزا صاحب فرماتے تھے اُس کے خلاف طرز اختیار کی یا لکھنؤ کے مخترعات و تصرفات اپنے کلام میں داخل کر لئے۔۔۔۔ ناسخ نے جدت کی لیکن دہلی نے تقلید نہیں کی، تمام اہلِ دہلی اپنی اپنی جگہ قدیم و جدید سب محاورے استعمال میں لاتے رہے ثقات شعرا میں اس کا زیادہ لحاظ رہا اور وہی وقتاً فوقتاً ترمیم اور متروک کرتے رہے"[۴]

اب حامیانِ لکھنؤ اسکول کی سُنئے لطیف احمد[۵] اختر مینائی خلف امیر لکھتے ہیں:۔

دربار رام پور

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ امیر کے دیوان دوم کا جو رنگ ہے وہ پہلے دیوان کا نہیں ہے اور اُس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ دربار رام پور میں اجتماع شعرا ہونے سے اہلِ دہلی کا اہلِ لکھنؤ پر اثر پڑا اور حضرت امیر نے داغ کا رنگ اختیار کیا یہ کہنا

---

[۱] رسالہ زمانہ جولائی ۱۹۱۱ء ـــ [۲] جلوۂ داغ صفحہ ۔ امیر کا یہ مقولہ سنا گیا ہے کہ وہ کلام پسندیدہ ہے جو مشاعرہ سے باہر جائے۔۔۔۔ انھیں کا قول تھا کہ میں نے اکثر مرزا داغ ہی کا شعر باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔

[۳] خمخانۂ جاوید جلد سوم۔ صفحہ بحث تذکیر و تانیث ساکن ـــ [۴] جلوۂ داغ صفحات ۲۴ تا ۲۹

[۵] سوانح عمری امیر مینائی۔ الاچھتین صفحات ۲۰ تا ۳۰

صحیح نہیں ہے بلکہ واقعہ اس کے برعکس ہے اور وہ یہ ہے کہ دربار رام پور میں بہ عہد نواب خلد آشیاں لکھنؤ کے شعرا بہ کثرت موجود تھے امیر، اسیر، جلال، بحر، قلق، منیر، ذکی، عروج، تسلیم، شرف، جان صاحب وغیرہ اور دہلی کے صرف فصیح الملک داغ تھے اور ایک صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا[۱] تھے جن کی کوئی نمود نہ تھی فطرت کا مقتضا ہے کہ انسان جس سوسائٹی میں رہتا ہے اُسی رنگ میں رنگ جاتا ہے نسیم دہلوی کا رنگ شاعری اس کا شاہد ہے جو لکھنؤ میں جاکر رہے تھے اسی طرح رام پور کی زبردست سوسائٹی کا اثر داغ پر ہونا لازم تھا، اور ہوکر رہا خصوصًا حضرت امیر کی صحبت سے جناب داغ نے معتدبہ فایدہ اُٹھایا، زبان کی صفائی میں کلام کی چستی اسی کا نتیجہ ہے، دہلی کی شاعری قابل تعریف مسلّم، مگر اُس میں صفائی نہیں ہے، مضامین اندھیری رات میں جگنو کی طرح چمک جاتے ہیں بخلاف اُس کے لکھنؤ کی شاعری ایسی ہے جہاں روشنی ہی روشنی ہے ---- نواب خلد آشیاں لکھنؤ کی زبان اور شاعری کے دلدادہ ہی نہ تھے بلکہ اس میں اُن کو انتہا کا غلو تھا سوا شعرائے لکھنؤ کے کسی کو شاعر نہیں سمجھتے تھے اُن کے دربار میں دلّی کی شاعری کا ذکر جرم سمجھا جاتا تھا ---- مرزا داغ کو زمرۂ شعرا میں نہیں رکھا بلکہ ریاست کے بعض کارخانوں پر مامور فرمایا تھا، انتہا یہ ہے کہ نواب صاحب نے حضرت امیر ایسے بے نفس اور صلح مشرب کو یہ کہنے پر مجبور کیا ؎

دعوئ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے،

دیوان دوم محض ایک رنگ میں ہے اور دیوان اول میں بمقتضائے دور ناسخ اور رنگ کے اشعار بھی ہیں - مولانا عبداللہ العمادی نے سوانح عمری امیر[۲] (مؤلفہ ممتاز علی آہ) کے دور میں اساتذۂ دہلی کے کلام پر تنقید کر کے دل کی بھڑاس نکالی ہے"۔

بات اتنی ہے کہ داغ نے لکھنؤ سے سیکھا یا امیر نے داغ کی تقلید کی یہ دونوں حضرات اس مسئلہ میں خاموش رہے لیکن انکے حامیوں میں ادبی جنگ جاری ہوگئی مکاتیب[۳] امیر کے مقدمہ میں احسن اللہ خاں ثاقب نے محاکمہ کیا ملاحظہ ہو :-

"جناب امیر کو اگرچہ مرزا داغ کے مقابلہ میں شہرت کم ہوئی لیکن معنی یاب طبایع میں اُنھیں کا کلام مقبول ہوا، دیوان اول اسیر و ناسخ کے رنگ میں ہے ----حضرت کی طبیعت میں جدت کم ہے اور کلام میں سوز و گداز بھی، البتہ شکوہ الفاظ، متانت بیان اور شاعرانہ لطافت ان کے اشعار میں ایسی ہے کہ جو داغ کے کلام میں نہیں پائی جاتی وہ اصناف سخن میں قادر اور استاد ماہر ہیں قصائد باشوکت و فرہیں اور سخنور با سرمایہ صاحبِ علم و فضل ہیں داغ ان اوصاف سے معرا ہیں ---- آخر عمر میں استاد نے داغ کا رنگِ کلام اور قبول عام کو دیکھ کر زبان کی صفائی اور تاثیر کے پیدا کرنے میں کوشش کی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہوئے تاہم صنم خانۂ عشق کی جلوہ آرائی گلزار داغ کی شادابی کو نہیں پہونچی، یہ واقعی بات ہے کہ امیر کی استادی میں کلام نہیں کرسکتا، لیکن اسیر کا تلمذ، اساتذۂ لکھنؤ کی ہم بزمی، اہل لکھنؤ کے کلام کا پیش نظر رہنا، پھر لکھنؤ کی صحبت کا اثر یہ سب امور مانع ترقی و کامیابی ہوئے اگر وہ دلّی میں پیدا ہوتے، دلّی کے ارباب کمال کی ہمنشینی میسر آتی، اساتذہ دہلی کا کلام سامنے رہتا اور شاہجہاں آباد کی سوسائٹی سے مستفید ہوتے تو وہ سخنور بے مانند اور استاد ارجمند ہوتے ---- مرزا داغ مرحوم کی شوخ طبیعت نے ایک ایسا رنگ اختیار کیا جس کو غزل کی جان اور اُردو شاعری کی روحِ رواں کہنا سراسر انصاف ہے"۔

ثاقب کے محاکمہ میں اگرچہ غیر جانبداری برتنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن پھر بھی داغ مرحوم کی شاعری کو سرمایۂ ادنیٰ جذبات و خیالات کہنا نا انصافی ہے۔

---

[۱] گلستان سخن - مرزا قادر بخش صابر ص۲۰۲ :- مرزا رحیم الدین حیا ... سبحان اللہ سخن اعجاز سے ہم پہلو اور معنی سحر سے دوبدو .... دلنشینی سخن ایسی کہ ہنوز لب سے آشنا نہیں ہوا کہ طبیعت سامع میں جا بیٹھا - ص۹۲ داستان غدر میں انکے متعلق ظہیر دہلوی لکھتے ہیں :- کہ انکا کلام پایۂ استادی سے ہم پایہ تھا - [۲] سوانح امیر مقدمہ ص۵ - [۳] مکاتیب امیر طبع ثانی - مطبع ادبیہ لکھنؤ ۱۹۲۴ء صفحات ۷۵ تا ۷۶

لکھنؤ اور دہلی اسکول کی آخری نمائندگی شہرتِ عام اور میلانِ خواص کی بنا پر انشاؔ، رنگینؔ، ناسخؔ، آتشؔ اور شاہ نصیرؔ پر منحصر تھی لیکن خواص میں ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو اس بگڑے ہوئے مذاق کو پسند نہیں کرتا تھا۔ مصحفیؔ[۱] نے ناسخؔ اور نصیرؔ دونوں کے رنگِ سخن پر تنقید کی ہے۔

مصحفیؔ کا ناسخؔ اور متبعانِ ناسخؔ پر یہ اعتراض کہ غزل کو قصیدہ بنا دیا صحیح ہے۔ واردات عشق و محبت کے لئے شیریں لہجہ اور سوز و گداز ہونا ضروری ہے لیکن تلاش معانی تازہ میں غزل کا حسن جاتا رہا، رہے شاہ نصیرؔ تو انھوں نے آبروؔ اور تاجیؔ وغیرہ کے رنگِ سخن کو دوبارہ حیاتِ نو بخشنا چاہی لیکن ممنونؔ، آزردہؔ، مومنؔ، غالبؔ وغیرہ کے سامنے ان کا چراغ نہ جل سکا اور دہلی کی شمعِ سخن روشن ہی رہی۔
لکھنؤ میں سوزؔ اور سوداؔ پہلے پہونچ چکے تھے لیکن سوداؔ نے عمر کا باقی حصہ بھی قصیدہ گوئی اور ہجو نگاری میں گزار دیا اور لکھنؤ میں اپنا کوئی جانشین نہ چھوڑا، سوزؔ کی طرز آصف الدولہ کی استادی کے باوجود بھی لکھنؤ پر گہرا اثر نہ ڈال سکی۔ سنہ ۱۱۹۶ھ[۲] میں میرؔ بھی دہلی سے پہونچ گئے اور سنہ ۱۱۹۸ھ[۳] میں مصحفیؔ نے بھی مستقل سکونت لکھنؤ کی اختیار کرلی۔ لیکن میرؔ کی خلوت پسند طبیعت کے باعث عوام تو درکنار خواص بھی اُن کے فیضِ سخن سے محروم رہے۔ حسرتؔ سے زیادہ اُس کے شاگرد جرأتؔ نے اس عہد میں شہرتِ عام حاصل کی، میر حسنؔ مثنوی کے اہل قرار پائے غزل میں وہ بھی کوئی اثر نہ پیدا کرسکے، انشاؔء کو ہر رنگ میں کہنے کا دعوی تھا لیکن اُن کی ہمہ دانی بھی خلعت قبولیتِ عامہ نہ دلا سکی، مصحفیؔ[۴] جو اپنی زندگی میں قائمؔ سے متاثر نظر آتے ہیں اُنھوں نے جرأتؔ کا بھی مقابلہ کیا اور انشاؔء کا بھی اُن کے شاگرد ہر طبقہ میں تھے مگر جرأتؔ کی سی مقبولیت نصیب نہ ہوسکی جو امیروں کی بزم میں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا اور عوام کا بھی محبوب شاعر تھا۔ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ میرؔ اور سوداؔ، دردؔ اور سوزؔ، قائمؔ اور یقینؔ نے جو سوسائٹی پائی تھی وہ کہاں میسر آسکتی تھی مرزا مظہر جان جاں اور سراج الدین علی خاں آرزو کی سرپرستی اور رہنمائی میں ریختہ گوئی نے معراج کمال پائی، ان میں سے ہر ایک حافظ و فغانی، کلیم و صائب، طالب و بیدل ریختہ گوئی میں تھا ان کے سامنے فارسی اساتذہ کا کلام تھا اور مبصر آرزو اور مظہر جیسے تھے، مصحفیؔ، انشاؔ، جرأتؔ، رنگینؔ وغیرہ کو یہ بات کیسے میسر آسکتی تھی ہر ایک نے اپنا رنگ علٰحدہ پیدا کیا، جرأتؔ کی طبیعت میں شوخی تھی اُسنے دہلی کی اُردوئے معلّٰی میں واردات عشق و محبت کی ترجمانی سوسائٹی کی صحیح عکاسی کے ساتھ کی، عوام و خواص نے سر آنکھوں پر جگہ دی میرؔ نے اس چوما چاٹی کو پسند نہیں کیا یہ میرؔ کی پسند تھی، مصلحت یہ تھی کہ مختلف طرزوں میں سے کوئی ایک طرز پسند کی جاتی، قائمؔ چاند پوری مولد رام پوری مسکن و مدفن نے اپنے شاگرد شاہ کمال کمالؔ کو صحیح رائے دی "میاں[۵] قلندر بخش جرأتؔ در سخن سنجاں نظیرے و در معنی آفرینیاں عدیلے ندارد"۔۔۔۔ مصحفیؔ نے بھی بہت جلد اپنا اعتبار لکھنؤ میں پیدا کرلیا، میرؔ نے ان کے شعر پر داد دے کر معاصرین میں ہمت افزائی کی، ان کا رنگِ سخن دہلی اسکول ہی کا ترجمان رہا۔ اب تک دہلی اُجڑ رہی تھی اور لکھنؤ بس رہا تھا، شاہ عالم کا زوالِ حکومت، اودھ کی ریاست کے لئے باعثِ فروغ رہا، پہلے دہلی کا ہر متوسل اودھ میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا لیکن دہلی کے مسلسل انحطاط سے حکومت اودھ نے فائدہ اُٹھایا اور نواب سعادت علی خاں کے عہد میں اس کا چرچا دربار میں بھی ہونے لگا۔
"دریائے لطافت[۶]" لکھ کر انشاؔ نے لکھنوی اسکول کی مستقل بنیاد رکھدی، میرؔ اور سوزؔ کی زبان غیر فصیح قرار دی گئی، دہلوی مولد ہونا بھی

---

[۱] ریاض الفصحا۔ صفحات علی الترتیب ۲۵، ۲۳، ۲۴۳ و ۲۴۲ — [۲] ذکر میر۔ ص ۱۳۹ بمجرد دیدن خط برخاستم و روانہ لکھنؤ شدم۔
[۳] عقد ثریا۔ مصحفی ص ۵۱ در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و ہشت صعوبت سفر کشیدہ از شاہجہاں آباد در لکھنؤ رسیدہ۔
[۴] تذکرہ ہندی۔ ص ۲۴۱ در پختگی کلام و چستی مصراع غزل و روئے قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ روش جدوش استادی می رود بلکہ در بعض مقام غلبہ می جوید — [۵] مجمع الانتخاب دیباچہ (مخطوطہ انجمن ترقی اُردو ہند) مولفہ شاہ محمد کمال کمالؔ شاگرد قائمؔ و جرأتؔ
[۶] دریائے لطافت۔ طبع مراد آباد۔ صفحات ۱۲ تا ۶۶

قابلِ اعتماد نہ رہا۔ زبان دانی کا معیار برائے نام قلعۂ معلّٰی دہلی اور دو ایک محلے قرار پائے لیکن غازی الدین خاں عماد الملک باوجود اپنے علم وفضل اور سکونت دہلی کے نواب سعادت علی خاں والی اودھ کے روبرو جاہل، اور خواجہ میردردؔ اور مرزا مظہرجانِ جاناں فصحائے دہلی باوجود دہلوی مولد اور مسکن ہونے کے ناقابلِ اسناد قرار پائے البتہ باخبر جوانانِ اودھ کی زبان بمقابلہ اہالیان دہلی مقیم لکھنؤ مستند قرار پائی۔

اب کیا تھا نوخیز شعرائے لکھنؤ نے ناسخؔ کی قیادت میں دہلی سے علمِ بغاوت بلند کیا، الفاظ کی تراش خراش شروع ہوئی، بجائے سوزوگداز کے غزل میں مضامین بلند اور معانی تازہ نے دخل پایا اور معشوق کے خارجی اوصاف لباس و سرمہ، مسی، محرم، موباف، دوپٹہ اور چشم ولب و دہن و بازو وسینہ سے گزر کر نازک سے نازک مسایل وصال تک معیارِ سخن بلند ٹھہرے، شاہ حاتمؔ، سوداؔ، میرؔ، یقینؔ، مظہرؔ، دردؔ، سوزؔ، قایمؔ ایہام کی بھول بھلیوں سے نکل کر جو معیارِ سخن قایم کر چکے تھے وہ مسترد ہوا اور پھر رعایت لفظی پر معانی نازک لطیف قربان ہونے لگے۔

جراتؔ و میرؔ (وفات ۱۲۲۵ھ) رخصت ہو گئے تھے، انشاؔ و مصحفیؔ تماشا دکھانے والوں میں تھے اور مصحفیؔ خود تماشا تھے جو اس جدید بزمِ سخن کو دیکھتا، مرعوب ہو جاتا، شاہ نصیرؔ لکھنؤ آکر قفس کی تیلیوں میں پھنس گئے مگر دہلی کو اس بگڑتی ہوئی حالت میں میر نظام الدین ممنونؔ خلف قمرالدین منتؔ نے سنبھالا (متوفی ۱۲۶۰ھ) ان کے شاگرد مفتی صدرالدین آزردہؔ کا مکان دہلی کے علماء اور ادبا کا مرکز تھا یہیں بیٹھ کر غالبؔ نے طرزِ بیدل میں ریختہ سے توبہ کی اور یہیں مومنؔ نے ..... عشق و محبت کے مضامین کو معانی بیگانہ میں ادا کرنے کی روش ممنونؔ کی روش پر پیدا کی، مومنؔ کے شاگرد شیفتہؔ اور تسکینؔ دہلی میں صفِ اول میں شمار ہوتے تھے اور عباس علی خاں بیتابؔ رامپوری بھی نوجوان خوش گو شعرا میں داخل تھے، داغؔ نے کمیِ تعلیم کے باعث غالبؔ و مومنؔ کی پیروی دشوار سمجھی، رہی زبان سو وہ انھیں قلعۂ معلّٰی سے تحفہ میں ملی تھی، عشق و محبت کی جیتی جاگتی تصویریں عالمِ طفلی سے اُن کی نظروں سے گزر رہی تھیں، سوسائٹی کا یہی رنگ رامپور میں قایم تھا[1] نواب کلب علی خاں موسیقی کے دلدادہ تھے ان کے دربار میں طوائفیں بھی تھیں اور موسیقی کے ماہرین بھی، داغؔ نواب کلبِ علی خاں کے ملازم ہی نہ تھے بلکہ مصاحب خاص بھی تھے، حج کے بعد بھی ایسے مشاغل سے دست کشی نہ نواب صاحب نے اختیار کی نہ داغؔ نے، داغؔ اپنے احباب اور شاگردوں سے برادرانہ ملتے تھے، حجابؔ کی[2] داستانِ عشق میں اُن کے راز دار اور چارہ گر شاگرد بھی تھے۔

میاں نظام شاہ نظامؔ جو رنگ جراتؔ کے خاتم میں اُن کا رنگِ کلام اور قبولیت عام فصیح الملک کی صحیح رہبر تھی، احمد علی رساؔ شاگرد بیمارؔ رام پور میں امیرؔ مینائی کے مدمقابل تھے انتخاب یادگار میں رساؔ اور امیرؔ کے شاگردوں کی تعداد مساوی ہے وہ لکھنؤ اسکول کے فریقِ مخالف اور رامپوری اسکول کے ترجمان تھے (جو دہلوی اسکول شاعری کی شاخ ہے) فصیح الملک نے اپنی علمی کمی کو مولوی ولی محمد خاں تسبلؔ رامپوری سے پورا کیا تھا۔ در اصل رام پور میں مقابلہ داغؔ اور لکھنوی اساتذہ کا نہ تھا بلکہ مقابلہ لکھنوی اسکول اور رام پور[3] کی اسکول کا تھا۔ صاحبزادہ مہدی علی خاں نحیفؔ شاگرد[4] بیمارؔ و رساؔ رام پوری، نواب احمد علی خاں رندؔ کے داماد شوہر شمسہ تاجدار بیگم تھے۔

سلہ گلشنِ بے خار۔ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۴ء صلا ۔ "اعتقادِ من ہونے کہ بے شرفِ مجالستِ ایشاں بپایاں آید دخل ایام عمر ہست۔ سلہ اخبار الصنادید جلد ۲ صفحہ ۱۰۲ ۔ مغنیوں کے سوا ایک گروہ طوائفوں کا تھا جن سے نواب صاحب کے جلسوں کی زینت تھی ۔ سلہ مثنوی فریادِ داغ ص۲۲ ۔

"میرے قمر ہو جا کے لائے انھیں" "یعنی کچھ بغیر آئے انھیں" صلا پٹنہ اسٹیشن پر سے "مجھ کو یہ فکر تھی کہ بیٹھ چکے" "میرزا شاغل آئے جب وہ بیٹھے"

سلہ کمال وکاظ ۔ پروفیسر حامد حسن قادری ص۳ مقدمہ ۔ شعرائے رام پور سے وادلینی تھی ۔ ھہ سوانح عمری امیرؔ مینائی ۔ از جلیل ص۲۳ شہر میں یوں تو اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے مگر ایک مشاعرہ خاص صاحبزادہ مہدی علی خاں کے یہاں مسلسل ہوتا تھا و مشاعرہ سرکاری کہا جاتا تھا جو خاص امیرؔ کی نگرانی میں منعقد کیا جاتا تھا۔

اُن کی باقاعدہ ریاست سے مقدمہ بازی رہی کہ حق ریاست شمسہ تاجدار بیگم کا ہے، ان کے مکان پر بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی بہت سیر چشم رئیس تھے ان کے بیٹے صاحبزادہ محب علی خاں عرف تبا صاحب سے بھی مقدمہ بازی رہی، اسی طرح صاحبزادہ کاظم علی خاں اور صاحبزادہ حیدر علی خاں سے نزاع رہا، غرض گھر گھر مسند ریاست بھی تھی جہاں مقامی شعرا کی پرستش ہوتی اور رائے عامہ آزاد تھی۔ سید احمد علی ترسا اور سید نظام شاہ نظام رام پوری شاگردان بیمار جو ہم وطنی میں ماخوذ ہوکر دربار سے دور رہے، ان کی پوچھ کچھ مقامی رؤسا اور خانزادی کرتے، نظام کو سواروں کی ملازمت میں اتنے پیسے بھی ہاتھ نہ آتے تھے کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی کرسکتا اصغر علی خاں جنرل فوج رام پور سے استدعا کرنے پر مجبور ہیں[۲] ؎

اُدھر ہے یہ اجازت ہمتِ عالی کی کہہ مطلب　　ادھر مانع حیا دشوار دل میں آرزو لانا
مگر کیا کیجئے شادی ہے اس عاجز کی بیٹی کی　　عنایت ہو تری تو سہل ہے اس غم سے چھٹ جانا

مدارالمہام محمد عثمان خاں (متوفی ۱۲۹۰ھ) سے استدعا کرتے ہیں کہ اسامی اسپ سرکار سے ملی ہے مگر رقم خریداری اسپ میرے پاس نہیں ہے دس روپے قدیمی تنخواہ ہے رقم جو سود پر مل رہی ہے وہ پہلے قرضہ سے سود وضع کرنا چاہتے ہیں ؎

جمع سے سود کاٹنا اندھیر　　حق نہ دکھلائے ایسی تو دوکاں
قرض کل مجھ پہ تین سو پچاس　　اور جو کچھ سود ہو سوائے آں

داغ شعرائے دربار رام پور سے متعلق تھے وہ منکسرالمزاج، ملنسار اور زمانہ کا گرم و سرد دیکھے ہوئے تھے، وہ نواب کلب علی خاں کے استاد نہ تھے مصاحب تھے، وہ مفتی عدالت نہ تھے بلکہ کارخانجات ریاست کے افسر تھے جس کا تعلق شاگرد پیشہ یا عام طبقۂ آبادی سے تھا وہ فراش خانہ میں بیٹھ کر سرکاری کام کرتے، احباب سے ملتے اور شاگردوں کو اصلاح بھی دیتے، اُن کے مکان پر ہر کس و ناکس بلا تکلف آسکتا تھا۔

لکھنوی شعرا خواہ اسیر ہوں یا منیر، بحر ہوں یا قلق، عروج ہوں یا امیر معقول مشاہرہ پاتے، ان میں سے ہر ایک ایکسو روپیہ ماہوار یا اس سے زیادہ مشاہرہ کسی خدمت یا شاعری کے نام پر پاتے، اودھ کی حکومت کی بہار دیکھے ہوئے تھے رام پور جیسی غریب بستی کے لوگ ان کی نظروں میں کیا جگہ پاتے ہاں جو ان سے قریب ہوا وہی آگے بڑھا، منشی امیر اللہ تسلیم تیس چالیس روپے سے آگے نہ بڑھ سکے اپنے شاگردوں کے مکانوں پر مقیم رہے شہر میں عام شناسائی کے بدولت یہ بھی عوام کے شاعر رہے اور شہرت پائی جلال اپنے شاگرد محمد شاہ خاں کاوش کے مکان پر رہتے تھے اس لئے زیادہ عوام سے قریب رہے، یہ بھی لکھنؤ سے ہٹ کر چلنے پر مجبور ہوئے اور جتنا عوام سے دور رہے اتنا ہی قبولیت عام سے محروم رہے اگر امیر مینائی داغ کے ہمنوا نہ ہوتے تو اسیر اور منیر، عروج وغیرہ کی طرح گمنام ہوجاتے لیکن داغ کی ہندوستان گیر شہرت دیکھ کر اپنا رنگ سخن بدلنا ہی پڑا، داغ کے طرفدار رام پور کے تمام عوام و خواص تھے اور لکھنوی شعرا کے حامی و مددگار رئیس وقت، نتیجہ یہ ہوا کہ جیت داغ کی رہی، ہر چند داغ کی تلاش خواش لکھنؤ میں زیادہ ہوئی اور دہلی میں کم مگر محاورات اور روزمرہ میں لکھنؤ دہلی کا مقابلہ نہ کرسکا، اور داغ کی کامیابی کا یہی راز تھا۔

کلب علی خاں فائق رامپوری

---

[۱] اخبار الصنادید جلد دوم ۔ ص۱۱۸ و ص۱۲۰ نواب یوسف علی خاں کو ایام غدر میں محافظ "کرشتان" کہتے اور چارج میں دے کر پہرہ کی تبدیلی کرتے ۔ ص۱۱۹ مولوی غلام جیلانی خاں رسالدار نے نواب فیض اللہ خاں سے کہا کہ کل اس گدی پر آپ نہ ہوں گے یوسف ہوگا مند ہوگا (املائی تبدیلی) ۔ [۲] کلیات نظام مطبوعہ صفحہ ۲۷۰ و ۲۷۱

وادیٔ کشمیر کی تاریخ پر سرسری تبصرہ

اس وقت کشمیر نے ہندوستان و پاکستان کے درمیان نزاعی مسئلہ کی صورت اختیار کرکے بڑی اہمیت حاصل کرلی ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے تاریخی حالات مختصراً قلمبند کردئے جائیں جن سے اکثر حضرات ناواقف ہیں
(ادارہ)

وادیٔ کشمیر سے وہ جھیلوں والا حصۂ زمین مراد ہے جسے دریائے جہلم اور اس کے باجگزار دریاؤں (خصوصاً دریائے سندھ اور لیدر) نے انسانی آبادی اور کاشت کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

یہ وادی کب اور کیونکر آبادی کے قابل ہوئی، اول اول یہاں کونسی قوم آباد تھی، کس کی حکومت تھی اور یہاں کے موسمی حالات میں آہستہ آہستہ کیا تغیرات رونما ہوئے، اس کا علم ہمیں حاصل نہیں، لیکن پچھلے دو ہزار سال کا حال جو کچھ معلوم ہوسکا ہے وہ یقیناً تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

جن ذرایع سے کشمیر کے تاریخی حالات پر روشنی پڑتی ہے ان میں سب سے زیادہ اہم کلہان کی راج ترنگینی ہے۔ یہ ایک مثنوی ہے جو بارھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی اور جسے اسٹین (Stein) نے اپنے ترجمہ کے ساتھ شایع کیا۔ دوسرا ذریعۂ معلومات چینی سیاح ہیوان چوانگ کے بیانات ہیں یہ سیاح ساتویں صدی عیسوی میں کشمیر آیا تھا۔ اس کے علاوہ البیرونی کی کتاب، ابوالفضل کی آئین اکبری، تزک جہانگیری اور اورنگ زیب کے فرانسیسی طبیب برنیر کے بیانات سے بھی یہاں کی تاریخ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

ان ذرایع کے علاوہ دوسرا ذریعۂ معلومات یہاں کے قدیم دریافت شدہ سکے ہیں جن سے چھٹی صدی عیسوی سے لیکر عہد مابعد تک کے بہت سے افتخالی، ہندو، مسلمان اور سکھ بادشاہوں کے ناموں کا پتہ چلتا ہے۔

وادیٔ کشمیر کی یہ خصوصیت کہ دنیا کے بڑے بڑے مشہور فاتحین میں سے کسی کی رسائی یہاں تک نہ ہوسکی، نہایت عجیب خصوصیت ہے۔ اسکندر اعظم، چنگیز، تیمور، بابر میں سے کسی کے قدم یہاں نہیں پہونچے، محمود غزنوی نے بیشک ایک بار ادھر کا رخ کیا تھا لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوسکا۔

بطلیموس سے قبل کوئی کلاسکل ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے کشمیر کے حالات پر روشنی پڑتی ہو، کیونکہ سکندر اعظم کے عہد کے مورخین نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا۔

سب سے پہلے بطلیموس نے دوسری صدی عیسوی میں بتایا کہ کشمیر میں ایک بڑی زبردست حکومت قائم ہے جو حدود وادی کے علاوہ دور دراز حصوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ بطلیموس نے جس حکومت کا ذکر کیا ہے وہ حقیقتاً کوشانوں کی حکومت تھی جو اس وقت شمالی ہند تک وسیع تھی۔

وہ اس کا نام کسپیریا لکھتا ہے (یہی لفظ بعد کو کشمیر ہوگیا) اور چونکہ اس کی جائے وقوع وہ جہلم، چناب اور راوی کے منبعوں کے نیچے بتاتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ وہ وادیٔ کشمیر کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوسکتا)

اس سے قبل کے حالات کا زیادہ صحیح علم نہیں تاہم یہ یقین کرنے کے اسباب موجود ہیں کہ مسیح سے ۲۵۰ سال قبل کشمیر اشوک کی قلمرو میں شامل تھا۔

چندر گپت (اشوک کے دادا) نے سکندر اعظم کے نائب سلیوکس کو شکست دیکر ایک بہت بڑی حکومت قایم کرلی تھی اور جب اشوک نے بودھ مذہب اختیار کیا تو اس وقت کشمیر بھی اس کی قلمرو میں شامل تھا۔ ہرچند وادیٔ کشمیر میں اشوک کے ستون یا لاٹ (جن پر اس کے احکام منقوش ہوتے تھے) اس وقت تک دستیاب نہیں ہوئے، لیکن مانسہرہ اور ہزارہ کی وادی میں ضرور اس کا پتہ چلتا ہے۔ ہیونگ چوان چینی سیاح کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وادیٔ کشمیر میں بھی اشوک نے بودھ کی یادگار میں چار اسٹوپا قایم کئے تھے اس کی تصدیق راج ترنگینی سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ اشوک نے یہاں متعدد اسٹوپا تعمیر کئے تھے اور ایک شہر سری نگری کے نام سے قایم کیا تھا جو موجودہ سری نگر سے تین میل دور پانڈرِ تھان مندر کے چاروں طرف آباد تھا)

اس کے بعد کنشک، ہوشک اور جشک تین فرمانرواؤں کے زمانہ کی روایات زیادہ واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ چینی اور بودھی ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ راجہ کنشک نے ایک بہت بڑا اجتماع بودھ مذہب والوں کا کیا تھا جس کا زمانۂ انعقاد بودھ کے ۴۰۰ سال بعد (یعنی قبل مسیح پہلی صدی میں) میں قرار پاتا ہے۔

کوشان خاندان کی حکومت کو جب زوال آیا تو یہاں کی حکومت مختلف چھوٹے چھوٹے سرداروں میں بٹ گئی یہاں تک کہ چھٹی صدی عیسوی میں افتھالیوں (سفید فام ہن Huns) نے اس پر قبضہ کرلیا۔

اس قبضہ کی داستان یہ ہے کہ افتھالیوں نے پہلے مغرب کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کیا تھا اور ان کا فرمانروا مہرا گولا ۵۲۰ء میں سیالکوٹ پر قابض ہوگیا تھا جب چینی سیاح سونگ یون یہاں آیا تو مہرا گولا نے کشمیر پر چڑھائی کر رکھی تھی لیکن یہ مہم غالباً ختم ہوگئی تھی کہ وسط ہند میں اس کو شکست ہوئی اور اس کے بعد اس نے کشمیر میں اپنے پاؤں آہستہ آہستہ جمالئے۔ اس کے بعد اس نے اپنے بھائی پر حملہ کیا جس نے اس کی راجدھانی گندھارا (قندہار) پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس مہم میں مہرا گولا کو ناکامی ہوئی اور اس کے بھائی کے فوجی افسر یسودھرمن نے اس کا تعاقب کشمیر تک کیا اور اپنے نام کا سکہ بھی جاری کیا۔ مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مہرا گولا کی حکومت کشمیر میں بدستور قایم رہی کیونکہ اس کے دو جانشینوں (لکھن گلا اور تورمان) کے نام کے سکے کشمیر میں پائے گئے ہیں۔

یوان چوانگ کا بیان ہے کہ مہرا گولا ظالم فرمانروا تھا اور بودھ مت والوں کو بہت ستاتا تھا۔ یہ چینی سیاح مہرا گولا کے زمانہ میں نہیں آیا تھا بلکہ اس کے بعد غالباً درلابھا کے زمانہ میں آیا تھا جو کارکوٹک خاندان کا بانی تھا اور جس کے عہد میں ۱۰۰ خانقاہیں بودھ مت کی یہاں پائی جاتی تھیں۔ اس کے تھوڑے زمانہ بعد ہی راجہ ہرش (والیٔ قنوج) نے کشمیر پر حملہ تو نہیں کیا لیکن بودھ کا دانت جو یہاں ایک خانقاہ میں محفوظ تھا حاصل کرلیا۔

ساتویں صدی میں چین و کشمیر کے تعلقات زیادہ گہرے رہے یہاں تک کہ چین اور کشمیر کے درمیان سفارتی تعلقات قایم ہوئے جو ۷۵۹ء تک باقی رہے۔

کارکوٹک خاندان کے عہد حکومت میں چین کا جو سفارتی مشن ۷۱۳ء میں آیا تھا وہ راجہ کندر پیڈا کے طلب کرنے پر آیا تھا اور مقصود یہ تھا کہ محمد قاسم کی طرف سے جو اندیشہ حملہ کا پیدا ہوگیا تھا اس میں چین کی مدد حاصل کی جائے۔ (محمد قاسم ہمالیہ کے دامن تک پہونچ گیا تھا لیکن آگے بڑھ کر کشمیر پر حملہ کرنے کی نوبت نہیں آئی)

اس خاندان کی حکومت ابتدا میں پکھلی، پونچھ، راجہ پوری، ٹکسلا اور سالٹ رینج تک وسیع تھی لیکن بعد کو ان حدود میں کمی ہوتی رہی تاہم چودھویں صدی عیسوی تک اس خاندان نے کشمیر میں حکومت کی اور اس کے بعد مسلمان آئے۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں گندھارا میں ہندو خاندان شاہی کی حکومت علحدہ قایم تھی اور کشمیر میں کارکوٹک خاندان کی

اور یہ دونوں ایک دوسرے کی حریف تھیں، لیکن چونکہ اب مسلمانوں کے اقدامات شروع ہوگئے تھے اس لئے کشمیر اور گندھارا کی حکومتوں میں اتحاد پیدا ہوگیا۔

اس وقت سندھ میں تو مسلمان پہونچ ہی گئے تھے، لیکن اب ان کے حملے گندھارا کی طرف سے کابل پر بھی ہو چلے تھے، طبری کا بیان ہے کہ ۲۳ ہجری میں عاصم بن عمر قندہار (گندھارا) اور ہندوستان کی سرحد تک پہونچ گئے تھے اور حسب بیان بلاذری و یعقوبی خلافت منصور کے عہد میں ہشام بن عمر تغلبی نے کشمیر و ملتان فتح کرنے کے بعد قندھار پر بھی قبضہ کرلیا تھا ــ لیکن مسلمانوں نے کشمیر کے جس حصہ پر قبضہ کیا وہ وادیِ کشمیر سے تعلق نہ رکھتا تھا بلکہ سندھ اور جہلم کے درمیان جو حصۂ زمین تھا اس سے متعلق تھا۔ وادیِ کشمیر میں بدستور ہندوؤں کی حکومت قائم تھی اور صدیوں تک قائم رہی۔ ان راجاؤں میں سب سے زیادہ مشہور اونتی ورمن تھا (۸۵۵ء ـ ۸۸۳ء) جس نے اونتی پور بسایا۔ اس کے بیٹے کے زمانہ میں کشمیر اور شاہی حکومتوں کے درمیان پھر اتحاد قائم ہوگیا اور آئندہ برابر بڑھتا ہی رہا۔

۱۰۱۳ء میں محمود غزنوی نے گندھارا کی شاہی خاندان کی حکومت کو ختم کر دیا، ہرچند اس خاندان کے آخری فرماں روا ترلوچن پال نے، کشمیری فوجوں کی مدد سے پورا مقابلہ کیا لیکن کامیاب نہ ہوا۔ محمود غزنوی نے اس کے بعد کشمیر کا رخ کیا لیکن قلعۂ لوہرا (یا بقول بیہقی لاہور) سے آگے نہ بڑھ سکا اور تاہم غزنوی عہد میں لوہرا خاندان ہی کی حکومت کشمیر میں قائم رہی۔

راج ترنگنی کے بیان کے مطابق اس خاندان کا راجہ ہرش (۱۰۸۹ء ـ ۱۱۰۱ء) پاگل سا تھا اور اس پر مسلمانوں کا اثر بہت کافی تھا، چنانچہ اس نے ترکی سپاہیوں کو ملازم رکھا اور ہندو و بدھ مت کے بہت سے بتوں کو مسمار کرا دیا۔ اب یہاں ہندوؤں کی حکومت بہت ضعیف ہوگئی تھی، ہر طرف بدنظمی پھیلی ہوئی تھی اور آبادی اسلام قبول کرتی جارہی تھی۔

سب سے پہلا باقاعدہ حملہ مسلمانوں کا کشمیر پر ۱۳۲۰ء میں ہوا۔ یہ حملہ ایک تاتاری نسل کے سردار ذوالقدر خاں نے کیا تھا کہا جاتا ہے کہ جب کشمیر کو لوٹ کر یہ لوٹا تو اس کی ساری فوج برفباری کی وجہ سے ہلاک ہوگئی۔ اس کے بعد شاہ میر سواتی (افغان) نے پوری طرح کشمیر پر تسلط قائم کرلیا اور "شمس الاعظم" کا لقب اختیار کرکے حکومت شروع کر دی (۱۳۳۹ء)۔ حکومت کے اس تغیر کو وہاں کی آبادی نے بھی تسلیم کرلیا جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ شاہ میر نے ہندوؤں کے ساتھ بڑی رواداری کا سلوک کیا اور بڑے بڑے عہدوں پر کشمیری برہمنوں کو بدستور قائم رکھا۔ اس کے بعد سکندر شاہ کے عہد میں (۱۳۸۹ء ـ ۱۴۱۳ء) حالات بدلے۔ یہ سخت مذہبی قسم کا انسان تھا اور اس نے وہاں کے بہت سے مندروں کو مسمار کیا، لیکن زین العابدین کے عہد میں (۱۴۲۰ء ـ ۱۴۷۰ء) دوبارہ رواداری کا دور شروع ہوا اور اس نے اس قدر عدل و انصاف سے کام لیا کہ کشمیری اس کے عہد کو کشمیر کا عہدِ زریں کہتے ہیں۔ اس نے نہریں، سڑکیں اور پل بہ کثرت تعمیر کرائے اور ملک کو خوشحال بنانے میں ہر ممکن کوشش سے کام لیا۔ مگر افسوس ہے کہ اس کے جانشین سخت نا اہل ثابت ہوئے اور آخرکار دردستان کے چک خاندان نے یہاں اپنا رسوخ اتنا قائم کرلیا کہ رفتہ رفتہ حکومت اسی کے ہاتھ میں آگئی۔ اس خاندان کے افراد غازی خاں، حسین شاہ، محمد علی اور یوسف نے بادشاہ کا لقب اختیار کرکے سکے بھی اپنے نام کے جاری کئے۔

اس کے بعد جب بابر نے شمالی ہند کو فتح کرلیا تو اس کی نگاہ کشمیر کی طرف بھی گئی، کیونکہ یہ خطۂ زمین اپنی شادابی اور سرد آب و ہوا کے لحاظ سے اس کے لئے بہت کشش رکھتا تھا، چنانچہ اس نے ایک مختصر سی فوج اس طرف روانہ کی لیکن وہ ناکام واپس آئی۔

جب ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ نے ہمایوں کو ہندوستان سے نکالا تو اس کے عم زاد بھائی حیدر شاہ دغلات نے جو کاشغر کا فرمانروا تھا ہمایوں کو متوجہ کیا کہ وہ کشمیر پر قبضہ کرکے اطمینان سے بیٹھ جائے۔ لیکن جب ہمایوں ایسا کرنے سے قاصر رہا تو خود

یدر مرزا کشمیر پر حملہ کرکے ہمایوں کے نام سے وہاں حکومت کرنے لگا - اس کے بعد جب ۱۵۵۱ء میں وہ غالباً شاہانِ سور کی شش سے ہلاک کردیا گیا تو پھر چک خاندان کی حکومت بحال ہوگئی -

اس کے بعد اکبر نے کشمیر پر حملہ کیا اور ہر چند یعقوب خاں فرمانروائے کشمیر نے پوری طرح مقابلہ کیا لیکن اسے شکست ہوئی ور اس طرح ۱۵۸۶ء میں کشمیر سلطنتِ مغلیہ میں شامل ہوگیا -

اکبر سب سے پہلے یہاں براہ درۂ پیر پنجال ۱۵۸۹ء میں پہونچا اور کچھ دن قیام کرکے واپس آیا - دوسرے سال پھر گیا - س مرتبہ مشہور مورخ نظام الدین (مصنف طبقات اکبری) بھی اس کے ہمرکاب تھا - تیسری مرتبہ گیا تو اس کا وزیر ٹوڈرمل بھی ساتھ تھا، اسی زمانہ میں یہاں کا بندوبست ہوا اور سرینگر کی ایک پہاڑی کو قلعہ بند کرکے اس کا نام ہری پربت رکھا گیا ——

ابوالفضل نے اکبر کے زمانہ میں کشمیر کے حالات آئینِ اکبری میں بہت تفصیل سے بیان کئے ہیں -

اکبر کے ساتھ جہانگیر بھی کشمیر گیا تھا اور اسے یہ مقام بہت پسند آیا چنانچہ جب وہ فرمانروا ہوا، تو اس نے یہاں متعدد باغ اور محل طیار کرائے جن میں نشاط باغ، اچھابل اور ویرناگ بہت مشہور ہیں - جہانگیر نے اپنی محبوب بیوی نورجہاں کا ذوق پورا کرنے کے لئے چنار کے پودھے بھی ایران سے منگواکر بہ کثرت یہاں نصب کرائے، جن سے کشمیر کے حسن و دلکشی میں واقعی بہت اضافہ ہوگیا -

شاہجہاں نے بھی یہاں متعدد باغ نصب کرائے اور علی مرداں خاں یہاں کے گورنر نے اسی زمانہ میں پیر پنجال روڈ پر متعدد سرائیں تعمیر کرائیں - داراشکوہ نے ایک قصر پری محل کے نام سے تعمیر کرایا جس کے کھنڈر ڈل کے کنارے اب بھی نظر آتے ہیں -

اورنگ زیب یہاں اپنے عہد میں صرف ایک بار آیا اور چند مسجدیں تعمیر کراگیا جو اسوقت بھی موجود ہیں - برنیر اورنگ زیب کے ساتھ یہاں آیا تھا اور اس نے اس عہد کے مفصل حالات قلمبند کئے ہیں -

نادر شاہ نے جب ہندوستان پر حملہ کیا اور مغلیہ حکومت ضعیف ہوگئی تو کشمیر کے صوبہ دار تقریباً خودمختار ہوگئے - ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ درانی قابض ہوگیا اور ۱۷۵۶ء میں اس نے بلند خاں سدوزئی کو یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا، درانیوں کے زمانہ میں کشمیر کی حالت بہت خراب ہوگئی اور اندرونِ ملک میں کئی دعویدارِ حکومت پیدا ہوگئے، خصوصیت کے ساتھ محمود شاہ اور شجاع الملک کے مابین یہ کشمکش عرصہ تک قائم رہی اور دونوں نے اپنے اپنے نام کے سکے جاری کئے - آخرکار فتح خاں بارک زئی رنجیت سنگھ فرمانروائے پنجاب کی مدد سے کشمیر پر قابض ہوگیا (۱۸۱۳ء) - گو اس کے بعد بھی یہاں کے فرمانروا محمود شاہ اور ایوب شاہ رہے لیکن یہ فرمانروائی برائے نام تھی اور اصلی اقتدار بارک زئی سرداروں کو حاصل تھا، یہاں تک کہ محمد اعظم شاہ بارک زئی نے محمد کے نام سے اپنا سکہ بھی جاری کردیا - اس زمانہ کی آپا دھاپی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ سرداروں کے علاوہ ایک مقامی درویش نورالدین نے بھی اپنے نام کا سکہ جاری کیا -

آخرکار ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے کشمیر پر حملہ کرکے اسے اپنے قلمرو میں شامل کرلیا اور یہ اختلاف ختم ہوگیا - سکھوں کا دورِ حکومت گو سختی و جبر کا دور تھا اور مور کرافٹ سیاح نے سکھ شاہی دور کے جو حالات کشمیر کے متعلق لکھے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں یہاں کی رعایا کس قدر پریشان تھی -

اسی زمانہ میں جموں کے ڈوگرا خاندان میں تین بھائی دھیان سنگھ، گلاب سنگھ اور سوچیت سنگھ ابھرے - یہ سکھ نہ تھے ہندو تھے اور ماوراء وادیِ کشمیر کے پہاڑی علاقہ کی راجپوت نسل سے تعلق رکھتے تھے - دھیان سنگھ کو سکھ حکومت میں ایک با اقتدار جگہ مل گئی، اور رنجیت سنگھ نے جموں کی گدی پر گلاب سنگھ کو بٹھا دیا (۱۸۲۰ء) اس نے رنجیت سنگھ کے نام پر متعدد پہاڑی ریاستوں

کشت وار و لداخ کو سکھ حکومت میں شامل کرلیا جس سے اس کا درخور سکھ دربار میں بہت بڑھ گیا۔ رنجیت سنگھ کی وفات (۱۸۳۹ء) کے بعد جو اختلال سکھ حکومت میں پیدا ہوا اس سے دھیان سنگھ نے فایدہ اُٹھاکر کچھ عرصہ کے لئے کشمیر پر بڑا اثر و اقتدار پیدا کرلیا اور گلاب سنگھ نے اس کی مدد سے جموں کے پہاڑی علاقوں میں اپنی پوزیشن بڑی مضبوط کرلی۔

اس کے بعد جب ۱۸۴۳ء میں سندانوالیا نے مہاراجہ شیر سنگھ اور دھیان سنگھ کو قتل کردیا تو گلاب سنگھ کچھ عرصہ کے لئے کشمیر سے ہٹ کر اپنی پہاڑی حکومت میں چلا گیا۔ اس وقت کشمیر میں سکھ حکومت حد درجہ متزلزل حالت میں تھی کہ بومبا قوم نے سکھوں کی فوج سے بھی مقابلہ شروع کردیا۔

اس کے بعد جب ۱۸۴۵ء میں خالصہ فوج اور انگریزی سپاہ کے درمیان لڑائی ہوئی تو گلاب سنگھ نے اس میں کوئی حصہ نہ لیا اور جنگ کے اختتام کے بعد شرایط صلح کی گفتگو شروع ہوئی تو مہاراجہ دلیپ سنگھ نے اس کو اپنا نمایندہ منتخب کیا۔ آخرکار میجر لارنس کی تجویز کے مطابق انگریزی حکومت نے کشمیر کو پنجاب سے جدا کرکے ایک علحدہ ریاست قرار دیا اور گلاب سنگھ کو وہاں کا راجہ تسلیم کرلیا گیا، گلاب سنگھ اور انگریزی حکومت کے درمیان ۱۸۴۶ء میں جو معاہدہ ہوا اس کی رو سے گلاب سنگھ نے برطانوی اقتدار کو تسلیم کرتے ہوئے ایک بڑی رقم خراج یا قیمت کی صورت میں بھی ادا کی، لیکن اس کے بعد بھی گلاب سنگھ کا قبضہ کشمیر پر آسانی سے نہ ہوسکا کیونکہ یہاں گورنر امام الدین جو بومبا قوم سے مل گیا تھا، اس نے گلاب سنگھ کی فوجوں کو شکست دی اور اپنا اثر کشمیر میں قایم کرلیا۔ آخرکار برطانوی فوج نے بومبا قوم کی بغاوت فرو کرکے جموں اور کشمیر پر گلاب سنگھ کا پورا تسلط قایم کردیا اور حکومت ڈوگرا خاندان میں منتقل ہوگئی۔

چند لمحے داغ کے ساتھ

اُردو شاعری میں جتنی خطرناک شخصیت داغ کی ہے شاید ہی کسی اور کی ہو۔ ان کی غزلوں سے لطف اُٹھانے کے لئے ایک ں قسم کے "بلوغ" کی ضرورت ہے۔ عمر ہی کا نہیں مزاج اور ذہن کا بھی "نابالغ" ذہنوں کو یہ شاعری یا تو تباہ کرکے ایسی ں پر ڈال دے گی جہاں وہ کہیں کے نہ رہیں گے یا وہ لوگ جو چند اخلاقی اقدار کے سائے میں پروان چڑھے ہیں وہ پڑھکر جنیپ سے جائیں گے اور بگڑکر کہیں گے لاحول ولاقوۃ یہ کیا بکواس ہے۔ یہ تو عیاشی اور ہوس کاری کا کھلم کھلا پروپگنڈا ۔ قوم کی تباہی اور نوجوانوں کے اخلاق کو بگاڑنے کا پورا سامان۔

ہمارے ملک میں ذہنی بلوغ کی بہت کمی ہے اور اسی لئے نقادوں کو یہاں بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے جو ، عام ذہنی سطح سے ہم آہنگ ہوکر لکھتے ہیں ان کے لئے تو خیر کچھ نہیں لیکن جہاں آپ نے صحیح معنی میں کوئی سوجھ بوجھ دکھائی تو سمجھ لیجیے کہ دنگو، بنے۔ عام بھیڑ چال نے تو ہمارے ادب میں عجیب عجیب کرشمے دکھلائے ہیں۔ میر نے اپنی شاعری میں اپنے غموں ایاں کیا تو "مشاعرے باز شاعروں" کو ایک نسخہ ہاتھ لگا کہ "غم" ہی شاعری کا موضوع ہے۔ اب جس کو دیکھیئے روتا بسورتا آئے گا چاہے اس کی زندگی میں دور دور بھی کہیں غم کا نشان نہ ہو۔ معمولی شاعروں کو تو چھوڑئے لکھنؤ اسکول کے بہت بڑے ادشیخ امام بخش ناسخ تک نے ایک بار صرف اس لئے فاقہ کشی اور چلہ کشی شروع کی کہ ان کے شعروں میں درد پیدا ہو جائے اور ۔ اس کے باوجود بھی درد نہ پیدا ہو سکا تو لوگوں نے سمجھایا کہ بھائی آپ کس جھنجھٹ میں پڑے ہیں اس چوڑے چکلے سینے کیلئے ہ سیر خوراک اور ۹، ۱۲ ڈنٹر ہی ٹھیک ہیں اور شاعری کے لئے بھی وہی کرتب اور پہلوانی آپ کے لئے موزوں ہے۔ ناسخ آدمی بھدار تھے۔ سمجھ گئے اور پھر اسی رنگ کو بنایا جو ان کے مزاج کے مطابق تھا۔

میرا خیال ہے کہ کسی شاعر کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ مزاج کو سمجھ لے اور اپنی شاعری کو اسی راستہ پر لگائے جس ، کے مزاج کو مناسبت ہو، شاعری اگر صحیح معنوں میں شاعر کی شخصیت اور اس کے کردار کا آئینہ بن جائے تو ہر شاعر کامیاب ہو سکتا ۔ اُردو شاعری کی تاریخ اُٹھاکر دیکھ لیجئے، جن لوگوں نے اپنے مزاج کے مطابق شاعری کی انھیں کلاسکس میں جگہ دی گئی، جن ں نے بازار میں چلتی ہوئی کسی چیز کو دیکھ کر اسی سُر میں سُر ملانا شروع کردیا وہ اپنی گرہ کا مال بھی کھو بیٹھے۔ غالب یا اقبال کی لید کرنے والوں کا انجام کس نے نہیں دیکھا۔

داغ کے متعلق میری سب سے پہلی رائے یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مزاج کو پا لیا تھا۔ اس معاملہ میں جتنی کامیابی ان کو ہوئی ہیت کم اس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اچھے اچھے لوگوں کو اپنی راہ پر لگنے سے پہلے اِدھر اُدھر بھٹکنا پڑا ہے۔ بعضوں نے بڑا شاعر ، کی دھن میں اور استادی کے مرتبے تک پہونچنے کے خبط میں اپنی شخصیت کو بالکل فراموش کردیا اور کسی پچھلے شاعر کی تقلید میں ا کافی وقت خراب کیا۔ بعض لوگ ایسے ہیں جنھیں ان کے استادوں نے نقصان پہونچایا اور اپنی ڈگر پر خواہ مخواہ چلانے کی شش کی۔ لیکن داغ کو دیکھئے کہ ایسے وقت میں آنکھ کھولتے ہیں جب ایک طرف میر کی عظمت لوگوں پر اتنی چھائی ہوئی تھی کہ

ناسخ جیسے آدمی کو ماننا پڑا تھا کہ "آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں" دوسری طرف خود ناسخ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شاہ نصیر او ذوق اور بہادر شاہ ظفر کا کیا ذکر مومن اور غالب جیسے خود دار و خود کام شاعر بھی ایک وقت میں ناسخ کی تقلید پہ فخر کرتے تھ بعد میں غالب نے اور ایک حد تک مومن نے بھی اپنے آپ کو سنبھالا لیکن شاہ نصیر اور ذوق کی بے جان شاعری میں اس "ناسخیت" کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ داغ کے سامنے میر کا کلام تھا، ناسخ کی شاعری تھی اور ان کے رنگ میں شاہ نصیر اور ذوق تھے جو کم از اپنے وقت کے بہت بڑے شاعر تھے اور ہاں انھیں کے سامنے غالب نے بھی اپنی فکری شاعری کے جوہروں کو چمکا لیا تھا اگرچ اسے عام مقبولیت نہیں ملی تھی تاہم پڑھنا آدمیوں کے لئے وہ بھی ایک لالچ دلانے والی چیز تھی۔ لیکن داغ کی ہوشیاری دیکھئے صرف اپنے استاد ذوق سے زبان کی صفائی اور سادگی لے کر ایک علحدہ راہ پر چل دیا۔ اس راہ پر جن لوگوں نے اپنے پاؤں نشانات بہت گہرے چھوڑے ہیں ان میں جرأت کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اسی لئے بعض لوگ داغ کا رشتہ جرأت سے جوڑتے یا داغ کو بھی جرأت ہی کے قبیلے کا ایک شاعر سمجھتے ہیں۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں، بات یہ ہے کہ لوگ شاعر کے مزاج انداز اس کی شاعری کے موضوعات سے کرنا چاہتے ہیں حالانکہ یہ بات سرے سے غلط ہے۔ ایک ہی موضوع پر دو طرح کی شخصیت دو علحدہ لب و لہجہ اختیار کریں گی اور ان کے اظہار میں نمایاں فرق محسوس ہوگا۔ "لب و لہجے" کی شاعری میں اس لحاظ سے بڑ اہمیت ہے کہ اسی سے پتہ چل سکتا ہے کہ شاعری میں کتنا حصہ فطری ہے اور کتنا غیر فطری جو لوگ میر کے دیوان سے ان اشعا ایک فہرست بناتے ہیں جن میں کسی نہ کسی طور امرد پرستی کا ذکر ہے یا "دلّی کے کج کلاہوں" میں سے کسی کا نام آگیا ہے اور ا بنا پر اسے میر کی شخصیت سے منسوب کرتے ہیں وہ لوگ اسی دھوکے میں مبتلا ہیں کہ چونکہ یہ موضوع شاعر کے یہاں کسی نہ کسی بندھا ہے اس لئے اس کا تعلق بھی شاعر کی سوانح عمری کے کسی نہ کسی باب سے ضرور ہوگا۔ یہاں میں اپنا تاثر بتا دوں کہ میں میر کے دیوان میں میر کا کوئی اچھا شعر اور ان کے مخصوص لب و لہجے کا کوئی شعر ایسا نہیں پایا جس کا تعلق امرد پرستی سے د کا بھی ہو۔ آپ غور سے پڑھیں تو فوراً پتہ چل جائے گا کہ جو دردمندی، سوگواری، ایک خاص طرح کی بے نیازی اور قلندری نرمی اور مانوسیت کا انداز میر کے اچھے شعروں میں ہے۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے میر ہی پر کیا موقوف آپ کہیں تو میں جرأت کے یہاں غالب کے رنگ کا شعر نکال کر دکھا دوں اور ناسخ کے یہاں اقبال کے رنگ کا۔ اپنے رنگ ہٹ کر انھوں نے کبھی کبھی کسی موضوع کو باندھ دیا ہے اس کی بنا پر اس کے مزاج کو متعین کرنا شاعر کے ساتھ تو ظلم کم ہی نہیں ادب میں گمراہی بھی پھیلانا ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جہاں تک موضوع کا تعلق ہے داغ اور جرأت میں مماثلت ہے۔ یعنی دونوں کا موضوع "معاملہ بندی" ہے لیکن داغ کا کارنامہ معاملہ بندی سے آگے ہے۔ میرا خیال ہے کہ داغ کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی شاعری کا نشاطیہ لب و لہجہ ہے۔ جرأت کی شاعری میں بھی محبت کے بجائے ہوس پرستی۔ اور داغ کے یہاں بھی لیکن فرق یہ ہے کہ جرأت کے یہاں صرف ذہنی عیاشی ہے جسے ایک بیماری کہہ لیجئے۔ جنسی دباؤ اور جنس معاملات میں محرومی اور ناکامی بعض اوقات لوگوں کو ننگی تصویریں دیکھ کر، فحش باتیں کہہ کر جنسی معاملات کا ذکر کرکے یا جسم جنسی اعضا کا نام لیکر جو لذت ملتی ہے اسے آجکل کی نفسیات میں Perversion کہتے ہیں۔ جرأت کی شاعری "پرورژن" کا نتیجہ ہے۔ جرأت عیاشی کر نہیں سکتے عیاشی کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ وہ محبوب کو پاتے نہیں بلکہ خیال میں لا پاکر اس کے وصال کا ذکر کرتے ہیں اور اس ذکر سے انھیں ایک تسکین سی ہوتی ہے۔ غالبًا ریختی کی ایجاد بھی اسی جذبے کی نکاسی کی ایک شکل ہے۔ لیکن داغ کی شاعری ہوس کی شاعری ہوتے ہوئے بھی صحت مند شاعری ہے۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد اصلیت پر ہے۔ یہ ہوس انگیزی تندرست قسم کی ہوس انگیزی ہے، یہ کسی منفی رجحان کی نمایندگی نہیں کرتی بلکہ یہ ایک عیاش آدمی کی آزادیوں اور اس کی فتوحات کا بیان ہے۔ داغ کی شاعری کا عاشق جنسی تشنگی کا شکار نہیں ہے بلکہ بہت

آسودہ ہے۔ وہ آئے دن وصال کے مزے لوٹتا ہے۔ اس کی محبوب سے چھیڑ چھاڑ واقعی چلتی ہے اس کے محبوب کے یہاں رقیبوں کا جھگڑا خیالی نہیں بلکہ اصلی ہے۔

ممکن ہے بعض لوگ اس بات پر حیرت کا اظہار کریں کہ جب ہندوستان زوال کے دور سے گزر رہا تھا اور سارے شاعروں کے یہاں اس زوال کی وجہ سے قنوطیت اور بے دلی ملتی ہے تو داغ کے یہاں کیوں اس کے خلاف نشاط کے عناصر ملتے ہیں اور اگر یہی نشاط کے عناصر ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اور ان کا مزاج ہیں تو یہ بڑی غیر فطری سی بات ہے۔ بات یہ ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کی طنابیں اُکھڑنے کے بعد بھی ہمارے یہاں جاگیردارانہ ماحول باقی تھا۔ خاص شاہی خاندان کے افراد یا خود بہادر شاہ معتوب ہوئے جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا لیکن غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد انگریزوں نے حکومت تو قائم کرلی البتہ بربنائے مصلحت انھوں نے جاگیردارانہ ماحول کو قایم رکھا اور لوگوں کو جگہ جگہ جاگیرداریاں، پنشنیں اور معافیاں دیدی گئیں جس کے نتیجے میں رئیسوں اور نوابوں کا طبقہ اب اور بھی بڑھ گیا۔ پہلے تو صرف امراء یا دربار شاہی سے وابستہ لوگ ہی دادِ عیش دے سکتے تھے لیکن اس ماحول میں ایک کھاتا پیتا رئیس بھی اپنے دل کے ارمان پورے کرسکتا تھا۔ داغ خود ایک نواب خاندان کے چشم و چراغ تھے پھر رامپور اور حیدر آباد میں ان کی عیش و عشرت کی زندگی۔ ان چیزوں کو دیکھا جائے تو یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ داغ کو ان سنگین حقیقتوں تک جانے کی نوبت ہی نہ آئی جہاں جانے کے بعد ایک طرف تو انسان کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ اپنے علاوہ دوسروں کے بارے میں بھی سوچنے لگتا ہے دوسرے یہ کہ شاعری میں فکر اور سنجیدگی کی پرچھائیاں پڑنے لگتی ہیں۔ داغ کو جو ماحول ملا وہ ان کے اسی مرحلے کے مطابق تھا جیسی کہ ابتدا میں ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی تھی، بعد میں کامیابیوں نے ان کے قدم چومے تو پھر انھیں کسی اور حقیقت سے ٹکر لینے کا مرحلہ ہی نہیں پیش آیا۔ ان کی شاعری کا نشاطیہ رجحان سو فیصدی فطری اور اصلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس رنگ میں بھی انھیں لوگوں کو کامیابی نصیب ہوئی جو اس قسم کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اقبال نے دو ایک غزلیں لکھنے کے بعد ہی کیوں داغ سے علٰحدگی اختیار کرلی اس کی وجہ مزاج اور ماحول کا اختلاف ہی تھا داغ کے رنگ کی مقبولیت کو دیکھ کر امیر مینائی نے ان کے رنگ میں شعر کہنا شروع کیا۔ ان کی استادی مسلم لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ امیر مینائی گھاٹے میں رہے کیونکہ یہ ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ وہ بیچارے پرہیزگار قسم کے آدمی تھے وہ چھیلاپن کہاں سے لاسکتے جو صرف بوالہوسی کے راستے پر چل کر ہی مل سکتا ہے۔ البتہ داغ کے رنگ میں سب سے زیادہ کامیابی ریاض خیر آبادی کو ہوئی۔

ریاض کے متعلق میں اس سلسلہ میں اپنے دل کا ایک چور بیان کردوں۔ ریاض میرے پسندیدہ شاعروں میں ہیں اور جتنے اشعار ان کے مجھے یاد رہتے ہیں بہت کم شاعروں کے یاد رہتے ہیں لیکن ریاض کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت جو بتائی جاتی ہے یعنی "خمریات" یہ بات میرے گلے سے نہیں اُترتی۔ بعض لوگ اس بات کو بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ دیکھئے ریاض نے کبھی شراب کو منھ سے بھی نہیں لگایا لیکن شراب میں اتنے شعر کہے ہیں۔ ان کی خدمت میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میرا تاثر اس معاملہ میں بالکل علٰحدہ ہے۔ ریاض کی خمریائی شاعری میں وہ کیفیت نہیں ملتی جو واقعی شراب پینے کے بعد پیدا ہوتی ہے یا ان شاعروں کے یہاں مل سکتی ہے جو شراب پیتے تھے۔ دراصل داغ کی طرح ریاض کا مزاج بھی خالص عیاشانہ ہے اور ان کے یہاں بھی وہی نشاط، شوخی، چھیڑ چھاڑ، معاملہ بندی اور ہوس پرستی ملتی ہے جو داغ کا خاصہ ہے اور یہ چیز غیر فطری نہیں ہے کیونکہ داغ کی شراب نوشی سے تو انکار کیا جاسکتا ہے ان کی کوچہ گردی سے انکار ذرا مشکل ہے اور ان کے سوانح نگار ان کی فتوحات کو چھپانا چاہیں بھی تو نہیں چھپا سکتے، ریاض کے مزاج کی یہی رنگینی اور عیاشی اور ان کا یہی نشاط ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ چنانچہ ریاض کے بہترین اشعار وہی ہیں جہاں حسینوں سے، واعظ سے، محتسب و ناصح سے چھیڑ چھاڑ ملتی ہے۔

اور وہ اپنی فتحمندیوں کا ذکر کرکے خوش ہوتے ہیں۔

ہم مل گئے، ہم پا گئے، ہم لے گئے آن کو — وہ کھوئے گئے کوچۂ دشمن سے نکل کر
میں ڈراتا ہوں یہ کہہ کہہ کے حسینوں کو ریاض — جو نہ پورا ہو مرے دل میں وہ ارمان نہیں

بہر حال اس سلسلہ میں عرصہ سے سوچ سمجھ کر میں نے یہ رائے قایم کی ہے اور اس پر مجھے اصرار ہے کہ ریاض خمریات کے شاعر نہیں ہیں بلکہ نشاط اور شوخی کے شاعر ہیں، معاملہ بندی اور ہوس پسندی کے (حسرت کی زبان میں فاسقانہ) شاعر ہیں اور اس سلسلہ میں ان کے پیش رو داغ ہی نہیں امیر مینائی کا شاگرد ان کے حریف داغ کے رنگ کو اپنا کر اپنے جوہر کو چمکاتا ہے یہ بھی شاعرانہ مزاج ہی کے کرشمے ہیں۔ ایک امیر مینائی ہی کیا غالب کے شاگردوں تک نے غالب کو چھوڑ کر داغ کا رنگ اختیار کیا اور میرا خیال ہے ٹھیک ہی کیا۔ فراق نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ حالی جیسے ثقہ آدمی بھی داغ کے رنگ پر بری طرح للچائے ہیں اور محمد حسن عسکری نے ابھی حال ہی میں نقوش لاہور میں حالی کی غزل گوئی پر ایک مضمون لکھ کر ان کے "بھلے مانس" ہونے کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے اس کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حالی کی شخصیت میں داغ والا عنصر بھی تھا لیکن دوسری طرف وہ بعض اسباب کی بنا پر ایک خاص قسم کی "سعادت مندی" کا بھی شکار تھے جو غالباً ان کو اپنے ماحول اور تربیت کے نتیجے میں ملی ہوگی اور اسی لئے عمر بھر ان کی شخصیت کے دونوں عناصر میں کشمکش جاری رہی۔ ان کی شاعری میں ایک دبا دبا سا انداز، ایک ڈھیلا پن اور طاقت و خود اعتمادی کی کمی ملتی ہے اس کی وجہ غالباً یہی ہے۔

داغ کی شاعری کسی بھی ماحول کی پروردہ ہو۔ وہ جاگیردارانہ نظام کی دین سہی۔ اس میں نوابوں کی عیاشیاں اور طوائفوں سے محبت کا ذکر سہی لیکن اس میں بھی ہمارے لئے بہت سے عناصر قابلِ قدر ہیں۔ محراب و منبر والوں کو تو چھوڑئے عام نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو یہ بات ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ جبکہ عام طور پر ہمارے سماج میں لوگوں کے اندر ایک خاص قسم کی "منافقت" ملتی ہے یعنی جب وہ ہوسکاریوں میں مبتلا ہوں گے تب بھی زبان پر تسبیح و مصلّیٰ کا ذکر ہوگا۔ ہمارے نوجوان بزرگوں سے چھپ کر سارے کام کریں گے، جنسی مسائل پر گفتگو ہوگی، فحش باتیں چلیں گی، عریاں ناول پڑھے جائیں گے لیکن پھر وہ اپنے اوپر ایک خول چڑھا لیں گے۔ اس خول کو چڑھانے اور اندر اندر گھٹنے سے شخصیتوں میں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ داغ نے گویا اس سماج میں اس خول کو اتارا ہے جب آج کی نسبت اخلاقی پابندیاں کہیں زیادہ تھیں۔ اس زمانہ میں عام شاعروں کا یہ حال تھا، شراب پیتے تھے اور طوائفوں سے عشق کرتے تھے لیکن شعر تصوف کے کہتے تھے۔ یا یہ کہ نماز پڑھتے ہیں اور تصوف و معرفت میں زندگی گزر رہی ہے لیکن عشق و محبت کے شعر اس لئے کہہ رہے ہیں کہ شاعری کی یہی روایت ہے۔ داغ نے اس تضاد کو ختم کرکے شاعری میں بیباکی اور جرأت کا میلان پیدا کیا۔ داغ کے یہاں گھناؤنے یا اخلاق و شائستگی سے گرے ہوئے اشعار نہ ملیں گے جس پر خواہ مخواہ کوئی کفر کا فتویٰ صادر کر دے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ گھناؤنی باتوں کو اور پھوہڑ قسم کے موضوعات کو بھی داغ نے اپنے کمالِ شاعری سے حسین اور آبدار بنا دیا ہے اور ایسا کہ رند تو رند زاہدِ خشک کے منہ سے بھی بے ساختہ واہ نکل جائے۔ داغ کے طرزِ بیان میں جو صفائی اور وضاحت، جو چستی، جو نکھار، جو البیلا پن، جو فنی رچاؤ ملتا ہے وہ بہت کم غزل گویوں کے حصے میں آیا ہے۔ داغ کی غزل میں غزل گوئی اپنے پورے شباب پر پہونچ جاتی ہے۔ جن مسایل پر دوسرے شاعروں کی زبانیں بند سی ہو جاتی ہیں وہاں داغ ایسے بے ساختہ انداز سے گزر جاتے ہیں کہ آدمی دیکھتا رہ جائے۔ داغ کا فن ان کی شخصیت ہی کی ایک تصویر ہے اس لئے اس میں بڑی جان ہے۔ ان کے مزاج کے نشاطیہ عناصر ہی نے اس طرزِ بیان اور لب و لہجہ کو بھی جنم دیا ہے۔ بعد میں جن لوگوں نے صرف زبان کے بل بوتے پر داغ کا رنگ اپنانا چاہا ان کی مٹی بڑی خراب ہوئی۔ ان کی شاعری میں کسی کیفیت کے بجائے "دو دو چار" والی بات پیدا ہوگئی۔ البتہ ان شاعروں نے داغ سے بڑا فایدہ اٹھایا جو پہلے ہی تھے اس رنگ کی شاعری

کے لئے اور ان لوگوں ہی کے کلام کو پڑھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ داغ اور داغ اسکول نے اُردو غزل کی راہ سے وہ سارے روڑے صاف کر دیئے جن کی وجہ سے اس میں ایک رکاوٹ اور بند بندسی کیفیت تھی ۔ اب اس راستے میں بڑی صفائی، چمک اور اُجالا ہے ۔ حسرت موہانی سے لیکر فراق گورکھپوری اور عدم تک نے اس اُجالے کی مدد سے اپنی منزلیں تلاش کی ہیں ۔

مجھے جو باتیں کہنی تھیں کہہ چکا ۔ اب آپ کو داغ کے کچھ اشعار سنانا چاہتا ہوں :-

زلف برہم، عرق آلودہ جبیں، دامن چاک — کس کی آغوش سے تو جان چھڑا کر نکلا
رکھ دیا ہاتھ مرے منھ پہ بتِ کافر نے — صبح اٹھتے نہ دیا نام خدا کا لے کر
شبِ وصل ایسی کھلی چاندنی — وہ گھبرا کے بولے سحر ہو گئی
وہ روزِ حشر ہے، دُنیا نہیں کہ راہ ملے — کہاں چھپوگے جو دو چار داد خواہ ملے
بڑا مزہ ہو کہ محشر میں ہم کریں شکوہ — وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لئے
شریر آنکھ، نگہ بے قرار، چتون شوخ، — تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لئے
نگہ نکلی نہ دل کی چور زلفِ عنبریں نکلی — اِدھر لا ہاتھ مُٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی
کُھل کھیلئے، کُھل جائیے، دل کھول کے ملئے — کب تک گرہِ بندِ قبا کو کوئی دیکھے،
میرے گھر خوف سے تھم تھم کے قدم رکھتے ہو — کیا ہوا اب وہ کہاں شوخیِ رفتار گئی
حلقۂ آغوش ہے، یہ حلقۂ گیسو نہیں — کسمسا کر ہو نہ جائے گی رہائی آپ کی
سبب کُھلا یہ ہمیں ان کے منھ چھپانے کا — اُڑا نہ لے کوئی انداز مسکرانے کا
ملے شباب میں ہر ایک گلعذار سے ہم — لٹے بہار کے موسم میں کس بہار سے ہم
خمار آلودہ آنکھیں، بل جبیں پہ، درد ہو سر میں — رہے تم رات بھر بے چین کس کمبخت کے گھر میں
ٹوک کر رستے میں پیار آ ہی گیا اس شوخ پر — وہ نظر حیرت زدہ، وہ آنکھ شرمائی ہوئی
گالیاں غیر کو دیتا ہوں سنو تم خاموش — میں بھی دیکھوں تو بڑے بات نہ کرنے والے
حور کے واسطے زاہد نے عبادت کی ہے، — سیر تو جب ہے کہ جنّت میں نہ جانے پائے
چارہ گر بھی ہم نشیں تھا، رات کو ناصح بھی تھا — ورنہ بے تابی میں ہم کیا جانے کیا کر بیٹھتے
جب سے یہ سنا داغ نے کی عشق سے توبہ — گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں کیا دل کو لگی ہے
پارسا جان کے وہ مجھ سے ملے دھوکے میں — آ گئی کام مری پاک نگاہی کیسی،
یہ سیر ہے کہ دوپٹہ اُڑا رہی ہے صبا — چھپا رہے ہیں وہ سینہ مگر نہیں چھپتی
اِدھر آؤ اس بات پر بوسہ لے لوں — مرے سر کی جھوٹی قسم کھانے والے،
دل کا کیا حال کہوں صبح کو جب اس بُت نے — لیکے انگڑائی کہا ناز سے ہم جاتے ہیں،

خلیل الرحمان اعظمی ایم ۔ اے

مولانا شبلی اور ندوۃ العلماء

پاکستان کے علماء میں آج کل قیادت کی جو ہوس پائی جاتی ہے اُس کے پیشِ نظر اسی قسم کی ایک تحریک کا جائزہ لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر لکھنؤ میں شروع ہوئی تھی۔ اس تحریک کے روحِ رواں مولانا شبلی نعمانی تھے۔ اس مضمون میں شبلی کے اپنے بیانات کی روشنی میں اس تحریک کے مقاصد کا تجزیہ کیا گیا ہے چونکہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لئے یہ تجزیہ نہایت مختصر ہے۔

ندوہ کی بنیاد، جیسا کہ معلوم ہے، مولانا شبلی کی شرکت سے پہلے پڑ چکی تھی۔ اُنھوں نے کانپور میں اس کے اجلاس میں شرکت کی اور ۱۹۰۵ء سے اس میں عملی طور پر حصہ لینا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی اور عربی تعلیم میں اچھی خاصی کشمکش تھی۔ مولویوں کو اپنی اقتصادی بدحالی کا احساس ہو چلا تھا اور ان کے سامنے سب سے زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ تعلیم کے بعد روٹی کہاں سے ملے گی۔ اس غرض کے لئے حکومت کے ادارے ناکافی تھے۔ پھر شبلی کی اپنی ہنگامہ پرور طبیعت کے لئے ایک میدانِ عمل درکار تھا۔ آدمی ذہین اور ساتھ ہی ساتھ جری اور دلیر بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے علماء کو للکارا اور بتایا کہ انگریزی پڑھنے والوں کا تعصب عربی کے خلاف نامناسب ہے۔ سر سید کا یہ منشا نہ تھا کہ عربی تعلیم ختم کر دی جائے اور اگر بالفرض ایسا تھا بھی تو عربی کی اہمیت بہرحال مسلم تھی۔ مگر علماء کے لئے جدید علوم کا جاننا ضروری تھا۔ ان کا ایک ضروری فرض یہ بھی تھا کہ وہ یورپی مصنفوں کے حملوں سے اسلام کو بچائیں۔ نئے حالات سے اپنے آپ کو کسی حد تک مطابق کریں اور یورپ کی خوبیوں سے سبق حاصل کریں۔ عربی کے مروجہ نصاب میں ترمیم کی جائے اس کی مدت میں تخفیف ہو۔ فنون کی تعداد کم کر کے ان کے خصوصی مطالعے پر توجہ کی جائے۔ انگریزی زبان لازمی ہو اور تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر کی بھی مشق بہم پہونچائی جائے۔ طلباء کو سیاست میں حصہ لینے سے باز رکھا جائے مگر انھیں ملک کے سیاسی حالات سے باخبر رکھا جائے۔ ان سب باتوں کے علاوہ جو ندوہ میں شبلی کی بدولت ظہور میں آئیں، شبلی نے اپنا ذاتی کتب خانہ ندوہ کو عطا کیا عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔ مصر و عرب کے مجلے اجراء ہوئے اور عام طور پر علماء میں بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ جوش جسے شبلی علی گڑھ میں برانگیختہ نہ کر سکے تھے اُسے اُنھوں نے ندوہ میں برانگیختہ کیا۔[1]

مولانا شبلی کا ایک مقصد ندوہ کے ذریعے ایسے علماء پیدا کرنا تھا جو جدید تعلیم یافتہ گروہ کی تشفی کر سکیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مولوی جدید علوم میں اُن لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے جنھوں نے کالجوں اور اسکولوں میں ان کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ غریب ان کی تشفی کیونکر کر سکتے تھے۔ پھر جو لوگ درحقیقت اسلام پر ایک بہتر نظامِ زندگی کی حیثیت سے ایمان رکھتے تھے وہ مولویوں کی تشفی کے بغیر بھی اس کے قایل تھے۔ اسی طرح جو لوگ مذہب سے بالعموم یا اسلام سے بالخصوص مطمئن نہیں تھے وہ مولویوں کے باوجود مذہب پر نکتہ چینی سے باز نہیں آ سکتے تھے۔ بات اصل میں یہی ہے کہ مولانا شبلی نئے زمانہ میں مولویوں کے وجود کے لئے ایک وجہِ جواز ڈھونڈتے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حیات شبلی"، "شبلی نامہ" اور "موج کوثر" از شیخ محمد اکرام

ہے ۔ اسلام کا مسئلہ مولویوں کے لئے اتنا اہم نہیں تھا جتنا پیٹ کا سوال ۔ ۱۸۹۴ء کے اجلاس ندوہ میں مولانا شبلی علماء کے ان "وسیع اختیارات" کا ذکر کرتے ہیں جو انھیں قوم پر حاصل ہوسکتے ہیں ۔ جب علماء ایک مجموعی قوت پیدا کرلیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ:

"۱۔ اس وقت ندوہ دعوی کرسکتا ہے کہ اوقاف کے لاکھوں روپے جو متولیوں کے ہاتھوں نہایت بیدردی سے برباد ہو رہے ہیں ندوہ کے ہاتھ میں دیدئے جائیں اور گورنمنٹ نہایت خوشی سے اس دعویٰ کو قبول کرے گی ۔

۲ ۔ ندوہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ انگریزی مدارس میں عربی و فارسی کا نصابِ تعلیم جو اس وقت ابتری کی حالت میں ہے اسکی اصلاح کردی جائے اور گورنمنٹ کو اس دعویٰ پر بہت کچھ لحاظ ہوگا ۔

۳ ۔ ندوہ دعوے کرسکتا ہے کہ جس طرح قدیم زمانہ میں عدالت صدر میں فقہی مسائل کے لئے قاضی و مفتی مقرر کئے جاتے تھے وہ قاعدہ سرنو سے قایم کیا جائے ۔

۴ ۔ ندوہ کو اس وقت یہ قوت حاصل ہوگی کہ تمام جماعتِ اسلام اس کی ہدایتوں کی پابند ہو ۔ اس کے فتووں کے آگے سر جھکائے ۔ اس کے فیصلوں سے سرتابی نہ کرسکے"

ان چاروں تجویزوں میں پہلی ، دوسری اور تیسری تجویزیں در اصل مولویوں کے واسطے حکومت کے اندر اثر و رسوخ بڑھانے کے ذرائع ہیں ۔ شبلی نے مولویوں کو مسلمانوں کا روحانی پیشوا ہی نہیں ، دنیوی امام بھی بنانا چاہا ۔ چنانچہ یہ ظاہر ہے کہ یہ تجاویز ناکام ہوئیں ۔ اس سوال کے جواب میں کہ مولوی کھائیں گے کیا ؟ شبلی لکھتے ہیں :-

"اس سوال کا جواب آسان تو یہ تھا کہ اب تک عام مولوی کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں اور علم الاعداد سے نظر آتا ہے کہ عربی مدارس کی تعداد گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی جاتی ہے ۔ جب جب ہم اس کو روک نہیں سکتے تو اس میں کیا ہرج ہے کہ اس گروہ کو زیادہ بکار آمد بنایا جائے"[۲]

کسی گروہ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کر رہا ہے اس کے وجود کا جواز نہیں ۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جنھیں اگر یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو وہ کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کرسکتے ہیں ۔ مثلاً جرائم پیشہ اقوام ۔ گداگر ۔ جواری ۔ بردہ فروش ناجائز اشیاء کی درآمد اور برآمد کرنے والے وغیرہ ۔ نیز علم الاعداد سے یہ نظر آتا ہے کہ ان کی تعداد گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی جارہی ہے ، جب ہم اس کو روک نہیں سکتے تو اس میں کیا مضایقہ ہے کہ ان کو زیادہ کار آمد بنایا جائے ۔ ظاہر ہے کہ یہ دلیل کتنی بودی ہے کچھ گروہ ہمارے لئے مفید ہیں ، کچھ مضر ۔ جو مضر ہیں انھیں ختم ہی کردینا بہتر ہے ، چاہے ان کی تعداد کچھ ہو ۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ مولویوں کا تعلق بھی خدا نخواستہ گداگروں یا جواریوں وغیرہ کے گروہ سے ہے ۔ ایک خاص حلقے کے مولویوں کے بارے میں تو یہ درست ہے لیکن عام طور پر مولویوں کی ذات سے فایدہ بھی پہونچ سکتا ہے ۔ اگر اس کا یقین ہوجائے تو اسے بدلا گھٹنے کی ضرورت ہے ۔ اس طرح کے جملے کہ " وہ کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں " یا اس میں کیا حرج ہے کہ انھیں زیادہ بکار آمد بنایا جائے " احساسِ کمتری کا اظہار کرتے ہیں ۔ اب تک ہم نے مولویت کو ایک پیشہ سمجھ رکھا ہے اور بغیر کسی مقصد کے مولویوں نے عوام پر اپنی حکومت قایم کر رکھی ہے ۔ یہ لوگ ہمارے کمزور اقتصادی نظام پر ایک بوجھ ہیں ۔ بقول شبلی وہ کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ ان "کسی نہ کسی طرح" کی تشریح ضروری نہیں ۔ اس میں تعویذ ، گنڈے ، فال ، اولاد پیدا کرنے کی ترکیبیں ، تماشے اور اسی طرح کی بہت سی شامل ہیں ۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں " اس نقطۂ خیال کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو جو لوگ قدیم عربی مدارس کو بے کار بتاتے ہیں وہ بھی تسلیم کریں گے کہ دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں ہے"[۳] غرض یہ ہے کہ دنیا میں بہت سی چیزیں بیکار بھی ہیں یا اگر

۱؎ مقالات شبلی سوم ۔ [illegible]　۲؎ مقالات شبلی سوم ۔ تعلیم قدیم و جدید ۔

ان سے کوئی فایدہ ہے تو وہ اس قدر بعید، خفیف اور دور از کار، کہ اس سے اُلٹے نقصان کا احتمال ہوتا ہے۔ مثلاً سرمایہ داری، جہالت یا تعصب۔ مولوی بھی اسی طرح بے کار ثابت ہوسکتے ہیں اگر ان کی اقتصادی ضروریات پوری نہ ہوں اور انھیں جدید علوم یا سائنس میں خواہ مخواہ اور بے سمجھے بوجھے ٹانگ اڑانے کا اختیار دیدیا جائے۔ غضب تو یہ ہے کہ شبلی ان مولویوں کا مقابلہ برہمنوں سے کرنے لگتے ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

"یہ کہنا غلط ہے کہ ہر شخص جو عضو معطل ہو وہ اسی طرح فکرِ معاش کرے جیسا کہ وہ گروہ جو کام کرنا چاہتا ہو۔ اسکو مطمئن کرنا اور اس کو اپنی ضروریات سے آزاد کرنا یہ تمھارا فرض ہے۔ ہندؤں نے برہمنوں کے ساتھ کیا کیا؟ انھوں نے برہمنوں کا ایک فرقہ بنایا۔ برہمن کوئی ذات نہیں تھی۔ ہندؤں نے اس قدر عمدہ تقسیم کی تھی کہ میں نثار ہوجاتا ہوں اُنکے اس مسلک پر۔"[۱]

بڑی اُلٹی منطق ہے۔ آپ ایسے گروہوں کا وجود تسلیم کرتے ہیں جو بقول آپ کے عضو معطل ہوں اور آپ کو اس میں قباحت نہیں نظر آتی کہ قوم میں ذات پات کی تفریق ہو۔ حالانکہ کسی ایسے گروہ کو جو اپنی ضروریات کے لئے دوسروں کا دستِ نگر ہو زندہ رہنے کا حق بہت کم ملتا ہے اور ہمارے ملک کے موجودہ افلاس کے پیش نظر ایسے گروہوں کا وجود معاشی ہی نہیں بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی غیر ضروری ہوجاتا ہے۔

مولویوں کی اس گروہ بندی کے پسِ پردہ جو اقتصادی اسباب تھے وہ اگرچہ اہم تھے لیکن یہ بڑی بے انصافی ہوگی اگر ہم انھیں وجوہ کو کافی مان لیں اور اس کے پیچھے جو معاشرتی اور سیاسی رجحانات تھے انھیں نظر انداز کردیں۔ نیا متوسط طبقہ جو انگریزوں کے اثر سے وجود میں آیا تھا علم کے بارے میں اس کا کیا نقطۂ نظر تھا؟ وہ علم کو محض علم کی خاطر حاصل نہیں کرتا تھا بلکہ اسے اپنے اغراض و مقاصد کا آلۂ کار بنانا چاہتا تھا۔ وہ اسے معاش اور دنیوی ترقی کا ایک ذریعہ سمجھتا تھا۔ انگریزوں سے پہلے تعلیم لازم نہیں تھی۔ ہاں اگر کوئی شخص اسے مقررہ حدود سے زاید حاصل کرلیتا تو ایک خاص حلقے میں اس کی عزت کی جاتی تھی۔ انگریزوں کے عہد میں جدید تعلیم کس طرح حکومت کے استحکام کا ایک ذریعہ بن گئی، اس کی تاریخ اس جگہ دہرانا مقصود نہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے حکومت کو مستحکم کرنے میں انگریزوں کی مدد کی انھیں حکومت کا مربیانہ تعاون حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی مگر یہ تعلیم عوام کے دلوں تک نہ پہنچ سکی اور متوسط طبقے میں بھی جہاں اس کی کامیابی کی امید تھی اس کا تناسب بقدر ضرورت نہ ہوسکا۔ ہندوستان اور پاکستان میں تعلیم ویسے ہی کم ہے، اور جہاں ہے، وہاں کچھ غربت اور کچھ عصبیت کے باعث، اور کچھ اس وجہ سے کہ اس کی تکمیل کے لئے خاص لمبی مدت درکار ہوتی ہے جس میں ایک خاندان پر نہ جانے کتنے انقلاب گزر جاتے ہیں، ایک ہی خاندان کے سب افراد اس سے یکساں طور پر مستفید نہیں ہو پاتے چنانچہ جن لوگوں نے ہمت کرکے اپنے نورچشموں کو یہ تعلیم دلائی وہ قدرتی طور پر ان کے مستقبل کی بابت لذیذ خوش فہمیوں میں مبتلا ہوگئے۔ ان حالات میں نیا تعلیم یافتہ طبقہ اپنی تعلیم کی نسبت ذرا اور حساس ہوگیا۔ اس نے اچانک اپنے سارے طور طریقے بدل دئے۔ وہ حکام کے ساتھ میل جول رکھنے میں فخر محسوس کرتا تھا، سرکاری ملازمت اس کے تخیل کی معراج بن گئی تھی۔ خوشامد، سازش، حکام رسی اور مصلحت بینی اُس کے وہ حربے تھے جنھیں لیکر وہ زندگی میں داخل ہوتا اور آخرکار خود انھیں حربوں کا شکار ہوجاتا۔ اُس نے مغربی طرز بود و ماند کا سطحی مشاہدہ کیا تھا اور اس کے بعض اصول اُسے ازبر تھے۔ مگر وہ خود ان پر عمل بہت کم کرتا تھا۔ اس تعلیم یافتہ گروہ کو شبلی نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اسی کے ذریعہ سے اُنکی رسائی مغرب تک ہوئی تھی۔ اُن کے تعلقات انگریزوں سے بھی تھے اور ان انگریزنما ہندوستانیوں سے بھی۔ اگرچہ بعد میں وہ دونوں سے متنفر ہوگئے تھے اور اگرچہ دونوں کی ظاہری تہذیب میں جو پوشیدہ حیوانیت تھی، ان کی

[۱] مقالات شبلی۔ "تعلیم"

ٹوں میں جو خود غرضی کی بو تھی، ان کے جلسوں اور کلب گھروں میں جو "کوٹ پتلون کی نمایش" تھی وہ ان کی نگاہوں سے چھپی رہ سکی لیکن وہ صحیح طور پر ان اسباب کا کھوج نہ لگا سکے جو اس کے لئے ذمہ دار تھے۔ اپنی تنقید میں انھوں نے عقل سے زیادہ جذبات سے کام لیا۔ اُن کا مشاہدہ سچّا تھا، تجزیہ سچا نہ تھا۔ اُنھوں نے ہندوستان کے طبقۂ اوسط کے افلاس اور احساسِ شکست کو نظر انداز کر دیا اور اُن مجبوریوں اور معذوریوں کو نہ دیکھا جو اس افلاس اور کس مپرسی اور جھوٹی عزت کو برقرار رکھنے کی کوشش کے باعث نئے نوجوان پر چاروں طرف سے مسلط تھیں۔ انھوں نے لارڈ میکالے کی اس اسکیم کو نہ سمجھا جس کا مقصد ہندوستان میں حکومت کی مشینری کے لئے اچھے کلرک مہیا کرنا تھا۔ انھوں نے سرمایہ دارانہ تہذیب کی اس اندھی کشاکش کو محسوس نہیں کیا جس کا نتیجہ ایک فرد کو دوسرے فرد سے اور ایک انا کو دوسری انا سے جدا کرنا تھا۔ اس تہذیب میں ایک آدمی دوسرے آدمی سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ افریقہ ہندوستان سے۔ شبلی نے اپنے فرزند کے نام ایک خط میں انگریزی دانوں کی حرص کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اول تو یہ بات کچھ انگریزی پڑھنے والوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر طبقے میں ملتی ہے، پھر اس کی وجہ کیا ہے؟ سرمایہ دارانہ معاشرت جس کی بنیاد در اصل ایک طرح کے سخت مقابلہ اور مسابقت پر رکھی گئی ہے اس میں ایک فرد کی کامیابی دوسرے کے دل کا کانٹا اور ایک کی شکم سیری دوسرے کی گرسنگی ہے۔ اس میں گھر کے بنانے والے کم ہیں، جلنے کا تماشہ دیکھنے والے زیادہ اس باہمی مقابلے میں سب سے زیادہ اہمیت اقتصادی حالات کو حاصل ہے یہ اقتصادی حالات مغربی سرمایہ داروں کی اُس بہیمانہ زر اندوزی سے متعلق ہیں جو تین سو سال سے ہندوستان کو لوٹنے کھسوٹنے میں مصروف ہے۔ اس غیر ملکی طاقت، اس کی خود غرضی اور وحشیانہ استحصال کو شبلی نے محسوس نہیں کیا اور اسی وجہ سے انگریزی دانوں کو مورد الزام ٹھہرایا۔

کہا جاتا ہے کہ مولانا شبلی کا علماء پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے علماء کو جدید علوم سے آشنا کرایا۔ لیکن یہ بھی محض تبرک ہی تبرک تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے جن سے زیادہ معتبر راوی اور کوئی نہیں ہو سکتا "حیاتِ شبلی" میں لکھا ہے کہ شبلی کا مقصد یہ تھا کہ "پہلے جدید علوم کو مسلمان بنانا چاہئے۔ پھر ان کو مسلمانوں میں رواج دینا چاہئے" جہاں تک مسلمان بنانے کا سوال ہے، اس مفروضے کے ماتحت اس کے امکانات بے حد بڑھ جاتے ہیں اور تصوف سے لیکر ریڈیو، ایٹم بم اور بینکنگ کے تازہ ترین اصولوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جس چیز کو چاہئے اسلام لانے پر مجبور کیجئے۔ (ہمیں تو بہرحال آپ کے "فتوؤں کے آگے سر جھکانا" ہی پڑے گا) اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مولانا شبلی کے نزدیک یہ جدید علوم بذات خود اہم نہیں تھے۔ ان کی اہمیت اس بات میں تھی کہ وہ مذہبی عقاید کی کس حد تک تائید کرتے ہیں۔ جہاں یہ تائید ختم اور اختلاف شروع ہوا وہاں ان کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ پھر ان کی تردید شروع ہو جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ "جدید علوم و مسایل سے اُن کی واقفیت بھی محض سُنی سنائی ہی تھی"۔ (حیاتِ شبلی۔ مقدمہ) اس کھینچا تانی سے جہاں خود مولانا کی کم نظری ظاہر ہوتی ہے، وہاں دوسری طرف جدید علوم کو بھی بے اندازہ نقصان پہونچ سکتا ہے، اور تیسری طرف علماء میں مولانا کی طرف سے برہمی پیدا ہوتی ہے جس کا ایک واضح ثبوت خود ندوہ سے مولانا کی علٰحدگی ہے۔

مفتون احمد

شہاب کی سرگزشت

سائنس کے نظر نہ آنے والے آلات

اس وقت ماہرین سائنس جن آلات سے کام لیتے ہیں ان کی فہرست بہت طویل ہے، اور ان میں سے بعض آلات اتنے نازک اس قدر چھوٹے ہیں کہ نگاہ انھیں دیکھ بھی نہیں سکتی۔

بظاہر یہ بات ناممکن سی معلوم ہوتی ہے اور مشکل سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ جب کوئی آلہ نظر ہی نہیں آتا تو اس سے کیونکر لیا جاسکتا ہے، لیکن سائنس کی دنیا میں بہت سی وہ باتیں جنھیں ہم ناممکن سمجھتے ہیں ممکن ہوجاتی ہیں اور انھیں میں سے ایجاد ان خورد بینی آلات کی بھی ہے، جن کی مدد سے قدرت کے بہت سے وہ راز جو آج تک پوشیدہ تھے، ظاہر ہوتے جارہے ہیں۔

مثلاً سرطان کے جراثیم، آٹم کے جوہری ذرات یا خود تخلیقِ حیات کے اسباب کہ اس وقت تک ان کی کامل تحقیقات نہ ہوسکی لیکن اب ان خورد بینی آلات کی مدد سے معلومات میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔

جراثیم کی حقیر جسامت اور ان کی کثرت کا اندازہ آسان نہیں۔ اگر آپ سے کہا جائے کہ ایک انچ لکڑی کے ٹکڑے کو آپ ا حصوں میں تقسیم کردیں تو ایسا کرنا ممکن نہ ہوگا حالانکہ جراثیم کی جسامت اتنی ہی بلکہ اس سے بھی کم ہے، اسی کے ساتھ جب آپ ان کی کثرت پر غور کریں گے تو اس سے زیادہ حیرت ہوگی۔ پانی کے ایک قطرہ کی کیا حیثیت ہے، لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس ایک قطرہ میں مختلف جراثیم پائے جاتے ہیں۔ ہزار دو ہزار نہیں، لاکھ دو لاکھ نہیں بلکہ کم از کم ۱۰ لاکھ سے ۲۰ لاکھ تک، پھر غور کیجئے کہ ا خورد بینی جراثیم کو ایک دوسرے سے علحدہ کرنا، ان کے مختلف گروپ متعین کرنا اور ہر ہر جرثومہ کو اس کے گروپ سے جدا کرکے ا عمل جراحی کرنا، کس قدر دقیق و مشکل کام ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے نازک کام کے لئے آلات بھی ایسے ہی نازک ہونا چاہئے اور اب سائنس نے ایسی خورد بینی آلات اور نشتر طیار کرلئے ہیں جن کی مدد سے ایک جرثومہ پر بھی عمل جراحی ہوسکتا ہے۔

اس قسم کے خورد بینی آلات طیار کرنے کا خیال اب سے ایک صدی قبل لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوا تھا، لیکن اس کی تکمیل سو سال بعد ایک فرانسیسی سائنس داں کی قسمت میں لکھی تھی۔

یہ بات عرصہ سے معلوم تھی کہ اگر کانچ کو گرم کرکے اس کا تار کھینچا جائے تو وہ اس حد تک بڑھایا جاسکتا ہے کہ نگاہ کو نظر نہ آئے اور اس تار سے سوئیاں وغیرہ بنائی جاسکتی تھیں، لیکن سوال یہ تھا کہ اس نظر نہ آنے والے تار سے نظر نہ آنے والے آلات کیونکر کئے جائیں۔

سب سے پہلے ۱۸۵۹ء میں فلاڈلفیا کے ایک ڈاکٹر ہنری شمدٹ نے ایک مشین ایسی طیار کی جس سے کانچ کے خورد بینی ا و آلات طیار کرنے کا امکان پیدا ہوا، لیکن یہ مشین زیادہ نازک نہ تھی اور چونکہ ہاتھ ہی کی مدد سے اس کو چلایا جاتا تھا، اسلئے خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تاہم مشق و مزاولت سے کانچ کے بعض آلات ضرور ایسے طیار ہوسکے جو پہلے موجود نہ تھے اور ان کی مدد سے صدی کے آغاز میں ایک ماہر حیاتیات بڑے بڑے خلایا (cells) پر عمل جراحی کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جس وقت یہ ماہر حیا اپنے عمل جراحی کا مظاہرہ کر رہا تھا تو تماشائیوں میں ایک فرانسیسی سائنس داں پری ڈی فان برملد بھی موجود تھا۔ یہ حیاتیات

مطالعہ کا بڑا شایق تھا، اس کو اس ایجاد میں بڑے امکانات نظر آئے اور اس نے ارادہ کرلیا کہ اپنی زندگی ان خوردبینی آلات کی طیاری میں صرف کردے گا۔

اس کے سامنے دو مسئلے تھے ایک یہ کہ زیادہ بہتر خوردبینی آلات طیار کئے جائیں اور دوسرے یہ کہ آلات و اوزار ہر قسم کے ہوں تاکہ ان کی مدد سے ہر قسم کی تحقیقات ہوسکے۔ اس نے کامل ۲ سال اس کوشش میں صرف کردیئے اور آخرکار وہ ایک ایسی خوردبینی بھٹی طیار کرنے میں کامیاب ہوگیا جس میں یہ خوردبینی اوزار و آلات طیار ہوسکتے تھے۔ یہ بھٹی کیا تھی؟ پلاٹنم کا ایک نہایت ہی چھوٹا سا تار جس کے سرے کو ایک چھوٹی سی دھوکنی کی مدد سے مختلف درجات حرارت تک گرم و روشن کیا جاسکتا تھا اور اس کی مدد سے کانچ کے تار کو کھینچ کر خوردبینی اوزار طیار ہوسکتے تھے یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ دنیائے سائنس فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگئی اور رفتہ رفتہ اس ایجاد کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ آج دنیا میں یہ خوردبینی بھٹیاں ۲۰۰ کی تعداد میں پائی جاتی ہیں جن کی مدد سے ایک ماہر پندرہ منٹ میں ایک درجن اوزار سادہ ساخت کے طیار کرسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی مشکل یہ سامنے آئی کہ ہاتھ کی حرکت پر کیونکر اتنا قابو حاصل ہوسکتا ہے کہ اس کی مدد سے یہ خوردبینی اوزار طیار ہوسکیں، مثلاً یوں سمجھئے کہ اگر انھیں ایک سوئی ایسی طیار کرنا ہے جس کی جسامت ۱/۲۵۰۰ انچ ہو تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہاتھ کسی آلہ کو اتنی نازک حرکت دے سکے۔
اس مشکل کو موجد نے ایک اور مشین کی مدد سے دور کیا اور کچھ ایسا حساب رکھا کہ اگر اس مشین کو ایک انچ حرکت دیجائے تو اوزار بنانے والے آلہ میں ۱/۱۵۰۰ انچ سے زیادہ حرکت پیدا نہ ہو۔ الغرض یہ فرانسیسی سائنس داں اپنی کوشش میں اس قدر کامیاب ہوا اور اس کی خوردبینی بھٹی اور خوردبینی آلات و اوزار بنانے والی مشین اتنی مقبول ہوئی کہ ساری دنیا میں اس کی مانگ شروع ہوگئی اور اسے ایک مستقل کارخانہ قایم کرنا پڑا۔ جن میں خوردبینی نلکیاں، سوئیاں، کانٹے، چمٹیاں، نشتر اور ہتوڑیاں طیار ہوتی ہیں اور ان کی نظر نہ آنے والی جسامت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک خوردبینی ہتوڑی کے سرے کا قطر ایک انچ کے ڈھائی لاکھویں (۱/۲۵۰۰۰۰) حصہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔

ان خوردبینی آلات و اوزار سے جو فوایدِ دنیائے سائنس کو پہونچے ہیں، ان کا بھی سرسری ذکر سن لیجئے!۔

آپ نے ایک پودھا دیکھا ہوگا جسے ہم کوکرمتا کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے کہتے ہیں۔ یہ وہاں بڑی مقبول ترکاری ہے اور اس کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں جن میں سے بعض بدمزہ اور محض خوش ذایقہ ہوتی ہیں۔ لیکن اسوقت تک ماہر نباتیات اس باب میں کامیاب نہ ہوسکے تھے کہ وہ صرف خوش مزہ پیدا کرسکیں، کیونکہ یہ ترکاری خودرو قسم کی ہے اور ان بیشمار ریشوں سے پیدا ہوتی ہے جن میں خوش مزہ اور بدمزہ سبھی قسم کے ریشے ملے جلے ہوتے ہیں۔ یہ ریشے اس قدر باریک ہوتے ہیں کہ ایک لاکھ ریشوں کا گچھا بھی خوردبین میں ایک نہایت ہی حقیر سا دھبا نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان ریشوں میں سے صرف خوش مزہ ریشوں کو چھانٹ لینا محال تھا، لیکن اب خوردبینی چمٹیوں کے ذریعہ سے یہ مسکل حل ہوگئی اور اس طرح صرف خوش مزہ کی کاشت آسان ہوگئی۔

ڈبل روٹی بنانے میں خمیر کی نوعیت کا اندازہ بڑا مشکل کام ہے۔ جس چیز کو خمیر کہتے ہیں وہ دراصل نباتاتی خلایا کا ایک گچھا ہے جو آٹے یا میدہ میں پیدا ہوجاتا ہے اور یہ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ نصف انچ خمیر میں ۱۵ ارب خلایا سے کم نہیں پائے جاتے۔ ان میں بعض خلیے ( ) پختہ ہوتے ہیں بعض خام، اور کام کے خلیے وہی ہیں جو پختہ ہوں لیکن ان کو خام خلیوں ( ) سے علحدہ نہیں کرسکتے تھے۔ اب ان خوردبینی آلات کی مدد سے یہ بات ممکن ہوگئی ہے کہ خمیر کے عمدہ اور پختہ خلایا علحدہ کرلئے جائیں اور انھیں کی مدد سے عمدہ روٹی طیار کی جائے۔

نادر و بیش قیمت دھاتوں کے استعمال کے سلسلہ میں بھی ان خوردبینی آلات سے بہت فایدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ مثلاً ایک

ایک دھات ہے پلوٹونیم (Plutonium) ہے جو سائنس کے تجربات کے لئے بہت ضروری ہے، لیکن اس کی موجودہ مقدار اتنی کم ہے کہ اس سے زیادہ فایدہ نہیں اُٹھایا جاتا، لیکن اب خورد بینی اوزار کی مدد سے اس کے باریک ذرات کئے جاسکتے ہیں اور ان سے سائنسی تجربات میں زیادہ وسعت پیدا ہوسکتی ہے۔

دنیائے طب میں ان خورد بینی آلات کی مدد سے بڑا زبردست فایدہ اُٹھایا جا رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جدید طریق علاج میں Serum اور Vaccine کو بڑی اہمیت حاصل ہے، یعنی جن جراثیم سے جو بیماری پیدا ہوتی ہے، انھیں سے سیال مادہ طیار کرکے مریض کے خون میں پہونچانا۔ لیکن کسی خاص مرض کا بہترین سیرم یا ٹیکہ طیار کرنا اس پر منحصر ہے کہ صرف انھیں جراثیم سے مادہ طیار کیا جائے، جو کسی مخصوص مرض کے پیدا کرنے والے ہیں، لیکن یہ بہت مشکل ہے، کیونکہ جراثیم کے جس جھنڈ سے یہ مادہ طیار کیا جاتا ہے اس میں سبھی قسم کے جراثیم ہوتے ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے علحدہ نہیں کرسکتے، لیکن اب ان خورد بینی اوزار کی مدد سے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ جراثیم کے اس جھنڈ سے ہم صرف مخصوص امراض کے جراثیم چن لیں اور انھیں کا خالص سیرم طیار کرکے جلد از جلد مرض کا ازالہ کرسکیں۔

اعصابی امراض کا تعلق اعصابی ریشوں سے ہے اور یہ ریشے اس قدر باریک ہیں کہ ایک ریشہ کا قطر ایک انچ کے پانچ ہزارویں ($\frac{1}{5000}$) حصہ کے برابر ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ ان ریشوں کا ایک دوسرے سے جدا کرنا آسان نہیں لیکن اب خورد بینی اوزار سے ایک ایک ریشہ کو علحدہ کرکے دیکھا جاسکتا ہے کہ وہ کس حد تک مجروح ہے اور اس کا ازالہ کیونکر ممکن ہے۔

اسی طرح خون کی بیماریوں کے ماہرین اب ان خورد بینی اوزار کی مدد سے خون کے ہر ہر سرخ ذرہ کو علحدہ کرکے اور ان کے اندر ملیریا وغیرہ کے جراثیم داخل کرکے صحیح نتائج کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔

ان آلات کی مدد سے کام لیکر اب سرطان کے ایک ایک خلیے (Cells) کو علحدہ کرکے دیکھا جاسکتا ہے کہ وہ دوسرے خلایا سے کیا اختلاف رکھتا ہے اور اس کا نشو و نما کیوں اس قدر جلد ہوتا ہے۔

داغ کی شاعری کے صحت مند عناصر

داغ قدیم رنگِ سخن کے ممتاز شعراء کی آخری یادگار تھے۔ انھوں نے دلی کی پرانی معاشرت کے انحطاط و انتشار اور اردو غزل کے بلوغ و شباب کا بہت قریب سے اور براہ راست مشاہدہ کیا تھا۔ اُن کی شاعری کا سراغ، اُن کی افتادِ طبع اُن کے سماجی حالات، اور دلی، رامپور اور حیدر آباد کی اُس عام کلچرل زندگی میں ڈھونڈا جاسکتا ہے، جہاں سے اُن کے تخیل اور اُن کے فنی مواد نے قوت حاصل کی تھی۔ داغ کے یہاں روز مرہ کی جو صفائی، بندش کی جو چستی، طرزِ ادا کی جو شوخی اور بانکپن، معاملاتِ حسن و عشق میں جو طراری اور تیکھاپن، اظہار میں جو تنوع اور مشاقی نظر آتی ہے، اُس میں ذوق کی شاگردی، قلعۂ معلّٰی کی سہل پسند فضا اور رام پور کی ادبی سرگرمیوں کو بڑا دخل ہے۔ آج جب کہ زندگی اور زمانہ کا رخ دگرگوں ہو چکا ہے اور ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں، جس کے مسایلِ حیات و فن، اُس دور کے مسایل سے یکسر مختلف ہیں، جن میں داغ، امیر اور جلال کا طوطی بول رہا تھا، تو ہمیں اس امر پر ایک گونہ حیرت ہوتی ہے کہ آخر اُس زمانہ کی شاعری میں جذبات کا وہ تنوع (multiplicity) اجتماعی زندگی کی باطنی کشمکش کا وہ عکس، اور انفرادی روح کی اُلجھنوں اور اُس کے کرب و غم کا احساس کیوں نہیں ملتا، جس کی ہم جدید شاعری میں اس درجہ جستجو کرتے ہیں۔ دراصل یہ استعجاب ایک غلط طریقۂ کار کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخی شعور کی غیر موجودگی میں کسی شاعر کے سرمایہ کا احتساب کیا جاتا ہے، آج شعر و ادب کے اسالیب ہی نہیں بدل گئے ہیں بلکہ وہ واضح اور معین حالات بھی تبدیل ہوگئے ہیں، جو ادبی اسالیب کو جنم دیتے ہیں اور قدروں کے ڈھانچے کو ایک قابلِ فہم شکل عطا کرتے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ادب میں بنیادی اور عالمگیر قدروں کا وجود نہیں ہے یا اُن کی تلاش بے سود ہے۔ لیکن یہ قدریں معین اور مخصوص حالات ہی میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی اور ہمارے ادراک کی گرفت میں آسکتی ہیں۔ حسن و عشق کے جذبات بنیادی اور ناقابلِ تغیر ضرور ہیں۔ لیکن اُن کی تعبیر و تفسیر اور مصوری میں نازک فرق کچھ تو ادیب اور شاعر کی انفرادی استعداد و بصیرت کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے اور کچھ اُن مادی حالات کے تغیر و تبدل سے جو بنیادی جذبات کی وسعت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

داغ کی شاعری کو چوچلے اور بوالہوسی کی شاعری کہکر اُس کی اہمیت کو کم کرنے کی جو کوشش ہم کرتے رہے ہیں، اُس کے تین اسباب ہیں۔ اول تو یہ کہ داغ کی شاعری کا وہ حصہ (اور اس حصہ کا حجم کافی ہے) جو حیدر آباد میں اُس وقت لکھا گیا، جبکہ معاشی آسودگی شہرت اور ذہنی اطمینان نے داغ کی تخلیقی صلاحیتوں میں ٹھیراؤ پیدا کردیا تھا۔ واقعی اس قدر کم وزن اور سطحی ہے کہ اُسے ایک طرح کی لفظی بازیگری سے زیادہ اہمیت نہیں دیجا سکتی۔ دوسرے یہ کہ داغ نے جس مخصوص معاشرت میں آنکھیں کھولیں اُسمیں زندگی کی بنیادی اور ہمہ گیر قدریں محض ایک نشان ہوکر رہ گئی تھیں۔ جنھیں لوگوں نے تبرک کے طور پر قبول کرلیا تھا۔ بھرپور زندگی بسر کرنے کے لئے جن سرشار تجربوں، جس گہرے علم، جس سچی بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے، اُس سے پوری اجتماعی روح غیر آہنگ ہوچکی تھی اسی سلسلہ میں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ رام پور کے مشاعروں اور اُن ہم طرحی غزلوں کی مسابقت نے جو گلدستہ کے لئے لکھی جاتی تھیں اور جن میں رام پور کے تمام شعراء حصہ لیتے تھے، اگر ایک طرف داغ کی فن کارانہ صلاحیتوں کو اُبھارا اور چمکایا، تو دوسری طرف مواد کے اُن عناصر کی جانب سے اُن کی توجہ رفتہ رفتہ اور بھی کم کردی، جو پہلے بھی بافراط موجود نہیں تھے۔ یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ

اگر کسی شاعر کو کسی خاص زمین میں محض اپنے حریفوں پر بازی لے جانے اور اپنی قادرالکلامی کا سکہ بٹھانے کے لئے غزلیں کہنی پڑیں، تو اُس کے تخیل کے سوتے بہت جلد خشک ہوجائیں گے۔ بجز اس صورت کے کہ اُس کے تخیل میں غیر معمولی رچاؤ، ندرت اور طرفگی موجود ہو، اور اُس کے تجربات و مشاہدات اس حد تک مربوط و منظم ہوگئے ہوں کہ وہ بآسانی مختلف قافیوں کے قالب میں ڈھل جائیں۔ قیمت یہ کہ شاعری کی تنقید میں ہم ابھی تک پیورٹین (Puritan) معیاروں کو برتتے رہے ہیں، اسی لئے جب ہم کسی ایسے شاعر پر تنقید کرنے بیٹھتے ہیں، جس نے اپنے کلام میں جسم کی لذتوں اور جنسی تجربوں کو بغیر کسی ذہنی پس و پیش کے اور ایک حد تک جرأت و بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہو، تو ہم اُس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں اور ایسی شاعری کو قابلِ حقارت سمجھنے لگتے ہیں۔ میری رائے میں کسی شاعر کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونے کا فیصلہ اس بنیاد پر کرنا کہ وہ خالص روحانی یا خالص جسمانی تجربوں کا بیان ہے، صحیح نہیں ہے، کیونکہ انسانی جذبات اور تجربے سادہ اور بے رنگ نہیں ہوتے۔ اس سلسلہ میں ہمیں سب سے پہلے تو اُس پیورٹین اندازِ فکر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہئے۔ جو مادی زندگی کی تمام نعمتوں کو انسان پر حرام کردیتا ہے۔ اُس کے بعد یہ غور کرنا چاہئے کہ جن تجربات سے ایک فنی کارنامہ پیش کیا جاتا ہے، وہ حقیقی ہیں یا محض روایتی، پھر یہ بھی دیکھنا ازبس ضروری ہے کہ شاعر نے اُن تجربات کے معنی خیز پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، یا صرف ضمنی، سطحی اور ذاتی پہلوؤں کو۔ میرا خیال ہے کہ تنقید کے ان اصول کو نظرانداز کردینے کی وجہ سے داغ کی شاعری پر کوئی ایسا متوازن فیصلہ نہیں ہوسکا، جو اُن کی شہرت کی جایز بنیادوں کی طرف متوجہ کرتا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہے کہ داغ کی شاعری کا معتدبہ حصہ محض بازیگری ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ داغ کے تجربات میں اکثر اُس خلوص، اُس لگن اور اُس شدت کی بھی کمی ہے، جو کامیاب عشقیہ شاعری کے لئے لازم ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اُن کے یہاں ہمیں ایسا چونچلا، ایسی لذتیت اور ایسا گھٹیاپن ملتا ہے، جس سے سنجیدگی آنکھیں چراتی ہے۔ تاہم میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس دل لگی، چھیڑ چھاڑ اور بذلہ سنجی کے نیچے ایک تہ ایسی بھی ہے، جسے صحت مندی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

داغ کی شاعری میں زبان و بیان کا جو مزہ اور واردات قلب کا جو رنگین و شگفتہ اظہار ہے، اُس پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ یہ کارنامہ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ اور یہ تسلیم کرنے میں کسی کو مطلق تامل نہیں ہوگا۔ کہ اُردو زبان کے ارتقا میں داغ کا بڑا حصہ ہے۔ غزل کے اسالیب میں تراش و خراش کا جو سلسلہ برابر جاری رہا۔ اُس میں داغ کی شاعری ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو ادیب و شاعر اُردو زبان میں ہیرے کی سی چمک، اور موسیقی کا سا رس پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں اُن میں داغ کا نام ضرور شامل کرنا ہوگا۔ داغ کو اپنی اس قنوطیت کا خود بھی بڑا احساس تھا، چنانچہ اُس نے اپنے کلام میں جابجا اپنی فصاحت اور زبان دانی کی طرف اشارے کئے ہیں۔ داغ کی مضمون آفرینی کو بھی سراہا گیا ہے لیکن اظہار بیان اور خیال میں جو نامیاتی رشتہ ہوتا ہے، اُس کے پیشِ نظر داغ کے کمال کا اعتراف شاید ابھی تک نہیں کیا گیا۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر وہ شاعر جسے زبان و بیان پر قدرت حاصل ہو، لازمی طور پر معنوی اعتبار سے بھی وزن و وقار رکھتا ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم شاید آج ذوق کی بھی اتنی ہی قدر کرتے، جتنی اُن کے معاصرین غالب اور مومن کرتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ داغ کے اچھے اشعار وہی ہیں، جن میں روزمرہ کی صفائی و برجستگی، مضمون کی جدت و خوبی کے ساتھ گھل مل گئی ہے۔ داغ غزل لکھنے میں کوئی بڑی کاوش نہیں کرتے تھے، نہ اُن کے کلام میں ہمیں معنی و مفہوم کی وہ سطحیں نظر آتی ہیں جو بڑے شاعروں کا طرۂ امتیاز ہیں، لیکن محدود معنی میں مضمون آفرینی اُن کے اچھے اشعار میں ہمیں ضرور ملتی ہے۔ وہ اعلیٰ شاعرانہ جوہر جو کسی تجربہ کے متنوع و متضاد پہلوؤں پر مشتمل ہوتا ہے، اُن میں نہیں تھا، اُن کے تجربات میں بھی فراوانی و وسعت نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود اُن کے مشاہدات میں تازگی و طرفگی نظر آتی ہے۔ جدت آفرینی کے متعلق ہمارا نظریہ ابھی تک کچھ میکانکی سا رہا ہے۔ بجز اُن شاعروں کے جو کسی مشہور شاعر کی کسی خاص غزل پر غزل لکھتے ہیں۔ کوئی اچھا شاعر اپنے پیشروؤں یا ہمعصروں پر تلاش

مضمون کے سلسلہ میں سبقت لے جانے کی ارادی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ کہیں کہیں ایک شاعر کے تجربات، دوسرے شاعر کے تجربات سے ہم آہنگ ہوجاتے ہیں، اور جب دو شاعر تقریباً یکساں اور متوازی تجربات بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ اپنے علم، مشاہدہ اور وجدان کے لحاظ سے اس بیان میں اشاریت پیدا کرسکتے ہیں اور اسی بنیاد پر ہم اُن کے شاعرانہ مرتبہ کا تعین کرتے ہیں۔ داغ کی شاعری کا مرکز و محور حسن و عشق کے جذبات و معاملات ہیں۔ اُن غزلوں اور اشعار سے قطع نظر جو بغیر کسی زبردست محرک کے، محض مشق یا مقابلہ کے خاطر لکھے گئے ہیں، داغ کے اچھے اشعار کو پڑھکر ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بیش با افتادہ مضامین میں ایک نوع کی جدت اور لطف پیدا کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ مثال کے لئے یہ اشعار دیکھئے :-

دل میں لے دے کر رہا تھا ایک قطرہ خون کا ــــ کچھ نثارِ غم ہوا، کچھ صرفِ مژگاں ہوگیا،

نہ پوچھئے مرے روزِ سیاہ کی ظلمت ــــ چراغ لے کے بھی ڈھونڈا، تو آفتاب نہ تھا

وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چار طرف ــــ ٹھہر گئے تو زمانہ کو انقلاب نہ تھا،

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں ــــ دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں ــــ مجھ سے کہاں چھپیں گے، وہ ایسے کہاں کے ہیں

جس دن سے کچھ شریک ہوئی میری مشتِ خاک ــــ اُس روز سے زمیں پہ ستم آسماں کے ہیں

کیا رشک ہے کہ طالبِ ہجراں ہوں اس لئے ــــ جو مجھ کو ہے رقیب کو وہ آرزو نہ ہو

تم آئینہ ہی دیکھ کے حیران رہ گئے ــــ واللہ میرے دل میں اک ایسا ہی اور ہے

قاتل نے دیکھے اس میں ہزاروں پری جمال ــــ دل چاک کیا ہوا کہ پری خانہ کھل گیا

شباب آنے نہ پایا کہ عشق نے مارا ــــ یہاں بہار کے لالے پڑے خزاں کیسی

ہم دل کی بات داورِ محشر سے کیا کہیں ــــ یہ راز کہہ کے اُس بتِ کافر سے کیا کہیں

داغ اور ان کے معاصرین کی شاعری پر الزام لگایا گیا ہے کہ اس میں تصنع زیادہ ہے اور واقعیت بہت کم۔ یہ الزام بالکل غلط تو نہیں، لیکن ایک حد تک مبالغہ آمیز ضرور ہے۔ در اصل اس مسئلہ پر کوئی صحیح رائے قائم کرنے کے لئے دو باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اول تو یہ کہ یہ الزام دلی کے شاعروں سے کہیں زیادہ لکھنؤ کے شاعروں پر عاید ہوتا ہے۔ دلی کی شاعری میں جذبہ کی صداقت اور اس کے برعکس لکھنؤ کی شاعری میں روایت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ صرف آتش اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں ظاہر ہے کہ جس معاشرت میں اصل جذبات کی جگہ صرف اُن کی روایت بروئے کار ہو، وہاں خارجیت اور سطحیت کا پیدا ہوجانا ناگزیر ہے۔ اور جب جذبات نگاری کی بجائے صرف قافیہ پیمائی شاعروں کا شعار ہوکر رہ جائے، تو اعلیٰ اور کامیاب عشقیہ شاعری کے محاسن کا، جو عبارت ہیں جذبات کی شدت و خلوص سے شاعر کی کائناتِ شعری سے خارج ہوجانا چنداں محلِ حیرت نہیں۔ دوسرے یہ کہ اُن جنسی تجربات کی نوعیت جن پر بیشتر شاعروں کے کلام کی بنیاد قایم ہے یکسر بدل گئی ہے۔ اس تبدیلی کا براہ راست تعلق مادی حالات کی تبدیلیوں سے ہے۔ عورت اور مرد کے تعلقات کا تجزیہ اب ہم پردوں میں چھپائے بغیر کرتے ہیں۔ یہ بہت ممکن ہو کہ جس خامی کو ہم تصنع سے تعبیر کرتے ہیں وہ ان شاعروں کے تجربات کی خامی نہ ہو، بلکہ اُس معاشرت کی کمزوری ثابت ہو، جو مرد اور عورت کے تعلقات کو ایک غیر حقیقی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ داغ کے متعلق یہ کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں ہے۔ کہ ان کا عشق وہی عشق ہے، جو اُسی زمانہ کے شرفار طوائفوں سے کیا کرتے تھے۔ آزاد جنسی محبت کی یہی ایک شکل تھی، جو اُس سماج میں رائج تھی۔ داغ کے یہاں جو دل لگی چھیڑ چھاڑ، شوخی اور گرم گفتاری ملتی ہے۔ اُسے جب اس پس منظر میں رکھ کر دیکھئے تو وہ پر تصنع معلوم ہونے کی بجائے بہت کچھ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ رقیب کا تصور بھی محض روایتی نہیں ہے بلکہ

یہ بھی اُنہی محفلوں اور سرگرمیوں کی یاد دلاتا ہے، جو اُس زمانہ کی سوسائٹی میں بہت عام تھیں۔ یہ سب چیزیں جاگیرداری نظام سے وابستہ تھیں۔ اسی لئے داغ اور اُن کے معاصرین کی شاعری میں ہمیں اس فضا کا احساس کم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اُس زمانہ میں نہ نفسیات کی موشگافیوں سے ہم روشناس ہوئے تھے، اور نہ سماجی علوم نے اتنی ترقی کی تھی، جتنی آج کرلی ہے۔ ان سب کا نتیجہ تھا کہ بیشتر غزل گو شاعر نہ اپنے جذبات کا کوئی نفسیاتی تجزیہ کرسکتے تھے، نہ انفرادی تاثرات کا رشتہ سماجی حالات سے جوڑنے کی کوشش کرتے تھے اور نہ حسن وعشق کے معاملات کو وسیع تجربہ اور گہری اشاریت کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی طرف میلان رکھتے تھے۔

اسی نقطۂ نظر سے اگر ہم غور کریں تو پتہ چلے گا کہ باوجود رسمی اور روایتی عناصر کے، داغ کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے، جو براہ راست تجربہ کی وجہ سے وجود میں آئے ہوں۔ اور اس لئے اُن کی شاعری کے منتخب حصہ پر تصنع کا الزام لگانا صحیح نہیں ہے، شوخی، طراری، چنچل پن داغ کی نمایاں خصوصیات ضرور ہیں، لیکن ان میں یکرنگی نہیں ہے۔ مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں :۔

عرضِ وفا پہ دیکھنا اُس کی ادائے دلفریب
دل میں کچھ اعتبار سا، آنکھ میں کچھ ملال سا

یہ فتنۂ آتشِ الفت کا پہونچے گا نہ محشر تک
لگی ہے آپ کے گھر میں بجھے گی آپ کے گھر سے

کسی کی آنکھ میں وہ انتظار ہوکے رہے
کسی کے دل کی بے شکیب وقرار ہوکے چلے

شبِ وصال قیامت تھی جب کسی نے کہا
وہ دیکھ صبح نمودار ہوتی آتی ہے،

اُسے افسانۂ غم ڈرتے ڈرتے
سنایا کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے

جل جل کے بزمِ عشق میں گھل جائیں استخواں
مانندِ شمع لطف ہے سوز و گداز کا،

باعثِ گریہ نہ پوچھ اے ہمنشیں،
کیا کہوں میں آگیا تھا یاد کیا

ہزاروں حسرتیں وہ ہیں کہ روکے سے نہیں رکتیں
بہت ارمان ایسے ہیں کہ دل کے دل میں رہتے ہیں

ترے غمزوں کو اپنے کام سے کام،
کسی کے دل کو تاب آئے نہ آئے

گدازِ غم سے میری ہڈیاں گھلتی ہیں گھل جائیں
ترا ارمان تو اے دیدۂ پرنم نکلتا ہے

یہ حال تھا شبِ وعدہ کہ تابہ راہگذر
ہزار بار گیا میں ہزار بار آیا،

کچھ رہ گیا ہے قصۂ غم وہ سنا تو دوں
کاش اُن کو نیند اور نہ آئے ذراسی دیر

کچھ ترا شوق کچھ تری حسرت
اور رکھا ہی کیا ہے اب ہم میں

وہی دل ہے، وہی لب ہیں، وہی اندازِ نیاز
جیسی اب ہے یہ دعا بے اثر ایسی تو نہ تھی

گزرگاہِ ارماں و حسرت رہا دل،
گزرتے رہے کارواں کیسے کیسے

کبھی ہم اُس گلی میں نقشِ دیوار
کبھی اُس بزم میں تصویرِ غم کی،

ترا اک وعدۂ دیدار اور وہ بھی قیامت پر
پھر اس پر صبر اتنا ہائے دلِ امیدوارں کا

داغ کی شاعری کے صحت مند ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اُن کے یہاں عاشق کا کردار اُس کے مروجہ کردار سے مختلف ہے۔ قطع نظر ان اشعار کے، جہاں داغ اپنے محبوب کو جلی کٹی سناتے ہیں، ایسے اشعار بھی اکثر جگہ نظر آتے ہیں، جہاں وہ ایک متین و متوازن لہجہ میں اپنی خودداری کا اعلان کرتے ہیں۔ سپردگی، سچے عشق کا لازمی جزو ضرور ہے، لیکن جس قسم کی سپردگی ہمیں عام غزل گو شعراء کے یہاں ملتی ہے، وہ غیر حقیقی سی معلوم ہوتی ہے۔ محبت کے اکثر شاعروں کے لہجہ میں اُتار چڑھاؤ پایا جاتا ہے، اس لئے کہ عشق کا جذبہ عاشق کو امید وبیم کی کیفیت میں مبتلا رکھتا ہے، اور محبوب کا التفات اور اُس کی بے رخی، عاشق کی طبیعت میں زیر وبم پیدا کرتے رہتے ہیں۔ داغ کے جن اشعار سے ایک طرح کی نرمی، گھلاوٹ اور یگانگت سی

ٹپکتی ہے، اُن کی مثال ہم ابھی پیش کر چکے ہیں۔ لیکن داغ کے یہاں کلبیت (Cynicism) کے آثار کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ کلبیت جن تند و تیز اور ناکام و نامراد جذبات کا فطری ردعمل ہوتا ہے، وہ داغ میں کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ اُن کی محبت خالص جسمانی محبت ہے، اور اس میں ایک طرح کا چٹخارہ اور کھلنڈراپن پایا جاتا ہے اس میں شوخی اور انانیت بھی ہے۔ یہ انانیت ہی در اصل اُس مریضانہ اور سوگوارانہ کیفیت کو زائل کرنے میں ممد ہوتی ہے، جو اُردو کے غزل گو شعراء کا کم و بیش مزاج اور اُن کے لئے معیار بن چکی تھی۔ یہ انانیت محبت کے اعلیٰ ترین تصور کے منافی سہی، لیکن ایک کمزور درجہ کی ارضی محبت کے لئے ایک متوازن کر دینے والی قوت کی حیثیت سے قابلِ تعریف اور قابلِ قبول ضرور ہے۔ یہ انانیت ہی عاشق کے اندر تجربہ سے وہ علٰحدگی پیدا کرتی ہے۔ جو تجربہ کو سمجھنے، اُس کے خط و خال کی مصوری کرنے اور اُس کی قدر و قیمت کے متعین کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے اور اس انانیت ہی کی وجہ سے محبت کے اس راز و نیاز میں حقیقت کا رنگ جھلکنے لگتا ہے

تمھیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع یہ ترکیب — ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا
تری تو برشِ تیغِ نظر کا کیا کہنا، — ہمیں تو دیکھ کے رکھتے ہیں ہم جگر کیسا
تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام — تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا
نگاہِ شوق پہ الزام بے قراری کا — تمھاری برقِ تجلی کو اضطراب نہ تھا؟
فرہاد کے مرجانے کا مذکور نہ کیجئے — کچھ آپ کی تلوار کا احسان نہ ہوا تھا،
وعدہ پہ مری اُن کی قیامت کی ہے تکرار — اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج
غضب ہے آہ مری نام داغ ہے میرا — تمام شہر جلاؤ گے کیا جلا کے مجھے،

داغ کے انداز بیان میں، مجموعی طور پر جو شیرینی اور شگفتگی ہے، وہ خاص اُن کی طبیعت کا رنگ ہے۔ مگر یہ نیاپن اور یہ تازگی محض زبان پر قدرت کا پتہ نہیں دیتی۔ کیونکہ الفاظ صرف تاثرات اور مشاہدات کی زبان ہیں۔ اُن میں حُسن کا جادو جگا دینے کی صلاحیت ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اس میں پوری طرح کامیابی اُسی وقت ممکن ہے جب اُن تجربوں میں خود رعنائی اور دلکشی موجود ہو، جن کے اظہار کا الفاظ صرف ایک خارجی وسیلہ ہیں۔ داغ کے مزاج میں جمالیاتی احساس پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے تاثرات اور مشاہدات کے بیان کرنے میں جن خارجی اشیاء کی طرف اشارہ کرتے ہیں، وہ پڑھنے والے کے سامنے حُسن کی ایک جنّت کھول دیتی ہیں۔ وہ محبت کے واردات کے بیان میں جذبہ اور خارجی شے کے درمیان جو علاقہ قائم کرتے ہیں، وہ سراسر تخیلی اور جمالیاتی علاقہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے جذبہ کی وضاحت کے لئے فطرت کے اُن حسین عناصر کی طرف ہمارے تخیل کو لے جاتے ہیں جن سے ہمارے حواس میں ایک قسم کی تازگی، کیف اور آسودگی پیدا ہوتی ہے۔ اس طریقۂ کار میں کوئی بات بالکل نئی نہیں ہے۔ لیکن پڑھنے والا یہ ضرور محسوس کرتا ہے، کہ شاعر نے بغیر کسی کوشش کے اُس کے ذہن میں ایک لطیف سرخوشی کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ برجستگی کا یہ تاثر ایسے اشعار پڑھ کر ہمیشہ مرتب ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ اب تک ہمارے نقاد داغ کی شوخ بیانی اور اُن کی بندش کی چستی کا تو ذکر کرتے رہے۔ لیکن کسی نے اس طرف توجہ نہیں دلائی کہ داغ کے تاثرات کس طرح ایک حسین پیکر میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور ان میں چاندنی کا حُسن آبِ رواں کا نغمہ اور ہیرے کی دلآویزی کس طرح مل جل کر ایک ایسا مرکب طیار کرتے ہیں جو ہمارے ذہن و تخیل کے لئے انبساط کا سامان فراہم کرتا ہے۔ داغ اس معاملہ میں [illegible]ن سے قریب تر ہیں، اور ذوق سے بہت دور۔ باوجود اس کے کہ داغ کو ذوق سے فیضِ تلمذ حاصل ہوا تھا، لیکن انفرادی طبیعت کی اُپج بھی عجیب گل کھلاتی ہے۔ ذوق کی شاگردی داغ کے لئے ان معنوں میں بہت مفید ثابت ہوئی کہ اُن کے اظہار بیان کی تمام صلاحیتیں بیدار ہو گئیں اور اُن کے انداز میں سلاست پیدا ہو گئی — لیکن مشاہدات کو اپنے شعور میں سمو لینے اور رچانے، اور مشاہدات و تجربات

معجونِ مرکب کو گوارا اور قابلِ فہم شکل عطا کرنے کا عمل، ہر شاعر کا انوکھا ہوتا ہے اور اسی لئے ہر اچھے شاعر کی پہچان اور
بین کے لئے ایک مخصوص معیار کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مومن، داغ اور حسرت کے جمالیاتی احساس میں جو فرق ہے وہ
کے مزاج اور ذوق کے اختلاف کے مطابق ہے۔ داغ کا رنگ مومن اور حسرت کے رنگ سے جدا ہونے پر بھی اپنے اندر ایک
نکھار، دلکشی اور جاذبیت ضرور رکھتا ہے:-

شرمگیں چشم میں اُس برقِ نظر کا جلوہ ——— ایک شعلہ سا تہِ دامنِ مژگاں نکلا
جلا کے داغِ محبت نے دل کو خاک کیا ——— بہار آئی مرے باغ میں خزاں کی طرح
گلشن میں ترے لبوں نے گویا ——— رس چوس لیا کلی کلی کا،
مانندِ برق، مثلِ ہوا، صورتِ نگاہ ——— اکثر نکل گئے ہیں وہ میرے قریب سے
جو سخت بات سنے دل تو ٹوٹ جاتا ہے ——— اس آئینہ کی نزاکت کسی کو کیا معلوم

داغ کی قادرالکلامی اُن کے زمانہ میں مسلم تھی۔ اُنھوں نے زبان میں جو لوچ، سلاست اور سادگی پیدا کی، اُسے آج
ی تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ مگر تنقید نگاری کا ایک دور ایسا بھی گزرا ہے، جب داغ کی شاعری کو عامیانہ سمجھ کر رد کر دیا
جاتا تھا اور اُسے بھرپور صحتمند اور جذبہ سے سرشار شاعری کا درجہ دینے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا تھا۔ - - - - - -

- - - - - - - - - - میرا یہ دعویٰ تو ہرگز نہیں ہے کہ داغ کی شاعری
ان تمام اوصاف سے مزین ہے، جو اعلیٰ عشقیہ شاعری کی جان ہیں۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر داغ کے عہد اُن کی شخصیت
اور اُن کے معاصر شعراء کے کلام کو نظر میں رکھا جائے، اور عشقیہ شاعری کے کسی بہت بلند تصور کو معیار نہ بنایا جائے، تو داغ
کے چوچلوں اور اُن کی رندی کی تہ میں بھی گوارا، برجستہ اور تخئیل پر اثر انداز ہونے والے اشعار کی تلاش بے سود ثابت نہیں ہوسکتی
۔ اصل بعض رائیں اس قدر تواتر اور اتنی شد و مد کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں کہ پھر اُن کی صداقت کی پرکھ کا کبھی خیال ہی نہیں
پیدا ہوتا۔ بعض لیبل بعض شاعروں پر کچھ اس طرح چسپاں کر دئے جاتے ہیں، کہ پھر اُن کے بغیر اُن کا تصور دشوار معلوم ہونے
لگتا ہے۔ کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیقی قوت اور فیضان کی لہر ہمیشہ ایک سطح پر نہیں رہتی۔ غزل گو شاعر کے یہاں تو خاص طور پر
حشو و زوائد کی موجودگی کم و بیش لازم سی ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ تنقیدی محاکمہ کے لئے صرف منتخب اشعار ہی کو سامنے رکھنا چاہئے
داغ کا لب و لہجہ اپنے بہت سے معاصرین سے مختلف ہے۔ لیکن اس میں بھی ہر جگہ یکسانیت نہیں ہے۔ پھر یہ بھی نہیں بھولنا
چاہئے کہ بعض کوتاہیاں اور خامیاں، مخصوص ادبی اسالیب، روایات اور محاورہ کی پابندی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی یاد رکھنا
اسی قدر ضروری ہے کہ ظاہری مسرت و اطمینان، بذلہ سنجی اور شوخ گفتاری، لذتیت اور سرمستی، بعض اوقات ایک نقاب کا کام
بھی دیتے ہیں۔ متوازن، شگفتہ اور سنجیدہ اشعار بھی، جو محض تفننِ طبع کی خاطر نہیں لکھے گئے، بلکہ جن میں شاعر نے کسی نفسیاتی
کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے، داغ کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ داغ کی شاعری کے جن عناصر کو میں نے صحتمندی سے تعبیر کیا ہے
ان کی وضاحت اُن اشعار سے بخوبی ہو جاتی ہے، جو داغ کی جدت پسندی، اُن کے لہجہ کی نرمی، اُن کی انانیت اور انکے جمالیاتی
احساس کے آئینہ دار ہیں۔ اس کے علاوہ وہ نشاطیہ عناصر بھی ہیں، جو زندگی کی نعمتوں کو قبول کرنے اور اُن سے بہرہ اندوز
ہونے کے حوصلہ کا پتہ دیتے ہیں۔ سب سے اہم اور غیر متوقع بات جو اس سلسلہ میں نظر آتی ہے، وہ یہ کہ داغ عشق کی نفسیات
کے متعلق بعض اشارے ایسے کر جاتے ہیں۔ جن سے اُن کی پختگی اور سمجھ بوجھ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بعض اشارے غزل کی شاعری
میں روایت بن گئے تھے، لیکن ان اشاروں کے پردہ میں بھی بعض دفعہ شاعر بڑے پتہ کی بات کہہ جاتا تھا۔ یہ اُسی وقت ممکن ہوتا
تھا، جب کوئی نیا خیال، کوئی تازہ مشاہدہ، کوئی دلکش تشبیہ، کوئی نفسیاتی نکتہ روایت میں جان ڈال دیتا تھا۔ داغ کو بھی اگر ذرا

ٹٹول کر دیکھئے، تو کہیں کہیں نظر میں ٹھٹک کر رہ جاتی ہیں۔ اور قیاس چاہتا ہے کہ جو کچھ ان اشعار میں کہا گیا ہے وہ محض روایت
نہیں ہے، بلکہ اس کی تخلیق براہِ راست تجربہ نے کی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ شاعر نے اس تجربہ کے اندر عمومیت کا رنگ بھرنے کی بھی کوشش
کی ہے ۔

مزا جو اضطرابِ شوق سے عاشق کو حاصل ہے — وہ تسلیم و رضا و بندگی سے ہو نہیں سکتا
مرگِ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھ کو ملال، — دشمنی کا لطف، شکووں کا مزہ جاتا رہا
ہنگامِ ضبط سینہ میں سو گردشیں رہیں — اچھا رہا وہ اشک جو آنکھوں سے بہہ گیا
رہروِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے — اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں
کئے جو ضبط کبھی آنسو کبھی نہ دل کی لگی — جلے ہوئے ہیں بہت چشمِ اشک بار سے ہم
ٹھہر ٹھہر کے جلا دل کو ایک بار نہ پھونک — کہ اس میں بوئے محبت ابھی نکلتی ہے

داغ کا کلام ہماری غزل کے کلاسیکل سرمایہ کا ایک قابلِ قدر حصہ ہے۔ اُن کے چلبلے پن میں بھی ایک متانت اور رکھ رکھاؤ ہے
اُن کے مزاج کے مختلف رنگوں میں ایک رنگ وہ بھی ہے، جسے خاص جرأت کا رنگ کہنا چاہئے۔ لیکن چونکہ معنوی اعتبار سے وہ
دلی کے دبستانِ شاعری سے قریب تر ہیں۔ اس لئے معاملہ بندی کے میدان میں بھی وہ ابتذال اور سوقیانہ پن سے اپنا دامن بچا کر
نکل جاتے ہیں۔ اور حدِ اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے۔ اُن کے پورے کلام میں ایک وحدتِ تاثر پائی جاتی ہے اور میرا خیال ہے کہ جہاں تک
اُن کی بہترین اور نمایندہ شاعری کا تعلق ہے، وہ اُن کے ہم عصر امیر کی شاعری سے اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ وہ محض استادی اور مشق
کے بل بوتے پر وجود میں نہیں آئی بلکہ اُس کی تہ میں جذبات کی آنچ اور اُن کی گویائی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غزل
میں اب ہم اُن مضامین کی تلاش نہیں کرتے، جن پر پہلے سر دھنا کرتے تھے۔ تاہم ذوق، شاہ نصیر، ناسخ اور اسی قسم کے دوسرے
شعراء کی نسبت داغ کے کلام میں اب بھی ہمارے لئے خاصی جاذبیت موجود ہے اور یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ جب تک حسن و عشق
کے جذبات و معاملات انسانوں کے دلوں کو گرماتے رہیں گے، داغ کی زبان کی چاشنی اور لطافت، اُن کے لب و لہجہ کی شوخی اور اُنکے
نقطۂ نظر کی صحتمندی اور اُس کی داخلیت پڑھنے والوں سے خراجِ تحسین حاصل کرتی رہے گی۔

اسلوب احمد انصاری

خدا اور پادری

ولایت کے ڈاک خانہ میں سارٹنگ کلرک کو ایک لفافہ ملا جس پر یہ پتہ لکھا ہوا تھا :۔
"خدا کے نام ، سب سے اونچے آسمان پر"
یہ خط ایک ضعیفہ کا تھا جس نے لکھا تھا کہ "اے خدا، میں بہت بڑھیا ہوں، مجھے پانچ پونڈ بھیج دے، نہیں تو مالک مکان مجھے
گھر سے نکال دے گا، اور میں در بدر ماری پھروں گی"
کلرک مذہبی آدمی تھا، اسے بڑھیا پر رحم آیا اور اپنے ساتھیوں سے چار پونڈ ۱۰ شلنگ چندہ جمع کرکے ایک پادری کے لفافہ
میں لپیٹ کر بڑھیا کو بھیج دیا۔ دوسرے دن بڑھیا کا دوسرا خط خدا کے نام آیا، جس میں تحریر تھا :۔
"اے پیارے خدا، جواب کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن آیندہ پادری کے ذریعہ سے کوئی رقم نہ بھیجئے کیونکہ اس نے اس مرتبہ
پانچ پونڈ میں سے ۱۰ شلنگ اپنا حصہ کاٹ لیا اور مجھے صرف ۴ پونڈ ۱۰ شلنگ بھیجے۔

گاہے گاہے باز خواں

ہمارے علماء کا نقطۂ نظر

انسان کی زندگی میں بعض ساعتیں ایسی بھی آتی ہیں جب وہ محو خواب ہوتا ہے لیکن انسانیت آپ ہی بیدار ہوتی رہتی ہے۔ اس کے قواء بظاہر بیکار نظر آتے ہیں لیکن روح اپنا کام کرتی رہتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کے جوارح ظاہری درد و تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن قلب و دماغ آہستہ آہستہ "سکونِ جاں" کی منزل سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسانیت پوری طرح آنکھ کھول کر مسکرانے لگتی ہے، روح ایک فاتحانہ مسرت کے ساتھ اُچھل پڑتی ہے، قلب و دماغ نشۂ کامیابی و نشاط سے سرشار ہوجاتے ہیں اور آخرکار انسان بھی چونک پڑتا ہے۔ اس کے اعضاء بھی بیدار ہوجاتے ہیں اور وہ منزل سامنے آجاتی ہے جسے "آشتی جسم و روح" سے تعبیر کرنا چاہئے۔ اسی کا دوسرا نام دُنیائے عمل ہے اسی کو "عالمِ تگ و دو" کہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جسے شاعرانہ زبان میں "شک زمیاں رفت و یقیں جلوہ کرد" سے تعبیر کرنا چاہئے۔

ابتدائے آفرینش سے لے کر تا ایں دم، کرۂ ارض کی زندگی پر کوئی صدی، کوئی قرن، کوئی دن، کوئی ساعت، بلکہ میں تو کہونگا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا ہے، جس میں قدرت کے اس نظام فطرت کے اصول اور خدا کی اس نہ تبدیل ہونے والی سنت پر کشود کار کا انحصار نہ رہا ہو۔ جواہر فرد اور قوت کا باہمی تعلق، مادّہ کی مختلف صورتیں، ایتھر بلکہ ماوراء ایتھر میں عناصر آفرینش کا نواۃ اور برق پاروں کی صورت اختیار کرنا، لطخات سحابیہ کا رفتہ رفتہ منجمد ہوکر مختلف کروں، سیاروں، چھوٹے چھوٹے ستاروں، چاندوں اور شہابِ ثاقب میں تبدیل ہوجانا۔ یہ کیا ہے؟ کیا سب اسی بیداری کا نتیجہ نہیں، کیا مادہ کا تفاعل اس کی بیداری نہیں۔ کیا برق پاروں کی گردش ان کا نشاطِ عمل نہیں، کیا آفتاب کے طلوع و غروب، چاند کے ایاب و ذہاب میں اس اہتمام خداوندی کی جھلک موجود نہیں جسکے پرتو سے تمام ملکوتی قوتیں دفعتہً جگمگا اُٹھتی ہیں۔

ابراہیم کی بت شکنی کیا اس بیداری کا نتیجہ نہ تھی، موسیٰ کا فرعون کی قوت قہرمانی کے مقابل میں آجانا کیا روح و جسم کے اتحاد کا نتیجہ نہ تھا، عیسیٰ کا صلیب پر چڑھ جانا کیا اس احساس کے علاوہ کچھ اور تھا۔ مہاتما بودھ کا شاہانہ جاہ و جلال کی زنجیروں کو توڑ پھینک دینا کیا کسی اور قوت کا کرشمہ تھا، رام چندر جی کی صحرا نوردیاں کیا کسی جذبۂ غیر روحانی سے متعلق تھیں۔ کرشن جی کی معرکہ آرائیاں کیا کوئی اور منظر پیش کرنے والی تھیں، کنفوشیوس کی ذات کیا کسی غیر صادق کیفیت کا مظہر تھی، زردشت کی زندگی میں کیا کسی اور شعلہ کی جھلک پائی جاتی تھی، سرزمین عرب سے پیدا ہونے والے نے سب سے بڑے انسان کا کوہِ فاران پر چڑھ کر کفارِ عرب کو پیامِ خداوندی پہونچانا کیا کسی اور احساس کا نتیجہ تھا، حسین کی عظیم الشان قربانی کیا کوئی اور رودادِ عمل تھی، منصور کے ساتھ دار و رسن کا معاملہ بھی اسی معمّہ کی گرہ کشائی تھی اور منصور کے حلقوم پر تیغ کی روانی بھی اسی کا اعادہ۔

لیکن جس طرح قدرت عرصہ تک محو خواب رکھنے کے بعد نوعِ انسانی کو بیدار کرنے کے لئے اس کے کسی ایک فرد کا انتخاب کرلیتی ہے، اسی طرح وہ یہ بھی کرتی ہے کہ وہ قرنوں تک بیدار رکھنے کے بعد دوبارہ آہستہ آہستہ نیند طاری کردیتی ہے، پھر کبھی تو ایسا ہوتا

ہے کہ کسی قوم کے لئے یہ نیند موت کی نیند میں تبدیل ہوجاتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے فنا ــــ اور کبھی یہ نیند پھر ایسی بیداری اختیار
ہے جیسے مُردہ میں از سرِ نو جان پڑجائے۔

کہا جاتا ہے کہ اصلاح کی بنیاد انسان کے جہل سے شروع ہوتی ہے اور علم کی روشنی میں اس کا اختتام ہوجاتا ہے یہ بالکل صحیح کیونکہ جو چیز جہل کے دور کرنے کے لئے آئے گی۔ اس کی ابتدا عہدِ تاریک سے ہوگی، اور یقیناً جب علم کی ترقیاں انسانی دماغ کو منور کرچکیں گی دورِ اصلاح ختم ہوجائے گا اگر اس کا مقصود کسی انسان کو محدود منزل تک پہونچاکر ٹھہر جانا ہے لیکن اگر کوئی خیال دنیا میں ایسا ہے یا ہو جس کے دائرۂ عمل سے تعینِ منزل کا سوال خارج ہے یا جس نے لانہایت کو اپنی تگ و دو کی جولانگاہ قرار دیا ہے یا جس کا مدعا عقول کو ہر وقت اور ہمیشہ منور کرتے رہنا ہے، یعنی اگر کوئی تعلیم ایسی ہے جو اخلاق ہی کی ترقی کو منتہائے نظر قرار دیتی ہے جس کی دعوت عالم کے ہر ہر فرد کو ایک شیرازہ سے وابستہ کرسکتی ہے اور جو تمام ظاہر پرستیوں سے بلند ہوکر انقیادِ فطرت کا مفہوم صرف روح کے جھک جانے قرار دیتی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ ایسی تعلیم کو ختم ہوجانا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک تعلیم اخلاق کا سوال ہے اس وقت تک جتنی اصلاحیں دُنیا میں بروئے کار آئیں، ان سب کا مقصود ہی تھا سب نے یہی تعلیم دی کہ اچھے کام اچھے اور بُرے بُرے ہیں، لیکن اس تعلیم کے عملی پہلو کے لحاظ سے جو اصول و قواعد انھوں مقرر کئے وہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے ضرور مختلف تھے اور انھیں مختلف ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ ان کا عقول انسانی کے مطابق ہونا ضر تھا۔ اور عقول انسانی کی ترقی ہمیشہ سے جاری ہے اور رہے گی لیکن جس وقت ہم تقابلاً ان کا مطالعہ کریں گے، ان کے مقاصد تعلی ان کے اصول اصلاح اور اُن کے اس پیغام پر غور کریں گے جو انھوں نے نوعِ انسانی تک پہونچایا تو ہم کو اس حقیقت کا اعترا کرنا پڑے گا کہ ان تمام تعلیمات میں صرف ایک ہی تعلیم ایسی ہے جس کے نصب العین کی بلندی ازل سے لیکر ابد تک تمام کائنات کا احاط کرلینے والی ہے اور جس نے اگر ایک طرف اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ تعلیم دی کہ نوعِ انسانی کے تمام افراد کو ایک ہی مرکز پر جمع ہوکر ابناء جنس کی خدمت کرنا چاہئے تو دوسری طرف علوم کی ترقی کے لحاظ سے اس نے تمام مظاہرِ فطرت انسان کے تصرف میں دے کر گویا یہ بتادیا کہ حقیقتاً نام ہے اس قوتِ عمل کا جو لانہایت تک برابر اسباب ترقی کا ساتھ دیتی چلی جائے۔ یقیناً اصلاحی تحریکوں کی تاریخ ارتقاء میں یہ ایک آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اور زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرجائے اس کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی مسلک کا حقیقی پیام یہی ہے جو بیان کیا گیا تو دنیا کے افراد اس کے ماننے سے کیوں احتراز کرتے ہیں اس کے متبعین کے زوال و انحطاط کا کیا سبب ہوسکتا ہے۔ غیر جماعتیں اس سبب کو اس کی تعلیمات میں ڈھونڈھتی ہیں اور میں اسکو تا میں پاتا ہوں۔ یعنی وہ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس کے اصول تعلیم ہی ایسے ناقص و ناکمل ہیں کہ اس کے متبعین زمانہ کا ساتھ دے سکنے کی وجہ سے پستی کی طرف مایل ہوتے جارہے ہیں اور میرا دعویٰ یہ ہے کہ اس انحطاط کا سبب ہی یہ ہے کہ انھوں نے تعلی کی اصل روح کو نظر انداز کردیا جس کے بہت سے اسباب تاریخ میں مل سکتے ہیں۔

جس وقت آپ نوعِ انسانی کی ذہنی یا اخلاقی ترقی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جب تک کسی قوم یا جماعت کا کو مصلح ان کے اندر موجود رہتا ہے، ایک عام انقیاد و اطاعت اور اقدامِ عمل کے سوا کوئی صورت اختلاف کی پیدا نہیں ہوتی، لیکن جس وقت وہ اُٹھ جاتا ہے تو رفتہ رفتہ قوائے عمل کی حرکت مضمحل ہونے لگتی ہے اور اسی کے ساتھ اختلاف آراء پیدا ہونے لگتا ہے جو روح کے لئے سم قاتل سے کم نہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخوت و ہمدردی، عدل و مساوات کا جذبہ ضعیف ہوکر ملوکیت و استبداد کی

پڑنے لگتی ہے اور انسانی برتری کا معیار، اخلاق نہیں بلکہ جاہ و ثروت، دنیاوی نمود و نمایش قرار پاجاتا ہے اور آخر کار ہر ہر فرد خود غرضی، نفسانیت اور آسایشِ جسم و جان کو زندگی کا حقیقی مقصود سمجھنے لگتا ہے۔ یعنی ایک وقت تو وہ ہوتا ہے جب روئے زمین پر ہر سانس لینے والے انسان کے سامنے تعلیم و اخلاق و اصلاح پیش کی جاتی ہے اور ہر شخص آزادی کے ساتھ سوچنے سمجھنے کے بعد شمع یقین اپنے دل میں روشن کرنے کے لئے آزاد ہوتا ہے اور پھر دوسرا وقت وہ آتا ہے جب خود اپنے افراد کو بھی اس کے اندر پناہ لینے کی جگہ نہیں ملتی اور اپنی کمزوریوں، اپنی ناہلیوں کا اندیشہ اس قدر غالب آجاتا ہے کہ ان کا ذکر سننا بھی گوارا نہیں ہوتا، یہی وہ منزل ہے جس کی طرف غالب نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ:-

تا روا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا
رونقے گشتم و از طالعِ دکاں رفتم

یہی سبب ہے کہ آج ہماری قومی و اجتماعی حیات، ہماری مذہبی و اخلاقی زندگی، ہمارا اقتصادی و معاشرتی نظام، الغرض ہماری ہر ہر چیز خواہ کسی شعبۂ حیات سے متعلق ہو، کسی نظامِ زندگی سے وابستہ ہو، بالکل ویسی ہی ہے، جیسے اندھوں کی وہ نزاع جب ان میں سے ہر ایک نے ہاتھی کے مختلف اعضاء کو ٹٹولنے کے بعد اس کی ماہیت کا اندازہ لگایا، اور ہر ایک نے اپنی جگہ اپنے آپ کو سچا باور کر کے دوسرے کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ درانحالیکہ ہاتھی کی حقیقت کو ان کے اعتقاد و یقین سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔

آج جس چیز کو ہم یقین کی صورت سے پیش کر رہے ہیں وہ محض وہم و گمان ہے، آج جن باتوں کو ہم حقایق و مسلمات کو کر بیان کرتے ہیں وہ صرف مزخرفات و ترہات ہیں۔ دنیا نئی ہے اور اس کے اصول نئے، زندگی نئی ہے اور اس کے امیال و عواطف نئے، پہلے سانس لینے کا طور اور تھا، اب جینے کی راہیں اور ہیں اب سے ایک صدی قبل جو انسان پیدا ہوتا تھا اب نہیں پیدا ہوتا اور پہلے عقلِ انسانی کے جو دروازے مقفل نظر آتے تھے، اب بالکل کھلے ہوئے ہیں، ذہن و دماغ جن زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے وہ اب ٹوٹ رہی ہیں، فراستِ انسانی آزاد ہے، اور اب اسی شخص کو یہاں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے جو آزادی کے ساتھ سوچ سکتا ہے جو آزادی سے بول سکتا ہے جس نے آزادی ہی کے لئے مرنا اور جینا اپنا شعار قایم کر لیا ہے اور جو دنیا کی آزاد فضا میں سانس لے رہا ہے۔

پھر کیا انسان کی یہ مسرت اس لئے ہے کہ وہ مذہب و اخلاق کی بندشوں سے چھوٹ کر بہیمانہ اخلاق اختیار کرنے کے لئے آزاد ہو گیا ہے۔ کیا یہ جذبۂ سرور اس بناء پر ہے کہ خونخواری و درندگی سے باز رکھنے کے لئے ناخن و چنگال کو قطع کرنے والی قوت کوئی باقی نہیں رہی — نہیں — یہ مسرت صرف اس لئے ہے کہ آج بالکل پہلی مرتبہ وہ خدا کو بے نقاب دیکھ رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس نے آزادی کی پوجا کی اس نے خدا کی پرستش کی کیونکہ قدرت کا یہی وہ مظہر ہے جو انسان کو انسانِ اعلیٰ یا خدا کا نائب و خلیفہ بنا دینے والا ہے۔

ابوالہول کی بیداری

عہدِ فراعنہ کے بعد یہ بالکل پہلا موقع ہے کہ مصر کا ابوالہول اپنی نیند سے (جسے ابدی نیند سمجھا جاتا تھا) بیدار ہو رہا ہے اور غالباً وہ وقت دور نہیں جب یہ انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھے۔

مصر کی تاریخ ایک طویل تاریخ ہے ہزاروں سال کے جبر و استبداد کی قریباً قرن تک انسانیت کی تباہی و بربادی کی اور آغاز تاریخ سے لیکر اسوقت تک ایسے مکروہ دور کی جس میں انسانی آزادی کو ہمیشہ پامال کیا گیا اور لاکھوں انسانوں کی لاشوں پر مصر کے ملوک و امراء کے قصر امارت تعمیر کئے گئے، یہاں تک کہ قدرت کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور اس نے ایک "مردِ باخبر" پیدا کرکے چشم زدن میں وہاں کی بساط جبر و استبداد کو اُلٹ کر رکھدیا۔

"یہ مردِ خود آگاہ" وہ ہے جسے اب سے چند ماہ پہلے کوئی جانتا بھی نہ تھا لیکن آج وہ مصر کا نجات دہندہ اور مغربی سیاست دانوں کی رائے میں مشرقِ وسطیٰ کا سب سے بڑا انسان سمجھا جاتا ہے جس نے چند گھنٹوں میں فاروق کو خارج البلد کرکے تاریخ کا ورق اُلٹ دیا اور سارے ملک میں دفعتاً انقلاب کی ایسی زبردست لہر دوڑا دی جس کی مثال اتاترک کو چھوڑکر کوئی دوسری نہیں ملتی۔

جب تک انقلاب نہیں آتا نہیں آتا، لیکن جب آتا ہے تو سیلاب کی طرح آتا ہے اور ملک کے خس و خاشاک کو چشم زدن میں بہا کر لیجاتا ہے، چنانچہ وہی مصر جہاں امیروں کے سوا کسی کو زندہ رہنے کا حق حاصل نہ تھا، جو قوم فروشی کا سب سے بڑا بازار تھا، جہاں بھوکے ننگے انسانوں کی کراہ کا سننے والا کوئی نہ تھا، آج ایک نئے دور میں قدم رکھ رہا ہے — ایک ایسا دور جو اپنا درخشاں مستقبل اپنے ساتھ لایا ہے اور جس کے زریں سایہ کو مشرقِ وسطیٰ کی سرزمین پر دور دور تک چھا جاتا ہے۔

محمد نجیب جس کی عمر اس وقت ۵۱ سال کی ہے سوڈان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا، جہاں اس کا باپ عامل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی ماں سوڈانی تھی جس کا سانولا رنگ نجیب کو بھی ملا تھا اور جس پر گورے رنگ کے لڑکے ہنسا کرتے تھے۔

یہ کھیل کود کے میدان اور تعلیم گاہ میں دونوں جگہ اپنے ہمجولی لڑکوں سے زیادہ تیز طرار سمجھا جاتا تھا اور اس کے باپ کا ارادہ تھا کہ اسے یا تو قانون کی تعلیم دلائے یا پھر وہ مدرسی کا پیشہ اختیار کرے۔ اسے ان دونوں میں سے کوئی راہ پسند نہ تھی، اس لئے وہ چپ چاپ کر اپنے گاؤں سے ایک ہزار میل دور قاہرہ کی طرف پیادہ پا چل دیا اور وہاں فوجی مدرسہ میں داخل ہونے کی درخواست دی۔ مگر بدقسمتی سے اس کے قد کی لمبائی ایک انچ کم نکلی اور یہ داخل نہ ہوسکا۔ یہ پھر وطن واپس آیا اور اس نے دن میں پانچ مرتبہ ہر نماز کے بعد مختلف قسم کی ورزشوں سے اپنا قد بڑھانے کی کوشش شروع کردی۔ ایک سال کے بعد وہ پھر قاہرہ پہونچا اور گو اس کا قد اب بھی نصف انچ کم تھا لیکن اس کی ذہانت دیکھکر مدرسۂ حربیہ میں لے لیا گیا۔

یہاں پہونچکر اس نے اپنی غیر معمولی محنت و ذہانت سے ڈھائی سال کا نصاب ۹ مہینوں میں پورا کرلیا اور آخرکار ۱۹ سال کی عمر میں وہ سکنڈ لفٹنٹ ہوگیا۔

اس وقت مصر کی فوج انگریزی فوج ہی کا ایک مختصر سا ضمیمہ تھی، اور نجیب ایسے سپاہیوں کے لئے جو امیروں اور درباریوں کی

خوشامد نہ کرتے تھے، ترقی کا میدان بالکل مسدود تھا۔ اس لئے اس نے ان حالات سے بیزار ہوکر اپنی فرصت میں قانون اور معاشیات کا مطالعہ شروع کردیا اور اسی کے ساتھ غیر زبانوں میں جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور انگریزی زبان بھی سیکھنے لگا۔ (اب وہ عبرانی بھی پڑھ رہا ہے)

جب حال ہی میں حکومت اسرائیل اور عرب لیگ کے درمیان نزاع شروع ہوئی تو وہ یہودی حکومت پر حملہ کرنے کا مخالف تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ مصری فوج ریگستانی جنگ کی اہل نہیں ہے، لیکن اس باب میں فوج والوں سے مشورہ کیا ہی نہیں گیا اور مجبوراً اسکو بھی اس جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ یہ اس وقت بریگیڈیر تھا اور صحراء سینا میں ایک مشین گن والی رجمنٹ کی کمان اس کے سپرد تھی۔ اس لڑائی میں یہ سخت زخمی ہوا اور اسرائیلی فوج اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئی، لیکن اس کا بھائی محمود اسے اٹھا لایا اور جب یہ اچھا ہوگیا تو نجیب پھر اپنی فوجی خدمات میں مصروف ہوگیا، لیکن مصری فوج کی شکست کا صدمہ اس کے دل میں بدستور باقی رہا اور ہر وقت سوچنے لگا کہ مصر کو اس کی موجودہ پستی سے کیونکر نکالا جاسکتا ہے۔

چونکہ وہ اقتصادیات و سیاسیات کا بھی ماہر ہے۔ دُنیا کی تاریخ پر بھی اسے عبور ہے زمانہ کے موجودہ رجحانات اور بین الاقوامی سیاسیات سے بھی پوری طرح آگاہ ہے، اس لئے اس نے سمجھ لیا کہ مصر کی تباہی و پستی کا اصل سبب یہاں کا جاگیردارانہ نظام ہے اور جب تک فاروق شاہ مصر کو نہ ہٹایا جائے (جو یہاں کا سب سے بڑا مستبد جاگیردار تھا) اصلاح محال ہے۔ چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ اس خیال کی تکمیل کے لئے طیاریاں شروع کردیں اور جب اس نے فوج میں اپنے ہمنوا کافی پیدا کرلئے تو راتوں رات وہ سب کچھ کردیا جس سے آج ساری دنیا واقف ہے۔

اس وقت مصر کی عنانِ حکومت اسی کے ہاتھ میں ہے، لیکن بالکل ایک سپاہی اور مزدور کی طرح وہ اب بھی فوجی بگل کی آواز سن کر اُٹھ بیٹھتا ہے، صبح کی نماز پڑھکر تلاوتِ قرآن کرتا ہے اور پھر ناشتہ کرکے جو ایک انڈے، ایک ٹماٹر اور ایک توس سے زیادہ نہیں ہوتا) ۸ بجے تک دفتر میں آجاتا ہے اور کام شروع کردیتا ہے، اسی دوران میں وہ تمام احکام نافذ کرتا ہے، مقامی کمانڈروں سے ملتا ہے اور مسلوں کا جواب لکھواتا ہے (جن کی تعداد ایک ہزار روزانہ سے کم نہیں ہوتی ہے)

نجیب نے مصر کے اصلاح کی جو ذمہ داری اپنے سر لی ہے وہ ایسی آسان بات نہیں، کیونکہ امراء و جاگیردار ایک ایک انچ کے لئے اس کا مقابلہ کر رہے ہیں اور رعایا کے دل سے اب تک یہ خوف نہیں نکلا کہ معلوم نہیں کل کیا ہو۔ اس کی سب سے زیادہ مخالف وفد پارٹی ہے اور رات دن نجیب کے نکالنے کی فکر میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے - - - - - - - - - -

- - - - - اشتراکی جماعت بھی وفد پارٹی کے ساتھ ہوگئی ہے اور یہ دونوں مل کر ملک میں شورش، اسٹرائک اور بدامنی پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ نجیب کے قدم جمنے نہ پائیں۔ چنانچہ حال ہی میں کاٹن مل کے ۲ ہزار مزدوروں نے اسٹرائک کرکے کارخانوں میں آگ لگانا شروع کی۔ پولیس پر پتھر برسائے، مشینیں توڑیں، لیکن نجیب نے فوجی مدد سے اس فتنہ کو فرو کیا۔

مشرقِ وسطیٰ میں اس سے قبل بھی بعض لیڈر نجیب ہی کی طرح اُبھر چکے ہیں، لیکن اتاترک کے سوا کوئی کامیاب نہیں ہوا اور مصر کا ہر شخص اس وقت نجیب کو مصر کا اتاترک ہی سمجھتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان دونوں میں بعض باتیں مشترک پائی جاتی ہیں۔ اتاترک کی طرح نجیب بھی سپاہی ہے، فوج ہی پر اس کو بھی اعتماد ہے اور اتاترک کی طرح وہ مصر کو بھی آزاد جمہوریت میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔

ان حالات میں یہ سوال بھی لوگوں کے سامنے ہے کہ آیا نجیب ترکی کی طرح مصر میں بھی کوئی جمہوری حکومت قائم کرسکے گا یا نہیں۔ اس کا جواب بڑی حد تک منحصر سمجھا جاتا ہے اس بات پر کہ برطانیہ و امریکہ کیا چاہتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ نجیب کو مصر میں اصلاحات کے نفاذ کے لئے بہت سی ایسی چیزوں کی ضرورت ہے جو اس کے پاس نہیں ہیں اور وہ برطانیہ و امریکہ ہی سے مل سکتی

مثلاً اسے اسلحہ کی ضرورت ہے، ٹکنکل امداد کی ضرورت ہے اور صنعتی فیکٹریاں قایم کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اور اس کے لئے یقیناً بیرونی امداد کا محتاج ہے۔

برطانیہ یونہی وعدہ کرچکا ہے کہ وہ مصر کو اسلحہ بھی فراہم کرے گا، فوجی تربیت و آراستگی میں بھی عملی حصہ لے گا لیکن اس کیلئے غالباً ضروری ہوگی کہ نجیب نہر سویز اور سوڈان کے مسئلہ پر خاموش رہے اور یہ بہ حالات موجودہ نجیب کے لئے ممکن نہیں کیونکہ اگر آج ، نے ان مسایل پر خاموشی اختیار کی تو کل ہی اس کی کمان اتر جائے گی۔ یہ ایک ایسی گتھی ہے جسے نہ نجیب اب تک سلجھا سکا ہے نہ جس پر برطانیہ کچھ کھل کر کہنا چاہتا ہے۔

امریکہ اس مسئلہ میں اور زیادہ احتیاط سے کام لے رہا ہے۔ کیونکہ عرب حکومتوں کے مقابلہ میں وہ اسرائیل حکومت کا طرفدار ہے اور اگر مصر کو کوئی مدد پہونچا سکتا ہے تو صرف اس شرط سے کہ مصر و اسرائیلی حکومت کے تعلقات خوشگوار ہوجائیں اور مصر مشرق وسطیٰ فاعی اسکیم میں شریک ہوجائے لیکن یہ ایسی شرطیں ہیں کہ نجیب ان کو کبھی آسانی سے نہیں مان سکتا کیونکہ ان کے تسلیم کرنے کے بعد کا موجودہ اقتدار ختم ہوجائے گا۔

بہرحال اس وقت مصری حکومت رقیق حالت میں ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ آیندہ اس کی ہیئت کیا ہوگی، لیکن چونکہ اسوقت ہر طبقہ و جماعت کے عوام نجیب کے ساتھ ہیں، اور وہ کسی قیمت پر بھی اعادۂ ملوکیت پر رضامند نہ ہوں گے، اس لئے یہ یقینی کہ مصری حکومت آیندہ جمہوری حکومت بنے گی اور بالکل ممکن ہے کہ نجیب ہی اس کا پہلا صدر ہو۔

لائڈ جارج انگلستان کی بڑی مشہور ہستی گزری ہے اور اس نے جس شان سے وہاں کی وزارت عظمیٰ کی خدمات انجام دیں، وہ مشکل ہی سے کسی اور کو نصیب ہوئی۔ اس کی کامیابی کے متعدد اسباب تھے لیکن سب سے بڑی صفت ان میں یہ تھی کہ انتہائی اشتعال کی حالت میں بھی اُن کا دماغی توازن خراب نہ ہوتا تھا، انتخاب کا زمانہ تھا اور ہر شخص اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا، لائڈ جارج بھی مختلف جلسوں میں اپنے انتخاب کا پروپاگنڈا کر رہے تھے۔

ایک دن وہ کسی جلسہ میں لوگوں کو خطاب کر رہے تھے کہ دوران تقریر میں ایک عورت جو لائڈ جارج سے سخت متنفر تھی اٹھ کھڑی ہوئی اور اُس کو مخاطب کرکے بولی کہ۔ "اگر میں تمہاری بیوی ہوتی تو یقیناً تمھیں زہر دیدیتی"۔

ظاہر ہے کہ یہ بڑا مشتعل کر دینے والا فقرہ تھا اور لائڈ جارج کی جگہ اگر دوسرا شخص ہوتا تو یقیناً برہم ہوجاتا اور خدا معلوم کیا جواب دیتا، لیکن آپ کو معلوم ہے لائڈ جارج نے اس کا کیا جواب دیا۔

انھوں نے مسکراتے ہوئے عورت سے کہا کہ "اے محترم خاتون اگر میں تمہارا شوہر ہوتا تو یقیناً اس زہر کو نہایت خوشی سے پی جاتا۔"

نئے سویرے

خوشا کہ قلعۂ و ایواں سے اُٹھ رہا ہے دھواں
اُبھر رہے ہیں افق پر نئی سحر کے نشاں

دیارِ قیصر و کسریٰ کے بجھ رہے ہیں چراغ
اُلٹ رہی ہیں بساطیں ڈھلک رہے ہیں ایاغ

جبینِ وقت پہ کھنچتے ہیں زر نگار خطوط،
مہک رہا ہے وہ شاہوں کی میتوں کا حنوط

وہ جل رہی ہیں کلاہیں سلگ رہے ہیں محل
فراتؔ و نیلؔ پہ کھلتے ہیں عظمتوں کے کنول

وہ مصر و رومؔ کے ماتھوں کے داغ دھلنے لگے
وہ رطل و جام میں قند و گلاب گھلنے لگے

چلے نکل کے وہ محلوں سے سر برہنہ جلوس
عروسِ نیلؔ کے جلووں کے بجھ گئے فانوس

قبا و ریش کے رنگین دام جلنے لگے،
دہکتی آگ میں میر و امام جلنے لگے،

خوشا کہ آج پرانے طلسم ٹوٹ گئے
صنم کدوں میں خداؤں کے جسم ٹوٹ گئے

مگر یہ کیا کہ افق پر ہے سُرخ سُرخ سی آگ
بناتِ ماہ و ثریا کا لٹ رہا ہے سہاگ

سلگ رہے ہیں ہواؤں کے ریشمی آنچل
دھڑک رہے ہیں ستاروں کے جگمگاتے محل

خرد کی آگ میں تپ تپ کے ڈھل رہے ہیں شکوک
مچل رہی ہے ارادوں میں جہل و جرم کی بھوک

ترس رہے ہیں چراغوں کو صبح و شام کے طاق
زمیں پہ آج رسولوں کا اُڑ رہا ہے مذاق

غضب ہوا کہ وہ اُترے زمیں پہ کرگس و بوم
وہ آج چلنے لگی گلکدوں میں بادِ سموم

گل و سمن کی جبینوں پہ دھول جمنے لگی
مہ و نجوم کی نبضِ حیات تھمنے لگی

یقیں کے پھول بھی وہم و شکوک چننے لگے
گنہ زمیں پہ خباثت کے دام بننے لگے

یہ کتنے دیو فرشتوں میں ہوگئے ہیں شریک
خلوص و امن کی انساں سے مانگتے ہوئے بھیک

بنامِ نور چمکتے ہوئے اندھیرے ہیں
نئے افق سے یہ نکلے ہوئے سویرے ہیں

ساقی جاوید بی۔ اے

مستقبل کی آواز

ہو رہی ہے بہار کی تشکیل لالۂ و نسترن کی عمر طویل
اب خزاں آپ جانے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

زر فشانی کریں گے لالۂ و گل عطر سے پھر ڈھلیں گے ساغرِ گل
فصلِ گل رنگ لانے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

لو، افق سے کرن وہ پھوٹ چلی ظلمتوں کی طناب ٹوٹ چلی،
صبح، محفل سجانے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

سبزۂ و صحنِ باغ سجتے ہیں مہ و انجم کے ساز بجتے ہیں
چاندنی گنگنانے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

کھلنے والے ہیں آئینوں کے ورق قہقہوں کی وہ نغمہ ریز شفق
شامِ گیتی پہ چھانے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

کوہ و صحرا کے آبگینے میں ذرے ذرے کے تنگ سینے میں
شمع سی جھلملانے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

تھے جو ثبت ایشیا کے ماتھے پر وہ دھندلکے تراشتی ہے سحر
رات، دن بن کے آنے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

پردۂ یاسمین و سنبل سے بات، نرگس سے لالۂ و گل سے
تیر و پیکاں تک آنے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

کسی آذر کدے کا دلکش روپ میرے افکار کی سنہری دھوپ
چار سو پھیل جانے والی ہے
زندگی مسکرانے والی ہے

فضا ابنِ فیضی

رومتہ الکبریٰ

تیرا افسانۂ ماضی ترے آدابِ کہن،
تیری تہذیب کی عظمت تری شاہی کا عروج،
جس نے روندی تھی کبھی مشرق و مغرب کی زمیں
تیری قوت کا وہ طوفان، وہ لشکر کا خروج

تیرے شاہوں کی جبینوں میں خداؤں کا وقار
تیرے دربار میں سجدوں کا، سلاموں کا ہجوم
تیرے بازار میں عصمت کا وہ زرّیں نیلام
تیری سڑکوں پہ پریزاد غلاموں کا ہجوم

جس میں انسان ہی انسان کا صیاد بنا
ہاں وہ تفریح و تفنن وہ ترا سیر و شکار
موت کے کھیل سے خوش ہوتی تھیں جن کی روحیں
تجھ میں ایسے بھی تھے کچھ ماہ لقا مہر نگار

تیری وحشت کا یہ انداز نیا دیکھا ہے
خود ترے خون کے چھینٹے ہیں ترے دامن پر
پھونک ڈالا ہے چراغِ تہِ داماں نے مجھے
بجلیاں گرتی ہیں تیری ہی ترے خرمن پر

اور وہ دولت و ثروت کی سنہری زنجیر
جس نے "مایا" کا حسین جال بُنا تیرے لئے
اور وہ مسندِ شاہی کی طربناک بساط
جو کہ بازیچۂ اطفال بنی تیرے لئے

تیرے محلوں کی کنیزوں نے جسے چھیڑا تھا
اب بھی ہے دہر میں وہ سازِ مسرت لرزاں
تیرے بازارِ تمدن میں جو بکتی تھی کبھی
اب بھی دُنیا میں ہے وہ جنسِ غلامی ارزاں

تیری تہذیب کے ہاتھوں نے جلایا تھا جسے
طاقِ مغرب میں فروزاں ہے ابھی تک وہ چراغ
آبِ خنجر سے ترے جس میں لہو ٹپکا تھا،
اب بھی ہے خون سے لبریز وہ مشرق کا ایاغ

اب بھی ہے جبر کے ہاتھوں میں سیاست کی زمام
زندگی سلسلۂ دار و رسن ہے اب تک
اب بھی جمہور سے برہم ہے سلاطیں کا مزاج
تیری تاریخ کے ماتھے پہ شکن ہے اب تک

تنویر احمد علوی تنویر

صدائے بازگشت

تری نگاہ سے ظاہر ہے بے دلی کا وفور	عیاں جبیں سے ہے ناکامی و پشیمانی،
بجھا بجھا سا ہے دل میں ترے شرارِ خودی	ترے دماغ میں رقصاں ہے فکرِ لایعنی
تو حادثات دمادم سے کھا رہا ہے فریب	سمجھ میں آ نہ سکا تیری سرِ یزدانی
اسی کا نام ہے اے دوست! ارتقائے حیات	یہی کشاکشِ پیہم ہے رازِ انسانی
خرد سے پا نہ سکے گا تو وہ مقامِ کمال!	کہ جس سے تجھ کو میسر ہو دل کی تابانی
تو جگمگاتے ستاروں کی روشنی پہ نہ جا	کہ مستعار ہے اُن کی یہ نور افشانی!
عمل، خلوص، یقیں، عزم و فکر کا فقداں!	رُلا رہی ہے مجھے تیری خستہ سامانی
خودی کی موت سے یہ حال ہوگیا ہے کہ آج	نہ تجھ میں سطوتِ سنجر نہ شانِ سلمانی

ولے ہنوز باایں صد خرابیِ بسیار
اگر تو چاہے تو آئے قدم قدم پہ بہار

حمید قادری ذوق

جگر بریلوی :-

نہ خم و سبو ہوئے چور ابھی نہ حجاب پیرِ مغاں اُٹھا	ابھی مست بادہ پرست ہیں ابھی لطف بادہ کہاں اُٹھا
جو حضورِ چیں بجبیں ہوئے کہا کس نے شورِ فغاں اُٹھا	رہے خیر برقِ نگاہ کی کوئی دل جلا نہ دھواں اُٹھا
کسی رہگزر میں پڑے ہیں ہم عبث آسماں کی ہیں بخششیں	کوئی لاکھ اُٹھائے اُٹھیں گے کیا کبھی پاؤں کا بھی نشاں اُٹھا
ہے حجابِ حسن کا یہ اثر کسی خود پرست کو کیا خبر	جو ازل سے سینے میں جوش تھا وہی بن کے شورِ فغاں اُٹھا

کسی میکدے میں رہا جگر کہ تھا محوِ خواب میں رات بھر
ہوئیں کیا بشارتیں صبحدم کہ اُٹھا تو زمزمہ خواں اُٹھا

جگر بریلوی

اکرم دھولیوی :-

تمنا میں اداسی میں خوشی میں غم میں گزری ہے
حیاتِ عشق ہردم اک نئے عالم میں گزری ہے

نہیں منت کشِ لفظ و بیاں رو دادِ دل اپنی،
کسی سے کیا کہیں جو کچھ کسی کے غم میں گزری ہے

طریقِ زندگی کے پیچ و خم ہم سے کوئی پوچھے
کہ ہر ساعت ہماری کاوشِ پیہم میں گزری ہے

خزاں کا رنج ہی کیسا گلہ ہے فصلِ گل سے بھی
کہ ہم پر اک نئی افتاد ہر موسم میں گزری ہے

نشاط و عیش ہی کو ہم سمجھ لیں زندگی کیونکر
ہے آخر زندگی وہ بھی جو رنج و غم میں گزری ہے

افتخار اعظمی :

شبِ غم میں تارے لٹاتا رہا ہوں — محبّت میں آنسو بہاتا رہا ہوں
چمن میں نہیں ہوں، تو کیا، خونِ دل سے — قفس میں گلستاں بناتا رہا ہوں
حوادث کے اِن خارزاروں میں ہمدم! — گلوں کی طرح مسکراتا رہا ہوں
"محبّت کی تاریکیٔ یاس میں بھی" — چراغِ تمنّا جلاتا رہا ہوں

خزاں میں بھی اہلِ چمن کو میں انور
نویدِ بہاراں سُناتا رہا ہوں

مطبوعات موصولہ

The mind Al-Quran builds ۱۴۴ صفحات کی مختصر سی کتاب ہے انگریزی کی، جس میں فاضل مصنف ڈاکٹر سید عبداللطیف سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نے تعلیمات قرآنی کی اس روح کو پیش کیا ہے جسے اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے اور جس سے اعراض کرکے دنیا کو یہ سمجھنے کا موقع دیا جاتا ہے کہ اسلام ایک خونخوار و خونریز مذہب ہے، حالانکہ اسلام کی حقیقی تعلیم یکسر صلاح و تقوی کی تعلیم ہے اور اس کی غایت صرف امن پسندی و صلح کوشی۔۔۔۔ فاضل مصنف نے اسی حقیقت کے پیش نظر قرآنی آیات سے ثابت کیا ہے کہ دنیا میں انسانیت، اخوت اور امن پسندی کی جیسی زبردست تعلیم اسلام نے دی ہے، اس کی مثال مشکل ہی سے کہیں اور مل سکتی ہے۔

یہ کتاب صرف آٹھ ابواب پر منقسم ہے، لیکن انھیں چند ابواب میں تمام عقاید اسلامی پر فاضلانہ تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ اسلام کے صحیح خط و خال کیا ہیں اور اگر ہم تمام اس غیر صالح مذہبی لٹریچر سے قطع نظر کرلیں جس نے اسلام کے چہرہ کو مسخ کر رکھا ہے تو اس میں وہ تمام صلاحیتیں پائی جاتی ہیں جو جملہ بنی نوع انسانی کو بلا لحاظ ملک و ملت ایک ہی رشتہ سے وابستہ کرسکتی ہیں۔ پچھلی نصف صدی میں دنیا دو نہایت ہولناک جنگوں سے گزر چکی ہے اور تیسری کے اندیشہ سے لرزہ بر اندام ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ صلح و آشتی اور امن و سکون کی اہمیت کو مختلف پہلوؤں سے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف اسلام کی طرف سے اس فرض کے ادا کرنے میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ اچھا ہوتا اگر اس کا اُردو ترجمہ بھی ساتھ ہی ساتھ شایع کردیا جاتا۔ یہ کتاب اکاڈیمی اسٹڈیز آغا پورہ حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے۔

اُردو غزل بڑی مشہور و مقبول کتاب ہے، ڈاکٹر یوسف حسین (پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی) کی جو اس سے قبل شایع ہوکر ملک سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہے۔ یہ اسی کتاب کا دوسرا اڈیشن ہے جسے مکتبۂ جامعہ دہلی نے مجلد شایع کیا ہے۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں جو ۱۰۰ صفحات کو محیط ہے، اُردو غزل پر تبصرہ کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ جو تبصرہ اتنا بسیط و طویل ہوگا، اس میں کیا کچھ نہ ہوگا۔

حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بعد یہ دوسری کتاب ہے جس میں اُردو غزل پر سنجیدہ اور مفکرانہ انداز سے نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ حالی نے اپنی کتاب میں شاعری پر تبصرہ کے ساتھ ہی ساتھ غزل گوئی کی طرف سے لوگوں کے رجحان کو ہٹاکر افادی منظومات کی جانب مایل کیا ہے اور ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں غزل گوئی پر محض جذباتی، نفسیاتی، فنی اور عصری حیثیت سے نگاہ ڈال کر اس کی افادیت سے بحث کی ہے، اور اس لحاظ سے یہ کتاب مقدمۂ شعر و شاعری سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔

اُردو میں فن انتقاد اپنے صحیح معنے میں حال کی چیز ہے۔ اس سے قبل یہاں صرف تذکرہ نویسی کا رواج تھا جس کی حیثیت ذاتی بیاض سے زیادہ نہ تھی۔ سب سے زیادہ مشہور تذکرہ آخری زمانہ کا "آب حیات" ہے۔ لیکن چونکہ اس میں بھی نقد و تبصرہ سے زیادہ شاعری کی گئی ہے، اس لئے کوئی زیادہ وزنی چیز نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو شاعری اور غزل گوئی پر اس وقت تک متفرق طور پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، لیکن جس جامعیت اور شرح و بسط کے ساتھ ڈاکٹر صاحب موصوف نے لکھا ہے وہ اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

س کتاب میں خدا جانے کتنے مباحث پر گفتگو کی گئی ہے لیکن چونکہ ان کی تقسیم کرکے انھیں جدا جدا عنوانات سے پیش نہیں کیا گیا اس لئے س کی حیثیت لکچر کی سی ہوگئی ہے، بہتر ہوتا اگر ترتیب میں اس کا لحاظ رکھا جاتا۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں ۳۰۰ صفحات پر شعراء کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے جو ولی اورنگ آبادی سے لیکر زمانہ حال ک کے ۱۰۹ شعراء پر مشتمل ہے، اور یہ انتخاب اتنا اچھا کیا گیا ہے کہ اگر تبصرہ کے حصہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی اس کتاب کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوسکتی۔

مکتبۂ جامعہ نے یہ کتاب شایع کرکے اس میں شک نہیں زبان کی بڑی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ جس کی ملک کو قدر کرنا چاہئے۔ اس کی قیمت دس روپیہ ہے جو اس کی خوبیوں کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں ہے۔

ترقی پسند ادب

دُنیا میں بعض سائے حقیقت میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور بعض حقیقتیں سائے میں، لیکن یہ تبدیلی ازخود نہیں ہوتی، زمانہ مجبور کرتا ہے، زمانہ کے ساتھ ساتھ رجحانات میں جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں وہ مجبور کرتے ہیں۔ چند سال پہلے جب ترقی پسند ادب کی صدا بلند ہوئی تو وہ حد درجہ ضعیف و مضمحل تھی اور اس کی حیثیت سایہ سے زیادہ نہ تھی لیکن آج یہ سایہ ایک حقیقت نظر آتا ہے اور اس کے اثرات اس قدر وسیع ہوگئے ہیں کہ مشکل ہی سے آج کوئی ادیب یا شاعر ایسا ہوگا جو اس سے دامن بچاکر نکل جانے میں کامیاب ہوسکے۔

اس میں شک نہیں کہ "ترقی پسند ادب" میں ہم کو ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں جو حد درجہ معیوب و مکروہ ہیں اور اس جماعت میں بعض ایسے ادیب و شاعر بھی شامل ہیں جن کا وجود "ترقی پسندی" کی پیشانی کے لئے داغ ہے تاہم، یہ ضروری نہیں کہ ہم ہر اس شخص کو جو اپنے آپ کو ترقی پسند شاعر یا ادیب کہتا ہے اسے سمجھیں بھی ایسا ہی اور محض اس کے وجود کی وجہ سے ترقی پسندی کی اہمیت ہی کو نظر انداز کر دیں۔

اس کتاب میں سردار جعفری نے ترقی پسند ادب کی تاریخ نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کی ہے اور تمام ان مباحث کو لے لیا ہے جو موضوع کے لحاظ سے ہمارے سامنے آسکتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں اس تحریک کے آغاز مقاصد اور غایات ہمیں تمام باتوں کا علم ہوجاتا ہے اور جن سے بہت سی وہ بدگمانیاں دور ہوسکتی ہیں جو ترقی پسند ادب کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہیں۔

افراد و اشخاص کے ذکر میں البتہ زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیا گیا اور اس میں بعض ایسے لوگوں کے نام بھی شامل کر دئے ہیں جو کسی حیثیت سے قابلِ ذکر نہ تھے۔

یہ کتاب نہایت اچھے کاغذ پر ٹائپ میں شایع کی گئی ہے اور انجمن ترقی اُردو علی گڈھ سے جس نے اسے شایع کیا ہے مل سکتی ہے۔

مسلمان اور نظریۂ شرافت

تصنیف ہے جناب رفیق مارہروی کی جسے نظامی پریس بدایوں نے شایع کیا ہے، نسلی برتری کے احساس نے ہمیشہ انسانیت کو چھوٹے بڑے طبقوں میں تقسیم کیا ہے، گو آج نسلی تفوق کا یہ احساس کم ہوتا جا رہا ہے مگر سادات میں اب بھی یہ احساس اکثر و بیشتر موجود ہے، قرآن نے تمام انسانوں کو خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، شاہ ہوں یا گدا، ایک ہی درجہ دیا ہے، اسلام کی نگاہ میں وجہ فضیلت اگر کوئی چیز بن سکتی ہے تو وہ ہے پاکیزگی و تقویٰ، جناب رفیق مارہروی نے اپنی اس کتاب میں نہایت تحقیق سے یہ بات بے نقاب کی ہے کہ سادات کے صحیح النسب ہونے کا ادعا کہاں تک صحیح ہے، انھوں نے بتایا ہے کہ شرافت و نجابت کے جو تصورات انھوں نے قایم کئے ہیں وہ روایات کی رو سے یکسر غلط ہیں، وہ نسلی حیثیت سے کچھ اس طرح خلط ملط ہیں کہ حفظِ نسب کا دعویٰ قطعاً باطل ہوجاتا ہے

مؤلف نے اس کتاب میں نہایت خوبی سے وہ تمام روایات پیش کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ سادات نسلی حیثیت سے کس طرح اور کب غلط ملط ہوئے، روایات کی چھان بین میں اُنھوں نے بڑی دقتِ نظر سے کام لیا ہے کہیں بھی اعتدال و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے، جہاں بہت سے خاندانوں کا ذکر کیا ہے وہیں اپنے خاندانی حسب و نسب کو بھی نہایت بیباکی سے بے نقاب کیا ہے، کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ نہایت دقتِ نظر اور علمی ترتیب کے ساتھ لکھی گئی ہے، جو بات بھی کہی گئی ہے اُس میں اگلی پچھلی روایات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ موضوع و معنی کے لحاظ سے یہ کتاب جتنی پسندیدہ ہے، طباعت و کتابت کے لحاظ سے اتنی ہی غیر پسندیدہ ہے۔ قیمت دو روپیہ۔

سرود و خروش مجموعہ ہے جناب جوشؔ ملیح آبادی کی نظموں کا جو انھوں نے پچھلے چند سالوں میں لکھی ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے اس مجموعہ کی نظمیں مختلف ابواب میں تقسیم کی جاسکتی ہیں جن میں حُسن و عشق، مذہب و سیاست، معاشرت و معیشت سبھی کچھ شامل ہیں، لیکن جوشؔ اپنی شاعرانہ خصوصیات کو انھیں نظموں میں زیادہ قایم رکھ سکے ہیں، جو رندی و سرمستی سے تعلق رکھتی ہیں یا اس سے قریب تر ہیں۔

جوشؔ کی شاعری میں نشاط و ولولہ کی کمی نہیں لیکن وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک ایسا آرٹ ہے جس سے پورا لطف اُٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے جذبات و تاثرات اور ذوق و احساس کو ایک خاص دایرہ کے اندر لے آئے اور یہ بات باوجود آسان ہونے کے اسقدر آسان نہیں کہ بلا استثناء ہر شخص اس میں کامیاب ہوسکے۔

جوشؔ اپنے عہد کا بڑا کامیاب طنز نگار شاعر ہے اور ان کی شاعری کی یہی وہ خصوصیت ہے جس پر دو رایوں کے پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں۔

یہ مجموعہ گلاب سنگھ اینڈ سنز دہلی نے شایع کیا ہے لیکن محض قیمت بڑھانے کے لئے کتابت ایسی کرائی گئی ہے کہ حجم زیادہ ہوجائے، ورنہ یہ ۳۶۸ صفحات کی کتاب آسانی سے ۲۵۰ صفحات میں آسکتی تھی اور اس کی قیمت بھی نصف ہوسکتی تھی۔ اب بھی اس کی قیمت سات روپیہ بہت زیادہ ہے۔

قائدِ ملت یہ کتاب مرحوم نوابزادہ لیاقت علی خاں کی زندگی اور پاکستان میں ان کی سیاسی جدو جہد سے تعلق رکھتی ہے جسے فضل حق صاحب قریشی نے نہایت خلوص و عقیدت کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ابتدا میں مرحوم کی بیگم، جناب غلام محمد صاحب گورنر جنرل پاکستان اور جناب خواجہ ناظم الدین صاحب وزیر اعظم پاکستان کے اعترافات پیش کئے گئے ہیں اور پھر مختصراً مرحوم کی حیات درج کی گئی ہے جو قیام پاکستان سے قبل و بعد دونوں زمانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن بڑا حصہ مرحوم کی ان تقریروں پر مشتمل ہے جو انھوں نے مختلف مواقع پر پاکستان اور پاکستان سے باہر دوسرے مقامات پر کیں۔ مرحوم نے قایدِ اعظم محمد علی جناح کے بعد، پاکستان کی بقا و ترقی کے لئے جو کچھ کیا وہ تاریخ پاکستان کا بڑا اہم حصہ ہے اور ان کے جذبۂ خلوص و ایثار کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اسے کسی طرح فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے ہمیں امید ہے کہ قریشی صاحب کی اس تالیف کو قدر منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ کتاب پسندیدہ طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع کی گئی ہے اور ہے میں ادارۂ ہمدرد صحت آرام باغ روڈ کراچی سے مل سکتی ہے۔

ابتدائی معاشیات ایم - ایچ حسن بی، اے کی تالیف ہے جس میں معاشیات کے تمام اساسی و ابتدائی اصول کو سہل زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے تین ابواب بالکل پاکستان کی آبادی اور وہاں کے معاشی مسایل سے تعلق رکھتے ہیں اور ایسا ہونا ضروری تھا کیونکہ یہ کتاب وہیں کے طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے۔ اخیر میں فہرست اصطلاحات بھی دیدی گئی ہے جو

افادہ سے خالی نہیں ۔ یہ کتاب اقبال بک ڈپو کراچی سے مل سکتی ہے۔

نقشِ جمیل مجموعہ ہے جناب جمیل مظہری پروفیسر پٹنہ کالج کی نظموں کا جسے جناب رضا نقوی نے مرتب کرکے مکتبۂ ادب پٹنہ سے نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے اسے ۵ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تفکرات و تاثرات، رومانیات وشبابیات، سیاسیات وعمرانیات، متفرقات اور باقیات، حالانکہ اس تقسیم کی چنداں ضرورت نہ تھی اور موخرالذکر دو ابواب کی نظمیں ابتدائی تین ابواب میں سے کسی نہ کسی باب میں شامل کی جاسکتی تھیں۔ جناب جمیل مظہری ملک کے ان چند مخصوص شعراء میں سے ہیں جو اُردو شاعری میں اسوقت نہ صرف استادانہ بلکہ مرشدانہ حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی شاعری ایک مستقل دبستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر کسی شخص میں مطالعۂ فطرت کا سلیقہ اور تخیل کی وسعت پائی جائے تو اس کے "شاعر بالقوۃ" ہونے میں کلام نہیں لیکن اگر وہ اس قوت کا منہ کے ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہے تو قدرت کی یہ تمام شاعرانہ ودیعتیں بیکار ہیں اور یہی وہ خصوصیت ہے جو ایک شاعر کے مرتبہ اور اس کے اقدار شاعری کو متعین کرتی ہے۔

جناب مظہر نے سب سے پہلی نظم (مالن کی بیٹی) ۱۹۲۲ء میں کہی تھی (ممکن ہے غزل گوئی کی ابتدا اس سے پہلے ہوچکی ہو) جبکہ انکی عمر ۱۸ سال کی تھی، لیکن اس کمسنی میں بھی ان کی شاعرانہ پختگی کا جو عالم تھا اس کا اندازہ آپ کو اس نظم کے ان دو شعروں سے ہوسکتا ہے

چن چن کے پروتی جاتی ہے دھاگے میں شگفتہ کلیوں کو
دھاگا جو اُلجھ جاتا ہے کبھی ماتھے پہ شکن پڑجاتی ہے

بچپن کا تقاضہ ہے شوخی، شوخی کا نتیجہ ہے غیرت　　　جھک جاتی ہیں آنکھیں شرم سے خود ہونٹوں پہ ہنسی جب آتی ہے

اس رنگ سے ہٹ کر مفکرانہ انداز میں ان کی آخری نظم دھارے کے عنوان سے نظر آتی ہے جس کا آخری بند یہ ہے:-

میں ان دھاروں میں کیونکر ناؤ اپنی چھوڑ دوں آخر
انھیں آنکھوں سے دیکھا ہے جنھیں گرداب میں جاتے
میں دھاروں کو نہیں سیلاب کا قایل ہوں اے ساقی
یہ سب دھارے سمٹ کر کاش اک سیلاب بن جاتے

اس مجموعہ میں جتنی نظمیں مختلف ابواب کے تحت شایع کی گئی ہیں وہ اپنے عنوانات کے لحاظ سے ہر طرح مکمل ہیں اور بعض بعض بہت بلند ہیں۔ ملک عرصہ سے جناب جمیل مظہری کے افکار شعری کی اشاعت کا منتظر تھا، اس لئے ملک کو جناب رضا نقوی کا ممنون ہونا چاہئے کہ ان کے اصرار وسعی سے یہ مجموعہ منصۂ شہود پر آسکا، ہمیں امید ہے کہ جناب جمیل کی غزلوں کا مجموعہ بھی جلد شایع کریں گے۔

نگار کے نادر نمبر

سالنامہ ۱۹۳۶ء

مومن نمبر جو عرصہ ہوا ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کے لئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۴۲ء

اس نمبر میں ریاض [illegible] مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد [illegible] نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری مارچ ۱۹۴۲ء

جزفن انتقاد پر ملک کے بہترین [illegible] اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۸ء

پاکستان نمبر نگار کا جو بلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہئے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۰ء

نگار کی ۳۰ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا مجموعہ جس میں سنہ ۱۹۲۲ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعرا کا تذکرہ مع انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔
قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۵۰ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مارس ہنڈرسن کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر مستقبل کے صحیح راستے کو اختیار کیا جائے دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت [illegible]

۵۰ سال کے بعد

یہ کتاب نفسیاتی عمل پر اتنا مفید اور عجیب لٹریچر ہے کہ آپ اس کو ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک نیچے نہ رکھ سکیں گے جب تک ختم نہ کر لیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ "زندہ رہنا بھی ایک فن ہے" قیمت ایک روپیہ بارہ آنے دو

سالنامہ سنہ ۱۹۵۱ء

حسرت نمبر جس میں ملک کے نامور اہل قلم نے حسرت کا [illegible] انتخاب کلام حسرت [illegible] [illegible] حسرت کے شاعرانہ [illegible] مطالعہ از بس ضروری ہے قیمت [illegible]

سالنامہ سنہ ۱۹۵۲ء

داغ نمبر جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے [illegible]

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۹۶

نگار

سالانہ چندہ پاکستان و ہند
آٹھ روپیہ

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰ر

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

ضخامت ۶۰۲ صفحات مجلد نو روپیہ ۹ للہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات کا مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے :۔ اصحاب کہف معجزہ و کرامت انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل طوفان نوح خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس و رہان ہی حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری علم غیب۔ دعا توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۳۶۴ صفحات کاغذ سفید سنہری قیمت ۵ محصول پانچ روپیہ ۴ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کیے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے اسلئے

قیمت ۵ روپیہ ۲ آنے علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کیے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت پانچ روپیہ بارہ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج کتنی مدد کی اس کتاب میں کچھ عجیب و غریب واقعات نظر آئیں گے نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

نہایت ضروری اطلاع

چونکہ رجسٹری کی فیس اب چھ آنے ہوگئی ہے، اس لئے "نگار" کا سالانہ وی پی آٹھ روپیہ چھ آنے کے بجائے آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں روانہ ہوگا — آپ اس نقصان سے اس طرح بچ سکتے ہیں کہ سالانہ چندہ آٹھ روپے ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں۔ منیجر

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۳ | فہرست مضامین اپریل ۱۹۵۳ء | شمارہ ۴

(داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ ختم ہوگیا۔ مئی کا پرچہ ذریعہ وی پی ۸/۸ روپیہ میں روانہ ہوگا۔ آپ کا فائدہ اسی میں ہے کہ چندہ =/8 روپیہ ذریعہ منی آرڈر روانہ کریں)

ملاحظات

ایک پاکستانی دوست کا خط اور اُس کا جواب

افسوس ہے کہ پرچہ کے آخری جزو کی کتابت کے بعد یہ خط پہونچا، اس لئے "باب المراسلات" کی جگہ مجبوراً "ملاحظات" کے تحت شایع کیا جاتا ہے۔

کراچی — ۲۵ مارچ ۱۹۵۳ء

قبلہ! سلام مسنون

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ "نگار" کا تازہ پرچہ وصول ہوا۔ آپ نے پاکستان کی نسبت جن تاثرات کا اظہار فرمایا ہے وہ کئی پہلوؤں سے بے حد خیال انگیز ہیں۔ آپ نے صحیح لکھا ہے کہ موجودہ حالات میں ہندوستان اور پاکستان کے لئے بہترین طریق کار یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔ یقین کیجئے کہ ہماری حکومت کی پالیسی اور نصب العین یہی ہے۔ مگر افسوس کہ ہمارے عظیم ہمسایہ ملک نے اس سلسلے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ بہرحال یہ ایک طویل مبحث ہے۔ جس پہ اخباری کالموں میں بحث

کی جا سکتی ہو! آپ نے اینٹی احمدی تحریک کے حالات اخبارات میں پڑھ لئے ہوں گے۔ کراچی میں تو یہ فلیتہ سلگ کر ہی فش ہوگیا۔ (اب تک تو یہی محسوس ہوتا ہے آگے کی خبر نہیں) لیکن لاہور میں عوام کی بے اطمینانی، بدگمانی اور بیزاری کا "جوالامکھی" پوری طاقت سے پھٹا۔ بڑے تباہ کن نتائج نکلے۔ خیر اچھا ہوا کہ دلوں کا بخار نکل گیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ لاہور کے حوادث کا پس منظر کیا ہے؟ لیکن ظاہر ہے کہ یہ باتیں زبان پر لانے کی نہیں ہیں۔ بہرحال لوگوں کو مرکزی حکومت کی طاقت کا اندازہ ہوگیا اور یہ بڑی اہم چیز ہے۔ اس اندازے کے نفسیاتی اثرات بہت وسیع اور عمیق ہوں گے۔

میرے خیال میں اس شر سے خیر کا ایک نیا پہلو پیدا ہوا ہے اور میں نے ..... اپنے اولیائے امور کی توجہ صورتِ حال کے اس پہلو کی طرف مبذول کرائی ہے، لطیفہ یہ ہوا ہے کہ اینٹی احمدی تحریک کے سلسلہ میں علمائے اسلام (کثر اللہ امثالہم؟) کی معقول اکثریت جیل چلی گئی ہے۔

وہ میرا ذکر بھی کچھ اس ادا سے کرتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

حضرت مولانا عبدالحامد قادری البدایونی سے لیکر مولوی ابوالحسنات تک جتنے بزرگان دین تھے وہ خوبیٔ تقدیر سے بندی خانے پہنچ گئے ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ ہم ۱۹۵۴ء تک ان کی زیارت سے محروم رہیں گے تعجب نہیں کہ میعاد اسیری میں ایک سال کا اضافہ اور ہوجائے۔ حکومت پاکستان کا فرض ہے کہ ― "فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار" کے پیش نظر وہ اس مدت میں تمام بنیادی امور کو نپٹا دے۔ یعنی دستور سازی۔ نفاذ دستور اور عمومی انتخابات وغیرہ ― قبلہ! انصاف کیجئے کہ حالات کا یہ پہلو کس قدر دلچسپ اور کتنا فرح بخش ہے؟ یعنی اندازہ فرمائیے کہ مجلس دستور ساز، جو ملاحدہ و زنادقہ پر مشتمل ہے، ٹھاٹ سے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا دستور بنا رہی ہوگی اور مولوی جیل میں پڑے ایڑیاں رگڑ رہے ہوں گے۔

کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

بے شک اس تحریک کے سلسلہ میں مولوی مودودی ایسی "سمجھدار مچھلی" ثابت ہوئے جو مچھیرے کی آمد سے ایک روز قبل ہی ٹھاٹ سے بہکر گہرے پانی میں چلی گئی تھی۔ مگر ان کا "نہ پکڑا جانا" ان کی مولویت اور پیرزادگی کے لئے تباہ کن ثابت ہوا کیونکہ جب اونٹ کی واحد شناخت "نکیل" قرار پا جائے تو جس اونٹ کی ناک میں نکیل نہ ہو اُسے کون اونٹ تسلیم کرے گا؟ آج سچا مولوی وہ ہے جو اینٹی احمدی تحریک کے سلسلہ میں پکڑا گیا ہو۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مولوی مودودی کی مولویت ختم ― کیونکہ انھوں نے عوام کو صرف ایک بیان پر ٹرخا دیا۔

مخلص

....

لکھنؤ - ۲۵ مارچ ۵۳ء

تسلیم -

کل آپ کا نوازش نامہ ملا تو بے اختیار آپ سے باتیں کرنے کو جی چاہنے لگا۔ کراچی کے دورانِ قیام میں جب کبھی آپ سے ملاقات ہوتی تھی تو موضوع گفتگو ہمیشہ "پاکستان" ہی ہوا کرتا تھا، اس لئے اب جو کئی ماہ کے بعد آپ کا خط ملا تو کراچی کی وہی صحبتیں نظروں میں پھرنے لگیں اور وہی "حدیثِ دوست" سامنے آگئی جس سے ہم آپ دلچسپی لیا کرتے تھے۔ جواب لکھنے بیٹھا تو خلاف توقع "سرِ دلبراں" ہوکر رہ گیا اور اس کا لطف اسی میں ہے کہ "گفتہ آید در حدیثِ دیگراں"۔ اس لئے آپ کا خط اور اپنا جواب دونوں نگار میں شایع کرتا ہوں۔

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم!

ہوسکتا ہے کہ پاکستان کی پالیسی اور اس کا نصب العین یہی ہو کہ وہ ہندوستان سے تعلقات خوشگوار رکھے اور آپ

فرماتے ہیں تو یقیناً ایسا ہی ہوگا، لیکن میرے عزیز دوست، پالیسی یا نصب العین، محض خواہش و تمنا کا نام نہیں اور نہ اس کا دامن Arm chair Politics سے ہے۔ یہ چیز تو بالکل حرکت و عمل سے تعلق رکھتی ہے۔ اور۔ اگر نوابزادہ کی رحلت کے بعد کوئی اقدام اس نوعیت کا پاکستان کی طرف سے ہوا ہو تو میں اس کے سننے کا مشتاق ہوں !

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "اس سلسلہ میں ہندوستان نے البتہ کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔" یہ سنکر مجھے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ معاہدۂ "نا جنگی" کی پیشکش اور قانون تخلیہ کنندگان کو یک لخت ختم کر دینے کی تجویز غالباً سب سے پہلے نہرو کی طرف سے کی گئی تھی جسے پاکستان نے شاید مذاق سمجھ کر ٹال دیا، حالانکہ پاکستان کے سامنے یہ ایسا Sporting offer تھا کہ اگر موقع شناسی سے کام لیا جاتا تو اس مذاق سے بھی بڑا فایدہ اُٹھایا جا سکتا تھا، لیکن جناب ڈاکٹر قریشی نے اس کے جواب میں (اور وہ بھی کافی تاخیر کے بعد) جو کچھ فرمایا اس کی روح یہ تھی کہ "پہلے ہندوستان قانون تخلیہ کنندگان کو منسوخ کردے، اس کے بعد پاکستان غور کرے گا کہ وہ کیا کر سکتا ہے !"

قربانِ نگاہِ تو شوم باز نگاہے !

تھوڑی دیر کے لئے میں مانے لیتا ہوں کہ نہرو کی یہ پیشکش بالکل Bluff تھا، لیکن Bluff کا جواب Bluff سے دینا بڑی گھٹیا درجہ کی سیاست ہے۔ بلند سیاست کا اقتضا یہ تھا کہ پاکستان بالکل غیر مشروط طور پر اپنے قانون تخلیہ کنندگان کو منسوخ کر دیتا اور ہندوستان سے کسی متوازی اقدام کی درخواست بھی نہ کرتا۔ اگر نہرو کا یہ پیشکش Bluff تھا تو اسے صرف اسی طرح بے نقاب کیا جا سکتا تھا۔

"معاہدۂ نا جنگی" کے سلسلہ میں پاکستان نے اس وقت تک جو کچھ کیا وہ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر اس کی پالیسی واقعی صلح جوئی پر مبنی ہے، جیسا آپ فرماتے ہیں، تو کیا پاکستان کو اس پیشکش کا جواب خاموشی سے دینا چاہئے تھا ؟ — اس کا جواب ایک ہی تھا اور وہ بھی صرف ایک ہی لفظ کا کہ — "بسم اللہ" ! لیکن افسوس ہے کہ پاکستان میں سب سے زیادہ کمی خود اعتمادی کی ہے اور یہی کمی اُسے کسی مسئلہ میں کوئی مضبوط قدم اُٹھانے نہیں دیتی۔

آپ کا یہ ارشاد کہ ہندوستان نے پاکستان سے خوشگوار تعلقات قایم کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، غالباً ان چند الزامات کی بنا پر ہے جو ہندوستان پر عاید کئے جاتے ہیں۔ آئیے اک نگاہ ان پر بھی ڈال لیں۔ سب سے بڑا الزام نہروں کی آبپاشی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مشرقی پنجاب کی طرف سے مغربی پنجاب کی نہروں میں پانی بہت کم آیا لیکن اس کا سبب یہ قرار دینا کہ ہندوستان نے پاکستان میں خشک سالی پیدا کرنے کے لئے ارادتاً ایسا کیا، بڑا عاجلانہ فیصلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے سال بارش کی کمی کی وجہ سے دریاؤں کی سطح معمول سے بہت نیچی رہی یہاں تک کہ خود مشرقی پنجاب کی نہروں میں بھی پانی بہت کم آیا، جس کی تصدیق حال ہی میں ایک غیر جانبدار ماہر فن نے بھی کی ہے۔

بات یہ ہے کہ غلہ کی کمی کا سوال حکومتوں کے لئے بڑا اہم سوال ہوا کرتا ہے اور عوام کی بے چینی و بدظنی دور کرنے کے لئے وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی تاویل اس کی پیش کرتی رہتی ہیں اور اپنے سر سے الزام دور کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی سبب ایسا ضرور بتا دیتی ہیں جس کا تعلق بیرونی اسباب سے ہو۔ اور اس باب میں پاکستان نے بھی یہی کیا، ورنہ آپ مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے آگاہ ہوں گے کہ پاکستان بھر کی تمام کھیتیاں پنجاب ہی کی نہروں سے سیراب نہیں ہوتیں —— اور تھوڑی دیر کے لئے اس الزام کو صحیح مان لیا جائے، تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ جب پاکستان، ہندوستان کو اپنا دشمن باور کرتا ہے تو وہ کیوں اس سے رواداری یا پاس عہد کی توقع رکھے، یہ مشہور مصرعہ یقیناً آپ کی نگاہ سے گزرا ہوگا کہ :-

اے صدف تشنہ بمیرد سوئے نیساں منگر

بات کہنے کی نہیں لیکن کہنا پڑتی ہے کہ اگر مشرقی پنجاب کی تمام نہروں کا پانی صرف پاکستان ہی کے لئے مخصوص ہوتا تو بھی اسے انھیں

دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا، کیونکہ وہاں سوال دراصل پانی کا نہیں بلکہ "بمیر د تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی" کا ہے۔

اس قسم کا دوسرا الزام تجارتی تعلقات کے سلسلہ میں ہندوستان پر یہ بھی عاید کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے یہاں جوٹ کی کاشت صرف اس غرض سے بڑھائی کہ پاکستان سے جوٹ لینے کی ضرورت اسے پیش نہ آئے!

گفتہ بودی ہمہ زرقند و فریب اند و فسوس
سعدی آں نیست ولیکن چو تو فرمائی ہست

اگر پاکستان کل اپنے یہاں لوہے کی کانوں سے لوہا نکالنا شروع کردے اور ہندوستان یہ شکایت کرے کہ پاکستان نے یہ سب کچھ اس لئے کیا ہے کہ ہندوستان سے اسے لوہا خریدنا پڑے، تو دنیا کیا کہے گی، ستم ہے

ہم اگر کہدیں کوئی بات تو کافر کہلائیں
شیخ کہدے تو وہی بات کرامت ٹھیرے

باور کیجئے میرے دل میں بھی پاکستان کا درد اتنا ہی ہے جتنا آپ کے دل میں اور اگر آج میں پاکستان کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ہندوستان کی طرف سے ہر اقدام صلح کوشی کا پوری فراخدلی و خود اعتمادی کے ساتھ خیر مقدم کرے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ میں ڈرتا ہوں مبادا کل یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے اور پاکستان کو اس سے زیادہ تلخ حقیقتوں کا مقابلہ کرنا پڑے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا، ممکن ہے اس سے آپ کو اختلاف ہو اور آپ اپنی تائید میں کچھ دلایل بھی پیش کرسکیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ ہندوستان کے مسایل پر غور کرتے ہیں، یہاں کی اقلیت کو سامنے رکھ کر اور میں پاکستان کے مسایل پر غور کرتا ہوں وہاں کی اکثریت کو سامنے رکھ کر، اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے ــــ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی بعض تنگ نظر جماعتیں بلکہ خود کانگرس پارٹی کے بھی اکثر افراد پاکستان کے دوست نہیں ہیں اور وہ اب تک غیر منقسم ہندوستان کا خواب دیکھ رہے ہیں اور جس حد تک جذبات و عمل کا تعلق ہے، ہندوستان یقیناً صحیح معنی میں نامذہبی حکومت نہیں ہے، لیکن یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب تک ہندوستان کی حکومت نہرو کے ہاتھ میں ہے، پاکستان کو ہندوستان کی طرف سے مطمئن رہنا چاہئے اور یہی وہ نکتہ تھا جس کے پیش نظر میں نے یہ عرض کیا تھا کہ پاکستان کے لئے ہندوستان کے ساتھ مضبوط دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کا بہترین وقت یہی ہے ــــ اگر آج دونوں حکومتیں اپنی اپنی جگہ یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ ایک دوسرے سے کبھی جنگ نہ کریں گی اور ایک نیوٹرل بلاک بنانے کے بعد مشترک دفاع کی اسکیم پر متحد ہوجائیں، تو کل ہندوستانی یا پاکستانی حکومتوں کے انقلاب کے بعد بھی اس رشتہ کا توڑنا آسان نہ ہوگا اور یہ تو آپ بھی مانتے ہیں کہ دونوں ملکوں کی بقا و ترقی کا انحصار صرف اس پر ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے دوست رہ کر شانہ سے شانہ ملاکر آگے بڑھیں ــــ اور یہ اتنا عظیم مقصد ہے کہ اگر اس کی تکمیل کی راہ میں بعض معمولی موانع حایل بھی ہوں تو انھیں نظرانداز کردینا چاہئے۔ مستقبل کی تعمیر کے لئے حال کی ٹھوکروں کو برداشت کرنا ضروری ہے۔

اینٹی احمدی تحریک کے سلسلہ میں لاہور کے جس پس منظر کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، وہ پردۂ راز کی چیز نہیں، سب کو اس کا علم ہوچکا ہے "آپ" زبان پر لائیں یا نہ لائیں"۔ اس لئے مجھے کہنا پڑتا ہے کہ مرکزی حکومت نے طاقت سے کام لینے کے باوجود، کام ادھورا چھوڑ دیا، ضرورت تھی کہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے انھیں پر ضرب لگائی جاتی جنھوں نے اس آگ کو اپنے دامن سے ہوا دی تھی۔ لیکن خیر، اب وزارت دولتانہ مستعفی ہوگئی ہے ممکن ہے حالات بہتر ہوجائیں

اس میں شک نہیں کہ احمدیوں کے خلاف پاکستان کے مسلمانوں نے جس درندگی و بربریت کا ثبوت دیا ہے وہ پاکستان و اسلام دونوں کی پیشانی پر نہ مٹنے والا داغ ہے اور ممکن ہے احمدی جماعت اسے بھلادے لیکن تاریخ پاکستان کے صفحات سے خون کے یہ دھبے کبھی نہیں مٹ سکتے۔

آج جو کچھ پاکستان کے مسلمانوں نے احمدی جماعت کے ساتھ کیا ہے، وہ علویین کے ساتھ خوارج و زنادقہ نے بھی نہ کیا تھا، غضب خدا کا محض اکثریت سے ناجایز فایدہ اٹھاکر دن دہاڑے بزدلانہ طریقہ سے احمدیوں کو قتل و ذبح کرنا، ان کی دوکانیں لوٹ لینا، مکانوں میں آگ لگادینا، عورتوں کی

عصمت دری کرتا — اور یہ سب کچھ خدا اور رسول کے نام پر کرتا! معاذ اللہ! میں حیات بعد الموت اور جزا و سزا کا قایل نہیں، لیکن ان واقعات کو سن کر یہ اختیار جی چاہتا ہے کہ جنت نہ سہی لیکن کم از کم دوزخ پر ضرور ایمان لے آیا جائے کیونکہ ایسے کمینے، نابکار و نامراد وحشی انسانوں کی سزا و تعزیر کی کوئی معقول صورت میری سمجھ میں تو آتی نہیں — یقیناً کراچی میں اس ہنگامہ نے زیادہ طول نہیں کھینچا اور ہوسکتا ہے کہ اس کا سبب یہی ہو کہ مولویوں کو حراست میں لے لیا گیا، علاوہ اسکے یوں بھی کراچی نہ احمدیوں کا مرکز ہے اور نہ انکے دشمنوں کا اڈا۔ اس لئے وہاں زیادہ شورش کی کوئی وجہ نہ تھی، لاہور میں صورت حالات اس سے بالکل مختلف ہے، وہ احمدیوں کا بھی مرکز ہے اور احراریوں کا بھی، اور ان دونوں کے تعلقات عرصہ سے کشیدہ چلے آرہے ہیں — وہاں کے بعض اخبارات و رسایل کی زندگی کا مقصد بھی اس آگ کو مشتعل رکھنا ہے، اور خود وہاں کی حکومت بھی غالباً سیاسی اغراض کی بنا پر کوئی نہ کوئی ہنگامہ چاہتی تھی، اس لئے وہاں جو کچھ ہوا وہ غیر متوقع بات نہ تھی، لیکن معاف کیجئے، ایک حد تک مرکز بھی اس کا ذمہ دار ہے کیونکہ اول اول جب مسئلہ "ختم نبوت" کے سلسلہ میں اینٹی احمدی تحریک کا آغاز ہوا تھا، اسی وقت مرکز کو مضبوط قدم اٹھا کر اس کا سد باب کر دینا چاہئے تھا۔ کیا جن لوگوں کو آج گرفتار کیا گیا ہے، ان کو پہلے گرفتار نہ کیا جاسکتا تھا — جس وقت حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ احمدی جماعت کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، تو حکومت کے لئے دو ہی راستے تھے، ایک Academic دوسرا Dynamic یعنی یا تو وہ فوراً ان لوگوں کا منہ بند کر دیتی جنھوں نے یہ آواز بلند کی تھی، یا پھر پہلا احمدی و غیر احمدی علماء کو جمع کر کے ایک مجلس مناظرہ قایم کرنے کا مشورہ دیتی (جیسا کہ مامون نے خلق قرآن کے مسئلہ میں کیا تھا) اور اس میں نہ صرف اس امر پر بحث کی جاتی کہ احمدی واقعی ختم نبوت کے قایل ہیں یا نہیں بلکہ یہ بھی کہ وہ ختم نبوت کے قایل نہیں ہیں تو انھیں کیا سمجھا جائے گا:- کافر، مشرک، ملحد، زندیق، فاسق یا کچھ اور (محض غیر مسلم کہہ دینا کافی نہیں کیونکہ یہ کوئی اصطلاحی لفظ نہیں) اور مناظرہ کی تمام روداد چند ایسے بیرونی علماء کے سامنے پیش کی جاتی جنھیں احمدی و غیر احمدی علماء دونوں کا اعتماد حاصل ہوتا اور انکی رائے کو قطعی فیصلہ قرار دیا جاتا۔ علاوہ لطف و تفریح کے مولویوں کو اس جھگڑے میں الجھا کر پاکستان کو دوسرے اہم مسایل پر توجہ کرنے کی فرصت مل جاتی اور دوسرے یہ کہ مذہبی مسایل کو خالص علمی طریقہ سے طے کرنے کی ایک مہذب و شایستہ رسم قایم ہوجاتی اور تیسرے یہ کہ پبلک کو ایک بار قطعی طور پر معلوم ہو جاتا کہ انکے علماء فاضل پر تھے — جس وقت لاہور میں ہنگامۂ قتل و غارتگری کی ابتدا ہوئی اور اسکی خبر مجھے پہونچی، تو میں دیر تک سوچتا رہا کہ اس جھگڑے میں احمدی جماعت کو کیوں فریق مخالف سمجھا گیا۔ اختلاف تو در اصل حکومت سے تھا کہ اسنے احمدی جماعت کو اقلیت والی جماعت تسلیم نہیں کیا اور اس لئے حکومت ہی سے مقابلہ کرنا چاہئے تھا، غریب احمدی جماعت کا کیا قصور تھا کہ اسکے خلاف آستینیں چڑھائی گئیں۔ لیکن میں اس کو مسلمانوں کی بدنصیبی کے سوا اور کچھ نہ سمجھ سکا — آپ نے بہت ٹھیک کہا کہ بغیر ان "بزرگان دین" کو کئی سال کے لئے "بندی خانہ" پہونچا دئے گئے اور پاکستان اس موقع سے فایدہ اٹھا کر "تمام بنیادی امور" کو بہ آسانی نپٹا سکے گا۔ لیکن مجھے اسکی امید نہیں کیونکہ چند علماء کو نظر بند کر دینے سے نہ انکی نسل منقطع ہوسکتی ہے اور نہ اس کا یقین ہوسکتا ہے کہ وہ اپنا پھیلایا ہوا زہر اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے — ان کو تو جو کچھ کرنا تھا کر چکے، مسلمانوں کی ذہنیت کو جتنا تباہ کرنا تھا کر چکے اور اگر آج چن چن کر ایک ایک مولوی کو ختم کر دیا جائے تو بھی ان کے پیدا کئے ہوئے مسموم اثرات دور کرنے اور انکی بگاڑی ہوئی ذہنیتوں کو سدھارنے کے لئے کم از کم ۲۵ سال کا زمانہ درکار ہے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ پاکستان اپنے دستور میں کسی ایک جگہ بھی "کتاب و سنت" کا نام دیئے اور ایسی جمہوریت قایم کرنا طے کرے جو مذہب کے تصور سے بالکل آزاد ہو — مغربی صحافیوں کا ایک وفد حال ہی میں پاکستان کی سیاحت کے لئے آیا تھا۔ اس کے ایک رکن محمد عبدالقادر حمزہ (اڈیٹر البلاغ) پاکستان اور مسلمانان پاکستان کے متعلق جو خیالات و اثرات لیکر گئے ہیں وہ شاید آپ کی نگاہ سے گزرے ہوں گے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"پاکستان کا مولوی مذہبی شعبدہ باز ہے اور یہاں کا مسلمان بالکل اندھا اور جاہل انسان جسے اصول اسلام سے مطلق واقفیت نہیں، حال ہی میں جو فرقہ وارانہ ہنگامے احمدیوں کے خلاف ہوئے ہیں اور جن کے نتایج دیکھنے کا ہمیں خود موقع ملا ہے وہ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ان کا اسلام ایک موروثی اندھے اعتقاد سے زیادہ کچھ نہیں اور وہاں کا مولوی اس سے بہت ناجایز فایدہ اٹھاتا ہے"

اس بیان سے آپ کو اندازہ ہوسکتا ہے کہ اینٹی احمدی ہنگاموں نے پاکستان کے وقار کو دنیا میں کتنا کم کر دیا ہے اور پاکستان کو اسکی تلافی کے لئے آیندہ کونسی راہ اختیار کرنا ہے۔ ابوالاعلیٰ مودودی کے ذکر میں آپ نے یہ بات بڑے مزے کی لکھی ہے کہ ان کی ناک میں نکیل نہ ہونے سے انھیں اب اونٹ کون تسلیم کرے گا۔ لیکن آپ کا ذہن شاید اس نکتہ کی طرف منتقل نہیں ہوا کہ اونٹ بہر حال اونٹ ہے اور اگر اس کی حیثیت "شتر بے مہار" کی سی ہو تو اور زیادہ خطرناک چیز ہے — رہا یہ امر کہ انھوں نے عوام کو صرف ایک بیان پر اٹھا دیا اور خود چھوڑ کر چلے یہاں غایب ہوگئے۔ یہ بھی مولویوں کی دنیا میں کوئی انوکھی بات نہیں۔ لاہور کے مجاہد اعظم (مولانا سعید نیازی) جو ہنگامۂ لاہور کے دوران میں مسجد وزیر خاں کے محراب و منبر سے شریروں کو حملہ کے احکام صادر کیا کرتے تھے، پنجاب کے ایک غیر معروف قریہ میں گرفتار کئے جاتے ہیں تو لوگوں کو ان کا پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ جس چہرہ پر پہلا ایک لمبی و طویل داڑھی لہلہاتی رہتی تھی وہ اب عورتوں کے چہرہ کی طرح بالکل سادہ و صاف تھا — اس کے علاوہ وہ واقعہ بھی آپ کے سامنے ہوگا جب پاکستان کے صدر جمعیۃ العلماء نے مشرقی بنگال طلبہ کے دھمکانے سے فوراً معذرت لکھ کر دیدی کہ بنگلہ زبان کے متعلق جو کچھ انھوں نے اپنے خطبہ میں ظاہر کیا وہ صحیح نہ تھا۔

[illegible] کے ہیں [illegible] اختیار

مولانا شبلی کی شخصیت

اس دور میں مولانا شبلی کی شخصیت، اُن کی شاعری، اُن کی سیاست اور اُن کے خطوط کی طرف کافی توجہ کی گئی ہے۔ مگر نوجوان حلقے کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ چیز ان کے وہ خط ہیں جو انھوں نے بمبئی کی دو پڑھی لکھی متمول اور قدرے روشن خیال خواتین کے نام لکھے تھے۔ کچھ اسی قسم کے خطوط اگرچہ اقبالؔ نے بھی لکھے تھے مگر اقبالؔ کی شخصیت چونکہ ہمارے ذہن کو متاثر ہی نہیں بلکہ مرعوب بھی کرتی ہے اس لئے اُن کے یہاں اس قسم کے خطوط کا پایا جانا ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ شبلیؔ کی بات دوسری ہے کیونکہ وہ شاعر سے زیادہ مولوی ہیں۔ اُن کے یہاں جو جذبہ ہے وہ اپنی شدت کے باوجود ہمہ گیر نہیں اور قلم کی زبان تک آتے آتے اس پر نہ جانے کتنے پردے پڑ جاتے ہیں۔ ان پردوں کو اُٹھانے میں بہت سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، یہاں تک کہ ان کی نیت پر بھی حملے کئے جاتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں جس چیز کی کمی ہے اُسے ہم آج اتنی دور سے، بڑی آسانی سے دیکھ لیتے ہیں، اور وہ کمی یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی باغیانہ تحریک نے جس طرح اور جس حد تک سرسید، حالیؔ یا نذیر احمد کو متاثر کیا اُس طرح شبلیؔ کو متاثر نہ کر سکی۔ وہ غدر سے براہ راست متاثر ہو کے سرسید کی تحریک میں شامل نہیں ہوئے، صرف علی گڑھ کے اثر سے اس تحریک کے ساتھ ہو گئے۔ یعنی وہ اس آگ سے سرسید یا حالیؔ یا غالبؔ کی طرح نہیں گزرے۔ اس کی حرارت سے ان کے ذہن میں گرمی نہ آئی، روشنی البتہ ملی۔ جب غدر ہوا تو وہ پیدا ہوئے لیکن سرسید اس اثناء میں شعور کی انتہائی بلندی تک پہونچ چکے تھے۔ مولانا نے تو غدر کو تماشائی کی حیثیت سے بھی نہیں دیکھا تھا، پھر وہ حالیؔ کی طرح غدر کے جلو میں خاندانوں کی تباہی، ذرائع معاش کی تنگی، زندگی کی دشواری، ذہن کی غارت گری، تخیل کی گمراہی کو کس طرح دیکھ سکتے؟ نذیر احمد ہی کو لیجئے۔ انھوں نے ایک مفلس، یتیم بچے کی طرح زندگی شروع کی مگر ان کا کمال یہ ہے کہ اس مفلسی کو جھوٹی شرافت میں چھپانے کے بجائے وہ اسے ظاہر کرنے، اس پر قابو پانے اور اس کو ایک سماجی قدر بنانے میں کامیاب ہیں۔ خاندانی وجاہت سے مرعوب ہونے کے بجائے نام نہاد شرفاء کی خانگی زندگی کی اُلجھنوں کو نمایاں کرنے میں بیباک ہیں۔ عورتوں سے حسنِ ظاہر سے متاثر ہونے کے بجائے ان کی جہالت، پھوہڑپن اور فطری کمینگی کے دور کرنے میں اُن کا قلم کوتاہی نہیں کرتا۔ شبلیؔ کے یہاں ان میں سے کوئی بات نہیں۔ انھیں نہ شخص سے شغف ہے نہ سماج سے۔ صرف اپنے ذہن سے محبت ہے۔ صرف اپنی جولانیِ طبع کے اظہار سے دلچسپی ہے۔ صرف اس طوفان سے فایدہ اُٹھانے کی کوشش ہے۔ ان کے یہاں یقین ہے نہ عزم۔ صرف حوصلہ ہے۔ ہنگامی دلچسپیاں ہیں۔ جراَتِ رندانہ کی بھی کمی نہیں مگر وہ ادیب ہیں، رفارمر نہیں ہیں۔ سیاست داں ہیں، مفکر نہیں۔ وقت سے فایدہ اُٹھاتے ہیں۔ شہرت کے پجاری ہیں۔ اور بسا اوقات سستی شہرت کے۔ آگ کو بھڑکتا ہوا دیکھ کر بجھاتے نہیں بلکہ اس پر اور تیل چھڑکتے ہیں۔ مولویوں کو جدید تعلیم کی طرف نہیں لاتے بلکہ انھیں ایک علٰحدہ کیمپ میں جمع کر دیتے ہیں۔ شبلیؔ پر یہ سارے اعتراضات وزن رکھتے ہیں، خاص طور پر اس لئے بھی کہ ان کے عقیدت مندوں نے ان کی شخصیت پر جو ایک رنگین نقاب ڈالنے کی کوشش کی ہے وہ مضحکہ خیز ہے۔ چنانچہ نئی نسل جو ان رنگین نقابوں کی سب سے بڑی دشمن ہے ان اعتراضات کو بیشتر حق بجانب سمجھتی ہے۔ مگر

یہاں ایک بات پر غور کرنا ہے - شبلی نے جب سرسید کی مخالفت شروع کی تو کیا یہ کوئی ایسی بات تھی جو اوروں کے یہاں ہمیں نہیں ملتی ؟ اُس دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ سرسید کے مخالفوں کی تعداد ہزاروں تک پہونچتی تھی - ان میں سے جن بزرگوں کے نام ہم تک پہونچتے ہیں ان میں ہر قسم کے لوگ شامل ہیں - مسٹر بھی ہیں اور مولانا بھی - ادنےٰ درجے کے لوگ بھی ہیں اور اعلیٰ طبقے کے لوگ بھی، مگر عام طور پر یہ سب لوگ سرسید کے مذہبی خیالات سے بیزار ہیں - جن حضرات نے کالج کے لئے چندے دئے انھوں نے بھی سرسید کی تفسیر سے اختلاف ظاہر کیا - ان کی کس کس چیز کی مخالفت نہیں ہوئی —— تہذیب الاخلاق کی توڑ پر کیسے کیسے پرچے نہیں نکلے - مسدس حالی کے جواب میں کیا کیا نظمیں نہیں لکھی گئیں، اُن کو نیچری، کافر، ملحد اور بے دین کے کیسے کیسے ناموں سے نہیں پکارا گیا - ان سب لوگوں کے مقابلہ میں مولانا شبلی کی حیثیت کس قدر معمولی تھی - ان کے چند مخالفانہ کلمے کس قدر حقیر تھے - جدید تعلیم پر ان کی تنقیدیں کس قدر جذباتیت سے معرّا، اصولی، اساسی اور حقیقی تھیں - ان تمام باتوں پر غور کیجئے تو اُن کی مخالفت کی اہمیت دب جاتی ہے اور یہ نظر آنے لگتا ہے کہ ان میں اور سرسید میں مخالفت تو کجا حد درجہ یگانگت ملتی ہے - مولانا کے معتقد خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں لیکن ان کے زمانہ میں لوگ انھیں سرسید کے گروہ کا ایک نامی پہلوان ہی سمجھتے تھے جیسا کہ نشتر نے لکھا ہے - مثلاً ان پر جو الزام لگائے گئے اور سرسید پر جو فتوے صادر کئے گئے ان میں زیادہ فرق نہیں - اسی زمانہ میں مولانا ظفر الملک نے لکھا تھا: "ہمارے مولانا پرستارانِ عقلیت کی رایوں کے مطابق اسلام کی تاریخ گزشتہ اور قرآنی تعلیم کو ایسے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں کہ خواہ مذہب کا منشا پورا نہ ہو لیکن متبعین یورپ کی تشفی ہو جائے - مولانا کی ایسی تمام تحریروں نے اگر ایک طرف حاملانِ شریعت اور علمائے مذہب کو برافروختہ اور کبیدہ خاطر کیا تو دوسری طرف خود اسلام کی قوت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچایا ہے۔" کیا ایسا ہی الزام سرسید پر بھی نہیں تھا اور کیا ان کی تحریروں نے بھی اسی طرح حاملانِ شریعت اور علمائے مذہب کو برافروختہ اور کبیدہ خاطر نہیں کیا تھا - اس کا جواب کھلا ہوا ہے، اور اسی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا نے سرسید سے جزوی اختلاف کے باوجود اُن سے بہت کچھ حاصل کیا تھا - اس اختلاف میں بھی اختلاف کو اتنا دخل نہیں جتنا کدورت کو دخل ہے - اسی کدورت کو دل میں لیکر مولانا علی گڑھ سے نکلتے ہیں مگر علی گڑھ کا احسان اتنا بڑا ہے کہ اسے وہ بھلانا چاہیں بھی تو نہیں بھول سکتے - یہی وجہ ہے کہ وہاں سے جانے کے بعد بھی بہت سے ایسے مواقع آتے ہیں جب انھیں علی گڑھ کی کشش غالب نظر آتی ہے اور نواب محسن الملک تو آخر تک انھیں واپس آنے کی ترغیب دیتے ہیں - مولانا بھی واپس آنا چاہتے ہیں مگر نہیں آتے، وعدے پر ٹالتے ہیں، حتیٰ کہ ندوہ انھیں اپنی طرف کھینچ لیتا ہے -

مولانا کی ابتدائی زندگی پر جو علی گڑھ سے پہلے ان کے وطن میں، تعلیم کے حصول یا تلاش معاش میں گزری تھی یہاں زور دینا ضروری نہیں اگرچہ اس کی اہمیت مسلّم ہے - اس میں ایک تو ان کی موروثی خصوصیات کی اہمیت ہے جس پر اکرام نے "شبلی نامہ" میں زور دیا ہے، جس کے نتیجے میں ان کی ذات میں شروع میں انانیت یا خود پسندی کے عناصر ملتے ہیں، دوسرے زندگی کی طرف سے بے اطمینانی اور نفسیاتی تنہائی، بے چارگی اور کس مپرسی کا ایک احساس ملتا ہے جو عہدِ شباب کی لعنت بھی ہے اور برکت بھی مگر جس کی بنیاد ایک طرح کی روحانیت پر ہے - ان کے یہ اشعار دیکھئے جو اسی دور کے طفیل میں ہمیں ملتے ہیں

نبود بہ زمانہ یاورِ من — نے خواہر و نے برادرِ من
از جورِ سپہر خستہ باشم — در کنجِ غمے نشستہ باشم
کس را نبود بہ من نیازے — من باشم و دردِ جانگدازے

اے پسر از چہ رمیدی از ما ؟ باز گو تا کہ چہ دیدی از ما ؟
گفتۂ ترکِ وفا یعنی چہ ؟ بافتی بزد وغنا یعنی چہ ؟
تو بہ یک دم زدن اے مہ رخسار گشتۂ چوں من از من بیزار
وقت ہا بزم سخن ساختمی طرح بیت و غزل انداختمی ،
من بہ تو بادلِ ماتم زدۂ ، خستۂ ، سوختۂ ، غم زدۂ ،
بے حجابانہ ہم از سر ذوق ، عرض می داشتمی حالتِ شوق ،

ان اشعار میں ان کی داخلی کیفیت نمایاں ہے اور یہی کیفیت بعض فارسی خطوط میں بھی نظر آتی ہے مگر صرف انھیں چیزوں کی بنا پر ان کی سوانح عمری مرتب نہیں کی جا سکتی۔ اکرام لکھتے ہیں: "لیکن اس بچّے کے لئے اپنے ماحول میں لفظ آرام و آسایش نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو اس سے ایک طرح کی ضد تھی۔ شبلی کو جن حالات سے سابقہ پڑا وہ تو غیر معمولی طور پر افسوس ناک اور مایوس کن تھے" حالانکہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ مولانا کو کسی قسم کی غیر معمولی دشواری کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان کے یہاں جو خانگی معاملات ہیں وہ ایک اوسط درجے کے ہندوستانی خاندان کے عام واقعات ہیں مگر صرف انہی واقعات کی بنا پر کوئی مولانا شبلی بننا چاہے تو کامیابی معلوم۔ اور پھر مولانا کو تو اپنے خاندان سے محبت بھی ہے جیسا کہ ان کے مرثیوں سے ظاہر ہوتا ہے مگر چونکہ وہ حساس طبیعت کے مالک ہیں اس لئے کہیں کہیں ان کی بعض تحریروں میں تلخی کی جھلک ملتی ہے۔ مگر یہ تلخی صرف منھ کا مزا بدلنے کے لئے ہے۔ اسے مولانا کی زندگی سے کوئی دائمی تعلق نہیں۔ اس کا اثر وقتی ہے۔ یہ زمانہ ہی کچھ ایسا تھا کہ باپ اور بیٹے کے درمیان معمولی اختلافات کا ہونا موجب حیرت نہیں۔ مولانا سے پہلے والی نسل میں اُن کی اپنی نسل کی بہ نسبت فرق ہونا چاہئے تھا۔ گزشتہ نسل کی سب سے اہم خصوصیت اس کی روایت پرستی تھی۔ اس روایت پرستی کی وجہ سے اُسے چند ایسی قدریں مل جاتی تھیں جن کی بدولت وہ ایک پُر امن زندگی گزار سکتی تھی۔ یہ نسل سیاسی اور معاشرتی مسایل سے کوسوں دور رہتی تھی۔ سماج میں جو مختلف فرقے تھے ان کی الگ الگ حیثیت کو تسلیم کرتی تھی۔ اگرچہ کہیں کہیں بعض صوفی، درویش یا شاعران فرقوں کو توڑ کر آفاقی وسعت اور انسانی برادری کا تصور بھی پیش کرتے تھے لیکن عام طور پر صوفیوں اور خانقاہوں کے اثر سے لوگ اپنی حالت پر قانع رہتے تھے، تاہم مولانا کے اپنے زمانہ میں اس اندھی عقیدت کا پول کھلنے لگا تھا۔ اپنی اور بزرگوں کی غلطیوں پر نگاہ پڑنے لگی تھی۔ خود تنقیدی کا احساس بیدار ہوگیا تھا۔ جاگیرداری کے قلعے پر پہلی ضرب لگ چکی تھی جو اگرچہ کاری نہ تھی مگر قلعہ کی دیواروں میں رخنے پڑنے لگے تھے۔ اسلام کی طاقت ہر جگہ روبہ زوال تھی اور فرنگی اسے اپنا غلام بنا رہا تھا۔ اس طرح مولانا کا دور درحقیقت پرانے اور نئے کے درمیان معلّق ہے۔ اس کا ایک قدم یہاں ہے دوسرا وہاں یہ دور ایک پل کی طرح ہے۔ ایک ناگزیر کڑی کی مثال ہے۔ اور مولانا کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس نئے دور کو سمجھنے کے لئے انھیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ اس کے لئے جن نئی روایات کی ضرورت تھی اور جن نئی قدروں کا نفاذ عمل میں آیا تھا ان میں سے بعض قدریں ان کو اپنے ہی گھر میں مل گئیں۔ ان کے والد کی وکالت بہت کامیاب تھی۔ حکومت کے نزدیک ان کی بڑی عزت تھی ان کے چھوٹے بھائیوں میں سے ایک اعلیٰ تعلیم کی غرض سے ولایت تک جا چکے تھے اور دوسرے نے وکالت شروع کر رکھی تھی چھوٹے بھائی کو پہونچانے کے لئے مولانا علی گڑھ گئے تو وہاں سر سید سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات نے گویا سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ حتیٰ کہ جب وہ مستقل قیام کی غرض سے دوبارہ وہاں پہونچے تو قدیم و جدید کے متعلق اُن کا ایک خاص تصور بن چکا تھا۔ اس تصور میں یورپ کے اعتراف کے ساتھ ساتھ مشرق کی روایات کا احترام اور پھر ان پر اصرار بھی شامل تھا۔ مولانا کا بنیادی خیال یہ ہے کہ مغرب جن نعمتوں سے آج مالا مال ہے وہ ہمیں آج سے بہت پہلے اسلامی سلطنت کے تصور میں

ملتی ہیں اس تصور کی لذت نے انھیں مغرب سے مرعوب نہ ہونے دیا اور جب کبھی انھوں نے اس تصور کو گلے سے لگایا تو ان کو ایک نیا کیف حاصل ہوا۔ "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" اور "الجزیہ" سے لیکر "الفاروق" اور "سیرت النبی" تک میں یہی کیف پایا جاتا ہے۔ ان کو پڑھ کر ایک نئی مغربی جمہوریت کا نقشہ آنکھوں کے آگے پھرنے لگتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سرسید جیسا حقیقت پسند بھی جب ان تحریروں کو پڑھتا ہے تو ان کی تعریف کرتا ہے اور آج تک انھیں پسند کرنے والوں کی تعداد میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ مولانا کی شخصیت میں جو دلکشی ہے اس کی وجہ اُن کی انانیت نہیں اور نہ یہ بات ہے کہ بقول اکرام کے وہ ہر جگہ حزب الاختلاف کے لیڈر بنا چاہتے ہیں۔ اس کا راز اُن کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت، ان کے بلند ادبی مذاق، ان کی باعمل سرگرم ذہنی زندگی میں تلاش کرنا چاہئے۔ محض انانیت آپ کو تھوڑی دیر کے لئے اوپر اُٹھا سکتی ہے، مقبولیت عطا نہیں کرسکتی۔ مولانا کے یہاں انانیت نہیں انفرادیت ملتی ہے۔ ایسی ہی انفرادیت جیسی غالب کے یہاں بھی دکھائی پڑتی ہے۔ ان کی ہر دلعزیزی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان کے معتقدوں میں مہدی افادی، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی جیسے لوگ شامل ہیں، ان میں سے ہر ایک کی دوربینی، انصاف پسندی اور مجاہدانہ عزم و وقار کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ مولانا کے یہاں وہی ولولہ، وہی روح عمل، وہی صداقت شعاری اور وہی مجاہدانہ اسپرٹ پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے اپنے زمانہ میں انھیں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے مسلم لیگ پر تنقید کرکے، اُسے آزادی خودداری کا سبق پڑھاکر، قومی زندگی میں تاریخی شعور کے صحیح مقام کا احساس دلاکر، خلوص ایثار اور بے نفسی کا مظاہرہ کرکے اپنے عہد کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی زندگی کا ساتھ دیا۔ اُنھوں نے شعر العجم میں شعر کی تحلیل کی اور انیس کی شاعری سے دبیر کے کلام کا موازنہ کرکے صالح ادبی روایات کو مستحکم کیا۔ وہ اُردو زبان سے بڑی زندہ محبت رکھتے ہیں اور انجمن ترقی اُردو کے پہلے سکریٹری ہیں۔ اُنھوں نے اپنے دورِ نظامت میں اُردو کو بعض اچھی مفید اور معیاری کتابیں دیں۔ اپنی عمر کے آخری دور میں بھی انھوں نے ہماری زبان کو انتہائی سنجیدہ مصنفین کا ایک مخلص حلقہ دیا اور بیسویں صدی میں بھی استادی اور شاگردی کا ایک ایسا سلسلہ قایم کیا جو ہر لحاظ سے قابلِ تقلید ہے۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالباری ندوی اور بہت سے ندوی حضرات مولانا کے شاگرد ہی نہیں بلکہ اُن کے پرستار بھی ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی اپنی قابلیت مسلّم ہے اس لحاظ سے مولانا کو معدودے چند خوش قسمت مصنفوں میں سے سمجھنا چاہئے۔ اسی دور کے دوسرے خوش قسمت شاعر داغ ہیں مگر مولانا کا ادبی حلقہ داغ کے حلقے سے یقیناً بڑا بھی ہے، بلند اور برگزیدہ بھی۔ ان کے حلقے میں چند ایسے عناصر ملتے ہیں جن کی وجہ سے مولانا کی شہرت لازوال ہے۔ موجودہ دور میں مولانا کی تصنیفات کی طرف سے جو بے اطمینانی ملتی ہے اس کی وجہ ان تصنیفات کی خامی نہیں بلکہ معیاروں کی تبدیلی ہے۔ اپنے زمانہ میں تو ان کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لیجاتی تھیں۔ آج کل وہ بات نہیں رہی اور اس کا سبب یہ ہے کہ آج کل شاعر اور ادیب سے جو مطالبے کئے جارہے ہیں مولانا کے زمانہ میں ان کا وجود نہ تھا۔ لیکن صرف اسی بنا پر ان کی تمام کتابوں کو رد کردینا یقیناً ظلم ہے اگرچہ ایسا وہی لوگ کرسکتے ہیں جو ادب کی ارتقائی منزلوں سے ناواقف ہیں مگر حیرت ہے کہ عبدالحق جیسا نقاد بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اگر اکبر کی شاعری سے ہم آج بھی لطف حاصل کرسکتے ہیں، اگر اقبال کا پیام آج بھی ہمارے لئے خضر راہ ہے اگر مولانا حالی کی تحریریں آج بھی ہماری رہنمائی کرسکتی ہیں اور اگر ان سب کی مخصوص علامتیں اور وقتی تجربے آج بھی ہمارے لئے کوئی معنی رکھتے ہیں تو پھر مولانا شبلی نے ایسا کونسا قصور کیا ہے۔

مولانا کی شخصیت میں تنوع، تضاد اور رنگارنگی سب کچھ ہے لیکن اس کے ساتھ ایک وحدت بھی ہے۔ ایک مرکز بھی ہے

ایک رشتہ بھی ہے۔ وہ اپنے دور کے سب سے اچھے نمایندے ہوں یا نہ ہوں اپنی شخصیت کے بہترین ترجمان ہیں اور اس شخصیت میں چند ایسے اجزا ملتے ہیں جن کے باعث وہ دلکش ہوجاتی ہے، شخصیت میں یوں تو دلکشی کے بہت سے سامان ہوسکتے ہیں مگر سب سے زیادہ دلکش ایک انسان کی انسانیت ہوتی ہے۔ انسانیت صرف شرافت یا مروت یا خاکساری کا دوسرا نام نہیں۔ یہ باتیں تو فرشتوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ انسانیت محض نیکیوں کی پوٹ نہیں، ان سے آپ بزرگی حاصل کرسکتے ہیں، زندگی اور اسکی حلاوت آپ کو نصیب نہیں ہوسکتی۔ مولانا کو زندگی کی یہی حلاوت نصیب تھی۔ ان کی وہی باتیں جنھیں ہم بظاہر غیر اہم سمجھتے ہیں درحقیقت ان کی انسانیت کی گواہی دیتی ہیں۔ ورنہ آخر انھیں ڈاکٹر انصاری کے بوٹوں پر سر رکھنے کی اس وقت کیا ضرورت تھی جب وہ ٹرکی ایک طبی وفد لیکر جارہے تھے۔ مولویوں کی بدگمانی کے باوجود ابوالکلام آزاد سے ان کے تعلقات دفعتاً اتنے گہرے کیوں ہوگئے۔ بمبئی کی تعریف میں ان کی رطب اللسانی یک بیک کیوں اتنی بڑھ گئی۔

شاعری ازمن مجو دور از سواد بمبئی ۔۔۔ حالیا شبلی شدم رندِ غزل خواں نیستم
شبلیا آں جلوۂ نیرنگہائے بمبئی ۔۔۔ بود تا وقتے کہ من خوابِ گرانے داشتم
دامنِ عیش زدستم نہ رود تا شبلی ۔۔۔ دامنِ بمبئی از کف ندہم تا باشم
نثارِ بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ ونو را ۔۔۔ طرازِ مسندِ جمشید و فرِ تاجِ خسرو را

پھر کیا تعجب ہے کہ ان خیالوں میں اکثر اوقات اتنا تضاد نظر آتا ہے کہ مثلاً ایک طرف وہ مسجد کانپور پر باغیانہ نظمیں لکھتے ہیں اور دوسری طرف عبدالماجد (دریا آبادی) سے جو معذرت نامہ حکومت کے یہاں لکھواتے ہیں اُس میں اپنی وفاداری کا ہر طرح سے یقین دلاتے ہیں۔ ایک جگہ ترکوں اور عربوں سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور دوسری جگہ سرسید کے کہنے پر خلافت کے خلاف مضمون لکھ مارتے ہیں، گو بعد میں "آورد" کہکر اس سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔ اپنی کتابوں میں جمہوریت اور حریت کا درس دیتے ہیں لیکن مسلمان بادشاہوں اور امیروں کی شان میں قصیدے بھی لکھتے ہیں، مثلاً سلطان عبدالحمید کی تعریف میں، ان میں جمہوریت اور انصاف کا خون انھوں نے جایز رکھا ہے، غرض وہ ہر نئی تحریک کے ساتھ ہیں مگر تحریک کی خاطر نہیں بلکہ جن سے محبت رکھتے ہیں اُن کی خاطر۔ اکثر ان کی محبت بے لوث ہوتی ہے۔ وہ اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ اپنی عزت اور شہرت کو بھی قربان کرسکتے ہیں۔ یوں تو انھیں اپنے دوستوں اور شاگردوں میں سب سے اُلفت ہے مگر ابوالکلام اور خصوصاً عطیہ بیگم سے ان کی انسیت، شوق کے درجے میں آجاتی ہے۔ گو یہ درست ہے کہ عطیہ بیگم کو ان کے ساتھ عمر، ذہن یا مرتبے کے اعتبار سے کوئی مناسبت نہیں لیکن محبت کو کسی آلے یا پیمانے سے ناپنا کب درست ہوسکتا ہے۔ مولانا کے ان خطوں کو جو عطیہ بیگم کے نام ہیں لبرل تنقید[1] ہمدردی کا مستحق سمجھتی ہے۔ انفرادیت پسند تنقید[2] تنگی اور بھوکی خواہشات کا اظہار گردانتی ہے۔ قدامت پسند تنقید[3] گناہگاری کا تمغہ عطا کرتی ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں گناہ اور جنس کا شائبہ تک نہیں۔ صرف دوستی، سادگی، عقیدت اور احترام کے جذبات ملتے ہیں۔ ان میں ایک ذہین مرد، ایک ذہین عورت کو مخاطب کرتا ہے۔ اس سے ملکی قومی اور ادبی معاملات پر گفتگو کرتا ہے۔ اُسے اپنے ذہن کا ایک گوشہ دکھاتا ہے جو اس نے کسی اور کو نہیں دکھایا تھا۔ یہ عورت چونکہ اس کے اپنے ماحول سے بلند اور ذرا علٰحدہ ہے لہذا وہ اس کی دوستی پر قدرے فخر محسوس کرتا ہے۔ اسکی لکھی ہوئی باتوں کو دوسروں کو سناتا ہے۔ اس کے سامنے جب آتا ہے تو اپنی صدیوں کی روایات کو فراموش کر بیٹھتا ہے اور ایک

---

[1] شیخ محمد اکرام ـ شبلی نامہ ــ [2] وحید قریشی ـ شبلی کی حیات معاشقہ ــ [3] مولوی محمد امین زبیری ـ تبصرۂ حیات شبلی؛ مولانا شبلی کی زندگی کا رنگین پہلو۔

نئی اور عجیب سی فضا میں کھو سا جاتا ہے۔ شریعت کے احکام اُسے یاد نہیں رہتے، صرف اپنے ضمیر کی آواز اُس کو سنائی دیتی ہے۔ یہاں وہ مرد کی حیثیت سے نہیں انسان کی حیثیت سے آتا ہے، چنانچہ ان خطوں میں سب سے اہم مولانا کی انسانیت اور معصومیت ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان میں انسانی محبت کو جسم کے بجائے ذہن کی روشنی میں دیکھنے کی جو کوشش ہے وہ کم از کم اُردو ادب میں بڑی خوشگوار ہے۔ الغرض یہ خطا ہے نہ ثواب، جنس ہے نہ افلاطونیت بلکہ سیدھا سادا اعتراف اور دوستی کا وہ درجہ ہو جہاں ایک ذہن دوسرے کے اثرات قبول کرتا ہے۔ ایک شخص دوسرے کو اپنے دل کے کچھ بھید بتاتا ہے۔ اس سے زیادہ جو لوگ ان خطوں کی اہمیت کے قایل ہیں وہ خود جنس پرستی کے شکار ہیں۔ ہمیں انہی کے ساتھ ہمدردی ہے، مولانا کے ساتھ نہیں۔

اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ مولانا کے تعلقات اپنے معاصرین کے ساتھ کیسے تھے۔ اس سلسلہ میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں سطحیت اور ذہنی غلاظت عام طور پر ملتی ہے۔ مولانا کے تعلقات سرسید کے ساتھ جس قسم کے تھے اس پر اوپر لکھا جا چکا ہے، ان کے دوسرے ہم عصر بزرگ مولانا حالی ہیں۔ یہ عمر میں بھی ان سے بڑے ہیں اور ساتھ ہی تصنیف و تالیف میں بھی ان کا سن و سال زیادہ ہے۔ مہدی کے الفاظ میں وہ بڑھے حالی ہیں، ان کی نظر بعض اوقات سرسید سے بھی زیادہ تیز اور زیادہ گہری پڑتی ہے۔ انھیں زندگی کا پختہ شعور اور ادب میں ایک غیر معمولی بصیرت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی سوانح عمریوں سے شبلی کو سوانح نگاری کا، اپنے "مقدمہ" سے تنقید نگاری کا اور اپنی شاعری سے جدید شاعری کا راستہ دکھایا۔ شبلی اور حالی کے تعلقات پر مولانا سید سلیمان ندوی نے "حیات شبلی" میں اور پروفیسر آلِ احمد سرور نے اپنے ایک مضمون میں کافی روشنی ڈالی ہے اور اُس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے جو مہدی افادی کے معاصرانہ چشمک والے مضمون سے پیدا ہوگئی تھی۔ آلِ احمد سرور کے بقول یہ چشمک حالی اور شبلی میں نہیں اُن کے جانشینوں میں پائی جاتی ہے۔ در اصل یہ ان کے جانشینوں میں بھی نہیں صرف بعض حضرات کے دماغوں میں ملتی ہے، ان سے باہر اس چشمک کا کوئی وجود نہیں۔ شبلی اپنے کو دریا اور حالی کو کنواں کہتے تھے اور ان کی کتابوں میں حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب کو بے حد پسند کرتے تھے۔ جب شبلی کو حادثۂ پا پیش آیا تو حالی نے ان کے لئے نہایت محبت بھرا خط لکھا (یہ خط دار المصنفین کے کتب خانہ میں محفوظ ہے) اسی طرح شبلی نے اپنی تحریروں، تقریروں میں حالی کے جابجا دیکر اُن کی تعریف کی۔ البتہ حیاتِ جاوید کے بارے میں ان کی رائے کچھ اچھی نہ تھی لیکن اس کی وجہ خود حالی سے اختلاف نہیں بلکہ اُنکے یک طرفہ بامروّت شریفانہ طرزِ سوانح نگاری سے اختلاف ہے۔ مولانا کا خیال یہ ہے کہ سوانح نگاری میں شرافت یا مروّت سے کام نہیں چلتا اور غور سے دیکھا جائے تو یہ خیال غلط نہیں۔

شبلی نے مولوی محمد حسین آزاد کی کتاب سخندانِ پارس کے بارے میں ایک خط لکھتے ہوئے ان کے طرز ادا اور ان کے سحر نگار قلم کے اعجاز کو تسلیم کیا ہے۔ پھر آزاد کی موت پر ان کا یہ جملہ "حیات شبلی" میں ملتا ہے۔ "آج خدائے سخن مرگیا" اس مختصر جملے سے ان کی دلی کیفیات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ مولانا کے دیگر معاصرین میں محسن الملک، وقار الملک، سید علی بلگرامی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مہدی حسن افادی الاقتصادی، اکبر الہ آبادی، مولانا محمد علی، شرر، داغ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ غرض مولانا کا دائرۂ احباب خاصا وسیع ہے اور وہ اپنی معلومات کو بڑی وسعت کے ساتھ اپنے دوستوں اور شاگردوں میں تقسیم کرتے ہیں جیسا کہ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ ایسے خطوط کا سلسلہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے لیکر عبدالماجد دریا بادی اور مولانا حمید الدین فراہی وغیرہ تک پھیلا ہوا ہے۔ گویا ایک دریا ہے کہ جہاں سے گذرتا ہے زمین کو سیراب کرتا جاتا ہے۔ اقبال کے متعلق مولانا کی یہ پیشین گوئی اہم ہے کہ وہ ایک دن اُردو شاعری کی خالی ہونے والی کرسیوں میں سے ایک کا حقدار ہوگا حسرت کو انھوں نے انسان کے بجائے جن کا خطاب دیا تھا۔ پریم چند کے بارے میں اُن کی رائے یہ تھی کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں میں کوئی شخص پریم چند سے بہتر زبان نہیں لکھتا۔ حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی علمیت پر مولانا کو اس قدر ناز تھا کہ

وہ ان سے اپنی تصنیفات کے سلسلہ میں بے تکلف مشورے کیا کرتے تھے۔ ان تمام باتوں کی تفصیل اس وجہ سے ضروری تھی کہ مولانا
کو ایک خاص حلقے میں اکل کھرے پن اور تنک مزاجی کا جو الزام دیا گیا ہے وہ ہرگز درست نہیں۔ شبلی کی دوستی ایک زمانہ میں
جب وہ حیدر آباد میں تھے اس وقت شرر اور داغ سے بھی تھی۔ ان تینوں بزرگوں اور مولوی عزیز مرزا وغیرہ کی بے تکلف صحبتوں
اور مشاعروں کا حال خود مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف "چندہم عصر" میں لکھا ہے۔ جب شرر کو حیدر آباد سے نکلنا پڑا تو مولانا
نے مولوی محمد امین زبیری کے نام جو اس وقت بھوپال میں صیغۂ تاریخ کے مہتمم تھے ایک خط لکھتے ہوئے شرر کی اس طرح سفارش
کی۔ "آپ کو معلوم ہے کہ مولوی عزیز مرزا صاحب بی۔ اے حیدر آباد سے نکلے تو ان کے مقربین بھی زد میں آئے۔ ان میں مولوی
عبدالحلیم شرر بھی ہیں۔ یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ مولوی صاحب موصوف عربی اُردو کے کیسے ماہر اور ساتھ ہی انگریزی داں بھی ہیں
ان کی قابلیت کے آدمی کم ہاتھ آسکتے ہیں۔ اگر وہ محکمۂ تعلیمات میں لے لئے جائیں تو بہت مفید ہوگا۔" مختصر یہ ہے کہ مولانا کی
شخصیت کسی طرح بند ہے نہ محدود بلکہ بڑی کھلی ہوئی، بڑی رنگین، جاذب نظر، جلد بکھر جانے والی، پگھل جانے والی شخصیت
ہے۔ غالب کی طرح اُن کے ارمان بہت نکلے لیکن پھر بھی کم نکلے۔ اُنھوں نے سرسید کی طرح علماء کو ناراض نہیں کرنا چاہا مگر اس
حکمت عملی کا نتیجہ خاطر خواہ نہ ہوا اور علماء آخرکار اُن سے ناراض ہوگئے۔ وہ علماء کے اس فتنہ و فساد سے واقف تھے لیکن
خواہ مخواہ ان سے ڈرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ یہی ان کی جرأت، نیک نیتی اور مستقل مزاجی کا ثبوت ہے جس کے سبب ان کا
نام زندہ رہے گا۔ اُن کی خودداری، اُن کی سادگی، ان کا علمی ذوق، ان کی جدت طرازیاں اور ان کے کارنامے ہماری اد
اور قومی محفلوں کو گرماتے رہیں گے، ان کا چست، دلفریب اور بیباک طرز نگارش، ان کی گہری تنقیدی نظر، اور اُن کی گرم گرم
جوش بیان سے لبریز فارسی غزلیں اور اُردو سیاسی نظمیں ہمارے ادب کے ایوان میں ہمیشہ جگمگاتی رہیں گی۔

مفتون احمد

آپ کی زبان کی نوک بھی قوت تخلیق کا ایک بڑا راز ہے جسے اب تک سائنس داں پوری طرح معلوم نہیں کرسکے۔ ماہرین
نفسیات اب تک نہیں سمجھ سکے کہ چیزوں کے مختلف مزے کیوں محسوس ہوتے ہیں۔ شکر کیوں میٹھی معلوم ہوتی ہے
اور ایلوا کیوں کڑوا محسوس ہوتا ہے۔ ابھی نہیں لیکن جب قوت ذائقہ کی کمسٹری پوری طرح دریافت ہوجائیگی
تو اس کی حقیقت کا پتہ چل سکے گا۔

زبان کی نوک جو ایک انچ کے تیسرے حصہ کے برابر ہے اپنے اندر ذائقہ کے دس ہزار بلب یا قمقمے پنہاں رکھتی
ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر بلب ایک خاص احساس کو دماغ تک پہونچاتا ہے۔ اس سے قبل
خیال کیا جاتا تھا کہ ہر شخص کی قوتِ ذائقہ ایک سی ہوتی ہے، لیکن اب معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کی قوتِ ذائقہ
بھی بینائی کی طرح کم زیادہ ہوتی ہے۔ ایک نئی کیمیائی چیز جسے Thiourea کہتے ہیں، دس آدمیوں
میں سے صرف چھ کو تلخ معلوم ہوتی ہے اور باقی چار کو پھیکی۔ ڈاکٹر جان کیسلے اور دوسرے ماہرین سائنس نے
۲۷ چمپنیزی بندروں پر اس کا تجربہ کیا تو بھی نتیجہ یہی برآمد ہوا۔

بچے بجائے زبان کے اپنے گالوں سے مزہ محسوس کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ذائقہ کے بلب
گال میں پائے جاتے ہیں، جو عمر کے ساتھ ساتھ فنا ہوجاتے ہیں یا زبان کی نوک میں منتقل ہوجاتے ہیں۔

داغ اور بہار

(۱)

ادیب اور اس کے محرکات کی دنیا بہت وسیع ہوتی ہے وہ کسی قوم، ملک اور صوبہ کی جاگیر نہیں - داغ دہلی میں پیدا، لال قلعہ میں پرورش پائی، دہلی، رامپور اور حیدر آباد کے درباروں کی سرپرستی میں پروان چڑھے، لیکن داغ کی شاعری دہلی، رامپور اور حیدر آباد کے مثلث میں محدود نہیں - شاعری کے اندر ماحول کا پرتو ناگزیر ہے - آسمان شاعری کے اندر مقامی رنگ حیثیت قوس قزح کی ہے - لیکن ان سب کے پیچھے شعور و لاشعور کی تہوں میں جو چیز اندر اندر کام کرتی ہے وہ شاعر کے اپنے محرکات شعری ہیں - داغ نے شاعری اس وقت شروع کی جب وہ نوجوان تھے - ان کی شاعری کے اندر ان کی نوجوانی تادم آخر باقی رہی ان کی شخصیت اور ان کی انفرادیت اسی نوجوانی میں چھپی ہے - جوانی اور اس کی اکڑ کو اگر داغ کی شاعری سے نکال دیا جائے تو ان کی شاعری ایک بجھا ہوا چراغ معلوم ہوگی -

داغ کی پرورش لال قلعہ میں ہوئی، لال قلعہ کی رنگینی داغ کی رگوں میں پیوست تھی - وہ ۲۶ سال کی عمر تک لال قلعہ میں رہے - ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ کو انگریزوں نے گرفتار کرکے رنگون بھیج دیا تو لال قلعہ کی رنگینی صحبتیں درہم برہم ہوگئیں - دہلی کی اس تباہی پر داغ نے ۲۳ بندوں کا ایک شہر آشوب لکھا ہے صرف ایک بند ملاحظہ ہو:-

یہ وہ جگہ ہے کہ عبرت پہ عبرت آتی ہے ۔۔۔ یہ وہ جگہ ہے کہ حسرت پہ حسرت آتی ہے
یہ وہ جگہ ہے کہ آفت پہ آفت آتی ہے ۔۔۔ یہ وہ جگہ ہے کہ شامت پہ شامت آتی ہے
یہ وہ جگہ ہے جہاں بیکسی بھی ڈر ڈر جائے
یہ وہ جگہ ہے اجل خوف کھائے مر مر جائے

ایک مغل شہزادہ مرزا قادر بخش صابر تلمیذ مولوی امام بخش صہبائی نے شعرائے اُردو کا ایک تذکرہ "گلستانِ سخن" اُردو زبان میں لکھا ہے - یہ تذکرہ ۱۲۷۱ھ میں شایع ہوا اس کا ذکر گارساں دتاسی نے اپنے خطبوں میں کیا ہے اس تذکرہ میں داغ کے ۱۹ اشعار بطور نمونہ درج ہیں - ان اشعار میں داغ کی جوانی اور اس کی اکڑ صاف نمایاں ہے :-

نہیں تاب ستم تو حضرتِ دل ۔۔۔ عاشقی کو سلام کرنا تھا
ہم جانتے ہیں خوب تری طرزِ نگہ کو ۔۔۔ ہے قہر کی آنکھ اور محبت کی نظر اور
کہنے دیتی نہیں کچھ منہ سے محبت تیری ۔۔۔ لب پہ رہ جاتی ہے آ آ کے شکایت تیری

غدر کے بعد جب لال قلعہ کی رنگینیاں ختم ہوگئیں اور بادشاہ سلامت رنگون بھیج دئے گئے تو مرزا داغ بہت پریشان ہوئے - اسی پریشانی میں دلی کی بربادی پر ایک شہر آشوب لکھا اور اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالی - دلی اور لال قلعہ کی تباہی داغ کی تباہی تھی لیکن اس بربادی میں داغ کی اکڑ نہ گئی - ملاحظہ ہو:-

اے داغ اہلِ شہر کا لٹنا تو درکنار ۔۔۔ تنخواہ بھی خزانۂ شاہی میں رہ گئی

غزل کے اندر داغ کی شوخی اور اکڑ ملاحظہ ہو:-

پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں | اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں
دباؤ کیا ہے سنے وہ جو آپ کی باتیں | رئیس زادہ ہے داغ آپ کا غلام نہیں
اے داغ اپنی وضع ہمیشہ یہی رہی | کوئی کھچا کھچے کوئی ہم سے ملا ملے
تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے | عاشق بھی تو معشوق کا نوکر نہیں ہوتا

دلی کی تباہی اور بربادی کے بعد مرزا داغ نواب یوسف علی خاں ناظم رامپور کے دربار میں حاضر ہوئے۔ نواب کو شعر و شاعری کا شوق تھا۔ شعرائے لکھنؤ اسیر، امیر، تسلیم اور جلال وغیرہ ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ نواب نے مرزا داغ کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور نواب کلب علی خاں ولی عہد رامپور کا مصاحب مقرر کیا۔ کچھ عرصہ بعد نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور ہوئے، اس دور میں مرزا داغ کی خوب قدر دانی ہوئی۔ یہ دور رام پور کا رنگین دور تھا اس دور کی زندگی مجسم شباب تھی۔ رام پور کی رنگینیوں میں مرزا داغ کی جوانی خوب پروان چڑھی۔ رام پور میں بے نظیر باغ کا میلہ لگا کرتا تھا اس میلہ میں کلکتہ کی ایک طوایف ماہ منیر سے آنکھ لڑ گئی داغ اس پر جی جان سے فدا ہوگئے، ماہ منیر عرف منی جان شاعرہ تھی اس کا تخلص حجاب تھا۔ میلہ کے بعد ماہ منیر کلکتہ واپس ہوگئی پھر اس نے وہاں سے داغ کو ایک خط لکھا اور کلکتہ آنے کی دعوت دی۔ داغ نے اپنی مثنوی "فریادِ داغ" میں اس خط کا یوں ذکر کیا ہے:۔

ہم یہاں تم وہاں تو لطف نہیں | ہے یہ دوری جہاں تو لطف نہیں
اٹھ کے سیدھے ادھر چلے آؤ | کوئی روکے مگر سے چلے آؤ
میہماں تم ہو میزباں ہم ہوں | عیش و عشرت کے لطف باہم ہوں

محبوب کی دعوت قبول کیوں نہ ہو۔ جواب لکھ دیا کہ میں فوراً آرہا ہوں۔ جواب ملاحظہ ہو ؂

تم بلاؤ نہ آؤں کیا ممکن | ہے سراسر یہ بات نا ممکن

اب داغ کلکتہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ پہلے دہلی آئے، پھر لکھنؤ پہونچے، کانپور الہ آباد ہوتے ہوئے عظیم آباد آئے۔ میر محمد باقر باقر عظیم آبادی تلمیذ حضرت وحید الہ آبادی کے گھر قیام کیا۔ عظیم آباد میں اپنے قیام کا مفصل تذکرہ خود داغ نے اپنی مثنوی میں نظم کیا ہے۔ مثنوی کے مطابق داغ نے عظیم آباد میں آٹھ دن قیام کیا ؂

آٹھ دن دیکھی سیر پٹنے کی | یہ ہوئی وجہ جی اچٹنے کی

اس شعر سے قیام کی مدت تو معلوم ہوئی لیکن مثنوی کے کسی شعر سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ داغ کا یہ سفر کس سن میں ہوا۔ داغ کے سوانح نگاروں نے بھی اس مسئلہ پر روشنی نہیں ڈالی، احسن مارہروی نے "انشائے داغ" میں داغ کا ایک خط بنام کلب علی خاں خلد آشیاں شایع کیا ہے:۔

غریب پرور فیض گستر سلامت

جناب عالی! فدوی بہ ضرورت چند درچند از ہفتہ وارد عظیم آباد پٹنہ گشت و از آں جا قصد کلکتہ نیز وارد۔ لہذا امید دارم کہ از راہ غریب نوازی رخصت دو ماہ دیگر مرحمت شود۔ واجب بود عرض نمود

الٰہی آفتاب دولت و اقبال تاباں باد

عرضی فدوی نواب مرزا خاں داغ۔ مورخہ یکم جون ۱۸۸۲ء از عظیم آباد پٹنہ، محلہ گرھٹا مکان سید باقر۔

حضرت داغ میر محمد باقر باقر عظیم آبادی کے مہمان تھے۔ داغ کے علاتی بھائی مرزا شاہ محمد شاغل خلف مولوی تراب علی متوطن دہلی میر باقر کے دوست اور ان کے پڑوسی تھے۔ میرزا شاغل داغ کے شاگرد بھی تھے۔ وہ عرصہ تک عظیم آباد میں رہے۔ شطرنج بازی میں یگانہ روزگار تھے۔ داغ جس وقت ریل سے اُترے عظیم آباد کی خلقت استقبال کے لئے حاضر تھی۔ اسی بھیڑ میں مرزا شاغل بھی تھے۔

پیشوائی کے واسطے احباب	آئے تھے شوقِ دید میں بیتاب
بہت اشخاص یک بیک آئے	اپنی اپنی سواریاں لائے
کوئی مجھ کو لئے ہی جاتا تھا	کوئی ناحق کا حق جتاتا تھا
کوئی کہتا کہ میرے گھر چلئے	آیئے اس طرف اِدھر چلئے
ہوئی لوگوں کی چپقلش کیا کیا	رہی آپس میں کشمکش کیا کیا
مجھ کو یہ فکر تھی کہ بھیڑ چھٹے	میرزا شاغل آئے جب وہ ہٹے
یہ وہ ہیں تام خلق ہو جن سے	آدمیت مراد ہے ان سے

میر باقر چونکہ مرزا شاغل کے گہرے دوست اور پڑوسی تھے، اس لئے داغ نے میر باقر کے گھر قیام کیا۔ میر باقر کے متعلق احسن مارہروی کا نوٹ ملاحظہ ہو:۔

" سید محمد باقر متخلص بہ باقر شاگرد وحید الہ آبادی پٹنے کے شرفا میں تھے۔ موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے، ستار کا بہت شوق تھا۔ اچھے خوشنویس تھے اور اس فن سے آگاہ تھے اسی ہم مذاقی نے مرزا داغ کو ان کا مہمان بنایا۔"

میر باقر نے ۱۱ر فروری ۱۹۲۰ء کو انتقال کیا۔ آپ کا پختہ مزار محلہ گورہٹہ میں اپنے مکان کے قریب واقع ہے آپ کا مختصر سا دیوان "سرمایۂ عشق" ۱۳۲۶ھ میں شایع ہوا، آپ کی ایک اردو مثنوی "کیمیائے دل" ۱۹۱۱ء میں شایع ہوئی۔ آپ کے بھانجہ اور آپ کے شاگرد میر سید حسن صاحب سید بقید حیات ہیں۔ سید حسن رضا صاحب ثاقب، عظیم آبادی بھی آپ کے شاگرد رشید ہیں۔ حضرت شاہ حامد حسین صاحب حامد سجادہ نشین تکیہ حضرت شاہ ارزاں تلمیذ حضرت داغ کے آستانہ پر شاندار مشاعرے ہوا کرتے تھے احسن مارہروی، سائل دہلوی، نوح ناروی، فصاحت لکھنوی، جلیل مانکپوری، ریاض خیر آبادی، کوثر خیر آبادی وغیرہ شریک مشاعرہ رہتے۔ سائل دہلوی جب پہلی بار پٹنہ آئے تو میر باقر صاحب سے ملنے گئے، وہ برابر میر باقر صاحب کو چچا کہا کرتے تھے۔ سائل دہلوی جب دہلی واپس ہوئے تو اپنی بیگم کو میر باقر اور داغ کے تعلقات کی داستان سنائی۔ بیگم سائل نے میر باقر کو خط لکھا اور دہلی آنے کی دعوت دی لیکن میر باقر پیرانہ سالی کی وجہ سے دہلی نہ جاسکے۔

"انشائے داغ" میں داغ کا ایک دوسرا خط مورخہ ۔ رمئی ۱۸۸۲ء بنام نواب سید بہادر حسین خاں انجم نیشاپوری لکھنوی بھی شامل ہے۔

جناب خاں صاحب عنایت وکرم فرما، مجمع محاسنِ فراواں، مصدرِ منّت و احسان بہادر حسین خاں صاحب دام عنایتہ، بعد سلام مسنون واضح ہو کہ میں بخیر و عافیت وارد پٹنہ عظیم آباد ہوا۔ محلہ گرہٹا مکان سید باقر صاحب میں مقیم ہوں۔ چار روز ہوئے کہ وہ کلکتہ روانہ ہوگئے۔ سید قطب الدین کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا نہایت خراب، گرمی کی نہایت شدت اہلِ عظیم آباد نے میری اس قدر خاطر و عزت کی ہے کہ جس کی حد نہیں۔ کلکتہ نہیں جانے دیتے میری طبیعت علیل ہوئی جاتی ہے۔ اب بھی علیل ہے، سرکار میں خط بھیجا ہے۔ ان کے جواب کا منتظر ہوں۔ منشی نیچ بہادر نے جو اپنے اخبار میں دیوان کے آنے کی کیفیت لکھی ہے اس کی نقل جلد بھجوا دو۔ چھپنے کی جلد کیفیت لکھو۔ اپنی خیریت سے آپ جلد آگاہ کریں۔ سب دوستوں کو سلام پہونچے۔

راقم نواب مرزا داغ دہلوی - ۔ رمئی ۱۸۸۲ء

پہلا خط جو نواب کلب علی خاں کے نام ہے ۱ر جون ۱۸۸۲ء کو لکھا گیا۔ دوسرا خط جو ۔ رمئی ۱۸۸۲ء کو تحریر پایا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ داغ ۳ر مئی کو عظیم آباد آئے۔ ان خطوط سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ داغ عظیم آباد میں ایک ماہ سے زیادہ مقیم رہے۔

۲ مئی ۱۸۸۲ء کو عظیم آباد آئے، ۸ جون ۱۸۸۲ء کو نواب کلب علی خاں کے نام خط لکھا۔ اور ۲ ماہ کی فرصت طلب کی جو یقینی منظور ہوئی ہوگی۔

داغ جب تک پٹنہ میں مقیم رہے ایک ہلچل مچی رہی۔ ہر روز مشاعرے اور محفلوں کی گرما گرمی رہتی۔ میر باقر کے گھر ہر وقت ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، شام کے وقت داغ خود بھی مرزا شاغل کے ساتھ باز دید کے لئے جایا کرتے تھے۔ داغ کو صوفیائے کرام سے بڑی عقیدت تھی۔ اسی عقیدت کی تحت وہ پیر طریقت شاہ محمد یحیٰ صاحب ابوالعلائی سجادہ نشین خانقاہ شاہ کی املی شہر پٹنہ سے بھی ملے۔ حضرت شاہ صاحب کو شعر و شاعری سے شوق تھا، داغ سے ملکر بہت مسرور ہوئے۔ ملاقات کے دوسرے دن تین قطعے لکھکر بھجوائے حضرت شاہ صاحب کا نوشتہ قلمی نسخہ محترمی مولوی فصیح الدین بلخی صاحب ریڈر شعبہ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی کے پاس اب تک محفوظ ہے۔ ان قطعوں کو اصل نسخہ سے نقل کر رہا ہوں ؎

قطعہ تاریخ قدوم نواب صاحب متخلص بہ داغ از رامپور بہ عظیم آباد۔

جناب داغ در شہر من آمد، رسیدند آرزو منداں زہر سوئے
بلوح دہر تاریخ قدومش رقم کردم قدوم داغ حق گوئے

۱۲۹۹ھ

ایضاً

جناب داغ عالیجاہ آمد در عظیم آباد مثال گل بہار افزائے دل چوں ماہ نور افشاں
ہمیں مصراع تاریخ از درون من بروں آمد رسیدہ مرہم دلہائے رنجوراں انیس جاں

۱۲۹۹ھ

ایضاً

یکتائے زمانہ داغ خوشگو، در ملک سخنوری بود شاہ
در وصف کمال آں ہنرور داماں دراز نظم کوتاہ
امروز بہ ارض ہند مثلش نبود یک فرد بعلم اللہ
در پٹنہ برائے سیر آمد نور افشاں نور پاشں چوں ماہ
شد طبع نیاز مند مسرور از دیدن آں یگانہ دلخواہ
تاریخ قدوم اگر بپرسند گو مقدم داغ صاحب جاہ

۱۲۹۹ھ

اس وقت عظیم آباد کے اندر داغ کے معاصرین کے نام یہ ہیں:۔" خواجہ فخرالدین سخن دہلوی تلمیذ حضرت غالب، صفیر بلگرامی (سن وفات ۱۸۹۰ء) میر نجف علی نذر تلمیذ الفت حسین فریاد، حکیم مولانا عبدالحمید پریشاں (وفات ۱۹۰۵ء) شمس العلماء مولانا حاجی شاہ محمد سعید حسرت عظیم آبادی (وفات ۱۳۰۴ھ) کنور سکھراج بہادر رحمتی، مہدی حسن خاں شاداب تلمیذ حضرت امیر مینائی (۱۳۱۸ء) میر محمد باقر باقر، تلمیذ حضرت وحید الہ آبادی، مرزا شاغل دہلوی، حضرت وحید الہ آبادی، سید شاہ مبارک حسین رئیس عظیم آباد تلمیذ وحید الہ آبادی، مرزا محمد یوسف حسین ناسہر لکھنوی تلمیذ مہدی حسین خان آباد۔ حضرت داغ کے اعزاز میں جو سب سے پہلا مشاعرہ منعقد ہوا اس کے لئے حضرت وحید الہ آبادی کا یہ شعر مصرع طرح مقرر ہوا ؎

ادھر آئینہ رکھا ہے ادھر دہ تن کے بیٹھے ہیں جو اپنا دیکھنا منظور ہے کیا تن کے بیٹھے ہیں

داغ کو جب مصرعِ طرح معلوم ہوا تو فی البدیہ بیٹھے بیٹھے کاتب کو غزل لکھوا دی، مطلع ملاحظہ ہو:۔

بھنویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں　　کسی سے آج بگڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

مقطع ملاحظہ ہو:۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں　　عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

داغ کی یہ غزل بہت مقبول ہوئی۔ حضرت امیر مینائی نے مسابقت کے خیال سے اس طرح میں ایک غزل لکھی اس کا ایک شعر یہ ہے ملاحظہ ہو:۔

نگاہ شوخ و چشمِ شوق میں در پردہ چھنتی ہے　　کہ وہ چلمن میں ہیں ہم سامنے چلمن کے بیٹھے ہیں

امیر مینائی نے اپنی غزل کے مقطع میں داغ کی غزل کی تعریف اس طرح کی ہے:۔

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے　　"بھنویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں"

محلہ مغلپورہ شہر عظیم آباد کے ایک منچلے رئیس نے داغ کا امتحان بھی لیا۔ مصرع طرح کا اعلان کر دیا گیا ؎

آباد کبھی خانۂ زنداں نہیں دیکھا

داغ کو قصداً اطلاع نہ دی گئی اور عین وقت پر معذرت کے ساتھ داغ کو لینے کے لئے حاضر ہو گئے۔ داغ نے برجستہ کاتب کو غزل لکھوا دی اور شریک مشاعرہ ہوئے۔ اس غزل کے اکثر اشعار طنزیہ ہیں یہ غزل آفتاب داغ میں موجود ہے۔ اس غزل کے چند طنزیہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ہم جیسے ہیں ایسا کوئی دانا نہیں پایا　　تم جیسے ہو ایسا کوئی ناداں نہیں دیکھا
نظروں میں سمایا ہوا ساماں نہیں جاتا　　لیلیٰ نے کبھی قیس کو عریاں نہیں دیکھا
جو دیکھتے ہیں دیکھنے والے ترے انداز　　تو نے وہ تماشا ہی مری جاں نہیں دیکھا
جو دن مجھے تقدیر کی گردش نے دکھایا　　تو نے بھی وہ اے گردشِ دوراں نہیں دیکھا
کیا داد ملے اس سے پریشانیِ دل کی　　جس بت نے کبھی خوابِ پریشاں نہیں دیکھا
تم منھ سے کہے جاؤ کہ دیکھا ہے زمانہ　　آنکھیں تو یہ کہتی ہیں کہ ہاں ہاں نہیں دیکھا

(۲)

دنیا کے ہر بڑے ادیب اور شاعر کی بعض خصوصیات اس کی اپنی انفرادیت کا نتیجہ ہوتی ہیں ---------

یہی انفرادیت ایک فنکار کو دوسرے فنکار سے الگ کرتی ہے۔ داغ کی انفرادیت اس کے احساس جوانی اور اس کے لب لہجہ میں مضمر ہے۔ داغ کا یہ انفرادی رنگ بہت مقبول ہوا پورے ہندوستان میں داغ کی پیروی کی جانے لگی۔ داغ کی شاعری دلی، رام پور، اور حیدر آباد کی طرح بہار اور عظیم آباد میں بھی مقبول ہوئی۔ داغ کے بہاری تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس وقت چند مخصوص تلامذہ کے ذکر پر اکتفا کروں گا، بہار میں داغ کے ارشد تلامذہ کے نام یہ ہیں۔ نسیم ہلسوی، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی، محمد یار خاں خیال رئیس مظفر پور، حضرت سید شاہ حامد حسین صاحب سجادہ نشین تکیہ حضرت شاہ ارزاں قدس سرہٗ اور جناب نظام الدین نجمی صاحب۔

(۱) سید نذیر احسن نسیم ہلسوی داغ کے معتقد تلامذہ میں تھے۔ احسن مارہروی "انشائے داغ" صفحہ ۱۲۵ میں ان کے متعلق فرماتے ہیں:۔ "نسیم مرحوم ہلسہ ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے اور استاد مرحوم کے بہترین شاگردوں میں تھے"

حضرت نسیم کی چند غزلیں میری نظر سے گزری ہیں۔ آپ کا کلام اپنے استاد کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ زبان کی صفائی، بیان کی خوبی، محاوروں کی بے تکلفی اور شوکتِ الفاظ جو داغ اسکول کی خصوصیات ہیں آپ کے کلام کے اندر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ۱۹۱۶ء

میں جب داغ کی جانشینی کا مسئلہ درپیش ہوا تو حضرت نسیم نے اپنے ایک مقطع میں سائل دہلوی کی جانشینی کا اعتراف کرلیا۔ یہ حضرت نسیم کا انکسار تھا جو سہر بہاری کی خصوصیت رہی ہے لیکن اس انکسار پر بھی مقتدر شعرا نے بہار و بنگالہ کے لئے آپ کو داغ کا جانشین تصور کیا۔ اس سلسلہ میں حضرت شاد عظیم آبادی کے ایک خط کی نقل حاضر کر رہا ہوں :-

مکرمی۔ تسلیم۔ عنایت نامہ نے ممنون کیا، عزیزی حضرت سائل مدعمرہٗ کا کیا کہنا، ان کے اخلاق کا میں کلمہ گو ہوں۔ آپنے ایک دفعہ مجھ کو سرفراز کیا تھا، اور شعر بھی سنائے تھے مجھ کو یاد ہے، ہرچند میں موازنہ کی لیاقت نہیں رکھتا مگر صوبہ بہار کیا دور دور تک آپ جانشین داغ کہے جانے کے مستحق ہیں، آپ کی دونوں غزلیں میں نے پڑھیں احسنت احسنت، خدا آپ کو کامیاب کرے۔ حاجی گنج پٹنہ۔ ۲۴ر جنوری ۱۹۱۶ء

نامہ نگار خاکسار

السید علی محمد شاد

اس سلسلہ کی دوسری کڑی شمس العلماء خان بہادر یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی کا ایک خط ہے۔ اس خط کی نقل حاضر ہے۔ کلکتہ ۳۰ر جنوری ۱۹۱۶ء

"جناب مولوی سید شاہ نذیر حسن صاحب نسیم ہلسوی عظیم آبادی کا کلام میری نظر سے گزرتا رہا ہے اور میں ہمیشہ اس سے مزہ لیتا رہا ہوں۔ نواب فصیح الملک داغ مرحوم کے دوسرے ارشد تلامذہ کے کلام بھی میری نظر سے گزرے ہیں اور میں جناب نسیم کو کسی سے کم نہیں سمجھتا اور میں زور کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر تمام ہندوستان میں نہیں تو کم از کم صوبجات بہار و بنگالہ میں تو یہ اس امر کے مستحق ہیں کہ جانشین حضرت داغ مانے جائیں۔

محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی

شمس العلماء خان بہادر

مندرجۂ بالا خطوط سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت نسیم کا مقام کیا تھا۔

(۲) محمد ریاض حسن خاں خیالی رئیس مظفر پور، بقید حیات ہیں، اس وقت آپ کا سن ۹۰ سال ہے۔ آپ کا مشغلہ برابر علمی رہا۔ داغ متعلق آپ کے پاس کافی مواد موجود ہے۔ داغ کے اکثر خطوط اور داغ کی بیشمار اصلاحیں آپ کے پاس اب بھی محفوظ ہیں۔ اب ضعف اور پیری نے آپ کو کسی کام کا نہیں رکھا۔ آپ کا کلام میری نظر سے گزرا ہے۔ آپ کی دس بارہ غزلیں میرے پاس محفوظ آپ کے کلام میں استاد کا رنگ نمایاں ہے۔

(۳) حضرت شاہ حامد حسین صاحب حامد ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۳۲۱ھ میں سجادہ نشین ہوئے۔ شعر و سخن کا ذوق اوا عمر سے دامنگیر ہے۔ پہلے خواجہ شہرت عظیم آبادی سے اصلاح لیتے تھے پھر حضرت داغ مرحوم سے بذریعہ ڈاک اصلاح لی۔ نواب فصیح ا کی وفات کے بعد حضرت احسن مارہروی کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ آپ کے پاس حضرت داغ کے چند خطوط اب بھی محفوظ ہیں۔ احس مارہروی کے بھی بیشمار خطوط آپ کے یہاں محفوظ ہیں۔ راقم کو اکثر خطوط کی زیارت کا موقع ملا ہے۔ مشق سخن کے باعث آپ کا کلا حسن روزمرہ، سادگی، استعارات اور محاورے کے زیور سے آراستہ ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

نکلے جو دل سے آہ تو کیوں کر اثر نہ ہو، ممکن نہیں کہ سنگ سے پیدا شرر نہ ہو

جبیں سائی کو سنگِ آستاں تیرا ہی کافی ہے کسی کے در پہ اپنا یہ سرِ تسلیم کیوں خم ہو

بھر آئیں سب کے دل جوشِ سخن ایسا بھی ہوتا ہے زبان ایسی بھی ہوتی ہے دہن ایسا بھی ہوتا ہے

آپ کا ایک ضخیم قلمی دیوان راقم کی نظر سے گزرا ہے۔ دیوان کے اندر غزلوں کے علاوہ رباعی، سلام، اور نوحے بھی کافی تعدا شامل ہیں۔ حضرت شاد صاحب کے یہاں تعزیہ داری کی رسم بہت خلوص اور انہماک سے ادا کی جاتی ہے، شہر بھر کے تمام تع اور اکھاڑے آپ کے آستانہ پر آکر اپنی آخری رسم ادا کرتے ہیں۔ آپ کے سلام اور نوحے اکثر تعزیوں اور اکھاڑوں میں مروج

(۴) ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی داغ کے ان تلامذہ میں ہیں جنھوں نے استاد کی روش کو اپنی روش قرار دیا۔ آپ زندگی کی ۹۰ بہاریں لوٹ چکے ہیں۔ اب جسم کے ساتھ حواس بھی جواب دے رہے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں جلوۂ داغ کے نام سے آپ کی غزلوں کا ایک انتخاب شایع ہوا ہے لیکن اکثر اہلِ ذوق حضرات کا خیال ہے کہ مبارک کی اکثر عمدہ غزلیں اس انتخاب میں شامل نہیں، مبارک کی زندگی میں مبارک کا انتخاب شایع ہو اور وہ بھی نامکمل یہ افسوس کی بات ہے۔

(۵) سید نظام الدین بلخی شہر عظیم آباد کے باشندہ ہیں۔ آپ کے والد ماجد ڈاکٹر غیاث الدین بلخی کچھ دن ریاست حیدر آباد میں رہے تھے۔ نظام الدین بلخی ۱۷ سال کی عمر میں داغ کے شاگرد ہوئے۔ داغ کے بعد کسی سے پھر اصلاح نہ لی۔ کلام میں پختگی اور داغ اسکول کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ آپ کا ایک قلمی دیوان ترتیب پا چکا ہے لیکن اشاعت کی امید نہیں۔ نظام الدین بلخی صاحب کو حضرت داغ کی زندگی کے بیشمار چھوٹے چھوٹے واقعات یاد ہیں۔ داغ کی زندگی کے چند واقعات ملاحظہ ہوں:-

(۱) حیدر آباد کے شاہی محل میں لارڈ الگن وائسرائے ہند کے استقبال کی طیاری ہو رہی تھی۔ تمام درباری استقبال کے لئے دو گھنٹے پہلے سے دست بستہ کھڑے تھے۔ حضرت فصیح الملک کو وجع مفاصل کا عارضہ تھا اور بوجہ پیری وہ کمزور بھی تھے کچھ دیر انتظار کے بعد داغ کی طبیعت بگڑی اور انھیں غش آ گیا اسی درمیان میں لارڈ الگن وارد ہوگئے۔ داغ کا ان سے تعارف کرایا گیا۔ یورپ میں شعرا کی بڑی قدر کی جاتی ہے لارڈ الگن نے داغ کو سینہ سے لگا لیا۔ اس واقعہ کے بعد شاہی استقبال کے موقع پر داغ کے بیٹھنے کا انتظام کر دیا جاتا۔

(۲) ایک بار دسمبر کے آخری عشرہ میں نظام حیدر آباد کے ساتھ داغ بھی کلکتہ آئے۔ منشی باقر صاحب کو داغ کے کلکتہ پہونچنے کی اطلاع ملی۔ باقر صاحب نے حضرت داغ کو پٹنہ آنے کی دعوت دی۔ داغ عظیم آباد کو یاد کر کے بیچین ہوگئے اور جواب میں صرف یہ شعر لکھ کر بھیجدیا:-

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی
تپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ برپا را

(۳) ایک بار حضرت داغ جب کلکتہ گئے تو وہاں کی ایک مشہور طوائف سے ان کی خوب ملاقات رہی۔ طوائف خود بھی شاعرہ تھی۔ داغ ایک گفتگو میں دو شعر کہہ گئے۔ طوائف مکالمہ کے اندر شاعری کو نہ سمجھ سکی۔ کچھ دیر بعد اسے اس کا احساس ہوا اور وہ بہت شرمندہ ہوئی ؎

مجھے کچھ تم سے کہنا ہے مگر کہنے سے ڈرتا ہوں
اجازت ہو تو کہہ ڈالوں کہ جاناں تم پہ مرتا ہوں

بہار کے اندر داغ اسکول کو بہت فروغ ہوا۔ یہاں کے اس فروغ میں داغ کے صرف بہاری تلامذہ کا ہاتھ نہیں، بلکہ احسن مارہروی نوح ناروی اور سیماب اکبر آبادی نے بھی بہار کے کشت شاعری کی آبیاری کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہار کے اندر داغ کی شاعری کا چراغ اب تک روشن ہے۔

پروفیسر ذکی اختر ہاشمی

فن کیا ہے؟

فن کا نام آتے ہی بعض اوقات ایک عجیب سی اُلجھن پیدا ہوجاتی ہے اور فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر فن ہے کیا؟ کسے فن کہا جائے اور کسے فن نہ کہا جائے۔ اس لئے کہ جب ہم فن کا نام لیتے ہیں تو ہمارے سامنے ادب۔ موسیقی۔ معماری۔ رقص۔ سنگتراشی باغبانی۔ دستکاری۔ کاشتکاری اور اسی طرح کی معلوم نہیں کتنی چیزیں سامنے آتی ہیں اور اس فہرست کا کوئی رکن، اعلیٰ و ادنیٰ سے قطع نظر فن سے خالی نہیں ہے، کھیت جوتنا بھی ایک فن ہے، کپڑا بننا بھی فن کی صف میں آتا ہے اور موسیقی، رقص، مصوری کا شمار بھی فن میں ہوتا ہے۔ آیئے ذرا اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

جمالیات کے ماہرین نے فن کو زیادہ تر چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ۱۔ رسمی۔ ۲۔ مرقعی یا استحضاری (۳۔ بیانیہ ۴۔ عملی فن (Practical Art) ان میں رسمی، بیانیہ اور مرقعی بہت کچھ ایک سے نظر آتے ہیں اور جنہیں سمجھنے کے لئے ہمیں تھوڑی دیر کے لئے ایک دوسری بحث میں جانا ہوگا۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی چیز جو آتی ہے وہ رسمی اور ہیولائی ہے۔ فن کا بیان زیادہ تر انھیں دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ کسی چیز کے پیش کرنے میں ایک تو پیش کردہ چیز کا ہیولیٰ ہوتا ہے اور دوسری اس میں کچھ رسمی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ ہیولیٰ میں مرقع بھی مضمر ہوا کرتا ہے۔ مثلاً کوئی مجسمہ یا تو سنگِ مرمر کا بنا ہے یا کسی فن کی تعمیر میں سنگ و خشت کے بجائے، رنگ و موقلم اور کسی انسانی جسم (جس کی شکل اُتاری گئی ہو) یا کسی سبزہ زار کے عکس سے مدد لی گئی ہے یا صرف صوتی کیفیت اور آواز کے اُتار چڑھاؤ سے اس کی تکمیل ہوئی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ شکل، بھی ہے جس کا عکس اُتارا گیا ہے یا جس کا مجسمہ بنایا گیا ہے۔ اب یہ تین چیزیں بالکل صاف ہیں۔ وہ مادّہ جس سے مجسمہ کی تعمیر ہوئی، وہ شکل جس کا عکس اُتارا گیا، وہ چابکدستی جو اس کی تکمیل میں صرف کی گئی۔ چوتھی چیز وہ روح، جذبہ، احساس ہوسکتا ہے جو ان تینوں کی مدد سے مجسمہ یا تخلیق میں ابھرا گیا۔ اور یہ سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اب ان میں سے فن رسمی اسوقت کہا جائے گا جب اس میں کوئی مادّی ہیولیٰ موجود نہ ہو۔ مثلاً موسیقی کے لئے کسی مادّی ہیولیٰ کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ صوتی اصول مقرر کرلئے گئے ہیں۔ نغمہ انھیں اصولوں پر سُر۔ تال کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ یہاں فن صرف مغنّی کی چابکدستی ہے۔ نغمے کا خیال شامل نہیں ہے۔ صرف جذبے کی ایک لہر ہلکی سی ضرور آجاتی ہے۔

دوسری قسم کے فن کی تعبیر کے لئے ہمیں خاص طور سے مصوری کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ فن کی دوسری قسم استحضاری ہے جسے کسی حد تک مرقعی بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس فن میں کوئی سین، واقعہ، کوئی سانحہ، تاریخی عمارت کی تصویر، کسی پہاڑی منظر کا مرقع پیش کیا جاتا ہے۔ استحضاری فن میں "پیشکش" ضروری چیز ہے۔ پیشکش اپنے خاص مفہوم میں ہے۔ مگر رسمی فن بھی اسمیں شامل رہتا ہے۔ مرقعی فن میں، فنکار کا انتخاب، پیش کردہ شے کی دل فریبی، اس کی ساخت، تناسب اور پھر وہ رسمی فن جسے فنکار کی چابکدستی کہا جائے، شامل رہتی ہے اور آخری چیز جو ان سب کے تناسبی اجتماع سے پیدا ہوگی وہ کسی حد تک حسن ہے۔ مرقعی فن میں ہیولیٰ اور ہیئت دونوں کی ضرورت ہوتی ہے صرف رسمیت سے کام نہیں چل سکتا۔

فن کی تیسری قسم، بہت کچھ دوسری قسم سے پیدا ہوتی ہے جسے بیانیہ فن کہیں گے۔ مرقعی فن کی طرح اس میں بھی ہیئت

اور ہیولیٰ حد تک ضروری ہیں۔ مرقعی فن جب کسی تاریخی واقعہ، کسی تلمیح کا حامل ہو جاتا ہے تو وہ بیانیہ فن بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر گوتم بدھ کا مجسمہ مرقعی ہے مگر بدھ کی آخری تصویر جس میں وہ اپنی موت کے وقت اپنے چیلوں کو درس دیتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ بیانیہ فن ہو گیا ہے یا حضرت عیسیٰ کی تصویر مرقعی فن ہے مگر لیونارڈو کی مصوری عشائے آخر (Last Supper) جس میں حضرت عیسیٰ کا وہ تاریخی کھانا دکھایا گیا ہے جو وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ کھا رہے ہیں، 'زہرہ کی پیدائش' (Birth of Venus) یا مائیکل انجلو کا آخری فیصلہ (Last Judgment) کسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں، کسی تلمیح کے حامل ہیں۔ اسے بیانیہ فن کہیں گے۔ ادب، بیانیہ اور مرقعی فنون ہی کے دائرہ میں آتا ہے۔

عملی فن کا شمار سب سے ادنیٰ فن میں کیا جاتا ہے، جس میں کسی بڑے دماغ، کسی بڑے فن کار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بہت کچھ میکانکی ہوتا ہے، جسے تھوڑا بہت سیکھ کر ہر آدمی فن کار بن جاتا ہے۔ اس میں فطری ملکہ کی ضرورت ہوتی ہے جیسے سلیقہ کہ لیجئے کاشتکاری۔ دستکاری (جو صرف مشقی اور میکانکی ہو) خطاطی۔ باغبانی۔ نجاری۔ امور خانہ داری۔ ان سب میں نہ اس جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے نہ اس تڑپ کی جو مصور، رقاصہ یا موسیقار کے دل و دماغ میں کروٹیں لیتی ہے۔

فن کی ہیئت، تقسیم اور ظاہری شکلوں کے بعد جب اس کے مواد اور ہیولیٰ پر نظر جاتی ہے تو اس سلسلے میں ذرا ہٹ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ فن کی خوبی اور خرابی کا معیار کیسے قایم کیا جائے۔ اس ضمن میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اچھے اور برے کا انحصار فن کے مواد اور فن کار کے اس انتخاب پر ہے جس کو اس نے اپنے فن سے مزین کرنے کو منتخب کیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک مصور کسی پہاڑ کے دامن میں غروب آفتاب کا منظر پیش کرتا ہے تو وہ اچھا فن ہے اس لئے کہ فن کا مواد اچھا ہے۔ بشکل دیگر اگر وہ کسی مردہ جانور کی تصویر کشی کرتا ہے جس کو گدھ نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں تو وہ اچھا فن نہیں ہے اس لئے کہ اس کا مواد کریہ المنظر ہے۔ یا کچھ تنگ نظر لوگوں کے نزدیک گوتم بدھ کا مجسمہ اچھا ہوگا خواہ کتنا ہی بدسلیقہ کیوں نہ بنا ہو۔ مگر مونا لیزا کی معصوم مسکراہٹ یا تاج کے مرمریں منارے کوئی وقعت نہیں رکھتے اس لئے کہ وہ دوسروں کا فن ہے یا 'عشائے آخر' دوسرے مذہب کی روایات سے متعلق ہے۔ ایک اچھا فن اور اچھا فنکار ان عیوب سے پاک ہوتا ہے۔ ایک کریہ منظر بھی اتنا ہی حسین ہے جتنا ایک دلفریب نظارہ اگر وہ اپنی حقیقی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ فنکار کی طرز پیشکش فن کی جان ہے۔ اگر کسی فن میں حقیقت کی طرف اس قدر اشارہ ہو کہ دیکھنے والا پیشکش کے اور لوازمات کو بھول کر صرف اس حقیقت کی طرف متوجہ ہو جائے جس کا اشارہ فن کار کر رہا ہے تو فن اور فن کار دونوں عروج کی آخری منزل تک ضرور پہونچ جاتے ہیں۔ جیسے مونا لیزا کے شاہکار کو دیکھ کر عورت، اس کا جسم، قد و قامت سب فراموش ہو جاتے ہیں اور دیکھنے والا صرف معصوم ہنسی سے مبہوت ہو جاتا ہے۔ ہارس ایٹ ایز (Horse At Ease) میں ذہن، گھوڑے کی ٹانگوں، سموں اور بدن کے جھکاؤ کی طرف مبذول ہوتا ہے۔ فن کا ہیولیٰ اور اس کی تعمیر در اصل وہ مواد، وہ پیشکش ہے جسے فن کار نے پیش کیا ہے۔ مٹی۔ پتھر۔ لوہا یا رنگوں کی پیالیاں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔

ادب کے سلسلہ میں جب فن کا سوال آتا ہے تو بہت سے دھوکے پیدا ہو جاتے ہیں کچھ لوگ فن کا مقصد، صرف الفاظ کی تراش خراش، لفظوں کی بندش، بحر، ردیف قافیہ کا محض التزام سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ نثر میں بھی فنکاری کا تقاضا کرتے ہیں کچھ نثر کو فن کے لئے مناسب نہیں سمجھتے۔ فن ان کے نزدیک صرف شاعری ہی میں مل سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ فن، نثر نظم سب میں ہوتا ہے صرف مقررہ اصول ہی نہیں بلکہ وہ روح وہ جذبہ بھی کام کرتا رہتا ہے جو ہر فن کی جان ہے۔ شاعری کے سلسلے میں فن، الفاظ کے انتخاب، ردیف، قافیہ، بحر، موسیقیت اور سب سے زیادہ اس مواد میں ہوتا ہے جو پیش کیا گیا ہے اور طرز پیشکش جس میں مواد ڈھالا گیا ہے۔ مقالات اور مضامین میں فن اس مقصد کے اتمام میں پوشیدہ ہوتا ہے جس کے

ہے !

وہ لکھا جا رہا ہے اور وہ طرزِ ادا جس کے ساتھ وہ پیش کیا گیا ہے ۔ ناول اور مختصر افسانوں میں فن ، کردار نگاری، پلاٹ، ارتقا، تشبیہ، اختتام اور مواد و طرزِ پیشکش میں مخفی ہے، ایسا مواد جو کہ مادی ہو، جسے انسانی حیات سے علاقہ ہو اور اس بات کا اطلاق پورے ادب پر ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ ادب کا تعلق جتنا براہ راست زندگی سے ہے اتنا تعلق اور کسی دوسرے فن لطیف کا نہیں ہے۔

ایک محدود طبقہ کے نزدیک ادبی فن اور ادبی محاسن کے معنی ہی بالکل مختلف ہیں ۔ ادب کا مطلب اول تو اس طبقہ کے نزدیک صرف شعر خوانی ہوتا ہے جس میں فن صرف لفظی بازیگری ۔ ردیف قافیہ کا کھٹکا ۔ صنعت لفظی ۔ بندش وغیرہ ہوتا ہے مگر یہ خیال صرف تشاعر اور چند نام نہاد ادیب نما لوگوں کا ہے جو ادب کا اصل مفہوم نہ سمجھتے ہیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب نہ صرف شعر و شاعری ہے اور نہ فن سے مراد صرف ردیف، قافیہ، الفاظ کی تراش خراش اور صنایع لفظی ہیں —— ادب میں ناول، افسانہ نگاری، داستان، نثر بھی کچھ شامل ہے اور ان سب چیزوں میں فنکاری موجود ہوتی ہے مگر ادب کے لئے پہلی اور سب سے ضروری چیز مواد ہے جس کی بنیاد کسی مادی خیال پر رکھی گئی ہو باقی چیزیں صرف مشاطگی کا کام کرتی ہیں۔ انسانوں کا ادب انسانی زندگی کا عکس ہے اور اس لئے اس ادب کا مواد انسانی سماج ہی اکٹھا کرتا ہے اور پھر اس کو فنکاری کی سان پر چڑھا کر پیش کرتا ہے ۔ ماحول اور سماج ادب کی جان اور ادیب کا دماغ ہیں اور سماج و ماحول میں خوبیاں بھی ہوسکتی ہیں، خرابیاں بھی۔ ادب کا مقصد زندگی کو سنوارنا ہے، اس سے منہ چرانا نہیں ۔ اس لئے خوبی و خرابی سبھی کچھ پیش کی جاتی ہیں مگر دیانتداری شرط ہے خرابی پیش کرنے یا اس کا مذاق اڑانے میں اگر اصلاح مقصود ہے تو ایسی خرابی کے بیان کرنے میں چنداں ہرج نہیں مگر جب اس خرابی کو اور گندگی بنا کر محض ذہنی تعیش کے لئے پیش کیا جاتا ہے تب وہ یقیناً تخریبی ہوجاتی ہے جس کا مقصد محض شرارت اور بد معاشی کے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا ۔ اب یہ غلطی خواہ کسی بھی اسکول کے ماننے والے سے سرزد ہو ۔

ادب کی فنی خصوصیت کا ایک پہلو حقیقت نگاری بھی ہے مگر صرف دو اور دو چار والی حقیقت ، سائنسی ہوجائے گی اگر فنکار اس کو اپنے تخیل کے سحر میں غرق نہیں کرتا۔ فنکار کے لئے ادب میں سب سے بڑی مشکل یہیں آپڑتی ہے ۔ اسے حقیقت سے بھی کنارہ کش نہ ہونا چاہئے اور ساتھ ہی ساتھ پیشکش ایسی ہو جس نے تخیل و محسوسات کی مدد تو لی ہو مگر ہوا میں معلق نہ ہوگئی ہو ۔ فلسفہ اور سائنس حقیقت کلی پر یقین رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی دنیا میں ادبی فن کا مذاق اڑایا جاتا ہے ۔ اس کو حقیقت سے گریزاں اور بے عمل کہا جاتا ہے ۔ سائنس کی دنیا میں رات صرف ایک مقررہ وقت کے بعد غروب آفتاب پر جب تاریکی پھیل جائے اس کا نام ہے مگر ادب کی دنیا میں فنکار کی رات اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے، اس سے میخانے میں چلنے کو کہتی ہے کسی لالہ رخ کے کاشانے کی طرف اس کا دامن کھینچتی ہے ۔ اب یہ واقعہ حقیقت سے دور بھی نہیں ہے ۔ انسانی دماغ میں بعض اوقات یہ خواہش پیدا ہوتی ہے ۔ لطف تو یہ ہے کہ سائنس بھی فن ہے اور ادب بھی اور یہ دونوں فن بھی ایک دوسرے میں اس طرح سموئے ہوئے ہیں کہ الگ نہیں کئے جاسکتے ۔ ادب کو سائنٹفک ہونا چاہئے جبکہ سائنس پر ادب کے بھی اصول قایم کئے جاتے ہیں

فن کو صرف ادب، صرف شاعری نہ سمجھ کر اگر اس کے وسیع معنی میں اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ ضروری ہے کہ اس بات پر نظر رکھی جائے کہ لفظ فن کا استعمال کس ضمن اور کس موقع پر ہوا ہے ۔ اب اگر 'فن' موسیقی کے سلسلہ میں آیا ہے تو وہاں اس سے مراد آواز ۔ سر تال، نغمہ، راگ، راگنی، لہجہ کا اتار چڑھاؤ اور پھر اس کے بعد وہ گیت ہے جس پر موسیقی کے ان لوازمات کا ترجمہ کیا جاتا ہے ۔ اور پھر گیت میں وہ جذبہ جو کسی گیت یا نغمہ کو موثر بناتا ہے ۔ اگر حقیقت بیں نظروں سے دیکھا جائے تو موسیقی کی روح وہی جذبہ ہے ۔ اور پھر گیت میں سمویا ہوا ہے اور جو موسیقی کے اور لوازمات کے ساتھ مل کر دل پر ایک چوٹ مارتا ہے (اسی طرح صرف ساز سے پیدا کی ہوئی موسیقی INSTRUMENTAL MUSIC میں) اگر یہ روح موجود نہیں تو فنِ موسیقی کا ظاہری فن اور صرف اصول، جذبات کو برانگیختہ نہیں کرسکتے ۔ قوت سامعہ شاید متلذذ ہوجائے

مثال کے لئے ہم مضطر خیرآبادی کا مشہور شعر لئے لیتے ہیں :-

اسیر پنجۂ عہدِ شباب کرکے مجھے کہاں گیا مرا بچپن خراب کرکے مجھے

اب اس شعر میں جو تاسف، کرب ملی ہوئی خواہش اور تڑپ موجود ہے وہ موسیقی کی سان پر چڑھ کر جتنا اثر پیدا کرے گی اتنا سے

گرا کے غار کی تہ میں اکیلا پا کے مجھے چلا گیا وہ مٹر خاں رُلا رُلا کے مجھے

میں نہیں پیدا ہوسکتی چاہے موسیقی کے فن کا اظہار انتہائی بلندی کے ساتھ کیوں نہ کیا جائے۔ سامعہ تو لذت حاصل کرے گا مگر وہ بھی ظاہری ہوگی اس لئے کہ سامعہ پر بھی جذبات اثر انداز ہوتے ہیں۔ موسیقی، سا۔ رے۔ گا۔ ما سے زیادہ اس احساس کا نام ہے جو مغنی کے دل میں کسی جذبہ کے تحت پھوٹ پڑتا ہے اور ساز ہاتھ سے زیادہ دل سے بجایا جاتا ہے۔

اسی طرح رقص، صرف آگے بڑھنے، پیچھے ہٹنے، جسم کی گردش، اعصاب کی مختلف جنبشوں کا نام نہیں بلکہ رقص کی۔ روح۔ رقاصہ یا رقاص کا وجود اور اس کے جذبات ہیں۔ کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رقص کا ہیولیٰ اور رقاصہ یا رقاص کا جسم بالکل دو الگ چیزیں ہیں[1]۔ رقص کے لئے اگر رقاصہ کے حرکات و سکنات ہی کافی ہوتے تو کٹھ پتلی یا کسی بھی میکانکی رقص میں زیادہ دلفریبی ہوتی اور اگر رقاصہ یا رقاص کی جاذبیت رقص پر اثر انداز نہ ہوتی تو ہر آدمی تھوڑے سے اصول سیکھ کر رقص کرسکتا تھا۔ ادا، یا طرزِ ادا جس کا نام ہے وہ نہ کٹھ پتلی میں پیدا ہوسکتی ہے نہ اصول رقص میں۔ صرف ظاہری فن کہیں بھی کام نہیں دیتا اگر مواد موجود نہ ہو ایسا مواد جس میں مادی لطافتیں موجود ہوں — فن اور مواد ایک دوسرے کے لئے ہر میدان عمل میں لازم و ملزوم ہیں حسن صرف تناسب کا نام نہیں ہے بلکہ اس شے کا نام ہے جو تناسب کے یکجا ہونے پر پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر رقاصہ کا فن، اس کا جسم اور اس جسم میں زندگی اور اس زندگی کے اظہار کی قوت نہ ہوتی تو نہ وہ فن پیدا ہوتا جسے ہم رقص کہتے ہیں نہ وہ حسن جو کسی مخصوص رقص کو اپنی صف میں ممتاز کرتا ہے۔

مصوری کے سلسلہ میں بھی خیال کو صرف ثانوی بلکہ اس سے بھی کم اہمیت حاصل ہے۔ مصوری کے لئے ضروری ہے کہ مصور میں قوتِ مشاہدہ زبردست قسم کی ہونی چاہئے۔ ذہن میں مختلف قسم کے رنگوں کے اثرات سے کیفیت پیدا ہونے کی صلاحیت موجود ہو باریک بیں اتنا ہو کہ ہر فطری اور مصنوعی پیشکش کی تہ تک پہونچ جائے۔ طبیعت ایسی حساس ہو جس کے خمیر میں مناظرِ فطرت حل کردئے گئے ہوں اور جس کے لئے یہ مادی دنیا ایک منظر ہو۔ اسی طرح سنگتراشی، مجسمہ سازی، ہر ایک کے لئے کچھ میکانکی اصول اور واجبات ہیں جن کے تذکرے میں کوئی دلکشی اس موقع پر پیدا نہ ہوگی۔

اعلیٰ فنون کے بارے میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اعلیٰ فنون کی تخلیق کہیں الگ سے یک بارگی نہیں ہوجایا کرتی۔ اس کی اساس بالکل ادنیٰ فن پر قایم ہے۔ پیراڈائز لاسٹ۔ اینیڈ۔ الیڈ۔ شاہنامہ۔ مراثی انیس کا وجود قلم کی گردش، خطاطی الفاظ، جملے، نشست، علم البیان جیسے چھوٹے چھوٹے فنون کی مدد اور ان کے اجتماع ہی سے ہوا۔ تاج کے منارے، موتی مسجد کی سادگی، مدورا کے منادر، اجنتا اور ایلورا کی ایسرائیں۔ آخری فیصلہ، مائیکل اینجلو کا فن ٹیٹن۔ مانی۔ بہزاد کی مصوری و نقاشی بھی موقلم، رنگوں کی پیالیاں اور سنگتراشی کے ابتدائی اوزار کی مرہونِ منت ہیں اور یہ ابتدائی چیزیں ادنیٰ فن کا ایک جزو ہیں جو اعلیٰ فنون کی تخلیق کا باعث بنتی ہیں — اس طویل بحث کے بعد جب فن کو ہم بہ حیثیت مجموعی دیکھتے ہیں تو بیساختہ ہماری زبان سے یہی نکلتا ہے کہ فن مادی حسن کی نقالی کا نام ہے۔

سید محمد عقیل

---

al The body of the dancer is not the body of the dance but the body of the dance is created from Sequence of bodily gestures:— Musical Studies by Earnest NEWMAN

مومن کا فارسی کلام

حکیم مومن کی فارسی شاعری کے متعلق نہ تو آج تک وضاحت سے کسی نے کچھ لکھا اور نہ عام طور سے دنیا کو معلوم کہ مومن خاں کی کلیات فارسی کن اصناف سخن پر مشتمل ہے غالبًا میں بھی اس سے بےخبر ہی رہتا اگر مجھ کو قسمت سے مومن خاں کے فارسی کلام کا مجموعہ نہ مل جاتا۔ مجھے جب یہ نسخہ دستیاب ہوا تو میں نے اکثر محققین سے ذریعہ خطوط معلوم کیا کہ مومن خاں کے کلیات کے متعلق اُن کی کیا رائے ہے، لیکن قریب قریب سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ نادر نسخہ مومن خاں کے پاس سے مجھ تک کس طرح پہونچا۔ اس نسخہ مجھ تک پہونچنے کا ذریعہ نواب وزیرالدولہ صاحب بہادر والیِ ٹونک ہیں۔ جو میرے پردادا صاحبزادہ عباداللہ خاں کے بھائی تھے۔ نواب وزیرالدولہ والیِ ٹونک سے چونکہ مومن خاں کے خاص تعلقات تھے اس لئے مومن خاں نواب صاحب سے اکثر خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ مومن خاں سے ابتدائی تعلقات نواب صاحب کے اسوقت ہوئے جبکہ نواب صاحب ایک عرصہ تک انتظامًا دہلی میں مقیم رہے۔ بہادر شاہ بادشاہ چونکہ نواب وزیرالدولہ صاحب کے خالو تھے اس لئے اکثر دہلی کے باکمال لوگوں سے اُن کی رسم و راہ ہوگئی جن میں ایک مومن خاں بھی تھے۔ مومن خاں نے نواب موصوف کے لئے کچھ قصاید بھی لکھ کر روانہ کئے تھے۔ ایک قصیدہ کلیات مومن (اُردو) میں درج ہے جس کا مطلع ہے:- "یادِ ایامِ عشرتِ فانی ⁂ نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی"

انھیں ایام میں یہ نسخہ بھی نواب وزیرالدولہ کو مومن خاں نے بطور نذر روانہ کیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مومن خاں اور نواب وزیرالدولہ میں خاص تعلقات پیدا ہونے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں ایک ہی پیر کے مرید تھے۔ جس زمانہ میں یہ نسخہ روانہ کیا گیا، اُس وقت چونکہ میرے پردادا کو بھی شاعری سے شغف تھا اس لئے انھوں نے نواب صاحب سے نسخۂ ہٰذا کو مانگ لیا۔ میرے پردادا کے انتقال کے بعد یہ نسخہ میرے دادا کے پاس رہا اُن کے بعد میرے والد مرحوم کے ورثہ میں آگیا۔ لیکن یہ نسخہ کس طرح والد صاحب کے پاس سے گم ہوگیا اور ایک عرصہ تک گم رہا لیکن والد صاحب کی وفات کے قریب دس سال بعد ایک روز بازار میں فروخت ہوتا ہوا دیکھا گیا۔ میرے بزرگ مولانا احمد حسن صاحب جو مومن خاں سے خاص عقیدت رکھتے ہیں، انھوں نے اس نسخہ کو خرید لیا اور میں نے ان سے لیا۔

نسخہ کی خصوصیت نسخہ میں خاص خصوصیت یہ ہے کہ جہاں جہاں کاتب سے غلطیاں ہوئی ہیں، وہاں مومن خاں نے خود اپنے قلم سے اُن کی اصلاح کی ہے، ایسی اصلاحیں نسخہ میں پچاس ساٹھ جگہ موجود ہیں۔ اگر کسی غزل یا قصیدے یا تاریخ میں کوئی شعر رہ گیا ہے تو بعد میں اس کا اضافہ مومن خاں نے خود اپنے قلم سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ جو آٹھ تاریخیں رباعیوں کا نسخہ روانہ کرتے وقت اضافہ کیا گیا ہے وہ بھی مومن خاں نے خود اپنے ہی قلم سے کیا ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

۱۔ تاریخ وفات خواجہ محمد نصیر مرحوم (نواسہ خواجہ میر دردؔ قدس سرہٗ)

۲۔ تاریخ وفات عبداللہ عرف منگاجان وکیل عدالت دیوانی دہلی۔

۱۰۳ تاریخ پیوہ پردازی در عہد محمد بہادر شاہ بادشاہ۔
۱۰۴ تاریخ ریش تراشیدن دبیرالدولہ
۱۰۵ دیگر
۱۰۶ کتخدائی برادر زادۂ خود عبدالرحمٰن
۱۰۷ " نامعلوم
۱۰۸ " نامعلوم

تفصیل اصناف سخن قصاید چھ، غزلیں ایک سو پندرہ، رباعیاں ایک سو چھبیس تاریخیں ایک سو ہیں اور کل صفحات ایک سو چھیانوے۔ ایک قصیدے کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں :-

گر چنین است گردشِ افلاک — زود چو گنج میروم در خاک
زارم از عشق ظالمے کہ ازو — ہم فلک کردہ ظلم استدراک
دلِ بریاں و خاطرِ مایوس — جانِ نمناک و دیدۂ نمناک
باتب و تاب آتشِ ہجراں — آنچنانم کہ شعلہ و خاشاک
ہستیم کار کردہ برمن تنگ — دارم از لطفِ مرگ چشم ہلاک
تا رود آب در حضیض زمیں — تا کند نخل سر سوئے افلاک
دشمن و دوستِ تو مائل باد — بہ نشیبِ ثریٰ باوجِ سماک

غزل مومن خاں کی غزل کا انداز جس طرح اُردو میں جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اسی طرح فارسی میں بھی وہ کسی بات کو معمولی طرح نہیں کہتے وہ اپنا خیال پیچیدگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں لیکن زبان و بیان کی سلاست حلاوت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے انھیں خصوصیات کی بنا پر اُن کا فارسی کلام ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔

مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں :-

یار گر خواست کہ عاشق نہ رسد تا سر کو — راند اول ز در خویش نگہبانش را

مومن خاں محبوب کے دربان سے چونکہ بدگمان ہیں اسلئے اظہار بدگمانی نہایت لطیف پیرایہ میں کیا ہے

ناصح کہ چاکِ خرمنِ من بخیہ میزند — یارب نہ بنید آں صنم جامہ زیب را

یہاں مومن خاں کو اپنے ناصح مشفق سے خوفِ رقابت پیدا ہوجاتا ہے۔ اور وہ نہیں چاہتے کہ ناصح اُن کے صنم جامہ زیب کو دیکھے۔ رشک اور خوفِ رقابت کے ساتھ ساتھ، شعر سے ایک لطیف طنز کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ یعنے ناصح مشفق اُسی وقت تک میری بخیہ گری میں مصروف ہے اور اسی وقت تک مجھے نصیحت کر رہا ہے جب تک کہ اُس نے میرے محبوب کو نہیں دیکھا ہے۔ جب وہ اُسے دیکھ لیگا تو یقیناً وہ بجائے میرے اپنے دامن کی بخیہ گری کی فکر کرے گا۔ اسلئے بہتر ہے کہ وہ میرے صنم جامہ زیب دیکھے ہی نہیں۔

دل را فریب وعدہ بدہ گو وفا مکن — شاید تسلی شود ایں ناشکیب را

اللہ رے مجبوریِ عشق کہ دل کی خاطر دانستہ فریب کھانا گوارا کرتے ہیں اور محبوب سے فریب دہی کی التجا کس قدر مؤثر الفاظ کرتے ہیں۔

نہ از کیں میشگافد آں ستمگر سینۂ ما را — کہ بہر آرزوے خویش خالی میکند جا را

مومن کے یہاں دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے محبوب کو کسی حالت میں موردِ الزام ٹھیرانا نہیں چاہتے - بلکہ اُس کی ہر جفا کو وفا سمجھتے ہیں اور اُس کی دشمنی اور عداوت کو دوستی تصور کرتے ہیں - محبوب کی بیگانہ روی کے زخم دل پر پے در پے کھاتے ہیں اور پھر بھی لذتِ یگانگت محسوس کرتے ہیں -

در رنجِ زندگی بخیالِ عدم خوشم یادِ وطن ز درد فزاید غریب را

مومن انتہائی عالمِ یاس میں بھی مسکراتے ہیں ہر غم میں اُن کی زندہ دلی کسی نہ کسی صورت سے کوئی خوشی کا پہلو نکال ہی لیتی ہے گو دنیا کی بے ثباتی کی تصویر الفاظ سے کھینچ رہے ہیں اور عارضی قیام گاہ کو مستقرِ دائمی پر ترجیح دے رہے ہیں لیکن رنجِ زندگی کو تکلیفِ مسافرت قرار دے کر تصورِ عدم سے خرم و شادکام ہیں -

زکاہشِ غمش اندر وطن غریب شدم کہ ہیچکس نشناسد دریں دیار مرا

وطن میں رہ کر اپنے غریب الوطن ہونے کا کس قدر مکمل ثبوت دیا ہے -

رحمے چہ میکنی بگمانِ جنونِ شوق ، پیراہنِ رقیب قبا کردہ ایم ما

اس شعر میں مومن خاں کا ذوقِ شعری اپنے اصلی خد و خال میں نمایاں ہے وہ محبوب کی نگاہ سے رقیب کا اعتبار کھونے کے لئے اوس کا سا روپ بدلتے ہیں اور وہ جب اُن پر رحم کھاتا ہے تو اصل واقعہ کا اظہار کرتے ہیں - یعنی اُس کو تنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ رقیب کا جنونِ شوق رقیب کے لئے جو تیری مہربانی اور رحم کی وجہ بنا ہوا ہے وہ فرضی ہے اور رقیب صرف تیری مہربانی حاصل کرنے کے لئے اور تجھے اپنی محبت میں مبتلا کرنے کے لئے جنونِ شوق کا ڈھونگ رچائے ہوئے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب میں رقیب کا بھیس بدل کر اور اُس کی قبا پہن کر تیرے سامنے آیا تو تو مجھ پر بھی رحم کرنے پر مجبور ہوگیا -

از کفِ دشمن گرفتم جام را می شناسم گردشِ ایام را

چونکہ علم ستارہ شناسی میں مومن کو ید طولےٰ حاصل تھا اس لئے اُن کی نظر گردشِ دوراں کا اچھی طرح جایزہ لے سکتی تھی ، چنانچہ مومن خاں کا یہ کہنا کہ "می شناسم گردشِ ایام را" میرے خیال میں غلط نہ ہوگا ، شعر سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنی زمانہ شناسی کا ثبوت بطریقِ احسن پیش کیا ہے - اور اس کے ساتھ ساتھ "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" کی تشریح - جس جامعیت کے ساتھ کی ہے وہ قابلِ داد ہے ، لفظ "دشمن" سے جو تغزل شعر میں پیدا کیا گیا ہے وہ بھی صرف مومن خاں ہی کا حصہ ہے - مومن خاں دشمن کے ہاتھ سے جام لیکر سیر نہیں ہوتے ، کیونکہ وہ تمام میخانے کی شراب کو اپنا ہی حق سمجھتے ہیں یا کہیئے کہ دوسرے کو اس کا اہل نہیں سمجھتے -

شکستنِ دلِ صیاد چوں روا دارم نگند دام و قفس تا کند شکار مرا

اسے مقتضائے عاشقی کہیئے یا مومن کی فطرت یا افتادِ طبیعت کہ وہ دانستہ مصیبت میں پھنسنا چاہتے لیکن کسی کی دل شکنی کرنا گوارا نہیں کرتے - اسی غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں :-

ز شوقِ جورِ تو در خویشتن نمی گنجم چہ غم کہ تنگیِ عالم دہد فشار مرا

تنگیِ عالم کے جملہ کی جامعیت ملاحظہ ہو کہ ایک جملہ سے دو معنے پیدا کئے گئے ہیں - ایک جگہ تنگی کے لفظی معنے اختصار اور کمی کے لئے گئے ہیں تو دوسری جگہ اصطلاحی معنے رنج و ابتلا کے لئے گئے ہیں - یہ امر مسلم ہے کہ جو شخص اپنے آپ میں نہیں سما سکتا وہ از خود رفتہ ہے اور بحالت از خود رفتگی تنگیِ عالم کا اُس کو کچھ غم نہیں ہو سکتا یعنے عالمِ از خود رفتگی نے تنگی اور کشاد تکلیف اور مصیبت کا احساس ہی اُس کے دل سے کھو دیا ہے - اس لئے اُس کو تنگیِ عالم محسوس ہی نہیں ہے -

اب میں کچھ ایسے ہم طرح اشعار پیش کرتا ہوں جو دوسرے شعرا کے یہاں انھیں قوافی میں پائے جاتے ہیں :

غالب، مومن

غالب :- دل مایوس را تسکیں بمردن میتواں دادن — چہ امید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را

غالب کو دل مایوس کے مرض سے اس قدر مایوسی ہے کہ تسکینِ مسیحا و ادریس و خضر سے بھی مطمئن نہیں ہیں - اور وہ مزید اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔

مومن :- مپرس از چارہ سازیہا ز پرسش بیشتر سوزم — سپے دارم کہ اعجاز ش نفس سوز و مسیحا را

مرض کی نوعیت اور شدت دونوں پر جس خوبصورتی سے روشنی ڈالی گئی ہے ظاہر ہے یہ کلیہ ہے کہ اگر کسی مایوس مریض کی مزاج پرسی کی جائے تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مایوسی کی بنا پر مریض آب دیدہ ہو جاتا ہے یہی پرسش احوال مرض میں شدت و اضافہ کا باعث ہو جاتی ہے۔ اسی کلیہ کو مومن خاں نے بہت خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

غالب :- غالب رسیدہ ایم بکلکتہ و بے ہے — از سینہ داغ دوریٔ احباب شستہ ایم

غالب کلکتہ پہونچ کر اپنے دل سے دوستوں کی جدائی کا غم بھلا بیٹھے ہیں۔ لیکن مومن خاں کہتے ہیں :-

مومن :- تا آب گشتہ ایم ز شرمِ نفاقِ خلق — گردے ز دامنِ دلِ احباب شستہ ایم

مومن خاں کا احساسِ غیرت و ایثار قابلِ ملاحظہ ہے کہ وہ دنیا کے نفاق کی وجہ سے شرم سے پانی پانی ہو کر اپنے احباب کے دل سے آپس کی کدورت دھو رہے ہیں

غالب :- راہیست کہ در دل فتد ار خوں رود از دل — ناید بزباں شکوہ و بیروں رود از دل،

شعر خوب ہے لیکن اب اسی قافیہ میں مومن کا مطلع بھی ملاحظہ فرمائیے :-

مومن :- گر دل ہمگی خوں شود و خوں رود از دل — مشکل کہ تمنائے تو بیروں رود از دل

کہتے ہیں کہ اگر غم سے دل خون ہو کر بھی بہ جائے تو بھی مشکل ہے کہ تیری تمنا دل سے دور ہو۔

اب کچھ اشعار نظیری نیشاپوری اور غالب کی اُن مسلسل غزلیات کے پیش کئے جانے جو تینوں شعرا نے ایک ہی زمین میں کہی ہیں۔ یہ غزل نظیری کی اُسوقت کی معلوم ہوتی ہے جب نظیری کا محبوب کسی اور کے عشق میں مبتلا ہے۔

نظیری، غالب اور مومن

نظیری :- چشمش براہے میرود مژگانِ نمناکش نگر — در سینہ دارد آتشے پیراہنِ چاکش نگر

شرم از میاں برخاستہ مہر از دہاں برداشتہ — گفتار بے ترسش ببیں رفتار بیباکش نگر

از کوئے معشوق آمدہ شوریدگاں در حلقہ اش — از صیدِ آہو میرسد شیراں بفتراکش نگر

غالب :- در گریہ از بس نازکی رخ ماندہ بر خاکش نگر — واں سینہ سودن از تپش بر خاک نمناکش نگر

ہر تے کہ جانہا سوختے دل از جفا سرخوش ببیں — شوخے کہ خونہا ریختے دست از حنا پاکش نگر

آں سینہ کز چشمِ جہاں مانندِ جاں بودے نہاں — اینک بہ پیراہن عیاں از روزنِ چاکش نگر

بر مقدمِ صید افگنی گوشے بر آوازش ببیں — در بازگشتِ توسنے چشمے بفتراکش نگر

مومن :- بسمل شدہ جلاد تر انداز بیباکش نگر — خورد آب پیکانِ بلا مژگانِ نمناکش نگر

خاکے بدل افتادہ ام در زلفِ عنبر بیز بیں — گردے بدل بنشستہ ام بر دامن پاکش نگر
شوخے کہ از نازو ادا نشنید احوال کسے — دادِ تظلّم میدہد افغان بیباکش نگر
اکنوں برائے بوالہوس صد زخمِ کاری میزند — آں دستِ نازک را ببیں پیراہن چاکش نگر

نظیرؔی ، غالبؔ ، مومنؔ ، تینوں ہی نے اپنے اپنے اشعار میں محبوب کی عاشقانہ بیتابی اور بے قراری کا اظہار کرتے ہوئے اپنا اپنا زور بیان اور کمال شاعری دکھایا ہے۔ لیکن نظیرؔی کے مطلع سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ جملہ اشعار معہ مطلع محبوب کیلئے مخصوص کردئے گئے ہیں۔ "گوش" کی ضمیر سے خیال اس طرف جاتا ہے لیکن واضح طور پر نہیں۔ غالبؔ نے اپنے مطلع میں لفظ ناز کی کہکر اس کمی کو پورا کردیا ہے، علیٰ ہذا مومنؔ خاں نے یہی لفظ "جلاد" مطلع میں کہکر جملہ اشعار کے مجموعی مفہوم پر پوری طرح روشنی ڈالدی ہے۔ ان قوافی کے علاوہ دوسرے قوافی بھی مومنؔ نے نظم کئے ہیں جو نظیرؔی کے یہاں تو نہیں ملتے البتہ غالبؔ کے یہاں ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں :-

غالبؔ :- برآستانِ دیگرے درشکرِ در بانش ببیں — درکوئے از خودکمتری در رشک خاشاکش نگر
خواند بہ امیدِ اثر اشعار غالب ہر سحر — از نکتہ چینی در گزر فرہنگ و ادراکش نگر

مومنؔ :- گرنیم نازے میکشد صد طعنہ برمن می زند — با بیخودیہائے جنوں در ہوش ادراکش نگر
درسجدہ آخر تا کجا نالیدن از دستِ صنم — مومن جبینے ہمچو گل مالیدہ بر خاکش نگر

پختگیِ بیان اور سلاستِ زبان کے اعتبار سے نظیرؔی ، غالبؔ ، مومنؔ تینوں کے اشعار کو اگر ملا دیا جائے تو ذرہ برابر فرق معلوم نہیں ہوتا کہ ایرانی شاعر کے کون سے اشعار ہیں ہندوستانی شعرا کے کون سے ہیں۔

ایک اور زمین ہے جس میں عبدالرحیم خانخاناں اور نظیرؔی دونوں کا مقابلہ شبلؔی نے شعر العجم میں کیا ہے یہ امر مسلّم ہے خانخاناں کی غزل اپنی کیفیت تغزل کے لحاظ سے اپنا جواب خود آپ ہے، بیشک نظیرؔی کا کوئی شعر ایسا نہیں جو خانخاناں کی غزل کے ساتھ پڑھا جاسکے۔ اسی زمین میں غالبؔ اور مومنؔ کی بھی غزلیات ہیں، خانخاناں کی غزل کو چھوڑکر باقی تین شعرا کے ہم قافیہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں صاحبانِ ذوق و نظر خود فیصلہ کریں کہ نظیرؔی اور غالبؔ نے کیا کہا ہے اور مومنؔ خاں نے انھیں قوافی کو کس طرح نظم کیا ہے

نظیرؔی :- درازدستیِ حُسن کہ گل بہ چشمم ریخت — کہ تا بدامنم از جیب در شکر خند ست
غالبؔ :- نگاہِ مہر بدل سرندادہ چشمۂ نوش — ہنوز عیش باندازۂ شکر خند ست

نظیرؔی کہتا ہے کہ حُسن کی دراز دستی نے وہ پھول کھلادئے ہیں یعنے (آنکھوں میں وہ اشک خونی پیدا کردئے ہیں) کہ جن کی وجہ سے جیب سے لیکر دامن تک مسکراہٹ ہی مسکراہٹ ہے۔ شکر خند کے معنے تبسم اور ہنسی کے ہیں، اس لئے چاک جیب کو بھی شکر خند یعنے مسکراہٹ ہی کہا گیا ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ مجھے باوجود محبوب کے التفات کے کمل مسرت میسر نہیں ہے اور میرا ابھی عیش تبسم تک محدود ہے۔

اب اسی قافیہ میں مومنؔ خاں کہتے ہیں :-

بہ تلخکامیِ من ذوقِ وصل گریاں باد — دمے کہ زہر چکانم لب شکر خند ست

مفہوم کی ندرت کے ساتھ ساتھ مومنؔ کے شعر میں جو تغزل پایا جاتا ہے وہ نظیرؔی اور غالبؔ دونوں کے اشعار کے تغزل سے مرجح حیثیت رکھتا ہے۔ ذرا پیوند کا قافیہ بھی ملاحظہ ہو:-

نظیرؔی :- [illegible] اہلِ غرض قرب بعد مانندست — دلِ شکستۂ مارا ہزار پیوند است

غالب :- دراز دستیِ من چاکِ ارفگند چہ عیب　　زبیش دلق ورع با ہزار پیوند است
مومن :- بصلح آمدہ شوق وصال میکشدم　　شکستہ آہ ولے راکہ دیر پیوند است

نیاز صاحب نظیری کے شعر کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں نظیری کے شعر کا پہلا مصرعہ اُلجھا ہوا ہے۔ میرے خیال میں پہلا مصرعہ ہی نہیں بلکہ پورا شعر اُلجھا ہوا ہے، غالب نے بھی دوسرے مصرعہ میں "چہ عیب" کہکر عیب نہ ہونے کی کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ اگر نظیری کے دوسرے مصرعہ میں دل کو ہزار پیوند کہا گیا ہے تو غالب نے دلق کو ہزار پیوند کہدیا لیکن دونوں نے کوئی بات پیدا نہیں کی۔ مومن خاں کے شعر کا دوسرا مصرعہ اپنی معنویت کے اعتبار سے پورے شعر کے مفہوم کا حامل ہے۔

نظیری :- نظیری از تو بجاں کندن است لب بکشائے　　بایں قدر کہ بگوئی بمیر خرسند ست

نظیری حالتِ نزع میں اپنے محبوب کی زبان سے یہ سننے کا آرزو مند ہے کہ "بمیر" اگر محبوب اُس سے کہدے کہ مرجا تو مراد پوری ہوجائے۔ غالب[1] نے شعر میں اپنی خودداری کا ثبوت دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ غالب وہ نہیں کہ دنیا سے وفا کا طالب ہو وہ دنیا کا احسان لینا نہیں چاہتے بلکہ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ اگر کوئی غالب کا حال پوچھے اور جواب میں صرف یہ کہدیا جائے کہ وہ ہے، کافی ہے اور اس پر وہ خوش ہے ---------

--------- نظیری کے یہاں آرزومند کا قافیہ نہیں ہے۔ غالب اور خانخاناں کے یہاں یہ قافیہ ہے اور خوب ہے۔

خانخاناں :- شمارِ شوق ندانستہ ام کہ تا چند ست　　جُز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومند ست
غالب :- زبیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی　　نگوید، ارچہ بمرگ من آرزومند ست

مومن خاں بھی آرزومند کے قافیہ میں کہتے ہیں :-

خوش است جور تواے چرخ لذتے بردم　　بقہر نیز کہ نادیدہ آرزومند ست

پند کا قافیہ خانخاناں اور نظیری دونوں کے یہاں نہیں ہے غالب کے یہاں البتہ ہے کہتے ہیں :-

غالب :- نگفتۂ کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر،　　برو کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند ست

دوسرے مصرعہ کا بے ساختہ پن خوب ہے۔ لیکن مومن کو جو پند سے تنفر ہے وہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔

مومن :- چناں زحرفِ نصیحت گراں ملول شدم　　کہ نشنوم زلبِ یار ہم اگر پند ست

اب کچھ وہ اشعار مومن اور غالب اور حافظ کے پیش کئے جاتے ہیں جو ہم طرح اور ہم قافیہ ہیں۔

حافظ :- ساقیا برخیز و در دہ جام را　　خاک بر سر کن غمِ ایام را
غالب :- در دل تست آنچہ برمن میرود　　می شناسم سختیٔ ایام را
مومن :- از کفِ دشمن گرفتم جام را　　می شناسم گردشِ ایام را
حافظ :- محرمِ رازِ دلِ شیدائے من،　　کس نمی بینم ز خاص و عام را
غالب :- رحمتِ عام است دائم خاص و عام　　عشرتِ خاص است ہردم عام را
مومن :- بے کسی بنگر کہ بر تابوتِ من　　چشم گریان ست خاص و عام را
حافظ :- صبر کن حافظ بسختی استوار،　　عاقبت روزے بیابی کام را
غالب :- بسکہ ایمانم بہ غیب است استوار　　از دہانِ دوست خواہم کام را

لہ غالب کا [illegible]

ن :- کام دلرویش ندیدیم در جہاں ، از جہاں رفتم کہ جویم کام را

ایک دوسری غزل کے کچھ اشعار حافظ اور مومن کے ملاحظہ ہوں :-

ظ :- آں چناں در ہوائے خاک درش / میرود آب دیدہ ام کہ مپرس

ن :- بر جگر تیر خوردہ نخچیرم ، / نگہے از تو دیدہ ام کہ مپرس

ظ :- گشتہ ام در جہان و آخر کار / دلبرے برگزیدہ ام کہ مپرس

ن :- جائے مانیز نیست از تنگی ، / خلوتے برگزیدہ ام کہ مپرس

افظ :- من بگوشِ خود از دہانش دوش / سخنہائے شنیدہ ام کہ مپرس

من :- من بکویت نبودم و از غیر ، / ماجرائے شنیدہ ام کہ مپرس

افظ :- ہمچو حافظ غریب در رہِ عشق / بمقامے رسیدہ ام کہ مپرس

ومن :- بے تو از حال من چہ می پرسی / ہاں بجائے رسیدہ ام کہ مپرس

جوہر ٹونکی

ایک دل کے دو آدمی

کلیفورنیا یونیورسٹی کے سائنس داں اس بات میں کامیاب ہو گئے کہ دو مختلف آدمیوں کے دلوں کو ایک ہی شریان سے وابستہ کردیں اور اس طرح ایک ہی دل سے دونوں میں دوران خون کا کام لیا جائے اس طریقہ کو وہ Cross Circulation (متقاطع دوران خون) کہتے ہیں۔

ہر چند یہ تجربہ ابھی ابتدائی دور میں ہے لیکن توقع کی جاتی ہے کہ اگر اس میں خاطر خواہ کامیابی ہو گئی تو وہ بعض ناقابل علاج امراض کا علاج کر سکیں گے۔

دو آدمیوں کے شریانوں کو آپس میں جوڑ دینے سے دورانِ خون کا نظام دونوں جسموں میں ایک ہو جاتا ہے اور اس طرح یہ بات ممکن ہو گئی ہے کہ کسی قلب، پھیپھڑے، یا گردہ کے مریض کی شریان تندرست آدمی کے شریان میں جوڑ دی جائے اور اس طرح تندرست انسان کا خون مریض انسان کے جسم میں بھی پہونچتا رہے۔

یہ خیال سیام کے ان دو توام بچوں کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا جن کے دل باہم گر ایک ہی شریان سے کام کر رہے تھے۔

زہریلی عورتیں

شعر و شاعری اور حسن و عشق کی دنیا میں تو کوئی عورت ایسی نہیں جو زہریلی نہ ہو لیکن یوں حقیقی معنی میں کسی عورت کو زہریلی کہنا شاید مبالغہ سمجھا جائے - میرا موضوع سخن اس وقت عشق و شاعری سے بالکل علٰحدہ ہے اس لئے میں جن زہریلی عورتوں کا ذکر کر رہا ہوں وہ تکلف برطرف واقعی زہریلی تھیں اور انسان کو بالکل اُسی طرح ہلاک کرسکتی تھیں جس طرح ایک افعی اپنی پھنکار سے کسی کو ہلاک کرسکتا ہے -

دنیا میں دشمن کو زہر دیکر ہلاک کرنے کا رواج کب سے شروع ہوا اور اس غرض کے لئے اس نے کیسے کیسے زہر ایجاد کئے اس کا صحیح علم ہم کو حاصل نہیں لیکن روایات سے ہم کو اس کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ زہر خورانی کے دوسرے معمولی طریقوں کے علاوہ ایک نہایت عجیب و غریب ذریعہ اور بھی ہندوستان میں ایجاد کیا گیا، جسے "وش کنیا" (زہریلی عورت) کہتے تھے اور آج کی صحبت میں ہم بعض انھیں زہریلی عورتوں کا ذکر کرتے ہیں -

(۱)

جب ۳۲۳ سنہ قبل مسیح، سکندر نے پنجاب پر حملہ کیا تو یہاں متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستیں قایم تھیں - ہرچند وہاں کے راجہ اکثر و بیشتر بہت کمزور تھے اور وہ سکندر کے سامنے تاب مقاومت نہ لاسکتے تھے، لیکن ان کی غیرت گوارا نہ کرتی تھی کہ وہ اپنے ملک میں کسی اجنبی کا درخور گوارا کریں، چنانچہ انھوں نے سکندر کا خطرہ دور کرنے کے لئے جہاں اور بہت سی تدابیر اختیار کیں، ان میں ایک تدبیر یہ بھی تھی کہ سکندر کو زہر سے ہلاک کردیا جائے - اس کی صورت انھوں نے یہ تجویز کی کہ اظہار اطاعت میں سکندر کو جہاں اور بہت سے قیمتی تحفے روانہ کئے تو انھیں کے ساتھ پانچ خوبصورت لڑکیاں بھی پیش کیں اُن میں خصوصیت کے ساتھ ایک لڑکی بہت حسین تھی - یہ سکندر کے دربار میں اس شان کے ساتھ پہونچی کہ بربط اس کے ہاتھ میں تھا اور ہندوستان کے دلکش ترین نغمے اس کی زبان پر - سکندر اسے دیکھ کر از خود رفتہ ہوگیا اور آغوش میں لینے کی خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی - ارسطو (سکندر کا استاد) بھی دربار میں موجود تھا اور وہ محفل کا یہ رنگ دیکھ رہا تھا - اس نے سکندر کی اس خواہش کی مخالفت کی اور سکندر سے کہا "ذرا ٹھہرو" اور یہ کہکر اُس نے دو غلاموں کو حکم دیا کہ وہ بڑھ کر اس لڑکی کا منہ چوم لیں، چنانچہ غلام آگے بڑھے، لیکن جیسے ہی اس کے ہونٹ لڑکی کے ہونٹ سے ملے، وہ معاً زمین پر گرکر مرگئے - اس کے بعد کچھ گھوڑے اور کتے اُس خوبصورت بلا کے سامنے لائے گئے اور اس سے کہا گیا کہ ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرے اور اس کا نتیجہ بھی یہی ہوا کہ گھوڑے اور کتے فوراً مرگئے -

سکندر یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا، اور اس نے ارسطو سے پوچھا کہ "یہ کیا ماجرا ہے" - ارسطو نے کہا کہ یہ لڑکی جس کو تم اپنی آغوش میں لینا چاہتے تھے ان لڑکیوں میں سے ہے جنھیں بچپن سے زہر کھلا کھلا کر پالا جاتا ہے اور آخر میں وہ مجسم زہر ہوکر رہ جاتی ہیں، اگر مجھے ہندوستانی راجاؤں اور حکیموں کی ان ترکیبوں کا علم نہ ہوتا تو اس نے یقیناً تجھے مار ڈالا ہوتا -

اس کے کچھ عرصہ بعد ارسطو اپنے وطن یونان واپس چلا گیا لیکن وہ پھر بھی خطوں کے ذریعہ سے سکندر کو ہدایت

تاکہ وہ ان زہریلی لڑکیوں سے ہوشیار رہے اور کبھی کسی ایک حکیم کی دوا استعمال نہ کرے بلکہ متعدد حکیموں سے مشورہ کرے

سکندر اور ارسطو کی یہ مراسلت پرانے زمانہ میں بہت مشہور تھی۔ اور خلیفہ المامون نے (تقریباً ۸۳۰ء میں) ایک سریانی عالم یحیٰی ابن بطریق کے ذریعہ سے اس کا پتہ چلاکر ان خطوں کا ترجمہ (جو غالباً یونانی زبان میں تھے) عربی میں کرایا۔ عربی ترجمہ کا نام "سرالاسرار" ہے جس کے مقدمہ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ نادر خطوط معبد شمس میں دستیاب ہوئے جو اسقلابیوس[1] سے منسوب تھا۔

سکندر اور ارسطو کے ان خطوط کا ترجمہ سریانی اور عربی کے علاوہ عبرانی، لاطینی (ہسپانوی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی موجود ہے لیکن ان ترجموں میں کافی اختلاف ہے اور بعض محققین ان خطوط کو ارسطو سے منسوب نہیں کرتے۔ کیونکہ قرون وسطیٰ میں بہت سے لوگوں نے ارسطو کے نام سے فرضی کتابیں لکھیں تھیں، بہرحال یہ خطوط ارسطو کے ہوں یا کسی اور کے، ان میں ان زہریلی عورتوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔

(۲)

سکندر کے حملے سے کچھ زمانہ قبل مگدھ میں ایک طاقتور راجہ مہاپدم نند راج کرتا تھا۔ اُس نے کسی بات پر ناراض ہوکر اپنے سپہ سالار چندرگپت موریا کو (جو موریہ خاندان کے چھتری گھرانے سے تعلق رکھتا تھا)[2] جلاوطن کردیا۔ اس کے بعد اُس نے ایک برہمن کو جو بعض مذہبی رسوم کی ادائی کے سلسلہ میں لایا گیا تھا، محض اس لئے باہر نکلوا دیا کہ وہ سیاہ فام اور بدصورت تھا۔

اس برہمن کا نام چانکیا تھا (اُسے کوٹلیا اور وشنوگپت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) وہ ٹکشلا کی یونیورسٹی میں سیاسیات کا صدر معلم تھا اور اُس کی کتاب "کوٹلیہ ارتھ شاستر" بہت مشہور ہے۔

چانکیا کو یہ توہین بڑی شاق گزری اور اُس نے مجمع عام میں اپنی چوٹی کھول کر عہد کیا کہ جب تک اس راج کو بیخ وبن سے نہ اُکھاڑ پھینکوں گا اپنی چوٹی میں گرہ نہ لگاؤں گا اور یہ کہکر وہ دربار سے نکل گیا۔

ایک دن وہ کہیں جارہا تھا کہ اُس کے پاؤں میں خس کے پودھے کا ایک تنکا چبھ گیا۔ اس پر اُسے اس قدر غصہ آیا کہ وہیں بیٹھ کر اُسے کھودنے لگا اور پھر کہیں سے مٹھا لاکر اُس کی جڑوں میں ڈالا تاکہ وہ دوبارہ نہ اُگے۔ اتفاق سے اسی وقت چندرگپت کا ادھر سے گزر ہوا۔ اُس نے چانکیا کے اس کا جذبۂ انتقام اور اس کی مستقل مزاجی دیکھ کر اس سے دوستی کرلی اور چونکہ دونوں کا مقصد نند خاندان کو ختم کردینا تھا اس لئے یہ دوستی بہت زیادہ گہری ہوگئی۔

جب سکندر نے پنجاب پر حملہ کیا تو چندرگپت اُس سے جاکر ملا اور اُسے مگدھ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی لیکن سکندر کی فوجیں تھکی ہوئی تھیں، اُنھوں نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔

سکندر کی وفات کے بعد جب پنجاب میں یونانی حکومت کی گرفت ڈھیلی پڑگئی تو چندرگپت نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھاکر یونانیوں کو ملک سے نکال باہر کیا اور پنجاب میں اپنی حکومت قایم کرلی۔ اس کے بعد اُس نے اپنے ساتھ ہمالیہ کے راجہ پروتک کو ملاکر مگدھ پر حملہ کیا اور راجہ نند مارا گیا یہ ۳۲۱ سال قبل مسیح کا واقعہ ہے۔

جب چندرگپت اور پروتک راجہ نند کے خزانے میں دولت کو اپنے درمیان تقسیم کررہے تھے تو اُنھیں ایک خوبصورت

---

[1] قدیم یونانیوں میں طب کا دیوتا — [2] بعض کا خیال ہے کہ وہ مگدھ کے راجہ نند کی ایک معمولی ذات کی داشتہ عورت مُرا کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اسی لئے موریا کے لقب سے مشہور ہوگیا۔

دوشیزہ نظر آئی - پرونک اُسے دیکھتے ہی عاشق ہوگیا اور چندر گپت کی اجازت سے دونوں کی شادی طے ہوگئی - جب پرونک اُس خوبصورت دوشیزہ کے ساتھ شادی کی رسوم کے سلسلہ میں (ہَوَن کُنڈ) کا طواف کر رہا تھا تو دونوں کو پسینہ آگیا لیکن جونہی اس دوشیزہ کے جسم کا پسینہ پرونک کے جسم سے لگا وہ زمین پر گر پڑا اور مرگیا - یہ عورت بھی در اصل "وش کنیا" تھی جس کے ذریعہ سے وہ چندر گپت کو ہلاک کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنی خوش اقبالی سے بچ گیا اور پرونک کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا -

ان واقعات کا وشاکھ دت نے اپنے ناٹک "مدرا راکشش" میں ذکر کیا ہے جو ساتویں صدی کی تالیف ہے۔[۱]

(۴)

وشاکھ دت کے مدرا راکشش کے علاوہ سوم دیو کے "کتھا سرت ساگر" (زمانۂ تالیف تقریباً سنہ ۱۰۷۰ء) میں بھی "وش کنیا" کا ذکر پایا جاتا ہے - اُس میں راجہ برہما دت کے وزیر یوگ کرنڈک کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ "اُس نے راستہ کے کنارے درختوں بیلوں، سبزہ اور پانی کو زہر اور دوسری مضر اشیاء سے سم آلود کرنے کے علاوہ وش کنیاؤں کو بھی دشمن کی فوج میں بھیجا تھا -

وش کنیا کس طرح طیار کی جاتی تھی - ارسطو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس لڑکی کو وش کنیا بنانا مقصود ہوتا تھا اُسے بچپن سے تھوڑا تھوڑا زہر کھلایا جاتا تھا - یہاں تک کہ جب وہ سنِ بلوغ کو پہونچتی تو وہ سر سے پاؤں تک زہر ہی زہر ہوتی تھی -

قزوینی کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے - وہ لکھتا ہے کہ "ہندوستان کے عجائبات میں ایک سردھا البیش ہے جو بڑا قاتل زہر ہے - یہاں کے فرمانرواؤں کے یہاں دستور ہے کہ وہ کسی خوبصورت نوزائیدہ بچی کے گہوارہ کے نیچے اس پودے کی پتیاں کو عرصے کے لئے بچھا دیتے ہیں - پھر گدّے کے نیچے اور اُس کے کپڑوں کے نیچے - اُس کے بعد پودے کو دودھ میں ملا کر پلایا جاتا ہے - یہاں تک کہ وہ لڑکی اُسے بے خطر کھانے لگتی ہے - اس لڑکی کو وہ دیگر تحائف کے ساتھ اُس بادشاہ کے پاس بھیجتے ہیں جسے وہ ہلاک کرنا چاہتے ہیں اور جب وہ اُس لڑکی سے مواصلت کرتا ہے تو مرجاتا ہے -

اگر ایک آدمی تھوڑا تھوڑا کرکے زہر کھانا شروع کرے اور اُس کی مقدار بڑھاتا جائے تو اُسکے جسم میں کس قدر سمیت پیدا ہوجائے گی اس پر محمود شاہ والی گجرات (زمانہ تقریباً سنہ ۱۵۰۰ء) کے حالات سے روشنی پڑتی ہے اُس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اُس کے والد نے اُسے بچپن سے تھوڑا تھوڑا زہر کھلانا شروع کیا تاکہ اگر اُسے کوئی زہر دے تو اثر نہ ہو یہاں تک کہ جب وہ جوان ہوا تو اس میں اس قدر سمیت پیدا ہوگئی تھی کہ اُس کے جسم پر مکھی بھی بیٹھتی تو فوراً مرجاتی، اُس کے اُتارے ہوئے کپڑوں کو کوئی شخص خوف سے ہاتھ نہ لگاتا، ہر وہ عورت جس کے ساتھ وہ شب بسر کرتا صبح کو مردہ پائی جاتی -

ان واقعات کو متعدد مغربی سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں لکھا ہے - (جن میں وارتھیما اور باربوسا کے نام قابلِ ذکر ہیں) - زہر کو نشہ یا طاقت کے لئے کھانا کوئی عجیب بات نہیں آج بھی ہندوستان کے بہت سے لوگ زہر کھاتے ہیں - یہ زہر تین صورتوں میں حاصل کئے جاتے ہیں - جمادات سے جیسے سنکھیا[۱] (سم الفار)، نباتات سے جیسے افیون اور دھتورا[۲] اور حیوانات سے جیسے بچھو کا ڈنک اور سانپ کا زہر[۳] زہر، زہر کا توڑ ہے جو لوگ افیون کھاتے ہیں اُن پر سانپ کے کاٹے کا اثر نہیں ہوتا یا کم ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا زہر کے مسلسل استعمال سے انسان کے جسم میں اس قدر سمیت پیدا ہوجائے گی، اُس کی سانس، اُس کا پسینہ، اُس کا لعابِ دہن وغیرہ سب سم قاتل بن جائیں، اس کی بابت یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن متذکرۂ بالا روایات سے ضرور اسکی تصدیق ہوتی ہے - **محمد اسحٰق صدیقی**

---

۱ پہلے کسی پتھر پر سنکھیا سے ایک چھوٹی سی لکیر کھینچتے ہیں جسے زبان سے چاٹتے ہیں یا پانی سے دھو کر پیتے ہیں - یہ چھوٹی لکیر دن بدن بڑھائی جاتی ہے پھر اسکے بعد دوسری اور تیسری اور چوتھی لکیروں کی باری آتی ہے — ۲ جو لوگ تیز بھنگ پینے کے عادی ہیں وہ اُس میں دھتورے کے بیج شامل کر لیتے ہیں -

۳ بعض آدمیوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ بچھو کو پکڑ کر اُس کی دم اپنی زبان کی نوک کے مقابل لاتے ہیں اور جب وہ ڈنک مار دیتا ہے تو اُنھیں تسلی ہوجاتی ہے - اسی طرح بعض اپنے کو سانپ سے ڈسوا کر فرحت محسوس کرتے ہیں -

کچھ داغ کے متعلق

جناب عرشی کا یہ مقالہ مارچ کے خاور میں شایع ہوا ہے، اگر عرشی صاحب یہ مقالہ داغ نمبر کی اشاعت سے قبل طیار کرسکتے تو وہ یقیناً نگار ہی میں شایع ہوتا، اس لئے ہم اسے نگار ہی کی ملکیت سمجھتے ہیں اور عرشی و خاور دونوں کے ممنون ہیں۔ اس مقالہ کے ابتدائی حصہ میں عرشی صاحب نے ایک فہرست تمام ان کتابوں اور تذکروں کی دیدی ہے جن سے داغ پر کام کرنے والوں کے لئے مدد لی جاسکتی ہے، اس حصہ کو حذف کرکے ہم اصل مضمون شایع کرتے ہیں، جس کی اہمیت کا اندازہ ہر شخص کرسکتا ہے۔

نیاز

خاندان

داغ کے والد کا نام سب سے پہلے امیر مینائی نے اور والدہ کا نام نساخ نے بتایا ہے۔ والد نواب شمس الدین احمد خاں بہادر والیِ فیروز پور جھرکہ نواب احمد بخش بہادر کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کی تاریخ وفات ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء ۱۲۵۱ھ ہے انھیں ۲۵ سال کی عمر میں دہلی کے ریزیڈنٹ ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں پھانسی دی گئی تھی۔

مولانا مہر نے غالب (صفحہ ۵۴) میں لکھا ہے کہ "شمس الدین احمد خاں کے نرینہ اولاد نہ تھی، صرف لڑکیاں تھیں جنکی شادیاں بعد میں ہوئیں"۔ یہ بیان اس حد تک تو درست ہے کہ ان کی بیاہتا بیوی سے کوئی لڑکا نہ تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ ان کے نرینہ اولاد سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ داغ کا شمس الدین خاں کے نطفے سے ہونا ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ داغ کی نظر میں ان کے قانونی اولاد ہونے کی حیثیت مشتبہ ہو، جس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ نواب کی ریاست کی ضبطی کے خلاف انکی بیاہتا بیگم نے بیٹیوں کی طرف سے چارہ جوئی کی۔ لیکن داغ کی والدہ کی طرف سے اس قسم کی کوئی سعی نظر نہیں آتی۔

داغ کی والدہ محمد یوسف سادہ کار کشمیری کی بیٹی تھی۔ مالک رام صاحب نے اس کا نام وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم بتایا ہے اور اسے اپنے باپ کی منجھلی بیٹی قرار دیا ہے۔ اسکے کشمیری الاصل ہونے کا ثبوت خود اس کی تحریر سے ملتا ہے، جو اس نے ۶ رجب ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۲ دسمبر ۱۸۶۴ء کو نواب یوسف علی بہادر فردوس مکان والی رام پور کو مبارکباد صحت کے سلسلہ میں لکھی تھی۔ اس میں وہ لکھتی ہیں:-

"از خارج استعفا نمودہ کہ عزم ملازمان حضور در موسم بہار برائے سیر و تفریح حضرت کشمیر جنت نظیر کہ وطن اصلی بزرگان ماست، تقرر یافتہ"

لیکن اس کا منجھلی ہونا ثبوت طلب ہے۔ اس لئے کہ خود چھوٹی بیگم کی عرفیت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنے باپ کی اولاد میں سب سے چھوٹی ہو۔

داغ کے سوانح نگاروں نے ان کی والدہ کو ولی عہد بہادر کی طرف سے مخاطب بہ "نواب شوکت محل صاحبہ" بتایا ہے۔ لیکن محولۂ بالا خط اور ایک اور خط کے آخر میں مہر ثبت ہے، جس میں "چھوٹی بیگم، ۱۲۷۴" منقوش ہے، خود چھوٹی بیگم نے نواب فردوس مکاں کو ۵ اگست ۱۸۵۵ء کو جو عرضی بھیجی تھی اس کے آخر میں بھی اپنا نام چھوٹی بیگم ہی لکھا ہے، اس کے چند دن بعد ۲۰ محرم ۱۲۷۲ھ ۲ اکتوبر ۱۸۵۵ء کو داغ کی خالہ عمدہ خانم نے عرضی بھیجی تو اس میں بھی یہی لکھا، چونکہ اس نے ولی عہد کی زندگی میں اپنا نام چھوٹی بیگم ہی لکھا اور ان کے انتقال کے بعد وہ مہر استعمال کی جو داغ کے والد کی زندگی میں کھودی گئی تھی، اس سے ولی عہد کی طرف سے "شوکت محل" خطاب پانا محل نظر قرار پاتا ہے۔

چھوٹی بیگم کی صحیح تاریخ انتقال کا ابھی تک پتہ نہ چل سکا۔ لیکن نواب خلد آشیاں کا ایک فرمان مورخہ ۱۰ شعبان ۱۲۹۶ھ

(۷ راگست ۱۸۸۸ء) محفوظ ہے جو داغ کی عرضی کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ اس میں نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"عرضی ایشان مشعرِ حالِ انتقالِ والدۂ ایشان باستدعای مبلغ دوصد روپیہ بہ ضرورت مصارف بلاحظہ گزشت و بردریافت انتقالِ والدۂ ایشان نہایت رنج و افسوس گردید۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبان ۱۳۰۵ھ کی ابتدائی تاریخوں میں سے کسی ایک میں ان کا انتقال ہوا تھا۔

نواب فردوس مکاں کے قیام دہلی کے زمانے سے چھوٹی بیگم کی بہن عمدہ خانم کو نواب صاحب سے توسل حاصل تھا اور اسی سلسلہ سے عمدہ خانم اور داغ اپنی ملازمت سے قبل رام پور آتے رہے تھے۔ لیکن خود چھوٹی بیگم کے آنے کا دستاویزی ثبوت نواب خلد آشیاں کے عہد میں ملتا ہے، داغ نواب صاحب کو دہلی سے یکم جولائی ۱۸۸۸ء کو لکھتے ہیں۔

"جناب خالہ صاحبہ سے ملا انھوں نے حضور کی صحت کے واسطے گود پھیلا کر دعا مانگی۔ عجیب حال ان کا دیکھا کہ چراغِ سحری پایا۔ حضور کی طرف سے حسب ہدایت سلام کہا۔ بہت دعائیں دیں۔ کہا کہ چونکہ تمھاری والدہ وہاں گئی تھیں، مشرف ملازمت سے نہ ہوئیں اور اس صدمے میں مرگئیں۔ اس لحاظ سے میں اس حالتِ ضعف میں بھی گو ہزار بار قصد کیا۔ نہ حاضر ہوسکی" (انشائے داغ)

داغ کے علاوہ چھوٹی بیگم کے دو بیٹے اور ایک بیٹی اور تھی۔ چونکہ یہ سب الگ الگ باپوں سے تھے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی تاریخہائے ولادت کا ذکر کیا جائے۔ تاکہ اس سے چھوٹی بیگم کے مختلف ازدواجی تعلقات پر روشنی پڑ سکے۔

(۱) داغ کی تاریخ پیدائش ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء (۱۲ ذیحجہ ۱۲۴۶ھ) ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم آغاز ۱۲۴۶ھ سے چھوٹی بیگم نواب شمس الدین خاں کے گھر میں تھیں۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ داغ اس کے پہلوٹی کے بیٹے تھے اور اس کی عمر ولادتِ داغ کے وقت ۱۶ برس کی تھی، تو اس کا سالِ ولادت تقریباً ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء) ہوگا۔

(۲) چھوٹی بیگم کے دوسرے بیٹے آغا مرزا شاغل ہیں، جو آغا تراب علی کی صلب سے پیدا ہوئے تھے۔ امیر مینائی نے ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں انھیں ۳۳ برس کا بتایا ہے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاغل کا سالِ ولادت ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۱ء) ہے چونکہ شمس الدین خاں نے ۱۸۳۵ء (۱۲۵۱ھ) میں پھانسی پائی تھی۔ اس لئے چھوٹی بیگم کو آغا صاحب کے گھر میں اس سنہ کے بعد اور ۱۲۵۶ھ سے پہلے داخل ہونا چاہئے۔ مولانا احسن مارہروی مرحوم نے انشائے داغ (صفحہ ۱۱۱) میں شاغل کو سہواً داغ کا علاتی بھائی لکھ دیا ہے، یہ علاتی نہیں، اخیافی بھائی تھے۔

(۳) چھوٹی بیگم کے تیسرے بیٹے مرزا خورشید عالم ہیں۔ جو ولی عہد مرزا فخرو کی صلب سے تھے۔ ان کا سالِ ولادت یقینی طور پر ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) ہے، اس لئے کہ ان کا نام تاریخی رکھا گیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۱ء) اور ۱۲۶۰ھ کے درمیانی سال میں چھوٹی بیگم ولی عہد کے محل میں پہونچی تھی۔

(۴) چھوٹی بیگم کی چوتھی اولاد بادشاہ بیگم خفی تخلص ہے، جو کسی بلاک نامی انگریز سے پیدا ہوئی تھی۔ اس کا سالِ ولادت

---

۵ صدیق مکرم مالک رام صاحب نے اپنے مضمون تلامذۂ غالب (اردو ادب ج ۲ نمبر ۱ صفحہ ۹۹ حاشیہ نمبر ۱) میں انھیں خورشید عالم سے چھوٹا بتایا ہے یہ درست نہیں اس لئے کہ عمدہ خانم نے ۲۰ محرم ۱۲۷۲ھ (۲ اکتوبر ۱۸۵۵ء) کو جو عرضی نواب فردوس مکاں کی خدمت میں لکھی تھی، اس میں یہ بھی تحریر ہے کہ فدوی بمند نواب مرزا و امیر مرزا و آغا مرزا و خانم صاحبہ و چھوٹی بیگم بخدمت عالی ماوجب می رسانند۔" یہ عرضی ولی عہد کی زندگی میں لکھی گئی تھی، آغا تراب علی سے تعلق ولی عہد کے انتقال کے بعد ہوا ہوتا، تو آغا مرزا کو ابھی پیدا ہونے میں دیر تھی —— ۶ احتمال یہ بھی ہے کہ وہ داغ سے بڑی ہو، جیسا کہ صدیق مکرم مالک رام صاحب نے اپنے مضمون مذکورہ میں ذکر کیا ہے مگر اس میں مجھے یوں شبہ ہے کہ ۱۲۷۳ھ میں رنگین نے اس کا ذکر ایک جوان اور خوبصورت فروش کے انداز سے کیا ہے ۱۲۴۶ھ (سال ولادت داغ) سے پہلے کی پیدائش ہوتی، تو ۱۲۷۳ھ میں اس کی عمر کم از کم ۳۵ اور ۴۰ کے درمیان ہونا چاہئے تھی۔ جو اس جیسی عورت کے لئے حسن کے زوال کا زمانہ ہے۔

معلوم نہیں۔ تاریخ میرٹھی نے ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) اس کو شعر گو کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سنہ مذکور میں وہ جوان تھی۔ چھوٹی بیگم ۱۲۴۶ھ سے ۱۲۵۲ھ تک شمس الدین خاں سے، تقریباً ۱۲۵۶ھ سے ۱۲۶۰ھ تک آغا تراب علی سے اور ۱۲۶۰ھ سے ۱۲۷۰ھ تک ولی عہد سے وابستہ رہی تھی۔ اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ یا تو ۱۲۵۲ھ اور ۱۲۵۶ھ کے درمیان یا ۱۲۵۶ھ اور ۱۲۶۰ھ کے درمیان ان کا تعلق بلاک سے ہوا۔ جس کا نتیجہ بادشاہ بیگم تھی، لہٰذا اسے انھیں دو مدتوں میں سے کسی ایک میں پیدا ہونا چاہئے۔

خفی اپنے مذکورۂ بالا تینوں بھائیوں کی طرح صاحب کمال اور شاعرہ تھی اس نے ۱۳۱۰ھ (۹۳-۱۸۹۲ء) میں اپنے نعتیہ کلام کا ایک مجموعہ طبع کرایا تھا۔ داغ نے اس کا قطعۂ تاریخ طباعت لکھا تھا جو اس کے دیوان میں چھپ چکا ہے اس کے یہ دو شعر قابل لحاظ ہیں:-

واہ عصمت مآب کیا کہنا کیا ہی اچھی کہی ہے نعت نبی

طبع دیوان کا سال تو لے داغ کہدے "مطبوع عشق پاک نبی"

داغ نے ۲۰ مئی ۱۹۰۴ء کو ایک خط حیدر آباد سے ادیبا بیگم کے نام دہلی بھیجا تھا، اس سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بادشاہ بیگم جے پور میں تھی اور بیمار تھی۔ (انشائے داغ صفحہ ۴۴) لیکن سال وفات کا ابھی تک علم نہیں ہوا ہے۔

میں نے عمدہ خانم کی ایک عرضی مورخہ ۲۰ محرم ۱۸۷۲ء کا اقتباس پچھلے ایک حاشیہ میں دیا ہے۔ اس میں نواب مرزا، امیر مرزا، اور آغا مرزا، تین نام آئے ہیں۔ ان میں سے دو' نواب مرزا داغ اور آغا مرزا شاغل کا ذکر چھوٹی بیگم کی اولاد کی حیثیت سے گزر چکا۔ یہ تیسرا نام "امیر مرزا" قابلِ غور ہے۔ چونکہ یہ نام نواب مرزا اور آغا مرزا کے جوڑ کا ہے، اس سے مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ بھی داغ کے بھائیوں میں داخل ہے۔ اتفاق سے اس کی ایک عرضی مورخہ ۲۷ اگست ۱۸۶۸ء بنام نواب خلد آشیاں کتاب خانے میں دستیاب ہوئی۔ اس میں وہ لکھتا ہے:- "میلۂ باغ بے نظیر پر قصد حاضری کیا تھا۔ مگر بچند وجوہ معذور رہا۔ اول میرے توہمات مانعِ راہ ہوئے۔ دویم بیماری برخوردار سے پریشانی رہی۔ ورنہ قدم بوسی حاصل کرتا ــــ ایک مہینہ گزرتا ہے جو بھائی صاحب یعنی نواب مرزا خاں داغ نے مطلق خط نہیں لکھا کمال تشویش ہے واللہ عالم کیا بات ہے۔ امیدوار ہوں کہ پیشگاہِ حضور سے ان کو ارشاد ہو کہ انھوں نے مکاتیب میں اس درجہ تاخیر کیوں کی ہے۔ عرضی محمد امیر مرزا دہلوی"

اس خط میں داغ کو بھائی صاحب لکھنا اور ان کی خیریت جوئی کا بے حد مشتاق ہونا اس کی دلیل ہے کہ وہ داغ کا بھائی تھا۔ رہا یہ کہ وہ داغ کا ماں جایا تھا یا خالہ زاد' اس کا فیصلہ بحالاتِ موجودہ دشوار ہے۔ داغ کے خط بنام عزیز بیگم مورخہ ۵ اکتوبر ۱۸۹۳ء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں امیر مرزا جے پور میں تھا۔ اور آج کل میں حیدر آباد جانے والا تھا۔ اس کے بعد ۲۲ جنوری ۱۸۹۴ء کو داغ نے بیخود دہلوی کو لکھا تھا کہ "بھائی امیر مرزا صاحب جے پور واپس آگئے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قیام جے پور ہی میں رہتا تھا۔

انشائے داغ میں مسماۃ عزیز بیگم اور ادیبا بیگم دو عورتوں کے نام بھی خط نظر آتے ہیں۔ انھیں داغ نے ہمشیرہ اور بہن کے الفاظ سے یاد کیا ہے، مولانا احسن مارہروی نے ان کے رشتے پر روشنی نہیں ڈالی۔ خدا جانے یہ کس رشتے کی بہنیں تھیں۔ اب خاندان لوہارو کے کسی معمر فرد سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ان کے تعلق کی حقیقت کو بیان کریں گے۔

آمد رام پور سرکار رام پور کی باضابطہ ملازمت سے پہلے بھی داغ رام پور آتے رہتے تھے، اب تک مجھے حسب ذیل تاریخی حوالے ملے ہیں:

(۱) داغ کی خالہ عمدہ خانم اور نواب فردوس مکاں کے درمیان موخر الذکر کے قیام دہلی کے زمانہ سے رابطۂ محبت و وداد تھا۔ تخت نشینی کے بعد عمدہ خانم نے نہایت پر اشتیاق عرضیاں لکھیں۔ آخری عرضی کے جواب میں ۱۲ شوال ۱۲۷۱ھ (۲۹ جون ۱۸۵۵ء) کو نواب صاحب نے جو خط لکھا تھا اس کے آخر میں بھی یہ تحریر تھا:-

"المختصر عبارت آرائی تا کجا۔ حسب الطلب آں مطلوب دلہا ہشت نفر کہاران و پالکی و یک منزل رتھ و یک پہرہ تلنگاں

فن کی نمائش کے علاوہ کسی اور چیز سے سروکار نہیں رکھتا، وہ اس فن کار کی طرح ہے جو ایک برہنہ عورت کا مجسمہ پیش کرتا ہے اور صرف فن کے نقطۂ نظر سے اس کی داد چاہتا ہے اور ان لوگوں سے اس کا خطاب نہیں، جو اس عریاں مجسمہ کو اخلاقی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں

داغ جس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، وہ تمام دوسرے شاعروں سے بالکل مختلف تھا۔ اب تک کسی نواب خاندان کے کسی بچّہ کو کبھی یہ سعادت نصیب نہ ہوئی تھی کہ وہ قلعۂ معلیٰ میں پرورش پا سکے، لیکن داغ کے لئے یہ فخر بھی مقسوم ہوچکا تھا اور وہ بہت کمسنی ہی میں قلعہ کی اس فضا میں پہونچ گئے تھے، جہاں انسان قبل از وقت جوان اور جوانی سے پورا فایدہ اُٹھانے پر مجبور ہوجاتا ہے اس فن میں عشق و محبت کا کیا ذکر دل میں کسک پیدا کر دینے والی ہلکی چوٹیں بھی میسر نہیں آتیں

داغ نے تقریبًا ۲۰ سال اپنی عمر کے اسی فضا میں بسر کئے، یہیں جنسی جذبات ان میں پیدا ہوئے، یہیں ان کی خاطرخواہ تسکین ہوتی رہی اور انھیں کا بیان ان کی شاعری کا موضوع قرار پایا۔ اس کے بعد جب رام پور گئے تو وہاں بھی عیش و نشاط کا یہی رنگ انھیں نظر آیا، اور پھر جب اخیر میں حیدر آباد میں پہونچے تو قسمت نے زیادہ یاوری کی اور اب عورتوں کا التفات خرید کرنے کی استطاعت بھی ان میں پیدا ہوگئی۔ الغرض شروع سے اخیر تک داغ کی شاعری عیاشانہ حدود سے آگے نہ بڑھ سکی اور نہ داغ نے اس سطح سے بلند جانے کی کوشش کی۔ یہی ان کی کامیابی کا راز تھا اور یہی ان کا کمال

غالب عمر بھر میں صرف "ایک ڈومنی کو مار رکھنے" کے علاوہ اور کچھ نہ کرسکے، مومن کو کسی پردہ نشین خاتون سے عشق ہوا اور ساری عمر اپنی ناکامی کا ماتم کرتے رہے، جرأت کی محبوبہ نے ہمیشہ ان کو دھوکا دیا اور یہ کچھ نہ کرسکے۔ داغ کا مسلک یہ تھا کہ:-

اک نہ اک ہم لگائے رکھتے ہیں

اور اس لئے ان کے لگاؤ میں کبھی عجز و نیاز کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی، وہ جس سے تعلق پیدا کرتے تھے اس کو اپنا محکوم بھی رکھنا چاہتے تھے اور اگر وہ اس پر راضی نہ ہوتا تھا تو سودا کسی اور سے ہوجاتا تھا، الغرض داغ کی شاعری اس جنسی تعلق کی شاعری تھی جسے ہر وقت حاصل کیا جا سکتا ہے اور جس کو ترک کرکے زیادہ تکلیف بھی نہیں ہوتی، لیکن یہ سمجھنا کہ اس قسم کی شاعری کوئی جان نہیں رکھ سکتی غلط ہے ـــ عیاشانہ زندگی اختیار کرنا اور اسے نباہنا آسان بات نہیں اس میں بھی خدا جانے کتنے نئے موڑ سامنے آتے ہیں، کن کن پیچیدہ راہوں سے گزرنا ہوتا ہے اور کتنے وار روکنے پڑتے ہیں

[کوٹھے کے نیچے "غریبانہ آہ کرکے بیٹھ رہنے والے" کیا سمجھ سکتے ہیں کہ کوٹھے تک پہونچ جانے والے کیسی کیسی مشکلیں جھیل چکے ہیں اور زانوئے یار دبا کر بیٹھ جانے کے بعد بھی وہ کن کن مخالف قوتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ الغرض عیاشی آسان نہیں، ایک مستقل فن ہے اور اسی فن کی نمایش داغ نے اپنی شاعری میں کی ہے]

اس میں شک نہیں جس حد تک جذبات کی بلندی اور فکر و تخیل کی گہرائی کا تعلق ہے، داغ کی شاعری کچھ نہیں، لیکن جس حد تک زبان کی صفائی و بیان کی سلاست، محاورات کی برجستگی، اور بے تکلفانہ اظہار خیال کا تعلق ہے بہت کم شاعر ایسے ہیں جو داغ کے مقابلہ میں پیش کئے جاسکیں اور یہ داغ کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ ادب اُردو کا کوئی مورخ اس کو نظر انداز کرکے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

معذرت

ہمیں افسوس ہے کہ جگہ کی کمی کی وجہ سے بعض حضرات کے مقالے سالنامہ میں شامل نہ ہوسکے۔ خصوصیت کے ساتھ جناب تمکین کاظمی کے وہ مقالے جو انھوں نے "داغ اور حیدر آباد"۔ "داغ اور نظام" کے عنوان سے لکھے تھے۔

(نیاز)

ایک زمین ہے — " باتوں میں - گھاتوں میں "۔
خرا باتوں کو امیر و داغ دونوں نے نظم کیا ہے
امیر کا شعر ہے :- مسجدوں میں ہیں یہ ہو حق کے کہاں ہنگامے
رنگِ توحید اُچھلتا ہے خرا باتوں میں

خرابات میں رنگِ توحید اُچھلنے کا کوئی ثبوت موجود نہیں، محض ہو حق کو سامنے رکھ کر انھوں نے یہ بات بنائی ورنہ جو چیز مسجد میں ہو حق ہے، وہ خرابات میں " ہنگامۂ نوشا نوش " ہے۔ ہو حق کے معنے ہنگامہ کے بھی ہیں لیکن ہر ہنگامہ ہو حق نہیں کہلاتا

داغ کہتے ہیں :- ابرِ رحمت ہی برستا نظر آیا زاہد،
خاک اڑتی کبھی دیکھی نہ خرا باتوں میں

اسی رنگ کے چند اور شعر سنئے جن سے کلام داغ کی برجستگی، سلاست و روانی، شوخی اور خصوصیت کے ساتھ لب و لہجہ کی " ڈرامائی کیفیت بخوبی ظاہر ہوتی ہے :-

شریر آنکھ، نگہ بے قرار، چتون شوخ ___ تم اپنی شکل کو پیدا کرو حیا کے لئے
اس کے ہاتھوں سے یہی ذلت و خواری ہوگی ___ غیر اپنی تو خبر لیں مجھے کیا کہتے ہیں
اب کی کچھ منھ سے نکالا تو تمھیں جانوگے ___ داغ پھر مجھ کو نہ کہنا جو برا بر نہ کہوں
ناروا کہئے ناسزا کہئے ___ کہئے کہئے مجھے برا کہئے
ہوش جاتے رہے رقیبوں کے ___ داغ کو اور باوفا کہئے
گرے ہوتے الجھ کر آستاں سے ___ چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے
لے ہی تو آئیں گے اسے ہمدم ___ میرے ہی نام سے تو آئے گا
ہاتھوں سے جو بچے تری باتوں سے مرگئے ___ چٹکی میں تھا جو تیر، وہ لب پر سخن ہوا
یہ داغ رند کب آلودۂ شراب نہ تھا، ___ خراب آج ہوا، آج تک خراب نہ تھا؟
خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا، ___ جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا،
ہاں امتحانِ برق تجلی ضرور تھا ___ کیا میں نہ تھا اس آگ میں جلنے کو طور تھا
جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں ___ مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں
گالیاں غیر کو دیتا ہوں، سنو تم خاموش ___ میں بھی دیکھوں تو بڑے بات نہ کرنے والے
تمھارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا ___ نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا
تمام بزم جسے سن کے رہ گئی مشتاق ___ کہو وہ تذکرۂ ناتمام کس کا تھا،
ہمیں تو شوق ہے بے پردہ تم کو دیکھیں گے ___ تمھیں ہے شرم تو آنکھوں پہ ہاتھ دھر لینا

آپ ان اشعار کا لطف اسوقت تک حاصل ہی نہیں کرسکتے جب تک آپ انھیں ایک خاص لب و لہجہ سے نہ پڑھیں، پڑھنے کا وہ مخصوص تیور اختیار نہ کریں جو داغ نے شعر کہتے وقت اختیار کیا تھا۔ طعن و تشنیع، ہزل و استہزاء، میل کشی، حسرت و یاس، نفرت و بیزاری، غصہ و برہمی، زیادہ تر یہی وہ چیزیں ہیں جن کو داغ کی شاعری کے عناصر ترکیبی کہہ سکتے ہیں اور ایک نقاد کا فرض ہے کہ وہ شاعر کے اسی مقصد کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرے کہ وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ داغ شعر میں باتیں کرتا ہے اور باتیں بھی معمولی لیکن اپنی بات سنانے اور منوانے کے لئے وہ کہتا اس طرح ہے کہ بے اختیار سننا اور ماننا پڑتا ہے۔ داغ ایک ایسا فنکار ہے جو صرف اپنے مخصوص

ہرکارہ می رسد۔ حرکت را برسکون راجح شمارند و مارا مشتاق دیدار خود انگارند"۔

چھوٹی بیگم نے ۵ر اگست ۱۸۵۵ء (ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ) کو ایک عرضی نواب فردوس مکاں کی خدمت میں بھیجی تھی۔ اسمیں وہ لکھتی ہے

"از تحریر دوحۂ حدیقۂ تمنا برخوردار نواب مرزا گلبانگ نوید صحت وری مزاج عالی دریافیہ نوازشات خاوندانہ وتفقدات خدویانہ کہ بر حال برخوردار مذکور مرعی و مبذول فرمودند، اگر درجنب شکر و سپاس مثلِ صد برگ از ہر بن مو ہزار زبان برآرم، ادای عشرعشیر نمی تواں کرد۔

فی الواقع از دیر باز آں نورالابصار آرزوی قدم بوسی جناب باقصی الغایات در دل عقیدت منزل خود متمکن داشت۔ فرط تمنائی تلثیم عتبۂ سپہر تکریم بغیر اجازت ولی عہد بہادر خود را بدرِ دولت حاضر ساختہ بشرف باریابی ملازمت کیمیا خاصیت مفخر و مباہی گشت۔ الحمدللہ کہ آخرالامر بمنتہائے مرام دل خود رسید۔ و تفقدات گوناگوں و عنایات بوقلموں برای العین معائنہ گروید

رقیمۂ نیاز چھوٹی بیگم"

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ داغ ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ میں رام پور آئے ہوئے تھے۔

عمدہ خانم ۲۰ر محرم ۱۲۷۲ھ کو رام پور سے واپس دہلی پہونچی تھی۔ اور اس نے اسی دن ایک عرضی نواب صاحب کو لکھی تھی جس کا اقتباس ابھی گزر چکا ہے۔ عمدہ خانم کے اس خط میں داغ کا سلام تحریر کیا ہے اس لئے اس خط اور چھوٹی بیگم کے خط ان دونوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ داغ کا رام پور میں ورود شوال ۱۲۷۱ھ کے آخر میں اپنی خالہ کے ساتھ ہوا تھا اور انھیں کے ساتھ ۲۰ر محرم ۱۲۷۲ھ کو وہ دہلی واپس پہونچ گئے۔

(۲) دسمبر ۱۸۵۵ء سے اگست ۱۸۵۶ء تک داغ دہلی میں تھے۔ کیونکہ عمدہ خانم کے اس زمانہ کے خطوط انھیں کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں اور ان سب خطوں میں انھوں نے مکتوب الیہ کو اپنا سلام بھی پہونچایا ہے۔

(۳) ۱۲ر شعبان ۱۲۷۵ھ (۲۷ر مارچ ۱۸۵۹ء) کے غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ اس تاریخ سے قبل رامپور آکر دہلی واپس جا چکے تھے[1]

(۴) ۱۷ر مارچ ۱۸۶۰ء اور ۲ر نومبر ۱۸۶۰ء کو داغ نے دہلی سے نواب فردوس مکاں کے حضور میں عرضیاں ارسال کی تھیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نومبر ۱۸۶۰ء تک دہلی ہی میں تھے[2]

(۵) ۱۳ر اگست ۱۸۶۵ء کو غالب کی عرضی بنام خلد آشیاں سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ رام پور آئے ہوئے ہیں[3]۔

(۶) ۸ر فروری ۱۸۶۶ء کے داغ کے ایک خط بنام ۔ ۔ ۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ نواب خلد آشیاں کی تخت نشینی کے جشن میں شریک ہوکر اس تاریخ سے قبل دہلی واپس جا چکے تھے[4]

(۷) ۳ر اور ۴ر مارچ ۱۸۶۶ء کو داغ نے دو عرضیاں دہلی سے بھیجی تھیں، ان کا جواب نواب خلد آشیاں کی طرف سے ۱۳ر مارچ (۲۵ر شوال ۱۲۸۲ھ) کو روانہ کیا گیا۔ اس میں نواب صاحب نے یہ بھی لکھا ہے۔

"چوں حاضر شدن آں عوالی مرتبت درحضور مناسب متصور لہذا قلمی می رود کہ حاضر حضور شوند، و مزاج حضور را متوجہ حال صداقت اشتمال خود دانند۔

(۸) ۲۹ر مارچ سنہ مذکور کے غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ نے رامپور آنے کی طیاری شروع کر دی ہے[5]

(۹) ۱۸ر اپریل ۶۶ء کو داغ نے دہلی سے ایک خط منشی سیل چند کے نام لکھا ہے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اس تاریخ تک رام پور نہیں آئے تھے۔

---

[1] حکایت غالب ص۱۱ طبع چہارم۔ [2] انشائے داغ۔ [3] حکایت غالب ص۱۲۔ [4] انشائے داغ ص۸ [5] مکاتیب غالب۔ صفحہ ۱۵

اخبار الصنادید (ج ۲ صفحہ ۲۰۸) کا بیان ہے کہ ۱۴ر اپریل ۶۶ء کو داغ کا تقرر ہوا تھا۔ اس کا ظاہری اقتضا یہ ہے کہ
تاریخ سے قبل رام پور آچکے تھے، جو داغ کے ۱۸ر اپریل کے خط کے منافی ہے۔ اس صورت میں یا تو داغ کے خط کی تاریخ
اور یا اخبار الصنادید میں ۲۴ کی جگہ ۱۴ درج ہوگیا ہے۔ خزانے کی امثلہ ۱۹۴۷ء میں جل چکی ہیں۔ اس لئے مزید تحقیق ممکن نہیں۔
بہر حال داغ کا مستقل قیام رام پور اپریل ۱۸۶۶ء سے شروع ہوکر ۱۸۸۸ء تک رہا ہے۔

تصانیف

داغ کی حسب ذیل تصانیف ہم تک پہونچی ہیں۔

(۱) گلزار داغ، جو ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ سب سے پہلے مطبع تاج المطابع رام پور میں ۱۲۹۶ھ
(۱۸۷۹ء) میں چھپا تھا۔ کتاب خانہ رام پور میں یہ ایڈیشن موجود ہے۔

آفتاب داغ، جو ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے۔ یہ پہلی بار ۱۳۰۲ھ میں منشی تیغ بہادر کے مطبع انوار الاخبار لکھنؤ میں چھپ کر
ہوا تھا۔ حمیدن بائی نقاب کو داغ نے ایک خط ۵ر ستمبر ۱۸۸۵ء کو لکھا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ سے قبل ایک
نواب خلد آشیاں کے پاس پہونچ چکا تھا، جس کا یہ مطلب ہے کہ ۲۵ ذی قعدہ ۱۳۰۲ھ سے پہلے طباعت مکمل ہوچکی تھی۔
کتاب خانہ رامپور میں اس مطبع کا ۱۳۰۶ھ کا مطبوعہ نسخہ موجود ہے۔

) مہتاب داغ، جو ان کے کلام کا تیسرا مجموعہ ہے۔ یہ ۳ر جمادی الآخر ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء) کو مطبع عزیز دکن حیدر آباد میں چھپا تھا۔

) یادگار داغ، جو ان کے کلام کا چوتھا مجموعہ ہے۔ یہ داغ کے انتقال کے بعد ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) میں اسٹیم پریس لاہور میں چھپا تھا۔

) ضمیمۂ یادگار داغ، جو دیوان چہارم کا تتمہ ہے۔ اس کا کوئی نسخہ کتاب خانۂ رام پور میں محفوظ نہیں۔

) فریاد داغ۔ یہ ان کی مثنوی ہے جس میں منی بائی حجاب سے اپنے معاشقے کا ذکر کیا ہے۔ جلال لکھنوی نے (دیوان جلال موسوم
شاہد سخن ص ۲۷۵) فریاد داغ سے اس کا سال نظم نکالا ہے جو ۱۳۰۰ھ (۸۳-۱۸۸۲ء) ہے اور فیروز رام پوری نے "نظم دردمندی"
اس کا سال طباعت برآمد کیا ہے جو ۱۳۰۲ھ ہے۔

کتاب خانۂ رام پور میں اس کا تیسرا ایڈیشن محفوظ ہے، جو ۲۵ر مئی ۱۸۹۵ء (۱۳۱۲ھ) کو سید ابن علی منیجر کے اہتمام سے مطبع
مطلع العلوم و اخبار نیر اعظم مراد آباد میں سید میر حسن صاحب مالک اخبار خیر خواہ عالم دہلی کی فرمائش پر ۲ ہزار کی تعداد میں چھپی تھی
۸ آنہ فی نسخہ فروخت ہوئی تھی۔ ان تصانیف کے علاوہ داغ کے دواوین کے تین انتخاب بھی چھپے ہیں۔

(۱) پہلا انتخاب بنام "انتخاب داغ" مطبع انور محمدی لکھنؤ سے شایع ہوا تھا۔ یہ گلزار داغ، آفتاب داغ اور مہتاب داغ کا انتخاب ہے

(۲) دوسرا انتخاب "کمال داغ" کے نام سے مخدومی مولانا حامد حسن قادری صاحب نے کیا ہے، اور آگرہ اخبار پریس آگرہ میں چھپا۔ یہ کل کلام کا
انتخاب ہے۔

(۳) تیسرا انتخاب مولانا احسن مارہروی مرحوم نے "منتخب داغ" کے نام سے کیا تھا، جو ان کی وفات کے بعد انوار احمدی پریس
الہ آباد سے چھپ کر شایع ہوا۔ یہ بھی کل کلام کا انتخاب ہے۔

غالب کی رائے کلام داغ پر

محمد نثار علی شہرت نے آئینۂ داغ (ص ۳۴) میں لکھا ہے:

ایک روز میں مرزا غالب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ کھانا نوش فرما رہے
تھے، میں مودب ہوکر ایک طرف بیٹھ گیا۔ آپ نے ایک رنگ ترہ میری طرف پھینکا کہ اس سے شغل کیجئے۔ چونکہ رمضان کا مہینہ تھا اور مجھے
روزہ تھا، میں نے اس رنگ ترہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ آپ تاڑ گئے اور فرماتے کیا ہیں " ہاں آپ مولوی ہوگئے ہیں" میں ہنسا تو آپ بھی مسکرانے
لگے۔ جب آپ کھانا نوش فرما چکے تو جو قلمی رسالہ آپ کے سامنے رکھا تھا، اس میں کچھ بنانے لگے غالباً اصلاح دے رہے تھے۔ میں نے
گزارش کی " جناب کیا ارقام فرما رہے ہیں" تو فرمانے لگے۔ " اس میں فارسی الفاظ بہت شوش دئے گئے ہیں اس لئے انھیں نکال رہا ہوں

اور شستہ اُردو الفاظ اس میں ڈال رہا ہوں" میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی "آپ کا دیوان بھی تو فارسی سے مالا مال ہے" فرمانے لگے وہ جوانی کی نازک خیالیاں ہیں۔ شہرت بعض شعر تو ایسے ادق میرے قلم سے نکل گئے ہیں کہ میں اب ان کے معنی خود نہیں بیان کر سکتا" پھر فرمانے لگے "دہلی والوں کی جو اُردو ہے (جس کو مشک و عنبر کہنا چاہئے) اس کو ہی اشعار میں لکھنا چاہئے۔ آخر عمر میں ہماری تو یہی رائے قایم ہوئی ہے" میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی کہ "داغ کی اُردو کیسی ہے؟" فرمانے لگے "ایسی عمدہ ہے کہ کسی کی کیا ہوگی، ذوق نے اُردو کو اپنی گود میں پالا تھا، داغ اس کو نہ فقط پال رہا ہے۔ بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا غالب بھی ان کی زبان کی صفائی اور محاورات کی درستگی و برجستگی کے معترف تھے۔

اصلاحیں

داغ نے اپنے اور دوسروں کے کلام میں جو اصلاحیں کی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے وہ بہت سلیم طبع کے مالک تھے اور عموماً مناسب اور پسندیدہ دخل کیا کرتے تھے۔

فیروز رامپوری لکھتے ہیں کہ ایک روز صاحبِ عالم مرزا رحیم الدین صاحب حیاؔ اُستاد کے یہاں تشریف لائے۔ اس وقت استاد زنانے مکان میں تھے۔ میں مرزا صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ انھوں نے اپنا مطلع فخریہ پڑھا اور کہا ایسا مطلع کوئی کہدے تو جانوں ؎

سینے میں اس کے تیر کا پیکاں کہیں نہیں
بس اب ہمارے پاؤں کے نیچے زمیں نہیں

تھوڑے عرصہ میں استاد بھی باہر آئے۔ مرزا صاحب تو اُن سے کچھ بات چیت کر کے رخصت ہو گئے۔ میں نے وہ مطلع اُستاد کو سنایا استاد نے فرمایا کہ یہاں پہلا مصرع یوں ہوتا تو خوب تھا ؎ "پیکانِ یار سینے میں اپنے کہیں نہیں"۔ اہلِ کمال اس نکتہ کو سمجھیں گے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

اپنے کلام پر اصلاح کے لئے انشائے داغ صفحہ چہارم ملاحظہ کیجئے جہاں وہ غزل درج ہے، جو انھوں نے ۲۹ برس کی عمر میں لکھ کر رام پور بھیجی تھی۔

شاگردوں کے کلام پر اصلاحوں کے لئے مولانا سیماب مرحوم کی کتاب دستور الاصلاح صفحہ ۹، ملاحظہ کیجئے۔ فیروز رام پوری نے حسب ذیل اصلاحیں نقل کی ہیں:۔

(۱) سید عنایت احمد صاحب متخلص بہ حیرت ساکن بدایوں محلہ سید باڑہ نے ایک خط بدیں مضمون بھیجا کہ "طرح مشاعرہ میں جو میں نے غزل لکھی ہے، لکھنوی اس کو از مطلع تا مقطع مہمل بتاتے ہیں۔ لہذا آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں اور منصفانہ رائے چاہتا ہوں کہ اس کے عیوب سے مطلع کیا جاؤں"۔

ان کی غزل کے سولہ شعر تھے۔ مرزا داغ نے ان شعروں پر اپنی رائے لکھی۔

سامانِ جنوں کیا کوئی دشوار نہیں ہے
اب ہات ہیں، تو جیب میں اک تار نہیں ہے

"اب" کا لفظ بگاڑتا ہے۔

عاشق ترے ظلموں کو سمجھتے ہیں کرم، ہائے
آزار ہے، تو لذتِ آزار نہیں ہے

"عاشق ترے ظلموں" اس کا لطف میں نہیں سمجھا۔

شرماتے ہو کیوں، دیکھ کے مستانہ ادائیں
یہ آنکھ ہے، کچھ ساغرِ سرشار نہیں ہے

اس شعر میں کس کی اداؤں کا ذکر ہے۔ عاشق کی ادائیں دیکھ کر معشوق شرماتا ہے یا اپنی اداؤں سے شرماتا ہے۔ اگر اپنی ادائیں دیکھ کر شرماتا ہے، تو "اپنی" کا لفظ چاہئے یا "آئینہ" کا لفظ چاہئے، مگر یہ (ثابت) ہو چکا کہ عاشق کی مستانہ ادائیں دیکھ کر شرماتا ہے "دیکھ" اسی پر دال ہے۔

(۳) نادر حسین صاحب نادر اور حمید اللہ صاحب عاجز نے اصلاح کے لئے اپنا کلام بھیجا تھا۔ اس پر لکھا۔

"لفظ تب" متروک ہے۔ آپ کا یہ مصرع ہے:- "آزمانا آپ کو ہے خاص جب اک کام میں" اور میرا یہ مصرع ہے:-

"غیر کو کیوں چھوڑتے ہو قتل گاہِ عام میں" بس غور کرنا چاہئے اس امر کو کہ "آپ" کا صلہ "چھوڑتے ہو" نہیں آنے کا۔ یہ ربط نہیں کھانے کا۔ لفظ "ہو" تم کا صلہ ہوسکتا ہے "آپ" کا صلہ "ہیں" چاہیے بادیہ پیائی کی (ی) گرتی ہے۔ میں فارسی کے میں گرتا ہوا حرف نہیں رکھتا ہوں۔ "چال و انداز" کا عطف جایز نہیں ہے وہ ہندی ہے یا فارسی ہے "الہیٰ نہ اس کے سوا چاہتا ہوں" لفظ نہ کی جگہ نہیں چاہئے "نہ" خلاف محاورہ ہے۔

لطیفے

داغ کی شوخیِ طبع اس کی شاہد ہے کہ وہ بہت حاضر جواب اور بذلہ سنج انسان تھے۔ ان کے متعدد لطیفے سوانح نگاروں نے نقل کئے ہیں۔ یہاں وہ چند لطائف نقل کئے جاتے ہیں جو ان حضرات سے رہ گئے ہیں۔

فیروز رام پوری داغ کے خاص شاگرد تھے۔ انھوں نے داغ کے خطوں کے مسودے اپنے پاس رکھنے کا التزام کیا تھا۔ ان میں سے چند مسودے کتاب خانہ رام پور کے لئے میں نے خرید لئے تھے۔ ان مسودوں میں حسب ذیل لطیفہ انھوں نے نقل کیا ہے:-

بے نظیر کا میلہ ہے، استاد بھی ایک جگہ چند آدمیوں سے گفتگو میں مشغول ہیں۔ ادھر سے علی اصغر خاں صاحب جنرل مرحوم تشریف لائے سلام علیک کی استاد نے نہ سنا۔ دوبارہ پھر سلام علیک کی، پھر نہ سنا۔ صاحب زادہ صاحب بولے کہ "او ہو نواب مرزا تمھارا تو مزاج ہی نہیں ملتا" بولے ہاں، حضور وہ ایسا تیسا نہ ملے میں تو آپ کا تابعدار ہوں"

عرش گیاوی صاحب نے حیات تسلیم میں لکھا ہے:-

"ایک صاحب فرماتے تھے کہ نواب کلب علی خاں صاحب کا عہد تھا۔ بحر، قلق، اسیر، امیر، منیر وغیرہ موجود تھے جب داغ صاحب کے پڑھنے کی نوبت آئی تو مشاعرہ گونج اٹھا اس مشاعرے میں منیر اپنی بے مثل غزل پڑھ چکے تھے۔ مگر وہ عام فہم شعر یہاں کہاں تھے۔ داد دل خواہ نہ ملی۔ داغ کی واہ واہ مرحوم منیر پر گراں گزری، مشاعرے سے باہر آکر داغ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "کیوں میاں داغ، کیا تمھاری غزل مجھ سے بھی زیادہ پرزور تھی؟" داغ نے کہا "ہرگز نہیں میری کیا طاقت کہ آپ کے سامنے زبان کھولوں مگر حضرت قبول خاطر و حسن سخن خدا داد است"۔ درمیان میں چند صاحب یہ گفتگو کرتے نظر آئے کہ "بھائی غزلیں تو سب نے پڑھیں مگر جب زاغِ بیابانی نے اپنا منھ نکالا تو پھر سارے عندلیب اپنا نغمہ بھول گئے" داغ کو وہ داد ملی کہ اللہ اللہ۔ خود نواب صاحب بہادر لوٹ لوٹ گئے۔ داغ نے منشی اسمٰعیل حسین منیر یادگار ناسخ سے کہا "حضرت اس مقبولیت کو کیا کہئے" منیر مرحوم چپ ہوگئے۔[ا]

غیر مطبوعہ اشعار و مکاتیب

داغ کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط اور اشعار بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ ذیل میں چند فارسی اور ایک اردو قطعہ نقل کیا جاتا ہے۔ قطعہ کسی مسجد کا سال تعمیر بتاتا ہے۔ قطعہ یہ ہے:

کی بنا مسجد بیتِ مقدس کی طرح نورانی
داغ نے اس کی یہ کہی تاریخ نادرِ عصر کعبۂ ثانی ۱۳۰۴

فارسی خط سب کے سب نواب سید یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں والی رام پور کے نام ہیں:-

(۱)

نواب صاحب قدر دان فیض رساں غریب پرور عدل گستر سلامت

بعز عرض می رساند کہ دریں ایام میمنت و فرحت انجام کہ نغمۂ بلبل در ہفت پردۂ نیلگونِ فلک رسیدہ و آوازِ دکلبانگ شادمانی در گنبدِ نیلوفری پیچیدہ ساقی موسم از مینائی سرد مہی نشۂ بادہ بے غمی در دماغ اہلِ روزگار رسانیدہ و زمانہ بساط مجلس آرا و بزم پیرائی بریں صفحۂ صندل بہمہ گردانیدہ۔ یعنی مژدۂ مسند نشینی[۲] آن والا گہر در عالمیان عالم عالم است، و نوید جلوہ افر

ذات عالی درجہانیاں جہاں جہاں - از شوقِ دیدار فائض الانوار حالتے دارم کہ از معائنہ اش نرگس حیران - کارسازِ حقیقی سببے سازد کہ این فدوی شرف اندوز آستانِ فیض نشان گشتہ کامیاب باشد کہ از مدت مدید و عرصۂ بعید روز و شب درہمیں امیدواری می گزرد - مگر سرانجام ہر کار بر دقت منحصر است - بیت :-

الٰہی تاکہ جہانست، درجہاں باشی　　　مدام برسرِ مردم خدائے گاں باشی

اللہ تعالیٰ ذاتِ والا صفات را تا ابد الدہر سلامت دارد، و بر دوستان راسخ الاعتقاد فرخ و مبارک کناد، برب العباد -

عرضی نواب مرزا مورخہ نہم شعبان ۱۲۷۱ھ

(۲)

نواب صاحب غریب پرور فیض گستر سلامت

بعز عرض می رساند

دریں ہنگام مسرت التیام مژدۂ فرحت افزا و نویدِ بہجت پیرا بگوشِ ہوا خواہان در رسید - یعنی خلعتِ مسند نشینی[۱] رام پور از ذاتِ مبارک زینت یافت - ہزار ہزار شکر بدرگاہِ مستجاب الدعوات بجا آوردہ - اللہ تعالیٰ ذات فیض آیات را مدام بہ حفظ و امن خود دارد

الٰہی، تاکہ جہانست، درجہاں باشی　　　مدام برسرِ مردم خدائے گاں باشی

عرضی نمک خوار نواب مرزا داغ مورخہ نہم دسمبر ۱۸۵۵ء

(۳)

غریب پرور، فیض گستر، دستگیر درماندگان، تسلی بخش بے کساں، حاجت روائے عالم و عالمیاں

مخدومِ جہاں و جہانیاں سلامت

بعز عرض می رساند

عجب درد است جانم را، نمی دانم کہ چوں گویم　　　دلا، خوں شو کہ تا برحال خود یک لحظہ خوں گویم

ہر آنچہ زاد بناچار بایدش نوشید　　　ز جامِ دہر می کلِ من علیہا فان،

دردے دارم کہ دوایش محال، و مرضے دارم کہ تیمارش دشوار - یعنی بتاریخ دہم جولائی ۱۸۵۶ء مہر سپہر سلطنت، مرزا محمد سلطان فتح الملک شاہ ولی عہد بہادر بہ وبائے ہیضہ ازیں جہان فانی رحلت فرمودند ---- و از وقوع ایں حادثۂ جانکاہ و صدمۂ دل خراش شورِ فغانِ عالمیان تا فلک الافلاک رسید، و در شہر شاہجہاں آباد صورت تباہی نمودار گردید - دریں دودمان والا چناں شخص صاحب تدبیر و لئیق و وجیہہ بعد چند سلطنت پیدا گردیدہ بود کہ نشانۂ تیر مرگ ناگہاں گشت - زباں راچہ یارا کہ حال ایں واقعہ بیان نماید، و قلم راچہ مجال کہ تحریر سازد - ہر چند دل بیتاب را صبر می دہم، مگر صبر کجا - برق کردار بیقراریست و ابر صدا رگریہ و زاری - واکنوں دفعیۂ ایں مرض بغیر مرحمت و نظر پرورش والا دشوار - بیت

مزد کار نیکواں　ضائع نماند نزدِ حق　　　لا یضیع اللہ فی الدارین اجر المحسنین

---

(۱) نواب فردوس مکاں کو حکومت انگریزی کی طرف سے خلعت مسند نشینی ملا تھا اور اس کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔ اخبار الصنادید میں اس جشن کی تاریخ مذکور نہیں - لیکن عمدہ خانم کے خط مورخہ ۶ ر دسمبر ۱۸۵۵ء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ سے قبل (غالباً نومبر میں) یہ تقریب عمل میں آئی تھی، اور خود نواب گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی نے رام پور آکر یہ خلعت نواب صاحب کو پہنایا تھا - سلہ نواب فردوس مکاں کی مسند نشینی کی تاریخ دوشنبہ ۱۳ رجب ۱۲۷۱ھ (یکم اپریل ۱۸۵۵ء) ہے

امیدوارم کہ مدام از صحائفِ مزاج فیض امتزاج اطلاع یافتہ مسرور و مستبشر گشتہ باشم کہ خاطرِ نیاز مظاہر متعلق می ماند۔ و ایں بخدمتِ علی بخش خاں صاحب[1] نوشتہ ام ۔ یقین است کہ بوقتِ بندگانِ عالی عرض خواہند نمود۔ آیندہ ہرچہ مرضی مبارک جب بود۔ عرض نمود۔ الٰہی آفتاب ابہت و کامگاری تاباں باد۔

عرضی

نمک خوار قدیم، نواب مرزا داغ مرقومہ ۲۰ جولائی ۱۸۵۶ء

مرزا محمد سلطان کا عرف مرزا فخرو تھا۔ ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے تھے مرزا دارا بخت کے ۱۸۴۹ء میں انتقال کر جانے پر بڑی کد و کد کے بعد ۱۸۵۲ء میں ولی عہد مقرر ہوئے۔ ان کے اچانک انتقال کرنے کا سبب یہ خیال اکثر یہ تھا کہ شاہ ظفر کی چہیتی بیگم نواب زینت محل اپنے بیٹے جواں بخت کی ولی عہدی کے درپے تھیں۔ انھوں نے کسی کے ذریعہ انھیں زہر دلوا دیا۔ لیکن میری دانست میں یہ صرف سوء ظن تھا، جو ظاہری حالات کے تقاضے سے پیدا ہو گیا تھا۔ اگر اس میں کچھ اصلیت ہوتی، تو داغ کے یہاں اس کا اشارہ ضرور پایا جاتا۔

مرزا فخرو شاعر بھی تھے۔ پہلے ذوق کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد غالب کو کلام دکھانے لگے تھے۔ داغ نے انکا قطعۂ تاریخ انتقال بھی فارسی میں لکھا تھا۔ جو مہتاب داغ (ص ۳۰) میں چھپ چکا ہے اس کا آخری شعر یہ ہے:۔

چو ز داغ سال رحلت دل دردمند پرسید ... بکشید آہ حسرت دو صد و دوازدہ بار

اس سے ۱۲۶۵ھ نکلتے ہیں۔

امتیاز علی خاں عرشی

---

[1] یہ شیخ محبوب بخش بن شیخ امان اللہ نجیب آبادی کے بیٹے تھے۔ ۱۴ شوال ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) کو نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ نواب فردوس مکاں نے "خان ساماں" کا عہدہ عطا کیا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی بڑی خدمت کی اور صلہ میں جاگیر پائی۔ ۲ محرم ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) کو رام پور میں انتقال کیا۔ (اخبار الصنادید جلد ۲ صفحہ ۱۹۸ و تذکرہ کاملانِ رام پور صفحہ ۲۷۴ و مکاتیب غالب، حواشی صفحہ ۱۳۹ طبع چہارم)

[2] یہ کنایہ غالباً ملازمت یا وظیفہ کے تقرر کا ہوگا، اس لئے کہ ولی عہد کے انتقال کے بعد ان کے اور ان کی والدہ کے مصارف کی کفالت کرنے والا کوئی نہ رہا تھا۔

عہدِ حاضر کی فلک پیمائیاں

دنیا کے دوسرے علوم و فنون کے ساتھ اس وقت فنِ تعمیر میں بھی غیر معمولی ترقیاں ہوئی ہیں یہاں تک کہ وقت حاضر کا فن تعمیر، قدیم فن تعمیر سے بالکل مختلف ہے۔

تعمیر میں حسن و زیبائش کے علاوہ، اس کا شاندار ہونا بھی ہمیشہ پیش نظر رہا ہے اور عہدِ قدیم کے آثار سے پتہ چلتا ہے کہ عمارتوں کی خوبصورتی کے ساتھ ان میں بلندی کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی، چنانچہ اس سلسلہ میں عہدِ عتیق کے برج بابل اور عہدِ وسطیٰ کے قطب مینار سے سب واقف ہیں، لیکن عہد حاضر میں عمارتوں کو بلند بنانے کا خیال بالکل دوسری نوعیت رکھتا ہے، پہلے تو عمارت کی بلندی صرف شان و شوکت کے اظہار کے لئے ہوتی تھی، لیکن اب بڑے بڑے شہروں میں آبادی کی کثرت اور زمین کی تنگی کی وجہ سے اونچی عمارتیں بنائی جاتی ہیں، تاکہ جن آدمیوں کے لئے زمین پر جگہ نہیں نکل سکی ہے، ان کے لئے زمین سے اوپر فضا میں جگہ پیدا کی جائے۔

اب سے پہلے تعمیر کے لئے اینٹ، پتھر، چونے، لکڑی کی ضرورت ہوتی تھی اور ان کی مدد سے بہت زیادہ بلند عمارتیں نہیں بن سکتی تھیں اور اگر اس کا امکان بھی تھا تو اس کے لئے بڑے صرف اور وقت کی ضرورت ہوتی تھی پھر بھی ان کی مضبوطی مشتبہ رہتی تھی، لیکن اب سیمنٹ اور لوہے نے اس فن کو وقت، صرف اور استحکام ہر لحاظ سے بہت زیادہ مقبول بنا دیا ہے۔

یوں تو اس وقت دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں، جہاں عجیب و غریب نمونوں کی عمارتیں نہ بنتی ہوں، لیکن جس حد تک بلندی کا تعلق ہے نیویارک کو خاص شہرت حاصل ہے اور یہاں یہ خبط اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ پندرہ بیس منزل کی عمارتیں طیار کرنا تو بہت معمولی بات ہوگئی ہے اور اب نوبت درجنوں منزل تک پہونچ گئی ہے۔ ایسی عمارتوں میں نیویارک کی ایک تعمیر جسے چینن ٹاور کہتے ہیں وہ بھی معمولی سمجھی جاتی ہے کیونکہ وہ صرف ۲۶ منزلیں رکھتی ہے۔ بعض دوسری مشہور عمارتیں یہ ہیں :-

۱- وولورتھ بلڈنگ جس کی بالائی منزل کا برج زمین سے ۷۶۲ فٹ کی بلندی پر واقع ہے جہاں اکثر بادل منڈلاتے رہتے ہیں۔

۲- دفترِ ٹیلی فون کی عمارت بھی نیویارک کی خاص عمارت ہے۔ یہ ۲۱ منزلہ عمارت ہے اور ایک نئے نمونہ پر طیار کی گئی ہے۔

۳- کرائسلر بلڈنگ، جو مشہور کارخانہ موٹر سازی سے تعلق رکھتی ہے ۶۸ منزلیں رکھتی ہے۔

۴- مٹروپلیٹن بیمہ کمپنی کی بلڈنگ ۱۰۰ منزل کی عمارت ہے جس میں ۴ ہزار آدمی رہتے ہیں۔

۵- لیک مچیگن کی ایک بلڈنگ ہے جو تجارتی بازار کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں دن کو ۴۰ ہزار سے زیادہ آدمی کام کرسکتے ہیں

۶- ٹریول اینڈ ٹرانسپورٹ بلڈنگ کی بلندی ایک فرلانگ سے زیادہ ہے۔

دُنیا کی بلند ترین عمارت

اس وقت دنیا کی بلند ترین عمارت نیویارک کی "امپائر اسٹیٹ بلڈنگ" ہے۔ یہ دو ایکڑ زمین پر قایم کی گئی ہے اور شہر کے اس حصہ میں ہے جہاں زمین کی قیمت اس وقت ۹۰ پونڈ فی مربع فٹ ہے اس کی بلندی ۱۲۴۷ فٹ یعنی دو فرلانگ سے زیادہ ہے اور اس کے ڈھانچہ میں ۶۰ ہزار ٹن لوہا صرف ہوا ہے، اس کے فرش کے لئے جتنا سنگ مرمر درکار ہوا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فرانس، اٹلی، بلجیم اور جرمنی کی تمام کانیں ایک سال کے لئے خالی ہوگئی تھیں۔ اس عمارت میں بجلی اور ٹیلی فون کے جو تار استعمال ہوئے ہیں انکی لمبائی ۳۰۰۰ میل ہے اور جتنے پائپ لگے ہیں ان کو اگر برابر برابر رکھا جائے تو ۵۰ میل تک پہونچ سکتے ہیں۔

اس عمارت میں ۱۰۲ منزلیں ہیں۔ اور چڑھنے کے لئے ۶۷ لفٹ ہیں اور ان کے علاوہ ۱۸۶۰ زینے بھی۔ اس میں ۳۰۰ عورتوں سے زیادہ صرف جھاڑنے پونچھنے کے لئے متعین ہیں۔ صرف اس کے ٹاور میں ۳ ہزار بجلی کے قمقمے نصب ہیں جن کی دیکھ بھال کے لئے ایک آدمی کو روزانہ آٹھ گھنٹے صرف کرنا پڑتے ہیں۔ اس کا بالائی برج اتنا بلند ہے کہ وہاں کا درجۂ حرارت ۳ سے ۹ درجہ تک بہ نسبت زمین کے کم رہتا ہے۔ ہوا اس پر ۶۰ سے ۸۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گزرتی ہے، اور کبھی کبھی اس کی رفتار ۱۲۵ میل فی گھنٹہ ہوجاتی ہے۔ یہ عمارت اسٹیل کے ڈھانچوں پر اس قدر مضبوط طیار کی گئی ہے کہ اگر ہوا ۹۰ میل کی رفتار سے برابر ۹ گھنٹے تک چلتی رہے تو برج صرف ڈیڑھ انچ کے قریب جھک جاتا ہے۔

یہ برج ۶ ٹیلی ویژن اور تین براڈکاسٹنگ کمپنیوں کا مرکز ہے۔ ٹیلی ویژن کے لئے جو مسطول اس میں قایم کیا گیا ہے خود اس کی بلندی ۱۷ منزلہ عمارت سے کم نہیں ہے اور اس کی طیاری میں سات لاکھ پونڈ صرف ہوئے ہیں۔ پچھلے سال آٹھ لاکھ ۵۰ ہزار آدمیوں نے اس کو آکر دیکھا۔ جب سے یہ عمارت طیار ہوئی ہے اس وقت سے لیکر اس وقت تک ایک کرور ۴۰ لاکھ آدمی اس کو دیکھ چکے ہیں اور دس لاکھ ڈالر ٹکٹ کی آمدنی ہوئی ہے، اس عمارت کی سب سے اوپر منزل پر جاکر دوربین کی مدد سے ۴۰ میل دور سمندر کا جہاز بالکل صاف نظر آتا ہے۔

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ عمارت نیویارک کے اس حصہ میں بنائی گئی ہے جہاں سے روزانہ ۴۰ ہزار م اور ۲ لاکھ پیدل چلنے والے آدمی گزرتے ہیں اور یہاں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں تعمیر کا سامان یا لوہے کے گرڈر وغیرہ رکھے جاسکتے۔ چنانچہ انتظام یہ کیا گیا تھا کہ جس وقت کارخانوں سے تمام سامان روانہ ہوتا تھا اس کے ۸۰ گھنٹوں کے اندر تمام سامان عمارت میں لگ جاتا تھا اس طرح ۲۳ ہفتوں میں اس عمارت کا فولادی ڈھانچہ طیار ہوگیا تھا اور آٹھ مہینے میں ساری تعمیر مکمل ہوگئی تھی۔

جگر بریلوی:-

شعلۂ حسن بھڑکنے لگا اب دل کے قریب　　گرمئ شوق ہو یا آگئے منزل کے قریب
روشن آنکھیں ہوئی جاتی ہیں تو دل محوِ نشاط　　لے ہی آئی ہمیں وحشت تری محفل کے قریب
شوق نے بڑھکے رگ و پے میں عجب حال کیا　　پاؤں اُٹھتے نہیں آکر تیری محفل کے قریب
پھٹنے لگتا ہے عجب جوشِ طرب سے سینہ　　مسکراتا ہوا آتا ہے جو وہ دل کے قریب
نیند آنکھوں میں ہے یا کیف ہم آغوشی ہے　　جیسے محبوب کا دل اب ہو مرے دل کے قریب

دل اُچھلتا ہے کہ ہوتا ہے جگر بیڑا پار
شاید آپہونچا سفینہ مرا ساحل کے قریب

میرزا غالب نقاد کی حیثیت سے

تنقید کا مطلب ہے جانچنا اور پرکھنا۔ اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی علمی یا ادبی مرقع یا اس کے کسی جزو کی اچھائی برائی اور حسن و قبح کو خوب دقتِ نظر سے جانچا اور پرکھا جائے۔ عبارت، اسلوب بیان اور ترتیب و تشریح مطالب کا اندازہ کرتے ہوئے کھرے کو کھوٹے سے الگ کر دیا جائے۔

میرزا غالب کی صلاحیت نقد و نظر پر گفتگو شروع کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند باتیں بطور تمہید عرض کر دی جائیں مثلاً میرزا غالب کے زمانہ میں فن تنقید ارتقا کے اس درجہ پر نہیں پہونچا تھا جس پر یہ آج کل پہونچا ہوا ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ آزادانہ اور حق شناسانہ جایزوں کا طریقہ بھی بڑی حد تک مفقود تھا۔ یا تو تقریظیں لکھی جاتی تھیں، جو مصنف، کتاب اور اس کے نفس مضمون کے بارے میں نہایت عجیب و غریب اور ایک حد تک مضحکہ خیز تحسین و ستایش سے لبریز ہوتی تھیں یا مخالفین تعریضاً کی برچھیاں اور تلواریں لے کر صاحبِ تصنیف پر یورش بول دیتے تھے اور کتاب کی اچھائیوں سے یا تو بالکل قطع نظر کر لیتے تھے یا پھر ان اچھائیوں کو بھی برائیوں کا جامہ پہنا کر منظرِ عام پر پیش کرتے رہتے تھے۔ میرزا کی تصانیف میں تقریظیں بھی موجود ہیں اور "قاطع برہان" کی اشاعت سے لیکر تا دمِ مرگ انھیں زہرِ تعریضات کے جام بھی پے بہ پے پینے پڑے۔

ادبیات میں تنقید کے لئے صرف وسعتِ معلومات کافی نہیں۔ معلومات کے علاوہ نقاد کے لئے صاحبِ ذوق ہونا بھی ضروری ہے اور ذوق کا درجہ جتنا بلند ہوگا، اتنا ہی اُس کا معیارِ تنقید بلند ہوگا۔ تنہا وسعتِ معلومات کی بنا پر ہم یہ تو جان سکتے ہیں کہ فلاں چیز صحیح ہے یا نہیں ہے۔ لیکن ادبیات میں حسن کا درجہ نفسِ صحت سے اوپر ہے۔ یعنی یہ کہ صحیح چیز ٹھیک اپنے موقع اور محل پر استعمال ہوئی یا نہ ہوئی۔ نظم و نثر میں ہمارے سامنے کئی ایسی چیزیں سامنے آتی رہی ہیں، جن کی صحت میں کسی کو کلام کی گنجایش نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ قواعدِ زبان اور لغت کی رو سے ان پر اُنگلی نہیں رکھی جاسکتی۔ لیکن ضروری نہیں کہ معیارِ ذوق کی ترازو میں بھی وہ پوری اُترتی ہو۔

میرزا غالب کی فارسی اور اُردو نظم و نثر میں پیشِ نظر موضوع کے متعلق بکثرت سامان موجود ہے، بعض کتابیں تو مستقل طور پر بائے بسم اللہ سے لیکر تائے تمت تک تنقید ہی کے تحت میں آتی ہیں۔ مثلاً "قاطع برہان" "لطایف غیبی" "سوالات عبدالکریم" اور "تیغ تیز" لیکن ان تصانیف کا جایزہ لینے کی شکل یہی ہے کہ سب سے پہلے ان کتابوں سے مفصل اقتباسات پیش کئے جائیں۔ جن پر میرزا غالب نے یہ تنقیدی کتابیں لکھیں۔ پھر میرزا کی کتابوں سے مختلف ٹکڑے سنا کر موازنہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ حق بہ جانب کون ہے۔ اس کے بغیر میرزا کی شانِ تنقید واضح نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس قسم کی تفصیلات ایک سرسری گفتگو کے دائرے سے خارج ہیں۔ لہذا میں جو کچھ عرض کروں گا اس کی حیثیت محض اشاروں کی ہوگی۔ امید ہے کہ اس طرح بھی نقادی کے اس جوہر کی چہرہ کشائی کا بندوبست ایک حد تک ضروری ہوجائے گا جو قدرت نے مرزا کی طبیعت میں ودیعت کیا تھا

میرزا جس ماحول میں پیدا ہوئے، جس ماحول میں انھوں نے پرورش پائی اور علم حاصل کیا، جس ماحول میں ان کی مشق سخن کا آغاز ہوا۔ اس کے مروجات و محمولات سے وہ یک قلم آزاد و بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے تاہم انھوں نے جس طرح

اپنے نادر اسلوب فکر سے اور قدیم اور دور جدید میں برزخ کا مقام پیدا کیا۔ اسی طرح تنقید میں بھی ان کو برزخ ہی کا مرتبہ حاصل ہے یعنی پچھلوں سے کامل قطع تعلق نہ کرتے ہوئے، آنے والوں کے لئے نئے راستے پیدا کئے اور اپنی انقلاب آفریں فطرت سے کام لے کر جدید دور کی بنیادیں استوار فرمائیں۔ یہ ان کی نقاد طبیعت اور ان کے ذوقِ سلیم کا کرشمہ تھا کہ اپنے عہد کے ادبی عیوب کا انھیں بہت جلد پورا احساس ہوگیا اور ان عیوب سے نہ محض خود جلد از جلد کنارہ کش ہوگئے بلکہ دوسروں کو بھی کنارہ کشی کی موثر دعوت دی نقادانِ فن کی خدمت میں غالباً یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ادبیات کو جس نہج پر میرزا نے ڈالا تھا، یہ آج تک اسی نہج پر جاری ہیں۔

"پنج آہنگ" کا دیباچہ میرزا نے اس زمانہ میں لکھا تھا جب وہ جوانی کے ابتدائی مراحل میں تھے۔ اس میں خطوط نویسی کے جو اصول و معانی پیش کئے ہیں۔ انھیں سامنے رکھ کر غور فرمائیں گے تو صاف آشکارا ہو جائے گا کہ یہ انیسویں صدی عیسوی کے عشرۂ ثالثہ کی صدا نہیں ہے۔ جبکہ ہر بات کو زیادہ سے زیادہ پیچ دیکر کہنا لازمۂ علم و فضل سمجھا جاتا تھا۔ یہ بیسویں صدی عیسوی کی صدا ہے جبکہ تکلفات کے سراسر لغو و لایعنی سمجھا جاتا ہے۔ میرزا کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے:۔

نامہ نگار کو چاہئے کہ نگارش کو مقصود سے زیادہ دور نہ لے جائے اور تحریر میں تقریر کا رنگ پیدا کرے۔

نفسِ مطلب کو ایسے انداز میں قلم بند کرے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

اگر نامہ نگار کے سامنے زیادہ مطالب ہوں تو تمام مطالب کو انتہائی احتیاط سے جدا جدا بیان کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ سب غلط ملط ہو جائیں اور پڑھنے والے کے لئے الجھن کا باعث بنیں۔

نامانوس الفاظ اور دقیق استعارات سے عبارت کو پاک رکھا جائے۔

حتے الامکان تحریر کو طول نہ دیا جائے۔

لطفِ تحریر کا تقاضا یہ ہے کہ ایک لفظ بار بار استعمال نہ کیا جائے۔

زبان کی خوبی کو ہاتھ سے نہ دیا جائے۔ لکھنے والے کو پوری کوشش کرنی چاہئے کہ سادگی اور لطافت اسکی عادت بنجائے کیا یہ روشن ہدایتیں صرف وسعت معلومات سے پیدا ہوسکتی ہیں؟ میرزا سے پہلے بھی بڑے بڑے عالم گزر چکے ہیں اور ان کے زمانہ میں بھی یگانۂ روزگار فاضلوں کی کمی نہ تھی لیکن ایسی باتیں صرف علم سے نہیں۔ بلکہ علم کے علاوہ حسن ذوق۔ کمال جدتِ نظر دقتِ اجتہاد اور مشق و مزاولت سے پیدا ہوتی ہیں۔ نامہ نگاری کے یہی روشن اصول تھے جو میرزا کے اُردو مکاتیب میں بوجہ احسن استعمال ہوئے اور ان مکاتیب کو وہ درجۂ کمال حاصل ہوا کہ ایک صدی گزر جانے پر بھی وہ اُردو زبان میں بے مثال ہیں۔

میرزا نے بھی اگرچہ اپنے دوستوں کی فرمائشوں پر پرانے انداز میں چند تقریظیں لکھیں لیکن وہ اپنے طریق فکر و نظر کو کالاً نہ بدل سکے اور اپنا خاص مجتہدانہ نقطۂ نگاہ نہ چھوڑ سکے۔ ان کے عزیز شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ نے اپنے دیوان کا دیباچہ لکھوایا۔ میرزا عام رواج کے مطابق تفتہ کی مدح میں زیادہ پھیلاؤ سے کام نہ لے سکے۔ یہ امر غالباً تفتہ کے لئے شکایت کا موجب بنا۔ دیکھئے مرزا جواب میں کیا فرماتے ہیں۔

"کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روشن ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھانٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں۔ میرے قصیدے دیکھو۔ تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم تر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کا دیباچہ دیکھو وہ جو تقریظ دیوانِ حافظ کی بموجب فرمائش "جانِ جاکوب بہادر" کے لکھی ہے۔ اس کو دیکھو کہ فقط ایک

بیت میں ان کا تمام زور ان کی مدح سرائی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ کسی شہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی تمھاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔"

یہ نقاد فکر اور حقایق رس نگاہ تھی۔ جس نے میرزا کو پرانی روش سے ہٹا کر نئی راہ پر ڈالا یہی روش ہے جو آج ادبیات میں وجہ افتخار مانی جاتی ہے۔ یہی نقاد فکر اور حقایق رس نگاہ تھی جنے شاعری میں میرزا کے اسلوب بیان کو شانِ امتیاز بخشی وہ بالکل سچ کہتا ہے ؂

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے　　کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

مولانا فضلِ حق خیرآبادی میرزا کے عزیز دوست تھے۔ جب ان میں اور شاہ اسمعیل میں مسئلہ امکانِ نظیر و امتناعِ نظیر پر بحث چھڑی تو مولانا فضل حق نے اپنے نقطۂ نگاہ کی تائید میں میرزا سے ایک مثنوی لکھوائی جو ان کے کلیات نظم فارسی میں موجود ہے۔ لیکن میرزا کی نقاد طبیعت مولانا کے بتائے ہوئے نظرئے کو قبول نہ کرسکی اور انھوں نے مثنوی کے آخر میں صاف لکھدیا۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود　　رحمۃٌ للعالمینے ہم بود

یہ بات مولانا فضل حق کی رائے کے مطابق نہ تھی اس پر وہ بہت بگڑے۔ میرزا نے ان کی دلداری کے لئے مثنوی میں چند شعر بڑھا کر اپنی اس بات کی تغلیط کردی۔

سرسید احمد خاں مرحوم نے بڑی محنت سے ابوالفضل کی "آئینِ اکبری" کی تصحیح فرمائی اسے چھپواتے وقت میرزا کی نقاد طبیعت رہائی مدح و ستایش کے لئے طیار نہ ہوسکی۔ وہ انگریزوں کے عہد کی ایجادات سے بہت متاثر تھے اور اکبر کے زمانہ کے آئین کو تقویم پارینہ سمجھتے تھے۔ لہذا بے تکلف ان چیزوں کو سراہنے لگے جو انگریزوں کے ذریعہ سے اس ملک میں پہونچی تھیں۔ مثلاً پتھر کو پتھر پہ رگڑ کر آگ سلگانے کی بجائے دیا سلائی سے کام لینا۔ بھاپ سے جہاز اور ریل گاڑیاں چلانا۔ تار برقی کے ذریعہ سے دور دوز کی خبریں لمحہ بھر میں منگالینا۔ فرماتے ہیں :-

آتشے کز سنگ بیروں آورند　　ایں ہنرمنداں زخس چوں آورند
تا چہ افسوں خواندہ اندایناں برآب　　دود کشتی رامہے راند در آب
گہ دخاں کشتی بہ جیحوں مے برد　　گہ دخاں گردوں بہ آموں مے برد
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند　　حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
ایں نمے بینی کہ ایں دو نا گروہ　　در دو دم آرند حرف از صد کروہ

آخر میں سرسید کے پاسِ خاطر سے کہتے ہیں :-

غالب آئینِ خموشی دل کش است　　گرچہ خوش گفتی نہ گفتن ہم خوش است
در میاں سید پرستی دین تست　　از ثنا بیذر دعا آئین تست
ایں سراپا فرۂ فرہنگ را　　سید احمد خانِ عارف جنگ را
ہرچہ خواہد از خدا موجود باد　　بیش کارش طالع مسعود باد

اب میرزا کی نقادی کی ایک دو مثالیں اُردو میں بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ عرفی کے حمد والے قصیدے کا مشہور شعر ہے :-

من کہ باشم عقل کل را ناوک اندازِ ادب　　مرغ اوصاف تو از اوجِ بیاں انداختہ

تمام شارحین اس کی جو شرح فرماتے تھے وہ خود میرزا کی زبان سے سنئے - فرماتے ہیں :-
اس کی جو شرح چھاپے میں لکھی ہے اس کو ملاحظہ کیجئے اور معنی میری خاطر نشان کیجئے تو سلام کروں - پہلی نظر یہاں پڑنی چاہیئے "از اوجِ بیاں انداختہ" کا فاعل کون ہے اور مفعول کون ہے ؟ اگر عقل کل انداختہ کا مفعول اور "منکہ" کے کاف کو کدامیہ ٹھیراؤ گے تو بے شبہ انداختہ کے دو فاعل ٹھیریں گے۔ "ایک ناوک انداز ادب" اور "ایک مرغ اوصاف تو" ایک فعل دو فاعل، یہ کیا طریق اور کیسی تحقیق ہے ؟ مروجہ شرح پر تنقید کے بعد خود یوں معنی بیان کرتے ہیں -

"من انداختہ" کا مفعول "رامقدر" منکہ کا کاف توصیفی "ناوک انداز ادب" ادب آموز یعنی استاد "مرغ اوصاف تو" فاعل (مطلب یہ ہوا کہ) مجھ کو کہ عقل کل کا استاد ہوں - یوں مرغ توصیف نے اوجِ بیان سے گرا دیا۔ عقل کل تک کہ وہ علویین میں اعلیٰ ہے اس کا ناوک پہونچ سکتا ہے - مگر میرے اوصاف کا مرغ اس مقام پر ہے کہ جہاں اس ناوک انداز کو ناوک پہونچانے کی گنجائش نہیں - اوجِ بیان سے گرنا عاجز آنا ہے - قدرت وہ کہ عقل کل سے بھی زیادہ اور عجز یہ کہ روح بیان سے گر گیا - اچھا مبالغہ ہے - مرغ اوصاف کی بلندی کا اور کیا خوب مضمون ہے ، اظہار عجز باوجود اموری قدرت کا - ظہوری کا ایک شعر :-

مروت کرد شبہا بر تو سیر بام و در لازم
کہ باشد چراغ خانہ ہائے بے نوایاں را

اس کا عام مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ تو مروت سے کام لے کر راتوں کے اندھیرے میں کوٹھے پر چڑھ کر دیکھے تو معلوم ہو جائے کہ بے نواؤں کے گھروں میں ایک دیا تک موجود نہیں - اب میرزا سے اس شعر کی شرح سنئے - پھر اندازہ فرمایئے کہ میرزا کیوں ظہوری کو "موج و رواں معنی" کہتے ہیں - فرماتے ہیں :-

ظہوری کا ممدوح اور معشوق ایک ہے یعنی سلطان جلیل القدر ابراہیم عادل شاہ - بادشاہوں کے منظر بلند ہوتے ہیں اور کیا بعید ہے کہ رعایا اور ملازمین میں سے کچھ لوگ زیر قصر رہتے ہوں - اس واسطے بادشاہ دن کو اس منظرِ بلند پر نہیں چڑھتا کہ مبادا رعیت یا ملازموں کی جورو بیٹیاں نظر آئیں - رات کو ان کے گھر تاریک ہوتے ہیں - اگر کوئی بلند مقام پر چڑھا تو کچھ نظر نہیں آئے گا - یہ مدح ہوئی عفت کی اب ابہام کو سوچئے - ممدوح نے راتوں کو کوٹھے پر چڑھنا اپنے اوپر لازم کیا ہے - اس واسطے کہ (بے نواؤں کے) گھروں میں چراغ نہیں - اگر کسی کو کپڑے میں پیوند لگانا یا چرخے کی کوئی چیز گانٹھنی یا کسی مریض کا تفحصِ حال منظور ہو تو وہ گھر اس ممدوح کے پرتو جمال سے منور ہو جائے - چراغ کی حاجت باقی نہ رہے . . . . مروت کا مزہ وجدانی ہے - سوا اس لفظ کے کوئی لفظ یہاں کام نہیں آتا - اگر حفظ ناموس رعایا تو مروت ہے - اگر مفلسوں کی کار برآری ہے تو مروت ہے -

اصل نقادی یہی ہے کہ نگاہ ایک ایک لفظ میں پھرے اور معلوم کرے کہ وہ کس غرض سے شعر میں لایا گیا اور مضمون شعر کی ترکیب و توضیح میں اس کا مقام اور اسکی حیثیت کیا ہے - یہ مرزا کی شانِ نقادی کی محض ایک جھلک تھی - اس بارے میں تفصیلی بات چیت کے لئے لمبی صحبت درکار ہے -

غلام رسول مہر
(آہنگ)

جفر و رمل کی نایاب کتابیں

(۱) (عربی) مصباح الرموز . . . منقول از امام جعفر صادق - ۶ر
(۲) (عربی) علم جفر . . . منقول از امام جعفر صادق . . . ۔۔
(عربی) قرعہ شریفہ . . . منقول از محی الدین العربی)
(فارسی) علم جفر - (عربی) کشف الساطع (جفر) - فارسی مقصد اقصیٰ
(عربی) کتاب زایرجات واشرف المربعات از امام غزالی

۳ (اردو) کوکب الرمل ۶ر - (اردو) محبوب الرمل ۵ر
۴ - (فارسی) مصداق الرمل - از محمد عطا لاہوری - - ۵ر
(فارسی) انوار الرمل - از حاجی عبدالغنی شروانی - - ۵ر
۵ - (فارسی) سراج الرمل - ۶ر - (فارسی) مجموعہ رسایل رمل
۶ - (فارسی) خواب نامہ یعنی کامل التعبیر مطبوعہ بمبئی صفحہ ۱

صبحِ کاذب

خام کتنا تھا سیاست کے طبیبوں کا شعور،
کروٹیں برق نے لیں آنکھ شگوفوں کی کھلی
روح معصوم شگوفوں کی سنانوں پہ تلی
خون پانی ہوا دیوارِ گلستاں کی دھلی
بن گیا زخمِ وطن چار ہی دن میں ناسور

برق لہرانے لگی وقت کے کاشانوں میں
گوہر و لعل کے فردوس بریں، جلنے لگے
مسند و تاج کے افلاک نشیں، جلنے لگے
صاحبِ مال و خداوندِ زمیں، جلنے لگے
شعلے کرنے لگے فریاد نیستانوں میں

چادرِ زہرہ و ناہید و قمر جلنے لگی
تلملا اٹھا غمِ ہوش ربائے مریخ
آسماں چیر گئی حوروں کی سہمی ہوئی چیخ،
چھپ گئی کہر میں تہذیب کی روشن تاریخ
صبح خود چہرے پہ گلگونۂ شب ملنے لگی

زندگی ہوگئی خود اپنی نگاہوں میں حقیر
بے مہ و کاہکشاں راتیں یہ کاذب صبحیں
مسکرائیں کہیں تارے نہ کہیں پھول کھلیں
شب دیجور کی تنظیم کو خورشید جھکیں
ہائے آزاد غلاموں کا یہ مجبور ضمیر

یہ لہو تھوکتی شبنم یہ دھواں دیتے سحاب
کانپتے زمزمے یہ ہانپتے طاؤس و نفیر
یہ دھڑکتے ہوئے سینوں میں مناجات کے تیر
یہ قبائے شہی یہ نیت کیخسرو و میر
ہائے یہ نیلم و الماس و زمرد کے سراب

دولت و زر کی نمائش یہ لباسوں کا نکھار
یہ سیاست کا خم و چم یہ عقیق و گوہر
یہ چمکتے ہوئے عہدے یہ چہکتے لیڈر
غم تیزاب میں ہیں شہد کی مکھی بن کر
ملک و ملت کے ڈرامے کے یہ "جھوٹے کردار"

فرطِ غم سے لہو دینے لگے یہ ساغر و جام
دھوپ کہسار کی گلزار تک آپہونچی ہے
زندگی مرحلۂ دار تک آپہونچی ہے
بات چنگیز سے فنکار تک آپہونچی ہے
شعلۂ برق میں ملفوف ہیں اب کوشک و بام

وادیِ نیل سے طوفاں کی صدا آتی ہے
اُڑ گئے خس کی طرح قافلۂ مصر و عجم
جانِ یوسف یہ عزیزوں کا ہوا خوب کرم
ساحلِ ضبط سے ٹکرانے لگا دجلۂ غم
کشتیِ عمر کی ہو خیر، بلا آتی ہے

اب ہے تکلیفِ نظر سوکھی ببولوں کی سحر
سر بزانو ہیں گل و لالہ گلستانوں میں
کوئی پُرکیف سی مستی نہیں خمخانوں میں
قصرِ مہتاب نہ خورشید کے کاشانوں میں
دامنِ خار سے اُلجھی ہے یہ پھولوں کی سحر

فضا ابن فیضی

مطبوعات موصولہ

نوائے نے مجموعہ ہے محمد سلیمان صاحب کی ۱۵ نظموں اور چند غزلوں کا جسے جہانگیر پریس کشن گنج پورنیا نے شایع کیا ہے۔ ضخامت ۸۶ صفحات - قیمت عہ

سلیمان صاحب صوبۂ بہار کے ایک معروف شاعر و صحافی ہیں اور ایک خاص حلقہ میں کافی مقبول - ان کے کلام میں کوئی معنوی بلندی یا تخییل کی ندرت نہیں پائی جاتی، لیکن انداز بیان کی سلاست و روانی کافی دلکشی رکھتی ہے -

پیش لفظ میں جناب اکمل یزدانی ام - اے نے ان کی شاعری کا تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ وہ ایک تعمیر پسند شاعر ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں زمانہ کے موجودہ رجحانات سے متاثر ہوکر لکھتے ہیں۔ کلام کے مطالعہ سے یزدانی صاحب کے اس خیال کی یقیناً تائید ہوتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس نوع کے تاثرات میں جو جوش و ولولہ پایا جاتا ہے وہ ان کے کلام میں نہیں ہے اور اس لئے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں بجائے شعریت کے ناصحانہ کیفیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ غزلوں کا حصہ زیادہ پھیکا ہے۔

ڈائن اور دوسرے افسانے مجموعہ ہے شکیلہ اختر کے ۱۲ افسانوں کا جسے مکتبۂ ادب رمنا روڈ پٹنہ نے شایع کیا ہے، ضخامت ۱۵۴ صفحات - قیمت ۱۲؍ - کتابت وطباعت غنیمت -

اس مجموعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جتنے افسانے پائے جاتے ہیں وہ واقعی عورت کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جن میں مردانہ طرز تحریر کی تقلید نہیں کی گئی - زبان، تاثرات اور ٹکنک سب میں نسائیت پائی جاتی ہے اور یہ خوبی کم نہیں۔

شکیلہ اختر نے ان افسانوں سے ثابت کیا ہے کہ معاشرہ میں عورت کو جو درجہ ملنا چاہئے اس سے محروم ہے اور اسی لئے وہ بہت سے آلام و مصائب میں مبتلا رہتی ہے۔ اس مقصد کے لئے جو لب ولہجہ اور انداز بیان انھوں نے اختیار کیا ہے وہ بہت موزوں و مناسب ہے اور اسی لئے یہ افسانے مطالعہ کے بعد اک گہرا اثر پڑھنے والے کے دل میں چھوڑ جاتے ہیں -

عورت قدرتاً زیادہ جذباتی ہوتی ہے اور اگر اسے اپنے جذبات پر اظہار کی قدرت حاصل ہو تو وہ مردوں سے زیادہ دنیا کو متاثر کرسکتی ہے اس لئے ہمیں امید ہے کہ شکیلہ اختر کی محنت رائگاں نہ جائے گی اور لوگ دردمندانہ حیثیت سے اس کا مطالعہ کریں گے -

مراثی میر میر تقی میر دنیائے شعر میں جس مرتبہ کے حامل ہیں، کسی سے مخفی نہیں اور اسی لئے لوگوں نے ڈھونڈھ ڈھونڈ کر ان کے کلیات میں وہ سب کچھ جمع کردیا جو انھیں دستیاب ہوا، لیکن ان کے مراثی اس وقت تک سامنے نہیں آئے تھے، اور بعض کتب خانوں ہی میں محفوظ تھے -

تذکروں سے تو بیشک یہ پتہ چلتا تھا کہ میر نے مرثیے بھی کہے اور بعض نے ایک آدھ بند نقل بھی کئے لیکن ان کے مراثی کا پورا مجموعہ نہ کسی کلیات میں شایع ہوا نہ ان پر کسی نے تبصرہ کیا، اس لئے مسیح الزماں صاحب ام - اے کا تلاش وجستجو کے بعد ان مراثی کو خوش ترتیبی کے ساتھ شایع کرنا یقیناً زبان کی بڑی خدمت ہے جس کی قدر ملک کو کرنا چاہئے -

اس مجموعہ میں ۲۷ مرثیے مربع (دوبیتی) ہیں، ایک مرثیہ مثمن ہے، تین مرثیے مسدس ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ سلام ہیں اور چار قصیدے، اس طرح یہ کل مجموعہ مع مقدمہ کے ۲۰۸ صفحات کو محیط ہے۔

ہمارے یہاں جس وقت مرثیہ کا ذکر آتا ہے تو بے اختیار ہمارا ذہن انیس و دبیر کی طرف جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اگر
انیس کے معیار کو سامنے رکھا جائے تو میر کے مراثی کوئی حیثیت نہیں رکھتے، لیکن اگر آپ اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں گے کہ میر
کے مرثیے اب سے تقریباً دو سو سال پہلے کی تصنیف ہیں تو ان کی اہمیت ایک مورخ و محقق زبان کے لئے انیس کے مرثیوں سے
زیادہ ہو جاتی ہے۔

فاضل مرتب نے ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ لکھ کر اُردو مرثیہ کی تاریخ پر جو روشنی ڈالی ہے وہ بجائے خود بڑی مفید چیز
ہے، قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ انجمن محافظ اُردو نیا محل منصور نگر۔ لکھنؤ۔

وجد

سکندر علی وجد کے کلام کا مختصر سا انتخاب ہے جسے ٹائپ میں انجمن ترقی اُردو علی گڑھ نے شایع کیا ہے۔ یہ انتخاب
چند نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ انتخاب اچھا ہے، وجد کا کلام پاکیزگی خیال اور حسن ادا کا مرقع ہے غزلیں
گو تھوڑی ہیں لیکن تمام کی تمام صاف و سادہ اور دلکش ہیں۔ وجد کی شاعری میں حسن بیان اور حسن خیال کا امتزاج بڑا
نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

خوش جمالوں کی یاد آتی ہے بے مثالوں کی یاد آتی ہے
جن کی آنکھوں میں تھا سرورِ غزل اُن غزالوں کی یاد آتی ہے
سادگی لاجواب ہے جن کی اُن سوالوں کی یاد آتی ہے
جانے والے کبھی نہیں آتے جانے والوں کی یاد آتی ہے

اس مجموعہ میں ان کی بہت مشہور نظم اجنتا بھی شامل ہے۔ حجم ۲۰ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔

ٹوٹ گئی ڈالی

یہ کتاب شفیق بانو کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان کہانیوں کا مرکزی خیال عورتوں کی مظلومی و مجبوری
اور مردوں کی ستم کیشی و فریب دہی ہے۔ زبان صاف و شستہ ہے۔ ہر کہانی میں ایک جذباتی ارتعاش
ہے جس سے پڑھنے والے پر اثر ہوتا ہے۔ واقعات جس انداز میں بیان کئے گئے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں۔ یقیناً مرد نے ہمیشہ عورت
کو ایک کھلونا سمجھا، اس سے کچھ دیر کھیلا جب طبیعت سیر ہو گئی تو پھر اس سے نگاہیں پھیر لیں۔ عورت کے لطیف جذبات کی
اب تک اس نے صحیح معنوں میں قدر نہیں کی۔ کہانیوں کا انداز بیان صاف و سلیس ہے۔ مکالمات اچھے ہیں۔ واقعات کو جس
ماحول میں بیان کیا گیا ہے وہ بھی صحیح ہیں لیکن افسانوں میں جذباتیت Sentamentalism کے علاوہ
اور کچھ نہیں ہے۔ جذباتیت کے ساتھ ساتھ فکری وزن کی بھی ضرورت ہے۔ محترمہ شفیق بانو نے کہیں بھی یہ بتانے کی
کوشش نہیں کی کہ آخر عورت کے لئے ان مظالم سے نجات کی کیا صورت ہے؟۔ یہ بات اگر کتاب میں ہوتی تو تعمیری حیثیت سے
کتاب نہایت مفید ہوتی۔ طباعت و کتابت اچھی ہے اور تین روپیہ میں ہوم لائبریری پبلیکشنز اُردو بازار لاہور سے مل سکتی ہے۔

ایک اسلام

تصنیف ہے ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اس وقت تک اسلام کو جس طرح
پیش کیا گیا ہے وہ یکسر قرآن و تعلیمات قرآن کے منافی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اسلام کا درس
خالص انسانیت پرستی و اخوت عامہ ہے، وہ نہ صرف یہ کہ نسل و رنگ کے امتیاز کا مٹانے والا ہے، بلکہ نفس مذہب کی صداقت
کو بھی وہ بہت فراخ نظری سے دیکھتا ہے۔

فاضل مصنف نے کرشن، بودھ، گرو نانک، وید، گیتا، انجیل، توریت تمام مقدس ہستیوں اور صحیفوں سے بحث کی ہے
اور ان سب کی حقیقت و صداقت کا اعتراف کیا ہے، انھوں نے ایک مستقل باب تعلیمات قرآنی کے لئے وقف کیا ہے جس میں
ایمان، توحید، اعمال صالحہ اور صلوٰۃ و زکوٰۃ وغیرہ کے فلسفہ کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ان کا مقصود اس تصنیف سے یہ بتانا ہے کہ اسلام نام ہے صرف صداقت کا اور صداقت کا اور صداقت دنیا میں ایک ہی ہے خواہ وہ کسی ملک اور کسی قوم کے رہبر و مصلح کی زبان سے ظاہر ہو۔

ڈاکٹر صاحب کی وسعتِ نظر اس میں شک نہیں قابلِ داد ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ پاکستان میں جہاں احمدیوں کو بھی غیر مسلم سمجھا جاتا ہے اس کتاب کو کس نگاہ سے دیکھا جائے گا اور ڈاکٹر صاحب کو اس جرأت کی داد دینا چاہئے کہ باوصف پاکستانی ملازم ہونے کے انھوں نے ایک ایسی کتاب لکھنے کی جرأت کی، جسے مولوی کفر و الحاد کی تبلیغ کے اور کچھ نہیں کہ سکتا۔

یہ کتاب مجلد نہایت اہتمام سے شایع کی گئی ہے اور کتاب منزل لاہور سے چار روپیہ میں مل سکتی ہے۔

گاندھی بابا کی کہانی

تالیف ہے قدسیہ بیگم زیدی کی جسے مکتبۂ جامعہ دہلی نے نہایت اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ یہ کتاب بچوں، عورتوں اور کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے نہایت آسان زبان میں لکھی اور روشن حروف میں چھاپی گئی ہے۔

اس میں مہاتما گاندھی کی زندگی کے خاص خاص واقعات کو کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور ایسے دلچسپ انداز سے کہ خواہ مخواہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ جا بجا تصاویر و نقوش نے اسے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ شروع میں جواہر لال نہرو کا پیش لفظ بھی ہے جس میں انھوں نے اس کتاب کا خیر مقدم کیا ہے۔ قیمت پانچ روپیہ۔

تذکرہ شعرائے اردو

از ڈاکٹر عبداللہ صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ کاغذ نہایت نفیس، طباعت ٹائپ ناشر:- مکتبۂ جدید لاہور۔

مصنف نے یہ کتاب بڑی خوش اسلوبی سے ترتیب دی ہے۔ ابتدا میں تمام "مرکزی" تذکروں کا ذکر ایک علمی ترتیب سے کیا ہے۔ ہر تذکرے کی خوبیوں اور خامیوں کا بڑی احتیاط سے تجزیہ کیا ہے، میر تقی میر سے لیکر کریم الدین، دتا سی اور مولانا حسین آزاد تک کے تذکروں کا جائزہ لیا ہے۔ قدیم و جدید تذکروں میں اسلوب بیان اور خیالات و رجحانات کے اعتبار سے جو تفاوت ہے اسے بھی بڑی خوبی سے بیان کیا ہے بعد میں "تنقید تذکرہ" کے عنوان سے ایک محاکمہ ہے جو نہایت عالمانہ اور منصفانہ ہے۔ اس محاکمہ میں بڑی احتیاط سے تمام قدیم و جدید اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کی علمی ترتیب اور تنقیدی انضباط پڑھنے والے کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جمالِ فطرت

فکری سلطانپوری کے قطعات کا مجموعہ ہے جسے خود انھوں نے پسندیدہ طباعت و کتابت کے ساتھ سفید کاغذ پر مجلد شایع کیا ہے۔ قیمت چار روپیہ۔ پاکستان میں نمبر ۱۷ مارٹن روڈ کراچی سے مل سکتی ہے اور ہندوستان میں امیر مرزا صاحب حنا بلڈنگ لکھنؤ سے۔

فکری کی شاعری حسن کی رنگینیوں میں کھوئی ہوئی ہے۔ حسن خواہ کسی روپ میں آئے وہ اس کی پرستش کرنے کے لئے طیار ہیں ان کے یہاں افسردگی اور احساس شکست نہیں ہے وہ فطرت کے حسن، زندگی کے جمال اور محبوب کے جلوؤں میں کھوئے رہتے ہیں۔ ان کے یہاں مشاہدہ ہے تجربہ ہے اور تیز احساس۔ "زندگی سے بیزاری" ان کے کلام میں کہیں بھی نہیں ملتی۔ لیکن ان کے یہاں عصری میلانات بالکل نہیں ہیں وہ سماج کی پیچیدگیوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے بعض قطعات میں کہیں کہیں عریانی اور سوقیت آگئی ہے۔ ان کے اشعار میں لذتیت پورے طور پر نمایاں ہے جو کہیں کہیں حدودِ لطافت سے گزر گئی ہے۔

رموزِ خطابت

تالیف ہے نذیر الدین احمد صاحب کی جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ خطابت کیا ہے اور اس میں کیونکر کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔

خطابت اور شاعری دونوں در اصل وہبی چیزیں ہیں اور اگر کوئی شخص قدرتاً خطیب بننے کی صلاحیت لیکر نہیں آیا تو وہ اچھا خطیب نہیں بن سکتا، لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر وہبی خطیب کامیاب خطیب بن سکے اگر وہ اس فن کو کی طرح حاصل نہ کرے۔

نذیرالدین احمد صاحب نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ تقریر کرنے کے لئے مقرر کو کیا طیاری کرنا چاہئے اور اسکی کامیابی باتوں پر منحصر ہے، اُردو میں اس موضوع پر بہت کم مواد ملتا ہے اس لئے امید ہے کہ ملک میں اس کی قدر کی جائے گی۔

قیمت ۱۲ؔ ملنے کا پتہ:- انجمن اشاعت علم و ادب ۲۳-۷ چیلہ پورہ حیدرآباد (دکن)

لگونہ مجموعہ ہے جناب محمد یاسین تسکین قریشی کی غزلوں اور چند نعتیہ نظموں کا۔ ابتدا میں حضرت جگر، جناب اثر اور پروفیسر سرور کی رائیں درج ہیں اور ان سب نے جناب تسکین کے کلام کو بالاتفاق سراہا ہے، حالانکہ اس اہتمام ضرورت نہ تھی اور جناب تسکین کا کلام بغیر کسی تعارُف کے آپ اپنی سفارش ہے۔

اس وقت غزلوں سے زیادہ نظموں پر توجہ کی جاتی ہے اور جناب تسکین نے نظمیں بھی کافی کہیں اور خوب کہیں، لیکن میرے دیک ایک شاعر کا صحیح مرتبہ اس کی غزل ہی کو دیکھکر کیا جاسکتا ہے اور اس لحاظ سے میں جناب تسکین کو اس وقت کا نہایت چھا غزلگو شاعر سمجھتا ہوں۔ ذیل کے چند اشعار سے ہر شخص ان معیار تغزل کا اندازہ کرسکتا ہے۔

کچھ اور پوچھئے، یہ حقیقت نہ پوچھئے — کیوں مجھ کو آپ سے ہے محبت نہ پوچھئے
نہ جانے محبت میں کیوں ہیں ضروری — وہ کچھ حسرتیں جو کبھی ہوں نہ پوری
مجھے عزیز سہی خاک دل مگر یہ کیا — تمھیں نے آگ لگائی، تمھیں بجھا نہ سکے
وہ کیا کریں گے مداوائے دردِ دل تسکیں — جو اک نگاہ محبت کی تاب لا نہ سکے
تم دے گئے ہو تنہائی دل، — تم کیا گئے ہو، خلوت نہ محفل
عشق سے پہلے نہ سمجھے تھے خوشی ہوتی ہے کیا — کیوں چمکتے ہیں ستارے چاندنی ہوتی ہے کیا
کوئی ہنستا ہے کوئی رو رہا ہے — یہ آخر کیا تماشہ ہو رہا ہے
محبت میں کسی کی کیا شکایت — جو ہوتا آ رہا ہے، ہو رہا ہے
کیا زندگی کا احساس کامل، — تیرے بغیر اے غارتگرِ دل،
لب پر تبسم آنکھوں میں آنسو، — ہم لکھ رہے ہیں افسانۂ دل،

اس قسم کے سر تیز نشتروں سے یہ مجموعہ بھرا پڑا ہے۔

یہ مجموعہ نہایت اچھی طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع ہوا ہے اور ۲ؔ میں مکتبۂ جامعہ دہلی سے مل سکتا ہے

بین الاقوامی سوشلزم رسالہ ہے ضیاء الحسن فاروقی ام۔ اے کا لکھا ہوا جس میں انھوں نے سوشلزم کی ابتداء اور اس کی تدریجی ترقی کی تاریخ نہایت احتیاط و خوبی کے ساتھ پیش کی ہے۔ جناب فاروقی بڑے کامیاب و تجربہ کار صحافی ہیں، اس لئے ان کی یہ کوشش ایک "کار آگاہانہ" کوشش ہے اور ان تمام خامیوں سے پاک ہے جو ایک Kayman کی کتاب میں پائی جاتی ہیں۔

قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:- دفتر مدینہ بجنور

آہنگ مجموعہ ہے جناب مجاز کی نظموں اور غزلوں کا جسے آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی سے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے اس وقت کے نوجوان ترقی پسند شعراء میں سب سے کم ترقی پسند میری نگاہ میں مجاز ہیں اور یہ میں نے اس لئے

کہا کہ ان کی نظموں کا پس منظر بھی کلاسکل خصوصیات سے معرّا نہیں ہوتا، چہ جائیکہ غزلیں کہ وہ تو تغزل کی تمام خصوصیات سے معمور ہوتی ہیں۔

مجاز کے کلام کی وہ خصوصیت جو انھیں دور جدید کے شعراء سے ممتاز کرتی ہے، اس کا غنائی لب و لہجہ اور بیساختہ پن ہے۔ ان کے کلام کا عنصر غالب سلاست و روانی ہے اور یہ وہ چیز ہے جو اکتساب سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ محض ذوق و وجدان سے پیدا ہوتی ہے۔ قیمت للعہ

کمار سمبھو

اُردو ترجمہ ہے کالی داس کی مشہور نظم کمار سمبھو کا جسے بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے اُردو میں پیش کیا ہے۔ کالی داس جس مرتبہ کا شاعر تھا ظاہر ہے، اور اس لئے اس کے کلام منظوم ترجمہ کسی معمولی شاعر کا کام نہ تھا لیکن جناب منور لکھنوی اس منزل سے جس قدر کامیاب گزرے ہیں اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کالی داس کے بلند خیالات اور اس کی شاعرانہ خصوصیات کو جس حسن و خوبی کے ساتھ اُردو نظم میں پیش کیا گیا ہے وہ نہ صرف انتہائی مہارت بلکہ حد درجہ پاکیزہ ذوق چاہتا تھا۔

جناب منور لکھنوی سرزمین لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہیں اور منشی دوارکا پرشاد افق کے فرزند ہیں جنھوں نے رامائن اور مہابھارت وغیرہ کے نہایت کامیاب ترجمے کئے تھے۔ منور صاحب کو یہ ذوق اپنے والد سے ورثہ میں ملا ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس ورثہ سے انھوں نے خود بھی پورا فایدہ اُٹھایا اور دوسروں کو بھی مستفید کیا۔ یہ کتاب انجمن ترقی اُردو بک ڈپو دہلی نے نہایت اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔

مراثی شاد

مجموعہ شاد عظیم آبادی کے پانچ مرثیوں کا جنھیں جناب حمید عظیم آبادی نے شایع کیا ہے، شاد غزل گو ہونے کی حیثیت سے جس مرتبہ کے شاعر تھے وہ کسی سے مخفی نہیں، لیکن یہ علم بہت کم لوگوں کو تھا کہ انھوں نے مرثیے بھی کہے اور ایسے معرکہ کے کہ ان کو دیکھ کر انیس کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ضرورت تھی کہ ان مرثیوں کو شایع کرکے جناب شاد کی اس شاعرانہ خصوصیت کو بھی سامنے لایا جاتا۔

اس مجموعہ کا حجم ۱۷۲ صفحات ہے اور قیمت پانچ روپیہ جو یقیناً بہت زیادہ ہے۔ معتمد بزم شاد، حمید منزل پٹنہ سے خط و کتابت کی جائے۔

آج کے نغمے کل کے شعلے

مجموعہ ہے عظیم قریشی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی نظموں کا جسے ملک دین محمد اینڈ سنز اشاعت منزل لاہور نے نہایت اہتمام کے ساتھ شایع کیا ہے۔

جناب عظیم قریشی پنجاب کے جدید شعرا میں سے ہیں اور خیال و ٹکنک کے لحاظ سے بڑے آزادہ رو اور ندرت پسند۔ انکے نظموں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تجرباتی دور سے گزر رہے ہیں، اور ممکن ہے ان کی جودت و ذہانت انھیں اس منزل سے کامیابی کے ساتھ لے جائے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

آکاش وانی دکھیا سنسار

یہ ڈائری ہے جناب کندن کی جس میں انھوں نے اپنے تاثرات "خیالات پریشاں" کی صورت میں یکجا کر دئے ہیں۔

ان خیالات کا تعلق بالکل اصلاح تمدن و معاشرت سے ہے اور ان کے ذریعہ سے انسانیت پرستی اور اخوت عامہ کی تعلیم دی گئی ہے جس کی آجکل سخت ضرورت ہے۔ یہ خیالات کسی ایک وقت یا مقام کے تاثرات سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ مختلف اوقات و مقامات میں جو کیفیات، کندن صاحب کے دل و دماغ میں پیدا ہوئے انھیں یکجا کر دیا گیا ہے۔ بعض تاثرات صرف اقوال کی حد تک مختصر ہیں لیکن روح ان سب کی ایک ہی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آج کل جبکہ دنیا کا امن وسکون خطرہ میں ہے اور ہر متنفس اس کی جستجو میں سرگرداں ہے، یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔

قیمت دو روپیہ، ملنے کا پتہ:۔ ۸۸ راجندر نگر، شنکر روڈ۔ نئی دہلی۔

علم شہریت اور نظام حکومت

جناب ابراہیم عمادی کی تصنیف ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ موضوع "Civics" کے لئے وقف ہے جس کا ترجمہ انھوں نے شہریت کیا ہے (حالانکہ مدنیت یا بلدیت زیادہ موزوں ترجمہ تھا) دوسرے حصہ میں ایڈمنسٹریشن (نظام حکومت) سے بحث کی گئی ہے۔

حصۂ اول دس ابواب پر مشتمل ہے جن میں شہری ہونے کے مفہوم اور اس کے حقوق وفرائض سے بحث کی ہے، دوسرے حصہ میں بارہ ابواب ہیں جن میں دستور ہند کی تدریجی ترقی اور اس کے نئے دستور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے صد درجہ مفید ہے اور اب کہ ہندوستان آزاد ہو چکا ہے اس کے ہر ہر فرد کو سمجھنا چاہئے کہ ایک آزاد شہری ہونے کی حیثیت سے ایک جمہوری حکومت میں اس کا صحیح موقف کیا ہے، اس کے حقوق فرائض کیا ہیں، اور حکومت سے وہ کیا مطالبات کر سکتا ہے۔

اس کتاب میں ہندوستان کے نئے دستور پر خاص زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کا مطالعہ بھارت کے ہر باشندہ کے لئے ضروری ہے۔

یہ کتاب نہایت آسان وسلیس عبارت میں لکھی گئی ہے جس سے نہ صرف طلبہ بلکہ پڑھے لکھے عوام بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، یہ کتاب عثمانیہ کتب خانہ بمبئی (۳) سے ڈھائی روپیہ میں مل سکتی ہے۔

قمر شیروانی :۔

کبھی آشیاں تک گئے لوٹ آئے ــــ کبھی آشیاں کی تمنا، مسلسل!
سحر تک بس تری باتیں رہی ہیں ــــ کچھ ایسی بھی خنک راتیں رہی ہیں
مری اکثر ملاقاتیں رہی ہیں، ــــ تجھے دیکھا نہیں ہے، پھر بھی تجھ سے
مرنے والے کدھر سے گزرے ہیں ــــ جینے والوں کو کیا خبر اس کی
ہم بھی دیوانہ وار ہنستے ہیں ــــ لگا ہے گا ہے تو ہوش والوں پر،
پھر گریباں کے تار ہنستے ہیں ــــ پھر بہاروں کا تذکرہ ہے قمر
ہم پر خود الزام بہت ہیں ــــ اُن سے قمر کیا شکوہ کیجے
نام بدلے حیات نے کیا کیا ــــ غم دئے کائنات نے کیا کیا،
آپ کے التفات نے کیا کیا ــــ رنگ دیکھے مری تباہی کے

مجھ کو مارا ہے ہر قدم پہ قمر
ایک جینے کی بات نے کیا کیا

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے قیمت ہر حصہ کا چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندیٔ مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت ۱ روپیہ

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اردو میں یہ سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

(۲) مادیین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کا عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اتنا بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اسکے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے متعلق سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و گمنامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے زبان، پلاٹ و انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے،

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایکبار اس کو شروع کردینا آخر تک پڑھ لینا ہے یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت

ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر، مورخانہ نظر اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اُردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ غالب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ ادبیات اور اصول نقد فنون و حقیقت نگاری

قیمت ... علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ سنہ ۱۹۳۰ء

[illegible] مومن نمبر — جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے۔ مومن کے مطالعہ کیلئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی کا مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری مارچ

جو [illegible] نعت [illegible] ملک کے [illegible] اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۸ء

[illegible] نمبر نگار کا جو بلا نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی [illegible] [illegible] پیش کیا گیا ہے کہ مسلمان اپنے مستقبل کا [illegible] اسلام کے دور قدیم کی طرف پھر لوٹ جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شامل کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے یکساں معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں سنہ ۱۹۲۲ء سے لیکر سنہ ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے۔ اس میں بعض ایسے اکابر شعرا کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں فادر ہنڈرسن کی مشہور عالم کتاب مستقبل کی تلاش کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی جدید اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستے کو [illegible] دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے [illegible] اور ان کے اسباب [illegible] کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ

۵۵ سال سے بعد



یہ کتاب نغمات [illegible] [illegible] [illegible] ہاتھ میں لینے کے بعد اسو [illegible] نہیں سکتے جب [illegible] کر لیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ [illegible] زندہ رہنا بھی [illegible]

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

سالنامہ سنہ ۱۹۵۲ء

یہ حسرت نمبر ہے جس میں ملک کے تمام اکابر [illegible] [illegible] انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ [illegible] [illegible] [illegible] حسرت کی شاعری کا [illegible] [illegible] [illegible] قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ سنہ ۱۹۵۳ء

داغ نمبر جس میں داغ کے سوانح حیات بہت [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] حیدرآباد، رامپور کے علاوہ ان کی حیات [illegible] [illegible]

رجسٹرڈ نمبر ایل ۶۶۸۴

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کردینے والی انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک عظیم الشان کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات، مجلد نو روپیہ لعہ، علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات کا مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس و دہان ہی (؟)۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا۔ توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ۔ ضخامت ۴۴۲ صفحات، کاغذ سفید دبیز۔ قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی و نفساتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے روکنے میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

آیندہ سالنامہ کا اعلان صفحہ ۳ پر ملاحظہ فرمائیے

چونکہ رجسٹری کی فیس اب زیادہ ہوگئی ہے اس لئے "نگار" کا سالانہ وی پی اب آٹھ روپیہ سات آنے میں روانہ ہوگا

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۵	فہرست مضامین مئی سنہ ۱۹۵۳ء	جلد ۶۳

(داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ ختم ہوگیا اور جون کا پرچہ ذریعہ وی پی آٹھ روپیہ سات آنے میں روانہ ہوگا۔ آپ کا فایدہ اسی میں ہے کہ چندہ آٹھ روپیہ ذریعہ منی آرڈر روانہ کریں)

ملاحظات

انقلاب پاکستان

پچھلے ایک سال کے اندر پاکستان میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا تھا وہ سیاسی و معاشی، مذہبی و ذہنی ہر حیثیت سے حد درجہ افسوسناک تھا اور مجھے یقین تھا کہ "ناظم الدین وزارت" اگر آئینی طور پر ختم نہ ہوئی تو وہ غیر آئینی طور پر ختم کردی جائے گی، اس لئے جس دن انقلاب وزارت کی خبر میں نے سنی تو مجھے خوشی ہوئی اور تھوڑی سی حیرت بھی، خوشی اس لئے کہ انقلاب محض خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو، بہرحال زندگی کا ثبوت ہے اور حیرت اس لئے کہ مسٹر غلام محمد گورنر جنرل نے جو عرصہ سے ناظم الدین وزارت کی ناکامی کو محسوس کر رہے تھے اور اس احساس کی بنا پر بارہا خواجہ صاحب کو مستقبل کی طرف سے متنبہ کرچکے تھے، اب کیوں دفعتاً وہ قدم اٹھایا جو اس سے پہلے ہی انھیں اٹھانا چاہئے تھا لیکن خیر ---- بہرحال اندرونی طور پر جو اسباب بھی اس فوری انقلاب کے ہوں یہ بڑی حد خوش کن خبر تھی نہ صرف اہل پاکستان کے لئے بلکہ ہم لوگوں کے لئے بھی جو پاکستان سے بہت قریب کا تعلق رکھتے ہیں۔

اس وقت پاکستان کے سامنے سب سے اہم مسئلہ اقتصادی عدم توازن کا ہے اور اسی کو سلجھانا حکومت کا فرض اولین ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا محض وزارت کا انقلاب اس دشواری کے دور کرنے کے لئے کافی ہے۔ کیا مسٹر محمد علی دفعتاً ملک کی اس ذہنیت کو بدل دیں گے جو غلط لیڈرشپ کی وجہ سے وہاں کے طبقۂ خواص و عوام میں پیدا ہو گئی ہے اور کیا بغیر معاشی نظام کو بدلے ہوئے اُس طبقاتی نشیب و فراز کو دور کیا جا سکتا ہے جو اسوقت پاکستان میں پایا جاتا ہے اور جس کو دور کئے بغیر کبھی کوئی ملک نہ ترقی کر سکتا ہے نہ سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر سکتا ہے ؟

ہوسکتا ہے کہ مسٹر محمد علی اسوقت امریکہ سے لاکھوں ٹن غلّہ حاصل کر کے لوگوں کو فاقہ کی مصیبت میں مبتلا نہ ہونے دیں، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ حکومت کے بڑھے ہوئے غیر ضروری مصارف میں کمی کر کے اپنے میزانیہ کو اعتدال پر لا سکیں اور یہ بھی دشوار نہیں کہ وہ ملازم کو کچھ دنوں تک سر نہ اٹھانے دیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جسے ہم اصلاح و ترقی کی بنیاد یا اساس کہہ سکیں۔ یہ سب عارضی و وقتی تدبیریں ہیں جن سے مرض کچھ دنوں کے لئے دب تو سکتا ہے لیکن دور نہیں ہو سکتا۔

پاکستان کا "نعرۂ عمل" جو اکثر وہاں کے ریڈیو سے سننے میں آتا ہے، الفاظ سہ گانہ پر مشتمل ہے۔ اتحاد۔ یقین اور سعی پیہم۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی بلند تعلیم ہے، لیکن افسوس ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد سے اسوقت تک ان میں سے کوئی بات عملی صورت سے ہمارے سامنے نہیں آئی، بلکہ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ جتنا زیادہ ان باتوں کا ذکر کیا گیا، عملاً ان سے اتنا ہی زیادہ بُعد ہوتا گیا۔

سب سے پہلی شرط تنظیم و اتحاد ہے، کیونکہ اس کے بغیر نہ کوئی اجتماعی جد و جہد ہو سکتی ہے نہ اپنے اندر خود اعتمادی و یقین کی کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے اور بدقسمتی سے یہی چیز پاکستان میں اب تک پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہاں جو صوبائی اختلاف و تنافر اس وقت پایا جاتا ہے وہ تقسیم ہند سے پہلے نہیں پایا جاتا تھا۔

یقیناً اس کا کوئی سبب ہونا چاہئے اور جب تک اس کو دور نہ کیا جائے کامیابی دشوار ہے۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ پاکستان اس وقت تک کوئی ایسا نصب العین متعین نہیں کر سکا ہے، جو موجودہ دنیا کے تقاضہ کو پورا کرنے والا ہو۔

اولین اساسی غلطی جس پر پاکستان کی بنیاد قایم کی گئی ہے دو قومی نظریہ نہ تھا، بلکہ تفریق کفر و اسلام تھی، جس نے عام طور پر وہاں کے لوگوں میں مذہبی جذبہ پیدا کر کے، انھیں یہ یقین کر لینے کا موقع دیا کہ پاکستان کی حکومت خالص مذہبی حکومت ہو گی۔

یہ تھی وہ پہلی بنیادی اینٹ جو ٹیڑھی رکھی گئی اور اسی پر پاکستان کی تعمیر شروع ہوئی جس کو قدرتاً کج ہونا چاہئے تھا۔ اس سے دو بہت بڑے نقصان ہوئے، ایک یہ کہ پاکستان کے قیام کے بعد جو نیا جوش و ولولہ وہاں کی آبادی میں پیدا ہوا تھا، وہ بجائے اسکے کہ ملک کی اصلاح و تعمیر میں صرف ہوتا، ایک جھوٹے مذہبی افتخار کی پرورش میں صرف ہونے لگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی جو ہمیشہ ایسے ہی موقع کا منتظر رہتا ہے سامنے آ گیا۔ پھر مسجدیں تو اس نے بہت سی تعمیر کرا دیں لیکن نمازی نہ پیدا کر سکا، قرون اُولیٰ کی اسلامی معیشت و معاشرت کو زندہ کرنے کا پیام تو اس نے دیا لیکن اس پیام پر عمل خود اس نے بھی کبھی نہ کیا، آخر کار مسلمان جو یوں بھی سہل انگار واقع ہوئے ہیں ان کی ذہنیت بالکل ٹھٹھر کر رہ گئی اور خدا تو خیر انھیں کیا ملتا "وصال صنم" بھی نصیب نہ ہوا، خوشحالی کا کیا ذکر روزی تک کے لالے پڑ گئے۔

دوسرا نقصان مذہبی حکومت کے تصور سے یہ ہوا کہ پاکستان نے اپنے اور ہندوستان کے درمیان ایک سنگین دیوار حایل کر دی اور اخلاق و انسانیت کے تصور کو پس پشت ڈال دیا۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے مسایل میں ہندوستان نے بھی انتہائی تنگ نظری سے کام لیا اور یہاں کی غالب آبادی کی نگاہ میں پاکستان اب بھی کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے لیکن حکومت کی متعینہ پالیسی سے اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ عوام سے ہے برخلاف اس کے پاکستان نے یہ یقین دلا کر کہ اس کا آئین و دستور ہی مذہبی اصول پر مرتب ہو گا، خود اس بات کو تسلیم

کردیا کہ وہ انسانیت کو صرف مذہب کے معیار سے جانچے گی اور اس طرح گویا اس نے ہندوستان کو بھی سوچنے کا موقع دیا کہ دنیا کے معاملات میں اگر اسلام اتنی بڑی قیمت رکھتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ "کفر و نامسلمانی" کو بالکل "جنس کاسد" قرار دیا جائے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ اس وقت مذہب کے نام سے کوئی حکومت ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتی اور حکومتوں کی برادری میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں مل سکتی اسلئے اگر پاکستان نے آج اپنی اس غلطی پر اصرار کیا تو کل لازماً اسے اپنی اس غلطی کا اعتراف کرنا پڑے گا اور ہو سکتا ہے کہ یہ کل وہ ہو جس کے بعد کوئی دوسرا کل آنے والا نہیں۔

بالفعل پاکستان میں اسکے زمانۂ قیام سے لیکر اس وقت تک یہی مذہبی فضا پیدا کی گئی، نوابزادہ لیاقت علی خاں نے بات بات میں "کتاب و سنت" کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ وہ کوئی بڑے شب زندہ دار مسلمان تھے، بلکہ محض اس لئے کہ اس طرح وہ پاکستانی عوام کے جذبات کے ساتھ اچھی طرح کھیل سکتے تھے۔ اس کے بعد خواجہ صاحب کا دور آیا، سو کچھ تو واقعتاً یہ نوابزادہ سے زیادہ مسلمان تھے بھی اور کچھ اس لئے کہ سوال اپنی قدح کی خیر منانے کا بھی تھا۔ بہرحال انھوں نے بھی مذہبیت ہی کا سہارا ڈھونڈھا، یہاں تک کہ چند دن میں جدھر دیکھیے پاکستان کے اندر مولوی ہی مولوی چنگھاڑ مارتا ہوا نظر آنے لگا۔ لیکن وہ تو کہیئے کہ قدرت کو جلد از جلد کوئی وعید نازل کرکے پاکستان کو چونکانا منظور تھا کہ پہلے تو "قادیان دشمنی" تحریک کے ذریعہ سے خواجہ ناظم الدین ہی کے ہاتھ سے مولویوں کا سر کچلوایا جنھوں نے ان کو سر چڑھایا تھا اور پھر خود خواجہ صاحب کو بھی منصب حکومت سے معزول کرا دیا۔ سچ ہے۔

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

پھر اب کہ محمد علی کا دور ہے۔ یہ تو ہم نہیں کہ سکتے کہ یہ دور "دورِ شجاع" ہے کہ حافظ کی طرح "مے دلیرانہ بنوش" کی دعوتِ عام دیجائے تاہم "دعوتِ برگ و نوا" ضرور ہے اور یہ یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ غالباً اب "پیر کنعان اور اس کی پیراہن پرستی" کا زمانہ واپس نہ آئے گا اور پاکستان کی جدید وزارت کا "Slogan" "کتاب و سنت" نہیں بلکہ

بیفشاں دامن و آزردہ برخیز ــــــــ ہوگا

اس وقت تک پاکستان سے جتنی خبریں ہم تک پہونچی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی فضا ابھی تک صاف نہیں ہے اور خواجہ صاحب پر

غمِ بے مہری ایں داستاں سوخت

کا سوگ ہنوز طاری ہے، لیکن یہ زیادہ فکر کی بات نہیں۔

ہے کیا جو کس کے باندھیے، میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

تاہم یہ تو یقینی ہے کہ مسٹر محمد علی کو بادِ مخالف کے سمت جانے والی کشتی کا رخ بادِ موافق کی طرف پھیرنا ہے اور اگر یہ زیادہ دشوار نہیں تو ایسا آسان بھی نہیں! میں سمجھتا ہوں کہ یہ انقلاب وزارت پاکستان میں ایک نئے دور کا طلوع ہے اور اس وقت تک مسٹر محمد علی اور بعض ان کے رفقاء (مثلاً مسٹر شعیب قریشی) نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان سے معاملہ فہمی، بالغ نظری اور وقت شناسی کا پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بارہا ظاہر کر چکے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں کا مفاد اسی میں ہے کہ ان کے تعلقات نہ صرف خوشگوار بلکہ دوستانہ رہیں اور تقسیم ہند کے بعد جو زخم دونوں کے دلوں میں پیدا ہوگئے ہیں انھیں کھلا کھلا کر ہرا نہ کریں بلکہ اگر کسی فریق کی طرف سے اشتعال انگیز باتیں ظاہر ہوں تو بھی ان کے جواب میں انتقامی جذبہ سے کام نہ لیں۔

ہندوستان و پاکستان کی جغرافی پوزیشن بلکہ گوشت و ناخن کی سی حیثیت رکھتی ہے اور ان دونوں کو جدا کرنے کی کوشش

تباہی کو دعوت دینا ہے خواہ اس کا باعث ہندوستان ہو یا پاکستان۔

پاکستان اب ایک مستقل حکومت ہے، جداگانہ سیاسی سالمیت ہے، اس کو اپنے ماضی سے ہٹ کر بالکل ایک نیا مستقبل بنانا ہے اور اس کے لئے گرم خون نہیں بلکہ ٹھنڈے خون کی ضرورت ہے، خود اعتمادی کی ضرورت ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر مشتعل ہوجانے کے بجائے ہنستے ہوئے گزر جانے کی ضرورت ہے اور ہندوستان کے ساتھ ایک مضبوط فضائے اتحاد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ ۲۸ اپریل کے اخبار میں مسٹر محمد علی کا وہ بیان نظر سے گزرا جس میں انھوں نے ہندوستان کے ساتھ رابطۂ خلوص واتحاد قایم کرنے کا ذکر کیا ہے اور ایسے الفاظ میں جو اس سے قبل نہ کبھی نوابزادہ مرحوم کے منہ سے نکلے تھے اور نہ خواجہ صاحب کی زبان فیض ترجمان سے۔

ہم اسے پاکستان اور ہندوستان دونوں کے لئے ایک نئی صبح امید کا طلوع سمجھتے ہیں اور یقین ہے کہ نہرو اور محمد علی کا باہمی تبادلۂ خیال دونوں ملکوں کے لئے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا — خلوص و محبت کا دور — ترقی و خوشحالی کا دور — وضعداری وانسانیت کا دور!

مسٹر محمد علی نے جس جوش وولولہ سے نہرو کے ساتھ تبادلۂ خیال کی خواہش ظاہر کی ہے، اس کا اقتضاء یہ تھا کہ جلد از جلد اس پر عمل بھی کیا جاتا، لیکن ایسا غالبًا ممکن نہ ہوگا، کیونکہ اول تو مسٹر محمد علی کو خود بھی اپنی پوزیشن پاکستان میں مضبوط و استوار کرنا ہے اور دوسرے یہ کہ ملکۂ انگلستان کی تقریب تاجپوشی کے سلسلہ میں دولت مشترکہ کے وزراء کی کانفرنس جون میں ہونے والی ہے اور یقینًا یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ نہرو اور محمد علی پہلے اس کانفرنس میں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ ان دونوں کی آیندہ ملاقات میں کشمیر کے مسئلہ پر بھی گفتگو ہوگی اور اگر اس طرح واقعی کوئی صورت مصالحت کی پیدا ہوگئی تو ہم اسے نہرو اور محمد علی دونوں کا معجزہ سمجھیں گے۔

اس وقت تک مسٹر محمد علی کے رجحانات کے بابت جو کچھ اخبارات سے معلوم ہوا ہے، اس میں ایک بات زیادہ کھٹکنے والی ہے اور وہ "دفاع مشرق وسطیٰ" میں شرکت کا مسئلہ ہے۔ گو اس وقت تک پاکستان نے اس کا اعتراف نہیں کیا ہے کہ اسے بھی شرکت کی دعوت دی گئی ہے لیکن مسٹر محمد علی کے اندازِ بیان سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ اگر پاکستان کو ایسی دعوت دی گئی تو وہ اسے قبول کرلے گا اگر واقعی یہ شرکت اسکے لئے مفید ہوئی — لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ شرکت قطعًا اس کے لئے مفید نہ ہوگی اور اسے بھی جلد یا بدیر محسوس کرنا پڑے گا کہ اس کا یہ — "اگر" کس قدر غلط تھا۔ علاوہ اس کے یوں بھی اگر مسٹر محمد علی ہندوستان و پاکستان کی مشترکہ دفاعی تنظیم کو ضروری سمجھتے ہیں، جیساکہ انھوں نے ظاہر کیا ہے، تو انھیں دفاع "مشرق وسطیٰ" میں شرکت کا خیال ترک کرنا پڑے گا، کیونکہ ہندوستان کبھی اس کو پسند نہیں کرسکتا کہ پاکستان کسی دوسری سلطنت سے کوئی ایسا معاہدہ کربیٹھے جو آتشِ جنگ کو کسی وقت بھی ہندوستان سے قریب تر لاسکتا ہے۔ بہرحال اس وقت جو حالات سامنے ہیں انکو دیکھتے ہوئے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ پاکستان و ہندوستان دونوں رواداری سے کام لیکر آپس میں مل بیٹھیں کی کوئی صورت نکال لیں گے۔

وہذا اما کنّا نبغیٖ!

آیندہ سالنامہ سنہ ۵۴ء

سالنامہ نکالنے کے بعد مجھے یک گونہ اطمینان تو ضرور ہوجاتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ خلش بھی شروع ہوجاتی ہے کہ آیندہ سالنامہ کے لئے کس موضوع کا انتخاب کیا جائے۔ موضوع کی جستجو میں کئی باتیں میرے سامنے ہوتی ہیں، ایک یہ کہ وہ دلچسپ بھی ہو اور مفید بھی، دوسرے یہ کہ اس پر اچھا لکھنے والے آسانی سے مل سکیں، تیسرے یہ کہ اگر ایسے حضرات نہ مل سکیں تو میں خود تنہا اس خدمت کو انجام دے سکوں۔ چنانچہ اس وقت تک نگار کے کئی سالنامے ایسے نکل چکے ہیں جن کے لئے صرف مجھی کو شروع سے اخیر تک لکھنا پڑا ہے۔

امسال داغ نمبر نکالنے کے بعد، یہ فیصلہ تو خیر میں کرچکا تھا کہ آیندہ سالنامہ شعر و شاعری یا ادب و انشاء سے متعلق ہوگا لیکن یہ ہر دو کیا ہوگا، اس کا فیصلہ مشکل تھا میں نے بعض احباب سے مشورہ کیا تو انھوں نے عموم پیر کردیا "شعر وادب" کا

ذکر چھیڑ دیا۔ اور آخرکار کامل تین ماہ کے غور و فکر کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ آیندہ سالنامہ اسلامی تاریخ سے متعلق ہونا چاہئے اور اس سلسلہ میں کوئی ایسی چیز پیش کرنا چاہئے جس میں جدت ہو، دلچسپی ہو اور افادیت بھی اور اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے طے کیا کہ آیندہ سالنامہ

"فرمانروایانِ اسلام"

کے لئے وقف ہونا چاہئے۔ یہ بات تو شاید سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں حکومت کی بنیاد عہدِ بنی امیہ سے پڑی، لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ آگاہ ہوں گے کہ مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ دنیا میں ان کی کتنی سلطنتیں کہاں کہاں قایم ہوئیں اور وہ کس طرح ختم ہوئیں۔

چند حکومتوں کا علم تو خیر سب کو ہے، کیونکہ وہ بہت مشہور ہیں، لیکن باقی کا علم عوام کیا خواص کو بھی نہیں ہے اور انکی تعداد اتنی ہے کہ اگر میں ان کا نام گنوانے بیٹھوں تو صفحے کے صفحے صرف اسم نویسی ہی میں سیاہ ہو جائیں۔

یقیناً ان تمام مسلم حکمران خاندانوں کا استقصاء آسان بات نہیں اور یہ کام اتنا ہی دشوار ہے جیسے آپ کسی گلاس کو فرش پر پٹک دیں اور پھر اس کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو یکجا کرنا چاہیں، لیکن بہرحال یہ ایک کام ہے اگر ہو جائے ــ انگریزی میں اس قسم کی ایک مشہور کتاب "Mohamedan Dynasties" لین پول کی لکھی ہوئی موجود ہے، اور گو اس میں بھی تمام مسلم حکومتوں کا استقصاء نہیں کیا گیا ہے، لیکن اردو میں تو کوئی ایسی کتاب بھی موجود نہیں ہے ــ اور اگر آج آپ کو یہ معلوم کرنا ہو کہ دنیا میں مسلمانوں کے قدم کہاں کہاں پہونچے، انھوں نے کہاں کہاں کس کس زمانہ میں کس کس نام سے اپنی حکومتیں قایم کیں، وہ کے لوگ۔ مراد کے کیا نام تھے، کس سلسلہ سے کن کن سنین میں وہ بچے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے اور پھر یہ کہ یہ حکومتیں کب اور کیوں ختم ہوئیں، تو آپ کے پاس اس علم کا کوئی ذریعہ اس کے سوا نہیں کہ آپ بیسیوں تاریخی کتابوں کی ورق گردانی کریں، عمر کا کافی حصہ ان کتابوں کے مطالعہ میں صرف کر دیں اور پھر بھی شاید آپ کو پورا علم حاصل نہ ہو

اسی خیال کے پیشِ نظر عرصہ سے خیال تھا کہ ایک ایسا سلسلۂ تحقیق شروع کیا جائے جس کے ذریعہ سے سلسلہ وار

فرمانروایانِ اسلام۔ مفکرینِ اسلام۔ علماءِ اسلام۔ وقایعِ اسلام اور اماکنِ اسلام

کی تاریخ کو دائرۃ المعارف (انسائکلوپیڈیا) کی صورت سے پیش کیا جا سکے، لیکن عملی حیثیت سے قدم اُٹھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی

اب جو سالنامہ [illegible] کا مسئلہ سامنے آیا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس سلسلہ کو شروع کر دیا جائے اور اس خیال نے ایسی مستحکم صورت اختیار کر لی کہ آخرکار "فرمانروایانِ اسلام" کے نام سے اس سلسلہ کی پہلی قسط آیندہ سالنامہ کی صورت میں پیش کرنا طے کر لیا یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ کام تنہا مجھ کو کرنا ہے، اس لئے نہیں کہ ملک میں ایسا کام کرنے والے نہیں ہیں، ہیں اور یقیناً مجھ سے زیادہ اہل ہیں، لیکن افسوس ہے کہ میں ان کی خدمات حاصل کرنے سے معذور ہوں۔ چنانچہ میں نے ۱۵ اپریل سے یہ کام شروع کر دیا ہے اور امید ہے کہ آیندہ ۶ ماہ کے اندر میں اسے پورا کر سکوں گا۔

ہو سکتا ہے کہ آپ کے لئے یہ چیز زیادہ دلچسپی کا باعث نہ ہو لیکن اس کے مفید ہونے سے بہرحال آپ کو بھی انکار نہ ہوگا اور اس بناء پر اگر میں آپ سے یہ توقع رکھوں کہ اس کام میں آپ میری مدد فرمائیں گے تو غالباً یہ توقع بے محل نہ ہوگی۔

اس سلسلہ میں آپ سے میں کوئی عطیہ نہیں چاہتا بلکہ صرف اتنی مدد چاہتا ہوں کہ آپ "نگار" کی توسیع اشاعت میں حصہ لیں اپنے احباب میں، طلبہ و اساتذہ کے حلقہ میں اور لائبریریوں میں اس سالنامہ کو مقبول بنانے کی پوری کوشش فرمائیں، اور اگر یہ ممکن نہیں تو اپنے سلسلۂ خریداری کو تو کم از کم قایم ہی رہنے دیں۔

اسلامی تہذیب و ثقافت

عہدِ نبوی سے عہدِ بنی امیہ تک

عہدِ رسالت و خلفاء راشدہ

رسول اللہ کی ذات زہد و انکسار کا مجسم پیکر تھی۔ اگر آپ چاہتے تو جناب خدیجہؓ سے شادی کے بعد ہی ان کے مال سے تجارت کر کے اپنے لئے ہر قسم کا آرام اور آسایش مہیا کر سکتے تھے لیکن دنیاوی آرام و آسایش کا تصور بھی آپ کے ذہن میں نہیں آیا اور ہمیشہ نہایت سادہ زندگی بسر کی۔ آپ کے بعد خلفاء راشدین بھی اپنی فتوحات کی وجہ سے ہر قسم کا دنیاوی جاہ و جلال حاصل کر سکتے تھے لیکن ان کو ذات نبوی سے ایسی والہانہ شیفتگی تھی کہ انھوں نے اتباعِ سنت کے علاوہ اور کوئی طریقۂ زندگی اختیار نہیں کیا۔ فرشِ خاک کو مسندِ شاہی سمجھ کر اخوت و مساوات اور عدل و انصاف کے ساتھ مسلمانوں اور دوسری قوموں پر حکمرانی کی۔

خلفاء راشدین کی حکومت خالص دینی حکومت تھی جس کو نمود و نمایش سے کوئی تعلق نہ تھا، وہ بازاروں میں پیوند لگے کپڑے اور پھٹے جوتے پہن کر عام لوگوں کی طرح چکر لگاتے تھے تاکہ ہر شخص ہر وقت ہر جگہ بغیر کسی روک ٹوک کے ان سے مل سکے۔ وہ غریبوں اور بیوہ عورتوں کی خدمت کے لئے ہر وقت طیار رہتے تھے، یہاں تک کہ اپنے کندھے پر مشک رکھ کر کسی بیوہ کے گھر پانی پہونچا دینے میں ان کو مطلق عار نہ ہوتا تھا۔ خلفاء میں بعض صاحبِ جائداد اور ذی ثروت بھی تھے لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنی دولت صرف نیک کاموں میں صرف کی اور اپنی ذات پر بہت کم خرچ کیا۔ کھانے میں بھی وہ بڑے محتاط تھے اور صرف اس قدر کھاتے تھے جو ان کی صحت کو قایم رکھ سکے چنانچہ مشہور حدیث ہے:۔ "نحن قوم لا ناکل حتی نجوع و اذا اکلنا لا نشبع" (ہم وہ قوم ہیں کہ جب تک بھوک نہیں لگتی کھانا نہیں کھاتے اور جب کھاتے ہیں تو پیٹ بھر کر نہیں کھاتے) رسول مقبول صلعم کا ایک اور قول ہے "ما ملاء ابن آدم وعاءً شراً من بطنہ حسب ابن آدم لقیمات یقمن صلبہ" (ابن آدم نے ایسا کوئی برتن نہیں بھرا جو اس کے پیٹ سے زیادہ بدتر ہو ابن آدم کو چند لقمے کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھ سکیں) حضرت عائشہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی۔ رسول اکرم نے مسلسل تین دن تک پیٹ بھر کے روٹی نہیں کھائی۔

الغرض رسول اکرم اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سادگی تھی۔

عہدِ بنی امیہ

جب زمام خلافت خاندان بنی امیہ کے ہاتھوں میں آئی تو رسول اکرم کی پیشین گوئی کے مطابق خلافت سلطنت میں تبدیل ہوگئی اور بہت سی اجنبی عادتیں انھوں نے اختیار کرلیں نتیجہ یہ ہوا کہ دینی حکومت کے بجائے بنو امیہ کی حکومت دنیاوی سلطنت ہوگئی اور شاہانہ جاہ و جلال میں مفتوحہ اقوام کی تقلید ہونے لگی۔ امیر معاویہ پہلے شخص تھے جنھوں نے انتخابی خلافت کو میراثی خلافت میں بدل دیا۔ امیر معاویہ ہی نے حاجب و دربان مقرر کئے اور شاہی شان و شوکت کے لوازم اختیار کئے۔ جامع مسجد میں اپنے لئے ایک علحدہ مقصورہ طیار کیا جہاں وہ نماز پڑھتے تھے اور جس وقت وہ سجدہ کرتے تھے تو ایک محافظ ننگی تلوار لئے ہوئے خلیفہ کے پاس کھڑا رہتا تھا یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس طریقے سے خلیفہ کی شان و شوکت کا اظہار مقصود تھا یا دشمن کے ناگہانی حملے سے بچنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا کیونکہ حضرت

شہادت بھی ناگہانی حملے سے ہوئی تھی اور خود امیر معاویہ بھی ایک بار اتفاقاً اس طرح کے حملے سے بچ گئے تھے۔

خلیفہ کے فرائض میں امامت بھی ایک مقدس فرض تھا جسے خلفائے راشدین خود انجام دیتے تھے۔ بنو امیہ کے ور میں بھی امیر معاویہ۔ عبدالملک بن مروان اور عمر بن عبدالعزیز نے اس فرض کو خود انجام دیا لیکن اس خاندان کے یگر خلفا نے اس اہم فرض کی ادائی رئیس الحرس اور صاحب شرطہ کے سپرد کردی۔ خلفاء بنو امیہ سفید چادر اور سفید مرصع مامہ پہن کر مسجد میں آتے تھے اور جمعہ کے دن جب خطبہ دینے کھڑے ہوتے تھے تو ان کی انگلی میں انگوٹھی اور ہاتھ میں صا ہوتا تھا جو جہانداری کا نشان خیال کیا جاتا تھا۔

امیر معاویہ کے دربار کی شان و شوکت اور وہاں کا طریقۂ باریابی بھی ملوک عجم کا سا تھا، انھوں نے ایک بڑا شاندار صر تعمیر کرایا اور اس میں تخت خلافت نصب کیا۔ جب وہ اس تخت پر بیٹھتے تھے تو داہنے جانب خاندان خلافت کے امراء ور بائیں جانب دوسرے بڑے امراء کھڑے ہوتے تھے اور جو شخص خلیفہ کے حضوری کا شرف حاصل کرنا چاہتا تھا وہ سامنے کھڑا ہوتا تھا۔

خاندان بنی امیہ کے بعض افراد نے تعیش کے بہت سے طریقے رومی اور دوسری قوموں سے اخذ کئے اور اس میں یسے منہمک ہوئے کہ امور سلطنت سے بے توجہ ہوگئے۔ ایسے خلفاء میں بدترین یزید بن عبدالملک خیال کیا جاتا ہے جو پنی کنیزوں (حبابہ اور سلامہ) کے ساتھ ہر وقت لہو و لعب میں مصروف رہتا تھا، لیکن اس خاندان میں ایسے ایسے خلیفہ بھی دئے ہیں جو عقل و دانش، سیاست، شجاعت، علم و فضل سے بھی متصف تھے اور ان میں عبدالملک بن مروان نہایت ربر حکمران اور بڑا زبردست عالم تھا۔ مورخین کا اس کے متعلق خیال ہے کہ اس کو اگر تخت خلافت نہ ملتا تو یہ کسی مسند علم زینت ہوتا۔ اس کا جانشین ولید بن عبدالملک گو باپ کی طرح ذی علم نہ تھا لیکن تدبیر جہاں بانی اور توسیع فتوحات ے لئے مشہور ہے۔ اس کے زمانے میں ہند۔ اسپین اور شمالی افریقہ کے مختلف حصوں کی فتوحات ہوئیں جس کی بنا پر سے خاندان بنی امیہ کے مشہور خلفا میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی خاندان کے مشہور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز تھے جو سادگی ہد اور انصاف میں بہت ممتاز تھے۔ اکابر علماء ان کی علمی فضیلت کے قایل تھے۔

گھوڑوں کا شوق عرب گھوڑوں کے بہت شایق تھے۔ ظہور اسلام کے بعد رسول نے سواری سیکھنے کی ہدایت فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔ " ارکبوا و ارموا ان ترموا احب الیّ من ان ترکبوا "۔

سوار ہو اور تیر چلاؤ، تیر چلانا سواری سے زیادہ مجھ کو پسند ہے)۔ بنی امیہ کے زمانہ میں اہم ترین دلچسپی کا شغل گھوڑ دوڑ ما۔ ہشام بن عبدالملک پہلا شخص تھا جس نے گھوڑ دوڑ کے لئے باقاعدہ گھوڑے جمع کئے اور گھوڑوں کی نسل کی بہتری پورا انتظام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے زمانہ میں گھوڑوں کی تعداد ہزار تک پہونچ گئی تھی۔ مسعودی کے بیان کے مطابق رتیں بھی سواری سیکھتی تھیں اور گھوڑ دوڑ میں شریک ہوتی تھیں۔ ولید ثانی بھی گھوڑ دوڑ کا بہت شایق تھا۔ اس نے ھوڑ دوڑ کے متعدد میدان بنوائے۔ ولید کے پاس ایک مشہور گھوڑا سندی نامی تھا جو ہشام کے مشہور گھوڑے زائدہ کبھی کبھی بازی لے جاتا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں گھوڑے عموماً اول و دوم آنے میں بہت مشہور تھے۔ ولید نے رصافہ ں ایک گھوڑ دوڑ کرائی اور خود وہاں قیام کرکے اس کا انتظام کیا۔ اس گھوڑ دوڑ میں بھی ہزار گھوڑے شریک تھے وڑ دوڑ کے متعلق ولید کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ اس زمانہ کے مشہور گھوڑے زائدہ، سندی اور وضاح تھے۔ زی جیتنے والے گھوڑوں کے حسب ذیل اصطلاحی نام تھے:۔

۱۔ اول نمبر پر آنے والا گھوڑا سابق کہلاتا تھا۔

دوسرے نمبر پر آنے والے گھوڑے کو مصلی کہتے تھے کیونکہ اس کا سر اول آنے والے گھوڑے کی وسط پشت یعنی صلا کے پاس ہوتا تھا۔

سوم و چہارم نمبر پر آنے والے گھوڑوں کو ثالث و رابع کہتے تھے۔ چنانچہ اس طریقہ سے دسویں نمبر پر آنے والے گھوڑے کو عاشر کہتے تھے۔ گھوڑ دوڑ میں دس نمبر تک گھوڑوں کا شمار ہوتا تھا۔

چوگان۔ شکار۔ شطرنج۔ تاش آخر عہد بنی امیہ میں پولو یعنی چوگان کا کھیل بھی بہت مقبول ہوا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کھیل عربوں نے ایرانیوں سے سیکھا۔ شکار کا شوق عربوں میں ہمیشہ سے موجود تھا۔ یمنی کتوں کو شکار کے لئے طیار کرنا بہت عام بات تھی ——— چیتے کو بھی شکار کرنا سکھاتے تھے خلفاء بنی امیہ میں یزید بن معاویہ شکار کا بہت شایق تھا۔ یہ چیتے سے بھی شکار کھیلتا تھا۔ یہ شکاری کتوں کو نہایت اہتمام کے ساتھ رکھتا تھا۔ ان کے گلے میں سونے کا پٹہ ہوتا تھا اور ہر کتے کی دیکھ بھال کے لئے علحدہ ملازم مقرر تھا۔

خلفائے بنی امیہ کے زمانہ میں مرغ لڑانے کا بھی لوگوں کو شوق تھا اور نرد و شطرنج سے لوگوں کی دلچسپی تھی۔

موسیقی خلفائے بنی امیہ کے زمانہ میں غنا و موسیقی کی طرف بھی کافی توجہ کی گئی۔ اس ذوق کے خلفا میں یزید بن عبدالملک کو خاص شہرت حاصل تھی۔

ایک دن اس کے بھائی مسلمہ بن عبدالملک نے ملامت کی کہ آپ عمر بن عبدالعزیز ایسے خلیفہ کے جانشین ہیں اور آپ کا یہ حال ہے کہ دو لونڈیوں کی وجہ سے خلافت کے کاروبار اور فریادیوں سے بالکل غافل ہیں۔ اس ملامت کا یزید پر بڑا اثر ہوا اور عیش و عشرت کو ترک کرکے ان لونڈیوں سے دور رہنے لگا۔ جب حبابہ کی آتش شوق بھڑکی تو اسنے خلیفہ سے ملنے کی کوشش کی۔ حبابہ نے اپنی ملازمہ سے کہا کہ جب خلیفہ جمعہ کے دن ایوان سے نماز کے لئے نکلیں تو مجھ کو مطلع کرنا۔ چنانچہ خلیفہ جب جمعہ کے دن نماز کے لئے ایوان سے نکلے تو ملازمہ نے مالکہ کے حکم کی تعمیل کی۔ حبابہ ہاتھ میں عود لیکر خلیفہ کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی اور نہایت دلکش آواز میں گانا شروع کیا۔

ألا لاتلمہ الیوم ان یتبلد فقد غلب المحزون ان یتجلد

اس جہالت پر اس کو ملامت نہ کر کیونکہ غمگین پر بہ تکلف صبر کرنا غالب آرہا ہے۔ جب اس شعر پر پہونچی

فما العیش الا ماتلذ و تشتھی ان لام فیہ ذو شنان وفندا

(عیش تو وہی ہے جو تجھکو اچھا معلوم ہو اور جس کی تو خواہش کرے اگرچہ کینہ ور اس کے بارے میں ملامت کرے اور بیوقوف بنائے)۔ یزید بے خود ہوکر لپٹ گیا اور کہنے لگا جو مجھ کو تجھ سے دور رہنے کی نصیحت کرے خدا اس کا بُرا کرے" چنانچہ یزید پھر انھیں لذائذ میں معروف ہوگیا۔ یزید کو حبابہ سے اس قدر محبت تھی کہ اس کے مرنے کے بعد خود بھی اس کی محبت میں گھل گھل کر مرگیا۔ یہ واقعہ تو بنی امیہ کی خلافت کے انحطاط کا ہے لیکن عروج کے زمانہ کے متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں کہ بیدار مغز خلفاء سلطنت کے کاروبار میں کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ یزید ہی کے باپ مشہور خلیفہ عبدالملک بن مروان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب وہ مصعب بن زبیر کے مقابلہ میں لڑنے کے لئے نکلا تو اس کی بیوی عاتکہ نے جو اس کو بہت محبوب تھی روکنا چاہا، لیکن اس نے مطلق پروا نہ کی۔

کتاب الاغانی میں بہت سے قصے پائے جاتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ بنی امیہ کے زمانہ میں حجاز فنون لطیفہ یعنی غنا، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں شام و عراق سے سبقت لے گیا تھا۔ حالانکہ بادی النظر میں یہ بات تعجب خیز معلوم ہوتی کہ

ہاز نے باوجود ویران وغیر آباد ہونے کے شام وعراق سے جن میں مختلف تہذیبوں کا اثر رہا کیسے تفوق حاصل کیا۔ اس کی ایک تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہل حجاز کا ذوق وشعور زیادہ ترقی یافتہ تھا اس کے علاوہ یہ کہ اہل حجاز میں بی تحمل اور رواداری زیادہ تھی۔ کتاب الاغانی میں اس بیان کی تائید میں بہت قصے ملتے ہیں۔ مثلاً ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔

داؤد ثقفی نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ ہم لوگ ابن جریج کے حلقے میں بیٹھے تھے وہ حدیث بیان کر رہے تھے۔ عبداللہ مبارک اور عراق کے دوسرے لوگ بھی اس حلقے میں شریک تھے۔ اسی اثناء میں مشہور مغنی ابن میزن اس طرف لا۔ ابن جریج نے اس کو بلا کر کچھ سنانے کو کہا ـــــ اس نے جواب دیا کہ میں اس وقت جلدی میں ہوں ، ابن جریج نے اصرار کیا تو اس نے کچھ سنایا اور چلتے وقت کہنے لگا کہ اگر آپ کے پاس عراق کے بد ذوق لوگ نہ ہوتے تو آپ کو اور کچھ سناتا اور آپ کی طبیعت خوش کرتا۔ ابن جریج نے عراق کے لوگوں سے مخاطب ہوکر پوچھا کہ کیا آپ لوگوں یری یہ بات بری معلوم ہوئی انھوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ غنا کو مکروہ ضرور خیال کرتے ہیں۔ ابن جریج نے ان سے بارہ سوال کیا کہ رجز خوانی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اس کو مکروہ خیال نہیں کرتے۔ اس پر جریج نے کہا کہ غنا اور رجز میں کیا فرق ہے۔

حجاز میں فنون لطیفہ کی ترقی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حجاز اور مکہ و مدینہ کے جوار میں اس وقت بہت سے مشہور مغنی موجو یہ حج کے زمانہ میں علیحدہ قافلے کی صورت سے حج کرنے آتے اور لوگ ان کی ہمت افزائی کرتے اس زمانہ میں حجاز کے ارباب کی فہرست بہت طویل ہے۔ بعض مشاہیر کے نام یہ ہیں :۔

جمیلہ۔ طویس۔ نومۃ الضحیٰ۔ رحمۃ۔ ہبۃ اللہ۔ مالک۔ ابن عائشہ۔ نافع بن طنبورہ۔ حبابہ۔ سلامہ سعیدہ۔ الزرقاء

بنی امیہ کے زمانہ میں موسیقی کی طرف لوگ بہت مایل تھے۔ چنانچہ امام مالک بھی شروع میں مغنیوں کے ساتھ رہتے اور ان سے گانا سیکھتے تھے۔ ایک دن ان کی والدہ نے کہا کہ اے بیٹے بدصورت مغنی کی طرف کوئی التفات نہیں کرتا۔ بہتر کہ تم غنا کو چھوڑ کر فقہ پڑھو۔ فقہ میں بدصورت بھی نقصان میں نہیں رہتا۔ چنانچہ انھوں نے غنا چھوڑ کر فقہ پڑھنا رع کی۔ غنا کے ساتھ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں بھی حجاز نے بڑی ترقی کی۔ ناضری اہل مدینہ کا مشہور لطیفہ گو خیال جاتا تھا۔ اس کے بعد اشعب مشہور ہوا جس کے لطایف بہت مشہور ہوئے۔

ندانی نظام زمانۂ جاہلیت میں بھی عرب ایک سے زیادہ شادیاں کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ قبایل میں باہمی جنگ کی وجہ سے مردوں کی تعداد کم ہوگئی تھی۔ اسلام نے اس رواج کو محدود کر دیا اور بیک وقت چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی، اس وقت بھی مردوں کی تعداد غزوات میں شرکت کی وجہ سے کم ہوگئی تھی۔ علاوہ کے ایک سے زیادہ شادی جایز رکھنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ بیوہ عورتیں اور ایسی غریب لڑکیاں جن کی شادی نہ ہوتی بے بیاہی نہ رہ جایئں، لیکن اس کے باوجود ایک سے زیادہ شادی کرنے کی حالت میں ہر عورت کے ساتھ مساوات کی نا شرط عاید کی گئی ہے۔ اسلام میں طلاق دینے کا اختیار ہے لیکن طلاق "ابغض المباحات" (جایز چیزوں میں سب سے زیادہ ندیدہ) خیال کی گئی ہے۔ یعنی اس اجازت سے فایدہ اٹھانا اچھا نہیں ہے۔ چنانچہ مختلف طریقوں سے باہمی مصالحت لئے مشورہ دیا گیا ہے اور اگر بدرجۂ مجبوری طلاق دینی پڑی تو اس کے ساتھ حسن سلوک کی بھی بجید تاکید ہے۔

تیں عرب عورتیں ہمیشہ آزادی سے فایدہ اٹھاتی تھیں۔ آغاز اسلام میں عورتیں لڑائیوں میں مرہم پٹی اور مردوں کے جذبات شجاعت برانگیختہ کرنے کے لئے شریک ہوتی تھیں۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں ذی علم، فصیح اور بہادر رتوں کے متعدد تذکرے پائے جاتے ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ نے جو حدیث فقہ اور نسب وغیرہ کی مشہور عالمہ تھیں

جنگِ جمل میں فوجوں کی قیادت کی۔ اسی طرح اسماء بنت ابوبکر جو عبداللہ بن زبیرؓ کی والدہ تھیں۔ روایت حدیث اور شجاعت میں مشہور تھیں۔ ان کی وہ نصیحت جو انھوں نے حجاج کے محاصرۂ مکہ کے وقت اپنے بیٹے عبداللہ بن زبیر کو دی تھی صبر و استقلال کی بہترین دعوت تھی۔ اس زمانہ کی عورتوں میں عکرمہ بنت الحرش تھیں جنھوں نے عراقی فوج کے جنگی جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے جنگ صفین کے موقع پر امیر معاویہ کے خلاف اور حضرت علی کی موافقت میں نہایت فصیح پرجوش تقریر کی تھی۔

خلفاء بنی امیہ کے زمانہ میں بعض عورتیں اپنی قابلیت اور صلاحیت کی وجہ سے خلفاء بنی امیہ پر کافی اثر رکھتی تھیں خلیفہ عبدالملک جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نازک اوقات میں پریشان نہ ہوتا تھا اور مشکلات اور مصائب کے ہجوم میں اس کی ہمت اور زیادہ ہوجاتی تھی۔ اپنی بیوی عاتکہ سے بہت مرعوب رہتا تھا۔ چنانچہ عاتکہ نے ایک مرتبہ عبدالملک سے ناراض ہوکر دروازہ بند کرلیا اور عبدالملک کو اپنے پاس آنے سے منع کر دیا۔ عبدالملک صلح کی کوشش میں ناکامیاب ہونے کی وجہ سے غمگین رہنے لگا۔ عبدالملک کے ایک مصاحب نے صلح کرانے کا وعدہ کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ یہ مصاحب عاتکہ کے پاس گریہ وزاری کرتا ہوا گیا اور اس سے کہا کہ میرے صرف دو بیٹے تھے۔ ایک بیٹے نے اپنے بھائی کو مار ڈالا جس کی وجہ سے خلیفہ نے دوسرے کو جو بچ گیا تھا بھائی کے مار ڈالنے کی پاداش میں قتل کا حکم دیا ہے۔ یہ فیصلہ صرف آپ ہی کی سفارش سے منسوخ ہوسکتا ہے، مصاحب نے اس قصہ کو عاتکہ کے سامنے اس طرح سے پیش کیا کہ عاتکہ کو رحم آگیا اور وہ فوراً خلیفہ کے پاس سفارش کو چلی گئی۔ خلیفہ نے پہلے عذر و معذرت کی لیکن بعد میں صرف عاتکہ کی سفارش کی وجہ سے معاف کرنے کا وعدہ کیا۔ عبدالملک نے اس مصاحب کو بہت کچھ انعام و اکرام دیا۔

مسعودی نے ولید بن عبدالملک کی بیوی ام البنین کا ایک قصہ بیان کیا ہے جس سے اس زمانہ کی عورتوں کی بلاغت اور قوتِ استدلال کا پتہ چلتا ہے۔ ایک دن حجاج بن یوسف مسلح ولید بن عبدالملک کے پاس بیٹھا تھا اور ولید معمولی کپڑے پہنے بیٹھا ہوا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ حجاج نے ولید سے کہا کہ ابن اشعث اور عبداللہ بن زبیر کی بغاوت نے مجھ کو اس قدر مشغول رکھا کہ میں آپ سے دور رہا۔ اسی اثنا میں ایک لونڈی آئی اور چپکے سے کان میں کچھ کہکر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہی لونڈی پھر آئی اور چپکے سے پھر کچھ کان میں کہکر چلی گئی۔ ولید نے حجاج سے پوچھا کہ تم سمجھے اس لونڈی نے کیا بات کی حجاج نے جواب دیا کہ میں کچھ نہیں سمجھا۔ ولید نے بتایا کہ اس لونڈی سے ام البنین نے کہلا بھیجا تھا کہ آپ کی نشست اس مسلح عرب کے ساتھ اس طرح مناسب نہیں میں نے کہلا بھیجا کہ یہ حجاج ہے اس پر ام البنین اور خائف ہوئیں اور دوبارہ کہلا بھیجا کہ خدا کی قسم میں نہیں پسند کرتی کہ یہ آدمی جس نے اتنی زیادہ خلق کو قتل کیا ہو آپ کے پاس مسلح بیٹھے اور آپ غیر مسلح ہوں۔ حجاج نے کہا کہ اے امیر المومنین عورتوں کے ساتھ تفریح کی باتیں زیادہ نہ کیا کیجئے اور نہ اپنے راز سے ان کو آگاہ، کسی اہم کام میں ان سے مشورہ بھی نہ کیجئے کیونکہ عورت کی رائے ضعیف ہوتی ہے۔

جب حجاج چلا گیا تو ولید ام البنین کے پاس گیا اور ان باتوں کا ذکر کیا۔ ام البنین نے ولید سے درخواست کی کہ حجاج کو ام البنین کے پاس بھیجدے۔ دوسرے دن جب حجاج، ولید کے پاس آیا تو ولید نے حجاج کو ام البنین کے پاس جانے کا حکم دیا پہلے تو حجاج نے معافی چاہی لیکن جب ولید نے اصرار کیا تو حجاج مجبوراً ام البنین کے پاس گیا۔ ام البنین نے حجاج کو دروازے پر دیر تک کھڑا رکھا اس کے بعد بلاکر کہا "اے حجاج تو ابن اشعث اور عبداللہ بن زبیر کے قتل کا امیر المومنین پر احسان جتاتا ہے۔ خدا کی قسم اگر خدا تجھ کو ذلیل ترین انسان نہ خیال کرتا تو تجھ سے کعبہ کے ڈھانے اور ذات النطاقین کے بیٹے عبداللہ بن زبیر کے قتل کا کام نہ لیتا۔ عبداللہ بن زبیر اسلام میں پہلی اولاد تھی۔ رہا ابن اشعث کا معاملہ تو اس نے تجھ کو ایسی شکست دی کہ تو نے امیر المومنین عبدالملک بن مروان کی پناہ لی، اور اگر انھوں نے تیری مدد نہ کی ہوتی تو سخت ذلیل ہوتا۔ تو نے امیر المومنین

کو مشورہ دیا ہے کہ عورتوں کی صحبت میں زیادہ نہ رہیں، اگر سب عورتیں ایسی ہی اولاد پیدا کرتیں جیسے تیری ماں نے پیدا کی ہے تو امیر المومنین تیری نصیحت پر عمل کرنے میں حق بجانب ہوتے لیکن اگر عورتیں امیر المومنین ایسی اولاد پیدا کریں تو وہ تیری نصیحت کیوں سنیں ۔

خواجہ سرا و حرم سرا خاندان بنی امیہ میں پہلا شخص جس نے خواجہ سراؤں کو نوکر رکھا یزید بن معاویہ خیال کیا جاتا ہے، سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ میں بہت سے رومی خواجہ سرا محل میں مقرر کئے اور آیندہ یہی فتنہ و شر کا باعث ہوئے ۔ وان کرامر کے بیان کے مطابق ولید ثانی کے وقت سے حرم سرا قایم کرنے کا رواج شروع ہوا اور بہت سی قبیح رسمیں اس کی وجہ سے رائج ہوگئیں اور مسلمان مصنفین مثلاً جاحظ وغیرہ نے نہایت سختی سے ان بری رسموں پر تنقید کی۔

غلامی اور اس کا ازالہ قدیم زمانہ میں غلامی کی رسم عام تھی اور غلاموں کے ساتھ سلوک کرنے کے باب میں مختلف قوانین تھے مثلاً یہود غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے اور سات سال کے بعد اسے آزاد کردیتے تھے رومانی قانون کے مطابق مالک کو غلام پر پورا اختیار تھا ۔ یہاں تک کہ اس کی موت و زیست بھی مالک کے ہاتھ میں تھی۔ عرب میں بھی جنگی قیدیوں کو غلام بنالیتے تھے اور ان کو بازاروں میں بیچ ڈالتے تھے ۔ لیکن اسلام میں غلامی کا نظریہ دوسری اقوام سے مختلف تھا ۔ اسلام میں غلام صرف وہی قیدی ہوسکتے تھے، جو ان لڑائیوں میں گرفتار ہوتے تھے جو کلمۃ اللہ کے اعلاء کے لئے لڑی جاتی تھیں ۔ ان کو فدیہ وغیرہ لیکر آزاد بھی کردیا جاتا تھا ۔ رسول اکرم نے غلاموں کو بیچنا حرام قرار دیا تاکہ باپ بیٹوں سے اور بیٹے باپ سے علیحدہ نہ ہوں ۔ متعدد احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے غلاموں سے نیک سلوک کی نصیحت فرمائی اور حکم دیا کہ غلاموں کو وہی کھلاؤ اور پہناؤ جو خود کھاتے اور پہنتے ہو ۔ غلاموں کو آزاد کرنا قرب الٰہی کا بہترین وسیلہ قرار دیا۔

لباس بدوی لباس ایک کھلی ہوئی قبا ہوتی تھی جو ایڑی تک لٹکتی تھی ۔ کمر پر چمڑے کی پیٹی باندھتے تھے ۔ یہی لباس بدوی عورتیں اور مرد اب بھی پہنتے ہیں ۔ قبا کے اوپر اونٹ کے اون کی بنی ہوئی ایک عبا پہنتے تھے ۔ سواری کا لباس مختلف تھا ۔ سواری کے وقت ایک پاجامہ پہنتے تھے اور لٹکتے ہوئے کپڑوں کی بجائے ایک ردا یا چادر ہوتی تھی ۔ سر کا لباس عمامہ تھا جس کا حجم سن اور علم کے لحاظ سے ہوتا تھا ۔ ایک طیلسان یا لمبا کپڑا عمامہ کے اوپر ڈالتے تھے جو کندھوں تک لٹکتا رہتا تھا اس سے سورج کی دھوپ سے بچنا مقصود ہوتا تھا ۔ چادریں امارت، شرف اور منصب کے لحاظ سے مختلف ہوتی تھیں ۔ قبایل کے سردار اور اکابر قوم ایسی قبائیں پہنتے تھے جو پاجامہ کے اوپر گھٹنوں تک لٹکتی رہتی تھیں، اس پر ڈھیلی چادریں ہوتی تھیں جو ایڑی تک لٹکتی تھیں بیچ میں ریشم کی پیٹی باندھتے تھے ۔ اس کے اوپر قبا پہنتے تھے جو در اصل ایرانیوں کا طریقہ تھا ۔ قبا دو قسم کی ہوتی تھیں ۔ ایک تنگ آستین کی اور دوسری ڈھیلی آستین کی ۔ ان میں بٹن قریب قریب لگے ہوتے تھے ۔ اس قسم کی قبا آج کل بھی ایران میں بڑے لوگ پہنتے ہیں، پاؤں میں جوتے پہنتے تھے، عورتیں ایک ڈھیلی شلوار اور ایک قمیص (جو گردن پر کھلی ہوتی تھی) پہنتی تھیں ۔ جاڑے میں اوپر سے ایک چھوٹی چادر اوڑھتی تھیں ۔ عرب عورتیں جب باہر نکلتی تھیں تو چادریں ان کے جسم کو ڈھانک لیتی تھیں تاکہ ان کا لباس غبار اور مٹی سے محفوظ رہے ۔ ایک رومال سر پر لپیٹ لیتی تھیں جو پیشانی پر بندھا ہوتا تھا ۔

کھانا عربوں کی زندگی ابتدا میں نہایت سادہ تھی ۔ ان کی بہترین غذا گوشت تھی ۔ شہر کے رہنے والے دیہات کے رہنے والوں سے کھانے میں عموماً زیادہ تکلف کرتے تھے ۔

خلفائے راشدین جیسا کہ شروع میں تذکرہ کیا گیا ہے کھانے میں کوئی اہتمام نہ کرتے تھے ۔ جب لوگ ساتھ کھاتے تو زمین پر دسترخوان بچھایا جاتا اور دونوں طرف لوگ بیٹھ جاتے ۔ اہل بادیہ کھانے کھلانے میں بڑے فراخدل تھے ۔ رات کو آگ روشن کردیا کرتے تھے کہ بھولا بھٹکا آگ کی روشنی کے ذریعہ سے ان تک پہونچ سکے ۔ (ڈاکٹر) سعید حسن (الہ آباد یونیورسٹی)

ہندوستان کا ایک گمنام شاعر قلق میرٹھی

میں نے جب مومن دہلوی پر کام شروع کیا تو شاگردانِ مومن کے متعلق بھی چھان بین شروع کی اور میرے مشفق تراب علی خاں باز نے اپنے نایاب اور قیمتی ذخیرے میں سے منجملہ اور کتابوں کے دیوان قلق اور دیوان مومن مرتبۂ قلق بھی دیا، شاگردانِ مومن کی فہرست میں قلق کا نام میرے پاس تھا ضرور مگر اُن کی شاعرانہ اہمیت سے میں بالکل ناواقف تھا اب جو میں نے دیوان کا مطالعہ کیا تو آنکھیں کھل گئیں۔

قلق کے حالات کہیں نہیں ملتے آبِ حیات میں صرف اُن کا نام ملتا ہے اور اُن کے دیوان میں جو دو تقریظیں خواجہ حالی اور سید احمد دہلوی کی ہیں اُن سے کچھ حالات ملتے ہیں اس کے علاوہ کہیں بھی قلق کا نام نظر نہیں آتا۔

مولانا آزاد نے آبِ حیات میں مومن کے حالات کے سلسلہ میں جو نوٹ لکھا ہے اس میں قلق کا ذکر اس طرح ہوا ہے

"اس سلسلہ میں نواب مصطفےٰ خاں کی ایک وسیع تقریر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسا ذکی الطبع آج تک نہیں دیکھا اُن کے ذہن میں بجلی کی سی سرعت تھی وغیرہ وغیرہ اس کے ساتھ اس مراسلت میں بعض اور معاملے منقول ہیں مگر ان میں بھی واردات کی بنیاد نہیں لکھی مثلاً یہ کہ مولا بخش قلق مولوی امام بخش صہبائی کے شاگرد دیوانِ نظیری پڑھتے تھے ایک دن خاں صاحب کے پاس آئے اور ایک شعر کے معنی اور نادر مطلب بیان فرمایئے کہ قلق معتقد ہو گئے اور کہا کہ مولوی صاحب نے جو معنی بتائے ہیں وہ اس سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتے لیکن نہ وہ شعر لکھا ہے اور نہ معنی لکھے ہیں"

(آبِ حیات صفحہ ۴۳۹ و ۴۴۰ طبع دوم مطبوعہ ۱۸۸۳ء وکٹوریہ پریس)

دیوان قلق ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء میں مطبع انصاری دہلی میں رائل سائز کے (۳۸۴) صفحات پر چھپا ہے (۱۷) سطری مسطر ہے کتابت طباعت معمولی ہے، چونکہ خواجہ حالی میرٹھ میں سرکاری عربی مدرسہ کے مدرس تھے اس لئے قلق سے بھی ان کے دوستانہ مراسم تھے جن کی بناء پر ایک تقریظ فارسی میں لکھی ہے ------ اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:-

"یہ دیوانِ غرابت عنوان افاداتِ گرامی حکیم غلام مولا عرف مولا بخش قلق سے ہے جو اُردو کے مشاہیر شعراء میں سے اور خان رفیع المکان جناب غفراں مآب حکیم مومن خاں کے شاگرد تھے، میرٹھ وطن تھا بارہ سال کی عمر میں میرٹھ سے دہلی گئے اور کسب کمال و تحصیل علم کیا غدر تک دہلی ہی میں ہے اور مدت طویل تک مولانا امام بخش صہبائی سے فارسی پڑھا کہتے ہیں کہ اُن کے تمام شاگردوں میں جودتِ طبع اور وحدتِ ذہن میں خصوصیت رکھتے تھے، صرف و نحو اور منطق اور دیگر فنونِ عربیہ ملا انتظام علی سہارنپوری سے حاصل کئے اور حکیم غلام نقشبند خاں سے طب پڑھی اُن دنوں جبکہ دہلی کی فصلِ بہار آخر تھی بیشتر گراں مایگانِ علم اور چابک خرامانِ عرصۂ سخن مثلاً غالب و ذوق و مومن اور دوسرے اہلِ کمال جو سخنوری اور نکتہ پروری میں فخرِ دہلی بلکہ نازشِ ہندوستان تھے، دہلی میں موجود تھے، حکیم قلق مرحوم بھی اپنی موزونیِ طبع جودتِ ذہن، فکرِ عمیق اور نظرِ دقیق کی وجہ سے اپنے آپ کو اس صحبت سے دور نہ رکھ سکے اور شاعری شروع کردی

اور مومن مرحوم کے شاگرد ہوگئے اور رفتہ رفتہ استاد کے دل میں خاصی جگہ پیدا کرلی"۔

"مومن مرحوم جیسا کہ اُن کے دیوان سے مستفاد ہوتا ہے غزل اور دوسرے اصناف میں دو طریقے رکھتے تھے — ایک عام اور دوسرا خاص، عام طریقہ وہی میر و مرزا اور دوسرے ریختہ گویوں اور استادوں کا سا تھا دوسرا طریقہ خاص انھیں کا نتیجۂ طبع اور انھیں کے لئے مخصوص ہے جو اگرچہ شاہراہ عامہ سے دور تر ہے مگر یہی اُن کی شہرت اور بلند آوازگی کا سبب ہے اور اسی سے وہ سارے ہندوستان میں استادی، نازک خیالی اور دقت آفرینی میں مشہور ہوئے اسی لئے مومن نے حکیم مولی بخش قلق کی مناسبت طبع اور میل خاطر اپنی طرز میں پاکر اُن پر خاص توجہ کی اور علاوہ اصلاح سخن کے القائے غوامض و دقایقِ فن بھی بڑے الطاف و کرم سے انھیں حاصل کرائے اور بہت کم عرصہ میں انھیں پختہ کردیا چنانچہ جہاں بھی مشاعرہ ہوتا قلق دوسرے اساتذہ کے ساتھ دادِ غزل سرائی دیتے اور حاضرین کو تعجب پر تعجب اور حیرت پر حیرت ہوتی، جب غدر کی آگ دہلی میں بھڑکی تو وہ مجبوراً میرٹھ واپس ہوگئے اور وہیں مستقلاً رہے چنانچہ ۱۲۹۷ھ میں وہیں وفات پائی، بعض سرکاری مدارس میں معلمی کرکے قلق نے زندگی بسر کی نہایت قناعت پسند، اپنے فضل و ہنر پر غیور اور مال و دولت سے مستغنی تھے شعر و سخن میں استاد اور طبابت میں بھی صاحبِ کمال تھے فرصت کا کچھ حصہ مطب کے بھی نذر کرتے تھے مرتے وقت اپنے چھوٹے بھائی کو دیوان چھپوانے کی وصیت کی تھی جس کی تعمیل اُن کے چھوٹے بھائی محمد عبداللہ نے جو انگریزی داں اور شعر و سخن سے زیادہ مانوس نہیں ہیں اس دیوان کو چھپوا کر کی ہے

گر برادراں زینساں مہر دوستی ورزند — چوں رسد بہ فرزنداں نوبتِ نکوئیہا"

یہ تین صفحات کی تقریظ خواجہ حالی نے لکھی ہے اس کے بعد سید احمد دہلوی مدرس فارسی گورنمنٹ اسکول دہلی کی تقریظ ہے جو نقل کی جاتی ہے۔

"یہ مولانا حکیم شیخ مولا بخش قلق جو میرٹھ میں اپنے شہر کا فخر اور موجودہ شعراء ہند میں ایک اعلیٰ درجہ کے نازک خیال تھے در اصل اساتذۂ دہلی کے فیض کا ایک عمدہ نمونہ تھے، درسی کتابیں آپ نے فاضل اجل جناب مولانا امام بخش صہبائی سے انکے فرزند مولوی عبدالکریم سوز کے ساتھ ہم سبق ہوکر دیکھیں، طب میں ارسطوئے زماں حکیم نقشبند خاں صاحب دہلوی سے تلمذ اور تجربہ حاصل کیا فنِ شعر میں جناب حکیم مومن خاں صاحب دہلوی سے کمال بہم پہونچایا، آپ کے شعر وہ تڑپتے ہوئے اور برجستہ ہوتے تھے کہ کیسا ہی ٹھنڈی طبیعت کا آدمی کیوں نہ ہو تڑپ ہی جاتا تھا، عجب نہیں جو بعض اوقات مولانائے ممدوح کو خود بھی اپنے اشعار پر رشک آجاتا ہو، استاد اور شاگرد میں جو ایک خاص نسبت ہونی چاہئے وہ آپ میں اور حضرت مومن خاں میں بخوبی موجود ہے کوئی بڑا ہی صاحبِ مذاق ہو تو شاید یہ کہہ سکے کہ اشعار تو مومن خاں کے ہیں مگر البتہ ابتدا اور انتہا کا کہیں کہیں فرق ہے ورنہ ہر ایک کا کام نہیں ہے کہ مومن اور قلق کے سخن میں تمیز کرسکے ان کے تڑپتے ہوئے اشعار ان کی طبیعت کی شوخی زبان کی سلاست خیال کی نزاکت۔ اور صنایع شعری پر خود گواہ ہیں ...."

"چونکہ آپ کی عمر نے ابھی دوسرا ہی مرحلہ طے کیا اس سبب سے ترتیب دیوان کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی تھی مگر دوست احباب کے تقاضے سے تنگ آکر مرنے سے چند روز پہلے جیسا بنا جوں توں کرکے ترتیب دے لیا تھا ابھی چھپنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ قضائے ناگہانی نے بیوقت آن دبایا"

معلوم نہیں کس جگہ مگر کہیں میں نے دیکھا ہے کہ مومن کے انتقال کے وقت قلق کی عمر اکیس برس کی تھی مومن نے ۱۲۶۸ھ میں انتقال کیا ہے اس طرح قلق کی ولادت ۱۲۴۷ھ کی قرار دی جاسکتی ہے اور ان کی آمد دہلی میں ۱۲۵۹ھ سمجھی جاسکتی ہے اور انتقال کے وقت یعنی ۱۲۹۷ھ میں عمر پچاس سال قرار پاتی ہے یہ اندازہ صحیح بھی ہے کیونکہ سید احمد دہلوی نے لکھا ہے کہ

"آپ کی عمر نے ابھی دوسرا ہی مرحلہ طے کیا تھا" یعنے عمر پچاس سال کی ہوئی تھی۔

دہلی میں قلق نے صہبائی سے اُن کے چھوٹے فرزند عبدالکریم سوز کے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی اور دونوں میں بڑی محبت تھی خمخانۂ جاوید میں سوز کے حالات میں لکھا ہے کہ:-

"مولا بخش قلق میرٹھی مرحوم جو حضرت صہبائی کی شاگردی سے پھر کر جناب مومن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے تھے اُن سے کارزار شاعری میں مقابلے ہوئے قلق کو زار و حزیں ہونا پڑا ہنگامۂ سخن میں اُن کے آگے قدم نہ جمے"

(خمخانۂ جاوید جلد ۴ صفحہ ۸۸۳)

عبدالکریم سوز، قلق کے ہم عمر تھے ممکن ہے کہ صہبائی سے پڑھنا چھوڑ کر مومن کے پاس قلق کا جانا سوز کو ناگوار گزرا ہو اور چند روز ان دونوں میں اختلاف رہا ہو مگر قلق کی وجہ سے صہبائی اور مومن کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا اور وہ دونوں حسب سابق ایک دوسرے کے مخلص اور دوست تھے، قلق کے دیوان میں سوز کے انتقال کی تاریخ کہیں نظر نہیں آتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قلق اور سوز میں آخر زمانہ میں کچھ خلوص باقی نہ رہا تھا ورنہ ۱۲۷۲ھ میں سوز گوروں کے ہاتھ دہلی میں بے گناہ مارے گئے ان دنوں قلق زندہ تھے اور غالباً دہلی ہی میں تھے پھر سوز کی تاریخ وفات وغیرہ نہ کہنا کیا بات اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن دونوں میں صفائی باقی نہ تھی، دیوان قلق میں صرف دو رباعیاں سوز کے متعلق ہیں جو ابتدائی زمانے کی ہیں، آپ بھی سن لیجئے:-

وہ ایک مہینے کے لئے کیا بچھڑے، جو اُٹھ نہ سکے حادثے وہ مجھ پہ پڑے
جنبش نہ کرے گا یہ مہینہ صد سال اے چرخ عجب پیچ سے بیٹھے جکڑے

اے صل علیٰ سوز ترا حسن و جمال، یہ مہر میں خوبی ہے نہ یہ مہ میں کمال،
کاہش کے سوا کچھ نہیں افزائش میں تو بارہ برس کا رہے یارب صد سال

اطبائے یونان کے متعلق مشہور ہے کہ جو حکیم جس مرض کا معالج خصوصی تھا اُسی مرض میں خود مبتلا ہوکر مرا ہے یہی حال قلق کا بھی ہوا ہے چونکہ بڑے اچھے حکیم اور ماہر طبیب تھے اس لئے مرضِ سل میں مبتلا ہوکر مرے چنانچہ حافظ محمد امداد حسین ظہور میرٹھی نے قطعۂ تاریخ وفات میں اس کی صراحت کی ہے اور یہ قطعہ دیوان قلق کے ساتھ چھپا ہے:-

قلق شاعرے خوش گپ و خوش خصال ز دنیا سوئے دار جنت برفت
بہ بیماریِ سل کہ بُد جاں گسل بہ تسلیم شاد و بہمت برفت
سروش از پئے سال گفت از ظہور قلق شاعر ما بجنت برفت

۱۲۹۷ھ

آپ شاید یہ سمجھیں کہ قلق کو سل کی بیماری خاندانی ہوگی مگر ایسا نہیں ہے، یہ سل ان کو افلاس و تنگ دستی آلام و افکار کی وجہ سے ہوگئی تھی، چنانچہ ان کے کلام سے خود اس کی تفصیل ملتی ہے، ایک رباعی "غم نان" میں کہی ہے:-

بے برگ و نوا کی شعر خوانی معلوم بے دانہ و دام نکتہ دانی معلوم
جس کی کہ غمِ نان ہی غذا ہو اس کی میدانِ سخن میں پہلوانی معلوم

ان آلام و افکار نے ان کی طبیعت میں قنوطیت پیدا کردی تھی چنانچہ کہتے ہیں:-

ہر شاخ پہ آشیاں ہے لرزاں اس باغ میں ہوچکا گزارا
کیوں موت کے آسرے پہ جیتے اے زیست ہمیں تو تو نے مارا

غم بھی کھانے کو نہ جی بھر کے میسر آیا   تہئ کاسۂ تقدیر سے دل بھر آیا

حیف خمیازہ ہائے حسرت و شوق   زندگانی کشاکشی ہی سہی

دیوان قلق ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہے صرف چند شعر نقل کئے گئے ہیں، قلق نے شادی نہیں کی تھی، بھائی میرٹھ میں ے تو ان کے ساتھ رہتے جب وہ اپنی ملازمت کی وجہ (کیونکہ وہ محکمۂ نہر کے سپروائزر تھے) سے کہیں چلے جاتے تو ہا رہتے تھے۔ قلق نے مومن، غالب، میر سبھوں کی غزلوں پر غزلیں پر غزلیں کہی ہیں مگر رنگ وہی مومن کا ہے، ایک مرع عام طور پر مشہور ہے اور میں بچپن سے سُن رہا ہوں آپ نے بھی سنا ہوگا ــ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا" ر کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ یہ مصرع قلق کا ہے، اور اُن کی ایک قطعہ بند یعنے مسلسل غزل کے مقطع کا مصرع ثانی ہے۔ لعہ لمبا ضرور ہے مگر پُرلطف ہے اس لئے نقل کرتا ہوں، سنئے :-

شب سرِ شوریدہ بالیں پر مرے یکجا نہ تھا   دل میں تھا اک جوش لب پر نالۂ مستانہ تھا

حسرتِ خوابیدہ کیا کیا چونکتی تھی سینے میں   دل میں جوں جوں شور افغاں ہائے بیتابانہ تھا

عاقبت کی چشم پوشی چشم نے اس حال سے   اور غفلت یہ ہوئی طاری کہ ہوش اصلا نہ تھا

لے اُڑی پھر دشتِ گردی خواب میں سوئے چمن   اور چمن بھی وہ کہ آزادوں کا دام و دانہ تھا

سیر کرتے کرتے جب آگے بڑھا دیکھا وہاں   شکل میں عشرت کدہ کی ایک عبرت خانہ تھا

اک طرف مئے اُڑ رہی تھی اور ہزاروں خم کے خم   کوئی بیخود کوئی بیتاب اور کوئی مستانہ تھا

نغمہ برلب جان برکف دل نگار آتشیں   سب محبت کیش تھے کیا حلقۂ رندانہ تھا

اور اک جانب کو حلقہ زن تھے چندیں شمع رو   مہر جن کے سامنے خاکسترِ پروانہ تھا

جس طرف کو ہنس دیا میدانِ محشر ہو گیا   پھر گئیں نظریں جدھر یک لخت سب ویرانہ تھا

اُن میں سے اک فتنہ گر آگے بڑھا میری طرف   زلف تھی رخ پر پریشاں ہاتھ میں اک شانہ تھا

خود بخود پہلو میں آ بیٹھا کچھ ایسے ناز سے   گویا وہ غارت گرِ دل میرا ہی دیوانہ تھا

اور لگا کہنے کہ گیسو تو ذرا سلجھا مرا   اس طرح سلجھا کہ یہ گویا کہیں اُلجھا نہ تھا

زلف چہرے سے سرکتے ہی موذن چیخ اُٹھا   آنکھ پٹ سے کھل گئی ایسی کہ میں سویا نہ تھا

پھر وہی دل تھا وہی ماتم وہی درد و قلق،
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اُردو شعراء میں سب سے پہلے مومن ہی نے مسلسل اور قطعہ بند غزلیں کہی ہیں ورنہ ان سے پہلے اور ان کے معاصرین مسلسل غزلیں نہیں کہا کرتے تھے، مومن کی اتباع قلق نے کی ہے اور اکثر غزلیں مسلسل کہی ہیں جن میں سے ایک آپ نے ہی سن لی، قلق نے مومن کی پوری خصوصیات کو بڑی خوبی سے "اپنایا" ہے ذیل کے شعر اس کا بہترین نمونہ ہیں،

جی کا جی ہی میں رہا حرفِ تمنا افسوس   کہنا کچھ آپ ہی اور آپ پشیماں ہونا

ہمیں کیوں دل دیا اور دلربائی دلمیں کیوں کی تھی   خدا دشمن بتوں کی بندگی سے ہو نہیں سکتا

کریں وہ پاک قصہ یہ نزاکت سے نہیں ممکن   اٹھاؤں ہاتھ یہ بےطاقتی سے ہو نہیں سکتا

جب نقدِ حسن رونقِ بازار ہو گیا   سودائے ناقبول خریدار ہو گیا،

وہ ہے قابو میں تو قابو نہیں اپنے اوپر   کب گئے ہوش کہ جب سامنے دلبر آیا

وہ ہی میں وہ ہی فلک وہ ہی عدو وہ ہی نصیب — جانے کیا حادثہ ہے کیوں وہ مرے گھر آیا
تا داستانِ وصل تو غمخوار تھے حریف — جب دردِ دل کہا تو کوئی درمیاں نہ تھا
حیف وہ نوحہ کہ دل میں آتے ہی نغمہ ہوا — ہائے وہ نغمہ جو آکر لب پہ شیون ہوگیا
اس کی بیداد میں بھی لطف کا ساماں ہوگا — سر نہ ہونے کا بھی سر پہ مرے احساں ہوگا
گو غیر ہی کی ہو مگر اُلفت کا اعتبار — ظالم ترے یقین کا مجھ کو گماں نہ تھا
نہ لگتی آنکھ تو سونے میں کیا برائی تھی — خبر جو آپ کی ہوتی تو بے خبر ہوتا
تقریب عیادت کی بھی امید ہوئی — ہوگیا اور بھی بیمار میں اچھا ہوکر
نالہ کرتا ہوں لوگ سنتے ہیں — آپ سے کچھ مرا کلام نہیں
یوں تو وہ عالم آشنا ہے مگر — اک مجھی سے ذرا لڑائی ہے
وہی رنج ہے تو یوں ہی سہی وہ قلق ہی تھا کوئی نہیں — مری آپ کو بھی ہے بندگی مرا عشق کو بھی سلام ہے
ہے ہے کہ ہوگا داورِ محشر بھی محو خواب — کہنی پڑے گی ساری تری داستاں مجھے

مومن نے نقشِ پا پر سجدہ کرتے ہوئے کوچۂ رقیب میں بھی گزر کیا تھا اور اس کو اپنی ذلت سمجھتے تھے مشہور شعر ہے:-

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا، کیا ذلیل — میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

مگر قلق، مومن سے بھی بڑھ جاتے ہیں ایک ایک نقشِ پا پر کئی کئی سجدے کرکے نقشِ پا مٹا دیتے ہیں۔

کثرتِ سجدہ سے پشیماں ہیں، — کہ ترا نقشِ پا مٹا بیٹھے

مشتے نمونہ از خروارے چند شعر میں نے نقل کئے ہیں اس سے اندازہ لگائیے کہ قلق نے مومن کا رنگ کتنا اڑایا تھا نہ صرف تخیل اور طرزِ ادا بلکہ استعارات، تشبیہات، تراکیب بھی مومن ہی کے استعمال کرتے ہیں چند اس قسم کے شعر بھی ملاحظہ فرمائیے:-

لو جوشِ قہر شوقِ ترحم میں آگیا — ثابت ہوا گناہ نہ کرنا قصور تھا
کوششِ پردہ عبث حوصلۂ دید کسے — جلوہ کیا کم تھا اگر منہ ہی چھپانا ہوتا
یا نہ ہوتی تھی چرخ کو گردش — یا مجھی پر مدار ہوتا تھا
پردہ داری عشق میں پردہ دری سے کم نہیں — میرا اندازِ خموشی خود فغاں ہوجائے گا
جیتے رہے ہیں مردنِ دشوار کے لئے — مرتے رہے ہیں عمر بھر اندازِ یار پر
ہے طرزِ محبت ہی دل آشوب وگرنہ — کچھ بات عداوت کی نہ تم میں ہے نہ ہم میں

اب تک آپ نے متفرق شعر ملاحظہ کئے ہیں اور صرف ایک قطعہ بند اور مسلسل غزل دیکھی ہے اب چند غزلوں میں سے چیدہ چیدہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے تاکہ آپ قلق کی شاعری کا صحیح اندازہ کرسکیں یہ اشعار بلا انتخاب ہر ایک غزل میں سے نقل کئے جارہے ہیں تاکہ آپ کو قلق کا عام رنگ معلوم ہوسکے۔

اللہ ری دشمنی مرے حالِ تباہ پر — اعدا بھی رو چکے وہ نہیں شادماں ہنوز
بے التفاتیوں میں بھی اک التفات ہے — ہے نذرِ نیم ناز مری نیم جاں ہنوز
اس قدر ہوگئے ہم زیست سے ناچار کہ بس، — چارہ سازوں سے طبیعت ہے یہ بیزار کہ بس
میرا ہر لفظ ہے یہ ذہن پریشاں کہ نہ پوچھ — اس کو ہر بات ہے اس مرتبہ تکرار کہ بس
نہ اسے پاس ہے میرا نہ حیا ہے اس کو — دلِ خود کام بھی ہے اتنا خود آزار کہ بس

ہم سے تیری وہ دلگیر اجل ہے کہ پناہ مرگ سے میرے وہ شرمندہ ہے آزار کہ بس
کر لیا سارے زمانے کو قلق نے دشمن کیا بلا نشۂ الفت میں ہے ہشیار کہ بس

عشق کو منظور رسوائی دروغ حسن کو پاسِ حیاداری غلط
رہ گئے ہم آسماں کو دیکھ کر اس کا آشوب ستمگاری غلط
نام لے کر تیرا رو پڑنا صحیح دل کو دے کر گریہ وزاری غلط

ملتے ہیں تیرے واسطے اب مدعی سے ہم پھرتے ہیں کیسے کیسے خوشی ناخوشی سے ہم
کیا ایسے ہی ذلیل تھے پہلے کبھی جاہ سے احوال اپنا پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم
یاد آگئیں جو شب کو تری بے حجابیاں سایہ میں اپنے چھپ گئے شرمندگی سے ہم

قلق، مومن کے نہ صرف متبع ہی تھے بلکہ انھوں نے اپنے آپ کو مومن کے رنگ میں رنگ لیا تھا اور یہ رنگ اتنا گہرا تھا کہ آپ مومن اور قلق میں مشکل سے تمیز کر سکتے ہیں مگر مومن کی طرح قلق نرے شاعر نہ تھے بلکہ ماحول سے متاثر ہونے والے اور پکے دنیا دار قسم کے آدمی تھے، دنیا کی پوری دلچسپیوں میں حصہ لیتے تھے اور میلے ٹھیلے تک جاتے آتے تھے چنانچہ نوچندی کے میلہ کا حال سنئے

نوچندی کے میلے کا نہ پوچھو کچھ حال ہوں دیکھ کے حیران کہ دوں کس سے مثال
یا روضۂ رضوان ہے سادا سا مکان یا سیر سے میرا ہی منقش ہے خیال،

قلق نے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، نواب کلب علی خاں والیِ رام پور، حیات خاں، رابرٹ جارج گرے، وغیرہ کی تعریف میں قصاید اور چند قطعات بھی کہے ہیں، قلق کے قصاید میں کوئی خاص بات نہیں مومن خاں کی طرح قصیدے میں غزل کا رنگ پیدا ہے شیفتہ کی مدح میں جو قصیدہ کہا ہے اس میں غزل بھی کہ ڈالی ہے نمونتہً دو تین شعر آپ بھی سن لیجئے:۔

نہ دے فریبِ اثر مجھ کو نالۂ ناشاد کہ یار حیلہ طلب بخت بد فلک بیداد
نہ پوچھ چرخ سے تقریب حشر و نشر نہ پوچھ کہ میری خاک کو کرنا ہے عاقبت برباد
تجھے کبھی روئے بنی بات بات پر ظالم تری زباں ہو اور کاش ہو مری روداد

البتہ ایک قصیدۂ لامیہ جو کلب علی خاں کی مدح میں کہا ہے اپنے رنگ سے ہٹ کر کہا ہے اور (۱۵۸) شعر کا طویل قصیدہ بڑا مکمل ہے جس کا مطلع ہے ا۔

تیغ خورشید حمایل کئے بیٹھا ہے حمل خیمہ گاہِ دے و بہمن میں پڑی ہے ہلچل

ایک واسوخت (دشمن) بھی بڑی اچھی کہی ہے، ایک بند آپ بھی سن لیجئے:۔

اے خانہ برانداز حیا ہم سے پھرا تو پامال کیا نقشِ وفا خوب گیا تو
کس خاطر ناکام کا آرام ہوا تو رنگ رخ مایوس کے مانند اڑا تو
کیا کام ہے دل میں اگر آنکھوں سے چھپا تو ارماں کی طرح پھر کے نہ آنے سے بھی جا تو
جیتے ہیں تو مقدور تلک صبر کریں گے
مجبور سہی دل پہ مگر جبر کریں گے

یہ واسوخت بہت طویل (۰۰) بند کی ہے۔ مرثیہ بھی قلق نے کہا ہے مگر کوئی خاص بات پیدا نہ کر سکے، اسی طرح چند قطعات اور رباعیات بھی دیوان میں ہیں مگر اُن میں کوئی خاص بات نہیں۔

تمکین کاظمی

اسٹالین اور ویلز کی تاریخی ملاقات

فلسفۂ اشتراکیت ایک ماہر اشتراکیت کی زبان سے

حال ہی میں امریکہ میں ایک کتاب شایع ہوئی ہے جس کا نام ہے The Great Conversation اس میں وہ تمام ریکارڈ کی ہوئی گفتگو درج ہے جو اسٹالین اور اچ - جی ویلز کے درمیان ہوئی تھی، اس میں شک نہیں کہ ۲۳ جولائی ۱۹۳۴ء اچ جی ویلز کی زندگی کی بڑی اہم تاریخ ہے جب پہلی بار اسٹالین سے ملنے اور دیر تک نظریۂ مارکیست پر گفتگو کرنے کا موقع اسے ملا - یہ ملاقات تقریباً تین گھنٹے تک جاری رہی جس میں ویلز اور اسٹالن دونوں نے دل کھول کر اپنے اپنے زاویۂ نگاہ کو پیش کیا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ویلز اس کے بہت گہرے اثرات لیکر ماسکو سے واپس آیا۔

ہم اسٹالن اور ویلز کی اسی گفتگو کا ضروری اقتباس اس جگہ پیش کرتے ہیں کہ جس سے دنیا کے معاشرۂ مستقبل کے متعلق اسٹالین ایسے خاموش اور گہرے انسان کا صحیح نقطۂ نظر معلوم کرنے میں ہم کو بڑی مدد مل سکتی ہے - (نیاز)

ویلز :- مسٹر اسٹالین، میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے تبادلۂ خیال کا موقع دیا۔ میں حال ہی میں امریکہ گیا تھا اور وہاں پریسیڈنٹ روزولٹ سے گفتگو کرنے کے بعد میں نے ان کے صحیح خیالات معلوم کئے اب میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں تاکہ یہ معلوم کروں "آپ کیا کرنا چاہتے ہیں" لیکن یہ واضح رہے کہ میں یہ تمام معلومات اس وقت ایک عام انسان کی حیثیت سے حاصل کرنا چاہتا ہوں کسی سیاسی فریق کے کارکن ہونے کی حیثیت سے نہیں۔

امریکہ جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہاں بڑا اقتصادی انقلاب پیش نظر ہے، پرانا مالیاتی نظام ختم ہو رہا ہے اور ملک کی اقتصادی زندگی کو بالکل نئے سانچے میں ڈھالا جا رہا ہے - لینن کا قول تھا کہ "ہم کو کاروبار سرمایہ داروں سے سیکھنا چاہئے" لیکن آج سرمایہ دار آپ سے پوچھنا چاہتا ہے کہ سوشلزم کی صحیح روح کیا ہے۔

اس وقت امریکہ میں تنظیم جدید کا کام پوری قوت کے ساتھ جاری ہے، اور اشتراکیت کی سطح پر وہاں کے اقتصادیات کو لایا جا رہا ہے گویا آپ اور روزویلٹ ایک ہی منزل تک دو مختلف راستوں سے پہونچنا چاہتے ہیں جو کچھ میں نے واشنگٹن میں دیکھا وہی یہاں بھی دیکھ رہا ہوں، منصوبہ بندیوں کے تحت نئے نئے دفاتر کا قیام مروجہ قوانین وقواعد میں مناسب تبدیلیاں، سول سروس کے نظام کی جدید تنظیم میں عملی اہلیت کا خاص لحاظ - یہ تمام باتیں آپ کے یہاں بھی ہیں اور وہاں بھی، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ واشنگٹن اور ماسکو کے درمیان اتحاد خیال کی بنا پر کوئی اختلاف نہ ہونا چاہئے۔

اسٹالین :- "ہمارے اور امریکہ کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے، امریکہ اقتصادی خطرات سے بچنے کے لئے جو کچھ کر رہا ہے اس کی بنیاد بدستور سرمایہ دارانہ جد و جہد پر قایم ہے اور وہ بنیادی طور پر اپنے اقتصادی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں کرنا چاہتا --- ---------------- گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ موجودہ اقتصادی

سے جو نقصان اُس کو پہونچ رہا ہے اس کو وہ بڑی حد تک کم کردینا چاہتا ہے۔ ہمارے یہاں صورت بالکل دوسری ہے اور ہم اقتصادی نظام کو باقی رکھنا ہی نہیں چاہتے اور ایک نیا نظام بالکل نئے زاویہ سے قایم کرنا چاہتے ہیں۔

امریکہ کی جدید اقتصادی اسکیم کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ پیدا واری نظام میں انارکی پیدا ہوجائے گی کیونکہ وہ پرانے سوشل نظام کو یں چاہتے بلکہ اس کی مضرتوں کو صرف کم کردینا چاہتے ہیں، برخلاف اس کے ہمارے اقتصادی نظام کا مقصود یہ ہے کہ ں کو یک لخت دور کر دیا جائے اور اس میں صرف اسی وقت کامیابی ہوسکتی ہے جب سرمایہ داری کو بالکل مٹا دیا جائے۔ دار کبھی اس بات پر راضی نہیں ہوسکتا کہ بیکاری کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ اس کو سستے مزدور اسی وقت مل سکتے ہیں لک میں بیکاروں کی کافی تعداد موجود ہو۔

ہمارے اقتصادی نظام کی روح یہ ہے کہ ملک میں صرف ان صنعتوں کو فروغ دیا جائے جو عوام کی ضرورتوں کو پورا کرنے ہیں خواہ ان میں نفع ہو یا نہ ہو، برخلاف اس کے امریکہ کا سرمایہ دار کبھی اس بات پر راضی نہ ہوگا کہ وہ کسی ایسی صنعت کو ے دے جس میں اس کو معقول نفع نہ ہو۔ اسی لئے میں نے کہا کہ جب تک ذاتی ملکیت اور سرمایہ داری کو بالکل ختم نہ کردیا جائے ے لئے واقعی کوئی اقتصادی نظام مرتب نہیں ہوسکتا۔"

ہر :- "آپ نے جو کچھ کہا میں اس سے بڑی حد تک متفق ہوں، لیکن اگر امریکہ اپنے موجودہ اقتصادی نظام کو دفعتًا بدلنے بجائے اس میں آہستہ آہستہ تبدیلی پیدا کرے اور آخر میں وہ سوشلزم کے حدود تک پہونچ جائے تو اس میں کیا حرج ہے روز ویلٹ کی جدید اقتصادی اسکیم بھی در اصل سوشلزم ہی تک پہونچتی ہے۔ اور یہ آپ کے ان کے درمیان ایسا مشترک ہے جس پر دونوں متحد ہوسکتے ہیں۔"

الین :- "میں مسٹر روز ویلٹ کی نیت اور ان کی ہمت و جراءت کا مداح ہوں اور جانتا ہوں کہ اس وقت سرمایہ دارانہ ام کی دنیا میں ان کی ذات سے کچھ توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ لیکن جب تک حالات موافق نہ ہوں اور ماحول مساعد نہ ہو ز ویلٹ بھی کیا کرسکتے ہیں۔

جس حد تک نظریہ کا تعلق ہے ہوسکتا ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو باقی رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ اس منزل کو پالیا ے جسے اینگلو سیکسن اقوام اپنی زبان میں سوشلزم کہتی ہیں، لیکن عملًا یہ بہت دشوار ہے کیونکہ جس وقت روز ویلٹ یا کوئی سرمایہ داری کے خلاف کوئی موثر قدم اُٹھائے گا تو بورژوا طبقہ فورًا مخالف ہوجائے گا اور کامیابی ناممکن ہوجائے گی۔ امریکہ بنک، صنعتی کارخانے، بڑے بڑے فارم، ریلوے کمپنیاں اور تجارتی جہازوں کے بیڑے روز ویلٹ کے ہاتھ میں نہیں ہیں بلکہ سب سرمایہ داروں کی ذاتی ملکیت ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ ان تمام اداروں، کارخانوں اور کمپنیوں میں کام کرنے والے ماہرین ن روز ویلٹ کا کہنا نہیں مانیں گے بلکہ وہی کریں گے جو ان کے مالک چاہتے ہیں، اور ان کے یہ مالک کبھی پسند نہ کریں گے کہ ان کی دولت میں عوام شریک ہوجائیں۔ ان حالات میں سرمایہ دار حکومتوں کی حیثیت در اصل محض ایک محافظ یا سپاہی کی سی ہے جس کا کام صرف یہ ہے کہ ملک میں بد امنی نہ ہونے دے اور اگر کوئی دوسرا ملک حملہ آور ہو تو مدافعت کرے اور اپنی اس خدمت کا معاوضہ وہ ٹیکس کے ذریعہ سے وصول کرتا رہے۔

سرمایہ دار ممالک اقتصادی و معاشی نظام میں کوئی تبدیلی کر ہی نہیں سکتے کیونکہ وہاں کی حکومتیں سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھ یں ہیں اور یہ طبقہ کوئی ایسا معاشی نظام پسند ہی نہیں کرسکتا جو فرقِ مراتب کا دور کرنے والا ہے۔ اسی لئے میں نے کہا کہ سٹر روز ویلٹ بھی اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ ہوسکتا ہے کہ کئی نسلوں کے بعد آہستہ آہستہ کوئی تدریجی ترقی ہوسکے، لیکن حقیقی منزل تک پہونچنے کا امکان پھر بھی بہت کم ہے۔

ویلز :- "موجودہ سائنس کی ترقی نے امریکن آبادی کی ذہنیت میں بھی بڑا انقلاب پیدا کردیا ہے اور انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے معاشی نظام کی تبدیلی کو ایک میکانکی ضرورت تسلیم کیا جاتا ہے۔ فرض کریجئے کہ وہاں بنکوں کا انتظام اور مصنوعات کی نقل و حرکت کا اہتمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیلے تو اس کے معنے بھی یہی ہوں گے کہ ان کی ملکیت حکومت کے ہاتھ آگئی اور اس طرح اشتراکی تنظیم کا آغاز ہوجائے گا۔ سوشلزم اور انفرادی ملکیت سفید و سیاہ کی طرح ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان کچھ ایسی منزلیں بھی پائی جاتی ہیں جہاں دونوں کا اشتراک ممکن ہے، مثلاً اگر ایک خاص نہج پر معاشی تنظیم کیجائے تو وہ سوشلزم ہی کی مترادف ہوسکتی ہے۔ جدید معاشی تنظیم بڑی حد تک ماہرین فن کی اعانت پر منحصر ہے اور ماہرین رفتہ رفتہ سوشلزم کے اصول پر کام کرنے کے لئے مائل کئے جاسکتے ہیں۔"

اسٹالین :- "یہ صحیح ہے کہ فردیت (Individualism) اور اجتماعیت (Collectivism) کے درمیان کوئی ایسا فرق نہیں ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے نہ مل سکیں، کیونکہ اجتماعی مفاد انفرادی مفاد بھی ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو سوشلزم کا تصور انفرادی مفاد کے تصور سے علحدہ ہو ہی نہیں سکتا، لیکن اصل سوال تو طبقاتی تفاوت کا ہے۔ ایک طبقہ سرمایہ والوں کا ہے، دوسرا ملکیت رکھنے والوں کا اور تیسرا مزدوری محنت کرنے والوں کا جسے پرولتاری طبقہ کہتے ہیں۔ اول الذکر دو طبقے وہ ہیں جو بنکوں، کارخانوں، معدنوں، فارموں اور نوآبادیوں کے مالک ہیں، اور صرف اپنے نفع کو دیکھتے ہیں، پرولتاری طبقہ غریبوں کا ہے جو اپنی قوت عمل کو فروخت کرنے کے بعد بھی ضروریات زندگی فراہم نہیں کرسکتا۔ پھر کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان کبھی اتحاد و اتفاق ہوسکتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ روزویلٹ اس طبقاتی کشمکش کو دور کرنے میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوئے اور نہ آیندہ ہوسکتے ہیں، ہر چند میں خود امریکہ کبھی نہیں گیا اور وہاں کے حالات مجھے صرف اخبارات و رسایل یا کتابوں کے ذریعہ سے معلوم ہوئے ہیں تاہم چونکہ میں سوشلزم کے لئے جہاد کرچکا ہوں، اس لئے سمجھ سکتا ہوں کہ اگر روزویلٹ نے کبھی حقیقی معنی میں پرولتاری طبقہ کے مطالبات پورے کرنا چاہئے تو سرمایہ دار طبقہ فوراً روزویلٹ کی جگہ دوسرا پریسیڈنٹ مقرر کرلے گا اور کہے گا کہ پریسیڈنٹ تو آتے ہی جاتے رہتے ہیں، ہم کیوں کسی کے لئے اپنے مفاد کی قربانی کریں۔"

ویلز :- انسانیت کی جو سادہ تقسیم آپ نے امیر و غریب جماعتوں میں کردی ہے، اس سے مجھے اختلاف ہے، وہاں ایک جماعت یقیناً ایسی ہے جس کا مقصود صرف مادی منفعت حاصل کرنا ہے، لیکن ان کو وہاں بھی برا سمجھا جاتا ہے۔ وہاں بہت سے دولتمند ایسے بھی ہیں جن کا مقصود صرف دولت جمع کرنا نہیں، بلکہ اس کو پھیلاکر اپنے نفع کے ساتھ دوسروں کو نفع پہونچانا ہے علاوہ اسکے وہاں ایک معقول جماعت ایسے لوگوں کی بھی ہے جو موجودہ معاشی نظام سے مطمئن نہیں ہے، اور یہ وہ لوگ ہیں جو مستقبل کا سوشلسٹ نظام استوار کرنے میں نمایاں حصہ لے سکتے ہیں، چنانچہ پچھلے دو سال کے اندر میں نے ان ٹکنکل ماہرین کے درمیان رہ کر سوشلزم کا کافی پروپگنڈا کیا ہے، لیکن ان کے سامنے اس مسئلہ کو صرف "امیر و غریب" کی تقسیم کی حیثیت سے پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

اسٹالین :- اس میں شک نہیں کہ امیر و غریب کے درمیان ایک اوسط طبقہ بھی ہے، ٹکنکل ماہرین کی بھی ایک جماعت ہے لیکن ان کے وجود سے "امیر و غریب کی تقسیم" پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ اوسط طبقہ جن میں کچھ اچھے ہیں اور کچھ برے، کبھی سرمایہ داروں کے ساتھ ہوجاتا ہے اور کبھی طبقۂ عمال کے ساتھ۔ اس لئے وہ کوئی تیسرا علحدہ طبقہ نہیں۔ اصل اختلاف تو وہ اصل سرمایہ دار اور مزدور جماعت کے درمیان ہے اور وہ بدستور قایم رہے گا۔ اوسط طبقہ کا وجود اس اختلاف کو وسیع تو کرسکتا ہے لیکن دور نہیں کرسکتا

ویلز :- "مگر بہت سے ایسے لوگ بھی تو ہیں جو غریب نہیں ہیں لیکن کام میں لگے ہوئے ہیں اور ملک کی پیداوار بڑھا رہے ہیں"۔

اسٹالین :- "ہاں چھوٹے چھوٹے زمیندار، تاجر اور صناع اس قسم کے ضرور موجود ہیں، لیکن ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنا ان کے ہاتھ میں نہیں، یہ فیصلہ تو عمال کے ہاتھ میں ہے جو اپنی محنت سے سوسائٹی کی ضروریات فراہم کرتے ہیں"۔

ویلز :- "سرمایہ داروں کی بھی تو قسمیں ہیں، بعض ایسے ضرور ہیں جن کا نقطۂ نظر صرف دولت اور نفع حاصل کرنا ہے لیکن بعض ایسے بھی ہیں جن کا مقصود یہ نہیں، کیا راکفلر اور فورڈ کی زبردست تنظیمی اہلیت سے انکار کیا جاسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں، یہ ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ سوویٹ حکومت کے متعلق انگریزی بولنے والی قوموں کی رائے میں نہایت اہم تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ ہر چند اس کا بڑا سبب جاپان کی پوزیشن اور جرمنی کے حالات ہیں لیکن ان کے علاوہ کچھ اور اسباب بھی ہیں جو بین الاقوامی سیاست سے تعلق رکھتے ہیں اور انھیں میں سے ایک پرائیویٹ نفع اندوزی کے طریقہ کو برا سمجھنے کا رجحان بھی ہے۔ اس لئے ان حالات میں مناسب نہیں کہ آپ کی دنیا اور مغرب کی دنیا میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو، میں جانتا ہوں کہ پرانا طریق کار جلد ختم ہونے والا ہے لیکن شاید آپ ایسا نہیں سمجھتے"۔

اسٹالین :- "آپ نے جن سرمایہ داروں کی تنظیمی اہلیت کا ذکر کیا ہے، ان کی خدمات کا مجھے بھی اعتراف ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ بھی نفع اندوزی کا کسی نہ کسی صورت سے ساتھ دے رہے ہیں۔ آپ نے فورڈ کا ذکر کیا۔ یقیناً وہ بڑی زبردست تنظیمی اہلیت رکھتا ہے، لیکن عمال کے ساتھ جو اس کا طرز عمل ہے کیا آپ اس سے واقف نہیں، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ وہ جب چاہتا ہے کام کرنے والوں کو کارخانہ سے نکال کر باہر کر دیتا ہے۔ سرمایہ دار خواہ کسی قسم کا ہو نفع اندوزی کے خیال سے کبھی خالی نہیں ہوسکتا اور دنیا کی کوئی قوت اس کے اس رجحان کو بدل نہیں سکتی۔

باور کیجئے کہ سرمایہ داری کو نہ تنظیمی اہلیت رکھنے والے دور کر سکتے ہیں نہ صناعوں اور ماہرین فن کا طبقہ۔ یہ کام طبقۂ عمال ہی کر سکتا ہے، کیونکہ صناعوں اور ماہرین فن کی جماعت بھی آزاد نہیں ہے اور وہ اپنے سرمایہ دار مالکوں کی مرضی کے مطابق کام کرنے پر مجبور ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ٹکنکل ماہرین کی جماعت بعض حالات میں یقیناً بڑا کام کر سکتی ہے، لیکن اس سے نقصان بھی پہونچ سکتا ہے۔ اکتوبر کے انقلاب کے بعد ہمارے یہاں کی ٹکنکل جماعت نے نئی سوسائٹی کی تنظیم میں ہمارا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور ہم بڑی مشکل سے انھیں راہ راست پر لاسکے لیکن جب وہ ہمارے ساتھ ہوگئے تو اس میں شک نہیں کہ ان کی مدد سے ہم کو بہت فایدہ پہونچا۔ لیکن آپ کے یہاں اس جماعت کو دفعتاً سرمایہ داری کے چنگل سے آزاد کرانا آسان نہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انگلستان اور فرانس کے ماہرین فن اس پر راضی ہو جائیں گے کہ سرمایہ داروں کے مقابلہ میں طبقۂ عمال کا ساتھ دیں، وہ مشکل ہی سے سرمایہ داروں کا ساتھ چھوڑنے پر راضی ہوں گے کیونکہ وہ خود بھی ذاتی منفعت کے خیال سے متاثر ہیں۔

علاوہ اس کے دنیا کو بدلنے کے لئے سیاسی قوت بھی بڑی ضروری چیز ہے۔ مانا کہ وہاں ایک جماعت ماہرین کی ایسی بھی ہے جو سرمایہ داری کو پسند نہیں کرتی لیکن وہ کر بھی کیا سکتے ہیں ان کے پاس کوئی سیاسی قوت ایسی نہیں جو وہ اپنے اصول کو سب سے تسلیم کرا سکیں، اس لئے جب تک وہ کسی بڑی جماعت کا ساتھ نہ دیں از خود کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکتے اور یہ بڑی جماعت عمال ہی کی ہوسکتی ہے۔

دنیا میں ذہنی انقلاب پیدا کرنا آسان نہیں، بڑی دردسری کا کام ہے، اور اس کو ملک کی بڑی جماعت ہی انجام دے سکتی ہے۔ دور و دراز سفر کرنے کے لئے بڑے جہازوں ہی کی ضرورت ہوتی ہے"۔

ویلز :- "لیکن ایسے سفر کے لئے کپتان کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے"

اسٹالین :- "بیشک ہوتی ہے، لیکن پہلے بڑا جہاز تو فراہم ہو"۔

ویلز :- "یہ بڑا جہاز کوئی مخصوص جماعت نہیں بلکہ جماعت انسانی ہے"۔

اسٹالین :- "مسٹر ویلز، آپ کے دلایل کی بنیاد اس حسن ظن پر قایم ہے کہ تمام آدمی اچھے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ بُرے آدمی زیادہ ہیں اور بورژوا طبقہ میں کسی اچھائی کے پائے جانے کا میں قایل نہیں"۔

ویلز :- اس میں شک نہیں اب سے دس بیس سال قبل ٹکنکل قابلیت رکھنے والی صاحب رائے جماعت کم تھی اور اس کا رجحان بھی کسی انقلاب کی طرف نہ تھا، لیکن اب یہ جماعت بہت وسیع ہوگئی ہے اور ذہنی حیثیت سے بھی وہ بہت آگے ہے۔ ایک ماہر فن جو پہلے انقلاب کا لفظ بھی نہ سُن سکتا تھا اب وہ اس سے کافی دلچسپی لینے لگا ہے۔ حال ہی میں مجھے رایل سوسائٹی کے ایک جلسہ میں جو انگریزوں کی ایک بڑی سائنٹفک سوسائٹی ہے شرکت کا اتفاق ہوا۔ اس کے پریسیڈنٹ نے جو تقریر کی وہ زیادہ تر سوسائٹی کی جدید تنظیم سے تعلق رکھتی تھی، حالانکہ اب سے تیس سال قبل یہ بات ان کے ذہن میں بھی نہ آسکتی تھی"۔

اسٹالین :- "ہاں، میں اس سے واقف ہوں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہاں کی سرمایہ دار سوسائٹی اب ضغطہ میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ اس سے نکلنا چاہتی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی نفع اندوزی کو بھی ساتھ لیجانا چاہتی ہے۔ پھر یہ تو ہوسکتا ہے کہ وہ گھٹنوں کے بل سر جھکا کر خطرہ کے اس دروازہ سے باہر ہو جائیں لیکن سر اُٹھا کر وہ نہیں گزر سکتے"۔

ویلز :- آپ کو تو انقلاب کا عملی تجربہ حاصل ہے۔ اس لئے آپ کہہ سکتے ہیں کہ عوام خود کبھی نہیں اُبھرتے اور انقلاب ہمیشہ اقلیت والی جماعتوں ہی نے پیدا کیا ہے"۔

اسٹالین :- بےشک انقلاب لانے کے لئے انقلاب انگیز غیر مطمئن اقلیت ہی کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اقلیت خواہ کتنی ہی ذہین، پُرخلوص و باعمل ہو، وہ کچھ نہیں کرسکتی اگر عوام کی ہمدردی اسے حاصل نہ ہو"۔

ویلز :- "میں نے مغرب میں کمیونسٹ پروپاگنڈا کا مطالعہ کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں یہ پروپاگنڈا بڑی دقیانوسی چیز معلوم ہوتا ہے۔ کسی سوشل نظام کے خلاف انقلابی پروپاگنڈا اسی وقت مناسب ہے جب سوسائٹی کو حکمراں جماعت کی طرف سے جبر و زیادتی کی شکایت ہو۔ لیکن موجودہ حالات میں جبکہ پُرانا سوشلزم خود منہدم ہو رہا ہے، ضرورت اس امر کی ہو کہ کارکردگی کی مہارت و اہلیت پر زیادہ زور دیا جائے اور اسی لئے کمیونسٹ پروپاگنڈا تعمیری خیال رکھنے والوں کو پسند نہیں آتا"۔

اسٹالین :- "یہ صحیح ہے کہ مغرب میں پرانا نظام منہدم ہو رہا ہے لیکن اسی کے یہ بھی غلط نہیں کہ اس نظام کے باقی رکھنے کی بھی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اگر پُرانا نظام درہم برہم ہو رہا ہے تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ از خود طبعی طور پر ایسا ہو رہا ہے۔ کسی قدیم سوشل نظام کی جگہ جدید نظام کا قایم ہونا بڑا پیچیدہ معاملہ ہے اور اس کے لئے جماعتوں کا باہمی تصادم ضروری ہے۔

اگر سرمایہ داری ختم ہو رہی ہے تو یہ ختم ہونا اس طرح کا نہیں ہے جیسے کوئی درخت پُرانا اور کھوکھلا ہو کر از خود زمین پر آرہے، بلکہ اس کے لئے دو متصادم جماعتوں میں موت و حیات کی سی کشش پیدا ہونا ضروری ہے، جب کہیں جا کر نیا نظام قایم ہوگا اور اسکے بعد بھی اس نئے نظام کی حفاظت کے لئے بڑی جدوجہد کرنا پڑے گی۔ مثالاً فاسزم کو لیجئے کہ وہ اب بھی اپنی رجعت پسندانہ ذہنیت کو قایم رکھنا چاہتی ہے اور پُرانے نظام کو جبر و قوت کے ساتھ برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کسی فاسسٹ کو دلایل سے قایل کرسکتے ہیں اور وہ محض افہام و تفہیم سے اپنے مقصود کو ترک کردیگا؟

ہرگز نہیں۔ پھر آپ کیا کریں گے؟ لامحالہ سختی سے کام لینا پڑے گا۔

کمیونسٹ جماعت کبھی جارحانہ اقدام کو پسند نہیں کرتی، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ پُرانا نظام از خود ختم ہونے والا نہیں ہے اور اس کے حمایتی پوری قوت کے ساتھ اس کا ساتھ دے رہے ہیں، اس لئے کمیونزم بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں

بڑ سکتی اور وہ پرولتاری طبقہ کو ہدایت کرتی ہے کہ اپنے پاؤں میں بیڑیاں نہ پڑنے دے اور سختی کا جواب سختی سے دے"۔

ویلز :- "یہ صحیح ہے لیکن کیا کمیونسٹ جماعت کا جارحانہ اقدام بالکل اسی قسم کا رجعت پسندانہ اقدام نہیں ہے جس کا الزام آپ سرمایہ دار حکومتوں پر رکھتے ہیں"۔

شالین :- "کمیونسٹ جماعت کا اقدام ایک ٹھوس تاریخی بنیاد رکھتا ہے اور کمیونزم اچھی طرح واقف ہے کہ سرمایہ دار جماعت صرف اس لئے کہ وہ ختم ہورہی ہے یوں آسانی سے نئے نظام کے لئے جگہ نہیں چھوڑ سکتی۔ انگلستان کی سترھویں صدی کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے۔ اس وقت بھی سب یہی کہتے تھے کہ پرانا نظام فرسودہ ہے، لیکن جب تک کرامول نے اٹھ کر سختی سے اسے ختم نہیں کیا وہ چلتا ہی رہا"۔

ویلز :- "کرامول نے جو کچھ کیا کانسٹی ٹیوشن (دستور) کے تحت کیا اور دستور ہی کی طرف سے کیا"

شالین :- "(طنزیہ لہجہ میں) ہاں، پارلیمنٹ کو توڑنا، بادشاہ کو قتل کرنا، امراء کو گرفتار کرکے ہلاک کردینا، یہ سب دستور ہی کے تحت تھا!

خیر اس کو جانے دیجئے ہمارے ملک کو دیکھئے، کیا دُنیا کو معلوم نہ تھا کہ زار کی حکومت بالکل کھوکھلی ہے، لیکن اسی فرسودہ اور سڑی ہوئی حکومت کو ختم کرنے کے لئے کتنا خون بہانا پڑا۔

اکتوبر کے انقلاب کو دیکھئے۔ کیا دنیا اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ روس کا سرمایہ دارانہ نظام صد درجہ بوسیدہ ہوچکا ہے لیکن اسے دور کرنے کے لئے بالشویک جماعت کو اندرونی و بیرونی مزاحمتوں کا کتنا سخت مقابلہ کرنا پڑا اور کتنی خونریزی ہوئی۔

اخیر اٹھارویں صدی کے فرانس کو لیجئے۔ ۱۷۸۹ء سے بہت پہلے لوگوں کو معلوم ہوچکا تھا کہ وہاں کا جاگیر دارانہ اور شخصی حکومت کے نظام کی عمارت متزلزل ہوچکی ہے، لیکن عوام و امراء کی جماعتوں میں باہمی گر تصادم و خونریزی کے بغیر وہ نظام دور نہ ہوسکا۔

بات یہ ہے کہ پرانے نظام کے طرفدار یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی عمارت میں صرف چند شگاف پڑگئے ہیں جن کو بھرا جاسکتا ہے اور مرمت کے بعد اس تعمیر سے پھر کام لیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے اپنے وجود اور اپنے ذرایع عیش و مسرت کو بچانے کے لئے وہ جان کی بازی لگا دیتے ہیں، پھر جب تک ان کے مقابلہ میں دوسری جماعت بھی جانبازی سے کام نہ لے، کار برآری دشوار ہے"۔

ویلز :- "لیکن انقلاب فرانس کی سرکردگی تو وہاں کی حامی قانون جماعت نے کی تھی"۔

شالین :- "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انقلاب فرانس کی کامیابی میں عوام کا ہاتھ نہ تھا اور انقلاب کے بعد جو حکومت قایم ہوئی تھی وہ بغیر عوام کی مدد سے قایم رہ سکتی تھی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہاں کی حامی قانون جماعت نے جو کچھ کیا وہ قانون مروج الوقت کے مطابق کیا، کیا انھوں نے اس کی جگہ نیا قانون بناکر اس پر عمل نہیں کیا؟

تاریخ کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں پیش کرسکتی کہ کسی جماعت نے خوشی سے اپنا اقتدار دوسری جماعت کو سونپ دیا ہو اور اسی لئے کمیونسٹ جماعت کو ہر وقت ہر خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے طیار رہنا پڑتا ہے"۔

ویلز :- "میں تسلیم کرتا ہوں کہ قوت کا استعمال کبھی کبھی ضروری ہوجاتا ہے لیکن میری رائے میں قوت کا استعمال اسی حد تک ہونا چاہئے جس حد تک قانون اجازت دے۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قانون کا احترام ضروری ہے یعنی قانون کے حدود کے اندر رہتے ہوئے سب کچھ کرنا چاہئے اور جماعتی پروپاگنڈا میں صرف تعلیم یافتہ لوگوں حصہ لینا چاہئے۔ عوام کے ہاتھ میں دیکر اسے کھلونا نہ بنانا چاہئے"

شالین :- "کسی اہم مقصد کے حاصل کرنے کے لئے صرف مضبوط انقلاب پسند جماعت ہی کافی نہیں، بلکہ ایک امدادی قوت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور یہ قوت سپاہ پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ ملک کے صاحب رائے افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ رہا تعلیم یافتہ طبقہ جس کا

ذکر آپ نے کیا ہے، سو میں نہیں کہہ سکتا کہ تعلیم یافتہ طبقہ سے آپ کی کیا مراد ہے، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ یہ تعلیم یافتہ طبقہ ہی تھا جس نے سترھویں صدی میں انگلستان کے نظام کہنہ کا ساتھ دیا، اٹھارویں صدی میں امراء کی طرفداری کی اور انقلاب اکتوبر میں روس کی مستبعد جماعت کی اعانت کی۔

تعلیم صرف ایک ہتھیار ہے اور دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ اسے کون کس طرح استعمال کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پرولتاریت اور سوشلزم کو بھی نیا نظام استوار کرنے کے لئے تعلیم یافتہ طبقہ کی ضرورت ہے، لیکن اس تعلیم یافتہ طبقہ سے کیا مراد ہے اس کی تعیین آسان نہیں۔ ان تعلیم یافتہ لوگوں کی قسمیں بہت ہیں اور ہمیں صرف ایک ہی قسم سے کام لینا ہے۔

ویلز :۔ "دنیا میں کوئی انقلاب ممکن نہیں، جب تک پہلے نظام تعلیم میں انقلاب نہ پیدا کیا جائے۔ مثلاً جرمن ریپلک کو لیجئے کہ اسنے قدیم نظام تعلیم کو بدستور قایم رہنے دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ریپلک نہ بن سکی۔ دوسری مثال برطانیہ کی لیبر پارٹی کی ہے کہ اس نے بھی نظام تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور نتیجہ وہی ناکامی ہوا۔"

اسٹالین :۔ "آپ نے بالکل صحیح کہا۔ اب آپ اپنی تینوں باتوں کا جواب مختصراً سن لیجئے۔ اول یہ کہ انقلاب کے لئے ضروری و بنیادی چیز "طبقۂ عمال" کا وجود ہے، دوسرے یہ کہ انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے قوت کی بھی ضرورت ہے جسے کمیونسٹ اصطلاح میں پارٹی کہتے ہیں، یہ پارٹی مشتمل ہوتی ہے ذہین کام کرنے والوں اور اچھے ماہرین فن پر جو طبقۂ عمال سے قریب تر ہوتے ہیں، تیسرے یہ کہ انقلاب کے لئے سیاسی قوت بھی ضروری ہے تاکہ نئی حکومت، نئے قوانین نافذ کرسکے۔ نظام حکومت میں نئے پرانے کی تقسیم میں نہیں کرتا، میں تو صرف اس نظام کا قایل ہوں جو طبقۂ عمال کے مفاد کا محافظ ہو۔ اگر پرانے قانون میں کوئی بات ایسی ہے جس سے ہم مقصود حاصل کرسکتے ہیں تو اس کو قایم رہنا چاہئے۔

میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ نئے نظام کے قایم کرنے میں خواہ مخواہ بدامنی یا لڑائی جھگڑا پیدا کیا جائے اور میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات کوئی نہیں ہوسکتی اگر موجودہ حکمراں جماعتیں، طبقہ عمال کے مطالبات کو اصولاً تسلیم کرکے ان کو پورا کریں۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ایسا کبھی ہوا نہیں اور نہ آیندہ ہونا ہے۔

ویلز :۔ "مگر انگلستان کی تاریخ میں ہم کو ایسی ایک مثال ملتی ہے کہ ایک جماعت نے اپنا اقتدار خوشی سے دوسری جماعت کو سونپ دیا۔ ۱۶۸۸ء اور ۱۸۳۲ء کے درمیانی زمانہ میں وہاں کے طبقۂ امراء نے جن کا اثر اٹھارویں صدی میں بھی کافی پایا جاتا تھا، اپنا اقتدار خوشی سے بورژوا (اوسط) طبقہ کے سپرد کردیا۔"

اسٹالین :۔ "آپ انقلاب کے مسئلہ سے ہٹ کر اب اصلاح (ریفارم) کے مسئلہ پر آگئے اور یہ بالکل دوسری چیز ہے۔ تاہم میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا انگلستان کی چارٹسٹ[1] تحریک نے انگلستان کی اصلاح میں جو حصہ لیا وہ اہم نہ تھا؟

ویلز :۔ "چارٹسٹ جماعت نے کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا اور آخر میں وہ ختم بھی ہوگئی۔"

اسٹالین :۔ "میں اس مسئلہ میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔ ان کی اسٹرائک کی تحریک نے کافی کام کیا اور حکمراں جماعت انکی مجوزہ

---

[1] ۱۸۳۸ء میں مصلحین کی ایک جماعت لندن میں رونما ہوئی اور اس نے ایک چارٹر (منشور) کے ذریعہ سے چھ اصلاحات کا مطالبہ حکومت سے کیا۔ اس جماعت کو چارٹسٹ (منشوریئن) کہتے ہیں۔ ۱۸۳۹ء میں انھوں نے دس لاکھ آدمیوں سے دستخط کراکے ایک محضر دارالعوام میں پیش کیا۔ ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۲ء کے درمیان اس سلسلہ میں کچھ ہنگامے بھی ہوئے لیکن یہ تحریک بعد کو کچھ دب گئی۔ [illegible] چھ سال کے بعد ۱۸۴۸ء میں پھر اس میں دوبارہ زندگی پیدا ہوئی اور آخرکار ان کے چھ اصلاحی مطالبات میں سے چار تسلیم کئے گئے اور دو سال تک ان پر عمل بھی ہوتا رہا۔ (نیاز)

اصلاحات [illegible] کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ مغرب کی تمام حکمران جماعتوں میں انگلستان ہی ایک ایسی [illegible] ہے جو [illegible] مفاد کے مستقبل میں کافی لچک اپنے اندر رکھتی ہے۔ مثلاً ۱۹۲۶ء کے اسٹرائک کو لیجئے کہ اگر یہ اسٹرائک [illegible] کے ممبر گرفتار کر لئے جاتے، لیکن برطانیہ کے بورژوا طبقہ نے ایسا نہیں کیا بلکہ خود اپنے [illegible] اس خوف کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔ امریکہ، فرانس اور جرمنی میں اگر یہی صورت پیدا ہوتی تو [illegible] ہو جاتا۔ برطانیہ [illegible] اقتدار قایم رکھنے کے لئے چھوٹی چھوٹی اصلاحات کے نفاذ میں اکثر و بیشتر رواداری سے کام لیا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ [illegible] کرنا چاہئے کہ جو اصلاحات برطانیہ نے تسلیم کیں وہ ایسی انقلاب انگیز نہ تھیں کہ اس کی حکمران جماعت کو کوئی نقصان پہنچاتیں۔

ویلز :- "آپ نے میرے [illegible] کے متعلق جو رائے قایم کی ہے وہ میری رائے سے زیادہ بلند ہے۔ لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ایک [illegible] انقلاب اور بڑی اصلاح میں بہت بڑا فرق ہے ؟"

اسٹالین :- "عوام کے دباؤ سے کبھی کبھی بورژوا طبقہ ایسی اصلاحات تسلیم کر لیتا ہے جو اس کے اقتصادی و معاشرتی نظام کو صدمہ نہ پہونچائیں اور وہ صرف اس لئے کرتا ہے کہ اس کا جماعتی اقتدار باقی رہے اور یہ ہے ان اصلاحات کی روح جن کا ذکر آپ نے کیا۔ انقلاب نام ہے اس کا کہ حکومتی اقتدار ایک جماعت سے دوسری جماعت میں منتقل ہو جائے۔ اس لئے ہم کسی اصلاح یا ریفارم کو انقلابی نہیں کہہ سکتے۔"

ویلز :- "میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے سوشلزم کے اصول کی تشریح میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا اور مجھے ان کے سمجھنے کا موقع دیا۔ اس وقت روئے زمین پر صرف دو ہستیاں ہیں جن کے ایک ایک لفظ پر دنیا کے کان لگے ہوئے ہیں۔ آپ اور روزویلٹ۔ باقی اور لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ چنداں قابلِ لحاظ نہیں۔ میں یہاں کل ہی آیا ہوں لیکن انھیں چند گھنٹوں میں میں نے یہاں کے مردوں عورتوں کے بشاش چہرے اور صحیح و توانا جسم دیکھ کر اندازہ کر لیا ہے کہ یہاں بہت کچھ ہو رہا ہے اور ۱۹۲۰ء کے مقابلہ میں روس کی موجودہ حالت بدرجہا بہتر ہے۔"

اسٹالین :- "ہاں، اس سے بہت زیادہ کام ہو جاتا اگر ہم "بالشیوک" زیادہ ہوشیار ہوتے۔"

ویلز :- "ہم بالشیوک" نہیں بلکہ یوں کہئے کہ "اگر جماعتِ انسانی زیادہ ہوشیار ہوتی"۔ کیا اچھا ہوتا اگر آپ کوئی "پنج سالہ منصوبہ" انسان کی دماغی تربیت کے لئے بھی سوچ سکتے۔"

اسٹالین :- "کیا آپ "سوویٹ رائٹرس اسوسی ایشن" کی کانگرس میں شرکت کے لئے زیادہ نہ ٹھہر سکیں گے ؟"

ویلز :- "افسوس ہے کہ میں یہاں ایک ہفتہ سے زیادہ قیام نہیں کر سکتا۔ مجھے اور بہت سے کام ہیں، میں تو یہاں صرف آپ سے ملنے آیا تھا اور میں اس ملاقات کا بڑا اطمینان بخش اثر لیکر جا رہا ہوں۔"

ایک سچّا دوست

"آنسہ عایشہ" معاشیات کی ایم۔ اے ہیں، اور اس وقت تک اپنی چھوٹی سی عمر کا بڑا حصّہ انھوں نے کچھ ایسے ہی خشک مطالعہ میں صرف کیا ہے جو عورت کی توہین تو نہیں، لیکن شاید اس کے لئے چنداں قابل فخر بھی نہیں ہے!

ایک دن خلاف معمول میں نے ان کے ہاتھ میں آسکر وائلڈ کا مجموعۂ مضامین دیکھ کر حیرت سے انکی طرف دیکھا تو بولیں :- "نیاز صاحب، زندگی میں کبھی کبھی آسمان سے اُتر کر زمین پر بھی آنے کو بھی جی چاہتا ہے، آخر کوئی کب تک عقل و ہوش کی باتیں کرے"

مجھے ان کا یہ جواب سنکر ایک لطیفہ یاد آگیا :-

"دو بے تکلف دوست بیٹھے ہوئے آپس میں نہایت بے معنی لیکن حد درجہ دلچسپ گفتگو میں مصروف تھے کہ انھیں ایک اور تیسرے دوست سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے۔ یہ نہایت خشک قسم کے فلسفی تھے (ہوسکتا ہے کہ معاشیات ہی کے ماہر ہوں)۔ بہرحال یہ دونوں ان کو دیکھ کر بہت جزبز ہوئے اور آخرکار ان میں سے ایک نے دوسرے سے گھبرا کر کہا کہ Let us talk sense, There comes a fool (وہ دیکھو ایک بیوقوف آرہا ہے، آؤ اب کچھ سمجھ کی باتیں کریں)

میں نے "عایشہ" کا فقرہ سنکر کہا کہ "آپ یہ کتاب صرف اس شرط سے دیکھ سکتی ہیں کہ اسکی کوئی کہانی جو آپ کو پسند آئے اس کا ترجمہ کرکے مجھے دیجئے۔ چنانچہ انھوں نے "The Devoted friend" کا ترجمہ کرکے میرے پاس بھیجدیا۔

میں نے اس کو دیکھا تو دل ہی دل میں بہت ہنسا کیونکہ "عقل و ہوش" کی دنیا سے بیزار ہوجانے کے باوجود انھوں نے ترجمہ کے لئے جو کہانی پسند کی وہ بھی "آٹے دال" کی ذکر سے خالی نہ تھی۔ آخر معاشیات کی ماہر ٹھہریں نا!—

میں نے ان سے کہا کہ "یہ کہانی تو خیر میں شایع کئے دیتا ہوں، لیکن اب اس قسم کی باتیں آپ سے سننا مجھے منظور نہیں" چنانچہ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ دوسرے مضمون میں وہ "ڈاکٹر و اسٹرلنگ" کے باہمی تعلق پر اقتصادی و معاشی حیثیت سے بحث کریں گی۔ ہمیں امید ہے کہ ان کا یہ موعودہ قیمتی مقالہ آیندہ اشاعت میں قارئین نگار کی نگاہ سے گزرے گا۔ (نیاز)

صبح خوشگوار تھی، بڈھے چوہے نے جھانکنے کے انداز میں بل سے سر نکالا۔ شیشے کی طرح چمکدار آنکھیں، شیر کی سی مونچھیں اور ربڑ کی سی دُم — تالاب میں بطوں کے بچے چھپ چھپ کر رہے تھے، جن کو ان کی ماں تیرنے کے طریقے سکھا رہی تھی۔ ان کے ننھے جسم ماں کی طرح سفید نہ تھے، پیلاپن لئے ہوئے تھے۔

خفا ہونے کے انداز میں بطخ بولی - "تم کسی اچھی محفل میں نہیں جا سکتے، جب تک سر کے بل کھڑا ہونا نہ سیکھ لو" ساتھ ہی ماں نے سر کے بل کھڑے ہونا ان کو دکھایا، مگر بچوں پر کیا اثر؟ معصوم ہی ٹھہرے نا! انھیں محفلوں سے کیا واسطہ! یہ دیکھ کر بڈھا چوہا چیخا "توبہ، کیسے نالائق بچے ہیں ان کو تو ڈبو دینا چاہیئے"

"خدا نہ کرے" بطخ بول اٹھی - "یہ تو کوئی نئی بات نہیں، ہر کام کے سیکھنے میں پہلے پہل دقت ہوتی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ ماں باپ کب تک صبر کریں"

چوہا بولا :- "اونھ، مجھے ماں باپ سے کیا سروکار - کوئی گھربار والا تو ہوں نہیں - میری تو شادی بھی نہیں ہوئی اور نہ اب اس کی ضرورت ہے کہیں محبت و حبت ہو جائے تو یہ الگ بات ہے — اصل چیز تو دوستی ہے، وہ دوستی جس کے بغیر دنیا بیکار ہے - سچی دوستی اور ایک سچا دوست"۔

— "یہ تو بتایئے آپ کا مطلب کیا ہے اور ایسے دوست کو کرنا کیا چاہیئے" پاس ہی جھاڑی پر بیٹھی ہوئی چڑیا نے جو ساری باتیں سن رہی تھی پوچھا -

— "ہاں، ہاں یہی تو میں بھی جاننا چاہتی" اور یہ کہکر بطخ دوسرے کنارے تیر گئی اور سر کے بل غوطہ لگاتے ہوئے بچوں کو نصیحت آمیز انداز میں دیکھا -

— "کس قدر مہمل سوال ہے" چوہا زور سے چیخا "دوست سے وفاداری کے سوا اور کیا امید ہو سکتی ہے، ہونھ!"

چھوٹی چڑیا نے پھولوں سے لدی ہوئی دوسری ڈالی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا :- "اس کے بعد ہم کو کیا کرنا چاہیئے"

چوہا :- "چل تیری بات میری سمجھ میں نہیں آتی"

چڑیا :- "اچھا، تم کو ایک کہانی سناتی ہوں"

چوہا :- "ہاں، ہاں ضرور سناؤ، مجھے قصے کہانیوں میں بڑا مزا آتا ہے، مگر یہ میرے متعلق تو نہیں ہے؟"

چڑیا :- "ہاں یہ تم پر بھی چپک سکتی ہے" اور یہ کہکر اپنی کہانی شروع کرنے قریب آ بیٹھی -

چڑیا :- "بہت دن ہوئے ایک بڑا نیک آدمی رہا کرتا تھا، اس کا نام ہنیس تھا -

چوہا :- "کیا وہ بہت مشہور آدمی تھا؟"

چڑیا :- "مشہور تو نہ تھا، مگر تھا بہت نیک — وہ اپنی چھوٹی کٹیا میں اکیلا رہتا اور دن بھر باغ میں کام کیا کرتا - اسکی کٹیا اپنے خوبصورت پھولوں کی وجہ سے بہت مشہور تھی رنگ برنگ کے خوشنما پھولوں کی مہک ہر طرف پھیلی رہتی تھی - ہنیس کے دوست بہت تھے - مگر سب سے زیادہ عزیز دوست میلر تھا - جو کبھی کٹیا کے پاس سے بغیر پھول توڑے نہ گزرتا اور پھلوں کے زمانہ میں ان سے اپنی جیبیں بھر لیتا -

میلر کہا کرتا کہ دوستوں کی ہر چیز ایک دوسرے کے لئے ہوا چاہیئے، ہنیس یہ سن کر مسکراتے ہوئے سر ہلا دیتا - ہنیس کو اپنے دوست کے خیالات پر بڑا فخر تھا - اکثر پڑوسیوں کو اس پر بہت تعجب ہوتا کہ میلر کبھی کوئی چیز ہنیس کو نہیں دیتا تھا - حالانکہ اس کی چکی پر خدا جانے کتنے بورے آٹے کے پڑے رہتے تھے - دودھ دیتی ہوئی کئی گائیں بھی اسکے پاس تھیں اور بھیڑوں کے کئی ریوڑ -

ہنیس غریب کبھی ان باتوں پر غور نہ کرتا، وہ تو ہر وقت بے غرض دوستی کی باتیں کیا کرتا اور انھیں میں مست رہتا -

— ہاں تو ہنیس سال بھر بعد اپنے باغ میں سوت کاتا کرتا، اور خوش رہتا - مگر جاڑا شروع ہوتے ہی اس کے پھل پھول ختم ہو جاتے تو اس کے کھانے کا سہارا بھی ختم ہو جاتا اور جاڑے کی تکلیف بھی برداشت کرنا پڑتی -

اکثر وہ بغیر کھائے پئے سو جاتا۔ کبھی کبھی سوکھے ہوئے پھلوں پر بسر کرتا۔
مگر خاص تکلیف جو اس کو بہت ستاتی یہ تھی کہ اس زمانہ میں میلر اس کو دیکھنے کبھی نہ آتا۔

— "آج کل ہنیس کے پاس جانے سے کیا فایدہ' ہر طرف برف ہی برف ہے۔ اور یوں بھی پریشانی میں لوگوں سے ملنے جلنے میں کیا لطف آسکتا ہے"۔ میلر اپنی بیوی سے کہتا۔ "میرا تو خیال دوستی کے بارے میں یہ ہے اور ٹھیک بھی ہے۔ مگر بہار شروع ہوتے ہی میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا۔ اور اپنی ڈلیا بھر کر پھول بھی لاؤں گا، میں جانتا ہوں ہنیس کو اس سے بڑی خوشی ہوتی ہے"۔

دہکتی ہوئی آگ کے نزدیک بیٹھی ہوئی بیوی بولی۔ "کس قدر خیال کرتے ہو تم دوسروں کا۔ دوستی کے بارے میں تمھاری باتیں مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں، میں تو کہتی ہوں بڑے آدمی بھی جو اونچے اونچے مکانوں میں رہتے ہیں اور سونے کی انگوٹھیاں پہنتے ہیں، ایسی باتیں نہیں کرسکتے'

— مگر ہم ہنیس کو یہاں کیوں نہ بلالیں؟' میلر کے چھوٹے بچّے نے کہا "ہنیس اگر پریشان ہے تو میں اس کو اپنی آدھی کھیر کھلاؤں گا اور خرگوش بھی دکھاؤں گا"۔

میلر چلایا "کس قدر بیوقوف لڑکا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھارے اسکول بھیجنے سے کیا فایدہ۔ ابھی تک تو کچھ نہیں سیکھا۔ اگر ہنیس یہاں آگیا تو وہ ہماری دہکتی ہوئی آگ، اچھے کھانے اور عمدہ شراب دیکھ کر یقیناً ہم سے جلنے لگے گا اور اچھی طبیعت والوں کے لئے یہ بات بہت بُری ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ میرا سب سے اچھا دوست ایسا کرے۔ میں اس کو ہمیشہ اسی طرح کی برائیوں سے بچاؤں گا اور مان لو وہ یہاں آیا تو ضرور کچھ آٹا قرض مانگے گا جو میں نہیں دینا چاہتا۔ آٹا اور چیز ہے، دوستی اور شے۔ ان دونوں کو ملانے سے فایدہ؟ غور تو کرو کس قدر فرق ہے دونوں میں"۔

بیوی:- "تم کیسی اچھی باتیں کرتے ہو۔ مجھے تو نیند آنے لگتی ہے"۔

میلر:- "اچھے کام تو بہت لوگ کرتے ہیں مگر اچھی باتیں کرنا کم لوگ جانتے ہیں —— باتیں کرنا کام کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے"۔ ساتھ ہی اس نے چھوٹے لڑکے کی طرف دیکھا جو شرم سے سر جھکائے رو رہا تھا اور جس کے موٹے موٹے آنسو چائے کی پیالی میں گر رہے تھے۔ 'کیا کہانی ختم ہوگئی'، چوہے نے پوچھا)۔

چڑیا:- "نہیں ابھی تو شروع ہوئی ہے"

چوہا:- "تب تو تم نے اپنی کہانی بڑے پُرانے ڈھنگ سے شروع کی، آج کل تو لوگ کہانی اخیر سے شروع کرتے ہیں پھر ابتدا کی بات بتاکر بیچ میں ختم کردیتے ہیں۔ یہ ہے نیا طریقہ کہانی سنانے کا۔ ایک دن میں نے ایک تنقید نگار کو ایک نوجوان سے یہی کہتے سنا تھا۔ تنقید نگار جس کا چشمہ ہمیشہ ناک پر رہتا اور سر گنجا تھا، نوجوان کی ہر بات کو ہنسی میں اُڑا دیتا اور ہشت کہکر ٹال دیتا۔ خیر تم اپنی کہانی کہو مجھے میلر بہت پسند آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے اس کے درمیان بڑی پُرانی دوستی ہے"۔

چڑیا بولی:- "جیسے ہی سردی کا موسم ختم ہوا اور پھول کھلنے لگے، میلر نے اپنی بیوی سے کہا اب میں ہنیس سے ملنے ضرور جاؤں گا"

بیوی:- "تم کتنے نیک دل ہو، اور کتنا خیال دوسروں کا کرتے ہو' لیکن دیکھو پھولوں کے لئے بڑی ڈلیا لیجانا"

میلر، ہنیس سے ملنے کے لئے چل پڑا۔

ہنیس، اپنا کھرپا لئے باغ میں کام کر رہا تھا۔ میلر کو دیکھتے ہی خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔

میلر: "کہو، سردیاں کیسی کٹیں"۔

ہنیس خوش ہو کر بولا "تم کتنے اچھے آدمی ہو - میرا کس قدر خیال رکھتے ہو - ہاں مجھے سردیوں میں بڑا برا وقت دیکھنا پڑا، لیکن اب بہار کا موسم آگیا ہے، میں بہت خوش ہوں - میرے خوبصورت پھول کھل رہے ہیں"

میلر: "ہم اکثر تمھاری باتیں کیا کرتے تھے"

ہنیس: "تم کس قدر مہربان ہو، میں ڈرتا تھا کہیں تم بھول نہ گئے ہو"

میلر: "ہنیس تم کیسی باتیں کرتے ہو، دوست بھی کبھی بھلائے جاتے ہیں، دوستی ہی تو اصل چیز ہے - معلوم ہوتا ہے تم نے آج تک زندگی کو سمجھا ہی نہیں، ارے، تمھارے پھول کس قدر خوبصورت ہیں"

ہنیس: "پھول تو میری خوش قسمتی ہیں - آج میں ان کو بازار لیجا کر بیچوں گا اور اپنا ٹھیلہ واپس لے آؤں گا"

میلر: "کیا تم نے وہ بیچ دیا تھا - بڑی بیوقوفی کی"

ہنیس: "ہاں مجھے ایسا کرنا پڑا - جاڑے میں جب میرے پاس کچھ کھانے کو نہ رہ گیا تو مجھے چاندی کی زنجیر، بٹن اور اپنا ٹھیلہ بیچنا پڑا - اب میں ان چیزوں کو واپس لے آؤں گا"

میلر: "ہنیس میں تم کو اپنا ٹھیلہ دیدوں گا، حالانکہ وہ بہت اچھی حالت میں نہیں ہے، اس کا ایک پہیہ اور ایک طرف کا حصہ ٹوٹا ہوا ہے - گو ایسا کرنے پر لوگ مجھ کو بیوقوف بنائیں گے - مگر مجھے پروا نہیں، میں خود بھی ایک نیا ٹھیلہ خریدنے والا ہوں، اس لئے تم کو پریشان نہ ہونا چاہئے، میں اپنا ٹھیلہ تم کو دیدوں گا"

ہنیس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا "میلر تم مجھ پر بہت مہربان ہو، میں ٹھیلے کو بہت آسانی سے ٹھیک کرلوں گا - ایک لکڑی کا بڑا تختہ میرے پاس موجود ہے"

میلر: "ارے وہ تختہ تو مجھے چاہئے - میری کھتوں کی چھت میں ایک بڑا سوراخ ہوگیا ہے اور اگر یہ ٹھیک نہ کیا گیا تو سارا غلہ سیل جائے گا - اچھا ہوا کہ تم نے اس کا ذکر کردیا دیکھو تو سہی کس طرح ایک نیکی سے دوسری نیکی پیدا ہوتی ہے - میں تم کو اپنا ٹھیلا دوں گا اور تم مجھے اپنا تختہ دو گے - حالانکہ وہ ٹھیلہ سے زیادہ قیمتی ہے - مگر غیر دوستی میں اس کا خیال"!

ہنیس "یقیناً یقیناً" کہتا ہوا گھر کی طرف دوڑا - اور ایک تختہ گھسیٹتا ہوا لے آیا -

میلر: "یہ تختہ زیادہ بڑا تو نہیں - شاید ہی اس میں کچھ بچ سکے جس سے تم ٹھیلہ ٹھیک کرسکو، مگر اس میں میرا کیا قصور، ٹھیلہ میں نے تم کو دیدیا ہے اور مجھے امید ہے اس کے بدلہ میں آج تم مجھے کچھ پھول بھی ضرور دو گے - لو یہ رہی ڈلیا، ذرا خیال رکھنا پوری بھر جائے"

"ہاں ہاں پوری" ہنیس نے کہا - لیکن وہ اپنے رنج کو نہ چھپا سکا کیونکہ ڈلیا بہت بڑی تھی، جس کو بھر دینے کے بعد اس کے پاس بیچنے کے لئے پھول نہ رہ جاتے اور وہ پھول ہی بیچ کر ضرورت کی چیزیں لانے کے لئے بیچین تھا -

"دیکھو میں تم کو اپنا ٹھیلہ دے چکا ہوں، اب کچھ پھول لے لینے پر تمھیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے - سچی دوستی بے غرض ہوتی ہے، اچھا خدا حافظ" میلر نے ڈلیا اٹھاتے ہوئے کہا -

"خدا حافظ" اور پھر وہ خوش خوش زمین کھودنے میں لگ گیا، کیونکہ اس کو ٹھیلہ ملنے والا تھا -

ایک دن وہ دیوار پر بیلیں چڑھانے کے لئے کیلیں گاڑ رہا تھا کہ میلر کی آواز آئی - ہنیس جلدی سے سیڑھی پر سے کود کر باغ میں آگیا، میلر سڑک کے کنارے آٹے کا ایک بڑا تھیلہ سر پہ رکھے کھڑا تھا -

میلر :- "میرے اچھے ہنیس کیا یہ آٹا تم بازار بیچ آؤ گے"۔

ہنیس :- "مجھے افسوس ہے، آج میں بہت مصروف ہوں، بیلیں دیوار پر چڑھانا ہیں۔ پھولوں میں پانی دینا ہے"۔

میلر :- "دیکھو میں تم کو اپنا تھیلہ دے رہا ہوں، میری بات نہ ٹالنا، ورنہ سچی دوستی پر الزام آجائے گا"

ہنیس :- "یہ نہ کہو میلر میں یہ نہیں سن سکتا، اور اپنی ٹوپی اوڑھتا باہر آگیا۔ تھیلہ لیکر بازار کی طرف چل پڑا۔ گرمی سخت تھی اور سڑک پر بہت خاک اُڑ رہی تھی۔ چھ میل چلنے کے بعد وہ بہت تھک گیا تھا، مگر پھر بھی ہنیس چلتا رہا اور بازار پہونچکر آٹا اچھی قیمت پر بیچنے کے بعد گھر آگیا۔ پلنگ پر لیٹ کر اسے خیال آیا، کتنا سخت دن گزرا۔ مگر ساتھ ہی ! خوشی بھی تھی کہ اس نے اپنے دوست کی بات کو نہ ٹالا۔ دوسری صبح میلر، ہنیس کے اُٹھنے سے پہلے آ پہونچا۔

میلر :- "تم کس قدر سست آدمی ہو، میں تم کو اپنا تھیلہ دے رہا ہوں۔ تم کو اب زیادہ کام کرنا چاہئے۔ بیکاری بڑا گناہ ہے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ میرا دوست اس گناہ میں مبتلا ہو۔ تم میری صاف گوئی کا بُرا نہ ماننا، خوشامد تو سب کرتے ہیں مگر سچی دوستی میں صاف گوئی نہ چھوڑنا چاہئے، چاہے اس میں کتنی ہی تکلیف ہو"۔

ہینس آنکھیں ملتے ہوئے بولا "میں شرمندہ ہوں مگر تھک جانے کی وجہ سے میں نے سوچا کہ کام شروع کرنے سے پہلے ذرا چڑیوں کا چہچہانا سن لوں، اس طرح میں کام زیادہ کرسکوں گا"

میلر :- "خیر ٹھیک ہے، مگر آج آکر ذرا میری چھت شروع کردو"

غریب ہنیس اپنے باغ میں کام کرنے کے لئے بیچین تھا۔ اس کے پودوں میں پانی نہیں پہونچا تھا۔ لیکن وہ اپنے دوست سے کیا انکار کرتا۔ پھر بھی اس نے آہستہ سے کہا کہ مجھے تو آج باغ میں بہت کام کرنا ہے۔

میلر :- "دیکھو میں اپنا تھیلہ تم کو دے رہا ہوں، اس لئے یہ امید کرتا ہوں کہ تم میرا کام کردو گے، لیکن خیر اگر تم انکار کرتے ہو تو میں خود ٹھیک کرلوں گا"

ہنیس "نہیں نہیں" کہتا ہوا بستر سے اُٹھا اور کھلیان کی طرف چلدیا وہ دن بھر کام کرتا رہا۔ شام کے وقت میلر اس کو دیکھنے آیا اور خوش ہوکر بولا "کیا تم نے چھت ٹھیک کردی"

"ہاں قریب قریب" ہنیس سیڑھی سے نیچے اُتر آیا۔

میلر :- "کس قدر خوشی ہوتی ہے دوسرے کا کام کرکے"

ہنیس نے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "میلر تم کتنی اچھی باتیں کرتے ہو"۔

میلر :- "تم کو بھی ایک دن یہ باتیں آجائیں گی، مگر تم کو اس سے زیادہ تکلیفیں اُٹھانے کی عادت ڈالنا چاہئے۔ ابھی تو صرف دوستی کی ابتداء ہے ایک دن تم کو اس کے اصول بھی معلوم ہوجائیں گے" !

ہنیس :- "کیا یہ ممکن ہے" ؟

میلر :- "اچھا اب تم جاؤ میری چھت کافی ٹھیک ہوگئی ہے، اب گھر جاکر آرام کرو، میں چاہتا ہوں کل تم میری بھیڑیں چرانے انھیں پہاڑ پر لے جاؤ"

ہنیس کچھ نہ کہہ سکا۔ دوسری صبح میلر اپنی بھیڑوں کو لیکر پہونچ گیا اور ہنیس کو پہاڑ کی طرف جانا پڑا، شام کو جب وہ گھر لوٹا تو اس قدر تھکا ہوا تھا کہ کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے سو گیا۔ کافی دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے سوچا کہ آج میں ضرور اپنے باغ میں کام کروں گا، لیکن جب وہ ارادہ کرتا تو کچھ ایسا ہوتا کہ اپنے پھولوں پر توجہ دینے کے بجائے اپنے دوست کے کسی نہ کسی کام کے لئے اسے جانا پڑ جاتا۔ ہنیس کو یہ سوچ کر پریشانی ہوتی۔ مگر اس کی تسکین اس

خیال سے ہو جاتی کہ یہ سب کچھ اپنے دوست کے لئے کرتا ہے اور وہ اسے اپنا ٹھیلہ دینے والا ہے، الغرض ہنیس اسی طرح میلر کے کام کرتا اور میلر اس کو دوستی کے متعلق اپنے خیالات بتاتا رہتا۔ جن کو ہنیس بھی اپنی نوٹ بک میں لکھتا جاتا اور ہر رات سونے سے پہلے پڑھ لیتا۔

ایک شام جب ہنیس آگ کے قریب بیٹھا پڑھ رہا تھا، دروازہ پر کسی نے دستک دی، ہوا بہت تیز چل رہی تھی، ہنیس نے سوچا کہ شاید طوفان کی وجہ سے دروازہ ہلا ہوگا مگر دوسری اور تیسری دستک زیادہ تیز تھی۔ ہنیس یہ سوچتے ہوئے اٹھا کہ شاید کوئی مسافر راستہ بھول کر ادھر آگیا ہے۔ مگر دروازہ کھولنے پر اس نے میلر کو کھڑا پایا جس کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں لکڑی تھی۔ میلر بولا "میں بہت پریشان ہوں میرا لڑکا زینہ سے گر گیا ہے۔ ڈاکٹر بہت دور رہتا ہے۔ میں نے سوچا کہ زیادہ اچھا ہو اگر تم چلے جاؤ۔ اور دیکھو میں تم کو اپنا ٹھیلہ دینے جا رہا ہوں اس میں کچھ ہرج نہیں اگر تم میرا کچھ کام کردو۔

"ضرور، ضرور" ہنیس بولا "میں فوراً جاتا ہوں، تم مجھے اپنی لالٹین دیدو۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کسی گڑھے میں نہ گر جاؤں۔"

میلر :۔ "میری لالٹین بالکل نئی ہے اور میں یہ نہ دوں گا۔"
ہنیس :۔ "خیر میں یونہی چلا جاؤں گا"

باہر طوفان بہت تیز تھا۔ اندھیری رات میں ہنیس کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہوا بہت تیزی سے چل رہی تھی مگر پھر بھی ہنیس چلتا رہا اور تین گھنٹے کے بعد ڈاکٹر کے یہاں پہونچ گیا۔ آواز دینے پر ڈاکٹر نے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا "کون ہے"

— "میں ہوں ہنیس"
— "کیا کام ہے، بولو"
— "میلر کا لڑکا زینہ پر سے گر گیا ہے۔ چوٹ آگئی ہے اور میلر نے تم کو بلایا ہے"
— "اچھا"

ڈاکٹر تیار ہوکر نیچے آیا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلدیا۔ ہنیس پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ طوفان تیز ہوتا جا رہا تھا اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ گھوڑے کا ساتھ نہ دے سکا اور راستہ بھول کر دلدل میں پھنس گیا۔ جہاں سے وہ نکل نہ سکا۔ دوسری صبح ایک گڑھے میں اس کی لاش تیرتی ہوئی پائی گئی۔ لوگ اس کو اس کی کٹیا میں لے آئے۔ سب لوگ اس کے جنازے میں شامل تھے۔ مگر میلر خاص رنج کرنے والوں میں سے تھا۔

میلر بولا :۔ "میں اس کا سب سے اچھا دوست تھا۔ مناسب یہ ہے کہ میں جنازے کے آگے آگے چلوں" — جو اکثر اپنی آنکھیں پوچھتا چل رہا تھا۔

لوہار بولا :۔ "غریب ہنیس کی موت سے سب کو بہت رنج ہے"۔ (جبکہ وہ لوگ دفن کرنے کے بعد ایک جگہ بیٹھ کر شراب پی رہے تھے)

ر ا:۔ "میں نے اس کو اپنا ٹھیلہ قریب قریب دے ہی دیا تھا۔ مگر اب میں کیا کروں، نہ اس کی مرمت ہو سکتی ہے نہ بیچا جا سکتا ہے۔ ہاں آیندہ خیال رکھوں گا کہ کبھی کسی کو کوئی چیز نہ دوں، اس میں نقصان ہوتا ہے۔"

چوہا :- "کیا یہ کہانی کا انجام ہے، مگر میکلر کا کیا ہوا"

چڑیا :- "مجھ کو معلوم نہیں - نہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے"

چوہا :- "اس سے ظاہر ہوتا ہے تمھارے دل میں انسانیت نہیں"۔

مگر چڑیا بولی :- "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے تمھاری سمجھ میں کہانی نہیں آئی"

چوہا :- "کیا ؟' تمھارے کہنے کا مطلب ہے کہ یہ کوئی بڑی نصیحت آموز کہانی تھی ؟"

چڑیا :- "یقیناً"

چوہا غصہ ہوکر بولا :- "تب تو یہ تم کو پہلے بتا دینا چاہئے تھا - کیونکہ میں بھی تنقید نگار کی طرح "ہشت" کر دیتا اور یہ تو میں اب بھی کر سکتا ہوں' اور "ہشت" کہکر وہ اپنے بل میں بھاگ گیا -

—— "ہاں، چوہے کی بابت تمھارا کیا خیال ہے"۔ بطخ نے پوچھا (جو اب تیر کر قریب آگئی تھی)

چڑیا بولی :- "اس میں اچھائیاں بھی ہوں گی مگر مجھے تو اس کی محبت سے مطلب ہے اور مجھے رنج ہے کہ میں نے اسے خواہ مخواہ نصیحت آمیز کہانی سنا کر خفا کر دیا -

بطخ بولی :- "ہاں' یہ بات تو ہمیشہ ہی خطرناک ہوتی ہے"

عائشہ (ام - اے)

ایک ہزار پونڈ فی منٹ

کیا آپ کوئی ایسی نوکری قبول کرلیں گے (خواہ کتنی ہی بڑی تنخواہ کیوں نہ ملے) اگر آپ کو یہ معلوم ہو کہ اس نوکری کو قبول کرنے والے کو آج تک اپنے گھر کے بستر پر مرنا نصیب نہیں ہوا - اگر آپ اس کے لئے طیار ہیں تو ٹکساس کی آیل کمپنی کے پاس چلے جایئے -

ٹکساس میں پیٹرول کے چشمے بکثرت پائے جاتے ہیں اور اکثر مشتعل ہو جاتے ہیں جس سے لاکھوں ڈالر کا نقصان کمپنی کو پہونچ جاتا ہے اور انھیں مشتعل چشموں کی آگ فرو کرنے کے لئے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے -

یہ آگ صرف نائٹرو گلیسرین کے بموں سے بجھ سکتی ہے اور یہ بم مشتعل چشموں کے بہت قریب پہونچکر پھینکے جاتے ہیں لیکن یہ بم خود بڑی خطرناک چیز ہیں —— اور ضرورت سے زیادہ گرمی یا ذرا سا جھٹکا پہونچنے پر از خود پھٹ جاتے ہیں - اس لئے ان بموں کا مشتعل چشموں تک لے جانا بھی حد درجہ خطرہ کی بات ہے - ہر چند یہ بم خاص قسم کے ٹرک میں نہایت احتیاط سے لے جائے جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود تجربہ بتاتا ہے کہ آج تک اس ٹرک کا کوئی ڈرائیور اپنی طبعی موت سے نہیں مرا کیونکہ جو آدمی ٹرک چلاتا ہے وہی بم بھی پھینکتا ہے -

جس وقت چشموں میں آگ لگنے کی اطلاع آتی ہے تو ڈرائیور ان بموں کو لیکر جو ربڑ کے گدوں میں لپٹے ہوتے ہیں، موقع پر روانہ ہوتا ہے اور ایسے راستہ سے گزرتا ہے جہاں کوئی قصبہ دس ہزار یا اس سے زیادہ آبادی کا اسے نہ ملے - پولیس کو پہلے سے اس کی روانگی کی اطلاع دیدی جاتی ہے اور اس کے لئے راستہ صاف کر دیا جاتا ہے -

جب وہ آگ کے قریب پہونچتا ہے تو ابرک کا لباس پہن لیتا ہے اور ایک خاص قسم کی ٹوپی جس میں صرف آنکھوں کے لئے دو سوراخ ہوتے ہیں اوڑھ لیتا ہے اسی کے ساتھ اور ایک زنجیر اپنی کمر میں باندھ لیتا ہے تاکہ اگر گرمی کی شدت اسے بیہوش کر دے تو لوگ زنجیر کھینچ کر اسے گھسیٹ لائیں - اسکے بعد وہ آگ کے قریب پہونچکر بم پھینکتا - لیکن بسا اوقات یہی ہوتا ہے کہ بم پھینکنے سے پہلے ہی گرمی کی شدت کے پیش نظر لوگ زنجیر کھینچکر اسے واپس لانا چاہتے ہیں، لیکن خالی زنجیر ہی واپس آتی ہے اور بم پھینکنے والے کا کہیں پتہ نہیں ہوتا -

زندگی کی ابتداء اور اس کا عروج

سمندر زندگی سے معمور ہے، خشکی میں ہر طرف زندگی نظر آتی ہے، ہوا زندگی سے بھری ہوئی ہے، جدھر دیکھو زندگی ہے اور حرکت پیدائش ہے، اور موت — حیات کا یہ عجیب سلسلہ جو ہماری زمین پر قایم ہے اس کو دیکھ کر ہمارے دل میں مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں، زندگی کیا ہے؟ اور موت سے کیا مطلب ہے؟ ایک زندہ ہستی (مثلاً انسان، جانور، یا پھول) میں اور ایک مردہ چیز (جیسے لکڑی، پتھر یا مٹی) میں کیا فرق ہے؟ زندہ چیزوں کی کتنی قسمیں ہیں اور اُن میں اس قدر اختلاف کیوں ہے؟ وغیرہ بہت سے ایسے سوالات ہیں جو ہمارے سامنے آتے ہیں اور علم الحیات کا موضوع انھیں سوالات کا جواب دینا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہر زندہ چیز ایک روز فنا ہو جاتی ہے، لیکن زندگی کو موت نہیں، اس وقت زمین پر کوئی ایسی چیز موجود نہیں جواب سے دو ہزار سال پہلے سے زندہ چلی آرہی ہو (بجز دیودار کے درختوں کے جو لبنان کے پہاڑوں پر موجود ہیں) اس دو ہزار سال کی مدت میں نہ کوئی درخت باقی رہا، نہ کوئی جانور، لیکن پھر بھی زمین پر زندگی ہی زندگی ہے، بلکہ دو ہزار سال پہلے کی دنیا سے اب وہ زندگی سے زیادہ معمور ہے، یہ کیوں! اس لئے کہ والدین زندگی کی امانت اپنی اولاد کے سپرد کر کے رخصت ہو جاتے ہیں اور اس طرح اُن کی اولاد یہ امانت آیندہ نسل کو سپرد کر دیتی ہے، اور یہ سلسلہ حیوانات و نباتات میں برابر قایم ہے۔

یہ تمام زندہ چیزیں کہاں سے آئیں؟ ان کی ابتدا کس طرح ہوئی اس کے جواب میں عوام کے لئے تو یہ کہدینا کافی ہے کہ سب کو خدا نے پیدا کیا، لیکن حقایق تلاش کرنے والے کے لئے یہ جواب کافی نہیں، لہٰذا آئیے اب ہم علم کی روشنی میں اس سوال کا جواب تلاش کریں، کہ اس کی ابتداء اور اس کی داستانِ عروج کیا ہے۔

زندہ چیزوں کی دو قسمیں ہیں حیوانات و نباتات، اور یہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں، سب سے بڑا اختلاف یہ ہے کہ حیوانات چلتے پھرتے اور حرکت کرتے رہتے ہیں اور نباتات میں حرکت نہیں پائی جاتی، لیکن نباتات کے اس طرح متحرک نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ زندہ نہیں ہیں، پہلے زمانہ میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ نباتات میں زندگی نہیں ہے کیونکہ وہ ایک جگہ قایم رہتے ہیں، لیکن اب یہ انکشاف ہوا کہ نباتات و حیوانات میں بعض اوصاف مشترک ہیں، اس بناپر زندگی کی دو قسمیں کر لیں ایک زندگی کامل جو حیوانات کی زندگی ہے اور دوسری حیات ناقص، لیکن اب اس سے انکار ممکن نہیں کہ نباتات بھی بالکل اسی طرح زندہ ہیں جس طرح حیوانات بلکہ بعض حیثیتوں سے نباتات میں مقابلتاً حیوانات سے زیادہ زندگی پائی جاتی ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ حیوانات کی زندگی کا مظاہرہ اُن کے حرکت کرنے سے ہوتا ہے اور نباتات اپنی زندگی کو دوسری حیثیت سے نمایاں کرتے ہیں۔ درخت یا پودا اگرچہ بالکل خاموش اور ساکن ہوتا ہے، لیکن اُس کی زندگی بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ وہ بذریعہ غذا حیوان کے جسم میں پہونچ کر اُس کی زندگی قایم رکھتا ہے، بظاہر شیر گھاس نہیں کھاتا لیکن وہ ایسے جانور کھاتا ہے جن کی غذا محض نباتات ہے۔ اس لئے شیر اور ہر گوشت خوار جانور کی زندگی بالواسطہ نباتات ہی پر منحصر ہے۔

بہرحال زندگی صرف چلنے پھرنے یا محض حرکت کا نام نہیں، کیونکہ دنیا کی ہر چیز حرکت میں ہے خواہ ہم اپنی آنکھ سے اس کو محسوس نہ کر سکیں، وہ چھوٹے چھوٹے ذرات جن سے قدرت نے ایک کنکر طیار کیا ہے حرکت میں ہیں وہ سادہ ذرات

جو اس صفحہ پر سیاہی کا رنگ دے رہے ہیں حرکت میں ہیں، ایٹم کے اندر برقپارے حرکت میں ہیں، سورج، چاند، سیارے سب حرکت میں ہیں، غرض پوری کائنات متحرک ہے۔

یہ صحیح ہے کہ زندگی کو حرکت سے خاص تعلق ہے، لیکن جس حرکت کو زندگی کہ سکتے ہیں وہ خاص قسم کی حرکت ہے اور اسکے سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ ہم پہلے نہایت سادہ قسم کی زندگی کا مطالعہ کریں، اور وہ نباتات کی زندگی ہے، سطح زمین پر نباتات کا وجود حیوانات سے کروروں برس پہلے ہوچکا ہے۔ پہلے نباتات کیوں پیدا ہوئے؟ اس کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ سب سے پہلا ذی حیات جو زمین پر نمودار ہوا اُس کی غذا کے لئے صرف بیجان چیزیں ہوا، پانی، نمک جیسی چیزیں موجود تھیں اور وہ زندہ چیز جو ان اشیاء پر اپنی زندگی قایم رکھ سکتی ہے، صرف نباتات ہی ہوسکتے ہیں۔

اب ہم عالم نباتات کا مطالعہ کرکے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ پودوں اور درختوں میں کس طرح تنوع پیدا ہوا، اور کس طرح اُن کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ اس سوال کو حل کرنے کے لئے ہم کو علم طبقات الارض سے مدد لینے کی ضرورت ہوگی جس کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر قایم ہے، یہ علم ہم کو بتاتا ہے کہ اگر ہم سطح زمین کو کھودتے ہوئے نیچے چلے جائیں، تو ہم کو ایک طبقہ کے بعد دوسرا طبقہ ملتا چلا جائے گا۔ اور ہر ایک طبقہ یا تہ ایک دوسرے سے مختلف ہوگی۔ وہ طبقہ جو اس وقت سطح زمین کہلاتا ہے اور جس پر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کے نیچے والا طبقہ کسی زمانہ میں سب سے اوپر والا طبقہ تھا جو ارضی انقلابات کی وجہ سے نیچے دب گیا اور اسی طرح اُس کے نیچے والے تمام طبقات ایک زمانہ میں زمین کی اوپر والی سطح بنائے ہوئے تھے۔

اگر ہم زمین کو دور تک نیچے کھودتے ہوئے چلے جائیں تو ہم کو مختلف قسم کے جانوروں اور پودوں کے آثار ملتے چلے جائیں گے جن کو دیکھ کر ہمیں داستان زندگی کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ان کے مطالعہ سے ہم قیاس کرسکتے ہیں کہ سب سے پہلے پیدا ہونے والے پودے کس قسم کے تھے، عالم نباتات میں سب سے پہلے پیدا ہونے والی چیزیں بڑے درخت نہیں تھے اور نہ پھول والے درخت تھے بلکہ وہ سمندر میں پیدا ہونے والی بحری گھاس تھی اور بالکل ہی سادہ قسم کی —— یہ ابتداء میں پیدا ہونے والے پودے بہت چھوٹے تھے، محققین کا خیال ہے کہ یہ اولین جاندار نباتی ہستیاں اُن جراثیم کے مانند تھیں جو آج کل ہمارے جسم میں داخل ہوکر بیماری کا سبب بن جاتے ہیں۔

نباتات کے اس دور پر لاکھوں برس گزرتے چلے گئے اور وہ بتدریج ارتقائی منازل طے کرکے ایسے درخت بن گئے جن کو انگریزی میں '   ' کہتے ہیں، یعنی پودوں کی وہ قسم جن میں پھول نہیں لگتا اور اُن کے جسم میں غذا حاصل کرنے کے لئے رگوں کی طرح نالیاں پائی جاتی ہیں، رفتہ رفتہ اس قسم نے اتنی ترقی کی کہ وہ آگے چل کر عظیم الشان درخت بن گئے۔ اس نوع کے نباتات کی ترقی کا زمانہ اتنا طویل ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، اسی قسم کے نباتات اسوقت بھی زمین کے اندر دفن ہیں، جن کو ہم پتھر کا کوئلہ کہتے ہیں۔

یہ قدیم قسم کے پھول نہ دینے والے درخت ماحول کی تبدیلی سے اپنی زندگی قایم نہ رکھ سکے اور یا تو اُن کی قسمیں بالکل فنا ہوگئیں، یا بہت ہی کم باقی رہ گئیں۔

اس کے بعد پھول والے درخت رونما ہوئے اور وہ رفتہ رفتہ بغیر پھول والوں کی جگہ لیتے چلے گئے، کیونکہ ان میں نئے ماحول کے اندر زندہ رہنے کی زیادہ صلاحیت پائی جاتی تھی، پھر پھول والے درختوں نے بغیر پھول والوں کی جگہ تو لے لی لیکن وہ ان کو بالکل ختم نہ کرسکے، اس وقت بھی ایسے سادہ اور نیچے طبقے کے پودے پائے جاتے ہیں جو اُن پودوں سے زیادہ مختلف نہیں جن کے آثار زمین کے اندر بہت نیچے پائے جاتے ہیں۔

اب ہم اپنے اس مطالعہ میں ایک قدم اور آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں، کہ پودے کیونکر زندہ

ہیں اور وہ کس طرح سانس لیتے ہیں اگر ہم پودوں کے سانس لینے کو سمجھ جائیں تو خود ہمارا اور آپ کا سانس لینا بھی سمجھ میں آجائے گا، عام طور پر سانس لینے کا یہ مطلب سمجھا جاتا ہے کہ ہم سینے کے اندر پھیپھڑوں میں ہوا داخل کریں اور پھر باہر نکالیں، لیکن درخت میں نہ سینہ ہوتا ہے نہ پھیپھڑا بلکہ بعض جانور بھی ایسے ہوتے ہیں جن میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہوتیں لیکن پھر بھی وہ سانس لیتے ہیں، بات یہ ہے کہ سانس لینے کے مختلف طریقے ہیں، لیکن مقصد سب کا ایک ہی ہے۔

جہاں کہیں کوئی زندہ چیز پائی جاتی ہے خواہ وہ پانی کے اندر ہو، یا پانی سے باہر وہاں ایک خاص قسم کا مادہ پایا جاتا ہے جس کو ہم آکسیجن کہتے ہیں جو زندگی کے لئے ضروری ہے۔ سب سے پہلے پیدا ہونے والے پودے نے پانی سے آکسیجن حاصل کیا لیکن ارتقائی عمل سے جب درختوں نے پانی سے باہر قدم نکالا تو ان سب نے ہوا سے آکسیجن لینا شروع کر دیا۔

سانس لینے میں دو عمل ہوتے ہیں، پہلا عمل یہ ہے کہ ہم ہوا کو اندر کھینچتے ہیں، اور اس سے آکسیجن لیتے ہیں، دوسرا وہ جبکہ ہم اس ہوا کو واپس کرتے ہیں، لیکن واپسی پر وہی آکسیجن ملی ہوئی ہوا واپس نہیں ہوتی، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو سانس لینا ایک بے معنی حرکت ہوتی، بلکہ اس کے ساتھ ایک اور چیز شامل ہو جاتی ہے جس کو کاربن کہتے ہیں۔

جب حیوان یا نبات کے جسم میں کاربن آکسیجن کے ساتھ مل کر سانس کے ساتھ باہر نکلتا ہے تو وہ ایک خاص قسم کا مادہ بن جاتا ہے، یعنی ایک خاص قسم کی گیس جس کو اصطلاح میں "کاربن ڈائی آکسائڈ" کہتے ہیں، انسان ہو یا حیوان بڑا درخت ہو یا ننھا سا پودا سب کے لئے سانس لینا ضروری ہے، اور اسی پر زندگی کا مدار ہے۔

اگر ہم کسی جانور کو ایک شیشے میں بند کر دیں، تو وہ آکسیجن ختم ہونے سے تھوڑی دیر میں گھٹ کر مر جائے گا، اور اس طرح اگر ہم کسی پودے کو بند کر دیں تو وہ بھی مرجھا کر ختم ہو جائے گا، لہذا ثابت ہوا کہ حیوان ہو یا نبات دونوں کے لئے سانس لینا ضروری ہے۔

نباتات کو حیوانات کے مقابلہ میں بہت کم آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان کی سانس کا عمل آہستہ ہوتا ہے اور اس کی نوعیت بھی حیوانی سانس سے مختلف ہے۔ نباتات کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے ایک وہ جس میں Chlorophyll (ہرے رنگ کا مادہ) پایا جاتا ہے دوسرے وہ جس میں یہ مادہ نہیں ہے۔

یہ مادہ سورج کی حرارت اور روشنی سے پیدا ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے درختوں کا رنگ سبز ہوتا ہے، اگر کسی پودے کو آفتاب کی روشنی اور حرارت سے محروم کر دیا جائے تو یہ سبز مادہ فنا ہو جائے گا اور اس کی زندگی بھی ختم ہو جائے گی، اس مادہ کا زیادہ حصہ پتوں میں پایا جاتا ہے اور کمتر حصہ شاخوں اور تنے میں، پتوں کی تخلیق کا مقصد ہی یہی ہے کہ ان کے ذریعہ سے یہ مادہ پیدا ہو کر بقائے حیات کا سبب بنتا رہے اور یہی وجہ ہے درخت کے پتے چپٹے، پتلے اور کثرت سے ہوتے ہیں، تاکہ ان کی زیادہ سے زیادہ سطح آفتاب کی روشنی اور حرارت سے استفادہ کر کے اپنے سبز رنگ کے مادے کو زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکے، اگر پتے پھلوں کی طرح گول یا کسی اور شکل کے ہوتے، تو ان کی بہت کم سطح اس مقصد کے لئے کام آسکتی۔

اب ہم اس سبز مادے کی اہمیت بتانا چاہتے ہیں، سب سے پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ سانس لینے کے عمل میں حیوانات اور نباتات کے درمیان ایک خاص اختلاف ہے۔ اور اس اختلاف کی نوعیت یہ ہے کہ حیوان ہوا سے آکسیجن لے کر کاربن باہر کر دیتا ہے لیکن نباتات کاربن کا بڑا حصہ اپنے اندر جذب کر کے اس کو اپنی غذا بنا لیتے ہیں۔

تمام جانوروں کو درختوں کی طرح کاربن کی ضرورت ہوتی ہے لیکن محض کاربن حیوان کی غذا اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ نباتات کے جسم میں پایا جانے والا ہرا مادہ اس میں دوسرے مادے شامل کر کے حیوانی غذا بننے کی صلاحیت پیدا نہ کر دے، نباتات کے اسی عمل پر کرۂ زمین میں بقائے حیات کا انحصار ہے یہ وہ عمل ہے جو نباتات کے ایک ایک پتے اور

اُس کی شاخوں میں خاموشی سے جاری ہے، گویا عالمِ نبات ایک عظیم الشان کارخانہ ہے جو ہمارے لئے غذا فراہم کرنے میں مصروفِ عمل ہے ـــــــــــ اگر نباتات اپنے سبز مادہ کے ذریعہ حیوانات کے لئے غذا فراہم نہ کریں تو تمام عالمِ حیوان ختم ہو جائے اور کرۂ زمین پر زندگی کا نام و نشان باقی نہ رہے۔

الغرض زندگی کے میدان میں سب سے پہلے نباتات ہی نے قدم رکھا اور زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ ارتقائی منازل طے کرتے چلے گئے یہاں تک کہ نباتات کے اس ارتقائی عمل نے سب سے پہلے حیوان کو پیدا کیا، اور جس طرح رفتہ رفتہ نباتات میں تنوع پیدا ہوا تھا اسی طرح حیوانات میں پیدا ہونے لگا، لیکن یہ سب کچھ پانی کے اندر ہی ہو رہا تھا، ابھی زندگی نے پانی سے باہر قدم نہیں رکھا تھا، آخر وہ وقت بھی آگیا جب نباتات و حیوانات سمندر سے خشکی پر نکلنا شروع ہوئے، یہ ایک بڑا اہم واقعہ تھا لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ کاروانِ حیات ایک ہی دن میں سمندر سے باہر نکل آیا، یہ منتقلی نہایت آہستہ اور ایک خاص طریقے سے ہوئی ہے۔

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ زندگی کو پانی سے خشکی پر لانے میں سب سے بڑا ہاتھ چاند کا ہے، چاند اپنی کشش سے روزانہ سمندر کے پانی کو چوبیس گھنٹے میں ایک دفعہ اوپر کو ابھار دیتا ہے جس کے اثر سے کناروں کا پانی سمٹ جاتا ہے اور زمین نکل آتی ہے اور جب چاند کرۂ زمین کے دوسرے نصف حصے کے مقابل آتا ہے تو پانی پھر اصل حالت پر آجاتا ہے اور کناروں پر اپنی پہلی جگہ پر پہونچ جاتا ہے، اور اسی عمل کو ہم جزر و مد کہتے ہیں۔

جزر و مد کی وجہ سے جو حیوانات اور نباتات پانی سے باہر خشکی پر رہ جاتے تھے رفتہ رفتہ اُن میں یہ صلاحیت پیدا ہوتی گئی کہ وہ پانی سے باہر بھی زندہ رہ سکیں چونکہ وہ پانی سے بالکل دور نہیں ہوتے تھے بلکہ جس زمین پر وہ پڑے رہ جاتے تھے وہ بالکل خشک نہیں ہوتی تھی، اس لئے زندگی کا سمندر سے باہر نکلنا طبعی قوانین کے تحت دفعتاً نہیں بلکہ تدریجاً ہوتا چلا گیا، اب تک ایسے جانور پائے جاتے ہیں جن کی اصلی جگہ پانی ہے، خاص طور پر وہ اتھلا پانی جو کناروں پر ہوتا ہے، یہ جانور پانی سے زیادہ دور خشکی پر نہیں جاتے، یہ چٹانوں پر یا ریت میں سمندر کے کنارے اُس وقت تک پڑے رہتے ہیں جب تک کہ جزر و مد کے عمل سے دوبارہ وہ پانی میں نہ پہونچ جائیں، بعض جانور ایسے بھی ہیں جو پانی سے نکل کر دور تک خشکی میں چلے جاتے ہیں، لیکن اُن کا اصلی وطن چونکہ پانی ہے اس لئے لوٹ کر پھر پانی میں پہونچ جاتے ہیں۔

کروڑوں برس گزرنے کے بعد زندگی سمندر سے خشکی میں پہونچ گئی اور رفتہ رفتہ نباتات اور حیوانات میں ماحول اور دوسرے اثرات سے تنوع پیدا ہوتا چلا گیا، اور ایسے جاندار بکثرت پیدا ہوگئے جنھوں نے نہ کبھی سمندر دیکھا تھا اور نہ جزر و مد سے اُن کو واسطہ تھا بلکہ بعض تو ایسے ہیں جو ہفتوں بغیر پانی پئے ریگستانوں میں چلتے رہتے ہیں۔

اب ہم کو اس بات پر غور کرنا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ پانی کے مقابلہ میں خشکی میں زندگی نے زیادہ ترقی کی، اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہم کو دیکھنا چاہئے کہ پانی کے اندر بسنے والے جانداروں کو کیوں زیادہ ترقی کرنے کا موقع نہیں ملا پانی کے جانوروں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ جانور مچھلی ہے، لیکن مچھلی چاہے جتنی بڑی ہو اُس میں خشکی کے جانوروں کی طرح ہوشیاری اور احساس نہیں ہوتا، یہ اُسی طرح بے حس اور ٹھنڈی ہوتی ہیں جس طرح اُس کے گرد و پیش کا پانی، ہاں بعض ایسی مخلوق بھی ہے جو مچھلیوں کی طرح سمندر میں رہتی ہیں مگر اس کے جسم میں گرم خون ہوتا ہے ـــ یہ جانور اگرچہ بظاہر مچھلی کی طرح معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ دراصل مچھلی نہیں ہے، ایسے جانوروں میں ہم وھیل مچھلی اور سیل کو شمار کرتے ہیں، ان کا وجود بھی مچھلیوں کے بہت بعد ہوا ہے۔ اس قسم کے جانور اگرچہ پانی میں رہتے ہیں، لیکن خشکی کے جانوروں کی طرح ہوا سے سانس لیتے ہیں۔

- یہ بات تو ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ ہر زندہ چیز کو سانس لینے کی ضرورت ہے اور سانس لینے کے لئے ہر وقت تازہ آکسیجن درکار ہوتی ہے، اب جس مقدار کی آکسیجن کسی جاندار کو اپنے ماحول سے حاصل ہوسکتی ہے اُسی مقدار کے تناسب سے وہ ترقی کرسکتا ہے اس لئے زندگی اُس کروروں برس کی مدت میں جب کہ اُس کا وجود صرف پانی میں منحصر تھا زیادہ ترقی نہ کرسکی، کیونکہ پانی میں ہوا کے مقابلہ میں بہت کم آکسیجن ہوتی ہے۔

پانی میں جس قدر بھی آکسیجن پائی جاتی ہے وہ ہوا سے حاصل ہوتی ہے اور اس لئے سطح کے قریب جو پانی ہوتا ہے اُس میں گہرے پانی کی بہ نسبت زیادہ آکسیجن پائی جاتی ہے، اس لئے جزر و مد کے اثر سے پانی میں بسنے والے جانور جب خشکی میں آپڑتے تھے تو وہ رفتہ رفتہ ہوا سے زیادہ آکسیجن لینے کے عادی ہوگئے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ قریب الفہم ہوگا کہ وہ سمندر کو چھوڑ کر خشکی کی طرف قدم بڑھانے لگے، گویا انھوں نے پانی کا سمندر چھوڑ کر ہوا کے سمندر میں غوطہ لگایا اور اس طرح ہوا میں زندگی کی ترقی کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔

پانی سے خشکی میں زندگی کا قدم رکھنا آسان کام نہ تھا کیونکہ پانی کا جانور مثلاً مچھلی پانی سے باہر نکلتے ہی مرجاتی ہے حالانکہ اُس کو بہ نسبت پانی کے ہوا میں کہیں زیادہ آکسیجن ملتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ مچھلی کے جسم میں پھیپھڑا نہیں ہوتا جو ہوا سے آکسیجن حاصل کرنے کا کام دے سکے، بجائے پھیپھڑوں کے مچھلی میں گلپھڑے ہوتے ہیں جو پانی سے قلیل مقدار کی آکسیجن کو چھان کر مچھلی کے جسم میں پہونچا دیتے ہیں اور پانی سے باہر آنے پر وہ اپنا عمل کرنے کے قابل نہیں ہوتے لہذا باوجود آکسیجن کی فراوانی کے مچھلی ہوا میں گھٹ کر مرجاتی ہے۔

پانی سے خشکی میں آنے کے بعد جب جانوروں نے آکسیجن بہ کثرت حاصل کرنا شروع کیا تو حرارت کا ذخیرہ بھی جسم کے اندر بڑھ گیا۔ حیوانات اور نباتات نے اگرچہ سمندر سے باہر نکل کر بڑی ترقی کی ہے لیکن وہ اپنی زندگی قایم رکھنے میں اس طرح پانی کے محتاج ہیں جس طرح سمندر میں رہنے والے جاندار۔ زندگی اب بھی پانی ہی کے اندر ہے ہمارے جسم میں ایک بڑی مقدار پانی کی ہر وقت موجود رہتی ہے اور اُس پانی میں اُسی قسم کے نمک پائے جاتے ہیں جو سمندر کے پانی میں ہیں، خاص کر کھانے کا نمک جس طرح سمندر کے پانی میں بہ کثرت موجود ہے اسی طرح ہمارے جسم کے پانی میں بھی پایا جاتا ہے اور اُس کا وجود حیوانی زندگی کے لئے لازمی ہے اس لئے انسان ہو یا حیوان، چرندہ ہو یا پرندہ اپنا سمندر اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے اور زندگی کو اب بھی پانی ہی کے اندر سمجھنا چاہئے۔

اب نباتات کو چھوڑ کر حیوانات کی طرف آئیے سب سے پہلے پیدا ہونے والے جانور نہایت سادہ قسم کے تھے، اُن میں ریڑھ کی ہڈی نہیں ہوتی تھی، یہ چیز جانوروں میں بہت عرصہ کے بعد پیدا ہوئی ہے اور اس اعتبار سے جانوروں کی تقسیم ریڑھ والے اور بغیر ریڑھ والے جانوروں میں کی جاتی ہے اور کچھ ایسے جانور بھی پائے جاتے ہیں جن کو ان دونوں میں سے کسی قسم میں نہیں رکھا جاسکتا، یہ دراصل بیچ کی کڑی ہیں اور اُن میں کچھ ناتمام سی ریڑھ کی ہڈی پائی جاتی ہے، ان جانوروں کا مطالعہ نہایت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ہم ان کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ کس طرح رفتہ رفتہ ریڑھ کی ہڈی جانوروں میں پیدا ہوئی کروروں برس گزرنے کے بعد بھی سمندر اور خشکی میں ایسا کوئی جانور نہ پایا جاتا تھا جو ریڑھ کی ہڈی رکھتا ہو اور اُس کے اندر دماغ بھی ہو۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ دماغ نہ ہونے کی وجہ سے یہ کسی چیز کو محسوس ہی نہیں کرسکتے ان کے احساس کا نظام بالکل دوسرا ہے، اور ان میں سے بعض مثلاً بھڑ یا شہد کی مکھی وغیرہ خاصی ترقی یافتہ زندگی گزارتی ہیں، لیکن پھر بھی ریڑھ اور دماغ نہ ہونے کی وجہ سے یہ جانور عالم حیوانات میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔

ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کو آسانی سے پانچ قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے، ۱ مچھلیاں - پانی اور خشکی دونوں میں

رہنے والے جانور۔ رینگنے والے جانور۔ پرندے اور دودھ پلانے والے جانور۔

بظاہر مچھلی، گائے، چڑیا، مینڈک، اور سانپ میں بہت فرق ہے، لیکن جہاں تک ان کے جسم کی ساخت اور ڈھانچہ کا تعلق ہے ان سب میں مشابہت پائی جاتی ہے، کیونکہ ان سب کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی پائی جاتی ہے، یہ صحیح ہے کہ مچھلی، ٹھنڈے خون والا جانور ہے اور وہ پانی کے اندر ہی سانس لیتی ہے، برخلاف اس کے گائے گرم خون والا جانور ہے اور ہوا میں سانس لیتا ہے، لیکن جہاں تک ان کی جسمانی ساخت کا تعلق ہے، یہ ایک دوسرے سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔

اب ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کی تاریخی ارتقا پر غور کیجئے، ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ترقی سب سے پہلے مچھلی میں پیدا ہوئی، مچھلی کی ریڑھ کی ہڈی پر اُس کے جسم کی تعمیر قائم ہے، اُس کے ڈھانچے کا اہم ترین حصہ ریڑھ کی ہڈی ہے، اور مچھلی کا یہ ڈھانچہ ایک نرم مادہ اور کھال وغیرہ سے ڈھکا ہوا ہے، جسمانی ساخت کی یہ ترکیب تمام ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔

رینگنے والے جانوروں کو (جن کے ہاتھ پاؤں نہیں ہوتے مثلاً سانپ) چھوڑ کر باقی سب ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے جانور دو ہاتھ، دو پاؤں، یا اگلے پاؤں اور پچھلے پاؤں یا بازو اور پاؤں رکھتے ہیں، یہ ہاتھ، پاؤں اور بازو کس طرح پیدا ہوئے یہ حیوانی جسم کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھنے والا سوال ہے، ان ہاتھ پاؤں یا بازوؤں کی ابتدا مچھلی کے پروں (Fins) سے ہوئی ہے، بعض مچھلیاں سر سے دُم تک بہت لمبے لمبے پر رکھتی تھیں، یہ مچھلیاں اونچے قسم کے ہاتھ پاؤں والے جانوروں کے بننے میں پہلی کڑی کی حیثیت رکھتی ہیں، ان مچھلیوں کے یہی پر کروروں برس گزرنے پر ارتقائی عمل سے ہاتھ پاؤں میں تبدیل ہوگئے۔ جو تمام ریڑھ والی ہڈی رکھنے والے جانوروں میں پائے جاتے ہیں۔

وہ مچھلیاں جو دیر تک پانی کے باہر رہ سکتی ہیں اور وہ جانور جو پانی اور خشکی دونوں میں زندہ رہتے ہیں جیسے مینڈک اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ زندگی نے کس طرح پانی سے باہر قدم نکالا اور ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے جانوروں کے عظیم سلسلہ نے کس طرح ارتقائی منازل طے کرنا شروع کئے، مینڈک کا چھوٹا بچہ جس کو بلبلیا یا (Tadpole) کہتے ہیں، مچھلی کی طرح ہوتا ہے اُس کے دُم اور گلپھڑے ہوتے ہیں اور پانی کے اندر ہی مچھلیوں کی طرح سانس لیتا ہے اور جب تک اُسکے ہاتھ پاؤں نہیں نکلتے وہ مچھلی ہی ہوتا ہے، پھر جب رفتہ رفتہ اُس میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور ہاتھ پاؤں بلکہ اُنگلیاں پیدا ہوجاتی ہیں اور پھیپھڑا پیدا ہوکر آزادی سے ہوا میں سانس لینے لگتا ہے تو مینڈک بن جاتا ہے اور مچھلی نہیں رہتا، اسی مینڈک سے تمام ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں میں ہاتھ پاؤں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

مینڈک ریڑھ والے جانوروں کی پہلی ترقی یافتہ شکل ہے کیونکہ اب اس کے ہاتھ پاؤں نکل آئے، اور وہ ہوا میں پھیپھڑوں کے ذریعہ سے سانس لینے لگا اور اب وہ آیندہ ترقی کرنے والے جانوروں سے قریب ہوگیا، جن کو Amphibian کہتے ہیں یعنی وہ جانور جو یا تو پیٹ کے بل گھسٹتے ہیں، جیسے سانپ یا چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں رکھتے ہیں جیسے چھپکلی، گرگٹ، گوہ، مگرمچھ وغیرہ۔

مینڈک اپنی ابتدائی شکل میں مچھلی ہوتا ہے، اور جب بڑا ہوجاتا ہے تو وہ Amphibian کی جنس میں شامل ہوجاتا ہے اور یہیں سے Reptile جانوروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ Reptile میں ایک قسم ایسی بھی ہے جس نے اپنے ہاتھ پاؤں کھودئے اگرچہ اُس کے آبا و اجداد میں ہاتھ پاؤں پائے جاتے تھے اور اس قسم میں سانپ اور سانپ کے خاندان کے تمام رینگنے والے جانور شامل ہیں۔

Reptile کی دوسری قسم یعنی ہاتھ پاؤں والی قسم بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ حیوانی تاریخ

میں ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جبکہ صرف Reptiles جانوروں کی حکومت تھی بعض ان میں سے بڑے خوفناک اور عظیم الجثہ ہوتے تھے، ان کی ہڈیوں کے ڈھانچے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں، اُن میں بعض ساٹھ فٹ تک لمبے پائے گئے ہیں، اب آپ ذرا تصور کیجئے ساٹھ فٹ لمبے ڈھانچے پر جب گوشت اور پوست ہوگا تو کیسا بھیانک معلوم ہوتا ہوگا، اِن میں سے بعض کے نہایت تیز قسم کے بہت سے دانت بھی ہوتے تھے ان جانوروں نے ایک طویل عرصہ تک زمین پر قبضہ کر رکھا تھا اس زمانہ کو زمین کی تاریخ میں Reptiles دور کہتے ہیں۔

جب زندگی کو پانی سے خشکی میں آئے ہوئے لاکھوں برس گزر جاتے ہیں تو ایک قدم اور آگے بڑھاتی ہے یعنی زمین سے اُٹھکر ہوا میں پہونچنے کی کوشش کرتی ہے، بعض ریپٹائل جانوروں کے ڈھانچوں سے جو صرف گزشتہ صدی میں ملے ہیں یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ اُن کی اُنگلیوں کے درمیان کھال کا ایک پردہ جیسا جُڑا ہوا تھا، جیسا کہ تیرنے والے پرندوں کے پنجوں میں ہوتا ہے، یہی چیز آگے چل کر پروں میں تبدیل ہوگئی اور ریپٹائل ترقی کرکے پرندہ بن گیا، بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے ——— ایک کبوتر اور ایک سانپ یا چھپکلی کی ساخت میں بڑا فرق ہے، سب سے بڑا فرق تو یہی ہے کہ ریپٹائل کے دانت ہوتے ہیں اور کوئی پرندہ دانت نہیں رکھتا، لیکن پھر بھی واقعہ یہی ہے کہ پرندہ، ریپٹائل کی ترقی یافتہ صورت ہے اور اب تو یہ بات اس وجہ سے اور بھی یقینی ہوگئی کہ بعض ایسے پرندوں کے ڈھانچے مل گئے ہیں جن کے دانت ہوا کرتے تھے، اس قسم کے پرندے گویا ریپٹائل اور پرندوں کی درمیانی کڑی ہیں۔

گزشتہ تمام تفصیل کو خلاصہ کے طور پر یوں سمجھنا چاہئے کہ مچھلیوں سے، Amphibia قسم کے جانور (یعنی وہ جو پانی اور خشکی دونوں میں زندہ رہتے ہیں) پیدا ہوئے اور amphibia سے reptiles پھر بعض ریپٹائل سے پرندے اور بعض سے، mammals یعنی دودھ پلانے والے جانور پیدا ہوئے، تمام جانوروں میں یہی آخری قسم سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے، اور اسی قسم کی ایک سب سے اعلیٰ قسم حضرت انسان ہے۔

ابتدا میں دودھ پلانے والے جانوروں کی زندگی ضرور دشوار رہی ہوگی، کیونکہ اُس دور میں بڑے بڑے ہولناک ریپٹائل کثرت سے زمین پر پائے جاتے تھے، اس لئے کچھ تو اپنے بچاؤ کے لئے اور کچھ اس لئے بھی کہ دودھ پلانے والے جانور سب سے زیادہ اپنے بچوں کی نگہداشت اور پرورش کرتے ہیں، یہ دودھ پلانے والے زمین کے ایسے گوشوں میں رہنے پر مجبور ہوئے جہاں ریپٹائل کا گزر نہیں ہوتا تھا، رفتہ رفتہ ان کی قوت بڑھتی گئی اور زمین پر ان کا تسلط ہوتا گیا، یہانتک کہ سب سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ جانور یعنی انسان زمین پر چھا گیا۔

محمود علی خاں

صوبۂ بہار میں غالب کی مقبولیت

ہندوستان کے شعرا میں جو مقبولیت غالب کو حاصل ہوئی کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ ہوئی، حالی کی 'یادگار غالب' سے لیکر اس وقت تک غالب اور اس کی شاعری کے متعلق جو تذکرے اور مقالے لکھے گئے ہیں ان کی تعداد سیکڑوں تک پہونچ گئی ہے اور آئے دن ایک نہ ایک مضمون شایع ہوتا رہتا ہے۔ غالب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اردو کا یہی ایک ایسا شاعر ہے جسکے دقیق اشعار کی شرحیں اردو میں لکھی گئیں۔ اس بارے میں وحیدالدین بیخود اور حسرت موہانی کی شرحیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں سنہ ۱۹۱۲ء میں جب مولانا محمد علی نے کلکتہ سے کامریڈ نامی انگریزی اخبار نکالا تو اس میں کمتر ان کی کوئی تحریر ہوتی تھی جس میں غالب کا کوئی حسب حال شعر انگریزی شرح کے ساتھ نہ ہوتا ہو۔

لیکن یہ تو تمہیدی بیان تھا۔ مجھے صوبہ بہار میں غالب کی مقبولیت کا حال لکھنا ہے۔ کسی تذکرے میں غالب کا عظیم آباد یا صوبۂ بہار میں آنا مذکور نہیں، آبِ حیات اور تاریخ ادب اردو (مترجمہ مرزا عسکری) میں صرف اس قدر لکھا ہے کہ غالب نے اپنی جاگیر حاصل کرنے کی کوششوں کے سلسلہ میں سنہ ۱۸۳۰ء میں دہلی سے کلکتہ کا سفر کیا اور اثنائے راہ میں لکھنؤ اور بنارس کی بھی سیر کی۔ لیکن غالب کے فارسی کلیات میں ایک شعر موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے سون ندی (سوہن) کا پانی پیا تھا۔ چنانچہ یوں کہا ہے:-

مرحبا سوہن و جان بخشیِ آبش غالب — خندہ بر گمرہیٔ خضر و سکندر دارم (کلیات صفحہ ۴۵)

یعنی سون ندی اور اس کے جان بخش پانی کو مرحبا، جس کو پی کر مجھے خضر و سکندر کے آبِ حیواں کی تلاش میں گمراہ رہ جانے پر ہنسی آتی ہے۔

یہ سون ندی اضلاع عظیم آباد اور شاہ آباد (آرہ) کے درمیان واقع ہے۔ بظاہر سون ندی کے مصفا اور شیریں پانی کی کیفیت دہلی تک اس قدر مشہور نہ تھی کہ وہاں کا کوئی شاعر خاص طور پر اس کا ذکر کرے۔ لہذا یقین ہوتا ہے کہ بنارس سے کلکتہ جاتے ہوئے غالب نے ضلع شاہ آباد (آرہ) یا عظیم آباد (پٹنہ) میں قیام کیا۔ کلیات میں اس مقطع کے بعد جو غزل ہے اس کے مقطع میں کلکتہ کا ذکر ہے جس سے ظاہر ہے کہ دونوں غزلیں اسی سفر سے تعلق رکھتی ہیں۔ بنارس سے کلکتہ کی راہیں صوبۂ بہار ہی سے ہو کر نکلتی ہیں، سنہ ۱۸۶۲ء سے پہلے بنارس سے کلکتہ تک ریل نہ تھی اس لئے سفر کے دو ہی ذریعے تھے ایک تو گنگا ندی سے بذریعہ کشتی دوسرے شیر شاہی سڑک (گرانڈ ٹرنک روڈ) سے بذریعہ رتھ یا یکہ۔ غالباً غالب نے خشکی ہی کی راہ اختیار کی ہوگی اور سہسرام سے چار کوس پورب ڈہری نامی مقام میں سون ندی کا پانی پیا ہوگا۔

بہرکیف، یوں تو سنہ ۱۸۳۰ء کے قبل غالب صوبۂ بہار میں ایک صاحب طرز شاعر اور مسلم الثبوت استاد فن تسلیم کرلئے گئے تھے مگر میں اس وقت ان مشاہیر شعرائے بہار کا ذکر کروں گا جو غالب کے اتباع یا تلمذ کو طرۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ ان میں سے بعض کو تو میں نے خود دیکھا تھا اور ذاتی طور پر جانتا تھا جس کی کیفیت ابھی عرض کروں گا اور بعضوں کے حالات نہایت تحقیق کے ساتھ معتبر اور قابلِ وثوق ذرایع سے معلوم کرکے اور ان کے غیر مطبوعہ کلام کا مطالعہ کرکے اپنی یاد داشت

میں قلمبند کرلئے تھے - لہذا ان کا تذکرہ تفصیل وار عرض کرتا ہوں -

(۱) مکرمؔ تخلص، اکرام الدولہ اکرام الملک مکرم علی خاں بہادر شیر جنگ نبیرہ معظم علی خاں بہادر کاؔفی (قوم افغان) قصبۂ بہار شریف میں پہاڑسی پر ان کے مکان کے کچھ کھنڈر اب سے پچیس تیس سال قبل راقم نے دیکھے تھے - ان کی آبائی جائداد ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں ضبط ہوگئی تھی - اُس کے بعد کچھ عرصہ تک یہ لکھنؤ اور دہلی میں رہے پھر سرہند پہونچے جہاں والی ریاست راجہ نرندر سنگھ کی بدولت کچھ دن اوقات خوشحالی سے بسر ہوئی - آخر میں پھر بہار واپس آئے - مکرمؔ نے ان واقعات کو ایک قصیدہ میں نظم کیا ہے - ان کے قصاید میں چند قصیدے بادشاہ اور مرزا فخرو ولی عہد کی مدح میں ہیں - اُردو کلام جو مختصر ہے اس میں ایک غزل کا مقطع یہ ہے :-

ہے مکرمؔ میکشوں کو میکدہ مثل حرم　　　طاق ابروئے مغاں انکے لئے محراب ہے

ان کے کلیات کا قلمی نسخہ خانقاہ محلہ بارہ دری بہار شریف میں راقم کی نظر سے گزرا اس کا دوسرا نسخہ شاید کہیں نہ ہوگا اس نسخہ پر ان کی مہر بھی ثبت ہے جس میں ۱۲۶۸ھ درج ہے -

یہ خود کو خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کا خانہ زاد لکھتے تھے اکثر فارسی غزلوں کے مقطع میں بادشاہ کی تعریف یا ذکر ہے چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ ہے :-

باشد مکرم الشعرا خانہ زاد شاہ　　　در آرزوئے خویش ازو مورد عطا

مکرمؔ، غاؔلب کے شاگرد تھے یا نہ تھے یقینی طور پر نہیں کہ سکتا - محض زبانی روایتوں پر پورا بھروسا نہیں اور ان کا کلیات بالاستیعاب دیکھنے کا موقع نہ ملا لیکن یہ معلوم ہے کہ انھوں نے غاؔلب کی اس غزل پر جس کا مطلع یہ ہے مصرعے لگائے تھے :-

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں　　　روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

یہ ہر کام میں بادشاہ کی پیروی کو باعثِ فخر سمجھتے تھے اس لئے گمان ہوتا ہے کہ جب ظفرؔ نے غاؔلب سے اصلاح لینا شروع کی تو انھوں نے بھی اپنا کلام غاؔلب کو دکھایا ہوگا - بہرکیف غاؔلب کی غزل پر مصرع لگانا جو اوپر مذکور ہوا اس سے غاؔلب کی شہرت اور مقبولیت ثابت ہے، مکرمؔ کا سن وفات صحیح طور پر معلوم نہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ بڑی عمر پاکر انتقال کیا -

(۲) شیرؔ تخلص، سید محمد شیر نام متوطن قصبہ بہار شریف - سید محبوب شیر صولت رئیس عظیم آباد (جن کا دیوان طبع ہوچکا ہے) کے خویش اور اپنے زمانہ میں مشہور خوشگو شاعر تھے - غاؔلب اور وحیدؔ الہ آبادی سے تلمذ تھا - افسوس ہے کہ جن لوگوں سے مزید حالات معلوم ہوسکتے تھے وہ ترک وطن کرکے یہاں سے چلے گئے - میری یادداشت میں انکا ایک شعر موجود ہے جس کو اس جگہ نقل کرتا ہوں :-

ہم کو دلیل عشق حقیقی ہوا مجاز　　　آوارگی نے کام دیا خضرِ راہ کا

(۳) کراؔمت تخلص سید شاہ کرامت حسین ہمدانی نام ساکن بہار شریف محلہ اصل گڑھی - مخدوم سید ہمدانی عرف حضرت منجھن کی اولاد سے تھے - ۱۱۹۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا - ایک غیر مطبوعہ دیوان یادگار چھوڑا جو غالباً ان کے ورثا کے پاس موجود ہوگا مرحوم احقر بہاری سے سنا گیا تھا کہ غاؔلب کے راسخ الاعتقاد تلامذ میں تھے اور کسی سے اصلاح سخن نہ لی - ان کا یہ شعر بہار کے بعض کہن سال بزرگوں کو اب تک یاد ہے :-

مری ہچکیوں کے شامل نکل آئیگا کلیجا　　　جو یہی رہے گی حالت جو یہی رہیگا رونا

(۴) باقر تخلص، سید شاہ باقر حسین نام ولد سید شاہ وارث علی اشکی۔ ساکن پیر بیگہ ضلع گیا۔ غالب سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ ان کے نام غالب کے کچھ خطوط بھی تھے جو غالباً ان کے پسر اوسط خاں بہادر عبدالصمد صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کے پاس ہوں گے۔ بیشتر فارسی میں کہتے تھے اُردو کلام کا نمونہ یہ ہے:-

شکل تصویر ہو خاموش تماشا کیا ہے — بیٹھے بیٹھے کھنچے جاتے ہو یہ نقشا کیا ہے

حضرت باقر کے والد شاہ وارث علی اشکی صوبۂ بہار کے مشاہیر اہلِ علم میں تھے۔ شاد عظیم آبادی نے حیات فریاد میں لکھا ہے کہ ان کے استاد حضرت فریاد نے بیشتر تعلیم اپنے ماموں شاہ وارث علی اشکی سے پائی تھی۔

(۵) خلیل و فوق تخلص اور محمد ابراہیم نام ساکن شہر آرہ محلہ چوک مسجد۔ ۱۸۶۷ء کے قبل سے اپنے کلام کی اصلاح غالب سے لیتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک بار انھوں نے اپنا کلام اصلاح کے لئے غالب کے پاس بھیجا تو اس کے ساتھ فارسی میں ایک خط بھی لکھا جس میں یہ عبارت تھی:-

"بہر حال ملازمان گرامی زحمت اصلاح و ملاحظہ غزل دادن و علاوہ از خرچ محصول ڈاک انچہ بروانی نامہ ہا گردد زیر بار نمودن اینجا غیر از مزید تفقد یا حیلۂ تلمذ ہیچ کدام"

غالب کو یہ جملہ بہت ناگوار ہوا، اس عبارت پر نشان بناکر حسب ذیل جواب کے ساتھ خط کو واپس کردیا:-

"منشی محمد ابراہیم صاحب خلیل تخلص کو غالب کمینہ بازاری فرومایہ کا سلام۔ خط کی پشت پر جواب لکھنے کی غرض یہ ہے کہ جس عبارت پر ۵ کا ہندسہ ہے اس کو ملاحظہ فرمائیے۔ جس شخص کا سیکڑوں روپے مہینے کا صرف ہو اس کو دو چار آنوں میں زیر باری کا لفظ لکھنا گالی دینے سے بدتر ہے یہ کوئی دوکاندار کسی اپنے بھائی دوکاندار کو لکھے۔ بہرحال بموجب آپ کی رائے کے زیر بار نہیں ہوتا اور آپ کا مجموعہ اشعار بیرنگ بھیجتا ہوں ۱۲ عفو جرم کا طالب غالب ۱۲۔ جمعہ ۴ر جنوری ۱۸۶۷ء"

غالب کا خط فوق کے کلیات (صفحہ ۱۴۵) میں چھپ کر شایع ہوچکا ہے لیکن اس کا حال باہر والوں کو بہت کم معلوم ہے۔ اس کلیات کے آخر میں صفیر بلگرامی کا قطعہ تاریخ بھی موجود ہے جس میں انھوں نے خود کو "شاگرد حضرت غالب دہلوی" لکھا ہے۔ فوق کے دیوان سے ایک اُردو شعر بطور نمونہ درج کرتا ہوں:-

مے ہو جب خونِ جگر ہجراں میں — منتِ پیرِ مغاں کیا کیجے

(۶) صفیر تخلص، سید فرزند احمد (بلگرامی) نام نہ صرف صوبۂ بہار بلکہ ہندوستان کے مشاہیر شعرا اور اہلِ قلم سے تھے۔ ۱۲۴۹ھ میں مارہرہ میں پیدا ہوئے اور پانچ برس کی عمر میں آرہ چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے، ان کی تصانیف میں 'فیض صفیر' رسالہ تانیث و تذکیر اور تذکرہ 'جلوۂ خضر' زیادہ مشہور ہیں۔ اول الذکر کو حضرت جلال کے رسالہ پر بھی سبقت حاصل ہے اس رسالہ پر غالب نے تقریظ بھی لکھی ہے جو اس رسالہ کے علاوہ غالب کی عود ہندی میں بھی موجود ہے۔ غالب سے تلمذ حاصل کرنے اور دہلی جاکر دو ڈھائی مہینے تک غالب کے ہاں ایک معزز مہمان کی طرح رہنے کا حال جلوۂ خضر صفحہ ۱۲۲ میں مذکور ہے۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ صفیر ۱۲۶۸ھ میں مارہرہ گئے تو اپنے ماموں صاحب عالم صاحب کے ہاں غالب کی شاعری کا چرچا دیکھ کر ان کو بھی تلمذ حاصل کرنے کا اشتیاق ہوا اور ایک عریضہ دو غزل فارسی اور دو غزل اُردو غالب کے پاس اصلاح کے لئے بھیجیں۔ غالب اصلاح دیکر آٹھویں دن غزلیں واپس بھیجدیں، پھر انھوں نے ایک مخمس قدسی کی غزل پر لکھکر اصلاح کے لئے بھیجا اور اس کے بعد ۱۲۶۹ھ میں اپنے ماموں کے ساتھ دہلی گئے اور دو ڈھائی مہینے غالب کے مہمان رہے اور رسالہ فیض صفیر پر تقریظ بھی لکھوائی اس کے بعد غالب کی حیات تک خط کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔

صفیر مرثیہ گوئی میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے - صوبۂ بہار اور یوپی میں خود صفیر کے شاگرد بہت تھے سخن گوئی کی مشق اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ بیالیس برس کی عمر میں آٹھ دیوان مرتب ہوگئے تھے جیسا کہ خود کہا ہے :-

عمر تیری ہے بیالیس برس کی ہے صفیر آٹھواں فضل الٰہی سے ہے دیوان تیرا

صفیر نے ۱۲۹۰ھ میں عظیم آباد میں انتقال کیا اور آرہ میں مدفون ہوئے - صوبۂ بہار میں صفیر کے تلامذہ کی کثرت خود ان کی اور غالب کی مقبولیت کا پتہ دیتی ہے -

(۷) صوفی تخلص احمد شاہ فرزند علی نام ، مشہور قصبہ منیر (مضاف عظیم آباد) کے مخدوم زادوں میں تھے ۱۲۴۵ھ میں پیدا ہوئے - درسیات سے فارغ ہوکر مشقِ سخن شروع کی اور غالب کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے - انھوں نے اپنی کتاب وسیلۂ شرف (غیر مطبوعہ) میں جو مخدوم شرف الدین احمد بہاری کے حالات میں ہے ضمناً لکھا ہے کہ غالب کے جو خطوط ان کے پاس آتے تھے ان میں سے ایک خط کے لفافہ پر قصبۂ منیر کی میم کو پیش دیکر مُنیر لکھا تھا جس سے ان کو گمان ہوا کہ شاید اس کا صحیح نام مُنیر ہی ہوگا -

جس زمانہ میں غالب کے دقیق اشعار پر لوگ معترض ہوئے اور کہا کہ :-

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

تو صوفی نے حق تلمذ ادا کرنے کے لئے اس کے جواب میں رباعیاں کہیں ان میں سے ایک رباعی پر غالب نے صاد بنا دیا تھا - وہ رباعی یہ ہے :-

سب تیغ زباں سے انھیں پہچانتے ہیں غالب وہ ہیں سب اہل سخن جانتے ہیں
یہ شیر خدا کے نام کی ہے برکت لوہا اسد اللہ کا سب مانتے ہیں

دیوان فارسی و اُردو کے علاوہ تین مثنویاں ۔ روشِ عشق ، کششِ عشق اور نوائے عشق صوفی کی تصنیف سے یادگار ہیں آخرالذکر مثنوی کے اس شعر پر غالب نے تین صاد بنائے تھے -

نورِ حق ، جلوۂ رب ، شانِ الٰہ ہے تو بندہ مگر اللہ اللہ

صوفی نے ستر سال کی عمر میں ۱۳۱۸ھ انتقال کیا - کلیات (غیر مطبوعہ) اب سے بیس برس قبل تک محفوظ تھا اور غالباً اب تک ان کے ورثا کے پاس موجود ہے -

(۸) سخن تخلص اور خواجہ فخرالدین حسین نام - ان کا دولت کدہ بخشی محلہ عظیم آباد میں راقم کے مکان سے بہت ہی قریب تھا ور راقم کے بزرگوں سے مخلصانہ ربط ہونے کے سبب ان کے ہاں راقم کی آمد و رفت تھی اور حضرت سخن راقم کو بزرگانہ شفقت لی نظر سے دیکھتے تھے - ان کے بڑے صاحبزادے خواجہ معین الدین حسین جن کی عمر اس وقت ستر سال کے قریب ہے راقم کے ڑے مخلص دوستوں میں ہیں - لہٰذا سخن کے متعلق جو کچھ عرض کروں گا وہ خود ان کی زبان سے سنی ہوئی باتیں ہیں یا جو ں نے خود دیکھا یا ان کے خاص عزیزوں اور دوستوں سے معلوم کیا -

خواجہ صاحب ۱۲۵۵ھ کے لگ بھگ دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام جلال الدین حسین عرف حضرت صاحب ابن ابوالقاسم نظام الدین احمد رضوی المعروف بہ خواجہ فقیر چشتی مودودی) تھا - سولہ برس کی عمر میں مختلف اساتذہ سے رسی کتابیں پڑھکر غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے - غالب کو نانا کہتے تھے لیکن صحیح طور پر معلوم نہیں کہ واقعی رشتہ مندی ں یا ان کے حقیقی نانا سے مخلصانہ ربط ہونے کے سبب ایسا تھا - بہرکیف سخن کو سترھواں سال تھا کہ غدر ۱۸۵۷ء کے اقعات پیش آئے اور ان کے والد ان کو ساتھ لیکر لکھنؤ چلے آئے اسی زمانہ میں انھوں نے دہلی کی مفارقت کے بیان میں ۔ غزل (زبانِ دہلی اور مکانِ دہلی) لکھی اور اس پر اصغر علی خاں نسیم دہلوی سے جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں تھے اصلاح

لی۔ کچھ دنوں کے بعد ۱۲۶۶ھ میں یہ اپنے پھوپھا کے ساتھ آرہ چلے آئے اور یہاں وکالت کا امتحان پاس کرکے عدالت میں وکالت کرنے لگے کچھ عرصہ کے بعد حکام کی سفارش سے منصفی کے عہدہ پر مقرر ہوگئے اور ہنگام ملازمت میں انگریزی تعلیم حاصل کرکے صدر اعلیٰ (سب جج) ہوگئے۔ ۱۲۷۶ھ سے انھوں نے مستقلاً صوبۂ بہار ہی کو اپنا وطن قرار دیا۔ شعر و سخن کا مشغلہ تا حیات جاری رکھا۔ صاحب تلامذہ بھی تھے اور اکثر شاگردوں کی غزلیں اصلاح کے لئے آیا کرتی تھیں۔ ۱۲۸۲ھ میں ایک ضخیم دیوان مرتب کرلیا تھا جس پر غالب نے تقریظ لکھی تھی جو اس دیوان کے ساتھ ۱۳۰۲ھ میں شایع ہوئی، دوسرا دیوان (غیر مطبوعہ) بھی مرتب تھا جس کو راقم نے خود دیکھا تھا، ان کے چھوٹے صاحبزادے بیان کرتے تھے کہ ایک شخص نے ان کے بکس سے چرالیا۔ اس بارے میں عجیب گل کھلے اور اشتہارات بھی شایع ہوئے۔

سخن نے رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عجائب کے جواب میں سروش سخن لکھی جو لکھنؤ میں متعدد بار طبع ہوچکی ہے۔ اس کا ذکر تاریخ ادب اُردو (مترجمہ مرزا عسکری) میں بھی موجود ہے، یہ کتاب بھی غالب کی اصلاح دادہ ہے اخیر عمر میں سخن نے تہذیب النفوس لکھی جو اُس زمانہ میں اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھی۔

سخن کے نام غالب کے چند خطوط بھی تھے جس کو وہ بڑی حفاظت سے رکھتے تھے۔ ان کے انتقال یعنی ۱۹۰۰ء کے بعد وہ خطوط ان کے خویش مولوی خلیل احمد مرحوم کلکتہ لے گئے تھے۔ اس زمانہ میں مرزا عسکری مرحوم بھی کلکتہ میں تھے وہ سخن کے قرابت مندوں میں تھے جس کا ذکر انھوں نے تاریخ ادب اُردو میں بھی کیا تھا، راقم کو اول مولوی خلیل احمد مرحوم کے ہاں مرزا صاحب سے نیاز حاصل کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ افسوس کہ اب اُن خطوط کا کچھ پتہ نہیں ملتا۔ ۱۹۴۵ء میں راقم بمبئی گیا تو مولوی خلیل احمد مرحوم کے صاحبزادے شرف الدین خلیل سلمہ کے ہاں ٹھہرا اور ان سے خطوط کا حال دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ میرے والد کی کوئی کتاب یا کوئی کاغذ میرے قبضہ میں نہ آیا میں علی گڑھ میں تھا اور کلکتہ میں کسی نے ایک تنکا بھی گھر میں نہ چھوڑا، یہ بھی نہ معلوم ہوسکا کہ کون لے گیا، سخن، غالب کے اس خط کا ذکر بہت فخر سے کرتے تھے جس میں غالب نے خود کو انکا جد فاسد لکھا تھا ایک خط کے ساتھ سخن کی وہ غزل بھی تھی جس کے اس شعر پر غالب نے تین صاد بنائے تھے:۔

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

راقم نے اس بار ان کو مشاعرہ میں بھی پڑھتے ہوئے سنا تھا۔

دیوان سخن پر سید شاہ محمد یحییٰ صاحب مرحوم (سجادہ نشین خانقاہ ابوالعلائیہ محلہ شاہ کی املی عظیم آباد پٹنہ) نے نظم میں تقریظ لکھی تھی جس کے ایک شعر میں غالب کا بھی ذکر ہے اور حاشیہ پر یہ عبارت ہے۔

ہمہ شوخیٔ غالب دہلوی۔ چو صہبا بریزد ز جام سخن۔ (سخن تلمیذ نواب اسد اللہ خاں غالب اند ۱۲)

یہ تقریظ شاہ صاحب مرحوم کے ہاتھ کی لکھی ہے راقم کے پاس موجود ہے۔

(۹) شاہ تخلص اور انور علی نام۔ راقم کے بزرگوں سے کافی ربط رکھتے تھے، ۱۹۰۰ء میں ان کی عمر تخمیناً ساٹھ برس ہوگی، ابتدا میں غالب سے بذریعہ خطوط اصلاح لیتے تھے پھر مرثیہ گوئی کی طرف طبیعت مایل ہوئی اور مرزا دبیر سے اصلاح لینے لگے اخیر عمر میں طبیعت تصوف کی طرف مایل ہوگئی تھی اور مشق سخن بالکل ترک کردی تھی۔ خود کوئی ذکر کمتر چھیڑتے تھے لیکن دوسروں کی گفتگو توجہ سے سنتے تھے اور نپے تلے الفاظ میں کوئی چست فقرہ اکثر زبان پر لاتے تھے۔ عظیم آباد کے مشہور اور صاحب تلامذہ شاعر تھے۔ ان کے شاگردوں میں واعظ الدین واعظ عرف بلٹو میاں نے رسالہ مغالطہ شاد لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے کہا تم نے یہ رسالہ بغیر مجھ سے پوچھے کیوں لکھا۔ آخر بڑے اصرار پر انھوں نے اس مضمون کی عبارت لکھی کہ اپنا نفس مضمون سے مجھے کوئی سروکار نہیں لیکن یہ رسالہ راستی کا راستہ دکھاتا ہے اس لئے اسی قدر لکھتا ہوں۔ انکے شاگرد

میں بعض کی غزلیں گلدستۂ رحمتی میں شایع ہوئی تھیں - ان کے ایک شاگرد مولوی عبدالغفور دقیق کی ایک تحریر موجود ہے جس میں انھوں نے فخر کے ساتھ شاہ کے واسطے سے اپنی شاعری کا سلسلہ غالب تک پہونچنا بیان کیا ہے - افسوس ہے شاہ کا کلام اب نایاب ہے - اخیر عمر میں انھوں نے اپنے شاگرد عبدالکریم کو حکم دیا کہ ساری بیاض کو لیجاکر گنگا میں ڈبو دو - نشتر مرحوم کہتے تھے کہ میں نے ان کے حکم کے بموجب سارا کلام گنگا میں ڈبو دیا - راقم کو شاہ کے چند اشعار جو یاد رہ گئے ہیں یہ ہیں :-

کچھ ایسے واقعات مرے دل کے ساتھ ہیں
جیتے تو ہیں مگر بڑی مشکل کے ساتھ ہیں

مایلِ حسن پرستی ہے طبیعت اپنی
خلق میں عشق بتاں سے ہوئی خلقت اپنی

دل پہ قابو نہیں بے بس ہیں علی انور شاہ
آہی جاتی ہے حسینوں پہ طبیعت اپنی

غالب کا سن وفات تو تذکروں میں پایا جاتا ہے لیکن دن اور مہینے کی تاریخ اہلِ تذکرہ نے کمتر لکھی ہے غالب کے مرنے پر صوبۂ بہار کے کئی شاعروں نے تاریخیں لکھیں ان میں ایک تاریخ شاہ یحیٰی صاحب کی کہی ہوئی راقم کے پاس موجود ہے یوں ہے "قطعہ تاریخ وفات نواب نجم الدولہ دبیر الملک اسداللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ واقعہ دوم ذیقعد روز دوشنبہ ۱۲۸۵ھ" اس کے بعد قطعہ ہے جس کا آخری شعر یہ ہے :-

سال آں بے نظیر یحیٰی
گو، بود نظیری زمانہ

صوبۂ بہار میں جہاں غالب کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی وہیں ان کا سب سے بڑا مخالف بھی پیدا ہوا، یعنی مرزا واجد حسین صاحب یاس عظیم آبادی معروف بہ یگانہ چنگیزی لکھنوی - یہ راقم کے منجھلے بھائی مولوی عزیزالدین بلخی راز مرحوم مولف تاریخ شعرائے بہار کے دوستوں میں ہیں جس کا ذکر مرزا صاحب نے اپنی مطبوعہ نظم میں بھی کیا ہے - مرزا صاحب کی تصنیف غالب شکن کا نتیجہ بظاہر ان کے منشا کے برعکس ہوا - اس کا سبب شاید یہ ہے کہ مرزا صاحب نے دانستہ یا نادانستہ غالب کی عظمت کا اعتراف کیا ہے اور اپنی تحریر میں غالب کی شاعری سے زیادہ اس کے کیرکٹر پر حملے کئے ہیں -

فصیح الدین بلخی

من و یزداں

[...]ے متعلق اکثر حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ جلدوں میں شایع [...]ہوئی ہے، حالانکہ وہ ایک ہی جلد میں تمام ہوگئی ہے -

[...] مذہبی استفسارات و جواب کا مجموعہ بالکل دوسری چیز [...] اور من و یزداں کے کسی مضمون کا تعلق اس سے نہیں ہے [...]ں طرح مذہب بھی ایک علحدہ کتاب ہے لیکن مناسب یہی [...]کہ مذہب کے موضوع پر ان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے [...]

[...] و یزداں کا دوسرا اڈیشن زیر طبع ہے اور جون تک غالباً [...]یع ہو جائے گا -

منیجر نگار

پاکستان کے لئے ہمارے ایجنٹوں کے پتے نوٹ کر لیجئے

۱- ڈاکٹر ضیا عباس ہاشمی - ۲۲۲، الٰہی بخش کالونی کراچی
۲- ملک دین محمد اینڈ سنز بل روڈ لاہور

آپ ان کو سالانہ چندہ بھیج کر نگار کے خریدار ہو سکتے ہیں اور کتابوں کی قیمت بھیج کر وہ بھی ہم سے حاصل کر سکتے ہیں -

منیجر نگار

اذا جاءت الساعۃ وانشق القمر

اس وقت جنگ و مدافعت دونوں نے ایسی علمی حیثیت اختیار کرلی ہے کہ جب تک پہلے سے اس کے نقشے نہ طیار کرلئے گئیں اور جملہ تفصیلات و امکانات ضبط تحریر میں نہ لے آئے جائیں کوئی قدم نہیں اُٹھایا جاتا اور یہ احتیاط اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کوئی مفروضہ خطرہ یا "اندیشۂ دور و دراز" بھی سامنے ہوتا ہے تو اس کو حقیقت و واقعہ فرض کرکے عملی تدبیریں شروع ہوجاتی ہیں اور اس کے متعلق نقشے اور چارٹ وغیرہ طیار ہونے لگتے ہیں۔

اس قسم کی پیش بندیوں میں غالباً سب سے زیادہ عجیب و غریب پیش بندی وہ ہے جو ویانا کے ایک انجنیر Hans Hoerbiger نے کی ہے۔ اس نے مدافعت و تحفظ کا پورا پروگرام مرتب کرکے اس کے نقشے وغیرہ بھی پہلے ہی سے طیار کرلئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ضرورت کے وقت کرۂ ارض سے دوسرے سیاروں تک انسان کیونکر سفر کرسکے گا، آتشی راکٹوں کے ذریعہ سے وہ کس طرح لاکھوں ٹن وزن کا تباہ کن مادہ فضا میں منتشر کرسکے گا، پانی، آگ اور زلزلہ سے بچنے کے لئے سربفلک پہاڑوں کی مضبوط چٹانوں کے اندر کس قسم کی پناہ گاہیں طیار کرنا پڑیں گی۔ لیکن آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ یہ اس نے کس دشمن سے بچنے کے لئے سوچا ہے؟ — چاند — وہی چاند جو ہمیں ٹھنڈک پہونچاتا ہے، لطیف و خنک روشنی مہیا کرتا ہے اور جس کے دم سے ہمارے محافل شعر و نغمہ زندہ ہیں۔

اس انجنیر کا خیال ہے کہ کرۂ زمین کے لئے سب سے بڑا خطرہ چاند ہے اور اس کا احساس سب سے پہلے اسے ۱۹۱۳ء میں ہوا تھا۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ گو زمین کی کشش سے چاند اس کی چاروں طرف طواف کررہا ہے، لیکن چونکہ وہ اپنی جگہ خود بھی گردش میں ہے اس لئے وہ آہستہ آہستہ زمین سے قریب ہوتا جارہا ہے اور اگر اس نے اپنی رفتار نہ بدلی تو تصادم ضروری ہے۔ اس لئے اس خطرہ سے بچنے کے لئے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ وہ کس رفتار سے آگے بڑھتا آرہا ہے۔

اس وقت تک زمین پر رہ کر جو اندازہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کم ازکم ۵ ہزار سال تک تو اس تصادم کا اندیشہ نہیں لیکن یقین کے ساتھ اسی وقت کو کہا جاسکتا ہے جب چاند کی سطح پر پہونچکر اس کا اندازہ کیا جائے یا فضا میں موسم کی جانچ کرنے والے اسٹیشن قایم کرکے آلات و تصاویر سے صحیح پوزیشن معلوم کی جائے پھر اگر اس تحقیقات سے یہ ثابت ہو کہ چاند خطرناک طور پر زمین کی طرف بڑھتا آرہا ہے، تو ہمیں سوچنا پڑے گا کہ ہم اس خطرہ سے کیونکر محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو قبل اس کے کہ چاند زمین سے ٹکرائے ہم چاند ہی کو فنا کردیں، یا یہ کہ اسے پیچھے ڈھکیل دیں۔

چاند کو فنا یا ریزہ ریزہ کرنے کے سلسلہ میں ان کا اندازہ یہ ہے کہ اس کے لئے کم ازکم سات ارب آتشی بموں کی قوت اور دس لاکھ سال کی فرصت درکار ہوگی اس لئے چاند کو فنا کردینے کا خیال تو ناقابلِ عمل ہے۔ اب رہا چاند کو پیچھے ہٹا دینا سو اس کے لئے ہم کو بڑے بڑے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے آتشی راکٹ چاند کی طرف سر کرنے ہوں گے اور اگر اس طرح ہم چاند کو پانچ ہزار میل بھی پیچھے ڈھکیل سکے تو کم ازکم ایک ہزار سال کے لئے ہم اس خطرہ کی طرف سے مطمئن ہوجائیں گے۔

لیکن اگر ہم اس میں کامیاب نہ ہوں تو پھر اس کے بعد یہ سوچنا ہوگا کہ اگر چاند ہم سے بہت قریب آگیا تو ہم تباہی سے

کیونکر بچ سکتے ہیں، اور ہمارا طریق مدافعت کیا ہونا چاہئے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ اگر چاند، زمین کے قریب آگیا تو ہوگا کیا؟۔ ہم اسے تصادم تو کہہ نہیں سکتے کیونکہ کُرّے ایک دوسرے سے ٹکرا نہیں سکتے، لیکن وہ اپنی قوت وکشش سے ایک دوسرے کو برباد و مسمار ضرور کرسکتے ہیں۔ جس وقت چاند زمین سے اس قدر قریب آئے گا کہ اس کو پارہ پارہ ہوجانا چاہئے، تو اس خطرہ کا علم ہم کو سب سے پہلے اس طرح ہوگا کہ مدوجزر میں فرق پڑ جائے گا، اور سمندروں کا پانی خط استوا (Equatorial region) سے ہٹ کر قطبین کی طرف سمٹے گا اس طرح بحر اٹلانٹک خشک ہونے لگے گا اور اس کا پانی آس پاس کے نشیبی حصوں میں پھیل جائے گا۔ اسی کے ساتھ چاند کی رفتار گردش زمین کے گرد کم ہوجائے گی اور ۲۸ دن کی جگہ ۳۰ دن، ۴۰ دن، ۵۰ دن اور اسی طرح رفتہ رفتہ زیادہ دن اپنی گردش پوری کرنے کے لئے درکار ہوں گے یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا جب وہ ایک جگہ قایم ہوکر رہ جائے گا اور زمین کے گرد گردش کرنے کے بجائے وہ زمین کے ساتھ ساتھ گھومنے لگے گا۔ بظاہر اس میں کوئی حرج نہیں نظر آتا، لیکن دراصل یہ حادثہ زمین کے لئے قیامت کا حادثہ ہوگا کیونکہ جب چاند ہمارے سروں پر آکر ایک جگہ قایم ہوجائے گا (اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ جگہ سیلون کا خط طول البلد یا اس کے مشرق میں واقع ہوگی) تو زمین کا وہ حصہ جو اس کے مقابل ہوگا دفعتًا اُبھرنا شروع ہوگا، آتش فشاں پہاڑ پھوٹ پڑیں گے اور زلزلے کے جھٹکے پے در پے محسوس ہونے لگیں گے، اس کے ساتھ ہی چاند کی برفیلی سطح ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہوگی اور چونکہ چاند کا اکثر حصہ یخ کی طرح منجمد ہے، اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی ان برفیلی چٹانوں سے زمین پر ۲۰ میل کی موٹی تہ چڑھ جائیگی اور یہاں کی تمام عمارتیں چور چور ہوکر برف کے نیچے دب جائیں گی۔

اسی کے ساتھ چونکہ چاند کی کشش ختم ہوجائے گی اس لئے منطقۂ حارہ (Torrid zone) کا پانی منطقۂ معتدلہ (Temperate) میں منتقل ہوکر وہاں سیلاب کی سی کیفیت پیدا کردے گا۔ اس کے بعد جب چاند کا اندرونی پگھلا ہوا حصہ باہر نکلنا شروع ہوگا تو وہ زمین پر اس طرح گرے گا جیسے بموں کی بارش ہو رہی ہو۔ اسی کے ساتھ پہاڑوں کی آتش فشانی، زبردست زلزلوں کے جھٹکے، نہایت گرم و تیز آندھیاں اور سیلاب وغیرہ کی مصیبتوں سے واسطہ پڑے گا ہم سوا ان چند نفوس کے جنھوں نے بلند پہاڑوں کے غاروں میں پناہ لیلی ہوگی تمام آبادی ختم ہوچکی ہوگی۔ اب زمین ایک ایسا کرہ نظر آئے گی جہاں کے سمندر ٹھیرے ہوئے ہیں اور مدوجزر سے بے نیاز، موسموں کا تغیر ختم ہوگیا ہے۔ قطبین نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے اور زمین کا محور یا دُھرا عمودی ہوکر رہ گیا ہے، چاند کے ملبے سے زمین چاروں طرف ڈھکی ہوئی ہے، کرۂ زمین کا شمالی حصہ بالکل برف پوش ہے اور جنوبی حصہ میں سمندر ہی سمندر نظر آرہا ہے۔

پھر اس وقت جو چند نفوس باقی رہ گئے ہیں وہ پہاڑوں کے غاروں سے نکلیں گے اور دنیا کو پھر از سرِ نو بسانے کی کوشش کریں گے، لیکن وہ اس میں کامیاب ہوں گے یا ناکام اسے کون جان سکتا ہے۔

دیانا کے اس انجینیر نے صرف ان خطروں ہی کا ذکر نہیں کیا، بلکہ اس سے بچنے کی بھی ایک اسکیم پیش کی ہے اور وہ یہ ہے کہ دس ہزار فٹ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر پناہ گاہیں بنائی جائیں جو ہمالیہ سے شمال یا شمال مغرب کی طرف دو ہزار میل دور ہوں۔ اس غرض کے لئے اس نے ہمالیہ کا وہ حصہ جو جنوبی تبت سے قفقاز تک چلا گیا ہے، بہت موزوں بتایا ہے اور اس کے بعد مغربی چین، جزایر ہوائی، فارموسا اور جنوبی افریقہ کا ذکر کیا ہے۔

یہ پناہ گاہیں اس کی رائے میں اتنی وسیع ہونی چاہئیں کہ آدمیوں کے ساتھ گھریلو جانوروں کو بھی ان میں جگہ مل سکے تاکہ جب انسان دوبارہ اس تباہ شدہ کرۂ زمین کو بسائے تو ان جانوروں سے مدد لے سکے۔

سلامِ عقیدت

سلام، اے فطرتِ کون و مکاں کے جوہرِ اعظم سلام اے مطلعِ انسانیت کے نیرِّ اعظم
سلام اے مرشدِ کامل، سلام اے رہبرِ اعظم

سلام اے کاکلِ فطرت کی گرہیں کھولنے والے ترازوئے عمل پر زندگی کو تولنے والے
مشیئت کے لبِ معجز اثر سے بولنے والے

سلام اے وقت کی رفتارِ کج کو موڑنے والے طلسمِ ظلمت آبادِ جہالت توڑنے والے
خدا کی ذات سے بندوں کا رشتہ جوڑنے والے

تری چشمِ حقیقت بیں امینِ رازِ یزدانی، ترے افکار، سوزِ سینۂ تقدیرِ انسانی
ترے جذبات، آب و گِل کی اک معراجِ روحانی

تپش سے تیری لپکا زندگی کے دل کا انگارا تری ٹھوکر سے ریگستان میں تہذیب کا دھارا
ترا سینہ مشیئت کی تمناؤں کا گہوارا

حرا کے غار میں روشن کیا ایسا دیا تونے کہ جس کی روشنی سے دہر کو چمکا دیا تونے
مئے وحدت کا ساغر چار سو چھلکا دیا تونے

بدل دی اک اشارے میں زمانے کی ہوا تونے بیابانِ عرب کو مرجعِ عالم کیا تونے
شتربانوں کو عرفانِ جہانبانی دیا تونے

محبت کے تلوّن کو جنوں کی پختگی بخشی، عمل کی روح کو اپنے جگر کی تازگی بخشی
چراغِ آدمیت کو نئی تابندگی بخشی

عروسِ زندگی کو فکر کا زیور دیا تونے تقاضائے دلِ فطرت کو پورا کر دیا تونے
خودی کی مئے سے جامِ روحِ انساں بھر دیا تونے

مزاجِ سنگ و آہن کو بنایا معتدل تونے مٹا کر قیصریت کا نظامِ مضمحل تونے
دیا انسانیت کو اک پیامِ مستقل تونے

ترا نورِ ہدایت آفتابِ صبحِ بیداری ترا پیغام دُنیا میں صداقت کی علمداری
اخوت کی جہاں سازی محبت کی فسوں کاری

ترے در کی گدائی نے عطا کی فقر کو میری ترے اعجاز سے پائی محبت نے جہانگیری
ترے صدقے میں دُنیا کو ملا کردارِ شبیری

مبارک ذہنِ انساں میں حیاتِ جاوداں تجھکو زمانہ کہہ رہا ہے رہبرِ کون و مکاں تجھکو
دُعا دیتا ہے ہر ہر موڑ پر یہ کارواں تجھکو

[illegible]

طوفان

وہ دیکھو گرد آلودہ ہوئے ماتھے ستاروں کے
سمن زاروں میں خیمے جل اُٹھے رنگیں بہاروں کے
وہ جاگے زلزلے، فطرت کے ماتھے پر شکن آئی
جبیں خورشید کی وہ آہنِ ظلمت سے ٹکرائی
بجھے تارے، دریدہ ہو گئے آنچل گھٹاؤں کے
وہ سجدے تھک کے لوٹے، سلسلے ٹوٹے دعاؤں کے
اندھیرے کے کفن پھیلے، وہ دم توڑا چراغوں نے
جہالت کی ردائیں اوڑھ لیں بڑھ کر دماغوں نے
وہ خبث و مکر دوڑے طاعت و عرفاں کے جادوں پر
لگا دی معصیت نے مُہر فطرت کے ارادوں پر
وہ ہر رہبر نے لوٹا جادۂ ہستی کے راہی کو
وہ ہر معمار نے آواز دی ہنس کر تباہی کو
وہ ہر مطرب نے سازِ امن چھیڑا جبر کی دُھن میں
درندہ بن گیا انسان آغوشِ تمدّن میں
وہ بھیگیں خون سے شعر و ادب کی آستینیں بھی
جھکا دیں وقت نے کانٹوں پہ پھولوں کی جبینیں بھی
وہ بھڑکے جبر و استبداد کے شعلے کنشتوں میں
نظر آنے لگے دوزخ کے انگارے بہشتوں میں
وہ لوٹا آدمیت کو سیاست کے لٹیروں نے
وہ نجم و کہکشاں کو ڈس لیا بڑھ کر اندھیروں نے

ہوا و سیل کی حد میں یہ دنیا آنے والی ہے
کسی طوفان کی زد میں یہ دنیا آنے والی ہے

وہ دیکھو آ گیا طوفاں وہ دیکھو آ گئی آندھی
سفینوں کے سواروں نے ابھی ہمّت نہیں باندھی
ابھی نیندوں کی مہریں ہیں ابھی ملّاح سوتے ہیں
نہ جانے ناخدا کب خواب سے بیدار ہوتے ہیں
سمندر کی جبیں پر اب ہوا کے نقش گہرے ہیں
وہ دیکھو کشتیوں پر گرد طوفاں کے پہرے ہیں
تلاطم بڑھتا جاتا ہے ہوائیں تیز ہوتی ہیں
سفینوں کی جبینیں آج سجدہ ریز ہوتی ہیں
اگر ملّاح جاگیں ناخدا ہشیار ہو جائیں
ہوا و سیل کے حاکم اگر بیدار ہو جائیں
سفینے کھینے والوں کو اگر اک جوش آ جائے
اگر ان نیند کے ماتوں کو اب بھی ہوش آ جائے
اگر اک عزمِ راسخ ان کو پیغمبر نگاہی دے
اگر ان کی صلابت ان کی عظمت کی گواہی دے
اگر یہ نوح کے بیٹے خود اک طوفان بن جائیں
ہوا و برق ابر و سیل کے سلطان بن جائیں

قدم رکھ دیں اگر بڑھ کر یہ طوفانوں کے سینوں پر
چمک اُٹھیں نبوت کے نشاں ان کی جبینوں پر

فضا ابنِ فیضی اعظمی :-

یہ دھندلکے یہ اندھیرے کا سفر اے ساقی! گم ہوا قافلۂ صبح کدھر اے ساقی!
شب کے گہوارے میں بے چین ہیں مہتاب و نجوم روشنی ڈھونڈھتی ہے راہِ سفر اے ساقی!
جُرم میں تیرہ شبی کے ہیں اُجالے محبوس دست و پابستہ ہے مظلوم سحر اے ساقی!
جس نے سورج کو سکھایا تھا چمکنے کا ہنر اب وہ ظلمات سے ٹکراتا ہے سر اے ساقی!
ہر گلِ لالہ ہے اوڑھے ہوئے زخموں کی نقاب عشوۂ خاک ہے تکلیفِ نظر اے ساقی!
شعلہ آمیز یہ شبنم، یہ سلگتے بادل خیمۂ گل پہ برستے ہیں شرر اے ساقی!
نہ رہا بادۂ شیراز کے قابل کوئی ظرف پھیر لی ساغر و مینا نے نظر اے ساقی!
ہو گیا مہرِ مبیں ذرے کے سینے میں غروب ریگ میں جذب ہوا آبِ گہر اے ساقی!
دیکے ہر موڑ پہ جبریل و خضر کو آواز بجھ گئی شمعِ سرِ راہ گزر اے ساقی!
کس طرح ہو گئے ناپید صنادیدِ عجم اف! یہ تاریخ و سیاست کے بھنور اے ساقی!
یہ در و بام یہ ایوانِ تباہی عنوان خون ہو جائے گا ہیرے کا جگر اے ساقی!
بھوک اور پیاس کے انداز پنپتی ہی رہی زینتِ افسر و اورنگ و کمر اے ساقی!
کون پوچھے زر و دولت کے خداؤں کا مزاج اپنے افلاس سے خیرہ ہے نظر اے ساقی!
اب بھی واضح نہیں ادراک و بصیرت کے نقوش سرد ہے آج بھی بازارِ ہنر اے ساقی!
باطل اندیشہ نبی — راہ غلط کردہ رسول راہ بر کوئی نہیں جائیں کدھر اے ساقی!

چھوڑ کر کنج میں ادبار و ملامت کے ہمیں
مڑ گئی گردشِ ایام کدھر اے ساقی!

جمیل مظہری :-

مجھ سے ممکن نہ ہوا تیرے تبسم کا جواب — ہنس دیا زخمِ جگر میری ہنسی پر اے دوست
بات یہ ہے کہ ستم میں تھی جبھی تک لذت — جب تلک تیرا کرم تھا نہ کسی پر اے دوست
ہو مبارک تیرے گیسوئے رسا کا سایہ — عشق اور عشق کی آشفتہ سری پر اے دوست
میرا جذبہ تو یہ کہتا ہے کہ قربان کردوں — سو نگاہیں تیری اک کم نگہی پر اے دوست
باغباں کچھ کہے لیکن نگہِ بلبل کا — قرض ہے باغ کی ایک ایک کلی پر اے دوست
ہم نے ظلمت کو بھی سمجھا ترے چہرے کی نقاب — اک تبسم میری اس خوش نظری پر اے دوست
عشق اک تشنہ لبی ہے بہ نظرگاہِ مجاز — حسن اک طنز ہے اُس تشنہ لبی پر اے دوست

ایک وارفتۂ صحرائے تحیر ہے جمیل
اور ترا لطفِ تبسم ہے اسی پر اے دوست!

جگر بریلوی :-

شعلۂ حسن بھڑکنے لگا اب دل کے قریب — گرمیِ شوق ہے یا آ گئے منزل کے قریب
روشن آنکھیں ہوئی جاتی ہیں تو دل محوِ نشاط — لے ہی آئی ہمیں وحشت تیری محفل کے قریب
شوق نے بڑھ کے رگ و پے میں عجب حال کیا — پاؤں اُٹھتے نہیں آ کر تری محفل کے قریب
پھٹنے لگتا ہے عجب جوشِ طرب سے سینہ — مسکراتا ہوا آتا ہے جو وہ دل کے قریب
نیند آنکھوں میں ہے یا کیفِ ہم آغوشی ہے — جیسے محبوب کا دل اب ہے مرے دل کے قریب

دل اُچھلتا ہے کہ ہوتا ہے جگر بیڑا پار
شاید آ پہونچا سفینہ مرا ساحل کے قریب

وحید اختر :-

تسکینِ ذوق دید کا ساماں نہ کر سکے　　جو جلوے پائے شوق کو جولاں نہ کر سکے
جب بھی بہار آئی فقط مسکرا پڑے　　کیوں پھول اعتبارِ بہاراں نہ کر سکے
شاید اُنھیں سے نورِ سحر کا ملے سُراغ،　　وہ ظلمتیں کہ جن کو فروزاں نہ کر سکے
کردی غموں نے اور بھی مربوط داستاں،　　شیرازۂ حیات پریشاں نہ کر سکے

شمیم نعمانی :-

جو دل پہ گزرتی ہے بہاروں سے نہ کہنا　　اب پھول بھی چُبھ جاتے ہیں خاروں سے نہ کہنا
امسال خزاں میں بھی کئی پھول کھلے تھے　　موقع بھی اگر ہو تو بہاروں سے نہ کہنا

دلوں کی آگ بھی ہے وہ بلائے بد کہ جسے　　لگانے والا بھی اکثر بجھا نہیں سکتا

تھا زندگی میں جبر مسلسل عزیز تر　　ناگاہ اختیار کے دھوکے میں آ گئے

ہم ہی نہیں ہیں وقفِ الم اور بھی تو ہیں　　منت گزارِ طرزِ ستم اور بھی تو ہیں
ہم نے تو خیر دردِ محبت کو پا لیا　　لیکن خرابِ دیر و حرم اور بھی تو ہیں
اک ہم ہی نامرادِ محبت نہیں شمیم　　مانوسِ اعتبارِ کرم اور بھی تو ہیں

اندازِ بیاں لاکھوں ہیں افسانہ وہی ہے　　ذرے ہیں وہی جلوۂ جاناں نہ وہی ہے
ہر بار بدل دیتا ہوں دامانِ تمنا،　　لیکن مرا اندازِ گدایانہ وہی ہے

رفتہ رفتہ زندگی کو راہ پر لانے لگے　　غم پہ غم کھائے نہ جاتے تھے مگر کھانے لگے
ہو گئے غنچے پریشاں، پھول کملانے لگے　　میرا افسانہ چمن والے بھی دُہرانے لگے

بشد چراغِ حرم و دیر بجھا دو　　ہم بزمِ محبت سے کہیں جا نہ سکیں گے
دل تابِ ہوا خواہیٔ غم لا نہ سکے گا　　ہم تابِ جگر داریٔ دل لا نہ سکیں گے

آئینِ التفاتِ غمِ یار دیکھنا　　دُنیا میں آج کوئی ہمارا نہیں رہا
اندازِ دلفریبیٔ طوفاں تو دیکھئے　　دریا میں ڈوبتے ہی کنارا نہیں رہا

شفیق جونپوری :-

بیگانگی پہ تیری جفا کا گماں نہ تھا
انجام عشق سوچکے تو مہرباں نہ تھا

ہر سادگی کو آمدِ محشر کا انتظار
نامِ خدا وہ دور کہ جب تو جواں نہ تھا

راضی تھا جس قدر کہ جفاؤں سے تری دل
اتنا کسی کے لطف سے بھی شادماں نہ تھا

وہ شیوۂ رضا طلبی یاد ہے تجھے
تیرا عتاب بھی مرے دل پر گراں نہ تھا

جب یاد آگیا تو نشاط آفریں ہوا
وہ لمحۂ فراق جو راحت رساں نہ تھا

گزری ہے تیرے غم میں جوانی شفیق کی
وہ موسمِ بہار میں بھی بے خزاں نہ تھا

نور دہلوی (از کراچی)

فرصت کے لمحے ہم کو زمانے نے جو دئے ہم نے وہ یادِ عشرتِ ماضی میں کھو دئے
میری تباہیوں پہ تبسم بھی تھا حرام رسوائی کا خیال جو آیا تو رو دئے
اک موجۂ امید نے دیکر فریبِ امن ساحل پہ لاکے لاکھوں سفینے ڈبو دئے

انورؔ ہمارے حالِ خراب و تباہ پر
آج اُن سے بھی رہا نہ گیا وہ بھی رو دئے

رئیس امروہوی :-

گو سبھی مشق ستم سے آزمائے جائیں گے — وائے اُن پر جو کرم سے آزمائے جائیں گے
سلسلہ جنباں ہوئے وحشت کے ہنگامے ترے — اُن کی زلفِ خم بہ خم سے آزمائے جائیں گے
کفر مطلق ! بندگانِ خاص تیرے تا کجا — فتنۂ دیر و حرم سے آزمائے جائیں گے
خضرِ ہمت کی منادی ہے کہ راہِ شوق میں — راہرو پہلے قدم سے آزمائے جائیں گے
امتحانِ سعیِ ضبطِ غم میں ہم تنہا نہیں — وہ بھی سعیِ ضبطِ غم سے آزمائے جائیں گے

اُن کو دعوے ہیں بہت بندہ نوازی کے رئیس
آزمائیں گے جو ہم سے آزمائے جائیں گے

رضا نقوی :-

فقط یہ پرسشِ غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے — کرم تمھارا، کرم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
شکستِ شیشۂ دل نے یہ دی صدا، کہ حیات — سرورِ ساغرِ جم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
مٹا رہی ہے جسے کارواں کی تیز روی — وہ صرف، نقشِ قدم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
یہ بات اہلِ حرم کاش کے سمجھ سکتے — صنم کدے میں صنم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
سمجھ سکو تو مری ان اداس نظروں میں — فسانۂ شبِ غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

ہوائیں لانے لگی ہیں پیامِ وقت رضاؔ
حیات، موسمِ غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

افتخار اعظمی انورؔ :-

دل ہے شادابِ مسرت، جاں ہے سیرابِ نشاط — چشم تر سے یوں رواں ہے آبشارِ آرزو
پھر وہی موجِ تبسم پھر وہی نورِ جمال، — روئے رنگیں پر کوئی دیکھے بہارِ آرزو
یہ ہوائیں، یہ گھٹائیں، یہ بہارِ رنگ و بو — آ کنارِ شوق میں آ، اے نگارِ آرزو
جگمگا اٹھیں فضائیں کثرتِ انوار سے — یوں اُٹھا رخ سے نقاب اے نوبہارِ آرزو

مطبوعات موصولہ

بکھری کرنیں مجموعہ ہے جناب پنڈت کشن پرشاد کول کے پانچ افسانوں کا جسے نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ جناب کول ایک کہنہ مشق ادیب ہیں اور ہر چند یہ ضروری نہیں کہ ہر ادیب فسانہ نگار بھی ہو، لیکن کول صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو ادبیات کے سلسلہ میں شاعر کے سوا سب کچھ ہیں اور ہو سکتے ہیں۔

اس مجموعہ کا پہلا افسانہ "دیپک اور پتنگ" اس سے پہلے کسی رسالہ میں شایع نہیں ہوا اور غالباً یہی ایک فسانہ ایسا ہے جس کا تعلق کسی خاص سانحہ یا واقعہ سے نہیں ہے باقی چار افسانوں کا پس منظر بڑی حد تک "واقعاتی" ہے جس کا اظہار انھوں نے اپنے پیش لفظ میں بھی کر دیا ہے — کول صاحب پیش لفظ میں تحریر فرماتے ہیں:-

> "ایک زمانہ تھا کہ رومان نگاری اور عبارت آرائی ادب کی جان سمجھی جاتی تھی — آج افسانوی ادب میں "زندگی، زندگی" کی ایسی پکار مچ رہی ہے کہ جب تک کوئی فسانہ کسی خاص "ازم" سوشلزم، کمیونزم، یا فرائڈازم کے رنگ میں رنگا ہوا نہ ہو قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا اور ادبیت کی معمولی چاشنی بھی ہنر نہیں بلکہ عیب سمجھی جاتی ہے اور ہمارا آجکل کا فسانوی ادب ادبیت سے دور اور صحافت سے قریب تر ہو گیا ہے ان دونوں انتہا پسند طرزوں سے ان افسانوں کا دامن بچایا گیا ہے"۔

ہم سمجھتے ہیں کہ کول صاحب کی یہ تنقید ان افسانوں کے متعلق بڑی حد تک صحیح ہے اور اسی تنقید کی روشنی میں انھیں اس مجموعہ کو دیکھنا چاہئے۔

کول صاحب کی عمر کا بڑا حصہ اور شاید عالم شباب میں بھی یہیں لکھنؤ میں بسر ہوا ہے لیکن ان افسانوں کے تاثرات یکسر غیر لکھنوی ہیں۔ کاشکے اس مجموعہ میں کوئی ایسی چیز بھی ہوتی جسے ہم کول صاحب کی "آپ بیتی" سمجھ کر پڑھتے اور اُس عہد شباب کا ماتم کرسکتے جسے کول صاحب نے نہیں تو ان کے بعض احباب نے ضرور یہاں کی گلیوں میں کھویا ہوگا۔

کول صاحب ادب میں "ازمیات" کے مخالف ہیں، لیکن وہ خود ان افسانوں میں conventionalism سے نہیں بچ سکے۔

مقننہ اور قانون سازی تالیف ہے جناب عبدالحفیظ صدیقی بی اس سی، ال ال ام کی جس میں انھوں نے تقابلی مطالعہ کے بعد ہند کے موجودہ دستور سے بحث کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی ملک کے دستور یا آئین کا صحیح مطالعہ، صحیح ذوق کے ساتھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو سیاست یا قانون سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن چونکہ عوام کو بھی اپنے فرایض و حقوق جاننا ضروری ہیں۔ اس لئے کوئی ایسی کتاب جو ان باتوں کو غیر قانونی سادہ زبان میں ہم کو سمجھا سکے، یقیناً قابل قدر ہے۔

اس کتاب کے فاضل مصنف نے پوری کوشش کی ہے کہ وہ ہندوستان کے آئین و دستور کو زیادہ قریب الفہم بنا سکیں اور اس لئے امید کی جاتی ہے کہ ان کی کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی — ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ کتابت، طباعت غنیمت۔ قیمت چار روپیہ (جو یقیناً زیادہ ہے) ملنے کا پتہ:- اُردو کتاب گھر، چار کمان، حیدر آباد دکن۔

امن کا کارواں اپریل ۵۲ء میں کل ہند امن کانفرنس کا اجتماع کلکتہ میں ہوا تھا۔ محترمہ رضیہ سجاد ظہیر بھی جو ترقی پسند جماعت سے بڑا اہم تعلق رکھتی ہیں، اس میں شریک ہوئی تھیں۔ انھوں نے اس کتاب میں اسی

رنس کی کاروائی پیش کی ہے، لیکن ایک ایسے دلچسپ انداز میں کہ وہ کانفرنس کی روداد تو کیا بالکل "روداد دل" ہو کر گئی۔
رضیہ سجاد ظہیر اس وقت کی خواتین میں، بہت مشہور فسانہ نگار ہیں اور یہ شہرت انھوں نے غلط حاصل نہیں کی لیکن کسی کانفرنس
ار روائی کو فسانہ بنا دینا یہ غالباً فسانہ نگاری سے زیادہ کچھ اور چیز ہے جسے نہ ہم تصنیف کہہ سکتے ہیں نہ تصحیف۔
یہ کانفرنس بجائے خود کیا تھی اور اس نے اس اجتماع میں کیا کام کیا۔ اس کی جستجو غالباً بے محل ہے، کیونکہ اس
ب کی اشاعت سے غالباً خود رضیہ سجاد ظہیر کا بھی مقصود یہ نہ تھا کہ اس حیثیت سے لوگ اس کا مطالعہ کریں، ورنہ وہ
ے اس انداز سے کیوں پیش کرتیں کہ پڑھنے والے کانفرنس کے بجائے خود انھیں کو دیکھنے لگیں۔
ضخامت ۹۶ صفحات، طباعت، کتابت وغیرہ معمولی۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ اردو کتاب گھر گورکھپور۔

نقد اقبال تصنیف ہے جناب میکش اکبرآبادی کی، جس میں انھوں نے اقبال کے نظریۂ تفلسف و تصوف سے بحث کی ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ بحث بڑی منصفانہ ہے۔
اس کتاب میں مسئلہ وحدت الوجود، افلاطونیت جدید، ویدانت، نظریۂ ابن عربی، افلاطون کے اعیان ثابتہ وغیرہ
ب کو سامنے رکھ کر بتایا ہے کہ اقبال کس چیز سے کس حد تک متاثر ہوئے اور ان کے کلام میں نظریاتی حیثیت سے جو
اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اس کے اسباب کیا ہیں۔
اقبال پر اس وقت تک متعدد کتابیں شایع ہو چکی ہیں، لیکن اپنے مخصوص موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب اپنی جگہ
خاص اہمیت رکھتی ہے اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب و تصنیف محض معتقدانہ شیفتگی کا نہیں
بلکہ صحیح ذوق نقد و جستجو کا نتیجہ ہے جس میں اس نشیب و فراز کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جہاں اقبال نے ٹھوکریں کھائی
ہیں۔ کتاب کی طباعت و کتابت بہت اچھی ہے اور تین روپیہ میں خود مصنف سے میوہ کٹرہ آگرہ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

جیبی فارماکوپیا انسان کی صحت زندگی کا اہم ترین مسئلہ ہے اور بدقسمتی سے اسی پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ بقاء صحت کے لئے یہی ضروری نہیں ہے کہ طبی امداد ہم کو آسانی کے ساتھ ہر وقت روز ایسال سکے
بلکہ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہر شخص خود بھی اصول صحت سے واقف ہو اور ایک حد تک مرض کو سمجھ خود دفع
مرض کی تدابیر کر سکے۔
مغرب کی زبانوں میں تو ایسی کتابیں بہت ہیں جو "فیملی ڈاکٹر" کا کام دیتی ہیں لیکن اردو میں بہت کم ہیں۔
ہمارے عزیز دوست حکیم اقبال حسن صاحب لاہوری نے اسی ضرورت کے پیش نظر یہ کتاب شایع کی ہے۔
اس میں مصنف نے تمام امراض کے نہایت آسان و ارزاں نسخے یکجا کر دئے ہیں جو خود ان کے خاندان کے تجربہ میں
آچکے ہیں۔ اس میں ایک باب کشتہ جات کا بھی ہے اور دوسرا علاج بالغذا کا بھی۔ ضرورت ہے کہ یہ کتاب ہر گھر
میں رہے تاکہ وقت ضرورت معمولی معمولی امراض کا علاج خود کر سکے اور ڈاکٹری علاج کے غیر معمولی مصارف سے
بچ سکے۔ یہ کتاب پانچ روپیہ میں دفتر رسالہ "اسرار حکمت"، داتا گنج بخش روڈ لاہور سے مل سکتی ہے۔

تحفۂ احسن مرحوم مولانا احسن مارہروی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے بچوں کے لئے بعض کہاوتوں اور مثلوں کو منظوم صورت میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک سو سے زیادہ ضرب الامثال پائی جاتی ہیں اور اس میں شک نہیں
کہ ان میں سے اکثر اس طرح نظم کی گئی ہیں کہ تکلف و تصنع کا پتہ نہیں چلتا، لیکن بعض امثال کے نظم کرنے میں وہ کامیاب نہیں
ہوئے یہاں تک کہ کہیں کہیں مصرعے وزن سے بھی خارج ہو گئے ہیں۔ ایسی نظموں کو شایع نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ ضخامت ۔۔ صفحات
۔ ملنے کا پتہ:۔ کاشانہ اردو۔ ۱۸۸ اے پی۔ پاکستان ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی۔

جون

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۶۶

نگار

ہندوستان پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

غلطی کی تصحیح	مضمون "ہندوستان کی آبادی" (صفحہ ۲۴) کی میزان میں غلطی ہوگئی ہے در اصل کل آبادی ۳۶۰۲۷۳۳۹۴ ہے اور مسلم آبادی ۳۶۴۷۷۸۴۱ ہے

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

مئی کے "نگار" میں ہم کافی وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ نگار کا آیندہ سالنامہ

"فرمانروایانِ اسلام" نمبر ہوگا

اور اس کی بعض خصوصیات کو بھی ظاہر کر چکے ہیں، لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے بعض حضرات اس کی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکے ہوں، ہم مکرر اس کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ سالنامہ در اصل "تاریخ اسلامی" کا نچوڑ ہوگا، جس میں ولادتِ رسول اللہ سے لیکر اس وقت تک کی تمام چھوٹی بڑی مسلم حکومتوں کا ذکر ہوگا جو ۱۳ سو سال کے اندر تمام کرۂ ارض پر رونما ہوکر فنا ہوگئیں یا اب بھی باقی ہیں۔ اس میں ان تمام حکومتوں کے اسباب قیام و عروج اور انحطاط و اختتام کے ذکر کے ساتھ، تمام حکمرانوں کے نام، ان کی حکومت کی مدت بقید سن ہجری وعیسوی درج ہوگی اور یہ بتایا جائے گا کہ ایک ہی خاندان سے اور کتنے خاندان پیدا ہوئے، انھوں نے کہاں کہاں حکومتیں کیں اور ان کا کیا حشر ہوا۔

مسلمان اپنے زمانۂ عروج میں یوروپ، ایشیا، افریقہ کے ان بعید ترین گوشوں تک پہونچ گئے تھے جن کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کا علم بہت کم حضرات کو ہے۔ نگار کے اس سالنامہ کے ذریعہ سے تاریخ اسلام کی انھیں مفید و دلچسپ معلومات کو پیش کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ دو نقشے ایسے پیش کئے جائیں گے جن کو دیکھ کر مسلمانوں کے عروج و زوال کی تصویر آپ کے سامنے آجائے گی۔

یہ پورا سالنامہ خود اڈیٹر نگار مرتب کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ہم پہلی جنوری ۱۹۵۴ء تک اسے شایع کر سکیں گے اس کی ضخامت کا صحیح اندازہ ابھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی بابت غالبًا ہم آیندہ کچھ کہہ سکیں گے۔ امید ہے کہ آپ اس کی توسیع اشاعت میں ضرور حصہ لیں گے اور اپنے حلقۂ احباب، مدارس کے طلبہ و اساتذہ کو بھی اس سالنامہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کریں گے۔

یہ سالنامہ در اصل ایک مستقل کتاب ہوگی اور کتاب ہی سمجھ کر اس کو حاصل کرنا چاہئے۔

جو حضرات نگار کے خریدار نہیں ہیں اور صرف سالنامہ ہی لینا چاہیں گے ان کے لئے اس کی قیمت (علاوہ محصولڈاک) تین روپیہ ہوگی۔

ایجنٹوں کو اپنا آرڈر جلد دیدینا چاہئے، تاکہ اسی حساب سے اس کی کاپیاں زاید طبع کرائی جائیں۔

آیندہ اشاعتوں کے بعض نہایت اہم و دلچسپ مضامین

اس ماہ کی اشاعت سے محمد اسحاق صاحب صدیقی کی "فنِ تحریر کی ایجاد" کی نہایت دلچسپ و مفید مضمون کا سلسلہ شروع ہوا ہے، یہ مضمون صرف تمہید ہے۔ محمد اسحاق صاحب صدیقی آیندہ جولائی کی اشاعت میں بتائیں گے کہ فن تحریر کی ایجاد سے قبل انسان کیونکر تبادلۂ خیال و اظہار جذبات کرتا تھا، اور اس مقصد کے لئے کتنے عجیب و غریب طریقے انسان نے پیدا کئے تھے، اسی سلسلہ میں وہ زمانۂ قدیم کے تصویری رسم خط کا ذکر کریں گے، جو کیکانی، ہیروغلفی (مصر، چینی، مایانی) اور وادی سندھ کی تحریروں پر مشتمل ہوگا۔ اور اس کے بعد وہ حروف کی ایجاد اور ان کی نشر و اشاعت سے بحث کریں گے جو سامی، یونانی اور براہمی شاخوں کے رسم خط سے متعلق ہوگی۔

آخر میں وہ آلات و ذرایع تحریر یعنی کاغذ، سیاہی و قلم وغیرہ کی ایجاد پر روشنی ڈالیں گے۔ یہ سلسلہ دسمبر ۵۳ء تک ختم ہو جائے گا۔ جناب محمد اسحاق صدیقی کا ایک سلسلۂ مضامین اعداد و حروف ہجا پر بھی ۵۲ء کے متعدد پرچوں میں شایع ہو چکا ہے جسے ارباب علم نے بہت پسند کیا۔ اب یہ نیا سلسلہ اس سے زیادہ دلچسپ و مفید ہے اس لئے ہمیں امید ہے کہ قارئین نگار اس سلسلہ کے تمام مضامین کو جو بیش بہا معلومات پر مشتمل ہوں گے اپنے پاس محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس مقالہ کے علاوہ بعض نہایت دلچسپ اور ادبی مقالے مومن، حالی اور درد پر بھی سلسلہ وار شایع ہوں گے۔

پاکستان کے خریدارانِ "نگار"

از راہ کرم مدت خریداری ختم ہونے پر بغیر کسی تقاضہ و یاد دہانی کے اپنا چندہ ذریعہ منی آرڈر ذیل کے پتہ پر بھیجدیا کریں اور رسید منی آرڈر جو ڈاک خانہ سے ملتی ہے اسے ہمارے پاس براہ راست ہمارے پاس بھیجدیں۔ اس طرح ان کو پرچہ بروقت اور جلد ملتا رہے گا۔ آپ کو چندہ کے اختتام کی اطلاع نگار ہی کے ذریعہ سے دیجاتی ہے۔ اگر آپ نگار کے صفحۂ فہرست پر داہنی طرف صلیب کا نشان دیکھیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کا چندہ ختم ہو گیا اور اولین فرصت میں منی آرڈر روانہ کر دیں

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی - کراچی

(مطبوعات نگار بھی اسی پتہ سے مل سکتی ہیں) منیجر نگار لکھنؤ

ایک غلطی کا ازالہ: پچھلے مہینے تلق میرٹھی پر جو مقالہ شایع ہوا ہے، اس میں ایک بڑی غلطی پائی جاتی ہے وہ یہ کہ سید تمکین کاظمی صاحب نے ایک جگہ لکھدیا ہے کہ یہ مشہور مصرعہ۔ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا"۔ تلق کا ہے۔ حالانکہ یہ مصرعہ درد کا ہے۔ افسوس ہے کہ مسودہ کو غور سے دیکھے بغیر میں نے کاتب کے حوالہ کر دیا۔ (نیاز)

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ جون میں ختم ہوگیا اور جولائی کا "نگار" آٹھ روپیہ سات آنے میں وی پی ہوگا جس میں سالنامہ ۵۴ء کی قیمت بھی شامل ہے

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۳	فہرست مضامین جون ۵۴ء	شمارہ ۶

ملاحظات

حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ

میرے ایک قدیم کرمفرما ہیں میری ہی عمر کے لیکن بالکل مجرد، زن و اولاد کے جھگڑے سے آزاد، نہایت زندہ دل، بڑے دلچسپ اور چونچال قسم کے انسان - ایک ہاتھ میں سونٹا - دوسرے میں تسبیح، بغل میں اخبار - سر برہنہ، جسم پر صرف کرتہ تہمد - یہ ہے ان کی وضع و ہیئت جو ان کی زندگی کا لازمی جزو بن گئی ہے - ان کا تنہا مشغلہ صرف اخبار دیکھنا ہے اور کبھی کبھی اپنے احباب کے پاس بیٹھ کر ان پر تبصرہ کرنا -

کل شام کو وہ مجھ سے ملنے آئے تو کچھ مضمحل سے تھے - میں نے پوچھا "میر صاحب آپ اداس سے کیوں ہیں، خیر تو ہے" - بولے:- "کیا پوچھتے ہو اسی خیر نے تو سارا کام بگاڑ رکھا ہے" میں کچھ سمجھا نہیں اور ان کا منہ تکنے لگا - کہنے لگے :- "دیکھتے ہو آجکل زمانہ کا رنگ! - اخبار کیا دیکھتا ہوں بے نمک کی ابلی ہوئی ترکاری کھاتا ہوں - جدھر دیکھو امن، سکون، شانتی کی پکار ہے، معلوم نہیں یہ "شانتی" ان مسخروں کی کیا لگتی ہے کہ ہر وقت اسی کا نام زبان پر رہتا ہے، کوئی پوچھے ان احمقوں سے کہ اگر آج ہر جگہ امن ہی امن ہو جائے تو دنیا رہنے کے قابل کب رہے، وہ تو کہئے انتظام خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ امن قایم ہونے نہیں دیتا ورنہ یہ دنیا والے تو کبھی کا کرۂ ارض کو تباہ و ویران کرکے رکھدیتے - ہائے ہائے، کیا شان خداوندی ہے، جلِ جلالہٗ، ایک طرف اس نے یہ کہا :- لوگو، مسجدیں بناؤ، مندر تعمیر کراؤ، خانقاہیں قایم کرو، دوسری طرف اوروں سے کہا کہ مسجدیں ڈھاؤ، مندر مسمار کرو، خانقاہیں لوٹو - چلئے قصہ ختم ہوا اور دنیا کی رونق ہمیشہ کے لئے قایم ہوگئی - بھئی بُرا ماننا لیکن سچ کہتا ہوں کہ نہرو مجھے بالکل پسند نہیں، جہاں کہیں لڑائی کا خطرہ ہوگا، یہ حضرت ضرور امن کا جھنڈا لیکر سامنے آجائیں گے، کوئی پوچھے کہ آپ کو پرائے پھٹے میں پاؤں ڈالنے سے کیا فایدہ آپ کو کیا اگر کوریا کی لڑائی بند نہیں ہوتی، آپ کو کیا تکلیف ہے اگر چین کو یو - ان - او میں شامل نہیں کیا جاتا - اور تو اور - اب آپ مصر و برطانیہ کا جھگڑا طے کرانے

کی فکر میں ہے۔ اس سے زیادہ کھلی ہوئی بغاوت خدا سے اور کیا ہو سکتی ہے۔"

میں نے کہا کہ :۔ "آپ تو اسٹالین کی بڑی تعریف کرتے ہیں، لیکن امن کی آواز تو اس نے بھی بلند کی تھی"۔ بولے :۔ "اس میں شک نہیں مجھے اسٹالین بہت پسند تھا اور گو اس نے بھی "امن" کی آواز بلند کی تھی لیکن یہ آواز اس کے منہ کچھ دھواں دیتی ہوئی نکلتی تھی اور اس کی کسی بات کا دنیا کو یقین نہ آتا تھا۔ مالنکوف کے تیور کچھ اور ہیں اور یہ احمق غالباً سچ مچ امن کا خواہاں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ تو کہیئے کہ اسٹالین کی دھاک ابتک بیٹھی ہوئی ہے اور دُنیا کو مالنکوف میں بھی اسٹالین ہی کا بھوت نظر آتا ہے، ورنہ یہ کوریا کے جھگڑے کا چراغ بھی گُل ہو جاتا اور دنیا بالکل تاریک ہو جاتی"۔

میں نے کہا :۔ "میر صاحب، یہ تو خیر اس دُنیا کی باتیں ہیں جس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ آپ تو یہ بتایئے کہ ہندوستان و پاکستان کے موجودہ حالات کو آپ کیسا سمجھتے ہیں"۔

جھومتے ہی بولے :۔ "بہت بُرا، اپریل تک تو پاکستان کے حالات کافی امید افزا تھے، لیکن اب وہاں بھی سناٹا ہے، لاہور کی فوجی حکومت ختم ہو گئی اینٹی احمدی تحریک دب گئی۔ لوگوں کی سزائے موت کو قید میں بدل دیا گیا، ناظم الدین کو معزول کر دیا اور وزیر اعظم بنا دیا محمد علی کو جس نے انتظام ہاتھ میں لیتے ہی کہہ دیا کہ "نہرو میرے بڑے بھائی ہیں" گویا نہرو بھی کوئی ایسی چیز ہیں جن کے بھائی بننے پر فخر کیا جا سکتا ہے"۔

میں نے پوچھا "کیا نہرو کو بھی آپ اچھا نہیں سمجھتے"۔ میر صاحب بولے :۔ "بڑے اچھے، کیا کہنا، یہ امن کا سارا فساد تو انھیں کا لایا ہوا ہے، یہ نہرو وہی تو ہیں جنھوں نے سب سے پہلے "نا جنگی" کی تحریک پاکستان کے سامنے پیش کی اور ناظم الدین نے اس پر کان نہ دھرا، غالباً یہ تحریک بھی نہرو ہی کی تھی کہ کشمیر کا مسئلہ آپس میں گفتگو کر کے طے کر دیا جائے، لیکن جب تک لیاقت علی خاں زندہ رہے وہ اس کے جواب میں گھونسہ دکھاتے رہے اور ان کے بعد جب ناظم الدین آئے تو انھوں نے بھی اس پر کوئی توجہ نہ کی ــــ لیکن اب محمد علی صاحب تشریف لائے ہیں تو یہ سارا کیا دھرا خاک میں ملا دینا چاہتے ہیں، عبد القیوم خاں سے البتہ کچھ امیدیں وابستہ ہیں، لیکن غریب تنہا وہ کیا کر سکتا ہے۔ مجھے تو محمد علی پر حیرت آتی ہے کوئی ان سے پوچھے کہ بندۂ خدا، پاکستان و ہندوستان میں اگر میل ہو گیا تو پھر بقول میر "منہ پر دوپٹہ تان کر سو رہئے" کے علاوہ اور کیا کام رہ جائے گا ــــ لوگ آزادی کے ساتھ ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان آنے جانے لگیں گے، ریلیں جاری ہو جائیں گی، پاسپورٹ کی دشواریوں میں کمی ہو جائے گی، آپس کی تجارت آسانی سے ہونے لگے گی متروکہ جایدادوں کے جھگڑے طے ہو جائیں گے۔ لیکن یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ سوئی ہوئی، ویران، سنسان! ۔ انسان کی ذہنیت خطرہ ہی کے ساتھ بیدار ہوتی ہے اور خطرہ دور ہوتے ہی سو جاتی ہے، سائنس ہمیشہ تلواروں ہی کے سایہ میں ترقی کرتی ہے۔ اگر پچھلی دو لڑائیاں نہ ہوئی ہوتیں، تو قدرت کے بہت سے چھپے ہوئے راز بدستور چھپے رہتے، نہ فنِ پرواز میں ترقی ہوتی، نہ نئے نئے عناصر دریافت ہوتے، نہ جوہری قوت کا علم لوگوں کو حاصل ہوتا۔"

میں نے ان کو روک دیا کیونکہ اب انھوں نے سائنس پر لکچر شروع کر دیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ جب اس موضوع پر ان کی زبان ایک بار کھل جاتی ہے تو مشکل سے رُکتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ :۔ "میر صاحب، آپ موضوع سے ہٹے جاتے ہیں، میں تو صرف ہندوستان و پاکستان کی سیاسیات پر آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں"۔ یہ کہکر ان کا جوش ٹھنڈا ہوا اور ایک آہ سرد کے ساتھ فرمایا کہ :۔ "بھئی میں کیا رائے دوں، مجھے تو اب آثار بہت بُرے نظر آتے ہیں۔ پاکستان میں جو سردی پیدا ہو گئی ہے اس کا حال آپ کو معلوم ہی ہے، وہاں سے کوئی ایک خبر بھی ایسی نہیں آتی جس سے ان کی زندگی کا پتہ چلے ــــ ہندوستان کے اندر البتہ اس دوران میں مہا سبھائیوں اور جن سنگھیوں کی طرف سے کچھ امیدیں قائم ہو چلی تھیں، لیکن وہ بھی کچھ نہ نکلے :ــــ

یہ حسینانِ جہاں بھی دلربا کہنے کو ہیں ــــ"

میں نے پوچھا :۔ "میر صاحب، اگر آپ کو پاکستان کا وزیر اعظم ــــ یا فرمانروا بنا دیا جائے تو آپ کیا کریں"۔

جوش میں آکر بولے :۔ "سب سے پہلے تو میں ان لوگوں کی سزائے قید کو جن کو فوجی قانون نے سزائے موت دی تھی، پھر سزائے موت میں تبدیل کر دوں تاکہ ملک میں شورش و اضطراب کی لہر دوڑ جائے اور پاکستانی فوج و پولیس جو چڑھی ہوئی اونگھ رہی ہے، پھر چونک پڑے۔ اس کے بعد کشمیر کے مسئلہ کو سکیورٹی کونسل سے ہٹا کر ہندوستان کو مقابلہ کا کھلا ہوا چیلنج دیدوں تاکہ برسوں سے جو یہ گھِس گھِس ہو رہی ہے کسی طرح ختم ہو"ــــ

میں نے پوچھا :۔ "اور اگر آپ کو اس لڑائی میں شکست ہو گئی تو پھر کیا ہوگا"۔

بولے :- " جو کچھ بھی ہو - لڑنے والے یہ نہیں سوچا کرتے، ان کا مسلک صرف یہ ہے کہ :-

آنکس کہ جاں ستاند و جاں می دہد یکے ست

میں نے کہا :- " میر صاحب، آپ تو غالباً نسلاً سید ہیں "

بولے :- " غالباً، کیا یقیناً "

میں نے پوچھا :- " آپ انھیں علویین کی نسل سے تو نہیں جو صرف حاجیوں کے قافلے لوٹ لوٹ کر زندگی بسر کرتے تھے، ہوسکتا ہے کہ آپ حسین بن علی کی اولاد میں سے ہوں جس نے مدینہ پر حملہ کرکے اسے تباہ کردیا تھا، یا حسین الافطس اور ابراہیم بن موسیٰ کی نسل سے تعلق رکھتے ہوں، جن کا سے بڑا کارنامہ کعبہ کو لوٹ لینا تھا " میر صاحب نے نہایت حسرت سے فرمایا : " کاش میں انھیں میں سے ہوتا " اور اُٹھ کر چلے گئے۔

ن ترقی اُردو ہند کا ایک بڑا کارنامہ

ہماری قوت عمل اس قدر ضعیف ہوگئی ہے کہ اول تو کسی کام کا ارادہ ہی نہیں ہوتا اور اگر ہو بھی جائے تو اس کا پورا ہونا گویا " ہفت خوان " طے کرنا ہے - جسوقت انجمن ترقی نے اُردو کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ یو-پی کے اُردو بولنے والوں میں سے کم سے کم ۲۰ لاکھ آدمیوں کے دستخط حاصل کرنا ضروری تو اس وقت میں بھی اس جلسہ میں شریک تھا، لیکن مجھے یقین نہ تھا کہ انجمن اس کام کو پورا کرسکے گی۔

اس کے لئے نہ صرف روپیہ کی ضرورت تھی بلکہ پرجوش کام کرنے والوں کی بھی اور میں ان دونوں کی کمی محسوس کرتا تھا، لیکن خیر، یہ تجویز کاغذ پر اور اسلوب کار کے لئے ایک کمیٹی مقرر کرکے اس کا اہتمام و انصرام حیات اللہ صاحب انصاری کے سپرد کردیا گیا۔ یہ کئی مہینے اس طرف کی بات ہے۔

اس دوران میں اس کام کی تکمیل کے لئے حیات اللہ صاحب اور ان کی بیگم نے کیا کیا تدابیر اختیار کیں، کس طرح کام شروع کیا گیا، اسے کیونکر آگے بڑھایا گیا، تقسیم عمل کے لئے وہ مختلف اضلاع و قصبات میں ۸۰۰ شاخیں قائم کرنے میں کیسے کامیاب ہوگئے، روپیہ کہاں سے آیا، کام کرنے والے کس طرح ہوگئے، یہ ایک بڑی داستان ہے اور اب کہ یہ کام پورا ہوچکا ہے اور ۲۰ لاکھ سے زیادہ دستخط حاصل ہوچکے ہیں، غالباً اس کے شرح و بیان کی ضرورت بھی نہیں - لیکن غالباً ناشکری ہوگی اگر ان لوگوں کی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے، جن کی سعی و کوشش سے یہ کام انجام تک پہونچا۔

لکھنؤ کی انجمن ترقی اُردو کے صدر پنڈت کشن پرشاد کول ہیں اور جنرل سکریٹری حیات اللہ صاحب انصاری اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر یہ ان کی جگہ کسی اور کے سپرد ہوتے تو اس کام کا تکمیل تک پہونچنا ممکن نہ ہوتا۔ ان دونوں حضرات نے جس جوش و خلوص، جس نظم و ترتیب کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیا اس کی مثالیں ہم کو دنیائے عمل میں بہت کم ملتی ہیں۔

۲۰ لاکھ دستخط حاصل کرلینا، یوں تو بظاہر کہنے میں بہت آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن جب کرنے پر آئے تو پتہ چلے کہ عملی حیثیت سے یہ کس قدر دشوار اور اگر کسی نہ کسی طرح دستخط حاصل کر بھی لئے جائیں، تو ان کو دفتری تہذیب و سلیقہ کے ساتھ ایک قابل اعتماد دستاویزی شکل میں لے آنا کس قدر صبر آزما ہے - لیکن آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ آٹھ سو شاخوں سے خط و کتابت کرنے، ان کو وقتاً فوقتاً ہدایات دینے، تبلیغی لٹریچر فراہم کرنے، ان کے کام کا احتساب رہنے اور پھر مرکزی دفتر میں تمام کاغذات کو باقاعدہ مرتب رکھنے کی تمام تر ذمہ داری ایک خاتون (بیگم حیات اللہ انصاری) نے اپنے سر لی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اسے انجام دیا کہ شاید حکومت کا کوئی سکریٹری بھی اس طرح انجام نہ دے سکتا۔

اس وقت درجنوں کلرک ہیں جو ان کے زیر ہدایت کام کر رہے ہیں اور ریکارڈ کے فایل کامل تنقیح کے بعد الماریوں میں حفاظت کے ساتھ رکھے جا رہے ہیں تاکہ انھیں عرضداشت کے ساتھ صدر جمہوریہ کے سامنے پیش کیا جائے۔

اب دستخطوں کے حاصل کرنے کا سلسلہ بند کردیا گیا ہے اور جو کام ہوچکا ہے اس کو سمیٹا جا رہا ہے، عرضداشت کا مسودہ بھی مرتب ہوچکا ہے ایک وفد اس عرضداشت اور ریکارڈ کو لے کر صدر جمہوریہ کی خدمت میں جانے والا ہے - ہمیں امید ہے کہ اُردو علاقائی زبان تسلیم کرلی جائے گی لیکن اگلی منزلیں بہت دشوار گزار ہیں، تاہم مایوسی کی کوئی وجہ نہیں اور ہم کو یقین رکھنا چاہئے کہ ہم جلد یا بدیر صحیح منزل مقصود تک ضرور پہونچیں گے۔

اکبر الہ آبادی پاکستان اور ہندوستان کی نظر میں

کسی فنکار کے ساتھ جب کسی خاص طبقہ کی خوش عقیدگی بڑھ جاتی ہے تو تنقید میں غلطیاں پیدا ہونے لگتی ہیں، مثلاً
ہی کے بعد پاکستان میں جو ادبی تجدید کا نیا دور شروع ہوا تو اس میں بھی ملک و ملت کے تنگ زاویہ کو سامنے رکھا گیا
سے ادب کو یقیناً نقصان پہونچا۔

اکبر پرستی بھی اسی تحریک کا ایک حصہ ہے، درجنوں مضامین، رسالے اور کتابیں اکبر پر لکھی جاتی رہی ہیں اور ان سب میں
اسلام دوستی اور ماضی سے وابستگی کو کھینچ تان کر یہ ثابت کر دیا جاتا ہے کہ وہ ایک عظیم شاعر تھے اور اس طرح ان کی شاعری
ت ایک رُخ پیش کر کے تنقید کو تقریظ بنا دیا جاتا ہے۔

اکبر کا احترام ہندوستان میں بھی ہوتا ہے۔ یہاں بھی شخصی اثرات سے متاثر ہو کر اکبر کے معائب سے چشم پوشی کرنے والے
ود ہیں اور ان سے الگ ہو کر اکبر کو بطور ایک انسان اور شاعر کے دیکھنے والے بھی۔ لیکن پاکستان کے لکھنے والے تقریباً یہاں کو
تعلق رکھتے ہیں، وہ سب مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ "اکبر فطرت کی جانب سے رسول ہو کر
تھے۔ ان کا پیغام اسی تحریک مغربیت کا ردِعمل تھا اور ان کی شاعری اول سے آخر تک اسی مادیت پرستی کا جواب ہے"۔ وہ
کو اقبال کی صف میں کھڑا کرتے ہوئے اُسے شاعر انقلاب تسلیم کرتے ہیں، اور ان کی شاعری کو پیامی مان کر اُسے کامیاب بتاتے
۔ مخمور اکبر آبادی اپنے مضمون "کیا اکبر رجعت پسند تھا" میں لکھتے ہیں کہ "اکبر کی تلقین جو اصل میں تلقین نہیں تجدید ہے،
پسندی کا جواز ہے"۔ گویا اکبر ان کے نزدیک ترقی پسندی کا پیش رو ہے، ایک باغی فلسفی شاعر ہے۔ کہیں وہ اسے غالب سے
ہ حقیقت نگار بتاتے ہیں تو کہیں اس کی مذہبیت کو ہومر، ملٹن، تلسی داس، ایلیٹ کی مذہبیت سے مماثلت دیتے ہیں اور کبھی
بھی کہہ دیتے ہیں کہ "ہند و پاکستان کی آزادی کی تاریخ میں شعر و ادب کا جب ذکر آئے گا تو اکبر الہ آبادی کا نام سرفہرست ہوگا"

ہندوستان کے لکھنے والوں نے اکبر کی شاعری کو زندگی کے جاں بخش زاویۂ نظر سے جانچا تولا ہے، ان کے یہاں نہ تو اکبر کے
ب سے چشم پوشی ملتی ہے نہ اُس کے محاسن کے بیان میں غلط بیانیاں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنے مضمون "اکبر پر ایک نظر"
لکھتے ہیں :۔ "اکبر مشاق غزلگو اور روایتی قسم کے صوفی تھے۔ الفاظ کے الٹ پھیر سے ہنساتے تھے۔ جاگیرداری نظام کے لائے ہوئے
ربی خیالات اور طور طریقوں سے بدگماں، سرسید کے مخالف، ترقی پسند رجحانات سے خائف اور عورتوں کی تعلیم و آزادی کے دشمن تھے"

دیکھئے صفحہ ۹ - "اکبر اس دور میں"
دیکھئے صفحہ ۱۶، ۲۴، ۲۸ "اکبر کے نکتہ چیں" از پروفیسر محمد طاہر فاروقی (اکبر اس دور میں)
دیکھئے صفحہ ۷۱ - ("اکبر اس دور میں")
دیکھئے صفحہ ۲۶۹ - (" ") اکبر اور تنقید حیات از سلطان برقی
دیکھئے صفحہ ۱۰۶ - (" ") جزولیت از پیغمبری از ماہر القادری
دیکھئے صفحہ ۷ - علی گڑھ میگزین اکبر نمبر - ۱۹۵۰

اس مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کیا واقعی اکبر ایک عظیم شاعر تھے اور ان کا کلام ادب اُردو میں اُس مقام کا حقدار ہے جو پاکستان والے اُسے دینا چاہتے ہیں۔

کسی شاعر کو عظیم بننے کے لئے لازم ہے کہ اُس کا مشاہدہ وسیع و عمیق ہو تاکہ وہ ادب میں اپنے ماحول کی سچی ترجمانی کر سکے، اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حقیقت نگاری کو موثر بنانے کے لئے وہ جذبۂ خلوص بھی رکھتا ہو، حقایقِ حیات کا جاں بخش تجزیہ بھی کر سکے، اعلیٰ فکر و تخیل کا مالک ہو اور اس کا اندازِ بیان بھی دلنشیں صاف اور سادہ ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اکبر ان شرائط پر کس حد تک پورے اُترتے ہیں۔

ہندوستان و پاکستان کے نقاد اس حد تک تو متفق نظر آتے ہیں کہ اکبر مشاہدہ کی قوت رکھتے تھے۔ شاعرانہ انداز میں انھوں نے اپنے زمانہ کی معاشرت کی نہایت دیانتداری سے ترجمانی کی ہے۔ ان کے کلام میں مسلمانانِ ہند کی اخلاقی قدروں، حکومت کی جیرہ دستیوں، قومی پریشانیوں، تہذیبی انحطاط اور قدیم و جدید کی کشمکش کی واضح تصویریں ملتی ہیں۔ اور اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ اکبر کی شاعری میں اس زمانہ کی روح پوری طرح کھنچ آئی تھی اور اس کے نقش و نگار اتنے روشن ہیں کہ اکبر کی شاعری کی تاریخی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ اس کی داد دیتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنے مضمون "اکبر پر ایک نظر" میں لکھتے ہیں[1] :-

"اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی ہماری پوری داستان حوصلہ و ہوس کی، الفت و آویزش کی، شور و سکوت کی، سود و زیاں کی اکبر کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔ کہیں خفی، کہیں جلی، کہیں شگفتہ کہیں حزیں لیکن ہر جگہ دلنشیں۔ اس عہد کے شعار و شعور کو سمجھنے کے لئے اکبر کے کلام سے ہر طرح کی مدد لی جاسکتی ہے۔ شاید اتنی قیمتی مدد کہیں اور سے حاصل بھی نہیں ہو سکتی۔"

اسی کے ساتھ اکبر کا خلوص بھی مسلّم ہے۔ ان کے یہاں سچے جذبات کی کمی نہیں۔ وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ جو قوم کی زبوں حالی کے دکھ سے معمور تھا۔ وہ ظریف ضرور تھے لیکن مجموعی طور پر ان کا کلام ملّت کے غم میں ڈوبی ہوئی ایک آہ ہے ؎

عقاید پر قیامت آئے گی ترمیم ملّت سے　　نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر　　بہت نزدیک ہے وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

وہ عوام کی ماضی سے بے تعلقی اور اسلامی تہذیب کی گرتی ہوئی دیوار کو دیکھ کر بے اختیار ہو جاتے تھے۔ انھوں نے جو کچھ بھی کہا، دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہا۔

اکبر کے خلوص کی اہمیت اس لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کے سامنے کسی انفرادی آسودگی نہیں بلکہ اجتماعی آسودگی کا سوال تھا اور یہی وہ احساس ہے جو بقول اقبال "سِل کو دل بناتا ہے" لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا اکبر اس دل کو آنکھ بھی دے سکے یا نہیں اور ایسا نہ کرنے سے ان کی عظمت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہونچ کر پاکستان کے ادیب حقایق سے چشم پوشی کر جاتے ہیں۔ یہ بتانے کے لئے کہ اکبر کی شاعری دل کو رونے رُلانے کے علاوہ اُسے حیاتِ نو کا مژدہ کیوں نہیں سناتی اُسے تیرہ و تار خانقاہوں کی طرف کیوں لے جاتی ہے ؟ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اکبر کی شاعری نے کشمکش کے اس نازک دور میں آنکھ کھولی تھی جبکہ قوم یاس و انحطاط کے انتہائی نقطہ پر پہونچ چکی تھی اور عوام کے رہے سہے جذبۂ آزادی و قوتِ عمل کو غدر کی ناکامی شل کر چکی تھی۔ سیاسیات معاشیات اور تہذیب میں بتدریج انقلاب آرہا تھا۔ حال سیہ پوش تھا، مستقبل کی خبر نہ تھی۔

---

[1] دیکھئے ص ۱۱ - علی گڑھ میگزین اکبر نمبر ۱۹۵۱ء

تعلیمی پستی کی وجہ سے فکری صلاحیتیں ناپید تھیں، ایسی حالت میں مذہب اور ماضی کا تصور قوم کے لئے بہت کچھ تسکین کا باعث تھا پھر خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی کہ اکبر نے اس کا بہت زیادہ اثر قبول کیا۔ اور خانقاہیت و روایت پرستی کو انھوں نے ایسا جزیرہ سمجھ لیا جہاں انھیں زمانے کے تھپیڑوں سے نجات مل سکتی تھی۔ نئی روشنی میں اکبر کو اپنے ماضی، اپنے مذہب اور اپنے اخلاق سب کا خون نظر آتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ مشرقیت کی برتری کی جتنی بحث انھوں نے کی ہے وہ مغرب کے داخلی پہلو کو نظر انداز کرکے کی ہے۔ ہمیشہ وہ مغرب کی خارجیت سے مشرقیت کا موازنہ کرتے رہے اور مغرب کا کوئی واضح تصور قایم نہ کرسکے۔ انھوں نے صرف بے پردگی، پتلون، کوٹ، ٹائی اور چھری کانٹے کو مغربی کلچر سمجھا، اس لئے ان کے ہاں مفکرانہ سنجیدگی کی وہ شان پیدا نہیں ہوسکی جو ایک اعلیٰ شاعر کے لئے درکار ہے۔ پرانی قدریں اقبال کو بھی عزیز تھیں۔ لیکن مغرب کے محاسن سے انھوں نے کبھی چشم پوشی نہیں کی۔ ٹیگور کو بھی اسی کشمکش کا سامنا تھا لیکن شانتی نکیتن میں ویدانت اور مغربیت دونوں کی روح جھلکتی ہے۔ راجہ رام موہن رائے بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جس سمجھ بوجھ سے یہ سب مشرقیت و مغربیت کو ملاتے ہیں وہ اکبر کے ہاں مفقود ہے۔ یہ سچ ہے کہ اکبر نے[1] اس دھوپ میں بال سفید کئے تھے جس نے سلطنت اسلامی کا باغ خشک کردیا تھا؟ لیکن یہ چمکتی دھوپ ان کے قریب لہرے کی ایک دبیز چادر بن گئی تھی۔ جس کے پار ان کی نظر جا ہی نہ سکی۔

اکبر کو ہر اس چیز سے شدید نفرت رہی جو نئی روشنی اپنے ساتھ لائی تھی۔ ریل تار۔ بجلی۔ حجاب، ٹائپ، پائپ۔ مشین، لباس، ٹب، صابن، انجن، انگریزی تعلیم، ٹم ٹم، بائیسکل سب نئی چیزوں سے ان کی مشرقیت کو خطرہ تھا۔

وہ جانتے تھے کہ زمانہ بدل رہا ہے اور اسے نئی قدریں عزیز ہیں۔ لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور رہے۔ گو زندگی کی تلخ حقایق کی نقاب کشائی انھوں نے کی لیکن کہیں گرمی محفل کے لئے اور کہیں صرف تماشائی کی حیثیت سے۔ مولوی سید ممتاز علی کو ایک خط میں لکھتے ہیں[2] :-

"شعرا قافیہ پیمائی ہی کیا کرتے ہیں۔ دنیا کے قوانین شعر سے نہیں چلتے۔ زمانے کا رنگ، زمانے کی ضرورتیں فیصلہ کرتی ہیں اور اس وقت بھی کر رہی ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ شعر انقلاب کو روکنے کے لئے نہیں بلکہ یادگار انقلاب ہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں زندگی کی وہ خلش نہیں ملتی جو نہاں خانۂ دل کو گرما دیتی ہے۔ حیات نو کی وہ تعبیر نہیں جو ادب میں ابدیت حاصل کرلیتی ہے ؎

برسوں فلاسفی کی چناں اور چنیں رہی — لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں — فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
ہم کو ان تلخ مباحث سے سروکار نہیں — ہم تو اک شوخ شکرلب کو لئے پھرتے ہیں

اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے کہ ؎

اکبر کی جو مانو، بیٹھ رہو — جو کچھ بھی ہو لیکن صبر کرو

یا ؎

مرنے سے مفر نہیں ہے اے اکبر — بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو

اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ اکبر فرار کے قایل تھے۔ وہ رجعت پسند تھے یا تنگ نظر تھے۔ سید احتشام حسین اپنے مضمون "اکبر کا ذہن" میں لکھتے ہیں[3] :-

---

[1] دیکھئے پیش لفظ از خواجہ حسن نظامی (اکبری اقبال)۔ [2] ص ۱۷۔ اکبر کے نکتہ چیں (اکبر اس دور میں)۔ [3] علی گڑھ میگزین۔ اکبر نمبر ۱۹۵۰ء

"وہ کسی مادی فلسفہ کا سہارا نہ ہونے کی وجہ سے اکبر کوئی اثباتی تجویز پیش نہ کر سکتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے زوال کی جستجو مادی حقایق میں نہیں اخلاقی کمزوریوں میں کرتے تھے۔ اس لئے وہ گھوم پھر کر پھر داخلی تصورات کی مدد سے خارجی حقایق کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ادراک حقیقت کا یہ طریقہ رجعت پسندی کی طرف لے جاتا ہے اور انسان کی اجتماعی اور عملی جدوجہد سے فلسفہ اور سائنس کے جو قابل عمل طریقے وجود میں آئے ہیں ان سے نظریں چراتا ہے"۔[1]

لیکن پاکستان کے ادیب اکبر کی اس فکری کمزوری اور تنگ نظری کو ظرافت کے پردہ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں سلیم احمد اپنے مضمون "اکبر کی تنگ نظری" میں لکھتے ہیں[2]:-

"اکبر طنز نگار شاعر تھے اور طنز نگاری کے لئے تنگ نظری غالباً اتنی ہی ضروری ہے جتنی تنقید کے لئے خشک دماغی یا اخبار نویسی کے لئے ابتذال۔ طنز نگار زندگی کو 'انسان' جوں کا توں قبول نہیں کرتا"۔

لیکن اکبر کے طنز میں جو جھلاہٹ اور تلخی ہے وہ اُن کی تصور پرستی کی غماز ہے جس نے ان کی نگاہ کو سطحی اور ان کی فکر کے دائرہ کو محدود کر دیا تھا۔ ان کی شاعری کے مواد کا تجزیہ کرنے سے یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

اکبر کی شاعری کی تمام تر بنیاد مغربیت و سرسید کی اندھا دھند مخالفت، مشرقی و مغربی عورت کے موازنہ اور روایتی مذہب پر قایم رہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں[3]:-

"ان کی شاعری کے مواد کے لئے روزمرہ کے مسایل اور کچھ خاص خاص اشخاص ہیں۔ جن کی خصوصیات وقتی طور پر فضا میں رہتی ہیں اور پھر زمانہ کی بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر ان ہی مسایل و اشخاص کو اور زیادہ اچھی لطافت کے ساتھ پیش کرتے تو غالباً فن اور اکبر دونوں ہمیشہ کی زندگی پا جاتے"۔

یہی وجہ ہے کہ حیات کے وسیع مسایل پر ہمیں اکبر کی شاعری میں کچھ نہیں ملتا۔ اور اکثر جگہ تو جان بوجھ کر انھوں نے زندگی کے حقایق سے چشم پوشی کی ہے۔ سرسید کی تحریک ان کی زندگی میں کامیاب ہو چکی تھی لیکن پھر بھی وہ اس کے مخالف رہے۔ جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کی چالوں کو دیکھتے ہوئے بھی وہ مہاتما گاندھی اور تحریک آزادی کو لغو سمجھتے رہے ؎

یہ پولیٹکل مرض[4]، یہ ہنگامہ ہے بے سود
اس سے کوئی چیز اپنی جگہ سے نہ ہلے گی

گو اس وقت تک اقبال، پریم چند، سرور اور چکبست اُردو ادب میں زندگی کے تعمیری میلانات کی راہ دکھا چکے تھے لیکن پھر بھی وہ "اودھر کو نہ پھرے جدھر کی ہوا تھی"۔ جلیانوالا باغ اور حادثہ کانپور سے تو جیسے وہ بے خبر ہی تھے ترک موالات کے سلسلہ میں ایک بار سروجنی نائیڈو الہ آباد تقریر کرنے آئیں اکبر کو بھی مدعو کیا گیا۔ ضعیفی کے باعث آنے سے معذور تھے۔ یہ شعر لکھ بھیجا:-

شمع کے سانچے بنیں گے موم تو دکھلایئے	رعلی میں حاضر کروں گا ہو تم تو دکھلایئے

اور ایسا کہنے پر وہ مجبور بھی تھے۔ یہ ان کی طبیعت کا رنگ تھا۔ جدوجہد، انقلاب اور انقلاب کی افادیت میں وہ شروع

---

[1] ص ۱۴۳- "اکبر اس دور میں"۔ [2] ص ۱۴۱- اکبر فنکار کی حیثیت سے - علی گڑھ میگزین - اکبر نمبر ۱۹۵۰ء
[3] صحیح لفظ "مرض" ہے۔ یا تو اکبر نے یہ لفظ غلط نظم کیا یا مصرع غلط نقل کیا گیا۔ (نیاز)

ہی سے اعتبار نہ رکھتے تھے ؎

ہرگز نہ مستقل سمجھ اس انقلاب کو ۔ رکھ راہ راست پھونکنے دے اِن کلاب کو

مشرقی و مغربی عورت کا موازنہ کرتے وقت بھی اکبر پھر وہی بنیادی غلطی کر جاتے ہیں یعنی دونوں کا محض خارجی موازنہ کرتے ہیں اور صرف لونڈر، اور ڈوائس پر طعنہ زن ہوکر وہ بیگم کی برتری ثابت کرتے ہیں۔

عورتوں کی تعلیم اور بے پردگی پر انھوں نے جابجا وار کئے ہیں لیکن یہ خود انھیں پر لوٹ جاتے ہیں۔ آل احمد سرورؔ لکھتے ہیں کہ[1]

"اکبر جب پردے کو تمکنت، اقبال، میاں پن، غیرت و محبت کی علامت بتاتے ہیں تو اُن کی مشرقیت میں جاگیردارانہ رئیسانہ و امیرانہ تمدن کی خوبصورت دکھائی دیتی ہے جو مردوں اور عورتوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ نظام اخلاق مقرر کرتی ہے اور آبادی کے نصف حصہ کو گھر کی چار دیواری میں ساز دلبری کا اسیر رکھتی ہے"۔

اس نظریہ کی تائید اکبر کی شخصی زندگی سے بھی ہو سکتی ہے۔ ان کا اپنی پہلی بیوی خدیجہ بی بی کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لینا ان کی بے رحمی، خود غرضی اور حاکمانہ تعصب کا کھلا ثبوت ہے۔ سید بشیر حسین کہتے ہیں :[2]

"خدیجہ بیگم ایک سادہ لوح، قبول صورت اور نہایت نیک طینت عورت تھیں۔ اکبر کی دوسری شادی کے بعد وہ اپنے دونوں لڑکوں سمیت "چک" میں شاید زمانہ جھیلتی رہیں، تا زیست انھیں اکبر منزل میں قدم رکھنے کی اجازت نہ ملی"۔

اکبر کی شاعری کا تیسرا اہم جزو مذہب ہے۔ ان کی نگاہ کی سطحیت اور ان کے تخیل کی کم مائیگی یہاں بھی بہت نمایاں ہے۔ گو وہ تصوف سے واقف تھے لیکن باطنیت کا سراغ ان کے ہاں بہت کم ملتا ہے۔ ان کا مذہب ظاہری رسوم اور خارجی پابندیوں کا مرکب ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے ایک دفعہ اکبر سے جبکہ وہ دہلی میں اُن کے مہمان تھے، غالبؔ کے مزار پر چلنے کو کہا۔ پوچھنے لگے کون غالب؟ خواجہ نے جواب دیا۔ وہ تو بہت مشہور شاعر تھے۔ خفگی کے لہجہ میں بولے، کیا وہی غالبؔ جنھوں نے یہ شعر کہا ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ۔ دل کے خوش کرنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

پس جو شاعر جنت کی حقیقت کا منکر ہوا۔ اُس کی قبر پر میں کیوں جاؤں؟[3]

مغربیت سے ان کی اندھا دھند مخالفت بھی ان کی اسی مذہبیت کا نتیجہ تھی۔ انھیں یقین تھا کہ مادیت اور سائنس کی روشنی میں مذہب اپنے پرانے روپ میں نہیں پنپ سکے گا لیکن چونکہ مذہب ان کے نزدیک قوم کی برائیوں کا واحد حل تھا اس لئے اس کے تحفظ میں انھوں نے آنے والی روشنی سے پیٹھ پھیر لی۔

اکبر مذہب کی صحت مند اقدار سے بے خبر تھے، اور اپنی اس کورانہ تنگ نظر مذہبیت کی وجہ سے انھوں نے خود کو مادی فلسفوں سے ہمیشہ دور رکھا۔ وہ کوئی اثباتی تجویز پیش نہ کر سکے۔ اور ان کا جوش و فن ذاتی سکون کی حدود سے آگے نہ بڑھا۔

پاکستان کے ادیب کہتے ہیں کہ اگر اکبر زندگی کے مسائل کا فلسفیانہ نقطۂ نظر سے مطالعہ نہ کر سکے، تو اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ملازمت کے فرائض سے انھیں فرصت نہ مل سکی۔ اس سلسلہ میں رشید احمد صدیقی کے چند جملے ملاحظہ ہوں:[4]

"بڑا شاعر کسی نظام کا زائیدہ اور پروردہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ خود ایک نئے نظام کا مبلغ اور مبشر ہوتا ہے ----

---

[1] دیکھئے ص ۱۰۳ - علی گڑھ میگزین اکبر نمبر - (اکبر کی ظرافت اور اس کی اہمیت)

[2] دیکھئے ص ۶۴ - " " " (اکبر کی لائف اور ان کا آرٹ)

[3] دیکھئے ص ۱۸ - " " " (معنوی استاد اکبر الہ آبادی)

[4] دیکھئے ص ۳ "اکبر میری نظر میں" - (علی گڑھ میگزین اکبر نمبر)

اچھا اور بڑا شاعر کسی مخصوص طبقہ یا مخصوص عہد کا شاعر نہیں ہوتا، وہ ہر طبقہ اور ہر عہد کا شاعر ہوتا ہے۔ ایسے شاعر کے ہاں آن ابد ہے اور ابد آن۔ وہ ماورائے وقت ہوتا ہے۔ شیری ہی نہیں ۔۔۔۔ شاعری بھی حقیقتِ ابدی ہے۔"

آگے چل کر کہتے ہیں :-

"حکومت شاعر کا آلۂ کار ہوتی ہے، شاعر حکومت کا آلۂ کار نہیں ہوتا۔"

اور بڑا شاعر تو زندگی کی بندشوں کے آگے کبھی سر بسجود نہیں ہوتا۔ اُس کے آگے تو ہمیشہ اپنی ایک منزل ہوتی ہے، ایک تعمیر ہوتی ہے، حیات افروز، مضبوط اور بھرپور! برخلاف اس کے اکبر دمِ واپسیں تک انگریزی راج کی جے پکارتے رہے۔ ان کی شاعری زندگی کی ترجمان تو ضرور ہے لیکن وہ صرف زندگی کی سطح چھوڑ کر رہ جاتی ہے۔ ان کے دل میں خلش اور کسک تو تھی لیکن ذہن کے دروازے ماضی کی کورانہ تقلید میں بند ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دماغ کا ایک حصّہ دوسرے سے ہمیشہ باغی رہا اور وہ دونوں میں کوئی ربط پیدا نہ کر سکے لیکن

"وقتوں اور ضرورتوں کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اکبر نہایت دور اندیش فنکار تھا جس نے اپنی صلاحیت کا صحیح اندازہ کر کے زمانہ کی دلچسپی اور ضرورت کو ظریفانہ انداز میں پیش کر کے خراجِ تحسین وصول کر لیا۔"[1]

اکبر کی مقبولیت کا راز ان کا طرزِ بیان ہے، یہ مسلّم ہے کہ اردو شاعری میں اکبر پہلے شاعر ہیں، جنھوں نے آرائشِ خیال صرف ظرافت کی حد سے کی۔ اور بحیثیت ایک مزاح نگار کے اردو میں وہ ایک مستقل مقام رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں بھی اکبر سائنس، تسخیرِ فطرت، فلسفہ اور ارتقائے انسانی کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں، طنز کی افادی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ جب انکی ذہنی ناآسودگی اور رسم پرستی بھی شامل ہو جاتی ہے تو ان کا مزاح مزاح نہیں رہتا، مرثیہ بن جاتا ہے۔

اکبر کا یہ تضاد بھی کم دلچسپ نہیں کہ دنیا بھر کے مزاحیہ ادب میں ہمیشہ ماضی پر طنز ملتی ہے، لیکن اکبر ماضی کے دلدادہ و فریفتہ تھے اور وہ بھی صرف زندگی کے معاملہ میں، زبان و ادب کے معاملہ میں نہیں وہ کہتے ہیں :-

غنیمت ہے شبِ فرقت کی فرصت ، رسالہ لکھو تحقیقِ کمر میں
کیا پوچھتے ہو اکبر آشفتہ سر کا حال ، خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال
مغرب نے خوردبیں سے کمر ان کی دیکھ لی ، مشرق کی شاعری کا مزا کرکرا ہوا

اکبر کی قادرالکلامی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس کے نکتہ چیں بھی اُس کی داد دیتے ہیں، الفاظ تو انکے ہاتھ میں جیسے کھلونا تھے۔ مس، بیگم، سید، صنم، دم، سر جیمز داس، برہمن، جمن، کلیسا، اونٹ، گائے اور الفاظ ہیں جن سے اکبر نہایت دلچسپ مفہوم مراد لیتے ہیں۔ لیکن جہاں جہاں انھوں نے انگریزی الفاظ کا ناجائز استعمال کیا ہے، زبان کو بجائے فایدے کے نقصان پہونچا ہے۔ اسکے علاوہ زود گوئی اور بسیار نویسی کی عادت سے بھی ان کے بعض اشعار کو بہت عامیانہ اور سوقیانہ بنا دیا ہے مگر پاکستان کے نقاد اکبر کی اس کمزوری کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ذیل کے اشعار میں اکبر کی لغزشیں عیاں ہیں ؎

سینے پہ بتوں کے دسترس مشکل ہے ، پوائنٹ یہ سخت ہے اسے ٹچ نہ کرو ،
تحفۂ شب برات کیا تمھیں دوں ، جانِ من تم تو خود پٹاخہ ہو ،
ممکن نہیں اے مس ترا نوٹس نہ لیا جائے ، محال ایسے پریزاد ہوں اور کس نہ لیا جائے
خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں ، مگر اندھیرے اُجالے میں چوکتا بھی نہیں

اکبر کی کلیات میں ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں ــــ اکبر کی شاعری کا پاکستان اور ہندوستان دونوں کے زاویۂ نگاہ سے تجزیہ کر چکنے کے بعد یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اکبر جیسے مزاح نگار تو تھے عظیم شاعر نہ تھے۔ اُن کے کلام کی تمام تر حیثیت ضمنی ہے۔ زندگی بھر وہ زمانہ کے رخ سے منہ پھیرے بیٹھے رہے اور انھیں بہت دیر میں یہ "ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا"۔ اگر یہ شعور ان میں پہلے ہی پیدا ہو جاتا تو آج انھیں اقبال و حالی کی صف میں جگہ دی جاتی۔

1۔ ڈاکٹر اعجاز حسین۔ اکبر فنکار کی حیثیت سے ص ۱۲ (اکبر نمبر)

علوم و معارف

(آغاز اسلام سے عہدِ بنو امیہ تک)

ظہور اسلام سے پہلے عربوں کے ادب کی حالت زمانۂ جاہلیت میں عرب اپنے ملک کی طبعی خصوصیات کی وجہ سے بادہ نشین و بادیہ پیما قوم تھی۔ نہ تو ان کے پاس عمرانیت کے وسایل تھے اور نہ دوسرے ایسے اسباب جو ان کو علمی تجبر، دینی تبصر یا زراعت کے عمدہ طریقوں کی طرف متوجہ کرسکتے۔ عربوں کے قبایل کی باہمی جنگ وجدل اور ان کے انتقامی جذبات کا سو سو برس تک نسلاً بعد نسلٍ مشتعل رہنا مشہور تھا۔ چنانچہ زمانۂ جاہلیت کی شاعری عموماً اس انتقامی تحریک اور فخر و مباہات کے تذکروں سے معمور ہے۔ ابن خلدون کے بیان کے مطابق قبیلۂ قریش میں جو تجارتی تفوق، حرم کی تولیت اور مجاورت کی وجہ سے مقتدر اور محترم خیال کئے جاتے تھے، کل سترہ آدمی ایسے تھے جنھوں نے اہل حیرہ سے لکھنا سیکھا تھا اور مدینہ میں اوس و خزرج کے قبیلوں میں صرف گیارہ آدمی ایسے تھے جنھوں نے یہودی قبیلوں سے جو ان کے پڑوسی تھے لکھنا سیکھا تھا۔ اس زمانہ میں لفظ کامل اطلاق ایسے لوگوں پر ہوتا تھا جو تیر چلانا، تیرنا اور لکھنا جانتے تھے۔

اسلام کا عربوں کی حالت پر اثر اسلام نے عربوں کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا اور بہت تھوڑے عرصہ میں ان کی زندگی دوسری قوموں کے لئے باعثِ رشک ہوگئی۔ رسول اللہ نے عربوں کی شجاعت، ایثار اور اخوت کے پوشیدہ جوہر اس طرح اُبھارے کہ یہی وحشی اور جاہل عرب قوم پستی اور ادبار سے نکل کر محیر العقول اقبال و عروج کو پہونچ گئی، اکاسرہ و قیاصرہ کے ممالک کو روند ڈالا اور ان کی فتوحات کا سیلاب برانس (Pyrenees) کے پہاڑوں سے ہند و چین تک پہونچ گیا اور ان مفتوحہ متمدن اقوام کے ہمسائگی اور باہمی ازدواجی تعلقات کی وجہ سے بھی ان کی ادبی اور عقلی زندگی میں بڑا خوشگوار انقلاب پیدا ہوا۔

عربوں کی زبان پر قریش کا لغوی و لسانی اثر عرب کی زبان پر قریش کی زبان کا اثر تو اسلام سے پہلے بھی پایا جاتا تھا لیکن جب اسلام کی فتوحات کے سلسلہ میں خلفاء، امراء اور اصحاب حل و عقد سب خاندان قریش ہی کے ہوئے تو یہ دائرہ اور زیادہ وسیع ہوگیا۔ اور ان کی زبان جملہ قبایل کے لئے ٹکسالی زبان قرار پائی۔

ظہور اسلام کے بعد تحریک علمی کا آغاز اور اسکے وجوہات جب نشر دین کے لئے کاتبین اور قارئین کی ضرورت پیش آئی تو لوگوں کی توجہ لکھنے پڑھنے کی طرف زیادہ ہوئی اور اسی لئے جنگ بدر میں جو قیدی لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور ناداری کی وجہ سے فدیہ دیکر رہائی حاصل نہیں کرسکتے تھے ان کے لئے آپ نے یہ شرط عاید کی کہ وہ دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا کر رہائی حاصل کرسکتے ہیں۔ رسول اللہ نے لوگوں کو صرف عربی زبان ہی کی تعلیم کی ترغیب نہیں دی بلکہ دوسری قوموں کی زبان سیکھنے کی بھی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ آپ کی ہدایت کے مطابق

زیدؔ بن ثابت نے یہودیوں کی زبان سیکھی۔ رسول اللہ خود بھی دوسری قوموں کے حالات معلوم کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے خدا کے وجود اور اس کی قدرت کے ثبوت میں عموماً انھیں باتوں کو پیش کیا جو پہلی آسمانی کتابوں میں موجود تھیں۔ آپ لوگوں کو گزشتہ امتوں کے حالات سے عبرت دلاکر اپنی شریعت کی تلقین فرماتے تھے۔

تحصیل علم کی ہدایت کو آپ نے مردوں ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ عورتوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی۔ حضرت عمرؔ کے زمانہ کے ذیل کے واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کے علم کی کیا حالت تھی۔

"ایک مرتبہ حضرت عمرؔ نے وعظ فرمایا کہ عورتوں کا مہر ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نہ رکھیں۔ اس پر ایک عورت نے آپ سے کھڑے ہوکر دریافت کیا کہ خداوند تعالیٰ کے اس قول کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے:-

"وَاِنْ آتَيْتُمْ اِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا" یعنی اگر تم کسی کو زرکثیر بھی دیدو تو اس سے واپس مت لو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زرکثیر بھی مہر میں دیا جاسکتا ہے۔ اس پر حضرت عمرؔ نے جواب دیا کہ تم صحیح کہتی ہو میں غلطی پر تھا۔

صحابہ کا علوم سے شغف اور ان کی مہارت

اقتصادی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے بعض صحابہ نے خاص خاص علوم میں خاص مہارت حاصل کی۔ مثلاً حضرت علیؔ نے فنِ قضا میں، معاذ بن جبل نے حلال و حرام کے علم میں، زیدؔ بنِ ثابت نے مواریث کی تقسیم اور غنیمت کے انضباط میں، ابن ابی کعب نے قرأتِ قرآن میں مہارت حاصل کی۔ یہی علما بعد کو شہروں میں منتشر ہوگئے اور وہاں بہت سے عرب اور موالی ان کے شاگرد ہوئے۔ چونکہ اس زمانہ کا ماحول علوم دینیہ تک محدود تھا اس لئے بنو امیہ کے عہد میں زیادہ تر دینی علوم کو فروغ ہوا۔ لیکن عباسیوں کے عہد میں علوم عقلیہ کو بھی بہت فروغ ہوا (مثلاً طب، فلسفہ، ریاضیات وغیرہ)

کلام مجید کا علمی تحریک پر اثر

چونکہ کلام مجید اور اس کے غوامض کا معلوم کرنا دینی حیثیت رکھتا تھا، اس لئے اس پر عبور حاصل کرنے کے لئے بہت غور و خوض سے کام لیا اور اس سلسلہ میں متعدد علوم و فنون کی بنیاد پڑی مثلاً:-

۱- لغت، صرف، نحو، بدیع۔

۲- اجتماعی و اقتصادی مسایل کے سلسلہ میں احکام فقہی کا استنباط۔

۳- علم تاریخ کیونکہ کلام مجید میں قوموں کے حالات اور ان کے پیغمبروں کے واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

۴- علوم عقلیہ، کیونکہ علاوہ کلام مجید میں ایسی متعدد آیات ہیں جو کائنات پر غور کرنے کی ہدایت کرتی ہیں۔

بہرحال جب ہم ابتدائے اسلام سے عہد بنو امیہ تک ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو تین قسم کی خاص علمی تحریکوں کا پتہ چلتا ہے، سب سے زیادہ دینی تحریک (یعنی تفسیر قرآن، حدیث، فقہ) اس کے بعد تاریخ وقصص و سیر وغیرہ اور پھر طب۔ کیمیا وغیرہ۔

تدوین کلام مجید

قرآن شریف رسول اللہ پر تھوڑا تھوڑا کرکے تقریباً ۲۲ برس کے عرصہ میں نازل ہوا۔ آپ اس کو درخت کی چھال، ہڈی اور ٹھیکری وغیرہ پر لکھوا دیتے تھے، مسلمان اس کو یاد کرلیتے تھے۔ کاتبین وحی میں زیدؔ ابن ثابت سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ اور آپ کو معلوم تھا کہ کیا لکھا گیا ہے اور کیا باقی ہے۔ چنانچہ آپ نے پورے کلام مجید کو رسول مقبول کو سنا بھی دیا تھا۔ اسی وجہ سے بعد میں حضرت ابوبکر و عمرؔ نے کلام مجید کو یکجا کرنے میں ان پر اعتماد کیا۔ رسول مقبول کی وفات کے بعد کلام مجید مختلف اجزاء اور حفاظ کے سینوں میں محفوظ تھا۔ جب واقعہ یمامہ میں سات سو حفاظ شہید ہوئے تو حضرت عمرؔ کو کلام مجید کے ضایع ہونے کا اندیشہ ہوا۔ آپ نے حضرت ابوبکر کو اس کی اطلاع دی اور مشورہ دیا کہ کلام مجید کو کتابی شکل میں مدون

ہونا چاہئے۔ آپ کے اصرار پیہم سے بہت ہی ردو قدح کے بعد حضرت ابوبکر نے تدوین کلام مجید کی اجازت دی۔ چنانچہ زید ابن ثابت کے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا جنھوں نے مختلف اجزا اور حفاظ کے سینوں سے کلام مجید کو کتاب کی شکل میں مدون کیا۔ یہ صحیفہ حضرت ابوبکر کی حیات تک ان کے پاس رہا اور ان کی وفات کے بعد حضرت عمر کے پاس رہا۔ حضرت عمر کی وفات کے بعد حفصہ بنت عمر کے پاس تھا۔ حضرت عثمان کے زمانہ میں جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور قرّاء شہروں میں منتشر ہو گئے تو کلام مجید کے املا و لب و لہجہ میں اختلاف شروع ہوا جس کی وجہ سے غیر عرب مسلمانوں میں غلطیوں کا احتمال بہت بڑھ گیا اور تحریف کا بھی خدشہ ہوا۔ بنابریں حضرت عثمان نے زید بن ثابت۔ عبداللہ بن زبیر۔ سعید بن العاص۔ عبدالرحمٰن بن حارث کو تدوین کلام مجید کا کام سپرد کیا۔ ان لوگوں نے حفصہ بنت عمر سے کلام مجید منگا کر اس کی نقل کی اور کلام مجید کی صورتوں کو اصلی[1] ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیا اور تمام الفاظ میں قریش کی زبان کو ترجیح دی کیونکہ کلام مجید در اصل قریش کی زبان میں نازل ہوا تھا۔

فتوحات کا زبان پر اثر اور اسکی اصلاح

ابتدائے اسلام میں وہ موالی جن کی تربیت عربی ماحول میں ہوئی تھی فصیح عربی بولتے تھے۔ جو موالی باہر سے آئے تھے وہ اس ملک میں اپنی مدت اقامت کے لحاظ سے کم یا زیادہ فصیح تھے۔ دیگر غیر عرب جو حال میں اسلام لائے تھے ان کی اقامت عرب کی مدت اتنی طویل نہ تھی کہ ان کی عجمیت کو بالکل ختم کر دیتی۔ چنانچہ غیر عرب عموماً اپنی زبان کے اسلوب اور مخارج کی طرف مایل ہوتے تھے۔ مشہور ہے کہ بلال حبشی زبان۔ سلمان فارسی زبان اور صہیب رومی لب و لہجہ کی طرف مایل تھے اور رسول اللہ زبان میں اعراب کی غلطی کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ کسی شخص نے زبان میں آپ کے سامنے غلطی کی تو آپ نے فرمایا "ارشدوا اخاکم فقد ضلّ"۔ یعنی اپنے بھائی کو سنبھالو وہ گمراہ ہو گیا ہے۔

جب اسلام مغرب و مشرق میں پھیلا اور مختلف شہر فتح ہوئے تو غیر عرب لاکھوں کی تعداد میں مسلمان ہوئے۔ ان میں باہمی ازدواج شروع ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی اولاد پیدا ہوئی جن کے حصہ میں باپ کی طرف سے فصیح عربی اور ماں کی طرف سے مخلوط عربی ملی۔ ایسے لوگ متعربین کہلاتے جن کی عربی زبان مخلوط تھی اور اس میں غیر عربی الفاظ بھی شامل ہونے لگے تھے۔

خاص عرب کے دیہاتوں کی زبان فتوحات کے بعد بھی ایک حد تک بدستور جاہلیت کی حالت پر رہی۔ البتہ شہر کے باشندوں اور شریف زادوں کی زبان بازار میں غیر عربوں سے خرید و فروخت اور دیگر معاملات میں اختلاط سے نہ بچ سکی۔ جب عربوں کو اس کا احساس ہوا تو انھوں نے غیر عرب عورتوں کے ساتھ شادی کرنے سے اجتناب شروع کیا اور اپنی اولاد کو بادیہ میں بھیجنے لگے تاکہ وہ صحیح عربی زبان سیکھیں۔ چنانچہ خلفائے بنی امیہ، ان کے امراء اور اشراف اس بات کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔ معاویہ بن ابی سفیان نے اپنے لڑکے یزید کو بادیہ میں تربیت دلائی تھی۔ خلفاء بنی امیہ اور ان کے امراء اور اشراف اگر ایک مرتبہ بھی گفتگو میں غلطی کرتے تھے تو ان کے لئے یہ بات ہمیشہ باعث عار ہو جاتی تھی۔ چنانچہ عبداللہ بن زیاد، ولید بن عبدالملک اور خالد قسری عرب کے غلط بولنے والوں میں شمار کئے جاتے تھے حالانکہ یہ لوگ کافی بلیغ اور خوش بیان تھے۔

اصلاح کتابت

عبدالملک ابن مروان کے زمانہ تک کتابت مکمل نہ تھی۔ حروف نقطوں سے خالی تھے جس کی وجہ سے غیر عربوں کو کلام مجید وغیرہ پڑھنے میں دقت ہوتی تھی۔ کلام مجید میں تحریف کا بھی اندیشہ تھا۔ چنانچہ عبدالملک بن مروان نے اصلاحِ کتابت کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اس تحریک میں حجاج بن یوسف نے (جو شروع میں خود معلم تھا) کافی حصہ لیا۔

---

[1] مجھے اس سے اختلاف ہے کیونکہ زید بن ثابت نے قرآن کو جس طرح مرتب کیا تھا اس کے لحاظ سے موجودہ نسخۂ قرآن مختلف ہے۔ لیکن زید بن ثابت نے نزول آیات کی تاریخی حیثیت کو سامنے رکھا تھا اور موجودہ قرآن کی ترتیب صرف چھوٹی بڑی آیتوں کے لحاظ سے ہے حالانکہ قرآن کو سمجھنے کے لئے از حد ضروری ہے کہ نزول آیات کی صحیح تاریخ سامنے ہو اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ کلام مجید کو بالکل از سر نو مرتب کیا جائے۔ (نیاز)

اس نے علامات وقف اور شکل کو خاص طریقہ سے درست کرادیا۔

زبان کی خرابیوں کی کثرت دیکھ کر لوگوں نے نحو کی تدوین کی طرف توجہ کی۔ پہلے شخص جنھوں نے نحو کی طرف توجہ کی ابوالاسود دوئلی خیال کئے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد بصرہ میں علوم نحو کی بڑی ترقی ہوئی اور بصرہ کی دیکھا دیکھی کوفہ کے لوگ بھی نحو کی طرف متوجہ ہوئے۔

تدوین حدیث چونکہ رسول اللہ خود نہایت صحیح و شستہ زبان بولتے تھے اس لئے احادیث بھی فصاحت و بلاغت اور ادبی خوبیوں کے لحاظ سے بڑا مرتبہ رکھتی ہیں۔

خلفائے راشدین کے زمانہ میں سوا کلام مجید کے اور کوئی چیز تحریر میں نہیں آئی۔ کیونکہ اس وقت اگر کوئی شبہ پیدا ہوتا تو لوگ فقہا اور صحابہ سے پوچھ لیتے تھے اور اقوال رسول اس وقت اس خوف سے نہیں لکھتے تھے کہ لوگ ان پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرکے کلام اللہ سے غافل ہوجائیں گے۔ اس کے علاوہ علم کتابت بھی چنداں مکمل نہ تھا لہذا تصحیف و تحریف کا بھی اندیشہ تھا۔

بعد میں جب خانہ جنگیاں شروع ہوئیں اور متعدد مذہب اور فرقے پیدا ہوئے تو بہت سے نئے مسایل سامنے آئے اور اس وقت لوگوں کو خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ لوگ سنت رسول کو چھوڑکر اپنے رہنماؤں کے اقوال پر اعتماد کرنے لگیں۔ ان حالات کے تحت امیرالمومنین عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر محمد بن حزم کو حدیث کی تدوین کا حکم دیا۔ انھوں نے خلیفہ موصوف کے حکم کے مطابق احادیث رسول کو سب سے پہلے کتاب کی شکل میں پیش کیا جس کو خلیفہ نے دوسرے شہروں میں تعلیم کی غرض سے ارسال کیا۔ اس کتاب کا بعد میں پتہ نہیں چلا۔

تاریخ سیر و مغازی (۱) علم حدیث کی ترقی کے ساتھ علم تاریخ اور سیر کی بھی ضرورت پیش آئی۔ محدثین اور راویوں کی بھی ضرورت پیش آئی۔ محدثین اور راویوں کی صحت عقل و دیانت معلوم کرنے کے لئے ان کے انساب و قبایل کا علم ضروری ہوا اور اس طرح علم تاریخ کی بنیاد پڑی لیکن باقاعدہ تدوین حدیث اب بھی شروع نہیں ہوئی کیونکہ تابعین بھی احتیاط و تقوی کی بنا پر عموماً تدوین احادیث کو پسند نہیں کرتے تھے۔

(۲) بعض خلفائے بنی امیہ کو گزشتہ اقوام اور سلاطین کا حال معلوم کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ امیر معاویہ مشہور قصہ گو عبید ابن شریہ سے گزشتہ لوگوں کے حالات سنا کرتے تھے۔ اس نے ایک کتاب "کتاب الملوک و اخبار الماضیین" لکھی جو مسعودی کے زمانہ ۹۵۶ء تک موجود تھی۔

دوسرا شخص فارسی النسل وہب بن منبہ تھا جو بعد میں مسلمان ہوگیا۔ اس نے ایک کتاب "التیجان فی ملوک حمیر" لکھی۔ یہ کتاب حال میں شایع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مشہور یہودی کعب بن احبار تھا جو خلفاء اولین کے زمانہ میں ایمان لایا تھا اور امیر معاویہ کا خاص مقرب تھا۔ اس نے بھی مسلمانوں اور یہودیوں کے حالات لکھے۔ لیکن اس سلسلہ میں بہت سی روایات توریت بھی اسلامی تاریخوں میں شامل ہوگئیں۔

(۳) جب مسلمانوں کو رسول اور صحابہ کے حالات اور ان کی فتوحات معلوم کرنے کا شوق ہوا تو سیر و مغازی کی تدوین شروع ہوئی۔ عروہ بن زبیر (متوفی ۹۴ھ) پہلے شخص تھے جنھوں نے سیرت نبوی تالیف کی۔ اس کے بعد ابان بن عثمان بن عفان ۱۰۵ھ نے ایک کتاب سیرت پر تالیف کی جس کو دراصل ان کے شاگرد عبدالرحمن بن المغیرہ نے جمع کیا تھا۔ ابن شہاب زہری (متوفی ۱۲۴ھ) نے ایک کتاب مغازی پر تالیف کی۔ اس کے بعد موسیٰ بن عقبہ (متوفی ۱۴۱ھ) نے ایک کتاب مغازی پر تحریر کی جس کا کچھ حصہ خوش قسمتی سے جو ۱۹۰۴ء میں شایع ہوچکا ہے۔ ایک اور کتاب مغازی پر ابن اسحاق (متوفی ۱۵۱ھ) نے تالیف کی جس سے اس کے شاگرد ابن ہشام (متوفی ۲۱۳ھ) مشہور مولف سیرت النبی نے بہت کچھ استفادہ کیا۔

دیوان الانشاء والرسایل جب فتوحات کا دایرہ وسیع ہوا تو بہت سے سرکاری دفاتر ظہور میں آئے جس کی وجہ سے زبان میں بہت توسیع ہوئی۔ عبدالملک کے زمانہ میں بہت سے دفتروں کی زبان جہاں اب تک عربی زبان مستعمل نہ تھی عربی کردی گئی۔ زبان کی ترقی کے لحاظ سے دیوان الانشاء اور رسایل بہت اہم ہے۔ اس ادارے کی وجہ سے ایک نئے قسم کی نثر کا ظہور ہوا جس سے عرب پہلے سے واقف نہ تھے۔ اس قسم کی نثر نثر فنی کے نام سے مشہور ہوئی۔ نثر فنی سے مراد ان خطوط کی زبان ہے جو خلیفہ کی طرف سے حکام اور عمال کو لکھے جاتے تھے۔ اس قسم کی نثر نے اس زمانہ میں بڑی ترقی کی۔ مشہور کاتب عبدالحمید جس نے اصول کتابت اور اس کے قواعد وضع کئے زعیم الکتاب یعنی کاتبوں کے سردار کے لقب سے مشہور ہوئے۔

خطابت گو فن خطابت عربوں میں پہلے بھی پایا جاتا تھا لیکن اموی عہد میں اس کو بڑی ترقی ہوئی۔ اس سلسلہ میں جمعہ کے خطبے۔ فوجوں کی شجاعت کو بڑھانے اور قومی اور وطن پرستی کے جذبات اُبھارنے کے لئے سرداران لشکر اور دیگر حکام کے خطبے بہت مشہور ہیں۔ ایسے زمانہ میں جب اشاعت ونشر کے وسایل کم تھے، جذبات کے اُبھارنے کے لئے خطبے بہترین وسایل تھے۔ حضرت علی کے خطبے اور حسن البصری کے وہ قصص و مواعظ جو وہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے بیان کرتے تھے بہترین خطبے خیال کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح بہادری اور قومی جذبات کو اُبھارنے کے لئے زیاد بن ابیہ اور حجاج کے خطبے عربی زبان کا بہترین خزانہ ہیں۔ مشہور خطیب خطبہ دیتے وقت صحتِ زبان کا بڑا خیال کرتے تھے۔

چنانچہ خلفائے بنی امیہ کے مشہور عالم و فاضل خلیفہ عبدالملک بن مروان سے کسی نے کہا کہ آپ پر بڑھاپا جلدی آگیا تو انھوں نے جواب دیا کہ منبروں پر چڑھنے اور زبان میں غلطی کے خوف نے مجھ کو بوڑھا کردیا۔ اسی خلیفہ سے کسی نے ایک اور موقعہ پر کہا کہ آپ پر بڑھاپا جلدی آگیا تو جواب دیا کہ بڑھاپا کیوں نہ آتا جبکہ ہر جمعہ کو مجھے اپنی عقل لوگوں کے سامنے پیش کرنی پڑتی ہے۔

علوم عقلیہ اور طب اس میں شک نہیں کہ عرب میں باقاعدہ طبیب آغاز اسلام میں نہ تھے۔ چنانچہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں حقارت کے ساتھ اس زمانہ کے طب کی حالت بیان کی ہے۔ عرب میں طب کا منبع یونانی اور فارسی ہے، حالانکہ فارسی طب نے بھی یونانی طب سے خوشہ چینی کی تھی۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں باقاعدہ طبیب طائف کا باشندہ حارث بن کلدہ تھا جس نے طب ایرانیوں سے سیکھی تھی۔ اس کے بعد اس کا لڑکا نضر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خالہ زاد بھائی تھا۔ یہ دونوں عرب کے طبیب خیال کئے جاتے ہیں۔ مغربی ایشیا کے فتوحات کے زمانے میں یونانی طب اوج پر نہ تھا تاہم کچھ لوگ یونانی طریقہ سے علاج کرتے تھے۔ چنانچہ امیر معاویہ کا مسیحی حکیم ابن اثال اور حجاج کا حکیم تیاذوق اسی طبقہ کے حکما سے تعلق رکھتے تھے۔ بصرہ کا یہودی فارسی النسل طبیب ماسرجویہ جو مروان بن حکم کے شروع زمانے میں تھا اس نے ۶۸۳ء میں اسکندریہ کے طبیب اہرون کی کتاب خیال کی جاتی ہے۔ الولید کے متعلق کہا جاتا ہے اس نے جذام کے مریضوں کے لئے علٰحدہ قیامگاہ بنواکر ان کے علاج کا انتظام کرایا۔ عمر ثانی کے متعلق بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اسکندریہ کے علمی مدرسہ کو انطاکیہ اور حرّان میں منتقل کیا۔

الکیمیاء والنجوم جہاں تک ہم کو معلوم ہوتا ہے خالد بن یزید بن معاویہ پہلا شخص تھا جس نے علوم کیمیا اور نجوم کو عربی میں منتقل کرنے کی طرف توجہ مبذول کی۔ علم کیمیا اس وقت مدرسہ اسکندریہ میں رائج تھا۔ خالد بن یزید نے اس مدرسہ کے کیمیاء کے ماہر کاہن خالد بن مریانوس سے استدعا کی کہ وہ اس کو یہ علم سکھادے۔

اس علم سے خالد بن یزید کو اس قدر شغف ہوا کہ اس نے خالد بن مریانوس کو قبطی و یونانی زبان سے اس علم کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔

اس خلیفہ کو علم نجوم کا بھی بہت شوق تھا ۔ چنانچہ علم نجوم کے آلات مہیا کرنے اور اس کو سیکھنے میں بے دریغ کثیر رقم خرچ کرتا تھا ۔ یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ خود بھی اس نے کسی غیر زبان کی کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا یا نہیں جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبیین میں خالد بن یزید کے متعلق لکھا ہے کہ خالد بن یزید بن معاویہ زبردست شاعر اور خطیب اور نہایت فصیح ادیب تھا ۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے نجوم اور کیمیاء کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے ۔

زمانۂ جاہلیت کی شاعری

زمانۂ جاہلیت کی شاعری جو دیوان العرب کے نام سے موسوم ہے عربوں کے مکارم کا مجمع، مفاخر کا منبع، شرافت کا مظہر اور فصاحت کا نمونہ خیال کی جاتی ہے ۔ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ اسلام نے شاعری کو اس آیت کی بنا پر " والشعراء یتبعھم الغاوٗن " فن مردود قرار دیا ہے ۔ ان کے خیال کے مطابق شاعری کی مذمت کا سبب یہ اندیشہ تھا کہ شاعری کے مقابلہ میں لوگ کلام مجید کو پس پشت ڈالدیں گے لیکن یہ رائے صحیح نہیں ۔

کلام مجید کی مذکورۂ بالا آیت سے وہ شعراء مراد ہیں جو دعوت اسلام کی مخالفت اور لوگوں کو اسلام کے خلاف اکسانے پر آمادہ کرتے تھے ۔ ـــــــ کیونکہ بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ خود رسول نے ایسے شعراء کو جنھوں نے عقاید دین کی نشر اور کلمۃ اللہ کے اعلاء کے لئے شہادت کی ترغیب اور قتال کی تحریص کی ان کی بہت قدر افزائی کی اور ان شعراء کو انعام بھی دیا ۔ رسول نے اس قسم کی شاعری کو جہاد فی سبیل اللہ اور امداد حق قرار دیا ہے ۔ چنانچہ اس لحاظ سے مخضری شاعر حسان بن ثابت کا بہت مرتبہ تھا ۔

آغاز اسلام میں شاعری کی حالت

شاعری کے احترام کا ثبوت خود جناب رسول مقبول کا یہ قول ہے " ان من البیان سحراً و ان من الشعر لحکمۃ " اس میں شک نہیں کہ رسول مقبول نے ایک نیا دین پیش کرکے لوگوں کے دلوں میں ایک ہیجان پیدا کردیا تھا ۔ موافقین تو ہدایت حاصل کرنے کے لئے کلام اللہ پر غور و فکر کرتے تھے اور مخالفین اسلام کے اصولوں پر " جن سے ان کو اچانک دوچار ہونا پڑا تھا " عیب جوئی اور تردید کے لئے غور کرتے تھے ۔ مخالفین جب اسلام یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتے تھے تو مسلمانوں کے معتقدات و اقوال کا مقابلہ اپنے دینی اصول سے کرتے تھے تاکہ رسول مقبول کے حملوں سے اپنے معبودوں، دینی رسوم اور اجتماعی حالات کو بچادیں ۔ اسی وجہ سے ان شعراء کے کلام میں مذہبی باتوں کا تذکرہ ہوتا تھا جن کی طرف زمانۂ جاہلیت کے شعراء بہت کم توجہ کرتے تھے حالانکہ بہت سی باتوں میں اس زمانہ کی شاعری زمانۂ جاہلیت کی شاعری سے بہت زیادہ مختلف نہ تھی ۔ خاص کر اسلامی شعراء کے ایسے قصاید جو مدح رسولؐ یا ہجو مشرکین کے متعلق ہیں وہ قریب قریب ایسے ہی ہیں جیسے زمانۂ جاہلیت میں شیخ قبیلہ کی مدح یا ہجو میں ہوتے تھے ۔ اس قسم کے مسلمانوں کے شعراء حسان بن ثابت ۔ عبداللہ ابن مالک ۔ کعب ابن مالک اور کعب ابن زہیر وغیرہ ہیں اور مشرکین کے اس قسم کے شعراء عبداللہ بن زبعری ۔ ضرار بن خطاب اور کعب بن اشرف وغیرہ ہیں ۔

آغازِ اسلام میں شعراء نے اسلام کی مدافعت میں مشرکین عرب کی ہجو کہی لیکن یہ ہجو تہذیب اور اخلاق کے حدود سے تجاوز نہیں کرتی تھی ۔ حسان بن ثابت نے خود مشرکین کی جو خاندان نبی سے تعلق رکھتے تھے ہجو کی ۔ رسول نے خود اس ہجو کو سنا تھا ۔ ہجو میں اقذاع یعنی فحشیات کو ناپسند کیا جاتا تھا ۔ حضرت عمرؓ نے مشہور فحش گو شاعر حطیئہ کو زبان کٹوانے کی دھمکی دی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو شعراء ہجو کے عادی تھے انھوں نے خود اپنی ہجو شروع کردی ۔ جیسے حطیئہ نے خود یہ شعر اپنی ہجو میں کہا ہے ۔ شعر ؎

اریٰ لی وجھًا شوہ اللہ خلقہ فقبح من وجہٍ وقبح حاملہ ،

(یعنی میں ایک ایسا چہرہ دیکھتا ہوں جسے اللہ نے بُرا بنایا ہے ۔ بُرا ہے یہ چہرہ اور بُرا ہے اس کا مالک)

چونکہ اسلامی شعراء کی توجہ افکار دینی کی طرف مبذول ہوگئی تھی اس لئے شاعری کے سابقہ اسلوب مثلاً تشبیب و مغازلہ مدح باطل، طلب انعام و ہجا وغیرہ کا زور بہت کم ہوگیا۔ فتنۂ ارتداد فرو ہونے کے بعد جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو اغراض شاعری میں معارک و حصار کی تعریف، آلات قتال جو لڑائی میں استعمال کئے گئے، ان کے حالات اور دیگر نئی چیزیں جو مشاہدے میں آئیں ان کا تذکرہ، اور شدائد و مصائب کے واقعات شامل ہوگئے۔ لہٰذا مغازی اور فتوح کی کتابوں میں اس قسم کے اشعار بہت پائے جاتے ہیں۔ امیر معاویہ اور حضرت علی کے واقعات میں بھی اس قسم کے شعر ملتے ہیں۔

بنو امیہ کے زمانہ میں شاعری

جب عنان حکومت بنو امیہ کے ہاتھ میں آئی تو شعر کے اغراض میں حالات اور واقعات کی بنا پر بہت کچھ تغیر ہوا۔ بنو امیہ کے زمانہ میں بہت سے فرقوں کا ظہور ہوا مثلاً شیعہ و خوارج وغیرہ۔ یہ تمام فرقے سیادت حاصل کرنے کے لئے تیغ و زبان دونوں سے جنگ کرتے تھے۔ ان کے اعلاء و اعلان مقاصد کے لئے شاعری بہتر آلہ ثابت ہوئی۔ خوارج کے گروہ کا مشہور شاعر عمران بن خطان، قطری بن فجارہ۔ زبیریوں کا مشہور شاعر عبیداللہ بن قیس الرقیات اور شیعوں کا مشہور شاعر کمیت بن زید الاسدی اسی قسم کے پروپاگنڈا کرنے والے شاعر تھے۔

خلفاء بنی امیہ نے شعراء کے خوش کرنے میں بیحد کوشش کی۔ شعراء کو بیحد انعام و اکرام دئے۔ وظائف مقرر کئے اور ان کی سفارشیں سنیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعراء میں بنی امیہ کی خوشنودی مزاج اور ان کے دروازے تک رسائی حاصل کرنے میں تسابق کا جذبہ پیدا ہوگیا اور بہت سے شعراء بجائے اپنے گروہوں کے بنو امیہ کی تعریف کرنے لگے۔ اس داد و دہش سے در اصل بنو امیہ کا مقصد یہی تھا کہ ادباء اور علماء کے طبقہ کو اپنا طرفدار بنالیں، تاکہ وہ بنو امیہ کے خلفاء حکام اور عمال کے اعمال پر نکتہ چینی سے باز رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری بہت سے گھرانوں اور خاندانوں کے لئے حصول مال کا ذریعہ ہوگئی اور شعر و شاعری کا مطالعہ، نقد و روایت علماء اور ادبا کی عادت ہوگئی یہاں تک کہ خلفاء اور ان کے امراء اور خاندان قریش کے دیگر لوگوں نے بھی شاعری شروع کردی جو اب تک اس کی طرف بہت کم توجہ کرتے تھے۔

حجاز میں شاعری کی حالت

جب مفتوحہ ممالک کے مال غنیمت کی وجہ سے ثروت بڑھی اور عجمی اور دیگر اقوام کی اختلاط سے تہذیب و تمدن کا معیار بدلا تو اسلام کے مختلف ممالک کی شاعری میں ایسے فنون ظاہر ہوئے جو پہلے نہ تھے اور ادب نے بھی ایسی شکلیں اختیار کیں جس سے عرب پہلے واقف نہ تھے۔

شاعری کا دوسرے ممالک میں اثر

اموی زمانہ کے مشہور شاعر جریر، فرزدق اور اخطل گزرے ہیں۔ یہ سب پیدائش اور تربیت کے اعتبار سے عراقی تھے۔ فرزدق اور جریر کی آپس میں بہت نوک جھونک رہتی تھی۔ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو تعصب کی بنا پر ایک شاعر کو دوسرے پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ مہلب بن ابی صفرہ والی خراسان کی اس فوج میں جس کو وہ خوارج کے گروہ ازارقہ کے مقابلہ کے لئے لے گیا تھا دو گروہ تھے۔ ایک گروہ جریر کی تعریف کرتا، دوسرا گروہ فرزدق کو فضیلت دیتا تھا۔

اس معرکہ میں اخطل بھی شریک ہوا۔ یہ فرزدق کا طرفدار تھا۔ اخطل امویوں کے دربار کا مشہور مداح شاعر خیال کیا جاتا ہے۔ اور عبدالملک بن مروان کا خاص مقرب تھا اور بغیر اجازت اس کے پاس آجا سکتا تھا۔ ان حالات کے تحت بنو امیہ کے زمانہ میں سیاسی شاعری کا بہت عروج ہوا۔

(ڈاکٹر) سعید حسن (الہ آباد یونیورسٹی)

فنِ تحریر کی تاریخ

تمہید کیا آپ نے کبھی یہ غور کرنے کی زحمت اختیار کی ہے کہ جن حروف میں آپ لکھتے پڑھتے ہیں اُن کی ایجاد کس طرح ہوئی، کب ہوئی، اُن کا موجد کون تھا، اور ان میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں ؟

پھر دُنیا میں صرف ایک ہی لکھائی نہیں ہے بلکہ ہزاروں رسم الخط ہیں اس لئے یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اُن کا باہمی تعلق کیا ہے، رسم الخط در اصل ایک ہی تھا جو ایک سے دوسری میں منتقل ہوا یا مختلف قوموں نے مختلف رسم خط اپنے اپنے زمانہ میں ایجاد کئے، اور اسی قسم کے متعدد سوال ہمارے سامنے آتے ہیں ۔

زمانۂ قدیم میں وادیِ سندھ، ایران، عراق، ایشیائے کوچک، مصر، جزایر ایجین، چین اور وسط امریکہ میں جو رسم الخط مستعمل تھے اُن میں بجائے نشانات کے تصویروں سے کام لیا جاتا تھا، جن کی تعداد ہزاروں تک پہونچتی تھی۔ ان میں اب صرف چینی رسم الخط باقی رہ گیا ہے اور سب فنا ہوگئے ۔

اس لئے ہمیں ممنون ہونا چاہئے اُس شخص یا قوم کا جس نے ایسی لکھائیوں کے مقابلہ میں جن میں ہزاروں نشانات سے کام لیا جاتا تھا، ایسا رسم الخط ایجاد کیا جو صرف چند درجن حروف پر مشتمل ہے ۔

حروف کی ایجاد کے علاوہ کتابت کی درستی و اصلاح بھی فنِ تحریر کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ کاغذ کی ایجاد سے پہلے بھوج پتر، پیپرس، ریشم، چمڑے، ہڈی، لکڑی، مٹی کی تختیوں اور پتھر کی سِلوں پر لکھنے کا چلن تھا۔ لیکن باوجود ان تمام دشواریوں کے پُرانے زمانہ کے لوگ لکھنے پڑھنے کی قدر کرتے تھے اور اُن میں تعلیم و تعلم کا خاصہ رواج تھا ۔ چنانچہ نِپّر (عراق) میں ماہرینِ اثریات نے ایک بہت پُرانے زمانہ کا مدرسہ دریافت کیا ہے اور اب سے ایک صدی اُدھر سر آگسٹس ہنری لیرڈ نے شہنشاہ اشور بنی پال (۶۶۸ لغایتہ ۶۲۶ ق - م) کے کتب خانہ کا اکتشاف کیا تھا جس میں مٹی کی تختیوں پر لکھی ہوئی ہزاروں کتابیں ملی ہیں اور ان کے علاوہ بہت سے مٹی کے خطوط بھی ملے ہیں جو مٹی کے لفافوں میں بند تھے ۔

یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ فنِ تحریر کا آغاز اب سے پچاس ہزار سال یا اس سے بھی کچھ پہلے ہوا تھا کیونکہ اسپین اور فرانس کے غاروں میں نقاشی کے جو نمونے ملے ہیں وہ تقریباً اسی زمانہ کے ہیں جب فنِ تحریر کی ابتدائی صورت روزانہ زندگی کی تصویر کے علاوہ کچھ نہ تھی ۔

جب آپ کسی کو گنتی کا شمار لکیروں کی صورت میں کرتے پائیں (اور یہ چیز آپ کو اکثر جاہل لوگوں میں نظر آئے گی) تو آپ سمجھ لیں کہ یہ طریقہ اُس زمانہ کی یادگار ہے جب انسان غاروں میں رہا کرتا تھا ۔

جب آپ کسی مرد کو رومال میں اور عورت کو آنچل میں بات یاد رکھنے کے لئے گرہ لگاتے دیکھیں تو باور کریں کہ یہ طریقہ اُس زمانہ کی ایجاد ہے جب انسان لکھنا نہیں جانتا تھا ۔

جب آپ کو سڑک کے کنارے آمد و رفت کے نشانات نظر آئیں (مثلاً ہاتھ یا تیر کا نشان سمت بتانے کے لئے) تو سمجھ لیں کہ یہ بھی فنِ تحریر کی قدیم صورت ہے اور جب آپ کسی زبان کے رسم الخط پر نظر ڈالیں تو یہ بھی یقین کیجئے کہ اُس کے ایک ایک حرف کی

موجودہ صورت صدیوں کے تغیر و تبدل کا نتیجہ ہے اور جس طرح دریا کی موجیں پتھر کے ناہموار ٹکڑوں کو سڈول بنا دیتی ہیں اُسی طرح عہد بہ عہد کی تبدیلیوں کے بعد حروف بھی اپنی موجودہ صورت تک پہونچے ہیں۔

پرانے زمانہ کے لوگ فنِ تحریر کو دیوتاؤں کی ایجاد سمجھتے تھے۔ چنانچہ مصر کے لوگ تھاتھ دیوتا کو (جس کا جسم انسان کا اور سر پرند کا بنایا جاتا تھا) کلدانی اونیس کو (جسے مچھلی کی کھال اوڑھے دکھایا جاتا ہے) اور ہندو برہما کو (اسی لئے ہند قدیم کا رسم الخط براہمی کے نام سے موسوم تھا) فنِ تحریر کا موجد سمجھتے تھے لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب انسان ہی کی ایجاد تھی۔ اس مقالہ میں انھیں تمام مسایل پر بحث کی جائے گی۔

فنِ تحریر کیا ہے؟

فنِ تحریر تقریر کو قلمبند کرنے کا آلہ ہے اور دونوں کا تعلق سمجھنے کے لئے زبان کی ماہیت کا جاننا ضروری ہے۔ زبان ایک فرضی چیز ہے یعنی اُن مفرد آوازوں کی ترکیب سے جنھیں انسان اپنے منھ سے نکال سکتا ہے ہزاروں مرکب آوازیں یا الفاظ بنتے ہیں۔ یہ آوازیں دنیا کی مختلف چیزوں کے لئے بطور نام کے استعمال کی جاتی ہیں جس کا منشاء یہ ہے کہ انسانی حافظہ ہر اس چیز کی تصویر کو چشمِ تصور کے سامنے پیش کردے جس کا نام لیا جائے مثلاً جب ہم قلم کہتے ہیں تو ہمارے دماغ میں قلم کی تصویر آتی ہے پینسل کی نہیں۔ پینسل کی تصویر جب ہی سامنے آتی ہے جب ہم پینسل کہتے ہیں گویا الفاظ انسان کے دماغ میں مختلف چیزوں کی تصویریں پیش کرنے کے آلے ہیں۔ الفاظ کے کثرتِ استعمال سے تصویریں تحت الشعور میں چلی جاتی ہیں اور انسانی دماغ کو ہر ہر لفظ پر تصویرکشی نہیں کرنا پڑتی۔

زبان کی طرح فنِ تحریر بھی ایک فرضی چیز ہے یعنی اُن مفرد آوازوں کے لئے (جن سے زبانِ انسانی کے الفاظ مرکب ہیں) کچھ نشانات مقرر کردئے گئے ہیں یعنی فلاں نشان فلاں آواز کو ظاہر کرے گا۔ ایسے نشانات کو حروف ہجا یا حروف تہجی کہتے ہیں انھیں پڑھنے کے معنی صرف یہ ہیں کہ انسان اپنے دماغ میں اُن آوازوں کو سوچے یا منھ سے نکالے جن کا مظہر ان نشانات کو قرار دیا گیا ہے۔ آپ کسی کاغذ پر لفظ گلاب لکھ کر کسی ایسے شخص کے سامنے رکھئے جو اُردو یا فارسی رسم الخط نہیں جانتا۔ وہ نہیں بتا سکے گا کہ ان نشانات کا کیا مطلب ہے لیکن جب آپ کی نظر مندرجۂ بالا نشانات پر پڑے گی تو آپ اُردو رسم الخط کے اصول سے واقف ہونے کی بنا پر فوراً معلوم کرلیں گے کہ یہ نشانات اِن اِن آوازوں کو ظاہر کرتے ہیں اور جب آپ نے اُنھیں ترتیب دیا تو لفظ گلاب بن گیا اس لفظ کا آپ کے نزدیک کوئی مفہوم نہ ہوتا اگر آپ نے گلاب کا پھول نہ دیکھا ہوتا۔ اس لئے اصل چیز تو گلاب کا پھول ہے، اس کے بعد لفظ گلاب ہے جو آپ کے دماغ میں صرف ایک خاص پھول کی تصویر سامنے لاتا ہے اور تیسری چیز وہ نشانات ہیں جو آپ کے دماغ میں لفظ گلاب کا تصور پیدا کرتے ہیں۔

فنِ تحریر کے فوائد

انسان کی زبان ایک محدود فاصلے تک سُنی جاسکتی ہے اور اُس کا وجود اُتنی ہی دیر کے لئے ہے جب تک اُسے بولا جاتا ہے لیکن تحریر کے ذریعہ سے ہم اسے دیرپا بناسکتے ہیں۔ اور دُنیا کے ہر گوشے میں پہونچا سکتے ہیں اور ہر زمانہ میں انھیں پڑھا جاسکتا ہے۔

اُس کا ایک فایدہ یہ بھی ہے کہ انسانی دماغ دُنیا بھر کی باتیں نہیں یاد رکھ سکتا، لیکن اگر اُنھیں لکھ لیا جائے تو وہ باتیں محفوظ ہوجاتی ہیں اور ان تحریری معلومات سے ہر وقت فایدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ ہماری تہذیب و شایستگی کو وجود میں لانے اور باقی رکھنے میں فنِ تحریر کا بڑا ہاتھ ہے۔ دنیا کے تمام علوم و فنون تحریر ہی کی بدولت زندہ ہیں۔

فنِ تحریر کی اقسام

انسان کی زبانیں دو ہیں ایک وہ جس میں الفاظ سے کام لیا جاتا ہے اور دوسری وہ جس میں چشم و ابرو اور ہاتھ پاؤں کے اشاروں سے مدد لی جاتی ہے۔ اسی طرح فنِ تحریر کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس میں حروف ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جس میں تصویروں سے کام لیا جاتا ہے۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ انسان کی دو زبانوں میں کون زبان زیادہ قدیم ہے لیکن اتنا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اشارہ کی گفتگو کا سیکھنا نسبتاً آسان ہے اور اُس کا استعمال نہایت وسیع ۔ اگر آپ کا ایسے لوگوں سے سابقہ پڑے جو آپ کی زبان نہ جانتے ہوں اور نہ آپ اُن کی زبان جانتے ہوں تو آپ مجبور ہو جائیں گے کہ اپنا مطلب اشاروں سے سمجھائیں ۔ فرض کیجئے کہ آپ چین جائیں اور کسی سے کہیں کہ مجھے پانچ انڈے دے دو تو وہ آپ کا مطلب نہ سمجھے گا لیکن اگر آپ انڈوں کی طرف اشارہ کرکے، پانچ انگلیاں اُٹھا کر اپنی طرف اشارہ کر دیتے ہیں تو آپ کو پانچ انڈے مل جائیں گے ۔

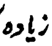
اشارہ کی گفتگو کیا ہے ؟ ہاتھ پاؤں کے اشاروں سے کسی چیز یا کام کی نقل کرنا ۔ مثلاً آپ کو لکھنے کا مفہوم ظاہر کرنا ہو تو آپ اپنے بائیں ہاتھ کو اس طرح پھیلائیں گے گویا اس پر کاغذ رکھا ہے اور پھر دائیں ہاتھ کو ایسا بنائیں گے گویا انگلیوں میں قلم دبا ہے اور پھر اُسے بائیں ہاتھ پر اس طرح پھرائیں گے، گویا قلم گردش میں ہے ۔

اسی طرح تصویری رسم الخط کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ ہمیں جن چیزوں اور جن کاموں کا بیان مقصود ہے اُنھیں تصویروں میں ظاہر کریں ۔

اشارہ کی گفتگو کا استعمال دو صورتوں میں کیا جاتا ہے ایک تو ایسی حالت میں جب ہم بول نہ سکتے ہوں یا بولنا نہ چاہتے ہوں ۔ (اسی لئے گونگے اشارہ کی گفتگو سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں، ہندوستانی رقص بھی اشارہ کی گفتگو کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے) اور دوسرے جب ہمیں اپنے بیانات کی وضاحت منظور ہوتی ہے ۔ آخری صورت مقرروں اور واعظوں میں زیادہ پائی جاتی ہے ۔

زمانۂ بعید کا انسان حروف کے استعمال سے نا آشنا تھا ۔ اور تصاویر کے ذریعہ سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا جنھیں پڑھا نہیں بلکہ دیکھ کر سمجھا جاتا تھا ۔ آگے چل کر انھیں تصویروں سے حروف کی ایجاد ہوئی ۔

فنِ تحریر کے مدارجِ ارتقاء

۱۔ **تصویر کی شکلوں میں ارتقاء** ۔ فنِ تحریر کا آغاز مصوری سے ہوتا ہے ۔ تصاویر کے ذریعہ سے خیالات کے اظہار کو تصویری رسم الخط کہتے ہیں ۔ شروع میں تصویروں کو پوری تفصیل کے ساتھ بناتے تھے لیکن لکھنے کی سہولت اور وقت کی بچت کے لئے تفصیلات دن بدن کم ہوتی گئیں اور پوری تصویر بنانے کے بجائے صرف اُس کے نمایاں حصّوں کا بنانا کافی سمجھا گیا ۔ یہاں تک کہ ایک منزل ایسی آئی جب تصویر کا تصویرپن غائب ہوگیا ۔ مثلاً عربی رسم الخط کو لیجئے کہ اُس کے پہلے حرف "الف" کے معنی بیل کے تھے ۔ اس کے لئے پہلے بیل کے چہرے کی تصویر اس طرح بنائی جاتی تھی  (یعنی بجائے پورا بیل بنانے کے صرف اُس کا سر بنانا کافی سمجھا جاتا تھا) اس کے بعد یہ سر کی تصویر صرف ایک لکیر یعنی (ا) رہ گئی ۔

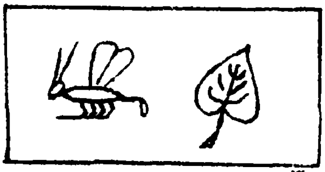
۲ ۔ **تصویر کے معنوں میں ارتقاء** ۔ تصویری رسم الخط کی ابتدائی صورت میں تصویروں کو پڑھا نہیں جاتا تھا بلکہ دیکھ کر سمجھا جاتا تھا ۔ پہلے تو جس چیز کی تصویر بنائی جاتی تھی وہی چیز مراد لی جاتی تھی ۔ (ایسی تصاویر کو " سادہ تصاویر" (PICTO GRAPHS) کہتے ہیں) بعد میں اُس تصویر سے تعلق رکھنے والی چیزیں بھی اسی تصویر سے ظاہر کی جانے لگیں ۔ ایسی تصاویر کو "تصاویر خیالی" (IDEO GRAPHS) کہتے ہیں ۔ مثلاً اگر سورج، چاند کی تصویریں بنا کر سورج، چاند مراد لئے جائیں تو یہ سادہ تصاویر ہوں گی لیکن اگر سورج بنا کر دن، سال، یا سونا مراد لیا جائے اور چاند بنا کر رات، مہینہ یا چاندی تو یہ تصاویر خیالی ہوں گی ۔

تصویری رسم الخط کی ابتدائی حالت میں سادہ تصاویر اور تصاویر خیالی دونوں کا استعمال ایک ساتھ کیا جاتا تھا ۔

۳ ۔ **تصویر کی آوازوں میں ارتقاء** ۔ تصویری رسم الخط کی دوسری منزل میں تصویروں کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ پڑھا

ں جاتا تھا، جیسے سورج کی تصویر بنانا اور اُسے "سورج" پڑھنا۔ جس چیز کی تصویر ہو اُس کو اُسی نام سے پکارنا، ایسے
شان کو "تصویری لفظ" (WORD - SIGN) کہتے ہیں۔ یعنی تصویر جو پورے لفظ کا مفہوم ادا کرتی ہے۔

اس کے بعد ایک ایسی منزل آئی جب تصویر کے نام اور اُس کے معنی میں باہم کوئی تعلق نہ رہا یعنی جس چیز کی تصویر ہوتی
ہ اُس سے وہ چیز مراد نہ ہوتی تھی بلکہ اُس تصویر کے نام کے ہم آواز کسی اور لفظ کا مفہوم مراد لیا جاتا تھا جیسے (انگریزی
بان میں) سورج کی تصویر بناکر بجائے SUN (سورج) کے SON (بیٹا) مراد لینا۔ اس طریقے کو REBUS SYSTEM
ہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت سے لفظوں کو لکھنے میں آسانی ہوگئی ہے کیونکہ ہر لفظ کی تصویر نہیں بنائی جاسکتی، مثلاً انگریزی کا
یک لفظ ہے (BELIEF) جس کے معنی "عقیدے" کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی تصویر نہیں بنائی جاسکتی اس لئے
"ریبس والے طریقے" کی مدد سے اسے یوں لکھنے لگے :۔



BEE (شہد کی مکھی) + LIEF (پتی) = BELIEF

اسی طرح کے انگریزی زبان کے چند اور الفاظ اور جملے جنھیں تصاویر کی مدد سے ظاہر کرسکتے ہیں یہ ہیں :۔

PEN -	MAN	SHIP		=	خوش خطی
قلم	آدمی	جہاز			
I	CAN	NOT	FLY	=	میں نہیں اُڑ سکتا
آنکھ	پیپا	گرہ	مکھی		
I	CAN	SAW	WOOD	=	میں آری سے لکڑی
آنکھ	پیپا	آری	لکڑی		کاٹ سکتا ہوں

مگر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ طریقہ اُنہی زبانوں میں مستعمل ہوسکتا ہے جن میں الفاظ کے متعدد معنی ہوں یا جس میں مختلف معنی
رکھنے والے الفاظ کی آواز ایک ہو (HOMO PHONES) جس زبان میں ایسے الفاظ نہ ہوں گے یا کم ہوں گے اسمیں
اس طریقہ سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ اس کے برعکس ایک دوسری صورت یہ ہے کہ کسی زبان میں ایک ہی خیال کے لئے بہت سے
الفاظ موجود ہوں (POLY PHONES) اس صورت میں ایک ہی تصویر کی (جو ایک تخیل کی حامل ہوگی) متعدد آوازیں ہوں گی
کسی لفظ کو لکھنے کے لئے ہم اُسے سادہ مفرد آوازوں میں تقسیم کرتے ہیں اور ان آوازوں کو ظاہر کرنے والے نشانات کو
حروف کہتے ہیں۔ یہ حروف دو قسم کے ہوتے ہیں حروف صحیح (CONSONANTS) اور حروف علت (VOWELS)
علاوہ ازیں الفاظ کی تقطیع کا ایک طریقہ اور ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ اگر لفظ (NOVEL) کے ٹکڑے یوں N-O-V-E-L
(اس میں دوسرے اور چوتھے حروف، حروفِ علت ہیں، بقیہ حروفِ صحیح) کرنے کی جگہ اس طرح کریں NO-VE-EL
(یا NO - VEL) تو ان ٹکڑوں کو ارکان لفظ (SYLLABLE) کہیں گے۔

قبل اس کے کہ انسان نے حروف صحیح اور حروفِ علت کی علامتیں وضع کیں اُس نے ارکانِ الفاظ کے لئے نشانات وضع
کئے۔ ان کے وضع کرنے میں "ریبس والے طریقے" سے مدد لی گئی یعنی بسا اوقات جب کسی لفظ کے ٹکڑے کئے گئے تو معلوم ہوا کہ

اُس کے ہر نقش کے معنی ہیں جس کی تصویر بنائی جا سکتی ہے۔ جیسے مذکورہ صدر انگریزی لفظ BELIEF میں آواز EE کے معنی "شہد کی مکھی" اور LEAF کے معنی "پتی" کے ہیں لیکن ان تصویروں کے ظاہری مفہوم کو نظر انداز کر کے تصویروں کے مجموعی نام سے جو دوسرا لفظ بنتا ہے وہ مراد لیا گیا — جس رسم الخط میں ارکانِ الفاظ کے نشانات کام آتے ہیں اُسے (SYLLABARY) کہتے ہیں اور جس میں حروفِ صحیح اور حروفِ علت اُسے (ALPHABET) کہتے ہیں۔

حروف کی ایجاد میں ایک خاص طریقے سے مدد لی گئی، جسے (ACROPHONY) کہتے ہیں، یعنی بعض تصویری الفاظ چن کر اُن کے ناموں کی شروع کی آوازیں لے لیتے ہیں اور بقیہ کو حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً عربی رسم الخط کے پہلے حرف (الف) کے معنی بیل کے ہیں گویا وہ ایک لفظ ہے لیکن اسے جب کسی دوسرے حرف سے ملاتے ہیں تو شروع کی آواز "آ" لے آتے ہیں اور بقیہ آوازیں "لْ" اور "فْ" کو حذف کر دیتے ہیں۔

یہاں تک تو صرف تمہید یا تعارف تھا، اس کے بعد ہم تفصیل کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ موجودہ فنِ تحریر کی ابتدائی و اساسی شکلیں مختلف ممالک و اقوام میں کیا تھیں، اور پھر وہ رفتہ رفتہ کن تبدیلیوں کے بعد انھوں نے موجودہ شکل اختیار کی۔

امید ہے کہ ہم اس مضمون کو بالاقساط دسمبر ۵۳ء تک پورا کر دیں گے۔

(باقی) محمد اسحاق صدیقی

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

"فرمانروایانِ اسلام" نمبر ہوگا

جو اُردو میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہوگی - اس میں آغاز اسلام سے لیکر زمانۂ حال تک کی ان تمام چھوٹی بڑی مسلم حکومتوں کا مختصر حال درج ہوگا، ہر حکمراں خاندان کے فرمانرواؤں کی فہرست ہوگی جس میں ان کے نصب و عزل کو ہجری اور عیسوی سالوں کی مطابقت کے ساتھ ظاہر کیا جائے گا۔

یہ گویا ایک انسائکلوپیڈیا ہوگی جس کے ذریعہ سے آپ ہزاروں فرمانروایانِ اسلام کے نام، سیکڑوں مسلم حکومتوں کے عروج و زوال کی تاریخ آسانی سے معلوم کر سکیں گے۔

کرۂ ارض کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں مسلمانوں کے قدم نہ پہونچے ہوں، لیکن بہت کم ہیں جن کو ان فاتحانہ اقدامات کا علم حاصل ہے — یہ سالنامہ مسلم حکومتوں کی ہزاروں سال کی تاریخ کا ایسا مکمل نقشہ ہوگا کہ اس کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی دوسری کتاب کی ورق گردانی کی ضرورت نہ ہوگی — یہ سالنامہ نہ صرف تاریخ کے طلبہ، اساتذہ، تصنیف و تالیف کے شائقین بلکہ عوام کے لئے بھی حد درجہ ضروری و دلچسپ چیز ہوگی۔

منیجر نگار

یادِ رفتگاں

(داغؔ کے چند مخصوص رامپوری تلامذہ)

احسانؔ رامپوری = منشی احسان علی خاں ولد منشی اکرام الدین علی خاں۔ سنہ ۱۲ھ میں پیدا ہوئے، عربی فارسی میں اچھی استعداد تھی، شاعری میں داغؔ کے شاگرد تھے، چونکہ اُستاد سے خصوصیت تھی اس لئے فراش خانہ سرکاری میں یہ بھی ملازم ہو گئے، زیادہ وقت استاد کے ساتھ گزرتا۔ ان کو سوز خوانی اور نوحہ اور سلام کہنے کا بھی شوق تھا، غزل، قصاید، مثنویات، رباعیات وغیرہ جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، استاد کی روش کو نباہنے کی پوری پوری کوشش کی۔ زبان کا جو لطف ان کے کلام میں پایا جاتا ہے، اُس کی مثال دوسرے شاگردان داغؔ میں مشکل سے ملے گی، بہت زود گو تھے متعدد تصانیف کیں مگر ان کے انتقال کے بعد ورثاء نے جملہ کتب بازار میں فروخت کر دیں اب صرف ایک دیوان قلمی باقی ہے جس میں جملہ اصناف سخن پائے جاتے ہیں رامپور میں ان کے شاگرد بہت تھے، بعمر ۶۵ سال سنہ ۱۹۰۰ء میں انتقال ہوا۔

منشی ممتاز علی آہؔ (مولف سوانح عمری امیر مینائیؔ صفحہ ۲۴ و ۲۵) لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۸۹۱ء کا زمانہ وہ تھا کہ رامپور میں منشی صاحب (امیرؔ) منشی امیر اللہ تسلیمؔ مرحوم اور آغا میرزا شاغلؔ مغفور (برادر فصیح الملک) کے سوا استادوں میں کوئی نہ تھا، داغؔ، جلالؔ، شاغلؔ اور تسلیمؔ کے تلامذہ نے باہم مشورہ کرکے ایک ماہوار مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔۔۔۔ حضرت سے اجازت لی، مشاعرے ہونے لگے جس میں تسلیمؔ مرحوم اور شاغلؔ مرحوم بھی غزل کہتے اور شرکت فرما کر مشاعرے کو رونق بخشتے۔۔۔ طرح حضرت (امیرؔ) نے دیوان امیرؔ سے "ہلال کے"، "کمال کے" نکالی۔۔۔۔ چند روز کے بعد اثرؔ اور رازؔ وغیرہ (شاگردانِ امیرؔ) نے ذکر کیا کہ احسانؔ تلمیذ داغؔ کہتے ہیں اگلے میں نے دو غزلیں کہی ہیں ایک لکھنؤ والوں کے رنگ میں، دوسری دلّی والوں کے رنگ میں۔ احسانؔ مرحوم کے اس طنز کو امیر مینائیؔ نے محسوس کیا اور آہؔ کو مجبور کرکے غزل کہلوائی" اب احسانؔ کی دہلوی اور لکھنوی رنگ والی غزلوں کے اشعار ملاحظہ کیجئے جس سے اندازہ ہوگا کہ رام پور میں جو مذاق شاعری پیدا ہو چکا تھا اُس کے تحت شاگردانِ داغؔ بھی لکھنوی اسکول کا مذاق اُڑاتے تھے۔

غزل لکھنوی رنگ میں

لائے ہیں دام زلف سے دل کو نکال کے — آئی بلا کو آئے ہیں ہم سر سے ٹال کے
وحشت میں دھن بندھی ہے لکھوں وصف چشم یار — خامے بنا رہا ہوں میں شاخ غزال کے
کیوں پیچ اُٹھاؤں کاکل پیچاں کو دے کے دل — صدمے مری بلا سہے رنج و ملال کے

غزل دہلوی رنگ میں

جس ناتواں سے ناز تمہارے نہ اُٹھ سکے — کس طرح وہ اُٹھائے گا صدمے ملال کے
جھپکے گی برق طور سے ہرگز نہ میری آنکھ — جلوے نگاہ میں ہیں کسی کے جمال کے

ان کے کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو :-

کچھ عجب حال ہے جب سے اُسے دیکھا کیا ہے — ہم نہیں آپ میں احساںؔ یہ تماشا کیا ہے
شکرِ جفا کو شکوہ سمجھ کر خفا ہوا — لو میں نے کیا کہا بتِ بدظن نے کیا سُنا
پردہ ڈھک دے اجل آکر کہیں بیچاروں کا — حال دیکھا نہیں جاتا ترے بیماروں کا
کاش اس سے تو بے زباں ہوتے — حرف مطلب کبھی ادا نہ ہوا

کیا کہیں ہجر بُرا اور وصال اچھا ہے   یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے
میں تم سے کیا کہوں جو مرے دل کا حال ہے   اللہ کی قسم مجھے صدمہ کمال ہے

دلیر۔ سید امیر حسن ولد سید الطاف حسین مارہروی سال ولادت [illegible] ہے۔ استعداد علمی معقول تھی پہلے مضطر خیر آبادی کے شاگرد ہوئے پھر نواب مرزا داغ کے ــــــ روز مرہ میں بے تکلفی اور کلام میں روانی اور زبان میں صفائی پائی جاتی ہے، ۱۹۱۰ء کے قریب رامپور آکر ملازم ہو گئے۔ دلیر نے ہزلیات کا مجموعہ بھی چھوڑا، بقول احسن مارہروی مرحوم داغ کے بہترین شاگرد تھے۔ (انشائے داغ)

روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں   بیٹھے بٹھائے آج مجھے ہو گیا ہے کیا
ہیں سب خیال و خواب کی باتیں یہ ہمنشیں   آنکھوں میں رہ گیا نہ کوئی دل میں رہ گیا
دم نکل جائے تو ہو ہجر کی مشکل آساں   موت کام آئے اگر آج تو کچھ کام چلے
ظلمتِ شام جدائی کب ہٹائے سے ہٹے   سامنے آنکھوں کے اک دیوار ہو کر رہ گئی
افسوس دل کا حال کوئی پوچھتا نہیں   کہ رہے ہیں سب تری صورت بدل گئی

رسا۔ منشی حیات بخش، موضع کاسنہ ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے، استعداد علمی رسمی تھی، تعلیم سے فارغ ہوکر سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے، شعر و سخن سے دلچسپی ہوئی تو نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے شاگرد ہو گئے، ۱۸۸۵ء میں تحصیل مصطفےٰ آباد، مین پوری میں تعینات تھے اور ۱۸۸۹ء میں شکوہ آباد میں محرر جوڈیشل تھے، گلدستوں میں آپ کا کلام طبع ہوتا رہا۔ آخر ۱۹۰۰ء میں رسا رام پور آئے اور سرکاری مشاعرے میں جو شہر کے اہتمام سے منعقد ہوتے تھے شریک ہوئے۔ یکم دسمبر ۱۹۰۰ء کے مشاعرہ میں جو غزل پڑھی تھی اُس کا مطلع درج ہے ؎

آئے دن تکرار شب ہے آئے دن تکرار صبح   اب تو یا اقرار شب ہو ہم سے یا اقرار صبح

یکم جنوری ۱۹۰۱ء کو جو سرکاری مشاعرہ ہوا وہ ہندوستان کے مشہور مشاعروں میں ہے، کثیر تعداد میں بیرونی شعراء شریک ہوئے۔ رسا بھی شریک مشاعرہ تھے آپ نے جب طرحی غزل کا یہ شعر پڑھا ؎

تم عرض مدعا پر میری زباں نہ کھینچو   ہاتھوں میں کچھ نہ جائیں کانٹے زباں پر ہیں

مضطر خیر آبادی نے انتہا سے زیادہ داد دی، اس کے بعد یہ مضطر کی سفارش سے سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے اسی کے ساتھ وکالت کی استدعا ہوئی۔

انتخاب کلام یہ ہے :-

رسا مانو خدا کو یا بتوں کے دل میں گھر کر لو   یہ دو دن زندگی کے جس طرح چاہو بسر کر لو
نصیب اُن کا ہٹاتے ہیں جو زلفیں روئے روشن سے   سحر کو چھپکے چھپکے منہ تمہارا دیکھنے والے
اُس بُت نے جو پیار سے نظر کی   کچھ بھی نہ چلی دل و جگر کی
کر لی ہیں جو اُن سے چار آنکھیں   اب اور ہوا ہے نامہ بر کی
نہ دیر میں ہمیں راحت، نہ چین کعبے میں   ٹھہرنے دے گا نہ اس دل کا اضطراب کہیں
تصور ہی سے اُن کے دو گھڑی دل کو تسلی دوں   مجھے اتنی تو فرصت دے کسی دن بیخودی میری
کیوں کر نہ ہوں ہم ہجر میں ممنون تمنا   سو بار ہمیں آپ کے گھر لے کے گئی ہے
سوجھی ہے جنوں میں ہمیں کعبے کے سفر کی   وحشت ہمیں اللہ کے گھر لے کے گئی ہے

میرا نہیں ہے کوئی کسی کا نہیں ہوں میں — اس طرح ہوں جہان میں گویا نہیں ہوں میں
ترے وعدے کا ہے مجھ کو یقیں، لیکن یہ کھٹکا ہے — کہیں دھوکا نہ دے جائے مجھے عمرِ رواں میری
ذکرِ وفا پہ آپ کو شرمِ جفا ہے کیوں — اک بات تھی کہ میری زباں سے نکل گئی

شاغل — محمد آغا مرزا خلف آغا تراب علی برادر اخیافی نواب مرزا خاں داغ۔ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئے، دہلی ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی، نہایت خوش فکر اور ذہین و طباع تھے علمی قابلیت رسمی تھی لیکن دہلی کی فضائے ادب نے اس کمی کو پورا کر دیا دہلی کے نوجوان شعرا میں یہ بھی مرتبۂ امتیاز رکھتے تھے۔ ہنگامۂ غدر میں یہ بھی رام پور آئے تھے۔ نواب مرزا خاں داغ ان سے بہت محبت کرتے تھے، بھائی کے ساتھ یہ بھی نواب کلب علی خاں کے ساتھ سفرِ حجاز میں تھے اور حج سے مشرف ہوئے، شاغل کی پروازِ طبع داغ سے علیحدہ ہے۔

رام پور میں (۱۸۹۱ء[1]) شاغل کا مرتبۂ استادی امیر، جلال و تسلیم کے برابر تسلیم کیا جاتا تھا، نواب مرزا خاں کے سفر کلکتہ جون ۱۸۸۲ء سے قبل یہ سفر بنگالہ کر چکے تھے، داغ اپنے مکتوب[2] ۱۰ راگست ۱۸۸۹ء میں نواب کلب علی خاں کو دہلی سے تحریر کرتے ہیں:

"چوں برادرم آغا مرزا ہنوز از مقام ڈھاکہ دریں جانہ رسیدہ است و بغیر تاں نہایت ہرج کارہاست و جواب تار برقی ہم نرسیدہ است کمال تفکر لاحق گردید"۔

ان کے بیٹے محمد غالب مرزا عرف امراؤ مرزا داغ (اپنے چچا) کے ساتھ حیدر آباد دکن جا کر مقیم ہو گئے تھے مگر شاغل کی قناعت پسند طبیعت نے رام پور کو نہیں چھوڑا، بزریا ہمت خاں میں مکان تھا، محمود خاں محمود رام پوری (شاگرد داغ) سے خصوصی تعلق تھے، نہایت خاموش، متین طبیعت پائی تھی، دیوان موجود تھا مگر ان کے انتقال کے بعد مرزا خورشید عالم ان کے اخیافی بھائی حاصل کر لیا، معلوم نہیں پھر کیا ہوا۔ ۱۳۱۵ھ میں بعمر ۹۹ سال رحلت کی اور مزار مولانا[3] جمال الدین صاحب کے قریب دفن ہے مولوی الٰہی بخش غریب شاگرد امیر مینائی نے ان کی یہ تاریخ وفات کہی ہے:-

عجب تھے شاعرِ نامی، عجب تھے رمزداں فاضل — سخن میں، فقر میں اک صاحبِ ادراک تھے شاغل
جہاں میں جس طرح وہ آشنائے بحرِ عرفاں تھے — محیطِ شاعری میں ایسے ہی تیراک تھے شاغل
غریب اس دارِ فانی سے گئے جب سوئے جنت وہ — کہی تاریخ یہ میں نے، بدی سے پاک تھے شاغل

۱۳۴۱ ۱۳۱۵ھ ۱۶

انتخاب کلام یہ ہے:-

نیچی نظروں سے نہ ہر اک کو خدا را دیکھئے — خاک میں مل جائے گا سارا زمانا دیکھئے
کیا کہوں گا داورِ محشر نے گر اتنا کہا — لیجئے یہ نامۂ اعمال اپنا دیکھئے
گو تڑپتا ہے وطن جانے کو جی شاغل مگر — دیکھی ہے جس کی بہار، اُس کی خزاں کیا دیکھئے
بتائیں کس زباں سے ہم خزاں دیدہ وطن اپنا — نہ اُجڑے یوں کسی کا جس طرح اُجڑا وطن اپنا
آخر کوئی حد بھی ترے اے عمرِ رواں ہے — ہر دم کا سفر اب تو مسافر پہ گراں ہے
کیوں نہ ہو ناز مجھے حالِ زبوں پر اپنے — جو مجھے دیکھنے آئے گا وہ رو جائے گا
گر یہی خود روی دل ہے تو شاغل اک دن — دو جہاں سے تجھے کمبخت یہ کھو جائے گا
اک دل ملا ہمیں جو کبھی شادماں نہیں — اک دل انھیں ملا کہ غمِ دو جہاں نہیں

---

[1] سوانح عمری امیر (آہ) صفحہ ۲۴ و ۲۵ — [2] انشائے داغ صفحہ ۱۲ و ۱۳ — [3] خیابانِ مسرت — مخطوطہ

غم نے جینے نہ دیا شوق نے مرنے نہ دیا ایک دم چین سے ان دو نے گزرنے نہ دیا
دیکھ لیتے دمِ آخر تجھے ہم جی بھر کے اتنا وقفہ تری سفاک نظر نے نہ دیا
قیامت میں وہ میرا منہ تکیں اور خوش نگاہی سے خدا کے واسطے میں باز آیا داد خواہی سے
کیا انفصالِ حشر کیا اک نگاہ میں دیکھا جدھر کو جان نہ تھی دادخواہ میں
وہی کوچہ، وہی قاتل، وہی دشمن، وہی رشک لے چلے کس طرف اے حضرتِ دل تم مجھ کو
ملے جو ہمدمِ دیرینہ کوئی تو پوچھیں، ہم اپنے دل پہ بھی، رکھتے تھے اختیار کبھی

شبیر۔ صاحبزادہ محمد شبیر علی خاں خلف نواب کلب علی خاں خلد آشیاں ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوئے چار سال کے نہ ہوئے تھے کہ مہربان باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، کتب درسی کی فراغت کے بعد شعر گوئی شروع کی، فصیح الملک داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے ان کا کلام بیشتر وارداتِ قلبی کا ترجمان ہے ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۲ء تک دہلی میں مقیم رہے اور بیخود دہلوی سے تلمذ اختیار کیا پھر رام پور آکر آنریری مجسٹریٹ ہوگئے ریاست رام پور سے وظیفہ پاتے تھے، معاصرین سے بہت خوشگوار تعلقات تھے ۴۹ سال کی عمر میں طویل علالت کے بعد ۱۹۳۱ء میں انتقال کیا، دو دیوان قلمی موجود تھے مگر ضایع ہوگئے، شاگردوں میں جلیل احمد خاں جلیل نعمانی و جمیل احمد خاں جمیل و ضبط ربانی وغیرہ ہیں چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں :-

مری بلا سے گرے برق یا چلے آندھی، غم آشیاں کا ہو کیا، میں جب آشیاں میں نہیں
مجھ سے حالِ دلِ بیمار سنایا نہ گیا جب وہ آئے مرے گھر ہوش میں آیا نہ گیا
اُس کا شکوے پر یہ کہنا، دل میں کٹ جانا مرا شکوہ کس منہ سے کیا، چاہا تھا کس دل سے مجھے

عظمت۔ محمد عظمت علی خاں فرزند دوم اصغر علی خاں، ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ کو رامپور میں پیدا ہوئے، فارسی عربی کی درسی کتب متداولہ، مولوی حسن علی اور مولوی ولی محمد خاں بسمل سے پڑھیں۔

اس زمانہ میں رام پور اہلِ کمال کا مخزن تھا گھر گھر شعر و شاعری کا چرچا تھا یہ بھی نواب مرزا خاں داغ کے شاگرد ہوگئے، مغرب سے دس گیارہ بجے شب تک اُستاد کی صحبت میں رہتے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں ریاست کی فوج میں ملازم ہوگئے، ۱۸۸۲ء میں مہاراجہ اندور، اپنے ساتھ اندور لے گئے، وہاں مختلف اعلیٰ عہدوں پر سرفراز ہوئے۔ ۶ نومبر ۱۹۰۶ء کو اندور ہی میں پاؤں کے زخم سے انتقال ہوا۔

دیوان قلمی موجود تھا جو اب غائب ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :-

راتیں گزر ہی جائیں گی، دن کٹ ہی جائیں گے اے سوزِ ہجر، صبرِ محبت کی جان پر
اب رشکِ غیر ہے نہ تری التجا مجھے قسمت سے مل گیا دلِ بے مدعا مجھے
وہ بھی نکل کے سینے سے لب تک نہ آسکی جس آہِ دل گداز کا تھا آسرا مجھے
عظمت یہ بے خودی نہیں بے وجہ بے سبب پھر یاد کوئے یار کی آئی ہوا مجھے

فیروز۔ فیروز شاہ خاں خلف اکبر شاہ خاں، ۱۸۶۰ء میں آپ رام پور میں پیدا ہوئے۔ کتب درسی مختلف اساتذہ سے پڑھیں شاعری کا شوق ہوا تو نواب مرزا خاں داغ دہلوی کو استاد بنایا۔ مشق سخن اس قدر کی کہ نوجوان طبقۂ شعراء میں خاص درجۂ امتیاز حاصل کرلیا۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء میں ایک مجلس ادب بھی قایم کی، ایک علمی و ادبی رسالہ جاری کیا جس کا نام "چودھویں صدی (۱۳۰۸ھ)" تھا۔ فصیح الملک کے خصوصی شاگردوں میں تھے جب خلد آشیاں کے انتقال کے بعد داغ رام پور سے چلے گئے تو عزیز شاگرد سے مراسلت کا سلسلہ جاری رکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی باعث فیروز نے استاد کے گرامی نامہ کا جواب نہ دیا تو اُس کی شکایت فصیح الملک داغ

نے امیرمینائی کو لکھی -

داغ دوران قیام رامپور میں خطوط کا جواب اکثر انھیں سے لکھواتے تھے، چنانچہ ان خطوں کی نقلیں اب برآمد ہوئی ہیں اور (مولانا عرشی ان خطوں پر مضمون لکھ چکے ہیں) تاریخ گوئی میں بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے - کلام کا نمونہ یہ ہے :-

تری آنکھوں میں ہے اعجاز کا انداز نیا مجھ کو جینے نہ دیا غیر کو مرنے نہ دیا،
کیا پوچھتے ہو مجھ سے مرے دل کی آرزو، خود دیکھ لو، فقیر کی صورت سوال ہے
دردِ دل سُن کے اُسے رحم کچھ آہی جاتا داستاں غم کی مگر مجھ سے سُنائی نہ گئی
پھر ہو رہی ہیں وحشتِ دل میں ترقیاں پھر آرہا ہے باغ میں موسم بہار کا

گوہر - ذوالفقار علی خاں خلف عبدالعلی خاں، انگریزی، اُردو، فارسی میں اچھی استعداد ہے، مولانا محمد علی جوہر کے برادر بزرگ اور قادیانی طبقہ کے ممتاز افراد میں شمار ہوتا ہے آج کل راولپنڈی میں مقیم ہیں، داغ کے قیام رام پور کے زمانہ میں شاگرد ہوئے مولانا محمد علی مرحوم اس واقعہ کی تفصیل اس طرح لکھتے ہیں :-

" خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا شوق ہوا تین چار عزیز داغ کے شاگرد ہوگئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں اور اُن کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق تھے، گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی ازراہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کردیا تھا تاکہ وظیفہ محض کار بے کاراں کی نذر نہ ہو یہ میرے مکان کے عقب میں (اصطبل) تھا اس لئے روز ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی اُس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا "

گورنمنٹ کی ملازمت میں رہ کر انسپکٹر آبکاری کے عہدہ سے پنشن لی، فصیح الملک کے خاص شاگردوں میں شمار ہے - نمونۂ کلام یہ ہے

مجھے اے ضبطِ غم سر پھوڑنے دے شور کرنے دے مجھے رو رو کے مرنا ہے مجھے رو رو کے مرنے دے
دلِ بیمار تیرے حلقۂ گیسو سے کیا نکلے یہ ہے قسمت کا پھندا جو نہ جینے دے نہ مرنے دے
کمی کرنا نہ تو اے آبِ خنجر تشنہ لب ہوں میں مرے سر سے اگر پانی گزرتا ہے گزرنے دے

محمود - محمود علی خاں خلف مولوی اشرف علی خاں، رام پور میں ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے، کتب فارسی و عربی مختلف اساتذۂ رام پور سے پڑھیں اور فارسی میں اشعار موزوں کرنے لگے، ان کے استاد سید منصور علی نے مادری زبان میں شعر کہنے کا مشورہ دیا نواب مرزا خاں داغ دہلوی سے آپ کے والد کے خصوصی تعلقات تھے - اس لئے داغ کے شاگرد ہوگئے - آپ روزانہ استاد کے یہاں جاتے اور استاد ان پر شفقت فرماتے، ۱۸۸۸ء میں جب رام پور سے فصیح الملک رخصت ہوئے تو بھی اصلاح کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ ۱۳۱۰ھ میں یہ حیدر آباد پہونچے اور میر محبوب علی خاں مرحوم سے مشاعرہ میں داد حاصل کی، حیدر آباد میں ان کی شاعری کا چرچا ہونے لگا - آغا مرزا شاغل مرحوم سے بہت گہرے تعلقات تھے بعد نماز مغرب آجاتے اور رات کے گیارہ بجے تک آپ کے مکان پر بیٹھے رہتے، ایک مرتبہ شاغل مرحوم سے فصیح الملک کچھ کشیدہ ہوگئے آپ نے اپنی غزل کے ساتھ ۹ رجب ۱۳۱۱ھ شاغل مرحوم کی غزل سے مقطع نکال کر برائے اصلاح بھیجی، فصیح الملک تاڑ گئے اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :-

" تم نے آغا صاحب کی غزل مقطع نکال کر بھیجدی تھی مگر ہم سمجھ گئے "

ان کی ایک غزل پر اصلاح کے سلسلہ میں فرماتے ہیں :-

" دونوں غزلیں کیا خوب ہیں خصوصاً پہلی غزل پر تو مجھ کو بھی رشک آیا "

اس غزل کا مطلع یہ ہے :-

کہتے ہیں کہتے ہو کیا جی سے گزرنے کے لئے ہم سلامت ہیں تو ہیں سیکڑوں مرنے کے لئے

مکتوب ۲۰ رمئی ۱۸۹۴ء میں اس غزل کے متعلق جس کا مطلع ذیل میں درج ہے لکھتے ہیں :-

"کیا خوب غزل کہی ہے ایسی غزل کوئی اور کہے تو جانوں"

دو فتنہ گر ہیں ایک مرا دل ہے کیا کرے تم سے گلہ کرے کہ فلک سے گلا کرے

رام پور میں آپ کے دم سے شاعری کا کافی چرچا رہا، سیکڑوں شاگرد ہوئے جن میں قابلِ ذکر رشید احمد خاں رشید، ابراہیم علی خاں عرف بدن خاں قہر، سید حامد علی شرق زیدی اور صاحبزادہ واجد علی خاں عرف اچھن صاحب اشک ہیں۔

۱۹۳۴ء مطابق ۱۲ر شعبان ۱۳۵۳ھ میں انتقال ہوا۔ دیوان قلمی آپ کے بھتیجے قہر رامپوری کے پاس موجود ہے۔

انتخاب کلام یہ ہے :-

آنسو بھرے ہیں آنکھ میں اُس مستِ حسن کی لبریز کس کی عمر کا پیمانہ ہوگیا

میں کچھ اس طرح ترے در سے پلٹ کر آیا کہ مجھے دیکھ کے غیروں کا بھی جی بھر آیا

اب ہے یہ ضعف کی حالت کہ ترستے ہیں ہم ہاتھ اپنے دلِ بیتاب پہ دھرنے کے لئے

جب وہ فرماتے ہیں کیوں جیتے ہو کہ دیتا ہوں آپ کی جان سے دور، آپ پہ مرنے کے لئے

اُلفت میں جو ہو جاتا ہے وہ حال ہے میرا یہ دیکھنے والے مجھے کیا دیکھ رہے ہیں

تم شکل سے ہو ہماری، بیزار اللہ اب ایسے ہو گئے ہم

جب کہا اُس نے آج کیوں چپ ہو پھر شکایت کا حوصلہ نہ ہوا

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں ہم وحشت میں ہائے دامن نہ ہوا، ہائے گریباں نہ ہوا

زاہد یہ چھیڑ خوب نہیں ہے خدا سے ڈر توبہ کے بعد پوچھنا میخوار کا مزاج

پہچان کی جو بات ہے بس وہ نہ پوچھئے یہ کہدیا کہ آتے ہیں دشمن کے گھر سے آپ

یہ تلوّن ہو تو کیا لطفِ اسیری صیاد کہ ادھر قید کیا اور اُدھر چھوڑ دیا

نجف ۔ حافظ محمد علی نجف خلف حافظ علی احسن قاصر ۱۲۶۶ھ میں پیدا ہوئے، ۱۴ برس کی عمر میں کتب فارسی اور صرف ونحو عربی سے فراغت پائی۔ ۱۸۶۹ء میں اپنے استاد خواجہ محمد بشیر کے پاس آرہ چلے آئے۔ دو سال تک ان کے پاس رہے اور لوٹے، کچھ دنوں رام پور رہ کر ۱۸۷۲ء میں کلکتہ گئے اور وہاں مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔

جون ۱۸۸۲ء میں فصیح الملک داغ کے جانے پر جو مشاعرے کلکتہ میں منعقد ہوتے تھے ان کے مہتمم یہی ہوتے تھے ۱۲۹۹ھ میں فصیح الملک داغ کے عقیدت مندوں میں شامل ہوگئے، ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۲ء میں داغ کے سفر کلکتہ کے بعد شرکاء مشاعرہ کے حالات میں ایک تذکرہ غنچۂ ارم کے نام سے کلکتہ سے شایع کیا، نواب کلب علی خاں نے رام پور آنے پر روک لیا اور سالانہ وظیفہ مقرر کردیا۔ ۱۳۰۶ھ میں انتقال ہوا، دیوان قلمی ضایع ہوگیا۔ رنگ کلام یہ تھا :-

مجھے کھلتی جب حقیقت مرے درد و غم کی ناصح ترے پہلو میں جو میرا دلِ بیقرار ہوتا

تصویر دل کی پھر گئی آنکھوں کے سامنے رُخ پر جو اُن کے زلفِ معنبر بکھر گئی

کل تھی سینے میں جستجو دل کی آج پہلو میں ہے جگر کی تلاش

آخر ایامِ جدائی کی بھی حد ہے کہ نہیں کب تک اللہ رہے گی یہ مصیبت باقی

وفا - حکیم مولوی عبدالہادی خاں خلف یعقوب خاں سنہ ۱۸۶۲ء رام پور میں پیدا ہوئے اور علوم متداولہ میں جلد ہی فراغت حاصل کرلی حکمت وفلسفہ میں مولوی عبدالحق خیرآبادی سے تکمیل کی، طب اپنے ماموں حکیم محمد حسین خاں سے پڑھی شاعری کا شوق ہوا تو ابتدائی چند غزلیں فصیح الملک داغ کو دکھائیں پھر امیر مینائی سے تلمذ اختیار کیا لیکن اپنی جدت پسند طبیعت کے باعث غالب و مومن کے رنگ میں کہنے لگے علیگڈھ میں بہ سلسلہ مطب قیام تھا، یہیں مولانا حسرت موہانی مرحوم سے تعلقات دوستانہ استوار ہوئے، رام پور میں بیمار رہ کر سنہ ۱۳۳۲ھ میں انتقال ہوا، دیوان طبع ہوگیا ہے - چند شعر رنگ داغ کے یہ ہیں :-

مانا کہ میرے پاس تک آیا نہ جائے گا — کیا غیر سے بھی ہاتھ اُٹھایا نہ جائے گا

ہے یہی مستی بے جا تو خدا خیر کرے — اُن کے ہاتھوں سے نکل جائے نہ دامن اُنکا

یہ بے کسیِ عشق وفا خاک میں مل جائے — غیروں سے مرے مرنے کا چرچا نہیں ہوتا

پلایا زہر مجھ کو غمخواری کے پردے میں — جو میرے دوستوں سے ہو چکا دشمن سے کیا ہوگا

ہائے اس بے کسیِ عشق پہ جی بھر آیا — آپ نے وعدہ کیا اور مجھے باور آیا

کلب علی خاں فائق

کیا آپ کو معلوم ہے

کہ :-

(۱) مسلم حکومتوں میں ایک حکومت اتجہ کی بھی تھی جس نے دو سو سال تک سلطنت کی

(۲) علوئین کی دو شاخیں تھیں، حسنی اور حسینی - جن میں سے حسنی شاخ کے بارہ خاندانوں نے اور حسینی شاخ کے سات خاندانوں نے علحدہ علحدہ حکومتیں قایم کیں

(۳) مسلم حکمراں خاندانوں میں ایک خاندان کا نام دانشمندیہ بھی تھا جس نے صلیبی لڑائیوں میں بڑا نمایاں حصہ لیا اور بازنطینی حکومت کی بنیاد ہلا کے رکھدی

(۴) خلفاء راشدین کے بعد جب بہ سلسلۂ فتوحات مجاہدین اسلام یورپ، افریقہ اور ایشیا کی طرف بڑھے تو انھوں نے کہاں کہاں اپنی حکومتیں قایم کیں، ان کے کیا نام تھے اور ان کا کیا انجام ہوا

(۵) جب اندلس کی اموی حکومت کو زوال ہوا تو اسپین میں کتنی چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں علحدہ علحدہ قایم ہوگئیں اور انکا کیا انجام ہوا

(۶) کہ جن لوگوں کو مملوک یا غلام کے حقیر لفظ سے یاد کیا جاتا ہے، ان کا موقف اسلام نے اتنا بلند کردیا تھا کہ انھوں نے دنیا میں متعدد زبردست حکومتیں قایم کیں اور تہذیب وثقافت کی نشرواشاعت میں نمایاں حصہ لیا ـــــ یہ اور اسی قسم کے سیکڑوں سوالات کا جواب اگر آپ چاہتے ہیں تو ـــ نگار کے آیندہ سالنامہ "**فرمانروایانِ اسلام**" نمبر کا انتظار کیجئے جو "تاریخ اسلام" کی ایک "انسائکلوپیڈیا" ہوگا -

منیجر

ڈالر اور اسٹرلنگ

(مالیاتی و تجارتی دُنیا میں)

مالیاتی و تجارتی نقطۂ نظر سے اس وقت دنیا کے ممالک دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک امریکہ، جس کا کاروبار ڈالر میں ہوتا ہے اور دوسرا وہ جن کا معیاری سکہ پونڈ (اسٹرلنگ) ہے۔ اسٹرلنگ کے معیار سے تجارت کرنے والے ممالک جن میں کناڈا کے علاوہ دولت مشترکہ کے تمام ممالک شامل ہیں "اسٹرلنگ ایریا" یا اسٹرلنگ برادری والے ممالک کہلاتے ہیں چونکہ اسٹرلنگ کا ہر ملک کے سکّہ سے ایک مقررہ قیمت پر تبادلہ ہوسکتا ہے۔ اس لئے تجارتی تعلقات کے قیام کی غرض سے اسٹرلنگ برادری والے ملکوں کو معقول نقد سرمایہ بصورت اسٹرلنگ ولایت میں رکھنا ضروری ہے۔ تاکہ آپس میں تجارت آسانی سے ہوسکے مگر اس مسئلہ کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے پہلے تجارت کے چند اصول جان لینا ضروری ہیں۔

تجارت کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو ملک کے اندر کی جاتی ہے۔ دوسری وہ جو دوسرے ملکوں سے تعلق رکھتی ہے۔ ملک کے اندر جب ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں سامان منگایا یا بھیجا جاتا ہے تو قیمت کی ادائی کے سلسلہ میں کوئی دقت نہیں پیش آتی کیونکہ پورے ملک میں ایک سکّہ رائج ہے اور بنکوں کے ذریعہ سے روپیہ بآسانی ادہر سے اُدہر منتقل ہوجاتا ہے۔ لیکن بین الاقوامی تجارت کا اصول دوسرا ہے اور وہ یہ کہ خریدکرنے والا ملک مال کی قیمت اپنے سکّہ میں ادا نہیں کرتا، بلکہ اُسی ملک کے سکّہ میں ادا کرتا ہے جہاں سے مال خریدا گیا ہے یا پھر سونے کی صورت میں۔ فرض کیجئے کہ بہ سلسلۂ تجارت امریکہ کا مطالبہ ہمارے ذمہ دو لاکھ ڈالر کا ہے، جو شرحِ تبادلہ کی رو سے پانچ لاکھ روپیہ ہوتا ہے، تو ہم اس قرضہ کو دو طرح ادا کرسکتے ہیں ایک یہ کہ ہم اپنے ملک سے اتنا سامان بھیجیں کہ اس کی قیمت خرید ہمارے سکّہ میں پانچ لاکھ روپیہ اور امریکہ کے سکّہ میں دو لاکھ ڈالر ہو، یا پھر اسی قیمت کا اسٹرلنگ امریکہ کے حساب میں منتقل کرادیں جسے امریکہ اسٹرلنگ ایریا والے ملک سے سامان خریدنے میں خرچ کرسکتا ہے۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے تاریخ کے چند اوراق پلٹنا ضروری ہیں پہلی جنگ عظیم سے قبل اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ ملکوں کی باہمی تجارت کا حساب وکتاب برابر رہنا چاہئے کیونکہ مقروض ممالک کو قرضہ کی ادائی کے لئے سونا ملک سے باہر بھیجنا پڑتا تھا اور یہ عموماً پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ کیونکہ سونا ہر ملک کو عزیز ہوتا ہے۔ پھر بھی تجارت کا پلّہ برابر رکھنے کے لئے سونے کی لین دین ہوتی رہتی تھی لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد ہر ملک میں یہ کوشش کی جانے لگی کہ ملک کی قیمتوں میں زیادہ فرق نہ ہو اور سونے کی آمد و رفت سے جو اثر اشیاء کی قیمتوں پر ہوتا ہے وہ زیادہ اور جلد جلد نہ ہو۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل Gold Standard کے زمانہ میں یعنی اس زمانہ میں جب سونے کی موجودہ مقدار کے لحاظ سے سکّے جاری کئے جاتے تھے، سونے کی آزادانہ آمد و رفت ہر ملک کی تجارت کو برابر اور متوازن رکھنے میں بہت مدد دیتی تھی۔ مثال کے طور پر الف اور ب ممالک لے لیجئے اگر الف، ب ملک کا مقروض ہوجاتا ہے تو اس کا سونا ب ملک میں جانے لگے گا اس کا نتیجہ ہوگا کہ وہاں سونا پہونچتے ہی روپیہ کی مقدار بڑھنے لگے گی جسے اصطلاح میں (Inflation) یا افراطِ زر کہتے ہیں۔ یعنی دو روپیہ کی چیز چار روپیہ میں ملنے لگے گی۔ یہ صورت پیدا ہوتے ہی ب میں الف کی چیزیں بکنے کے لئے زیادہ آنے لگیں گی۔ جبکہ ب کی بھیجی ہوئی چیزیں الف میں قیمت کم ہوجانے کی بنا پر

کم جائیں گی۔ اور الف سے آئی ہوئی چیزوں کی قیمت ادا کرنے کے لئے ب کا سونا الف ملک میں جانے لگے گا۔ غرض کہ یہ سلسلہ یونہی
قایم رہتا تھا۔ اور سونے کی آمد و رفت دونوں ملکوں کی قیمتوں کو گھٹاتی بڑھاتی رہتی تھی اور اس طرح قیمتوں کی کمی و بیشی کا اثر
پیدا وار کی لاگت پر پڑتا تھا۔ جس سے مزدوری یا اُجرت کم ہوجاتی اور عوام میں بےچینی کا باعث بن جاتی، اسی زمانہ میں ٹریڈ یونین وغیرہ
کے بن جانے سے نہ تو اُجرت کو بے انتہا گھٹایا بڑھایا جاسکتا تھا اور نہ یہ ممکن تھا کہ ایک ہی قسم کے کارخانوں میں کسی جگہ اچھی
تنخواہیں ہوں اور کسی جگہ کم۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد تجارت کے استحکام کی جگہ ملک کی اندرونی قیمتوں کے استحکام نے لے لی
اور کچھ عرصہ کے بعد گولڈ اسٹنڈرڈ کی جگہ Gold Exchange Standard نے لے لی۔ اس طرح دوسرے طریقہ میں یہ
ضروری نہیں کہ ہر ملک سونے سے براہ راست متعلق ہو بلکہ وہ دوسرے ملک کے سکہ کے ذریعہ سے سونے سے مقررہ قیمتی توازن
رکھتا ہے مثلاً ہندوستان جو سونے سے براہِ راست متعلق نہیں ہے بلکہ انگلستان کے ذریعہ سے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس طریقہ
میں ملکوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ سونا بھیجنا ضروری نہیں رہ جاتا۔ تیسرے یہ کہ اسی طریقہ میں یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف سونے
وچاندی کا سکہ رائج ہو بلکہ ان کی بجائے بیشتر جگہ کاغذ کے نوٹ اور چیک مروجہ ہوسکتے ہیں۔

یہ سمجھنے کے بعد کہ 'اسٹرلنگ ایریا' سے کیا مراد ہے یہ سمجھنا ضروری ہوجاتا ہے کہ اس ایریا سے باہر رہنے والے ملکوں کی اور
اس کی تجارتی حالت کیا ہے اور کن قوانین پر عمل کیا جاتا ہے ——— اس کو سمجھنے کے لئے دُنیا کے ملکوں کو چار حصوں میں تقسیم
کرسکتے ہیں۔

(الف) وہ ممالک جو کمیونسٹ ہیں یا کمیونسٹ ممالک کے زیر اثر ہیں ان میں روس اور چین اہم ہیں۔ ان ممالک کے تجارتی تعلقات
باہر کے دوسرے ملکوں سے بہت کم ہیں۔

(ب) دولت مشترکہ کے ممالک یا وہ جو انگریزوں کے قبضہ میں تھے اور اب بھی ان کے زیر اقتدار ہیں۔ ان میں ہندوستان
پاکستان، جنوبی افریقہ، سیلون، آسٹریلیا، کناڈا شامل ہیں۔ آسٹریلیا اور کناڈا کے علاوہ باقی تمام ممالک غیر ترقی یافتہ کہلاتے
ہیں۔ ان کی معاشی اور تجارتی حالت بہت کمزور ہے آبادی گنجان ہے زیادہ تعداد غریبوں کی ہے نباتات اور معدنیات کی کثرت
کے باوجود ان سے پورا فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا الغرض ترقی میں یہ ممالک بہت پیچھے ہیں۔ اس لئے ان کو ترقی یافتہ ملکوں کی مدد بہت
ضروری ہے۔

(ج) امریکہ اور لیٹن امریکہ (جنوبی امریکہ اور جزائر کے ممالک) آج امریکہ کی حالت تجارتی، صنعتی اور مالی اعتبار سے بہت مضبوط
ہے۔ سوا چند خام اشیاء کے اس کو دوسرے ملکوں سے کسی چیز کے خریدنے کی ضرورت نہیں۔ برخلاف اس کے غیر ترقی یافتہ ممالک کو امریکہ
کے بنائے ہوئے سامان کی سخت ضرورت ہے۔

(د) اس ضمن میں وہ ممالک سمجھے جاسکتے ہیں جو پہلے تینوں میں سے کسی میں بھی شامل نہیں ہیں۔ مثلاً اسپین، اٹلی،
سوئٹزرلینڈ وغیرہ۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد تین موقعوں پر اسٹرلنگ ایریا کے ملکوں کو امریکہ کے ساتھ تجارت کرنے میں سخت نقصان اُٹھانا پڑا
چونکہ لڑائی کے ختم ہوتے ہی یورپ کے ملکوں کو اور ان ممالک کو جہاں لڑائی ہوئی تھی اپنی معاشی زندگی کو سدھارنے، تباہ و برباد
مقامات کو پھر سے بسانے، بیکاروں کو کام سے لگانے اور اس طرح کے دوسرے تعمیری کام کرنے کے لئے سامان اور قوتِ خرید کی
سخت ضرورت تھی۔ اس لئے بہت سے ممالک امریکہ کے مقروض ہوگئے، یعنی امریکہ کے تجارتی منافع کا پلہ بھاری ہوگیا اور اسٹرلنگ
ایریا کے ملکوں کا ہلکا۔ اس حالت کو سمجھنے کے لئے دنیا کی تجارت کو دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک حصہ کا سکہ پونڈ ہے اور دوسرے
کا ڈالر۔ اگر دونوں ملکوں کی خرید و فروخت قیمتوں کے لحاظ سے برابر رہے تو یہ تجارت متوازن

ہلائے گی اور دونوں ملکوں میں سے کوئی کسی کا مقروض نہ ہوگا مگر ایسا ہونا یقینی نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے پونڈ والا ملک زیادہ ل خرید لے اور ڈالر والا ملک اتنا نہ خرید سکے کہ تجارت متوازن رہے۔ ایسے حالت میں پونڈ والا ملک ڈالر والے ملک کا مقروض ہوجائے گا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ گولڈ اسٹنڈرڈ کے زمانہ میں سونے کی آزادانہ آمدورفت اس کمی وبیشی کو پورا کردیتی تھی مگر اس کے بعد جب اسٹرلنگ ایریا کی تجارت ناموافق ہوئی تو امریکہ کا قرضہ ان ممالک پر بڑھنے لگا۔

۱۹۴۷ء میں کئی International Monetary organisations (اس میں بہت سے بین الاقوامی بنک اور ادارہ شامل ہیں جن کا مقصد تجارتی تناؤ کو کم کرنا ہے) کے وجود میں آنے سے تقریباً ۴۲ کرور ۸۰ لاکھ ڈالر اسٹرلنگ ایریا کے ممالک کو ڈالر اور سونے کی شکل میں دینے پڑے اور پہلی دفعہ ڈالر کی کمی ان ممالک نے محسوس کی جو امریکہ سے تجارتی کاروبار ضرور رکھتے تھے۔ ان ناموافق تجارتی حالت کو بہتر بنانے کے لئے یا دوسرے الفاظ میں ڈالر حاصل کرنے کی خاطر اسٹرلنگ ایریا کے ممالک نے تین باتوں پر عمل کرنا شروع کیا۔ پہلا یہ کہ اپنی صنعتی اور زراعتی پیداوار بڑھانے لگے تاکہ امریکہ سے کم سے کم چیزیں خریدلیں۔ دوسرا یہ کہ اپنے قدرتی ذرائع پیداوار زاید سے زاید کام میں لانے کی کوشش شروع کی۔ تیسرا یہ کہ امریکہ کو اپنا مال زیادہ بھیجنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس طرح ایک حد تک حالت بہتر ہوگئی مگر ۱۹۴۹ء میں ایک بار پھر یہ قرضہ بڑھنے لگا اور تقریباً ۱۹۴۷ء کے قرضہ کے برابر ہوگیا۔ جس سے امریکہ کا سامان خریدنے میں دقتیں پیش آنے لگیں۔ اس مرتبہ یہ کمی اسٹرلنگ ایریا والے ملکوں کے علاوہ دوسرے ممالک نے بھی محسوس کی —————— مگر سب سے زیادہ مقروض برطانیہ رہا کیونکہ اسٹرلنگ ایریا کا سب سے بڑا رکن یہی تھا اور اس پر سب سے زیادہ خراب اثر پڑنا ضروری تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹ ستمبر ۱۹۴۹ء کو برطانیہ نے اسٹرلنگ (پونڈ) کی قیمت گھٹا دی۔ تاکہ سستا ہونے کی وجہ سے امریکہ میں یہاں کا سامان زیادہ بکنے لگے، باہر کی چیزیں ملک میں مہنگی ہونے کی وجہ سے کم خریدی جائیں اور اس طرح برآمد درآمد کے مقابلہ میں بڑھ جائے۔ اس تدبیر سے یہ ہوتا ہے کہ زیادہ مال فروخت ہونے کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ شروع ہوجاتا ہے اور ملک کے اندر بہت سے بیکار لوگوں کو مختلف کاموں میں لگایا جاسکتا ہے۔

جب برطانیہ نے اپنے اسٹرلنگ کی قیمت کم کردی تو پاکستان کے علاوہ اس ایریا کے اور سب ممالک نے بھی اپنے سکّوں کی قیمت گھٹا دی۔ جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ برطانیہ میں ڈالر کی مقدار بڑھ گئی۔ اور امریکہ کا سامان اسٹرلنگ ایریا کے بازاروں میں کم بکنے لگا۔ اور امریکہ میں باہر کے سامان کی مانگ کچھ بڑھ گئی کیونکہ ان کی قیمتیں کم ہوگئی تھیں۔ مگر اس زمانہ کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ ان ممالک کی جو کچھ بھی حالت سنبھلی وہ صرف Devaluation کا نتیجہ تھی کیونکہ اسٹرلنگ ایریا کے ممالک نے ۱۹۴۸ء میں امریکہ کے بھیجے ہوئے مال کو ۲۵ فیصدی کم خریدنے کی اسکیم پر عمل درآمد شروع کردیا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں کوریا میں لڑائی شروع ہوجانے اور اسرائیل وعرب ممالک میں لڑائی چھڑ جانے کی وجہ سے امریکہ کے ٹین، ربڑ، اون وغیرہ خریدنا شروع کردیا اور اس طرح سے حالات موافق ہوگئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسٹرلنگ ایریا کے ممالک میں ڈالر کا ذخیرہ کافی فراہم ہوگیا۔

ہندوستان کی تجارت پر Devaluation کا پہلا اثر یہ ہوا کہ یہاں کی پیداوار کی مانگ بڑھ گئی جس میں روئی اور جوٹ کو خاص اہمیت حاصل ہے، لیکن چونکہ پاکستان اور ہندوستان تقسیم کے بعد جوٹ پیدا کرنے والے سارے حصے پاکستان میں چلے گئے تھے۔ اس لئے پاکستان نے موقع سے فایدہ اٹھاتے ہوئے جوٹ کی قیمت بڑھادی اور ہندوستان کو اس مد میں روپیہ کی قیمت گھٹا دینے سے کوئی فایدہ نہ ہوا۔ چائے میں البتہ تھوڑا فایدہ ہوا۔ لیکن مال کی برآمد کے بعد میں اس عمل سے خاص فایدہ نہ ہوا۔

۱۹۵۱ء میں ڈالر کی کمی پھر محسوس کی گئی کیونکہ اسٹرلنگ ایریا کے ملکوں میں امریکہ کی مشینوں، مشینی پرزوں، موٹر ...
انجنوں اور بجلی کے سامان کی مانگ بڑھ گئی تھی اور ساتھ ہی امریکہ سے جو ڈالر حاصل کرنے کا ذریعہ ہاتھ آیا تھا وہ بھی جاتا رہا تھا۔ ایرا...
کے تیل کے کارخانے برطانیہ کے پاس نہ رہے اور تیل خریدنے کے لئے بھی کچھ اپنے پاس سے برطانیہ کو خرچ کرنا پڑا۔ اس کا نتیـ...
یہ ہوا کہ ڈالر کا ذخیرہ جو پہلے ہی بہت کم رہ گیا تھا اور زیادہ گھٹنے لگا۔ اور اسٹرلنگ ایریا کے ممالک خاص طور پر برطانیہ کو نہ...
امریکہ بلکہ دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت کرنے میں مشکلات پیدا ہونے لگیں اور باہری مدد کی ضرورت روز بروز بڑھنے لگی۔ ...
صورت امریکہ کے لئے بھی پریشان کن تھی۔ کیونکہ امریکہ جن ملکوں سے تجارت کرتا تھا۔ اگر ان کے پاس امریکہ کا سامان خرید...
کے لئے ڈالر نہ ہوتا تو پھر امریکہ کو اپنا سامان یا دمفت بھیجنا پڑتا یا پھر تجارتی تعلقات ختم کردینے پڑتے، پہلی صورت میں جو نقصا...
امریکہ کو ہوتا وہ ظاہر ہے اور دوسری صورت میں امریکہ کی حالت اس گولی کھیلنے والے کی سی ہوتی جو سب کی گولیاں جیت کر یا ت...
کھیل بند کردینے کا ارادہ کرے یا پھر دوسرے کھلاڑیوں کو اُدھار گولیاں دینے پر راضی ہوجائے۔ ان حالات کے پیشِ نظر ا...
نے ضرورت مند ممالک کو امداد پہونچانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ مختلف بنکوں کے ذریعہ صنعتی اور زراعتی امداد کے لئے مشینیں وغ...
بھیجنا شروع کردیں۔ اور ساتھ ہی اپنے ملک کے ماہرینِ فن بھی باہر بھیجے تاکہ وہ جدید منصوبہ بندیوں میں صحیح مشورہ...
اس تدبیر سے امریکہ کے پیشِ نظر دو فایدے تھے ایک یہ کہ وہ اپنی تجارت کو قایم رکھ سکے گا اور دوسرے یہ کہ وہ ممالک جو ام...
کا سامان خریدنے پر مجبور ہیں ان پر اپنا سیاسی اثر قایم رکھ سکے گا۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ امریکہ کسی حد تک اپنی اس اسکیم
کامیاب رہا۔

۱۹۵۲ء میں جو کانفرنس دولتِ مشترکہ کے وزراءِ مالیات کی ہوئی تھی، اس میں بھی یہی مسئلہ زیرِ بحث رہا، کہ کس طر...
اس پریشانی کو دور کیا جاسکتا ہے، اور چند تجاویز بھی وقتی طور پر حالات کو سدھارنے کے لئے پیش کی گئیں۔ مگر یہ بیماری کا...
علاج نہیں ثابت ہوا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ اگر امریکہ سونے کا نرخ کم کردے یعنی پہلے جتنا سونا ایک ڈالر میں خریدا جاسکتا تھا اب نصف ڈا...
ملنے لگے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے ملکوں کے پاس ڈالر کی مقدار بڑھ جائے گی اور وہ ممالک جو امریکہ کا مال خریدتے
فایدہ میں رہیں گے، مگر امریکہ کا نقصان لازمی ہے۔ کیونکہ امریکہ کو اپنے مال کی قیمت سونے کو مدنظر رکھتے ہوئے کم ملے گ...

دوسرا حل یہ ہے کہ اسٹرلنگ ایریا امریکہ سے سامان کی خریداری کم کردے مگر جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے اسٹرلنگ ایریا...
ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے ایسا کرنے پر قادر نہ ہوگا۔ کیونکہ غیر ترقی یافتہ ممالک بغیر مشینوں کے اپنی ضروریات کو پورا نہیں کر...
اور انھیں مجبوراً یہ سامان امریکہ سے لینا پڑے گا کیونکہ اور کوئی ملک یہ سامان بہم نہیں کرسکتا۔

(آنسہ) عائشہ (ام۔ اے)

گاہے گاہے بازخواں ــــــ

شکر ہے اس وقت پاکستان میں "ملاازم" کی کمان اُتر گئی ہے
لیکن پھر چڑھ گئی تو کیا ہوگا ــــــــــــ؟

پاکستان کے اربابِ سیاست کے لئے ایک لمحہ فکریہ

اگر آج ہماری قوم سے کفش دوز، پارچہ باف، رنگریز، سونار، لوہار، بڑھئی، معمار وغیرہ معدوم ہوجائیں تو ہماری ضروریاتِ زندگی کو کتنا صدمہ پہونچے اور ان کو جانے دیجئے صرف شاعروں کو لے لیجئے کہ اُن سے زیادہ بیکار جماعت بظاہر کوئی نظر نہیں آتی، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ نہ ہوں تو ہماری بہت سی لطیف صحبتیں ختم ہوجائیں مگر خدا کے لئے کوئی بتائے کہ اگر آج روئے زمین سے اس جماعت کو فنا کردیا جائے جو ہمارے مذہب و اخلاق کی ضامن بنی ہوئی ہے تو اس سے ملک و قوم کو کیا نقصان پہونچ سکتا ہے

ہر چیز کی اہمیت کا اندازہ اس خدمت کے لحاظ سے متعین کیا جاتا ہے جو اس دنیا میں اس سے متعلق ہوتی ہے، پھر اگر وہ خدمت زیادہ اہم ہے تو اس چیز کا وجود بھی اتنا ہی اہم سمجھا جاتا ہے اور اگر وہ چنداں اہم نہیں ہے تو اس کے وجود کی بھی زیادہ پروا نہیں ہوتی یہاں تک کہ اگر کوئی چیز بیکار ہے تو وہ مٹ جاتی ہے۔

اچھا اب غور کیجئے کہ اس جماعت سے کیا خدمت متعلق ہے یا اس سے دنیا کو کیا فایدہ پہونچ رہا ہے ــــ انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک وہ جس کا تعلق مادیات سے ہے اور دوسرا وہ جو اخلاقیات سے متعلق ہے، پھر یہ تو ظاہر ہے کہ مادی زندگی کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ نہایت فخر و ناز کے ساتھ دنیا و کاروبارِ دنیا سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا کرتے ہیں، رہی اخلاقی زندگی سو آج تک یہی نہیں معلوم ہوسکا کہ وہ کس اخلاق کی تعلیم دے رہے ہیں اور دُنیا کا وہ کون سا اخلاق ہے جو انسان کو دنیا سے بیزاری کا درس دے سکتا ہے۔

اسلام کی گزشتہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء اور شاہانِ اسلام مادیات و روحانیت یعنی دنیا و دین دونوں کا مرکز سمجھے جاتے تھے اور اسی لئے اسلام میں قدرتاً وہ اُصولِ زندگی پیدا ہوگئے جو مذہب کا کاروبارِ دنیا اور ہنگامۂ حیات کے دوش بدوش لیجانے کے ضامن تھے اور یہی سبب تھا کہ اسلام کے عہدِ وسطیٰ میں جو یقیناً اس کا زریں دور تھا، ایک شخص کے لئے یہ متعین کرنا دشوار تھا کہ مسلمانوں کے اصولِ زندگی میں کس طرح خطِ فاصل کھینچکر اُن کے دین کو دنیا سے ممیز کیا جاسکتا ہے کیونکہ انکا بیٹھنا اُٹھنا، کھانا پینا، جاگنا سونا، الغرض دنیا کا ہر دنیاوی عمل مذہب ہی کے لئے تھا، جس طرح اُن کے تمام مذہبی اعمال دنیاوی ترقی کے روح رواں تھے ۔ یہی وہ چیز تھی جس نے حکمراں جماعت اور علماءِ دین کے گروہ کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر رکھا تھا اور اگر اتفاق سے کوئی قاضی یا مفتی، مولوی یا عالم حکومت کے مصالح کے خلاف کوئی فتویٰ دینے کی جرأت کرتا تھا تو اسے قید و بند میں ڈالاجاتا تھا مگر ہے کوئی شخص اسے حکومت کی زیادتی یا سلطنت کا ظلم قرار دے، لیکن جہاں تک اصولِ سیاست کا تعلق ہے اس طرزِ عمل

پر نکتہ چینی کی کوئی گنجایش نہیں پائی جاتی۔ بہر حال مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ مسلمانوں کے عہدِ ترقی میں یہ جماعت کبھی آزاد و خود سر نہیں رکھی گئی اور ہمیشہ اُن کو مجبور کیا گیا کہ وہ حکومت کے مصالح، اور سیاست کی ضروریات کو سامنے رکھ کر اپنے احکام فقہی میں تبدیلی پیدا کرتے رہیں۔ پھر یہ تو یقیناً ہوا کہ جس چیز کو سلطنت کی مصلحت بتایا گیا وہ بارہا مستبدانہ خود غرضی ثابت ہوئی لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی عالمِ دین نے اس خود غرضی کا احساس کر کے صدائے احتجاج بلند کی ہو اور اس کی زبان کو حرکت کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہو۔

پھر غور کیجئے کہ اگر مسلمانوں کی حکومت بدستور قایم رہتی اور بجائے عیسائی حکومتوں کے آج انھیں کی حکومت روئے زمین پر غالب ہوتی تو کیا آپ کہ سکتے ہیں کہ اس وقت جو حالت ہمارے یہاں کے علماء دین کی نظر آتی ہے اس وقت بھی پائی جاسکتی تھی؟ قیامت تک ممکن نہ تھا کہ وہ زمانے کا ساتھ دینے سے احتراز کرتے اور اُن کو زندہ و سلامت رہنے دیا جاتا کیونکہ ایک پاپائے روم کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی کلیسہ کی دُنیا علحدہ قایم کر کے کاروبارِ عالم سے کوئی واسطہ نہ رکھے لیکن ایک مسلمان کے دل و دماغ سے کبھی یہ بات نہیں نکل سکتی کہ اُس کا مذہب اُس کی دنیا سے علحدہ کوئی چیز نہیں اور نہ کبھی یہ بات اُس کی عقل میں آسکتی ہے کہ مذہبِ اسلام کے علاوہ ایک چیز قومیت و وطنیت اور بھی ہے جو غیر مذہب والوں کو بھی اپنے میں شامل کر کے خالص دنیوی تمدنی ترقی کے لئے زبردست مرکزیت پیدا کرسکتی ہے۔

الغرض حکومت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اگر کوئی مذہب چل سکتا ہے تو صرف اسی طرح کہ وہ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے احکام و قوانین میں بھی تبدیلی پیدا کرے ورنہ اس کا فنا ہو جانا بالکل یقینی ہے، چنانچہ آج ترکی و ایران کے حالات کو سامنے رکھ کر غور کیجئے وہاں مذہب کی کیا حالت ہے اور علمائے مذہب کس بے چارگی و بے بسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں نہ مسلمانوں کی حکومت ہے نہ اکثریت نہ جہاں علم ہے نہ واقفیت، مولوی جو چاہے کہے جو بدعت جی میں آئے کرتا پھرے، لیکن ترکی و ایران میں تو جا کر کہہ دے کہ بنک میں روپیہ جمع کرنا حرام ہے۔

اب اتنا پڑھنے کے بعد آپ پھر ابتدائی سطور پر غور کیجئے اور ٹھنڈے دل سے فیصلہ فرمائیے کہ اس جماعت سے مسلمانوں کو کیا فایدہ پہونچ رہا ہے یا اس کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ حکومت تو ان کے بس میں نہیں کہ یہ حضرات اس کا ساتھ دیکر عوام پر سلطے کے اقتدار کو قوی بنائیں اور اس کے عوض میں گرانقدر معاوضے حاصل کرتے رہیں اور چونکہ یہ خون ان کے منھ لگ گیا ہے اس لئے اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ خود اپنی ہی ذات کو دنیا و دین کا مرکز قرار دیکر عوام کو اپنی طرف بلائیں اور اس غرض کے لئے وہ سب جایز و ناجایز باتیں روا رکھیں جو انکے اسلاف نے شاہانِ اسلام کے لئے روا رکھیں تھیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ایک مولوی کے تمام تعلیمات و نصائح مذہبی کا موضوع صرف مابعد الطبیعیات کی دنیا ہوتی ہے اور وہیں کے خوفناک تاریک مناظر سے ڈرا ڈرا کر وہ پرستش کرایا کرتا ہے، اس کو مطلق اس سے بحث نہیں کہ دنیا کہاں جا رہی ہے، زمانہ کس رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے، جہل و قوم کس تیزی سے علم کی روشنی میں پیچھے ہٹ رہی ہے، وہ برابر یہی کہے جائے گا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسی کو برحق جانو، وہ اس سے بالکل ناآشنا ہے کہ اس وقت کے اقتصادی مسایل ہم سے کیا چاہتے ہیں، وہ غریب اس سے مطلق آگاہ نہیں کہ ملک کی سیاسیات کا مستقبل کیا ہے، مخلوط و غیر مخلوط انتخاب کس جانور کا نام ہے، فیڈریشن کیا بلا ہے اور راونڈ ٹیبل کانفرنس کیا، پھر لطف یہ کہ اپنے جہل پر فخر بھی کرتا ہے۔ اس نادانی پر نازاں بھی ہے اور کہتا ہے کہ اہلِ جنّت تو ایسے ہی سیدھے سادھے بھولے بھالے لوگ ہونگے درآنحالیکہ یہ جنّت کی مخلوق جو ان معاملات میں اپنے آپ کو اس قدر نیک و بے خبر ظاہر کرنے پر فخر کرتی ہے، کتنی ہوشیار دنیا دار غریبوں کا روپیہ وصول کرنے میں اور جاہلوں کا گھر اُجاڑ اُجاڑ کر اپنا گھر بسانے میں۔

جس وقت یہ کسی مجمع میں وعظ فرما ہوتے ہیں تو ان کی صورت و حالت یونان کے اس جیوپٹر دیوتا کی سی ہوتی ہے، جو

ایک ہاتھ میں دوزخ کے انگارے ہیں اور دوسرے میں جنت کی گل فشانیاں اور وہ اپنے آپ کو بالکل مالک و مختار سمجھتے ہیں خواہ چشم زدن میں جلاکر خاکستر کردیں، خواہ بیک جنبش چشم و ابرو ہر ہر ذرّہ کو گل و گلزار بنادیں۔

ان لوگوں کی اولین کوشش یہی ہوتی ہے کہ لوگوں کو دُنیا و کسب دُنیا کے خیال سے منحرف کردیں اور اس کے لئے وہ غلط توجیہ و تاویل کے ساتھ کلام مجید کی آیتیں بھی پڑھتے ہیں احادیث نبوی سے بھی استناد کرتے ہیں، اقوال ائمہ کبار بھی سناتے ہیں اور مثنوی مولانا روم کے اشعار بھی خاص لحن کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس تعلیم کا مقصود حقیقی سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ جب لوگ دولت کو حقیر سمجھنے لگیں گے تو نہایت آسانی سے اُن کے حوالہ کردیں گے۔

اسی کے ساتھ وہ دوسری نفسیاتی ضرب یہ لگاتے ہیں کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں اور عہد سلف کے اولیاء کرام کے واقعات سناکر ان کے خوارق عادات اور کرامات کی داستانیں سنانے لگتے ہیں کہ انھوں نے کس طرح سیکڑوں سال کی غرق شدہ بارات کو دریا سے زندہ نکال لیا، ایک شخص پر نگاہ ڈالتے ہی کیونکر اس کے دل کا تمام حال بتادیا، کسی کے بھاگے ہوئے غلام کو کس طرح ایک تعویذ لکھ کر واپس بلا دیا اور پھر آخر میں وہ سارے وعظ کی تان "علماء امّتی کانبیا و بنی اسرائیل" پر توڑتا ہے اور احمق جاہل مسلمانوں پر اپنی عظمت و بزرگی، اپنی غیر معمولی قوت روحانی اور اپنے محیر العقول کارناموں کا سکّہ بٹھاکر آخر کار اُن کی جیبیں خالی کرالیتا ہے۔

تمام دنیا کی قومیں اس اصول پر ترقی کر رہی ہیں کہ عقول انسانی کی تربیت کے لئے تمام موانع کو دور کردینا چاہئے، لیکن یہ فرماتے ہیں کہ نہیں عقلی ترقی روحانی انحطاط ہے اور اب دُنیا میں کوئی شخص کو سوچنے سمجھنے کا مجاز نہیں، جو ہونا تھا ہوچکا، جو کچھ سمجھ میں آسکتا تھا آگیا اور وہ اسی علم و یقین یا ضلالت و گمراہی کو سامنے رکھ کر اپنا دائرۂ عمل قایم کرتے ہیں، چنانچہ ان کی تصنیف و تالیف تبلیغ و اصلاح، پند و ہدایات سب اسی اصول کے تحت ہوتی ہے اور اس دائرہ سے ایک انچ اِدھر اُدھر ہٹنا گوارا نہیں کرتے۔

ایک قوم کے اندر انقلاب کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں ایک یہ کہ اس قوم کے اندر حُسنِ اتفاق سے بعض افراد صالح ایسے پیدا ہوجائیں جو قومی جمود کو دور کردیں، یا پھر افراد قوم کے اندر کسی خارجی اثر سے ذہنی اضطراب پیدا ہوجائے۔ امر اول کی تو بظاہر کوئی امید ہندوستان و پاکستان میں نظر نہیں آتی لیکن دوسری صورت کے آثار ضرور رونما ہوچکے ہیں اور ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی ہے جو علماء دین کی تعلیمات کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگی ہے لیکن چونکہ یہاں انسان کی ذہنی و عقلی آزادی کو گہوارہ ہی سے چھینا شروع کردیا جاتا ہے اور خدا جانے کتنے زمانہ سے نسلاً بعد نسل اس پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ عادت چھٹتے ہی چھٹتے چھٹے گی۔ الغرض پاکستان و ہندوستان کا مسلمان اس وقت جن راہوں سے گزر رہا ہے وہ اس قدر دشوار گزار ہیں کہ اگر کوئی فوری انقلاب نہایت ہی شدید قسم کا اُن میں رونما نہ ہو تو اُن کے نجات کی کوئی صورت نہیں اور ان کا بالکل وہی حشر ہوگا جو ہسپانیہ کے مسلمانوں کا ہوا کہ چند منہدم آثار تو اُن کے باقی رہ جائیں گے لیکن وہ خود کہیں کچھ نہ ہوں گے۔ ہمارا مولوی یا عالم دین جو بدقسمتی سے ہمارا قاید و رہنما اور ہمارا مصلح بنا ہوا ہے دوزخ و جنّت کی روایات بیان کرنے میں، رات دن لوگوں سے نماز پڑھوانے کی فکر میں تو بے شک منہمک نظر آتا ہے لیکن وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غور نہیں کرتا کہ جس قوم سے وہ اپنے لئے لذایذ دنیوی حاصل کر رہا ہے اُس کی اقتصادی حالت کیا ہے اور اس کا انحطاط کس حد تک پہونچ چکا ہے۔

میں کہتا ہوں، بہ آواز بلند کہتا ہوں اور بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ یہ وقت اس بات کے دیکھنے کا نہیں ہے کہ مسلمان نماز پڑھتا ہے یا نہیں، روزے رکھتا ہے یا نہیں، دوزخ و جنّت کا قایل ہے یا نہیں بلکہ صرف یہ سوچنے کا ہے کہ مسلمانوں کے پاس کچھ کھانے کو بھی ہے یا نہیں اگر علماء دین ہمارے حقیقی بہی خواہ ہوتے اور اُن کے دلوں میں ہمارا سچا درد ہوتا تو اس وقت تمام مباحث مذہبی کو چھوڑکر صرف اس پر غور کرتے کہ مسلمان اپنا پیٹ کس طرح بھریں اُن کے بچے بھوک کی تکلیف سے کیونکر محفوظ رہیں اور

اُن کی عورتیں کس تدبیر سے اسباب ستر پوشی حاصل کرسکیں ۔ آپ ایک مسلمان کو موٹر پر سوار، نفیس لباس پہنے ہوئے دیکھ کر اس کی خوش حالی و مسرّت کا اندازہ کیجئے بلکہ اس کے گھر میں جاکر دیکھئے کہ کیا حالت ہے اور اس کے دل میں سماکر معلوم کیجئے کہ وہ کس تکلیف و عذاب میں مبتلا ہے ۔ پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہمارے اس قائد و رہنما کو ہمارے اس دینی و دنیوی رہبر کو کبھی اس کا خیال ہوا ہے کہ جس وقت وہ اپنے وسیع دسترخوان پر نفیس نفیس غذائیں کھانے میں مصروف رہتا ہے ۔ ٹھیک اسی وقت اس کے پڑوس میں کتنے مسلمان ایسے ہیں جو بھوکے پیاسے پڑے ہوئے ہیں اور کتنے بچّے ایسے ہیں جن کی مائیں اپنی خشک چھاتیوں سے ایک قطرہ دودھ کا ان کے منہ میں نہیں ٹپکا سکتیں ۔ جس وقت وہ حریر و کمخواب یا باریک چکن اور ولایتی تنزیب کی اچکن پہن کر، ایک ادائے معشوقانہ کے ساتھ موٹر پر سوار ہونے کے لئے گھر سے باہر نکلتا ہے ۔ کیا ایک لمحہ کے لئے کبھی اس کا خیال اس حقیقت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس قوم کے کتنے افراد اس وقت جھلسا دینے والی دھوپ میں ننگے بدن، برہنہ پا پتھر توڑ رہے ہیں، کیا اس سے زیادہ دنیا میں کوئی بے عزتی، بے حیائی اور بے شرمی ہو سکتی ہے کہ جو افراد فاقہ کر کر کے اپنے بچّوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر اس کے لئے یہ نعایم و لذائذ فراہم کریں اُنھیں کے دکھ درد کی طرف سے وہ یوں بے خبر و بے پروا رہے ۔

ہر چند فرعون و نمرود کو گزرے ہوئے زمانہ گزر گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی اولاد ابتک دُنیا میں باقی ہے اور اسی اخلاق سوز و انسانیت شکن خصوصیات کے ساتھ باقی ہے جو کسی وقت اُن کے اسلاف میں پائی جاتی تھیں مگر صرف یہ ہے کہ اُن پر عذاب نازل ہو چکا اور ان کے لئے ہنوز دست خدا میں انتظار کر رہا ہے ۔

علمار کے کسی مجمع میں ایک بار میں نے دریافت کیا کہ " فرمایئے اب کیا ارادہ ہے اور قومی فلاح و بہبود کے لئے کون سی مقامی تحریک آپ کے پیش نظر ہے "۔ ان میں سے ایک نے کہا " ہاں، عرصہ سے میرا خیال ہے کہ یہاں کے مسلم کلب کی حالت درست کی جائے اور انسائکلو پیڈیا کے قسم کی ایک کتاب اُردو میں لکھی جائے "۔ میں نے کہا " قبلہ، اپنے جھونپڑے کو محل بنانے سے پہلے کیوں آپ اسکی آرائش و زینت کی فکر میں مبتلا ہیں، تمدن کی ترقی، جاہ و ثروت کے تنعم کے ساتھ یہ سب کچھ اپنے آپ ہو رہے گا، نہ جانے کتنے کلب قایم ہو جائیں گے، کتنی انسائیکلو پیڈیا بن جائیں گی ۔ اس وقت تو سوال جرّحیات کا ہے ۔ بقائے زندگی کا ہے، تن پوشی اور دفع گرسنگی کا ہے ۔ اس لئے طریقۂ زکوۃ کو منظم کیجئے ۔ قومی بیت المال کی طرح ڈالئے، گھر گھر جاکر دیکھئے کہ کون کس حال میں مبتلا ہے اور سب سے پہلے اس زخم کا علاج کیجئے جس نے ساری قوم کو مفلوج بنا رکھا ہے " یہ سُن کر فرمانے لگے " کہ ہاں یہ تحریک بھی ضروری ہے اور انشاءاللہ الرحمٰن اس پر غور کریں گے " لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ جب مولوی کسی بات کو انشاءاللہ سے شروع کرتا ہے تو اس کا انجام کیا ہوا کرتا ہے ۔

یہ ہے حال ان تمام اداروں کا جنھیں ہم مدرسہ و خانقاہ کہتے ہیں اور جہاں سے یہ زہریلے افعی نکل نکل کر مسلم آبادی کو ڈس رہے ہیں اُن کے علاوہ بعض ادارے ایسے ہیں جو صرف تصنیف و تالیف کے لئے وقف ہیں اور جن کے مریدوں کو فخر ہے کہ وہ دنیا میں بڑا کام کر رہے ہیں، مسلمانوں کی عظیم الشان خدمت انجام دے رہے ہیں لیکن چونکہ اُن کی ذہنیتیں بھی اسی مسموم ماحول کی پیداوار ہیں اس لئے اُن کی جملہ تصانیف غیر ضروری اور غیر اہم بلکہ ایک حد تک مضرت رساں ثابت ہوتی ہیں، یہ بڑی بڑی کتابیں تاریخ و جغرافیہ کی لکھ رہے ہیں، لیکن ان کی حقیقت داستان پارینہ دُہرانے سے زیادہ کچھ نہیں یہ فلسفہ و مذہب پر موٹی موٹی تالیفات پیش کر رہے ہیں، لیکن بالکل اسی اندھے کی طرح جس کا سہارا ایک لکڑی کے سوا کچھ نہ ہو ۔ اول تو اُن کو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ وقت اس قسم کی تصنیف و تالیف میں ضایع کرنے کا نہیں بلکہ دوڑ کر اپنے آپ کو طوفان میں ڈال دینے اور ڈوبتے ہوؤں کو باہر نکالنے کا ہے اور اگر یہ اُن کے بس کی بات نہیں ہے تو پھر کم از کم ایسے لٹریچر پیش کرنے کا ہے جو دوسروں میں یہ ولولہ پیدا کرے ۔

جس وقت کوئی قوم ترقی کرتی ہے تو علوم و فنون کا ذخیرہ وہ خود اپنے ساتھ لے آتی ہے اور ہر جگہ علمی ادارے قایم ہونے لگتے ہیں لیکن جب انحطاط ہوتا ہے تو یہ ادارے خود بخود ضعیف ہونے لگتے ہیں اور اُن کو کوئی قوت سنبھال نہیں سکتی ۔ اس لئے جس رنگ کی

صاتیف ہمارے یہاں کے بڑے مصنفین پیش کر رہے ہیں وہ وقت کے لحاظ سے بالکل لغو و بے کار ہیں اور اُن سے ملک و قوم کا کوئی
ایدہ نہیں پہونچ سکتا بلکہ مضرت کا اندیشہ ہے کیونکہ ان کا موضوع اور ان کے اُصول ترتیب وہی آزادی عقل و ضمیر کے چھیننے والے
ور اندھی تقلید کو مضبوط کرنے والے ہیں جس نے مسلمانوں کو نکبت و ذلّت کی اس منزل تک پہونچا دیا ہے۔

پھر جب حالات یہ ہیں تو سوال صرف یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے اور اپنی بقا و تحفظ کے لئے
یا تدابیر عمل میں لانا چاہئے۔

غالبًا آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت کرۂ زمین پر مسلمانوں کی آبادی تقریبًا ۲۵ کرور ہے اور اسی کے ساتھ غالبًا یہ بھی آپ کے
لم میں ہوگا کہ یہ آبادی کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی ہے، آپ نقشہ اُٹھاکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف یہ سلسلہ مغربی افریقہ کے
سواحل اٹلانٹک سے شروع ہوکر بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل کو اپنی آغوش میں لیتا ہوا مصر اور مغربی ایشیا تک پہونچتا ہے اور پھر
سواحل بحر قلزم و بحر اسود سے ہوتا ہوا سائبیریا اور منگولیا تک پہونچ جاتا ہے، دوسری طرف مشرقی ساحلِ افریقہ سے شروع ہوکر
رنا سکر کے عرض البلد پر منتہی ہوتا ہے اس کے بعد ایک سلسلہ وہ ہے جو افغانستان کے کوہستان کو عبور کرکے ہندوستان تک پہونچتا
ہے اور یہاں سے جزیرۂ ملایا ہوتا ہوا مشرقی مجمع الجزائر تک پہونچ جاتا ہے۔

اچھا اب اسی کے ساتھ آپ تاریخ اُٹھاکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کی یہ تدریجی ترقی نہ تھی بلکہ ایک سیلاب کی سی ترقی تھی جو
قتاً فوقتاً اُٹھتا رہا اور چند صدیوں میں کرۂ ارض کے اتنے وسیع حصہ پر محیط ہوگیا ۶۳۰ء اور ۸۰۰ء کے درمیان ہسپانیہ و مراکش
سے لیکر وسط ایشیا تک پھیل گیا اور تقریبًا ڈھائی صدی تک اسی جگہ محدود رہا۔ اس کے تقریبًا ڈھائی صدی بعد ۱۰۰۰ء اور ۱۱۰۰ء
کے درمیان اس کی وسعت مغربی افریقہ سے لیکر ایشیا کوچک، وسط ایشیا اور شمالی ہند تک پہونچ گئی۔ پھر دو صدی گزرنے کے بعد ایک
در لہر اُٹھی جس نے (۱۳۰۰ء اور ۱۷۰۰ء کے درمیان) جزیرہ نمائے بلقان سے لیکر سائبیریا، ہندوستان اور مجمع الجزائر تک تمام
حصہ کو اپنے اثر میں لے لیا۔

اس وقت میں اس امر سے بحث نہیں کروں گا کہ اس کی ترقی کے کیا اسباب تھے، یعنی کوئی خاص اخلاقی خوبی اسلام میں ایسی تھی
جس کا اثر دنیا پر پڑا یا یہ کہ صرف اس کی عسکریت کو اس کا امتیاز دینا چاہئے بہرحال حقیقت یہ ہو یا وہ ہمیں اس سے بحث نہیں دیکھنا
ہے کہ اسلام جہاں جہاں گیا کن خصوصیات کے ساتھ گیا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا لیکن اس پر غور کرنے سے قبل بطور اصول موضوعہ
ہم کو یہ متعین کر لینا چاہئے کہ اسلام سے ہماری مراد اس مضمون میں کیا ہے۔

میں اس سے قبل بھی ظاہر کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ دین و مذہب بالکل علٰحدہ چیزیں ہیں، یعنی دین نام ہے
ان خاص اعتقاد کا جو متعلق ہے ہماری عبادات سے، ہماری مابعد الطبیعیات اور اس سکونِ نفس سے جو کسی مخصوص عقیدہ کی بنا پر
انفرادی طور پر ایک شخص کو حاصل ہوتا ہے سوسائٹی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، لیکن مذہب نام ہے اس تہذیب و تمدن کا جو کسی دین
کے تحت دُنیا میں قایم ہوجاتا ہے اور جس کا تعلق انسان کی ہیئت اجتماعی سے ہوتا ہے، اس کا میں وہی مفہوم قرار دیتا ہوں جو انگریزی
لفظ (Culture) کا ہے پس میری مراد بھی مضمون زیر بحث میں مذہب سے ہے نہ کہ دین سے یعنی میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ
اسلام بہ لحاظ اعتقاد مذہبی نہیں بلکہ بہ حیثیت ایک خاص مذہب (Creed) ہونے کے کیا خصوصیات اپنے ساتھ ہر جگہ لے گیا۔

اب اس سلسلہ میں آپ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ جس وقت اسلام کا ظہور ہوا اس وقت اس کا ماحول کیا تھا، اس میں کلام نہیں
اسلام پیدا ہوا ایشیا ہی کے ایک گوشہ سے، لیکن اثر اس نے قبول کیا یورپ کی اس تہذیب کا جس کے لئے صحیح لفظ میرے خیال میں
صرف "یونانیات" ہے مگر اس سے مراد ملک یونان کی تہذیب نہیں بلکہ وہ تمام مغربی تہذیب مقصود ہے جو حقیقتاً مجموعہ تھی روم
و یونان دونوں کی تہذیب کا اور جس سے نہ صرف سارا یورپ بلکہ جزیرہ نمائے عرب بھی عرصہ تک ممتاز رہنے کے بعد اپنے دورِ انحطاط

میں اسی کے زیر اثر نظر آتا تھا چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ولادت نبوی و بعثت کے وقت سرزمین حجاز میں بھی یہود و نصاریٰ ہی کا اثر قایم تھا۔ اہلِ عرب باوجود اس کے کہ اُن کی بُت پرستی شدید قسم کی بت پرستی تھی نصاریٰ و یہود کے علماء کا خاص احترام کرتے تھے اُنکے علم و فضل اور روحانیت کے قایل تھے۔ اس کا ایک سبب غالبًا یہ بھی تھا کہ اہلِ عرب میں بُت پرستی کا خیال خود یونان و روما سے آیا تھا، لیکن اس کی بڑی وجہ سلطنتِ روما کے اقتدار و وسعت، ہیبت و جبروت کی وہ روایاتِ قدیمہ تھیں جو عرب میں ایک ایک بچّے کے ذہن نشین ہو چکی تھیں اور قدرتًا ہونا چاہئے تھیں جبکہ اُسوقت بھی قسطنطین اعظم کا مسیحی جھنڈا آبنائے باسفورس پر لہراتا ہوا ہر شخص کو نظر آتا تھا۔

ہر چند اسلام نے اپنی فتوحات کا اولین ہدف یونان و روما ہی کی حکومت کو قرار دیا لیکن بجائے اس کے کہ یونانیات کا اثر زایل ہوتا مسلمانوں پر اور زیادہ رنگ اس کا چڑھ گیا۔ یعنی گو ظاہری حکومت تو اہلِ یوروپ کو ضرور چھین گئی لیکن اس کی تمدنی حکومت عربوں پر اور زیادہ قایم ہو گئی، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ عربوں نے نہ صرف علوم و فنون میں یونانی لٹریچر کا اثر قبول کیا بلکہ تدوین شرع و فقہ میں بھی ارسطو کی تصانیف سے مدد لی گئی حتّٰی کہ بعض مفسرین نے تو اسکندر اعظم کو پیغمبر تک قرار دیدیا، ایک ہی تہذیب کی مختلف قوموں کا ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہنا کوئی نئی بات نہیں ہے، ہمیشہ ہوا ہے اور ہوگا خود مسلمانوں میں باہم جس قدر جنگ و خونریزی ہوئی ہے کسی سے مخفی نہیں، الغرض مسلمانوں کا روما و یونان کے مقبوضات کو تصرف میں لے آنا اگر ایک طرف اسلام کی فتح تھی، تو دوسری طرف یونانیات کی بھی کامیابی تھی جس سے اسلام برابر متاثر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور اگر ایرانی تہذیب جو جزیرہ نمائے عرب میں کہیں کہیں اکاسرۂ عجم کے سطوت و اقتدار کو قایم کئے ہوئے تھی اس وقت نہ پائی جاتی جس سے اہلِ عرب ایک حد تک متاثر ہو چکے تھے، تو آج مسلمانوں کی تہذیب یکسر مغربی تہذیب ہوتی اور اس میں ادنیٰ شائبہ بھی مشرقیت کا نہ پایا جاتا۔

اِس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ ترقی میں علوم و فنون کی بڑی خدمت انجام دی لیکن اس کی بنیاد بھی وہی یونانیات تھی جنھے کسی وقت اسلام کا ساتھ نہیں چھوڑا اور آخر کار ان کے تمام شعبہ ہائے حیات کو اس قدر سختی کے ساتھ جکڑ لیا کہ آج ہندوستان میں بھی جہاں مسلمانوں کو رہتے ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں، وہی مغربی خصوصیت اُن کی قایم ہے اور جس نے اُن کے مستقبل کو مشرق میں حد درجہ تاریک بنا رکھا ہے۔

آپ اسلامی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مسلمان جہاں گئے اپنی تہذیب اپنے ساتھ لے گئے اور کسی مفتوحہ ملک کے تمدن سے متاثر نہیں ہوئے جو بالکل مغربی ذہنیت ہے —— ہندوستان میں ایک غضب اور یہ ہوا کہ دورِ مغلیہ ختم ہونے کے بعد انگریزوں کی حکومت شروع ہو گئی جو ایک مغربی قوم تھی اور اپنی تمام مغربی خصوصیات اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس لئے جسوقت جذبات عناد و انتقام مسلمانوں کے سرد پڑ گئے تو پھر وہی اُن کی تقلید میں پیش پیش نظر آنے لگے اور اپنے اوپر افرنجیت طاری کرنے میں نمایاں سبقت کا اظہار کیا —— آپ کسی مسلمان سے جس نے کچھ بھی مذہبی تعلیم حاصل کی ہے دریافت کیجئے کہ وہ انگریزوں اور ہندوؤں میں سے کس کو بہتر سمجھتا ہے تو وہ فوراً انگریزوں کا نام لے دے گا اور یہ دلیل بیان کرے گا کہ وہ صاحبِ کتاب ہیں اور یہ کافر، ان کی لڑکیوں سے ہم شادی کر سکتے ہیں اور انکے یہاں نہیں، کلام پاک ان کے ساتھ صلح و آشتی سے رہنے کی ہدایت کرتا ہے اور مشرکین و کفار سے نہیں۔ الغرض وہ بہت سے اسباب و دلایل نصاریٰ کی ترجیح میں پیش کر دے گا، لیکن عمرانیات و اقتصادیات یا اجتماعی و سیاسی مصالح کا کوئی سوال اس کے سامنے نہ ہوگا۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اگر ان مسلم حکومتوں کی ذہنیت جو مغرب سے قریب ہیں انھیں مغربی تہذیب کی طرف کھینچ رہی ہے تو درست ہے اور وہ انھیں اصول کو سامنے رکھ کر ترقی کر سکتے ہیں لیکن پاکستان اگر ان کی پیروی کرنا چاہے تو یہ کیونکر کامیاب ہو سکتا ہے، جبکہ اس کا قریب ترین تعلق ہندوستان سے ہے اور اگر ان دونوں ملکوں میں کوئی اختلاف بھی ہے تو وہ ایسا نہیں جو ان دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے نہ دے۔ لیکن پاکستان کے مسلمان میں یہ ذہنیت اس وقت تک پیدا ہونا دشوار ہے جب تک وہ کتاب و سنّت پر اپنے آئین کی بنیاد رکھنے کا خواب دیکھ رہا ہے، کیونکہ "کتاب و سنت" کا نام آتے ہی مولوی دستور پر اپنا اقتدار قایم کرلے گا اور مولوی کا جو نظریہ کتاب و سنّت کے متعلق ہے، اس کی فرسودگی و کہنگی ظاہر ہے۔

ہندوستان کی آبادی
(سنہ ۱۹۵۱ء)

ہندوستان کی کل آبادی جس میں تمام مذاہب شامل ہیں ۳۴ کروڑ ۲۲ لاکھ ۳۸ ہزار چھ سو بیس ہے۔
مذاہب کے لحاظ سے آبادی کی ترتیب یہ ہے :-

ہندوؤں کی آبادی = ۳۰۳۱۸۶۵۳۳
مسلم آبادی = ۳۵۱۰۹۰۷۹
عیسائی آبادی = ۸۱۷۳۱۳۱
سکھ آبادی = ۶۲۱۵۹۸۰
وحشی اقوام و مذاہب = ۱۹۷۴۹۱۰
جینی = ۱۶۱۹۱۵۶
بودھ = ۱۳۸۸۴۹
زردشتی = ۱۱۱۶۱۰
یہود = ۲۶۶۶۹

صوبہ وار آبادی کا نقشہ یہ ہے :-

صوبہ	ہندو	سکھ	جین	بدھ	زردشتی	مسلمان	عیسائی	یہود	دیگر مذاہب و اقوام	میزان
یوپی	۵۳۷۶۲۹۲۵	۱۹۷۶۱۲	۹۷۷۴۴	۳۲۲۱	۱۲۵۸	۹۰۲۸۹۹۲	۱۲۳۸۷۶	۳۴	۸۰	۶۳۲۱۵۷۴۲
بہار	۳۴۳۱۶۴۱۴	۳۸۰۰۳	۸۶۵۶	۱۱۲۸	۴۵۵	۴۵۶۴۴۶۶	۴۲۲۰۳۰	۹۲	۸۸۳۹۶۱	۱۴۳۱۸۹۴۷
مغربی بنگال مع چندر نگر	۱۹۵۱۰۶۶۰	۲۹۸۶۷	۱۹۱۱۶	۸۱۵۸۹	۱۹۱۸	۴۹۲۷۱۶۳	۱۷۵۲۹۳	۲۶۱۹	۱۱۱۹۹۲	۲۴۸۶۰۲۱۷
آسام	۵۸۹۴۷۳۳	۴۱۰۷	۴۲۴۵	۲۲۷۶۵	۲۷	۱۹۹۶۳۵۶	۵۸۵۳۹۹	۲۰۹	۵۲۵۸۵۶	۹۰۴۳۷۰۷
مدراس	۴۹۹۹۵۳۱۸	۲۸۵۹	۳۵۷۷۸	۱۳۷۵	۲۰۸۷	۴۵۳۸۱۳۴	۲۴۳۱۰۰۶	۴۷۴	۸۹۶۹	۵۷۰۱۶۰۰۲
بمبئی	۳۱۷۸۵۹۱۴	۲۸۰۱۷	۵۱۲۰۹۳	۲۳۹۵	۹۷۵۷۳	۲۹۰۶۸۸۷	۵۲۵۴۵۴	۲۰۱۳۵	۸۹۸۲	۳۱۲۴۷۵۲۳
مدھیہ پردیش	۲۰۲۱۵۶۰۷	۲۳۳۹۶	۹۶۲۵۱	۲۸۴۱	۳۰۶۶	۸۰۰۷۸۱	۸۸۸۰۲	۲۲۸	۶۶۹۱	۲۱۲۴۷۵۳۳
پنجاب	۸۱۷۴۴۳۰	۳۸۳۱۹۸۳	۳۷۵۱۸	۱۴۴۱	۷۷	۲۲۹۰۸۰	۹۵۲۹۳	۱۵۰	۶۳۱ (۳۱۸۶۰۳) ریکارڈ جل گیا	۱۲۶۴۱۲۰۵
میسور	۸۱۷۷۲۹۱	۳۲۴۷	۲۲۹۳۶	۱۱۲۵	۴۷۰	۶۹۸۸۳۱	۱۷۰۹۰۹	۱۸۲	۱	۹۰۷۴۹۷۲
ٹراونکور کوچین	۵۵۸۷۸۸۵۳	۲۷۵	۳۵۴	۴۰	۳۸	۷۲۱۲۲۷	۲۹۶۱۰۳۰	۲۴۲۸	۲۲۱	۹۲۸۰۴۲۵

صوبہ	ہندو	سکھ	جین	بدھ	زردشتی	مسلمان	عیسائی	یہود	دیگر مذاہب واقوام	میزان
سوراشٹرا	۳۵۸۷۸۸۴	۸۸۱	۱۲۳۹۱۶	۱۳	۵۶۰	۴۲۲۱۸۶	۱۷۱۴	۶۹	۳۶	۴۱۳۷۳۵۹
مدھیہ بھارت	۷۳۳۳۰۲۱	۱۲۵۲۱	۱۰۰۲۳۴	۲۱۹	۹۳۴	۳۹۶۱۵۳	۱۰۹۴۷	۱۲۵	—	۷۹۵۴۱۵۴
حیدرآباد	۱۶۰۸۸۹۰۵	۸۴۴۹	۳۰۲۸۷	۱۴۵	۱۹۹۲	۲۲۰۶۱۸۲	۲۹۰۹۷۳	۱۶	۲۸۱۵۹	۱۸۶۵۵۱۰۸
راجستھان	۱۳۸۶۲۱۵۰	۱۴۴۲۳۴	۳۲۷۷۶۳	۳۱	۵۰۰	۹۴۹۳۴۸	۶۷۶۲	—	—	۱۵۲۹۰۷۹۷
پیپسو	۱۶۰۴۳۴۹	۱۷۲۱۹۳۶	۷۵۷۸	۲۱۹	۹۸	۵۵۹۱۳	۳۵۶۵	۹	۱۹	۳۴۹۳۶۸۵
دہلی	۱۴۶۷۸۵۴	۱۳۷۰۹۶	۲۰۱۷۴	۵۰۳	۱۶۴	۹۹۵۰۱	۱۸۶۸۵	۹۰	۵	۱۷۴۴۰۷۲
اجمیر	۵۹۹۵۲۴	۲۹۶۴	۳۲۰۰۴	۴۳۱۹	۲۶۲	۴۸۸۸۶	۴۴۱۳	—	—	۶۹۳۳۷۲
منی پور	۳۴۷۳۲۵	۵۰	۱۵۰	۳۳	۱	۳۷۱۹۷	۶۸۳۹۴	—	۱۲۴۴۸۵	۵۷۷۶۳۵
تریپورا	۴۸۰۶۶۲	۳۵	۳۶	۱۵۴۰۳	۱	۱۳۶۹۴۰	۵۲۶۲	—	۶۹۰	۶۳۹۰۲۹
کورگ	۱۹۹۴۶۵	۹	۵۴	۱۲	۱۰	۲۳۰۶۲	۶۷۸۸	—	۱	۲۲۹۴۰۵
کچھ	۳۹۳۱۲۸	۴۷۸	۶۲۳۹۷	—	۴۹	۱۱۱۴۳۴	۱۱۷	۳	—	۵۶۸۶۰۶
وندھیا پردیش	۳۴۸۵۰۸۳	۵۲۹	۱۱۸۳۵	۷	۱۳	۷۶۱۲۶	۱۰۹۲	۵	—	۳۵۷۴۶۹۰
بھوپال	۷۰۰۳۸۱	۵۶۲	۵۹۸۵	۷	۵۵	۱۲۸۶۷۲	۸۱۲	—	—	۸۳۶۴۷۴
ہماچل پردیش	۱۰۸۸۸۴۱	۵۰۱۹	۳۴	۲	۶	۱۵۲۵۳	۳۱۷	×	×	۱۱۰۹۴۶۶
جزائر انڈمان و نکوبار	۹۲۹۴	۱۲۶	۱	۱۶۰۴	۲	۴۷۸۳	۹۴۹۴	۱	۵۶۶۶	۳۰۹۷۱
سکم	۹۷۸۶۳	۱۸	۱۹	۳۹۳۹۷	—	۱۲۳	۳۰۳	×	×	۱۳۷۷۲۵
میزان :-	۲۸۸۸۶۸۵۳۳	۶۲۱۵۹۸۰	۱۶۱۹۱۵۶	۱۳۸۸۴۹	۱۱۱۶۱۰	۳۵۱۰۹۷۷۹	۸۱۷۳۱۳۱	۲۶۶۶۹	۱۹۷۴۹۱۷	میزان کل ۲۸۸۸۶۸۵۳۳

اس میں مسلم آبادی تین کرور ۱۵ لاکھ نو ہزار سات سو اناسی ہے جو مختلف صوبوں میں اس ترتیب سے پائی جاتی ہے:-

یوپی :- ۹۰۲۸۹۹۲
مغربی بنگال :- ۴۹۲۷۱۶۳
بہار :- ۳۵۶۴۴۶۶
مدراس :- ۳۵۳۸۱۳۶
بمبئی :- ۲۹۰۶۸۸۷
حیدرآباد :- ۲۲۰۶۱۸۲
آسام :- ۱۹۹۶۴۵۶
راجستھان :- ۹۴۹۳۴۸
مدھیہ پردیش :- ۸۰۰۷۸۱

ٹراونکور کوچین :- ۷۲۱۲۲۷
میسور :- ۶۹۸۸۳۱
مدھیہ بھارت :- ۴۹۶۱۵۳
سوراشٹرا :- ۴۲۲۱۸۶
تریپورہ :- ۱۳۶۹۴۰
پنجاب :- ۲۲۹۰۸
بھوپال :- ۱۲۸۶۷۲
کچھ :- ۱۱۱۴۳۴
دہلی :- ۹۹۵۰۱

وندھیا پردیش :- ۷۶۱۱۹
پیپسو :- ۵۵۹۱۳
اجمیر :- ۴۸۸۸۶
منی پور :- ۳۷۱۹۷
کورگ :- ۲۳۰۶۲
ہماچل پردیش :- ۱۵۲۵۳
جزائر انڈمان و نکوبار :- ۴۷۸۳
سکم :- ۱۲۳

میزان کل
۳۵۱۰۹۷۷۹

مومن کا تغزل

مومن اُردو کے ان خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جن کے ممتاز غزل گو ہونے پر تذکرہ نگاروں سے لے کر اس دور کے نقادوں تک کے درمیان دو رائیں نہیں ہیں۔ مومن کو غالب اور شیفتہ جیسے معاصرین نے بھی خراج تحسین ادا کیا تھا اور آج کے بھی اکثر اہل نظر ان کے بڑے مداح ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر مومن کے کلام کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت عقیدت مندانہ مبالغہ آرائی اور طرفداری سے کام نہ لیا جائے جب بھی ان کو اُردو کے بڑے غزل گو شاعروں کی فہرست میں رکھنا ہی ہوگا۔ لیکن میں مومن کے تغزل کا قایل ہونے کے باوجود ان کے نقادوں سے اکثر مقامات پر متفق نہیں ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مومن کے کلام کا جو حصہ ہمیشہ پر کیف و شاداب رہنے والا ہے اس کی طرف اب تک یا تو سرے سے توجہ نہیں کی گئی یا نگاہ غلط انداز کو کافی سمجھا گیا۔ اور جو اشعار وقت کے ہاتھوں اپنی آب و تاب کھو چکے اور کھو رہے ہیں ان کو مومن کا سرمایۂ کمال قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ صرف ذوق و وجدان کے اختلاف کا نتیجہ ہے کہ مومن کے جو اشعار میرے نزدیک سدا بہار ہیں ان کی طرف دوسرے نقاد متفق نہ ہو سکے یا ان کو اتنا وقیع نہ سمجھ سکے جتنا کہ میں سمجھ رہا ہوں —— لیکن اگر تنقید صرف ذوق و وجدان کے فیصلے کا نام نہیں بلکہ اس میں غور و فکر اور تحلیل و تجزیہ کے نتائج بھی اہمیت رکھتے ہیں تو نامناسب نہ ہوگا اگر میں مومن پر اظہار خیال کے سلسلے میں ان کے نقادوں سے اپنے اختلافات کا بھی ذکر کردوں۔

کلام مومن کی جو خصوصیت بڑے فخر کے ساتھ پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مومن نے غزل کو عشق و محبت کے جذبات و معاملات تک محدود رکھا اور اس طرح تغزل کی حدوں سے متجاوز نہ ہوئے۔ بحث و تمحیص کے لئے اس مسئلہ میں بڑی جان ہے کہ عشق و محبت کے علاوہ دوسرے مضامین کو غزل کا موضوع بنانا مستحسن ہے یا نہیں۔ لیکن مجھے اس مسئلہ سے کوئی سروکار نہیں۔ یہاں دیکھنا صرف یہ ہے کہ مومن کے متعلق پروفیسر ضیا احمد بدایونی کا یہ دعوے کہ انھوں نے "غزل کو اس کے حقیقی مفہوم میں منحصر کردیا" یا مجز سہسوانی کا یہ قول کہ انھوں نے "جو کچھ کہا تغزل کے اندر ہی کہا" اور "عشق و محبت کے جذبات سے تمام دیوان کو مملو کردیا" کس حد تک صحیح ہے۔ اس امر کے جانچنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ تغزل کی حدوں سے انحراف کی کتنی صورتیں ممکن ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہی ہے کہ غزل میں تصوف، اخلاق اور فلسفہ وغیرہ کے مضامین بیان کئے جائیں۔ جب مومن کے پرستار یا نقاد یہ کہتے ہیں کہ مومن نے غزل کو تمام بیگانہ اور اجنبی مضامین سے محفوظ رکھا تو ان کا مطلب صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ مومن کا کلام تصوف کے مضامین سے خالی ہے چنانچہ نیاز فتحپوری ایک جگہ لکھتے ہیں:۔ " دوسری خصوصیت جو مومن کو اپنے دیگر ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ رنگ تغزل میں ان کا کلام اس غیر متغزلانہ چیز سے پاک ہے جس کو تصوف یا عشق حقیقی سے موسوم کیا جاتا ہے " اور اس میں شک نہیں کہ مومن نے تصوف اور فلسفہ کے مسایل کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن تغزل کی حدوں سے متجاوز ہونے کی جو دوسری صورت ہو سکتی ہے اسکی طرف مومن کے پرستاروں اور نقادوں کی نگاہ نہیں جاتی درانحالیکہ وہ چیز مومن کے یہاں موجود ہے آپ بیتابی سے پوچھیں گے وہ کیا ؟ — دوسری صورت یہ ہے کہ غزل میں ایسے مضامین ادا کئے جائیں، جو بظاہر حسن و محبت سے متعلق تو ضرور ہوں لیکن اگر ان پر غور کیا جائے تو وہ نہ صرف جذبات و محسوسات اور واردات و معاملات سے عاری ثابت ہوں بلکہ مفہوم و معنی سے بھی بیگانہ نکلیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خدا کرے ملک الموت ان سے پہلے آئے بہت سی لینی ہیں جانیں پئے نثار مجھے

اس شعر میں ایک ایسے عاشقِ ہجراں نصیب کا ذکر ہے جو اپنی محبوبہ کی آمد کا منتظر ہے مگر اس کی آرزو یہ ہے کہ محبوبہ کے آنے سے پیشتر ملک الموت اس کے پاس روحوں کا پشتارہ لئے ہوئے آجائے تاکہ محبوبہ پر نچھاور کرنے کے لئے بہت سی جانیں مستعار لی جاسکیں اب ذرا سوچئے کہ کیا عاشقوں کے دماغ میں اسی قسم کے لایعنی خیالات پرورش پاتے رہتے ہیں کیا عشق و محبت میں دیوانگی کا مفہوم یہی ہے کہ عاشق ذہنی مجہولیت اور لغویت کی اس سطح پر اتر آئے ؟ فرض کئے لیتا ہوں کہ جنونِ محبت کے زیرِ اثر انسان اس قسم کی باتیں بھی کرسکتا ہے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب ایک طرف متصوفانہ مسایل و نکات کو غزل کے لئے اجنبی اور بیگانہ مضمون قرار دیا جاسکتا ہے تو دوسری طرف کسی مخبوط الحواس عاشق کی ہرزہ سرائی اور یاوہ گوئی کو غزل میں کیونکر روا رکھا جاسکتا ہے:

گر پھر بھی اشک آئیں تو جانوں کہ عشق ہے حقے کا منھ سے غیر کی جانب دھواں نہ چھوڑ

بزمِ ناز کا کیا عجیب و غریب منظر پیش کیا گیا ہے ۔ محبوب کے پاس عاشق اور رقیب دونوں بیٹھے ہوئے ہیں۔ محبوب جس کی خصوصیاتِ جمیل میں حقہ نوشی بھی ہے حقے کا کش لے لے کر رقیب کے منھ پر دھواں چھوڑتا جاتا ہے ۔ دھواں کے اثر سے رقیب کی آنکھوں میں آنسو نکل آتے ہیں ۔ محبوب اس قدر سادہ لوح یعنی عقل و فہم سے بے بہرہ واقع ہوا ہے کہ رقیب کے ان آنسوؤں پر اسے محبت کا گمان ہونے لگتا ہے ۔ حضرت عاشق محبوب کے اس گمان کو غلط ثابت کرنے کے لئے اس سے کہتے ہیں کہ تم رقیب کے منھ پر حقے کا دھواں نہ چھوڑو ۔ اگر اس کے بعد بھی اس کی آنکھوں میں آنسو نکل آئیں تو میں سمجھوں کہ اس کو واقعی تم سے محبت ہے ۔ کیا بزمِ ناز کی یہ مضحکہ خیز تصویر جو شاعر کی خوش مذاقی، سلامت طبع اور لطافتِ ذوق کی دلیل ہے تغزل کے تحت آسکتی ہے ؟ کیا تغزل اور تمسخر ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ؟

ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ تنقید میں کسی شاعر کے گھٹیا اشعار کو سامنے رکھ کر گفتگو کرنا مناسب نہیں۔ لہٰذا اب میں مومن کے دو ایک ایسے شعر پیش کرتا ہوں جن کی تعریف میں ایک اہلِ نظر رطب اللسان ہیں ؎

غیر عیادت سے بُرا مانتے ہیں قتل کیا آن کے اچھا کیا

اثر لکھنوی اپنے مضمون میں اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں :- " دیکھئے ان سادہ الفاظ کے انداز بیان نے کس قدر معنی پیدا کئے ہیں ۔ معشوق در اصل عاشقِ زار کو قتل کرنے آیا تھا جو انتہائے بیرحمی ہے گو معشوق کی شان یہی ہے ۔ مگر ہائے عشق جو معشوق کے آنے کو عیادت پر محمول کرتا ہے اور قتل کو حیائے معشوق کا پردہ بتاتا ہے ۔ اس کے ساتھ اظہار رشک کرتا ہے جو جانِ عاشقی ہے ۔ کہتا ہے کہ در اصل میری عیادت کو آیا تھا مگر اسی کے ساتھ تجھے غیروں کا بھی پاس تھا اور اسی لئے کہ وہ برا نہ مانیں ان کے سمجھانے کو تونے مجھے قتل کر ڈالا تاکہ اب وہ عیادت کا شکوہ نہ کرسکیں ۔ بلکہ یہ سمجھیں کہ تو میری عیادت کو نہیں گیا بلکہ قتل کرنا مقصود تھا ۔

قافیہ " اچھا " سے ایک اور نازک مطلب پیدا ہوتا ہے ۔ میں قتل ہوا اچھا ہوا ۔ اب رقیبانِ بوالہوس اگر بیمار ہونگے تو اپنی جان کے ڈر سے تجھ سے عیادت کے متمنی نہ ہوں گے بلکہ اسی دھڑکے میں مرجائیں گے کہ تو کہیں عیادت کے بہانے سے آکر مار نہ ڈالے "

ایک اور مثال لے لیجئے :-

یہ جوشِ یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت دعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا

اثر لکھنوی لکھتے ہیں :- " جذبۂ یاس کی تصویر کس خوبی سے کھینچی ہے ۔ وصل سے مایوس ہوکر اپنے مرنے کی دعا مانگی جو اس طرح قبول ہوئی کہ معشوق قتل پر آمادہ ہوگیا جس کا لازمی نتیجہ قربِ قاتل و مقتول ہے ۔ اب وصل کوئی مشکل نہ تھا ۔ مگر جوشِ یاس

نے دعائے وصل سے باز رکھا ورنہ دعائے مرگ کی طرح وہ بھی مستجاب ہوتی"۔

مندرجۂ بالا دو مثالوں کے متعلق میں اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا ۔ اس محل پر نیاز فتحپوری اور پروفیسر ضیاء احمد کے مضامین سے دو اقتباسات پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں تاکہ ان کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کرلیں کہ متذکرہ اشعار تغزل کے منافی ہیں یا نہیں ۔ پروفیسر ضیاء لکھتے ہیں :۔" ہمارے خیال میں ایک غزل نگار کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ غزل کی بنیاد صرف ان واردات پر رکھے جن کا تعلق جذبات عشق و محبت سے ہے"۔ نیاز صاحب لکھتے ہیں :۔" تصوف کے حدود وہاں سے شروع ہوتے ہیں جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے ۔ اور وہ فضا جو ماوراء سرحدِ عقل و شعور ہے اس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں یہاں تک کہ مجانین و مجاذیب کی باتیں بھی وہاں کوئی نہ کوئی مفہوم اختیار کرلیتی ہیں اس لئے میرے نزدیک تغزل میں تصوف کو شامل کرلینا ایک غزلگو شاعر کا کمال نہیں بلکہ اس کا عجز ہے"۔

اب آپ دو باتوں پر غور فرمائیں اول تو یہ کہ مندرجۂ بالا شعروں میں مومن نے غزل نگار کا فرض کس حد تک ادا کیا۔ دوسرے یہ کہ اگر غزل میں تصوف سے تعلق رکھنے والے مجانین و مجاذیب کی بے معنی باتوں کا بیان غیر مستحسن اور غزل گو شاعر کا عجز ہے تو پھر کسی عاشق کے بھی لایعنی خیالات کو تغزل کے منافی کیوں نہ قرار دیا جائے ؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ ان حضرات کی توجہ کا خاص طور پر مستحق ہے جن کا یہ خیال ہے کہ مومن نے غزل کو اس کے حقیقی مفہوم میں منحصر کر دیا۔

میں نے اوپر کی سطروں میں مثال کے طور پر صرف چار شعر پیش کئے ہیں ۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مومن کے دیوان میں مجھے مثال کے لئے صرف چار ہی شعر مل سکے ۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار سے دیوان مومن کا ایک بھی صفحہ خالی نہیں۔

مومن کے تغزل سے متعلق پروفیسر ضیاء کے دو ایک اور بیانات خصوصیت کے ساتھ محل نظر ہیں ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

" اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ مومن دنیا کو اپنی نسبت مغالطے میں رکھنا نہیں چاہتے کہ عشق کے جذبے سے ناآشنا ہوں اور " بہ ضرورت شعر" خود کو عاشق ظاہر کریں ۔ یا عشق مجازی کی منزل میں ہوں اور متصوف بنیں" یہ صحیح ہے کہ مومن عشق کے جذبے سے ناآشنا نہیں تھے ۔ اس میں بھی کلام نہیں کہ انھوں نے نہ تو "حقیقت" کو "مجاز" کے پردے میں چھپایا اور نہ "مجاز" کو حقیقت تک پہونچنے کا بہانہ بنایا لیکن بایں ہمہ یہ واقعہ ہے کہ ان کے کلام کا کثیر حصہ "بہ ضرورت شعر" کہا گیا ہے نہ کہ اپنے تجربات و محسوسات کے اظہار کی غرض سے ۔ چنانچہ ان اشعار کے آئینے میں جس عاشق کا عکس نظر آتا ہے وہ ان تمام خصوصیات کا مالک ہے اور اردو شاعری کے روایتی عاشق سے منسوب کئے جاتے ہیں ۔ اردو غزل کی سب سے بڑی بدنصیبی یہی تو رہی ہے کہ ہمارے شعرانے عشق میں بہکنے کی جرأت کی ہو یا نہیں لیکن وہ عشقیہ شاعری میں بہکی بہکی باتیں ضرور کرتے ہیں ۔ انھوں نے محبت میں جو کچھ نہیں کیا اور نہ کیا جاسکتا ہے اس کے بیان میں سیکڑوں اشعار کہ ڈالتے ہیں اور فی الواقع جو کچھ ان پر گزرتی ہے اُسے اپنی شاعری میں بہت کم جگہ دیتے ہیں ۔

پروفیسر ضیاء ایک جگہ لکھتے ہیں :۔" مومن کی شاعری اکثر اساتذۂ دہلی کی طرح تقریباً تمام تر داخلی ہے ۔ لکھنؤ کے شعرا خارجی متعلقات حسن و عشق پر زیادہ زور دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا کلام پھیکا اور بے اثر ہو کر رہ گیا ۔ اس کے برخلاف مومن کے یہاں مضامین وصل ۔ ہجر ۔ رشک رندی ۔ جنون ۔ زارنالی سب میں داخلی انداز نمایاں ہے"۔

جب کوئی شعر کسی جذبہ یا احساس پر مبنی ہوگا تو خواہ اس کا موضوع دنیا کی کوئی چیز ہو اس میں داخلی انداز یقیناً نمایاں ہوگا لیکن جب کسی شعر کی بنیاد تخیل کے ہوائی قلعوں پر ہوگی وہاں داخلیت کیا معنی، ڈھب کی خارجیت تک پیدا نہیں ہوسکتی ۔ چنانچہ مومن کے کلام کا نصف سے زاید حصہ ایسا ہے کہ داخلیت اور خارجیت کے اعتبار سے اس پر کوئی حکم لگایا ہی نہیں جا سکتا ۔ لہٰذا پروفیسر ضیاء کا یہ خیال کہ مومن کی شاعری اکثر اساتذۂ دہلی کی طرح تقریباً تمام تر داخلی ہے ، خوش عقیدگی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا

مومن نے ہر چند کہ خارجی متعلقات حسن و عشق پر لکھنوی شعرا کی طرح زیادہ زور نہیں دیا پھر بھی ان کے کلام کے بیشتر حصے میں پھیکا پن اور تاثیر کی کمی ضرور ہے۔

موصوف نے اپنے مندرجۂ بالا دعوی کے اثبات میں چند شعر پیش کئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے:-

شبِ ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے ، زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

باوجود انتہائی غور و فکر کے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ شعر داخلیت کی مثال کے طور پر کیوں پیش کیا گیا۔ اگر اس شعر کے معنی یہی ہیں کہ شب فراق میں عاشق پر بلاؤں کا نزول ہوتا رہا اور ہر بلا کو خوش آمدید کہتے کہتے اس کی زبان تھک گئی تو ذرا سوچئے کہ یہ بات کیا ہوئی۔ آخر وہ کون سی حسین بلائیں تھیں جو یکے بعد دیگرے عاشق کو پیش آتی گئیں اور وہ بڑی کشادہ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرتا گیا۔ واقعات کی دنیا میں ہر عاشق شب فراق کی جانگداز اذیتوں سے پناہ مانگتا ہے۔ مگر یہ شعر جس عاشق کے حال کی ترجمانی کے لئے کہا گیا ہے کہ اس کی بلند حوصلگی اور ضبط و تحمل کا کیا کہنا۔ واقعی سوز و گداز اور درد و اثر سے لبریز داخلیت کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوسکتی ہے ؟

جس طرح پروفیسر ضیا، اس بات کے دعویدار ہیں کہ مومن کی شاعری تمام تر داخلی ہے اسی طرح پروفیسر وقار عظیم کا دعوی ہے کہ " مومن اردو کے تنہا غزل گو شاعر ہیں جن کے رنگِ تغزل میں ہر جگہ خلوص اور سچائی ہے" اس جملہ کو پڑھ کر مجھے بے اختیار غالب کا یہ شعر یاد آگیا تھا ؎

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

لیکن اب جبکہ مومن پر مضمون لکھ رہا ہوں مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ وقار عظیم صاحب کے اس جملہ پر قلم کو انگشت بدنداں اور ناطقہ کو سر بگریباں چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤں۔ قبل اس کے کہ وقار عظیم صاحب کی اس رائے عالیہ کے متعلق کچھ عرض کروں آپ ان کی چند سطریں اور ملاحظہ فرمالیں جن میں موصوف نے متذکرہ دعوے کی وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں:-

" یہ کہتے وقت کہ مومن اردو کے تنہا غزل گو شاعر ہیں جن کے رنگِ تغزل میں ہر جگہ خلوص اور سچائی ہے میرے ذہن میں تغزل کا وہی مفہوم ہے جو عاشق محبوب اور رقیب کے مثلث میں گھرا ہوا ہے۔ غزلوں میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے لیکن میں اسے تغزل نہیں کہتا اور اسی لئے یہ دعوی کرتے وقت میری نظر میں میر، غالب اور آتش کی عظمت مومن کی غزلوں سے زیادہ ہے جس چیز کا نام تغزل ہے اس کی کمی میر، غالب اور آتش کے یہاں بھی نہیں ، بلکہ جیسا کہ میں نے ابھی کہا یہ تغزل اکثر صورتوں میں محض رسمی اور روایتی ہے۔ میر، غالب اور آتش اپنی شاعرانہ پیمبری کے باوجود تغزل کو اکثر ان کی رسمی اور روایتی قیدوں سے باہر نہ نکال سکے۔ یہ کام سب سے پہلے مومن نے کیا اور اس طرح کیا کہ یہ ان کا رنگ خاص بن گیا۔ اس میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ مومن کی غزلوں میں عشق کی داستان گل اور بلبل، شمع اور پروانے ، ساقی اور بادہ کی زبان سے بیان نہیں کی گئی۔ ان کی رشک پسند طبیعت کو گوارا نہ تھا کہ اپنے عشق کی کہانی ان بیامیوں کی زبانی دوسروں تک پہونچائیں اور اس لئے چند گنے چنے شعروں کو چھوڑ کر جن میں یہ اشارے برائے نام موجود ہیں (ان کے اچھے شعروں میں یہ بات نہیں) مومن کی غزلیں ان روایتی اشاروں سے بالکل پاک ہیں"

اس اقتباس کا غور سے مطالعہ کرنے پر دو نتیجے نکلتے ہیں۔ اول تو یہ کہ اگرچہ وقار عظیم صاحب نے دعوی تو یہ کیا ہے کہ مومن کے رنگ تغزل میں ہر جگہ خلوص اور سچائی ہے لیکن " ہر جگہ" سے ان کی مراد مومن کا پورا کلام نہیں بلکہ صرف اچھے اشعار ہیں۔ دوسرے یہ کہ " خلوص اور سچائی" سے ان کا مطلب یہ ہے کہ مومن نے اپنی غزلوں (بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اپنے اچھے اشعار) کو گل و بلبل شمع و پروانہ، اور بادۂ و ساقی جیسے روایتی اشاروں سے پاک رکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر کسی شاعر کے اچھے اشعار میں بھی

خلوص اور صداقت کے عناصر نہ ہوں گے تو اور کہاں ہوں گے ۔

دوسرے یہ کہ اگر کوئی شاعر غزل کے چند روایتی علامات و استعارات کو برسرکار نہ لائے تو اس سے یہ کیونکر لازم آتا ہے کہ اُس کی شاعری سرتا سر خلوص اور صداقت پر مبنی ہے ۔ خلوص اور صداقت کا اتنا محدود بلکہ غلط تصور شاید ہی دنیائے ادب میں اب تک کسی نے پیش کیا ہو ۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ چند رسمی و روایتی اشاروں سے دامن چھڑا لینے کے باوجود ایک شاعر کے کلام کا بیشتر حصہ خلوص اور صداقت سے خالی رہ جائے ۔ اس خیال کی تصدیق کے لئے خود مومن کے دیوان کا دیانتداری کے ساتھ مطالعہ کر لیجئے ۔ پھر یہ بھی نا ممکن نہیں کہ رسمی علامات و استعارات سے کام لینے کے باوجود خلوص اور صداقت کا سر رشتہ شاعر کے ہاتھ میں رہ گیا ہو ۔ ثبوت کے لئے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر	پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر	(ذوق)
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے	جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے	(ثاقب)
خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو	وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے	(غالب)
تھا آفتِ جاں اس کا اندازِ کمانداری	ہم بچ کے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا	(حالی)
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل	کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت	(حالی)

خوفِ طوالت زیادہ مثالیں دینے میں مانع ہے ۔ ان میں سے ایک بھی شعر ایسا نہیں جو روایتی اشاروں سے پاک ہو پھر بھی ان اشعار کے خلوص اور صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ ممکن ہی نہیں کہ آپ ان میں سے کوئی بھی شعر کسی صاحب ذوق کے سامنے پڑھیں اور وہ اس کے دل میں نیشتر کی طرح اُتر نہ جائے ۔ لہٰذا اگر ان اشعار کو خلوص اور صداقت سے بیگانہ مان لیا جائے تو یہ بتانا ممکن نہ ہوگا کہ ان میں دل کے تاروں کو چھو لینے والی کیفیت کہاں سے آئی ۔ غرض کہ بعض اوقات "بادہ و ساغر" کے پردے بھی خلوص اور صداقت کو مجروح نہیں کرتے ۔ در اصل کلام میں خلوص اور صداقت کا پیدا ہونا محض روایتی علامات و اشارات کے عدم استعمال پر منحصر نہیں اس کے لئے ضروری یہ ہے کہ شعر حقیقی جذبات اور سچے تجربات کی ترجمانی کے لئے کہا جائے نہ کہ تخیل کی بلند پروازی اور میناکاری دکھانے کی غرض سے ۔ مومن کے اچھے اشعار کے متعلق خلوص اور صداقت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا مگر چونکہ ان کے بیشتر کلام میں تخیل بے راہ رو تخیل کی کارفرمائی زیادہ ہے اس لئے ہر دیانتدار نقاد پر یہ اعتراف واجب ہے کہ مومن کے زیادہ تر اشعار خلوص اور صداقت سے معرا ہیں ۔

وقار عظیم صاحب متذکرۂ بالا دعوے کو مضبوط بنانے کے لئے ایک بڑے پتے کی بات کہہ گئے ہیں ۔ آپ بھی اس سے لطف اندوز ہوتے چلیں ۔ فرماتے ہیں :- " ہمارے غزلوں کے صدہا دیوانوں میں تغزل کی جو شوخیاں ، رنگینیاں اور درد اور سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی جو تاثیر اور تڑپ ہے اس میں خلوص بہت کم جگہ ہے " میں سمجھتا ہوں کہ تناقض (Self contradiction) کی اس سے بہتر مثال ڈھونڈے نہیں مل سکتی ۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو وقار عظیم صاحب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سب سے پہلے مومن نے تغزل کو رسمی اور روایتی قیدوں سے باہر نکالا اور دوسری طرف وہ مومن کے ان اشعار پر سر دھنتے نظر آتے ہیں ؎

پشیماں آئے ہیں وہ لاش پر اَب — تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

موئے آغاز اُلفت میں ہم افسوس — اسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی ،

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں — ہم نہیں چاہتے کبھی اپنی شبِ دراز میں

کیا تغزل کی رسمی اور روایتی قیدیں محض گل و بلبل ، شمع و پروانہ اور ساقی و بادہ کے چند الفاظ تک محدود ہیں ۔ کیا محبوب کا

عاشق کی لاش پر آنا اور عاشق کا مرنے کے بعد بھی محبوب کی پشیمانی دیکھ سکنا اور یہ تمنا کرنا کہ " تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے " یا کسی عاشق کا آغازِ الفت میں مرجانا اور مرجانے کے باوجود اپنے دل میں یہ خلش محسوس کرنا کہ " اسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی " رسمی اور روایتی باتیں نہیں ہیں ؟ کیا مومن کا یہ کہنا کہ چونکہ وہ اپنے محبوب کے خواب ناز میں خلل اندازی پسند نہیں کرتے لہٰذا اپنی " شب دراز " میں کمی نہیں چاہتے محض ادعائے شاعرانہ نہیں ہے ؟ ۔ مندرجہ بالا آخری شعر کے متعلق نیاز فتحپوری کی ایک دلچسپ عبارت یاد آگئی۔ فرماتے ہیں " مومن کا عشق باوجود مادی ہونے کے اس درجہ بلند فتادگی رکھتا ہے کہ وہ اپنی ہر ناکامی کا شکار خود ہی بنا پسند کرتے ہیں اور محبوب سے کوئی مطالبہ ایسا نہیں کرتے جو شانِ عاشقی و محبوبی کے خلاف ہو۔ زمانِ ہجراں میں عاشقوں اور شاعروں کا واویلا خاص چیز ہے لیکن مومن کا ذوق اس باب میں یہ ہے :-

تانہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

اب یہ نیاز صاحب سے کون کہے کہ حضرت ! ایک ایسا شخص جس کو صحیح معنی میں عاشق کہ سکیں ، جس کے دل میں واقعی محبت کی تڑپ ہو کبھی اس بات کی تمنا نہیں کرسکتا کہ جدائی کی رات جس کا ایک ایک لمحہ اس کو پہاڑ معلوم ہوتا ہے جلد سے جلد سحر میں تبدیل نہ ہوجائے۔ اور اس لحاظ سے مومن کا وہ ذوقِ بلند جو متذکرہ شعر سے ظاہر ہوتا ہے ایک شاعرانہ ڈینگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس " زمانِ ہجراں میں عاشقوں یا شاعروں کا واویلا " انسانی فطرت کا صحیح اظہار ہے عشق و محبت میں عقل کے مطالبات دل کے تقاضوں پر غالب نہیں آتے۔ وہاں دل کی مجبوریاں دماغ کی وضعداریوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ غالب جیسے انانیت پسند شاعر کو بھی آخرکار کہنا ہی پڑا سے

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

مومن کی جس خصوصیت پر تذکرہ نگاروں ، اُردو ادب کے مورخوں اور نقادوں نے سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ اُن کی نازک خیالی اور معنی آفرینی ہے۔ چنانچہ اُردو شاعری میں جس طرح میر اپنے سوز و گداز ، درد اپنے متصوفانہ رنگ اور غالب اپنے مفکرانہ انداز کے لئے ضرب المثل ہیں ، اسی طرح مومن بھی اپنی نازک خیالی اور معنی آفرینی کے لئے خاص طور پر مشہور ہیں۔ مومن کو خود بھی اپنی خصوصیت پر ناز تھا سے

اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے کہاں ہے لیک معنی بند و مضمون یاب اپنا سا

(باقی)

نظیر صدیقی

ادھر اُدھر سے

آگ بجھانے کا نیا طریقہ

اس وقت کہیں آگ لگ جاتی ہے تو سب سے پہلے پانی کی طرف خیال جاتا ہے اور پھر یہ کہ گھر کے آدمیوں اور مال و اسباب کو باہر نکال دیا جائے تاکہ وہ آگ سے محفوظ رہیں، لیکن ان دونوں باتوں میں جن جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور اسی لئے حکومتوں نے آگ بجھانے والوں کا ایک محکمہ ہی الگ کر دیا ہے۔

اول تو یہی مشکل ہے کہ آگ لگنے کی اطلاع فوراً اس محکمہ کو پہونچ سکے اور اگر پہونچ بھی جائے تو یہ توقع رکھنا کہ بغیر کسی توقف کے آگ بجھانے والے فوراً موقع پر پہونچ جائیں گے، غلط ہے۔ یہ شکایت ہندوستان ہی نہیں بلکہ مغربی ممالک میں بھی ہے کہ آگ بجھانے والے بہت تساہل سے کام لیتے ہیں (چنانچہ بعض فلموں میں ان کی اس سہل انکاری کا خاکہ بھی اُڑایا گیا ہے)۔

آگ جس تیزی سے پھیلتی ہے، اتنی ہی تیزی سے اس کو بجھانا واقعی مشکل ہے، اول تو گھروں میں ہر وقت اتنا پانی موجود نہیں رہتا کہ وہ کافی ہوسکے دوسرے یہ کہ اگر کنوؤں اور نلوں سے حاصل کیا جائے تو اس میں بہت دیر لگ جاتی ہے اور آگ کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے، اس لئے آگ بجھانے والے اپنے ساتھ پائپ، سیڑھیاں، جال وغیرہ بھی لاتے ہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ پانی بیک وقت حاصل کرسکیں اور جن لوگوں کی جان خطرہ میں ہے ان کو باہر نکال سکیں۔ الغرض آگ بجھانے کے جو طریقے اس وقت رائج ہیں وہ بہت ناقص ہیں اور اسی لئے دنیا کو ہر سال آتشزدگی سے جان و مال کا کافی نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔

اس مسئلہ پر سائنس داں عرصہ سے غور کر رہے تھے کہ پانی کے علاوہ اور دوسرے زیادہ موثر طریقہ آگ بجھانے کے کیا ہوسکتے ہیں اور آخرکار ایک امریکی ماہر "ڈیل آگ" اس گتھی کو سلجھانے میں کامیاب ہوگیا اور اس نے ثابت کر دیا کہ آگ بغیر پانی اور گیس کی مدد سے بھی گھر بیٹھے بجھائی جاسکتی ہے، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جو طریقہ اس نے دریافت کیا ہے وہ اس قدر عجیب و غریب ہے کہ ذہن انسانی اس طرف کبھی منتقل ہی نہ ہوسکتا تھا یعنی اس نے اپنے تجربات سے ثابت کر دیا ہے کہ آگ کو مطلق آواز یا ایتھر کی ان موجوں سے بجھایا جاسکتا ہے جو فضا میں آواز سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جب ہم گیس کے چولھوں یا مشعلوں (Burners) کو آواز کی لہروں سے بجھا سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ بڑی آگ کو بھی اس طرح نہ بجھا سکیں۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ اس کے لئے ہم کو فائر اسٹیشنوں پر آواز کی لہریں پیدا کرنے کیلئے بڑے بڑے آلات رکھنا پڑیں گے اور ان کے استعمال کی صورت یہ ہوگی کہ جب کسی جگہ سے آگ لگنے کی اطلاع آئے گی تو اسی طرف یہ لہریں پھینک دی جائیں گی اور آگ بجھ جائے گی، اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے آلات گھروں میں بھی رکھے جاسکتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے معمولی آگ کو فوراً بجھایا جاسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ قدرت کا سب سے بڑا انعام سورج کی گرمی ہے، لیکن ہم اس سے بہت کم فایدہ اُٹھاتے ہیں، حالانکہ بہت سے وہ کام جو آگ کی مدد سے پورے کئے جاتے ہیں محض آفتاب کی گرمی سے پورے ہوسکتے ہیں

اس کا خیال ہے کہ ہم سورج کی گرمی پر بڑی طرح قابو پاسکتے ہیں جس طرح بجلی پر، یعنی اگر ہم بغیر تار کی مدد کے بجلی کو قابو میں لاسکتے ہیں جیسا کہ ریڈیو سے ظاہر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ سورج کی گرمی کو بھی اسی طرح گھر گھر منتقل نہ کرسکیں اور اس کی مدد سے بہت سے گھریلو کام (جیسے کھانا پکانا، استری کرنا وغیرہ) انجام نہ دے سکیں۔

حرارت آفتاب:

سورج میں کیا کیا قوتیں اور کس کس مقدار میں موجود ہیں، ان کا صحیح اندازہ انسانی قوت سے باہر ہے۔ سورج سے جتنی گرمی کرۂ زمین تک پہونچتی ہے وہ اس کی اصل گرمی کا دس کروڑواں حصہ بھی نہیں ہے، لیکن پھر بھی اس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ اس سے محروم ہوجانا گویا زندگی سے محروم ہوجانا ہے۔

اگر آپ دُنیا کے تمام کوئلہ کی سالانہ پیداوار برابر ۵۰ ہزار سال تک جمع کرکے اس کو روشن کریں تو ہم کرۂ ارض پر ۹۰ فٹ کی منجمد برفیلی تہ کو ایک سال کے اندر پگھلا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ گرمی یا حرارت کی بہت بڑی مقدار ہے، لیکن سورج سے جو گرمی ہم کو ہر وقت حاصل ہوتی رہتی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے، حالانکہ سورج کی اصلی حرارت سے اسے ذرہ و آفتاب کی بھی نسبت نہیں

اس مسئلہ پر آرخمیدس اور پلوٹارک کے زمانہ سے غور ہو رہا ہے۔ لیکن عملی حیثیت سے اول اول اٹھارویں صدی میں بفون نامی ایک ماہر سائنس نے ایک محدب شیشے کے ذریعہ سے آفتاب کی کرنوں کو ایک نقطہ پر لاکر آگ پیدا کرنے کی کوشش کی اس کے بعد اُنیسویں صدی میں مختلف ممالک کے ماہرین نے اس کا تجربہ شروع کیا، یہاں تک کہ آج یہ بات بالکل ممکن ہوگئی ہے کہ بعض گھریلو کام بغیر آگ کی مدد کے محض سورج کی گرمی سے انجام دے سکیں۔

عملی تجربات کے سلسلہ میں پروفیسر فلکس ٹرمبو نے بہت نمایاں قدم اُٹھایا ہے۔ وہ ایک گاؤں مانٹ لوئی کی تجربہ گاہ میں بہت بڑے بڑے محدب شیشے نصب کرکے آفتاب سے ۶۲۵۴ ڈگری حرارت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ یہ درجۂ حرارت وہ ہے جس میں ... اپونڈ لوہے کے ٹکڑے کو ایک گھنٹہ کے اندر گلاکر پانی کرسکتے ہیں۔

دھاتوں کے گلانے کے جو اور طریقے مستعمل ہیں ان میں بجلی، تیل اور کوئلہ سے کام لیا جاتا ہے، لیکن اس میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ صرف بہت زیادہ ہوتا ہے، متعدد آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے، دوسری خرابی یہ ہے کہ اس طرح دھات گلانے سے کوئلہ، تیل اور بھٹیوں کے اجزاء بھی دھات میں شامل ہوجاتے ہیں اور ان کو دوبارہ صاف کرنے کی محنت شاقہ برداشت کرنی پڑتی ہے، لیکن اگر یہی کام محض حرارت آفتاب سے لیا جائے تو صرف بھی بہت کم ہوگا اور دھات میں کسی اور چیز کی آمیزش بھی نہ ہوسکے گی۔

ہندوستان میں ایک چولھا اس قسم کا طیار ہوگیا ہے جو سورج کی گرمی سے ہمارے لئے کھانا طیار کرسکتا ہے، لیکن یہ کامیابی کی بالکل ابتدائی منزل ہے، ضرورت ہے کہ سورج کی گرمی سے جو قدرت کا بہت بڑا انعام ہے، زیادہ سے زیادہ فایدہ اُٹھایا جائے۔

دُنیا کا سب سے زیادہ قیمتی فلم مٹرو گولڈون کمپنی نے حال ہی میں ایک فلم طیار کیا ہے جو دُنیا کا سب سے زیادہ اہم و قیمتی فلم سمجھا جاتا ہے۔ اس فلم کا نام QUO VADIS ہے جس میں روم کے مشہور ظالم بادشاہ نیرو کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ اس فلم کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کی طیاری میں پورے بارہ سال صرف ہوئے، ۳۲ ہزار لباس طیار کئے گئے، ایک لاکھ ۵۰ ہزار سبزیاں بنانا پڑیں، ۳۰ ہزار اداکاروں نے اس میں حصہ لیا اور ۲۵ لاکھ پونڈ اس کی تکمیل میں صرف ہوئے۔

اس تصویر کی طیاری کے لئے روم ہی کی سرزمین تجویز کی گئی اور وہی اسٹوڈیو حاصل کیا گیا جسے کسی زمانہ میں مسولینی نے ہالی ووڈ کے مقابلہ میں طیار کیا تھا۔

نیرو کے زمانہ کا روم پیش کرنے کے لئے پورا شہر کا شہر انھیں بنانا پڑا۔ اس کے لئے خدا جانے کتنے معماروں، کتنے بڑھئی، کس قدر سنگ تراشوں اور پینٹروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ۳۲ ہزار لباسوں کے لئے ۵۰ ہزار کپڑا خریدا گیا اور اس کے سینے کے لئے ایک درزی خانہ علٰحدہ قایم کیا گیا۔

صرف اسٹوڈیو سے باہر کے مناظر طیار کرنے کے لئے ۵۰۰ کاریگر لگائے گئے جنھوں نے ایک لاکھ ۵۰ ہزار سین سینری طیار کیں۔ قدیم اہل روما جس وضع کے بال رکھتے تھے، اس کے لئے فلارنس کی ہزاروں عورتوں کے بال حاصل کئے گئے تاکہ ان سے تین ہزار طیار کئے جائیں۔

بجلی کا سامان جو ہالی ووڈ سے آئی بھیجا گیا اس کا وزن ۵۰ ٹن تھا۔

نیرو کا ایک دلچسپ مشغلہ یہ بھی تھا کہ وہ دنگل میں شیروں کے سامنے آدمیوں ڈالدیا کرتا تھا اور شیر انکے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالتے تھے اس سین کے لئے ۳۴ شیر مختلف سرکسوں سے حاصل کئے گئے اور ہفتوں تک انھیں رومی لباس دیکھنے کا عادی بنایا گیا اس مشق کے دوران میں ایک شیر نے ایک اداکار کو ہلاک بھی کردیا۔ اس سلسلہ میں ایک اداکار فورا سوتبرن کا بیمہ جسے شیروں کے پاس رہ کر کام کرنا تھا ۲۰ ہزار ڈالر میں کرایا گیا۔

سرکس کے یہ شیر چونکہ صرف گدہے اور خچر کا گوشت کھانے کے عادی تھے اس لئے جب انھیں بغیر راتب دئے ہوئے ڈمی اداکاروں کی طرف چھوڑا گیا تو شیروں نے توجہ بھی نہیں کی، مجبوراً ان پر خچروں کا گوشت منڈھا گیا اور اس کے بعد شیروں کے حملہ کا سین مکمل ہوا۔

شاہ نیرو کا محل طیار کرنے کے سلسلہ میں سات ۴۰۰۰ فیٹ کے مجسمے طیار کرکے نصب کئے گئے اور دریائے ٹائبر پر ایک نیا پل طیار کیا گیا تاکہ شہر کی آتشزدگی کے وقت اس پل سے لوگوں کے بھاگنے کا سین دکھایا جاسکے۔

آگ لگانے کے لئے پورا شہر کا شہر انھیں از سرِ نو طیار کرنا پڑا اور ۴۰ ٹینک پٹرول سے بھرے ہوئے آگ لگانے میں خالی ہوگئے۔

فلم کا وہ حصہ جو روز طیار ہوجاتا تھا، انگلستان بھیجا جاتا تھا اور وہاں سے ڈیولپ ہونے کے بعد فوراً واپس کیا جاتا تھا تاکہ ڈائرکٹر اسے دیکھ کر معلوم کرسکے کہ اس میں کوئی کمی تو نہیں ہے۔

وزیر اعظم پاکستان کے نام

(فضا ابن فیض اعظمی)

کیوں جذب تہ ریگ ہوئی موجِ گہر ریز ؟
خورشید ترے کیوں ہوئے راتوں پہ رضامند ؟
اے مردِ خرد مند !

مہتاب و کواکب ہیں اسی خاک کی میراث
دریوزہ گری عالمِ افلاک سے تا چند ؟
اے مردِ خرد مند !

ہر صبح کا سرمایہ ہے اک مہرِ جہانتاب
کس طرح سے بے سوز و تب عشق ہے خورسند
اے مردِ خرد مند !

حاصل نہیں سوزِ ابدی بے نفس گرم
شبنم نہیں کر سکتی شعاعوں کو نظر بند
اے مردِ خرد مند !

بے سوز ہوں سینے تو ہیں کردار بھی بیکار
بے لالہ و گل باغ ہے ویرانے کے مانند
اے مردِ خرد مند !

یہ تیرہ نہادانِ قبا پوش و خطا کوش،
پیراہنِ آئینہ میں ہیں زنگ کے پیوند
اے مردِ خرد مند !

جل کر بھی ہیں یہ فطرتِ پروانہ سے محروم
"مُلّا" ترے گلخن کے ہیں بس دانۂ اسپند
اے مردِ خرد مند!

یہ دشمنِ ایمان ہیں، کفرانِ بصیرت
یہ بندۂ زر، جاہ و مناصب کے ہیں پابند
اے مردِ خرد مند!

چھڑکی ہے انھیں آئینہ سازوں نے سیاہی
ہیں تیری فضائیں انھیں ذرّوں سے گلہ مند
اے مردِ خرد مند!

بادل ہیں یہ وہ جن سے برستی ہے فقط آگ
آشوبِ ہلاکو سے یہ آشوب ہیں سہ چند
اے مردِ خرد مند!

کتنے گل و نسریں نہیں اس راز سے آگاہ
ہے کس کا لہو لالۂ صحرا کا حنا بند،
اے مردِ خرد مند!

رندانِ قدح خوار پہ بھی گاہے نظر کر
شاید کہ یہی جامۂ ملت کے ہوں پیوند
اے مردِ خرد مند!

ممکن ہی نہیں یہ کہ جگر تشنہ ہوں کانٹے
اور پھولوں کے ہونٹوں پہ ہوں امواج شکرخند
اے مردِ خرد مند!

شہر نگار

(پروفیسر شور)

یہ دھوپ اور اس بلا کا سایہ
غربت میں وطن کا دھیان آیا

پردیس نے سحر کیا کچھ ارشاد
اک شہرِ نگار آگیا یاد

وہ خاکِ وفا، وہ مہر کا شہر
ہنس ہنس کے پیا ہے جس کا ہر زہر

وہ شہرِ سرود و ساز و آہنگ
آتشکدۂ چغانہ و چنگ،

رقص و رم و رنگ و نور کی خاک
مضرابِ جنوں خرد کی فتراک

جبریل شکار و کعبہ در دام
میخانے کی شب کنشت کی شام

آتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز
چھڑتے ہوئے بتکدوں کے وہ ساز

سلگے ہوئے ساز دہکے سینے
ہے ہے وہ پگھلتے آبگینے

بربط کی وہ لو وہ چنگ کی آگ
دل میں وہ اُترتے آتشیں راگ

شعلوں سے وہ کھیلتے نواگر
سینوں میں وہ ٹوٹتے سے نشتر

جلوؤں کی سحر، جمال کی رات
تپتے ہوئے دن، سلگتے لمحات

وہ سیم تنانِ برہمن زاد
بت خانے کا غم، حرم کی فریاد

آنکھوں میں صنمکدوں کی تقدیس
ہونٹھوں کی ہنسی میں درد کی ٹیس

گل پوش و نوا فروش اصنام
زہرہ کا سرود خوابِ خیام

معبد کو رواں بنات ناہید
رستوں میں طلوعِ ماہ خورشید

یونان کی صبح، مصر کی رات
خورشید جمال دیویاں سات

کندن سے بدن کا آتشیں روپ
جلوہ بھی سحر نقاب بھی دھوپ

آنچل میں چھپی شفق کی لالی،
شانوں پہ گھٹائیں کالی کالی،

قشقہ بہ جبین و گل بگیسو ، — بستی کے وہ شوخ و شنگ آہو
معصوم شرارتوں کا ہنگام — آوارہ غزال رام در دام
بدمست جوانیوں کا عالم — بھرپور شباب چست محرم

. . . .

وہ عطر و گل و حنا وہ کاجل — اُڑتے ہوئے وہ سروں سے آنچل
وہ پیرہنوں کی گلفشانی ، ، — کھولے ہوئے زلف رات رانی
زلفوں کی مہک ہوا کی مستی — پی جاؤ تو ہر شراب مستی !!
وہ پھول، وہ سبزہ، وہ کنارے — وہ ابر، وہ بوندیاں، وہ دھارے
وہ سرد ہوا کا تیز چلنا — وہ نبض سحاب کا اُچھلنا ،
بھیگی ہوئی رات ، نم ہوائیں — برکھا کی ہوا وہ سائیں سائیں
وہ ابر، وہ بتکدے کی برسات — وہ رات وہ دوست سے ملاقات
گھنگھور گھٹا، فضا دھواں دھار — اور اُس سے ملیں یہ دل کا اصرار
کہتے تھے یہ راستوں کے سائے — ایسا نہ ہو کوئی دیکھ پائے
آساں نہیں قہقہوں میں جینا، — یہ زہر ذرا سنبھل کے پینا !!
وہ چہرۂ دوست کی اُداسی — پھولوں کی ہنسی کرن کی پیاسی
معصوم محبتوں کا اخلاص، — محتاط نظر کی دعوتِ خاص
زخموں کا نفس نفس سے چھلنا — مل کر بھی نہ ہائے اس کا ملنا !
ہر شام کوئی نیا بہانہ ، — چھپ چھپ کے اُسی گلی میں جانا
گلیوں میں گریز آدمی سے، — رستوں میں وہ بھیگنا خوشی سے
جب اُس کے دیار سے گزرنا — سائے سے بھی آدمی کے ڈرنا
ڈرنا کہ زمانہ ڈس نہ جائے — انساں کا زہر ہائے ہائے !
اے کشمکشِ برہنہ پائی، — کس دشت میں مجھ کو کھینچ لائی

اِس رنگ سے ابر چھا رہا ہے
پھولوں کو پسینہ آ رہا ہے !

"گل و بلبل کی سرزمین سے"

(تنویر احمد علوی ایم - اے)

جہاں پھر ڈھونڈتا ہے تیرے ایوانِ معلّٰی کو
تری فردوسِ گم گشتہ کے اُس نقشِ مجلّٰی کو
"کنارِ آبِ رکنا باد و گل گشتِ مصلّٰی" کو

خموں میں ہاں ترے اب تک مئے دوشینہ باقی ہے
وہی پیرِ مغاں ہے ساغر و مینا ہے ساقی ہے
عمر خیّام ہے حافظ ہے سعدی ہے عراقی ہے

یہاں نوشیروانی بھی ہے مزدک کا قرینہ بھی
یہاں زردشت بھی ہے جلوۂ ماہ مدینہ بھی
یہاں آتش کدہ بھی ہے فروغِ طورِ سینا بھی

مگر محفل تری تیرہ ہے، ظلمت ہے دماغوں میں
یہ تیرا خونِ دل جلتا ہے مغرب کے چراغوں میں
"مئے باقی نہیں اب زہر ہے تیرے ایاغوں میں"

جگر بریلوی:

جتنی کثرت ہوئی رعنائی و زیبائی کی
پیاس بڑھتی ہی گئی چشمِ تماشائی کی

جلوۂ حسن نے اک آگ لگا دی دل میں
آگ وہ آگ کہ جس نے چمن آرائی کی

گرمیِ شوق کے صدقے غمِ رنگیں کے نثار
ہم جہاں بیٹھ گئے انجمن آرائی کی

اب وہاں صرف بہاروں سے پتہ چلتا ہو
دفن تھی خاک کہاں حُسن کے شیدائی کی

کچھ ازل ہی سے تھا کانٹوں کو کفِ پا سے لگاؤ
کیا یونہیں ہم نے جگر بادیہ پیمائی کی

اُٹھتی جاتی ہے جگر حُسن کے چہرے سے نقاب
لگ گئی جب سے لگن ہم کو خود آرائی کی

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۸۰ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخئیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشار عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں بھی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں۔

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

(۲) مادئین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کا عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اسکے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشار کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کردینا آخر تک پڑھ لینا ہے یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت

ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقش ہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد فنون و ہیئت حقیقت نگاری

قیمت چار روپے علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

REGD No.

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۴۲ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کیلئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری۔ مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۸ء

پاکستان نمبر نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت اور قرون اسلام کے بعض حقایق کو پیش کیا گیا ہے تا کہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زرین کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کیے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیئے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا مجموعہ جس میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعرا کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں "مارس ہنڈس" کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ (اقتباس) ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد ہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستے کو جان لیں سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت دو روپیہ

۵۵ سال کے بعد

یہ کتاب نفسیات عمل پر اتنا مفید دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اسکو ایکبار ہاتھ میں لینے کے بعد اسوقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کر لیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ "زندہ رہنا بھی ایک فن ہے"

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

سالنامہ ۵۲ء

(حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد نے حصہ لیا ہے۔ اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپکو کلیات حسرت دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لئے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۵۳ء

داغ نمبر جس میں داغ کے سوانح حیات ... [illegible]

رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۴۴۶

11 JUL 1953



ہندوستان و پاکستان دو روپے ٹکہ ۔ سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان

قیمت فی کاپی ۱۰/- ۔ بارہ روپیہ (سالانہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

من ویزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ واخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

ضخامت ۶۰۲ صفحات مجلد نو روپیہ للعہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات کا مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے ۱۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس و رہان ہی حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۴۶۲ صفحات کاغذ سفید سنر قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے روکنے میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپکو بعض ایسے واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

مئی اور جون کے نگار میں ہم کافی وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ نگار کا آیندہ سالنامہ

"فرمانروایانِ اسلام" نمبر کیا، اور کیسا ہوگا

اور اس کی بعض خصوصیات کو بھی ظاہر کر چکے ہیں، لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے بعض حضرات اس کی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکے ہوں، ہم مکرر اس کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں

یہ سالنامہ در اصل "تاریخ اسلامی" کا نچوڑ ہوگا، جس میں ولادتِ رسول اللہ سے لیکر اسوقت تک کی تمام چھوٹی بڑی مسلم حکومتوں کا ذکر ہوگا جو ۱۴ سو سال کے اندر تمام کرۂ ارض پر رونما ہوکر فنا ہوگئیں یا اب بھی باقی ہیں۔ اس میں ان تمام حکومتوں کے اسباب قیام و عروج اور انحطاط و اختتام کے ذکر کے ساتھ تمام حکمرانوں کے نام، ان کی حکومت کی مدت بقید سن ہجری و عیسوی درج ہوگی اور یہ بتایا جائیگا کہ ایک ہی خاندان سے اور کتنے خاندان پیدا ہوئے، انھوں نے کہاں کہاں حکومتیں کیں اور ان کا کیا حشر ہوا

مسلمان اپنے زمانۂ عروج میں یورپ، ایشیا، افریقہ کے ان بعید ترین گوشوں تک پہونچ گئے تھے جن کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کا علم بہت کم حضرات کو ہے۔ نگار کے اس سالنامہ کے ذریعہ سے تاریخ اسلام کی انھیں مفید و دلچسپ معلومات کو پیش کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ دو نقشے ایسے پیش کئے جائیں گے جن کو دیکھکر مسلمانوں کے عروج و زوال کی تصویر آپ کے سامنے آجائے گی

یہ پورا سالنامہ خود اڈیٹر نگار مرتب کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ہم پہلی جنوری ۱۹۵۷ء تک اسے شایع کر سکیں گے اس کی ضخامت کا صحیح اندازہ ابھی نہیں ہوسکتا۔ اس کی بابت غالباً ہم کچھ کہہ سکیں گے۔ امید ہے کہ آپ اس کی توسیع اشاعت میں ضرور حصہ لیں گے اور اپنے حلقۂ احباب، مدارس کے طلبہ و اساتذہ کو بھی اس سالنامہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کریں گے۔

یہ سالنامہ در اصل ایک مستقل کتاب ہوگی اور کتاب ہی سمجھ کر اس کو حاصل کرنا چاہئے

جو حضرات نگار کے خریدار نہیں ہیں اور صرف سالنامہ ہی لینا چاہیں گے ان کے لئے اس کی قیمت (علاوہ محصول ڈاک) تین روپیہ ہوگی۔

ایجنٹوں کو اپنا آرڈر جلد دیدینا چاہئے تاکہ اسی حساب سے اس کی کاپیاں زاید طبع کرائی جائیں۔

مینجر نگار لکھنؤ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ جولائی میں ختم ہوگیا اور اگست کا
"نگار" آٹھ روپیہ سات آنے میں وی پی ہوگا جس میں سالنامہ ۵۳ء کی قیمت بھی شامل ہے

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۴ | فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۵۳ء | شمارہ ۱

ملاحظات

پاکستان کا نیا دورِ حکومت اور اس کا مستقبل

پاکستان کی جدید وزارتِ عظمیٰ کے ساتھ جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں، ان کے متعلق یہ سوچنا کہ وہ کس حد تک پوری ہوئیں قبل از وقت ہے لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ خواجہ صاحب کے آخری عہد میں جو ایک عام کیفیت اضطراب و انتشار کی پاکستان میں پیدا ہو چلی تھی وہ بڑی حد تک کم ہوگئی ہے اور مسٹر محمد علی کے جو بیانات اس وقت تک شایع ہوئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ہوا کا رخ معلوم کر لیا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

پاکستان کے سامنے اس وقت اہم ترین مسئلہ اپنی مالی و اقتصادی دشواریوں کو دور کرنا ہے اور غیر صنعتی، غیر ترقی یافتہ ممالک کے لئے یہ مسئلہ ہمیشہ بڑا دردِ سر ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ نہ ملک کی غذائی پیداوار کو دفعتًا اتنا بڑھایا جا سکتا ہے کہ اسے باہر سے غلّہ نہ منگانا پڑے اور نہ وہ اپنے قدرتی صنعتی وسایل کو آنًا فانًا کارخانوں اور فیکٹریوں میں تبدیل کر سکتا ہے۔ لامحالہ اسے دوسرے ملکوں کے سرمایہ اور ماہرینِ فن کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور بسا اوقات نہ صرف اپنی ملک کی خام دولت بلکہ اپنی خود داری کو کھو کر یہ سودا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کسی ملک کے باشندوں کے لئے فراہمی غذا اور انسدادِ بے روزگاری کا مطالبہ تو بہت آسان ہے، لیکن جو لوگ ان مطالبات کے پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں ان سے پوچھئے کہ یہ مطالبات پورا کرنے کے لئے کتنے ہفتخوان انھیں طے کرنا پڑتے ہیں اور جذبات کا کتنا خون انھیں کرنا پڑتا ہے۔

پاکستان کی پبلک یہ سُنکر غالبًا بہت خوش ہوگی کہ امریکہ نے لاکھوں ٹن گیہوں دینا اسے منظور کر لیا ہے، لیکن وہ اس سے بیخبر ہیں کہ

گیہوں کے ایک ایک دانہ کے عوض خود انھیں کیا دینا پڑے گا، روپیہ نہیں، سونا نہیں، بلکہ ترازو کے ایک پلّہ میں غلّہ رکھا جائے گا، دوسرے پلّہ میں آزادی و خودداری اور جب یہ پلّہ جھک جائے گا اس وقت سودا پورا ہوگا۔

اس لئے وہ پاکستان ہو یا ہندوستان جب تک عوام میں یہ احساس نہ پیدا ہوکہ دوسروں کی امداد پر جینا، جینا نہیں، موت ہے بلکہ موت سے بدتر کوئی اور چیز، اس وقت تک نہ حکومت کچھ کرسکتی ہے، نہ خدا۔ حکومت تو اس لئے مجبور ہے کہ پبلک کی ذہنیت اس کا ساتھ نہیں دیتی۔ رہا خدا، سو اس کا فیصلہ معلوم ہی ہے کہ وہ کسی قوم کے حال میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہ کرے (حتیٰ یغیروا ما بانفسہم) یعنی نفس کی تبدیلی، رجحان کی تبدیلی، احساس و وجدان کی تبدیلی! یہی وہ چیز تھی جس نے ہمیشہ قوموں کو اُبھارا اور اسی چیز کا فقدان ہے جو ہمیشہ انھیں مٹاکر رکھدیتا ہے۔

میں ہندوستان کی آبادی کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ اس کے موجودہ رجحانات کیا ہیں، لیکن پاکستان جاکر میں نے وہاں لوگوں کی جس ذہنیت کا مطالعہ کیا وہ یقیناً افسوسناک ہے۔

مسلمانوں نے غالباً یہ سمجھا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد وہ کسی ایسی دنیا میں پہونچ جائیں گے جہاں صرف شہد اور دودھ کی نہریں ہوں گی اور فراغ و اطمینان کی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی اور طوبیٰ کے سایہ میں وہ اپنی ساری عمر اینڈ اینڈ کر گزار دیں گے۔ وہ لوگ جو ہندوستان سے ہجرت کرکے وہاں گئے ہیں، کم ازکم ان کے متعلق تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اسی "فردوس ارضی" کا تصور اپنے ساتھ لیکر گئے تھے، اب رہگئے خود پاکستان کے اصلی باشندے سو وہ بھی اس نشہ میں مست تھے کہ حکومت ان کی ہوگی اور حکومت کا مفہوم ان کے نزدیک صرف عیش و تنعم کی زندگی بسر کرنا تھا۔ الغرض تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے مہاجرین و انصار دونوں غلط فہمیوں میں مبتلا تھے اور بہت کم نفوس ایسے تھے جو سمجھتے تھے کہ فی الحال پاکستان جغرافی وجود سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور اس کو ملک یا حکومت بنانے کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تقسیم کے بعد پاکستان کی حالت ایک اُجڑے دیار کی سی تھی اور قیام حکومت کیلئے وہاں کے حالات بہت ناموافق تھے لیکن قایداعظم کا وجود ایک ایسی انرجی (ENERGY) تھی جو ہر جگہ اپنا کام کررہی تھی اور اسی قوت کی بدولت آخرکار یہ مشکل بہ آسانی حل ہوگئی اور حکومت کا ڈھانچہ بہت جلد طیار ہوگیا۔ پھر چونکہ نیا نیا جوش تھا، قایدِ اعظم زندہ تھے، سب کا نقطۂ نظر ایک تھا، اس لئے کم وقت میں بہت کچھ ہوگیا۔

لیکن قایدِ اعظم کی آنکھ بند ہونا تھا کہ ردّ عمل شروع ہوا اور یہ وہی ردّ عمل تھا جس کا قایدِ اعظم کو بھی اندیشہ تھا، یعنی وہاں صوبائی عصبیت شروع ہوگئی اور قومی وملکی یکجہتی ذاتی و شخصی اغراض کی کشمکش میں پارہ پارہ ہوگئی۔

کیا کوئی کہہ سکتا تھا کہ پاکستان جو غلّہ کا گھر ہے کسی وقت دوسروں کے سامنے دست سوال پھیلانے پر مجبور ہوجائے گا اور وہاں کا TARIFF جس پر اس کی ساکھ قایم تھی دفعتاً یوں غیر متوازن ہوجائے گا۔ لیکن یہ ہوکر رہا اور صرف اس لئے کہ وہاں پاکستان کا کلی وجود ختم ہوگیا اور وہ قوتیں جن کو صرف ایک وحدتِ ملکی کے قیام میں صرف ہونا چاہئے تھا، صوبہ داری تعمیر میں صرف ہونے لگیں حالانکہ اسلام کا مقصد اولین رنگ ونسل کے امتیاز کو بھی مٹانا تھا چہ جائیکہ صوبوں کا امتیاز کہ یہ تو نہایت ادنیٰ درجہ کی چیز ہے۔

الغرض اس وقت پاکستان کو دو بہت بڑے سنگ گراں راستہ سے ہٹانا ہیں یعنی ایک طرف اسے صوبہ داری عصبیت کو محو کرنا ہے اور دوسری طرف معاشی نظام میں ایسی تبدیلی پیدا کرنا کہ وہاں کے عوام یہ سمجھ سکیں کہ آسمان سے من و سلویٰ نازل ہونے کا زمانہ ختم ہوگیا ہے اور اب دُنیا میں وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جو حرکت و عمل سے اپنے آپ کو زندہ رکھنا چاہے۔

مسٹر محمد علی لاکھ باخبر انسان سہی، لیکن ان سے کسی معجزہ کی توقع رکھنا بیکار ہے۔ اگر قوم ان سے حصول اطمینان و فراغ کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس حال میں کہ وہ خود ان کے ساتھ تعاون کرنے پہ آمادہ نہیں تو یہ یقیناً معجزہ کا مطالبہ کرنا ہے اور یہ رسم اب باقی نہیں

: میں نے اس لئے کہا کہ پاکستان کی نئی وزارت عظمیٰ جن گتھیوں کو سلجھانا چاہتی ہے وہ بہت پیچیدہ ہیں اور ہوسکتا ہے کہ انکے سلجھانے میں بعض ایسی تدابیر سے بھی اسے کام لینا پڑے جو اہلِ پاکستان کی پچھلی توقعات کے منافی ہوں اور وہ پھر اپنے جذبات سے مغلوب ہوکر مخالفت پر آمادہ ہوجائیں۔

ہم تقسیم ہند کے بعد ہی سے یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ ہندوستان و پاکستان دونوں کی بقا اسی میں ہے کہ وہ دونوں ہر حالت میں متحد رہیں اور آپس کے اختلافات کو دوستانہ طریقہ پر آپس ہی میں طے کریں خواہ کسی کو کتنا ہی کیوں نہ دبنا پڑے — اس لئے جب مسٹر محمد علی نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی ہندوستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو ہم کو مسٹر محمد علی کی وقت شناسی سے بڑی خوشی ہوئی لیکن اب کہ پچھلے ایک ماہ کے اندر مصالحت و مسالمت کی یہ فضا زیادہ وسیع ہوگئی ہے اور قول سے گزر کر عمل کا وقت قریب تر آتا جا رہا ہے، بعض اوقات یہ اندیشہ بھی دامنگیر ہوجاتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کسی خاص مسئلہ میں پاکستان کے لوگ پھر جذبات سے مغلوب ہوجائیں اور یہ سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔

تمام اختلافی مسایل میں سب سے زیادہ اہم اور بنیادی مسئلہ کشمیر کا ہے اور یہ اسی وقت طے ہوسکتا ہے جب ہندوستان و پاکستان دونوں رواداری سے کام لیں۔ یہ صورت تو اب یقیناً باقی نہیں کہ پورا کشمیر ہندوستان کو مل جائے یا پاکستان کو، اسلئے اب رواداری کا تعلق صرف اس بات سے رہ جاتا ہے کہ وہ اس کی تقسیم پر راضی ہوں، لیکن یہ تقسیم ہندوستان کی سی تقسیم نہ ہو جس نے لاکھوں انسانوں کا خون کرا دیا، بلکہ اس کی نوعیت ایک ایسے سمجھے بوجھے لائحۂ عمل کی سی ہو جس سے آیندہ کے فتنہ و فساد کا بھی سدِباب ہوسکے۔

کہا جاتا ہے کہ کشمیر کی تقسیم میں جموں اور لداخ کا علاقہ ہندوستان کو ملنا چاہئے اور آزاد کشمیر کا پاکستان کو۔ خیر اس حد تک تو کسی زیادہ اختلاف کا اندیشہ نہیں ہے لیکن وادی کشمیر کا فیصلہ البتہ بہت مشکل ہے کیونکہ اصولاً اس کو رائے عامہ پر چھوڑ دیا گیا ہے اور پرجا پریشد تحریک نے یہ پہلو ہندوستان کے لئے کافی کمزور کردیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شیخ عبداللہ کی حکومت نے جو اصلاحات کشمیر میں نافذ کی ہیں وہ وہاں کے عوام کے لئے جن میں غالب حصہ مسلم آبادی کا ہے، بڑی خیر و برکت کا باعث ہیں اور بڑے امید افزا مستقبل کا پتہ دیتی ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ آزاد رائے شماری کے وقت وہاں کا مسلمان ان تمام باتوں کو پس پشت ڈال دے گا اور جموں کی تازہ جن سنگھی شورش کے پیش نظر اس کی ذہنیت ضرور مذہبی جذبات سے مغلوب ہوجائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ ان حالات میں رائے شماری کے وقت کشمیر کو دو جداگانہ وحدتوں میں تقسیم کرکے جموں کو ایک علٰحدہ وحدت قرار دیا جائے اور اس صورت میں اس کا قوی امکان ہے کہ جموں کثرت رائے سے ہندوستان کے ساتھ ملحق ہوجائے لیکن اسی کے ساتھ ایک بہت بڑا سوال وہاں کی مسلم آبادی کی ہجرت کا سامنے آئے گا اور کشت و خون سے بچنے کے لئے ہندوستان کو پوری ذمہ داری کے ساتھ انتقال آبادی کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا، جو آسان بات نہیں —— ہم کو نہیں معلوم کہ نہرو اور محمد علی کے درمیان لندن میں جو گفتگو ہوئی ہے اس میں کشمیر کا بھی ذکر تھا یا نہیں اور اگر تھا تو اس کی نوعیت کیا تھی، لیکن مسٹر محمد علی کے تازہ بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اس باب میں جو تبادلۂ خیال ہوا ہے وہ کافی امید افزا ہے اور اگر اسی کے ساتھ ہم امریکہ و برطانیہ کے بعض اخباروں کے بیانات کو بھی سامنے رکھیں تو آثار کچھ ایسے نظر آتے ہیں کہ ملکوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والی مغربی پالیسی کے تحت کشمیر بھی غالباً تقسیم ہوجائے گا، یعنی جموں اور لداخ ہندوستان کو اور آزاد کشمیر کا علاقہ پاکستان کو دیدیا جائے گا۔ اب رہ گیا سوال وادی کشمیر کا سو ممکن ہے کہ عبداللہ حکومت کو بدستور قایم رکھتے ہوئے دس بارہ سال کے لئے اسے یو۔ان۔او کے سپرد کردیا جائے اور جب اس مدت کے بعد رائے شماری کی جائے تو وہ امریکن پروٹکٹریٹ کی صورت اختیار کرلے —— اگر اس قرارداد پر پاکستان و ہندوستان دونوں راضی ہوگئے جس کا قوی امکان ہے تو اس کا فوری نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں ملکوں کی فوجیں جو وہاں سالہا سال سے بیکار پڑی ہوئی ہیں ہٹ جائیں گی اور دفاعی مصارف کم کرکے وہ اپنے تعمیری منصوبوں کی طرف متوجہ ہوسکیں گے —— اس میں شک نہیں کہ یہ فیصلہ ہندوستان و پاکستان دونوں کے اقتدار کو ایک حد تک صدمہ پہونچانے والا ثابت ہوگا —— لیکن اگر مفاہمت کی یہ صورت موجودہ دورِ تذبذب کی الجھنوں اور آیندہ جنگ کے امکانات کو دور کرسکتی ہے تو ہندوستان و پاکستان دونوں کو اسے گوارا کرنا چاہئے کیونکہ اقتدار کا سوال بڑی حد تک جذباتی چیز ہے اور عملی دنیا کے مصالح تو بڑی بڑی قوموں کو بھی سپر ڈالدینے پر مجبور کردیتے ہیں۔

جوش کی انقلابی شاعری

اُردو شاعری کے نشاطیہ دور کے بعد حالؔی کے اثر سے تنقیدِ حیات شروع ہوئی اور زندگی کو سوارنے نکھارنے کی جدوجہد کا آغاز بھی ہوا، لیکن ہمیں اس کا اثر پہلی جنگِ عظیم سے قبل اتنا نمایاں نہیں ملتا، جتنا اس کے بعد۔ جنگ عظیم کے بعد شاعری وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوئی، شاعری سے پیغام کا کام لیا جانے لگا اور اقبالؔ جیسا عظیم شاعر پیدا ہوا۔ اقبالؔ کے یہاں جو تضاد ملتا ہے اس سے قطع نظر اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وطنیت قومیت وغیرہ کے محدود تصورات سے آگے وہ ایک ایسے مقام پر نظر آتے ہیں جہاں سے انھوں نے عالمگیر اخوت، مساوات اور محبّت کا پیغام دیا۔ اقبالؔ نے اپنی فکر و اجتہاد سے دُنیا کا جو وسیع مطالعہ پیش کیا ہے اُس نے ہماری نئی نسل کو بہت متاثر کیا۔ اقبالؔ زمین کے اندیشوں سے نہ بچ سکے اور وہ سرمایہ دارانہ نظام بھی لوٹ کھسوٹ سے کبھی غافل نہ رہ سکے، مزدوروں کی بدحالی بھی اُن کے پیشِ نظر رہی۔

اب اُردو شاعری میں نئے عنوانات بھی آئے، نئے خیالات اور تصورات نے بھی جگہ لی لب و لہجہ بھی بدلا۔ قنوطیت کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑی اور رجائیت نے اُس کی جگہ لے لی، جبر و استبداد کے آگے سرنگوں ہونے کی بجائے اب مظلوم میدان میں ہتھیار باندھ کر اُتر آیا تھا۔ ہندوستان انگریزوں کی غلامی تلے سسکنا نہیں چاہتا تھا وہ آزاد ہونا چاہتا تھا۔ حالات بدلنے کی امنگ پیدا ہوئی۔ ہمارے شاعروں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ انگریزوں کی غلامی سے نجات کا مسئلہ تھا۔ اقبالؔ اور جوشؔ کے یہاں یہ سیاسی رجحان دوسرے رجحانات پر غالب ہے۔ مگر اقبالؔ کے یہاں جو گہری مفکرانہ سنجیدگی ملتی ہے جوش کے یہاں وہ مفکرانہ سنجیدگی نہیں ہے۔ جوشؔ کے انقلاب کا تصور محدود اور زیادہ تر رومانی ہے۔

یہاں مقصد جوشؔ اور اقبالؔ کا موازنہ نہیں ہے بلکہ جوشؔ کی انقلابی شاعری کو پرکھنا ہے۔ عام طور پر جوشؔ کو "شاعرِ انقلاب" کہا جاتا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ جوشؔ کی انقلابی شاعری بڑی حد تک مکمل ہے اور اُن کی شاعری کا بیشتر کامیاب حصہ انقلاب ہی سے متعلق ہے، اگر تعمیری مقصد کے بغیر تخریب کا نام انقلاب ہے تو جوش واقعی انقلابی شاعر ہیں اور اگر خطابت کا نام شاعری ہے تو کسی کو جوشؔ کی شاعری میں شبہ نہیں ہونا چاہئے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ نہ تو محض تخریب کا نام انقلاب ہے اور نہ خطابت کا نام شاعری۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو میں جوشؔ ہی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مذہب، سماج، محکومی اور خدا کے خلاف نعرۂ بغاوت بلند کیا ہے۔ لیکن ہمیں جوشؔ کو نعرہ لگانے والے کی حیثیت سے نہیں دیکھنا ہے بلکہ شاعر کی حیثیت سے پرکھنا ہے، جوشؔ کی نظموں میں بہت زیادہ بلند آہنگی ہے۔ مگر اس قدر بلند آہنگی ہونے کے باوجود اُن میں واقعیت نظر نہیں آتی۔ ستائے ہوئے، گرے ہوئے، بدحال عوام کے حالِ زار پر رونے کے لئے آنسو نہیں ہیں، محبّت بھرے الفاظ بھی نہیں، اگر اُن کے پاس کچھ ہے تو صرف اُن کے آتشیں الفاظ—! اُن کے انفرادی جذبات زورِ بیان کی

تمام شگفتگی و لطافتوں کو جھلساتے چلے جاتے ہیں ؂

گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا دماغ ——— آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ

یا:- کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب ——— میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

اور:- آہ اے ہندوستاں اے مفلسوں کی سرزمیں ——— اب تو ایک روٹی کا ٹکڑا بھی تجھے ملتا نہیں

یہ آتش فشاں خطبہ ہو تو ہو مگر شاعری نہیں ہے۔

جوش اور جوش کے سامعین کے درمیان بڑی اجنبیت محسوس ہوتی ہے، کوئی رشتہ نہیں۔ کوئی تار نہیں جو ان دونوں کو ملا سکے، دونوں کے درمیان ایک خلیج ہے جس کو پاٹنے کے لئے جوش کے پاس کچھ نہیں ہے، جوش ایک آگ پھانکنے والا باغی ہے جو کسی بہت ہی اونچی چٹان پر کھڑا ہو کر آگ اور خون کی بارش کر رہا ہے، ہر لفظ ایک انگارہ ہے، ایک شعلہ! جوش ایک آتش فشاں کی طرح آگ اُگلتے چلے جاتے ہیں اور عام سطح کا انسان مرعوب ہو کر محض تماشائی بن کر دیکھتا رہ جاتا ہے وہ اُن سے مرعوب ہوتا ہے مگر متاثر نہیں ہو سکتا۔ جوش کے سامعین جوش کی آواز کو اپنی آواز نہیں سمجھ سکتے، جس سے وہ شاعر کی آواز کو اپنے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ پائیں اپنے پن کا وہ رشتہ جو شاعر اور سامعین کے درمیان ہوتا ہے، غائب ہے۔

فنکار اپنے فن سے اُس وقت تک عوام کو متاثر نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنے تصورات کو موزوں جامہ نہ عطا کرے شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ یقیناً بہت اہم ہے مگر یہ کم اہم نہیں ہے کہ وہ اپنی بات کس طرح کہتا ہے۔ جھنجھلاہٹ اور غصہ نے مل ملا کر جوش کی شاعری کو خطیبانہ رنگ میں اس حد تک غرق کر دیا ہے کہ شعریت مردہ ہو گئی ہے، وہ بیان و انداز بیان انقلاب و شعر میں خوشگوار توازن قایم نہیں کر سکے۔ وہ واعظ ہیں، باغی ہیں، مگر شاعر نہیں!

جوش کے اس خطیبانہ اندازِ بیان کے علاوہ جو چیز ان کے موضوع کی سطحیت کی ذمہ دار ہے وہ ان کی سماجی علوم سے ناواقفیت ہے۔ جوش کی انقلابیت کو کسی سماجی عالم کا سہارا نصیب نہیں ہے۔ جوش کے یہاں موجودہ سماج سے بغاوت، مذہب سے انحراف اور حکومت سے نفرت کی کوئی ٹھوس اور اثباتی بنیاد نہیں ہے، جوش کی بغاوت ایک جلاپاتی چیز ہے ان کی بغاوت میں جتنا دخل ان کے جذبات کو ہے اتنا عقل کو نہیں۔ یہ جذباتیت موضوع میں کوئی گہرائی پیدا نہیں ہونے دیتی اس لئے جوش شوکتِ الفاظ میں پناہ لیتے ہیں جن سے ظاہری طور پر تو بڑا دبدبہ اور وقار ظاہر ہوتا ہے مگر ان کا اثر جلد زایل ہو جاتا ہے۔

وہ سرمایہ دار کو پُرشکوہ الفاظ میں گالیاں اور کوسنے دے سکتے ہیں مگر اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کر سکتے وہ حُسن کو ٹکڑ کوٹنے پر مجبور دیکھ کر ایک خالص جذباتی نظم کہہ سکتے ہیں مگر اس کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ اس نظام کی طرف اشارہ بھی نہیں کر سکتے جو اس کا ذمہ دار ہے --- --- وہ اس کا ٹکڑ کوٹنا گوارا نہیں کر سکتے محض اس لئے کہ وہ حسین ہے اور جوان لیکن چھوٹا ناگپور کی سیاہ فام جھریاں پڑی بڑھیا کو مٹی ڈھوتے ہوئے دیکھ کر ان میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ جوش کے انقلاب کا تصور دراصل رومانی ہے اور اس میں مفکرانہ گہرائی اور سنجیدگی نہیں ہے جو انقلابی شاعری کے لئے ضروری ہے

میں نے ابھی ظاہر کیا ہے کہ جوش کی شاعری میں خطیبانہ جلال ہو تو ہو، مگر شاعرانہ جمال نہیں ہے اس سے میرا مقصد یہ نہیں کہ میں جلال و جمال کے درمیان ایک دیوار حایل کرنا چاہتا ہوں اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے متعلق نہیں سمجھتا۔ بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ جلال جو چنگیز کی آنکھوں سے شعلہ فشاں ہوتا ہے اور وہ جلال جو ایک شاعر کی آنکھوں سے محبت کے پھول برساتا ہے۔ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جوش کے یہاں معنوی جلال کا پتہ نہیں چلتا، جو کچھ شان و شکوہ اور جلال ہے وہ الفاظ تک ہی محدود ہے، ان کی نظم "کارل مارکس" کے چند اشعار دیکھئے ؂

نخلِ خوشحالی کی بیخ و بن ہے تو ______ عقدہ ہائے زیست کا ناخن ہے تو
اے خطیبِ منبرِ فیضِ عمیم ، ______ اے ضیائے مشعلِ رزقِ کریم !
ہمدمِ شبیر و بدخواہِ "یزید" ______ موسٰیِ نو بہرِ فرعونِ جدید !

اس میں کارل مارکس سے کسی دلی محبت کا پتہ نہیں چلتا، اُس نے دنیا کو کیا دیا یہ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ کوئی پیغمبر تھا، مصلح تھا ؟ یہ بھی نہیں معلوم ! ایک مصنوعی اور پرتکلف قسم کا اظہارِ عقیدت ہے اور بس ! کارل مارکس کو دانائے راز۔ مریضِ انسانیت کا چارہ ساز، عقدہ ہائے زیست کا ناخن، خطیبِ منبرِ فیضِ عمیم ، اور ضیائے مشعلِ رزقِ کریم کے خطابات دیکر جوش نے سمجھ لیا کہ انھوں نے انقلابی شاعری کا حق ادا کردیا۔ الفاظ کے جلال کے نیچے محض ایک کھوکھلا دماغ ہے۔ جس میں کوئی روح نہیں، کوئی زندگی نہیں، کوئی حرکت نہیں۔

جوش کے نعرۂ انقلاب کو شعور کی رہبری حاصل نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سلسلے میں جوش کا اتنا قصور نہیں جتنا شعور کی اس کمی کا ہے جس کی بنا پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ انقلاب اور موسیقی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

یا رقص کی محفل میں بجا تال سے گھنگھرو ______ یا جنگ کے میداں میں سنا تیغ کی جھنکار

پڑھنے والے سوچتے ہیں تیغ کی جھنکار اور گھنگھرو کی چھنا چھن میں آخر کیا بُعد ہے ؟ ، شاعر دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب پر کیوں زور دے رہا ہے ؟ کیا گھنگھرو کی تال پر انقلابی ترانے نہیں گائے جاسکتے ؟ یا رقص کی محفل یا جنگ کا میدان کیوں ؟ یا گھنگھرو یا "تلوار کیوں ؟ اگر غور کیا جائے تو اس "یا" کے پیچھے فکر کا اوتھلا پن نظر آئے گا شعور کی سطحیت دکھائی دے گی۔ یہ فکر کا چھچھلا پن اور شعور کی سطحیت کیوں ہے ؟

شعور کی پختگی اور فکر کی گہرائی مطالعہ کی وسعت سے پیدا ہوتی ہے اور جوش اس نعمت سے محروم ہیں، جو شاعر جذباتی طور پر انقلابی ہوجاتے ہیں ان کے یہاں فکر کا اوتھلا پن کوئی تعجب کی بات نہیں۔ سماجی علوم سے ناواقفیت حالات کا تجزیہ کرنے سے روک دیتی ہے۔ مطالعہ سے میری مراد کتابی مطالعہ اور زندگی کا مطالعہ دونوں ہیں۔ جوش کے یہاں زندگی کو نزدیک سے دیکھنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ اور نہ کوئی ایسی تڑپ ملتی ہے جس کا سرچشمہ زندگی ہو۔ انھوں نے ہندوستان کی تمام سیاسی تحریکات کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھا ہے، ظاہری حالات کو دیکھ کر روح تک پہونچنا ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوش کی سیاسی نظمیں ناکامیاب ہیں۔ انھوں نے ان تحریکات کا اثر محض جذباتی طور پر قبول کیا ہے تحریکات سے یہ دوری ہی جوش کو تحریکات کی بنیاد سمجھنے نہیں دیتی اور وہ سماجی اور سیاسی مسایل کا تجزیہ کرنے سے معذور ہوجاتے ہیں اور اُن کا کوئی حل پیش نہیں کرسکتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی شوکتِ لفظی کی نقاب ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں :-

"اقبال نے اپنا مفہوم ادا کرنے کے لئے اصطلاحی الفاظ اور مخصوص محاورے منتخب کرلئے تھے جو فلسفیانہ نکات کے بیان کرنے میں ایک خاص سماں پیدا کردیتے ہیں جس میں پوری فضا حکیمانہ انداز سے سامنے آجاتی ہے۔ جوش کے اپنے بلیانات کو پیش کرتے وقت اس قسم کا کوئی ماحول پیدا نہیں کیا"

جوش اس قسم کا کوئی ماحول پیدا نہیں کرسکتے اس لئے کہ ان کے موضوع میں وہ گہرائی نہیں ہے جس سے وہ پرشکوہ انداز بیان کو نباہ سکتے اگر موضوع میں گہرائی نہ ہو، فکر میں رچاؤ نہ ہو یا موضوع میں گہرائی کم ہو اور فکر میں کم رچاؤ ہو تو حسین سے حسین الفاظ ان میں جان پیدا نہیں کرسکتے۔ شاندار الفاظ انھیں عظمت نہیں بخش سکتے، رنگ و روغن محض بناؤ سنگار سے نہیں آتا بلکہ رگوں میں جوان خون بھی ہونا چاہئے۔ زرق برق پوشاک ہی سے حسن نہیں نکھرتا بلکہ جسم کو

جامہ زیب بھی ہونا چاہئے۔

جوش کی چند سیاسی نظموں کو لیجئے اور ان کا تجزیہ کرکے دیکھئے کہ جوش کا سیاسی شعور کیا ہے ۔ (۱) وقت کی آواز ۔ (۲) کانگریس سے خطاب (۳) لیگ سے خطاب ۔ (۴) کمیونسٹ سے خطاب ۔

مادر ہندوستان کہتی ہے :-

میرے تو بس ہیں تین چہکتے ہوئے نگیں | اک کانگریس کہ ہے وہ بلوغت کی نازنیں
اور لیگ اس کی پیٹ کی بچی قمر جبیں، | اور کمیونسٹ ہے مرا فرزند نکتہ چیں

یہ ہے مادرِ ہند کا شجرہ ۔ اس میں تفکر کی سنجیدگی کا دور دور پتہ نہیں ہے ۔ ان نظموں میں بھی وہی سطحیت نمایاں ہے جو محدود مطالعہ اور ناپختہ شعور کی پیداوار ہے ۔ اب مادرِ ہندوستان کی زبان سے سنئے جوش کیا کہلواتے ہیں ؎

آؤ سنو بھی مادرِ ہندوستاں کی بات | بیٹا وہی شریف ہے مانے جو ماں کی بات
وہ کہہ رہی ہے دل میں کدورت نہ چاہئے | اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہئے

کانگریس، لیگ اور کمیونسٹ پارٹی کے سیاسی اختلافات اور نظری تفاوت کو جوش نے بھائی بہنوں کی روحانی کھٹ پٹ سمجھا ہے اور وہ نہیں جانتے کہ کانگریس کی باگ ڈور کن ہاتھوں میں ہے ان کی طبقاتی بنیاد کیا ہے ۔ وہ لیگ کی زہریلی سیاست اور فرقہ وارانہ طریق کار کو کوئی تجزیہ نہیں کرسکتے وہ کمیونسٹ پارٹی کو اپنی سیاسی سمجھداری کی بنا پر ایک نابالغ بچہ تصور کرتے ہیں جو بڑا ذہین ہے ۔

اور ـــــ " اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہئے " جوش نفرت و محبت کے فلسفہ سے بھی بیگانہ ہیں وہ نہیں جانتے کہ اگر نفرت شدید نہ ہو تو محبت کی بنیاد ٹھوس نہیں ہوسکتی ۔ اگر ہم ایٹم بم سے شدید ترین نفرت نہ کریں تو ہمیں امن و شانتی سے دلی محبت نہیں ہوسکتی، جب ہم بُری چیز سے نفرت کرتے ہیں تو یہی نفرت اچھی چیز سے محبت کی بنیاد بن جاتی ہے ۔ یہاں پر جوش گاندھی جی سے متاثر معلوم ہوتے ہیں ۔ مجھے تو ہمیشہ جوش سے یہی ڈر معلوم ہوتا رہتا ہے کہ پتہ نہیں کب کس چیز سے متاثر ہوجائیں گے ۔ ایک طرف تو وہ نیٹشے سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی شاعری کا ایک حصّہ اس کے نام معنون کردیا اور دوسری طرف گاندھی جی سے متاثر ہیں اور پھر باغی اور انقلابی ہیں ۔

مذہب کی بنیاد پر ہندوستان میں دو قومی نظریہ کو سہارا دینے کے لئے جوش نے جن غیر حقیقی دلایل کو پیش کیا ہے وہی لیگی رہناؤں کے تھے ان کے خیال میں اس کی بنیاد مذہب ہے حالانکہ قوم ایک ایسی ملت ہے جو تاریخ کے ارتقاء سے پیدا ہوتی ہے اور جس کی زبان جس کا وطن اور جس کی اقتصادی زندگی ایک ہوتی ہے اور جو ایک مخصوص نفسیاتی ساخت رکھتی ہے اور اس کا اظہار اس کے مشترکہ کلچر سے ہوتا ہے جوش کی زبان سے ہندوستانی مسلمان اور ہندو کا فرق ملاحظہ ہو ؎

قصّوں میں اختلاف، فسانوں میں اختلاف | لہجوں میں اختلاف زبانوں میں اختلاف
وضع و طریق، حرف و حکایت شگون و فال | اندازِ نطق، طرزِ عمل جادۂ خیال،
رسم و رواج، دین و روایات قیل و قال، | اٹھنا بیٹھنا، بات چیت، لب و لہجہ چال ڈھال
تم میں ہر ایک چیز جدا، ہر چلن جدا | دونوں کے پھول پات جدا ہیں چمن جدا

اگر یہاں جوش سے یہ سوال کیا جائے کہ بنگال کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی زبان میں کیا فرق ہے، اور پنجاب کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کیا فرق ہے ؟ تو جوش کوئی فرق نہیں بتاسکتے ! جوش فرقہ واریت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح کیوں بہہ گئے ۔ کیونکہ ان کی سمجھداری کی کوئی ٹھوس اور اثباتی بنیاد نہیں تھی ۔ انھوں نے کبھی حالات کا کسی اصول کے تحت

تجزیہ نہیں کیا انھیں نعرے پسند ہیں اس لئے نعرے لگاتے بھی ہیں۔ اور نعروں کا ساتھ بھی دیتے ہیں اس کے پیچھے کوئی ٹھوس شعور نہیں ہوتا۔

اب اگر اوپر کے اشعار میں انداز بیان پر غور کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ جوش نے ان اشعار میں بھی عادت کے مطابق الفاظ کا ایک میلہ لگا دیا ہے، جہاں خیال ایک بچے کی طرح کھو گیا ہے۔ اور جس طرح میلہ میں دوکانوں کی کوئی خاص ترتیب، تنظیم اور قرینہ نہیں ہوتا بالکل اسی طرح یہاں بھی الفاظ کی ترتیب تنظیم اور قرینہ پر دھیان نہیں دیا گیا ہے۔ پہلے مصرعوں کے دونوں حصّوں میں کون سی الگ بات کہی گئی ہے۔ "لہجہ، زبان، اندازِ نطق، بات چیت، لب ولہجہ" ان الفاظ کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ جن سے ایک ہی معنی نکلتا ہے۔ الفاظ کے کثرت استعمال سے کلام میں تکرار اور اعادہ کا نقص پیدا ہوگیا ہے۔

خیر — اب نفس مضمون کی طرف آیئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرق کو بیان کرنے کے بعد کانگریس کے سامنے حرف مدعا زبان پر لاتے ہیں ؎

چھوٹی بہن مراد نہ جب تک کہ پائے گی — بیٹیا یہ روز روز کی کل کل نہ جائے گی

یعنی مطالبۂ پاکستان کو مان لینا چاہئے۔ دیکھا آپ نے سیاسی تحریکات کو اوپر ہی اوپر سے دیکھنے کا نتیجہ؟ مطالعہ کے فقدان اور شعور کی ناپختگی کا عطیہ؟

"کانگریس سے خطاب" اور "لیگ سے خطاب" میں جوش کے شعور کی بے بسی اور بے کسی کا جو مظاہرہ ہوتا ہے وہ "کمیونسٹ سے خطاب" میں مکمل ہوجاتا ہے۔ پہلا ہی شعر ہے ؎

اور تو اداس اداس ہے کیوں کمیونسٹ لال — صورت دھواں دھواں ہے تو اُلجھے ہوئے ہیں بال

بہت سے اوچھے مخالفین تحقیر کے خیال سے کمیونسٹ کی تصویر کشی کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ یہ بڑے بڑے اور اُلجھے ہوئے بال رکھتے ہیں۔ داڑھی بڑھی ہوئی اور ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتی رہتی ہیں۔ اس گمراہ کن اور غلط خیال سے جوش اس قدر متاثر ہیں کہ انھوں نے اسے صاد کردیا، اس میں جوش کی بدنیتی کو دخل نہیں ہے بلکہ انھوں نے اپنی معصومیت سے ایسا کیا ہے، کاش جوش نے کسی کمیونسٹ کو نزدیک سے دیکھا ہوتا اور عمل اور جدوجہد کی سرخیوں سے تابناک چہرے پر امید اور یقین کی جھلکیاں دیکھی ہوتیں۔ آگے چل کر انھوں نے کمیونسٹ لال کو اپنی بڑی بہنوں کانگریس اور لیگ کے آگے جھکنے کی مادرانہ تلقین کی ہے ؎

جھکتے ہیں ماں سمجھ کے اکڑتے نہیں ہیں بھائی — بہنوں کی جھڑکیوں پہ بگڑتے نہیں ہیں بھائی

اس نظم میں جوش کی انقلابیت نے اصلاح پسندی کا روپ دھار لیا ہے۔ پوری نظم میں جو روح کار فرما ہے اس پر اصلاح پسندی کی بڑی گہری چھاپ ہے۔ پچھلی تین نظموں میں سمجھوتہ بازی کا جو پرچار کیا ہے وہ اس نظم میں آکر اور بھی پختہ ہوگیا ہے۔ اصلاح پسندی کا یہ رجحان اس بات کا غماز ہے کہ سماج کے طبقاتی نظم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کی آئیڈیولوجی اور کانگریس کے عناصر کو سمجھے بغیر ان کے اغراض و مقاصد کو سمجھنا محال ہے۔ آگے جوش کی تمنائیں ملاحظہ ہوں:—

میری دعائیں جب تجھے دولہا بنائیں گی — برسے گا نور ڈومنیاں گیت گائیں گی،
بچّوں کے غل میں سالیاں جوتے چرائیں گی — بہنیں بھی نیگ مانگنے اسوقت آئیں گی
سمجھوں گی مجھ پہ حق کا یہ احسان بڑا ہوا — دیکھوں گی تجھ پہ ماں کا جب آنچل پڑا ہوا

کمیونسٹ لال کے سر پر کانگریس دیدی اور آپالیگ کے آنچل کا تماشہ بس جوش کی ایجاد ہے۔

کمیونسٹوں پر مخالف کیمپ سے ایک الزام یہ قایم کیا جاتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی ماسکو سے بن کر آتی ہے اور یہ کہ ان میں نیشنلزم نہیں ہوتی وہ الزام جوش نے براہ راست تو نہیں دیا مگر اس کا اثر ضرور قبول کیا ہے اور نتیجہ کے طور پر پند و نصائح کا ایک دفتر کھول دیا ہے:۔

پردیسیوں کی بوتلوں میں ڈاٹ ہو تیری کپڑا تو روس کا ہو مگر کاٹ ہو تیری

جوش نے کمیونسٹوں کی پرخلوص حب الوطنی اور کانگریس کی نیشنلزم کے فرق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

ایک اور غلط بات جسے شروع میں پھیلانے کی کوشش کی گئی یہ ہے کہ کمیونسٹ تمام قدیم چیزوں کو قابلِ اعتناد نہیں تصور کرتے گویا انھیں ماضی سے کوئی سروکار ہی نہیں، یہ بات جوش کے دل میں کھٹکتی ہے حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ در اصل ماضی ہی کی زندگی کے تجربات پر تو مستقبل کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور ان سے بڑھکر اور کوئی ماضی کی روایات کا سچا قدر دان نہیں۔ قدیم روایات کی پوجا کرنا اور بات ہے اور ان کو لیکر آگے بڑھنا اور بات ہے۔ جوش کا خدشہ ملاحظہ ہو ؎

اس کا مگر خیال رہے وقتِ سرخوشی، خم میں نئی شراب ہو ساغر رہیں یہی،
میری ہی کنگھیوں سے بنے زلفِ زندگی میرے ہی جلمہ ساز ہوں میری ہی راگنی
تازہ ہوں اصطلاحیں مقولے یہی رہیں شاخیں نئی ضرور ہوں جھولے یہی رہیں
کل کی جبیں پہ نقش ہو اک گوٗ آج کا، دستور نو میں رنگ ہو میرے مزاج کا

ان نظموں میں بھی وہی مصنوعی وقار پایا جاتا ہے جو سامعین اور جوش کے درمیان ہمیشہ حایل رہتا ہے۔

جوش کی نیچرل شاعری کو دیکھا جائے تو وہاں بھی جوش کی جذباتیت اس حد تک مسلط ہے کہ مناظر قدرت کی عکاسی مکمل اور موثر طور پر نہیں ہو پاتی، الفاظ کا ایک دریا ہے جو تمام حسن و جمال کو بہاتا ہوا بڑی تیزی کے ساتھ نظروں کے سامنے سے گزر جاتا ہے اور دیکھنے والا حیران اور مبہوت رہ جاتا ہے۔ جذباتی شاعری کا درجہ قدرتاً پست ہوتا ہے کیونکہ اس میں گہرائی اور سنجیدگی پیدا ہونا ممکن نہیں۔

نئی تشبیہات سے شاعری میں ایک کیف ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ خوشگوار اور نکھری ہوئی تشبیہات تو نظم کو دلفریبی عطا کرتی ہے، لیکن جوش کے پاس الفاظ اور تشبیہات کا جو خزانہ ہے وہ یہاں بھی انھیں کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ زیادتی ہر چیز کی بری ہوتی ہے یہی حال جوش کی تشبیہات کا ہوتا ہے ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری اس طرح تشبیہات کا ایک بے ترتیب ریلا آتا جاتا ہے اور ایک سے دوسرے کا اثر زایل ہوتا جاتا ہے۔ جوش نے گرچہ مذہب کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا ہے مگر یہاں بھی ان کا شعور کارفرما نہیں ہے بلکہ انھوں نے محض جذباتی طور پر خدا اور مذہب کے خلاف لکھا ہے۔

جس طرح مذہب نے انسان کو برابر اس کی موت سے ڈرایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ دُنیا فانی ہے۔ انسان کی زندگی بہت مختصر ہے، اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ اس دنیا میں رہکر عیش آرام کی بات سوچنا غلط ہے اور گمراہی ہے۔ اصلی فکر آخرت کی ہونی چاہئے۔ اس لئے دنیا کے آرام کا خیال عبث ہے۔ آخرت کو سنوارنے کی لگن ہونی چاہئے۔ اس طرح جوش نے بھی بتایا ہے کہ یہ زندگی کچھ بھی نہیں، کمال زندگی بس موت ہے۔ اس طور پر شکست کا احساس پیدا ہوتا ہے، بددلی پھیلتی ہے اور انسان کی قوت عمل مفلوج ہو جاتی ہے نظم جنازہ میں:۔

دیکھ اے انساں یہ کیا شے جا رہی ہے دوش پر
ہاں خدارا اک نظر اس پیکرِ خاموش پر
کون یہ اوڑھے کفن تا حشر سونے کے لئے
جا رہا ہے قبر کی خوراک ہونے کے لئے

اس سے پہلے یہ "پیکرِ خاموش" کیا تھا ؎

اس کی راتیں بھی تبسم کی طرح شاداب تھیں
اس کے دل میں بھی بہت سی حسرتیں بیتاب تھیں

اور پھر ؎
موت کے آتے ہی چہرہ زرد ہو کر رہ گیا
ایک جھونکے میں یہ شعلہ سرد ہو کر رہ گیا

نتیجہ — ؟
اب تو افشا ہو گیا رازِ کمالِ زندگی
او غلامِ زندگی دیکھا مآلِ زندگی

چنانچہ اسی کے پیشِ نظر جوش نے راہ فرار اختیار کی ؎

بجلیاں جس نخل پر رقصاں ہوں پھل سکتا نہیں
تیری اس دنیا کا مجھ سے کام چل سکتا نہیں
میں پروں کو تولتا ہوں آشیانے کو سنبھال
یہ ہے دنیا اور اپنے کارخانے کو سنبھال

جس طرح مذہب نے دنیا کے عیش و آرام سے متنفر کر کے عوام کی قوتِ عمل کو شل کر دیا اور ایک طبقہ نے اپنے مفاد کے لئے مذہب کی تعلیمات کو عام کر کے فایدہ اُٹھایا اسی طرح جوش بھی انسان کے سامنے موت کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ چند روزہ زندگی سے ان کو نفرت ہو جاتی ہے اور شاندار آغاز کا بھیانک انجام دیکھ کر دنیا کو سنوارنے کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے یہ سب محض اس بات کا نتیجہ ہے کہ جوش نے کبھی مذہب کے متعلق سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا اور اُنھوں نے محض جذبات کے بہاؤ میں مذہب اور خدا کی مخالفت کی مذہب کا صحیح تجزیہ ان کے یہاں نہیں ملتا ہے مذہب کے تاریخی کردار کو انھوں نے کبھی اجاگر نہیں کیا۔ اس کو کس طرح لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے نے اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا اور کر رہا ہے۔ ان ساری باتوں کا جوش کے یہاں پتہ نہیں ملتا اور یہیں سے ان کی شاعری نعرہ بازی کے سرحدوں سے جا ملتی ہے جس میں تفکر کی گہرائی اور شعور کی سنجیدگی کا فقدان ایک قدرتی امر ہے۔

دوسرے مسایل کے سلسلے میں بھی جوش کا زاویۂ نگاہ بہت ہی کھوکھلا اور غیر حقیقی ہے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جوش سماج سے نابلد ہیں انھیں سرمایہ دارانہ نظام کی خصوصیات کے بارے میں کچھ علم نہیں انھوں نے ہر مسئلہ کی سطح کو دیکھا اور کبھی اس کی گہرائی میں نہیں اُترتے ہیں۔ مثال کے طور پر عورتوں کے مسئلہ پر جوش کی رائے ملاحظہ ہو۔ وہ مغربی عورتوں کو بے حیا تصور کرتے ہیں اور مشرقی عورتوں کو نہایت ہی پاکباز مقدس دیوی ؎

صرف اک تو اُس تلاطم میں رہے گی پاکباز
جب کرے گی صنفِ نازک اپنی عریانی پہ ناز

تعلیم نسواں کے متعلق ان کے خیالات ملاحظہ ہوں۔ مشرقی عورت کو جہالت پر قانع رہنے کی تلقین کرتے ہوئے جوش اور مسجد کے ملا میں کیا فرق رہ جاتا ہے ؎

علم سے ہر چند تجھ کو کم کیا ہے بہرہ مند
لیکن اس سے ہو نہ اے معصوم عورت! درد مند
جب ضرورت سے زیادہ ناز فرماتا ہے علم
عارضِ تاباں کے بھولے پن کو کھاتا ہے علم
علم سے بڑھتی ہے عقل اور عقل سے وہ بدداغ
جو بجھا دیتی ہے سینے میں محبت کا چراغ
چاندنی، قوسِ قزح، عورت، شگوفہ، لالہ زار
علم کا ان نرم شانوں پر کوئی رکھتا ہے بار

عورت کی تعلیم کو جوش اس کے نرم و نازک شانوں پر ایک بار تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ علم کی وجہ سے اس کے سینہ میں "محبت کا چراغ" گل ہو جائے گا۔ عقل کے بڑھنے کو بھی جوش گوارا نہیں کرتے وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ نزاکت عورت کا ایک پہلو ہے۔

خاتونِ مغرب کے متعلق جوش کے خیالات اور رجعت پسند مولوی کے خیالات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انھوں نے مغربی عورت کی بے باکی اور بے حیائی کا سبب سماج کے نظام میں تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اخلاقی گراوٹ کو اگر جوش دوسرے سماجی مسایل سے الگ تھلگ مسئلہ تصور کرتے ہیں تو یہ محض کوتاہ بینی ہے۔ یہ ساری خرابیاں جو مشرق و مغرب کے سرمایہ دارانہ ممالک میں مشترک ہیں۔ ——— اُس سماج کی ہیں جس میں اخلاق محض منافع کا نام ہے اور ہر بات کی تان منافع پر ٹوٹتی ہے۔ مغربی عورت کے متعلق جوش کی رائے کی تان یہاں ٹوٹتی ہے ؎

نازکی، عزت، محبت، آبرو کچھ بھی نہیں نام تو ہے پھول لیکن رنگ و بو کچھ بھی نہیں

جوش کی پوری انقلابی شاعری میں فکر کی سطحیت نمایاں ہے۔ اُنھوں نے جس مسئلہ پر قلم اُٹھایا ہے اسے نزدیک سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مطالعہ کے فقدان اور سیاسی و سماجی تحریکات سے دوری۔ یہی چیزیں ہیں جنھوں نے جوش کو موضوع کی گہرائیوں میں اُترنے نہیں دیا ہے۔ الغرض جوش شاعر کم ہیں، خطیب زیادہ، مفکر کم ہیں اور جذباتی زیادہ!

کلام حیدری ام۔ اے

(نگار) دیکھا جاتا ہے کہ آجکل بعض نقاد جب کسی شاعر کے کلام پر اظہار خیال کرتے ہیں تو تقابلی مطالعہ کے لئے کسی اور شاعر کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کسی چیز کے پرکھنے اور نقد و فنیہ کی تمیز کے لئے یہ طریق عمل غلط نہیں ہے لیکن اس سلسلہ میں اس حقیقت کو اکثر و بیشتر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، کہ ہم جن دو شاعروں کا کلام پہلو بہ پہلو رکھ کر ایک کی فوقیت دوسرے پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں، وہ دونوں ایک ہی منزل کے مسافر ہیں، یا ان کی راہیں الگ الگ ہیں ——— مومن کے ساتھ غالب کا اور میر کے ساتھ درد کا ذکر کیوں کیا جائے۔ جب داغ پر بات چلے تو امیر کو کیوں سامنے لایا جائے، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے اور غلط ہوتا ہے۔

یہی غلطی اس مضمون میں بھی کی گئی ہے کہ جوش کے ساتھ اقبال کو بھی لے لیا گیا ہے، اگر یہ غلطی اس سے قبل بعض نقادوں کی طرف سے ہو چکی ہے تو یہ اس کے جواز کی دلیل نہیں ——— اقبال اور جوش دونوں کی راہیں بالکل جدا ہیں، تخئیل، معنویت، احساس، تاثر، غرض ہر لحاظ سے جدا۔ دونوں کا زاویۂ نگاہ ایک دوسرے سے مختلف ہے اور دونوں کی زبان ایک، دوسرے سے الگ۔

اس میں شک نہیں سیاست و مذہب کے متعلق دونوں نے نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن موضوع کا اتحاد اس کو مستلزم نہیں کہ دو شاعروں کے کلام کو سامنے رکھ کر ان میں ایک پر دوسرے کو ترجیح دیجائے، خاص کر ایسی صورت میں جبکہ دونوں کا مقصود ایک دوسرے سے جدا ہو۔ ایک کے یہاں مذہب کی رندانہ تضحیک ہے۔ دوسرے کے یہاں حکیمانہ رشد و ہدایت، ایک کے یہاں سیاست وقتی و جذباتی کھیل ہے اور دوسرے کے یہاں ملت و قوم کی بنیاد، ایک کے یہاں زبان معنی کی پابند ہے، دوسرے کے یہاں معنی زبان کا پابند۔ ایک کا مقصود دنیا سے صرف کھیلتے ہوئے گزر جانا ہے، دوسرے کے یہاں دُنیا کے لئے سر دُھننا۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جوش و اقبال کا ذکر کیوں ساتھ ساتھ کیا جائے ——— جوش ایک آرٹسٹ ہے خطوط کا اور اقبال فنکار ہے، رنگوں کے مزاج کا۔ جوش کے یہاں سنگستانی ندی کا شور و ہنگامہ ہے اور اقبال کے یہاں اوقیانوس کا سا سکون و عمق، جوش کا کلام بازیگاہ ہے الفاظ کا، اقبال کا کلام ایک طلسم کدہ ہے معنویت کا، جوش کی شاعری ایک منظر ہے کبوتروں کی ایک ٹکڑی کا جو فضا میں چکر لگا کر چھتری پر آکر بیٹھ جاتی ہے، اقبال کی شاعری ایک عقاب کی سی پرواز ہے جس کے تعاقب میں پہلے ہماری نظریں کھو جاتی ہیں اور پھر ہم خود۔ جوش "از صحن خانہ تا بہ لب بام" از آن من" کا شاعر ہے اور اقبال "از بام خانہ تا بہ ثریا" کا۔ اس لئے یہ غلطی ہے کہ ان دونوں کا موازنہ کر کے ایک کا تفوق دوسرے پر ظاہر کیا جائے، جوش کے میدان میں اقبال کا گزر نہیں، اقبال کی جولانگاہ میں جوش کا نفوذ و اثر نہیں۔ دیوار کے نقش و نگار کو گھر جھک کر دیکھنا اور پسِ دیوار پہنچکر دیوار کے نقش و نگار کو دیکھنا دونوں بے محل باتیں ہیں۔ (نیاز)

فنِ تحریر کی ایجاد سے پہلے

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

اس میں شک نہیں عہدِ قدیم کا انسان جب وہ کوہ و بیابان میں زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا، بہت وحشی و ناتراشیدہ تھا تاہم درندوں اور جانوروں سے ضرور مختلف تھا۔ یعنی جانوروں میں ایک قدرتی (INSTINCT) کے علاوہ اور کوئی قوت غور و فکر کی نہ پائی جاتی تھی اور انسان سمجھ بوجھ کی صلاحیت لیکر آیا تھا، وہ سوچ سکتا تھا، سوچنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کرتا تھا اور دوسروں تک اپنے دل کی بات پہونچانے کی خواہش اس کے اندر پائی جاتی تھی، اس کے اندر مختلف جذبات پیدا ہوتے تھے اور وہ ان جذبات کے اظہار کی بھی کوشش کرتا تھا۔ پھر ہمیں یہ تو نہیں معلوم کہ اولین دور میں اپنے خیالات دوسروں تک پہونچانے کے لئے اس نے کیا طریقے اختیار کئے، لیکن جب وہ نیم مہذب حالت تک پہونچا تو اس نے اس کے لئے تین طریقے اختیار کئے۔ ایک یہ کہ وہ دوسروں کے پاس کچھ چیزیں بھیج دیتا تھا یا انھیں راستہ میں رکھدیتا تھا اور مقررہ اصول کی بناء پر وہ سمجھ لیتے تھے کہ بھیجنے والے کا کیا مقصد ہے، دوسرا طریقہ یہ تھا کہ وہ ستلی یا کپڑے میں گرہ لگاکر کسی خاص بات کی یاد تازہ رکھتے تھے یا دوسروں تک اسے پہونچا دیتے تھے، تیسرا طریقہ یہ تھا کہ لکڑی وغیرہ پر خاص خاص نشانات بناکر لوگوں کو بھیج دیتے تھے اور انھیں ذرائع سے وہ پیغام رسانی کا کام لیتے تھے۔ آج ہم انھیں تین طریقوں پر گفتگو کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان طریقوں سے اظہار خیال یا پیام رسانی کا تعلق کان اور آنکھ دونوں سے ہوسکتا تھا۔ یعنی یا تو کوئی آواز پیدا کرکے کوئی خاص مطلب ادا کرنا جس میں سنکھ، سیٹی، بگل، ہارن اور ڈھول وغیرہ کی آوازیں شامل ہیں، یا کسی اشارہ سے کام لینا، جیسے چشم و ابرو یا دیگر اعضاء کی جنبش و حرکت یا آگ، دھویں اور جھنڈے وغیرہ سے کام لینا۔

اشیاء کے ذریعہ سے اظہار خیالات کی سب سے قدیم مثال ہمیں یونانی مورخ ہیروڈوٹس کے بیان میں ملتی ہے وہ کہتا ہے کہ جب دارا شاہ ایران نے سیتھول (SCYTHIANS) کے ملک پر حملہ کیا (۵۱۲ ق-م) تو دشمن کا ایک ایلچی اُس کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے ساتھ ایک چڑیا، ایک چوہا، ایک مینڈک اور پانچ تیر لایا۔ وہ انھیں دیکر جانے لگا تو دارا نے اُسے روک کر پوچھا کہ ان سے کیا مطلب ہے۔ اُس نے کہا، مجھے حکم ہے کہ انھیں دے کر فوراً واپس آجاؤں۔ اگر فارس والوں میں سمجھ ہے تو وہ خود ان کا مطلب سمجھ لیں گے۔

دارا نے رات بھر اس مسئلہ پر غور کیا اور دوسرے دن اپنے افسروں سے کہا کہ میں نے سیتھی پیغام کا مطلب سمجھ لیا ہے۔ وہ مجھے اپنے وطن کی زمین اور پانی کا (چوہے اور مینڈک) بادشاہ تسلیم کرتے ہیں اور میری بڑی فوج سے خوفزدہ ہوکر بھاگ گئے ہیں (چڑیا) اور اُنھوں نے ہتھیار (تیر) ڈال دئے ہیں۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ اُسی دن رات کو دشمن نے شبخون مارا

---

[1] سیتھی۔ ایک جنگجو قوم جو بحیرۂ اسود کے شمال میں آباد تھی۔ ان لوگوں کو مغلوب کرنے کے لئے دارا ہلسپانٹ (آبنائے دردانیال) کے پار اُترا اور دریائے ڈینوب پر کشتیوں کا پل باندھ کر اُن کی سرزمین میں داخل ہوا۔ مولانا عبدالحلیم شرر "عصر قدیم" (مطبوعہ ۱۹۲۹ء)، صفحہ ۲۰

جس میں دارا کا سخت نقصان ہوا۔

آخر دارا کو ایک سیتھی افسر سے معلوم ہوا کہ اُن کے پیغام کا اصل مطلب یہ تھا کہ جب تک ایرانی' پرندوں کی طرح ہوا میں اُڑنا یا چوہے کی طرح زمین میں گھسنا' یا مینڈک کی طرح تہِ آب روپوش ہونا نہ سیکھ لیں وہ سیتھی تیروں سے نہیں بچ سکتے۔

یہ ایک تاریخی مثال تھی' لیکن علم الانسان (اینتھراپولوجی) کی کتابوں اور سفرناموں سے پتہ چلتا ہے کہ نیم مہذب اقوام میں اشیاء کے ذریعہ سے خیالات کا اظہار بہت عام تھا۔ مثلاً :-

جپسی (GYPSY) خانہ بدوشوں کا طریقہ ـــــ اگر اُن کے قافلے میں سے کوئی شخص اپنی گاڑی کے آگے درخت کی خشک شاخ ڈال دیتا تو معلوم ہوجاتا کہ اُن کے یہاں کوئی بیمار ہے۔ اگر شاخ جلی ہوئی ہوتی تو معلوم ہوجاتا کہ کوئی مرگیا ہے اور ہری شاخ ولادت کو ظاہر کرتی۔ اگر برادری کو دعوت دینا مقصود ہوتا تو کھال کا ایک ٹکڑا راستے میں ڈال دیا جاتا اور دعوت کی جگہ متعین کرنے کے لئے اُس میں چوکھنٹے سوراخ کردئے جاتے جس سے معلوم ہوتا کہ اتنے شہروں کے بعد وہ گاؤں ملے گا جہاں دعوت ہے اور اگر یہ سوراخ گول ہوتے تو ان سے مراد گاؤں ہوتے۔ یہ طریقہ کہیں کہیں اب بھی رائج ہے۔

ٹامپسن ہندیوں کا طریقہ ـــــ یہ لوگ برٹش کولمبیا میں آباد ہیں۔ ان کے یہاں اگر زمین پر (خیمہ کے سامنے) چار لکڑیاں گڑی ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چار آدمی اُس طرف گئے ہیں جدھر لکڑیوں کا جھکاؤ ہے۔ اگر وہیں پر گھوڑے کے بال ہوں تو اُنھیں گن کر یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اُن کے پاس کتنے گھوڑے تھے اور اگر گھوڑے کے بالوں سے ہرن کے بال بھی بندھے ہوں تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ اپنے ساتھ ہرن کا گوشت کھانے کو لے گئے ہیں۔ اگر کوئی چھڑی دور پر رکھی ہوا اُس سے مچھلی کے کانٹے یا جڑیں بندھی ہوں تو اُس کا مطلب ہوگا کہ وہ لوگ بھوکے مر رہے تھے اور مچھلی کے کانٹے اور جڑیں کھاکر دن گزار رہے تھے۔

مشرقی ترکستان ـــــ ایک جوان لڑکی نے اپنے محبوب کو ایک تھیلا بھیجا جس میں کئی چیزیں تھیں ان میں ایک چائے کی ٹکیہ تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ "اب مجھ سے چائے نہیں پائی جاتی"۔ بھوسے کا ایک تنکا بھی تھا جس سے مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ "تمھاری محبت میں میرا رنگ زرد ہوگیا۔ ایک سرخ پھول بھی تھا یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ جب میں تمھارا تصور کرتی ہوں تو میرا چہرہ سُرخ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ایک سوکھی ہوئی خوبانی سے یہ مفہوم لیا گیا "میں اس پھل کی طرح سوکھ گئی ہوں" کوئلے کے ٹکڑے سے یہ ظاہر کیا گیا "میرا دل تمھاری محبت میں جل رہا ہے"۔ ایک پھول سے مراد لی گئی "تم اس کی طرح حسین ہو" شکر کی ڈلی سے یہ بتایا گیا کہ "تم بہت شیریں ہو"۔ پتھر کے ایک ٹکڑے سے یہ ظاہر کیا گیا کہ "تمھارا دل پتھر کا ہے" اور باز کے ایک پر سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ "اگر میرے پر ہوتے تو میں تمھارے پاس اُڑکر پہونچ جاتی"۔

اوپر کی مثالوں میں اشیاء اور اُن کے ذریعہ سے ظاہر کئے جانے والے خیالات میں کچھ نہ کچھ تعلق موجود ہے، لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اشیاء اور خیالات میں کوئی تعلق نہیں ہوتا، لیکن یہ فرض کرلیا جاتا کہ فلاں چیز سے فلاں خیال مراد ہے مثلاً یوربا کے جیبو قوم کے لوگوں میں رواج ہے کہ وہ کوڑیوں کو مختلف وضع سے ملاکر تاگوں میں پرو لیتے ہیں اور ان سے مختلف مطالب ظاہر کئے جاتے ہیں۔ یہ کوڑیاں سرداروں کے پاس بطور خط کے بھیجی جاتی ہیں

کسی حد تک ہم لوگ بھی اشیاء کے ذریعہ سے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جیسے کسی بڑے آدمی کے مرنے پر جھنڈا نیچا کرنا، شادی میں بلاوے کے طور پر ہلدی وغیرہ بھیجنا یا شادی کے دعوت نامے پر ہلدی کا رنگ لگانا اور موت سے مطلع کرنے والے خط کا ایک کونا پھاڑنا یا اُس کے گرد سیاہ حاشیہ کھینچنا۔

رنگوں سے کئی طرح کے خیالات وابستہ ہیں سیاہ رنگ موت اور غم کی علامت ہے، سفید اور سبز رنگ سکون کے مظہر سمجھے

جاتے ہیں۔ زرد بیماری کی اور سُرخ رنگ خون اور خطرے کی نمائندگی کرتا ہے۔

ہندو کام شاستر کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صنفی تعلقات کے سلسلہ میں بھی جذبات کا اظہار اشیاء سے کیا جاتا تھا مثلاً اگر سُپاری (دل کی علامت) کے بیچ میں تیر کا نشان کٹا ہوتا تو اس کا مطلب محبت کی زیادتی ہوتی لیکن اگر وہ بیچ سے ٹوٹی ہوتی اور اُس کے گرد ایک سیاہ دھاگا لپٹا ہوتا تو اس سے تعلقات محبت کا منقطع ہونا مراد لیا جاتا۔

ان تفصیلات سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ فنِ تحریر کی ایجاد سے قبل انسان اظہارِ خیال کے لئے کتنی زحمتیں برداشت کرتا تھا اور انھیں زحمتوں کو دور کرنے کے لئے اس نے بعد کو تصویری رسم خط ایجاد کیا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

۲۔ گرہوں کی یادداشت — اگرچہ زمانۂ قدیم میں مذہبی لٹریچر کو زبانی یاد رکھنے کا رواج عام تھا۔ لیکن روز کی زندگی میں اکثر باتوں کو وہ گرہوں کی مدد سے بھی یاد رکھتے تھے چنانچہ "بات کو گرہ میں باندھنا" مشہور محاورہ ہے، بات کو یاد رکھنے کے لئے بھلکڑ مرد رومال میں اور عورتیں آنچل میں گرہ لگاتی ہیں۔ حالی نے مرزا غالب کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ اکثرات کو عالمِ سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہوجاتا تھا تو کمربند میں ایک گرہ لگا لیا کرتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن یاد پر سوچ کر تمام اشعار کو قلمبند کر لیا کرتے تھے" (یادگارِ غالب)

ہندوستان کے بعض گھرانوں میں یہ رواج ہے کہ جب بچّہ ایک سال کا ہو جاتا ہے تو کسی دھاگے میں ایک گرہ لگا دیتے ہیں جیسے "سالگرہ" یا "ورش گانٹھ" کہتے ہیں۔ اسی طرح ہر سال ایک نئی گرہ لگائی جاتی ہے۔ اور گرہوں کو دیکھ کر بتایا جا سکتا ہے کہ جس کے نام کا وہ تاگا ہے اُس کی عمر کیا ہے۔

اصل میں یہ طریقہ اُس زمانہ کی یادگار ہے جب انسان لکھنا نہیں جانتا تھا۔ اُس وقت گنتی اور ضروری باتوں کو گرہ کے ذریعہ یاد رکھتے تھے۔ گرہوں کا استعمال کتنا عام تھا، یہ بات ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہوگی۔

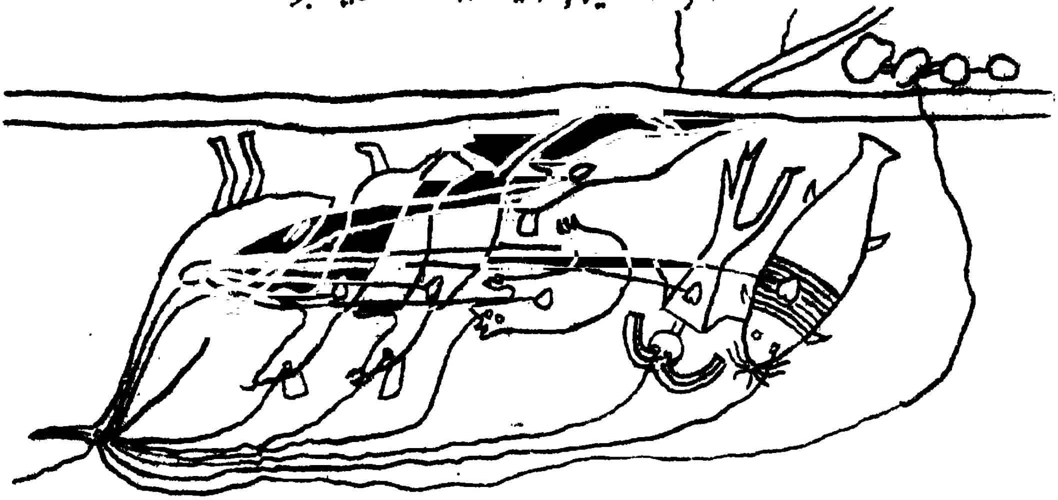
یونانی مورخ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ دارا نے چند یونانیوں کو دریائے ڈینوب کے ایک پُل پر متعین کیا اور اُنھیں ایک چرمی تسمہ دیا جس میں دو مہینہ کے لئے ساٹھ گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ اُس نے کہا "یونان کے لوگو! اس تسمہ کو اپنے پاس رکھو اور جیسا میں کہوں ویسا کرو، میرے سیتھوں کے مقابلہ پر جانے کے بعد ہر دن ایک گرہ کھولنا اور جب ساری گرہیں کھل جائیں اور میں واپس نہ آؤں تب تم اپنے وطن کو واپس چلے جانا لیکن اس سے قبل نہیں۔"

مشہور چینی فلسفی لاؤتسہ اپنی کتاب "تاؤتیہہ کنگ" (زمانۂ تصنیف چھٹی صدی ق-م) میں لکھتا ہے :- "لوگوں کو گرہ دار ستلیوں (چیہہ شنگ) کی طرف پھر جانے دو تاکہ وہ اُن کا استعمال کریں۔"

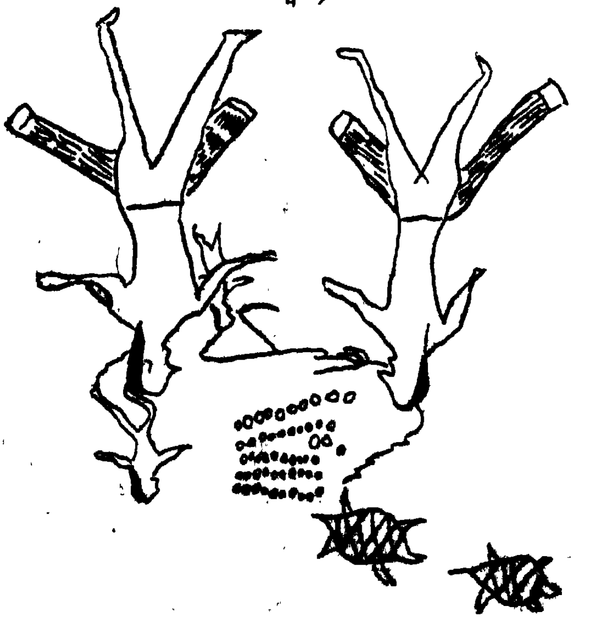
چین کے علاوہ تبت اور بعض دوسرے ملکوں میں بھی گرہ دار ستلیاں کام آتی تھیں۔ اور پیرو (جنوبی امریکہ) کے قدیم باشندوں میں تو یہ رسم انتہائی ترقی کو پہونچ چکی تھی۔ اُن کا طریقہ یہ تھا کہ ایک موٹی رسّی میں بہت سے دھاگے جھالر کی طرح باندھ دیتے جو کئی گچھوں میں منقسم ہوتا۔ ہر گچھے کے درمیان کچھ فصل ہوتا اور ہر گچھے میں دھاگوں کی تعداد برابر ہوتی۔ یہ دھاگے سفید یا رنگین ہوتے۔ اُن میں سُرخ دھاگا سپاہی کی، زرد سونے کی، سفید چاندی کی اور سبز اناج کی علامت تھا، ان دھاگوں میں مختلف طرح سے گرہیں لگائی جاتی تھیں اور کبھی کبھی تاگوں کو آپس میں ملا کر مختلف شکلیں بنائی جاتی تھیں جن میں سے ہر گرہ اور ہر شکل ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ ان جھالروں کو "کوئیپس" یا "کوئیپو" کہتے تھے جس کے لفظی معنی "گرہ" کے ہیں۔

اول اول ان گرہوں سے گنتی یا تعداد کا شمار رکھا جاتا تھا، بعد کو تاریخی واقعات، قوانین اور فرمانوں کو بھی اسی طرح محفوظ کیا جانے لگا۔ انھیں پیغام رسانی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ ہر قصبہ میں ایک "گرہوں کا عہدہ دار" (کوئیپوکامایوکونا)

[illegible]



[illegible]



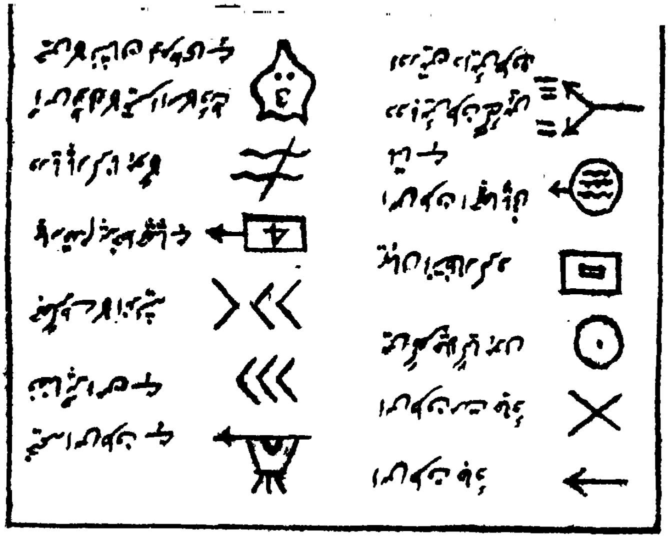
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]



[illegible]

منتقل کردیا گیا۔ انھیں کے ساتھ فوجیوں اور ملاحوں کے بِلّوں کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جن کا تخیل نیم مہذب اقوام کے امتیازی نشانات سے ماخوذ ہے۔



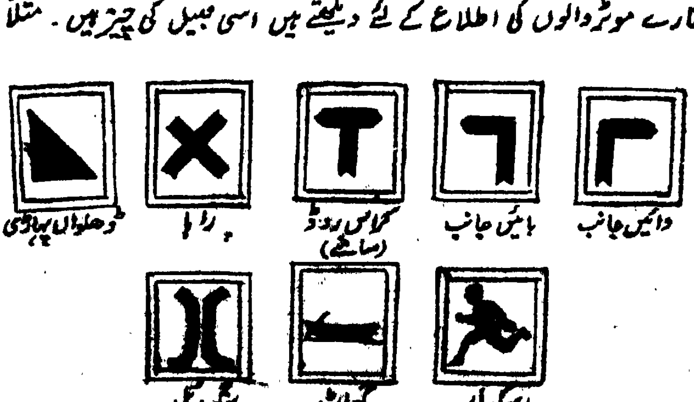
اسی سلسلہ میں مَیں ناظرین کی توجہ ۱۹۷۷ء کے انتخاب (ووٹنگ) کی طرف مبذول کروں گا جس میں ہر پارٹی نے امتیاز کے لئے ایک جداگانہ نشان قرار دیا تھا۔ جیسے کانگریس کا نشان دو بیلوں کی جوڑی، جن سنگھ کا جلتا ہوا چراغ اور کسان مزدور پرجا پارٹی کا جھونپڑا وغیرہ وغیرہ — دوسروں سے اپنے کو ممتاز کرنے کے لئے نیم مہذب اور مہذب اقوام نے نشانات کے علاوہ بعض اور ترکیبوں کا بھی استعمال کیا ہے جیسے بالوں کو مخصوص وضع کا بنانا اور خاص طرح کے گہنے اور لباس پہننا۔ مختلف سیاسی تحریکوں، پیشوں اور ملکوں کے لحاظ سے بھی لباس میں فرق ہوتا آیا ہے۔

نشاناتِ ملکیت — جس طرح ہم اپنی چیزوں پر اپنا نام یا اپنے نام کے پہلے حروف لکھتے ہیں اُسی طرح نیم مہذب اقوام اپنی چیزوں پر اپنا یا اپنے قبیلے کا مخصوص نشان بناتی ہیں۔ عموماً یہ نشانات اُس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں جسے "ٹوٹم ازم" (TOTEMISM) کہتے ہیں اس مذہب کے ماننے والے اپنا رشتہ شجر، حجر اور حیوانوں سے جوڑتے ہیں جن کی تصویر اُن کا مخصوص نشان ہوتی ہے۔

جیسے آج کل گھوڑوں کے داغنے کا رواج ہے اُسی طرح پُرانے زمانہ میں پالتو جانوروں پر کسی نہ کسی طرح کے نشان بنائے جاتے تھے۔ رگوید میں اکثر جگہ ایسی گایوں کا ذکر آیا ہے جن کے کان پر ہنسئے وغیرہ کے نشان بنائے گئے تھے۔ عرب کے بدو اور عراق کے عرب اب بھی ایسے نشانات کا استعمال کرتے ہیں جنھیں "وسم" کہتے ہیں (وسم کے لغوی معنی "نشان" اور "داغ" کے ہیں)

ماضی بعید کے برتنوں پر اظہارِ ملکیت کے لئے بہت زیادہ نشانات کا استعمال کیا جاتا تھا۔ ایسے برتن بحیرۂ روم کے اطراف سے لیکر جنوبی ہند تک پائے جاتے ہیں اور بعض عالموں (خصوصاً سر فلنڈرس پیٹری) کا خیال ہے کہ یہی نشانات حروفِ تہجی کا ماخذ ہیں۔

راہ نما نشانات — ان نشانات کا استعمال نیم مہذب اقوام میں بہت عام ہے۔ خصوصاً اُن لوگوں میں جو خانہ بدوش زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ لوگ اپنے پیچھے آنے والوں کے لئے کچھ نشانات چھوڑتے جاتے ہیں تاکہ آنے والوں کو راستے کے حال سے پوری آگاہی ہو جائے (تصویر کشی کا فن سیکھنے سے پہلے ان لوگوں میں غالباً وہی طریقہ کام میں لایا جاتا رہا ہوگا جس کا میں نے جپسیوں اور شامپیسن ہندیوں کی تحت ذکر کیا ہے) — نیم مہذب اقوام سے یہ طریقہ غالباً مہذب اقوام میں منتقل ہوا۔ آمد و رفت کے نشانات جنھیں آپ سڑک کے کنارے موٹر والوں کی اطلاع کے لئے دیکھتے ہیں اسی قبیل کی چیزیں ہیں۔ مثلاً:-



[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] (PETROGLYPHS) [illegible] (NEOLITHIC AGE) [illegible]

[illegible] (SILHOUETTE) [illegible]

[illegible]

[illegible]

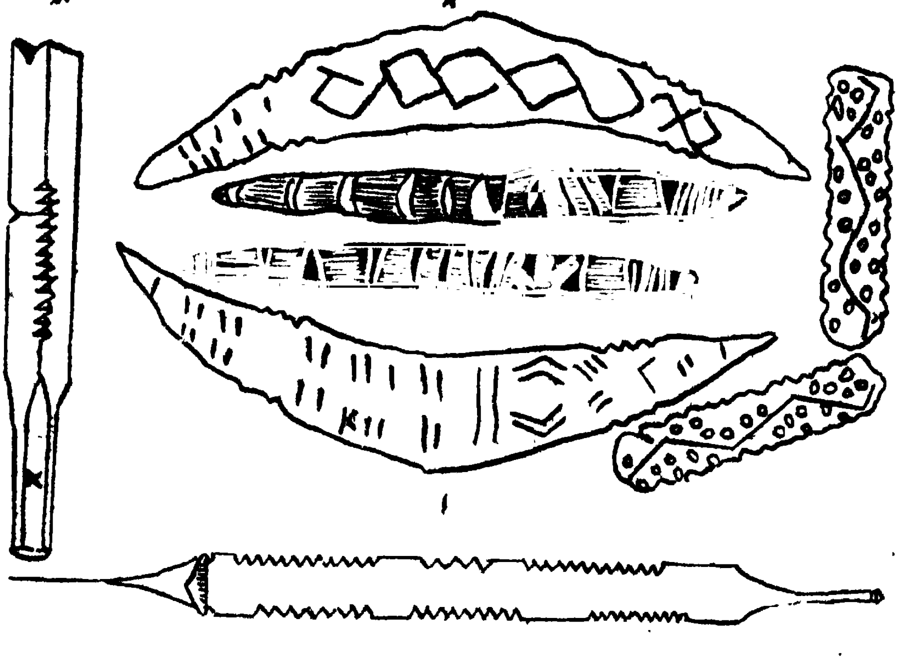
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

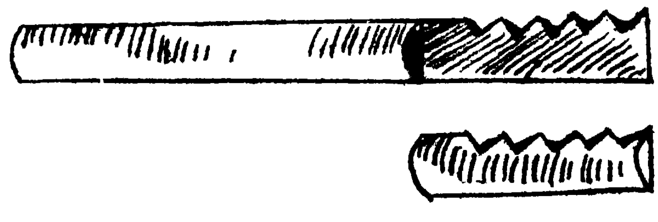
[illegible]



[illegible]

(قوم دیوتا (خالق) انسان کو بنا رہا ہے اور ستھا تھ (فنِ تحریر کا موجد) اُس کی عمر متعین کر رہا ہے)

قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں کٹاؤ دار چھڑیوں سے روپیہ کا حساب رکھتے تھے۔ عموماً بید (WILLOW) یا ہیزل (HAZEL) کی لکڑی پر دندانے بنائے جاتے تھے۔ بڑے نشانات ۱۰۰۰ پونڈ، اُن سے چھوٹے ۱۰۰ پونڈ اور اُن سے چھوٹے ۱۰ پونڈ ظاہر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اُن پر شلنگ اور پینس بھی ظاہر کئے جاتے تھے۔ روپیہ کے لین دین کے وقت ۸ یا ۱۰ انچ لمبی پٹڑی یا قلم لیا جاتا۔ اُس پر رقم کے مطابق دندانے بنائے جاتے اور جہاں پر نشانات ختم ہوتے وہاں لکڑی کے ایک پہلو میں گہرا خط دیدیا جاتا (چوڑائی میں) اور پھر لمبائی کی طرف سے اُسے چیر کر دو ٹکڑے کر دیتے جن میں سے ایک روپیہ لینے والا رکھتا اور دوسرا روپیہ دینے والا۔ جب روپیہ لوٹایا جاتا تو روپیہ لینے اور دینے والے ان کٹاؤ دار لکڑیوں کو آپس میں ملاکر دیکھتے تھے۔



حساب ملانے کو انگریزی میں "TALLY" کرنا کہتے ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو اس کی اصلیت معلوم ہوگی کہ اصل میں "ٹیلی" کٹاؤ دار چھڑیوں کو کہتے تھے۔ خود اس لفظ کا ماخذ یا تو فرانسیسی زبان کا لفظ (TAILLER) ہے جس کے معنی کاٹنا ہیں اسی سے انگریزی کا لفظ "TAILOR" نکلا ہے بمعنی درزی) یا لاطینی زبان کا لفظ "TALEA" جس کے معنی پتلی شاخ کے ہیں۔ غالباً یہی لفظ ہندوستان میں "تیلی" (تنکا) ہے

شکسپیر اپنے ایک ڈرامے میں لکھتا ہے:۔

"Our fore fathers had no other books
but the Score and the tally."

2, Henry, VI, IV, vii, 38.

"اسکور" کے اصلی معنی نشان کے ہیں جو کسی چیز پر کاٹ کر بنایا جائے لیکن چونکہ پہلے حسابی قلموں پر بیسواں نشان زیادہ گہرا اور بڑا کاٹا جاتا تھا اس لئے اسکور کے معنی بیس کے بھی ہوگئے۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عوام کے علاوہ انگلستان کا "بینک آف انگلینڈ" بھی کٹاؤ دار چھڑیوں کا استعمال کرتا تھا۔ جب کوئی شخص روپیہ جمع کرتا تو رسید کی جگہ اُسے ایک لکڑی کا ٹکڑا ملتا جس پر رقم کے لئے نشانات بنے ہوتے جارج سوم کے زمانہ میں کسی شخص نے اِس کی مخالفت کی اور یہ سوال اُٹھایا کہ جب ہمیں لکھنا پڑھنا آگیا ہے تو پھر ان کے استعمال کی کیا ضرورت ہے۔ آخر بڑی ردوقدح کے بعد ۱۸۲۶ء میں یہ رسم منسوخ ہوگئی لیکن ۱۸۳۴ء میں پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ بینک میں اس قسم کی سڑی گلی اور کرم خوردہ لکڑیوں کا جو انبار لگا ہے۔ اُس کا کیا ہو؟ کتنا اچھا ہوتا اگر انھیں غریب لوگوں میں جلانے کے لئے تقسیم کر دیا جاتا مگر انھیں قانوناً بینک سے باہر نہ لے جاسکتے تھے۔ لہٰذا یہ قرار پایا کہ انھیں پارلیمنٹ ہی کے کسی حصے میں جمع کرکے خفیہ طور پر جلا ڈالا جائے اور جب اس حکم پر عملدرآمد ہو رہا تھا تو پارلیمنٹ کی عمارت میں آگ لگ گئی

ہوا ہے اور چند پتھر کے ٹکڑے ملے ہیں جن پر منجملہ دیگر نشانات کے سیدھی لکیریں بھی کھنچی ہوئی ہیں اور قیاس غالب یہی ہے کہ ان سے مراد اعداد ہیں۔



اسی طرح اسپین کے ایک غار میں جو زمانۂ قدیم کے انسان کا مسکن تھا رینڈیر (بارہ سنگھا) کے سینگ کا ایک ٹکڑا ملا ہے جس پر کسی سخت چیز (غالباً پتھر) سے سیدھی لکیریں کھینچی گئی ہیں۔ ان سے غالباً شکار یا دنوں کی تعداد مراد ہے۔



مصر قدیم کے بعض نقوش سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں لکڑی پر دندانے بنا کر گنتی کو یاد رکھا جاتا تھا:۔



مصر قدیم کا ایک نقش

ہوتا تھا جس کا کام یہ تھا کہ وہ دوسرے مقامات کو بھیجنے کے لئے قوئیپو بنائے اور وہاں سے آنے والے قوئیپو کو دیکھ کر اُن کا مطلب بتائے جب یہ قوئیپو کسی دور دراز کے صوبے سے آتے تو لانے والے کی زبانی ہدایات کے بغیر انھیں سمجھنا مشکل ہو جاتا۔

زمانۂ قدیم کے بہت سے قوئیپو ابھی تک محفوظ ہیں۔ اُن میں سے ایک کا وزن ۱۲ یا ۱۴ پونڈ ہے۔ لیکن اب وہاں کے لوگ قوئیپو کا بنانا اور سمجھنا بھول گئے ہیں۔ اس لئے ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ان "گرہوں" میں کیا کیا راز پنہاں ہیں۔

اب وہاں کے باشندوں میں صرف پونا کے گلہ بان اپنے مویشیوں کی تعداد یاد رکھنے کے لئے گرہوں کا استعمال کرتے ہیں۔ قوئیپو کی پہلی رسّی پر وہ بیلوں کو ظاہر کرتے ہیں اور دوسری پر گایوں کو۔ اور پھر اس کے دو حصّے کر دیتے ہیں، ایک پر تو اُن گایوں کی تعداد ظاہر کی جاتی ہے جو دودھ دیتی ہیں اور دوسری پر اُن کو جن کا دودھ سوکھ گیا ہے؟ اس کے بعد والی رسّی پر بچھڑے ظاہر کئے جاتے ہیں اور پھر وہ رسّی ہوتی ہے جس پر بھیڑیں ظاہر کی جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ دودھ وغیرہ کا حساب بھی قوئیپو کی مدد سے رکھتے ہیں اور یہ سب کچھ دھاگوں کے رنگ اور گرہ لگانے کے انداز پر منحصر ہے۔

کیلیفورنیا کے پالوئی ہندی بھی اسی طریقہ پر کاربند ہیں جن کے متعلق ڈاکٹر ہوف تین نے لکھا ہے کہ اُن میں ہر سال کچھ لوگ کمبل بیچنے کے لئے سین جبرئیل بھیجے جاتے ہیں۔ ہر شخص جو کمبل بھیجتا ہے انھیں بٹے ہوئے بالوں یا اون کی دو رسّیاں دیتا ہے تاکہ جب بیچنے والا کمبل بیچے تو ایک رسّی پر ایک گرہ کمبل کے لئے لگا دے اور دوسری رسّی پر ریل (سکّہ کا نام) کے لئے جو اُسے کمبل کی قیمت کے طور پر ملے۔ جب اُس کے پاس دس ریل یعنی ایک ڈالر ہو جاتا ہے تو وہ ایک دوسری گرہ لگا دیتا ہے۔ جب یہ لوگ کمبل بیچ کر واپس لوٹتے ہیں تو کمبل دینے والے فوراً آجاتے ہیں اور گرہ دار رسّیوں کو دیکھ کر دام لے لیتے ہیں۔

اسی طرح بعض نیم مہذب اقوام روزانہ گفتگو میں تعداد کا اظہار گرہوں سے کرتی ہیں مثلاً افریقہ کے اُس حصّہ میں جو ٹینگینیکا کے نام سے مشہور ہے مکونڈے نامی ایک قبیلہ آباد ہے۔ ان لوگوں میں اظہارِ اعداد کی جو صورت ہے اُسے یوں سمجھئے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو رسّی کا ایک فٹ لمبا ٹکڑا دیا جس میں گیارہ دن کے لئے گیارہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں اور کہا کہ اس سے مراد آج ہے جب میں جا رہا ہوں، دوسری کو چھوتے ہوئے بتایا کہ میں راستے میں ہوں گا تیسری اور چوتھی گرہ کو چھوڑ کر بتایا کہ میں ان دنوں میں برابر چلتا رہوں گا اور پانچویں گرہ کو پکڑ کر بتایا کہ میں اس دن اپنی منزل پر پہونچ جاؤں گا۔ اسی طرح چھٹی گرہ سے قیام کا دن اور ساتویں گرہ سے واپسی کا دن ظاہر کیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ ہر دن ایک گرہ کھولنا بھول نہ جانا اور دسویں دن تمھیں میرے لئے کھانا پکانا ہوگا کیونکہ گیارھویں دن میں واپس آجاؤں گا۔

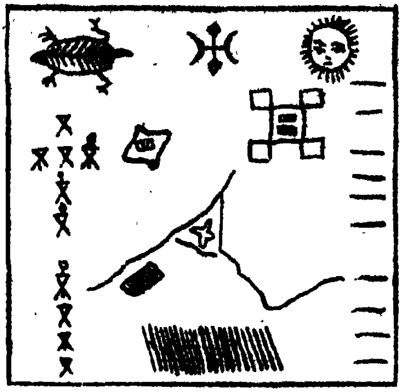
ہندوستان کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو: ۱۸۶۲ء میں سنتھال لوگوں کو سنتھال پرگنہ کی مردم شماری کرنا تھی۔ اُن کے سردار نے چار رنگ کی چار ڈوریاں لیں، سیاہ، سرخ، سفید اور زرد، سیاہ سے مراد جوان مرد تھے، سرخ سے جوان عورتیں سفید سے لڑکے اور زرد سے لڑکیاں۔ وہ ہر گھر پر جاتا اور رسّی میں ضروری گرہیں ڈال لیتا۔ اس طرح اُس نے سارے علاقہ کی آبادی کا شمار کر لیا۔ اُس کا یہ کارنامہ مدراس کے عجائب خانہ میں اب بھی محفوظ ہے۔

الغرض گرہوں کے ذریعہ سے گنتی اور ضروری باتوں کو یاد رکھنے کا رواج زمانۂ قدیم سے بہت عام تھا اور اب بھی بہت سی نیم مہذب قومیں جیسے ہیناں کے لی، بنگال کے سنتھال، جزائر جاپان جزائر پولی نیشیا، وسطی اور مغربی افریقہ، کیلیفورنیا اور جنوبی پیرو کی بعض اقوام میں رائج ہے۔ کسی حد تک یہ طریقہ جزائرِ سلیمان، کیرولائن، پے لو اور مارکوئس جزائر میں بھی مستعمل ہے۔

۳- کٹاؤ دار چھڑیاں — جس طرح گنتی کو یاد رکھنے کے لئے رسّیوں میں گرہیں لگائی جاتی تھیں۔ اسی طرح پتھر، لکڑی اور ہڈی وغیرہ پر کھرچے یا آڑے نشانات بنائے جاتے تھے۔ یہ ترکیب بہت پرانی ہے۔ جنوبی فرانس کے پاس ایک مقام ہے:-

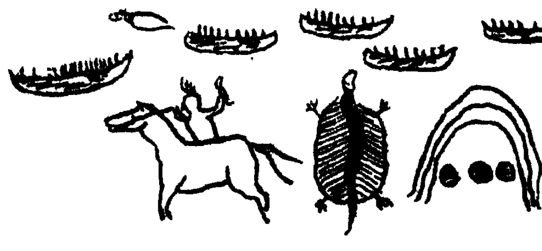
(Mood' Azil.) - یہاں پر عہدِ حجری کے درمیانی زمانہ (Mesolithic Age) کی تہذیب کا انکشاف ہوا

آنکھوں کے سردار کے دل اور آنکھ سے ملانے کے معنی یہ ہیں کہ جملہ قبیلے سردار کے ہم خیال ہیں اور سب کی دلی خواہش یہ ہے کہ انھیں مطلوبہ جھیل مل جائے۔ ایک اور نقش ملاحظہ ہو:-



دلاورے خاندان نے اپنے سردار وینج منڈ کی اُس فتح کا حال جو اُس نے انگریزوں کے خلاف ۶۳-۱۷۶۲ء میں حاصل کی تھی اوہیو ریاست میں ایک پیڑ کی چھال پر تصویروں میں کندہ کیا تھا۔ اس میں نیچے کی طرف ۲۳ متوازی لکیریں سپاہیوں کا اظہار کرتی ہیں۔ جو میدانِ جنگ کو جا رہے ہیں۔ سورج کے نیچے کھنچی ہوئی لکیریں اس سے پہلے میدانِ جنگ میں گئی ہوئی دو فوجوں کے کوچ کو ظاہر کرتی ہیں۔

تصویر کے وسط میں تین انگریزی قلعے ہیں۔ دریائے سنگم پر واقع ہونے والے قلعہ کا نام "فورٹ پٹ" ہے۔ داہنی طرف والا قلعہ جس میں دو تجارتی کوٹھیاں ہیں "ڈیترائٹ" کا ہے اور تیسرا قلعہ ایری جھیل میں واقع ہے بائیں طرف جو دس انسانی شکلیں ہیں اُن میں ۶ بے سر والے مقتولین کو ظاہر کرتے ہیں اور چار سر والے اُن مرد اور عورتوں کو جو قید کر لئے گئے (مردوں کو عورتوں سے ممتاز کرنے کے لئے اُن کی ٹانگوں کے درمیان ایک لکیر کھینچی ہے) کچھوا غالباً خاندانی علامت ہے۔ ایک اور نقش یہ ہے:



یہ تصویریں سوپیریر جھیل کے پاس ایک چٹان پر بنی تھیں۔ اس میں ایک سردار کے جھیل پار کرنے کا حال ہے۔ سردار کا نام "کنگ فشر" تھا جسے اس نام کی چڑیا سے اوپر (بائیں طرف) ظاہر کیا ہے۔ اُس کے ۵۱ سپاہی ۵ کشتیوں میں سوار تھے اس سفر میں ۳ دن لگے جسے سورج کے تین مرتبہ نکلنے ڈوبنے سے تعبیر کیا ہے۔ کچھوا خشکی یعنی منزلِ مقصود کا مظہر ہے۔

امریکن ھندیوں کی ایک شاخ ڈیکوٹا کے نام سے مشہور ہے۔ اُن کے وہاں سالوں کا شمار بہت دلچسپ طریقہ سے کیا جاتا ہے یعنی وہ ہماری طرح کسی اہم واقعہ کے بعد سے سالوں کا شمار نہیں کرتے۔ اُن کا سال جاڑے سے شروع ہوتا ہے اور اُس جاڑے کے خاص واقعہ سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ اُن میں سے ایک شخص مسمیٰ "لون ڈاگ" نے بھینس کی صاف کی ہوئی کھال پر

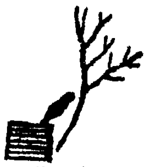
۱۸۰۰ء سے لیکر ۱۸۷۰ء تک کے واقعات کی یادداشت رکھی تھی۔ اُن میں سے چند مثالیں نیچے نقل کی جاتی ہیں۔ اب یہ کھال "امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری" (نیویارک) میں محفوظ ہے۔


تیس ڈیکوٹا ہندی مارے گئے ۱۸۰۰ء


چیچک کی وبا پھیلی ۱۸۰۱ء


نعل بند گھوڑے چرائے ۱۸۰۲ء


کالی کھانسی کا زور ۱۸۱۳ء


سوکھ [illegible] سے لو دام بنا ما ۱۸۱۶ء


سردار کے گھوڑے مارے گئے ۱۸۲۲ء


سیلاب میں بہت سے ہندی غرقاب ہوئے ۱۸۲۵ء


گبڑا نامی ہندی بھالے سے مارا گیا ۱۸۴۸ء

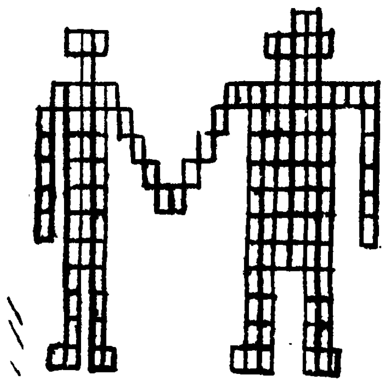

مسٹر جان رچرڈ سے کمبل خریدے ۱۸۵۳ء


سورج گرہن پڑا جس میں ستارے نظر آئے ۱۸۶۹ء (۷ اگست)

نیچے کی تصویر "وابوجیگ" نامی سردار کا سنگِ مزار ہے (جو سوپیریر جھیل کے نزدیک ۱۷۹۳ء میں مرا تھا) اُس کے قبیلے کا نشان رینڈیر (بارہ سنگھا) تھا جسے اُلٹا بنانے سے اُس کی موت مراد ہے۔ بارہ سنگھے کے نیچے کھنچی ہوئی لکیریں اُس کے زخموں کو ظاہر کرتی ہیں۔ اور دائیں بائیں طرف کی آڑی لکیریں اُن لڑائیوں کو جن میں وہ شریک ہوا تھا۔ بقیہ اشکال مطلب غیر واضح ہے۔



امریکی ہندی عموماً صاف کئے ہوئے چمڑے پر رنگوں سے لکھتے ہیں لیکن اُن میں سے بعض قبیلے بجائے لکھنے کے اُنھیں پوتوں سے سجاتے ہیں، جنھیں "ویم پم" کہتے ہیں۔ ان پوتوں کی بُنائی یا ٹکائی میں مختلف تصویریں بنائی جاتی ہیں جن سے خاص خاص مطلب مراد لئے جاتے ہیں۔ ایسی "پوت کی لکھائی" کا سب سے اچھا نمونہ وہ پیٹی ہے جسے لینی لینپ خاندان کے سرداروں نے ۱۶۸۲ء میں ولیم پین کو صلح کے موقع پر پیش کیا تھا۔ اُس میں ایک انگریز اور ایک ہندوستانی کو مصافحہ کرتے ہوئے دکھایا ہے (صلح کی علامت) اب یہ پیٹی "پنسلوانیہ ہسٹاریکل سوسائٹی" میں محفوظ ہے۔



امریکی ہندیوں کی طرح الاسکا کے لوگ بھی تصاویر کے ذریعہ پیغام رسانی کرتے ہیں۔ عموماً یہ پیغامات لکڑی کی کھپاچوں پر نقش کرکے مکان کے سامنے آنے والوں کی اطلاع کے لئے رکھدئے جاتے ہیں۔ نیچے اس کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں :-

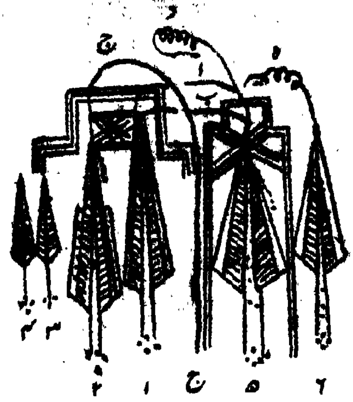


(دائیں سے بائیں کو) گھر میں ——— کچھ کھانے کو ——— نہیں ہے۔



(دائیں سے بائیں کو) میں اُس طرف جاؤں گا ——— ناؤ کے ذریعہ (اور) ایک رات سوؤں گا ——— جزیرے کے ایک جھونپڑے میں ——— (پھر وہاں سے) میں جاؤں گا ——— ایک (دوسرے) جزیرے میں ——— (اور وہاں) دو راتیں سوؤں گا ——— میں شکار کروں گا ——— ایک بحری شیر ——— تیر و کمان سے ——— (پھر لوٹ آؤں گا) ناؤ سے ——— اپنے گھر کو ———

سائبیریا میں بھی کسی حد تک تصویری رسم الخط کام میں لایا جاتا ہے۔ نیچے دی ہوئی مثال ایک محبت کی درد بھری داستان ہے :-



نمبر(۱) شوہر ہے اور نمبر(۲) اُس کی بیوی (سر کے پاس نقطوں سے مراد چوٹی ہے) نمبر ۳ اور ۴ اُس کے بچے ہیں لیکن وہ اس شادی سے خوش نہیں ہے (گھر کے درمیان صلیب ملاحظہ ہو) وہ ایک دوسری لڑکی (نمبر ۵) کو چاہنے لگتا ہے (الف) اور وہ بھی اُسکی محبت میں مبتلا ہوجاتی ہے (ب) لیکن اُس مرد کی بیوی بیچ میں حائل ہوجاتی ہے اور رشتۂ محبت منقطع ہوجاتا ہے (ج) مگر پھر بھی وہ اُسے چاہے جاتی ہے (د) — یاد رہے عورت ایک بار محبت کرتی ہے بار بار نہیں — اگرچہ ایک دوسرا نوجوان (نمبر ۶) اُسے چاہتا ہے (ہ) اس طرح اُس کی زندگی بے حد تلخ ہوجاتی ہے (گھر کے درمیان صلیب ملاحظہ ہو)

آخر میں افریقہ کے ایوے زبان بولنے والے نیگرو لوگوں کے رسم الخط کا ذکر کروں گا جو اگرچہ شمالی امریکہ کے قدیم باشندوں کے رسم الخط کی طرح مکمل نہیں لیکن پھر بھی وہ کسی حد تک تصاویر کے ذریعہ خیالات کا اظہار کر لیتے ہیں۔ تصویری رسم الخط میں ان کی چند ضرب الامثال ملاحظہ ہوں:-



۱ ۲ ۳

نمبر ۱ — "دو جنگجو ایک میدان میں نہیں رہ سکتے"۔ نمبر ۲ — "سوئی بڑے بڑے کپڑے سیتی ہے" یعنی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بڑے بڑے کام ہوتے ہیں۔ نمبر ۳ — "تاگا سوئی کے ساتھ چلتا ہے"۔ یعنی لڑکے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔

یوں تو دنیا کی بہت سی نیم مہذب اقوام تصویری رسم الخط کا استعمال کرتی ہیں لیکن میں اتنی ہی مثالوں پر اکتفا کروں گا کیونکہ میرا مقصد صرف یہ دکھانا تھا کہ تصویری رسم الخط سے کہاں تک خیالات کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ آئندہ اشاعت میں زمانۂ قدیم کی مہذب اقوام کے تصویری رسم الخط کا ذکر کروں گا۔

(باقی)

محمد اسحاق صدیقی

مومن کا تغزل

(بہ سلسلہ ماسبق)

مومن پر لکھنے والوں نے ان کی معنی بندی و مضمون یابی، دقیقہ سنجی و بلند پروازی، نازک خیالی و معنی آفرینی کی داد جن بلند آہنگ الفاظ میں دی ہے وہ پڑھنے والے کو مرعوب کردیتے ہیں لیکن اس باب میں انھوں نے جو مثالیں پیش کی ہیں اُن کو دیکھ کر ایک سوچنے سمجھنے والا دماغ یہ رائے قایم کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ غزل سے متعلق اصطلاحات میں نازک خیالی اور مضمون آفرینی سے زیادہ خوش آہنگ مگر پُر فریب اور دھوکے باز اصطلاح شاید ہی کوئی اور ہو۔ اگر آپ سے کہا جائے کہ فلاں شاعر خرافات و مہملات کا بادشاہ ہے۔ اس کے کلام میں تخیئل کی بے اعتدالیاں اور گمراہیاں نقطۂ عروج پر نظر آتی ہیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس کے کلام کو ذرا بھی لایقِ التفات نہیں سمجھیں گے لیکن اگر انھیں خصوصیات کو یوں بیان کردیا جائے کہ وہ شاعر نازک خیالی اور معنی آفرینی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تو آپ نہ صرف اس کے کلام کے متعلق بلند رائے قایم کرلیں گے بلکہ اس کے سامنے سرِ عقیدت بھی خم کردیں گے حالانکہ یہ دونوں باتیں نفسِ حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ ثبوت کے لئے مومن کی نازک خیالی اور معنی آفرینی کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ اس ضمن میں میں صرف وہی اشعار پیش کرونگا جو مومن پرست قسم کے ارباب قلم نے پیش کئے ہیں تاکہ آپ یہ نہ کہ سکیں کہ میں نے مثالوں کے انتخاب میں نیک نیتی سے کام نہیں لیا۔ سب سے پہلے پروفیسر ضیاؔ کی منتخب کردہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا　　کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری

اس شعر کے معنی بھی موصوف ہی کے الفاظ میں سُن لیجئے۔ لکھتے ہیں:۔ "مجھے حالتِ اسیری میں بھی آزادی میسر ہے۔ اس واسطے کہ جب میں زنداں میں تڑپتا ہوں تو میری تپش کے اثر سے تمام کرۂ زمین گردش کرنے لگتا ہے اور اس کے ساتھ میں بھی گردش کرنے لگتا ہوں۔ اب آزادی کے لئے اور کیا چاہئے۔"

اگر قدرت نے آپ کو فہم عامہ کا تھوڑا سا بھی حصہ عطا کیا ہے تو غور فرمایئے کہ اس شعر میں کون سی بات ایسی ہے جسکی بنا پر اس کو مہمل نہ کہا جاسکے۔ دعویٰ یہ ہے کہ میں زنداں میں آزاد رہا۔ دلیل یہ ہے کہ جب میں تڑپتا ہوں تو میری تپش کے اثر سے تمام کرۂ زمین گردش کرنے لگتا ہے اور اس کے ساتھ میں بھی گردش کرنے لگتا ہوں۔ یعنی ایک لغو دعوے کو لغو تر دلیل سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اسی کا نام ہے نازک خیالی و معنی آفرینی۔ غالبًا ایسے ہی موقع کے لئے کہا گیا ہے، برعکس نہند نام زنگی کافور۔

یادش بخیر۔ جناب اثرؔ لکھنوی نے اِس شعر کو ایک اور نقطۂ نظر سے سراہا ہے لکھتے ہیں:۔ شعر نہیں ایک کارنامہ ہے۔ پہلا مصرع بندش اور بلاغت کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ایک تو اس زمانہ میں جب کہ دنیائے شاعری گردشِ فلکی کی قایل تھی (میں یہ نہیں کہتا کہ گردش ارضی سے واقف نہیں تھی) ؏

"کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری"

کہنا اختراع فایقہ ہے۔ مجھے علم نہیں ممکن ہے کہ اوروں نے بھی کہا ہو مگر تپشِ عشق کو گردشِ ارضی کا سبب قرار دینا شاعری

کی وہ منزلیں ہیں جن کے خیال سے بڑے بڑوں کے حوصلے پست ہوگئے ہوں گے" قربان جایئے اس نکتہ سنجی و سخن فہمی کے جسکی بدولت ایک لایعنی شعر ایک کارنامہ اور اختراع فائقہ کے مرتبے کو پہونچ گیا۔ خواجہ حافظ نے حسرت آگیں لہجے میں پوچھا تھا۔

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند ۔ آیا بود کہ گوشۂ چشمے بہ ما کنند؟

معلوم نہیں کہ ان کی تمنا پوری ہوسکی یا نہیں لیکن مؤمن کے بارے میں شک نہیں کہ ان کو اس دور میں ایک ایسا اہلِ نظر مل ہی گیا جس کی توجہ نے اُن کی "خاک" کو "کیمیا" بنانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ کاش آثر صاحب سمجھ سکتے کہ مؤمن کا مندرجۂ بالا شعر یا اسی قسم کے اور اشعار کہنے کے لئے حوصلے کی بلندی قطعی ضروری نہیں صرف "ذوقِ فضول" کا ہونا کافی ہے۔

مؤمن ؎ دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب ۔ تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

پروفیسر ضیاء کے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں:۔ "منجم نے شاعر کا حالِ زار دیکھا اور تاثیرِ نجوم کے حساب سے اس کی ناکامیِ عشق کا پتہ لگا لیا اور خود اس کا رقیب بن بیٹھا کیونکہ عاشق کی ناکامی دریافت کرکے اس کو اپنی کامرانی کی توقعات پیدا ہوئیں۔ اس طرح اس کا طالعِ ناساز دیکھنا منجم کے حق میں سازگار ہوا۔"

دُنیا صدیوں سے اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ محبت ایک قسم کا جذبۂ بے اختیار ہے اس ضمن میں مؤمن کی تحقیق کچھ اور نکلی۔ چنانچہ انھوں نے دنیا کی صدیوں پُرانی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے مندرجۂ بالا شعر تصنیف کیا اور بتایا کہ عشق کسی خود رو جذبے کا نام نہیں۔ اس میں مصلحت نوازی، دور اندیشی اور عاقبت بینی کو اتنا ہی دخل ہے جتنا کہ سیاست اور تجارت میں۔ جب تک کسی کو اس بات کی قوی امید نہ ہو کہ وہ فلاں سے عشق کرنے میں کامیاب ہوگا اس وقت تک وہ اس کام میں ہاتھ ہی نہیں لگاتا۔ اور جس طرح ایک بنیا تجارت میں صحیح Speculation کی مدد سے نسبتاً زیادہ منافع حاصل کرسکتا ہے اسی طرح ایک منجم عشق کے معاملے میں اپنے علم نجوم سے نسبتاً زیادہ فایدہ اُٹھا سکتا ہے۔ غالباً اسی قسم کے انکشافات جدیدہ کا نام نازک خیالی اور معنی آفرینی ہے۔

مؤمن ؎ پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے ۔ اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

پروفیسر ضیاء کی تشریح:۔ "محبوب کا میری طرف نہ دیکھنا بھی نگہِ التفات کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اگر وہ اِدھر دیکھتا تو میرا قرار و ثبات پامال ہوجاتا۔"

اس عالمِ آب و گل میں جب کوئی انسان کسی سے محبت کرتا ہے تو اس وقت تک بے قرار اور مضطرب رہتا ہے جب تک محبوب اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتا۔ عاشق کی طرف محبوب کا التفات اس کی بے قراری اور بے چینی میں تسکین کا باعث ہوتا ہے نہ کہ اس کا رہا سہا صبر و قرار بھی پامال ہوجاتا ہے لیکن مؤمن کا تجربہ ٹھیک اس کے برعکس ہے۔ اور کیوں نہ ہو بقول مؤمن ع "ہم اُلٹے، بات اُلٹی یار اُلٹا" یار اُلٹا ہو یا نہ ہو لیکن باقی دو کا اُلٹا ہونا یقینی ہے۔

مؤمن ؎ بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے ۔ شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

"مدعی (رقیب) نے معشوق سے کہا کہ عاشق (مؤمن) تمھاری شکایتیں کرتا پھرتا ہے اس پر معشوق آمادۂ قتل ہوگیا۔ عاشق کہتا ہے کہ مدعی کا الزام جھوٹا ہے اور اگر میں خود جان سے بیزار نہ ہوتا تو اس ناکردہ جرم کے مواخذہ سے بچنے کے لئے اس سے ضرور گواہ طلب کرتا۔ لیکن میں تو خود مشتاقِ قتل ہوں۔"

آپ خود فیصلہ کرلیں کہ یہ مضمون تخئیل کی نزاکت ہے یا خرافیت؟ معنی آفرینی ہے یا مہمل طرازی؟

مؤمن ؎ عدو اس اوج پر شاکی ہے شاید غصہ آجائے ۔ ملادے خاک میں یہ تو بھی شکرِ آسماں کیجے

پروفیسر ضیاء کی تشریح:۔ "اگر آسماں مجھے خاک میں بھی ملادے تو بھی مجھے چاہیئے کہ اس کے ظلم پر شکر کرتا رہوں۔

نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس (آسمان) کی عادت بگڑ جائے گی۔ اور وہ اس شکر کو اپنا حق سمجھنے لگے گا۔ ادھر رقیب کا یہ حال ہے کہ اس اوج کے باوجود آسمان کی شکایت کرتا رہتا ہے اور بالآخر کسی دن آسمان شکایت پر بگڑ کر اس کو نیچا دکھائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان تو مجھ ستم زدہ کی شکر گزاری کا خوگر ہوگا۔ رقیب کی شکوہ سنجی (اوج کے باوجود) اس کو برہم کردے گی۔"

اگر کوئی عاشق اس قسم کے خیالات کا اظہار اپنے کسی رازدار یا غمگسار سے بھی کرے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام تر ہمدردیوں کے باوجود اس قسم کی باتوں کو معاف نہ کرسکے گا اور بے اختیار کہہ اُٹھے گا۔ "یہ کیا بکواس ہے؟" لیکن جب کوئی شاعر اسی بکواس کو دو مصرعوں کی شکل میں پیش کردیتا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ارباب نقد و نظر تک اس بکواس کو نازک خیالی اور معنی آفرینی سے کیوں تعبیر کرنے لگتے ہیں۔

پروفیسر ضیاء نے اپنے مرتب کردہ "دیوان مومن" کے مقدمے میں نازک خیالی اور معنی آفرینی کے عنوان کے تحت اور بھی کوئی اشعار پیش کئے ہیں، جن سے بخوف طوالت میں صرف نظر کئے لیتا ہوں اور بعض دوسرے ارباب قلم کی پیش کردہ مثالوں سے بحث کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ مومن کے لایعنی اشعار پر نازک خیالی اور معنی آفرینی کا دھوکا صرف پروفیسر ضیاء ہی کو نہیں ہوا بلکہ دوسروں کو بھی۔

مومن کے پرستاروں میں ایک صاحب ہیں معجز سہسوانی۔ انھوں نے "مومن و غالب" کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے۔ جس میں نازک خیالی اور معنی آفرینی کے اعتبار سے مومن و غالب کا موازنہ کرکے مومن کو غالب سے برتر شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں اس موازنہ سے کوئی بحث نہیں۔ میں اس میں سے مومن کے صرف دو تین ایسے اشعار لیتا ہوں جن کی نزاکتِ تخئیل اور معنی آفرینی پر جناب معجز لوٹ ہیں۔

مومن ؎　　دیکھا ادھر کو تو نے کہ بس دم نکل گیا　　　اترے نظر سے اپنی نگہبانیوں میں ہم

جناب معجز لکھتے ہیں:۔ "یعنی[1] معشوق کا کسی طرف دیکھنا ہم کو گوارا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اپنی جانب بھی اور جس کی طرف وہ دیکھتا وہی ہم کو اپنا دشمن نظر آتا ہے۔ اس وجہ سے جب اس نے ہماری جانب دیکھا تو ہم خود اپنی نظر سے اُتر گئے یہ ہماری نگہبانی کا نتیجہ نکلا۔ اس تخئیل کی نزاکت قابلِ تحسین ہے۔"

عام قاعدہ تو یہی ہے کہ جذبۂ رشک کی بنا پر عاشق کو محبوب کا کسی اور کی طرف دیکھنا گوارا نہیں ہوتا لیکن مومن جو عشق کے معاملے میں بھی "صاحبِ طرز" واقع ہوئے تھے انھیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ محبوب خود ان کی طرف دیکھے۔ بدقسمتی یا سوء اتفاق سے ایک مرتبہ ان پر محبوب کی نگاہ پڑ ہی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اور رقیبوں کی طرح مومن خود بھی اپنی نظر سے اُتر گئے۔ خیر یہ توجو ہونا تھا سو ہوا۔ زندگی میں بے تکے واقعات بھی وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جب مومن نے اس بے تکے واقعہ کو نظم کردیا تو اس میں تخئیل کی نزاکت کہاں سے پیدا ہوگئی۔

مومن ؎　　دعا بلا تھی شبِ غم سکون جاں کے لئے　　　سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لئے

جناب معجز لکھتے ہیں:۔ "مومن خاں کا (یہ) شعر دقیق و کثیر المعنی ہے۔ یعنی ہم نے شب غم سکونِ جاں کے لئے جو دعا مانگی وہ مرگ ناگہاں کے لئے بہانہ ہوگئی اور اس نے آکر قصہ فیصل کردیا۔ یا یہ کہ دعا مانگنے میں ضعف سے روح پرواز کرگئی اور یہ پہلو بھی درست ہے کہ موت خود ہی آنے والی تھی دُعا کا ایک بہانہ ہوگیا۔ حاصل تمام معانی کا ایک ہے۔ اس بلاغت کا جواب نہیں ہوسکتا۔"

---

[1] پروفیسر ضیاء کی تشریح معجز صاحب کے بیان کردہ مطلب سے مختلف ہے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان تصفیہ کرانا میرا کام نہیں۔

یوں تو اس شعر میں بے مزہ بلکہ بدمزہ مبالغے کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن اگر کوئی شخص جناب متجز کی سی بصارت و بصیرت کا مالک ہو تو وہ اس میں خیال کی دقت، معنی کی کثرت، طرزِ ادا کی بلاغت غرض کیا کچھ نہیں دیکھ سکتا؟

اب مومن کے دو ایک ایسے شعر ملاحظہ ہوں جن کی نازک خیالی اور معنی آفرینی نے جناب آسی لکھنوی سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔

مومن ؎ تیری جفا ہو تو ہے سب دشمنوں سے امن　　بدمستِ غیر، محو دل، اور بخت خواب میں

جناب آسی لکھتے ہیں :- "..... غیر اس وقت شرابِ عیش سے بدمست ہے۔ میرا دل محو ہو کر رہ گیا ہے۔ میرا نصیب محو خواب ہے۔ اگر ایسے میں تو بھی جفا سے باز آجائے تو مجھے تمام دشمنوں سے نجات مل جائے۔ تغزل کی حد میں ایسی مضمون آفرینی اور اسی کے ساتھ بیان میں شگفتگی مومن ہی کا حصہ تھا۔"

یہ شعر مومن کی زندگی کے ایک خاص لمحے کی یادگار ہے۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت رقیب شراب پی کر بدمست ہو گیا تھا اور مومن کو اس کی ستم رائیوں سے نجات مل گئی تھی۔ اِدھر ان کی پرآشوب قسمت (زیر بحث شعر کا ایک اہم نقص یہ ہے کہ "بخت خواب میں" کا مفہوم وہ نہیں جو مومن کا مقصود ہے۔ بخت کا خواب میں ہونا بدبختی کی علامت ہے نہ کہ خوش نصیبی کی) بھی سو رہی تھی۔ صرف محبوب کے مظالم کی مشین بدستور چل رہی تھی اور اگرچہ اُس وقت مومن کا دل بھی محو ہو کر رہ گیا تھا پھر بھی مومن کو تکلیف ہو رہی تھی کیونکہ محبوب کے مظالم دل کی بجائے ان کے اعصاب پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بیتاب ہو کر فرمایا ؎

تری جفا نہ ہو تو ہے سب دشمنوں سے امن　　بدستِ غیر، محو دل، اور بخت خواب میں

اب ایک آخری مثال پیش کرتا ہوں جو مومن کے ایک نقاد سید امتیاز احمد کا انتخاب ہے۔

مومن ؎ لذتِ مرگ سے ہجراں میں دعا ہے کہ خدا　　یہ مزا ہو نہ نصیبوں میں کسی بے حس کے

امتیاز صاحب لکھتے ہیں :- "بے حس لذتِ مرگ سے کیا خاک لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اسے مومن ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہئے۔ نیش کو نوش بنانا شاعر کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ مومن کی تخئیل کو دیکھئے۔ کہتا ہے ظاہر ہے کہ عدو کو نہ کبھی ہجر کی مصیبت اُٹھانا پڑے گی نہ اس کے صدموں سے کبھی مزا ہوگا۔ یہ شرف تو صرف عاشق صادق کی قسمت میں لکھا ہے جب یہی ہونا ہے تو کیوں نہ مرگ کو شربت بناکر اس طرح پیو کہ ایک بار تو رقیب کو بھی رشک ہو جائے۔ یہ مومن کی وہ پروازِ تخئیل ہے جس کے متعلق غلام ربانی عزیز کا خیال ہے کہ ان بلندیوں پر غالب ایسے سدرہ نشین کے پر جلنے لگتے ہیں۔"

امتیاز صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ "نیش کو نوش بنانا شاعر کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے" لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ شاعر جب بائیں ہاتھ کا کھیل دکھانے پر اتراتا ہے یا تخئیل کے زور سے آسمان پر چڑھنے لگتا ہے اُس وقت وہ اللہ جو کچھ بھی رہے شاعر باقی نہیں رہتا اور اس عالم میں جو کچھ کہتا ہے اسے شعر کہنا بھی ایک وجدانی جرم ہے۔

یہ صحیح ہے کہ نازک خیالی اور مضمون آفرینی کی آڑ میں "اناپ شناپ فرمانے" کے گنہگار تنہا مومن نہیں ہیں۔ در اصل یہ ایک مستقل روایت ہے جو اُردو شاعری کو فارسی شاعری سے بطور وراثت ملی۔ اس غیر صحت مند روایت سے فارسی و اُردو شاعری میں بڑے بڑوں کے دامن داغ دار ہیں۔ یہ دونوں زبانوں کی انتہائی بدنصیبی تھی کہ انکے اساتذۂ سخن اس مضر روایت کے شکار ہو گئے۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس روایت کے نتائج کو تعریف و تحسین کا مستحق ٹھہرا کر اور ان کو اپنے اساتذۂ سخن کا سب سے بڑا کمال قرار دے کر دوسری غلطی ہم کیوں کریں!

آپ مومن کی نازک خیالی اور معنی آفرینی کی چند مثالیں دیکھ چکے۔ ان کے دیوان میں اسی قسم کے اشعار کی

کثرت ہے۔ اس کے باوجود مومن کے بعض پرستاروں مثلاً جناب معجز کا دعویٰ ہے کہ مومن کا "ہر شعر دقیق معنی اور لطیف احساس کا ایک طلسم ہے"۔ اور پروفیسر ضیا احمد کے نزدیک مومن حسنِ تخئیل کے اعتبار سے یوسفِ مصرِ معانی کہے جانے کے مستحق ہیں"۔

لیکن جب دورِ حاضر کا ذوقِ شعری مومن کے ان اشعار کو صحیح شاعری کے دائرے سے خارج قرار دیتا ہے تو مومن کے پرستار بعض ادبی نظریات کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً جب پروفیسر کلیم الدین احمد نے مومن پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ "مومن کی نازک خیالی اور بدیع الاسلوبی مسلم۔ مگر یہ صحیح شاعری نہیں، کیونکہ اول الذکر تاثیر سے مجبور ہے اور آخر الذکر تصنع سے معمور"۔ تو پروفیسر ضیا احمد نے جواب میں دو ادبی نظریات کا سہارا لیتے ہوئے فرمایا:-

"جب ہم اچھے شعر کے لئے صداقت کی شرط لگاتے ہیں تو ہمارا مقصود سادہ اور سپاٹ حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا ورنہ دنداں تو جملہ در دہانند، چشماں تو زیر ابرو آنند، کو بھی شعر ماننا پڑے گا۔ بات یہ ہے کہ شعری حقیقت اور سائنٹفک حقیقت میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ شعر میں حقیقت اس زاویے سے بیان کی جاتی ہے جس سے شاعر کا ذہن اسے محسوس کرتا ہے اس کے برخلاف سائنس کا نصب العین حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے، ایک کا نقطۂ نظر موضوعی، داخلی اور جذباتی ہے دوسرے کا معروضی، خارجی اور عقلی۔ ایک تخلیقِ حسن کا ضامن ہے۔ دوسرا اضافۂ معلومات کا۔۔۔۔۔"

" اولاً ان (مومن) کے خیالات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر خیال حسبِ معمول جذبات اور تخئیل کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں انھوں نے وارداتِ محبت کی جو ترجمانی کی ہے اس کا تعلق جذبات سے ہے جن میں ان کی تخئیل نے اپنا رنگ بھر دیا ہے۔ یا یوں کہئے اپنے جذباتی تجربات کو انھوں نے اپنی تخئیل کی رنگین عینک سے دیکھا ہے۔ جذبات کی اصلیت و صداقت کی بحث اوپر گزری۔ رہی تخئیل۔ یہ دراصل قوتِ اختراع کا نام ہے جس کے بغیر شعر شعر نہیں کہلاتا"۔

شاعرانہ حقیقت اور حکیمانہ حقیقت کا فرق مسلم۔ لیکن اس بحث سے کلیم صاحب کے اعتراض کی تردید ممکن نہیں۔ اگر ایک طرف دنداں تو جملہ در دہانند، چشماں تو زیر ابرو آنند والی حقیقت کسی شعر کا موضوع نہیں بن سکتی تو دوسری طرف ان حقائق پر بھی شاعری کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی جو (مثال کے طور پر) مومن کے ان اشعار میں پائے جاتے ہیں:-

کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری　　　میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لئے　　　سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے

یہ اشعار جہاں سائنٹفک حقیقت سے خالی ہیں وہاں شاعرانہ حقیقت سے بھی بیگانہ ہیں۔ رہا یہ نظریہ کہ تخئیل کے بغیر شعر شعر نہیں کہلاتا سو وہ بھی درست ہے لیکن انھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ "جہاں تخئیل شعر کی روح رواں ہے وہاں اس کی بے راہ روی اور بے اعتدالی شعر کی موت بھی ہے"۔ اور مومن کے کلام میں تخئیل کی بے اعتدالیاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ پروفیسر ضیا احمد کا یہ زیرِ لب اعتراف کہ "مومن کے یہاں تخئیل کے اعتدال کے ساتھ اس کی بے اعتدالی کی مثالیں بھی ملتی ہیں خصوصاً ابتدائی دور میں جب کہ وہ رنگِ ناسخ کے پیرو تھے"۔ یا ایک جگہ یہ کہنا کہ "مومن کے یہاں خصوصاً ابتدائی کلام میں (جب کہ وہ رنگِ ناسخ کی طرف مائل تھے) اور کہیں کہیں بعد میں شاید عام مذاق کے اثر سے رسمی اور غیر حقیقی جذبات کا سراغ بھی ملتا ہے۔ لیکن یہ ان کا اصلی رنگ نہیں"۔ دراصل کلامِ مومن کے ایک نمایاں عیب پر پردہ ڈالنے کے برابر ہے۔

چونکہ مومن کی نازک خیالی اور مضمون آفرینی سے متعلق زیادہ تر اشعار غیر فطری اور مبالغہ آمیز ہیں اس لئے مومن کے ایک پرستار سید امتیاز صاحب نے ان کی شاعری کو متذکرہ نقص سے بری ثابت کرنے کے لئے ایک عجیب منطق پیش کی ہے فرماتے ہیں [illegible] شعروں کو مبالغہ آمیز کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے وہ درحقیقت کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر ایک شاعر کی حس [illegible] ہوتی ہے اور اس کا بیان ہمارے محسوسات کی مدد سے مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ مبالغہ آمیز ہو

موتمن کہتا ہے :-

تیرے دل تفتہ کی تربت پہ عدو جھوٹا ہے گل نہ ہوں گے شررِ آتشِ سوزاں ہوں گے

بہی نظر میں یہ شعر صاف مبالغہ معلوم ہوتا ہے اور ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ موتمن کسی طور پر یہ محسوس ہی نہیں کرسکتا کہ تیرے دل تفتہ کی تربت پر گل ہوں گے اگر ہوں گے تو شررِ آتشِ سوزاں ہی ہوں گے۔ اس بڑھی ہوئی حس کے سامنے مبالغہ آمیز کہنے والوں اور عدو کے بیان کی کیا وقعت باقی رہ سکتی ہے۔ انداز بیان نے اس غیر فطری بیان میں تاثیر پیدا کردی" امتیاز صاحب کی مندرجۂ بالا سطریں ان کے دعوے کو تو ثابت نہ کرسکیں لیکن ان سے اس امر کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ایک پڑھا لکھا آدمی بھی اگر ذوقِ سلیم سے محروم ہو تو کس درجہ لغو گفتگو کرسکتا ہے۔ انھوں نے موتمن کا جو شعر پیش کیا ہے اس کی تاثیر کو محسوس کرنا ان ہی کے دل گداختہ کے بس کی بات تھی۔ پھولوں کی شررِ آتشِ سوزاں کہنا مبالغہ نہ سہی شاعر کی بڑھی ہوئی حس کا نتیجہ سہی لیکن کیا قبر کے اندر سے عدو کے بیان کی تردید بھی جناب عاشق یا جناب شاعر کی بڑھی ہوئی حس ہی کا نتیجہ ہے ؟۔ اس میں شک نہیں کہ ایک عام آدمی کی بہ نسبت ایک شاعر کے احساسات زیادہ مشتعل اور تیز ہوتے ہیں مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ جو چیز ایک عام آدمی کو رائی کے برابر نظر آتی ہے وہ شاعر کو پہاڑ کی ہمسر نظر آئے۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک عام شخص شاعروں کے کلام میں اپنے جذبات و محسوسات کا عکس دیکھنے سے قاصر رہتا۔ شاعر کی قوتِ حس کے زیادہ تیز ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ جن کیفیات و جذبات کو ایک عام انسان مبہم طور پر اپنے دل میں محسوس کرتا ہے، ایک شاعر ان کو وضاحت اور شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور بس۔ جب میر یہ کہتے ہیں ؎

میرے مرنے کی حقیقت جس میں تھی ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

یا جب موتمن یہ کہتے ہیں :-

مہتاب کا کیا رنگ کیا دودِ فغاں نے احوالِ شب تار سے روشن ہے ہمارا
جا بجا نہریں ہیں جاری میں نے اشک پونچھے ہوں گے دامنِ کہسار سے
کیوں کر نجات آتشِ ہجراں سے ہو کہ مرگ آئی تو دور ہی تب و تاب بدن سے ہے
ہوگئی ساری زمیں صرف حروفِ نور قم اک جہاں ویران ہے میرے نامہ کی تحریر سے
سیکھے ہیں مجھ سے نالۂ نہ آسماں شکن صیاد اب قفس میں عنادل کو تھامنا

تو وہ اپنی بڑھی ہوئی حس کا ثبوت نہیں دیتے بلکہ مضحکہ خیز قسم کی مبالغہ آرائی میں اپنے کمال کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں یہ ایک سیدھی سی بات ہے جس کو منطقی ہتھیروں سے غلط ثابت کرنے کی کوشش بے سود ہے۔

اوپر کی سطروں میں میں نے موتمن کی نازک خیالی اور معنی آفرینی کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ جن اشعار میں بے تکی خیال آرائیاں ہوں، بے بات کی بات (بات سے بات پیدا کرنا حسن ہے) پیدا کی گئی ہو، دوراز کار مبالغے سے کام لیا گیا ہو، کسی لغو دعوے کو لغو تر دلیل سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہو ان پر نازک خیالی اور مضمون آفرینی کا لیبل نہیں لگانا چاہیے۔ ان اصطلاحات کا اطلاق ان اشعار پر ہونا چاہیے جو حسن تعبیر، حسن توجیہ، حسن تمثیل سے عبارت ہوں جو خیال کی نزاکتوں پر مبنی ہونے کے باوجود ذہنی ورزش کے نتائج نہ ہوں، جن میں کوئی ایسی بات کہی گئی ہو جو حیرت انگیز ہونے کے باوجود غیر فطری نہ ہو، جو انوکھی ہونے کے باوصف ہر شخص کو اپنے دل کی بات محسوس ہو اور دل کی بات محسوس ہوتے ہوئے بھی انوکھی نظر آئے۔ مثال کے طور پر غالب کے اس شعر کو لیجئے ؎

نہیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت شنیدہ کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیم

اس میں تخیل کی نزاکت، فکر کی بلاغت، اور نکتہ آفرینی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ روایت کی رو سے پہلے مصرعہ کی قیمت میں کوئی شک ہی نہیں۔ دوسرا مصرعہ بڑا چونکانے والا ہے پھر بھی اصلیت سے بیگانہ نہیں۔ انسان شعلہ و شرر کے بغیر بھی جلتا ہے۔ جذبات و محسوسات میں بھی سوز و تپش کی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ ہر شخص کے تجربہ کی بات ہے لیکن غالب نے اس آفاقی تجربے کو اپنے انداز بیان سے ایک انوکھی چیز بنا دیا ہے۔

تمثیلات و تمثیلات کی شاعری میں نازک خیالی اور مضمون آفرینی کے بڑے پاکیزہ نمونے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر غالب کے دو فارسی شعر ملاحظہ ہوں ؎

نازم فروغ بادہ ز عکس جمال دوست　　گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را

سرگرمیِ خیال تو از نالہ باز داشت　　دل پارۂ آتش است کہ دودش نماندہ است

پہلے شعر میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ روئے محبوب کے عکس سے شراب کی تابش ایسی معلوم ہوتی ہے گویا پیالے میں آفتاب نچوڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔

دوسرے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ تیرے خیال کی محویت نے مجھے نالہ و فغاں سے باز رکھا۔ گویا دل آگ کا ایک ٹکڑا ہے جس سے دھواں نہیں نکلتا۔

سچ پوچھئے تو نازک خیالی اور معنی آفرینی کے الفاظ ان ہی اشعار پر سجتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار کے لئے متذکرہ اصطلاحات استعمال کرتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ یہ اصطلاحات لفظی حیثیت سے جس قدر حسین اور خوش آہنگ ہیں معنوی اعتبار سے بھی اتنی ہی لطیف و دلکش ہیں۔

نازک خیالی اور مضمون آفرینی کی ایک اچھی مثال غالب کا یہ اُردو شعر بھی ہے ؎

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا　　ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

ایک معقول دعوے کے لئے ایک شاعرانہ دلیل پیش کی گئی ہے لیکن وہ بھی معقولیت سے خالی نہیں۔

نازک خیالی اور معنی آفرینی کی اور بھی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ غالب کا ایک شعر ہے:۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد

ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

یہاں دوسرے مصرعہ میں صرف ایک لفظ "صد" کے استعمال نے شعر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ اسے کہتے ہیں تخئیل کی نزاکت اور نکتہ آفرینی۔ غالب ہی کا ایک اور شعر یاد آیا ؎

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے

کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

نازک خیالی اور معنی آفرینی کا کتنا دلکش مرقع ہے! اس میں تخئیل کی جو لطافتیں پوشیدہ ہیں وہ تشریح کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔

یہاں غالب کے اشعار پیش کرنے سے میرا مقصود غالب اور مومن کا موازنہ نہیں بلکہ نازک خیالی اور معنی آفرینی کے صحیح مفہوم کی وضاحت کرنی ہے ـــ مومن کے کلام میں ایسے اشعار جو نازک خیالی اور معنی آفرینی کے صحیح معیار پر پورے اُترتے ہوں نایاب نہیں لیکن کمیاب ضرور ہیں اور جو کچھ ہیں ان کو مومن کے پرستاروں نے لائقِ التفات نہیں سمجھا ـــ یہاں میں صرف دو تین مثالیں پیش کرنے پر

اکتفا کرتا ہوں سے

ناصح کہاں تلک تری باتیں اُٹھا سکوں
سچ ہے کہ مجھ میں طاقت جور و ستم نہیں

شبنم خراب مہر و کتاں سینہ چاک ماہ
لو اب ہم بھی ستم زدۂ روزگار ہیں

دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش
وہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

(باقی)

نظیر صدیقی

(نگار) جناب نظیر صدیقی کے "تبصرۂ کلام مومن" کے متعلق ہم اپنی رائے اُس وقت پیش کریں گے جب یہ مقالہ تمام و کمال شایع ہو جائے گا۔

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

(فرمانروایانِ اسلام نمبر)

در اصل "تاریخ اسلامی" کا نچوڑ ہوگا، جس میں ولادتِ رسول اللہ سے لے کر اس وقت تک کی تمام چھوٹی بڑی مسلم حکومتوں کا ذکر ہوگا جو ۱۳ سو سال کے اندر تمام کرۂ ارض پر رونما ہوکر فنا ہوگئیں یا اب بھی باقی ہیں۔ اس میں ان تمام حکومتوں کے اسباب قیام و عروج اور انحطاط و اختتام کے ذکر کے ساتھ، تمام حکمرانوں کے نام، ان کی حکومت کی مدت بقید سن ہجری و عیسوی درج ہوگی اور یہ بتایا جائے گا کہ ایک ہی خاندان سے اور کتنے خاندان پیدا ہوئے، انھوں نے کہاں کہاں حکومتیں کیں اور ان کا کیا حشر ہوا

مسلمان اپنے زمانۂ عروج میں یوروپ، ایشیا، افریقہ کے ان بعید ترین گوشوں تک پہونچ گئے تھے جن کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کا علم بہت کم حضرات کو ہے۔ نگار کے اس سالنامہ کے ذریعہ سے "تاریخ اسلام" کی انھیں مفید و دلچسپ معلومات کو پیش کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ دو نقشے ایسے پیش کئے جائیں گے جن کو دیکھ کر مسلمانوں کے عروج و زوال کی تصویر آپ کے سامنے آجائے گی

یہ پورا سالنامہ خود اڈیٹر نگار مرتب کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ہم پہلی جنوری ۱۹۵۶ء تک اسے شایع کرسکیں گے اس کی ضخامت کا صحیح اندازہ ابھی نہیں ہوسکتا۔ اس کی بابت غالباً ہم آیندہ کچھ کہہ سکیں گے۔ امید ہے کہ آپ اس کی توسیع اشاعت میں ضرور حصہ لیں گے اور اپنے حلقۂ احباب، مدارس کے طلبہ و اساتذہ کو بھی اس سالنامہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کریں گے

یہ سالنامہ در اصل ایک مستقل کتاب ہوگی اور کتاب ہی سمجھ کر اس کو حاصل کرنا چاہئیے جو حضرات نگار کے خریدار نہیں ہیں اور صرف سالنامہ ہی لینا چاہیں گے ان کے لئے اس کی قیمت (علاوہ محصول ڈاک) تین روپے ہوگی۔

منیجر نگار

مالہ وماعلیہ

جگر کی ایک غزل

ماہنامہ سب رنگ شاہجہاں پور کے عید نمبر (۱۹۵۳ء) میں جناب جگر کی ایک غزل شایع ہوئی ہے۔ جو بہ حیثیت مجموعی بری نہیں ہے۔ لیکن اگر اٹھارہ اشعار کی پوری غزل شایع کرنے کی جگہ صرف انتخاب آٹھ نو اشعار کا شایع کیا جاتا اور باقی سقیم شعروں کو حذف کردیا جاتا تو بہتر تھا۔ غزل یہ ہے:-

۱۔ یہ راز ہم پر ہوا نہ افشا، کسی کی خاص اک نظر سے پہلے
کہ تھی ہماری ہی کم نگاہی ہمیں تھے، کچھ بے خبر سے پہلے

۲۔ ہر ایک شے غیر معتبر تھی، ترے غمِ معتبر سے پہلے
یہ زندگی خاک زندگی تھی گدازِ قلب و جگر سے پہلے،

۳۔ تجھے ہو سیرِ چمن مبارک مگر یہ رازِ چمن بھی سن لے
کلی کلی خون ہو چکی تھی شگفتِ گل ہائے تر سے پہلے

۴۔ کہاں کہاں اُڑ کے پہونچے شعلے یہ ہوش کس کو یہ کون جانے
ہمیں بس اتنا ہے یاد اب تک لگی تھی آگ اپنے گھر سے پہلے

۵۔ قفس کی نازک سی تیلیوں کی بھی کچھ حقیقت ہے ہمصفیرو
مگر اُلجھنا پڑے گا شاید خود اپنے ہی بال و پر سے پہلے

۶۔ کہاں یہ شورش کہاں یہ مستی کہاں یہ رنگینیوں کا عالم
زمانہ خواب و خیال سا تھا ترے فسونِ نظر سے پہلے

۷۔ خوشا یہ بیماریِ محبت زہے یہ خود داریِ طبیعت
وہی ہیں اب وقفِ دلنوازی وہی تھے جو بے خبر سے پہلے

۸۔ زمانہ مانے نہ مانے لیکن ہمیں یہی ہے یقین کامل،
جہاں اُٹھا کوئی تازہ فتنہ اُٹھا تری رہگذر سے پہلے

۹۔ اگرچہ ذوقِ نظارہ میں بھی ہزار ہا مستیاں بھری تھیں
مگر یہ بیباکیاں کہاں تھیں ترے حجابِ نظر سے پہلے

۱۰۔ اُٹھا جو چہرے سے پردۂ شب سمٹ کے مرکز پہ آگئے سب
تمام جلوے جو منتشر تھے طلوعِ حسنِ بشر سے پہلے

۱۱۔ مری طبیعت کو حسنِ فطرت سے ربطِ باطن نہ جانے کیا ہے
مری نگاہیں کبھی نہ اُٹھیں طہارتِ چشمِ تر سے پہلے

۱۲۔ وہ یادِ آغازِ عشق اب تک انیسِ جان و دلِ حزیں ہے
وہ اک جھجک سی وہ اک جھپک سی بہم التفاتِ نظر سے پہلے

۱۳۔ ہمیں تھے کیا جستجو کا حاصل ہمیں تھے کیا آپ اپنی منزل
وہیں پہ آکر ٹھہر گیا دل چلے تھے جس رہ گزر سے پہلے

۱۴۔ بس اک دل اور کیف و لذت بس ایک ہم اور جمالِ فطرت
یہ زندگی کس قدر حسیں تھی شعورِ فکر و نظر سے پہلے

۱۵۔ سفر تو اک شرطِ جستجو ہے مگر جو ہے شرطِ ہمرہی بھی
مرے جنوں کا بھی ساتھ دیگا یہ پوچھ لوں راہبر سے پہلے

۱۶۔ ہمارے شوقِ جنوں ادا کی ستم ظریفی تو کوئی دیکھے
کہ نامہ بر کو روانہ کرکے پہونچ گئے نامہ بر سے پہلے

۱۷۔ کہاں تھی یہ روح میں لطافت کہاں تھی کونین میں یہ وسعت
حیات ہی جیسے سو رہی تھی کسی کی پہلی نظر سے پہلے

۱۸۔ یہ نالہ کیوں ہے، یہ نغمہ کیوں ہے، یہ آہ کیسی یہ واہ کیسی
یہ پوچھ لے آئینے کے دل سے نہ پوچھ اپنے جگر سے پہلے

۱۔ پہلے شعر میں کوئی فنی نقص نہیں ہے۔ البتہ "خاص اک نظر" میں ہلکی سی تعقید ضرور ہے۔ اگر لفظ "اک" خاص سے پہلے

لایا جاسکتا تو بہتر تھا، لیکن چونکہ وزن کی مجبوری سے یہ ممکن نہ تھا اس لئے یہ پورا ٹکڑا بدلنا چاہئے تھا، اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا تو مناسب تھا۔

"یہ راز ہم پہ ہوا نہ افشا کسی کے لطف نظر سے پہلے"

مفہوم کے لحاظ سے بھی شعر میں تھوڑی سی الجھن پائی جاتی ہے۔ شعر کے الفاظ سے جو مفہوم پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "تیری نظرِ خاص کے بعد ہی ہم کو یہ معلوم ہوا کہ کم نگاہی اور بے خبری ہماری تھی"۔ لیکن یہ مفہوم ناقص ہے کیونکہ جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ کم نگاہی کا تعلق کس چیز سے تھا اور بے خبری کس بات سے تھی، مفہوم پورا نہیں ہوتا۔ اگر اس خلا کا پر کرنا ذہن سامع پر چھوڑ دیا جائے تو شعر کا مفہوم مختصراً یہ ہوگا کہ "کسی کی نظرِ خاص سے پہلے ہم کو یہ خبر نہ تھی کہ اسے بھی ہم سے لگاؤ ہے"۔ لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ محبت تو محبت کی نظر کے بعد ہی پہچانی جاسکتی ہے۔

۲- دوسرے شعر میں کوئی نقص نہیں۔ لیکن شعر کو مطلع بنانے کے لئے پہلے مصرعہ کا قافیہ غیر ضروری تھا۔ "ترے غم سے پہلے ہر ایک شے غیر معتبر تھی" کہنا بالکل کافی تھا۔ غم محبت کے لئے معتبر کی تخصیص کوئی معنی نہیں رکھتی۔

۳- تیسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "شگفتِ گل" کی ترکیب محل نظر ہے۔ فارسی میں کھلنے کے مفہوم میں ہمیشہ شگفتگی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ شگفتن کا حاصل مصدر شگفت اہلِ زبان میں رائج نہیں، اور دوسرے مصادر پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ شِگِفت (بہ کسرۂ شین و کاف) ضرور مستعمل ہے لیکن اس کے معنی حیرت و تعجب کے ہیں۔ سعدی کا شعر ہے:-

بخندید و انگشت بر لب گرفت
کزو ہرچہ آید نہ باشد شِگِفت

صاحب ہفت قلزم نے البتہ لکھا ہے کہ شگفت، پھول کھلنے کے معنی میں بھی آتا ہے، لیکن اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی، کسی صاحبِ زبان کے کلام میں شگفت کا استعمال، شگفتگی کے مفہوم میری نگاہ سے اس وقت تک نہیں گزرا۔

۴- چوتھا شعر صاف ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اب تک کا لفظ البتہ غیر ضروری ہے۔ محض وزنِ شعر پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔

۵- چھٹے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "خواب و خیال" کا فقرہ کمزور ہے۔ اس کی جگہ کوئی ایسا فقرہ ہونا چاہئے تھا جو خورش، مستی و رنگینی کا ضد ہوتا۔ محض "خواب و خیال" کہدینے سے تقابلی زور پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرا مصرعہ یوں ہوتا تو مناسب تھا:- "زمانہ بے کیف و رنگ سا تھا ترے فسونِ نظر سے پہلے"

۶- آٹھویں شعر کے پہلے مصرعہ میں لفظ "یہی" کا استعمال غیر ضروری ہے۔ پہلا مصرعہ یوں بھی ہوسکتا تھا:-

زمانہ مانے نہ مانے لیکن ہمیں ہے اس کا یقین کامل

دوسرے مصرعہ کا اندازِ بیان الجھا ہوا ہے۔ لفظ جہاں کہنے سے مصرعہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ "جس جگہ کوئی نیا فتنہ اٹھا وہ پہلے تری رہگزر سے اٹھا" حالانکہ یہ ممکن نہیں۔ جو تازہ فتنہ کسی جگہ سے اٹھے گا وہ پہلے کسی اور جگہ سے کیسے اٹھ چکا ہوگا۔ اگر جہاں کے بجائے جب یا جب کبھی ہوتا تو بیشک درست ہوسکتا تھا۔

۷- نویں شعر کے پہلے مصرعہ میں "بھی" کا استعمال بے محل ہے۔ اس کا استعمال اس وقت مناسب تھا جب دوسرے مصرعہ میں کوئی ایسا لفظ لایا جاتا جو "ذوقِ نظارہ" کے کسی اور ارتقائی منزل کو ظاہر کرتا۔

دوسرے مصرعہ میں "حجاب نظر" غور طلب ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ میرے ذوقِ نظارہ میں پہلے بھی بیتابیاں تھیں، لیکن تیرے حجاب نظر کے بعد (خواہ وہ حجاب یا پردہ شرم کا ہو یا کسی اور چیز کا) اس میں بیباکیاں بھی پیدا ہوگئیں۔ حالانکہ بیباکی کا موقع رفع حجاب کے بعد ہوتا ہے نہ کہ حجاب کے بعد۔ اگر "بیباکیاں" کے بجائے "بیتابیاں" ہوتا تو یہ عیب رفع ہوجاتا۔

- دسویں شعر میں "حُسنِ لبشر" کا فقرہ سمجھ میں نہیں آیا - ہو سکتا ہے کہ کاتب کی غلطی ہو اور "حسنِ سحر" کو اس نے "حسنِ لبشر" لکھدیا ہو - لیکن اس صورت میں حُسن کا لفظ بیکار ہو جائے گا - "طلوعِ سحر" کافی ہے -

٩ - گیارھویں شعر میں "طہارتِ چشمِ تر" بڑا دلچسپ ٹکڑا ہے - جگر صاحب نے لفظ طہارت بالکل فقہی معنی میں استعمال کیا ہے، جیسے آبدست اور استنجا بھی کہتے ہیں - جگر صاحب غالبًا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب تک آنکھیں آنسوؤں سے تر نہیں ہو گئیں مری نگاہیں حسنِ فطرت کے مطالعہ کے لئے نہیں اُٹھیں - اس میں شک نہیں خیال اچھا ہے، لیکن اسکو ادا کیا اس طرح جس سے چشمِ تر کی نجاست و طہارت کا مسئلہ زیادہ نمایاں ہو گیا جو ذم کا بہت برا پہلو ہے -

١٠ - تیرھویں شعر میں ایک معنوی نقص ہے جس کی طرف جگر صاحب کی نگاہ نہیں گئی - پہلے مصرعہ میں انھوں نے اپنے ہی آپ کو جستجو کا حاصل اور اپنی منزل ظاہر کیا ہے، اور اس کا ثبوت یہ دیا ہے کہ دل جس رہگزر سے چلا تھا آخر کار وہیں آکر ٹھہر گیا - حالانکہ اس صورت میں رہگزر "مرکز و منزل" قرار پائے گی جہاں دل جاکر ٹھہرا تھا نہ کہ شاعر - عاشق خاک رہگزر تو ہو سکتا ہے لیکن رہگزر نہیں -

١١ - چودھویں شعر کا دوسرا مصرعہ بہت صاف و پاکیزہ ہے لیکن پہلے مصرعہ میں وہ سلاست و روانی نہیں ہے - بس ایک دل اور بس ایک ہم کی تخصیص نے خیال کی وسعت کو بھی کم کر دیا -

١٢ - پندرھویں شعر کا دوسرا مصرعہ بہت صاف ہے، لیکن پہلے مصرعہ کو لفظ جو نے خراب کر دیا - پہلا مصرعہ تھوڑی سی تبدیلی چاہتا ہے :- "سفر تو بس شرطِ جستجو ہے، مگر ہے اک شرط ہمرہی بھی"

١٣ - سترھویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں - "حیات ہی" میں ہی بیکار ہے - مصرعہ کا پہلا ٹکڑا یہ ہوتا تو بہتر تھا :-

"حیات گویا کہ سو رہی تھی"

١٤ - مقطع کے دوسرے مصرعہ میں "پوچھ لے" کا لے بیکار ہے - صرف پوچھ ہونا چاہئے علاوہ اسکے آئینہ کا دل بھی کچھ نہیں - "اپنے آئینہ سے" کہنا چاہئے تھا -

---

قدرت کی ایک خاموش مخلوق

کروروں سال زمین پر ایسے گزرے ہیں جب اس پر کسی جاندار کا نام ونشان تک نہ تھا، اس طویل عرصہ میں جس کا اندازہ لگانے سے عقل انسانی بالکل قاصر ہے، زمین بالکل مشتعل حالت میں آگ کا ایک کرہ تھی اور کسی قسم کی زندگی کا وجود میں آنا ناممکن تھا، اس حالت پر کروروں سال گزر جانے کے بعد رفتہ رفتہ اُس کی بیرونی سطح ٹھنڈی ہونے لگی اور اس آتشیں کرے پر ایک خول سا جمنے لگا جس کو علم طبقات الارض میں "قشرالارض" (یعنی زمین کا چھلکا) کہتے ہیں۔

یہ چھلکا کئی مرتبہ بنا اور ٹوٹا، لیکن دبازت بڑھتی گئی، اور پگھلے ہوئے مادے کی تہیں ایک دوسرے پر جمتی چلی گئیں، غار اور گڑھے جو متعدد بار اندرونی حرارت کے زور مارنے اور مادے کو کہیں توڑنے اور کہیں اُبھارنے سے پیدا ہوگئے اُن میں پانی بھر گیا، لیکن اب بھی اندرونی گرمی کی شدت سے بخارات کی کثرت تھی اور زمین پر گیس ہی گیس چھائی ہوئی تھی، امتداد زمانہ سے جب حرارت میں کمی واقع ہوئی اور قشرالارض اعتدال کی طرف قریب ہوا تو سب سے پہلی جاندار چیز وجود میں آئی، لیکن ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ یہ زندہ چیز کہاں سے اور کس طرح پیدا ہوئی اور نہ یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ اُس چیز کی حقیقت کیا تھی۔

تخلیق حیات کی ابتدائی تاریخ بالکل مجہول ہے، البتہ محتاط نظریہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ سب سے پہلے وجود میں آنے والی چیز ازقسم جراثیم تھی۔ اس کے ساتھ ہم ایک اور بات یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ زندہ چیز نہ تو قطعی طور پر حیوان کہی جاسکتی تھی اور نہ نبات، گویا یہ جاندار اس تردد میں تھے کہ وہ نباتی زندگی اختیار کریں یا حیوانی، ایک حیثیت سے وہ نباتات سے قریب تر ضرور تھے اور وہ یہ کہ وہ اپنی غذا پانی، کاربانک ایسڈ گیس (کاربن ڈائی آکسائڈ) اور اُس نمک سے حاصل کرتے تھے جو سمندر کے پانی میں پایا جاتا ہے، اور وہ اس قابل تھے کہ اُس قوت سے کام لیں جو آفتاب کی روشنی میں پائی جاتی ہے تاکہ وہ سادہ قسم کے مادوں سے کاربن کمپاؤنڈ بناسکیں۔

تمام زندہ چیزوں کے شجرۂ نسب کو ایک مشجر قسم کا حرف [illegible] بناکر سمجھنا آسان ہوگا اس حرف کے داہنے بازو کو حیوانی ارتقا کی لائن سمجھنا چاہئے، اور اُس نقطہ کو جہاں سے دونوں بازو شروع ہوتے ہیں پہلا جاندار فرض کرنا چاہئے جس سے ایک طرف حیوانات کا اور دوسری طرف نباتات کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ہر بازو سے جو چھوٹی چھوٹی شاخیں نکلتی ہیں وہ حیوانات اور نباتات کی مختلف انواع ہیں جو ارتقائی سلسلہ میں پیدا ہوتی چلی گئی ہیں، اس شکل میں حیوانی بازو کو نباتی سے بہت زیادہ لمبا بنانا چاہئے، کیونکہ حیوانات کا تنوع نباتات کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ایک گلہری اور ایک آم کے درخت میں بڑا فرق ہے لیکن یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ ابتدائی حیوان اور نباتات میں کب سے فرق پیدا ہوا مثلاً اسفنج (حیوان کی ابتدائی شکل) اور مشروم (دکھرتا سادہ قسم کے ابتدائی نباتات) نے کس طرح ایک دوسرے سے علحدہ لائن اختیار کی، اور اس سے زیادہ یہ بات معلوم کرنا مشکل ہے کہ ایک خلیہ ([illegible]) والا جاندار نباتات میں شامل ہے یا حیوانات میں، خاص طور پر جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض سادہ قسم

کے حیوانی جاندار اپنے اندر سبز رنگ والے مادے کلوروفیل (chlorophyll) کو جمع رکھ سکتے ہیں جو تقریباً ہر پودے کی خصوصیت ہے ۔

مذکورۂ بالا V کے اُس نقطہ پر جہاں سے اُس کے دونوں بازو شروع ہوتے ہیں ایسے جاندار رکھنا چاہئے جن کو نہ یقینی طور پر حیوان کہا جاسکتا ہے اور نہ نبات ایسے جانداروں کو اصطلاح میں (Protista) کہتے ہیں ۔

کروروں سال گزر جانے پر ایک خلیہ والے جاندار میں کلوروفل پیدا ہوا جو ایک غلاف میں بند تھا جس کو اصطلاح میں " سلیولوس " Cellulose کہتے ہیں اور اُس کے اندر شکر (نشاستہ) اور کاربن کے دوسرے مرکبات پیدا ہونے لگے ، اور اسی کو ہم سب سے پہلا پودا کہہ سکتے ہیں ، لیکن یہ پودے ایک جگہ قایم نہیں تھے بلکہ سمندر میں آزادی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ بہے پھرتے تھے اور نہایت معمولی و سادہ قسم کی کیمیائی مرکبات پر زندہ رہ سکتے تھے ، جن کی طیاری میں سورج کی روشنی مدد کرسکتی تھی ۔

اس میں شک نہیں کہ حیوانات کی ابتدا بہت سادہ قسم کے جانوروں سے ہوئی ہے اور حیوانات و نباتات نے اُسی وقت ایک دوسرے سے علیحدہ ہونا شروع کیا ، جب نباتات کی ایک قسم نے اپنے لئے خود غذا پیدا کرنا چھوڑ دیا اور دوسرے نباتات کی طیار کردہ غذا پر زندہ رہنے کی عادت اختیار کرلی ۔ یہیں سے حیوانی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے ، حیوان اور نبات میں یہی فرق ہے کہ نباتات اپنی غذا اپنی ضرورت سے زیادہ خود ہی اپنے اندرونی کیمیاوی عمل سے پیدا کرلیتے ہیں ، اور حیوانات خود غذا اپنے اندر فراہم نہیں کرتے بلکہ نباتات کی طیار کردہ غذا پر زندہ رہتے ہیں

حیوانات اور نباتات کے مذکورہ دونوں بازو V جتنا آگے بڑھتے ہیں اُتنا ہی ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہیں یعنی ارتقائی رفتار میں اُن کا درمیانی فرق بڑھتا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض نباتات میں حیوانات اور بعض حیوانات میں نباتات کی خصوصیات پائی جاتی ہیں ، بعض ایسے پودے ہیں جو کیڑے مکوڑوں کا شکار کرکے اپنی غذا بنا لیتے ہیں ۔

اسی طرح بہت سی نباتی خصوصیات بعض جانوروں میں ملتی ہیں ، اسفنج اور مونگا ان کی مثالوں میں پیش کیا جاسکتا ہے یہ در اصل سمندری جانور ہیں ، لیکن اُن کا جسم بہت کم حرکت کرنے اور شاخ در شاخ ہونے میں درختوں سے مشابہ ہے ، خاص کر جب کہ وہ چھوٹے ہوں تو یہ مشابہت اور بھی بڑھ جاتی ہے ، اِن کے حرکت کرنے والے جانوروں میں بہت سے ایسے ہیں جو اپنے اندر ایک بڑا غذائی ذخیرہ جمع کرلیتے ہیں جو ضرورت کے وقت اُن کے کام آتا ہے ، یا اُن کی اولاد کو میراث کے طور پر مل جاتا ہے ۔

نباتی خصوصیات رکھنے والے بعض جانور ایسے ہیں کہ درختوں کی طرح ماحول کے ناموافق ہونے سے اُن کا ایک حصّہ مردہ ہوجاتا ہے اور باقی زندہ رہتا ہے ، اور بعض ایسے ہیں جو مرنے کے بعد اپنے اندر درختوں کے بیج کی طرح جرثومۂ حیات قایم رکھتے ہیں ، جو سخت سے سخت سردی میں بھی زندہ رہتا ہے اور اُسی سے اُن کی آیندہ نسل کا تسلسل قائم رہتا ہے ۔

بعض سبز رنگ کے ایسے جانور بھی پائے جاتے ہیں جن کی سبزی اس وجہ سے نہیں ہے کہ خود اُن کے اندر کلوروفیل پایا جاتا ہے بلکہ یہ سبزی اصل میں اُن چھوٹے چھوٹے نباتی مادہ کی وجہ سے اُن کے خلایہ میں پایا جاتا ہے ۔

نباتات کی دنیا بہت وسیع ہے اور مشکل سے کوئی جگہ ایسی ہوسکتی ہے جہاں نباتات کا وجود نہ ہو حتی کہ برف

کے عظیم الشان تودوں پر بھی ایک سُرخ قسم کی نباتی چیز ہوتی ہے جس کو اصطلاح میں Red Snow کہتے ہیں اور بعض سادہ قسم کے پودے گرم چشموں میں پائے جاتے ہیں، بلکہ ڈاکٹری تحقیقات نے تو یہ ثابت کردیا ہے کہ انسان کی غذا کی نالی میں بھی ایک نباتی مادہ پیدا ہوتا ہے جس کو " Flora of food canal " کہتے ہیں۔

عالمِ نباتات ہر طرف حُسن سے معمور ہے، خاص کر پھولوں کی دُنیا تو حُسن سے بھری پڑی ہے، اگر آپ اُن پودوں کو دیکھیں جو سمندر کی تہ میں پیدا ہوتے ہیں، تو آپ اُن کے رنگ اور شکلوں کو دیکھ کر حیران رہ جائیں۔

یہ نباتات کے حُسن کا پہلو ہے، اب ذرا ان کی عظیم الشان طاقت کو غور کیجئے، عام طور پر ہم طاقت کا یہ مفہوم سمجھتے ہیں کہ ایک پہلوان بڑے سے بڑا وزن اُٹھا سکے، لیکن ہم یہ غور نہیں کرتے کہ ایک تناور درخت کس طرح ہزاروں من کا وزن زمین کی کشش کے خلاف اُٹھائے رہتا ہے۔ ہم ڈائنامیٹ کی توڑ پھوڑ والی طاقت کو بڑی حیرت سے دیکھتے ہیں لیکن اُس طاقت کی طرف ہمارا ذہن منتقل نہیں ہوتا جو ایک بڑے درخت کی جڑوں میں پائی جاتی ہے، اُسکی جڑیں کس طرح زمین کو چیرتی ہوئی غذا کی تلاش میں کہاں سے کہاں پہونچ جاتی ہیں، کس طرح زمین کو پھاڑتی ہوئی چٹانوں سے لپٹتی ہوئی اپنا کام پورا کرتی رہتی ہیں۔ ہم کو اُن بڑے بڑے کارخانوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، جن میں عظیم الشان مشینیں سیکڑوں آدمیوں کی مدد سے کیمیاوی اجزا کی ترکیب و تحلیل کا کام شور مچاتے ہوئے انجام دیتی رہتی ہیں لیکن ہم اُس کارخانہ سے غافل ہیں جو ہر ایک سبز پتے میں خاموشی کے ساتھ یہی کام کرتا رہتا ہے۔

نباتات کی نشوو نما کے لئے اُن کا ماحول سازگار ضرور ہے، پانی، کُہر، بادل، ہوا وغیرہ بہت سی چیزیں درختوں کو مدد پہونچاتی ہیں لیکن اِن تمام مادوں کی فراوانی کے باوجود نباتات کو اپنا وجود قایم رکھنے کے لئے بڑے جدو جہد کی ضرورت پیش آتی ہے، کیونکہ جس ماحول میں وہ پرورش پاتے ہیں وہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے اور بعض نباتات ان تبدیلی کو برداشت کرکے زندہ رہتے ہیں، بعض مرجاتے ہیں

جس طرح کہ موسم کی مناسبت سے ہم اپنے لباس میں تبدیلی کرتے رہتے ہیں، اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ پودے اپنے اندر اختلاف موسم کو برداشت کرنے کے لئے تبدیلی کرتے ہیں، جن مقامات پر بارش زیادہ ہوتی ہے، اور اُس کے بعد زیادہ عرصے تک پانی نہیں برستا وہاں بعض پودے ایسے ہوتے ہیں جن کے جسم میں پانی جمع رکھنے کے خلایا پائے جاتے ہیں، بعض پودوں کی کھال موسم کی سختی برداشت کرنے کے لحاظ سے موٹی اور پتلی ہوتی رہتی ہیں، بعض اس ضرورت کے تحت اپنے پتے کم کردیتے ہیں، اور بعض کے تنوں کی سبزی گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے، بعض پودوں پر موسم سرما کی سختی برداشت کرنے کے لئے اون کی طرح ریشہ دار چیز اُن کے پتوں اور شاخوں کو چھپائے رہتی ہے۔

نباتات میں اپنی نسل کو قایم رکھنے اور بڑھانے کا طریقہ حیوانات سے کہیں زیادہ کامیاب ہے، بعض درختوں کے بیج اس کثرت سے ہوتے ہیں کہ ایک پودا ایک مرتبہ ساڑھے ساتھ لاکھ سے زیادہ بیج پیدا کردیتا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر اُس کے ہر بیج کو درخت بن جانے کا موقع دیا جائے تو اُس کی آیندہ نسل تمام روئے زمین پر چھا جائے لیکن ایسا نہیں ہوتا اس لئے کہ جہاں ماحول پودوں کے پیدا ہونے کے لئے سازگار ہے وہاں مخالف طاقتیں بھی پائی جاتی ہیں، بیج کی کثرت میں مصلحت صرف اس قدر ہے کہ درخت کی نسل قایم رہے۔

حیوانات اور نباتات کو اپنی ہستی قایم رکھنے کے لئے غذا کی ضرورت ہے، یہ بات ہم ابھی معلوم کرچکے ہیں کہ سبز درخت کاربن ڈائی آکسائڈ پر زندہ رہتے ہیں جو ہوا میں پایا جاتا ہے اور پتوں کے ذریعہ نباتات کی غذا

بن جاتا ہے، اسی طرح وہ پانی پر زندہ ہیں جس کو وہ عام طور پر جڑوں کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں، اور مختلف قسم کے نمکوں پر جو جڑوں کی مدد سے پانی کے ساتھ زمین سے چوستے ہیں، عام طور پر یہ سادہ غذائیں کثرت سے پائی جاتی ہیں، لہذا اس قسم کی غذا کے لئے جدو جہد کے یہ معنی ہیں کہ ان کی آمد قایم رہے اور اپنے ہم جنس درختوں سے اُس کے حصول میں مقابلہ ہوتا رہے۔

بعض دلدل کی جگہوں پر جہاں ہر وہ مادہ نہیں پایا جاتا جس سے نباتات غذا حاصل کرتے ہیں وہاں کے نباتات اس کی کمی کو ایک عجیب طریقہ سے پورا کرتے ہیں" ایسے مقامات کے اکثر پودے کیڑے مکوڑوں کا شکار کرکے اُن کو اپنی غذا بنا لیتے ہیں۔

اب ہم ذرا تفصیل سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ درختوں کو اپنی زندگی قایم رکھنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ حیوانات کے مقابلہ میں درخت بالکل ساکن نظر آتے ہیں اس لئے ہم اُن کی قوتِ عمل کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے حالانکہ ان کو جڑوں اور پتوں کے ذریعہ غذائی مادہ حاصل کرنے اور اُس کو ہضم کرنے میں بڑا کام کرنا پڑتا ہے وہ اس طریقہ پر مادۂ خام حاصل کرکے اُس کو کاربن کمپاؤنڈ — شکر اور اسٹارچ (نشاستہ) دُہنیت، اور پروٹین میں تبدیل کردیتے ہیں اور اپنی اس طیار کردہ غذا کو اپنا وجود قایم رکھنے، اُس کو بڑھانے اور ذخیرہ جمع رکھنے کیلئے کام میں لاتے ہیں، ایک سبز درخت کا بڑا کام یہ ہے کہ زندگی قایم رکھنے والے مادے کو بڑھاتا رہے، آپ املی کے یا بڑ کے ایک عظیم الشان درخت کو لیجئے، ایک ذرا سے بیج سے ابتدا میں ایک ننھا سا پودا پیدا ہوتا ہے لیکن وہی پودا غذا حاصل کرنے کے عمل کو مسلسل جاری رکھتے ہوئے ایک زبردست بلند اور تناور درخت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ دریائی پودوں کو غذا حاصل کرنے کے لئے بہت کم جڑوں کی ضرورت پیش آتی ہے، کیونکہ وہ اپنے پتوں اور شاخوں کے ذریعہ اپنی سادہ غذا پانی سے حاصل کرلیتے ہیں اور جن دریائی پودوں میں جڑیں نکل آتی ہیں زیادہ وہ ایک جگہ لنگر انداز ہوجاتے ہیں، تاکہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہ نہ جائیں لیکن خشکی کے درختوں کے لئے جڑ بڑی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ وہ اُس کے ذریعہ زمین سے غذا حاصل کرتے، اور اُسی کے زمین میں جمے رہنے سے وہ کھڑے رہتے ہیں۔

جڑ کا سرا نہایت صاف اور نازک ہوتا ہے، ہمیشہ تازہ رہتا ہے اور بڑھتا رہتا ہے، وہ ہر وقت زمین میں اپنے لئے راستہ نکالنے کی کوشش کرتا ہے، بڑھنے والے سرے سے کچھ پیچھے بال جیسی چیز ہوتی ہے جو زمین سے پانی چوستی ہے — اب پتوں کو لیجئے۔ ہر سبز پتہ دنیا میں ایک زبردست کارخانہ ہے۔ یہ کارخانہ اس لحاظ سے بھی بڑا اہم ہے کہ حیوانی اور انسانی زندگی کا تمام تر انحصار اُن غذائی مادوں پر ہے جس کو سبز پتہ طیار کرتا ہے، ہر پتہ ایک زندہ "ٹیشو" (Tissue) کی چادر ہے، حجم کے لحاظ سے بعض پودوں کے پتے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ بغیر خوردبین کی مدد کے اُن کا دیکھنا ناممکن ہے اور بعض درختوں کے پتے چھ فٹ تک لمبے پائے گئے ہیں۔

پتے کے اندر ایک زبردست رگوں کا جال ہوتا ہے، اگر کسی پتہ کو روشنی کے مقابل دیکھیں تو یہ جال صاف طور پر نظر آئے گا۔ پتے کی ڈنڈی جو شاخ سے لگی رہتی ہے، اُسی کے ذریعہ اِن رگوں میں غذائی مادہ جڑوں سے آتا ہے اور اُسی کے ذریعہ واپس جڑوں تک پہونچ جاتا ہے۔

محمود علی خاں

"گاہے گاہے باز خواں"

دشمنِ اسلام کون ہے؟

مذہب یا دین اگر کوئی ایسی حقیقت ہے جو خدا کی طرف سے ظاہر کی گئی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حقیقت کبھی بدل سکتی ہے اور کیا خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ حقیقت تک پہونچنے میں وہ موانع حایل کرتا رہے۔

آپ کسی پابند مذہب شخص سے سوال کیجئے تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ مذہب یقیناً خدا کی ظاہر کی ہوئی حقیقت ہے اور وہ کبھی اس کو پسند نہیں کرتا کہ انسان حقیقت تک پہونچنے سے باز رکھا جائے۔

اچھا اب آپ مختلف مذاہب والوں سے علحدہ علحدہ پوچھئے کہ جب مذہب خدائی حقیقت ٹھہرا تو اس میں تنوع کی کیا ضرورت تھی اور اس نے مختلف مذاہب پیدا کرکے انسان کو کیوں اُلجھن میں ڈال دیا —— اس کا جواب ایک آتش پرست یہ دیگا کہ حقیقت تو ایک بار زردشت کے ذریعہ ظاہر کی جاچکی ہے —— ایک یہودی کہے گا کہ حقیقت تو صرف موسوی تعلیم کا نام ہے ایک عیسائی دعویٰ کرے گا کہ صداقت کی تبلیغ تو صرف عیسیٰ نے کی، اسی طرح بودھ مت والا، بودھ کی تعلیمات کو، ایک ہندو کرشن کی ہدایات کو اور ایک مسلمان محمد کے بتائے ہوئے معتقدات کو حقیقت و صداقت سے تعبیر کرے گا اور باقی تمام مذاہب کو حقیقت سے دور ظاہر کرکے لغو و باطل قرار دے گا۔

اب غور کیجئے کہ ایک شخص جو مذہب کے خیال سے بالکل خالی الذہن ہے یہ سُن کر کیا اثر قبول کرے گا۔ وہ اگر زیادہ آزادی سے کام لیکر سب کو لغو نہ کہدے گا تو وہ تحقیق و جستجو ضرور کرے گا تاکہ خود کوئی فیصلہ کرکے کسی ایسے نتیجہ پر پہونچے جو اسکے لئے قابل قبول ہو اچھا آیئے ہم آپ بھی بالکل خالی الذہن ہوکر جستجو کریں کہ صداقت کس مذہب کی تعلیمات میں پائی جاتی ہے اور مذہب کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ کسی مذہب کو خدا کی بتائی ہوئی حقیقت و صداقت کہنا کیا معنی رکھتا ہے، اس کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ خدا براہ راست اپنے خدائی الفاظ اور اپنی الٰہانہ زبان میں اس کی تلقین فرمائے یا اپنے کسی خاص بندے میں غور و تامل کی غیر معمولی کیفیت پیدا کرکے اصول مذہب وضع کرنے کی طرف مایل کرے، بہرحال جو صورت بھی ہو اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذہب کی صداقت کا تعلق ماحول و زمانہ سے ہوا کرتا ہے اور وقت و حالات کے لحاظ سے اس میں تغیر و تبدل ہونا ضروری ہے کیونکہ مذہب نام ہے اُن اُصول کا جو اصلاح اخلاق و معاشرت کے کام آئیں اور چونکہ اخلاق و معاشرت کے معیار کا امتداد زمانہ کے ساتھ بدل جانا ضروری ہے اس لئے وقتاً فوقتاً اصول مذہب کا تغیر بھی لازم ہے۔

انھیں اصول زندگی پر لوگوں کو مستحکم کرنے کے لئے بعض معتقدات دینی وجود میں آئے جو لوگوں کو معاشرتی پابندی پر مجبور کرنے کے لئے ذریعہ و وسیلہ کا کام دیتے تھے، مثلاً یہ کہ جو قانون پیش کیا جاتا ہے وہ خدا کا نازل کیا ہوا ہے اور جس شخص کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے وہ خدا کا خاص بندہ ہے اور معجزات کا مالک ہے یا یہ کہ جو شخص اس کی پابندی کرے گا اُسے مرنے کے بعد طرح طرح کے نعائم و لذائذ حاصل ہوں گے اور جو پابندی نہ کرے گا وہ آگ میں ڈالا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ ایک شخص جو صرف ان معتقدات کا ماننے والا ہے اور ان سے آگے بڑھکر اپنے اخلاق کو متاثر نہیں ہونے دیتا، بہ لحاظ نتیجہ
ں کے یہ دینی عقاید بالکل بیکار ہیں، کیونکہ مقصود تو شارع کا جسے آپ نبی، رسول، مرشد، رشی، دیوتا وغیرہ کے نام سے پکارتے ہیں،
ہی نہیں ہوا اور عقاید محض عقاید ہونے کے لحاظ سے انسانی زندگی کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

الغرض اصل مقصود صرف اصلاح اخلاق و معاشرت ہے اور اس کے حصول کے لئے بعض غیر معمولی دماغ رکھنے والے لوگوں
دین یا شریعت کو رائج کرکے بعض مخصوص عقاید پیدا کئے تاکہ لوگوں کو ترغیب و تخویف سے حقیقی مدعا کی طرف لا سکیں۔

اس جگہ یہ سوال اُٹھانا کہ عقاید دینی کوئی حقیقت نہیں رکھتے تو کیا انبیاء نے ان کو حقیقت ظاہر کرکے غلط بیانی سے کام نہیں
، درست نہیں، کیونکہ اول تو اس امر کا امکان ہے کہ اُن میں سے اکثر نے اُن عقاید کو واقعی حقیقت باور کرکے پیش کیا ہو اور
سرے یہ کہ اگر بعض نے ایسا نہیں سمجھا تو دوسروں کی اصلاح کے لئے ایسا کرنا قرین مصلحت جانا ہوگا اور مصلحت کے لحاظ سے کوئی
ت ایسی کہہ دینا جو واقعہ کے خلاف ہو کبھی موردِ الزام نہیں ہو سکتا — وہ عقاید دینی جو آج معرض بحث میں ہیں، زیادہ تر
بعد الطبیعیات سے متعلق ہیں، یا خدا کے مفہوم سے، یعنی اہلِ مذاہب ایک بات تو یہ کہتے ہیں کہ حقیقی زندگی تو مرنے کے بعد ہی
روع ہوگی اور وہاں عذاب و ثواب، دوزخ و جنت وغیرہ کے معاملات پیش ہوں گے اور دوسری یہ کہ خدا نام ہے ایک ایسی ہستی
جس نے تمام عالم کو اس طرح پیدا کیا جس طرح ایک صناع اپنے قایم کئے ہوئے ارادہ کے ساتھ کسی چیز کو طیار کرتا ہے اور وہ
ا قادر ہے، جس وقت جو چاہے تغیر و تبدل کرکے کائنات کے نظام کو بدل دے۔

آپ اگر جستجو کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ عقاید مع تمام جزئیات کے کسی ایک قوم یا مذہب سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ کم و بیش ہر
ں قوم یا ملک میں پائے جاتے ہیں، جہاں کوئی مذہب پایا جاتا ہے، اس لئے یہ امر غور طلب ہے کہ مہمات عقاید دنیا کی تمام مذہبی قوموں
ں کیوں تقریباً ایک ہی سے پائے جاتے ہیں اور وہ کون تھا جس نے اول اول اُن کو حقایق جان کر پیش کیا۔ ہر چند امر ثانی کی کوئی تعیین
شوار ہے لیکن امر اول کی نسبت یہ کہنے میں قطعاً تامل نہیں ہو سکتا کہ ہر جدید مذہب نے اپنے ماسبق مذہب کے معتقدات سے فایدہ اُٹھایا
ور یہ سلسلہ عہدِ قدیم تک پہونچ کر اس زمانۂ وحشت تک پہونچ جاتا ہے، جب انسان کے تجربات دُنیا میں بہت تھوڑے تھے اور اس کا علم محدود و
اقص و نامکمل تھا — مثلاً آپ جنّت اور حور و غلمان کو لے لیجئے، کیا کوئی مسلمان دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسلام سے قبل یہ خیال یا
قیدہ کسی اور مذہب میں نہ پایا جاتا تھا — اگر آپ قدیم ایرانی اور آرین لٹریچر کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ تقریباً یہی عقیدہ
س زمانہ میں بھی پایا جاتا تھا، فارسی زبان میں ایک لفظ پری ہے جو قدیم ایرانی زبان میں "پیرک" تھا اور پیروانِ زردشت کا عقیدہ
ھا کہ یہ آسمانی دیویاں ہیں جو ہوا میں رہتی ہیں اور اس قدر جمیل ہیں کہ ان کو دیکھتے ہی انسان فریفتہ ہو جاتا ہے، چنانچہ خود عربی کا لفظ
ردوس، ایرانی لفظ ہے — لفظ حور کے متعلق ہمارے علماء کا خیال ہے کہ وہ خالص عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی میں سفیدی و
اکیزگی کا مفہوم غالب ہے، درآنحالیکہ اس کا ماخذ اوستا کا لفظ "ہورہ" ہے جسے پہلوی زبان میں ہور اور موجودہ فارسی میں خور کہتے ہیں
جس کے معنی نور، روشنی اور مجازاً آفتاب کے ہیں۔ حور و غلمان کا عقیدہ ہندوؤں میں بھی پایا جاتا ہے اور ان کے لئے اپسرائیں اور گندھرب
کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں — کسی غزوہ میں مارے جانے پر شہید ہونے اور جنت میں جانے کا خیال بھی آرین خیال ہے۔ چنانچہ
دھرم شاستر میں لکھا ہے کہ "جنگ میں جو لوگ بہادری سے لڑتے ہیں اور پیٹھ نہیں دکھاتے وہ بہشت میں جاتے ہیں،" اسی طرح اندر لوک
سے جس وقت خطاب کرتا ہے تو بہشت کا ذکر کرتا ہے — اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ازل میں تمام روحیں پیدا ہو چکی تھیں
اور انھوں نے "قالو بلیٰ" کہا تھا — پارسیوں کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں اوستا میں اس کے لئے لفظ "فروشی"
پایا جاتا تھا، اور پہلوی زبان میں اس کو "فروہر" کہتے ہیں۔ الغرض یہ عقیدہ کہ روحیں پہلے سے موجود ہیں۔ مجوس کے یہاں پایا جاتا تھا
اسی طرح ملک الموت کا خیال بھی مجوس کا خیال ہے اور اُن کے یہاں بھی ایک فرشتہ "استوویہ ہوتس" کے نام سے پایا

جاتا تھا جو روح کو جسم سے جُدا کرتا تھا ــــ عزرائیل کے متعلق مسلمانوں میں جو روایات پائی جاتی ہیں وہ بھی بہت کچھ قدیم ایرانی روایات سے ملتی جلتی ہیں اور آدم و ابلیس، سانپ اور طاؤس کے متعلق جو کچھ مسلمانوں میں بیان کیا جاتا ہے وہ بھی مجوسی روایات میں نظر آتا ہے، اسی طرح میزان، صراط، نور محمدی، حشر و نشر، حساب و کتاب، دوزخ و جنت وغیرہ کے متعلق جو اعتقادی مسایل اسلام میں پائے جاتے ہیں وہ قبل اسلام بھی بعض مذاہب میں پائے جاتے تھے اور اگر تمام مذاہب کی چھان بین کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک وقت نامعلوم سے یہ خیالات نوعِ انسانی میں پرورش پاتے چلے آرہے ہیں اور انسان کی بالکل ابتدائی ذہنی نشو و نما کی یادگار ہیں ــــــــ ابتدائے عہدِ انسانی میں جب کوئی شخص غیر معمولی عقل و ذہانت رکھنے کی وجہ سے اپنے قبیلہ کا سردار بن جاتا تھا تو اس پر دو فرض عاید ہوا کرتے تھے، ایک یہ کہ وہ قبیلہ کے تمدنی و معاشرتی نظام کو قایم رکھے اور دوسرے یہ کہ وہ افراد قبیلہ کے دل میں پیدا ہونے والی اُلجھنوں کو دور کرے۔

لوگ رات کو خواب دیکھتے تھے اور اس سے آکر پوچھتے تھے کہ اس کا کیا مطلب ہے، کوئی مرجاتا تھا تو اس سے دریافت کیا جاتا تھا کہ وہ کہاں گیا، کسی کو کوئی مرض لاحق ہوتا تھا تو اس سے استصواب کیا جاتا تھا، الغرض اُن کی ہر خواہش و جستجو کا مرکز سردار قبیلہ ہوا کرتا تھا اور اُسے اپنا منصب قایم رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی جواب دینا پڑتا تھا ــ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی قائدانہ حیثیت ضعیف ہوجاتی اور قبایلی نظم و نسق میں وہ کامیاب نہ ہوسکتا ــــ پھر چونکہ مرنے والوں کے ساتھ زندگی میں محبت و رفاقت کا جذبہ متعلق ہوتا تھا اور ان کی جدائی سے لوگوں کو تکلیف پہونچا کرتی تھی، اس لئے بقاء روح کے خیال سے اُن کو تسکین دی گئی اور روح کو عذاب و ثواب کا محل قرار دے کر ترغیب و تخویف کی وہ صورتیں اختیار کی گئیں، جو اصلاح قبایل اور اصول معاشرت کے قیام کے لئے ضروری تھیں۔

اس میں شک کرنے کی گنجایش نہیں کہ جتنے مذہبی معتقدات دنیا میں پیدا ہوئے وہ سب نتیجہ ہیں قیاس کا اور چونکہ قیاس کا تعلق موجودات کے تصورات سے ہوا کرتا ہے اس لئے حیات بعد الموت کے متعلق بھی ایک انسان نے اپنے قیاس سے کام لے کر وہی باتیں کیں جو دُنیاوی زندگی میں پیش آتی ہیں ــــ خدا کا وہی قہرمانی تصور جو دُنیاوی بادشاہوں کا ہوا کرتا ہے، اس کا وہی مختار کل ہونا جو ایک مستبد حکمرانِ انسان کی خصوصیت ہے۔ بہشت میں انھیں لذایذ و نعائم کا ذکر کرنا جن کی خواہش دنیا میں ہوا کرتی ہے اور دوزخ کے وہی دل دہلا دینے والے مناظر بیان کرنا، جن سے عالم آب و گل میں ایک انسان پر دہشت طاری ہوجاتی ہے۔ یہ سب اسی قیاس کی بنا پر تھے جو تجرباتِ دُنیا کے سلسلہ میں قایم کیا گیا اور جس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا ــــ مثلاً آپ اسلام ہی کو لیجئے کہ جس سرزمین میں اس کا ظہور ہوا وہاں کے باشندوں کی کیا حالت تھی دنیاوی لذایذ و نعایم میں عورت، شراب، دودھ، شہد اور فواکہ ان کا انتہائی نقطۂ نظر تھا اور ان کی قساوت و سنگدلی کا یہ عالم تھا کہ گرم پتھروں پر لٹا لٹا کر ایک آدمی کو مار ڈالنا ان کا روز کا مشغلہ تھا، جہل و لاعلمی کا یہ عالم تھا کہ اپنی بے علمی و بے خبری پر فخر کیا کرتے تھے اور باہم کر معمولی معمولی باتوں پر سالہا سال تک کشت و خون جاری رہنا وہاں کا معمولی منظر تھا، باوجود ایک ہی سرزمین میں سانس لینے کے ہر قبیلہ کا معبود جُدا تھا اور افتراق کی وہ تمام مکروہ صورتیں جو بھائی کو بھائی سے اور گوشت کو ناخن سے جُدا کر دیا کرتی ہیں اُن میں بدرجۂ کمال پائی جاتی تھیں ـــ ظاہر ہے کہ اس حالت میں ایک مصلح یا رفارمر کا اولین فرض یہی ہونا چاہئے تھا کہ وہ ان کو ایک مرکز پر لائے اور سب کو ایک خیال مشترک سے وابستہ کر دے چنانچہ سب سے پہلے ان کو خدا کی توحید کی طرف دعوت دی گئی۔

ہر چند اللہ اور اللہ کی توحید کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے اہلِ عرب واقف نہ رہے ہوں لیکن اس میں کلام نہیں کہ وہ اس چیز کو بالکل بھلا چکے تھے اور اسی لئے ان کا شیرازہ درہم و برہم ہوچکا تھا ــ ظاہر ہے کہ محض خدا کو ایک کہنا تو سود مند نہ ہوسکتا تھا اس لئے اصلاح معاشرت کے لئے اور وہ صورتیں بھی اختیار کی گئیں جو اس سے قبل مفید ثابت ہوئی تھیں اور عذاب و ثواب، بہشت و دوزخ، حشر و نشر وغیرہ کے وہ تمام عقاید علیٰ حالہا قایم رکھے گئے، جن کے بغیر اصلاح ناممکن تھی، اگر جاہل عربوں کے سامنے اظہار حقیقت کے طور پر بہشت و دوزخ کا مفہوم صرف روحانی مسرت یا روحانی اذیت بتایا جاتا تو ظاہر ہے کہ ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا کیونکہ اس مفہوم

وہ آشنا ہی نہ تھے اور ان کے ذہن اس قدر ترقی یافتہ نہ تھے کہ وہ اس کی بلندی کو سمجھ سکتے ۔ لیکن جب ان کو بتایا گیا کہ نعائم فردوس میں وہی تمام لذتیں شامل ہیں جن کے لئے وہ بے چین رہتے ہیں اور عذاب دوزخ اس قسم کی سخت گیریوں کی انتہائی صورت ہے جن سے انھیں یہاں واسطہ پڑتا ہے تو ان کی سمجھ میں مذہب کی اہمیت بھی آئی اور وہ اُن اصول کے بھی پابند ہو سکے جن کی تبلیغ ایک مصلح کا حقیقی مقصد ہوا کرتا ہے ۔۔۔ اِس لئے مذہبی معتقدات کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ وہ حقیقتاً لغو و باطل تھے اِن معتقدات کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتا کیونکہ اُن سے جو کام لینا مقصود تھا وہ پورا ہو کر رہا اور اگر آج ان معتقدات سے ہٹ کر کوئی دوسرا ذریعہ اصلاح اعمال و اخلاق کا اختیار کیا جا سکتا ہے تو مذہب کے حقیقی مقصود کے منافی نہیں اور یہ ایسا باریک نکتہ ہے جس کو سب سے پہلے اسلام اور بانیِ اسلام نے ظاہر کیا ۔۔۔ جیسا کہ ہم نے ابتدائی سطور میں بیان کیا ہے ، ایک مذہب والا ہمیشہ دوسرے مذہب والے کو گمراہ کہتا آیا ہے لیکن قرآن کی تعلیم یہ نہیں ہے اور اُس نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوا کرتا ہے جو اس قوم کی خصوصیات اور زمانہ کی ضروریات کا لحاظ رکھ کر تمدن و معاشرت کے اصول قایم کرتا ہے اور لوگوں کو امن و سکون کی طرف بلاتا ہے ۔ آنحضرت نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں تم لوگوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں لایا ، آپ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ آپ سے مافوق الفطرت معجزات کا ظہور ہو سکتا ہے ، آپ نے مذہب کے باب میں کبھی جبر و تشدد کو پسند نہیں کیا اور آپ نے اگر بہشت و دوزخ کا وہ عام مفہوم پیش کیا جو جاہلوں کے لئے قابلِ قبول تھا تو دوسری طرف اہلِ علم و عقل کے لئے یہ بھی کہدیا کہ یہ سب تشبیہات و استعارات ہیں اور حقیقت سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں ۔۔۔ پھر آپ تمام مذاہب عالم کی تاریخ ڈھونڈھ ڈالئے اور بتائیے کہ کیا محمد کے سوا کوئی اور نبی یا مصلح ایسا ہوا ہے جس نے انسان کی فطری سطح پر آ کر کسی مذہب کی بنیاد ڈالی ہو ، جس نے اپنے آپ کو " انا بشر مثلکم " سے زیادہ اہمیت نہ دی ہو ، جو معجزات و خرقِ عادات پیش کرنے سے انکار کرتا ہو ، جس نے مذہب کے لئے تلوار اُٹھانا حرام قرار دیا ہو ، جو تمام دوسرے مذاہب کی عزت کرتا ہو ، جو وہم پرستی و لایعنی مراسم عبودیت کا مخالف ہو اور جو مذہب کا مفہوم صرف اخلاق کی پاکیزگی اور ذہنی ترقی و آزادی قرار دے ۔۔۔ اگر انصاف کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ محمدؐ کی ذات اس باب میں بالکل منفرد نظر آتی ہے اور اس لئے مذہب ہونے کے لحاظ سے تکمیل کا دعویٰ صرف اسلام ہی کر سکتا ہے ۔۔۔ یہ ہیں وہ اصلی خط و خال اسلام اور اسکی تعلیمات کے جو ہر شخص کو غائر مطالعہ کے بعد نظر آ سکتے ہیں ۔ لیکن افسوس ہے کہ آج اگر میں ان کو ایک مسلمان کے سامنے بیان کروں تو وہ بھی ان کو صحیح باور نہ کرے گا چہ جائیکہ غیر مسلم ، کیونکہ آج خود ہمارے علماء کرام اور دوا غفان ذی احترام کے نزدیک رسول اللہ انسان نہ تھے بلکہ ایک دیوتا تھے جن کے جسم کا سایہ نہ تھا ، جن کی پشت پر مُہرِ نبوت ثبت کر کے خدا نے بھیجا تھا جن کے ہاتھ میں سنگریزے بولنے لگتے تھے ۔ جن کی رسالت کا اقرار درخت بھی ایک انسان کی طرح کیا کرتے تھے ۔ جب وہ جنگ کرتے تھے تو مدد کے لئے آسمانوں سے فرشتے اُترا کرتے تھے اور جب آپ کسی مجمع میں ہوتے تو ہمیشہ آپ سب سے بلند نظر آتے ، خواہ آپ سے زیادہ لانبے قد کے آدمی کتنے ہی وہاں موجود ہوں ، وہ ایک بُراق پر سوار ہو کر ساتوں آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے عرشِ اعظم تک پہونچے اور ذاتِ خداوندی سے ہمکلام ہوئے ۔ جبرئیل نے آپ کا سینہ چیر کر دل سے خون کی پھٹکی نکال لی تاکہ معاصی کی اہلیت باقی نہ رہے اور آپ ایک اشارہ سے پہاڑ کے پہاڑ سونے چاندی میں تبدیل کر سکتے تھے ۔ پھر یہ وہم پرستی یہیں تک پہونچ کر ختم نہیں ہو گئی بلکہ صوفیائے کرام نے تو یہاں تک کہدیا کہ احمد اور احد میں تو میم کا پردہ مصلحتاً رکھا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ محمد اور خدا میں کوئی فرق نہیں اور اس طرح صنمیات کا پورا لٹریچر اسلام میں داخل ہو گیا ۔ اگر آپ کسی مجلس میلاد میں جا کر شریک ہوں تو آپ کے لئے اس قسم کے معجزات و خوارق عادات سننا ناگزیر ہو گا اور پوری صحبت میں مشکل ہی سے دو چار واقعات اخلاق محمدی کے سننے میں آئیں گے ۔ اسلئے موجودہ زمانہ میں جبکہ مذہب کے خلاف ایک عام تحریک دُنیا میں پیدا ہو رہی ہے ۔ اسلام کے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ وہ اغیار کے حملہ سے کیونکر محفوظ رہے بلکہ سوال یہ ہے کہ خود اسی کے حامی و علمبردار جو دشمنی اسکے ساتھ کر رہے ہیں اسکو کیونکر دفع کیا جا سکتا ہے ، اسکی دو ہی صورتیں ہیں ، ایک یہ کہ بزور شمشیر مولویانہ ذہنیت کو ختم کر دیا جائے ، یا خود عوام میں علم کی اشاعت اتنی ہو کہ وہ نقد و نسیہ میں تمیز کر سکیں لیکن چونکہ اول الذکر صورت کا امکان نہیں اس لئے صرف دوسری صورت باقی رہ جاتی ہے ، جو دیر طلب تو یقیناً ہے لیکن کسی نہ کسی دن بہر حال اسے پورا ہو کر رہنا ہے ۔

خطِ ایام

(ساقی جاوید بی اے)

وقت کے آتشکدے شعلے اُگلتے ہی رہے
مریم و حوا کے آنچل آہ جلتے ہی رہے

قصر و ایواں میں بھڑکتی ہی رہی سطوت کی آگ
آہ لُٹتا ہی رہا عذرا و سلمیٰ کا سہاگ

آندھیاں روشن چراغوں کو بجھاتی ہی رہیں
ظلمتیں ایام کے بربط پہ گاتی ہی رہیں

خوں سے دھلتے ہی رہے اسکندر و دارا کے ہاتھ
وقت بڑھتا ہی رہا اک صرصر و طوفاں کے ساتھ

جگمگاتا ہی رہے فغفور و قیصر کے دیار
بابل و روما سے اُٹھتا ہی رہا خونیں غبار

زار و سیزر کی سنانیں خوں بہاتی ہی رہیں
سطوتوں کی دیویاں لاشوں پہ گاتی ہی رہیں

جنگ کے شعلوں میں جلتے ہی رہے اہرام و نیل
اف دہکتا ہی رہا فطرت کا ہر نقشِ جمیل

آگ جلتی ہی رہی طوفان آتے ہی رہے
تاج و الحمرا کے سینے زخم کھاتے ہی رہے

اُڑ رہی ہے جانے کب سے روم و غرناطہ کی دھول
جل رہے ہیں جانے کب سے کوکب و پروین کے پھول

آگ یہ صدیوں کی ہے اس کو بجھا سکتا ہے کون

جبر و استبداد کے محلوں کو ڈھا سکتا ہے کون

آج بھی اُٹھتے ہیں طوفاں آج بھی جلتی ہے آگ
آج بھی لُٹتا ہے مہتاب و ثریا کا سہاگ

آج بھی دہکے ہوئے ہیں طیلسان و رحل و طاق
آج بھی اُڑتا ہے قرآن و محمد کا مذاق

آج بھی موجود ہیں اس دہر میں لات و ہبل
آج بھی کھل کھل کے مرجھاتے ہیں ذہنوں کے کنول

شعلہ زا ہیں آج بھی خیام و حافظ کے دیار
آج بھی اُٹھتی ہے خاکِ قرطبہ سے اک پکار

آج بھی بکتا ہے بازاروں میں یوسف کا جمال
آج بھی اے مصر تیرے نیل کا پانی ہے لال

طغرل و سنجر کی تیغیں آج بھی پیتی ہیں خوں
آج بھی انسانیت ہے وقت کا صیدِ زبوں

اک دہکتا خطِ ہستی کھینچتا جاتا ہے وقت

خونِ آدم سے زمیں کو سینچتا جاتا ہے وقت

جذباتِ دل شاہجہانپوری :-

مرا حال تھا جہاں تک وہ ادا کیا زباں سے — جو کہیں گے اشکِ رنگیں وہ الگ ہے داستاں سے
کہاں تھے جلوہ آرا کون تھا کہئے تو کیا کہئے — کہ اپنی ہر نظر اک داستاں معلوم ہوتی ہے
ہمیں یہ دیکھنا تھا وقتِ گریہ، — کہ دامن میں ہے گنجایش کہاں تک
نظروں کا سہارا کوئی نہیں پہونچوں بھی تو کیونکر منزل تک — گھبرا کے جدھر رخ کرتا ہوں ہر نقشِ قدم مٹ جاتا ہے
ہو چکی برباد گو اے شمع پروانوں کی خاک، — ذرّے ذرّے میں ہے پنہاں اک جہانِ زندگی
پہلے رودادِ دلِ ناکام پر ہو اک نظر، — پھر جہاں سے چاہئے چاکِ گریباں دیکھئے
اس اضطراب پہ قرباں اک جہانِ سکوں — کوئی سنبھال رہا ہے تڑپ رہا ہوں میں
تا بہ لب شکوے نہ آئے تھے کہ خود ہوں منفعل — حسن کی معصوم فطرت کو پشیماں دیکھ کر
نظر ایسے مجبور کی زندگی پر — جو ہر سانس میں کہہ گیا اک فسانہ
وہی دن شبابِ بہارِ چمن کے — وہی میری دیوانگی کا زمانہ۔
نہ ہوا دل کسی صورت سے بھی مانوس اے دلؔ — گو لبھاتی رہی نیرنگیٔ دُنیا مجھکو

ارشدؔ کاکوی :-

غضب ہے موسمِ گل میں خزاں کی یاد آئے — کسے ہوس تھی کہ اس طرح سے بہار آئے
کھلا یہ راز جب آئے وہ بال بکھرائے — کہ روشنی سے زیادہ حسین ہیں سائے
جسے نصیب نہیں ہے ترا تغافل بھی — وہ رہ نوردِ محبّت بھلا کہاں جائے
یہ زندگی ہے تو اس زندگی سے موت اچھی — یہ روشنی ہے تو اس روشنی سے باز آئے
ترے خیال کی ضو پاشیاں معاذاللہ — خدا کرے مہ و انجم کی لاج رہ جائے
تصورات کی مشاطگی خدا کی پناہ — طرح طرح سے انھیں جا کے ہم سنوار آئے

غمِ نشاط و نشاطِ الم کا کیا کہنا،
یہ تجربے ہیں مری زندگی کے سرمائے

نفیس قادری :-

ہزار بار اُٹھیں دل میں نور کی موجیں ۔۔۔ جو ایک بار ترے غم سے زندگی مانگی
دلِ غمِ دوراں سے تھا یکسر اداس ۔۔۔ اور پھر تم بھی مجھے یاد آ گئے
جب طریقِ عشق کے کچھ مرحلے طے ہو گئے ۔۔۔ زندگی سود و زیاں کے راز سمجھانے لگی
وہ اضطرابِ شوق میں شدت نہیں رہی ۔۔۔ کیا کہ گئی یہ دل سے تری چشمِ التفات
غم و الم سے تھی معمور زندگی اپنی ۔۔۔ ہزار شکر کہ پھر بھی تجھے بھلا نہ سکے
ہائے وہ بے کسی معاذاللہ ۔۔۔ جب تری یاد تک نہیں آئی

کیفی چریاکوٹی :-

یہ دھوکا ہو نہ ہو، امید ہی معلوم ہوتی ہے ۔۔۔ کہ مجھ کو دور سے کچھ روشنی معلوم ہوتی ہے
خدا جانے، کس اندازِ نظر سے تم نے دیکھا ہے، ۔۔۔ کہ مجھ کو زندگی، اب زندگی معلوم ہوتی ہے
اسی کا نام، شاید زندگی نے یاس رکھا ہے ۔۔۔ نفس کی جو کھٹک ہے آخری معلوم ہوتی ہے
ہوا ہے حُسن سے کچھ اور، عکسِ حسنِ خودداری ۔۔۔ خموشی اُن کے ہونٹوں پر ہنسی معلوم ہوتی ہے
تصور میں ہے میرے، یوں فریبِ بزم آرائی ۔۔۔ اندھیری رات ہے اور چاندنی معلوم ہوتی ہے
کہاں ہوں؟ کس طرف ہوں میں؟ خبر اتنی نہیں مجھکو ۔۔۔ یہی گم گشتگی، کچھ آگہی معلوم ہوتی ہے

سرِ موجِ نفس کشتیٔ دل کو کیا کہوں؟ کیفی ؟
اُبھرتی ہے جہاں تک، ڈوبتی معلوم ہوتی ہے

شفقت کاظمی :-

وہ توجہ وہ التفات نہیں — بات کیا ہے کہ اب وہ بات نہیں
میری محرومیاں بجا ہیں مگر — حسن پابندِ التفات نہیں
قیدِ ہستی سے چھوٹنا آساں — تیرے غم سے مگر نجات نہیں
اُن کو منظور ہے کرم نہ ستم — میری قسمت میں کوئی بات نہیں
تا بہ کے انتظارِ مقدمِ دوست — فرصتِ عمر کو ثبات نہیں

یکساں ہے دلِ زار کو از روئے محبت — الطاف کسی کا ہو کہ بیداد کسی کی
کیا میں بھی ہوں اے محوِ جفا یاد کسی کو — بیتاب جو رکھتی ہے مجھے یاد کسی کی
لاریب ترے دامِ تمنا سے نکل کر — نادم ہے بہت فطرتِ آزاد کسی کی
ایذا طلبِ عشق جو تھا شوق ہمارا — مرغوب رہی سختیٔ بیداد کسی کی
جی اہلِ ہوس میں نہ لگا ہے نہ لگے گا — آئے گی بہر حال تمھیں یاد کسی کی

رسوا ہو نہ وہ محوِ جفا بھی کہیں شفقت
پہونچی ہے لبِ غیر پہ روداد کسی کی

مضطر حیدری :-

کچھ دیر بہلتا رہتا ہوں کچھ دیر مچلتا رہتا ہوں — ہر دور میں اپنے جینے کے انداز بدلتا رہتا ہوں
کیا جانئے کیسی آگ ہے یہ شعلوں کا پتہ ہے اور نہ دھواں — محسوس مگر ہوتا ہے یہی جیسے کہ میں جلتا رہتا ہوں
قبضے میں اقامت ہے نہ سفر پوشیدہ اشارے ہیں رہبر — رکتا ہوں تو بس رک جاتا ہوں چلتا ہوں تو چلتا رہتا ہوں
موجوں کی روانی تیز ہوا ملاح بھی غافل اور بھنور — ایسے میں سنبھلنا مشکل ہے لیکن میں سنبھلتا رہتا ہوں

فطرت میں ازل ہی سے میری نیرنگی و ندرت ہے مضطر
افسانہ تو ہوں میں ایک مگر عنوان بدلتا رہتا ہوں

رُباعیات صفیہ شمیم

شرمندہ کبھی نہ روحِ محنت ہوگی — ہمت ہے تو ہر گام پہ نصرت ہوگی
اسوقت اگر تجھ سے گریزاں ہے تو ہو — کل وقت کو خود تری ضرورت ہوگی

کچھ بھی نہیں زندگی میں خدمت کے سوا — سوزِ دل و دردِ آدمیت کے سوا
اورنگ و نشان و چتر و مُہر و دیہیم — سب ہیچ ہیں سب ہیچ محبت کے سوا

تپتے ہوئے نغموں کی نہ ہوتی ایجاد — نغموں میں نہ گونجتی غموں کی روداد
برباد دلوں کو عشق کرتا نہ اگر — ہوتا نہ کبھی عالمِ امکاں آباد

اب دل کی خلش کا ہو رہا ہے آغاز — گل کردو یہ، فانوس اُٹھا دو یہ ساز
اے نغمہ گرانِ بارگاہِ عشرت — خاموش کہ ماضی کی وہ گونجی آواز

کس طور سے دیکھ جی رہا ہے انساں — خود اپنے کفن کو سی رہا ہے انساں
کچھ تجھ کو بھی معلوم ہے اے ربِ جلیل — انسان کا خون پی رہا ہے انساں

مطبوعات موصولہ

اور سالگرہ آتی رہی

ناول ہے شمس بمن گرامی کا جسے ساحل بک ڈپو کشن گنج بازار پورینہ نے شایع کیا ہے ---
ضخامت ۲۳۶ صفحات - قیمت دو روپیہ -

جناب شمس بمن گرامی کا نام میرے لئے بالکل نیا ہے اور میری نگاہ سے اب تک ان کی کوئی کتاب نہیں گزری - بہ سلسلۂ تعارف جناب محشر صادقی اعظمی نے لکھا ہے " یہ کتاب کہنے کو تو ناول ہے لیکن ناول سے زیادہ سیاسی اور واقعاتی حقیقتوں کا حامل ہے " - آگے چل کر انھوں نے شمس صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ " وہ موجودہ صدی کے انقلاب پسند اور سوشلزم تحریک کے علمبردار نوجوان ہیں " ان دونوں باتوں کو اگر صحیح سمجھ لیا جائے (اور صحیح نہ ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی) تو پھر کتاب و صاحب کتاب دونوں کے متعلق کسی مزید قیل و قال کی ضرورت باقی نہیں رہتی - کیونکہ آج کل کے نوجوان فسانہ نگار جب کسان و مزدور - زمیندار و سرمایہ دار کا ذکر کرتے ہیں تو ان سب کے خیال کی رفتار ایک ہی سی ہوتی ہے اور معنوی حیثیت سے ان میں بہت کم فرق ہوتا ہے -

شمس صاحب بھی چونکہ " سوشلزم کے علمبردار " ہیں ؛ لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس راہ سے ہٹ کر کچھ اور فرماتے رہ گئی زبان سو اس کے متعلق کچھ کہنا اس لئے بیکار ہے کہ اُردو ان کی زبان نہیں (جیسا کہ فاضل تعارف نگار نے ظاہر کیا ہے)

بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب اچھی نہیں ہے تو ایسی بُری بھی نہیں اور اگر کسی کے پاس وقت ہو تو کسی نہ کسی طرح اس کا پڑھنا گوارا ہوسکتا ہے -

غالب کی باتیں

اس کے مصنف بھی جناب شمس بمن گرامی ہیں اور تعارف کی خدمت بھی محشر اعظمی ہی نے انجام دی ہے - اس کے معنی یہ ہیں کہ جناب شمس تنہا ناول نویس ہی نہیں بلکہ نقاد بھی ہیں اور نقاد بھی اس پائے کے کہ (بقول محشر صاحب) مولانا حالی اور ڈاکٹر بجنوری کے علاوہ ہندوستان میں اگر کوئی تیسرا غالب شناس ادیب نظر آتا ہے تو وہ شمس صاحب ہیں - یقیناً یہ کوئی امر محال نہیں، اور ہوسکتا ہے کہ شمس صاحب میں حضرت محشر کو یہی خصوصیت نظر آئی ہو، لیکن افسوس ہے کہ ان کے اس دعوے کی تصدیق اصل کتاب کے مضامین سے نہیں ہوتی -

فاضل مصنف نے سات مقالے لکھے ہیں جن میں سب سے پہلے کا عنوان غالب ہے ، دوسرے کا رازِ ہستی، تیسرے کا تخیل جنت ، چوتھے کا پند و نصایح ، پانچویں کا تصور فنا چھٹے کا غالب سرور کائنات کی حضور میں اور ساتویں کا چند لمحے غالب کے ساتھ -- اور ایک سو دس صفحات کی مختصر کتاب میں انھیں عنوانات کو سامنے رکھ کر غالب کی انفرادیت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے -

غالب اور غالبیات اتنا پامال اور فرسودہ موضوع ہے کہ اول تو اس پر قلم اُٹھانا ہی کوئی معنی نہیں رکھتا اور اگر کوئی شخص اس کی جرأت کرے بھی تو بحث و گفتگو کا کوئی دلچسپ پہلو نکالنا آسان بات نہیں، تاہم چونکہ شمس صاحب

کے حضور میں خراج عقیدت کی حیثیت رکھتی ہے اور تحفہ کی چیز کو نہ رد کیا جاتا ہے، نہ اس کے اچھے برے خیال، اس لئے امید ہے کہ لوگ اسے پڑھیں گے اور اس سے بالکل خالی الذہن ہوکر پڑھیں گے کہ اس میں کیا لکھا ہے اور کس نے لکھا ہے۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:- ساحل بک ڈپو۔ کشن گنج پورینا۔

اصطلاحات معاشیات

تالیف ہے جناب پروفیسر دلشاد کلانجوی ام۔ اے کی، جسے دانشکدۂ بہاولپور نے کافی اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے۔ قیمت سوا روپیہ۔

کتاب کے نام سے موضوع ظاہر ہے اور موضوع کی اہمیت کے متعلق کچھ لکھنا بے کار۔ کیونکہ اس وقت دُنیا کا سب سے زیادہ مہتم بالشان مسئلہ جس پر انسان کی نجات منحصر ہے، معاشیات ہی کا مسئلہ ہے۔

اُردو میں اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جارہی ہیں، لیکن ضرورت کے لحاظ سے پھر بھی کم ہیں — علوم و فنون کی کتابیں لکھتے وقت یہ خیال رکھنا اشد ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو انھیں نہایت سہل و سادہ زبان میں لکھا جائے تاکہ عوام بھی انھیں سمجھ سکیں اور فاضل مصنف نے غالباً اسی مقصد کو سامنے رکھ کر یہ کتاب پیش کی ہے۔

اس میں معاشیات کی تمام مروجہ انگریزی اصطلاحات کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ ان کے مفہوم و مطلب کو بھی نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کتاب کو طلبہ کے لئے تو خیر مفید ہونا ہی چاہئے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ عام ذہن انسانی کے لئے بھی کم مفید نہیں اور اس لئے ہمیں امید ہے کہ علمی و غیر علمی دونوں حلقوں میں اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

گریہ و تبسم

مجموعہ ہے محترمہ صفیہ شمیم ملیح آبادی کی رباعیات کا جسے خود انھوں نے بہت اہتمام سے شایع کیا ہے اور دو روپیہ آٹھ آنے میں، ۹۳۔ مارگلا لائنز راولپنڈی سے مل سکتا ہے۔ شروع میں جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی اور میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں کی رائیں تعارف و پیش لفظ کی حیثیت سے درج کی گئی ہیں اور اسکے بعد رباعیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو صفحہ ۸۹ تک چلا گیا ہے۔

اس مجموعہ میں غالباً ۱۰۰ سے زیادہ رباعیاں ہیں اور سب کی سب اتنی اچھی ہیں کہ انتخاب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شمیم کی رُباعیاں ملک کے اکثر جراید و رسایل میں شایع ہوتی رہتی ہیں اور ارباب ذوق ان سے کافی لطف اُٹھاتے ہیں۔ رُباعی بڑی مشکل صنف سخن ہے اور یہ ہر شاعر کا کام نہیں کہ وہ فنی پابندیوں کے ساتھ صرف چار مصرعوں میں کسی اہم بات کو پوری تکمیل کے ساتھ کہہ سکے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شمیم کو قدرت کی طرف سے رباعیاں کہنے کی خاص اہلیت عطا ہوئی ہے اور اسی لئے انھوں نے اس ودیعت سے فایدہ اُٹھاکر اکثر و بیشتر رباعیاں ہی کہی ہیں اور مشق سے ان میں استادانہ رنگ پیدا ہوگیا ہے۔

ان کی چند رُباعیاں نگار کی اس اشاعت میں بھی درج ہیں ان کو پڑھکر قارئین نگار اس مجموعہ کی اہمیت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

چنگ و آہنگ

مجموعہ ہے جناب عرش ملسیانی کی غزلوں اور نظموں کا جسے مرکز تصنیف و تالیف نکودر (جالندھر) نے مجلد شایع کیا ہے۔ قیمت تین روپیہ ضخامت ۲۳۰ صفحات۔

جناب عرش کا ایک مجموعۂ نظم "ہفت رنگ" کے نام سے پہلے شایع ہوچکا ہے۔ اس کی ترتیب میں وہ حال سے ماضی کی طرف گئے ہیں اس لئے یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ یہ مجموعہ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۳۶ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔

انھوں نے پہلا دور ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۵ء تک قرار دیا ہے، دوسرا ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک اور تیسرا ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۵ء تک ۔ اس مجموعہ میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ رباعیاں اور گیت بھی پائے جاتے ہیں۔
جناب عرش بڑے ذہین و پختہ کار شاعر ہیں اور جس موضوع پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے اس کے کسی پہلو کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے وسیع الخیال انسان ہیں اور انسانیت کا بڑا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ وہ اظہار خیال میں بھی کافی احتیاط سے کام لیتے ہیں اور کہنے کا انداز بھی دلنشین ہے
ان کی غزلیں بڑی صاف و پاکیزہ ہیں، نظمیں نہایت موثر و دلکش اور رباعیاں بڑی سبق آموز۔

پوسٹ مارٹم مجموعہ ہے جناب عرش ملسیانی کے فکاہی مضامین کا ۔ جسے مرکز تصنیف و تالیف نکودر (جالندھر) نے شایع کیا ہے، ضخامت ۱۲۸ صفحات ۔ قیمت عہ
اس مجموعہ میں جناب عرش ملسیانی کے ۱۵ مقالے شامل ہیں جو مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہو چکے ہیں
اس مجموعہ کا نام انھوں نے پوسٹ مارٹم اس لئے رکھا ہے کہ اس میں انھوں نے طنز و مزاح سے کام لیکر اشخاص و حالات پر انتقاد کیا ہے ۔
مجموعہ دلچسپ ہے اور بعض مقالے بہت پرلطف ہیں ۔

گلشن ترجمہ ہے جناب کشور ساہو کے افسانوں کے مجموعہ "ٹیسو کے پھول" کا، جسے ہندوستان چترا چمبور بمبئی نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے، ضخامت ۲۴۴ صفحات ۔ قیمت تین روپیہ۔
کشور ساہو، دنیائے فلم میں ڈائرکٹر و پروڈیوسر کی حیثیت سے خاص شہرت رکھتے ہیں، لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ ادیب و فسانہ نگار بھی ہیں ۔
اس مجموعہ میں ان کے بارہ افسانے شامل ہیں اور فنی خصوصیات کے لحاظ سے بڑے کامیاب فسانے ہیں
ہر فسانہ نگار کامیاب فلم ڈائرکٹر نہیں ہوسکتا، لیکن ایک فلم ڈائرکٹر اگر اچھی فسانہ نگاری اختیار کرے تو اس کی کامیابی زیادہ یقینی ہے ۔
اس مجموعہ کے افسانے بیان و زبان، لب و لہجہ اور کردار نگاری کے لحاظ سے بہت کامیاب افسانے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ لوگ انھیں بہت دلچسپی سے پڑھیں گے ۔

ماہ و انجم مجموعہ ہے جناب نثار اٹاوی کی رباعیوں اور غزلوں کا جسے مکتبۂ شانِ ہند دہلی نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے ۔ ضخامت ۱۳۶ صفحات ۔ قیمت عہ
ابتدا میں جناب اثر لکھنوی کا پیش لفظ ہے اور اس کے بعد جناب ضیاء بدایونی کا مقدمہ اور ان دونوں حضرات نے ان کے شاعرانہ ذوق کی پوری داد دی ہے ۔
جناب نثار جدید طبقۂ شاعری سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی شاعری کا ٹکنک اور پس منظر جدید نہیں ہے زمانہ کے موجودہ رجحانات سے وہ یقیناً متاثر ہیں، جن کا ثبوت ان کے کلام سے ملتا ہے، لیکن چونکہ بہ اتباع اساتذۂ قدیم وہ فن سے منحرف ہوکر شعر کہنا پسند نہیں کرتے، اس لئے ان کے کلام میں ترنم و نغمہ کی بھی کمی نہیں۔
ان کے خیالات بہت پاکیزہ ہیں اور طرزِ ادا نہایت دلکش، ان کی رباعیوں میں چونکا دینے والی باتوں اور غزلوں میں تڑپا دینے والے اشاروں کی کمی نہیں ۔

مظہر العجائب

ترجمہ ہے شیخ فریدالدین عطار کی فارسی مثنوی مخزن الغرائب کا جسے سید شاہد صاحب نے نہایت اہتمام کے ساتھ پاکستان منزل لارنس روڈ کراچی سے شایع کیا ہے۔
ضخامت ۳۹۲ صفحات۔ قیمت آٹھ روپیہ۔

مخزن الغرائب، شیخ عطار کی مشہور مثنوی ہے، لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ تصنیف ان کی نہیں ہے۔ جناب شاہد نے سب سے پہلے تقریباً ۱۰۰ صفحات میں اسی مسئلہ پر بحث کی ہے اور مختلف و متعدد شواہد و دلایل سے اس خیال کی تردید کی ہے۔

اس کتاب میں ایک صفحہ پر اصل فارسی مثنوی کے اشعار درج کئے گئے ہیں اور اس کے مقابل دوسرے صفحہ پر منظوم ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ ترجمہ ہے۔

تاریخ صحافت اُردو جلد اول

تصنیف ہے جناب امداد صابری کی جسے سوشلسٹ بک ڈپو دہلی نے شایع کیا ہے ضخامت ۴۰۳ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔

اس وقت تک "اُردو ادب" کی متعدد تاریخیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن "صحافت اُردو" کا کوئی تذکرہ شایع نہیں ہوا، حالانکہ "اُردو ادب" کی کوئی تاریخ مکمل ہو ہی نہیں سکتی، جب تک اس موضوع کو اس میں شامل نہ کیا جائے۔

جناب صابری نے سب سے پہلے تاریخ ہند کی خبر رسانی پر ایک بڑا مفید و دلچسپ تبصرہ کیا ہے جو عہد منو سے لیکر وقت حاضر تک پورے زمانہ پر محیط ہے اور اس کے بعد بعض قدیم انگریزی، بنگالی و گجراتی اخباروں کا ذکر کرکے اُن اُردو فارسی رسایل و جراید کی تاریخ پیش کی ہے جو غدر ۱۸۵۷ء تک جاری رہے تھے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے اخبار "جام جہاں نما" کا ذکر کیا ہے جو ۱۸۲۲ء میں اُردو فارسی دونوں زبانوں میں کلکتہ سے شایع ہوتا تھا اور آخری اخبار طلسم حیرت کو قرار دیا ہے جو ۱۸۵۵ء میں مدراس سے شایع ہوتا تھا۔

انھوں نے اس کتاب میں ایک سو اخبارات و جراید کا ذکر کیا ہے اور ہر ممکن تحقیق سے کام لیا ہے۔ انھوں نے متعدد قدیم اخباروں کے چربے بھی پیش کئے ہیں اور ان کی تحریر کے نمونے بھی دئے ہیں جن سے بعض نہایت اہم تاریخی واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جناب صابری نے یہ کتاب لکھکر زبان کی بڑی گرانقدر خدمت انجام دی ہے اور جس محنت و کاوش سے انھوں نے یہ خدمت انجام دی ہے اس کی صحیح داد دینا الفاظ سے ممکن نہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ ملک ان کی اس جدو جہد کی پوری قدر کرے گا تاکہ صابری صاحب اس کی دوسری جلد بھی جلد شایع کرسکیں۔

فطری علاج

تصنیف ہے حسن الدین احمد صاحب حیدرآبادی کی جسے خود انھوں نے شایع کیا ہے اور ڈھائی روپیہ میں، عزیز باغ، سلطان پورہ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔ فطری طریق علاج اس لحاظ سے نیا نہیں کہ وہ کوئی جدید دریافت ہے کیونکہ زمانۂ قدیم میں زیادہ تر اسی کا رواج ہے، لیکن اس لحاظ سے ضرور نیا ہے کہ لوگوں نے اسے بھلا دیا تھا اور اب پھر دنیا اسکی طرف متوجہ نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے پہلے فطری علاج کے فلسفہ پر علمی انداز میں گفتگو کی ہے اور پھر اسکے ابتدائی اصول پیش کرکے فطری علاج کے تمام طریقوں پر گفتگو کی ہے۔ ان تمام طریقوں پانی کا علاج ... سے منسوب ہے) ہومیوپیتھی (جس کا موجد ہنی من تھا) خصوصیت کے ساتھ بہت اہمیت رکھتے ہیں اور مصنف نے ان پر ... اسی کے ساتھ غذا اور ورزش کے متعلق جو ہدایات درج کی گئی ہیں وہ بھی غور سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ کتاب ... مفید ہے اور ہمیں امید ہے کہ لوگ اس کے مطالعہ سے مستفید ہوں گے۔

مکتوبات نیاز

تین حصوں میں (۱)
...یٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو
...ربات نگاری، سلاست بیان
...ینی اور الجھیے ہیں کے لحاظ
...فن انشا میں بالکل پہلی
...رہیا او جن کے سامنے
...خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے
...ان اڈیشنوں میں پہلے
...یشن کی غلطیوں کو دور کیا
...باہے اور عمدہ ٹائپ کے کاغذ
...باعت ہوئی ہر قیمت حصہ
...چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر
افسانہ جو اردو زبان میں
بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری
کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی
زبان و تخئیل اسکی نزاکت
بیان اسکی بلندی مضمون
اور اسکی انشاء عالیہ سحر
حلال کے درجہ تک پہونچ گئی
ہے۔ یہ اڈیشن نہایت
صحیح اور خوشخط ہے
قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک عجیب
تمہید کے ساتھ بہترین
ہندی شاعری کے نمونے
پیش کرکے ان کی ایسی
تشریح کی ہے کہ دل بیتاب
ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہ بھی
سے پہلی کتاب اس موضوع
پر لکھی گئی ہے جس میں
ہندی شاعری کے بے مثل
نمونے نظر آتے ہیں۔
قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز
کے دو علمی مضامین
شامل ہیں:۔
(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم
کی روحوں کے ساتھ
(۲) مادئین کا مذہب
نہایت مفید و عجیب
کتاب ہے۔
قیمت
ایک روپیہ
علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کا عنفوان شباب
کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق
کی تمام نشہ بخش کیفیات
اسکے ایک ایک جملہ میں موجود
ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ
اور انشاء کے لحاظ سے اعلیٰ
بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ
اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔
تازہ اڈیشن نہایت صحیح و
خوشخط، سرورق رنگین
قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فراست الید

...لعہ نیاز فتحپوری۔ اسکے
...طالعہ سے ایک شخص انسانی
...ہ کی شناخت اور اس
...، لکیروں کو دیکھ کر
...نے یا دوسرے شخص کے
...ستقبل، سیرت، عروج
...وال، موت و حیات
...عہ میازی شہرت

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا
مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے
کہ ہمارے ملک کے ہادیان
طریقت و علمائے کرام کی
اندرونی زندگی کیا ہے اور
ان کا وجود ہماری معاشرت
اجتماعی حیات کے لئے ک...

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری
جو ادبیات و تنقید عالیہ کا
عجیب و غریب ذخیرہ ہے
ایک بار اس کو شروع کر دینا
آخر تک پڑھ لینا ہے یہ بھی
جدید اڈیشن ہے جس میں
...

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مضامین
کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے
ایران و ہندوستان کا اثر جس
شاعری پر فارسی زبان کی
پیدائش پر مورخانہ نظر اردو
شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اردو
...

مذہب

... کا وہ
مشہور مقالہ جس میں
انہوں نے بتایا ہے کہ
مذہب کی حقیقت کیا
ہے اور دنیا میں یہ کیونکر
رائج ہوا۔ اس کے مطا...

...ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت ... ۱۰/

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

نگار کے [illegible]

سالنامہ [illegible]

[illegible] [illegible] بہت [illegible] تھی وہ دوبارہ شایع کیا گیا [illegible] کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری [illegible]

[illegible] کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے [illegible] تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ [illegible] تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری۔ مارچ [illegible]

[illegible] جو ضخامت [illegible] ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۸ء

[illegible] نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے [illegible] کے دور زرین کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی [illegible] قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیئے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۵۰ء

نگار کی ۳۰ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات، انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے۔ اس میں بعض ایسے اکابر شعرا کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مارس ہنڈس کی مشہور عالم کتاب "مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ (اقتباس) ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستے کو جان لیں [illegible] دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ

سالنامہ ۱۹۵۲ء

۵۵ سال بعد

[illegible]ری علاج

میں، [illegible] [illegible] ہے کی [illegible] ہے۔ اور نہیں کہ وہ کوئی جدید دریافت ہے کیونکہ زمانہ قدیم میں زیادہ تر اسی کا رواج ہے، لیکن اس لحاظ [illegible] اسے بھلا دیا تھا اور اب پھر دنیا اسکی طرف متوجہ نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے پہلے فطری علاج کے فلسفہ پر [illegible] کی ہے اور پھر اسکے ابتدائی اصول پیش کر کے فطری علاج کے تمام طریقوں پر گفتگو کی ہے۔ ان تمام طریقوں [illegible] منسوب ہے) ہومیوپیتھی (جس کا موجد ہنی من تھا) خصوصیت کے ساتھ بہت اہمیت رکھتے ہیں اور مصنف نے [illegible] اسی کے ساتھ غذا اور ورزش کے متعلق جو ہدایات درج کی گئی ہیں وہ بھی غور سے پڑھنے کے قابل ہیں [illegible] اور ہمیں امید ہے کہ لوگ اس کے مطالعہ سے مستفید ہوں گے۔

رجسٹرڈ ایل ۱۳۸۴ جامعہ کراچی



ہندوستان پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی پرچہ ۱۰؍

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کردینے والی انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔
ضخامت ۶۰۲ صفحات مجلد نو روپیہ لعہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات کا مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف، معجزہ و کرامت، انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل، طوفان نوح، خضر کی حقیقت، مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں، یونس و ردہان ہی، حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا، توبہ، لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت، حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نورِ محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود و غیرہ
ضخامت ۲۶۴ صفحات کاغذ سفید سیر قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنہ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں و مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئیگا، ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے
قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے دور کرنے کی کیا کوشش کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن
قیمت [illegible] علاوہ محصول

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

مئی اور جون کے نگار میں ہم کافی وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ نگار کا آیندہ سالنامہ

"فرمانروایانِ اسلام" نمبر کیا، اور کیسا ہوگا

اور اس کی بعض خصوصیات کو بھی ظاہر کر چکے ہیں، لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے بعض حضرات اس کی اہمیت کا اندازہ نہ کرسکے ہوں، ہم مکرر اس کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ سالنامہ در اصل "تاریخ اسلامی" کا نچوڑ ہوگا، جس میں ولادت رسول اللہ سے لیکر اس وقت تک کی تمام چھوٹی بڑی مسلم حکومتوں کا ذکر ہوگا جو ۱۳ سو سال کے اندر تمام کرۂ ارض پر رونما ہوکر فنا ہوگئیں یا اب بھی باقی ہیں۔ اس میں ان تمام حکومتوں کے اسباب قیام و عروج اور انحطاط و اختتام کے ذکر کے ساتھ تمام حکمرانوں کے نام، ان کی حکومت کی مدت بقید سن ہجری و عیسوی درج ہوگی اور یہ بتایا جائے گا کہ ایک ہی خاندان سے اور کتنے خاندان پیدا ہوئے انھوں نے کہاں کہاں حکومتیں کیں اور ان کا کیا حشر ہوا۔

مسلمان اپنے زمانۂ عروج میں یورپ، ایشیا، افریقہ کے ان بعید ترین گوشوں تک پہونچ گئے تھے جن کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کا علم بہت کم حضرات کو ہے۔ نگار کے اس سالنامہ کے ذریعہ سے "تاریخ اسلام" کی انھیں مفید و دلچسپ معلومات کو پیش کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ دو نقشے ایسے پیش کئے جائیں گے جن کو دیکھ کر مسلمانوں کے عروج و زوال کی تصویر آپ کے سامنے آجائے گی۔

یہ پورا سالنامہ خود اڈیٹر نگار مرتب کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ہم پہلی جنوری سنہ ۱۹۵۴ء تک اسے شایع کرسکیں گے اس کی ضخامت کا صحیح اندازہ ابھی نہیں ہوسکتا۔ اس کی بابت غالباً ہم کچھ کہ سکیں گے۔ امید ہے کہ آپ اس کی توسیع اشاعت میں ضرور حصہ لیں گے اور اپنے حلقۂ احباب، مدارس کے طلبہ و اساتذہ کو بھی اس سالنامہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کریں۔

یہ سالنامہ در اصل ایک مستقل کتاب ہوگی اور کتاب ہی سمجھ کر اس کو حاصل کرنا چاہئے۔

جو حضرات نگار کے خریدار نہیں ہیں اور صرف سالنامہ ہی لینا چاہیں گے ان کے لئے اس کی قیمت (علاوہ محصول ڈاک) تین روپے ہوگی۔

ایجنٹوں کو اپنا آرڈر جلد دیدینا چاہئے تاکہ اسی حساب سے اس کی کاپیاں زاید طبع کرائی جائیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

نگار

دامنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے
نگار آٹھ روپیہ سات آنے میں وی پی ہوگا

اس امر کی کہ آپ کا چندہ اگست میں ختم ہوگیا اور ستمبر کا
جس میں سالنامہ ۵۴ء کی قیمت بھی شامل ہے

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۴ | فہرست مضامین اگست سنہ ۱۹۵۳ء | شمارہ ۲

ملاحظات

پاکستان کا مستقبل

جولائی کی تین تاریخیں ۲۵، ۲۶، ۲۷ جن کا ہندوستان اور پاکستان دونوں کو انتظار تھا آئیں اور گو وہ اپنے ساتھ کوئی نیا روشن اُفق لیکر نہیں آئیں، لیکن یہی کیا کم ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے باہمی تعلقات پر جو سیاہ بادل چھائے تھے ان کے کناروں سے روشنی کی جھلک نظر آنے لگی ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ روشنی کسی نئے آفتاب کے طلوع کا پیش خیمہ ہو۔

اس وقت نہرو، محمد علی کے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے، وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یقیناً اُس گفتگو سے بہت مختلف ہے جو اس سے قبل نہرو اور لیاقت علی خاں میں ہوئی تھی اور ایسا ہونا چاہئے تھا، کیونکہ نہرو لیاقت علی گفتگو کا نفسیاتی پس منظر کچھ اور تھا اور نہرو محمد علی گفتگو کا نفسیاتی پس منظر کچھ اور ہے۔

نوابزادہ مرحوم کی ملاقات کا پس منظر تھا۔ "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں"۔ اور اب نہرو محمد علی کی ملاقات بڑی حد تک بے حجابانہ و مخلصانہ ہوئی ہے اور وہ "دشنہ" جو پہلے آستینوں میں چھپا ہوا تھا اس مرتبہ نکال کر پھینک دیا گیا تھا۔

جو بیانات اسوقت تک شایع ہوئے ہیں، وہ بہت امید افزا ہیں اور ہو سکتا ہے کہ آغاز ستمبر (جب وزیر اعظم پاکستان دہلی تشریف لائیں گے) بعض مسایل طے پا جائیں اور ان کے بارہ میں کسی مختتم فیصلہ کا اعلان ہو جائے، امید ہے کہ ان مسایل میں متروکہ جائداد، ریلوں کی آمد و رفت، اور پاسپورٹ و ویزا کے معاملات بھی شامل ہوں گے اور اگر یہ حسب مراد طے پا گئے، تو پاکستان و ہندوستان کے باشندوں کے باہمی تعلقات جذباتی و تجارتی دونوں حیثیتوں سے زیادہ خوشگوار و استوار ہو جائیں گے اور اس کا نفسیاتی اثر کشمیر کے مسئلہ پر بھی ضرور پڑے گا جو یقیناً سب سے زیادہ اُلجھا ہوا مسئلہ ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ سب سے پہلے کشمیر ہی کے مسئلہ پر گفتگو ہوگی، لیکن یہ نہرو اور محمد علی کی بڑی دانشمندی تھی کہ انھوں نے سب سے پہلے چھوٹے مسایل کو سلجھانے کی کوشش کی، کیونکہ کشمیر کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے زیادہ صاف و خوشگوار فضا کی ضرورت تھی اور یہ اسی طرح پیدا ہو سکتی تھی کہ پہلے چھوٹے چھوٹے مسایل کو طے کر کے دونوں ملکوں کے باشندوں میں ایک حد تک ذہنی سکون کی کیفیت پیدا کر دی جائے۔

کشمیر کے مسئلہ پر بھی یقیناً گفتگو ہوئی ہوگی لیکن غالباً صرف اصول کی حد تک اور اگر اصولاً اس بات پر دونوں متفق ہو گئے ہیں کہ یہ مسئلہ بھی آپس ہی میں طے کر لیا جائے اور کسی تیسری قوت کو دخل دینے کا موقع نہ دیا جائے (جیسا کہ نہرو محمد علی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے) تو ہم سمجھتے ہیں کہ نصف دشواری ختم ہو جائے گی اور باقی نصف دشواری کے ختم کرنے میں گو وقت کافی صرف ہو جائے لیکن وہ کسی مزید اُلجھن کا باعث نہ ہوگی۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ نہرو محمد علی کی یہ ملاقات بڑی مبارک ملاقات تھی اور اگر یہ سلسلہ برابر جاری رہا تو —

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے سامنے اس وقت خارجی مسایل سے زیادہ داخلی مسایل زیادہ توجہ طلب ہیں اور وہ اس حد تک تشویشناک ہیں کہ اگر تمام خارجی مسایل پاکستان کی خواہش کے مطابق طے پا جائیں تو بھی وہ کوئی فایدہ نہیں اُٹھا سکتا بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ کہیں ابتری اور زیادہ نہ بڑھ جائے۔

وہ داخلی مسایل کیا ہیں؟ ان کی تفصیل، پاکستان ہی کے ایک ممتاز صحافی کی زبان سے سنئے، جس نے پاکستان کے موجودہ معاشی نظام کی ابتری اور وہاں کے اکابر کی اخلاقی پستی پر بے باکانہ روشنی ڈالی ہے۔

یہ زوال پذیر معاشرہ!

اس کی وجوہ اخلاقی ہوں یا سماجی، بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج ہم جس معاشرہ کے رکن ہونے پر فخر کرتے ہیں وہ ہر لحاظ سے مائل بہ انحطاط ہے اور اب اس کے زوال و انحطاط کی رفتار اس قدر تیز ہوگئی ہے کہ وہ لوگ جو حقایق کو نظر انداز کرنے کے عادی تھے، اعتراف کرنے لگے ہیں کہ واقعی صورتِ حال خواہ مخواہ خراب تر ہوتی جا رہی ہے اور اس کی اصلاح کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہئے۔ خصوصیت کے ساتھ قیام پاکستان کے بعد تو قومی اخلاق اور قومی کردار کے زوال کی رفتار اس قدر تیز ہوگئی ہے کہ یقین نہیں آتا کہ ہم آج بھی اس معاشرہ کے رکن ہیں جو پاکستان کی آزاد مملکت سے قبل ہمارے لئے سرمایۂ فخر تھا، جس شعبۂ زندگی پر نظر ڈالئے محسوس ہوگا کہ شرافت افکار اور دیانت کردار کا فقدان ہے، تاجروں کی برادری ہو یا سرکاری اہل کاروں کی جماعت، اربابِ اختیار کا گروہ ہو یا عام شہریوں کی سوسائٹی، زندگی اعلیٰ اقدار سے تقریباً تہی دست نظر آتی ہے، ممکن ہے کہ پاکستان کے عام شہروں اور قصبات میں یہ حالات نہ ہوں کیونکہ وہاں مسابقتِ حیات اور کارزارِ زندگی کی رفتار سست ہے، لیکن کراچی جیسے تجارتی شہر اور بین الاقوامی مرکز میں تو یہ چیز اس قدر واضح اور یہ خصوصیت اس درجہ نمایاں ہے کہ کوئی شخص اس سے آنکھیں موند کر نہیں گزر سکتا۔ رشوت، بددیانتی، تغلب، بے اعتباری، اعصابی بدحواسی اور فکری انتشار عام ہے اور مستقل عام کو تین تین اور چار چار ہزار روپے تنخواہ پانے والے عہدہ داروں سے لیکر، جو زندگی کے بڑے اونچے مقام پر فایز ہیں ـــ معمولی شہریوں تک جنھیں زندہ رہنے کی ابتدائی ضروریات تک میسر نہیں، ہر شخص انہی نفسیاتی اور ذہنی امراض میں مبتلا نظر آتا ہے، ہر شہری اس مقصد کے لئے تگ و دو کر رہا ہے کہ استحقاق سے زیادہ حاصل کرے خواہ اس کے نتیجے میں ہزاروں حق داروں کا حق ہی کیوں نہ مارنا پڑے۔ جن لوگوں سے یہ توقع نہ کی جا سکتی تھی کہ وہ جائز و ناجائز مفادات کے لئے ضمیر فروشی کریں گے، وہ بھی ضمیر فروشی کرتے ہیں اور انھیں احساس تک نہیں ہوتا کہ کیا کر رہے ہیں، جن بزرگوں کو اعلیٰ خیالی اور بلند نظری مسلمات کا درجہ رکھتی تھی وہ اب ایک بازاری انسان کی طرح پست خیالی اور تنگ نظری کا شکار ہیں، تاجروں کے گروہ میں اکثریت اُن لوگوں کی ہے جو حصول زر کے شریفانہ ذرایع کو پس پشت ڈال کر دن رات اس فکر میں مبتلا رہتے ہیں کہ کسی طرح بلیک مارکٹنگ اور اسمگلنگ کے ذریعہ اپنی تجوریاں بھر لیں، جو اربابِ اختیار مملکت کے کلیدی عہدے دبائے بیٹھے ہیں ان کا نصب العین (قیام پاکستان کے بعد) یہ بن گیا ہے کہ جس طرح ممکن ہو وہ ان کلیدی عہدوں پر قابض رہیں، جن بزرگوں کو قیادت کا دعویٰ اور لیڈری کا ادعا ہے، ان کی ایک ہی تمنا ہے اور وہ یہ کہ قیادت کے زینے پر قدم رکھتے ہوئے وزارت کے بامِ بلند تک پہونچ جائیں، غرض سفاہت، کمینگی، ایمان فروشی، تلبیس، مکر و فریب، بے ضمیری اور اخلاقی انحطاط کا ایک طاعون ہے جس نے پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، بعض اوقات تو خود اپنے وجود سے شرم آنے لگتی ہے، اس موقع پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد قومی معاشرے میں یہ انحطاطی کیفیت کس طرح رونما ہوگئی؟ ہم عہدِ غلامی میں کہا کرتے تھے کہ تمام اخلاقی عیوب و مفاسد کا سرچشمہ "محکومی اور غلامی" ہے، جونہی ہم غیر ملکی اقتدار کے جوئے سے آزاد ہوئے، ہمارا دعویٰ تھا کہ تمام اخلاقی اور سماجی عیوب کا قلع قمع ہو جائے گا۔ لیکن گزشتہ چھ سال کی آزاد زندگی کا تجربہ اور مشاہدہ یہ خیال قایم کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ تمام "مفاسد و معائب" کا سرچشمہ پچھلی سیاسی غلامی نہ تھی، بلکہ یہ موجودہ سیاسی آزادی ہے جس نے ہمیں صرف غیر ملکی اطاعت کے بندھنوں سے آزاد نہیں کر دیا بلکہ اُن تمام رشتوں کو بھی کاٹ کر پھینک دیا جو ایک اعلیٰ اور صالح معاشرے کی شیرازہ بندی کے لئے تار و پود کا حکم رکھتے ہیں ـــ اس سلسلہ میں کامل غور و فکر سے حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد لامحالہ ذہن چند نتائج تک پہونچتا ہے۔ ہم آزادی سے قبل اس خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ تمام برائیوں کی جڑ دوسروں کی سیاسی محکومی ہے لیکن تجربہ نے بتایا کہ فقط سیاسی محکومی ہی سرچشمۂ مصائب نہیں ہے، قومی کردار کے لئے سیاسی آزادی بھی اتنی ہی خطرناک اور نقصان رساں ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ معاشی خوش حالی اور سماجی استحکام کے مقاصد کی تکمیل کا سامان موجود نہ ہو، متحدہ ہندوستان میں حصولِ آزادی کے جوش اور قومی عزت و خود مختاری کے انقلابی جذبے نے قوم کی صفوں میں ایک مصنوعی اتحاد پیدا کر دیا تھا۔ ہم سب مسمریزم کے معمول کی طرح ایک ساتھ چند اشاروں پر حرکت کرتے تھے، انفرادی اغراض اس خوبصورتی کے ساتھ اجتماعی مفادات کے سانچے میں ڈھل گئی تھیں کہ عمومی زندگی بہت خوشگوار نظر آتی تھی۔ ہمارے اپنے معاشرے کی تہوں میں جو داخلی تضادات موجود تھے وہ وقتی طور پر دب گئے تھے کیونکہ پوری قومی توانائیاں

ایک اور عظیم تر مقصد کے حصول کے لئے صرف ہو رہی تھیں، یہ بالکل ایسی ہی مثال ہے جس طرح ایک شخص بیک وقت طاعون، زکام، کھانسی اور خارش میں مبتلا ہو جائے اس صورت میں وہ بخار، کھانسی، زکام اور خارش کی فکر چھوڑ کر سب سے پہلے "طاعون" کا علاج کرے گا کیونکہ زندگی کے لئے سب سے بڑا خطرہ وہی ہے۔ انگریزوں کی غلامی ہمارے اجتماعی وجود کے لئے "طاعون" کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہم نے بڑے پرجوش طریقے پر اس "مرض مہلک" کا علاج کیا اور بظاہر اس سے شفایاب ہو گئے لیکن اس "بڑے مرض" کے دور ہوتے ہی دوسرے امراض نے سر اٹھایا اور آخر طاعون کا مارا ہوا مریض دوسری بیماریوں کے ہاتھوں جاں بلب ہو گیا، آج ہماری حالت اسی "جاں بلب مریض" کی سی ہے، بے شک سیاسی آزادی ہمیں حاصل ہو گئی ۔۔ لیکن کیا وہ معاشی خوشحالی، اقتصادی استواری اور سماجی استحکام بھی نصیب ہو گیا؟ جس کے بغیر سیاسی آزادی محض مذاق کی حیثیت رکھتی ہے!

قیام پاکستان سے قبل یقیناً ہم پر ایک قوم کا اطلاق ہوتا تھا کیونکہ ہم سب کا نصب العین حیات ایک تھا! لیکن اب ہم اپنے کو ایک "قوم" نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اب ہمارے مقاصد حیات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، ہر فرد اپنے طبقاتی مفاد کے لئے کوشاں ہے، ہر شخص اپنی ذاتی اغراض کے پیچھے سرگرداں ہے، ملک میں جو ایک خاص قسم کی سیاسی ناپختگی کی کیفیت نظر آتی ہے اس نے سماجی زندگی کے ڈھانچے کو اور بھی متزلزل کر دیا ہے، مستقبل کی طرف سے بے یقینی اور اس اندیشہ نے کہ خدا جانے کل کیا ہو جائے، نفع اندوزی اور منفعت ذاتی کی اس جنگ کو بہت شدید کر دیا ہے، افلاس، بے روزگاری، اور ناامیدی ایک ایسی دیگ میں ابالے جا رہے ہیں جس میں خود غرضی ۔۔ بے اعتباری، ہوسناکی، لالچ، تن آسانی اور ضمیر فروشی کے مہیب مادے کھد بد پک رہے ہیں اور جس کے نیچے جہنم کی آگ جل رہی ہے!

کیا اس ذلیل انحطاط پذیر اور جاں بلب معاشرے میں کوئی شخص اطمینان قلب محسوس کر سکتا ہے؟ کیا ایسے ماحول میں سکون قلب کا سامان فراہم ہو سکتا ہے؟ نہیں بالکل ناممکن ہے کہ ایسا ہو اور جب ایسا ہونا ممکن نہیں تو آخر کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ اس معاشرے میں تخلیقی صلاحیتیں نشوونما پا سکیں گی؟ انسان کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے پورا "صالح ماحول" چاہئے، یہ صالح ماحول فقط بے جان پرستی سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ایک ایسے ہمہ گیر انقلاب کی ضرورت ہے جو سماج کے معاشی تضاد کو رفع کر دے۔ جب تک ان معاشی تضادات کو دور کر کے ایک ایسی سوسائٹی کی تخلیق نہ کی جائے گی جو معاشی نابرابری اور سماجی عدم مساوات کے زہر سے مسموم نہ ہو، تب تک ہم امید نہیں کر سکتے کہ اپنے تصور کا معاشرہ تخلیق کر سکیں، ہمارے وزیر اعظم اور ان کے رفقاء پاکستان کے شاندار مستقبل کی نسبت عجیب عجیب دلخوش کن تصورات رکھتے ہیں اور موقع بے موقع ان کا اعلان بھی کرتے رہتے ہیں، لیکن جب تک وہ صحیح تشخیص نہ کر سکیں گے قومی امراض کا صحیح اور مکمل علاج ممکن نہیں!

یہ ہے داستان پاکستان کے موجودہ معاشی نظام کی جسے وہیں کے ایک معزز صحافی نے بیان کیا ہے اور جس کے غیر صحیح ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

میں بھی اس سے قبل بارہا ظاہر کر چکا ہوں کہ پاکستان کو سب سے زیادہ ضرورت مخلص کام کرنے والوں کی ہے، جو عوام کا اعتماد حاصل کر سکیں اور سب سے پہلے معاشی نظام کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں، لیکن کس درجہ افسوسناک امر ہے کہ پچھلے چھ سال کے اندر پاکستان کوئی قدم اصلاح و ترقی کی طرف نہیں اٹھا سکا ۔۔ موجودہ وزارت نے ایک نیا ورق الٹنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ ورق بالکل سادہ ہونا چاہئے اور اس سے قبل جو روایات کوتاہ بینی اور غلط اندیشی کی پائی جاتی تھیں ان سے اس ورق کو بالکل پاک ہونا چاہئے ۔ اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ پاکستان کا مستقبل ان مسائل سے وابستہ نہیں ہے جن کا تعلق ہندوستان سے ہے، بلکہ خود اپنی اندرونی اصلاح سے ہے اور جب تک اس میں کامیابی نہ ہوگی اس کا مستقبل ہمیشہ خطرات سے گھرا رہے گا۔

مومن کا تغزل

(بہ سلسلۂ ماسبق)

جس طرح دیوان مومن کے زیادہ تر اشعار خیالات و مضامین کے اعتبار سے صحیح رنگ تغزل کے آئینہ دار نہیں اسی طرح مومن کا انداز بیان بھی غزل کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ غزل کی نطافت طریق اظہار کے پیچ و خم اور آمد و تصنع کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ لیکن مومن کے طرز ادا کی سب سے نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ وہ پُرتکلف ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر پیچیدہ ہے کہ بقول پروفیسر ضیاء کے "تقریباً ہر غزل کے نصف اشعار محتاج شرح ہیں"۔ کیا ان کا اسلوب اس وجہ سے پیچیدہ اور تصنع آمیز ہے کہ ان کے خیالات بہت ہی نازک اور گہرے ہیں؟ یا اس لئے کہ انھوں نے اپنے پیچیدہ اور پر تکلف اسلوب سے سچے اور گہرے جذبات و محسوسات کی خانہ پُری کی ہے؟ یا پھر کوئی اور سبب ہے؟ پروفیسر ضیاء کے خیال میں اس کی وجہ "ان کی منفرد شخصیت ہے جو کبھی روش عام پر چلنا گوارا نہیں کرتی ...... مومن ایک genius یا نابغہ تھے اور نابغہ مخصوص فوق العادہ ذہنی اور تخلیقی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے۔ اس بنا پر اگر انھوں نے اپنے مطالب کے ادا کرنے کے لئے ایک نیا اور غیر متعارف پیرایہ ایجاد کیا تو کیا تعجب ہے۔ اس کے علاوہ سب جانتے ہیں کہ ان کا عشق حقیقی نہیں مجازی ہے۔ مجاز بھی وہ جس سے ہوس پرستی اور کوچہ گردی کی بو آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عشق میں بر شتگی اور نامرادی، ربودگی اور خود فراموشی کا کیا کام وہاں تو عاشق یہ چاہتا ہے کہ تھوڑے سے تھوڑے ایثار کے سہارے معشوق سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کیا جائے عجب نہیں کہ اس داؤ پیچ کے کاروبار نے ان کو متصنع اور پیچ دار باتوں کا خوگر بنا دیا ہو۔ پروفیسر کلیم الدین نے سودا کی نسبت کہا ہے کہ وہ مصنوعی خیالات کو اصلی کر دکھاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ مومن اصلی جذبات کو مصنوعی انداز میں پیش کرتے ہیں"۔

پروفیسر موصوف کی یہ معصومانہ توجیہ جس قدر دلچسپ ہے اسی قدر غلط بھی ہے۔ اس باب میں انھوں نے عشق مجازی کو خواہ مخواہ بدنام کیا ہے۔ آخر جرأت کا عشق بھی تو مجازی ہی تھا اور ویسا ہی مجاز جیسا مومن کے یہاں پایا جاتا ہے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک کے اسلوب میں تو قابلِ رشک سادگی اور بے ساختگی ہے مگر دوسرے کے انداز بیان میں بیزار کن الجھاؤ اور بناوٹ۔ دوسرے یہ کہ مومن کے اشعار میں جو پُرتصنع اور پیچ دار باتیں ہیں ان کو اس داؤ پیچ سے دور کا بھی تعلق نہیں جس سے ایک ہوس پرست کام لے سکتا ہے یا کام لیا کرتا ہے۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ مومن اصلی جذبات کو مصنوعی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مومن اپنے مصنوعی انداز میں جو چیزیں پیش کرتے ہیں .... وہ اور جو کچھ بھی ہوں جذبات یقیناً نہیں ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن کے اسلوب میں تکلف اور پیچ و خم کئی وجہوں سے پیدا ہوئے اول تو اس لئے کہ ان کے اکثر پیچیدہ اشعار حد درجہ لایعنی مضامین پر مبنی ہیں اسی لئے وہ پڑھنے والے کو پیچ دار اور الجھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ مومن بعض اوقات بہت وسیع مضمون کو ایک شعر میں ادا کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی وسیع مضمون کو دو مصرعوں کے پیمانے میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس کے بعض اجزاء کو لازمی طور پر چھوڑ دینا پڑے گا۔ اب چونکہ مومن کے مضامین زیادہ تر تخیلی اور مفروضاتی ہوتے ہیں اس لئے ان کے چھوڑے ہوئے اجزاء مشکل سے سامع کے ذہن میں آتے ہیں۔ نتیجتاً شعر پیچ دار بن جاتا ہے۔ تیسرے اس لئے کہ بسا اوقات مومن کے اشعار ایہام پر

مبنی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے بھی مطلب بہ یک نظر سمجھ میں نہیں آتا۔ چوتھے اس لئے کہ مومن کے زیادہ تر اشعار کی بنیاد دقیق مضامین پر ہے۔ ان میں ندرت و تازگی پیدا کرنے کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ وہ سیدھے سادے پیرایہ میں بیان نہ کئے جائیں۔ پانچواں سبب یہ ہے کہ مومن کے بعض اشعار کا سمجھنا بعض باتوں کے جاننے پر منحصر ہے اب جو کوئی ان باتوں سے ناواقف ہے اس کو مومن کا اسلوب قدرتی طور پر پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔ ان خیالات کی تصدیق کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

سرگرم مدح غیر دم شعلہ زن سے ہے　　　دوزخ کو کیا جلن مرے دل کی جلن سے ہے

اس شعر میں پیچیدگی کے دو سبب کا اجتماع ہے۔ اول تو نفس مضمون ہی اس قدر مہمل ہے کہ اس تک سامع کا ذہن آسانی سے نہیں پہونچ سکتا۔ دوم یہ کہ شعر میں نفس مضمون کے بعض اجزا محذوف ہیں اور چونکہ مضمون سرتا سر خیالی اور مفروضاتی ہے اس لئے محذوفات کی طرف خیال فوراً منتقل نہیں ہوتا۔ اس شعر کا جو مطلب الفاظ سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ دوزخ اپنے شعلوں کی لپٹ سے رقیب کی مدح میں سرگرم تو اس کا سبب یہ ہے کہ دوزخ کو میرے دل کی جلن پر رشک آتا ہے۔ یہ مطلب سن کر آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ آخر بات کیا ہوئی۔ عاشق اور رقیب کا دوزخ سے کیا تعلق۔ پھر یہ کہ دوزخ کے شعلے رقیب کی تعریف میں کیوں سرگرم ہیں اور ان کو عاشق صادق یعنی حضرت مومن کے دل کی جلن پر رشک کیوں ہے یہ تو خیر مومن ہی بتا سکتے تھے کہ دوزخ کے شعلے ان سے اور ان کے رقیب سے کیوں دلچسپی لینے لگے اور بالفرض ایسا ہوا بھی تو اس کی اطلاع مومن تک کیونکر پہونچی۔ یعنی جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے اس کا جواب شعر کے محذوفات میں مل جاتا ہے۔ محذوفات کے ساتھ شعر کا مطلب یہ ہے کہ "دوزخ اپنے شعلوں کی لپٹوں سے رقیب کی مدح میں سرگرم ہے اور میرے سوزِ دل کی (جو دوزخ سے کہیں زیادہ ہے) تعریف نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو میرے دل کی جلن پر رشک آتا ہے۔ یعنی چونکہ وہ سوز میں مجھ سے کمتر ہے اس لئے مجھ پر حسد کرتا ہے اور میرے جلانے کے لئے رقیب کی تعریفیں کرتا ہے جو سوزِ عشق سے خالی ہے"[1]

مومن ؎　　کچھ بھی کیا نہ یار کی سنگیں دلی کا پاس　　سب کاوشِ رقیب بجا کوہکن سے ہے

یہ شعر بھی اسلوب کے اعتبار سے پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی پیچیدگی کا اصل سبب نفس مضمون کی نوعیت ہے۔ شعر کا مفہوم پروفیسر ضیاؔ کے الفاظ میں یہ ہے کہ "کوہکن نے پتھر کاٹ کر نہر نکالی اور اپنی محبوبہ کی سنگ دلی کا پاس نہ کیا۔ یعنی پاسِ ادب کا تقاضا تو یہ تھا کہ پتھر کو دلِ یار سے مشابہ سمجھ کر اس کا احترام کرتا۔ مگر نہ کیا۔ اس لئے خسرو کی دشمنی اس سے بالکل حق بجانب ہے"

اول تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ کوہکن یعنی فرہاد کی روداد محبت سے مضمون پیدا کرتے وقت مومن نے اس کی محبوبہ یعنی شیریں کی سنگ دلی کا تذکرہ کیوں کیا جب کہ وہ سنگدل ہرگز نہ تھی۔ شاید مومن نے اس باب میں دادِ تحقیق دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ پھر مانا کہ شیریں سنگ دل تھی اور ایک عاشقِ صادق پر محبوب کی ہر اچھائی برائی کا احترام واجب سہی لیکن اس کا یہ مطلب لینا کیا معنی کہ اگر محبوب سنگ دل واقع ہوا ہے تو عاشق کو چاہئے کہ دنیا میں جتنی بھی سنگین چیزیں ہیں مثلاً پہاڑ، کنکر، پتھر ان سب کو احترام اور محبت کی نگاہ سے دیکھے۔ دو مصرعوں میں مومن نے جتنی لغویتیں بھر دی ہیں ان کو کہاں تک واضح کیا جائے۔ ان لغویات کی طرف اشارہ کرنے سے میرا مقصود صرف یہ ہے کہ مومن کے اسلوب کی

---

[1] یہ مطلب "دیوان مومن" مرتبہ پروفیسر ضیاؔ سے نقل کیا گیا

پیچیدگی اور بناوٹ بڑی حد تک ان کے لایعنی خیالات کا نتیجہ ہے۔ نکہ بقول پروفیسر ضیا اصلی جذبات کو مصنوعی انداز میں پیش کرنا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا مومن کے اسلوب میں پیچیدگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اُن کے بہت سے اشعار ایہام پر مبنی ہوتے ہیں۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

گر بہائے خون عاشق ہے وصال   انتقام زحمت جلاد کیا ؟

اس شعر کا مطلب اثر لکھنوی کے الفاظ میں سنئے۔ لکھتے ہیں۔ "اس شعر میں ایہام ہے۔ وصال کے معنی وصل کے بھی ہیں اور مرنے کے بھی۔ پہلے مصرع میں ایک زبردست نظریہ قایم کیا ہے کہ وصال قتل عاشق کا معاوضہ ہے۔ مگر دوسرے مصرعہ میں اس کو غلط ثابت کیا ہے کہ وصال بہائے خون عاشق نہیں ہے (اب لفظ وصال بمعنی مرگ لینا ہوگا) بلکہ اس زحمت کا انتقام ہے جو جلاد کو قتل کرنے میں پیش آئی اگر ایسا نہیں ہے تو اس زحمت کا بدلہ کیا ہے؟"

اثر صاحب کی اس تشریح سے یہ بات تو واضح ہو ہی گئی کہ اس شعر کی عمارت ایہام پر مبنی ہے۔ لیکن مجھے اتنا اشارہ اور کرنا ہے کہ اس شعر کو گورکھ دھندا بنانے میں ایہام کے علاوہ نفس مضمون کی لغویت کو بھی بڑا دخل ہے۔

مومن :۔ کیوں کہا تھا یہ کہ بکتے بکتے سر پھرنے لگا   اب تو باندھوں گا میں ناصح اسکو بھی زنجیر سے

اس شعر کے الفاظ سادہ ہیں لیکن شعر پیچیدہ ہے اور اس پیچیدگی کا سرچشمہ "سر پھرنے لگا" کا ٹکڑا ہے۔ پروفیسر ضیاء کے الفاظ میں شعر کا مطلب یہ ہے :۔ "ناصح نے کہیں کہدیا کہ تجھے نصیحت کرتے کرتے میرا سر پھرنے لگا مگر تجھ پر اثر نہیں ہوتا۔ عاشق دیوانہ جواب دیتا ہے کہ جب میں آوارہ پھرتا تھا تو میرے پاؤں میں زنجیر ڈالی گئی تھی۔ اب تیرا سر پھرتا ہے تو اس کو میں زنجیر سے باندھوں گا"

اس شعر کے نفس مضمون کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ اس سے اُس طالب علم کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جس نے "میرا سر چکر کھا رہا ہے" کا انگریزی ترجمہ یوں کیا تھا۔

مومن :۔ ذکر کر بیٹھے برائی سے ہی شاید میرا   اب وہ اغیار کی صحبت سے حذر کرتا ہے

کہنا یہ مقصود ہے کہ "ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں" اس خیال میں نہ کوئی گہرائی ہے اور نہ تازگی۔ لیکن شعر پھر بھی پیچیدہ ہے اور یہ پیچیدگی انداز بیان میں صرف اس لئے پیدا کی گئی کہ ایک فرسودہ خیال میں تازگی سی آجائے۔

مومن :۔ حیرت حسن سے یہ شکل بنی   کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

اِس شعر کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ جب کسی کی موت کے متعلق پورا یقین کرنا ہوتا ہے تو اس کے منہ کے قریب آئینہ لیجاتے ہیں کہ اگر ذرا بھی سانس ہوگی تو آئینہ پر نم پیدا ہوجائے گا جو شخص اس امر سے ناواقف ہے اس کو مومن کا مندرجۂ بالا شعر قدرتی طور پر پیچیدہ معلوم ہوگا۔

جس طرح غزل کے اسلوب کا پرپیچ اور تکلف آمیز ہونا ایک عیب ہے اُسی طرح غزل میں علمی اصطلاحات کا استعمال بھی مستحسن نہیں۔ غزل میں علمی اصطلاحات کا استعمال ایسا ہی ہے جیسے ریشم کے کپڑے میں ٹاٹ کی پیوند کاری۔ لیکن پروفیسر ضیا کی پرستارانہ عقیدت کلام مومن کے اس بدنما داغ کا اعتراف کیونکر کرتی۔ چنانچہ انھوں نے اس عیب کو خوبی میں تبدیل کرنے کے لئے بڑی حسین دلیل پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں "حکیم صاحب کی مستجمع الصفات ذات متعدد علوم و فنون کی سرمایہ دار تھی۔ اسلئے کلام میں علمی اصطلاحات کا بلا قصد آجانا ناگزیر تھا۔ قصاید میں تو اس سے چارہ نہیں۔ ان کی غزلیات میں بھی کہیں کہیں یہ رنگ جھلکتا ہے مگر خوبی یہ کہ تغزل کی شان بدستور قایم رہتی ہے اور ان علمی مسایل کی حیثیت ثانوی رہجاتی ہے" پروفیسر ضیا نے اپنے اس دعوے کی تائید میں چند اشعار بھی پیش کئے ہیں ان میں سے دو تین شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں اور موصوف

کے ذوق سلیم کی داد دیں کہ اس کی بدولت ان اشعار کی تغزلانہ شان ہم لوگوں پر منکشف ہوئی ہے ۔

صبح دم آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے ہے ‌‌ ‌‌ رجعت قہقری شمس و قمر آخر شب
دشمنِ سگ کوچہ نہ ہو اس شوخ آہو چشم کا ‌‌ ‌‌ نادم ہوں کعب گرگ پائے نامہ بر سے باندھکر
قرانِ انجم سیارہ برج آبی میں ‌‌ ‌‌ ڈبوئیگی مری چشم ستارہ بار مجھے

شعریت کے فقدان کی بنا پر اول تو ان اشعار کو اشعار کہنا ہی غلط ہے چہ جائیکہ ان کو غزل کے اشعار تسلیم کر لینا اور ان میں شانِ تغزل کو جلوہ گر پانا۔

مومن کے اسلوب کو پرپیچ اور تصنع آمیز قرار دیتے وقت مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ دیوانِ مومن میں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جن میں سادگی اور بے ساختگی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لیکن چونکہ ان کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے اس لئے انکو مومن کے مخصوص رنگ سے علٰحدہ سمجھنا نامناسب نہ ہوگا اور اسی بنا پر مجھے یہ خیال آتا رہا ہے کہ جہاں مومن نے تغزل کا حق ادا کیا ہے وہاں وہ اپنے انفرادی اسلوب کو قائم نہیں رکھ سکے اور جن اشعار میں انھوں نے اپنے مخصوص پیرایۂ بیان سے کام لیا ہے ان میں تغزل کے مطالبات کہیں کہیں پورے ہو سکے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے اپنے اس خیال کا اظہار پروفیسر حامد حسن قادری صاحب کے نام ایک خط میں کیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا:

"آپ کا خیال صحیح ہے کہ مومن خاں سے مخصوص رنگ اور تغزل ساتھ ساتھ نہیں نبھتے اور نبھ بھی نہیں سکتے۔ پیچ پیچ میں بے ساختگی کہاں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ جب وہ دور کی کوڑی لاتے ہیں تو اکثر پورا شعر اور سارا مضمون بے لطف ہو جاتا ہے لیکن کہیں کہیں بات دلچسپ اور خوبصورت بھی نکل آتی ہے۔"

نیاز فتحپوری نے مومن کی نفسیاتی ژرف بینی پر زور دیتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میرے خیال میں مومن ہی ایک ایسا شاعر ہے جو نفسیاتی رموز کو سمجھ کر شاعری کرتا ہے اور ایسی معنوی نزاکتیں پیدا کرتا ہے کہ غور سے تجزیہ کرنے کے بعد ان کا پتہ چلتا ہے۔" جہاں تک مومن کی شاعری کا تعلق ہے معنوی نزاکتوں کا تو ذکر ہی کیا معمولی بات کا بھی اس وقت تک پتہ نہیں چلتا جب تک غور و تامل اور دماغ سوزی سے کام نہ لیا جائے۔ البتہ ان کی شاعری میں نفسیاتی رموز کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ کوئی ایسی خصوصیت نہیں جو صرف مومن ہی کے حصے میں آئی ہو۔ اگر دیانت کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو ہر غزل گو شاعر کے یہاں کسی نہ کسی مقدار میں ایسے اشعار ضرور ملیں گے جو نفسیاتی رموز کے حامل ہوں گے۔

نفسیاتی رموز کو مومن کی خصوصیت خاصہ قرار دینا انتقادی دیانتداری سے بعید ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص غزل جیسی داخلی صنف میں شاعری کرے اور فطرت انسانی کی نفسیات سے بیگانہ رہ کر ایک بڑا شاعر بن جائے یہ اور بات ہے کہ غزل کے اچھے اور برے شاعروں میں بعض کے نفسیاتی رموز کم ہیں اور بعض کے یہاں زیادہ

فراق گورکھپوری نے اپنے مقالہ "حسرت موہانی" میں مومن کے متعلق کئی جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے فارسی ترکیبوں کے ذریعہ سے حسن و عشق کی نفسیاتی و داخلی کیفیتوں کی عکاسی کی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ فراق صاحب کا خیال غلط ہے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی کہ انھوں نے مومن کے کلام میں نفسیاتی و داخلی کیفیتوں کی عکاسی کا ذریعہ خصوصیت کے ساتھ فارسی تراکیب کو کیوں قرار دیا۔ جب کسی شعر میں کوئی نفسیاتی یا داخلی کیفیت ظاہر کی جائے گی تو اس کے لئے سادہ الفاظ بھی اتنا ہی کام آسکتے ہیں جتنا کہ فارسی تراکیب۔ اب یہ شاعر کے اختیار میں ہے کہ وہ حسب موقع شعر میں سادہ الفاظ استعمال کرے یا فارسی تراکیب۔ چنانچہ مومن نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اُن کے کلام میں فارسی تراکیب استعمال اور نفسیاتی و داخلی کیفیات کا اظہار لازم و ملزوم کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے جو فارسی

تراکیب کے باوجود کسی نفسیاتی یا داخلی کیفیت کی ترجمانی نہیں کرتے (اور کرتے کیسے جب کہ ان اشعار کا موضوع کوئی نفسیاتی یا داخلی کیفیت ہے ہی نہیں) اس کے برعکس مومن کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں زبان و بیان کی سادگی کے باوصف محبت کی نفسیات اور داخلی کیفیات کی بڑی اچھی مصوری کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں:-

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا / جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
پاس دیکھو کہ غیر سے کہہ دی / بات اپنی امیدواری کی
مجھے چپ لگی مدعا کہتے کہتے / رکے ہیں وہ کیا جانے کیا کہتے کہتے
کہنا پڑا درست کہ اتنا ہو لحاظ / ہر چند وصل غیر کا انکار ہے غلط
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم / منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بےکسی سے ہم

پرستارانِ مومن کی ایک دلچسپ ادا یہ ہے کہ وہ کلام مومن کی تقریباً ہر خوبی کو صیغۂ "افضل التفضیل" میں بیان کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر ضیا اور پروفیسر وقار عظیم نے مومن کی طنز نگاری کا ذکر بھی اسی انداز میں کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مومن کے یہاں طنز کی بڑی پاکیزہ مثالیں ملتی ہیں لیکن پروفیسر ضیا کا یہ کہنا کہ "اساتذۂ اردو میں مومن سے زیادہ طنز کا استعمال کسی نے نہیں کیا" اور پروفیسر وقار عظیم کی یہ رائے "طنز ہجو یا فن کا ایک ایسا حربہ ہے جسے اردو کے غزل گو شاعروں میں سے کسی نے بھی اتنے سلیقہ اور لطافت سے استعمال نہیں کیا جیسے مومن نے" مبالغے سے خالی نہیں۔ اردو شعرا میں کم از کم میر اور غالب کے یہاں طنز کا استعمال مومن سے زیادہ نہ سہی لیکن کم بھی نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ان دونوں کے طنزیات میں بھی وہی لطافت اور نشتریت پائی جاتی ہے جو مومن کے طنزیہ اشعار کی خصوصیت بتائی گئی ہے۔ ثبوت کے لئے میں یہاں مومن، میر اور غالب کے چند بہترین طنزیہ اشعار پیش کرتا ہوں اور فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں ؎

مومن:- واقعی سجدۂ در ایسی ہی تقصیر ہے اب / جور جو بندہ پہ ہوتا ہے بجا ہوتا ہے
ہوں سزاوار ستم میں نے کیا ہے جرم عشق / بوالہوس ہیں بے گنہ پھر کیوں ڈریں تعزیر سے
رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے / میں نے ہی تم سے بے وفائی کی
مجھ پہ بعد امتحاں بھی جور کم کیونکر کریں / وہ ستائیں غیر کو ایسا ستم کیونکر کریں
گر نہ کھیلیں، جان پر، جی ہار دیں / عشق بازی سیکھئے اغیار سے

میر:- کیونکر نہ ہو تم میر کے آزار کے درپے / یہ جرم ہے اس کا کہ تمہیں پیار کرے ہے
یاں شہر حسن میں تو کہیں ذکر بھی نہیں / کیا جانئے کہ مہر و وفا ہو کہاں کی بات
یاں مہر تھی وفا تھی، واں جور تھے ستم تھے / پھر نکلے بھی تو میرے ہی یہ گناہ نکلے
حال بدگفتنی نہیں میرا / تم نے پوچھا تو مہربانی کی

غالب:- یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے / ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی / بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی / تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے؟
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم / میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب / ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کیا وہ بھی بے گنہ کُش وحق ناشناس ہیں   مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

مومن کے اکثر طنزیہ اشعار کا ایک نقص یہ ہے کہ انھوں نے "حسبِ عادت" ان میں لایعنی مضامین باندھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا ذوق ان لایعنی مضامین سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہو وہ ان اشعار کے طنزیہ پہلو سے کیونکر لطف اندوز ہو سکیں گے۔ مثلاً ؎

غیر عیادت سے برا مانتے   قتل کیا آن کے اچھا کیا
دیکھ مضطر کیوں نہ پھیرے دشنہ پھر   یار ہے وہ کچھ تماشائی نہیں،
مٹی نہ دی مزار تلک آ کے اس پہ بھی   کہتے ہیں لوگ خاک میں اس نے ملا دیا!

مومن کے کلام میں خمریاتی اشعار کی تعداد بہت کم ہے اور اگر اس خصوصیت کو بھی اُن کے امتیازات میں شمار کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ لیکن اس باب میں جناب مجیز سہسوانی کا یہ کہنا کہ مومن نے "غزل کا دامن مضامین شراب سے آلودہ نہ ہونے دیا اور جہاں کہیں بضرورت قافیہ ذکر کیا ہے وہاں اپنی ذات کو بادہ نوشی سے محفوظ رکھا ہے اور اس طرح بیجا یا بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے" نہ صرف مبالغہ آمیز ہے بلکہ مضحکہ خیز اور تبسم انگیز بھی۔ اول تو خمریاتی اشعار میں اپنی ذات کو بادہ نوشی سے محفوظ رکھنا یا دکھانا کوئی ایسی لائقِ تعریف بات نہیں جس کو اجاگر کرنا اور جس کی داد دینا ضروری ہو۔ لیکن اگر ہم اسے تھوڑی دیر کے لئے قابلِ ستائش مان لیں جب بھی مومن داد کے مستحق اس لئے نہیں کہ ان کے یہاں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جن میں وہ اپنے آپ کو رند و بادہ خوار کی حیثیت سے پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

مجھ سے میکش کی طرف محتسب آتا ہے تو آئے   ایک قطرہ بھی سبو و خم و ساغر میں نہیں
پس شکستن خم، زجر محتسب معقول،   گناہ گار نے سمجھا گناہ گار مجھے،

مومن کے بعض نقادوں نے جہاں اور بہت سی دلچسپ اور بصیرت افروز باتیں کہی ہیں وہاں اُردو شعرا میں میر، غالب اور جرأت سے ان کا موازنہ بھی کیا ہے۔ اور اس قدر انصاف کے ساتھ ہر ایک کے مقابلہ میں مومن ہی کو بہتر اور برتر دکھایا گیا ہے سب سے پہلے جرأت اور مومن کا "ٹکراؤ" دیکھئے۔ ان دونوں کے موازنہ کی بنیاد معاملہ بندی ہے جسے وقوعہ گوئی بھی کہتے ہیں۔ اس باب میں جرأت کی عریاں نگاری اور مومن کی متانت و سنجیدگی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ پروفیسر ضیا تذکرہ جلوۂ خضر کی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جرأت بہ سبب کم علمی کے بہت کھل گئے تھے۔ اس کے برخلاف مومن نے ہر جگہ دہلی کی متانت کو نبایا ہے اور دائرۂ تہذیب میں رہ کر جذباتِ عشق کو ادا کیا ہے"۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جب جرأت کے یہاں بھی سنجیدہ معاملہ بندی اور مومن کے یہاں بھی مبتذل وقوعہ گوئی کی مثالیں دال میں نمک کے برابر نہیں بلکہ خاصی تعداد میں موجود ہیں تو پھر ان دونوں کا موازنہ کرتے وقت اول الذکر کی عریانی اور موخرالذکر کی متانت کو کیوں نمایاں کیا جاتا ہے۔ کیا نقدِ صحیح کا تقاضہ یہی ہے کہ جب دو شاعروں کا موازنہ کیا جائے تو ایک کے صرف بلند کلام کو سامنے رکھا جائے اور دوسرے کے صرف پست کلام کو؟ دیانتداری کا اقتضا تو یہ تھا کہ معاملہ بندی میں جرأت و مومن کے صرف متین و شایستہ کلام کا موازنہ کرکے دونوں کے فرق کو واضح اور مرتبے کو متعین کیا جاتا لیکن پروفیسر ضیا صرف یہ کہکر الگ ہو رہے کہ جرأت دائرۂ تہذیب سے متجاوز ہوگئے اور مومن نے دہلی کی متانت کا رشتہ ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ایک جگہ اسی قسم کی "تنقیدی سیاست" کو اپناتے ہوئے نیاز فتحپوری لکھتے ہیں:۔ "مومن کا محبوب بھی جرأت و انشا کی طرح بازاری ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جرأت و انشاء کا عشق کبھی بازاری ہے اور مومن بہت بلندی سے دیکھتے ہیں اور اُسی بلند فضا تک محبوب کو بھی لے جانا چاہتے ہیں۔ جرأت و انشا، اگر اپنی تمنا میں کامیاب نہیں ہوتے تو وہ ترک محبت کے لئے بھی آمادہ

ہوجاتے ہیں لیکن مومن کی پاکیزگیِ ذوق کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی امید کو بھی اس عالم آب و گل سے جدا قرار دے کر ایک غیر فانی چیز بنا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کی محبت کی فضا محبوب و جلوۂ محبوب سے بھی بے نیاز ہوجاتی ہے چنانچہ کہتا ہے :-

قطع امید سے سر کاٹنے کو کیا نسبت — مجھ میں وہ دم ہے ابھی جو ترے خنجر میں نہیں

میں یہاں انشاؔ کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ لیکن جہاں تک جراَتؔ کا تعلق ہے اگر ان کی شاعری کے عامیانہ حصے سے قطع نظر کرلیجئے تو پھر نہ تو اس کا محبوب ہی بازاری ہے اور نہ ان کی محبت ہی سوقیانہ ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ اگر جراَتؔ کا محبوب سر تا سر بازاری ہوتا تو ان کے یہاں اس قسم کے اشعار نہ ملتے ؎

کوچۂ جاناں سے جاتے ہیں پہ جا سکتے نہیں — گو اُٹھاتے ہیں قدم پر دل اُٹھا سکتے نہیں

کیا ہوئے وہ دن جو پیغام آتے تھے ہمیں — اب تو درد ہجر کی ایذا اُٹھا سکتے نہیں

صورت اپنی تم کسی صورت دکھا جاؤ ہمیں — ہیں پرائے بس میں ہم لاچار آ سکتے نہیں

وہ سوز دل سے بھر لاتا تھا اشک سرخ آنکھوں میں — اگر ہم جی کی بے چینی سے آہ سرد بھرتے تھے

سُنا ہے وہ خدا ناکردہ ہے بیمار کیا کیجے — عیادت کو بھی جانا ہے ہمیں دشوار کیا کیجے

اور اگر جراَتؔ کا عشق بازاری ہوتا تو وہ اس قسم کے دل گداز اشعار ہرگز نہ کہہ پاتے ؎

ترے ہی دیکھے جراَتؔ کی یہ حالت ہوگئی غم سے — کہ اپنے سے تو اس کو پھر نظر دیکھا نہیں جاتا

دیکھ اس گل کو جو شعلہ سا جگر سے چمکا — کیا مرا داغ کہن پھر نئے سر سے چمکا

آج کیا جانے کیا ہوا ہم کو — کل تک ایسا تو جی نڈھال نہ تھا

کریں عاں قصد کیونکر اضطراب دل جتانے کا — کسی صورت نہ ہو مقدور جس جا لب ہلانے کا

کیا کہیں وصل ہوئے پھر بھی زباں سے اپنے — حرفِ مطلب نہ کوئی منہ سے ہمارے نکلا

روئے ہے بات بات پر جراَتؔ — ہے گرفتار یہ کہیں نہ کہیں

بھلا دیکھو تو ہم تم ایک ہی بستی میں بستے ہیں — سو تس پر یہ غضب ہے دیکھنے کو بھی ترستے ہیں

سختیاں دردِ محبت کی نہ پوچھو سے ہے — جی ہی جانے ہے جو کچھ دل نے اذیت پائی

یہ نہ کہہ یاد آئی کس کی جو کلیجے پر مرے — سانس کے لینے میں اک برچھی سی لگ جانے لگی

اختصار کی غرض سے اتنی ہی مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ اس قسم کے تیر و نشتر جراَتؔ کے یہاں بہت ہیں اور ایسا تو نہیں ہے کہ جراَتؔ کے یہ اور اسی قسم کے دوسرے اشعار نیازؔ صاحب کی نظر سے نہیں گزرے لیکن اس کا کیا علاج کہ ان کی مومن پرستی جراَتؔ کے ساتھ انصاف کرنے کی روادار تھی ہی نہیں اور اسی لئے جراَتؔ کے صرف عامیانہ اشعار کو سامنے رکھ کر جتنی پست رائے قایم کی جا سکتی تھی وہ اس کا اظہار کر گئے اور اس ضمن میں انھوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ جن تیروں سے وہ جراَتؔ کو مجروح کر رہے ہیں ان کا نشانہ مومنؔ کو بھی بنایا جا سکتا ہے مثلاً انھوں نے مومنؔ کی پاکیزگیِ ذوق کا جو قصیدہ لکھا ہے اُس کی تشبیب میں یہ فرما گئے کہ "جراَتؔ و انشاؔ اگر اپنی تمنا میں کامیاب نہیں ہوتے تو وہ ترک محبت کے لئے بھی آمادہ ہو جاتے ہیں"۔ لیکن کیا اس جرم کے گنہگار مومنؔ نہیں ہیں؟ آخر نیازؔ صاحب مومنؔ کا یہ شعر کیوں بھول گئے ؎

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری — واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

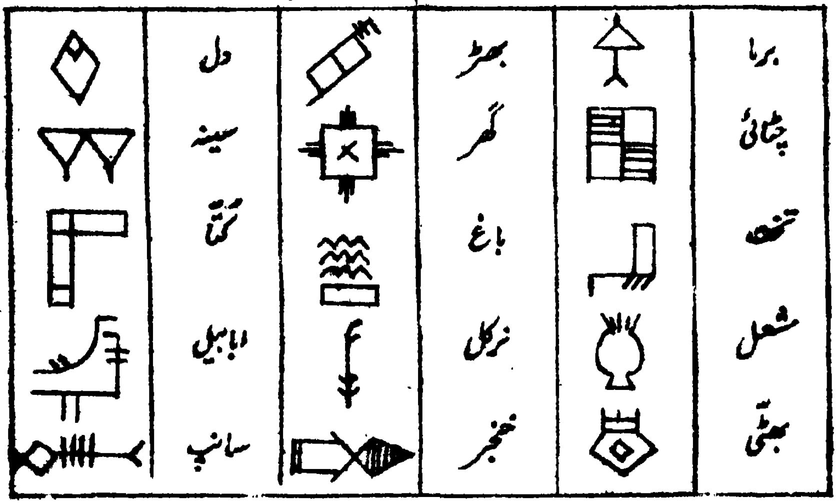
جراَتؔ کا پست کلام بغایت پست سہی لیکن جہاں انھوں نے صحیح اور پاکیزہ رنگ کی شاعری کی ہے وہاں جذبات کی متانت، شائستگی اور بلندی، تجربات کے خلوص اور واقعیت۔ اور انداز بیان کی روانی، سلاست اور حلاوت کے اعتبار سے وہ کہیں کہیں مومنؔ کے ہمسر اور اکثر جگہ برتر نظر آتے ہیں علاوہ ازیں جراَتؔ کے یہاں لسانیاتی شاعری کے بھی بعض پرکیف نمونے ملتے ہیں اور یہ وہ عنصر ہے جس سے مومنؔ کا کلام بالکل خالی ہے۔ (باقی) نظیر صدیقی

فنِ تحریر کی تاریخ

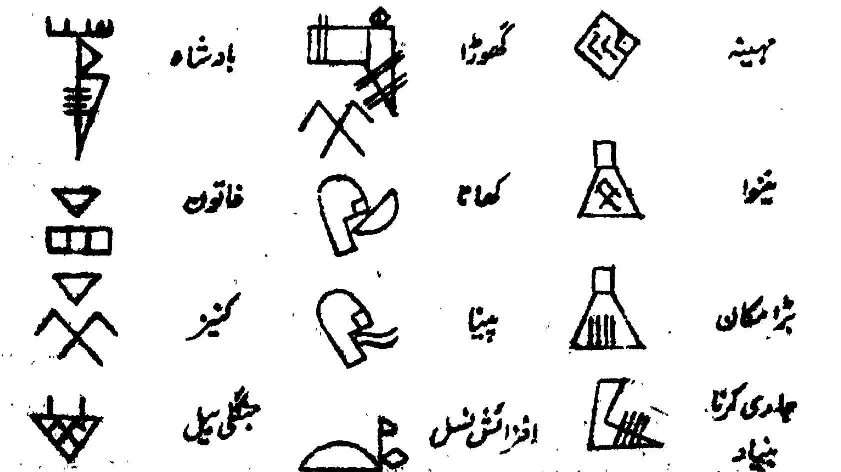
(بہ سلسلۂ ماہ جولائی)

سمیری رسم خط عراق کی سمیری قوم کا عروج تقریباً ۵۰۰ سال (۲۵۰۰ قبل مسیح سے ۲۰۰۰ قبل مسیح تک) رہا۔ یہ قوم کہاں سے ہجرت کرکے عراق آئی اور نسلی و لسانی اعتبار سے اس کا تعلق کس گروہ سے تھا، اس کی پوری تحقیق ابھی تک نہیں ہو سکی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی زبان قدیم ترکی، منگولی اور دراوڑی سے ملتی جلتی تھی۔

ان کا رسم خط تصویری تھا۔ اس میں تقریباً دو ہزار نقوش و تصاویر سے کام لیا جاتا تھا، جن کی دو قسمیں تھیں، سادہ تصاویر (PICTOGRAMS) اور تصاویر خیالی (IDEOGRAMS) قسم اول میں ہر تصویر سے وہی چیز مراد لی جاتی ہے جس کی تصویر ہوتی تھی جیسے:-



قسم دوم میں دور کے معنی مراد ہوتے تھے، جیسے سورج بنا کر دن یا وقت اور پاؤں بنا کر چلنا یا کھڑا ہونا۔ بعض خیالات کا اظہار مرکب تصاویر سے بھی کیا جاتا تھا۔ مثلاً:



بادشاہ کے لئے آدمی اور تاج کی تصویر اور خاتون کے لئے عورت اور لباس کی (عورت کے لئے پوری تصویر بنانے کی جگہ اُس کے مخصوص عضو کا بنانا کافی سمجھا جاتا تھا) اسی طرح کنیز کے لئے عورت اور پہاڑ کی تصویر بنائی جاتی تھی (شاید اس لئے کہ اُس زمانہ میں پہاڑی عورتوں کو گرفتار کر کے لونڈیاں بنا لیا جاتا تھا)۔

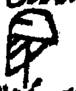
بیل کے چہرے کے اندر پہاڑ کا نشان بنا کر جنگلی بیل مراد لیا جاتا تھا۔ گھوڑے کے لئے یہ لوگ گدھے (آنشو) اور پہاڑ (کُر) کی تصویر بناتے تھے کیونکہ ان کی زبان میں گھوڑے کو "پہاڑی گدھا" (آنشوکُر) کہتے تھے۔

کھانے کے لئے یہ لوگ آدمی کا چہرہ بنا کر اُس کے منہ سے پیالہ لگا دیتے اور پینا لکھنے کے لئے حلق کے پاس پانی کی لہر بنا دیتے، افزائش نسل کے لئے بیج اور انڈے کی تصویر بنائی جاتی تھی (گویا انسان کا اولاد پیدا کرنا ان کے نزدیک بیج کے انڈے کے تھا۔

سورج کرنوں کی علامت مانا جاتا تھا جس میں تیس کا ہندسہ لکھ کر مہینہ مراد لیا جاتا تھا۔ سمیر کے شمال میں ایک شہر نینوا تھا جو آگے چل کر اشوری قوم کا دارالحکومت ہوا۔ اُس کے لئے سمیری رسم خط میں مکان اور مچھلی کی تصویر بنائی جاتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا یہ شہر ماہی گیروں کی بستی تھا۔

کسی شے میں عظمت یا کثرت کا مفہوم پیدا کرنے کے لئے اصل نشان میں چار لکیروں کا اضافہ کر دیا جاتا جیسے اگر مکان کی تصویر بنا کر اُس میں چار لکیریں (کھڑی یا آڑی) کھینچ دی جاتیں تو اس کے معنی بڑا مکان ہو جاتے۔ پاؤں کھڑا ہونے اور چلنے کی علامت تھا۔ اگر اُس میں چار لکیریں بڑھا دی جاتیں تو اُس کے معنی جلدی کرنے کے ہو جاتے۔

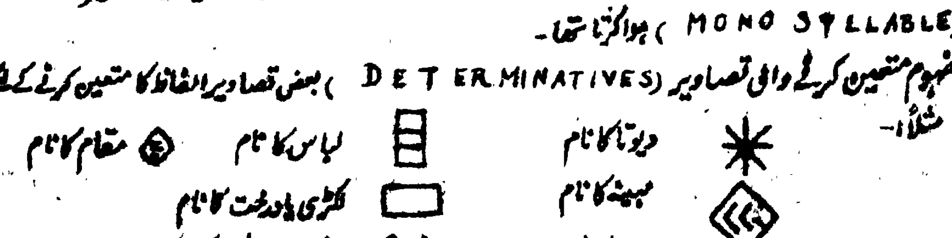
ان کو سمیری زبان میں گُو والے نشانات کہتے تھے۔ گُو کے معنی ان کی زبان میں بڑھانے یا اضافہ کرنے کے تھے (ہو سکتا ہے کہ ہماری زبان میں مثلاً گُنا (جیسے دوگنا، چوگنا) سمیری زبان ہی سے آیا ہو)

۱۔ تصویری الفاظ (WORD SIGNS) سمیری رسم خط میں نشانات کو پڑھا نہیں جاتا تھا بلکہ دیکھا اور سمجھا جاتا تھا یہ تصویریں جن خیالات کو ظاہر کرتی تھیں اُن سے متعلق الفاظ استعمال کئے جانے لگے۔ مثلاً ستارے  کو وہ "آن" کہتے تھے اس کے بعد کو ستارے کا نشان ہی آواز "آن" کا مظہر قرار پایا۔ پھر چونکہ ایک ہی نشان سے مختلف خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ لہٰذا ایک ہی نشان کئی کئی آوازوں کے لئے استعمال ہونے لگا، ایسے نشانات کو (POLY PHONES) کہتے ہیں۔ مثلاً سمیری رسم خط میں انسان کا چہرہ  چار چیزوں کو ظاہر کرتا تھا:۔ چہرہ، بولنا، چلانا، لفظ اور اس طرح یہ چار آوازوں کا (دگ، گگ اور انیم) کا حامل تھا۔

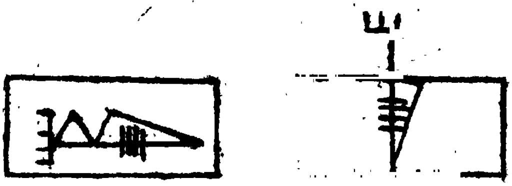
اس کے علاوہ ایک دوسری صورت اور تھی جس میں بعض خیالات کو ایک سے زاید طریقوں سے (بذریعۂ تصاویر) ظاہر کرتے تھے اور اس طرح ایک ہی آواز کے بہت سے نشانات بن گئے تھے جنہیں (HOMO PHONES) کہتے ہیں۔

۲۔ تصویری کلمات (SYLLABIC SIGNS) بعض صورتوں میں تصویروں کے معنی نظر انداز کر دئے جاتے ہیں اور صرف آوازیں لی جاتی ہیں۔ ایسی دو تین آوازوں کے ملانے سے جو مرکب آواز تیار ہوتی ہے وہ عموماً اُن کی زبان کا کوئی ایسا لفظ ہوتا ہے جس کی تصویر نہیں بنائی جا سکتی۔ یہ آوازیں یک رُکنی (MONO SYLLABIC) ہوتی ہیں کیونکہ سمیری زبان کا ہر لفظ ایک کلمہ مفرد (MONO SYLLABLE) ہوا کرتا تھا۔

۳۔ مفہوم متعین کرنے والی تصاویر (DETERMINATIVES) بعض تصاویر الفاظ کا متعین کرنے کے لئے بنائی جاتیں۔ مثلاً:۔



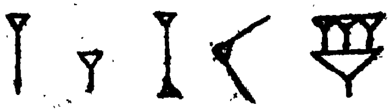
تحریرات ۔ تقریباً ۳۰۰۰ ق ۔ م سمیری رسم خط میں ایک زبردست انقلاب ہوا یعنی پہلے وہ چینی رسم خط کی طرح اوپر سے نیچے کو کھڑے خانوں میں لکھا جاتا تھا (لکھنا دائیں طرف سے شروع کرتے تھے) لیکن بعد کو بائیں سے دائیں کی طرف آڑے خانوں میں لکھا جانے لگا۔ یہ غالباً لکھنے میں آسانی پیدا کرنے کے لئے کیا گیا تھا ۔ چونکہ بعض نشانات ایسے تھے جو کھڑا لکھنے پر خانے سے باہر ہو جاتے اس لئے انھوں نے خانوں کو افقی صورت دیکر بائیں طرف سے لکھنا شروع کیا جس کی وضاحت ذیل کے نقشے سے ہو سکتی ہے :۔



عام طور سے سمیری رسم خط صاف کی ہوئی چکنی مٹی کی تختیوں پر لکھا جاتا تھا جنھیں لکھ کر دھوپ میں سکھا لیتے تھے ۔ خصوصی اہتمام تختیوں کو بھٹیوں میں پکا لیا جاتا تھا۔

پرانے کتبات کی لکھائی بڑی بھدی تھی اس عیب کو دور کرنے کے لئے جودتِ نظر کے زمانے سے کوشش شروع کی گئی ۔ چونکہ مٹی پر تصویریں اور گولائیوں کا بنانا مشکل ہوتا ہے اور لکیروں کو کھینچنا نسبتاً آسان ۔ اس لئے نشانات کو باقاعدہ بنانے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر نشان لکیروں کا مجموعہ معلوم ہونے لگا ۔ اسی بناء پر اس لکھائی کو (LINEAR SCRIPT) کہتے ہیں۔

اس کے بعد ایک دوسری تبدیلی ہوئی ۔ سمیری کاتبوں نے لکھنے میں مزید سہولت پیدا کرنے کے لئے ایک خاص طرح کے قلم استعمال کرنا شروع کئے جن کے سرے کو مٹی پر دبانے سے میخ یا پیکان کا نشان بنتا تھا ۔ یہ میخیں تین ناپ کی ہوتی تھیں ' بڑی ' چھوٹی اور چھوٹی ۔ چھوٹی بڑی کی نصف ہوتی تھی ، ایسی دو میخوں کو نوک کی طرف سے ملا سکتے تھے یا موٹے سرے کی طرف سے ۔ تیسری میخ اتنی چھوٹی ہوتی تھی کہ اگر یہ چھوٹی والی تین میخیں کھڑی کی جا سکتی تھیں اور اس کی اونچائی بڑی کی نصف ہوتی تھی۔



اور ابتدائی میخی رسم خط کی ۔

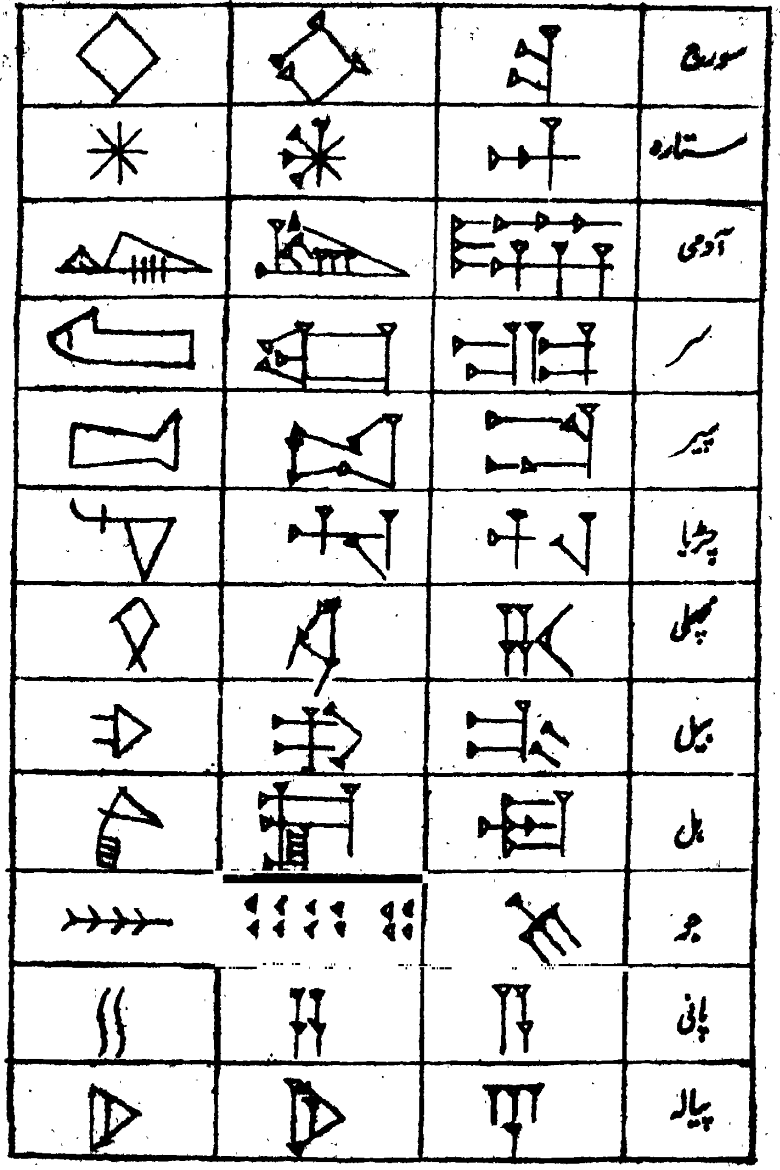
میخی رسم خط دنیا کے رسوم خط میں میخی رسم الخط کی تاریخ بہت طویل ہے ۔ اس کا استعمال سن عیسوی کے آغاز تک جاری رہا ۔ ایک زمانہ تھا جب وہ ایران کی مغربی سرحد سے لیکر ایشیائے کوچک تک مستعمل تھا اور اس نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی تھی ، حتیٰ کہ فراعنۂ مصر کا محکمۂ خارجہ اسی رسم الخط میں خط و کتابت کرتا تھا۔

اس رسم الخط کے نشانات کبھی کھونٹی (میخ) سے مشابہ ہوتے ہیں ، کبھی تیر کے پھل (پیکان) اور کبھی کیل (مسمار) سے — اسی لئے اسے میخی ، پیکانی اور مسماری کا نام دیا جاتا ہے ۔ آخری نام عربی میں مستعمل ہے ۔

انگریزی میں اس کا نام (CUNEIFORM) ہے جو لاطینی الفاظ (CUNEUS) "میخ" اور (FORMA) "شکل" سے مرکب ہے ۔ یہ نام پہلے پہل ۱۷۰۰ء میں مسٹر طامس ہائیڈ نے استعمال کیا تھا جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں عبرانی کے پروفیسر تھے ۔

بعد کو اکاد ، بابل اور آشور کی سامی اقوام نے بھی تھوڑے سے تغیر کے ساتھ میخی رسم خط استعمال کیا ۔ اس تبدیلی کی کیفیت

آپ کو ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا۔

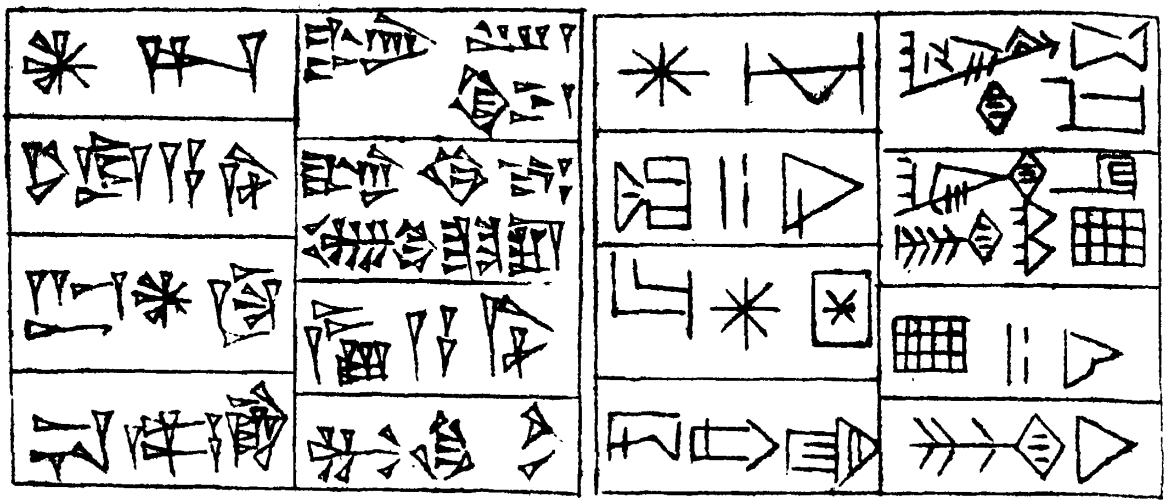


اکادی رسم خط

عراق کے شمالی حصّہ کو اکاد کہتے تھے جہاں سامی قوم آباد تھی۔ اس قوم نے سمیری رسم الخط ۳۰۰۰ ق۔م کے کچھ زمانہ بعد اختیار کیا اور ۲۵۰۰ ق۔م سے اُن میں اس کا رواج عام ہوگیا۔ چنانچہ سامی قوم کے مشہور حکمراں سارگون اول (زمانہ ۲۵۰۰ ق۔م) کا ایک کتبہ سنگ سماق پر اس رسم خط میں برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔

اکادیوں نے سمیری رسم خط کی تصویروں کے نام اپنی زبان میں مقرر رکھے اور ساتھ ہی ساتھ سمیری نام بھی رہنے دئے۔ اس سے نشانات کی آوازیں بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ ورنہ سمیری اور اکادی رسم خط میں بجز اس کے کوئی فرق نہیں ہے۔ اکادیوں کے زمانہ تک سمیری رسم خط

(LINEAR SCRIPT) میں بدل چکا تھا۔ چنانچہ سارگون کا کتبہ اسی لکھائی میں ہے۔ نیچے اکادی رسم خط کا ایک پرانا کتبہ اور اُس کی نقل ہیکانی حروف میں درج کی جاتی ہے۔ یہ دو اینٹوں سے ماخوذ ہیں جو ہنری راولنسن کو ورقہ (قدیم اُرک یا ایریخ) کے کھنڈروں میں ملی تھیں۔



اکادی رسم خط کا کتبہ

ترجمہ۔ اُرخ، مقدس سردار، سُمر کے بادشاہ اور اکاد کے ملک کے بادشاہ سے بلیتس، اُس کی مالکہ نے اپنے لئے ایک مندر بنوایا۔

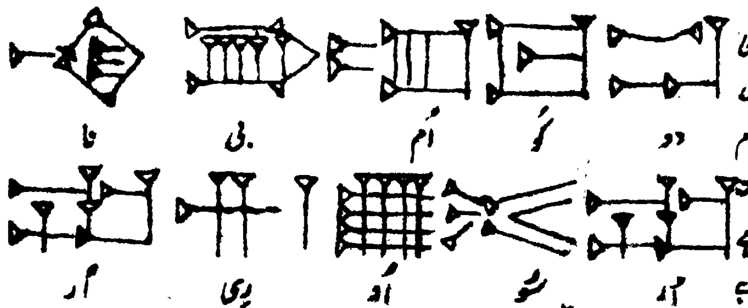
بابلی رسم خط

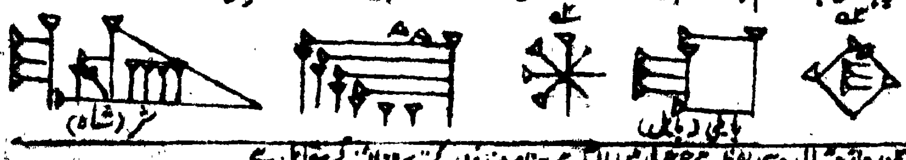
شاہانِ اکاد کے زوال کے بعد حکومت بابل[1] نے عروج حاصل کرنا شروع کیا۔ اُس کا پہلا بادشاہ حموابی (۱۹۰۰ سنہ ق م) تھا۔ اُس کی حکومت رفتہ رفتہ اکاد کی پوری مملکت پر پھیل گئی اور اُس کا نام بجائے اکاد کے بابل پڑ گیا۔

بابل والے زبان اور نسل کے اعتبار سے اکاد والوں سے مختلف نہیں تھے۔ حموابی سے پہلے کی زبان و قوم اکادی کہلاتی تھی اور بعد کی بابلی۔ ان کا رسم خط اکادیوں سے مختلف نہیں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان لوگوں نے میخوں کی ترتیب میں کچھ تبدیلی کر دی تھی اور بعض نشانات کا استعمال ترک کر دیا تھا۔ پھر بھی ان کے رسم خط میں ۶۴۰ سے زیادہ نشانات کام آتے تھے۔ دور آخر میں اس کے نشانات بہت مختصر ہو گئے تھے۔

بابلی رسم خط کا نمونہ یہ ہے:-

سمیری اور اکادی رسم خط کی طرح اسے بھی بائیں سے دائیں کو پڑھا جائے گا۔ یہ شاہِ بابل یعنی اُم گُدو بی اُشر (متوفی ۱۷۰۵ ق-م) کا نام ہے جسے عام طور سے بخت نصر کہتے ہیں۔ یہ اس بات[2] کی علامت ہے کہ اس کے بعد کوئی مقدس نام ہے اور یہ[3] اس بات کی کہ اس کے پہلے کسی جگہ کا نام ہے۔





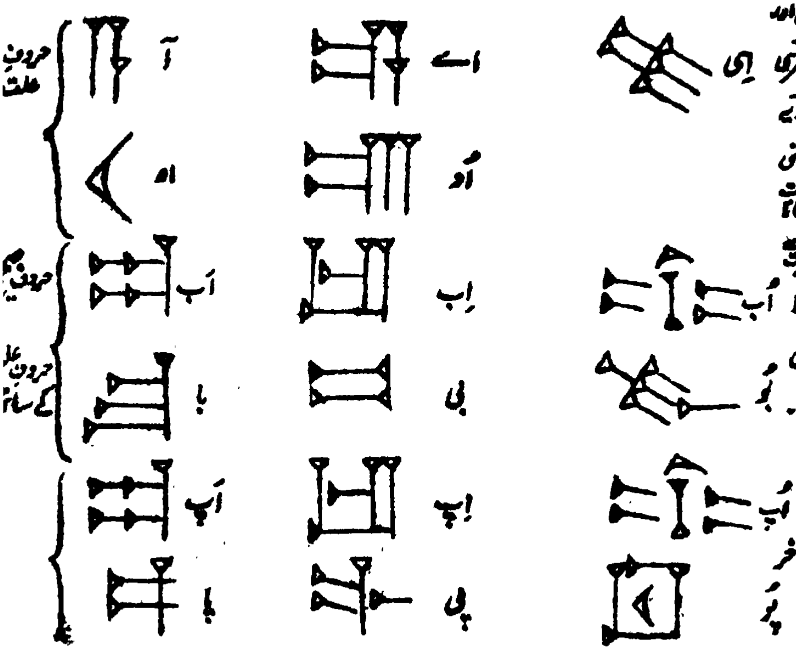
[1] بابل کے لفظی معنی ہیں "خدا کا دروازہ" اِل دیبی لفظ ہے جو عربی میں اللہ ہے یہ نام ہندوؤں کے "پرودار" کے مقابل ہے

آشوری رسمِ خط وادیٔ دجلہ و فرات کا شمالی حصہ آشوریہ یا اسیریا کہلاتا تھا۔ یہ نام اُن کے مشہور شہر آشور سے ماخوذ ہے۔ خود اس شہر کا نام اُن کے دیوتا کے نام پر رکھا گیا تھا۔

آشوریہ میں سمیری رسم خط کا رواج بابل والوں کے بعد تقریباً ۲۳۰۰ ق۔م ہوا۔ بابل اور آشوریہ والے سامی النسل تھے۔ دونوں نے سمیری نشانات کے نام سامی زبان میں رکھے۔ آشوریہ والوں نے بابلی رسم خط میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ یعنی نشانات کو چوکور بنانے کی کوشش کی، یکسانی نشانات کو کچھ گھٹا دیا، انکی ترتیب میں فرق کر دیا، اور بہت نشانات کا استعمال چھوڑ دیا۔ آشوری رسم خط میں کام آنے والے نشانات کی تعداد کل ۵۰۰ تھی جن میں سے تقریباً ۳۰۰ عام طور سے مستعمل تھے۔ انکی پانچ قسمیں تھیں۔

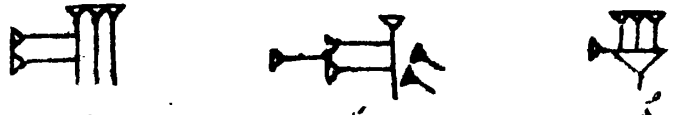
(داہنے سے بائیں کو پڑھئے)

۱۔ یک کنی اصوات[۱] یعنی حروفِ علت یا حروفِ صحیح جن کے شروع یا آخر میں حروفِ علت جُڑے رہتے تھے جیسے:-



مندرجۂ بالا نشانات کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ آشوری میں مفرد حرف ب کے لئے ایک نشان نہ تھا بلکہ چھ تھے۔ یہی حال دوسرے حروفِ صحیح کا تھا۔

۲۔[۲] COMPOUND SYLLABLES ۔ یعنی دو حروفِ صحیح جن کے بیچ میں ایک حرفِ علت ہوتا ہے۔ جیسے:-



شُور　　　　بَل　　　　بت

۳۔ پورے لفظ کا مفہوم ظاہر کرنے والے نشانات ۔ (WORD SIGNS) جیسے:-



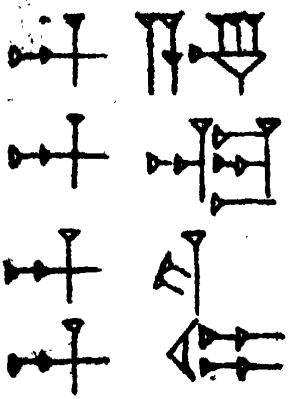
الپو (بیل)　　　　بلیتو (حاکم)　　　　ست (پہاڑ)

۴۔ نشاناتِ تعیینی (DETERMINATIVES) ٹھہر تو والے نشانات جنہیں اشارات یا علامات کے طور پر بعض ناموں کے پہلے یا بعد میں لکھا جاتا تھا، پڑھا نہیں جاتا تھا، یہ حرف اس بات کی طرف اشارہ کرتے تھے کہ ان کے پاس جو لفظ آیا ہے وہ کس چیز کا نام ہے۔ دیوتا کا ہو یا عورت کا ...

---

[۱] انھیں OPEN SYLLABLES بھی کہتے ہیں۔ [۲] انھیں CLOSED SYLLABLES بھی کہتے ہیں۔

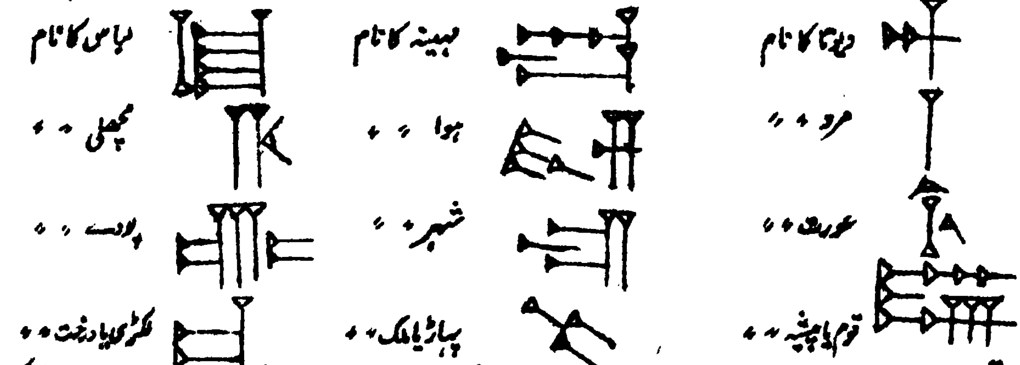
اس طرف دی ہوئی مثالوں سے ان کے استعمال کو آپ اچھی طرح سمجھ سکیں گے :-



اشوری رسم خط بائیں سے دائیں کو لکھا جاتا تھا۔

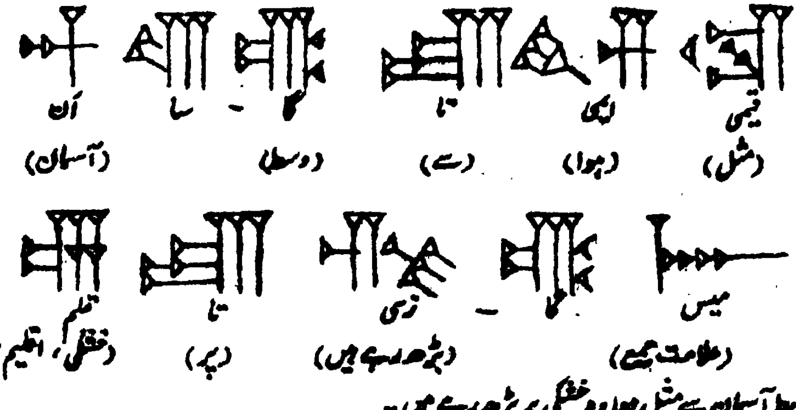
ان مثالوں میں پہلا نشان (ستارے کی مختصر صورت) دیوتا یا تقدس کی علامت ہے اور اس بات کو متعین کرتا ہے کہ اس کے بعد دیوتا یا کسی مقدس چیز کا نام ہے۔

آشوری رسم خط میں کام آنے والے خاص تعیینی نشانات یہ ہیں۔



۵۔ صوتی لاحقے (PHONETIC COMPLEMENTS) وہ نشانات جو الفاظ کے آخر میں اُن کا تلفظ متعین کرنے کے لئے لکھے جاتے تھے۔ جیسے یہ نشان ( ) اُن کے یہاں دو معنی رکھتا تھا۔ سورج اور دن۔ جب اس کے معنی دن ہوتے تو اس کے لئے ایک جداگانہ صوتی لاحقہ استعمال کیا جاتا تھا اور جب اس کے معنے سورج کے ہوتے تو دوسرا لاحقہ لکھا جاتا۔

آخر میں آشوری رسم خط کی ایک عبارت اور اُس کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ اسے بائیں سے دائیں کو پڑھئے :-



ترجمہ :- وسطِ آسمان سے مثل ہوا وہ خشکی پر بڑھ رہے ہیں۔

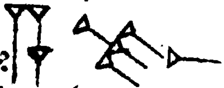
اب تک ہم نے جن میخی (سمیری۔ اکادی۔ بابلی۔ اشوری) رسم خط کا ذکر کیا ہے وہ وادیٔ دجلہ و فرات میں مستعمل تھا۔ اس کے بعد ہم ان ملکوں کا ذکر کریں گے جہاں یہ لکھائیاں قدرے ترمیم و تنسیخ کے بعد رائج تھیں۔

کیپاڈوشیا (زمانہ ۲۰۰۰ ق۔م) - ترکی میں پرانے شہر قیصریہ اور دوسرے مقامات پر کھدائی کے دوران میں بہت سی پختہ تختیاں بیگانی رسم خط

کی ملی ہیں۔ یہ سب تجارتی تحریریں ہیں۔ صرف ایک کتبہ قوانین سے متعلق ہے۔ ان کے لکھنے والے سامی تاجر تھے اور ان کی زبان اور رسم خط اشوری سے مشابہ ہے۔ زمانہ تخمیناً ۲۳۰۰ ق۔م ہے۔ ملک کے جس حصے میں یہ کتبے ملے ہیں اُس کا نام پرانے زمانہ میں "کیپاڈوشیا" تھا لہٰذا انھیں "کیپاڈوشیا کی تختیاں" کہتے ہیں۔

حتی قوم (زمانہ ۱۵۰۰ لغایت ۱۲۰۰ ق۔م)۔ ایشیائے کوچک کی سامی اقوام کے علاوہ حتی قوم (HITTITES) میں بھی پیکانی رسم خط رائج تھا۔ اُس کا دارالحکومت (BOGHAZ KEUI) تھا جو ترکی کے موجودہ دارالحکومت کے قریب ہے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں یہاں پر کھدائی کرتے ہوئے (DR. HUGO WINCKLER) کو پیکانی رسم خط کی بیس ہزار تختیاں ملیں۔ ان کا زمانہ ۱۵۰۰ اور ۱۲۰۰ ق۔م کے درمیان کا ہے۔ ان کی زبانیں مختلف ہیں جو ہندیورپی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں اور اُن میں ہندوستانی اور ایرانی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں ان کا رسم خط بابلی سے ماخوذ ہے۔

بابلی رسم خط میں بعض نشانات پورے لفظ کا مفہوم ظاہر کرتے تھے (LOGOGRAMS) اور بعض محض ارکان (SYLLABLES) الفاظ تھے۔ جب ان لوگوں نے اول الذکر نشانات لئے جیسے مچھلی کے لئے مچھلی کا نشان  تو ان کے اختیار کرنے میں انھیں کوئی دقت نہیں ہوئی کیونکہ ایسے نشانات کا زبان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

لیکن جب انھوں نے دوسری قسم کے نشانات لئے جیسے "ابو" باپ  جو دو (SYLLABLES) سے مرکب ہے تو اُس کا اپنی زبان میں نام "اتش" رکھا گویا انھوں نے اسے (LOGOGRAM) کے طور پر اختیار کیا۔

یہ رسم خط حتی قوم میں اُس کے زوال (۱۲۰۰ ق۔م) تک مستعمل رہا اس کے علاوہ اُن میں ایک تصویری لکھائی بھی رائج تھی۔

تل العمرنہ (زمانہ چودھویں پندرھویں صدی ق۔م)۔ تل العمرنہ، مصر میں ایک مقام ہے جو امینوفس چہارم (اخیناتین) (۱۳۸۰–۱۳۶۲ ق۔م) کا دارالحکومت تھا۔ سنہ ۱۸۸۷ء میں یہاں ۳۰۰ مٹی کی تختیاں میخی رسم خط کی برآمد ہوئیں یہ وہ خطوط تھے جنھیں شاہانِ بابل متا اور امرائے فلسطین و شام نے امینوفس سوم[2] (۱۴۱۵–۱۳۸۰ ق۔م) اور امینوفس چہارم کو لکھے تھے۔ فراعنۂ مصر یا اُن کے گورنروں نے ان خطوں کے جو جواب دئے اُن میں سے بھی بعض کی نقلیں ملی ہیں۔ ان کی زبان اور رسم خط بابلی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت یعنی پندرھویں چودھویں صدی ق۔م میں بابلی زبان اور رسم خط کا استعمال کتنا وسیع ہو گیا تھا۔

زاغ روس (ZAGROS) تقریباً ۱۵۰۰ اور ۱۲۰۰ ق۔م کے درمیان آشوری قوم نے اپنا رسم خط دریائے دجلہ کے مشرقی صوبوں میں بھی رائج کر دیا۔ چنانچہ عرفہ (ARRAPHA) میں یہ رسم خط عام طور سے رائج تھا۔

راس شامرہ (چودھویں صدی ق۔م)۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں ملک شام کے ایک گاؤں راش شامرہ کے پاس (جزیرۂ قبرص کے مقابل) قدیم شہر یگارت کے آثار دریافت ہوئے جو مقامی حکمرانوں کے مقابر اور مندروں سے تعلق رکھتے ہیں، مندر کے کتبخانہ سے جو تختیاں ملیں اُن میں سے انھیں جلد پڑھ لیا گیا، جن پر فنیقی رسم خط میں کتبے تھے، لیکن انھیں پڑھنے میں کچھ دقت ہوئی جن پر ایک خاص قسم کے میخی حروف میں کچھ لکھا تھا۔

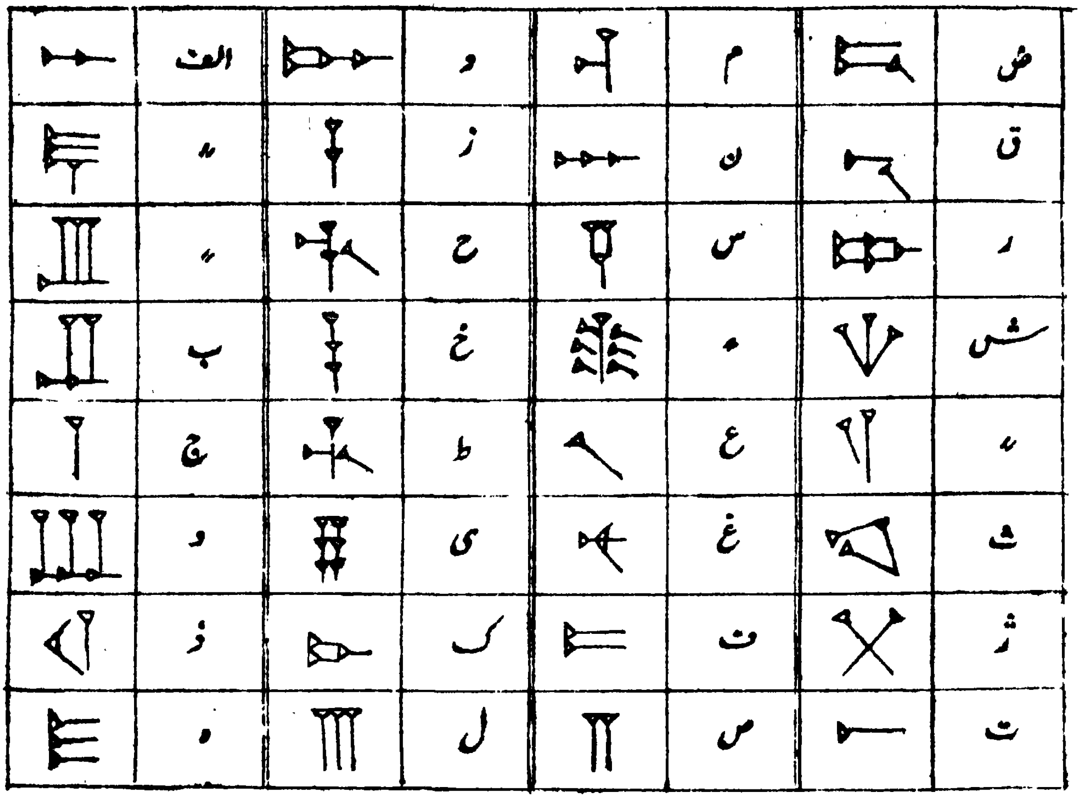
یہ رسم خط چودھویں صدی ق۔م مستعمل تھا۔ اس میں دو زبانیں لکھی جاتی تھیں ایک سامی جو فنیقی اور عبرانی سے مشابہ تھی اور دوسری حُرّی (HURRIAN) جو اُس وقت شمالی شام اور وادیٔ دجلہ و فرات کے وسیع حصوں میں بولی جاتی تھی۔

---

[1] ایک آریہ ذات جو سوریہ (سورج)، ورُن اور اندر کی پوجا کرتی تھی۔ انھوں نے ایک زمانہ میں اتنا عروج پکڑا کہ وادی دجلہ و فرات کے ایک حصہ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ ان کا آخری بادشاہ دشرت تھا جس کا نام ہمیں رامائن کے راجہ دشرت کی یاد دلاتا ہے۔

[2] شہزادی نیفرتیتی کا شوہر۔ اُس کا دوسرا نام "آمین ہوتپ سوم" ہے۔

اس لکھائی میں کل ۳۲ حروف کام آتے تھے جو یہ ہیں :-



ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض آوازوں کے لئے متعدد نشانات ہیں جن کے تلفظ میں یقیناً کچھ فرق رہا ہوگا جس کا علم ہمیں نہیں۔ سمیری بابلی اور آشوری اقوام کے پیکانی رسم خط کی طرح یہ بھی بائیں سے دائیں کو لکھا جاتا تھا لیکن اس کا اُن سے کوئی تعلق نہ تھا۔

آرمینیا (نویں صدی ق۔م) آرمینیا کے لوگوں نے آشوری رسم خط سے اپنی ضرورت کے لحاظ سے کچھ نشانات چن لئے اور اُن میں سے ہر نشان کو بجائے کئی آوازوں کے ایک آواز کا مظہر قرار دیا۔ اس رسم خط کی یہ ایک خصوصیت تھی کہ جب دو پیکان ایک دوسرے کو منقطع کرتے تو بجائے صلیب کے یہ شکل بنائی جاتی اور ایسا اس لئے کیا جاتا کہ کھرے اور آڑے پیکانوں کے ملنے کی جگہ پر کا پتھر ٹوٹ جاتا تھا۔

شاہانِ وان کی یادگاروں اور مٹی کی تختیوں کے کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں یہ رسم خط عام طور سے رائج تھا۔ وانی کے کتبات کی زبان (ALARODIAN) گروہ کی زبانوں سے تعلق رکھتی ہے جس کی موجودہ نمائندہ جارجین زبان ہے۔

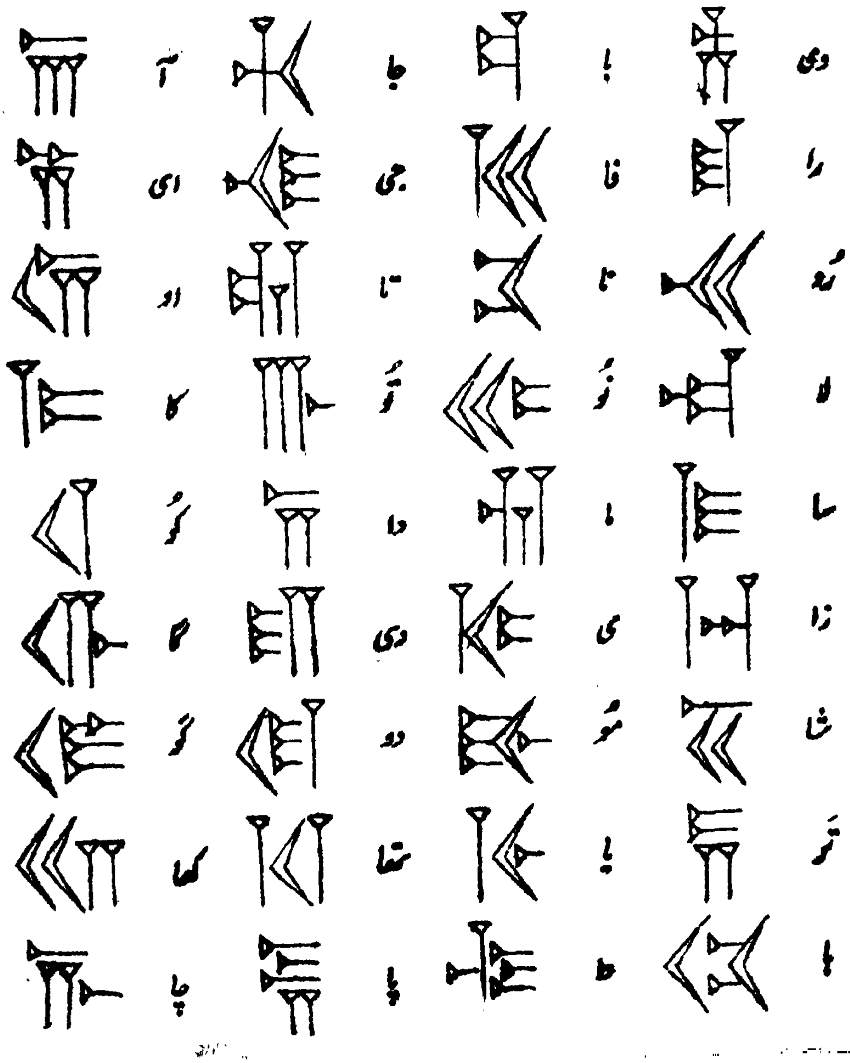
جب آرمینیا میں آریہ لوگ آباد ہو گئے تو یہ رسم خط متروک ہو گیا۔ اس کا کوئی کتبہ ساتویں صدی ق۔م کے بعد کا نہیں ہے۔ اس اہم خط کو ارمنی (ARMENIAN) کے علاوہ وانی (VANNIC) بھی کہتے ہیں۔

قدیم فارسی رسم خط چھٹی اور چوتھی صدی ق۔م کے درمیان فارس میں پیکانی رسم خط مستعمل تھا۔ اُس میں کل ۴۱ نشانات تھے، جن کے ترکیبی پیکانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ان میں سے ایک نشان لفظوں کو جدا کرنے کے لئے اور چار آہورا مازدا، بادشاہ، سرزمین اور صوبہ کے الفاظ کے مظہر تھے۔



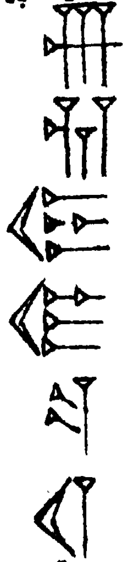
آہورا مازدا	شیاتھیا	بومی	داہیا	لفظوں کو جدا
(خدا کا نام)	(بادشاہ)	(زمین)	(صوبہ)	کرنے والا نشان

بقیہ ۴۲ نشانات حروفِ علت (VOWELS) اور حروفِ صحیح + حروفِ علت SYLLABLES تھے وہ یہ ہیں[1]۔



[1] اس نقشہ میں فارسی حروف کو سنسکرت حروفِ تہجی کے مطابق ترتیب دینے میں سر ہینری رالنسن کی پیروی کی گئی ہے۔

ابھی تک یہ بات نہیں طے ہو سکی کہ آیا فارس کا میخی رسم خط رفتہ رفتہ ارتقاء پذیر ہوا تھا یا اُس کے نشانات بیک وقت وضع کرلئے گئے تھے۔ مزید برآں اُس کا وادی دجلہ و فرات کے رسم خط سے کیا تعلق تھا۔ (PROF. OPPERT) نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ پہلے ایران کے لوگوں نے آشوری رسم خط سے چند نشانات لئے پھر اُنھیں آشوری ناموں کے بجائے فارسی نام دئے اور ان ناموں کے شروع کی آواز لینے اور پیکانوں کے گھٹانے یا ترتیب میں فرق کرنے سے فارسی کا میخی رسم خط بنا۔ مثلاً:۔



	(معنی)	(لفظ)	(زبان)
	شہزادہ	روبو	اشوری
(ا)	آقا	ماتشا	فارسی
	بہر	سپو	اشوری
(گ)	"	گزیکا	فارسی
	سورج	شمش	اشوری
(کو)	"	گرو	فارسی

لیکن اب یہ نظریہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ہو سکتا کہ اُس کے نشانات کا آشوری اور بابلی رسم خط کے پیکانی حروف سے کوئی تعلق نہ ہو اور صرف پیکانوں کے استعمال کا تخیل اُن سے اخذ ہو۔ اسی طرح بجائے سیکڑوں کے چند درجن نشانات استعمال کرنے کی خواہش آرامی حروف تہجی کو دیکھ کر پیدا ہوئی ہوگی جس کا استعمال رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔

فارس کے پیکانی حروف کی ایجاد کا زمانہ بھی مشکوک ہے۔ بعض کیخسرو یا سیروس کبیر کا عہد (۵۲۹ – ۵۵۰ ق۔م) ظاہر کرتے ہیں اور بعض دارا یا داریوش اعظم (۴۸۶ – ۵۲۱ ق۔م) کا۔ بہر حال اس رسم خط کے مشہور کتبے دارا اور اُسکے زمانہ کے بعد کے ہیں جن میں اہم ترین "بے ستون کی چٹان کا کتبہ" ہے[1] اس کے بعد نقش رستم اور کوہ الوند کے کتبات ہیں۔ خشیارشا (XERXES) یا زرکسیز کا وہ کتبہ بھی قابلِ ذکر ہے جو وآن کی جھیل کے پاس ایک چٹان پر کندہ ہے۔ علاوہ ازیں اصطخر (PERS POLIS) کے کتبے بھی خاصے اہم ہیں۔

خاندانِ ہخامنشی (ACHAEMENID DYNASTY) کے علاوہ (جس میں دارا اور زیرو وغیرہ شامل تھے) خاندان سلیوکس (SELUCID DYNASTY) کے کتبے بھی اسی رسم خط میں پائے جاتے ہیں۔

شاہان عجم نے اپنے کتبے تین زبانوں میں کندہ کرائے ہیں اسی لئے اُنھیں (TRILINGUAL INSCRIPTIONS) کہتے ہیں۔ یہ زبانیں (۱) قدیم فارسی (۲) ایلمی اور (۳) بابلی ہیں۔ ان کا رسم خط بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ بابلی رسم خط کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ اب ہم ایلمی رسم خط کا ذکر کرتے ہیں۔

ایلم کا پرانا رسم خط PROTO-ELAMITE

خلیج فارس کے شمالی مشرقی علاقہ کو پرانے زمانہ میں ایلم کہتے تھے اُس کا دارالحکومت سوسا یا شوشان تھا۔ اس علاقہ میں تقریباً وہی حصہ شامل تھا جسے اب خوزستان

[1] مولانا ابوالکلام آزاد "غبار خاطر" کے مقدمے میں لکھتے ہیں "ایران کے قدیم آثار میں ایک اثر "بے ستون" کے نام سے مشہور ہے اور داستان سراؤں نے اُسے فرہاد کوہکن کی طرف منسوب کر دیا ہے مگر دراصل یہ "بے ستون" نہیں ہے "بہستون" (بہستان یا بغستان) ہے اقدیم فارسی میں باغ "خدا یا دیوتا" کو کہتے تھے یعنی یہ مقام "خداؤں کی جگہ" تھی ـــــ انگریزی (BEHISTUN)

کہتے ہیں یہاں پر پرانے زمانے میں ایک تصویری لکھائی کا رواج تھا جس میں کئی سو نشانات کام آتے تھے مثلاً۔



اس لکھائی کو ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا ہے بجز اس کے کہ گنتی کی علامتوں کا کسی حد تک پتہ چل گیا ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہو گئی ہے کہ اُن کے حساب کی بنیاد اعشاریہ والے طریقہ پر رکھی گئی تھی۔

اس رسم خط کا سمیریوں کے رسم خط سے گہرا تعلق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایلم والوں کا رسم خط سمیریوں سے ماخوذ ہو یا اس کے برعکس سمیریوں کا ایلم والوں سے اور یا پھر دونوں کا ماخذ ایک ایسی لکھائی ہو جس کا علم ہمیں نہیں ہے۔ (اور یہی بات وادیِ سندھ کے رسم خط کے متعلق بھی جا سکتی ہے جس کی علامتوں سے ایلمی اور سمیری رسوم خط کی علامتیں بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔

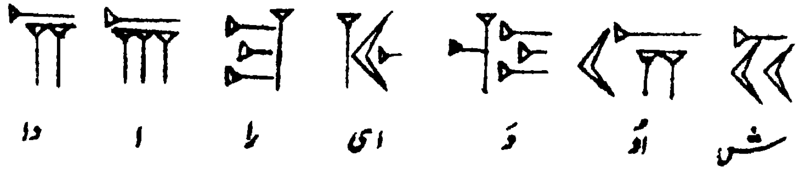
اس رسم خط کے کتبے بہت کم ہیں۔ پتھر پر لکھے ہوئے کتبوں کی تعداد صرف نو ہے اور مٹی کی تختیوں کی کئی سو (زمانہ تقریباً ۳۰۰۰ ق-م) لکھائی کا رخ عموماً دائیں سے بائیں کو ہے اور کمتر بائیں سے دائیں کو۔ ایسے کتبے بھی ہیں جن پر دونوں طرف سے لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ لکھائی کی شان (LINEAR) ہے یعنی اُنمیں سیدھی لکیریں زیادہ ہیں۔ اور گولائیاں کم۔

ایلم کا نیا رسم خط (NEO-ELAMITF)

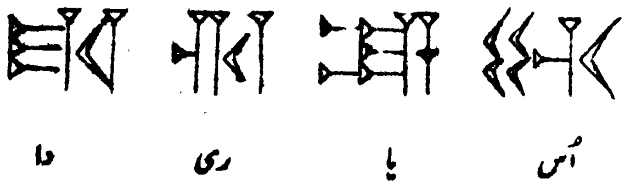
بعد میں یہاں کے باشندوں نے پرانی تصویری لکھائی کو چھوڑ دیا اور بابل والوں کے میخی رسم خط سے اپنی ضرورت بھر کے نشانات چُن لئے (تخمیناً ساتویں یا چھٹی صدی ق-م) پھر اُن میں بھی کافی تبدیلیاں کی گئیں، اس لکھائی میں کل ۱۱۳ نشانات کام آتے تھے جن میں ۸۰ سے کچھ اوپر ارکانِ الفاظ (SYLLABLES) تھے اور بقیہ الفاظ کے مظہر (IDEOGRAMS) اور معنی متعین کرنے والے نشانات (DETERMINATIVES) تھے۔

شاہانِ عجم کے پرانے کتبات پر قدیم فارسی کے بعد دوسری جگہ اسے دی جاتی ہے اور تیسری بابلی کو۔ تینوں ایک دوسرے سے ممیز ہیں لیکن پھر بھی ایلمی اور بابلی رسم خط میں تھوڑا سا فرق ہے یہاں پر ہم "بے ستون" کے کتبے پر پائے جانے والے دادیوش اعظم کے نام تینوں رسوم خط میں درج کرتے ہیں جن سے آپ اس کا باہمی فرق سمجھ سکتے ہیں:۔

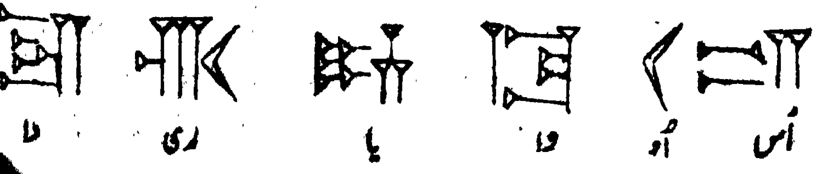
فارسی



بابلی



ایلمی



ان تینوں لکھائیوں کی زبانیں بھی مختلف ہیں۔ فارسی رسم خط کے

قبیلوں کی زبان ہند یورپی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ بابلی حصے کی زبان سامی ہے اور ایلامی کتبات کی زبان (AGGLUTINATIVE) ہے۔ وہ یورال التائی شاخ سے تعلق رکھتی ہے (مسٹر نارس کا کہنا ہے کہ وہ فن لینڈ کی سوئتی زبان سے مشابہ ہے) اسے ایران کے شمالی مغربی حصے کی سیتھی قوم بولتی تھی۔

ایلامی لکھائی کے اور بھی کئی نام ہیں۔ دار الحکومت کے لحاظ سے سوسائی (SUSIAN) سوسا کے شمالی حصے یعنی میڈیا میں لکھا جانے کی وجہ سے (MEDIAN) اور لکھنے والوں کی قومیت کے لحاظ سے اُسے (SCYTHIAN) کہتے ہیں۔

میخی رسم خط کا خاتمہ

بابل اور آشوریا کی سلطنتوں کا کمزور ہو جانا میخی رسم خط کے خاتمہ کا ایک بڑا سبب تھا۔ کیخسرو کی فتح بابل (۵۳۹ ق م) اس لکھائی کے حق میں ایک ضرب کاری ثابت ہوئی۔ بابل کی تباہی کے بعد اس کا استعمال رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔

اس کے متروک ہونے کا ایک دوسرا سبب فنیقی رسم خط کی ایجاد و اشاعت تھی (بابلی اور آشوری رسوم خط میں سیکڑوں نشانات کام آتے تھے جن میں سے بعض چودہ چودہ پندرہ پندرہ پیکانوں سے بنتے تھے، برخلاف اس کے فنیقی رسم خط میں کل ۲۲ حروف کام آتے تھے جن کا لکھنا پڑھنا بھی آسان تھا۔

فنیقی رسم خط کی ارامی شکل ۸ ویں صدی ق۔م شام میں رائج ہو گئی تھی اور اُس کا رواج بابل اور آشوریہ میں بھی ہونے لگا تھا لیکن جب تک یہ ملک آزاد رہے ارامی رسم خط میخی کی جگہ نہ لے سکا۔ ارامی رسم خط بابل میں چھٹی صدی ق۔م کے خاتمہ یا پانچویں صدی ق۔م کے آغاز سے پہلے نہیں ظاہر ہوتا۔ اُس کی ترویج کی رفتار سست لیکن یقینی تھی۔ بہرحال میخی رسم خط سنہ عیسوی کی ابتدا تک رائج رہا۔ اُس کا آخری کتبہ ایک تختی ہے جو غالباً سنہ ۸۰ء میں لکھی گئی تھی اور اب میونخ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

میخی رسم کا پڑھا جانا

میخی رسم خط کو دنیا بھول چکی تھی۔ یہاں تک کہ اصطخر (PERSEPOLIS) کے کھنڈرات میں پائے جانے والے میخی کتبات نے مغربی سیاحوں اور عالموں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا جرمن معلم جی۔ ایف گروٹ فنڈ نے سنہ ۱۸۰۲ء میں اُس کے بعض اُصول و قواعد اور بہت سے نشانات کی آوازیں معلوم کیں اور انگریز عالم میجر جنرل سر ہنری رالنسن نے سنہ ۱۸۴۶ء میں بیستون کے پورے کتبے کو پڑھ ڈالا۔ یہ کتبہ ۳۰۰ فیٹ اونچی سپاٹ چٹان پر کندہ ہے اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ تین رسوم خط میں ہے۔ سب سے پہلے فارسی رسم خط پڑھا گیا پھر ایلامی اور بعد میں بابلی۔ آخر میں سمیری رسم خط کی باری آئی جس کے انکشاف کا سہرا بھی رالنسن کے سر ہے۔ شہنشاہ اشور بنی پال (۶۲۶ - ۶۶۸ ق۔م) کے کتب خانہ سے جو تختیاں ملیں انھیں میں سے بعض پر غور کرتے ہوئے رالنسن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ کتبے کسی ایسی قوم سے متعلق ہیں جو سامی اقوام سے پہلے عراق میں آباد تھی، رنا ہنٹ اور بعض دوسرے عالموں نے اس خیال کی مخالفت کی لیکن آخر میں یہ بات ٹھیک نکلی۔ سر ہنری رالنسن کو بجا طور پر آشوریات کا باپ کہا جاتا ہے۔

مصری ہیروغلیفی رسم خط

مصری ہیروغلیفی رسم خط کی تاریخ میخی سے مختلف ہے۔ میخی رسم خط وادی دجلہ و فرات میں ایجاد ہوا اور ایران کی مغربی سرحد سے لیکر ایشیائے کوچک تک پھیل گیا جس میں مختلف زبانیں لکھی جاتی تھیں۔ برخلاف اس کے ہیروغلیفی رسم خط وادی نیل تک محدود رہا (بحیرہ متوسط کے ساحل سے لیکر جنوب میں جزیرۂ فیلو تک تخمیناً ۷۰۰ میل لمبے قطعۂ ملک میں) وہ اس میں صرف مصری زبان لکھی جاتی تھی۔ اس کا آخری کتبہ رومی شہنشاہ (THEODOSIUS I) کے عہد (سنہ ۳۹۴ء) کا ہے۔

وجہ تسمیہ

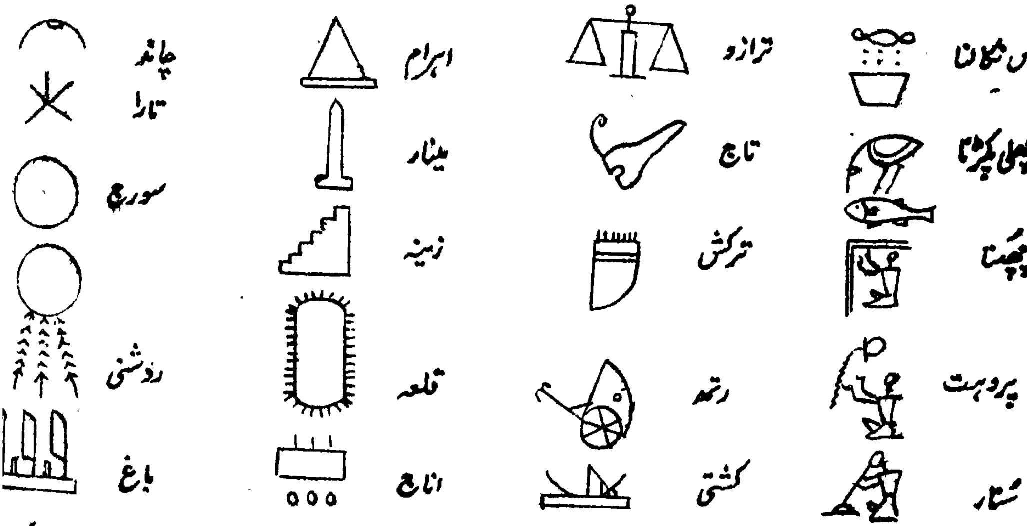
مصر میں یونانی حکومت کے زمانہ تک (جس کا آغاز سکندر کی فتح مصر سے ہوا) تصویری رسم خط مندروں اور مقبروں کی دیواروں تک محدود تھا۔ بریں بناء یونانی مورخ ہیرو ڈوٹس نے اُسے "مقدس حروف" (GRAMMATA HIERO) کہا ہے ڈایوڈورس نے "مقدس منقوش حروف" (GRAMMATA-HIEROGLYPHIKA) کلیمنٹ اسکندری (زمانہ تقریباً سنہ ۲۰۰ء) نے بھی یہی نام لکھا ہے اور اسی سے انگریزی نام (HIEROGLYPHIC) ماخوذ ہے جس کی معرب صورت "ہیروغلیفی" یا "ہیراغلیفی" ہے۔

عام طور سے ہیروغلیفی رسم خط کے معنی "تصویری لکھائی" لئے جاتے ہیں لیکن یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ ہیروغلیفی رسم خط کا اطلاق

اصل کے اعتبار سے صرف مصر قدیم کی تصویری لکھائی پر ہوتا ہے اور ہمارا لکھنے والے اس لفظ کا استعمال انھیں معنوں میں کرتے ہیں" ہیروغلیف کے انگریزی زبان میں ایک اور معنی بھی ہیں یعنی " نہ سمجھ میں آنے والی چیز" بر این بنا کہ یہ رسم خط شروع میں بڑی مشکل سے پڑھا گیا تھا۔

نشانات کی قسمیں ۔ مصری رسم خط کے نشانات کی ظاہری اعتبار سے دو قسمیں ہیں سادہ تصاویر اور تصاویر خیالی ۔

۱۔ سادہ تصاویر (PICTOGRAPHS) دنیا کی کوئی چیز یا بات ایسی نہیں ہے، جس کی تصویر مصری رسم خط میں نہ پائی جاتی ہو۔ ہر طرح کے جانور اور اُن کے اعضا، مرد، عورت اور اُن کے اعضا، دیوی دیوتا، مختلف عمارتیں، فرنیچر، مناظر فطرت، کھانے پینے کا لباس، آلات، مختلف سواریاں، مختصر یہ کہ ہر چیز کی تصویر اُن کے رسم الخط میں پائی جاتی ہے مثلاً :-



۲۔ تصاویر خیالی (IDEOGRAPHS) یعنی کسی چیز کی تصویر بنا کر بجائے قریب کے دور کے معنی مراد لینا۔ زمانۂ سلف کی دیگر اقوام کی طرح اہل مصر بھی صفت کے لئے موصوف، سبب کے لئے سبب اور مظروف کے لئے ظرف بناتے تھے بعض خیالات کا اظہار مرکب تصاویر سے کیا جاتا مثلاً :-



لکھائی میں ہوا کے لئے بادبان، شراب کے لئے خم اور تیل کے لئے بوتل کی تصویر بنائی جاتی تھی۔ سونا (طلا) کے لئے سونے کی برادہ چھانتے اور کپڑوں کے لئے گٹھری بناتے تھے، مردانہ اور زنانہ اعضائے تناسل کا اتصال ایک نئی جان کو وجود میں لانے کی بناء پر زندگی کی علامت روح کے لئے چراغ بناتے۔ شروع یا آغاز ظاہر کرنے کے لئے شیر کے جسم کا اگلا حصہ اور ختم کے لئے پچھلا۔ گیدڑ چالاکی کی علامت تھا ہد کی مکھی اپنی قوت نظم و نسق کی بنا پر بادشاہت کی ۔ سیپیرس (ایک پودا) کو شمالی مصر اور کنول کو جنوبی مصر کا مظہر مانتے تھے۔ پیاس کے لئے ور ہیمنے کی تصویر بنائی جاتی تھی۔ انصاف کے واسطے شتر مرغ کا پر بنایا جاتا کیونکہ وہ خیال کرتے تھے کہ شتر مرغ کے سب پر برابر ہوتے ہیں لئے مندر کے لئے جیسے انصاف کا خیال وابستہ تھا شتر مرغ کا پر اور گھر بناتے۔ کلہاڑی کو دیوتا کا نشان مانتے تھے، اسی لئے مندر کے کلہاڑی اور گھر بھی بنایا جاتا، اگر انھیں شام کا وقت ظاہر کرنا ہوتا تو وہ آسمان میں ایک کنول کا پھول لٹکا دیتے، کیونکہ شام کو وہ بند ہو جاتا ہے۔ رات لکھنے کے لئے آسمان میں ایک تارا لٹکا دیا جاتا اور بارش کے لئے آسمان سے پانی برستا ہوا دکھایا جاتا۔ اُن کے آسمان چار ستونوں پر ٹکا ہوا تھا لہذا جب وہ طوفان لکھنا چاہتے تو آسمان کو ان ستونوں سے کھسکتا ہوا دکھاتے۔

معنوی اعتبار سے مصری نشانات کی چار قسمیں ہیں :-

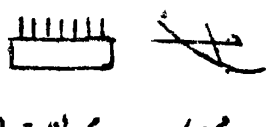
تصویری الفاظ (WORD SIGNS)[1] یعنی تصویر جو پورے لفظ کا مفہوم ادا کرتی ہے۔ مصری زبان کے الفاظ ایک سے لیکر حروف صحیح سے مرکب ہوتے ہیں۔ جن الفاظ میں ایک حرف صحیح ہوتا ہے انھیں (UNICONSONANTAL SIGNS) کہتے ہیں مثلاً



کھا = (تلفظ) — کھو — را — رو

مچھلی = (معنی) — حفاظت کرنا — سورج — دروازہ۔ دہانہ

جو الفاظ دو حروف صحیح سے مرکب ہوتے ہیں انھیں (BICONSONANTAL SIGNS) کہتے ہیں۔ جیسے :-



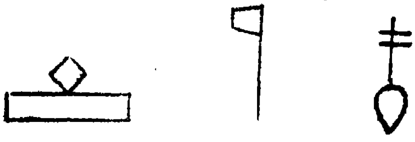
م۔ن = (تلفظ) — م۔ا — م۔س

رکھنا = (معنی) — محبت — پیدا ہونا

مصری رسم خط میں حروف صحیح کے بیچ میں آنے والے حروف علت کو ظاہر نہیں کیا جاتا۔ حروف علت شامل کر کے ان کو یوں پڑھا جائیگا

۱۔ مِن۔ مر۔ مس ۔۔۔۔۔۔

جو الفاظ تین حروف صحیح سے مرکب ہوتے ہیں انھیں (TRICONSONANTAL SIGNS) کہتے ہیں جیسے :-



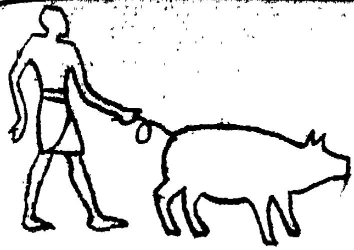
ہ۔ت۔پ = (تلفظ) — ن۔ف۔ر — ن۔ت۔ر

پرشاد = (معنی) — اچھا — مقدس۔ دیوتا

انھیں حروف علت ملا کر یوں پڑھا جائے گا۔ ہیتیپ (یا ہوتیپ) نیفر۔ نیتر۔۔۔۔

---

[1] انھیں (LOGOGRAMS) بھی کہتے ہیں۔

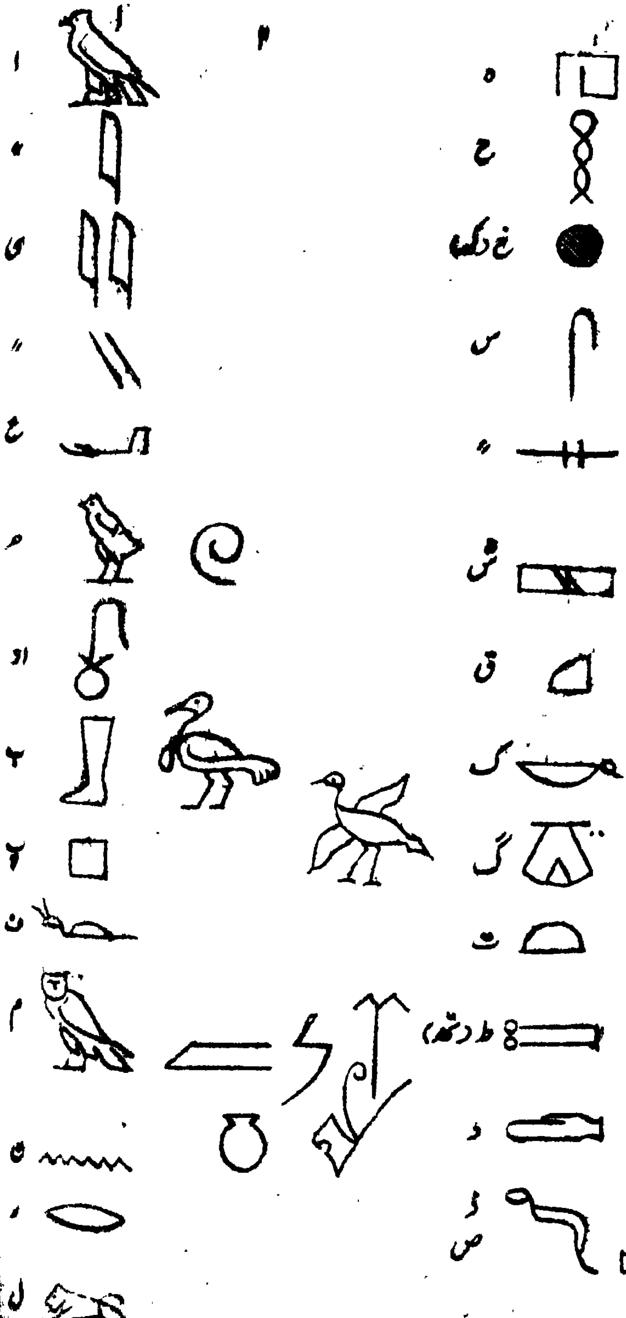


۳۔ تصویری کلمات (SYLLABIC SIGNS) ظاہر ہے کہ ہر چیز کی تصویر نہیں بنائی جا سکتی اس لئے اہل مصر بہت جلد" ریبس والا طریقہ" ایجاد کرنے پر مجبور ہو گئے یعنی مختلف معنی رکھنے والی تصاویر کو ملا کر کوئی نیا لفظ لکھنا جیسے اُن کی زبان میں لاجورد کو "خیس تیب" کہتے تھے لیکن "خیسے" کے معنی روکنے اور "تیب" کے معنی سور کے تھے لہذا لاجورد لکھنے کے لئے سور کو روکتے ہوئے آدمی کی تصویر بنائی جاتی تھی۔

تصویری کلمات اصل کے اعتبار سے یک حرفی اور دو حرفی کلمات ہوتے ہیں لیکن اس صورت میں وہ معنی نہیں دیتے

۴۔ تصویری حروف (ALPHABETIC-SIGNS)

علم الحروف کا ایک اصول ہے (ACROPHONY) کہتے ہیں یعنی لفظ کے شروع کی آواز لے کر بقیہ حصے کو حذف کر دینا۔ اس اصول کے مطابق قدیم مصریوں نے اپنے بعض الفاظ کو حروف بنا لیا تھا۔ مثلاً ان کی زبان میں شیر نی کو لابو کہتے تھے لہذا شیر نی کے نشان کو آواز ل کا مظہر قرار دیا گیا۔ پانی کو نون کہتے تھے لہذا پانی کی لہر آواز ن کی حامل قرار پائی۔ اسی طرح الو جسے ملوک کہتے تھے آواز م کی نمائندگی کرنے لگا اسی طرح انھوں نے بعض یک حرفی کلمات کے آخری حروفِ علت کو حذف کر کے مفرد حروف بنا لیا۔





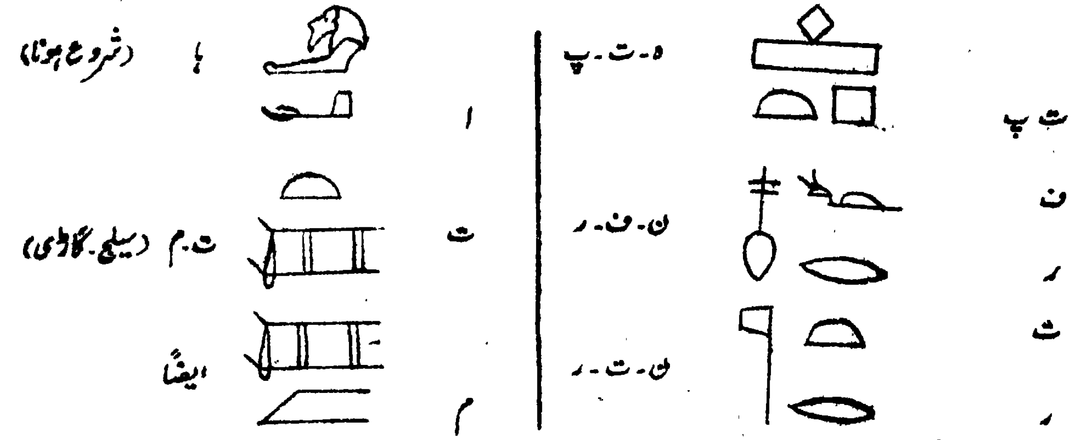
مصری حروف تہجی یہ ہیں :-

۱۔ عام طور سے کام آنے والے

۲۔ کم استعمال کئے جانے والے

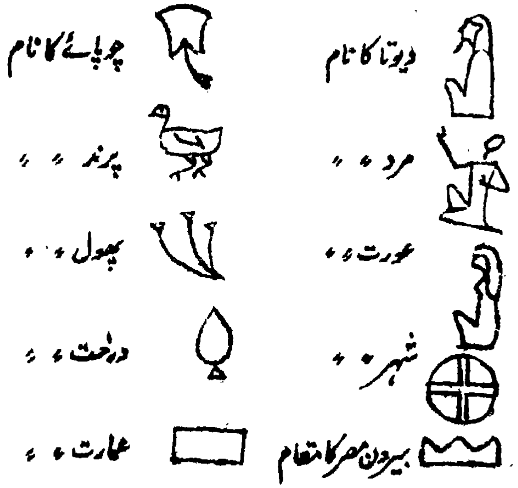
لہ اس طریقے پر ہم جلد کے شروع میں تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔

۴۔ صوتی سابقے اور لاحقے (PHONETIC COMPLEMENTS) مصری رسم خط میں اکثر الفاظ کے ساتھ اُن کے شروع یا آخر کا حرف بھی بنا دیتے ہیں تاکہ تلفظ معلوم کرنے میں آسانی ہو جیسے :-

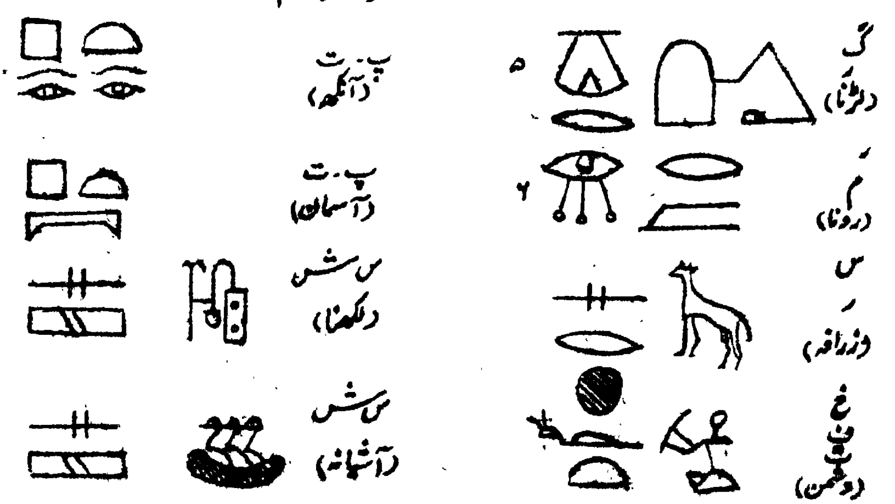


ان مثالوں میں نیچے اوپر اور دائیں طرف لکھے ہوئے تصویری حروف ۔

۵۔ معنی متعین کرنے والے نشانات (DETRMINATIVES) ان کی دو قسمیں ہیں ایک تو عمومی (GENERIC) اور دوسرے خصوصی (SPECIFIC) عمومی سے معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کا نام لیا گیا ہے وہ کس "قسم" کی چیز ہے آیا وہ کسی دیوتا کا نام ہے ۔ مرد کا نام ہے یا کسی عورت کا وغیرہ وغیرہ ایسی بعض علامتیں یہ ہیں :-



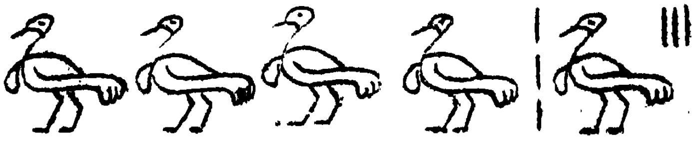
خصوصی :- یک حرفی اور دو حرفی کلمات سے الفاظ لکھنے کے بعد اُن کے معنوں کی تصویر بنا دیتے ہیں مثلاً :-



ان کے استعمال کی دو وجہیں تھیں ایک تو محض خوبصورتی کے خیال سے (بلا ضرورت) اور دوسرے اس لئے کہ مصری زبان میں اکثر الفاظ متعدد معنی تھے مثلاً "پیت" کے معنی آنکھ بھی ہیں اور آسمان بھی۔ لہٰذا ان معنوں میں تمیز کرنے کے لئے حرفوں میں لکھ کر دونوں کی تصویریں بنا دیں۔ اس طرح "سیش" کے معنی لکھنا بھی ہیں اور چڑیا کا گھونسلہ بھی۔ لہٰذا انھیں بھی حرفوں میں لکھ کر ان کی تصویریں بنائیں۔

ان تصاویر کو پڑھا نہیں جاتا۔ یہ صرف معنی معلوم کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ ان کی وجہ سے ہمارے لئے قدیم مصری زبان اور رسم خط پر عبور حاصل کرنا بڑا آسان ہو گیا۔

مصری ہیروغلیفی میں جس چیز کی جمع بنانی منظور ہوتی اُسے تین مرتبہ لکھ دیتے یا اُس کے نیچے تین لکیریں کھینچ دیتے مثلاً جب روحیں لکھنا ہوتیں تو تین بگلے بنا دیتے یا ایک بگلہ بنا کر تین لکیریں بھی اسی کے ساتھ بنا دیتے (روح کا اظہار ان کے یہاں بگلے سے ہوتا تھا)



یہ مصری رسم خط میں کام کرنے والے نشانات کی خاص خاص قسمیں ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ مصری لکھائی میں تقریباً ۶۰۰ تصویریں کام آتی تھیں۔

لکھائی کا رخ مصری رسم خط نیچے سے اوپر کو چھوڑ کر ہر طرف سے لکھا جاتا تھا۔ عموماً دائیں سے بائیں کو بسا اوقات بائیں سے دائیں کو اور کبھی کبھی دونوں طرف سے۔ اس صورت میں کچھ حصہ دائیں طرف سے پڑھا جاتا ہے اور کچھ بائیں طرف سے اور وسط میں آکر ختم ہو جاتا ہے، لیکن ایسا محض خوبصورتی کے خیال سے کیا جاتا ہے۔ عمودی گھیروں میں فراعنۂ مصر کے نام اوپر سے نیچے کی طرف لکھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

پڑھنا کدھر سے شروع کیا جائے گا اس کا پتہ نشانات کے رُخ سے چلتا ہے جدھر جانوروں اور پرندوں وغیرہ کا منھ ہوتا ہے اُدھر ہی سے پڑھتے ہیں۔

عرصہ ہوا ڈاکٹر ایل۔ اے ویڈل نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مصری رسم خط سمیری سے ماخوذ ہے۔ (دونوں کے بہت سے نشانات صوری۔ صوتی اور معنوی لحاظ سے آپس میں ملتے جلتے ہیں۔) اور اب عام طور سے یہ نظریہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

(باقی) محمد اسحاق صدیقی

سید اختر امام کے دو خط

(بغداد اور نیروبی سے)

اختر کی موہنی صورت، ان کی صحت وجوانی، ان کا بلند و پاکیزہ ذوق شعر و ادب، ان کا علمی تبحر، ان کا خاندانی امتیاز، ان کا دنیوی جاہ و منصب، اور سب سے بڑھ کر کوثر و تسنیم سے دُھلا ہوا ان کا دل، جب کبھی ذہن میں آتا ہے تو روح وجد کرنے لگتی ہے۔

ان سے پہلی شناسائی خط کے ذریعہ سے ہوئی جب وہ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس کے بعد عربی میں ایم۔اے کرنے کے بعد جب وہ باآن (جرمنی) گئے تو وہاں سے بھی انھوں نے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا، عربی میں پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے بعد یورپی ممالک کا سفر کرتے ہوئے جب وہ ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے آرہ آنے کی بھی زحمت گوارا کی، یہی میری ان سے پہلی ملاقات تھی اور شاید آخری بھی۔

چند دن بعد کلکتہ یونیورسٹی نے پوسٹ گریجویٹ کلاس میں تعلیم دینے کے لئے ان کا تقرر کیا اور پھر وہ کالمبو یونیورسٹی (لنکا) میں شعبۂ عربی کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے مقرر ہوئے یہاں ان کو بارہ سو روپے ملتے تھے، لیکن بقول اختر "اقتصادی تقاضوں" نے ان کو پاکستان کے محکمۂ امور خارجہ سے رشتہ جوڑنے پر مجبور کیا، پہلے وہ عراق کے سفیر مقرر ہوئے اس کے بعد فروری ۵۳ء سے "نیروبی" (برطانوی مشرقی افریقہ) میں غالباً ہائی کمشنر ہیں۔

اختر کا وطن بہار کا ایک مردم خیز گاؤں "کرائے پرسرائے" ہے۔ نواب امداد امام کے ایک حقیقی بھائی یوسف امام صاحب موضع کرائے پرسرائے میں بس گئے تھے، یہ اختر صاحب کے حقیقی دادا تھے۔

اختر کے سارے کمال میں ان کی دو چیزیں بے حد کشش رکھتی ہیں، ان کی تحریر اور ان کا دل، اختر کی تحریر اتنی ستھری، اتنی پاکیزہ، اتنی صاف ہے کہ اس آئینہ میں ان کا پاک اور معصوم دل جھلکتا ہے ان کی تحریروں میں فن ہے، اور فنی محاسن کے ساتھ ایک بے پناہ دل ربائی۔ ان کے علمی، تاریخی اور ادبی اشارے اتنے فاضلانہ، محققانہ اور پاکیزہ ہوتے ہیں کہ تعجب آتا ہے کہ جو شخص اتنا سکون پسند، اتنا تن آسان، اس قدر ہنس مکھ اور لطف و انبساط کا دلدادہ ہو وہ وسعت مطالعہ کے لحاظ سے اس قدر جامع کیونکر ہو سکتا ہے۔ اختر کے یہاں معاشی سکون کے ساتھ ہمیں ایک روحانی ٹھہراؤ بھی نظر آتا ہے ان کے چہرہ پر بشاشت کے ساتھ ایک پاکیزہ تبسم بھی پایا جاتا ہے ان کے یہاں تلخی نام کو نہیں، صورت، تکلم، تحریر ان کی ساری چیزیں تلخ احساسات سے پاک ہیں ان کی معصوم اداؤں سے کبھی کسی کو تلخی کا احساس نہیں ہو سکتا اور شاید وہ خود زمانہ کی تلخیوں سے یا تو بیگانہ ہیں یا ان کے تصور کے لئے ان کے ذہن میں کوئی مقام نہیں۔

وہ یورپ میں "ایپرا" کے عشرتکدوں سے بھی لذت اندوز ہوئے لیکن اخلاقی اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا پھر ان محافل سے جی بھر گیا تو دمشق میں حضرت یحییٰ اور بغداد میں حضرت معروف کرخی کی قبروں پر مجاوری بھی کی، وہ مشرقی انداز کے ایک یوروپین شہری معلوم ہوتے ہیں اور اسلامی احکام و شعائر کے باب میں ایک سخت کوش قسم کے متقی بھی۔

ڈاکٹر بہت بڑے فاضل ہیں وہ بیک وقت جرمن، انگریزی، عربی، فارسی اور اُردو پر ماہرانہ عبور رکھتے ہیں جرمن زبان وہ اس روانی و لطافت کے ساتھ بولتے ہیں کہ ایک ناآشنائے زبان بھی یہی چاہے گا کہ وہ جرمن زبان میں بولتے رہیں لیکن اُردو زبان سے ان کو ایک غیر معمولی لگاؤ ہے وہ جرمنی سے آتے آتے تو میں انھیں "جین سدھارت بھون" لے گیا کاٹبریو نے رائے لکھنے کے لئے کتاب پیش کی تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی، جب عربی، جرمن اور انگریزی کے بدلے اُردو میں انھوں نے اپنی رائے لکھی۔ ان کی عربی اور انگریزی دونوں سے مجھے لطف حاصل ہوگا۔ وہ کسی پر اپنے علم وفضل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتے، حالانکہ یہ کمزوری عام طور پر نوجوان علماء میں پائی جاتی ہے۔ انھوں نے قیام سرانذیپ کے دوران میں ایک عرب گھرانے سے ازدواجی رشتہ جوڑ لیا، اور اس کی یادگار عشرت امام سلمہ ہیں۔

عبدالمالک آروی

۳۰ر جون ۵۲ء

عزیز دوست مالک صاحب سلام ومحبت!

آپ کو یہ خط بغداد سے لکھ رہا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ میں یہاں کیسے آدھمکا تو جواب سنئے! لنکا میں چاندی کے دن تھے اور سونے کی راتیں، شوخ وشنگ جوانیاں باغات بھی تھے اور نیلگوں آسمان تلے خواب آلود انگڑائیاں لے رہا تھا! اب آپ اسے میری وحشت کہیں یا تلون، ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اس مادی شکل میں تو دوبارہ زندہ ہونا ناممکن ہے، فطرت تغیر کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے، میں ہر لمحہ بلکہ ہر آن نادانستہ طور پر بدلتا جارہا ہوں اگر بدھ مت کا پیرو ہوتا تو لنکا جیسی ارضی جنت کو ہرگز نہ چھوڑتا کیونکہ اپنے اعمال کے اعتبار سے شاید پھر وہیں مرنے کے بعد جنم لیتا مگر تناسخ سے دور کا بھی مجھکو لگاؤ نہیں ہے اس لئے میرے سامنے دو مسئلے تھے ایک تو یہ کہ کسی اور بہشت میں سانس لینے کا موقع ملے جو ہر اعتبار سے مختلف ہو، دوسرے یہ کہ ہزار اور بارہ سو ماہانہ میں خود کو ہمیشہ کے لئے مقید کر دینا سنجیدہ حماقت ہے۔ اسی منزل سے گزر رہا تھا کہ چند نادر موقعے ہاتھ آگئے، میں نے ان سے فائدہ اُٹھایا اور اس کا ماحصل مصدر یہ نکلا کہ میں جنوری ۵۱ء میں جزیرہ سرانذیپ کو خیرباد کہتا ہوا کراچی پہونچا اور وزارت خارجہ سے تعلقات قایم کرلئے۔ چند ماہ بعد یعنی جولائی میں حکمنامہ صادر ہوا کہ بہ حیثیت Charge d'affaires یعنی القائم باعمال الباکستانیہ کے بغداد چلے جاؤ، چنانچہ چند دنوں بعد میں بال بچوں سمیت تاریخی دجلہ کے کنارے بیٹھا ہوا سانس لے رہا تھا۔ یہ ہے شانِ نزول مجھ صحرا نورد کے یہاں آنے کی۔ کہئے اب تو مان گئے کہ میں نے ایک بہاری شاعر کے شعر کو عملی جامہ پہنادیا۔

رہے ہمارا جنوں سلامت ہزاروں صحرا کو چھان لیں گے
اس ایک دُنیا کی کیا حقیقت کہ ناپ ڈالا جسے قدم سے

یعنی یوں سمجھئے کہ میں نے درس وتدریس کی پاکیزہ فضا کو چند سکوں کے عوض مکدر کر ڈالا ہے۔ کیا کیجئے گا اقتصادی تقاضے کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں!

مالک صاحب، آپ اس ایک برس کے عرصہ میں اکثر یاد آئے اور اپنی تمام سادگیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے رہے۔ آپ میری ان چند گنتی کے مخصوص دوستوں میں ہیں جن کی ذات پر میں فخر کرتا ہوں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آپ کی شخصیت میرے تمام دوستوں سے ممتاز ہے۔ آپ سے زندگی میں ایک بار اور صرف ایک بار ملاقات نصیب ہوئی ہے مگر لذت تجدید سے محرومی کے باوجود ہمیشہ یہ ایسا محسوس کرتا رہا جیسے برسوں کی ملاقات ہو، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں اصلی مالک کو اس کے علمی مقالوں اور دلنشین خطوں کے ذریعہ تاک جھانک کر دیکھتا رہا ہوں اور اجنبیت کے رسمی حجابات خود بخود اُٹھتے گئے۔ آپ نقاد، ادیب، فنکار اور "مولوی"

[illegible] حیثیت سے عقیدت [illegible] میں پیش کرتے ہیں جیسے خسرو، مرزا غالب، اقبال اور محمد علی کی طرح آپ نے اپنے شدید احساسات کو نظموں پر منتقل کیا مگر خود معاملات و مرغوبات میں جو توازن قائم رکھا وہ یقیناً قابلِ رشک ہے۔

آپ کو یہ شکوہ کہ حیرت ہوگی مگر بات یہ اصل حیرت کی نہیں ہے وہ یہ کہ آپ کے تمام وہ خطوط جو آپ نے وقتاً فوقتاً مجھے لکھے ہیں میں نے ہمیشہ ان جواہر پاروں کو سینہ سے لگائے رکھا۔ آج بہت زمانہ بعد جی چاہا کہ "حسینوں کے خطوط" اور "تصویر بتان" کو باقاعدہ ادوار میں تقسیم کردوں اور انھیں کتابی شکل میں مرتب کر ڈالوں۔ اس لطیف کام میں منہمک تھا کہ آپ مسکراتے نظر آئے۔ آپ کہیں گے واہ بھئی اختر صاحب یہیں اور تبسم ! میں تو قنوطی ہوں یہاں مسرت کا گزر کہاں مگر جانے کیوں آپ کی یاد ہمارے لئے حسرت و یاس کی بجائے ہمیشہ شادمانی کا موجب ہوتی ہے۔

اے وائے نالۂ لب خونیں نوائے گل !

آپ کے خطوط کو جن میں بعض مجھے دل سے یاد تھے بار بار پڑھتا رہا اور پڑھنے کے بعد دیر تک کچھ ایسا محسوس کیا جیسے شیشۂ دل پر ایک وجدانی کیفیت جس کی سرحدیں شباب کی عشرت ناک راتوں سے جا ملتی ہیں۔ مجھ کو اپنی قوس قزحی دھاریوں میں لپیٹے ہوئے ہیں! کیٹس نے سچ کہا تھا "ایک حسین شے دائمی مسرت کا سرچشمہ ہے۔"

چاہتا ہوں کہ کچھ اس سرزمین کے حالات سناؤں جس کا ذرہ ذرہ تاریخی عظمت سے درخشاں ہے۔ بابل و نینوا کے کھنڈرات قدیم عیسائی خانقاہیں جو قرون وسطیٰ کی روایات اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور طاق کسریٰ کی ہیبتناک محراب جہاں تالیاں بجاتے ہی صدیوں کی بازگشت ہزاروں تالیاں سناتی ہے۔ اسلامی عہد کی عمارتیں تو تقریباً ناپید ہیں۔ ہلاکو نے تو سب کچھ خاکستر کر ڈالا تھا مگر قبرستان اُس جہاں سوز کی زد سے بچ گئے اس لئے آج بھی آپ بغداد میں دیکھ سکتے ہیں کہ یہ ہے حضرت سری السقطی کی آرامگاہ اور ان کے برابر ان کے مرید خاص حضرت جنید بغدادی کی ضریح مبارک ہے۔ ذرا پرے ہٹ کر حضرت معروف کرخی ہیں اور ان کے روضہ سے دو قدم پر منصور حلاج کا مقبرہ ہے۔ کوئی دو میل پر حضرت امام اعظم (حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) ہیں اور اسی خطہ میں رابعہ بصری محوِ خواب ہیں۔ سیدنا عبدالقادر الجیلانی اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ زبیدہ یعنی بادشاہ ہارون الرشید کی ملکہ ابدی نیند سو رہی ہے۔ بغداد سے کوئی پچیس میل باہر طاق کسریٰ سے قریب تین صحابہ کرام آرام فرما رہے ہیں حضرت سلمان فارسی، حضرت جابر الانصاری اور حضرت حذیفہ الیمانی۔ شہر کی دوسری جانب کربلا اور نجف ہیں۔ ذرا اندازہ کیجئے عظمت کا!

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

پچھلے دنوں بصرہ گیا تو حضرت امام حسن بصری اور اسی مقبرہ میں ابن سیرین جو خواب کی تعبیر میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر جیسے صحابیٔ رسول بھی وہیں ہیں۔ موصل شہر کے باہر حضرت یونس اور حضرت شیث مدفون ہیں اور قدیم نینوا کا کافی حصہ شہری آبادی میں ضم ہو گیا ہے۔ موصل سے ٹیکسی کی اور اربیل پہنچا یہاں صوبۂ بہار کی طرح خانقاہیں ہیں اور پیر طریقت شافعی مذہب کے پیرو ہیں۔ ایک گاؤں سے گزرا جہاں ابن خلکان پیدا ہوئے تھے کرد ویسا دیہات۔ موصل میں ابوتمام اور ابن الاثیر کی قبریں دیکھیں ! فاعتبروا یا اولی الابصار !

اسی قدر لکھنے پایا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ دفتر نے یاد دلایا ہے کہ آج ڈنر کے لئے باہر جانا ہے۔ اس لئے اب پھر پہلے کی طرح نئے رنگ میں باہر نکلنا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ میں وہ بغداد بلکہ عراق کے حالات لکھوں مگر اس کو اب آپ کے جواب آنے پر ملتوی رکھتا ہوں۔ امید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا اختر امام

۳ر جون ۱۹۵۳ء

عزیز دوست مالک صاحب - سلام و محبت

بہار کے مشہور شاعر نواب امداد صاحب اثر نے میر تقی میر کے رنگ میں ایک شعر کہا تھا اور جہاں تک میں اس شعر کے ذریعہ اثر کی تحلیل نفسی کر سکا ہوں وہ یہ ہے کہ عنفوان شباب میں وہ ابونواس اور اعشیٰ کی طرح آزادانہ پھرا کئے اور تمام زمینی مسرتوں سے لطف اندوز ہوئے۔ جس کا حاصل مصدر عشق ہے - شعر ہے :-

جنگل جنگل صحرا صحرا مارے مارے پھرتے ہیں
آہو وحشی جان کے مجھ کو ساتھ ہمارے رہتے ہیں

اگر اثر زندہ ہوتے تو میں باادب عرض کرتا کہ جنگل آپ کی آپ کی قسمت میں نہیں بلکہ آپ کے پوتے کی قسمت میں لکھا تھا۔ جنگل تو ویسے ہزاروں ہیں، کچھ گھنے جن میں کچھ جنگلی جانوروں کی بھی پرورش ہے بعض بس ویرانے جہاں کوسوں تک آدمی اور جاندار شے کا نشان تک نہیں ہے، اکے دُکے ببول کے درخت اور چاروں طرف ہولناکیاں جن کے بارے میں غالباً خواجہ آتش نے کہا تھا۔

کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر، لا دے اک جنگل مجھے بازار سے،

یا پھر:- جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی، عجیب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

مگر مالک صاحب یقین مانئے میں جس جنگل میں سانس لے رہا ہوں وہ میر اثر کے تخیل سے بھی بالاتر ہے - یہاں تو حقیقی معنوں میں

جنگل کے شیر ہونک رہے" ہیں" کچھار میں

مگر میں بھی بڑا سڑی آدمی ہوں کہ آپ کو آدھہ سے جنگل میں کھینچنا چاہتا ہوں اور وہ بھی براہ راست - مچھیرے پہلے رو جال پھینکتے ہیں پھر مچھلیاں شکار کرتے ہیں اس لئے اسی زمردیں وسعتوں میں دعوت دینے سے پہلے یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کے اس محبت نامہ کا دلی شکریہ ادا کروں جو آپ نے ہمیں بغداد بھیجا تھا وہ جواہر پارے اب تک سینہ سے لگائے ہوئے ہوں۔ آپ نے اس خط میں خطیب بغدادی اور ابن خلکان کا بھی ذکر کیا تھا۔ جب میں فروری میں بغداد سے رخصت ہونے لگا تو ان تمام بزرگوں کی خدمت میں سلام کے لئے حاضری دی - جب مسجد ابی حنیفہ سے گزرتا ہوا عباسیہ قبرستان کے پچھواڑے بشر الحافی کے سرہانے پہونچا تو فاتحہ میں آپ کو بھی شریک کر لیا۔ خطیب کی قبر کا نام و نشان تک نہیں ہے - بعض اہلِ علم کے ذریعہ اس یکتائے روزگار محقق کی آخری آرامگاہ سے واقف ہو چکا تھا۔ جب خطیب کے سامنے پہونچا تو دیکھا کہ ایک کمرہ ہے جہاں لکڑیوں کا انبار ہے اور ایک بڑھئی بسولا لئے ہوئے لکڑیوں کو کاٹ رہا ہے۔ میں نے دل میں کہا ارے ظالم تجھے خبر بھی ہے کہ تو کس کے سینہ پر یہ ضرب لگا رہا ہے ؟ پھر خیال آیا آخر خطیب نے بھی تو انسانی کردار کی تشکیل کی تھی، قلب ماہیت کے لئے بسولے سے زیادہ تیز قلم ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ فاتحہ کے بعد بڑھئی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کس کے فاتحے پڑھ رہے تھے یہاں تو کوئی قبر نہیں ہے میں نے کہا جہاں تم بیٹھے ہو اس کے نیچے ایک فخر روزگار سو رہا ہے۔ خطیب بغدادی، وہ بیچارہ ہکا بکا سا رہ گیا، بولا کون خطیب ؟ میں نے کہا تھے ایک سیدھے سادھے بزرگ۔

—— "ان کا انتقال کیا ترکوں کے زمانہ میں ہوا تھا" ؟

—— "نہیں ان سے صدیوں بیشتر۔"

جب وہاں سے لوٹا تو سوچا کہ ذرا ابوبکر شبلی کو بھی سلام کرتا چلوں وہاں پہونچا تو شکستہ مقبرہ میں لحد پر قرآن شریف کے منتشر اوراق پڑے تھے، دیر تک بیٹھا رہا۔ کبھی خیال آتا کہ بقول Arberry تصوف کا چراغ چند صدیوں کو اُجالا کرنے کے بعد جھلملا جھلملا کر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ کیا آربری سچ کہتا ہے ؟ کیا انسان کے پراگندہ دل و دماغ کو یکسوئی اور سکر آمیز لذت اس دو آتشہ سے اب حاصل نہیں ہو سکتی ہے ؟ اسی ادھیڑبن میں تھا کہ فاقہ کش مجاور مقبرہ میں داخل ہوا، میں نے کہا اس مقبرہ کی مرمت کیوں نہیں ہوتی ؟

اس نے جواب دیا کس کس کی مرمت کی جائے یہاں تو ہزاروں گنج گرانمایہ پڑے ہوئے ہیں، میں نے کہا بھائی سچ کہتے ہو، اسی قبرستان میں ابن تیمیہ اور رابعہ بصری کی آرامگاہ ہے۔ زمانہ نے ان نقوش کو ملیامیٹ کردیا۔ حضرت جنید بغدادی موجودہ بغداد سے باہر ہوائی اڈے سے اسی طرف محوخواب تھے، آپ اپنے پیر سری السقطی کے برابر مدفون ہیں۔ میں پیر اور مرید کے درمیان دو زانو ہوکر زمان و مکان کے قیود سے ہر لحہ نکلتا گیا۔ خدا جانے کہاں پہونچ گیا تھا نہ یہ بغداد تھا اور نہ اسکی پرمی صفت عشرت گاہیں، نہ موٹروں کا ہجوم اور نہ ریڈیو کی چیخ پکار۔ جب دوبارہ ہزار برس بعد کی دنیا میں داخل ہوا تو نہ جانے کیوں کچھ ایسا محسوس کیا جیسے ان باکمال ہستیوں سے ہمکلام ہوچکا ہوں، ایک غیر مسموع آواز سُنی تھی جس کے نہ الفاظ کفالت کرتے ہیں اور نہ فن بیان۔ بہلول دانا کے یہاں بھی یہ نشہ سر میں موجود تھا۔ ابراہیم خواص سے ہوتا ہوا جب کار میں جاکر بیٹھا تو ڈرائیور سے کہا ذرا شیخ معروف کے یہاں چلو۔ شیخ مسجد کے گوشہ میں اس طرح آرام کررہے ہیں کہ گنبد کا آخری زاویہ بلکہ مسجد کی دیوار حلقہ کئے ہوئے ہے۔ مقبرہ کے چاروں طرف شہر خموشاں ہے۔ شیخ کے مقبرہ کے بارے میں خطیب نے لکھا ہے کہ جب کوئی حاجت مند دو رکعت سنت کے بعد ننانوے مرتبہ قل ھواللہ یعنی سورۂ اخلاص پڑھ کر شیخ کی روح پر ایصال ثواب کرتا ہے اور خدا سے دعائیں مانگتا ہے تو دعا کامیاب ہوتی ہے پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "ہذا مجرب" میں نے بھی اسی تفصیل کے ساتھ دعا مانگی ـــ حقیقت یہ ہے کہ میں جس دنیاوی چکر میں مبتلا تھا اس سے نجات کی صورت بظاہر نظر نہیں آتی تھی، اب اسے آپ شیخ کی کرامت کہیں یا ایک مادہ پرست کی حیثیت سے اسے حُسن اتفاق یا دلچسپ حادثہ سے تعبیر کریں ـــ میں خلاف توقع اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ میں اکثر جمعہ کی نمازیں شیخ کی مسجد میں پڑھا کرتا تھا کیونکہ وہاں کی قرأت میں رعشہ سیماب پایا جاتا تھا۔

سیدنا عبدالقادر محی الدین الکیلانی کے کیا کہنے، اب بھی ایک چشمہ جاری ہے۔ بغداد سے باہر کوئی پچیس میل دور حضرت سلمان فارسی، حضرت حذیفہ الیمانی اور حضرت جابر الانصاری، طاق کسریٰ کے برابر مدفون ہیں۔ اللہ اللہ عراق کی سرزمین بھی کس حد تک حیات افروز ہے۔

ایک دن خلاف توقع سرکاری حکمنامہ ملا کہ نیروبی جاؤ۔ سنگ آمد و سخت آمد۔ بغداد سے جب نیلگوں آسمان میں پرواز کررہا تھا تو نیچے علم و عرفان کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا رفتہ رفتہ یہ منظر بھی روپوش ہوگیا۔ چند گھنٹوں بعد لق و دق صحرا کے سینہ کو چاک کرتا ہوا دمشق اترا تو مسجد اعظم گیا۔ میں نے اتنی دلکش اور وسیع مسجد نہیں دیکھی تھی۔ خالص عربی تعمیر کا نمونہ ہے جو بنو امیہ کی یادگار ہے۔ نہ گنبد اور نہ قبے بس ایک شاندار ہال پھیلتا چلا گیا ہے۔ مسجد میں داخل ہوا تو تین حلقے تین بزرگوں کے تفسیر قرآن اور درس حدیث میں منہمک تھے۔ میں ہر حلقہ میں شریک ہوتا گیا۔ سبحان اللہ شامی عرب کتنی فصیح عربی بولتے ہیں بس یہی جی چاہتا ہے کہ عمر بھر سنتا رہوں۔ مسجد کا جو بڑا سا ہال ہے اس کے وسط میں ایک قبر دیکھی جس کے چاروں طرف چاندی کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ قبر حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ہے۔ اس وقت شیخ سعدیؔ یاد آگئے جنھوں نے گلستاں کے کسی باب میں لکھا ہے:

"بربالیں تربت حضرت یحییٰ علیہ السلام معتکف بودم در جامع دمشق"

میں بھی شیخ کی اتباع کرتے ہوئے سرہانے بیٹھ گیا، کیا عجب کہ ہماری نشست شیخ سعدیؔ کی پاکیزہ جگہ ہو! سلطان صلاح الدین ایوبی اور شیخ محی الدین ابن عربی بھی اسی دمشق میں مدفون ہیں۔ ابن عساکر یاد آگئے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز، شہاب الدین الزہری اور الاخطل جیسا پیکر دمشق ہماری اصلاح سے نا؟)

دمشق میں مغربی اور مشرقی بلکہ عربی قدروں کی جو ہم آہنگی ہے ویسا امتزاج میں نے دنیا کے کسی ملک میں نہیں دیکھا ہے جہاں مسلمان بستے ہیں۔ شہری اعتبار سے یورپ کا نمونہ، تہذیبی نقطۂ نظر سے خالص عربی۔ جب قاہرہ پہونچا اجتماع اضداد کی ایک

ہے نظیر تصویر سامنے ہے۔ بازار کے محلے، شراب خانے اور ناچ گھر یا پھر زمینوں کو جنا، الازہر مسجدوں کی آبادیاں، اسلامیت اور بات بات میں فکر عاقبت اور دنیا کی ناپائیداری، مسجد سے اذانوں کی صدا اور گلیوں میں قافلوں کے کھلے ہوئے ہاتھ! میں قاہرہ میں ایک ہفتہ رہا، ابوالہول، اہرام مصر اور الاقصر (Luxor) کے گرد چکر کاٹتا رہا۔ قاہرہ سے نیم شب کے سناٹے میں روانہ ہوا اور سطح سمندر سے ہزاروں فٹ بلند صحرائے اعظم کو عبور کر رہا تھا۔ جب خرطوم پہونچا تو صبح صادق کا سماں تھا۔ مسجدوں کے منارے بڑی شان سے فضا میں بلند تھے۔ یہاں سے چلا تو تیج کے وقت خود کو Entebbe میں پایا۔ یہ شہر مشہور وکٹوریہ جھیل کے کنارے آباد ہے اور Uganda کا پایۂ تخت ہے۔ اب صحرائے اعظم کے جنوب میں تھا اور ہمارا تعلق صحیح معنوں میں تاریک براعظم سے تھا ہر طرف کالے کالے انسان، کریہہ منظر اور نیم برہنہ عورتیں جن کی پیٹھوں پر شیر خوار بچے تھیلیوں میں لٹکے ہوئے تھے۔ کوئی تین بجے نیروبی پہونچا۔

نیروبی خط استوا سے قریب ہے مگر چونکہ سطح مرتفع ہے، اس لئے سال بھر تک گلابی جاڑا رہتا ہے۔ یہ انگریزوں کا آباد کیا ہوا دلکش شہر ہے۔ بارونق اور مغربی یورپ کی تمام رعنائیاں لئے ہوئے۔ انگریزوں کے علاوہ تقریباً پچاس ہزار ایشیائی ہیں، جن میں اکثریت ہندوستانیوں کی ہے، بقیہ پاکستانی ہیں۔ یہ سب کے سب تجارت پیشہ ہیں۔ سیاہ فام افریقی اپنے محلوں میں آباد ہیں۔

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ان افریقیوں میں خاصی تعداد مسلمانوں کی ہے۔ میں نے ان کی مسجدیں دیکھی ہیں جو ہمیشہ آباد رہتی ہیں۔ یہ ان باہمت عربوں کی یادگار ہیں جو کبھی سارے عالم پر چھائے ہوئے تھے۔ ساحلی مقامات مثلاً دارالسلام اور زنجبار تو مسلمانوں سے بھرے ہوئے ہیں جو اب بھی گھر پر عربی بولتے ہیں۔

نیروبی سے باہر یا تو انگریزوں کی نوآبادیاں ہیں یا پھر گھنے جنگلوں میں قطعاً وحشی اور غیر مہذب افریقی ہیں۔ یہ قبائلی نظام زندگی میں منقسم ہیں۔ مرد اور عورتیں تقریباً عریاں۔ بعض مقامات پر اب تک آدم خور قبیلے موجود ہیں جن کے گاؤں میں آدمی کا گوشت ایک پرتکلف کھانا تصور کیا جاتا ہے۔ مسائی Masai قبیلہ والے یہاں سے بارہ میل کے فاصلے پر ہیں۔ یہ اب بھی دشمن کو ذبح کرکے اس کا خون دودھ میں ملا کر پیتے ہیں۔ جنگلی جانوروں کی بہتات ہے اور فطرت کے دلکش مناظر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ کہئے اب تو سمجھے آپ میں کہاں ہوں؟

یہاں ایک طرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ از منۂ تاریخ سے بھی ہزاروں سال پیشتر کی دنیا سامنے ہے جہاں غاروں میں بسنے والے درندہ صفت نام نہاد انسان کلہاڑیوں سے وحشی جانوروں اور ہم جنسوں کا شکار کھیلتے ہیں اور کچے گوشت کو چبا چبا کر مزے سے کھاتے ہیں یا پھر نیروبی اور دوسرے متمدن شہر جہاں عصر حاضر کی تمام شعبدہ بازیاں موجود ہیں۔ تاریک ماضی اور حال میں جو ہیبت ناک فرق ہے وہ آپ ایک نظر میں دیکھ سکتے ہیں۔ خیر ہٹائیے بھی اس "یادِ وحشت" کو!

آپ نے لکھا تھا کہ آپ گردہ کے مریض ہیں۔ کبھی میں بھی اس مرض کا شکار تھا۔ میں صرف ہومیوپیتھک کی ایک دوا سے شفایاب ہوگیا تھا۔ آرہ میں تو ہومیوپیتھک دوائیں ملتی ہوں گی۔ آج ہی آنکھ بند کرکے بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ چاند کی ابتدائی تاریخوں میں ایک خوراک Lycopodium CM کھالیں۔ نہار منہ خشک زبان پر۔ ترش چیزوں سے پرہیز کیجئے گا۔ اللہ نے چاہا تو آپ اس مرض سے نجات پا جائیں گے۔

رمضان کے تمام روزے رکھ رہا ہوں۔ یہ دن نہیں ہے بلکہ نیم شب کا سناٹا ہے۔ سوچا کہ آپ کو خط لکھ کر سحری کھالوں پھر سو جاؤں۔ آپ بہت یاد آتے رہے اس لئے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ لکھوں گا اور ضرور لکھوں گا۔ یہ ہے شاید غزل اس کی ہے زندگی۔ بہار کی تھکی تھکی فضا اب بھی یاد آتی ہے، اس خنکی میں بیزاری بھی تھی اور دلکشی بھی۔ افریقی ماحول کی طرح اجتماع اضداد وہاں بھی تھا۔ شادی بیاہ کے وقت قاسم تمرو کے گیت گائے جاتے تھے۔

اے نیز ہ وال کنگنا تمھارا !

رات اُتارو سجوے پہنو، کنگنوا میں نا پہنوں گی

میاں بنرے کو لگی جیجے چوٹ

کنگنوا میں نا پہنوں گی !!

ہائے ان گیتوں میں کتنی محبت ہے، کتنا رس ہے۔ یہ ماحول اعد و ساز کے قوس قزحی نغمے کہاں ملیں گے ؟ وہ ہار لکھ کھاؤ اس "جاگیر دارانہ نظام" کے صدقے جاؤں جہاں کے امراء غریبوں کی پرورش کیا کرتے تھے جہاں دوسروں کا درد محسوس کرتے تھے۔ دل پر چوٹ لگتی تھی !

یادگار رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک !

"ترقی پسندوں" پر خدا کی مار۔ عورت، چادر، گرماگرم بوسے، مزدور، پسینہ کی قسم، زمینداروں کا ستم۔ سماجی اعتبار سے اصلاح تسلیم۔ مگر انھوں نے تو انسانیت کے دوستوں پر بھی ہاتھ صاف کیا ہے تنقیص ضرور کی مگر "تعمیری" کام یہ کیا کہ غالب، تمیر اور تمام دردمند انسانوں پر طنزیہ قہقہے لگائے۔ شہوت میں ایک جسمانی لذت ضرور ہے۔ ہیجان کا نشہ بھی ہے مگر زندگی کے تقاضے اور بھی تو ہیں !

خیر اب اس داستان کو کون چھیڑے ورنہ "دقیانوسی" کہلاؤں گا۔ امید کہ آپ بخیر ہوں گے

آپ کا بھائی

اختر امام

بین الاقوامی سرمایہ

بین الاقوامی سرمایہ کے تبادلہ سے مراد سرمایہ کا ایک ملک سے دوسرے ملک کو منتقل ہونا ہے۔ یہ سرمایہ دو مختلف شکلوں میں آتا جاتا ہے۔ زر کی شکل میں اور صنعتی و زراعتی امداد کی صورت میں۔ چونکہ دونوں قسم کے سرمایہ کا تعلق پیدائش دولت سے نہایت ہی اہم ہے اور سرمایہ کی نقل و حرکت، پیدائش دولت ہی کی غرض سے ہوتی ہے اس لئے پہلے پیدائش دولت کے عام مفہوم کو سمجھ لیجئے۔

انسان اپنی ضروریات پورا کرنے کے لئے قدرت کی مختلف پیداوار کو جنھیں عطیۂ قدرت کہنا چاہئے، اپنی صلاحیتوں اور قوتوں سے ایک نئی ترکیب یا نئی شکل دیتا رہتا ہے۔ اور انسان کا یہ عمل، عملِ پیدائشِ دولت کہلاتا ہے۔ عطیات قدرت مثلاً نباتات، معدنیات، جمادات اپنی اصلی شکل میں ہمارے لئے زیادہ کارآمد نہیں، لیکن جب انھیں ہم کھانے، کپڑے، مکان برتن کی شکل میں تبدیل کر لیتے ہیں تو ان سے ہماری بہت سی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔

ہزاروں سال قبل جب انسان نے اول اول پتھر کے ٹکڑے کو اوزار بنانے کے لئے توڑا تو اسے صرف پتھر کے ٹکڑے اور جسمانی محنت کی ضرورت پڑی لیکن آج جبکہ زمانہ ترقی کے مختلف مدارج طے کر چکا ہے۔ پیدائش دولت اس قدر آسان و سادہ نہیں رہی۔ اب یہ عمل بہت وسیع و پیچیدہ ہو گیا ہے، خام اشیاء کی فروخت، کارخانوں کا قیام، نقل و حمل، آسان کام نہیں اور ان کے لئے مصارف کا ہونا ضروری ہے۔ یہ مصارف دو طرح کے ہوتے ہیں ایک مصارف مقدم دوسرے مصارف ضمنی یعنی ایک وہ مصارف جو کسی شے کی طیاری کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً خام مواد، ایندھن، اُجرت وغیرہ۔ دوسرے وہ مصارف جو کسی چیز کی طیاری کے لئے بنیادی حیثیت تو نہیں لیکن ضمنی حیثیت ضرور رکھتے ہیں مثلاً اصل سرمایہ کا سود، کارخانہ کا کرایہ، اشتہارات کا خرچ، بیمہ وغیرہ۔ الغرض پیدائش دولت کا انحصار بعض خاص وسایل پر موقوف ہے۔ جن کو معاشیات کی اصطلاح میں وسائل پیدائش کہتے ہیں۔ یہ وسایل چار ہیں۔ زمین، محنت، سرمایہ اور تنظیم۔ ان چاروں کا اہتمام کرنے والے بالترتیب یہ ہیں۔ زمیندار، مزدور، سرمایہ دار اور ناظم۔

اس وقت ہم تیسرے وسیلۂ پیدائش (یعنی سرمایہ) سے بحث کریں گے۔ معاشیات میں سرمایہ کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ سرمایہ افراد یا قوم وا، کی وہ دولت ہے جو مزید دولت پیدا کرنے کے لئے استعمال کی جائے۔ لیکن اس میں زمین شامل نہیں ہے۔ سرمایہ وہ پیدا یا جمع کی ہوئی دولت ہے۔ جو مزید دولت پیدا کرنے میں صرف کی جاتی ہے۔ اس سے مراد صرف روپیہ نہیں بلکہ روپیہ کی مدد سے حاصل کی ہوئی اشیاء بھی اس میں شامل ہیں مثلاً مشین، کارخانہ کی عمارت وغیرہ غرضکہ ہر وہ چیز جس سے مزید دولت پیدا کرنے میں مدد لی جاتی ہے۔ اور جسے دوسرے کو منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ سرمایہ میں شخصی فراست، استعداد عقل وغیرہ بھی شامل ہیں۔ جن کو غیر مادی سرمایہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی سرمایہ کی بہت سی قسمیں ہیں۔ پیدائش دولت کے لئے وسایل پیدائش کا فراہم ہونا ضروری ہے۔ اور کم سے کم خرچ پر دولت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب یہ وسایل پیدائش بھی کم سے کم قیمت پر فراہم ہو سکیں۔

پیدائش دولت کے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ کی مقدار کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ خام اشیاء کی

بڑی مقدار میں غیر ملکی مشینوں کی خریداری وغیرہ پر بڑا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ دنیا میں اس وقت ہندوستان کے علاوہ بھی بعض دوسرے ممالک ایسے ہیں جو قدرتی معطیات کے لحاظ سے تو بہت امیر ہیں مگر سرمایہ ان کے پاس کافی مقدار میں نہیں ان ملکوں میں دولت کی پیدائش کم قیمت پر اسی وقت ممکن ہے جب سرمایہ باہر کے کسی ملک سے آئے یا ملک کی قدرتی پیداوار (خام اشیاء) باہر بھیجی جائیں لیکن چونکہ قدرتی پیداوار بآسانی باہر نہیں بھیجی جاسکتی اس لئے زیادہ تر سرمایہ باہر سے آتا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ کے بازاروں سے بے انتہا سرمایہ ان ممالک کو بھیجا گیا جو قدرتی دولت کے لحاظ سے امیر سمجھے جاتے تھے، لیکن سیاسی طور پر حکومت برطانیہ کے مستعمرات تھے۔ ہندوستان بھی ۱۹۴۷ء تک برطانیہ کا ایک مستعمرہ تھا۔ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور جوٹ، روئی، کوئلہ، تل (تلہن)، نیل، میگنیز وغیرہ اس کی مختلف قدرتی پیداواریں ہیں۔ جو بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اس لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے قدم جماتے ہی سارے وسائل پیداوار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُن کے پاس سرمایہ تھا، جو صنعتی ترقی پر صرف ہوا اور سارا نفع ولایت کے بنکوں میں پہونچتا رہا۔ گزشتہ صدی میں بیرونی سرمایہ ہندوستان کی معاشی و صنعتی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، ریلیں، نہریں، بندرگاہ، چائے کے بڑے باغات، روئی اور جوٹ کے کارخانے، نیل کی کاشت، بڑے بنک اور دوسرے قومی ادارے اسی سرمایہ کے ممنون احسان ہیں۔ گو اس طرح ہم کو صنعتی ترقی ضرور حاصل ہوئی، مگر اسی کے ساتھ خام پیداوار بہت کچھ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی اور مشین کے آجانے سے گھریلو صنعت بھی ختم ہوگئی۔ بیکاری میں اضافہ ہوگیا۔ کارخانوں میں انسان زیادہ سے زیادہ تعداد میں داخل ہونے لگے اور اس طرح وہ ملک جو ۸۰ فیصدی زراعتی تھا سرمایہ کے برے اثرات سے نہ بچ سکا۔

تقسیم سے پہلے چالیس کرور انسانوں والے ملک میں صرف چند ایسے انسان تھے جو سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار کہلانے کے مستحق تھے مگر ان کا سرمایہ ہندوستان جیسے وسیع ملک کی ضرورت کے لئے کافی نہ تھا۔ ہندوستان پر کتنا بیرونی سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اس کی مقدار کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کی رائے میں اس کی مقدار ۱۹۳۸ء تک ۳۸ کرور ۸۰ لاکھ پونڈ تھی اور بعض کے نزدیک ایک کرور پونڈ۔

۳۰ جون ۱۹۴۶ء کی ریزرو بنک کے حسابات سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان ظاہری طور پر قرضدار ملک نہیں کہا جاسکتا۔ مگر حقیقت حال یہ نہیں۔ کیونکہ بیرونی سرمایہ جو ہمارے ملک میں لگا ہوا ہے، اس پر ہر سال ہم اصل کے قریب سود ادا کرتے ہیں اور اس کا زیادہ تر نفع باہر چلا جاتا ہے، کیونکہ سرمایہ کا بڑا حصہ ایسی شرایط پر دیا گیا ہے کہ اس کا نفع ہم تک نہیں پہونچتا۔ اس میں زیادہ مقدار اس سرمایہ کی ہے جو طویل مدت کے لئے قرض لیا گیا ہے۔

تیس چالیس سال پہلے برطانیہ اہم قرضہ دینے والا ملک گنا جاتا تھا، مگر اس وقت امریکہ کا نمبر اول ہے اور اس وقت تخمیناً کل داخلی یا بیرونی سرمایہ کی مقدار جو ہندوستان میں لگا ہوا ہے (۶) چھ ارب ۶۵ کرور روپیہ ہے۔ ہمارے پنجسالہ منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لئے ۲۰۶۹ کرور روپے کی ضرورت ہوگی، ۱۲۵۸ کرور روپے ملک کے اپنے وسایل سے حاصل کئے جائیں گے، ۱۵۶ کرور روپے حکومت ہند کو بیرونی امداد کی شکل میں مل چکے ہیں اور باقی ۶۵۵ کرور روپے کی فراہمی بیرونی قرض کے ذریعہ ہوگی۔

بین الاقوامی سرمایہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک قلیل المدت سرمایہ اور دوسرا طویل المدت سرمایہ۔ پہلا سرمایہ کم مدت یا کم وقت کے لئے حاصل کیا جاتا ہے اور یہ زیادہ تر سونے کی شکل میں ہوتا ہے۔ معمولاً یہ سرمایہ ملک کا تجارتی توازن قایم رکھنے کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔ مگر بعض ممالک میں سیاسی بدامنی ہونے پر یا کسی طبقہ سے برا سلوک ہونے پر لوگ

یا سرمایہ سونے کی شکل میں امریکہ بھیج دیتے ہیں جہاں ان کا سرمایہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس کو "گشتی سرمایہ" [illegible] Capital کہنا بیجا نہ ہوگا۔ مگر اس طرح سرمایہ کا بہاؤ ایک طرف ہو جانے پر تجارتی توازن خراب ہو جاتا ہے۔ دوسرا یعنی طویل المدت سرمایہ عام طور پر توازنِ حسابات کو برقرار رکھنے کے لئے قرضہ کے طور پر حاصل کیا جاتا ہے توازنِ حسابات سے مراد ان تمام حسابات کی تسکین بخش ادائی سے ہے جو ملکوں کے باہمی تجارتی تعلقات کی بنا پر کرنا پڑتی ہو مثلاً ہندوستان زیادہ مدت تک امریکہ سے زیادہ مال لیتا رہے اور اس کی قیمت نہ ادا کرسکے تو وہ مجبور ہوگا کہ اپنا سونا وہاں بھیجے یا پھر اس سرمایہ سے کام لے جو ہندوستان کا امریکہ میں موجود ہے۔ لیکن اگر ہندوستان ان دونوں ذرائع میں سے کسی کو بھی اختیار نہیں کرسکتا تو توازنِ حسابات برقرار نہ رہے گا۔ اور لامحالہ امریکہ کے لئے یہ ضروری ہو جائے گا کہ اپنا سرمایہ بھیج کر ہندوستان کی معاشیات کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنے تجارتی توازن کو برقرار رکھ سکے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو ہندوستان دیوالیہ ہو جائے گا اور امریکہ کی تجارت جو ہندوستان کے ساتھ تھی یکلخت ختم ہو جائے گی اور اس کا اثر امریکہ کے معاشی نظام پر برا پڑے گا۔ کیونکہ وہاں ان تمام اشیاء کا کاروبار بند ہو جائے گا جو باہر بھیجی جاتی تھیں اور ملک میں بے روزگاری بڑھ جائے گی غرضکہ ان وجوہ کی بنا پر سرمایہ کی حرکت ہمیشہ جاری رہتی ہے۔

طویل المدت بیرونی سرمایہ ملک میں دو طرح سے آتا ہے۔ ایک تو وہ جو Direct Loans کہلاتے ہیں۔ دوسرا Portfolio Investment۔ پہلی حالت میں قرض دینے والے ملک کو اپنے سرمایہ پر سارے اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور قرض دینے والا خود سارے فایدہ ونقصان کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ قرضخواہ ملک کو سود کے طور پر کوئی رقم نہیں ادا کرنی پڑتی۔ وہ صرف اصل سرمایہ کی ادائی کا ذمہ دار ہوتا ہے جو مقررہ مدت کے بعد ادا کرنی ہوتی ہے گو اس طرح قرض لینے والا ملک سود ادا کرنے کی مصیبت سے بچ جاتا ہے اور نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ مگر اسی کے ساتھ اسے قرض دینے والے ملک کی پالیسی کا غلام ہو جانا پڑتا ہے

میں قرض لینے والے ملک کے اختیارات زیادہ ہوتے ہیں اسے ایک خاص مقدار سود کی ادا کرنی پڑتی ہے۔ خواہ فایدہ ہو یا نقصان۔

بین الاقوامی سرمایہ سے تجارتی توازن پیدا ہونے کی بنا پر یہ ضرور ہوتا ہے کہ دونوں ملکوں کی خوشحالی بڑھ جاتی ہے۔ مگر چونکہ قرض لینے والے ملک کو سیاسی پابندیاں بھی قبول کرنی پڑتی ہیں، اس لئے تعلقات میں کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے اور لڑائی کا سبب بن جاتا ہے۔

بین الاقوامی سرمایہ کا اثر دنیا کے قدرتی وسایل پر بھی پڑتا ہے کیونکہ اس طرح خام پیداوار کا استعمال بڑھ جاتا ہے کاروبار ترقی کرتا ہے، بیروزگاری گھٹتی ہے اور معاشی حالت سنبھلتی ہے، دوسرے ملک کی ایجادات واختراعات سے فایدہ اٹھا سکتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل انیسویں صدی کے شروع میں حکومت برطانیہ بڑا اہم قرض دینے والا ملک تھا۔ مگر اسکے بعد حکومت برطانیہ کو خود امریکہ سے قرضہ لینے کی نوبت پہنچی اور امریکہ نے بڑی مقدار میں اپنا سرمایہ ان ممالک کو بھیجا جہاں خاص طور پر لڑائی ہوئی اور جہاں جنگ کے اثرات شدت سے محسوس کئے گئے۔ لڑائی کے دوران میں ہر ملک اپنی بقا کے لئے لڑائی کا سامان زیادہ بنانا شروع کر دیتا ہے مگر لڑائی ختم ہوتے ہی یہ سب سامان بیکار ہو جاتا ہے اور ملک کی اصل حالت بحال ہونے کے لئے نئے سرے سے سرمایہ کی ضرورت پڑتی ہے، ان [illegible] پہلی جنگ عظیم کے بعد انہیں قرضوں کو پورا کرنے کے لئے امریکہ کا سرمایہ باہر جانے لگا اور قبل اس کے کہ دنیا پہلی جنگ کی [illegible] دوسری جنگ عظیم کا سامنا کرنا پڑا اور ہر طرف سے بیرونی سرمایہ کی مانگ بڑھنے لگی۔ اس کا نتیجہ [illegible] امریکہ اپنی داخلی وخارجی پالیسی [illegible] سرمایہ کا مرکز بن گیا۔ امریکہ کی تجارت امریکی دنیا کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے اور توازنِ حسابات قائم رکھنے اور اپنی معاشیات [illegible] بہت سے ملک امریکہ کے سرمایہ دار کا منہ دیکھ رہے ہیں اور اس مضبوطی کی بنا پر آج امریکہ دنیا کی ایک بڑی طاقت [illegible]

[illegible] ایم۔ اے

جلوے

(مولوی عبدالحق)

یہ تحریری خاکوں کا ایک سلسلہ ہے جو صرف ان اکابر سے تعلق رکھتا ہے جن سے میں ذاتی طور پہ واقف رہا۔ اس سلسلہ کا پہلا خاکہ مولوی عبدالحق سے تعلق رکھتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق، علی گڑھ کالج کے مایۂ ناز فرزند، اردو زبان کے سب سے بڑے محسن، اور اردو ادب کے بلند پایہ محقق اور نقاد ہیں۔ علی گڑھ کالج سے گریجویٹ ہونے کے بعد انسپکٹری آف اسکول وغیرہ کی منزلوں کو طے کرکے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن) کے شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اور وہیں سے پنشن لینے کے بعد اب صرف اردو کی خدمت اور اس کی بہبودی ہی آپ کی زندگی کا مقصد ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں آپ کا سب سے بڑا ہاتھ تھا اور پاکستان میں آج بھی اسی مقصد کے لئے اردو کالج چلا رہے ہیں۔

عزیز مرزا کے بعد انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) کے معتمد اعزازی چنے گئے۔ اور یہ تو دنیا نے دیکھا کہ اپنے منصب کا چارج لینے کے بعد انھوں نے انجمن ترقی اردو کو دنیا کی عظیم الشان اور ذی وقار انجمنوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا۔ آل انڈیا اردو کانفرنس جو ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں ہوئی تھی اس میں انجمن ترقی اردو کا مرکز بجائے حیدر آباد کے دہلی منتقل ہونا قرار پایا اس رزولیوشن کے مطابق انجمن کا مرکز دہلی منتقل ہوا اور "دہلی قتل عام" کے قبل تک جو خدمات انجمن ترقی اردو نے ہندوستان میں انجام دیا اس کا تفصیلی تذکرہ نہ میرا مقصد ہے اور نہ ممکن ہی ہے لیکن اتنا ضرور یاد دلاؤں گا کہ یہ سب بابائے اردو ہی کے دم سے ہوا۔ دہلی کے خوں چکاں واقعہ کے بعد بعض مجبوریوں کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کراچی چلے گئے اور وہاں رہ کر آج جو خدمات اردو کی انجام دے رہے ہیں اور جو احسان اس زبان و ادب پر کر رہے ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب سے میری سب سے پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ میں ہوئی تھی۔ میں اسوقت اردو آنرز کا طالب علم تھا۔ یونیورسٹی کی کسی میٹنگ کے سلسلہ میں وہ علی گڑھ تشریف لائے تھے اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کو اپنے یہاں شام کی چائے پر مدعو کیا تھا۔ مجھ پر اور لیث صاحب پر رشید صاحب کی چونکہ خاص شفقت تھی اس لئے انھوں نے ہم دونوں کو بھی بلایا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اردو ادب کے سب سے بڑے محسن سے نیاز حاصل کرنے کا موقع حاصل ہو۔ ان کی صورت اور شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا۔ باتیں کوئی علمی اور ادبی قسم کی نہیں ہو رہی تھیں بلکہ مزاح کا رنگ غالب تھا۔

یہ ملاقات سرسری تھی ۱۹۳۶ء میں جب شعبۂ اردو نے مجھ کو اور لیث صاحب کو "دکن کے قدیم مثنوی گو شعرا" اور "تذکرۃ الشعرا" پہ تحقیقی مقالہ مرتب کرنے کے سلسلہ میں کتب خانۂ آصفیہ سے استفادہ کے لئے حیدر آباد بھیجا اور ہم لوگوں کو تقریباً دو مہینے تک عبدالحق صاحب کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا اس وقت میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر مجھے غور کرنے کا موقع ملا۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں جب انجمن ترقی اُردو کا مرکز دہلی میں منتقل ہوا اور میں علی گڑھ سے ایم۔ اے کرچکا تو عبدالحق صاحب نے سنہ ۱۹۳۹ء میں "ہندوستانی ڈکشنری" مرتب کرنے کے سلسلہ میں مجھے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے دہلی بلالیا۔ وہاں میں کسی نہ کسی طرح سنہ ۱۹۴۷ء تک رہا اور اس طویل عرصہ میں علمی، ادبی، معاشرتی اور اخلاقی کوئی پہلو بھی ان کی زندگی کا ایسا نہیں ہے جو میری نظر سے پوشیدہ رہا ہو۔ اور جس کا میں نے مطالعہ نہ کیا ہو۔

عبدالحق صاحب میں مروت اور سیر چشمی بدرجۂ اتم ہے اور اکثر اوقات لوگ ان کی اس صفت سے غلط فایدہ بھی اُٹھا لیتے ہیں۔ دہلی میں قلمی کتابوں کے بیچنے والے اکثر ان کے یہاں آتے اور منھ مانگی قیمت لیکر جاتے۔ منیجر صاحب نے ایک دو مرتبہ اس طرف توجہ بھی دلائی لیکن غریب کتب فروش کی مایوسی کا خیال کرکے وہ کبھی بھی قیمت میں کمی یا لینے سے انکار نہ کرسکے۔ آخر منیجر صاحب نے دربان کے ذریعہ ایسے لوگوں پر ملاقات میں پابندی لگادی۔

عبدالحق صاحب کی رہائش بالکل انگریزی اور مغربی لیکن وضع قطع اور لباس نہ صرف مشرقی بلکہ مولویانہ ہے۔ حیدرآباد میں ان کا حسین اور آرام دہ بنگلہ اور اس کا قیمتی فرنیچر اور سامان آرائش قابلِ رشک تھا۔ حیدرآباد کے طویل قیام نے طبیعت میں ریاست اور درباداری پیدا کردی تھی شروع شروع جب میں حیدرآباد پہونچا تو ان کی شاہانہ کروفر اور مغربی طرزِ رہائش کو دیکھ کر متعجب ہوا اور میں اکثر سوچا کرتا کہ یہ وزرا جیسی طرزِ رہائش کیا ایک ادیب اور پروفیسر کے لئے موزوں ہے۔ دربان اور شاگرد پیشیوں کا ایک لشکر اور سب کے سب فرعون بے سامان۔ ایک مرتبہ حیدرآباد کے کوئی ضعیف اور ستم رسیدہ شخص ہم لوگوں کی موجودگی میں عبدالحق صاحب سے ملنے آئے اور دو گھنٹے تک انتظار کرنے کے باوجود بھی باریاب نہ ہوسکے۔ دوسرے روز جاپہنچے پھر پہونچے اور پھر خبر کرائی لیکن ملازمین نے اطلاع کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی، تیسرے روز وہ پھر آئے اور گھنٹوں بیٹھے رہنے کے بعد بھی جب وہ باریاب نہ ہوسکے تو مجھے ان کی ضعیفی اور بے بسی پر ترس آیا۔ میں نے ان سے ان کے حالات پوچھے۔ کہنے لگے

"اوایل زندگی میں جب میں ایک ممتاز تاجر تھا۔ عبدالحق صاحب سے میرے روابط اور تعلقات تھے۔ بہار کے زلزلہ نے میرے کاروبار اور خاندان کو تباہ کردیا۔ میں ایک سلسلہ میں حیدرآباد آیا تھا۔ خیال ہوا کہ عبدالحق صاحب سے بھی مل لوں۔ لیکن یہ ملازمین ملاقات نہیں ہونے دیں گے۔ اس لئے اب خودداری کا تقاضا نہیں کہ چوتھی مرتبہ پھر آؤں"۔

مولوی عبدالحق صاحب دن کا کھانا بہت عرصہ سے نہیں کھاتے۔ صرف شب کا کھانا کھاتے ہیں۔ حیدرآباد میں دن کا کھانا تو ہم لوگ تنہا کھالیتے تھے لیکن شب کا کھانا برابر ساتھ کھاتے تھے۔ کھانے کے دوران میں وہ حد درجہ بے تکلف ہوجایا کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر لوگوں پر پھبتی کسنا اور مذاق اُڑانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اور ان کی یہ کیفیت بعض مرتبہ حد سے اتنی تجاوز کرجاتی کہ مذاق سلیم پر ناگوار گزرتی، کبھی کبھی ہمارے اساتذہ پر بھی پھبتی کستے اور ہر جملہ کے بعد خوب خوب ہنستے۔ مجھے ان کی یہ بات ناگوار معلوم ہوتی لیکن خاموش رہتا۔ ایک مرتبہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا انھوں نے یہی طرح مذاق اُڑایا۔ اس روز میں اپنی طبیعت پر قابو نہ رکھ سکا۔ اور جواب میں کوئی سخت جملہ میں نے بھی کہدیا۔ میز پر سناٹا چھا گیا۔ اور مولوی صاحب بالکل خاموش ہوگئے۔ ڈاکٹر عابد حسین میری بغل میں تھے۔ سامنے مولانا احتشام الحق دہلوی مرحوم اور اختر راے پوری تھے۔ کھانا ختم ہوا تو ڈاکٹر عابد حسین صاحب چہل قدمی کے بہانے مجھ کو علحدہ لے گئے اور سمجھانے لگے کہ مولوی صاحب کی یہ عادت سی ہوگئی ہے ان کو دل سے کسی کی تحقیر منظور نہیں، محض تفریحاً کھانے کے دوران میں اس طرح کی گفتگو کرنے کے عادی ہیں۔ آپ کو اس قدر سخت جملہ استعمال نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا اور آئندہ خاموش رہنے کا وعدہ کیا۔ لیکن مولوی صاحب اس روز سے مجھ کو مخاطب کرکے ہمارے اساتذہ کا مذاق اُڑانے کے بارہ میں خود محتاط ہوگئے۔

عبدالحق صاحب کی طبیعت میں ظرافت اور بذلہ سنجی بہت زیادہ ہے ایک مرتبہ میز پر ایک صاحب کھانا کھا رہے تھے جب وہ
ی انگلیاں چاٹ چکے تو جھٹ اپنی انگلیاں ان کے منہ کے پاس کر دیں کہ اسے بھی صاف کر دیں۔ لوگ ہنس پڑے اور وہ
رگوار پسینہ پسینہ ہوگئے۔

مولوی عبدالحق صاحب سیاست کے بارے میں "باہمہ بے ہمہ" کا نظریہ رکھتے ہیں، ان کا سیاسی موقف اُردو ہے اور
رف اُردو۔ ہندوستان میں جب تک رہے "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" کے اصول پر کانگرس، مسلم لیگ،
ندو مہاسبھا، کمیونسٹ اور سوشلسٹ، سبھوں سے سمجھوتہ کئے رہے، سیاست میں انھیں سب سے اتفاق رہتا ہے بشرطیکہ
ئی ان کی اُردو سے اختلاف نہ کرتا ہو ورنہ پھر سے "من و گرز و میدان و افراسیاب" پر اُتر آتے ہیں۔

مذہب کے بارہ میں وہ ناقابلِ فہم ہیں۔ اتنے دنوں تک ساتھ رہنے کے باوجود بھی میں ان کے متعلق کچھ نہیں جان سکا کہ
کیا ہیں۔ وضع اور صورت مولویوں کی، سیرت اور اخلاق صوفیوں اور درویشوں کا، عمل دہریوں کا۔ نماز وہ کبھی نہیں پڑھتے
ید بقرعید کی بھی نہیں، روزہ ہر روز رکھتے ہیں اور کبھی بھی نہیں۔ یعنی دن کا کھانا عرصہ سے نہیں کھاتے، پانی گھنٹہ گھنٹہ پر
تے ہیں اور حقہ ایک منٹ کے لئے بھی منہ سے جدا نہیں کرتے، مروت فیاضی، جود و سخا اور صداقت کے لحاظ سے وہ قرونِ
ولیٰ کے مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ اخلاقی جرأت ان میں بہت ہے۔ دشمنوں کے ساتھ بھی ان کا سلوک فیاضانہ اور دوستانہ
ہوتا ہے۔

عام بڑے آدمیوں کی طرح ان میں ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنی تعریف اور خوشامد سے خوش ہوتے ہیں اور ہمیشہ
وئی نہ کوئی ان پر حاوی ضرور رہتا ہے۔ دوسروں کے کہنے پر فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ اور جس پر اعتماد کرتے ہیں یا یوں سمجھئے کہ جو
ن پر حاوی ہوجاتا ہے اس کی ہر بات کو آمنّا و صدقنا سمجھتے ہیں۔ حیدرآباد میں اختر رائے پوری ان پر حاوی تھے۔ دہلی میں
ہاشمی صاحب فرید آبادی ان پر حاوی تھے۔ آج کل کراچی میں معلوم نہیں ان پر کون حاوی ہے۔ جس کی نظر سے وہ سب کچھ
دیکھتے اور جس کی زبان سے وہ سب کچھ بولتے ہیں۔

عبدالحق صاحب میں عالی ظرفی بہت زیادہ ہے وہ ادیبوں اور اسکالرز کی بہت زیادہ قدر اور عزت کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ
کام کرنے میں ہم لوگوں کو ان کی بزرگانہ عنایات اور شفقت کا بارہا تجربہ ہوتا تھا۔ انجمن ترقی اُردو دہلی میں اسکالرز کے درمیان
کچھ چشمک بھی رہتی تھی اور اس کی بڑی وجہ ایک دو حیدرآبادی افراد تھے جو وہاں کام کر رہے تھے ....
وری مسٹر لال سروپ استوا م۔ اے علیگ بھی ہندوستانی ڈکشنری کے مرتب کرنے میں میرے ساتھ کام کر رہے تھے ان کی عادت
تھی کہ کام کرتے کرتے اکثر اپنے دارالمطالعہ سے اُٹھ کر ہوٹل چائے پینے چلے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی بزرگ نے مولوی صاحب سے
شکایت کی تو وہ منغض اور کبیدہ ہوکر بولے:۔ "میاں! یہ علماء اور ادیبوں کے کام کرنے کی جگہ ہے، سرکاری دفتر نہیں ہے
ریسرچ کرنے والے کلرک نہیں ہو سکتے۔ اس طرح کی پابندی نہ میں اپنے لئے پسند کرتا ہوں نہ اپنے کسی رفیق کار کے لئے" شکایت کرنے والے
بزرگ کو بڑی خفت ہوئی۔

عبدالحق صاحب میں انانیت اور علم کا غرور نام کو نہیں لیکن طرزِ رہائش میں رکھ رکھاؤ اور نفاست بہت ہے۔ طبیعت
میں چڑچڑاپن پایا جاتا ہے۔ لیکن غالباً یہ کبر سنی اور غیر معمولی مشغولیت کے باعث ہے۔ اپنے حصول مقصد میں حد درجہ مستقل مزاج
ہوتے ہوئے بھی وہ تلون طبع واقع ہوئے ہیں۔ خوشامد پسندی اور دربار داری نے ان میں بادشاہوں کی سی خصوصیت پیدا کر دی
ہے یعنی "گہ بہ جابے برنجند و گہ بہ دشنامے انعام دہند"۔ ان کی اس خصوصیت کے باعث آج ان کو کوئی اپنا جانشین نہ مل سکا
شبلی کو سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی کئی جانشین ملے جو ان کے مقاصد کو ان کی خواہش اور تمناؤں کے مطابق اب تک

چلا رہے ہیں۔ لیکن عبدالحق صاحب کی اپنی تمام تبحر علمی اور خلوص کے باوجود یہی کوئی مستقل جانشین اب تک نہیں نکل سکا۔ وہ بھی پیش اکثر وہ اس پر حسرت کرتے تھے اور متفکر رہتے تھے۔ اس کی وجہ بہت صاف ہے۔ شبلی اپنے عالمانہ اوصاف کے ساتھ ساتھ درویشانہ زندگی گزارنے کے عادی تھے، اپنے رفقائے کار اور شاگردوں کے ساتھ وہ ایک سطح پر آ کر رہتے تھے، عبدالحق صاحب میں اس کی کمی ہے۔ وہ اپنے رفقائے کار اور شاگردوں کے ساتھ بھی بڑی رکھائی بلکہ حاکمانہ تیور سے ملتے ہیں۔ ان کی اس کمزوری کے باعث انھیں آج تک کوئی لائق جانشین نہ ملا۔

تصانیف کے معاملہ میں وہ ایک خاص قسم کے سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔ دوسروں کی محنت اور کاوشوں سے تیار کردہ کتابوں پر اپنے نام کی مہر لگا کر دنیا کے سامنے پیش کر دینے میں انھیں ذرا جھجک نہیں ہوتی۔ ان کی یہ کمزوری خواہ کسی وجہ جس بنا پر ہو لیکن بہت سے غریب ادیبوں کے لئے یہ حد درجہ تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری" کو لیجئے۔ جس زمانہ میں اس کی ترتیب کا کام حیدر آباد میں ہو رہا تھا۔ میں کچھ دنوں تک وہاں رہا تھا۔ اس ڈکشنری کے مرتب کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی کچھ اسکالر تھے۔ عبدالحق صاحب کا کام اس پر نظر ثانی سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ ادبی اور علمی دیانتداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس میں عبدالحق صاحب اپنے تمام رفقائے کار کا نام بورڈ کی شکل میں لکھ دیتے اور خود کو اس تالیفی بورڈ کے صدر کی حیثیت سے پیش کرتے ذکہ مصنف کی حیثیت سے چند پیسوں کے عوض جو ان مرتبین لغت کو معاوضہ کی شکل میں دئے گئے ان کو ان کے اتنے بڑے علمی کارنامے کی سرفرازی سے محروم کر دیا گیا۔

تحقیق اور تنقید انسانی دماغ کی دو مختلف تحریکیں اور صلاحیتیں ہیں۔ ایسی مثالیں کم ملتی ہیں کہ یہ دونوں صلاحیتیں کسی ایک آدمی میں مجتمع ہوں۔ لیکن عبدالحق صاحب کا یہ کمال ہے کہ ان میں یہ دونوں صلاحیتیں بدرجہ اتم ہیں۔ جہاں ان کی علمی تحقیقات ہر طرح کی ہمت شکنی اور صبر آزما دشواریوں پر غالب رہتی ہے اور عالمانہ موشگافیوں کی حامل ہے، وہاں ان کی تنقیدیں سنجیدہ طور پر طالب دیا ہیں، کھرے کھوٹے اور اصل نقل میں فرق بتلا کر انشا پردازوں کو صحیح راستہ دکھلاتی ہیں۔ بلاشبہ حالی نے جس کی داغ بیل ڈالی تھی عبدالحق صاحب نے بہت حد تک اس کو تکمیل کی حد تک پہونچا دیا ہے۔ وہ جس کتاب پر تنقید کے لئے قلم اٹھاتے ہیں تو اس پر پہلے کامل عبور حاصل کر لیتے ہیں اور بعض مرتبہ ان کی تنقید میں تحقیق کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ اپنی رائے بے لاگ دیتے ہیں اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تنقید سے مصنف کی ہتک یا دلآزاری نہ ہونے پائے۔ کج فہمی اور کوتاہ نظری تو ان کے یہاں نام کو نہیں۔ جس کتاب پر تنقید کرتے ہیں اس کے مصنف کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا کوئی ہمدرد دوست اور شفیق بزرگ اس کی خوبیوں پر ہمت افزائی کرتے ہوئے غلطیوں سے خبردار کر رہا ہو۔ وہ سمجھ بوجھ اور صداقت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور خارجی واقعات سے تنقید کرتے وقت متاثر ہوتے ہیں۔ تنقید کرتے وقت ان کا انداز ہمدردانہ ہوتا ہے۔ ان کے یہ چند جملے ان کو ایک نقاد کی حیثیت سے سمجھنے میں ہماری مدد کریں گے۔

"غلطی تحقیق و جستجو کی گھات میں رہتی ہے ادب کا کامل ذوق سلیم ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتا۔ بڑے نقاد اکثر فاش غلطیاں کر جاتے ہیں۔ لیکن ان سے ان کے کلام پر حرف نہیں آتا۔ غلطی ترقی کی مانع نہیں بلکہ وہ صحت کی طرف رہنمائی کرتی ہے پچھلوں کی بھول چوک آنے والے مسافر کو راستہ بھٹکنے سے بچا دیتی ہے۔"

غرض یہ کہ عبدالحق صاحب کے یہاں بیجا سرزنش یا استہزا تنقید کرتے وقت روا نہیں۔ وہ مصنف کی غلطیوں کا انکشاف کرتے ہیں لیکن اس امر کا بہت خیال رکھتے ہیں کہ اس انکشاف کے وقت مصنف کی تحقیر نہیں ہونے پائے۔ مثال ملاحظہ ہو۔

"بعض بعض باتیں اس کتاب میں عجیب ملتی ہیں۔ جس سے ہمارا یہ شبہ قوی ہو جاتا ہے کہ فاضل مصنف نے کتابوں

کے متعلق راے ظاہر کرتے ہیں ان کا مطالعہ اور ان کی اثر اندازی کیا ہے تو محض سرسری - مثلاً فرانس کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ بادشاہ تھا جس نے ... نظم لکھی ہے اس کا نام فردوسی ہے اور موضوع موسیقی ہے - فردوسی کو اردو کی کتاب بتانا ایسا ہے جیسے کوئی گلستان کو اردو کتاب کہے - فردوسی ... زبان میں ہے اور اسے اردو سے متعلق کوئی واسطہ نہیں۔

عبدالحق صاحب کی زبان بہت رواں اور طرز تحریر پر نور ہے - ان کی تحریر میں غضب کا استدلال پایا جاتا ہے اور جو کچھ لکھتے ہیں اس کی بنیاد ٹھوس دلائل پر ہوتی ہے - غیر دلچسپ عالمانہ مضامین پر بھی قلم اٹھاتے ہیں تو اسے اپنی زبان اور طرز بیان سے مدد دے کر دلچسپ بنا دیتے ہیں - عربی فارسی کے ثقیل اور مغلق الفاظ سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں - مثلاً ایک جگہ لکھنؤ اسکول کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"لکھنؤ کی ممتاز خصوصیت تصنع اور تکلف تھی اور یہ ان کے تمدن کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں صاف نظر آتی ہے وہ نمائش و خوش لباسی اور ظاہری آرائش پر مٹے ہوئے تھے اور عوام و خواص میں اس کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ اس لئے سب کے سب ادھر ہی ڈھل گئے۔ اور ساری ہمت تکلفات میں صرف کر دی۔ سادگی کی جگہ بناوٹ نے اور فطرت کی جگہ صنعت نے لے لی۔ میر اور ان کے ہم عصروں کا اثر زائل ہو گیا۔ اور ان کی بجائے دوسرے استاد پیدا ہوئے جو اس سوسائٹی کے سپوت اور اس تمدن کے پروردہ تھے۔ حضرت ناسخ اور ان کے بعد خواجہ وزیر، صبا، رشک اور امانت وغیرہ کے کلام میں سوائے لفظی صنعت، مناسبت اور تلازمہ اور دیگر تکلفات کے کچھ بھی نہیں۔"

پروفیسر محمد معین الدین دردائی

گاہے گاہے باز خواں —

ہمارے موجودہ علماء کرام

کبھی آپ نے اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ مذہب کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ کیا وہ کوئی معمہ ہے جسے عقل انسانی اسوقت تک حل نہیں کرسکی، کیا وہ کوئی دقیق علمی مسئلہ ہے جس کی حقیقت کا علم ابھی تک نوع انسانی کو نہیں ہوسکا، کیا وہ خیالی تار و پود ہے جس کی گتھیاں کبھی سلجھائی نہیں جاسکتیں، کیا وہ فطرت کا کوئی ایسا راز ہے جو کبھی بے نقاب نہیں ہوسکتا اور کیا وہ کوئی شاعرانہ ادعا ہے جو کبھی "شرمندۂ معنی" نہیں ہوا؟

یقیناً مذہب ان میں سے کوئی چیز نہیں ہے۔ نہ وہ کوئی معمہ ہے نہ دقیق علمی مسئلہ، نہ وہ کوئی خیالی چیز ہے نہ فطرت کا عمیق راز، نہ وہ شاعری ہے نہ محض لفاظی، پھر کیا ہے؟

اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے صرف خدا کی پرستش و نیایش کا تو آپ کو اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہوگا کیونکہ اس سے نہ خدا کو کوئی فایدہ پہونچ سکتا ہے نہ انسان کو اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے بے چون و چرا ان صحائف پر ایمان لے آنے کا جنھیں الہام ربانی سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو آپ کو اس کے ماننے میں پس و پیش ہوگا، کیونکہ بغیر سمجھے ہوئے کسی بات کی تصدیق کرنا عقل انسانی کے منافی ہے، اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ مذہب نام ہے چند متعین حرکات و مراسم کا بعض مخصوص الفاظ کے زبان سے ادا کردینے کا تو آپ کو اس کی صحت سے اور بھی انکار ہوگا کیونکہ ان باتوں سے تاثرات دماغی کو کیا واسطہ — لیکن اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے — احساس انسانیت کا تو غالباً اصولی نقطۂ نظر سے نہ زاہد متقشف کو انکار ہوگا اور نہ عقلیت پرست انسان کو —

پھر آپ کا وقت تو ضایع ہوگا لیکن آیئے چند لمحات اس کے سمجھنے میں بھی صرف کردیں کہ "احساس انسانیت" کیا چیز ہے۔

میں انسان پیدا ہوا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ واقعی انسان ہوں لیکن اگر میں چھری لے کر اپنے کسی عضو کو مجروح کر ڈالوں یا کسی بلند دیوار پر چڑھ کر نیچے کود پڑوں تو کیا آپ اس وقت بھی مجھے انسان کہیں گے؟ غالباً نہیں۔

زید نہایت زیرک انسان ہے لیکن دو اور دو کے مجموعہ کو وہ ہمیشہ تین سمجھتا ہے تو کیا آپ اس کی صحت عقل و دماغ کا یقین کریں گے؟ غالباً نہیں۔

حامد بڑا صاحب عقل و فراست انسان ہے لیکن کسی دوسرے شخص کو ذبح کر ڈالنے یا لوٹ لینے میں مطلق تامل نہیں کرتا تو کیا آپ اس کی فراست و دانائی کو تسلیم کریں گے؟ غالباً نہیں۔

اس لئے معلوم ہوا کہ انسان اس مخصوص ہیئت والی مخلوق کو نہیں کہتے جو خاص وضع کے جوارح و اعضا رکھتی ہے بلکہ انسان نام ہے اس خاص کیفیت عقل و شعور کا۔

(۱) جو خود اس کی ذاتی اہمیت کو متعین کرتی ہے۔

(۲) جو عقل کا صحیح استعمال سکھاتی ہے۔

(۳) جو افراد انسانی کا احترام کرنا بتاتی ہے۔

اور اس لئے اگر ان میں سے کسی ایک حس کا فقدان کسی شخص میں پایا جائے تو ہم کہیں گے کہ وہ دائرۂ انسانیت سے خارج ہے۔
پھر آپ غور کریں کہ مذہب و الحاد کی موجودہ دور کش مکش میں احساس کہاں پایا جاتا ہے اور کس کا ساتھ دینے میں انسانی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تاریخ مذہب کا تعلق جس حد تک بانیان مذہب سے ہے ہمیں اس میں حرف گیری کا کوئی موقع نہیں ملتا اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں یہ احساس سہ گانہ پوری قوت کے ساتھ پایا جاتا تھا۔ کیونکہ جس حد تک ذاتی اہمیت کا تعلق ہے وہ اپنے آپ کو فرستادۂ خدا اور مامور من اللہ کہہ کر انتہائی نقطہ تک کھینچ لائے اور جس حد تک استعمال عقل و فراست کا واسطہ ہے، اس کا بین ثبوت وہ اُن جماعتوں کی صورت میں چھوڑ گئے جنھوں نے ان کو رسول و نبی مان کر اُن کے کہنے پر عمل کیا اور جن کی عقلوں کو اپنے زمانہ کے مقتضاء کے لحاظ سے غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ رہ گیا نوع انسانی کا احترام، سو اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ انھوں نے مقالاً نہیں بلکہ عملاً ہمیشہ اسی کا درس دیا۔

لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر بانیٔ مذہب کے اٹھ جانے کے بعد اس کی تعلیم کا اثر ضعیف ہونے لگا اور یہ ضعف رفتہ رفتہ اس حد تک بڑھ گیا کہ مذہب کا صحیح مفہوم ہی لوگوں کے دلوں سے محو ہو گیا اور وہ چیز جس کا تعلق صرف فعل و عمل سے تھا، محض لفظی و مقامی ادعا ہو کر رہ گئی۔

مثلاً عہدِ سعادت کو لیجئے جب رسول اللہ زندہ تھے اور ان کی تعلیم زندہ تھی کہ اس وقت اپنے آپ کو "نحن مسلمون" کہنے والے کس نوع کے انسان تھے اور آج کس انداز کے ہیں ــــ اس وقت مسلم نام تھا ایک ایسے انسان کا جس کی ذاتی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ جب مستعد ہو کر اس نے اپنی آستین اُلٹ دی تو یہ سمجھئے گویا زمانہ کا ورق اُلٹ دیا اور جب وہ دوسروں کی ہمدردی پر آمادہ ہوا تو اپنی جان قربان کرنے میں اس نے پس و پیش نہ کیا، رہ گئی عقل آزادی سو اس کا ثبوت "لااکراہ فی الدین" سے زیادہ اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے۔

برخلاف اس کے آج کل اُن اکابر اسلام کو دیکھئے جو اپنے بڑے بڑے عماموں اور لانبی لانبی عباؤں کے ساتھ تقدس اسلامی کا قدِ آدم اشتہار بنے پھرتے ہیں اُن علمائے کرام اور صوفیائے عظام کو دیکھئے جو اپنی طویل الذیل داڑھیوں اور ڈھیلے ڈھالے کرتوں کے ساتھ ہیبتِ اسلامی کا دیو پیکر مجسمہ نظر آتے ہیں کہ اگر کسی ایسی بستی میں جو انسانی عصیان کاری سے تباہ و برباد ہو چکی ہے عدوان و معصیت کا کوئی صحیح مجسمہ نصب کیا جانا مقصود ہو تو اُن سے بہتر "ماڈل" مل ہی نہیں سکتا ــــ ان کے جسم کے ایک ایک ریشہ کی پرورش، ان کے خون کے ہر ہر قطرہ کی روانی ایک مستقل یادگار ہے اس بد باطنی و کور نفسی کی، ایک طویل داستان ہے اس مکر و فریب اور زور و ریا کی جس کو اسلام نے بدترین لعنت قرار دے کر دنیا سے مٹانا چاہا اور اس جماعت نے بہترین ذریعہ فلاح و کامیابی سمجھ کر اختیار کر لیا۔

ان کے سر نمازوں میں اس لئے نہیں جھکتے کہ مقصود خدا کی پرستش ہے بلکہ صرف اس لئے کہ دوسروں کے سر اُن کے سامنے جھکیں، وہ روزے اس لئے نہیں رکھتے، کہ ابنا و جنس کی عسرت و تنگدستی کا اندازہ کر کے ان کے ساتھ ہمدردی کریں بلکہ صرف اس لئے کہ بہتر سے بہتر غذائیں ان کے سامنے پیش کی جائیں، وہ اپنے مواعظ میں بخشش و عطا کی فضیلت اس لئے بیان نہیں کرتے کہ اس کی اہمیت کا خود انھیں بھی عملی اعتراف ہے بلکہ محض اس لئے کہ دوسرے اپنی دولت اُن کے قدموں پر ڈال دیں۔

ان خدا سے ڈرنے والوں کی اندرونی زندگی کا مطالعہ کرو تو معلوم ہو کہ وہ اپنی شبستانِ عیش میں کیسی شاد کام اور عذاب الٰہی کی طرف سے کیسی مطمئن زندگی بسر کرتے ہیں۔ دنیا کی کوئی معصیت ایسی نہیں جو دوسروں کے لئے حرام اور ان کے لئے حلال نہ ہو اور فرائض اخلاق میں سے کوئی امر ایسا نہیں جو دوسروں کے لئے واجب اور ان کے لئے غیر ضروری نہ ہو، ان کا خدا قہار تھا

ہے، لیکن دوسروں کے لئے اُن کے لئے نہیں، اُن کا خدا رحیم و کریم ہے مگر صرف ان کے لئے دوسروں کے لئے نہیں اُن کی فردوس بھی مخصوص ہے اور اس کا حوض و کوثر بھی دوسرا اُن کی حوریں بھی مخصوص ہیں اور اُن کے غلمان بھی مخصوص۔ الغرض یہ جماعت جو جسم کے لحاظ سے "گاؤ پرستی" — اور نفس کے لحاظ سے "فرعون و نمرود" ہے ایک مستقل عذاب ہے جو انسانیت و اخلاق پر نازل ہوا ہے اور یہی اصل سبب ہے موجودہ ارتداد و الحاد کا کیونکہ اُن کی تنگی، اُن کی تعلیم، اُن کا عجب و غرور نسلِ حاضر کے لئے جو یقیناً زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ اہل تنقید ہے ایک ایسا حجاب ہے قبول مذہب کے لئے جس کا دور ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اُن بتوں کو مسمار نہ کر دیا جائے — پھر یہ خصوصیت صرف علمبرداران مذہب اسلام ہی میں نہیں پائی جاتی اور دوسرا بلکہ صرف انہیں سے مخصوص ہے بلکہ اس وقت تمام مذاہب عالم کے عالموں، پجاریوں، راہبوں اور موبدوں کا یہی حال ہے اور اس لئے اگر ہم اُن کی تعلیمات اور ان کے حالات زندگی کو سامنے رکھ کر مذہب کی حقیقت سمجھنا چاہیں تو ہم اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ "نجات انسانی" کبھی مذہب سے متعلق نہیں ہو سکتی — کیونکہ جس حد تک اعتماد نفس و احترام انسانیت کا تعلق ہے وہ یکسر نفس پرست و خود غرض واقع ہوئے ہیں، اور ان کی ذہنی غلامی کا یہ عالم ہے کہ مذہب کے باب میں عقل سے کام لینا وہ کسی طرح گوارا کر ہی نہیں سکتے — یہاں تک کہ اب مذہب نام صرف اس چیز کا رہ گیا ہے جسے عقل انسانی قبول نہ کر سکے۔

اب مذہب کے مقابلہ میں الحاد و ارتداد کو دیکھئے جو اس وقت نہایت قوت کے ساتھ دُنیا میں پھیل رہا ہے، اس میں کلام نہیں کہ انسان کی ذاتی اہمیت اب اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا ہے اور اس کی تمام کارگاہ عقل و علم پر قائم ہے، لیکن مجھے یہ ماننے میں تامل ہے کہ وہ اجتماعی طور پر نوع انسانی کو کوئی فائدہ پہونچا سکتا ہے اور جب تک کوئی ادارہ حقیقتاً "احساس انسانیت" کو بیدار نہ کر سکے، ہم اسے امن و سکون کا ضامن نہیں کہہ سکتے۔

ہو سکتا ہے کہ ایک ملحد و منکر دنیا میں غیر معمولی دولت کا مالک ہو جائے، ممکن ہے کہ مذہب سے آزاد ہونے کے بعد انسان کی عقلی و ذہنی آزادیاں علوم و فنون میں بیش بہا ایجاد و اختراع کا سبب بن سکیں، لیکن کفر و الحاد میں کوئی ادنیٰ سی علامت بھی اس امر کی نہیں پائی جاتی کہ وہ تمام بنی نوع انسان سے محبت کرنا سکھا سکے اور ساری دُنیا کے افراد کو کسی وقت ایک رشتہ سے وابستہ کر دینا اس کے امکان میں ہو، یورپ کی موجودہ علمی ترقیاں اور اس کے ساتھ اس کا استعماری جذبہ اس کی تجارتی حرص اور انسانیت سوز جنگی تیاریاں کافی ثبوت اس امر کا ہے کہ دُنیا کو جس چیز کی ضرورت ہے اور عالم انسانی جس مقصود کے لئے تڑپ رہا ہے وہ نہ اس وقت کے بنائے ہوئے مذہب سے حاصل ہو سکتا ہے، ورنہ الحاد والا مذہبیت سے بلکہ

"مرد ایں رہ را نشانے دیگر ست"

پھر وہ نشان کیا ہو سکتا ہے؟ وہ کون سا راستہ ہے جو منزل مقصود تک پہونچا سکتا ہے؟ افسوس ہے کہ اس کا جواب دنیا کی اس قوم کے لئے بہت مشکل ہے جو ذہنی غلامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اِدھر اُدھر سے

سمندر کے عجائب

کرۂ زمین کی سب سے زیادہ حیرتناک چیز اس کا سمندر ہے جو اس کے تین چوتھائی حصّہ کو گھیرے ہوئے ہے اور ہمارے کرہ کی یہ وہ خصوصیت ہے جو غالباً کسی دوسرے کرہ میں نہیں پائی جاتی۔

مریخ میں برفیلی چوٹیاں پائی جاتی ہیں، وہاں کچھ تری کا بھی پتہ چلتا ہے اور نباتات کا بھی لیکن سمندر وہاں نہیں ہے۔ زہرہ کے چاروں طرف نہایت غلیظ ابر پایا جاتا ہے لیکن ہمارے کرہ کے بادلوں سے بالکل مختلف ہے جس میں آکسیجن ہے نہ پانی۔ دوسرے سیارے اس قدر سرد ہیں کہ وہاں سمندر کا وجود ممکن ہی نہیں، چنانچہ مشتری کا ٹمپریچر صفر سے بھی نیچے ۲۱۶ ڈگری ہے اور زحل کا ۲۴۰ ڈگری صفر سے نیچے اور اس لئے یہاں ہر چیز منجمد حالت میں ہے۔

ہمارے کرہ میں پانی کی اس قدر زیادتی ہے کہ اگر زمین کی تمام خشکی کا حصّہ پانی میں ڈبو دیا جائے تو سمندر کا صرف اٹھارواں حصّہ اس کے لئے کافی ہوگا۔ اسی طرح اگر زمین کے نشیب و فراز کو دور کرکے اس کی سطح برابر کردی جائے تو سمندر کی سطح اس سے ۸ ہزار فٹ اونچی ہوجائے۔

سمندر میں پانی کہاں سے آیا؟ ماہرین سائنس کا خیال ہے کہ یہ پانی آتش فشاں پہاڑوں سے آیا ہے۔ اول اول جب کرۂ زمین پیدا ہوا تو وہ مشتعل تھا اور اس کی بالائی سطح آہستہ آہستہ سرد ہوکر منجمد ہونا شروع ہوئی، لیکن اندرونی حصّہ بدستور گرم و مشتعل رہا اور اس کے بخارات اندر ہی اندر گھٹتے رہے، لیکن جب یہ بخارات بہت زیادہ ہوئے تو وہ زمین پھاڑ کر باہر نکلے اور پانی کا طوفان بن گئے، یہ سلسلہ زمانۂ نامعلوم سے برابر جاری رہا یہاں تک کہ لاکھوں سال میں اس پانی نے سمندر کی شکل اختیار کرلی۔

سمندر کی نیچے کی دنیا کیسی اور کیا ہے اس کا صحیح حال ابتک نہیں معلوم ہوسکا، جس طرح زمین کے خشک حصّہ پر میدان، پہاڑ، درے اور گھاٹیاں پائی جاتی ہیں اسی طرح سمندر کے نیچے بھی ہیں، لیکن سمندر کے میدان زیادہ وسیع، اسکے پہاڑ بہت بلند اور اس کی گھاٹیاں بہت گہری ہیں اور اس کا اندازہ یوں ہوسکتا ہے کہ اگر ہمالیہ کی ایورسٹ چوٹی کو جو ۲۹ ہزار فٹ بلند ہے، سمندر کے اندر ڈبو دیا جائے تو بھی سمندر کے پانی کی سطح اس سے ایک میل اونچی رہے گی۔

سمندر کے کنارے اس کی گہرائی ۴۰۰ سے ۶۰۰ فٹ تک ہوتی ہے، لیکن جوں جوں آگے بڑھتے جایئے یہ گہرائی بھی بڑھتی جائے گی یہاں تک کہ کہیں کہیں وہ ۷۰۰۰ میل تک پہونچ جاتی ہے۔ سمندر کے نیچے جو سلسلہ پہاڑوں کا پایا جاتا ہے وہ بہت عجیب و غریب ہے۔ چنانچہ بحر اٹلانٹک میں آئس لینڈ کے پاس جو کوہستانی سلسلہ زیر آب پایا جاتا ہے، اسکی لمبائی دس ہزار میل اور چوڑائی ۵۰۰ میل ہے۔ ہر چند ان پہاڑوں کی چوٹیاں پانی کے اندر ایک میل کی گہرائی میں ہیں لیکن ان میں سے بعض چوٹیاں پانی کے اوپر بھی آگئی ہیں اور انھوں نے جزیروں کی صورت اختیار کرلی ہے۔

کہیں کہیں زیر آب سطح پہاڑ بھی پائے جاتے ہیں۔ اور اس قسم کے پہاڑ اب تک سیکڑوں کی تعداد میں دریافت ہوچکے ہیں، یہ بالکل زمین کی سطح کی طرح ہموار ہیں اور اگر پانی خشک ہوکر یہ سامنے آجائیں تو وہ ہزاروں میل کے مسطح میدان نظر آئیں

سمندر کا تموج بھی خاص چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سمندر میں موجوں کا اُٹھنا زیادہ تر ہوا پر منحصر ہے لیکن تموج کا سبب وہ اندرونی چشمے بھی ہیں جو اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر آتے جاتے رہتے ہیں اور اس طرح سطح آب میں تموج پیدا کرتے رہتے ہیں۔ جن مقامات میں بارش نہیں ہوتی وہاں کا پانی گرم ہوجانے کی وجہ سے ابخرات میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اور اس طرح نمک کی مقدار زیادہ ہوجانے کی وجہ سے وہ نیچے کی طرف جاتا ہے اور دوسرے حصوں کا پانی اس کی جگہ لے لیتا ہے، اس سے پانی میں تلاطم پیدا ہونے لگتا ہے جس کا دوسرا نام تموج ہے، جو کافی نقصان کی چیز ہے۔ موجوں کی کمی و بیشی کا تعلق زیادہ تر ہوا کی رفتار پر ہے۔ موجوں کی بلندی تیز ہوا کی صورت میں ۱۶ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن کبھی کبھی جب ہوا طوفانی ہوجاتی ہے تو چالیس چالیس فٹ بلند موجیں سمندر میں اُٹھنے لگتی ہیں اور بعض بحری سیاحوں نے تو سو سو فٹ بلند موج کا مشاہدہ کیا ہے۔

جب سمندر میں کوئی موج اُٹھتی ہے تو اس کی بلندی رفتہ رفتہ کم ہوجاتی ہے لیکن اسکی لمبائی بڑھتی جاتی ہے اور ہزاروں میل تک چلی جاتی ہے، جس کی رفتار کبھی کبھی ۵۰۰ میل فی گھنٹہ تک ہوجاتی ہے۔

سمندر کی سطح برفانی تودوں کے پگھلنے سے اونچی بھی ہوجاتی ہے، چنانچہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ تمام برف کی چٹانیں گھل جائیں تو سمندر کی سطح ۶۵ سے ۱۶۵ فٹ تک بلند ہوجائے اور زمین کا چوتھائی حصہ غرقاب ہوجائے۔

صرف ایک لفظ نے جاپان کو تباہ کردیا

دوسری جنگ عظیم میں ۱۹۴۵ء تک جاپان کی حالت بہت سقیم ہوگئی تھی۔ اتحادی فوجوں کے فضائی حملوں سے شہر کے شہر تباہ ہوچکے تھے، لاکھوں آدمی تباہ و برباد ہوگئے تھے، ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا، اور جاپان کا آخری بحری بیڑہ بھی تباہ کیا جاچکا تھا۔

اس وقت جاپان میں دو جماعتیں تھیں، ایک لڑائی جاری رکھنے کے حق میں تھی اور دوسری صلح کرلینے کے حق میں، آخرکار کثرت رائے سے یہ طے پایا کہ ہتھیار ڈالنا ہی مناسب ہے اور سوویٹ یونین کو بیچ میں ڈالنا چاہا کیونکہ اس وقت تک روس جاپان کے خلاف جنگ میں شریک نہ ہوا تھا۔ چنانچہ جاپان کا وزیر اعظم روسی سفیر جیکب ملک سے ملا۔ لیکن اس نے بے رُخی سے کام لیا۔ شاہ جاپان شاہزادہ کونوئی کو ماسکو روانہ کیا کہ وہ سوویٹ یونین سے اپیل کرے۔ لیکن اسٹالین اور مولوٹوف نے بھی کوئی توجہ نہیں کی اور یہ عذر پیش کیا کہ وہ پوسٹڈم کانفرنس میں شرکت کی طیاری کررہے ہیں اور اس مسئلہ پر غور کرنے کی فرصت نہیں ہے۔

پوسٹڈم پہونچ کر اسٹالین نے ٹرومین صدر امریکہ سے اس بات کا ذکر کیا اور ۲۶ر جولائی ۴۵ء کو برطانیہ، امریکہ اور چین کے دستخطوں سے جاپان کو الٹی میٹم بھیجا گیا کہ یا تو وہ ہتھیار ڈالدے یا تباہ ہونے کے لئے طیار ہوجائے۔ یہ خبر سُن کر جاپان بہت خوش ہوا کیونکہ شرائط صلح کافی نرم تھے اور ان میں ظاہر کیا گیا تھا کہ ہتھیار ڈالنے کی صورت میں جاپان کی قومی حیثیت باقی رکھی جائے گی، وہ اپنی حکومت خود بناسکے گا اور شاہ جاپان بھی اپنے تخت پر بدستور قایم رکھا جائے گا۔

شاہ جاپان نے اپنے وزیر خارجہ سے کہا کہ شرایط بہت مناسب ہیں اور انھیں قبول کرلینا چاہئے اور ۲۷ر جولائی تک پوزیشن یہ تھی کہ سوا وزیر حربیہ کے سب نے متفقہ طور پر شرائط صلح مان لینا طے کرلیا، لیکن چونکہ پوسٹڈم کے شرائط صلح کا علم جاپان کو صرف ریڈیو کے ذریعہ سے ہوا تھا اور کوئی باقاعدہ اطلاع پوسٹڈم سے نہ آئی تھی، اس لئے سوال یہ تھا کہ محض ریڈیو کی اطلاع پر کوئی قدم اُٹھانا مناسب ہے یا نہیں۔

اس کے دوسرے دن جاپان کے وزیر اعظم کا اخبار والوں سے انٹرویو مقرر ہوچکا تھا اس لئے قرار پایا کہ اخبار

والوں سے اس باب میں صرف یہ کہدیا جائے کہ جاپان اتحادی مطالبات کو رد کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا لیکن وہ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کرسکا ہے۔

دوسرے دن ۲۸ر جولائی کو وزیر اعظم نے اخبار کے نمایندوں سے کہا کہ جاپان فی حال "mokusatsu" سے کی پالیسی پر قایم ہے۔ جاپانی زبان میں یہ لفظ بہت مبہم سا مفہوم رکھتا ہے جس کے معنی رد کرنے کے بھی ہوسکتے ہیں اور "اظہار رائے سے احتراز" کرنے کے بھی۔

بدقسمتی سے انگریزی خبر رساں ایجنسیوں نے اس کا پہلا مفہوم قرار دیکر یہ خبر شایع کردی کہ جاپان اتحادیوں کی شرائط صلح کو رد کردینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اس خبر کا امریکہ کے اخباروں میں شایع ہونا تھا کہ غصہ کی لہر دوڑ گئی اور ۲۸ر جولائی کے نیویارک ٹائمز میں یہ خبر شایع ہوگئی کہ چونکہ جاپان نے شرائط صلح رد کردئے ہیں اس لئے حملہ میں دیر نہ ہونا چاہئے اور امریکہ کے سکریٹری محکمۂ جنگ نے یہ بیان شایع کردیا کہ "چونکہ جاپان نے ہمارے شرائط رد کردئے ہیں اس لئے اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ جاپان کو سبق دینے کے لئے آٹم بم سے کام لیا جائے" — اور اس طرح ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی کا باعث صرف ایک لفظ تھا جس کا صحیح مفہوم سمجھنے میں انگریزی اخباروں نے غلطی کی تھی۔

قصر بکنگھم

لندن کا قصر بکنگھم، شاہی محل ہے۔ اس کا پہلا مالک جان شفیلڈ ڈیوک آف بکنگھم تھا جسے ایک ڈچ انجینیر نے سنہ ۱۷۰۳ء میں تعمیر کیا تھا۔ سنہ ۱۷۶۱ء میں جارج ثالث شاہ انگلستان نے اسے ۲۱ ہزار پونڈ میں خرید کیا۔ سنہ ۱۸۲۵ء میں دوبارہ اس کی تعمیر و ترمیم ہوئی۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۴۶ء اور سنہ ۱۸۵۶ء میں کچھ اضافہ کیا گیا اور ایک کمرہ رقص کا بنایا گیا جس کا طول ۱۱۱ فٹ اور عرض ۶۰ فٹ ہے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں اس کا روکار (صدر دروازہ کی طرف کا حصہ) دوبارہ تعمیر کیا گیا۔

یہ قصر گویا عجائب خانہ ہے قدیم شاہی یادگاروں کا، آرٹ کے نمونوں کا، طلائی و نقرئی ظروف کا اور بہت سی ایسی عجیب غریب چیزوں کا جنھیں انسان کی نگاہیں اس وقت تک نہیں دیکھ سکیں۔ اس میں ۶۰۰ سے زیادہ کمرے ہیں اور ان میں صرف چند ایسے ہیں جنھیں اجازت لینے کے بعد لوگ دیکھ سکتے ہیں۔ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی اس کی صفائی شروع ہوتی ہے اور ۶ بجے ایک پولیس کا افسر اس کا پھاٹک کھولتا ہے۔ ساڑھے ۶ بجے دودھ کی گاڑی اندر داخل ہوتی ہے اور اس کے بعد ایک بائسکل سوار لڑکا ملکہ الزبتھ کی پسند کے تین اخبار لیکر آتا ہے۔ ساڑھے سات بجے دو شاہی ڈاکئے زریں وردی پہنے ملکہ کی ڈاک سفید تھیلوں میں لیکر آتے ہیں اور ۸ بجے تک تمام سکریٹری، کلرک اور دفتر کے اہلکار اپنی اپنی میزوں پر پہونچ جاتے ہیں۔

ساڑھے آٹھ بجے ملکہ اپنی نشستگاہ میں اپنی ڈاک پڑھنا شروع کرتی ہیں اس حال میں کہ نیچے پائیں باغ میں بینڈ بجتا رہتا ہے ۲۴ گھنٹوں کے اندر سکریٹریز خطوں کا جواب دیدیتے ہیں لیکن خود ملکہ کسی پر دستخط نہیں کرتیں اس خیال سے کہ لوگ اسے فروخت نہ کرنے لگیں ملکہ الزبتھ خانہ داری کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتی ہیں اور روزانہ وہ ہر شعبہ کو ہدایات دیتی ہیں۔ قصر بکنگھم کے ۶۰۰ کمروں میں ۲۰۰ کمرے بالعموم خالی رہتے ہیں۔ ان کمروں کی غلام گردش تقریباً تین میل ہے جن پر قرمزی رنگ کے قالین ہر وقت بچھے رہتے ہیں۔ یہ کمرے گویا بھول بھلیاں ہیں چنانچہ ایک بار ملکہ میری تین گھنٹے تک راستہ نہ پاسکیں — باہر کا کوئی آدمی ان کمروں کو نہیں دیکھ سکتا۔ تخت شاہی کا کمرہ ۶۵ فٹ لمبا ہے اور ڈرائنگ روم کی لمبائی بھی اتنی ہی ہے۔ یہ دونوں کمرے جدید آراستہ ہیں۔ آرٹ گیلری کا کمرہ ۱۵۰ فٹ لمبا ہے جس کی چھت شیشے کی ہے محل کو صاف رکھنے کے لئے ۲۰۰ آدمی نوکر ہیں، شاہی کمروں میں ۲۶ مقررہ خادموں کے علاوہ اور کوئی نہیں جاسکتا۔ سال بھر میں رقص گاہ کا کمرا استعمال میں آتا ہے۔ قصر اگرچہ لندن کے بیچ میں ہے پھر بھی اس کا احاطہ ۴۰ ایکڑ زمین کو گھیرے ہوئے ہے جس میں باغ سبزہ زار، درخت، جھیل وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ قصر کے اندر ۳۰۰ گھڑیاں لگی ہوئی ہیں جن کو کوکنے اور صاف رکھنے کی ایک خاص کمپنی ذمہ دار ہے۔ قصر کی حفاظت میں بڑا اہتمام کیا جاتا ہے اور ملکہ کی موجودگی میں ۴۴ سنتری اور ۵۰ پولیس سارجنٹ ہر وقت متعین رہتے ہیں — جو سپاہی جھنڈے پر تعینات ہوتا ہے اس کا کام بہت سخت ہے کیونکہ ۵۰ فٹ بلندی پر اڑنے والے جھنڈے کو ہر وقت یہ دیکھتے رہنا کہ وہ صحیح رخ پر اڑ رہا ہے یا نہیں اور اس میں شکنیں تو نہیں پڑ رہیں، آسان کام نہیں ہے۔

انسان

عہدِ حاضر میں

پر افشاں سرمدی نغمے مرے بربط کے تاروں میں — نشاطِ جاوداں میرے گلستاں کی بہاروں میں
مری منت کشِ تعمیر ہے آسایشِ ہستی — ہوا میں تازگی رقصِ مسلسل آبشاروں میں
مری موجِ تبسم جلوہ دیتی ہے گلستاں کو — مری برقِ تجلی مسکراتی ہے ستاروں میں
غلط کیا ہے جو خود بینی مرا آئینِ ہستی ہے — کہ ہے خود حسن پنہاں بھی تو میرے بیقراروں میں
مرے ابرِ کرم سے زندگی ہے مستعار اس کی — وہ موجِ رنگ محوِ رقص ہے جو لالہ زاروں میں
مری عظمت کو یہ خاکِ پریشاں کیا سمجھ سکتی — فلک پر بھی تو کوئی تھا نہ میرے رازداروں میں

امینِ سرِّ پنہاں آرزوئے قلبِ دوراں ہوں
فرشتے جس کو سجدہ کر چکے ہیں میں وہ انساں ہوں

اجل کیا ہے قضائے زندگی کا بیکراں ہونا — خزاں یعنی نئے جلووں سے نظمِ گلستاں ہونا
پہونچ سکتا نہیں دستِ حوادث میرے داماں تک — سکوتِ موج ہے بیتاب رہنا پرفشاں ہونا
جھکا سکتی نہیں میری جبیں دنیا کی رعنائی — کہاں میں اور کہاں سرگشتۂ سود و زیاں ہونا
مرا اک کھیل ہے یہ ناتمام افسانۂ ہستی — ابھی باقی ہے اسرارِ حقیقت کا عیاں ہونا
تباہی کے علم لہرا چکے ابنائے گیتی میں — یہ موجِ ناتواں اب چاہتی ہے بیکراں ہونا
محبت اک حقیقت ہے فنا مفہوم ہے جس کا — فنا اک راز ہے مطلب ہے جس کا جاوداں ہونا

زمیں سے تا فلک اجزائے ہستی جن سے رخشاں ہیں
مرے سینہ کے ہر گوشہ میں وہ اسرار پنہاں ہیں

ارادہ ہے ان اسرارِ نہاں کو برملا کر دوں — زمیں کو آسمانی عشرتوں سے آشنا کر دوں
سنواروں اس تکلف سے یہی بکھری ہوئی زلفیں — عروسِ دہر کے جلووں کو میں دانش ربا کر دوں
ہوئی مدت کہ دھندلے پڑ گئے ہیں نقش ہستی کے — ان اجزائے کہن کو اک لطافت پھر عطا کر دوں
محبت عہدِ نو میں نامۂ ہستی کا عنواں ہو — شبوں کو صبح کے مانند رنگیں ماجرا کر دوں
ہر اک ذرہ سے پھوٹیں سرمدی انوار کے چشمے — فنا کے دام سے ابنائے گیتی کو رہا کر دوں
مٹا کر تفرقے مزدوری و سرمایہ داری کے — علم حریتِ کامل کا دنیا میں بپا کر دوں

پھر ان ڈوبی ہوئی ہستی کی نبضوں میں لہو آئے
وہ عالم ہو کہ ہر ذرے میں لطفِ رنگ و بو آئے

(کاروان)   علی اختر

نظرؔ سیہوری :-

رسم بندگی نکلی اُن کے آستانے سے
کفر عاشقی پھیلا میرے سر جھکانے سے

روح کو ملی تسکین دل ہوا ہے آسودہ
اُن کو یاد کرنے سے خود کو بھول جانے سے

میں نے تو چھپایا تھا رازِ غم کو خود سے بھی
آپ کی نگاہوں نے کہدیا زمانے سے

میری نسبتِ گلشن بجلیاں سمجھتی ہیں
حق تو مٹ نہیں سکتا آشیاں جلانے سے

زندگی کی راہوں میں دل اگر نہ ہو روشن
تیرگی نہیں مٹتی مشعلیں جلانے سے

دیکھنا قفس والو کس طرف گری بجلی
یہ دھواں سا اُٹھتا ہے کس کے آشیانے سے

اہلِ ظرف سمجھیں گے میرے ظرف کی قیمت
مجھ کو کچھ نہیں شکوہ اے نظرؔ زمانے سے

معصیت پر جو کسی کی کبھی پڑتی ہے نظر
دیکھ لیتا ہوں کہ دامن مرا تر ہے کہ نہیں

دیکھنے والے گلستاں کو ذرا غور سے دیکھ
لالۂ گل میں مرا خونِ جگر ہے کہ نہیں

لوگ کہتے ہیں گلستاں میں بہار آئی ہے
دیکھنا شاخ پہ کوئی گل تر ہے کہ نہیں

سمندر

(ساقیؔ جاوید بی اے)

یہ ابرو باد کا دمساز، زلزلوں کا امیں
یہ موج و سیل کی بستی، تلاطموں کی زمیں

یہ آندھیوں کا محل، بجلیوں کا گہوارہ
نگار خانۂ فطرت کا ایک شہپارہ

یہ ندیوں کا پسینہ، پہاڑیوں کا عرق
کتابِ شام و سحر کا یہ زرنگار ورق،

یہ وادیوں کا جگر یہ جبال و دشت کا دل
فراتؔ و نیلؔ کے دھاروں کی آخری منزل

فلک کی آنکھ کا آنسو، زمیں کے دل کی امنگ
یہ لوحِ خاک پہ تسنیم و سلسبیل کا رنگ

یہ صبح و شام کا شیشہ، یہ ماہ و سال کا جام
یہ ناخداؤں کا آقا، یہ کشتیوں کا امام۔

یہ حوصلوں کی ترازو، یہ عزم کی میزان
یہ تند و تیز ہواؤں کی جنگ کا میدان،

زمیں کی اُجلی قبا کا یہ سیکڑوں دامن،
بنا ہے کتنے سفینوں کی میّتوں کا کفن،

یہ کتنے قیصر و کسریٰ سے لے چکا ہے خراج
بدل چکا ہے یہ کتنی جلالتوں کا مزاج،

بہا چکا ہے یہ کتنے صلیب و منبر و طاق
اُڑا چکا ہے یہ کتنے تمدّنوں کا مذاق

پلا چکا ہے زمانہ کو مصرؔ و رومؔ کا خون،
زمیں سے اس نے اکھاڑے ہیں سطوتوں کے ستون

بنے ہیں جودیؔ و سیناؔ پہ اس نے سیل کے دام
غضب سے اس کے لرزتے ہیں آج بھی اہرام

ہلاکتوں کا یہ رہبر یہ ہیبتوں کا رسول،
سکھا رہا ہے زمانہ کو زندگی کے اصول

بہ بانگِ سیل و تلاطم یہ دے رہا ہے پیام
گلاب و عطر بناتے ہیں آدمی کو غلام،

اُٹھو زمیں پہ ابھی انقلاب لاتا ہے
قلاع و قصر پہ خونیں عذاب لاتا ہے

سکندر علی وجد:-

بہت حسین، بہت شاندار گزرے ہیں	جو صبح و شام سر رہگذار گزرے ہیں
ترے ہی نقشِ قدم پر کھلے ہیں لالہ و گل	چمن سے یوں تو بہت گلعذار گزرے ہیں
جنوں کے جوش میں بھی تیرے در سے دیوانے	خموش مثلِ نسیمِ بہار گزرے ہیں
ہزار بار مری زندگی کی راہوں سے	خود اہلِ حُسن بھی دیوانہ وار گزرے ہیں
سمیٹ لوں تو صنم خانۂ جہاں بن جائے	نظر سے حُسن کے وہ شاہکار گزرے ہیں

کہیں ٹھہر نہ سکے وجد مہر و ماہ و نجوم
رہِ حیات سے بے اختیار گزرے ہیں

شوق کی داستاں کو طول نہ دے	حُسن کا سلسلہ دراز نہیں
وقت گرم سفر ہے تیز چلو	ساری دُنیا حریم ناز نہیں
اپنے ہر غم سے دل ہے بے پروا	غمِ دنیا سے بے نیاز نہیں

گنجِ اسرار زندگی ہے وجد
موت کے پاس کوئی راز نہیں

دے سکے اہلِ محبت کب زمانے کو فریب	راز افشا کر گیا اندازِ بیگانہ ترا،

کس عقیدت اور محبت سے تراشے ہیں صنم
کعبۂ اہلِ نظر ہے وجد، بتخانہ ترا

ماتمِ تمنّا

عشق میں ضبط کا یہ جبر، عیاذاً باللہ — دل تڑپتا ہے مگر لب پہ نہ شیون ہے نہ آہ
مضطرب جس سے میں ہو جاؤں، وہ اُن کا انداز — مطمئن جس سے وہ ہوں، اتنا مرا حال تباہ
جان پامالِ ستم، ہوش تغافل پہ نثار — دل ہے مایوسِ کرم، دید سے محروم نگاہ
وہ اُدھر جلوہ گہِ ناز میں مصروفِ نشاط — آستاں اُن کا اِدھر میرے لئے حدِّ پناہ
خلوتِ ناز سے نکلے بھی اگر تفریحاً — اور مجھے جلوہ نظر آ ہی گیا خواہ مخواہ
میں ہوا محوِ جمال اور اُدھر اُن کا یہ حال — بل جو ابرو پہ تو پھیرے ہوئے چشمانِ سیاہ
غیظ کی وجہ سمجھنے سے اِدھر میں قاصر — اور اُدھر وجہ بتانے سے انھیں بھی اکراہ
نہ انھیں فرصتِ پرسش نہ مجھے تابِ بیاں — کس مپرسی و خموشی ہی سے کرنا ہے نباہ
اک تبسم نہیں، اک حرفِ تسلی بھی نہیں — یعنی دل جوئیِ اربابِ وفا بھی ہے گناہ
نہ یہ جرأت ہے کہ سر اُن کے قدم پر رکھ دوں — نہ کوئی اور نکلتی ہے منا لینے کی راہ
آؤ ماؔئل کہ تمناؤں کا ماتم کر لیں، — یاس بھی آئے کہ امید تو ہوتی ہے تباہ
پھر بھی اک سلسلۂ جور ابھی باقی ہے — یہ تعلق بھی بہت خاص ہے، ماشاء اللہ
تھا اسدؔ منزلِ آخر پہ مگر اے ماؔئل — اُس سے اک منزل ابھی میرا سفر ہے کوتاہ
ابھی غاؔلب کی طرح میں یہ نہیں کہہ سکتا — "اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا"

ماؔئل جائسی

ندؔیم جعفری :-

بہت شگفتہ و واضح، بڑے خلوص کے ساتھ — پیام تیری محبت کے آئے ہیں کیا کیا
یہ کون رات کو آیا نقاب اُلٹے ہوئے — ستارے تا بہ سحر جھلملائے ہیں کیا کیا
خبر بھی ہے تری محفل میں جاں نثار ترے — زباں پہ شکوۂ بیداد لائے ہیں کیا کیا
بچا کے دین کے تاریک راستوں میں ندیم
چراغ کفر کے میں نے جلائے ہیں کیا کیا

مطبوعات موصولہ

آفتابِ تازہ مجموعہ ہے وجد حیدرآبادی کی ۴۱ نظموں اور ۳۱ غزلوں کا جسے چیتنیا پرکاش لمیٹڈ حیدرآباد دکن نے نہایت اہتمام سے نفیس کاغذ پر پاکیزہ طباعت وکتابت کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے ضخامت ۱۴۸ صفحات قیمت چار روپیہ

دس بارہ سال سے زیادہ کی بات ہے کہ جناب سکندر علی وجد کو میں نے سب سے پہلے یہیں لکھنؤ میں دیکھا تھا جب وہ حیدرآباد سول سروس کی ٹریننگ کے سلسلہ میں غالباً سیتاپور میں کام سیکھ رہے تھے اور وقتاً فوقتاً لکھنؤ آتے رہتے تھے۔ یقیناً یہ زمانہ ان کی شاعری کی ابتدا کا تو نہ تھا، لیکن ان کی مقبولیت کی آغاز کا ضرور تھا۔

انھوں نے جب کبھی کرم فرمایا تو اپنا کلام بھی مجھے سنایا اور میں ان کے ذوق و آہنگ دونوں سے ہمیشہ لطف اندوز ہوا، کیونکہ جتنا اچھا وہ کہتے تھے، اس سے بہتر وہ پڑھتے تھے۔ اس کے بعد جب وہ حیدرآباد واپس گئے تو ان کا کلام جراید و رسایل میں نگاہ سے گزرنے لگا اور میں نے یہ دیکھ کر بڑی مسرت محسوس کی کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں گہرائی اور سنجیدگی بھی بڑھتی جارہی تھی، لیکن اب وہ غزل سے ہٹ کر نظم نگاری کی طرف زیادہ متوجہ نظر آتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام لہو ترنگ کے نام سے شایع ہوا اور ان کی معرکۃ الآرا نظم اجنتا کو بہت پسند کیا گیا۔ ان کی یہ نظم اس میں شک نہیں بڑی فن کارانہ چیز تھی، جس نے ان کی شاعری کا مستقبل واضح کردیا اور وہ ایک کامیاب نظم گو شعراء کی صف میں آ گئے۔

اس کے بعد حال ہی میں ان کے کلام کا انتخاب انجمن ترقی اردو (ہند) نے شایع کیا اور اب یہ مجموعہ حیدرآباد کی ایک نئے پبلشر نے پیش کیا ہے۔

اس مجموعہ میں ۴۱ نظمیں ہیں اور اتنی ہی غزلیں۔ نظموں میں ایلورا بڑے پایہ کی نظم ہے اور اجنتا کے ساتھ ساتھ اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد دوسری طویل نظم "کاروانِ زندگی" بڑی جاندار چیز ہے جس میں انھوں نے دنیا کی موجودہ تحریکِ آزادی کے شاندار مستقبل کو پیش کیا ہے۔ رومانٹک نظموں میں رقاصہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جس میں انھوں نے بہت لطیف شاعرانہ نقاشی سے کام لیا ہے۔

غزلوں کا حصہ، تغزل کے لحاظ سے نسبتاً گرا ہوا ہے اور ان میں نظم کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ انھیں بھی بے تکلف حصۂ نظم میں شامل کیا جاسکتا تھا۔

ہمیں یقیناً اس بات کی خوشی ہے کہ وجد نے نظم نگاری میں بڑی پختگی پیدا کرلی ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس بات کا افسوس بھی ہے کہ ان کی غزلوں میں اب وہ کیفیت نہیں پائی جاتی جو ان کے ابتدائی دور کی غزلوں میں پائی جاتی تھی۔ شباب تو خیر ان کا ابھی ختم نہیں ہوا لیکن زمانہ نے غالباً احساس شباب کم کردیا ہے اور یہ ان کی شاعرانہ زندگی کا معمولی سانحہ نہیں۔

بہرحال وجد اس عہد کے نوجوان شاعروں میں خیال و بیان کے لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور چونکہ ان کی شاعری کی ٹکنک ان تمام بدعتوں سے پاک ہے جو اس وقت کے بعض ترقی پسند شعراء کا تنہا سہارا ہے، اس لئے اس میں معنویت کے ساتھ ترنم بھی ہے اور خیال کے ساتھ فنی جمال بھی۔

ہمیں امید ہے کہ اہلِ ذوق وجد کے ان نقوشِ تازہ کو پسند کریں گے۔ کتاب کی قیمت اس کے حجم کو دیکھتے ہوئے زیادہ معلوم ہوتی ہے، لیکن آج کل کے مصارفِ اشاعت اور کلام کی خوبی کو دیکھتے ہوئے، ایسی زیادہ نہیں ہے۔

رجسٹرڈ نمبر ل ۲۴۴۸

نگار

سالانہ چندہ پاکستان وہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

ہندوستان پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/

نہایت ضروری اطلاع اگر کسی مہینہ کا پرچہ ۱۵ تک نہ پہونچے تو ہمیں لکھ بھیجئے تاکہ مہینہ کے اندر ہی آپ کو پرچہ دوبارہ روانہ کر دیا جائے، ورنہ پھر پرچہ بیرنگ روانہ کیا جائے گا۔ منیجر

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

مئی اور جون کے "نگار" میں ہم کافی وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ نگار کا آیندہ سالنامہ

"فرمانروایانِ اسلام" نمبر کیا، اور کیسا ہوگا

اور اس کی بعض خصوصیات کو بھی ظاہر کر چکے ہیں، لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے بعض حضرات اس کی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکے ہوں، ہم مکرر اس کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ سالنامہ در اصل "تاریخ اسلامی" کا نچوڑ ہوگا، جس میں ولادت رسول اللہ سے لیکر اس وقت تک کی تمام چھوٹی بڑی مسلم حکومتوں کا ذکر ہوگا جو ۱۳سو سال کے اندر تمام کرۂ ارض پر رونما ہوکر فنا ہوگئیں یا اب بھی باقی ہیں۔ اس میں ان تمام حکومتوں کے اسباب قیام و عروج اور انحطاط و اختتام کے ذکر کے ساتھ تمام حکمرانوں کے نام ان کی حکومت کی مدت بقید سن ہجری و عیسوی درج ہوگی اور یہ بتایا جائے گا کہ ایک ہی خاندان سے اور کتنے خاندان پیدا ہوئے انھوں نے کہاں کہاں حکومتیں کیں اور ان کا کیا حشر ہوا

مسلمان اپنے زمانۂ عروج میں یوروپ، ایشیا، افریقہ کے ان بعید ترین گوشوں تک پہونچ گئے تھے جن کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کا علم بہت کم حضرات کو ہے۔ نگار کے اس سالنامہ کے ذریعہ سے "تاریخ اسلام" کی انھیں مفید و دلچسپ معلومات کو پیش کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ دو نقشے ایسے پیش کئے جائیں گے جن کو دیکھ کر مسلمانوں کے عروج و زوال کی تصویر آپ کے سامنے آجائے گی

یہ پورا سالنامہ خود اڈیٹر نگار مرتب کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ہم پہلی جنوری ۱۹۵۳ء تک اسے شایع کر سکیں گے اس کی ضخامت کا صحیح اندازہ ابھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی بابت غالباً ہم کچھ کہہ سکیں گے۔ امید ہے کہ آپ اس کی توسیع اشاعت میں ضرور حصہ لیں گے اور اپنے حلقۂ احباب، مدارس کے طلبہ و اساتذہ کو بھی اس سالنامہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کریں

یہ سالنامہ در اصل ایک مستقل کتاب ہوگی اور کتاب ہی سمجھ کر اس کو حاصل کرنا چاہئے

جو حضرات نگار کے خریدار نہیں ہیں اور صرف سالنامہ ہی لینا چاہیں گے ان کے لئے اس کی قیمت (علاوہ محصول ڈاک) تین روپے ہوگی۔

ایجنٹوں کو اپنا آرڈر جلد دیدینا چاہئے تاکہ اسی حساب سے اسکی کاپیاں زاید طبع کرائی جائیں

سالنامہ کی کتابت شروع ہوگئی ہے اور ۱۰ جنوری ۱۹۵۳ء کو شایع ہو جائے گا۔

ایجنٹ حضرات مطلع فرمائیں کہ انھیں سالنامہ کی کتنی کاپیاں درکار ہوں گی۔ قیمت تین روپیہ فی کاپی (علاوہ محصول) ایجنٹوں سے دو روپیہ فی کاپی مع محصول۔

منیجر نگار لکھنؤ

دائیں طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ ستمبر میں ختم ہوگیا اور اکتوبر کا
"نگار" آٹھ روپیہ سات آنے میں وی پی ہوگا جس میں سالنامہ ۵۴ء کی قیمت بھی شامل ہے

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

جلد ۶۴ | فہرست مضامین ستمبر ۱۹۵۳ء | شمارہ ۳

پیاری بیٹی شوکت

تم کو کیا خبر، لیکن ۱۵ر جون ۲۵ء کی رات مجھے یاد ہے جب تم پیدا ہوئیں - میں بہت خوش تھا اور اولاد کے پیدا ہونے سے کون خوش نہیں ہوتا، لیکن تمھارے ساتھ میرا لگاؤ اس لئے اور زیادہ ہوگیا کہ تمھارے پیدا ہونے کے بعد تمھاری ماں جو مجھے بہت زیادہ عزیز تھیں علیل ہوگئیں اور تمھاری پرورش کا زیادہ تر بار مجھی کو اٹھانا پڑا، گویا تمھارے لئے ایک ماں کے فرائض بھی کئی سال تک مجھے ادا کرنے پڑے

تمھارے پیدا ہونے کے دو سال بعد جب میں بھوپال سے لکھنؤ آیا تو تمھاری ماں صحت یاب ہو چکی تھیں اور تم آہستہ آہستہ پروان چڑھ رہی تھیں

تم صرف میری اور ماں ہی کی محبوب بیٹی نہ تھیں بلکہ تمھارے نانا، نانی، خالائیں، ماموں اور تمام اعزہ تم کو بہت چاہتے تھے

زمانہ گزرتا گیا اور تم نشو و نما پاتی رہیں اور چونکہ تم اپنی ماں کی تنہا اولاد تھیں، اس لئے تمھاری کوئی خواہش ایسی نہ تھی جسے پورا نہ کیا گیا ہو

جب تمھارا توتلانا کچھ کم ہوا تو تمھاری تعلیم کی طرف توجہ ہوئی اور میری خوشی کی انتہا نہ تھی جب تم نے دبیر ماہر کی سند حاصل کی، اس کے بعد میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر تم انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں بیٹھیں

اس کے بعد تمھارا سلسلۂ تعلیم ختم ہوا، کیونکہ تمھاری ماں تمھاری شادی جلد کردینا چاہتی تھیں ــ اور آخر کار کتوبر ۴۲ء میں مجدد نیازی سے (جس کا نشو و نما بھی تمھارے ہی ساتھ ہوا تھا اور مجھے تم سے کم عزیز نہ تھا) تمھارا عقد کردیا گیا

۴۳ء میں جب تمھارا پہلا بچہ (جاوید) پیدا ہوا تو تمھاری ماں کی خوشی کا جو عالم تھا اسے الفاظ میں ظاہر ہیں کیا جاسکتا، اس بچہ کو تم نے نہیں بلکہ تمھاری ماں نے پالا اور تم پر یہ بار نہیں ڈالا۔ اس کے بعد ۵ سال ہنسی وشی گزر گئے اور دفعتاً تمھاری ماں بیمار پڑیں اور آٹھ مہینے علیل رہ کر چل بسیں۔ زندگی میں یہ پہلا غم تھا جو تم کو اٹھانا پڑا۔ لیکن اس کے بعد تمھارے دو بچے اور پیدا ہوئے (جواد۔ فرحت) اور تم بہل گئیں

اس کو بھی ۵ سال گزر گئے، اور ہر چند تمھاری ماں کی جدائی نے میری کمر توڑ دی تھی، مینے تمھیں کبھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ تمھاری زندگی میں کوئی خلا پیدا ہوگیا ہے اور تم کو خوش رکھنے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو پیرانہ سالی میں ن کرسکتا تھا

اب میری صحت گرتی جارہی تھی اور وہ زمانہ قریب تر آتا جارہا تھا جب میں تمھیں اور تمھاری اولاد سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتا ـــ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا ـــ اور ـــ دفعتاً ۲۷ اگست کو (ٹھیک وہی مہینہ ور وہی تاریخ جب ۵ سال قبل تمھاری ماں کا انتقال ہوا تھا) تم بیمار ہوئیں اور دو دن کے اندر میری زندگی کا خری ورق الٹ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئیں

ایک وقت تھا جب میں نے تمھارے سر پہ سہرا باندھا تھا اور آج بارہ سال کے بعد تم کو کفن پہنا کر پہلی اور خری بار گھر سے رخصت کر رہا ہوں ـــ شادی کے بعد رخصتی کی رسم ادا ہوا کرتی ہے، لیکن کبھی کبھی یہ رسم اس طرح بھی پوری کی جاتی ہے، مجھے معلوم نہ تھا

خیر، اس زخم کے مندمل ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ مجھے اب کتنے دن جینا ہے کہ تمھاری یاد دل سے ہٹانے کا خیال دل میں آئے، اور یوں بھی ممکن نہیں، کیونکہ گھر کے در و دیوار، گھر کی ایک ایک چیز، گھر کا ہر ہر ذرہ تمھیں پکار رہا ہے اور ذرا سی آہٹ سے ابھی میں چونک پڑتا ہوں کہ یہ تمھارے قدموں کی آواز تو نہیں، وہ میرے ساتھ تمھاری سمندر کی سی گہرائی رکھنے والی خاموش محبت، جس کے سہارے میں اپنی زندگی کے خری دن پورے کر رہا تھا اب کہاں! ـــ اچھا ہوا تنکا بھی تم اپنے ساتھ لے گئیں ـــ ڈوبنا ہے تو دیر کیوں ہو؟ ـــ لیکن ہاں یہ تو بتاؤ کہ یہ جو ہر طرف سے "شوکت، شوکت" کی آواز میرے کانوں میں آرہی ہے سے کیونکر روکوں ـــ اور بے اختیارانہ تمھارا نام میری زبان سے نکل جاتا ہے تو تم "جی ابا" کہکر کیوں فوراً جواب نہیں دیتی ہو ـــ تم تو بہت آہستہ بولنے کی عادی تھیں اور اب اتنی دور سے بھی تمھاری آواز میرے کانوں تک پہونچ جاتی ہے، شاید اس لئے کہ میں یہ نہ سمجھوں تم مجھ سے جدا ہوگئی ہو

یقیناً اس وقت جبکہ میری عمر ستر سال یا اس کے قریب قریب پہونچ چکی ہے ایسا صدمہ مشکل ہی سے برداشت ہوسکتا ہے، لیکن میں اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ میں زندگی کے باقی دن تمھارے بچوں کی خدمت میں صرف کر دوں اور جب تمھاری چھوٹی بچی فرحت کو اپنی گود میں لوں تو یہ سمجھوں کہ تمھیں میری گود میں ہو ـــ ـــ وہ کھیل جو میں نے ۲۸ سال پہلے تمھارے ساتھ کھیلا تھا، اب پھر کھیلنا چاہتا ہوں ـــ تم نہ سہی تمھاری بچی سہی، ایک ہی بات ہے

اولاد کی موت کا صدمہ بڑا سخت صدمہ ہے، لیکن کوئی نہ کوئی پہلو تسکین کا نکل ہی آتا ہے۔ سوچتا ہوں دو چار سال بعد آخرکار تم کو میری موت کا غم اٹھانا ہی تھا اور وہ تمہارے لئے یقیناً ناقابل برداشت ہوتا۔ اس لئے مجھے یک گونہ تسکین ہو جاتی ہے اس خیال سے کہ تم مجھ سے پہلے رخصت ہو کر اس صدمہ سے محفوظ رہیں اور تمہارا سارا غم خود میں نے اپنے سر لے لیا

اب تم جس دُنیا میں ہو، وہاں کا حال کسی کو معلوم نہیں، لیکن غالباً وہاں کی آبادی اتنی خود غرض، اتنی بے رحم نہ ہوگی جس قدر یہاں کی ہے اور پھر تم تو کس قدر معصوم تھیں، کتنی نیک تھیں، تم کو تو جوار رحمت میں جگہ ملی ہوگی اور تم وہیں سے اپنے غمزدہ باپ، اپنے سوگوار شوہر، اپنے معصوم بچّوں، اپنی چاہنے والی خالہ، اور اپنے چھوٹے بھائیوں کو محبّت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہوگی

اچھا، تم سے کافی باتیں ہو چکیں۔ اب اجازت دو کہ کچھ دیر کے لئے آنسو خشک کر لوں

خدا تمھیں اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دے

گھبراؤ نہیں میں بھی بہت جلد تمہارے پاس آنے والا ہوں۔ صرف اتنے دنوں کی مہلت چاہتا ہوں کہ تمہاری چھوٹی بچی فرحت تمھیں بھول جائے اور ہر شخص سے بار بار یہ پوچھنا چھوڑ دے کہ "باجی کہاں ہیں، کب آئیں گی"۔

تمہارا غمزدہ باپ
نیاز

ملاحظات

کشمیر کی نہ سلجھنے والی گتھی

اس مہینے کا اہم ترین واقعہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کے لئے نہرو، محمد علی کی ملاقاتیں تھیں جو کراچی اور دہلی میں ان دونوں کے درمیان ہوئیں، گو نہرو کا کراچی جانا اور اس کے بعد دہلی آنا، ان میں سے ہر ایک بہ لحاظ حالات مختلف نوعیت رکھتا تھا، لیکن مقصد بہر نوع دونوں کا ایک تھا۔ جس وقت نہرو کراچی گئے اس وقت کشمیر کی وزارت میں انقلاب نہ ہوا تھا لیکن ان کی واپسی پر شیخ عبداللہ معزول ہو گئے اور بعض اخباروں نے یہ خبر شایع کر دی کہ کشمیر کے اس انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے ہندوستانی فوجوں سے بھی مدد لی گئی تھی تو پاکستان میں اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ وہاں کی بعض جماعتوں میں ہلچل مچ گئی اور اسے ہندوستان کا ناروا اقدام قرار دیکر جہاد کی تبلیغ شروع کر دی جس میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ مس فاطمہ جناح نے لیا اور غالباً اس لئے کہ ان کی زندگی میں سب سے پہلا (اور غالباً سب سے آخری) موقع یہی ایسا تھا کہ وہ پبلک میں آکر اپنی پچھلی ۲ سال کی کس مپرسی و خانہ نشینی کا انتقام حکومت سے لے سکتیں۔ کشمیر کے انقلاب وزارت کی وجہ سے جو ہیجان پاکستان میں پیدا ہوا، اس سے محمد علی کو یقیناً پریشان ہونا چاہئے تھا، کیونکہ چند دن قبل ہی، نہرو کراچی آکر بڑی خوشگوار و امید افزا فضا پیدا کر گئے تھے اور اس کے بعد فضا کا یہ تکدر یقیناً تشویش کی بات تھی۔

محمد علی نے اس میں شک نہیں کہ بڑی دانشمندی سے کام لیا اور نہرو سے جلد از جلد بالمشافہ گفتگو کرنا ضروری سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس حد تک عوام کے جذبات کا تعلق ہے، دونوں ملکوں میں اتحاد و یگانگت کی راہ زیادہ واضح ہو گئی اور محمد علی اپنی جگہ کافی اطمینان لیکر کراچی واپس گئے۔ لیکن ان کو ابھی ایک اور کٹھن منزل طے کرنا تھی، یعنی واپس جاکر پاکستانی کابینہ اور وہاں کے عوام کو مطمئن کرنا، اور اس میں وہ غالباً پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ تو خیر وہ ابتدائی مرحلے تھے جن کا سب سے پہلے طے ہو جانا ضروری تھا اور ایک حد تک طے ہو بھی گئے لیکن

غور طلب امر یہ ہے کہ کشمیر میں رائے شماری کے بنیادی اُصول پر عمل کرنے کی وہ کونسی صورت ہوسکتی ہے جو پاکستان و ہندوستان دونوں کو مطمئن کرسکے۔

اس میں شک نہیں کہ کشمیر کے حالات میں بعض ایسی تبدیلیاں ضرور ہوئی ہیں، جنھوں نے معاملہ کو سلجھانے کے بجائے اور اُلجھا دیا ہے اور اس کی ذمہ داری نہ عبداللہ گورنمنٹ پر ہے، نہ کشمیری مسلمانوں پر بلکہ ہندوؤں کے اس طبقہ پر جو ہندوستان میں بھی انتشار و تفریق پیدا کرنا چاہتا ہے اور کشمیر میں بھی ــ جن سنگھیوں نے جس نہج سے کشمیر کے مسئلہ کو ہاتھ میں لیا وہ بڑا غلط طریقہ تھا، انھوں نے کشمیریوں کا دل ہاتھ میں لینے کی کوشش نہیں کی، بلکہ ان میں بد دلی و بدگمانی پیدا کرکے وہاں کے مسلمانوں کو یہ سمجھنے کا موقع دیا کہ ہندو قوم کبھی ان کے ساتھ رواداری و مسالمت کا سلوک نہیں کرسکتی - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود عبداللہ کے دل میں بھی شک و شبہ پیدا ہونے لگا، ایک جماعت پاکستان کی حمایت کرنے والی اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس موقع سے بعض غیر ملکی افراد نے بھی فایدہ اُٹھا کر کشمیریوں میں ایک آزاد حکومت کا تصور پیدا کرنا شروع کیا - پھر یہ تو ضرور ہوا کہ عبداللہ کو معزول کرکے انھوں نے ایک ایسے شخص کی قوت توڑ دی جسے وہ آزاد کشمیر کا حامی سمجھتے تھے، اسی کے ساتھ غیر ملکی افراد کی ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کرکے بیرونی مداخلت کے امکان کو بھی ضعیف کر دیا گیا اور بخشی کی نئی حکومت نے بھی بعض اقتصادی اصلاحات کا اعلان کرکے کشمیر کے فاقہ کش مسلمانوں میں اطمینان کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اب ہندوستان کے لئے راہ بالکل صاف ہوگئی ہے، غالباً درست نہیں کیونکہ باوجود اس یقین کے کہ کشمیر ہندوستان ہی کے ساتھ رہکر ترقی کرسکتا ہے، باوجود اس علم کے کہ پاکستان کشمیر کی اقتصادی دشواریوں کو دور نہیں کرسکتا اور باوجود اس اعتقاد کے کہ آزاد ہونے کے بعد کشمیر کو کسی نہ کسی بیرونی طاقت کا غلام رہنا پڑے گا، کشمیری مسلمان اس اندیشہ کو بمشکل دل سے نکال سکتا ہے کہ ہندوستان سے الحاق کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کا دست نگر ہو جائے گا، اس کی زندگی اور آبرو ہندوؤں کے ہاتھ میں ہوگی اور ہندو قوم کی تنگ نظری کا جو تصور جنگ سنگھ نے ان کے دل میں پیدا کر دیا ہے اس کو کسی اقتصادی یا سیاسی دلیل سے نہیں محو کیا جاسکتا کیونکہ یہی وہ مواقع ہیں جب مذہب اور مذہبیت کا جذبہ اُبھر کر اور تمام مصالح کو ٹھکرا کر آگے گزر جاتا ہے اور ایک قوم دنیاوی خوشحالی کے مقابلہ میں فاقہ کشی کو ترجیح دینے پر مجبور ہو جاتی ہے ــــ ان حالات کے پیش نظر، میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان کا پہلو کافی ضعیف ہے ــــ اس وقت ہندوستان کے بعض اخبارات میں جو پروپاگنڈا اہل کشمیر کو اپنی طرف مایل کرنے کا اختیار کیا ہے وہ حقیقت کے لحاظ سے غلط نہیں، لیکن اس کی بنیاد صرف اقتصادی اصلاح کی یقین دہانی پر قایم ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، محض معاشی فلاح کا یقین ان بدگمانیوں کو دور نہیں کرسکتا جن کا تعلق مذہب اور مذہبی جذبات سے ہے ــــ یہ تھا گفتگو کا صرف وہ پہلو جو رائے شماری کو ممکن العمل قرار دینے کے بعد سامنے آتا ہے، لیکن غالباً اس سے زیادہ اہم پہلو بحث کا یہ ہے کہ رائے شماری درحقیقت ممکن بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو وہ حال و مستقبل کے کتنے خطرات اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے ــــ حال ہی میں جو توجہ نامہ پاکستان سے نہرو کے پاس بھیجا ہے اس میں ایک مطالبہ یہ ہے کہ نمٹز کو بدستور ایڈمنسٹریٹر رہنے دیا جائے اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اصولی اختلاف ابھی سے شروع ہوگیا - دوسرا مطالبہ پاکستان نے یہ کیا ہے کہ رائے شماری میں وہ لوگ بھی شامل کئے جائیں جو کشمیر سے ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے ہیں - یہ شرط عجیب و غریب ہے کیونکہ اگر ہندوستان اس شرط کو مان بھی لے تو کشمیر سے ہجرت کرکے پاکستان چلے جانے والوں کی صحیح تعداد کا یقین اسے کیونکر ہوسکتا ہے - تیسرا مطالبہ یہ ہے کہ رائے شماری یو - ان - او ہی کی نگرانی میں ہو، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہندوستان نمٹز کو ناظم رائے شماری تسلیم کرے اور بظاہر ہندوستان کی طرف سے اس بات کے تسلیم کرنے کا کوئی امکان نہیں - چوتھا مطالبہ پاکستان کا یہ ہے کہ رائے شماری کے زمانہ میں کشمیر کی حکومت نہ ہندوستان کے پاس رہے نہ پاکستان کے پاس اور دونوں ملکوں کی فوجیں ہٹ جائیں - خیر جہاں تک فوجوں کے ہٹائے جانے کا سوال ہے، بظاہر اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی، لیکن یہ سوال البتہ بہت پیچیدہ ہے کہ دوران رائے شماری میں حکومت کسی تیسری پارٹی کی ہو کیونکہ یہ تیسری پارٹی پاکستان کے نزدیک یو - ان - او ہی ہوسکتی ہے اور ہندوستان اسے مشکل ہی سے تسلیم کرے گا۔

رائے شماری کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کشمیر کے لجلیچر کو پورے کشمیر کا نمایندہ قرار دیکر اس کی رائے معلوم کرلی جائے، لیکن یہ صورت پاکستان کے لئے کسی طرح قابل قبول نہ ہوگی اور نہ ہوسکتی ہے - الغرض رائے شماری کا مسئلہ کسی طرح طے ہوتا نظر نہیں آتا اور رائے شماری کے علاوہ کوئی دوسری صورت اس جھگڑے کو طے کرنے کی اگر ہوسکتی ہے تو وہ بڑی خطرناک ہے -

مومن کا تغزل

(بہ سلسلہ ماسبق)

اب غالب اور مومن کے موازنہ پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ جناب آسی میرٹھی جنھوں نے "غالب و مومن" کے عنوان سے رسالہ "نگار" کے مومن نمبر میں ایک مقالہ لکھا تھا اس میں انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ تغزل کے اعتبار سے مجموعی طور پر ان دونوں میں کون کس سے بہتر ہے۔ انھوں نے دونوں کے ہم قافیہ اور ہم مضمون اشعار کا موازنہ کرتے ہوئے کہیں غالب کے شعر کو بہتر قرار دیا اور کہیں مومن کے شعر کو برتر ٹھہرایا۔ جناب معجز سہسوانی نے بھی اپنی کتاب "مومن و غالب" میں موازنہ کا یہی طریقہ (ہم قافیہ وہم مضمون اشعار کا موازنہ) اختیار کیا ہے لیکن انھوں نے نازک خیالی اور معنی آفرینی اور زبان و بیان کی خوبیوں کے اعتبار سے برتری کا تاج مومن کے سر پر رکھا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آخر میں یہاں تک فرما گئے کہ "شعر اردو کا اعلیٰ سرمایہ مومن کے سوا کہیں مل سکتا۔۔۔۔ خود میر کی حالت یہ ہے کہ ان کے چھ دیوانوں میں ٹھکانے کے شعر سو سوا سو سے زیادہ نہیں ہیں" معجز صاحب نے مومن و غالب کے جن اشعار کو سامنے رکھ کر موازنہ کیا ہے ان پر تفصیل کے ساتھ بحث کا یہ موقع نہیں۔ مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ ہر چند معجز صاحب نے مومن و غالب کے تقابلی مطالعہ کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ موازنہ کا کوئی صحیح معیار نہیں ہے تاہم اگر وہ پوری غیر جانب داری سے کام لیتے تو غالب کی شاعری کو اس قدر فروتر نہ پاتے جس قدر کہ انھوں نے اسے پایا۔ یہ صحیح ہے کہ بقول حالیؔ مومن نزاکت خیال میں غالب سے سبقت لے گئے ہیں لیکن اب زمانہ یا زمانہ کا ذوق سلیم بتا رہا ہے کہ مومن کی وہی سبقت اُن کے شاعرانہ مرتبے کے حق میں کس درجہ مہنگی پڑ رہی ہے۔ اور یہ کتنا اچھا ہوا کہ غالب نے اپنے جوہر اندیشہ کی اس گرمی کا زیادہ مظاہرہ نہیں کیا جو ان سے اس قسم کی شاعری کرانے کا باعث ہوئی ع

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

غالب کے فلسفیانہ انداز کے اشعار کو روکھا پھیکا کہنا مومن کے تغزل کی مدح سرائی کا جزو اور مومن پرستوں کا مستقل شیوہ بن گیا ہے۔ چنانچہ معجز صاحب بھی اس "سنت" کے ادا کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ معجز صاحب سے مومن کے کلام میں فلسفہ و تصوف کا فقدان دیکھا نہ جاسکا۔ چنانچہ اپنی تسکین کے لئے انھوں نے یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ مومن کے یہاں فلسفہ و تصوف کی بھی کمی نہیں ہے بلکہ مومن کو غالب پر یہ فوقیت بھی حاصل ہے کہ "وہ فلسفہ لکھ جاتے ہیں اور غزل کی رنگینی میں ذرا بھی فرق نہیں آتا" اس باب میں معجز صاحب نے جو مثالیں پیش کی ہیں اُن سے آپ بھی لطف اندوز ہوتے چلیں ؎

حلقۂ اغیار اس کے گرد مہ کا ہالہ تھا ! دیکھ کر یہ مجمع اُمڈا کیا ہی ابر اشک آہ

اِس شعلہ رو کو سینہ سے میرے لگا دیا تاثیر سوزِ دل کرۂ نار ہے مگر،

جی ہی گیا اگر نفس شعلہ زا گئے لئے آب اشک آتش عنصر ہے دیکھنا

معجز صاحب کی اس معجزانہ کاوش کے متعلق میری رائے سے پہلے پروفیسر ضیا کی رائے سُن لیجئے۔ موصوف لکھتے ہیں۔ "غالب کے مقابلہ میں بعض اہلِ قلم مثلاً جناب معجز سہسوانی نے کھینچ تان کر فلسفہ و تصوف کے مضامین مومن کے یہاں تلاش کئے ہیں مگر

یسی مشکور نہیں معلوم ہوتی"۔

اگر مجنوں صاحب کی یسی مشکور بھی ہو جب بھی اس میں کیا شبہ کہ مومن کے مندرجۂ بالا اشعار غالب کے فلسفیانہ اشعار کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

غالب کے بعض فلسفیانہ اشعار میں دل کے تاروں کو چھولینے والی جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ بعض اوقات مومن کے تغزل میں بھی محسوس نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ غالب کے بعض فلسفیانہ اشعار مومن کے تغزلانہ اشعار سے زیادہ مشہور و مقبول ہیں حالانکہ ان دونوں کا مفہوم و مقصود ایک ہی ہے۔ مثلاً :۔

غالب :۔ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
مومن :۔ چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی — ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے
غالب :۔ رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں
مومن :۔ منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں، — اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں،

غالب کے یہ اشعار تغزل کے دائرے سے باہر سہی لیکن ان میں غزلیت کی روح کار فرما ہے۔ ان میں وہی تعمیم، وہی آفاقیت، وہی خلوص اور وہی صداقت اور لب و لہجہ کی وہی نرمی موجود ہے جو ہر اچھی غزل یا غزل کے ہر اچھے شعر میں پائی جاتی ہے۔ ان اشعار کو خشک فلسفہ کہکر گزر جانا تعصب کے لئے آسان سہی لیکن انصاف کے بس کی بات ہرگز نہیں۔ مجنوں صاحب کا یہ کہنا بھی کھلی ہوئی نا انصافی ہے کہ غالب کے زیادہ تر اشعار ایسے ہیں جن کو نہ فارسی کہا جاسکتا ہے اور نہ اُردو بلکہ اکثر شعر معمے اور چیستان ہیں۔ فصاحت سے بیگانہ غیر متعارف ترکیبوں سے مملو اور معانی کے لحاظ سے بھی کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہیں۔ شارحین کا جگر خون ہوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا"۔

غالب کے دیوان میں ایسے اشعار جن میں مغلق الفاظ اور ثقیل تراکیب استعمال کئے گئے ہیں، جو مفہوم و معنی کے اعتبار سے پیچیدہ اور گنجلک ہیں اُن کی تعداد اُن اشعار کے مقابلہ میں کم ہے جو معنوی خوبیوں سے قطع نظر، زبان و بیان کے اعتبار سے بھی صفائی و شستگی، تناسب و توازن، ایجاز و اختصار کے دلکش نمونے ہیں۔ البتہ میر کے سے سادہ اور سلیس اشعار اُن کے یہاں بہت کم ملتے ہیں۔ لیکن غالب کی زیادہ تر غزلوں میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ ایسی نہیں کہ اسے اُردو کہنے کے لئے کھینچ تان کر ضرورت ہو اور رعایت سے کام لینا پڑے۔ میر کی سی ٹھیٹھ اُردو خود مومن کے کلام میں کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ ان کی زبان میں بھی فارسی کا عمل دخل غالب سے کچھ کم نہیں اور اس باب میں جس طرح غالب ہر جگہ حد اعتدال کے اندر نہ رہ سکے اسی طرح مومن بھی متعدد مقامات پر بے اعتدالی کے شکار ہوگئے۔ چنانچہ غالب کی طرح مومن کے یہاں بھی کچھ ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک آدھ لفظ ہٹا دیا جائے تو مصرع یا شعر فارسی کا ہوجائے۔ مثلاً ؎

اشک و اثر و نہ اثر باعثِ صد جوش ہوا — ہچکیوں سے میں یہ سمجھا کہ فراموش ہوا
از بسکہ تھی وصال میں غیروں سے ہمسری — عیش و سرور باعث رنج و تعب ہوا
وقت جوشِ بحر گریہ میں جو گرم نالہ تھا — حلقۂ گرداب رشکِ شعلۂ جوالہ تھا
آگ کیا ہم کو لگائی اپنے تیرے بغیر — وقت بارش اخگرِ خورشید تف ہر ژالہ تھا
پس شکستن خم ز جبر محتسب معقول، — گنا ہگار نے سمجھا گنا ہگار سبھے،
پھر سینہ سوز داغ غم شعلہ فام ہے — پھر گرمجوشی دل و سودائے خام ہے
یاد آگیا زبس کوئی مہ روئے مہروش — امید داغ تازہ سپہر کہن سے ہے

لیکن جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ مومن کے کلام کی عام زبان بیجا ہے اُسی طرح غالب پر بھی یہ الزام رکھنا درست نہیں کہ ان کے زیادہ تر اشعار کی زبان وہ ہے جسے نہ اُردو کہہ سکتے ہیں اور نہ فارسی۔ اُردو اور فارسی کے خوشگوار امتزاج سے جو زبان وجود میں آسکتی تھی اُس کی پہلی اور دلکش مثال غالب کے یہاں ملتی ہے جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے، فصاحت بلاغت اور ایجاز و اختصار کے لحاظ سے بھی غالب، مومن سے پیچھے نہیں بلکہ روانی اور ترنم کے اعتبار سے خود مومن کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ رہا یہ الزام کہ غالب کے زیادہ تر اشعار کوہ کندن و کاہ بر آوردن کے مصداق ہیں سو اس بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر غالب کے مختصر سے دیوان کے زیادہ تر اشعار ایسے ہی ہوتے تو کم از کم موجودہ دور انھیں فراموش کرچکا ہوتا۔ غالب کی مقبولیت اور عظمت اُن کے پرستاروں کے زورِ قلم کا صدقہ یا اس دور کی بے بصری کا نتیجہ نہیں ہے ان کے یہاں کوہ کندن و کاہ بر آوردن کے مصداق گنتی کے چند شعر نکلیں گے۔ در اصل یہ خوبی یا خامی زیادہ تر مومن ہی کے اشعار میں پائی جاتی ہے بشرطیکہ اُن کے منظوم خرافات و مہملات کو نازک خیالی اور مضمون آفرینی سے تعبیر کیا جائے۔

متجز صاحب نے غالب و مومن کا موازنہ کرنے سے پیشتر غالب کی لسانی اور فنی غلطیوں کے چند نمونے پیش کئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ نمونے غالب کی لغزشوں کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن اس باب میں متجز صاحب کا ایک اعتراض ایسا ہے جو اگر ان کی کم سوادی کا تقاضہ نہیں تو ناانصافی کا نتیجہ یقیناً ہے۔ وہ غالب کے اس شعر پر ؎

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام　　قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "اُردو غزل کا یہ مسلمہ ضابطہ ہے کہ معشوق کو مذکر لکھا جاتا ہے فعل اور ضمیر سب مذکر لاتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا چاہئے تھا کہ اگر یہی پری زاد وہاں حوریں ہوگئے۔" مجھے یقین ہے کہ اگر مندرجۂ بالا شعر غالب کی بجائے مومن کا ہوتا تو متجز صاحب اسے مومن کے اجتہادات میں شمار کرتے ہوئے کہتے کہ دیکھئے جس طرح مومن نے صنفِ لطیف کو اپنا محبوب بناکر امرد پرستی کی مذموم روایت سے اپنا دامن بچایا ہے اسی طرح محبوب کے لئے صیغۂ تانیث استعمال کرکے انھوں نے اپنی صحت مذاق کا ثبوت دیا ہے لیکن چونکہ وہ شعر غالب کا ہے اس لئے اس کی سب سے بڑی خوبی کو سب سے بڑی خامی ثابت کرنے کے لئے انھوں نے غزل کے ایک ایسے ضابطے کا سہارا لینے میں تامل نہ کیا جو ایک غیر صحت مند روایت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور اگر یہ بات ناانصافی پر مبنی نہیں تو متجز صاحب کی بدمذاقی کی دلیل ضرور ہے کہ وہ پری زادوں اور حوروں کے لئے صیغۂ تذکیر کے استعمال پر مصر ہیں۔

متجز صاحب غالب کے کلام میں زبان و بیان کی چند لغزشوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ "ہم نے غالب کے سقطات کا استیعاب نہیں کیا۔ نہ ہمارا یہ مقصد ہے کہ مرزا پر طعن و اعتراض کرکے ان کی کسرِ شان کریں بلکہ باوجود ان کمزوریوں کے ان کی شاعری کا پایہ ہماری نظر میں بہت سے مشاہیر سخنوروں سے بلند ہے اور ہم کو ان کے کمال کا دل سے اعتراف ہے۔ لیکن ابنائے عصر کی کوتاہیٔ نظر پر تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے مرزا غالب کے کمال کا نمونہ ان کی اُردو شاعری کو قرار دے کر اُن کے بلند مرتبے کو پست کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ مرزا صاحب نے اپنے اُردو کلام کی بابت خود ہی فرمایا ہے :-

بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

اس میں شک نہیں کہ اگر متجز صاحب غالب کی غلطیوں کا استیعاب کرتے تو وہ مزید مثالیں پیش کرسکتے تھے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ غلطیاں غالب کو مومن سے فروتر ثابت کرنے میں ہوسکتی تھیں۔ یہ بات تو جبھی ممکن تھی کہ خود مومن کا کلام اغلاط سے پاک ہوتا مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اور اس امر کا اعتراف پروفیسر ضیا جیسے مومن پرست تک کو ہے کہ "مومن اپنی دارفتہ مزاجی سے صحت زبان اور صفائی بندش کی پروا نہیں کرتے۔" یہاں اس کا محل نہیں کہ زبان و بیان کے معاملہ میں کلام مومن کی خامیو

سے گفتگو کی جائے ورنہ میں اپنی علمی کم مایگی کے باوجود مومن کی لغزشوں کے متعدد نمونے پیش کرسکتا ہوں۔ ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے برتر ثابت کرنے کے لئے ایک کی خامیوں اور دوسرے کی خوبیوں کو پیش کرنا نہ تو صحیح منطق ہے اور نہ صحیح تنقید۔ رہا مجنوں صاحب کا یہ دعویٰ کہ غالب کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرنے سے ان کا مقصود غالب کی کسرِ شان نہیں سوان کی یہ نیک نیتی اپنی ترجمانی آپ کر رہی ہے۔ انھوں نے غالب کے اُردو کلام کو بے حقیقت ثابت کرنے کے لئے خود غالب کا یہ قول کہ "بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است" اس انداز سے دہرایا ہے کہ پڑھنے والے کہہ اُٹھیں۔ جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔ میں غالب کے قول کی تردید نہیں کرنا چاہتا اور نہ کرسکتا ہوں لیکن اس سے یہ کیونکر لازم آتا ہے کہ اگر ان کا اُردو کلام ان کے فارسی کلام کے مقابلہ میں بے رنگ ہے تو کلامِ مومن کے مقابلہ میں بھی اس کا بے رنگ ہونا یقینی ہے۔ غالب کی اُردو شاعری ان کی فارسی شاعری سے ہزار پست سہی لیکن وہ بھی اپنے اندر اتنا دم خم رکھتی ہے کہ نہ صرف اُردو کے بڑے شاعروں سے ٹکر لے سکتی ہے بلکہ ان میں سے بعض کو شکست بھی دے سکتی ہے اور مومن انھیں شاعروں سے ٹکر لے سکتی ہے بلکہ ان میں سے بعض کو شکست بھی دے سکتی ہے اور مومن انھیں شاعروں میں سے ہیں۔ جن کا کلام گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے غالب کے اُردو کلام کا مدِ مقابل تک نہیں کہا جا سکتا۔ نیاز فتحپوری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "غالب کے یہاں مومن کی سی وہ حقیقت نگاری نہیں جو سینے میں نشتر پر نشتر توڑتی چلی جاتی ہے" اور غالبًا اسی خیال کو حسرت موہانی نے ایک جگہ یوں ظاہر کیا ہے کہ "مومن کا کلام درد و تاثیر کے لحاظ سے غالب سے افضل ہے" میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں بھی مومن کو غالب سے برتر قرار دینا صحیح نہیں۔ غالب کے یہاں بھی ایسے اشعار خاصی تعداد میں ملتے ہیں جن کی تاب لانا ایک دردمند دل کے لئے آسان بات نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ مومن و غالب کے کلام میں جو نشتریت پائی جاتی ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یکساں نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ مومن کے پُر درد اشعار میں رو پڑنے والا انداز نمایاں ہے اور غالب کے ناخن بر جگر اشعار آہوں اور آنسوؤں کو پی جانے والی کیفیت کے حامل ہیں۔ اس خیال کی تائید و توضیح کے لئے مومن و غالب کے چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں درد و تاثیر بدرجۂ اتم موجود ہے ؎

مومن:

کیا کہوں کیونکر رکوں ناصح رُکا جاتا ہے دل
پیش کیا چلتی ہے اُس سے جس پہ آجاتا ہے دل

تڑپنے لوٹنے رونے کا باعث تجھ پہ بھی کھلتا
ترے دل کو بھی میری سی اگر اے بے وفا لگتی

حال دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے
سر اُٹھا بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے

اب گریہ میں ڈوب جائیں گے ہم
یوں آتشِ دل بجھائیں گے ہم،

دمبدم رونا ہمیں، چاروں طرف تکنا ہمیں
یا کہیں عاشق ہوئے یا ہوگیا سودا ہمیں،

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

غالب:

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

ہوگئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

نیند اسکی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں،

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید،
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے،

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

نالہ پابندِ نے نہیں ہے،
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ لب آشنائے خندہ ہے

مندرجۂ بالا مثالوں سے مومن کا گریۂ بے اختیار اور غالب کا ضبط و تمکین نمایاں ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مومن عشق

کی آگ میں جل رہے ہیں اور رو رہے ہیں۔ غالب تپ رہے ہیں مگر جذبات کی حشر سامانیوں کو فریاد و فغاں میں تبدیل نہیں ہونے دیتے یہی وجہ ہے کہ بادی النظر میں مومن کے اشعار غالب سے زیادہ پُر اثر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ذرا غور کیجئے تو پتا چلتا ہے کہ غالب کے اشعار بھی انتہائی درد و کرب میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

مومن کو غالب سے برتر ثابت کرنے کے سلسلہ میں پروفیسر ضیا بھی غالب کے متعلق ایک ایسی بات کہہ گئے جو بالکل عامیانہ ہے۔ فرماتے ہیں۔ "یہ طرز (ناسخ و نصیر کا طرز) جس کی بڑی خصوصیت آورد تھی زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہی اور دونوں استادوں (غالب و مومن) کے ذوق سلیم نے اس کو نباہنے سے باز رکھا۔ آخر غالب نے رنگ میر اختیار کیا اور مومن اپنے ذاتی طرز پر آگئے اس سلسلہ میں یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ ان کے ہم عصروں میں ذوق و غالب دونوں مقلد ہیں۔ یعنی ایک کے کلام میں سودا، نصیر، معروف، مصحفی، انشا، جرأت کا تتبع پایا جاتا ہے اور دوسرے کے یہاں بیدل و میر کا۔ صرف ایک مومن ہیں جن کو مجتہد فن کہا جا سکتا ہے"۔

مومن کا صاحب طرز ہونا تسلیم۔ لیکن اس کے لئے غالب کو محض بیدل و میر کا مقلد قرار دینا اگر نا انصافی نہیں تو بے بصری یقیناً ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غالب اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں بیدل سے اور آخری دور میں میر سے متاثر ہوئے پھر بھی جس چیز نے غالب کو غالب بنایا وہ ان کی اپنی شخصیت اور انفرادیت ہے جو ان کے اسلوب اور معنی دونوں میں کارفرما نظر آتی ہے دنیا میں کوئی ادیب یا شاعر محض مقلد کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتا چہ جائیکہ وہ اس عظمت و مقبولیت کا مالک بھی ہو جو غالب کو حاصل ہے۔

غالب کی طرح ذوق بھی محض مقلد نہیں۔ بلکہ ایک مخصوص طرز و منفرد رنگ کے مالک ہیں۔ تغزل کے اعتبار سے ان کے کلام کا مرتبہ جو کچھ بھی ہو لیکن ان کے کلام کی انفرادیت سے انکار کرنا حقیقت سے روگردانی کے مترادف ہے۔ ان کی انفرادیت کا تعلق انداز فکر سے اتنا نہیں جتنا کہ انداز بیان سے ہے اور ان کا انداز بیان اپنی صحت و صفائی، پختگی و مضبوطی، کے اعتبار سے کلاسیکل حیثیت رکھتا ہے

دُنیا میں کوئی شاعر ایسا نہیں جو اپنے بعض پیشرو یا معاصرین سے متاثر نہ ہوا ہو۔ چنانچہ مومن بھی اس باب میں استثنا کی حیثیت نہیں رکھتے۔ خود پروفیسر ضیا کو اعتراف ہے کہ مومن کے کلام میں سودا۔ میر۔ ناسخ۔ جرأت۔ امانت اور غالب کے رنگ کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ مومن کے کلام میں ان اساتذہ کے رنگ کو صرف اثرات سے تعبیر کرتے ہیں لیکن غالب کے معاملہ میں دوسروں کے اثرات کی بنا پر ان کو سرتاپا مقلد قرار دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی دریافت طلب ہے کہ جب غالب کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہے تو پھر مومن کے متعلق یہ اعتراف کرنا کیا معنی کہ ان کے کلام میں غالب کے رنگ کے اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔ صرف اتنا ہی کہنا کافی تھا کہ مومن کے کلام میں کہیں کہیں میر کا رنگ بھی جلوہ گر ہے کیونکہ بقول پروفیسر موصوف آخر غالب نے رنگ میر اختیار کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ غالب کے یہاں میر کا رنگ صحیح معنی میں ہے ہی نہیں۔ البتہ میر کی سی سادگی ایک حد تک پائی جاتی ہے لیکن صرف زبان کی سادگی کو میر کا رنگ یا طرز نہیں کہا جا سکتا۔ میر کا رنگ جن عناصر سے مرکب ہے ان میں زبان کی سادگی، بیان کی نرمی، لب و لہجہ کا دھیما پن، ان کے جذبات کی خستگی و برشتگی سبھی کچھ شامل ہے۔ میر کے ہر اچھے شعر میں یہ تمام عناصر بیک وقت موجود ہوتے ہیں اور ان عناصر کے اجتماع سے جو فضا پیدا ہوتی ہے وہ کم از کم غالب کے یہاں نہیں ملتی غالب کی دُنیا میر کی دُنیا سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ غالب کی سادگی میں بھی ایک تہہ داری ہوتی ہے جو میر کے یہاں نہیں مل سکتی پھر ان کے جذبات و تجربات میں بھی میر کی جھلک تک نظر نہیں آتی بلکہ ایک انوکھی شخصیت اور منفرد مزاج کا احساس ہوتا ہے۔ ایک ایسی شخصیت اور ایک ایسا مزاج جو میر کی طرح غم کوش و حسرت پرست نہ ہونے کے باوجود زندگی کے المیہ پہلوؤں کا دلدادہ

ہے، جو غمِ جاناں کی لذتوں سے آشنا ہونے کے باوصف غمِ دوراں کی تلخیوں کو فراموش نہیں کر پاتا، جو عشق و محبت کے معاملات میں محض پرستار ہونے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ کو طلبگار کی حیثیت سے بھی پیش کرتا ہے، اب آپ غالب کے چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمائیں جو میرے نزدیک ان کے مخصوص رنگ کے آئینہ دار ہیں اور جن سے مذکورۂ بالا خیالات کی تصدیق ہوگی ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے　　غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں　　جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا
گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار　　لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی　　وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے
تری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں　　تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی
عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر　　دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچیے

ان اشعار سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ غالب کے مخصوص رنگ کی جلوہ گری ان کے متفرق اشعار تک محدود ہے۔ اُن کے یہاں ایسی غزلیں کافی تعداد میں ملتی ہیں جس کا ہر شعر ان کے مخصوص رنگ کا حامل ہے۔ میں مثال کے طور پر چند مطلع کے حوالے دینے پر اکتفا کرتا ہوں ؎

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو　　نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں　　روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے　　جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی　　میری وحشت تری شہرت ہی سہی
گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو　　کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو
وہ فراق اور وہ وصال کہاں　　وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی　　دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

تو یہ ہے غالب کا مخصوص رنگ جس کو میر کے طرز سے اتنی بھی نسبت نہیں ہے جتنی کہ بتوں کو کعبے سے رہی ہے یہی نہیں بلکہ غالب اپنے اس رنگ کے لئے کسی بھی اُردو شاعر کے مرہونِ منت نہیں ہیں۔ اس کے باوجود غالب کو صاحب طرز ماننے سے انکار کرنا ہٹ دھرمی کے سوا اور کیا ہے۔ یہاں اس کا محل نہیں کہ غالب کے مخصوص رنگ پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے۔ کیونکہ اس مقالے کا اصل موضوع مومن کا تغزل ہے۔

میر سے مومن کا باقاعدہ اور تفصیلی موازنہ تو کسی نے نہیں کیا لیکن مومن کے بعض امتی ان کے مرتبے کی تعیین کے سلسلے میں دو تین جملے ایسے لکھ گئے ہیں جو میر و مومن کے طویل سے طویل موازنے پر بھاری ہیں۔ مثلاً معجز صاحب کا یہ جملہ آپ کی نظر سے گزر ہی چکا ہے کہ "شعرِ اُردو کا اعلیٰ سرمایہ مومن کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ مرزا غالب نے آخر میں کچھ غزلیں میر کے انداز میں کہیں اور زبان کی سلاست کو مدنظر رکھا لیکن کسی نے ان کو میر کا ہم پلہ تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ خود میر کی یہ حالت ہے کہ ان کے چھ دیوانوں میں ٹھکانے کے شعر سو سوا سو سے زیادہ نہیں ہیں۔ باقی تمام ذخیرہ فحش و ہزل اور انتہا درجہ کا پست کلام ہے" تقریباً اتنے ہی ہولناک جملے پروفیسر ضیا نے بھی لکھے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے "اُردو شعرا میں مومن نفس تغزل کے اعتبار سے جس

نقطۂ عروج تک پہونچ گئے ہیں دوسروں کو اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں"۔ ایک اور جملہ ملاحظہ ہو۔ "مجھے شعرائے اُردو میں مومن سے غیر معمولی شغف رہا ہے۔ اور میں (میر کو چھوڑکر) نفس تغزل میں کسی کو ان کا ہم پایہ نہیں سمجھتا"۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ مجنوں صاحب اور پروفیسر ضیا نے اتنے بلند آہنگ دعووں کے اثبات میں ایک بھی دلیل پیش نہیں کی۔ گویا یہ دعوے کھلے ہوئے حقایق ہیں جن کی صحت میں کسی کو شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ عیاں راچہ بیاں یا آفتاب آمد دلیل آفتاب، اول تو مجنوں صاحب کا یہ اندازہ ہی غلط ہے کہ میر کے چھ دیوانوں میں "ٹھکانے کے شعر سو، سوا سو سے زیادہ نہیں ہیں۔ میر کے کلام کا کتنا ہی سخت انتخاب کیوں نہ کیا جائے اچھے اشعار تین چار سو کی تعداد میں ضرور ہی نکلیں گے۔ تھوڑی دیر کے لئے مانے لیتا ہوں کہ میر کے یہاں ٹھکانے کے شعر سوا سو سے زیادہ نہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ اُن اشعار نے تغزل کا جو معیار قایم کردیا ہے وہاں تک اُردو کے چند بہترین متغزلین میں کوئی بھی نہیں پہونچتا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر میر کے زمانے سے لےکر عہد حاضر تک کے ارباب نظر متفق ہیں۔ کاش مجنوں صاحب محسوس کر سکتے کہ میر پر خاک ڈال کر مومن کو میر سے برتر ثابت کرنا تو ممکن نہیں البتہ اپنے ذوق ونظر کو رسوا کرنا آسان ہے۔ پروفیسر ضیا کے پہلے جملے سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مومن اُردو کے بہترین غزل گو ہیں بلکہ یہ بھی کہ دیگر بلند پایہ متغزلین ان سے بہ مدارج فروتر ہیں۔ پروفیسر موصوف نے دوسرا جملہ کسی قدر سنبھل کر لکھا ہے لیکن اُس سے بھی میر کے مقابلہ میں مومن ہی کی برتری کا پہلو نکلتا ہے۔ ان بلند بانگ دعووں کو سن کر ممکن ہے خاقانی اور ظہیر فاریابی کی روحیں خوش ہوگئی ہوں کہ اُردو نثر میں ان کا ایک جانشین پیدا ہوا لیکن ان دعووں کو صحیح تنقید سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ کاش پروفیسر ضیا کو معلوم ہوتا کہ حد سے گزری ہوئی عقیدت خود صاحبِ عقیدت کی مٹی پلید کر ڈالتی ہے۔

نیاز فتحپوری نے مومن کو نہ تو میر سے برتر قرار دیا ہے اور نہ اُن کا ہمسر ٹھہرایا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی ان کے نزدیک مومن کا جو درجہ ہے وہ بحث طلب ضرور ہے۔ نیاز صاحب لکھتے ہیں۔ "اگر میرے سامنے اُردو کے تمام شعرائے متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیاتِ مومن دیدو اور باقی سب اُٹھالے جاؤ"۔ نیاز صاحب کے ان جملوں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُردو کے شعرائے متاخرین تک تغزل کے اعتبار سے میر کے بعد سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ جہاں تک نیاز صاحب کا تعلق ہے ان کا جواب بھی ان ہی جملوں میں پوشیدہ ہے یعنی ان کے نزدیک میر کے بعد غزل کے سب سے بڑے شاعر مومن ہیں۔ لیکن ارباب نظر کے درمیان مومن کا یہ مرتبہ بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں اس اَمر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب میں نے حضرت وحشت کلکتوی سے متذکرہ سوال کیا تو انھوں نے جواب میں مومن کی بجائے داغ کا نام لیا اور جب اس باب میں میں نے اپنے بعض سخن فہم احباب کی رائے دریافت کی تو ان میں کسی نے میر کے بعد مصحفی کو بہترین غزل گو قرار دیا اور کسی نے آتش کو۔ پھر جب میں نے پروفیسر حامد حسن قادری سے رجوع کیا تو انھوں نے یہ لکھا کہ "اس سوال کا ایسی آسانی سے جواب دینے سے معذور ہوں کہ خالص تغزل میں کسی ایک شاعر کو بہترین بتادوں۔ شاعری میں میرے نزدیک یہ دیکھنا کافی نہیں کہ کیا کہا اور کتنا کہا۔ بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ کس طرح کہا۔ مجازی عشق و محبت کی شاعری میں جذبات، معاملات، ادائیں، شانیں سبھی نے لکھیں مگر کثرت و وسعت سے قطع نظر کرکے کہنے کی تازگی اور خوبی میں میر کے بعد مصحفی، غالب، مومن، داغ اور ریاض کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ (میں غالب کو مجازی شاعر بھی سمجھتا ہوں اور ریاض کو داغ کا ہم عصر مانتا ہوں، امیر مینائی کا شاگرد نہیں) اس خمسہ کے ارکان اپنی انفرادی خوبیوں میں ایک دوسرے سے اس قدر الگ اور ممتاز ہیں کہ ایک کا انتخاب کرنے سے دوسروں کی خوبیاں رہ جاتی ہیں۔ مثلاً مومن کو لے لیجئے تو مصحفی کا لوچ، غالب کا فکر، داغ و ریاض کی زبان اور شوخی رہی جاتی ہے۔ لیکن اگر کسی ایک ہی کو لینا ہے تو ریاض بہتر رہیں گے۔ میں اپنی پسند سے تو عشقیہ شاعری ہو یا فلسفہ، غالب ہی کو بہترین سمجھتا ہوں"۔

جب میں نے ان سطور کے جواب میں اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے قادری صاحب سے دوبارہ پوچھا کہ آپ کے نزدیک عشقیہ جذبات و محسوسات کی گہرائی کے اعتبار سے میر کے بعد اُردو کا بہترین غزل گو کون ہے تو اُنھوں نے لکھا کہ:-

"بہترین غزل گو کے مسئلے میں آپ نے جذبات و محسوسات کے "گہرے اتھلے" ہونے کی شرط نہیں لگائی تھی۔ اعلیٰ عشقیہ شاعری کی اصل روح کا سوال ہو تو میر و غالب کو چھوڑ کر اللہ کا نام ہے۔ میں نے ریاض کو اور دوسروں نے آتش، مومن، داغ کو صرف حُسن و عشق کے جذبات و معاملات کی کثرت و وسعت رنگینی اور رنگا رنگی کے سبب سے تجویز کیا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ ان میں گہرائی یا آفاقیت ہے یا نہیں۔ یہ اوصاف اگر ملیں گے تو یا چوٹ کھائے ہوئے دلوں میں ملیں گے یا فطرت انسانی اور فطرت عالم سے ہمدردی رکھنے والے ذہنوں میں ملیں گے۔ آتش کے لکھنوی رنگ میں صناعی اور تصنع بے حد ہے۔ مومن اور داغ شاہد باز ہیں۔ ریاض سستے جذبات سے کھیلنے والے ہیں۔ ان میں اعلیٰ عشقیہ شاعری کو ڈھونڈنا عبث ہے۔ یوں دس دس بیس شعر مل جائیں گے۔ یہ بات مصحفی کے دور تک ملتی ہے۔ خود مصحفی میں ملتی ہے۔ پھر داغ کے دور میں حالی جیسوں میں ملتی ہے۔ حالی کی غزلوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیجئے۔ بہت ہی خوب غزل گو ہے۔"

مندرجۂ بالا مختلف رایوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح میر کے امام المتغزلین ہونے پر تمام اہلِ نظر کا اتفاق ہے ویسا اتفاق میر کے بعد کسی دوسرے غزل گو کے متعلق ممکن نہیں۔ اس باب میں میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی صرف اس لئے نہیں کرنا چاہتا کہ اسے بھی ایک شخص کی "ذاتی پسند" سے زیادہ اہمیت نہیں دی جائے گی۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی مانع ہے کہ اس قسم کے پیچیدہ اور نازک مسئلہ میں صرف اپنی رائے ظاہر کر کے الگ ہو رہنا یا آگے بڑھ جانا کوئی معنی بھی نہیں رکھتا۔ اس قسم کی رائے تفصیل کے ساتھ اظہار خیال چاہتی ہے اور اس تفصیل کے لئے ایک علٰحدہ مقالے کی ضرورت ہے۔ اس لئے میں زیرِ نظر بحث کو آیندہ کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں۔

(باقی) نظیر صدیقی

حقیقت وفات حضرت عیسیٰؑ ابن مریمؑ

انجیل میں قتلِ مسیح کا ذکر

انجیل کے مصنفوں کے متعلق ہمیں صرف اتنی معلومات ہے کہ پہلی صدی مسیحی میں بہت سے لوگوں نے حضرت عیسیٰ کے حالات اور اقوال لکھے تھے، پھر دوسری صدی مسیحی میں ان میں سے چار انجیلیں منتخب کی گئیں۔ یوحنا کی انجیل کے علاوہ متی، لوقا اور مرقس سب ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ ان چاروں انجیلوں کا درجہ مسلمانوں کی احادیث و سیر کی کتابوں کا درجہ ہے اور کتب الہیہ میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان میں نصرانیت کے وہ عقاید جو بعد میں بنائے گئے، بہت کم پائے جاتے ہیں۔

ان اناجیل کی روایات کے مطابق قیصر طائبیریس کے زمانہ میں حضرت یسوعؑ اپنے گاؤں ناصرہ سے عید فسح کا تہوار منانے یروشلم (دارالسلام) آئے تھے۔ ان کی عمر تینتیس سال کی تھی اور وہ "حکومت الہیہ" (یعنی دنیا میں ملوکیت الہیہ Kingdom of Heaven) کے قایم ہونے یا اُس کے آنے کی خوش خبری (انجیل) دنیا والوں کو سناتے تھے۔ انکی بول چال دیہاتی تھی اور وہ انسانوں کی طرح کھاتے پیتے، ہنستے بولتے، غصہ اور رنج کرتے تھے۔ لیکن وہ اللہ کی بندگی کا پیغام لائے تھے اور بقول مصنفین اناجیل وہ دعا کرتے تھے کہ:- جس طرح آسمان پر ملوکیت الہیہ قایم ہے اُسی طرح اس دنیا میں بھی کنگڈم آف ہیون (ملوکیت الہیہ) قایم ہو۔

بابل کی قید کے زمانہ میں جب یہودیوں نے اپنی گم شدہ توراۃ مرتب کی تھی، تو اُنھوں نے مجوس سے یہ عقیدہ سیکھا تھا کہ خدا کی حکومت آسمان پر ہے، زمین پر نہیں ہے، یہاں اہرمن کا راج ہے۔ اسی لئے حضرت عیسیٰ بھی اسی تصور کو ظاہر کرنے والے بتائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے یہودیوں کو یہ بھی بتایا کہ یہوا صرف تمھارا ہی خدا نہیں ہے، بلکہ دنیا کی کل قوموں کا خدا ہے۔ اسے قرآن نے اس طرح کہا ہے (الٰہنا و الٰہکم الٰہ واحد) مگر یہود نہ تو خدا کو سب قوموں کا خدا ماننے کو طیار تھے نہ اُن کی ایک جماعت بعثت بعد الموت کی قایل تھی۔ لہذا اُنھوں نے حضرت یسوعؑ ناصری پر یہ الزام لگایا کہ یہ رومی شہنشاہیت کا باغی ہے اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو مسیح (بادشاہ) کہتا ہے۔ - - - - - - - - - - - - - - - گویا کہ یہودیوں کا بادشاہ بن کر قیصر طائبیریس کے خلاف بغاوت کرنا چاہتا ہے۔

جزئیات کو چھوڑ کر چاروں انجیلیں اس پر متفق ہیں کہ یہودیوں نے حضرت یسوعؑ کو پکڑ کر رومی گورنر پلاطوس کے سامنے پیش کیا کہ اسے بغاوت کے جرم میں سزا دیجائے۔ گورنر کو آپ کے مجرم ہونے میں شک تھا، لہذا اُس نے حسب دستور یہ اعلان کیا کہ عید فسح کی خوشی میں جو جان بخشی ہوتی ہے اُس سلسلے میں یا تو وہ یسوعؑ کو آزاد کرالیں یا ڈاکو برباس کو۔ لوگوں نے برباس کو مانگ لیا اور شور مچایا کہ (حضرت) عیسیٰ کو سولی دی جائے۔ آخر مجبوراً پلاطوس نے سولی دینے کا حکم دیدیا۔

حضرت عیسیٰ نے اس فیصلہ کو نہایت پامردی کے ساتھ سُنا اور دستور کے مطابق خود اُس صلیب کو لے کر مقتل کی طرف چلے جس پر اُنھیں صلیب دیجانے والی تھی۔ اُن کے وقار میں ذرا فرق نہیں آیا۔ اُن پر وہ مصیبتیں نازل ہوئیں کہ اُنھیں مبشر ماننے والے بھی چھوڑ کر چل دئے، حتیٰ کہ حواریوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ یہی نہیں بلکہ اُن میں سے ایک (یہوداہ) نے برملا غداری کی اور دوسرے (پطرس) نے آپ کو بشیر و مبشر ماننے سے انکار کردیا، عوام نے مذاق اُڑایا،

غلاموں اور سپاہیوں نے تھپڑ لگائے اور تھوکا، کسی نے کانٹوں کا تاج لاکر پہنا دیا کہ دیکھئے یہ "یہودیوں کے بادشاہ (مسیح) ہیں" اور پھر انتہا ہوئی کہ دو چوروں کے درمیان سولی پر چڑھا کر ذلیل کیا۔

(جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے اُنھیں اطمینان ہو گیا کہ اُنھوں نے حضرت عیسیٰ بن مریم کو صلیب پر چڑھا کر قتل کر دیا اور خود پیروان مسیح نے بھی یہ مان لیا کہ وہ صلیب پر قتل کر دئے گئے۔ چاروں انجیلوں میں یہ ذکر موجود ہے)

حضرت عیسیٰ کا دوبارہ پیدا ہونا

حضرت عیسیٰ کو جمعہ کے دن سولی دی گئی تھی وہ جسمانی طور پر کمزور تھے کیونکہ راویوں نے لکھا ہے کہ صلیب کو لے کر چلتے چلتے وہ بہت تھک گئے اور ایک جگہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔

بہرحال چونکہ دوسرے دن "سبت" یا سنیچر کا دن تھا اور سپاہی پہرہ چھوڑ کر چھٹی منانا چاہتے تھے اس لئے جب اُنھوں نے دیکھا کہ حضرت مسیح کی گردن لٹک گئی تو ایک سپاہی نے سینہ پر نیزہ مارا تو پانی ملا ہوا خون نکلا، اُنھوں نے حرکت نہ کی، تو یہ سمجھ کر کہ وہ وفات پا گئے، اُنھیں سولی سے اُتار دیا اور حسب دستور اُن کے پاؤں نہیں توڑے۔ پھر مسیح کے ایک حواری کو لاش دیکر چلتے بنے۔

آپ کی لاش ایک غار میں رکھدی گئی اور تیسرے دن اتوار کو آپ دو عورتوں کو نظر آئے۔ یعنی دوبارہ زندہ ہو گئے اور بقول نصاریٰ کے اب تک زندہ اور قایم ہیں اور دکھی کی پکار سنتے ہیں اور مدد کرتے ہیں۔ جب وہ حواریوں کو نظر آئے تو وہ ڈر گئے کہ یہ کوئی روح ہے۔ بہرحال اُنھوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ مادّی جسم میں ہیں اُنھیں اپنے زخمی ہاتھ دکھائے پھر مچھلی کھا کر یہ ثابت کیا کہ وہ جسم کے ساتھ موجود ہیں۔ محض روح ہوتے تو کھانے کی حاجت نہ ہوتی۔ اسکے بعد حواریوں کو نصیحت کی کہ وہ دنیا بھر میں "ملوکیت الٰہیہ" کی تبلیغ کریں۔" اس کے بعد وہ آسمان پر چلے گئے اور خدا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے ہیں" (مرقس) اور بقول لوقا وہ آسمان پر اُٹھا لئے گئے" (لوقا ۵۱)۔ متی میں آسمان پر اُٹھائے جانے کا ذکر نہیں ہے لیکن یہ تفصیل درج ہے کہ کسی آسمانی فرشتے نے غار کے منھ سے پتھر ہٹا دیا اور پہرے کے سپاہی ڈر کر بھاگ گئے۔ اور اُس نے مریم مگدلینی اور دوسری مریم کو بتایا کہ مصلوب یسوع مُردوں میں سے "اُٹھ" گئے ہیں (یعنی زندہ ہو گئے ہیں) ممکن ہے کہ اسی "اُٹھنے" یا "رفع" ہونے یا "بلند" ہونے کے تخفظ نے "زندہ ہو کر اُٹھنے" یعنی "آسمان پر اُٹھائے جانے کا جامہ پہن لیا ہو۔ بہرحال فرشتے نے یہ بھی بتایا کہ آؤ دیکھو جیسا کہ مسیح نے کہا تھا کہ میں اُٹھ جاؤں گا، وہ اُٹھ گئے ہیں اور کفن خالی پڑا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ عورتیں خوف و مسرت کے احساسات کو لئے ہوئے حواریوں کو اطلاع کرنے دوڑیں کہ یسوع نے اُنھیں سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ جلیلی میں ملو۔ پھر متی یہ بھی روایت بیان کرتا ہے کہ یہودیوں نے سپاہیوں کو رشوت دے کر اس پر راضی کر لیا کہ وہ کہدیں کہ یسوع کے حواری اُن کی لاش کو چرا لے گئے۔ آخر میں متی کہتا ہے کہ حواریوں کو نصیحت کرنے کے بعد حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ میں ہمیشہ دنیا کے خاتمہ تک تمھارے ساتھ رہوں گا یعنی طور پر تمھاری مدد کرتا رہوں گا۔

انجیل کی روایات کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) حضرت یسوع مسیح بے گناہ صلیب پر چڑھائے گئے۔ یہ محض یہودی سردار ربّی (ہیڈ پریسٹ) کی معاصرانہ چشمک کی وجہ سے ہوا۔ وہ اُنھیں ذلیل کرنا چاہتا تھا۔

(۲) حضرت یسوع نے بلند آواز خدا کو پکارا اور صلیب پر وفات پا گئے، پھر اُن کی لاش ایک غار نما قبر میں رکھدی گئی جہاں سے وہ زندہ ہو کر "اُٹھ" گئے اور کفن سے غائب ہو گئے، یا بقول یہود وہ لاش چوری ہو گئی۔

(۳) حواریوں نے جب اُن کو دیکھا تو بعض شبہ کرنے لگے کہ یہ وہی مصلوب یسوع ہیں یا نہیں - بہر حال اُن کے کھانا کھانے پر حواری مان گئے کہ یہ مسیح کی روح نہیں بلکہ خود مسیح مع جسم و روح کے ہیں - ورنہ "طعام" کیوں کھاتے -

(۴) نصیحت کرنے کے بعد وہ "رفع" کر لئے گئے - یا "رفع" ہو گئے اور "اللہ" کے قریب رہتے ہیں - اور اپنے ماننے والوں کے ساتھ قیامت تک رہیں گے اور اُن کی پکار سنیں گے -

قرآن اور قتل مسیح

ہر شفلڈ نے قرآن کریم کی ایک ایک آیت پر غور کیا ہے اور بائبل کی آیات سے پورے قرآن کی مطابقت دکھائی ہے - اس نے ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۱ء تک رسالہ انڈین انٹی کوئری بمبئی میں "قرآن کی نئی تحقیقات" کے نام سے ایک سلسلۂ مضامین لکھا تھا جو بعد میں کتابی شکل میں چھپ گیا ہے اور اس کا عربی ترجمہ بھی ہو گیا ہے - اُس نے قرآن کو مختلف زمانوں میں بھی تقسیم کیا ہے - اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً پورا قرآن لفظاً بہ لفظاً بائبل میں موجود ہے - لیکن چونکہ پورا قرآن زبان وحی میں موجود ہے اس لئے بائبل کے ترجموں کے مقابلہ میں بہت زیادہ فصیح و بلیغ ہے - بہر حال معناً دونوں کتابیں یکساں ہیں اور لفظاً بھی بہت کچھ مشابہ ہیں - خود قرآن کریم بھی اسے مانتا ہے (کتاباً متشابهاً مثانی - سورۂ الزمر)

اس طرح قرآن پر غور کرنے سے یہ عجیب و غریب بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ خود قرآن میں محاسن کے ساتھ ساتھ اضداد موجود ہیں - اور اگر کسی لفظ کے مختلف "وجوہ" ہیں تو جن مخصوص معنوں پر قرآن نے توجہ دلائی ہے وہ اُسی جگہ واضح کر دئے گئے ہیں، مثلاً ضلال و ہدیٰ، عائل و غنی، ضحیٰ و لیل، حق و باطل، قرآن و سحر، ظالم و قاسط، قتل و رفع ذکر وغیرہ وغیرہ -

اب اس نقطۂ نظر سے کہ (۱) قرآن کتب اولین کی تصدیق کرتا ہے - (۲) قرآن کتب اولین سے معناً مشابہ ہے اور لفظاً بھی بڑی حد تک اور (۳) قرآن میں ہر لفظ کی تفسیر خود قرآن ہی سے مل جاتی ہے، اگر ہم اُن آیات کو دیکھیں جو قتل و صلب مسیح کے متعلق ہیں تو جو پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ رفع ہو جاتی ہیں - آیات یہ ہیں :-

فبما نقضهم ميثاقهم وكفرهم بآيات الله وقتلهم الانبياء بغير حق وقولهم قلوبنا غلف ط بل طبع الله عليها بكفرهم فلا يؤمنون الا قليلا ۝ وبكفرهم وقولهم على مريم بهتاناً عظيماً ۝ وقولهم انا قتلنا المسيح عيسى ابن مريم رسول الله، وما قتلوه وما صلبوه ولكن شبه لهم ط وان الذين اختلفوا فيه لفي شك منه ط ما لهم به من علم الا اتباع الظن ج وما قتلوه يقيناً ۝ بل رفعه الله اليه ط وكان الله عزيزاً حكيماً ۝ وان من اهل الكتاب الا ليؤمنن به قبل موته ج ويوم القيامة يكون عليهم شهيداً ۝ (النساء ع ۲۲)

پس (یہودیوں کو جو سزائے غلامی ملی اور طیبات اُن پر حرام کئے گئے) وہ اُنکے میثاق کو توڑنے اور اللہ کے احکام (آیات اللہ) کے انکار اور ناحق نبیوں کو قتل (ذلیل) کرنے کی وجہ سے اور اُنکے اس قول پر ہوا کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے (ہم کلام اللہ نہیں سن سکتے) - یہی نہیں بلکہ اللہ نے اُنکے دلوں پر مہر لگا دی ہے بوجہ اُنکے کفر کے، ان میں سے سوائے چند یہودیوں کے کوئی ایمان (اسلام) نہ قبول کرے گا - اسکے علاوہ اُن کے کفر اور مریم پر (بے عصمتی) کا بڑا بہتان تھا اور اُنکے اس قول کی وجہ سے (وہ ذلیل کئے گئے) کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کو قتل (ذلیل) کر دیا - (حقیقت یہ ہے کہ) اُنھوں نے اُس کو نہ قتل کیا نہ صلیب دی، بلکہ اُن کے لئے خدا نے حالات مشتبہ کر دی، اور جو لوگ قتل مسیح کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں وہ اس مسئلہ پر شک میں مبتلا ہیں - ان کو (حقیقتی) علم نہیں بلکہ وہ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں، یہودیوں نے مسیح کو یقیناً قتل (ذلیل) نہیں کیا نہ صلیب دی، بلکہ اللہ نے اُسے اپنے پاس اُٹھا لیا اور اللہ کی اس میں عزت و حکمت پائی جاتی ہے اور اہل کتاب (یہود) میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو اپنی موت سے پہلے یہ بات نہ مان لے اور قیامت کے دن مسیح اُن پر گواہ ہوگا - (النساء ع ۲۲)

ان آیات میں محض تلمیحات و اشارات سے مندرجہ ذیل باتیں بتائی ہیں اور اس طرح بتائی ہیں کہ سننے والے یعنی یہود و نصاریٰ پورے طور پر سمجھ گئے اور جان گئے کہ قرآن سچ کہتا ہے اور تصدیق انجیل کرتا ہے :-

(۱) یہودی حضرت مریمؑ پر بہتان عظیم لگاتے ہیں -(یہ بہتان قرآن میں بالتصریح درج نہیں- یہودیوں کا بہتان یہ تھا کہ وہ حضرت مریمؑ کو پاکباز نہیں مانتے تھے -قرآن نے بارہا اس افترا پردازی کی تردید کی ہے، اور کہا ہے کہ حضرت مسیح روح اللہ تھے اور حضرت مریم محصنہ تھیں، یہ قرآن کی انتہائی بلاغت ہے کہ احصان کے اضداد کا استعمال نہیں کیا- اور اشارتاً حقیقت حال بتادی- یہی نہیں بلکہ قرآن نے بار بار یہ کہا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم بے باپ کے پیدا کئے گئے اور اُن کو اللہ کی ایک روح نے بشر بن کر ایک "غلام زکی" دیا (فارسلنا الیہ روحنا فتمثل لھا بشراً سویا..... قال انما انا رسول ربک لاھب لک غلاماً زکیا) اس پر حضرت مریم کو تعجب ہوا کہ جب میں نے کسی مرد کا منہ نہیں دیکھا تو بچہ کیسے ہوگا (قالت انیٰ یکون لی غلاماً ولم یمسسنی بشرٌ ولم اکُ بغیا) تو وہ بولا کہ خدا کے لئے یہ آسان ہے، ایسا ہی ہوگا (قال کذلک قال ربک ھو علیّ ھیّنٌ) (سورۂ مریم)

(۲) یہود کہتے تھے کہ ہم نے مسیح کو قتل کر دیا- قرآن کہتا ہے وہ "شک" "شبہ" اور "ظن" میں گرفتار ہیں- انھوں نے ہرگز قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اُنھیں اُٹھاکر (رفع کرکے) اپنے پاس بلالیا- (یہاں قتل کے مقابلہ میں "رفعہ اللہ" کا لفظ استعمال ہوا ہے- یہی "رفع" کا لفظ انجیلوں میں ہے)- یہ دونوں الفاظ تلمیحاً بطور اضداد کے استعمال ہوئے ہیں- قتل بمعنی ذلت اور رفع بمعنی عزت کے ہیں- اس کی مثالیں یہ ہیں :-

قتل :- (الف) فاقتلوا انفسکم (س ۲: ۶۱) یعنی منکسر مزاجی اختیار کرو- (دیکھئے نہایہ راغب) قتل نفس سے اماتۃ الشہوات مراد ہے-

(ب) کسی کو ذلیل کرنا مثلاً "قتل الخراصون الذین فی غمرۃٍ ساھون" (الذاریات) قیامت کے بارے میں شک کرنے والے اور عقلی گدّے لگانے والے ذلیل ہوں (یا ان کا بُرا ہو) انھیں قیامت کی حقیقت اُس وقت معلوم ہوگی جب وہ جہنم میں ڈالے جائیں گے اور اپنی آنکھ سے عذاب دیکھ لیں گے (یوم ھم علی النار یفتنون - الذاریات)

اسی طرح کا ایک محاورہ (قاتلھم اللہ) ہے یعنی اللہ کی اُن پر مار پڑچکی یا مار پڑے، یا دوسری جگہ (قُتِل اصحاب الاخدود) ہے- اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ خدا اصحاب الاخدود کو ذلیل کیا یا ذلیل کرے- حالانکہ یہ بات اُن کے مرنے کے عرصہ دراز کے بعد قرآن میں آئی- اور وہ یقیناً ذلیل ہوچکے گویا اس کے معنی ماضی اور مستقبل دونوں کے ہیں-

قتل کسی چیز کے زور اور تیزی کو گھٹادینے کے لئے بھی استعارہ استعمال ہوتا ہے، جیسے (قتلت الخمر بالماء) یعنی شراب میں پانی ملاکر اُسے قتل کر دیا یعنی اُس کی تیزی کم کر دی-

(ج) قتل کے لغوی معنی ہلاک کرنے کے ہیں- اس سلسلے میں قرآن بار بار بتاتا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں وہ رفیع و عزیز ہوتے ہیں اور جو طاغوت کی راہ میں قتل ہوتے ہیں-

چونکہ یہود کا یہ شیوہ تھا کہ اللہ کے رسولوں کے احکام ماننے کی جگہ اُن کی نافرمانی کرکے اُنھیں ذلیل کرتے تھے اور موقع ملتا تھا تو ہلاک بھی کر ڈالتے تھے -مصر کی غلامی کے زمانہ میں خود حضرت موسیٰ کو قتل کرا دینے کے لئے یہودیوں نے گواہی دی تھی- پھر حضرت زکریا (متی ۲۳) اور حضرت یحییٰ (متی ۱۴) کو قتل کر ڈالا تھا- اور بعض پرستی، سود خوری، اور طاغوت پرستی اختیار کی تھی اسی لئے ان کے ظلم و کفر کی مثالوں میں قتل انبیاء کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ ویقتلون النبیین بغیر الحق- (بقرہ ۶۱) یہاں قتل کے دونوں معنی حسب موقع وسیاق عبارت لئے جاسکتے ہیں- کہیں ہلاک کرنا مراد ہے کہیں ذلیل کرنا- اب (رفع) کے معنوں پر غور کیجئے :-

رفع [illegible] کے معنی ہیں بلندی، علو، ترقی، عزت، ہٹادینا، زائل کرنا، زیادہ کرنا، فراخی، جلیش، اونٹ کو ہانکنا، محاصرہ [illegible] معاف کردینا (ڈیکشن وغیرہ)

رفع [illegible] مبالغہ کرنا۔

رفع و رفعانؑ (الی) کسی کو کسی کے نزدیک کرنا (رفعہ اللہ الیہ" اللہ نے اُسے اپنی نزدیکی یا قربت بخشی)

رفع سلاح، صلح کرلینا۔ رفع حجاب:۔ کھل جانا۔ رفع یدعنہٗ کسی کام سے ہاتھ اُٹھالینا یا ہاتھ کھینچ لینا۔

رفع کی ضد ہے وضع۔ (رفعنا لک ذکرک) ہم نے تیری عزت بڑھائی (ووضعنا عنک وزرک) اور تیری پریشانی گھٹائی، سورۃ الانشراح)

یرفع اللہ الذین آمنوا منکم (والذین اوتوا العلم درجات۔ سورۂ مجادلہ آیت ۱۱) مومنوں اور اہل علم کے درجے اللہ بلند کرے گا۔ یعنی عزیز ہوں گے ذلیل نہ ہوں گے۔ اسی طرح حضرت ادریس کے متعلق اسی سورۂ مریم میں اسی رفعت کا استعمال کیا جو اسی سورہ میں حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ کے لئے مذکور ہوا۔

فرمایا کہ "انہ ماکان صدیقاً نبیاً ورفعنٰہ مکاناً علیاً" (ادریس ایک صدیق نبی تھا اُسے ہم نے مقام بلند پر سرفراز کیا) اس سے یہ مراد نہیں کہ اُنھیں آسمان پر پہونچا دیا۔ (سورۂ مریم ۵۷)

یا فرمایا کہ "رفعنا بعضہم فوق بعضٍ درجات" (سورہ الزخرف ۳۲) یعنی ایک آدمی کو دوسرے پر بلند رتبہ دیا۔

رفع نہ صرف انسانوں کی عزت بڑھانے کے لئے استعمال ہوتا ہے بلکہ اشیاء کے لئے بھی ہوتا ہے، مثلاً "فی صحفٍ مکرمۃ مرفوعۃ مطہرۃ" (سورہ عبس ۱۴) میں مرفوعہ کے مترادفات مکرمہ ومطہرہ ہیں۔ اسی طرح جنت میں جو تخت ہوں گے اُنھیں بھی رفعت وشوکت کے لحاظ سے مرفوعہ کہا گیا ہے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ فرش سے بلند ہیں، اس لئے کہ فی نفسہٖ کسی چیز کا بلند جگہ پر ہونا یا خود بلند ہونا اُس کے شاندار ہونے کی دلیل نہیں، یہاں مرفوعہ سے مراد معزز وشاندار، یا مکرمہ ومطہرہ کے ہیں دیکھئے "فیہا سررٌ مرفوعۃ" (سورۂ الغاشیہ ۱۳) اسی طرح فرش کو بھی مرفوعہ کہا گیا ہے، یعنی عام سطح سے بلند ہونے کی وجہ سے وہ معزز وشاندار معلوم ہوتا ہے، "وفرشٍ مرفوعۃ" (سورہ الواقعہ ۳۴) سے مراد ہے ایسے گدّوں کی جو اپنی دبازت کی وجہ سے سطح زمین سے اونچے ہوگئے ہوں۔

"وکان اللہ عزیزاً حکیماً"۔ رفع مسیح کے سلسلے اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ عزیز وحکیم ہے۔ دیکھئے "رفعت" کی مناسبت سے خدا کی صفت "عزت" بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح پہلے فرمایا ہے (وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدہ الخیر) یعنی عزت وذلت دینا خدا کے اختیار میں ہے۔ یہود کیا چیز ہیں جو کسی خدا کے رسول کو ذلت دے سکیں۔

(۴) تیسری بات جس پر قرآن نے زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ (وان من اہل الکتاب لیؤمنن بہ قبل موتہ) یعنی اہل کتاب "اس کو" "اپنی موت" سے پہلے مان لیں گے کہ سچ ہے۔ یہاں بہ کی ضمیر اس واقعہ کی طرف ہے کہ قرآن سچ کہتا ہے کہ وہ مسیح کو قتل (ذلیل) نہیں کرسکے، اور یہ بھی ثابت نہیں کرسکے، ام عیسیٰ غیر محصنہ تھیں۔

اہل کتاب سے مراد اہل علم اور سچے یہودی ہیں، اور (موتہٖ) کی ضمیر ان ہی یہود کی طرف ہے کہ اپنے مرنے سے پہلے وہ حضرت مسیح کے علوئے مرتبت اور حضرت مریم کے احصان کے قایل ہوجائیں گے۔

آل عمران کی مندرجہ ذیل آیتوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جو یہود اپنی زندگی میں اسے نہ مانیں گے، وہ مرنے کے بعد دیکھ لیں گے کہ حضرت مسیح کو کتنا بلند مرتبہ ملا ہے اور حضرت مریم پاکباز ہیں۔

رفعت مسیح کے سلسلے میں سورۂ آل عمران کی یہ آیات قابل غور ہیں۔

ومکروا ومکر اللہ ط واللہ خیر الماکرین ط
اذ قال اللہ یٰعیسیٰ انی متوفیک و
رافعک الیَّ ومطہرک من الذین کفروا
الیٰ یوم القیامۃ ثم الیَّ مرجعکم
فاحکم بینکم فیما کنتم فیہ تختلفون ہ
(آل عمران ۶۶)

اور مکر کیا (یہودی نے) اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ کا داؤں دوسرے
داؤں والوں سے بہتر ہے۔ جب اللہ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ میں تجھے وفات
دوں گا اور اپنے پاس اٹھا لوں گا، پھر کافروں (یہود) کے الزامات
سے تجھے بری کردوں گا، اور تیرے پیروؤں (نصاریٰ) کو کافروں (یہود)
پر غالب کر رکھوں گا قیامت کے دن تک۔ پھر جب (مرنے کے بعد)
میرے پاس تم سب واپس آؤگے، اُس وقت جس معاملے میں تمہارا
اختلاف تھا اُس کا فیصلہ کروں گا۔ (یعنی مریم محصنہ تھی اور تو پاکباز تھا اللہ کا بندہ اور رسول تھا)

وفات کے معنی یہاں موت کے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے سورۂ مریم میں مذکور ہوا۔ حضرت عیسیٰ کو وفات دینا ضروری
دینا اس لئے ضروری تھا کہ وفات ہر مخلوق کے لئے ضروری ہے صرف اللہ حی و قیوم ہے۔ یہاں رافعک بمعنی مطہرک
بالکل اُسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح سورہ عبس میں مرفوعہ، مکرمہ اور مطہرہ ہم معنی الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور
یہاں یہ بھی بتایا ہے کہ جس طرح حضرت مسیح کو خدا کی قربت کی عزت بخشی گئی ہے اُسی طرح مسیحیوں اور یہودیوں پر قیامت تک
"تفوق" رہے گا۔

یہاں یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ مسیحیوں اور یہودیوں میں جن باتوں میں اختلاف تھا اُن کا فیصلہ بھی قیامت کے دن
خدا کرے گا۔ یعنی مسیحی حضرت مریمؑ کو محصنہ مانتے تھے۔ یہودی اس کے منکر تھے اور اُن پر بہتان عظیم لگاتے تھے۔ اسی طرح
مسیحی حضرت مسیح کو کلمۃ القاہا الی مریم (دیکھئے انجیل میں ورڈ آف گاڈ) کہتے تھے اور یہودی حضرت مسیح کو سچا مسیح نہیں مانتے تھے
بلکہ باغی و کاذب بناکر قتل کراچکے تھے۔ اس کے علاوہ یہودی یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہوا کو کل قوموں کا خدا مانا جائے بلکہ وہ
اسے اپنا مخصوص خدا سمجھتے تھے اور غیر قوموں اور غلاموں کو اپنے مخصوص خدا کی خدائی سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ ان میں
اکثر قیامت کے بھی قایل نہ تھے۔ خود مسیحیوں میں حضرت عیسیٰ اور اُن کی ماں کے متعلق عجیب و غریب اختلافات تھے جیسا کہ
یہودی اپنے احبار کو اور مسیحی حضرات مسیح و مریم کو ابن اللہ قرار دیتے تھے۔ قرآن نے اس کا انکار کیا کہ جسے موت آجائے
وہ ابن اللہ یا اللہ کیسے ہوسکتا ہے۔

بہر حال جب یہ ثابت ہے کہ قرآن نے جزم کے ساتھ کہا ہے کہ حضرت مسیح نہ تو قتل کئے نہ صلیب پر چڑھائے گئے بلکہ
رفع کئے گئے اور یقیناً قتل نہیں کئے گئے تو صاف ظاہر ہے کہ قتل کے معنی اس جگہ ذلیل کرنے کے اور رفع کے معنی معزز بنانے کے
ہیں۔ یعنی اگرچہ مسیح بظاہر مصلوب ہوکر قتل یا ہلاک ہوگئے اور یہودیوں نے دو چوروں کے درمیان صلیب دیکر ہر طرح ذلیل بھی
کرنا چاہا لیکن درحقیقت وہ قتل (ذلیل) نہیں ہوئے بلکہ اُن کا نام اور کام زندہ جاوید بنا دیا گیا۔ وہ اللہ کی راہ میں قتل (ہلاک)
ہوکر شہید ہوگئے اور درحقیقت زندہ ہیں اور جنت میں ہیں۔

"مقتولین فی سبیل اللہ" کے لئے قرآن نے بار بار یہی بتایا ہے کہ وہ جنت میں زندہ ہیں اگرچہ قتل ہوچکے ہیں، مثلاً:

(۱) والذین قتلوا فی سبیل اللہ فلن یضل
اعمالھم ہ سیھدیھم ویصلح بالھم ہ ویدخلھم
الجنۃ عرفھا لھم ہ

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے اُن کے
اعمال بے راہ نہ ہوں گے۔
اللہ اُن کو ٹھیک راہ پر چلائے گا اور وہ خوش
ہوجائیں گے اور جس جنت کو وہ انھیں بتاچکا
ہے اُسی میں اللہ انھیں داخل کرے گا۔

(۲) فلیقاتل فی سبیل اللہ الذین
یشرون الحیٰوۃ الدنیا بالآخرۃ ہ

ومن یقاتل فی سبیل اللہ فیقتل او یغلب
فسوف نؤتیہ اجراً عظیما ۰ (سورۂ نساء ۴)

جو کوئی اللہ کی راہ میں قتال کرنے کے بعد قتل
ہوجائے یا مغلوب ہوجائے اُسے ہم اجر عظیم دیں گے

یہاں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ مقتول فی سبیل اللہ کو اجر عظیم اس لئے ملے گا کہ وہ اللہ کی راہ میں قتل ہوا یعنی مارا گیا۔ یہی حال مغلوب کا بھی ہوگا۔ پھر فرمایا:۔

این ما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی
بروج مشیّدہ (نساء ۷۸)

یعنی موت (جسمانی) سے کوئی نہیں بچ سکتا
خواہ وہ بروج مشیدہ ہی میں کیوں نہ ہو۔

اور اسی سلسلے میں ان موت سے ڈرنے والوں اور اللہ کی راہ میں قتل ہونے سے گھبرانے والوں سے کہا گیا کہ عجب بات ہے کہ یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ اللہ کی راہ میں مرنا اس دنیوی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے اور کہا کہ:۔
(فمال ھٰؤلاء القوم لایکادون یفقھون قولا" نساء ۷۸) "اس قوم کو کیا ہوگیا ہے کہ اتنی سیدھی سادی بات کو یہ نہیں سمجھتے:۔

قرآن کا صریح ارشاد یہی ہے کہ مجاہدین فی سبیل اللہ جب مرجاتے ہیں تو دنیوی زندگی سے بہتر زندگی میں داخل ہوجاتے ہیں۔ یعنی اُن کی حالت بہت ارفع و بہتر ہوجاتی ہے۔ وہ ایسی زندگی ہوتی ہے جس پر ہزار دنیوی زندگیاں نثار کی جاسکتی ہیں، یہی تصور تھا کہ قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کا شوق شہادت اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ موت پر فتح پاچکے تھے اور دنیوی زندگی اُن کے سامنے ہیچ تھی۔

آخری سورۃ قرآن اور وفات مسیح

قرآن کی آخری سورت المائدہ ہے۔ اس سورہ میں اُن مجمل باتوں کی تفصیل پائی جاتی ہے جو پہلے بیان ہوچکی ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ دولت اسلامیہ کتابیہ قائم ہوچکی ہے اور مومنوں کے لئے (جن میں اہلِ کتاب بھی داخل ہیں) ایک عالمی پروگرام رکھا گیا ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے اقرار ہے کہ تو جانتا ہے میں نے یہ نہیں کہا کہ میری ماں اور میں معبود ہیں اور میرے مرنے کے بعد کی بھی تجھ کو خبر ہے

ما قلت لھم الا ما امرتنی بہ ان اعبدوا اللہ
ربی وربکم وکنت علیھم شھیدا ما دمت
فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب
علیھم ۰ وانت علیٰ کل شئی شھید۔
(المائدہ رکوع ۲)

میں نے اُن سے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس کا تونے حکم نہ دیا ہو، یعنی یہ کہ اس اللہ کی بندگی کرو جو میرا اور تمھارا دونوں کا آقا ہے (اور جب تک میں اُن میں رہا میں اُن کی خبر رکھتا تھا) پھر جب تونے مجھے وفات دے دی تو خود اُن پر نگران تھا، تو ہی ہر چیز سے خبردار ہے۔ (المائدہ - آخری رکوع)

یہاں صاف بتایا ہے کہ اللہ نے حضرت مسیح کو اُس زمانہ کے فوراً بعد جب وہ اُن میں نہیں رہے وفات دے دی ورنہ حضرت مسیح اگر خفیہ طور پر اُن میں موجود ہوتے تو یہ ہرگز نہ کہتے کہ "جب تونے وفات دی" (لما توفیتنی)

قرآن میں آسمان پر زندہ مع جسم کے لیجانے کا ذکر نہیں

وفات یعنی ممات مسیح کے متعلق لوگوں نے انجیل کے خلاف یہ روایت بنائی ہے کہ حضرت مسیح کو خدا نے یہودیوں سے بچالیا اور اُنھیں آسمان پر اُٹھالیا۔ اس پر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں:۔
(۱) خدا کی شان کے خلاف ہے کہ چند یہودیوں کو ہلاک اور جہنم واصل کرنے کی جگہ خود حضرت مسیح کو آسمان پر زندہ اُٹھالیا۔
(۲) قرآن میں آسمان پر زندہ اُٹھالینے کا ذکر نہیں۔ اُس میں صرف یہ ہے کہ اپنے پاس رفع کرلیا۔ لہذا جو لوگ آسمان پر اٹھالینا بیان کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ خدا زمین پر نہیں ہے۔ یہی عقیدہ یہود و مجوس کا تھا کہ خدا آسمان پر ہے۔ زمین پر

اُس کی حکومت نہیں ہے۔ اور جو مسیحی اب تک ملوکیت الٰہیہ کے تصور کو نہیں سمجھے وہ بھی یہی دعا کیا کرتے ہیں کہ "اے خدا جو آسمان پر ہے، تیری حکومت اس زمین پر بھی ہو" حالانکہ حضرت عیسیٰ یہی بتانے آئے تھے کہ " وسع کرسیہ السماوات والارض " وہ پوری کائنات کا خدا ہے، آسمان اور زمین دونوں کا مالک ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں تھی کہ خدا حضرت عیسیٰ کو آسمان پر لیجاتا۔

(۳) بعض لوگ جو آسمان کے قائل نہیں وہ کہتے ہیں " رفع " سے مراد " بلند زمین " ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ صلیب پر مرے نہیں تھے۔ بلکہ نیم جاں ہو گئے تھے، اس لئے جب ہوش آیا تو اپنے حواریوں سے ملنے کے بعد فلسطین سے کوہ ہمالیہ کی بلندیوں کی طرف رخ کر دیا اور کشمیر میں جاکر وفات پائی۔ اور وہاں جو بوذا (سف) (بوذاسف) کی قبر مشہور ہے وہ ان ہی کی ہے۔

یہ باتیں نہ صرف منگھڑت ہیں بلکہ حضرت عیسیٰ کی شان رفیع کے بھی خلاف ہیں۔ جب انجیل (جسے ہر مسلمان کتاب اللہ مانتا ہے) یہ کہتی ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو شہید کر دیا اور تیسرے دن ایک فرشتے نے خبر دی کہ ان کو اللہ نے اُٹھا لیا۔ اور وہ اپنے حواریوں کو نظر آئے اور اب بھی زندہ (بطور شہید) موجود ہیں اور اپنے ماننے والوں کی پکار سنتے ہیں، تو یہ کہنا سراسر بے معنی ہے کہ وہ اپنے تبلیغی مشن اور فرض کو چھوڑ کر کسی بلند مقام کی طرف چل دیئے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو خدا اُن کا وہی حال کرتا جو حضرت یونس کا کیا تھا، اور وہ کشتی میں فرار ہونے کی جگہ مچھلی کے ذریعے واپس ساحل پہ لائے گئے تھے اور پھر نینوی والوں کے پاس دعوتِ حق کے لئے بھیجے گئے تھے۔

(۴) حضرت مسیح نے صرف تین سال تک " ملوکیتِ الٰہیہ " کی تبلیغ کی تھی، اس عرصے میں مکذبین اولی النعمۃ نے اُنھیں شہید کر دیا۔ ان کا مشن پورا بھی نہیں ہوا، حتیٰ کہ گیارہ حواریوں نے اُن کو پہچانا تک نہیں۔ اس حالت میں اگر وہ زندہ تھے تو اُنھیں اپنا مشن پورا کرنے کے لئے یہودیوں پر دوبارہ ظاہر ہو جانا تھا۔

دیکھئے رسول عربی صلعم پر بارہا مکہ میں دشمنوں نے حملہ کیا اور قتل کر ڈالنا چاہا۔ حتیٰ کہ غار ثور تک پہونچ گئے۔ پھر مسلسل مدینہ پر آنحضرت کو قتل کرنے کے لئے حملے کئے۔ کسی حال میں آپ نے اللہ سے یہ دعا نہیں کی کہ اُنھیں آسمان پر اُٹھا لیا جائے۔ یا جب آپ غار ثور میں چھپے ہوئے تھے تو آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ خدایا مجھے آسمان پر اُٹھالے، یا کسی بلند مقام (مثلاً کشمیر وغیرہ) بھیج دے کہ وہاں جاکر آرام کروں۔ مقابلہ سے ہٹ جانا اور اپنے فرض سے منہ موڑ لینا ایک معمولی انسان کے لئے بھی نامناسب ہے، چہ جائیکہ اللہ کے جلیل القدر رسول، اس امر کے مرتکب ہوں۔

غرضکہ محض " رفع " کے ناموزوں معنی سمجھنے اور " قتل " کے موزوں معنی نہ سمجھنے کی وجہ سے ایسی روایتیں تصنیف کر لی گئی ہیں کہ ایک طرف تو حضرت مسیح اور خود خالق ارض و سما پر اعتراض وارد ہوتا ہے اور دوسری طرف " مہدی " کا تصور پیدا ہوتا ہے جو لاکھوں آدمیوں کو ایک امید موہوم کے سہارے رکھ کر " بے عمل " یا گریز پا بنا چکا ہے۔

سورۂ المائدہ کے شروع میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسیح ہرگز خدا نہیں ہیں اس لئے کہ خدا حی و قیوم ہے اور مسیح بشر ہیں اُنھیں موت مثل اور لوگوں کے آئے گی اور یہ ہلاکت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ خالق اور مخلوق میں یہی فرق ہے کہ خالق حی ہے اور مخلوق معرضِ فنا میں ہے اس سے نہ مسیح مستثنیٰ ہیں نہ مریم اس سے ثابت ہے کہ وہ معبود نہیں ہیں۔

"لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم قل فمن یملک من اللہ شیئًا ان اراد ان یہلک المسیح ابن مریم وامہٗ ومن فی الارض جمیعا۔
(المائدہ ۱۷)

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم خدا ہے وہ کافر ہیں۔ اگر خدا چاہے کہ مسیح بن مریم اور اس کی ماں (مریم) اور کل دُنیا والوں کو ہلاک کر دے، تو کون اللہ کی ملوکیت میں دخل دے سکتا ہے۔ (المائدہ آیت ۱۷)

اسی طرح فرمایا:۔ " کل نفسٍ ذائقۃُ الموت "

ہر جاندار موت کا مزہ چکھے گا۔

اور یہ بھی کہا کہ:-

"اینما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدۃ" (سورہ ۴: ۷۸)

تم جہاں کہیں بھی ہوگے خواہ بروج مشیدہ ہی میں کیوں نہ ہو، موت آنا برحق ہے۔

اور سورۂ مریم میں، جوکہ ہجرت حبشہ کے زمانہ میں مکی سورہ ہے اور تقریباً ۶ سنہ نبوی میں، یعنی ہجرت سے پانچ سال پہلے نازل ہو چکی ہے صاف صاف ذکر ہے کہ جب حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تو ان کی قوم (یہود) نے بچے کو گود میں دیکھ کر کہا:-

(یا مریم لقد جئت شیئاً فریاo یا اخت ہارون ماکان ابوک امرأ سوءٍ وما کانت امک بغیاo)

اے مریم تو ایک عجیب تہمت کی بات لائی ہے۔ تعجب اس لئے زیادہ ہے کہ تو شریف خاندان کی ہے اور تیرے ماں باپ بھائی سب اچھے لوگ ہیں اس پر حضرت عیسیٰ کی زبان سے یہ بتایا گیا ہے کہ میں "عبداللہ" ہوں (نہ کہ ابن اللہ، جیسا کہ نصرانیوں نے حضرت مریم کو باعصمت مان کر اُن کا شوہر اللہ کو قرار دے دیا) مجھے احکام الٰہیہ پر (جو توراۃ میں ہیں) عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور میں انسان ہوں اللہ کی بندگی یعنی نماز اور اللہ کے عطا کئے ہوئے مال کی زکاۃ بھی مجھ پر زندگی بھر عاید ہوتی رہے گی" واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ ما دمتُ حیاًo" (یہی نہیں بلکہ عام انسانوں کی طرح میں بھی پیدا ہوں مروں گا اور (قیامت میں) دوبارہ پیدا کیا جاؤں گا) "والسلام علیّ یوم ولدتُ و یوم اموتُ و یوم اُبعثُ حیاً" (حضرت مریم کے صدیقہ ہونے اور حضرت مریم کے بیٹے کے متعلق عبداللہ ہونے کا صاف صاف یہ حال ہے جس میں یہود کو شبہ تھا۔ قرآن نے اس شبہ کا ازالہ کردیا) "ذٰلک عیسی ابن مریم قول الحق الذی فیہ یمترون" کہ عیسیٰ بن مریم انسان ہیں، زندگی بھر خدا کے لئے نماز و زکات دیں گے، پھر وفات پائیں گے۔ (یعنی اگر وہ آسمان پر زندہ ہیں تو نماز تو پڑھتے ہوں گے مگر زکات کسے دیتے ہوں گے) یوم البعث کو دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ اگر وہ خدا ہوتے پھر وہ تو نہ پیدا ہوتے نہ وفات پاتے۔ اسی مناسبت سے سورہ آل عمران کے شروع میں جو آیتیں نصارائے نجران کو مخاطب کرکے آنحضرت نے پڑھی تھیں، یہ بتاتی ہیں کہ خدا حی و قیوم ہے مسیح نہیں ہیں وہ پیدا بھی ہوئے اور وفات بھی پاگئے۔

(الم اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم - آل عمران)

اور جس طرح بچپن (فی المہد) سے حضرت عیسیٰ نے نبوت کا کام شروع کردیا تھا یعنی عبودیت خدا کی طرف بلانا شروع کیا تھا اسی طرح اسی سورہ مریم میں حضرت یحییٰ کا تذکرہ ہے کہ انہوں نے الکتاب یعنی توراۃ پر عمل کرنا اور اس کے مطابق فیصلہ (حکم) کرنا بچپن سے شروع کردیا تھا (یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃٍ ط و آتیناہ الحکم صبیاًo) اور پھر اُن کے پیدا ہونے اور وفات پانے اور دوبارہ قیامت میں عام انسانوں کی طرح مبعوث ہونے کا ذکر بالکل حضرت عیسیٰ کے ذکر کے مانند ہے ——

(وسلامٌ علیہ یومَ وُلِد ویومَ یموتُ ویومَ یُبعثُ حیاًo سورۂ مریم) غرضکہ حضرت عیسیٰ کی بھی ولادت و موت حضرت یحییٰ کی طرح ہو چکی، قرآن شاہد ہے۔ بات یہ ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ کی بغیر باپ کے ولادت محیر العقول تھی اور یہود اس میں شک کرتے تھے اُس سے زیادہ حیرت انگیز حضرت یحییٰ کی ولادت تھی اس لئے خود اُن کے والد زکریا اتنے بوڑھے ہوگئے تھے کہ اُن سے اولاد پیدا ہونا ناممکن تھا اور اُن کی بیوی بانجھ تھیں۔ ان دونوں مجبوریوں کے باوجود خدا نے اپنی قدرت سے انھیں بیٹا دیا۔ (وکانت امرأتی عاقراً و قد بلغت من الکبر عتیاً) یہاں بھی وہی الفاظ ہیں جو حضرت عیسیٰ کی ولادت کے بارے میں ہیں (قال ربک ھو علیّ ھیّنٌ) یعنی یہ بات خدا پر بہت آسان ہے۔ اُس نے تو لاشئے سے کل کائنات پیدا کردی۔

(وقد خلقتک من قبلُ ولم تک شیئاًo واذا ارادہ شیئاً یقول لہ کن فیکون)

لہٰذا قتل کے معنی ذلیل کرنا، رفع کے معنی عزت دینا اور ولادت وفات کے مشہور معنیٰ دونوں نبیوں کے لئے قرآن سے ثابت ہیں۔

چند اور قرآنی تلمیحات جو محاورۃً متضاد نہیں ہیں: جس طرح قرآن نے قتل مسیح کو ما قتلوہ کہا ہے اور قتل کی حقیقت کے معنی رفعت وطہارت و اکرام کے بتائے ہیں اسی طرح قرآن میں کئی موقعوں پر اس طرز بیان کو اختیار کیا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) "ما رمیت اذ رمیت ولاکن اللہ رمیٰ" (انفال) اے رسول تونے نہیں مارا (اگرچہ تونے ہی مارا) بلکہ اللہ نے مارا (غزوۂ بدر)

(۲) "بصرت بما لم یبصروا بہ" (طٰہٰ-۹۶) سامری نے کہا کہ مجھے وہ بات سوجھی جو اسرائیلیوں کو نہیں سوجھی۔

(۳) "مثل الفریقین کالاعمیٰ والاصم والبصیر والسمیع ط ھل یستویان مثلاً ط افلا تذکرون" (؟) (سورۂ ہود رکوع ۲) یعنی کافر و مومن کی مثال ایسی ہے کافر آنکھوں کانوں کے باوجود اندھے اور گونگے ہیں۔ اسی طرح فرمایا:۔

(۴) "لھم قلوبٌ لا یفقھون بھا، ولھم اعینٌ لا یبصرون بھا، ولھم آذانٌ لا یسمعون بھا۔ اولائک کالانعام، بل ھم اضل، اولائک ھم الغافلون ٥" (الاعراف ع ۲۲) یا

(۵) "افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوبٌ یعقلون بھا، او آذانٌ یسمعون بھا، فانھا لا تعمی الابصارُ ولاکن تعمی القلوب التی فی الصدور" (الحج ۶ع)

(۶) "والذین لا یؤمنون فی آذانھم وقرٌ (یعنی القرآن) علیھم عمیٌ اولائک ینادون من مکانٍ بعید"۔ (حم السجدہ - رکوع ۴)

خلاصہ کلام خلاصہ یہ ہے کہ جو بات استعارۃً کہی جاتی ہے، اور اس لئے کہی جاتی ہے کہ کلام میں زور پیدا ہو، اسے اگر ہم زیور استعارہ سے محروم کر دیں تو پھیکی اور بے مزہ ہو جاتی ہے۔ جو لوگ کلام کی اس بلاغت سے واقف ہیں وہ مجاز میں حقیقت اور تشبیہ و استعارہ میں حقیقت سے بلند تر حقیقت کو دیکھتے ہیں اور کبھی جسمانی موت کو فنا یا دل کے اندھے پن کو کور چشمی نہیں کہہ سکتے۔ وہ جانتے ہیں کہ خود رسول کریم کے سامنے کثرت سے لوگوں نے بدر و احد، خندق و حنین میں جام شہادت پیا۔ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے۔ دفن ہوئے اور اب تک ان کو مقتول فی سبیل اللہ مانا جاتا ہے، لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ وہ مر کر فنا ہو گئے۔ بلکہ قرآن کی تصریح کے مطابق وہ اسی طرح زندہ ہیں جس طرح کھانا کھانے والے جاندار مادی جسم کو کھانا کھلا کر زندہ رہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:۔

(۱) ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتٌ ط بل احیاءٌ ولاکن لا تشعرون۔ (بقرہ ۱۵۴)

(۲) پھر مقتولین احد کے سلسلہ میں کہتا ہے کہ منافقین نے اپنے مقتول بھائیوں کے متعلق کہا کہ اگر وہ بھی ہماری طرح گھر بیٹھ رہتے اور ہمارا کہا مانتے تو قتل نہ ہوتے۔ اے رسول ان منافقوں سے کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت کو ٹال دو۔ (الذین قالوا لاخوانھم وقعدوا لو اطاعونا ما قتلوا ط قل فادرؤا عن انفسکم الموت ان کنتم صادقین۔ آل عمران ۱۶۸)۔

دیکھئے یہاں شہدائے احد کے لئے قتل بمعنی موت استعمال ہوا ہے۔ اسی کے آگے جو آیت ہے اس میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں مرنے والوں کو مردہ نہ سمجھو (ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا ط بل احیاءٌ عند ربھم یرزقون فرحین بما آتاھم اللہ من فضلہٖ لا ..... یحزنون ﴿۱۷۰﴾ (آل عمران)

اب بتائیے کہ ہم حضرت مسیح بن مریم کو مقتول فی سبیل اللہ (شہید) سمجھیں یا نہ سمجھیں؟ قرآن کی تعلیم کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اس میں کوئی ابہام نہیں۔ حضرت مسیح ضرور شہداء میں سے ہیں اور اگر وہ دوبارہ آسمان سے اتر کر یہاں آنے والے اور وفات پانے والے ہیں، تو ان لوگوں کو انتظار کا حق ہے، جو قوم موسیٰ کی طرح چاہتے ہیں کہ سب کچھ وہی کر دیں اور یہ بیٹھے کہتے رہیں (انا ھھنا قاعدون)

محمد اجمل خاں (دہلی)

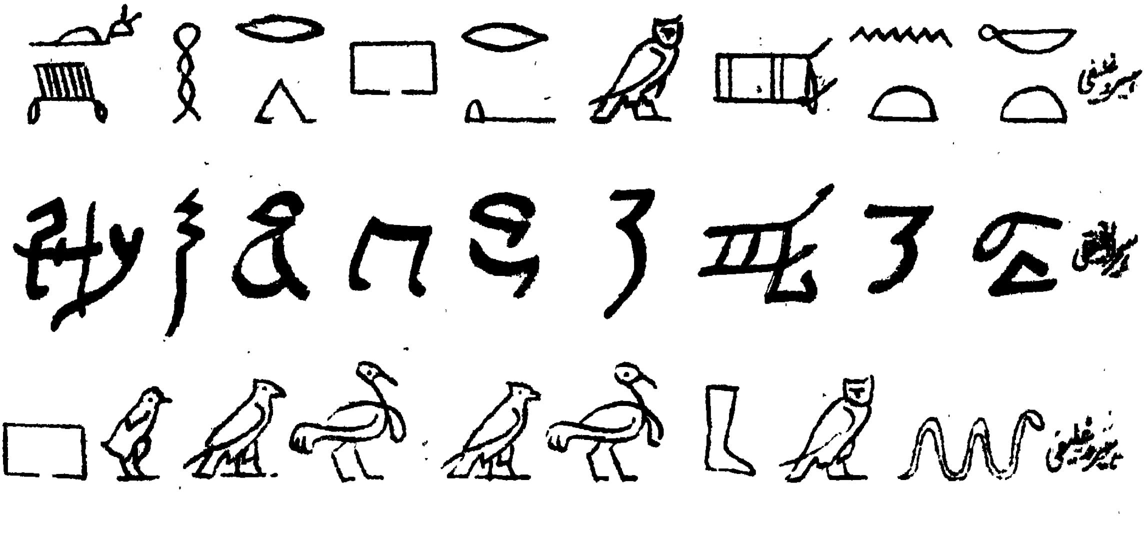
فنِ تحریر کی تاریخ

(بہ سلسلۂ گذشتہ)

ہیراطیقی رسم خط ہیروغلیفی نقوش عام طور سے عمارتوں پر کندہ کئے جاتے تھے لیکن جب روزانہ زندگی کے معمولات اور اظہارِ خیال کے لئے انھیں پیپرس پر لکھا جانے لگا تو عرصہ تک وہ اپنی خوبصورتی باقی نہ رکھ سکے اور تصویری حروف کی صورتیں مسخ ہونے لگیں اور اس مسخ شدہ نئی لکھائی کو "ہیراطیقی" کہتے ہیں۔

لفظ ہیراطیقی معرب ہے انگریزی (HIERATIC) کا جو یونانی لفظ (HIERATIKOS) سے ماخوذ ہے یہ نام کلمینٹ اسکندری نے اپنے زمانہ کی اُس مصری لکھائی کے لئے استعمال کیا ہے جو پروہتوں میں رائج تھی اور اس کے معنی ہیں "مقدس ۔ پروہتوں کا"۔

ہیروغلیفی اور ہیراطیقی میں وہی فرق ہے جو انگریزی کے چھپے اور لکھے ہوئے حروف میں یا نستعلیق اور خطِ شکستہ میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لکھنے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ تصویروں کا تصویرپن غائب ہوگیا، نیچے ہیراطیقی رسم خط کی ایک عبارت معہ ہیروغلیفی اصل کے درج کی جاتی ہے جن سے آپ دونوں کا فرق سمجھ سکتے ہیں۔ لکھائی کا رُخ دائیں سے بائیں کو ہے:۔



پہلے ہیراطیقی رسم خط اوپر سے نیچے کو لکھا جاتا تھا لیکن بعد میں دائیں سے بائیں کو لکھا جانے لگا۔ جہاں تک قدامت کا تعلق ہے ہیراطیقی رسم خط ہیروغلیفی سے کچھ ہی کم پرانا ہے، دونوں بیک وقت رائج تھے۔ تقریباً ... سو سال مستعمل رہ کر تیسری صدی عیسوی سے اُس کا استعمال بند ہوگیا

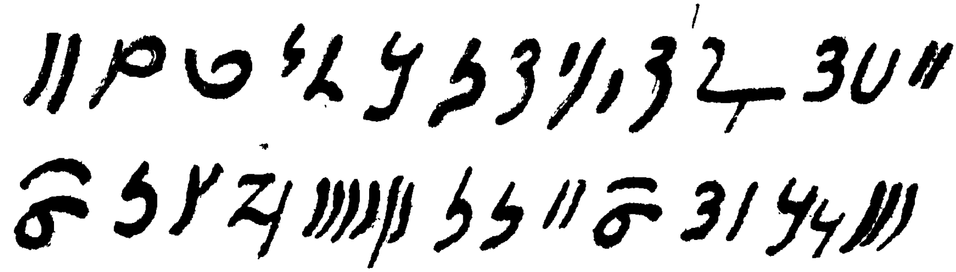
دیموطیقی رسم خط مصری عوام کی لکھائی پروہتوں سے جدا تھی۔ ہیرودوتس اور ڈیوڈورس نے اُسے (GRAMMATA DEMOTIKA) یعنی "عوامی یا جمہوری لکھائی" کہا ہے۔ اس سے انگریزی نام (DEMOTIC) ماخوذ ہے۔ جس کی معرب صورت "دیموطیقی" ہے۔

یہ لکھائی ہیراطیقی نشانات کے مزید اختصار سے پیدا ہوئی تھی۔ اسے ایک قسم کی مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) کہنا چاہئے۔ ہیراطیقی کی طرح اسے بھی پیپرس پر لکھا جاتا تھا۔ لکھائی کا رُخ دائیں سے بائیں کو ہے۔ اس کے قدیم ترین نمونے ساتویں صدی ق۔م کے ہیں اور سب سے آخری ۴۷۰ء کا۔

مصر کے یونانی حکمرانوں کے زمانہ میں اس لکھائی نے بڑی اہمیت حاصل کرلی تھی۔ چنانچہ "کتبہ روزیٹا" (جس کا ذکر آگے آئیگا) اور "فرمانِ کینوپس" پر ہیروغلیفی کے بعد دوسری جگہ اسے اور تیسری جگہ یونانی کو دی گئی ہے۔

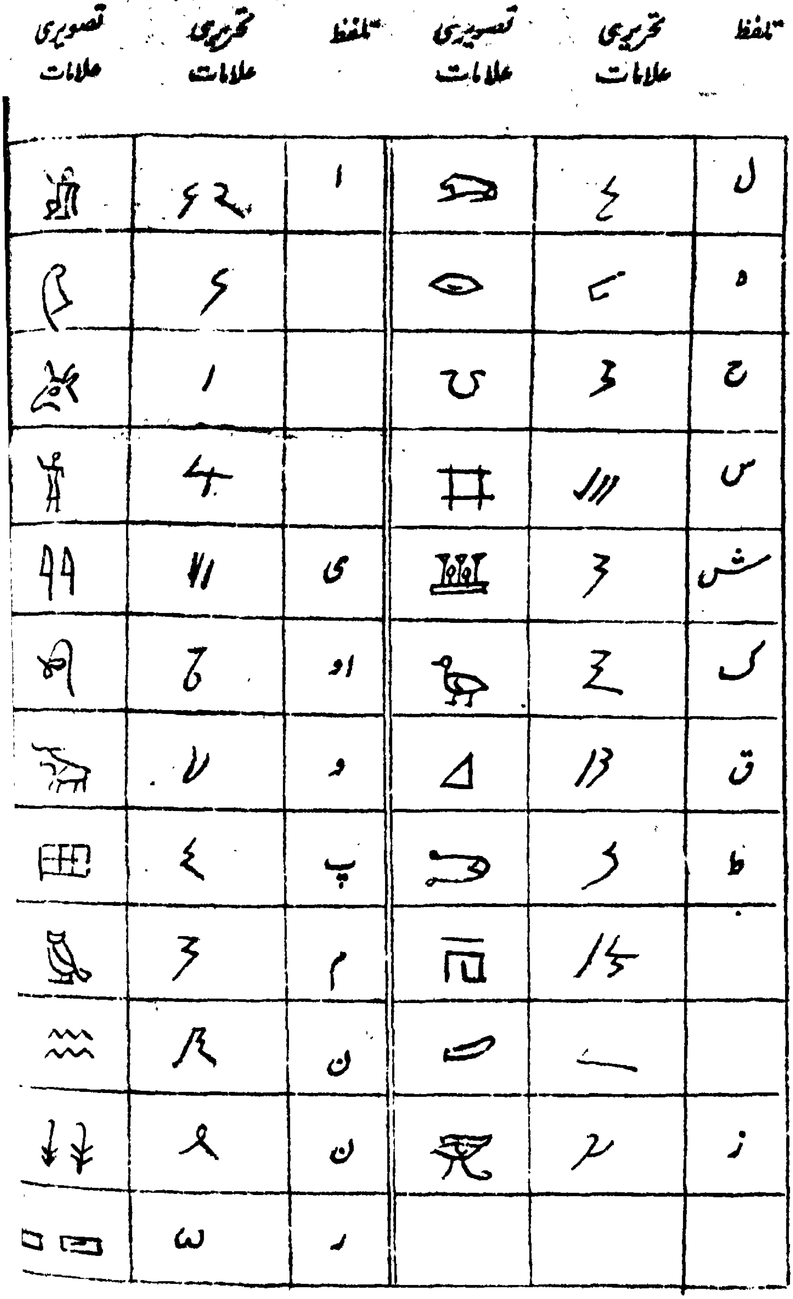
دیموطیقی مخطوطات کو پڑھنے میں بہت دقت ہوتی ہے۔ ہر کاتب کا ہاتھ دوسرے سے جدا اور ہر پیپرس کی لکھائی دوسرے سے مختلف ہے۔ انھیں پڑھنے کے لئے بڑی محنت اور مشق کی ضرورت ہے۔ اور چونکہ دیموطیقی مخطوطات کے موضوع غیر دلچسپ ہیں (تجارتی اور قانونی معاملات وغیرہ) اس لئے اُنھیں پڑھنے کی خواہش بھی نہیں ہوتی۔

دیموطیقی رسم خط کا نمونہ یہ ہے :۔



میروئی لکھائی مصر کے جنوب میں نوبیا کا ملک ہے جس کا دارالحکومت زمانۂ قدیم میں میرو کا شہر تھا۔ نوبیا مصر کے زیرِ تابع تھا۔ نویں آٹھویں صدی ق۔م اُس نے آزادی حاصل کرلی، لیکن وہاں کے لوگ مصری زبان اور رسم خط استعمال کرتے رہے یہاں تک کہ ولادت مسیح سے کئی صدی قبل مصری زبان بھی ترک کردی گئی اور مقامی زبان استعمال شروع ہوا جسے لکھنے کے لئے تیسری یا دوسری صدی ق۔م ایک نیا رسم خط ایجاد ہوا جسے میرو کی رعایت سے ہم "میروئی" (MEROITIC) کہہ سکتے ہیں۔

میروئی کی دو قسمیں ہیں تصویری اور تحریری۔ اُس کے حروف یہ ہیں :۔



تصویری علامتیں ہیروغلیفی رسم خط سے ماخوذ ہیں۔

تحریری علامتوں کا ماخذ دیموطیقی رسم خط معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ اُس کے مقابلہ میں ہیروغی علامتیں زیادہ مختصر ہیں۔

کتبہ روزیٹا

مصری رسم خط کے اصول و قواعد وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُسے پڑھا کیسے گیا؟ جبکہ تیسری صدی عیسوی سے اُس کا استعمال بند ہو گیا تھا اگرچہ پُرانے محلوں، مندروں اور مقبروں پر تصویری رسم خط میں کتبے موجود تھے لیکن کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ اُن میں کیا لکھا ہے یہ کیفیت ۱۵۰۰ سال تک رہی یہاں تک کہ قدیم مصری رسم خط کی کنجی کتبہ روزیٹا کی شکل میں مل گئی۔

روزیٹا ایک مقام کا نام ہے جو اسکندریہ سے چند میل جانب مشرق واقع ہے۔ ۱۷۹۹ء کا واقعہ ہے کہ نپولین نے مصر پر حملہ کیا۔ اُس کے توپخانہ کا ایک افسر بوسارڈ (BOUSSARD) روزیٹا میں سینٹ جولین کے قلعہ کی ایک دیوار کھدوا رہا تھا کہ یکایک کھودنے والوں کی نظر ایک سیاہ پتھر پر پڑی جس پر عجیب و غریب نشانات تھے۔ سپاہیوں نے یہ پتھر اپنے افسر کو دکھایا۔ بوسارڈ نے اُسے مفید اور دلچسپ پاکر اُن عالموں کے حوالے کردیا جو نپولین کے ساتھ آئے تھے اور جب ۱۸۰۱ء میں فرانسیسیوں نے شکست کھائی تو یہ کتبہ انگریزوں کے ہاتھ آیا۔ مصر سے اُسے انگلستان لے آئے اور برٹش میوزیم (لندن) میں رکھ دیا۔

اس کتبہ کی لمبائی ۳ فیٹ ۹ انچ، چوڑائی ۲ فیٹ ۴ ½ انچ اور موٹائی ۱۱ انچ ہے۔ اس کے اوپر کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا ہے۔

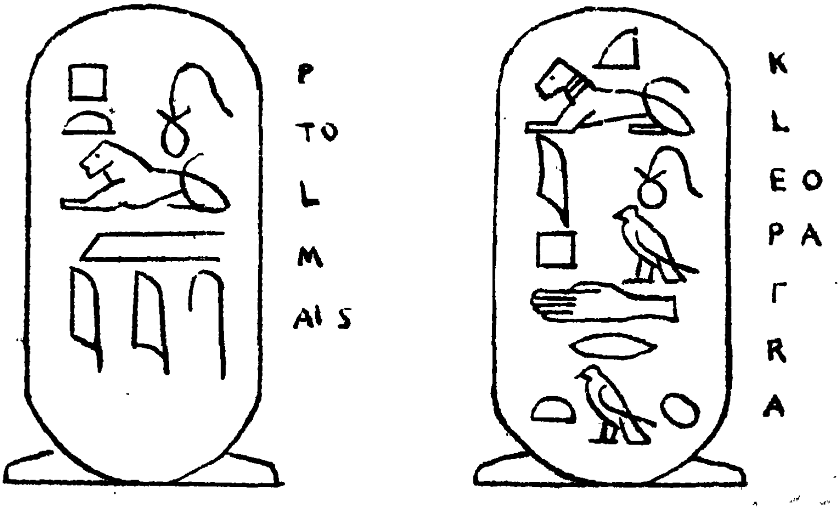
باہنی طرف نیچے کا کچھ کونا بھی اس کے نقوش ہیروغلیفی دیموطیقی اور یونانی تین طرح کے رسم خط سے تعلق رکھتے ہیں، اوپر کی ۱۴ سطریں تصویری حروف میں ہیں، درمیان کی ۳۲ سطریں دیموطیقی رسم خط میں اور نیچے کی ۵۴ سطریں یونانی حروف میں۔

یونانی تحریر کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ اس کتبے کو بطلیموس پنجم مسمیٰ ایپیفانیس (PTOLEMY V EPIPHANES) نے ۱۹۶ - ۱۹۷ ق - م کندہ کروایا تھا۔ یہ بات تو ظاہر تھی کہ تینوں کتبوں کا مضمون ایک ہے صرف زبان اور لکھائی کا فرق ہے۔ یونانی رسم خط معلوم تھا لہٰذا سب سے پہلے اُسے پڑھا گیا۔ اس کے بعد دیموطیقی اور ہیروغلیفی رسوم خط کے کتبے پڑھے گئے۔

ہیروغلیفی رسم خط کے پڑھنے میں دو چیزوں سے بڑی مدد ملی ایک تو قبطی زبان جو قدیم مصری سے نکلی ہے اور دوسرے مصری رسم خط کی یہ خصوصیت کہ اُس میں بادشاہوں کے نام ایک خاص قسم کا حلقہ بنا کر لکھے جاتے ہیں جنھیں جدید اصطلاح میں "کارتوس" کہتے ہیں۔[1]

۱۸۱۴ء میں مشہور سائنسداں ڈاکٹر ٹامس ینگ نے کتبۂ روزیٹا کے ہیروغلیفی حصے میں اُس حلقے کو معلوم کر لیا جس میں بطلیموس کا نام تھا لیکن وہ اُس میں آنے والی تصاویر کی ٹھیک ٹھیک آوازیں متعین نہ کر سکا۔

اسی اثناء میں ایک دوسرا فرانسیسی عالم جین فرنیکوئس شمپولین بھی کتبۂ روزیٹا کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے سامنے کتبۂ روزیٹا کی نقل کے علاوہ جزیرہ فلائی کے ایک مخروطی مینار پر پائے جانے والے دو کارتوسوں کی نقلیں تھیں۔ اس مینار کے نیچے کے حصے میں ایک یونانی کتبہ تھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ مینار بطلیموس اور قلوپطرہ سے منسوب ہے۔ اب ان میں سے ایک حلقے کے نقوش کتبۂ روزیٹا کے حلقہ کے نقوش سے ملتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دونوں میں بطلیموس کا نام تھا اور یہ بھی ایک کھلی ہوئی بات تھی کہ مینار کے دوسرے حلقے میں قلوپطرہ کا نام تھا۔ جب ان ناموں میں آنے والے رومن حروف کی گھیروں میں آنے والی تصاویر پر تطبیق کی گئی تو اتفاق سے پوری اُتریں اور اس طرح مصری ہیروغلیفی حروف میں سے کئی کی آوازیں معلوم ہو گئیں۔

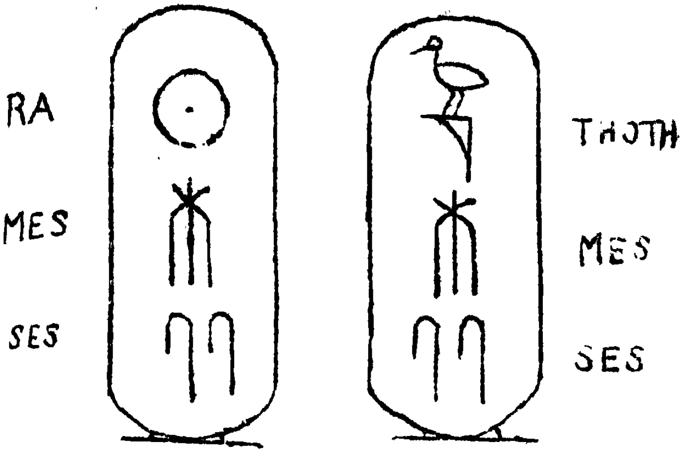


اسی طرح اُس نے مصر کے ۷۹ یونانی اور رومی حکمرانوں کے نام پڑھ ڈالے۔

---

[1] یعنی یہ شکل ▭ میرے خیال میں یہ انگوٹھی ○ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ انگوٹھیوں پہ نام کندہ کرا کے مُہر کے طور پر ثبت کرنے کا طریقہ بہت پُرانا ہے۔

۱۴ ستمبر ۱۸۲۲ء کو اُسے دو اور مندروں پر پائے جانے والے کارتوسوں کی نقلیں ملیں :-



ان میں سے ایک میں اوپر کی طرف (بائیں جانب والا نقش) سورج کی تصویر تھا جسے قبطی زبان میں "را" کہتے ہیں۔ بیچ کا نشان کتبۂ روزیٹا میں بھی پایا جاتا تھا جہاں وہ پیدائش کے معنی دیتا تھا اور قبطی زبان میں "میس" کے معنی پیدا ہونا اور "ماس" کے معنی بچے کے ہیں۔ سَ کے نشانات جو آخر میں ہیں اُسے پہلے ہی سے معلوم تھے۔ اس طرح یہ بات ظاہر ہوگئی کہ یہ "رامیسیس" کا نام ہے اور اس کے معنی ہیں "(سورج دیوتا) را کا بیٹا"۔

دوسرے کارتوس میں اوپر (IBIS) نامی پرند کی تصویر تھی۔ یونانی تحریروں سے معلوم ہوا کہ یہ پرند تھاتھ دیوتا کی علامت تھا۔ بقیہ علامتیں وہی تھیں جو پہلے کارتوس میں ہیں اسے "تھاتھ موسیس" پڑھا گیا بمعنی "تھاتھ (دیوتا) کا بیٹا"۔ چونکہ یہ نام یونانی مورخ (MANETHO) کی تاریخ میں بھی پایا جاتا ہے لہٰذا اس کے صحیح ہونے میں شبہ نہ رہا۔

اب اُسے یہ معلوم ہوگیا کہ مصری ہیروغلیفی رسم خط میں تین طرح کے نشانات کام آتے تھے۔ (۱) تصویری الفاظ جیسے "را" اور "تھاتھ" وغیرہ۔ (۲) دو حرفی کلمات جیسے "میس"۔ (۳) یک حرفی کلمات یا حروف جیسے پ۔ ت۔ ل۔ م۔ وغیرہ۔

۱۰ ستمبر ۱۸۲۲ء کو اُس نے مصری حروفِ تہجی کا ایک نقشہ مرتب کرکے پیرس کی (ACADEMIE DES INSCRIPTIONS) کو پیش کیا اور اب اُسے مصری ہیروغلیفی رسم خط پر اتنا عبور ہوگیا تھا کہ وہ اُسکے کتبات پورے وثوق کے ساتھ پڑھنے لگا۔ اُس نے کتبۂ روزیٹا کے کافی حصہ کو پڑھ ڈالا لیکن اُس کی زندگی نے وفا نہ کی اور ۴ مارچ ۱۸۳۲ء کو اُس کا انتقال ہوگیا۔ اور اس کام کو اُس کے بیٹے نے پایۂ تکمیل کو پہونچایا۔ کتبۂ روزیٹا کا ترجمہ ۱۸۴۱ء میں شایع ہوا۔ شمپولین کو صحیح معنوں میں "مصریات کا باپ" کہا جاتا ہے۔ ہیروغلیفی رسم خط کے پڑھنے میں اُس کا وہی مقام ہے جو سرہنری رالنسن کا میخی رسم خط کے پڑھنے میں۔

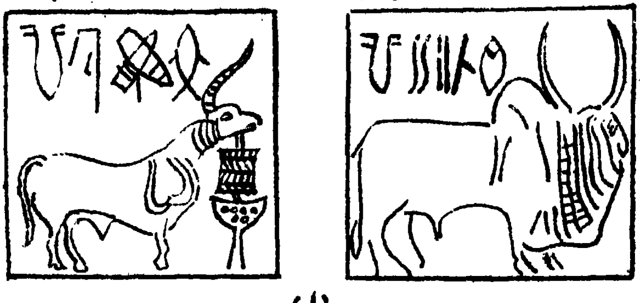
وادیِ سندھ کا رسم خط

آثارِ قدیمہ کی تحقیقات سے یہ ثابت ہے کہ زمانۂ قدیم کی وادیِ سندھ اعلیٰ تہذیب کا مرکز تھی اور اپنی معاصر سمیری اور مصری تہذیبوں سے کسی طرح پیچھے نہ تھی۔ یوں تو وادیِ سندھ میں کئی پرانے شہر کھود کر نکالے گئے ہیں لیکن اُن میں سے دو بہت مشہور ہیں ایک ہڑپّا (ملتان اور لاہور کے درمیان) اور دوسرا موہنجو داڑو (مُردوں کا ٹیلہ) ضلع لاڑکانہ صوبۂ سندھ میں۔ سرجان مارشل کے مطابق اس تہذیب کا مرکزی زمانہ ۳۲۵۰ تا ۲۷۵۰ ق م ہے۔

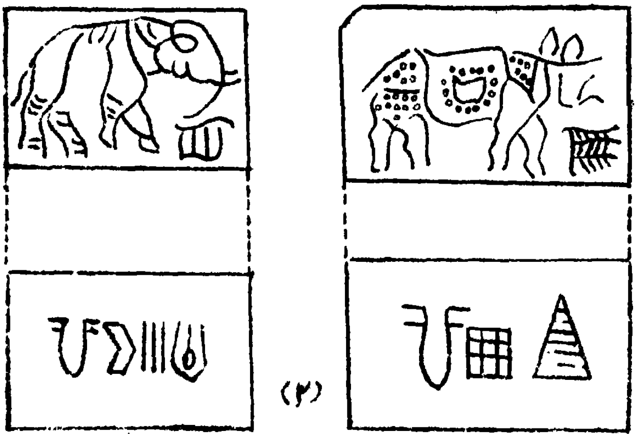
کتبے۔ وادیِ سندھ کے کتبے بہت چھوٹے ہیں وہ عموماً چوکور چپٹی مُہروں (STAMP SEALS) کی شکل میں پائے جاتے ہیں جن کے درمیان کسی جانور کی تصویر ہوتی ہے اور اوپر کے حصے میں تصویری لکھائی۔ یہ مُہریں ایک خاص قسم کے پتھر کی ہیں جسے (STEATITE) کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ پیتل کی چھوٹی چھوٹی تختیاں بھی ملی ہیں جن کے ایک رخ پر کسی جانور کی تصویر ہوتی ہے اور دوسرے رخ پر کتبہ۔

حیواتی تصاویر کے علاوہ بعض دیوی دیوتاؤں کی تصویریں بھی پائی جاتی ہیں جن میں سب سے خاص شیوجی کا "پشوپتی روپ" ہے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہروں اور پیتل کی تختیوں کو مذہبی اہمیت حاصل تھی اور ممکن ہے اُنھیں تعویذ کی طرح پہنا جاتا ہو۔



(۱)



(۲)

موہنجو داڑو اور ہڑپا کے کتبے
نمبر (۱) پتھر کی مہریں - نمبر (۲) پیتل کے تعویذ

اس رسم خط کا ابھی تک کوئی طویل کتبہ نہیں ملا ہے غالبًا اس لئے کہ انھیں ایسی اشیاء پر لکھا جاتا تھا جو زیادہ دیر پا نہیں ہوتیں مثلاً بھوج پتر کھجور کے پتے، چمڑا (PARCHMENT) لکڑی اور سوتی کپڑا وغیرہ - اُس کے بعض نشانات اتنے مختصر ہیں کہ صورت کا پہچاننا بھی مشکل ہے - چونکہ مختصر نویسی فن تحریر کے ارتقاء کی دوسری منزل ہے اسلئے ہمیں وادیِ سندھ کے رسم خط کے نشو و ارتقاء کا ایک طویل دور تسلیم کرنا ہوگا لیکن عبوری دور کا کوئی کتبہ نہیں ملا جس کا سبب یہ ہے کہ وہ آسانی سے سڑ گل جانے والی چیزوں پر لکھے گئے تھے اور فنا ہو چکے ہیں

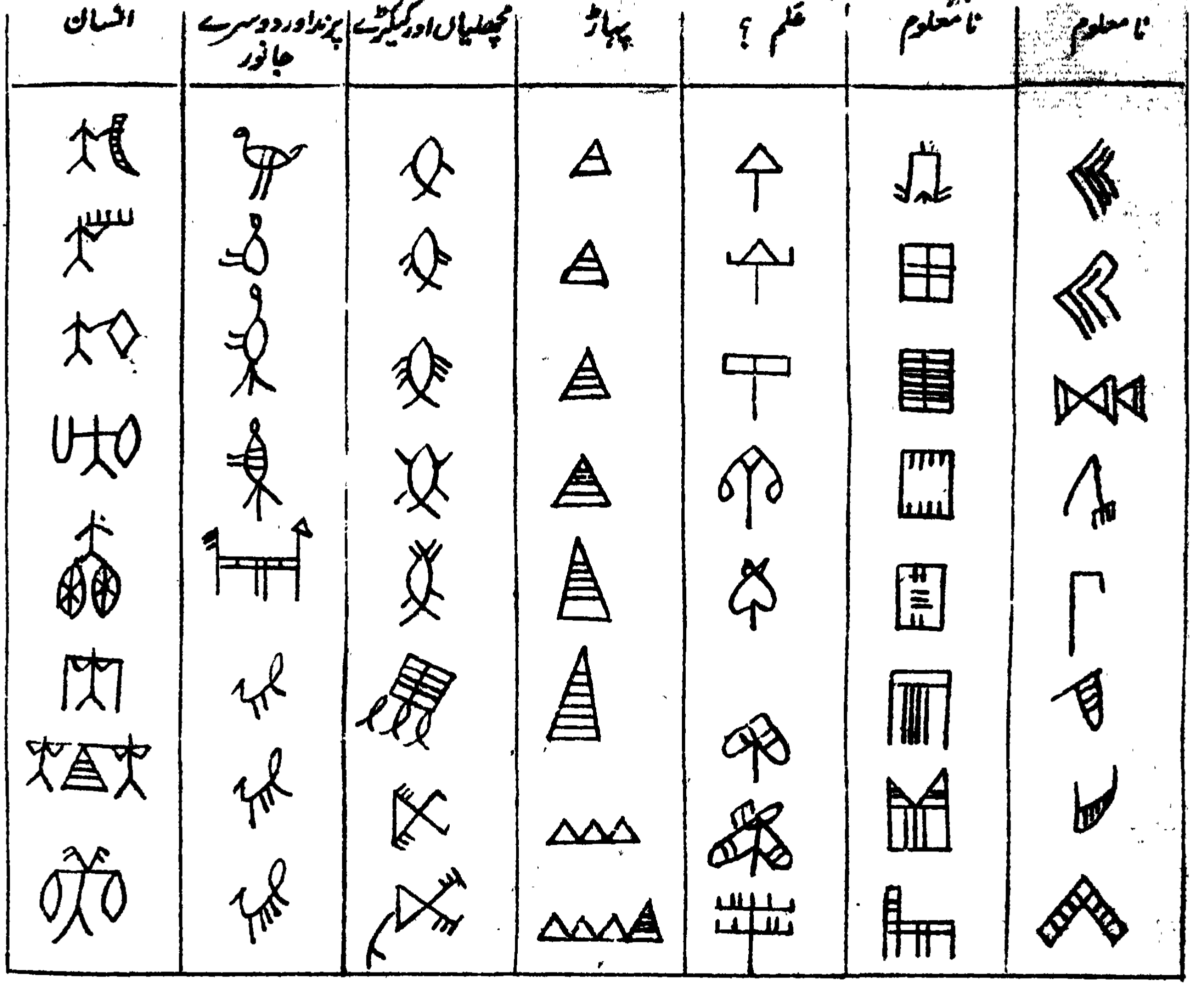
کتبات کی لکھائی

نشانات کی تعداد — اس لکھائی کو ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس میں کتنے نشانات کام آتے تھے ڈاکٹر ہنٹر ۲۵۳ نشانات ظاہر کرتے ہیں - پروفیسر اسٹیفین لینگڈن ۲۸۸ اور سی - جے گڈ اور سڈنی اسمتھ ۳۹۶ - لیکن میرا اندازہ اس سے کہیں زیادہ کا ہے - سر جان مارشل نے اپنی کتاب میں موہنجو داڑو کی تقریبًا ۵۰۰ مہروں کے فوٹو دئے ہیں، اور مادھو سروپ وٹس نے اپنی کتاب میں ہڑپا کی تقریبًا ۹۰۰ مہروں کے - ان ۱۴۰۰ مہروں کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد میں نے وادی سندھ کے رسم خط میں کام آنے والے نشانات کی جو فہرست اپنے ذاتی استعمال کے لئے مرتب کی ہے اُس میں تقریبًا ۷۵۰ اندراج ہیں اگرچہ ان میں سے بعض نشانات ایک ہی نشان کی بدلی ہوئی صورتیں (VARIANTS) ہیں - ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وادیِ سندھ کے لوگ کن نشانات کو مفرد مانتے تھے اور کن کو مرکب - ایک ہی نشان مختلف طریقوں سے بنایا جاتا تھا یا ذرا سا فرق کر دینے سے اس کے معنے میں تغیر ہو جاتا تھا -

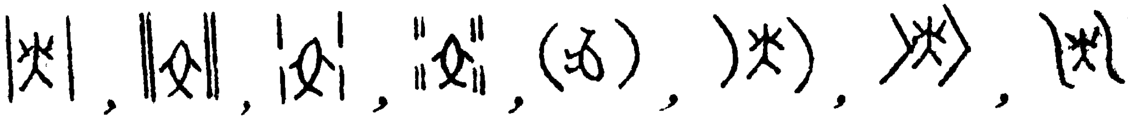
اس کے علاوہ چونکہ مہروں پر پائے جانے والے کتبات یا تو مالکوں کے نام ہوں گے یا دیوی دیوتاؤں کے اس لئے ظاہر ہے کہ اُن میں خاص قسم کے الفاظ استعمال کئے گئے ہوں گے اور زبان کا ایک محدود حصہ ہیں - دوسرے مضامین کے لئے دوسرے الفاظ اور دوسرے نشانات کی ضرورت ہوتی ہوگی - لیکن افسوس ہے کہ اس رسم خط کے طویل کتبے دستیاب نہیں ہوئے جن سے اس رسم خط کے نشانات پر پوری روشنی پڑتی -

نشانات کی قسمیں — اس لکھائی میں کام آنے والے نشانات کی زیادہ قسمیں نہیں ہیں، اُن میں سے تو بعض کے بارے میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس چیز کی تصویریں ہیں - لیکن آدمیوں، جانوروں، پرندوں، مچھلیوں، کیکڑے اور پہاڑ وغیرہ

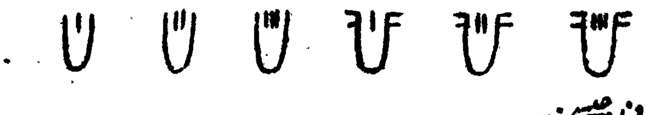
کی تصاویر کو بہ آسانی پہچانا جا سکتا ہے مثلاً :۔



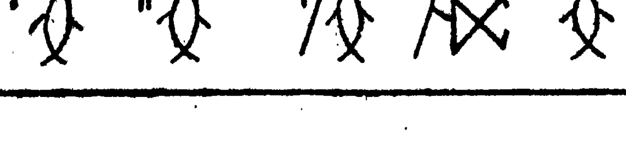
کچھ نشانات خاص قسم کی لکیروں اور قوسین میں بند کئے جاتے ہیں مثلاً :۔



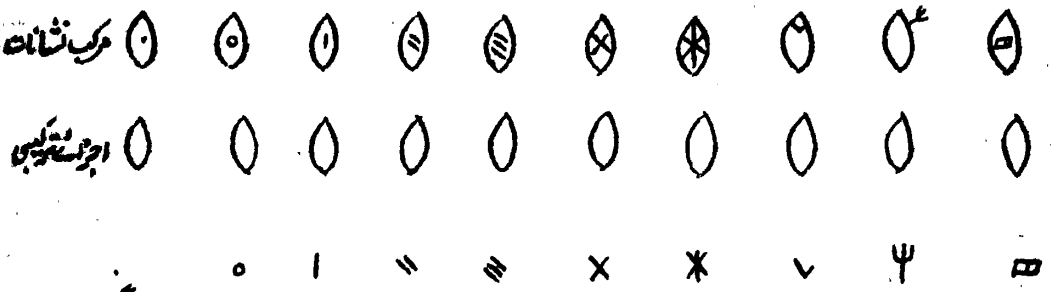
بعض نشانات کے اندر کچھ لکیروں کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے :۔



اور بعض میں باہر کی طرف جیسے :۔



ممکن ہے یہ براہمی اور دیو ناگری رسوم خط کی ماتراؤں (اعراب) کی صورتیں ہوں۔
بہت سے نشانات مرکب ہیں جن کے اجزائے ترکیبی کو علاحدہ کیا جا سکتا ہے جیسے:۔

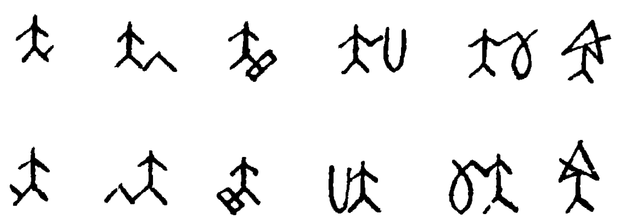


اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ان مہروں پر ایک سے لیکر بارہ تک جو لکیریں پائی جاتی ہیں انھیں گنتی کے طور پر استعمال کیا گیا ہے یا ارکان الفاظ کے طور پر:۔



اگر یہ مان لیا جائے کہ مہروں پر پائی جانے والی اس طرح کی علامتیں گنتیاں ہیں تو اس کا مطلب ہوگا کہ ان مہروں پر بعض چیزوں کا حساب ہے (جیسے اوپر کی مثال میں بارہ گائیں یا مچھلیاں) لیکن جب ہم مہروں کی خوبصورتی کا خیال کرتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ ان کے بنانے میں کتنی محنت صرف کی گئی ہوگی تو ہمیں یہ خیال ترک کرنا پڑتا ہے۔ معمولی حساب رکھنے کے لئے اتنی خوبصورت مہریں بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر سمیری رسم خط میں اکثر گنتی کی علامتوں کو "ارکان الفاظ" کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اس لئے ممکن ہے وادیٔ سندھ میں بھی ایسا ہی کیا جاتا ہو۔

لکھائی کا رُخ عام طور سے یہ رسم خط دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا تھا لیکن بعض مہروں پر بائیں سے دائیں کو لکھا ہوا پایا جاتا ہے اور بعض پر دونوں طرف سے۔ یعنی کچھ حصہ دائیں سے بائیں کو اور کچھ بائیں سے دائیں کو۔ اس طرز نگارش کو (BOUSTROPHEDON) کہتے ہیں۔ نیچے کی مثالوں کو دیکھئے:۔



مصری ہیروغلیفی رسم خط میں تصویری نشانات کو اس طرف سے پڑھا جاتا تھا جس طرف تصویروں کا رخ ہوتا تھا ممکن ہے

سلہ اسے ایک مثال سے سمجھئے اگر انگریزی لفظ (BEFORE) بمعنی قبل اس طرح (B4) لکھا جائے تو یہاں پر چار کا نشان گنتی نہ ہوگا بلکہ رکن لفظ (SYLLABLE)

وادیِ سندھ کے لوگ اس اصول پر کاربند ہوں - اس صورت میں اوپر والے نشانات کو دائیں سے بائیں کو اور نیچے والوں کو بائیں سے دائیں کو پڑھا جائے گا۔

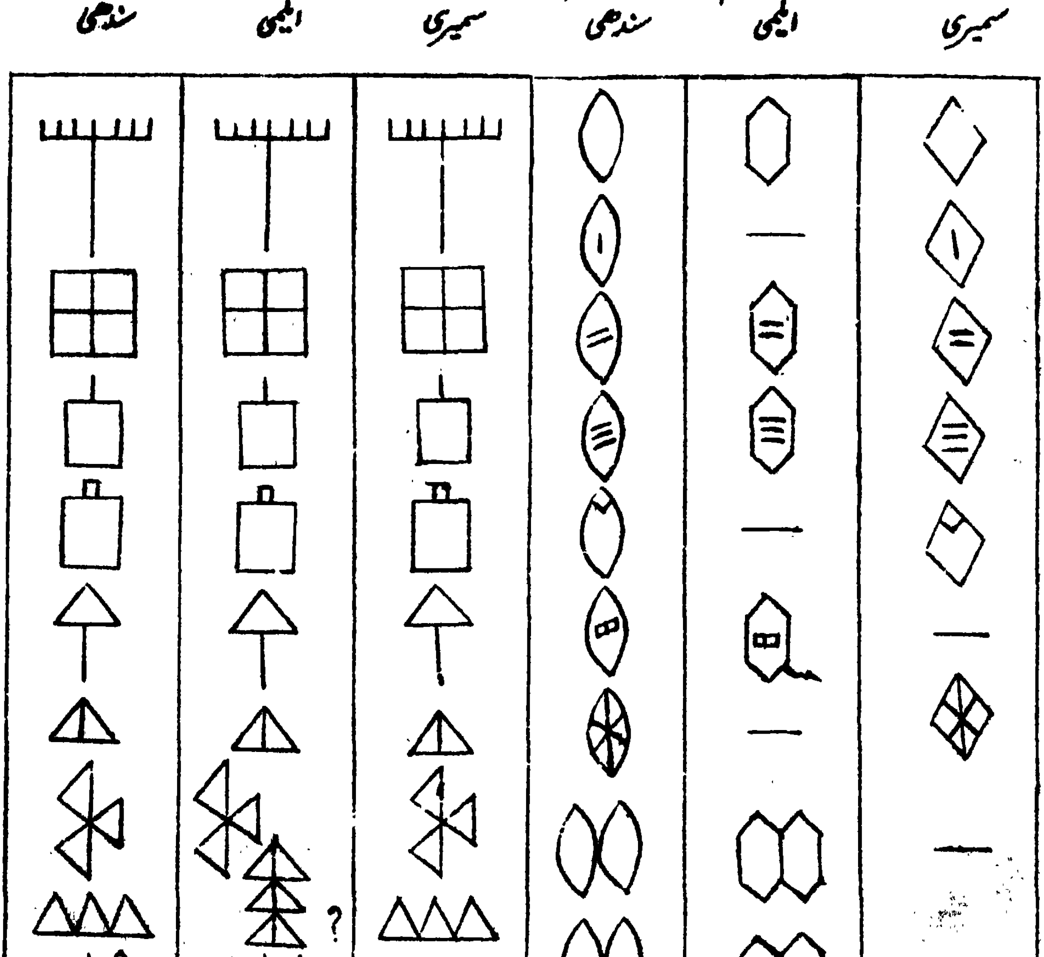
کتبات کی زبان

اگرچہ کتبات کی لکھائی کو ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا ہے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انکی زبان کا سنسکرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وادیِ سندھ کا تمدن آریوں کی آمد سے پہلے کا ہے جب تقریباً پورے شمالی ہند میں دراوڑی قومیں آباد تھیں اس لئے بالکل ممکن ہے کہ وادیِ سندھ کے لوگ دراوڑی ہوں چنانچہ آج بھی بلوچستان میں دراوڑی لوگوں کی ایک شاخ زمانۂ نامعلوم سے آباد چلی آتی ہے جو "براہوی" زبان بولتی ہے۔

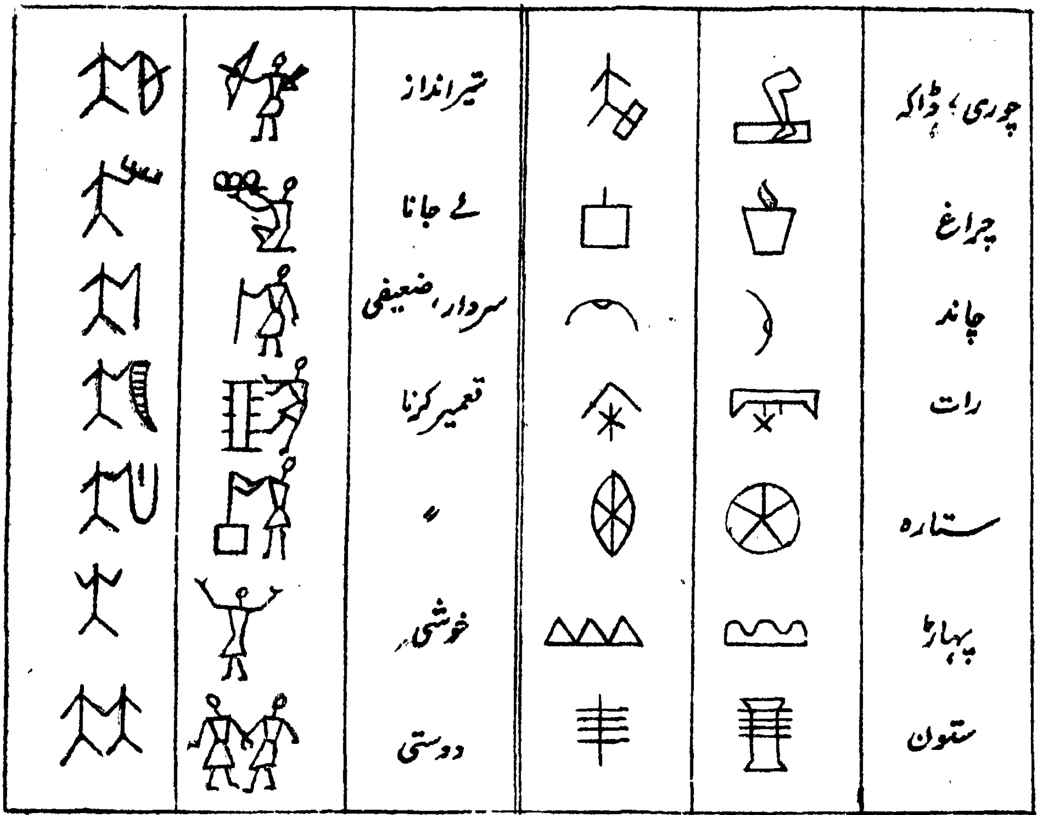
علاوہ اس کے دراوڑی زبانیں (AGGLUTINATIVE) ہیں اور سمیری لوگوں کی زبان بھی اسی زمرہ میں شامل تھی اس لئے ممکن ہے وادیِ سندھ کی زبان اور عراق کی سمیری زبان میں تعلق رہا ہو۔

دوسری لکھائیوں سے تعلق

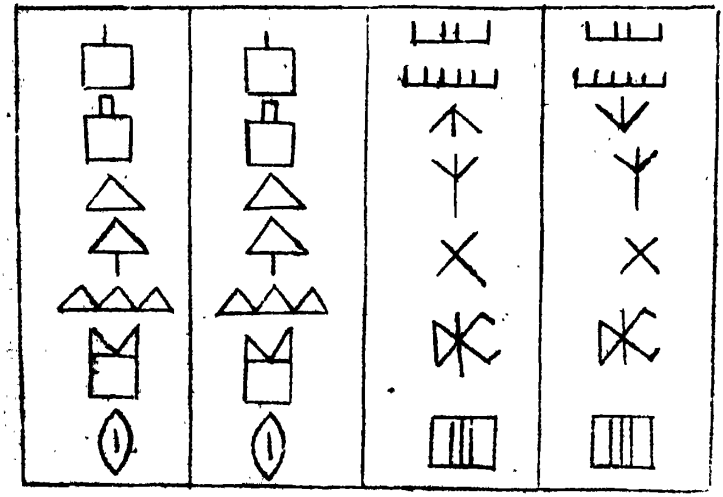
وادیِ سندھ کا رسم خط ایلم (موجودہ خوزستان) کے رسم خط سے مشابہ تھا اور سمیری رسم خط سے نسبتاً کم۔



لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس لکھائی کی انسانی تصاویر نہ تو سمیری سے ملتی ہیں اور نہ ایلمی سے۔ اُن کا بنانے کا انداز مصری ہیروغلیفی سے مشابہ ہے۔ یہ مشابہت چند اور نشانات میں بھی پائی جاتی ہے:۔



وادیِ سندھ کے رسم خط اور کریٹ کی لکھائی (مینون) میں بھی کچھ تعلق تھا۔ چنانچہ دونوں کے بعض نشانات تو بالکل ہی ملتے ہیں مثلاً:۔



اسی طرح اُس کا حطّی قوم کے رسم خط سے بھی کچھ تعلق معلوم ہوتا ہے چنانچہ ہڑپا کی مہروں پر پائے جانے والے یہ نشانات  حطی رسم خط میں بھی کام آتے تھے۔ ان لکھائیوں کے تعلق پر (B. HROZNY) نے بڑی تحقیقات کی ہے اُن کے نظریات کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

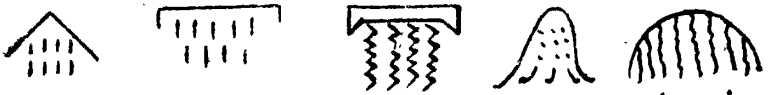
ان لکھائیوں کے باہمی تشابہ کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ ان میں سے کوئی ایک سب کا

ماخذ تھی، مثلاً سمیری یا ایلمی، یا سہران کا ماخذ ماضی بعید کی کوئی ایسی لکھائی تھی جس کا ابھی تک پتہ نہیں چلا ہے ۔ ایک وجہ اور بھی سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ یہ لکھائیاں ہمعصر تھیں اس لئے ایک دوسرے سے متاثر ہوئی تھیں ۔

سندھی رسم خط کے ماخذ کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ خود اس سے کون کون سے رسم خط اخذ کئے گئے ۔ پروفیسر لینگڈن نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہند قدیم کا براہمی رسم الخط وادیٔ سندھ کے رسم خط سے ماخوذ تھا جس کا ذکر ہم براہمی رسم خط کے سلسلہ میں کریں گے ڈاکٹر ہنٹر نے وادیِ سندھ کے نشانات کا حمیری، سبائی (جنوبی عرب کی لکھائیاں) فنیقی اور قبرصی (جزیرہ قبرص کی لکھائی) سے مقابلہ کر کے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان کا ماخذ وادیِ سندھ کا رسم خط ہے لیکن یہ نظریہ قابلِ تسلیم نہیں بدیں بناء کہ سندھ کی لکھائی حمیری اور فنیقی وغیرہ رسوم خط کے وجود میں آنے (تقریباً ۱۰۰۰ ق ۔ م) سے کم از کم ۲ ہزار سال پہلے ناپید ہوگئی تھی ۔

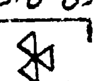
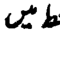
سب سے زیادہ حیرت انگیز انکشاف (G. DE HEVES Y) کا ہے اور وہ یہ کہ جزیرۂ ایسٹر کی لکھائی کے بہت سے نشانات وادیِ سندھ کے نشانات سے مشابہ ہیں ۔ جزیرۂ ایسٹر یہاں سے ہزاروں میل کے فاصلے پر جنوبی امریکہ کے پاس ہے تو کیا اس سے ہم کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وادیِ سندھ کے لوگ تجارت کے سلسلہ میں وہاں تک پہونچ گئے تھے؟ پھر یہ کہ جزیرۂ ایسٹر کا رسم خط اب سے کچھ پہلے تک لکھا جاتا تھا اور عقل یہ باور نہیں کرتی کہ وہ وادیِ سندھ کے تمدن کے زمانہ (۳۰۰۰ ق ۔ م) سے تعلق رکھتا ہے ۔ ممکن ہے یہ مشابہت اتفاقی ہو ۔

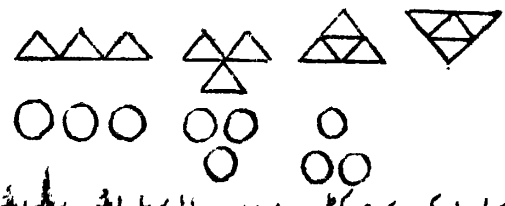
یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تصویری رسم خط کے نشانات آپس میں مشابہ ہوسکتے ہیں ۔ اگر کسی چیز کی تصویر بنائی جائے تو تصویر بنانے کے انداز میں فرق ہوسکتا ہے مگر تصویروں میں بنیادی طور پر فرق نہیں ہوسکتا ۔ مثلاً برسات کا تخیل مختلف تصویری لکھائیوں میں اس طرح ظاہر کیا جاتا ہے ۔

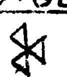


عراق ۔۔۔ سندھ ۔۔۔ مصر ۔۔۔ چین ۔۔۔ شمالی امریکہ

اب اگر ان تصاویر کو ایک دوسرے سے ماخوذ بتایا جائے تو یہ غلطی ہوگی ۔ اس لئے وادیِ سندھ کے بہت سے نشانات کی دوسری لکھائیوں کے نشانات سے مشابہت اتفاقی بھی ہوسکتی ہے ۔

پھر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ بعض محققین دو لکھائیوں کے نشانات میں ادنیٰ سی ادنیٰ مشابہت پاکر دونوں کو ایک دوسرے سے متعلق کر دیتے ہیں ۔ مثلاً ڈاکٹر ہنٹر نے وادیِ سندھ کے ان نشانات   کا مقابلہ مصری ہیروغلیفی کے پھول کے نشان  سے کیا ہے حالانکہ دوسرے نشان کے اوپری حصے سے مراد آسمان ہے جسے ہیروغلیفی رسم خط میں اس طرح  بتاتے تھے اور نیچے کے حصے سے پہاڑ جسے سمیری رسم خط میں اسی طرح سے بنایا جاتا تھا ۔



سندھی رسم خط کا نشان اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے (اوپر والی سطر بائیں سے دائیں کو) اس کی تائید ایک دوسرے نشان یعنی  سے ہوتی ہے ۔ غالباً اس سے "فلک بوس پہاڑ" مراد ہے لہٰذا یہ نشان  یا تو اسی تخیل کا حامل ہوگا اور یا پھر اس سے مراد "آسمان کے نیچے کا پہاڑ" ہے ۔ اس لئے جس نشان کو ڈاکٹر ہنٹر پھول سمجھتے ہیں وہ اصل میں پہاڑ ہے ۔

کتبات کو پڑھنے کی کوشش ۔۔۔ وادیِ سندھ کے رسم خط کو مختلف اوقات میں مختلف حضرات نے پڑھنے کی کوشش کی ہے ۔

سر الکزانڈر کننگھم، مسٹر کے۔ پی۔ جیسوال اور رائے بہادر بشن سروپ نے مہروں کی تصویری لکھائی کے نشانات کو سنسکرت نام دئے اور ان ناموں کی پہلی آوازیں لے کر کتبات کو پڑھنا چاہا۔ پڑھنے میں براہمی سے بھی مدد لی گئی (براہمی کو سندھی سے ماخوذ مان کر) لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وادیِ سندھ کا تمدن "آریوں کی آمد" سے پہلے کا ہے جبکہ ہندوستان میں سنسکرت کا رواج بھی نہ تھا تو ہمیں اُنکی لغزش پر حیرت ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے بعض ایسے عالم بھی ہیں جنھوں نے وادیِ سندھ کی تہذیب کو ویدی زمانہ کی آریہ تہذیب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

موہنجو داڑو کی دریافت کے بعد ہی پروفیسر لینگڈن اور سی۔ جے گڈ وغیرہ نے یہ بات ظاہر کردی کہ وادیِ سندھ کے رسم خط کے نشانات سمیری سے مشابہ ہیں۔ ڈاکٹر ایل۔ اے۔ وڈیل نے مہروں کو سمیری زبان اور رسم خط کی مدد سے پڑھا اور بتایا کہ وادیِ سندھ ایک سمیری نوآبادی تھی اور مہروں پر سمیری امرا کے نام پائے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کا یہ نظریہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔

بنارس ہندو یونیورسٹی کے ڈاکٹر پران ناتھ نے وادیِ سندھ کے رسم خط کو ایک "حروفی لکھائی" ثابت کرنا چاہا۔ اور اُنھوں نے اپنی دانست میں اُس کے حروفِ تہجی کا پتہ بھی لگا لیا جو اُن کے نزدیک براہمی حروف سے مشابہ ہیں (یہ حروف سے مشابہ ہیں (یہ حروف سندھی رسم خط کے مرکب نشانات کا تجزیہ کرنے سے حاصل ہوئے تھے) اُنھوں نے کچھ کتبات ان حروف کی مدد سے پڑھے تو معلوم ہوا کہ اُن پر اُن ہی ایسے دیوی دیوتاؤں کے نام نہیں جو سمیری قوم میں پائے جاتے تھے۔ گویا وادیِ سندھ کے لوگ سمیری قوم کے ہم مذہب تھے لیکن دونوں کی لکھائیوں میں کوئی تعلق نہ تھا؟ — اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ سندھی رسم خط کے بہت سے نشانات مرکب ہیں لیکن ڈاکٹر ناتھ نے بہت سے مفرد نشانات کے بھی ٹکڑے کر ڈالے ہیں۔ اور یہ تو ہم کبھی باور ہی نہیں کر سکتے کہ اُس وقت جبکہ ایلم، عراق اور مصر میں تصویری رسوم خط مستعمل تھے (جن کے نشانات سے وادیِ سندھ کے نشانات مشابہت رکھتے ہیں) وادیِ سندھ میں ایک حرفی رسم خط کا رواج تھا۔

میرے خیال میں وادیِ سندھ کے رسم خط کو پڑھنے کی سب سے معقول کوشش فادر ہیراس کی ہے۔ اُنھوں نے وادیِ سندھ کے کتبات کی زبان کو دراوڑی مان کر تامل کی مدد سے پڑھا ہے۔ اُن کے بہت سے مضامین اس موضوع پر شایع ہو چکے ہیں — بہرحال ان تمام کوششوں اور کاوشوں کو اُس وقت تک تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک یہ بات معلوم کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ ہو کہ مہروں پر جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ ہمیں ایسے کتبات کی تلاش ہے جو دو زبانوں میں ہوں (BILINGUAL INSCRIPTIONS) اور اُن میں سے ایک کی لکھائی معلوم ہو (پرانے کتبات کو پڑھنے کا یہی طریقہ ہے کہ نامعلوم کو معلوم کی مدد سے پڑھتے ہیں) امید ہے کہ ایسے کتبات کسی نہ کسی دن عراق میں ضرور ملیں گے کیونکہ وادیِ سندھ اور وادیِ دجلہ و فرات میں تجارتی تعلقات تھے۔ چنانچہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں اُر اور کش (عراق کے مدفون شہر) میں جو کھدائیاں ہوئی تھیں اُن کے دوران میں بعض ہندوستانی وضع کی مُہریں ملیں۔ علاوہ ازیں تل اُثمر میں مسٹر فرینک فرٹ کو ایک مُہر ملی۔ زمین کے ایک ایسے طبقہ میں جس کا زمانہ ۲۵۰۰ ق م متعین ہے۔ یہ مُہر بیلن نما ہے — وادیِ سندھ میں عموماً چوکور اور چپٹی مہریں مستعمل تھیں۔ لیکن موہنجو داڑو میں تین بیلن نما مُہریں بھی ملی ہیں اس لئے ممکن ہے کہ ان کا بھی استعمال کیا جاتا ہو — اس پر ہندوستانی جانوروں کی تصویریں یعنی ہاتھی، گینڈا، گھڑیال یا مچھلی کھانے والا مگر ہندوستانی طرز میں کندہ ہیں۔ پھر ڈاکٹر ہوئن کے بیان کے مطابق عراق میں ایک قبل تاریخی زمانہ کا سوتی کپڑا ملا ہے جس پر وادیِ سندھ کی مہر کے نشانات ہیں (اس سے مہروں کے استعمال پر روشنی پڑتی ہے) گڈ کا کہنا ہے کہ یہ مہریں موہنجو داڑو اور ہڑپا کے سوا کسی دوسرے شہر جیسے چنہو داڑو (موہنجو داڑو کے جنوب میں) بنائی گئی تھیں۔

محمد اسحاق صدیقی

(باقی)

صحرا کا موتی

صبح کے آثار نمودار ہو چلے تھے، یعنی کائنات گریباں کھولکر آہستہ آہستہ اپنا سینۂ عُریاں کر رہی تھی۔ دریائے نیل کی موجیں ہلکی ہلکی نسیم کے ساتھ (جسے ندیمِ صباح کہہ سکتے ہیں) مضطرب تھیں، یعنی فطرت چادرِ آب کو جنبش دے دیکر مصروف تماشا تھی۔ آسمان کی محراب یہ معلوم ہوتا تھا کہ آج اس کا خم بہت دور بلندی سے شروع ہوا ہے اور زریں ریگستان کے اُفق سے لیکر نیلی آسمان کے عمق تک، اُن سپید بادلوں کے سوا کوئی چیز حایل دتھی، جو سوڈان اور بالائی حصّۂ مصر کی فضا میں ہمیشہ اضافۂ حُسن کرتے رہتے ہیں۔ یہ تھی صبح اور ایسی صبح جس کو دیکھ کر ایک شخص بے اختیار کہہ سکتا تھا کہ:۔

—— "یہ دُنیا واقعی رہنے کے قابل ہے"—— آفتاب کی گرم و طلائی شعاعیں فضا کو زرکار بنا رہی تھیں اور سطحِ آب کو رنگین۔ مختلف قسم کے طائر سیاہ و سپید، سبز و سُرخ، ارغوانی و قرمزی اپنے بازوؤں کے پورے اضطراب و طپش کے ساتھ ساحل پر آ آکر گر رہے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ کوئی سبکدست نقاش صفحۂ کاغذ پر جلدی جلدی پھول بنا کر چھوڑتا جاتا ہے۔ عین یہی وقت تھا کہ دریا میں ایک کشتی نمودار ہوئی اور موجوں کو قطع کرتی ہوئی ساحل بحر کی طرف بڑھنے لگی۔ ایک سپید طائر نے اپنی گردن اُٹھا کر اک آواز دی اور قدرت کی اس اچھوتی خلوت گاہ میں صنعت انسانی کی مداخلت پر اظہار نفرت کرتا ہوا اُڑ گیا۔ دوسرے طائروں نے بھی یہ آواز سُنی اور کشتی کو دیکھا، لیکن اس سے قبل کہ وہ کوئی فیصلہ اپنے رہنے یا اُڑ جانے کا کریں، کشتی ساحل تک آگئی۔ اور ایک سوڈانی لڑکے نے جو اپنے حُسن کے لحاظ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے آبنوس میں اڈونس کا مجسمہ طیّار کیا ہے اپنے خوبصورت ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کشتی نشین سے کہا:۔

"وہ ہے اُمدرم"۔

اس کشتی پر ایک نوجوان ترک تھا جو سیاحت کی غرض سے یہ سفر کر رہا تھا، اس کا لباس بالکل مغربی وضع کا تھا، اور ریگستان کی دھوپ سے چہرے کو محفوظ رکھنے کے لئے اس قسم کی ٹوپی سر پہ رکھے ہوئے تھا جسے ہم انگریزی ٹوپی کہہ سکتے ہیں اُمدرم، ایک ریگستانی گاؤں تھا۔ جس میں سوڈانیوں کی غریب و مفلس آبادی اپنے چھوٹے چھوٹے پست مکانات میں زندگی بسر کرتی تھی، نہ یہاں کوئی کھجور کا درخت تھا نہ چشمہ، نہ کوئی باغ اور تفریح گاہ۔ لیکن پھر بھی وہ صحرائی دلکشی جو ریگستان مصر کے ہر ہر ذرہ میں پائی جاتی تھی، اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی، اور اسی کا ذوق سیاحوں کو اس طرف کھینچ لاتا تھا اور یہی وہ مقام ہے جہاں مہدی سوڈانی کا مقبرہ بھی تھا۔

لڑکے نے کہا:۔ "مجھے اجازت دیجئے کیونکہ مجھے پھر واپس جانا اور دوسرے لوگوں کو لانا ہے"۔

خالد:۔ "لیکن میرا کیمرہ کیونکر جائے گا اور میں وہاں تک کیسے پہونچ سکوں گا۔ میں تو راستہ سے بالکل ناواقف ہوں"۔

لڑکے نے تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر کچھ سوچا اور پھر بولا "اچھا سامان مجھے دیجئے میں اس کو اپنے گھر کی طرف لے چلوں گا۔ اور وہاں پہونچ کر اپنی بہن کو آپ کے ساتھ کر دوں گا"۔

یہ سُن کر سیاح نے کسی قدر تامل کیا۔ گویا اس نے سوچا کہ کیا وہی کرنا چاہئے جو لڑکا کہتا ہے اور پھر کسی خیال سے مسرور ہو کر بولا "اچھا مجھے اپنے گھر لے چلو" اور دل میں کہنے لگا اگر وہ بہن اسی بھائی کی ہے تو میری نقاشی و مصوری کا

بہترین موضوع ہوسکتی ہے۔

(۲)

مرآ اپنے جھونپڑے کے سامنے دروازہ پر کھڑی ہوئی دریا کی طرف دیکھ رہی تھی اور آفتاب کی شعاع سے جو براہ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، تابشِ حُسن کچھ اور نمایاں ہوتی جاتی تھی۔ اس کی عمر سترہ سال کی تھی اور وہ شباب جو اس عمر کی مشرقی لڑکیوں میں اپنے پورے عروج پر پہونچ جاتا ہے اس کے ہر ہر عضو سے ٹپکا پڑتا تھا، اس کا چھریرا اور نازک جسم اس قدر سڈول اور خوبصورت جسم اس قدر سڈول اور خوبصورت تھا کہ اگر کوئی بُت ساز چاہتا تو اس سے حُسن تناسب کا استعارہ کرکے کسی مجسّمہ میں جان ڈال سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ کشیدہ قامتی صحرائی لڑکیوں کا عام حُسن ہے لیکن مرآ کے جسم میں کچھ اور بھی ایسی بات تھی جس نے اس کو اسی طرح ممتاز کردیا تھا جیسے ہرنوں کے گلہ میں کوئی سب سے زیادہ وحشی ہرنی، یا سانپوں میں سب سے زیادہ نازک و لچیلی ناگن۔ اس کی پیشانی بلند تھی اور ابرو تلوار کی نوک تک پوری طور سے خمیدہ۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں وہ وحشت تھی جو بڑھ کر سحر ہوسکتی ہے اور ان میں وہ مستی تھی جسے عطرِ شباب سے تعبیر کرسکتے ہیں اس کی لانبی لانبی گھنی پلکیں جو پوری طرح جدا ہوجانے کے بعد بھی ایک دوسری سے ملی ہی رہتی تھیں جب بڑی بڑی آنکھوں سے اپنے نقاب کو ہٹا لیتی تھیں تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک موج مے تھی جو سر سے گزر گئی، ایک پھانس تھی جو دل میں چُبھ گئی یا ایک سیلاب افسوں تھا جو دیکھنے والے کے ہوش و حواس کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ خوبصورت چمکیلے بال جو بے شمار چھلّوں کی صورت میں منتشر تھے، شانہ و دوش پر پھیلے ہوئے تھے۔ اُس کی گردن وہ حسین گردن جو تمام آرائش و زیبائش سے بے نیاز ایک مستقل فوارۂ حُسن تھی اس وقت عریاں تھی، اور چھوٹے چھوٹے سفید دانت، معلوم ہوتا تھا کہ فطرت نے فرطِ مسرّت سے اُس کے منہ میں موتی بھر دئے ہیں۔ غرض یہ کہ مرآ قدرت کی بہترین صناعی اور فطرت کا اختراعِ فائقہ تھی۔ لیکن باوجود اس کے وہ یہ نہ جانتی تھی کہ حُسن اور حُسن کا مفہوم کیا ہے۔ وہ ایک پھول تھی، وہ پھول جو جنگل کی کسی جھاڑی میں کھلتا ہے، وہ ایک کنول تھی، ایسا کنول جو سطحِ آب پر تنہا ہچکولے کھاتا ہے۔ گاؤں کی اور عورتیں آئینہ دیکھ دیکھ کر سنوارا کرتی تھیں، لیکن وہ کبھی اس طرف متوجہ بھی نہ ہوتی تھی۔ اس کی ہمجولی لڑکیاں بلوری موتیوں کا ہار پہنکر گھنٹوں یہ دیکھتیں کہ وہ ہر سانس کے ساتھ اُن کے سینہ پر کس طرح جنبش کھاتا ہے، لیکن مرآ کی حسین گردن، اس مصنوعی آرائش سے مستغنی تھی۔ وہ اس سادگی کے عالم میں بھی اک قیامت تھی عریاں، ایک فتنہ تھی بے نقاب اور ایک نویدِ عشق تھی، بالکل کھلا ہوا۔

مرآ اپنے حُسن سے بے خبر، مرآ ایک مجسّمہ تھی عصمت و عفت کا، حیا و شرافت کا، ایک تمثال تھی خودداری و غیرت کی۔ اس میں حُسن تھا لیکن بے پرواہ، اس میں شباب تھا لیکن پُر استغنا۔ وہ غریب تھی لیکن دولتِ حُسن سے مالا مال، وہ وحشی تھی مگر اس قسم کی جو لاکھوں مہذب و شائستہ دلوں کو تباہ کردے سکتی تھی

اس کا بہترین مشغلہ یہ تھا کہ رات کو اپنے جھونپڑے سے نکلتی اور ایک جگہ بیٹھ کر صحرا کی سنسان تاریکی میں ستاروں کو دیکھتی اور اس سے گھبرا جاتی تو اُس دف کی آواز سننے لگتی جو گاؤں میں دور کسی جگہ بجا کرتا تھا۔ جب کبھی مزدوری کرتی تو سب سے پہلے اُجرت میں جو کچھ ملجاتا اس سے گھر کی ضروریات فراہم کرنے میں اپنی ماں کی مدد کرتی اور اس سے بھی بچ رہتا تو پھر اونٹ کا چارہ خریدتی۔ آج بھی وہ اپنے دروازہ پر اسی ضرورت سے کھڑی تھی اور اک خاموش حالتِ مسرت میں دریا کی روانی کو دیکھ رہی تھی کہ اس کا بھائی آتا ہوا نظر آیا۔ مسرت اُس کے چہرے پر دوڑ گئی، اس کے رنگ میں خون

کی وہ سُرخی کچھ اور زیادہ نظر آنے لگی جس پر اس کے شباب کی رنگینیاں قایم تھیں - اُس نے بھائی کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھا - مگر اسی طرح معصومانہ انداز سے کھڑی رہی - بھائی نے کہا :- " مرلا بکس لے جا اور انھیں کریری تک پہونچا دے، مجھے جلدی واپس جانا ہے " مرلا یہ سُن کر جھونپڑے کے اندر گئی اور فوراً واپس آکر ترک نوجوان سے مخاطب ہوکر بولی :- " چلئے میری ماں نے اجازت دیدی ہے "

اس وقت اُس کی آنکھوں میں اک خاص کیفیت پیدا تھی، چہرے پر ایک رنگ تھا اور رنگ میں تبسّم، اس کی آمادگی میں ایک سرور تھا اور سرور میں کچھ بے خبری، اُس نے تصویر کشی کا بکس اُٹھانا چاہا، لیکن خالد نے اُسے خود اُٹھالیا اور مرلا کو صرف تپائی دیدی -

آفتاب بلند ہوچکا تھا، لوگ کھیتوں کے اندر اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور مرلا خاموشی کے ساتھ خالد کے پہلو میں سایہ کی طرح چلی جا رہی تھی - جب گاؤں کی حد سے دونوں دور نکل گئے تو خالد جو ریگستان میں اس طرح پیدل چلنے کا عادی نہ تھا، اپنے اندر اضمحلال محسوس کرنے لگا - اُس کا جوتہ ریت میں دھنس دھنس جاتا تھا اس لئے ایک طرف تو اسکے لئے قدم اُٹھانا مشکل ہوگیا اور دوسری طرف دھوپ کی شدت نے اُس کے تمام کپڑے پسینہ میں تر کردئے - مرلا، خالد کی اس تکلیف کو دیکھ رہی تھی لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ تکلیف کیوں ہے وہ تکلیف جس کے اسباب بظاہر موجود تھے، اُسکے نزدیک ایسی نہ تھی جس سے ایک شخص مضمحل ہوسکتا، وہ سوچ رہی تھی اور چاہتی تھی کہ اپنی فراست سے تکلیف کی نوعیت معلوم کرلے - اس غرض سے جب اُس نے خالد کی طرف دیکھا تو اس کی نظر خالد کی کلائی پر پڑی جو گرمی کی شدت سے سُرخ ہوگئی - مرلا نے سمجھا کہ شاید خون نکل آیا ہے اور تکلیف و اضمحلال کا سبب یہی ہے - اس لئے وہ فوراً اپنے سپید ململ کے نقاب سے ایک دھجی پھاڑ کر کلائی میں باندھ دینے کے لئے آمادہ ہوگئی اور یہ کہتے ہوئے کہ " اسے کلائی میں باندھ لیجئے ورنہ آپ کو اور زیادہ تکلیف ہوگی " خود ہی لپیٹ بھی دی -

خالد نے کہا " تم نے اپنا نقاب میرے لئے کیوں خراب کردیا " مرلا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور اس حصۂ صحرا کی گزشتہ تاریخ بیان کرنے لگی - خالد سنتا جا رہا تھا، اور خاموش تھا - جب کچھ اور آگے بڑھ گیا تو اُسے ایک سفید چٹان ملی - اب تو اس کے قدم دفعتہً رُک گئے اور وہ یہ کہکر بیٹھ گیا " مرلا میں بہت تھک گیا ہوں کچھ دیر بیٹھ جاؤ " مرلا نے فوراً تعمیل حکم کی اور اُس کے سامنے خاموش بیٹھ گئی، اُس کے رخسار کا ایک حصہ ہتھیلی پر تھا اور ریت پر اپنی نازک اُنگلیوں سے کچھ نشانات بنا رہی تھی - پندرہ منٹ اسی حال میں گزر گئے تو خالد بولا " مرلا، تم اجازت دو گی کہ میں تمھاری تصویر کھینچ لوں؟"

مرلا :- یہ تو ہمارے دستور و رواج کے خلاف ہے -

خالد :- لیکن کیا میری خاطر سے بھی تمھیں منظور نہیں ؟

مرلا :- بے شک مجھے آپ کی خاطر اپنے دستور و رواج سے زیادہ عزیز ہے -

خالد نے تصویر لے لی اور جب اطمینان سے بیٹھا تو کہنے لگا :-

" مرلا تمھیں معلوم ہے تم کس قدر حسین ہو "

مرلا :- حسین ! وہ اونٹ جو آپ نے بازار میں بیٹھا ہوا دیکھا تھا اور مہدی کا وہ سپید مقبرہ بے شک حسین ہے -

خالد :- مگر تم اس اونٹ اور مقبرہ دونوں سے زیادہ حسین ہو، ور ہاں میرے متعلق تمھارا کیا خیال ہے -

مرلا :- آپ تو اس آفتاب کی طرح ہیں جو صبح کو اس میدان میں نکلتا ہے یا اس چاند کے مانند جو شام کو نیلگوں آسمان پر نظر آتا ہے -

یہ کہنے کے بعد مرلا خاموش ہوگئی اور اُس کے کُرتے کے نیچے محسوس ہونے لگا کہ سانس معمول سے زیادہ سریع ہوگئی ہے، اس کی آنکھوں میں کچھ گرمی پیدا ہونے لگی اور آواز میں رعشہ - دل میں ایک جوش تھا جس سے وہ شاخ بید کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی - یہ دیکھ کر خالد بھی خاموش ہوگیا اور اس کے رنگ کی سُرخی سے ظاہر ہونے لگا کہ اب وہ کچھ بولنا نہیں چاہتی -

(۳)

آج اس گاؤں میں بازار بھی تھا اور اس لئے ایک شور و ہنگامہ جو ایسے اجتماع کی خصوصیت ہے، برپا تھا۔ آدمیوں کا ہجوم تھا اور قرب و جوار کے لوگ اپنی ضروریات کی چیزیں خریدنے کے لئے جمع ہو رہے تھے - اسی میدان کے ایک کونے میں ایک ارغوانی قالین بچھا ہوا تھا، آس پاس اونٹ کھڑے تھے اور قالین پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جو اپنی وضع سے خوشحال سوداگر معلوم ہوتا تھا- اس کا لباس بھی اچھا تھا اور اونٹ بھی مضبوط و توانا- اس کے سامنے ایک غریب و ناتواں ضعیف آدمی بھی بیٹھا ہوا تھا- سوداگر بولا :-

"یہ صحیح ہے کہ تمھاری مرلا، صحرا کا موتی ہے، لیکن تم یہ خیال کرو کہ ایک نوجوان اونٹ سے تم روزانہ کتنا کما سکتے ہو اور چند دن میں کیسے دولتمند بن جاؤ گے ؟"

سننے والے کی سیاہ آنکھیں یہ الفاظ سُن کر چمکنے لگیں، وہ کچھ سوچ کر بولا :-

"یہ تو صحیح ہے - لیکن میری لڑکی تو اتنا نہیں کھاتی جتنا یہ اونٹ کھائے گا اور پھر لوگوں کو روزانہ اونٹ کی ضرورت بھی نہیں ہوتی -

سوداگر :-" چونکہ میں تمھیں برہم نہیں کرنا چاہتا اس لئے میں تم کو اونٹ کے ساتھ ایک چاقو بھی دوں گا اور یہ قالین بھی"۔

یہ کہکر سوداگر نے چاقو اپنی کمر سے نکالا اور ضعیف سوڈانی کے سامنے رکھدیا اس نے چاقو کو دیکھا اور کہا :-

" اگرچہ یہ چاقو معمولی ہے لیکن خیر میں معاملہ کرلوں گا - جب آپ واپس جائیں گے تو لڑکی آپ کے گھر پہونچا دیجائے گی"۔

سوداگر :-" میں ابھی گھر تو واپس نہ جاؤں گا کیونکہ مجھے اور سفر کرنا ہے لیکن جس دن چاند پورا ہوگا اس دن پھر یہاں آؤں گا اور مرلا کو ساتھ لے جاؤں گا - دیکھو کرتو اب مجھے مایوس نہ کرنا" کرتو نے کہا،-" نہیں اب ایسا نہیں ہوسکتا"۔ اس نے اونٹ کی نکیل ہاتھ میں لی، چاقو کمر میں رکھا اور قالین بغل میں دباکر گھر روانہ ہوگیا۔

آسمان کا رنگ قرمزی ہوچلا تھا اور دریائے نیل کی لہریں طلائی سے ارغوانی، کہ صحرا کی طرف سے خالد اور مرلا ساحل پر پھر واپس آئے تاکہ ایک دوسرے سے جدا ہوں -

خالد :- مرلا اب تم مجھے اجازت دو - میں اپنا سفر پھر شروع کروں گا -

مرلا نے اپنی مسترحم نگاہیں اُٹھائیں اور کہا " آفتاب سیاہ چٹانوں کو روز روشن کر دیتا ہے لیکن پھر غروب ہوکر ان کا سارا رنگ، ساری مسرت چھین لیتا ہے پھر کیا اس وقت کوئی پتھر یہ توقع کرسکتا ہے کہ وہ سورج کو غروب ہونے سے روک لیگا اور اپنی روشنی کو باقی رکھ سکے گا ؟ آپ جائیے"

خالد :- لیکن اگر میں نہ جاؤں اور چاہوں کہ کوئی ایک چاندنی رات اس وسیع خلوت میں بسر کروں اس طرح کہ میں ہوں اور تم، تو تم سمجھتی ہو کہ میں پھر بھی زندہ رہ سکوں گا ؟

مرلا :- میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کیا کہتے ہیں - آپ زندہ نہ رہیں گے کیوں ؟

خالد :- اگر کسی پھول کو یہ خبر ہو کہ اس کی نکہت ایک دماغ کو معطر کرسکتی ہے، اس کی نزاکت کے تخیل سے ایک قلب

پاش پاش ہوسکتا ہے، اس کے رنگ میں وہ اثراتِ حُسن پنہاں ہیں، جن سے بہار کی ساری دلربائیاں قائم ہیں تو میں تم کو بھی بتادوں کہ تمھاری اِک نگاہ، ایک مستغنی نظر، میرے ساتھ وہ کچھ کرسکتی ہے جو تیرو خنجر سینہ کے ساتھ کرتے ہیں میرے بدن میں لرزہ ہے، میری روح میں ارتعاش ۔ میرے جسم میں کپکپی ہے، میرے اعضاء میں تھرتھراہٹ ۔ لیکن تمھیں کیا خبر کہ یہ سب کیوں ہے اور کس لئے "

مرلا :۔ لیکن اگر میری نگاہوں سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے تو میں اِن کو ہٹا لوں گی میں آپ کے پاس تنہائی میں کوئی چاندنی رات نہ بسر کروں گی ۔ اس دریا کے کنارے جب شام ہوجائے گی، میں کبھی آپ کے پاس نہ بیٹھی رہونگی جب آپ کی روح میں لرزش محسوس ہونے لگے گی، جب میں دیکھوں گی کہ ساحل پر اب کوئی نہیں رہا اور سارے کشتی بان اپنے اپنے گھر چلے گئے تو میں خود بھی چلی جاؤں گی ۔

(۴)

راستہ پرسکون تھا ۔ چاند پورا چاند افق سے نکل چکا تھا، خالد، مرلا کے ساتھ دریائے نیل کی سیر کر رہا تھا اور سوچتا جاتا تھا کہ اس کی زندگی جو اب سے پہلے بالکل آزاد و خود مختار تھی آج پابند و گرفتار ہے اور دُنیا کے تمام تعلقات سے گھری ہوئی ۔ وہ اپنے دل سے کہہ رہا تھا ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرلا انسان ہے یا دیوی، اور میں اس کا فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں ۔ مرلا بھی خاموش تھی شاید اس کے دل میں بھی ایسے ہی خیالات کا مدوجزر ہو رہا تھا ۔ دونوں کبھی کبھی ایک دوسرے کی صورت دیکھتے اور پھر حجاب و انفعال کی پوری حیرت سامانیوں کے ساتھ اپنی نگاہیں نیچی کر لیتے ۔ فطرت کا یہ دلفریب منظر، ساحل کی یہ اچھوتی فضا، گویا ان دونوں کی جولان گاہ خیال تھی جس میں یہ دونوں اپنی اپنی جگہ تخیل کی اُلجھنوں میں مبتلا تھے ۔ وہ اس آغاز کو دیکھ کر انجام پر کوئی حکم لگانا چاہتے تھے وہ اِس ابتدا کے سہارے سے انتہا کا کوئی راز دریافت کرلینے میں مصروف تھے ۔ لیکن باوجود اس کے اُن کا ہر خیال تصادمِ نظر کے بعد روح میں بالیدگی پیدا کرنے کے بجائے اضمحلال پیدا کر دیتا تھا ۔ ان میں سے ہر ایک اپنے وارداتِ دل بیان کرنے سے عاجز تھا ۔ البتہ آنسوؤں سے نکل پڑنے والا الم کبھی کبھی ان کی ساری کیفیت ظاہر کر دیتا تھا وہ کبھی مسکرا بھی دیتے، لیکن یہ مسکرانا بھی تردد سے خالی نہ ہوتا تھا ۔ جب بہت دیر اسی حال میں گزر گئی تو مرلا نے کہا " آج تو آپ بہت افسردہ و مضمحل نظر آتے ہیں "

خالد :۔ ہاں، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میری محبت مجھے کہاں لئے جا رہی ہے ۔

مرلا :۔ آپ اس کی فکر ناحق کرتے ہیں قسمت پر چھوڑ دیجئے وہ مستقبل کے ہر لمحہ کی نسبت اپنا فیصلہ مستحکم رکھتی ہے ۔

خالد :۔ مگر قسمت پر چھوڑ دینا بھی تو آسان نہیں ۔

مرلا :۔ تو زیادہ آسان یہ ہے کہ آپ واپسی کا عزم کرلیجئے وطن پہونچ کر یہ خیالات رفع ہوسکیں گے ۔

خالد :۔ اور تم ؟

مرلا :۔ مجھے یہیں کہیں دفن ہوجانے دیجئے ۔

خالد :۔ آخر تمھیں میرے ساتھ چلنے میں کیا عذر ہے ۔

مرلا :۔ یہ ناممکن ہے، وہ ذرے جو رات بھر چاند کی ضیاء میں جگمگایا کرتے ہیں صبح کو اس کا ساتھ نہیں دے سکتے

خالد :۔ تو میں چلا جاؤں، اس پر تم راضی ہو ؟

مرلا :۔ ہاں، راضی ہوں ۔ اس لئے کہ آپ کے چلے جانے کے بعد موت مجھے کچھ کم سکون نہ پہونچائے گی، خاص کر

اس حالت میں کہ آپ کی محبت میری روح سے جدا نہیں ہوسکتی۔

رات کا حصہ زیادہ گزر گیا تھا اور خالد کو دریا عبور کرکے خرطوم اپنے جائے قیام پر پہونچنا تھا، اس لئے وہ پھر ملنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگیا۔ مرلا کچھ دیر تک کھڑی رہی اور جب خالد نظروں سے اوجھل ہوگیا تو اُس نے بھی اپنے گھر جانے کا قصد کیا۔ وہ جانے ہی والی تھی کہ اُس نے دیکھا کہ خالد اپنا کوٹ بھول گیا ہے۔ اس نے چاہا کہ دوڑکر دیدے لیکن پھر یہ خیال کرکے کہ کل دیدوں گی اپنے بازو پر ڈال لیا۔ اب رات زیادہ جاچکی تھی۔ اسلئے وہ جلدی جلدی گھر کی طرف آئی۔ اس کا جھونپڑا روشن تھا اور اندر سے کچھ آوازیں آرہی تھیں۔

تم مجھ سے ایک اونٹ، چاقو اور قالین لے چکے ہو، لیکن اب تک مرلا کو تم نے میرے پاس نہیں بھیجا۔ اور بھیجتے کیسے۔ شاید تم کو خود خبر نہیں کہ مرلا کہاں ہے۔ وہ ایک اجنبی کے ساتھ نیل کے کنارے باتوں میں مصروف ہے اور اب مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ تم تو میرا چاقو اور قالین میرے حوالے کرو، اونٹ میں خود کھول لوں گا۔

کرقو نے یہ سنتے ہی ایک چیخ ماری اور چاقو نکال کر فوراً ایک پتھر پر تیز کرنے لگا۔

مرلا کا خون خشک ہوگیا، اس کے قلب کی حرکت بند ہونے لگی اس وجہ سے نہیں کہ وہ بدنام اور رسوا ہوئی بلکہ اس لئے کہ خالد اگر راستہ میں مل گیا تو وہ ضرور ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس لئے وہ فوراً جھونپڑے کے دوسرے حصہ میں گئی جہاں اُس کا بھائی سو رہا تھا اور اُسے جگاکر بولی "تو ابھی دریا کی طرف جا راستہ میں تجھے ایک اجنبی سیاح ملے گا اس سے کہدینا کہ اب اِدھر وہ کبھی نہ آئے کیونکہ لوگ اُسے ہلاک کردینا چاہتے ہیں"۔

بھائی کو روانہ کرکے وہ دروازے سے باہر نکلی ہی تھی کہ اس کا باپ بھی دوسرے دروازے سے نکلا اور اندھیرے میں دیکھنے لگا کہ اُسے کس طرف جانا چاہئے۔ مرلا نے سمجھا کہ غالباً خالد کو اطلاع ہونے سے قبل اس کا باپ ساحل تک پہونچ جائے گا۔ اس لئے اُسی لمحہ میں کچھ سوچکر اس نے خالد کے کوٹ کو اپنے جسم پر ڈال لیا اور قصداً جھونپڑے کی پشت سے جاکر ادھر کھڑی ہوگئی جدھر سے اس کا باپ گزرتا۔ وہ ابھی وہاں پہونچی ہی تھی کہ اس کا باپ ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو لئے ہوئے اس طرف سے گزرا اور یہ اس کو دیکھ کر اس طرح بھاگی کہ اُسے یقین ہوجائے وہ اجنبی یہی ہے، جس کی اُسے تلاش ہے۔ چنانچہ کرقو نے کوٹ کو دیکھ کر یہی یقین کیا اور اُس کے پیچھے دوڑا۔ مرلا نے بھی ایک ناکمل سعی اپنی جان بچانے میں کی۔ کبھی اِدھر بھاگی، کبھی اُدھر مڑگئی، لیکن آخر کو کرقو نے اُسے پالیا۔ اور عین اُس وقت جبکہ وہ آگے کو بھاگ رہی تھی اس نے چاقو کی ایک ایسی ضرب پہونچائی کہ دستہ تک شانہ کے نیچے تیر گیا اور مرلا ایک کراہ کے ساتھ مُنھ کے بل گر پڑی۔

کرقو اب مطمئن تھا۔ اس لئے کہ اُس کا انتقام پورا ہوچکا تھا اور اسی لئے اُس نے اس سے قبل کہ اجنبی کی صورت دیکھنے کی کوشش کرے اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کیا تاکہ تنفس ٹھیک ہوجائے۔ مگر جب اس نے اپنا چاقو نکالنے کے لئے لاش کو اپنی طرف کھینچا اور اُس کا چہرہ چاندنی میں دیکھا تو اُسے معلوم ہوا کہ یہ تو "صحرا کا موتی ہے"

"ق"

موجودہ ہندی اور اُس کی نئی اصطلاحات

مجھے چونکہ زبانوں کے پیدا ہونے اور اُن کی ترقی یا زوال کے اسباب معلوم کرنے سے دلچسپی ہے، اس لئے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندی کے بہی خواہ جو اس زبان کو ہر قیمت پر جلد از جلد رائج کرنا چاہتے ہیں، سخت غلطی پر ہیں، اور لسانیات کے علم سے قطعًا بے بہرہ ہیں، احکام یا جذبات کے اثر سے زبانیں پیدا نہیں ہوتیں تاریخ کی تدریجی رفتار زبانیں بناتی اور مٹاتی ہے۔

ہندی زبان میں علمی اصطلاحات تو درکنار، متمدن زندگی کی معمولی چیزوں کے نام تک نہیں ہیں، ہندی ڈکشنری پوری پڑھ ڈالیئے مشکل سے آپ کو چند نام کھانے پینے کی چیزوں کے، لباس کے یا مکان وغیرہ کے حصوں کے، نظر آئیں گے، اس قسم کے جو الفاظ بھی ہیں وہ یا تو اُردو، فارسی یا انگریزی سے لئے گئے ہیں، لہٰذا ایسی محدود زبان کے متعلق یہ کوشش نہیں کرنی چاہیئے کہ مشکل اصطلاحیں بنا بنا کر اُس کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دیدیا جائے ایک بڑی غلطی یہ کی جارہی ہے کہ انگریزی اور اُردو کے آسان الفاظ اور اصطلاحات کو خارج کرکے ان کی جگہ مشکل الفاظ گھڑے جارہے ہیں، یہاں تک کہ ریل، انجن، سائکل، گواہ، عدالت جیسے عام فہم الفاظ کا بھی ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

اس قسم کی کوشش ہندی کو فایدہ پہونچانے کے بجائے نقصان پہونچا رہی ہے، ایک طرف تو ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قومی زبان ہندوستان بھر کی عام زبان بن جائے اور دوسری طرف سنسکرت کے مشکل اور مردہ الفاظ کو زبان میں شامل کرکے اُس کو مشکل سے مشکل تر بنانے میں لگے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جنوبی ہند میں روز بروز ہندی کی مخالفت بڑھ رہی ہے۔

ذیل میں آج کل کی اصطلاحی ہندی میں ایک فرضی سفر کے حالات درج کرتا ہوں، اور آپ ہی سے جو اس ملک کے باشندے ہیں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ اس مضمون کو اور اس کے الفاظ کو کہاں تک سمجھ سکے، اس کے تمام تر اصطلاحی الفاظ آئین ہند کے ہندی ترجمہ سے، اور ناگپور کی مطبوعہ "پرشاسن شبد کوش"، مولفہ ڈاکٹر رگھوویر پی، ایچ ڈی، ڈی لٹ، و جی ایس گپتا اسپیکر لیجسلیٹو اسمبلی مدھیہ پردیش اور دوسری جدید اور مستند ڈکشنریوں سے لئے گئے ہیں۔

محمود علی خاں

ایک فرضی سفرنامہ

آج ۱۴ اگست ہے کل بھارت کے سوتنتر (स्वतत्र) ہونے کا شبھ دوس (शुभ दिवस) ہے، آج پرتیک بھارتی (प्रतियेक भारतीय) کا ہردے (हृदय) ہرشت (हर्षित)

آج ۱۴ اگست ہے، کل بھارت کے آزاد ہونے کا مبارک دن ہے، آج ہر ایک ہندوستانی کا دل خوش ہے۔

اَتہ (अत:) یہ کیسے سمبھو (संभव) ہے کہ میں اپنے گھر میں چپ چاپ بیٹھا رہوں، میں بھی تو اپنے راشٹر (राष्ट्र) کا شبھ چنتک تتھا راج بھکت (शुभचिंतक तथा राजभक्त) ہوں میرے ہردے میں ایسا وچار (विचार) آتے ہی میں اُٹھ کھڑا ہوا، میں نے اپنے سمست (समस्त) اوشیک کاریوں (आवश्यक कार्यों) کو چھوڑ دیا اور گھر سے باہر نکلا۔

پہلے میں دوی چکر (द्विचक्र) پر، اُس کے پشچات (पश्चात) وہتر دوی چکر (वहित्र द्विचक्र) پر اور انت (अंत) میں وہتر رتھ (वहित्र रथ) پر چڑھ کر سمیان استھان (संयान स्थान) پہونچا، اور میں نے سوچا کہ میں سوادھینتا (स्वधीनता) کے بھویہ (भव्य) سماروہ (समारोह) میں دلّی پہونچ کر بھاگ (भाग) لوں۔ یتہ (यत:) مجھے کچھ وستوئیں (वस्तुएं) پوٹلی (पोटली) بنا کر بمبئی بھیجنا تھیں اس لئے میں سمیان پوٹلی کاریالیہ (संयान पोटली कार्यालय) میں گیا اور پوٹلی لپک (पोटली लिपिक) سے سمیان وستو بھاٹک (संयान वस्तु भाटक) کے سمبندھ (संबन्ध) میں وگیپتی (विज्ञप्ति) پراپت (प्राप्त) کی اور پوٹلیاں بھیج کر دور لیکھ کاریالیہ (दूरलेख कार्यालय) میں گیا اور اپنے دلّی پہونچنے کی سوچنا (सूचना) اپنے ایک متر (मित्र) کو دور لیکھ (दूरलेख) دوارا (द्वारा) بھیجدی۔

اس بیچ میں جب میری درشٹی (दृष्टि) شیام پٹ (श्याम-पट) پر پڑی تو گیات (ज्ञात) ہوا کہ سمیان کے آنے میں ابھی ایک گھنٹے کا ولمب (विलम्ब) ہے، اس لئے میں سمیان کی پرتیکشا (प्रतीक्षा) میں پرتھم شرینی کی سمّلت وشرام گرہ (प्रथम श्रेणी सम्मिलित विश्राम गृह) میں جا بیٹھا اور میں نے سمیان کے ایک کرمچاری (कर्मचारी) سے ولمب کا کارن (कारण) پوچھا، وہ کرمچاری پوچھ تاچھ کاریالیہ (पूछताछ कार्यालय) کا پردھان لپک (प्रधान लिपिक) تھا اُس نے بتایا کہ راستہ میں سمیان اگنتر (गन्त्र) بگڑ گیا ہے اور اُس کے باشپ پتر (वाष्पित्र) کے پھٹ جانے کا ڈر ہے، پرنتو (प्रन्तु) وہ سوچنا ٹھیک نہیں؛ اور اگنتر بھک بھک کرتا ہوا سمیان کو لئے ہوئے آپہونچا، میں نے دوتیہ شرینی

اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے گھر میں چپ چاپ بیٹھا رہوں، میں بھی تو اپنی قوم کا خیراندیش اور وفادار ہوں میرے دل میں ایسا خیال آتے ہی میں اُٹھ کھڑا ہوا، میں نے اپنے سب ضروری کاموں کو چھوڑ اور گھر سے باہر نکلا۔

پہلے میں سائکل پر، اُس کے بعد موٹر سائکل پر اور آخر میں موٹر پر سوار ہو کر ریلوے اسٹیشن پہونچا اور میں نے سوچا کہ میں آزادی کے شاندار جشن میں دہلی پہونچ کر حصہ لوں، چونکہ مجھے کچھ چیزیں پارسل بنا کر بمبئی بھیجنا تھیں اس لئے میں ریلوے پارسل کے دفتر میں گیا اور پارسل کلرک سے اور ریلوے پارسل کے محصول کے بارے میں معلومات حاصل کیں، اور پارسل بھیج کر تار گھر میں گیا اور اپنے دہلی پہونچنے کی اطلاع اپنے ایک دوست کو تار کے ذریعہ بھیجدی۔

اس درمیان میں جب میری نظر بلیک بورڈ پر پڑی، تو معلوم ہوا کہ ریل کے آنے میں ابھی ایک گھنٹے کی دیر ہے اس لئے میں ریل کے انتظار میں فرسٹ کلاس جنرل ویٹنگ روم میں جا بیٹھا اور میں نے ریلوے کے ایک اہلکار سے (گاڑی کے) لیٹ ہونے کا سبب پوچھا وہ اہلکار انکوائری آفس کا ہیڈ کلرک تھا، اُس نے بتایا کہ راستہ میں ریل کا انجن بگڑ گیا ہے اور بوائلر کے پھٹ جانے کا ڈر ہے لیکن وہ اطلاع ٹھیک نہیں نکلی اور انجن بھک بھک کرتا ہوا ریل کو لئے ہوئے آپہونچا میں نے سکنڈ کلاس

(द्वितीय श्रेणी) کا سمیان پترک (सम्मान पत्रक
لے رکھا تھا۔ جھٹ سے میں اپنی شرینڑی (श्रेणी) میں جا بیٹھا اور
سمیان بھی چل پڑا۔

میں شاکاہاری (शाका हारी) نہیں ہوں اس لئے مجھے بھوجن
(भोजन) کے سمبندھ میں بڑا کشٹ (कष्ट) اٹھانا پڑا اور رات کا
سمے تھا اور سمیان کی ودیت پرکاش (विद्युत प्रकाश) بھی مندا تھا
اس لئے کوئی پستکا اتھوا سماچار پتر (पुस्तका अथवा समाचार पत्र) بھی
نہ پڑھ سکا۔

پراتہ کال (प्रात: काल) ہمارا سمیان دلی پہونچ گیا، منچ (मंच)
پر بڑی بھیڑ تھی، بہت سے آرکشی (आरक्षी) بھی وہاں سموویش (समवेश)
لگائے دکھائی دئے۔ سمیان استھان سے باہر نکل کر میں نے کسی آواس گرہ
(आवास गृह) میں ٹھہرنے کا وچار کیا، نئی دلی میں بھارت آواس گرہ
بہت پرسدھ (प्रसिद्ध) ہے۔ جب میں نے دور بھاش (दूरभाष)
دوارا آواس گرہ کے ویوستھاپک (व्यवस्थापक) سے گیات کر لیا کہ وہاں
میرے ٹھہرنے کے لئے استھان ہے تو میں ترنت (तुरन्त) ہی ایک وِہتر رتھ
بھاٹک (भाटक) پر لے کر وہاں پہونچ گیا۔ اور آواس گرہ کی ایک کوٹھری
دس روپیہ دینک بھاٹک (दैनिक भाटक) پر لی۔ سمیان میں میری
مسی پورتر لیکھنی (मसी पूर्ण लेखनी) کھو گئی تھی اس لئے میں نے کاریہ
چلانے کے لئے ایک لیکھنی (लेखनी) ایک انکنی (अंकनी) ایک مسی پاتر
(मसी पात्र) اور کچھ مسی (मसी) مول لے کر اپنے پاس رکھ لی۔
میرے متر جن کو میں نے دور لیکھ بھیجا تھا وہ مجھ سے ملنے سمیان استھان پر
نہ آسکے۔ ان سے بھینٹ ہونے پر گیات ہوا کہ دور لیکھ ان کو میرے دلی پہونچنے کے
دوسرے دن ملا تھا۔

یاترا (यात्रा) کی تھکن سے میرے شیرش (शीर्ष) میں پیڑا (पीडा)
ہو رہی تھی اس لئے میں شیّا (शय्या) پر وشرام (विश्राम) کرنے کے لئے لیٹ
گیا، پھر میں چائے پی کر آواس گرہ سے نکلا اور وہتر رتھ پر چڑھ کر ٹھیک آٹھ بجے لال قلعہ
کے سامنے والی چورس بھومی (चौरसभूमि) پر پہونچ گیا، وہاں پرائیہ
(प्राप:) ایک لاکھ منشیوں (मनुष्यो) کی بھیڑ ہوگی، جس میں پرتیک
ورگ (वर्ग) اور جاتی (जाति) کے ویکتی (व्यक्ति) دکھائی دے
رہے تھے اور ایک وشیش (विशेष) استھان پر گنیہ (गण्य) منتری
اور [illegible] کھڑے ہوئے تھے۔ راشٹرپتی (राष्ट्रपति) سیناپتی (सेनापति)

کا ٹکٹ لے رکھا تھا۔ جھٹ پٹ میں
اپنے درجہ میں جا بیٹھا، اور ریل بھی
چل پڑی۔

میں گوشت خور نہیں ہوں، اس لئے
مجھے کھانے کے بارہ میں بڑی تکلیف
اٹھانی پڑی، اور رات کا وقت تھا اور
ریل کی بجلی کی روشنی بھی مندی تھی، اسلئے
کوئی کتاب یا اخبار بھی نہ پڑھ سکا۔

صبح سویرے ہماری ریل دہلی پہونچ گئی، پلیٹ فارم
پر بڑی بھیڑ تھی، بہت سے پولیس کے کانسٹبل
بھی وہاں وردیاں لگائے دکھائی دئے،
اسٹیشن سے باہر نکل کر میں نے کسی ہوٹل میں
ٹھہرنے کا خیال کیا، نئی دہلی میں بھارت ہوٹل
بہت مشہور ہے، جب میں نے ٹیلیفون کے ذریعہ
ہوٹل کے منیجر سے معلوم کر لیا کہ میرے ٹھہرنے کے لئے
وہاں جگہ ہے تو میں فوراً ایک موٹر کرایہ پر لیکر
وہاں پہونچ گیا اور ہوٹل کا ایک کمرہ میں نے
دس روپیہ روزانہ کرایہ پر لیا۔ ریل میں میرا
فاؤنٹن پن کھو گیا تھا، اس لئے میں نے کام
چلانے کے لئے ایک قلم، ایک پنسل، ایک دوات
اور کچھ سیاہی مول لیکر اپنے پاس رکھ لی۔

میرے دوست جن کو میں نے تار بھیجا تھا وہ
مجھ سے ملنے اسٹیشن پر نہ آسکے، انسے ملاقات ہونے پر
معلوم ہوا کہ تار انکو میرے دہلی پہونچنے کے دوسرے دن
ملا تھا۔ سفر کی تکان سے میرے سر میں درد ہو رہا
تھا اس لئے میں پلنگ پر آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا
پھر میں چائے پی کر ہوٹل سے نکلا اور موٹر پر سوار ہو کر
ٹھیک آٹھ بجے لال قلعہ والے میدان میں پہونچ گیا
تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کی بھیڑ ہوگی، جس میں ہر ایک
طبقہ اور فرقے کے اشخاص دکھائی دے رہے تھے
ایک خاص جگہ پر معزز وزیر اعظم اور [illegible] کھڑے ہوئے تھے

ناودھی پتی (नावधिपति) اور وایودھی پتی (वायुधिपति
بھی اُپستھت (उपस्थित) تھے اور سب دھوجا رو ہن (ध्वजा-
प्रधान) کی پرتیکشا کر رہے تھے، اتنے میں پردھان منتری (रोहण
मंत्री) آگے بڑھے اور انھوں نے اس سنسکار (संस्कार) کو بڑی
مہما (महिमा) سے پورا کیا، اُس سمے پر پرتی ییک وکتی کا ہردے راشٹریہ
گرو (राष्ट्रीयगर्व) سے بھرا ہوا تھا، اس سنسکار کے سماپت (समाप्त
ہونے پر سب وہاں سے لوٹ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور میں بھی دلی نگر میں
گھومنے پھرنے لگا، میں نے دیکھا کہ ہر چھوٹا بڑا مارگ (मार्ग) راشٹریہ
جھنڈوں سے سجا ہوا تھا۔

دوسرے دن میں نے سوچا کہ دلی ایک ایتہاسک (एतिहासिक) نگر
ہے، یہاں کے پُراتتو (पुरातत्व) کو دیکھے بنا نہیں جانا چاہئے، میں دن
بھر ایتہاسک اسمارکوں (एतिहासिक स्मारकों) کو دیکھتا رہا،
میرے تیسرے دن کا کاری کرم (कार्यक्रम) یہ تھا کہ سرکاری کاریالیوں
(कार्यालयों) اور سچی والیہ (सचिवालय) کو دیکھوں،
پہلے میں پرسارن گرہ (प्रसारणगृह) دیکھنے گیا، وہاں بھن بھن
(भिन्न भिन्न) بھاشا بھاشکوں (भाषा भाषकों) سے
میری بھینٹ ہوئی، جو ودیشی (विदेशी) بھاشاؤں میں اپنے اپنے
کاری کرم پرسارت (प्रसारित) کرتے ہیں، میں نے آکاشوانی کے
(आकाशवाणी) کے ہر وبھاگ (विभाग) کو دیکھا، مجھے
کر نردھارن ادھی کاری (कर निर्धारण अधिकारी)
سے ملنا تھا، اُن سے ملنے کے پشچات، ویاپار، شکشا، نرمان، وکاس، پرراشٹر،
گرہ، وت، شرم، رکشا، کھادیہ اور یاتایات
शिक्षा, व्यापार
रक्षा, श्रम, वित्त, गृह, परराष्ट्र, विकास, निर्माण
यातायात खाद्य
منتریوں کے کاریالیہ دیکھے، منتریوں کے سچو (सचिव) بھی ادھر اُدھر
پھرتے دکھائی دئے۔ پردھان منتری کے آتمیہ سچو (आत्मीय सचिव)
کو میں پہلے سے جانتا تھا، اُن سے پنچ ورشیہ یوجنا (पंच वर्षीय योजना)
پر بڑی دیر تک بات چیت ہوتی رہی، میں نے وہ کاریالیہ بھی دیکھا، جہاں آیات نریات
(आयात निर्यात) کا انوگیا پتر (अनुज्ञा पत्र) دیا جاتا ہے، پھر
میں ویوہار (व्यवहार)، دنڈ، جلا، فیڈرل، راجسو، اُچ اور اُچتم نیایالیہ
उच्चतम, और, उच्च, राजस्व, फेडरल, जिला, दंड

اور صدر جمہوریت، سپہ سالار، امیر البحر اور
ہوائی سپہ سالار بھی موجود تھے اور سب
رسم پرچم کشائی کا انتظار کر رہے تھے، اتنے
میں وزیر اعظم آگے بڑھے اور انھوں نے اس رسم
کو بڑی شان سے پورا کیا، اُسوقت ہر ایک شخص
کا دل قومی فخر سے بھرا ہوا تھا، اس رسم کے
ختم ہونے پر سب وہاں سے لوٹ کر اپنے اپنے
گھروں کو چلے گئے اور میں بھی دہلی شہر میں گھومنے
پھرنے لگا، میں نے دیکھا کہ ہر چھوٹا بڑا راستہ
قومی جھنڈوں سے سجا ہوا تھا۔ دوسرے
دن میں نے سوچا کہ دہلی ایک تاریخی شہر ہے
یہاں کے آثار قدیمہ کے دیکھے بغیر نہیں جانا چاہئے
میں دن بھر تاریخی یادگاروں کو دیکھتا رہا
میرے تیسرے دن کا پروگرام یہ تھا کہ سرکاری دفتروں
کو اور سکریٹریٹ کو دیکھوں، پہلے میں ریڈیو کی نشرگاہ
دیکھنے گیا وہاں مختلف زبانوں کے بولنے والوں سے
میری ملاقات ہوئی، جو غیر ملکی زبانوں میں اپنا اپنا
پروگرام نشر کرتے ہیں، میں نے ریڈیو کے ہر شعبہ
کو دیکھا، مجھے اسسٹنٹ تشخیص ٹیکس سے ملنا تھا
اُن سے ملنے کے بعد تجارت، تعلیم، تعمیر،
ترقیات، امور خارجہ، امور داخلہ، فنانس،
لیبر، دفاع، خوراک اور رسل و رسائل سے
وزیروں کے دفاتر دیکھے، وزیروں کے سکریٹری
بھی اِدھر اُدھر پھرتے دکھائی دئے۔ وزیر اعظم
کے پرائیویٹ سکریٹری کو میں پہلے سے جانتا تھا
اُن سے پنج سالہ منصوبہ پر بڑی دیر تک بات
چیت ہوتی رہی، میں نے وہ دفتر بھی دیکھا
جہاں درآمد و برآمد کا لائسنس دیا جاتا ہے۔
پھر دیوانی، فوجداری، ضلع، فیڈرل، ریونیو
کی عدالتیں، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ
دیکھنے گیا۔

(न्यायालय) دیکھنے گیا۔

مکھیہ نیای دِھی پتی (मुख्य न्यायाधिपति) اور

نیترک مہالیکھا پریکشک (नियन्त्रक महालेखा परीक्षक)

سے ملنا چاہتا تھا، پرنتو اُن دونوں کا استھانانترن (स्थानान्तरण)

ہوگیا تھا، اس لئے بھینٹ نہ ہوسکی، وانجیہ منڈل (वाणिज्य मण्डल)

کے کاریالیہ کو بھی میں دیکھنا چاہتا تھا، پرنتو سمے نہ ملنے سے وہاں نہ جا سکا۔

ابھی میں اپنے آواس گرہ لوٹ آیا، میں بہت پرسن (प्रसन्न) تھا کیونکہ اب

میں کسی ودیشی راشٹر کا داس نہیں ہوں، اپیتو (अपितु) اب گرو سے کہتا

ہوں کہ میں سوتنتر بھارت کا سوتنتر ناگرک ہوں، اور میری ماتر بھومی (मातृभूमि)

اب سمپورنڑ۔ پربھتو سمپنّ لوک تنتر آتمک گنڑ راجیہ ——————

सपूर्ण - प्रभुत्व-सम्पन्न लोकतन्त्रात्मक गणराज्य

بن گئی ہے۔

میں نے اپنے گھر لوٹنے کے لئے سمیان استھان پربندھک (सयान - स्थान प्रबंधक) سے دور بھاش دوارا اپنا استھان رکشت (रक्षित) کرنے کے لئے بات پرنتو ابھاگیہ وش (अभाग्यवश)

سپھلتا نہیں ہوئی۔ اس لئے میں وایویان (वायुयान) دوار اپنے گھر

لوٹ آیا۔

میں چیف جسٹس اور کنٹرولر و آڈیٹر

جنرل سے ملنا چاہتا تھا، لیکن اُن دونوں کا

تبادلہ ہوگیا تھا اس لئے ملاقات نہ ہوسکی،

ایوانِ تجارت کے دفتر کو بھی میں دیکھنا چاہتا

لیکن وقت نہ ملنے کی وجہ سے وہاں

نہ جاسکا۔

اب میں اپنے ہوٹل لوٹ آیا، میں بہت خوش

تھا کیونکہ اب میں کسی غیر ملکی قوم کا غلام نہیں

ہوں بلکہ اب فخر سے کہتا ہوں کہ میں آزاد

بھارت کا آزاد شہری ہوں اور میری مادرِ

وطن اب جمہوری حکومت بن گئی

ہے۔

میں نے اپنے گھر لوٹنے کے لئے اسٹیشن ماسٹر

سے ٹیلیفون کے ذریعہ اپنی سیٹ ریزرو کرنے

کرنے کے لئے بات کی لیکن بدقسمتی سے کامیابی

نہیں ہوئی اس لئے میں ہوائی جہاز کے

ذریعہ اپنے گھر لوٹ آیا۔

"گاہے گاہے باز خواں ———"

نظریۂ اسلام میری نظر میں

میں نے جہاں تک اسلام کی تعلیم پر غور کیا ہے اس میں کوئی تنگ نظری ایسی نہیں ہے جیسی آج کل مسلمانوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ اس نے عوائد و مراسم کی بیخکنی کرکے صرف اخلاق کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ حقیقتاً مسلمان وہی ہے جسکے اخلاق پاکیزہ ہوں۔
سب سے پہلی غلطی جو مذہب کے باب میں لوگوں سے ظاہر ہوتی ہے وہ کفر و اسلام اور شرک و توحید کے مفہوم کے امتیاز میں ہوتی ہے اور چونکہ یہ غلطی صدیوں سے چلی آرہی ہے اس لئے اس کا دور ہونا آسان نہیں، تاہم چونکہ اس وقت بات آپڑی ہے اس لئے مجبور ہوں کہ مختصراً اس مسئلہ پر روشنی ڈالوں۔

انسان و خدا یا خالق و مخلوق کا جس حد تک یا جیسا تعلق ہے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کرسکتا کہ خالق اور خدا کی ذات بالکل بے نیاز ہے اور انسان کی کوئی بدعنوانی، کوئی نامعقولیت، یہاں تک کہ بتوں کا پوجنا بھی اس کو کوئی مضرت نہیں پہونچا سکتا، اس کی برہمی نہ انسان کی سی برہمی ہے کہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہونچتی ہے اور وہ خفا ہوجاتا ہے اور نہ اس کی مسرت ہماری مسرت ہے کہ کوئی امر مفید کسی سے ظاہر ہوا، اور ہم اس سے خوش ہوگئے۔

چونکہ خدا کی ذات ہمارے فلسفۂ مسرت و الم سے بلند ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی خوشنودی یا برہمی کا مفہوم بھی کچھ اور ہوگا پھر اس مفہوم کی جب جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جس امر کو اپنی خوشنودی سے تعبیر کیا ہے، وہ حقیقتاً ہماری بہتری سے متعلق ہے اور جس امر کو وہ اپنی برہمی سے تعبیر کرتا ہے اس کا واسطہ ہماری مضرت سے ہے۔ اسلئے ظاہر ہوا کہ خدا کا منشا صرف یہی ہوسکتا ہے کہ انسان اپنے فلاح و اصلاح کی تدبیر اختیار کرے جیسا کہ "اِن ارید الّا الاصلاح" سے ثابت ہوتا ہے اور ان مکارم اخلاق سے آپ اپنے آپ کو آراستہ کرے جو تمام نوع انسانی کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ اب آپ اسی اصول کو پیشِ نظر رکھ کر کفر و اسلام، شرک و توحید کے مفہوم پر غور کریں گے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اسلام و توحید نام ہے صرف "اِستقامۃ فی العمل" کا، بلندیٔ اخلاق کا، اخوتِ عامہ کا اور کفر و شرک کہتے ہیں، نظم و نسق سے منحرف ہوجانے کو، ترکِ عمل کو، انحطاطِ اخلاق کو، انتشار و افتراق کو، فرقہ بندی کو، تفریقِ جامعۂ انسانیت کو اور انسانی اجتماعیت کے خراب کرنے کو۔ کلام مجید کی یہی تعلیم ہے اور رسول چونکہ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے آئے تھے اسی لئے ان کو "کافۃ للناس" ——— اور "رحمۃ للعالمین" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ رسول نے فرقہ بندی کے خلاف اور تفریقِ مذاہب کے باوجود "اخوتِ عامہ" کے موافقت میں جو کیا یا کہا اس کا ثبوت کلام مجید سے ملتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"قل آمنّا باللہ وما اُنزل علینا وما اُنزل علیٰ ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ و عیسیٰ والنبیون من ربھم لانفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون۔"

پھر کیا نبیوں میں آپ رام۔ کرشن۔ بودھ۔ کنفیوشس وغیرہ کو شامل نہیں کرتے۔ کیا ان کی نبوت سے کسی کو انکار ہوسکتا

ہے "ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا" (ہم نے ہر قوم میں کوئی نہ کوئی نبی مبعوث کیا) ارشاد خداوندی ہے۔ پھر اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ "ونحن لہ مسلمون" میں دنیا کے تمام ممالک و مذاہب کو شامل نہ کیا جائے۔

کلام پاک کے متعدد مقام سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشاء خداوندی یہی ہے کہ ساری دُنیا ایک جماعت، ایک امت ہو کر زندگی بسر کرے اور جو لوگ اپنے عمل سے اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ حقیقتاً فطرت کی مخالفت کرتے ہیں:-

"ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ ولاکن لیضل من یشاء و یھدی من یشاء ولتسئلن عما کنتم تعملون ۞"

"ولو شاء اللہ" کے معنی یہ نہیں ہیں کہ "اگر اللہ چاہتا" بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ تم سب کو ایک امت بنا دے ——— لیکن وہ گمراہ کر دیتا ہے اس کو جو اپنی ہدایت چاہتا ہے۔ لیکن اے لوگو تم مطمئن نہ رہو خدا تم سے ضرور باز پرس کرے گا۔ تمھارے افعال و اعمال پر وہ تم سے پوچھے گا کیوں تم نے ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی کو اختیار کیا اور کیوں تم نے اپنے عمل سے اپنی وسعت نظر سے اپنے رواداری سے اور اپنے اُصول زندگی سے اس "اخوت عامہ" کو دُنیا میں پیدا نہیں کیا جو خدا کے نزدیک محبوب ہے "یضل من یشاء و یھدی من یشاء" کے معنی بھی بعض مفسرین و مترجمین نے صحیح نہیں کئے ہیں اس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے یعنی انھوں نے "یشاء" کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے، حالانکہ حقیقتاً "یشاء" کا فاعل "من" ہے کیونکہ آپ یہ معنی مراد نہ لیں گے تو پھر "ولتسئلن عما کنتم تعملون" بالکل بیکار ہو جائے گا۔ کیونکہ جب ہدایت و گمراہی صرف خدا داد بات ہوگئی تو باز پرس کیوں اور کس سے؟

کلام پاک میں اسلام کے صحیح مفہوم کو ایک جگہ نہایت ہی پاکیزہ انداز میں بیان فرمایا ہے اور اس کی وسعت و ہمہ گیری کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:-

"صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ ونحن لہ عابدون"

یعنی اے رسول لوگوں سے کہہ دو کہ ایمان و اسلام جس چیز کا نام ہے وہ تو وہی اتحاد و یکرنگی ہے جسے ہم خدائی رنگ کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس رنگ سے بہتر کون رنگ ہو سکتا ہے، اس لئے اسلام کی دعوت جن مختصر الفاظ میں کی گئی ہے اور جس آسانی کے ساتھ تمام افتراق و انتشار کو مٹانے کی کوشش کی گئی وہ یہ تھی کہ:-

"قل یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشہدوا بانا مسلمون"

پس اسلام نام ہوا صرف اس کا کہ سوا ذات خدا کے اور کسی کی عبادت نہ کی جائے اور نہ کسی اور ہستی کو اس کا مقابل سمجھا جائے۔ یہ تعلیم اس قدر سادہ، اس درجہ آسان اور ایسی قریب الفہم ہے کہ گمراہ سے گمراہ قوم بھی اس کی مخالفت نہیں کر سکتی۔ ایک سوال اس جگہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی عبادت کرانے کا کیوں اس قدر شوق ہے اور وہ شرک و کفر یا جحود و انکار سے کیوں اس درجہ برہم ہوتا ہے اور میرے خیال میں اسی کے سمجھنے پر نہ صرف اسلام بلکہ تمام مذاہب کے سمجھنے کا انحصار ہے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ خدا کی ذات اس تاثر سے بے نیاز ہے جو ایک انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس لئے اس کی برہمی یا خوشی کا مفہوم انسانی مضرت و منفعت کے علاوہ کچھ نہیں ہے، انسان کا خواہ انفرادی حیثیت سے ہو خواہ اجتماعی لحاظ سے کسی ایسے امر کا مرتکب ہونا جو اخوت عامہ کو صدمہ پہونچانے والا ہو جو اجتماعیت عالم کو برباد کرنے والا ہو جو مرکز انسانیت سے انحراف پیدا کرنے والا ہو، جس سے اشتراک عمل تباہ ہوتا ہو، شرک و کفر ہے، جحود و انکار ہے، ابتدا

ہے اور سجدہ وہ چیز جس کو غیر خدا کی پرستش سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ایسا کرنا منشاء و حکم کے خلاف کرنا اس کی اہمیت سے انکار کرتا ہے، اس کے وجود کو نظر انداز کر دینا ہے۔ اس کی مخالفت پر آمادہ ہونا ہے۔

اسی پر آپ اسلام و توحید کے مفہوم کا بھی قیاس کرسکتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ نہ اذان سے خدا کو فائدہ پہونچتا ہے نہ ناقوس سے کوئی سے کوئی نقصان۔ نہ مسجد سے خدا کو کوئی راحت ملتی ہے نہ کلیسا اور مندر سے کوئی تکلیف۔

اگر ایک شخص غیر مسلم یعنی موجودہ جماعت اسلامی کا فرد ہونے کے باوجود تمام انھیں مکارم اخلاق و محاسن فطرت سے آراستہ ہے۔ جن کی محمد نے تعلیم دی ہے تو کیا آپ اس کو صرف اس لئے کہ وہ آپ کی جماعت میں شامل نہیں ہے، کافر و مشرک کہکر ناری و جہنمی کہدیں گے اور دوسرا شخص جو آپ کی جماعت کا فرد ہے، لیکن حد درجہ ظالم، بے رحم، مجرم اور شقی تو کیا اس کو صرف اس بناء پر کہ اس کا نام آپ ہی کی طرح ہے آپ کے زمرہ میں اس کا شمار ہوتا ہے، نجات و فردوس کا پروانہ دیدیں گے۔

ایک بے رحم قزاق قافلہ کو تباہ و برباد کرکے متعدد بے گناہ جانوں کے خون سے اپنے ہاتھ کو رنگین کرکے فارغ ہوتا ہے کہ دفعتہً مغرب کی اذان ہوتی ہے، وہ فوراً اپنے ہاتھ اور دامن سے خون کے دھبّے دور کرکے نماز میں مشغول ہوجاتا ہے۔ دوسرا شخص جو تمام تمام دن دھوپ میں محنت شاقہ برداشت کرکے اپنے متعلقین کے لئے حلال روزی فراہم کرتا ہے۔ گاؤں کے بچوں، بوڑھوں، یتیموں اور بیواؤں کی خدمت کے لئے اپنی محنت، دولت، زندگی سب کچھ وقف کئے ہوئے ہے، لیکن شام کو وہ نماز پڑھنے کے بجائے ناقوس پھونکتا ہے۔ مسجد جانے کے بجائے وہ مندر کا رخ کرتا ہے۔

اب آپ ایک مسلمان مولوی سے ایک متعصب مدعی اسلام سے دریافت کیجئے۔ وہ نہایت آزادی سے بلا پس و پیش کہدے گا کہ بہرحال اس قزاق کو نجات ملنی ہے کیونکہ وہ مسلمان ہے اور اس دوسرے کو آخر کار دوزخ میں جانا ہے کیونکہ اس نے بت پرستی کی اور اسلام کو قبول نہیں کیا۔ پھر اگر اسلام نام اسی وسعتِ نظر و انصاف کا ہے اگر "صراط مستقیم" اسی کو کہتے ہیں اگر "فامرہم بالقسط" کا یہی مفہوم ہے۔ اگر دین محمدی کا یہی مدعا ہے تو میں مشورہ دوں گا کہ آیئے آپ بھی میرے ساتھ کافر ہوجایئے کیونکہ پھر تو خدا کفر ہی میں تلاش کرنے سے ملے گا۔

مسلمانوں کا یہ یقین کرلینا کہ صرف خدا انھیں کا ہے اور دوسری قوموں کو اس نے صرف دوزخ کا ایندھن بنانے کے لئے پیدا کیا ہے ایسا لغو و مہمل اعتقاد ہے جو کسی ذی فہم کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہوسکتا اور نہ اس تعلیم کے ساتھ ہم کسی کو اپنی طرف مایل کرسکتے ہیں اسی لئے میں نے کہا کہ جہاں تک نفس تعلیم مذہب کا تعلق ہے، مسجد و کلیسا، ناقوس و اذان میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر ان دونوں جگہ مقصود خدا کی عبادت اور اصلاح اعمال ہے۔

آپ جب تک اس روا داری سے کام نہ لیں گے، جس وقت تک خیال میں یہ وسعت نہ پیدا ہوگی آپ کیونکر دوسروں سے توقع کرسکتے ہیں کہ وہ آپ کی جماعت میں شریک ہوجائیں گے آپ تو ناقوس کی آواز سن کر لاحول پڑھنے لگیں لیکن دوسرا آپ کی اذان کو سن کر سر بسجود ہوجائے باجہ بجانا چھوڑ دے۔ کیوں؟ آپ میں آخر وہ کون سی خصوصیت ہے جس نے آپ کو خدا کا بیٹا بنا دیا ہے اور دوسرے کو گروہ شیطان و طاغوت میں داخل کردیا، آپ کیوں خدا کی ذات کو اپنے اندر محدود سمجھتے ہیں، اس کی صفت خلق و ربانیت کو اپنے لئے کیوں مخصوص جانتے ہیں بہ حیثیت انسان ہونے کے ہر شخص خواہ وہ عیسائی ہو یا ہندو، چینی ہو یا بدھ، معتزلہ ہو یا اشعریہ، ناصبی ہو یا خارجی، شیعہ ہو یا سُنی، خدا کے نزدیک ایک ہے، اس کا سب سے ایک ہی مطالبہ ہے، پھر جو اس کو پورا کرے گا خدا اسی کو ترقی و فلاح دے گا اور جو اس کو ترک کرے گا خدا بھی اس کو چھوڑ دے گا۔

بے شک یہ میرا ایمان ہے کہ مذہب اسلام یعنی وہ مذہب جسے محمدؐ نے پیش کیا، یقیناً بہترین ذریعہ تصفیہ اخلاق اور تزکیۂ نفس کا ہے اور اس لئے ہر انسان کا فطری فرض ہے کہ وہ اس مذہب کو اختیار کرے لیکن میں اس کی اشاعت کو اس طرح پسند نہیں کرتا کہ دوسرے مذہب کو بُرا کہوں جبکہ مذہب ہونے کے لحاظ سے وہ بھی سب سچے ہیں۔

آپ اگر ایک ہندو کو تعلیم اسلام دینا چاہتے ہیں تو آپ کا فرض یہ نہ ہونا چاہئے کہ اس کے ارکان پر ناک بھوں چڑھائیں، اس کی طریق عبادت پر نکتہ چینی کرنے لگیں، بلکہ طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ آپ اس کو نفس مقصود مذہب سے آگاہ کرکے آمادہ کریں کہ وہ اپنے طریق مذہب کے ساتھ ہی ساتھ مذہب اسلام کو بھی دیکھے اور خود فیصلہ کرے کہ منزل تک پہونچانے کا سب سے زیادہ آسان اور سیدھا راستہ کون سا ہے اور میری رائے میں "جادلھم بالتی ھی احسن" کا بھی یہی مفہوم ہے۔

آپ اگر اپنی حرمت چاہتے ہیں تو دوسروں کی حرمت کیجئے۔ یہ عام اصول اخلاق کا ہے۔ اس لئے اگر آپ اپنے مذہب کا وقار قایم کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے مذاہب کی بھی عزت کیجئے۔ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا اور نہ قوت وجبر سے کوئی مذہب اشاعت پذیر ہوسکتا ہے۔ تلوار ایک آدمی کا نام تو بدل سکتی ہے وضع ومعاشرت میں تو تبدیلی پیدا کرسکتی ہے۔ لیکن دل کو نہیں پھیر سکتی، دماغ کو مجبور نہیں کرسکتی ہے۔ اطمینانِ نفس، طمانیت روح، لطف ورافت، محبّت وشفقت ہی سے حاصل ہوسکتی ہے، جس کے ثبوت میں اسوۂ نبوی آپ کے اور ہمارے سب کے سامنے موجود ہے اور یہ چیز مسلمانوں کے پاس ایسی عظیم المرتبت، ایسی جلیل القدر ہے کہ اس کے سامنے سوا سرِعجز جھکا دینے کے اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ پھر کتنی حیرت کی بات ہے کہ جو حقیقی دولت آپ کے پاس ہے، اُسے تو آپ پیش نہیں کرتے، دکھاتے ہیں خزف ریزوں کو اور دنیا کو مجبور کرتے ہیں کہ انھیں کو جواہر ریزے سمجھے۔

پھر چونکہ یہ تنگ نظری نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے مقلّدین میں پائی جاتی ہے اس لئے جو اعتراض میرا اہلِ اسلام پر ہے، وہی ہندوؤں پر ہے اور وہی دوسرے مذہب والوں پر۔ نہ ہم میں رواداری، نہ ان میں انصاف، نہ ہم صراطِ مستقیم پر، نہ وہ راہِ راست پر، منزل سے بعید ہونے میں سب کا ایک درجہ ہے اور گمراہی میں مبتلا ہونے کے لئے سب یکساں طور پر حریص ہیں۔

یہ ہے میرا اعتقاد ویقین مذہب کے متعلق جسے میں نے صاف صاف الفاظ میں ظاہر کردیا اور اگر متقدمین کی تعلیم اس کی منافی ہے تو میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں، جس طرح میں آپ کو مجبور نہیں کرسکتا کہ آپ میرے قول کو صحیح سمجھ لیں لیکن اگر موجودہ حالت قایم رہی اور رہے گی تو باور کیجئے کہ ایک زمانہ آئے گا جب تمام مذاہب محو ہوجائیں گے اور وہی وقت تجدید اسلام واحیاءِ دین محمدی کا ہوگا۔

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

مالہ وما علیہ

جنگ اور جاسوسی

جس وقت دو فریق مقابلہ میں ہوتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک دوسرے کو شکست دینے کا آرزومند ہوتا ہے تو پھر اس وقت تمام قوائے انسانی اور تمام ادراکات نفس صرف ایک خیال کی طرف مایل ہوجاتے ہیں اور وہ خیال اپنی کامیابی کا ہوتا ہے، پھر چونکہ یہ بالکل فطرت کا اقتضا ہے، اس لئے غالباً یہ کہنا درست نہ ہوگا، کہ عہدِ بدویت میں بھی وہی تمام ذرائع کامیابی کے اختیار کئے جاتے ہوں گے جو اس وقت نظر آتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ اُس وقت علم وحکمت کی ترقی نہ تھی، اس لئے یہ تدابیر ناقص، بھدی اور غیر مکمل ہوتی ہوں گی، اس وقت "ذہنیات وعقلیات" کی ترقی نے اور تمام علوم وفنون کے ساتھ فنِ حرب کو بھی درجۂ کمال تک پہونچا دیا ہے اور اب زیادہ کامیابی کے ساتھ تدابیر کو بروئے کار لاسکتے ہیں۔

منجملہ دیگر تدابیر کے جو عہدِ حاضر میں جنگ کو کامیاب بنانے کے لئے اختیار کی جاتی ہیں، ایک تدبیر جاسوسی کی بھی ہے جس کا تعلق جارحانہ ومدافعانہ دونوں پہلوؤں سے ہے، دشمن کی تدابیر معلوم کرنا اور اپنے حالات کو پوشیدہ رکھنا، جنگ کا اولین فرض ہے اور پھر چونکہ علم کی ترقی نے راز کو پوشیدہ رکھنے کے لئے ہزاروں حیلے اور بہانے پیدا کردئے ہیں، اسی طرح اسکو پوشیدہ اور افشاء سے محفوظ رکھنے کے لئے ویسی ہی احتیاطیں عمل میں لائی جاتی ہیں۔

گزشتہ جنگ کی اگر کوئی تاریخ کبھی لکھی گئی تو اس کے نمایاں ابواب میں سے ایک باب جاسوسی کا بھی ہوگا، جس نے بعض اوقات بساطِ جنگ پر مہروں کا رُخ بدل دیا اور بعض اوقات بڑی بڑی مصیبتوں کو دور کردیا، ہرچند یورپ کا کوئی ملک ایسا نہ تھا جہاں کے جاسوس دُنیا میں نہ پھیل گئے ہوں، لیکن جرمنی نے جس قدر وسیع پیمانہ پر اس سے کام لیا اور تفتیش وتحقیق میں جو احتیاط اس کی طرف سے ظاہر ہوئی وہ مخصوص طور پر ظاہر ہوئی، وہ مخصوص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

جو ممالک باہم برسرپیکار تھے، وہاں کے باشندے تو خیر کسی طرح دشمن کے ملک میں جا ہی نہیں سکتے تھے اور جو پہلے سے موجود بھی تھے وہ مقید کرلئے گئے تھے، لیکن غیر جانبدار ملکوں کے رہنے والے بھی نہایت مشکل سے پہونچ سکتے تھے جس کا اندازہ ان کے بیانات سے ہوتا ہے۔ ایک سیاح نے لکھا ہے کہ "ہر شخص نہیں سمجھ سکتا کہ اہلِ جرمنی کے نزدیک تفتیش کا مفہوم دورانِ جنگ میں کیا تھا۔ میں جس وقت ہربتال کے اسٹیشن پر اُترا، تو مجھے ایک چھوٹے سے کمرہ میں لے گئے اس حال میں کہ سپاہیوں کا ایک دستہ مع اپنے کپتان کے مجھے گھیرے ہوئے تھا تاکہ میرے خلوصِ نیت کا امتحان کرے، چنانچہ خود کپتان نے میری تلاشی لینی شروع کی، اس نے میری جیبیں، کپڑے، استر، کاغذات، پاسپورٹ اور ایک ایک چیز جو میرے پاس تھی نہایت غور سے دیکھا اور اس کے بعد حکم دیا کہ جسم برہنہ کردیا جائے، جب اس کی تعمیل ہوگئی تو اس نے اسپنج کا ایک ٹکڑا لیکر کسی عرق میں بھگوکر میرے سارے جسم کو تر کیا اور تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد غور سے دیکھنے لگا کہ کوئی پوشیدہ تحریر تو جسم پر نمایاں نہیں ہوئی، لیکن جب وہ مطمئن ہوگیا تو مجھے کپڑے پہننے کی اجازت دی۔

ایک دوسرے سیاح نے لکھا ہے کہ "جنگ جس قدر طول پکڑتی جاتی تھی جرمنی کی تفتیش وتحقیق اسی قدر بڑھتی جاتی تھی، چنانچہ جب میں پہونچا تو میرے پاس کے تمام کاغذات لے لئے اور ان کو نہایت غور سے دیکھا اس کے بعد کسی عرق

میں ان کو ڈبویا تاکہ اگر پوشیدہ تحریر لکھی ہو تو ظاہر ہوجائے۔ پھر میری پنسل، میرا قلم لیکر اس پر غور کرتے رہے، میرے بعض ساتھیوں کے کان اور ناک کی بھی تلاشی لی گئی۔

انگلستان کی ایک خاتون جو "ایک جنگی انجمن امداد" کی صدر تھی، پیرس گئی تاکہ یہاں سے ہالینڈ جائے، یہ وہ زمانہ تھا جب فرانسیسی فوجوں کا اجتماع ہو رہا تھا اور کوچ کے حکم کی ہر وقت توقع کی جاتی تھی، حکومت فرانس چاہتی تھی کہ اس کی خبر کسی طرح جرمنی کو نہ پہونچے، اور اُدھر جرمنی اُس کے ہر ہر راز کو معلوم کرلینے کے لئے بیتاب تھا۔

یہ خاتون ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی اور صبح و شام آتے جاتے وہاں کی خاکروب عورت کو جو فرانسیسی تھی مضمحل و ملول دیکھا کرتی تھی، لیکن چونکہ حزن و ملال اُس وقت ہر شخص کے چہرے پر نمایاں تھا اس لئے اُس خاتون نے کچھ خیال نہیں کیا سفر شروع کرنے سے ایک دن قبل وہ عورت انگریزی خاتون کے کمرے میں آئی اور بولی کہ میرا بیٹا بلجیم میں مقید ہے اور میں اس کے لئے کچھ نقد بھیجنا چاہتی ہوں۔ میں آپ کے پاس اس لئے حاضر ہوئی ہوں کہ آپ امسٹرڈم کے ایک شخص کو میری امانت پہونچا دیجئے اور وہ ایک غیر جانبدار ملک کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے اس تک پہونچا سکے گا۔" یہ کہکر اُس نے آنسو بہاتے ہوئے پانچ پانچ فرانک کے تین سکے نکالے اُن کو بوسہ دیا اور خاتون کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ "ایک مجبور ماں کی محبت کی طرف سے یہ ہدیہ اس کے بیٹے کو پہونچا دیجئے" خاتون اس منظر سے بہت متاثر ہوئی اور امسٹرڈم پہونچکر وہ سکے اس آدمی کو دیدئے جس کا اس نے پتہ بتایا تھا۔

یہ بات بظاہر نہایت معمولی معلوم ہوتی ہے اور اس خاتون نے بھی خیال کیا ہوگا کہ اس نے کوئی بڑا اچھا کام کیا، حالانکہ اسی واقعہ نے فرانس کے تمام تدابیر کو جرمنی پر ظاہر کردیا اور اس کی پہلی شکست کا باعث یہی واقعہ ہوا۔ ان تینوں سکوں پر مخصوص نشانات تھے جن سے فرانسیسی فوج کی تعداد، اور سمت و تاریخ روانگی کا حال جرمنی کو معلوم ہوگیا۔

فرانس نے بھی اپنے بعض جاسوسوں کے ذریعہ سے بڑا فایدہ حاصل کیا جس کی ایک مثال ذیل میں پیش کی جاتی ہے:-
سوئٹزرلینڈ کے بعض حصوں اور اُس کے جوار میں شہد کی مکھیاں پالنے کا بڑا رواج ہے، یہاں تک کہ اس فن کے متعلق اخبارات و رسایل بھی شایع ہوتے ہیں ایک ضعیف شخص جو سوئٹزرلینڈ کے قریب جرمنی کے ایک صوبہ میں رہتا تھا، یہی کاروبار کرتا تھا اور ایک رسالہ بھی اس فن کا شایع کرتا تھا، لیکن یہ حقیقتاً جرمنی کا بہت دشمن تھا اور جنگ ہفتاد سالہ کے بعد سے اس جوار میں صرف اس لئے مقیم تھا کہ کسی طرح جرمنی کو زک پہونچائے۔ اور رسالہ کا ٹائیٹل بظاہر معمولی چیز تھا، لیکن اسی میں سارا راز پنہاں تھا جس سے فرانس کی وزارت حربیہ کے مخصوص افراد واقف تھے اس شخص نے دوران جنگ میں اسی ذریعہ سے جرمنی کے بہت سے راز افشا کئے اور فرانس بہت سی مصیبتوں سے بچ گیا۔

جب جنگ شروع ہوئی تو انگلستان اور امریکہ کے درمیان تاروں کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی۔ یہاں کی خفیہ پولیس نے یہ معلوم کرکے تفتیش شروع کی اور ایک شخص پر اسے کچھ شبہ پیدا ہوا، لیکن اس کے تاروں میں بظاہر کوئی بات ایسی نہ ہوتی تھی جس کی گرفت ہوسکتی یا جس سے کوئی حال معلوم ہوسکتا۔ ایک مرتبہ اس آدمی نے کسی شخص کے پاس امریکہ نے تار بھیجا کہ "(DIED FATHER" (باپ مرگیا) اتفاق سے یہ تار قبل روانگی مُراقب (سنسر) کے ہات پڑگیا اس نے بجائے DIED (مرگیا) کے (EXPIRED) "گزر گیا" لکھدیا اور تار کی روانگی کی اجازت دیدی۔ تھوڑے

عرصہ کے بعد اس کا جواب آیا کہ "باپ مرگیا یا گزر گیا" اور اس طرح پولیس کو اس جاسوس کا حال معلوم ہوگیا اور اُسے گرفتار کرلیا۔

امریکہ کا ایک نوجوان اہلِ ثروت فرانسیسی محکمۂ طیران (ہوائی) میں داخل ہوگیا اور اس کی بہن نے صلیب احمر کے کسی اسپتال میں اپنی خدمات وقف کردیں، چند دن کے بعد اس خاتون کو بھی محکمۂ طیران میں داخل ہونے کا شوق پیدا ہوا لیکن عورت ہونے کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکتی تھی۔

ایک شام کو اس کا بھائی آیا اور کہا کہ جرمنی کی فوج نے اُس مکان پر قبضہ کرلیا ہے جس میں ہم تم رہتے تھے اور اس کو ذخیرۂ رسد بنایا ہے" یہ سنتے ہی وہ بولی کہ "آؤ اس میں آگ لگا دیں" اس نے پوچھا یہ کیونکر ممکن ہے؟" وہ بولی کہ "تم اپنے ہوائی جہاز میں مجھے وہاں لے چلو اور کچھ اِدھر اتار دو، میں مزدوروں کے لباس میں وہاں جاکر آگ لگادونگی تم بہت صبح اپنا ہوائی جہاز لیکر آجانا میں پھر واپس آجاؤں گی"۔

ایک دن جب ابر بہت کثیف تھا، اس پر عمل کیا گیا اور وہ آگ لگانے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن آگ زیادہ مشتعل نہ ہوئی تھی کہ بجھادی گئی، اب اس کی فکر ہوئی کہ آگ کا سبب دریافت کیا جائے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ ایک مزدورنی شمع لیکر شراب کی بوتلیں لینے یہاں آئی تھی اور اسی کی شمع سے یہ آگ لگی ہے، چنانچہ یہ بلائی گئی اور دریافت کیا گیا، اس نے جواب دیا کہ "شمع سے مکڑی کے جالے مشتعل ہوگئے اور ان سے آگ پھیل گئی"۔

جب فوج کے سردار نے جو ہنگری کا رہنے والا تھا اور آسٹریا کی فوج کے ساتھ آیا تھا، اس بات کو سنا تو فوراً واپس گیا اور تھوڑی دیر میں مکڑی کا جالا لئے ہوئے آیا اور بولا کہ "یہ قصہ جھوٹ ہے کیونکہ جالا شعلہ کو قبول نہیں کرتا" یہ کہکر اس نے شمع کے اوپر جالا رکھا اور اُس پر بالکل کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد اس نے سپاہیوں کو رخصت کرکے کہا کہ "میں خود اس معاملہ کی جانچ کروں گا" جب سب چلے گئے تو اس نے اُس عورت سے کہا کہ "میں تمھیں آزاد کرتا ہوں لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم فرانسیسی حدود کے اندر واپس جانے کی توقع کیسے کرتی ہو؟"

اس نے جواب دیا کہ "میرے ساتھ اس میدان میں آیئے جو اس مکان کے جنوب میں واقع ہے"۔

افسر اس کے ساتھ چلا اس حال میں کہ پیچھے پیچھے تین سپاہی چلے آرہے تھے، اس مقام پر پہونچکر وہ کھڑا ہوگیا اور وہ خاتون ڈری کہ یقیناً یہاں مجھے گولی سے مار دیا جائے گا۔ اور پھر میرے بھائی کی بھی خیر نہیں۔ لیکن افسر نے اس سے کہا کہ "تم فرانس کی رہنے والی نہیں ہو، بلکہ تمھارا وطن امریکہ میں ہے، میں نے تم کو تمھارے بھائی کے ساتھ کرلسبادا اور نیس میں دیکھا تھا، اس لئے تمھارے لئے یہ عذر بھی نہیں کہ وطن پرستی کے خیال سے فرانس کی مدد کرو، میں بھی جرمن نہیں ہوں اور اس لئے تمھیں رہا کرتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ تم یہاں سے سیدھی امریکہ جاؤ اور یہاں کی کوئی خبر کسی کو نہ پہونچاؤ"۔

خاتون نے اس کا وعدہ کیا اور ایک گھنٹہ کے بعد جب اس کا بھائی آیا تو اس کے ساتھ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر چلی گئی لیکن وہاں پہونچ کر اس نے کوئی بات کسی سے نہیں کی اور سیدھی پیرس پہونچکر وہاں سے امریکہ چلی گئی۔

دوست

حلقۂ احباب میں ہیں کیکڑے بھی ناگ بھی
لالۂ و گل بھی ہیں گلشن میں دہکتی آگ بھی

ہمرہانِ شوق کچھ معصوم کچھ چالاک ہیں
یعنی کچھ عیسیٰ نفس ہیں اور کچھ ضحاک ہیں

ایک ہی جادہ پہ ہیں زردار بھی دہقاں بھی آج
ایک ہی منزل پہ ہیں ابلیس بھی انساں بھی آج

چڑھ رہا ہے آج ہر پیتل پہ اک چاندی کا خول،
اللہ اللہ کنکروں کے ساتھ ہیروں کا تول

یہ تخاطب کی سجاوٹ یہ تکلم کا سنگار،
سادگی کے حلق پر آداب کے خنجر کی دھار

آہ یہ لہجوں کا مرہم آہ یہ لفظوں کے گھاؤ
ہر قدم پر اک گلستاں ہر قدم پر اک الاؤ

قدسیوں کی انجمن میں اہرمن زادے بھی ہیں
نور کی وادی میں لاکھوں آگ کے جادے بھی ہیں

ساغرِ زم زم میں بھر کر زہر بھی دیتا ہے وقت
ایک ہی شیشے سے دونوں کام اب لیتا ہے وقت

ساقی جاوید (بی۔اے)

نقوشِ مانیؔ :-

اندوہ کشِ طوفانِ بلا ساحل سے بھی گھبراتا ہے
اللہ یہ منزل کون سی ہے امید سے جی گھبراتا ہے

نازک تو ہے یارب وہ لیکن اب ختم ہو قصۂ تیغ و گلو
میں بھی جاں سے عاجز ہوں اور قاتل بھی گھبراتا ہے

تقدیرِ محبت ہی یہ ہے، بیتابیٔ دل کو کیا کہئے
ہنس بول کے تم نے تسلی دی کم بخت اب بھی گھبراتا ہے

ظاہر ہے کہ چارہ ہی کیا، اُس دل کا تمنا کیجئے
جس کو نگہِ دل جو سے تری تسکیں نہ ملی گھبراتا ہے

فرقت میں تصور سے تیرے کیا جانئے دل بہلا کہ نہیں
اس وقت تو نام بھر نہ لے، اس نام سے جی گھبراتا ہے

یہ میرا جنوں ہے یا اُن کا نیرنگِ نظر ہے اے مانیؔ
وہ جلوہ نما ہیں پھر بھی کبھی دل خوش ہو کبھی گھبراتا ہے

سکندر علی وجد :-

آج دیوانے بھٹک جائیں نہ منزل کے قریب — آ رہی ہے تری آوازِ قدم دل کے قریب
ناقصوں ہی نے سکھائے مجھے آدابِ نظر — بھول کر بھی نہ گیا میں کسی کامل کے قریب
طرفہ نیرنگ ہے پرسوز نواسنجی کا — بوئے گل پھیل گئی کنجِ عنادل کے قریب

وجد عالم تھا عجب حسن کی حیرانی کا
میں نے دستک جو نہ دی پردۂ محمل کے قریب

سوز جب دل میں اتر آتا ہے، — نغمہ آنکھو سے نظر آتا ہے
مسکراتا ہے گلستانِ حیات — جب کوئی تفتہ جگر آتا ہے
وہ مرا خواب میں آنے والا — نہیں آتا ہے مگر آتا ہے

وجد اب آنکھ نہ لگ جائے کہیں
کوئی ہمراہِ سحر آتا ہے

فضا جالندھری :-

طوفاں کی زد میں آئے تو ہم پر کھلا یہ راز — آغوشِ موج میں بھی ہیں ساحل جگہ جگہ
دل میں اٹھ کر دب گئی کچھ اس طرح موجِ نشاط — جام میں جیسے مئے گلگوں چھلک جانے کے بعد
حسن نے ایک اچٹتی ہی نظر ڈالی تھی — آج تک عالمِ حیرت میں ہے دیوانۂ عشق
مست ہیں اپنے ہی عالم میں ترے دیوانے — جنتِ عشرتِ سرمد ہے کہ ویرانۂ عشق
میں پرسشِ پنہاں کے اس انداز پہ قرباں — معصوم نگاہوں میں وہ مبہم سے اشارے
وہ میکدۂ شوق وہ یارانِ قدح نوش — پھرتے ہیں نگاہوں میں ابھی تک وہ نظارے
حیران ہوں خود میری سمجھ میں نہیں آتا — کس طرح غمِ ہجر کے دن میں نے گزارے

یادِ رفتگان

کلام آزاد انصاری مرحوم:-

ظاہر ہے کہ بیکس ہوں، ثابت ہے کہ بے بس ہوں — جو ظلم ہوا ہوگا برداشت کیا ہوگا،
بیدل بھی ہوں، شاداں بھی، شاکی بھی ہوں نازاں بھی — جو داغ دیا ہوگا، دلچسپ دیا ہوگا،

نام خدا جدھر گئے، دل میں اتر اتر گئے — خنجر آبدار ہو، دشنۂ تابدار ہو،

امید سو وہ مفقود، ارمان سو وہ محروم — اے وائے دل محروم، صد وائے دلِ محروم
اب دل کی نہ کچھ پوچھو، اب دل کا خدا حافظ — مایوس نہ کچھ مایوس، مسرور نہ کچھ مغموم

آپ نے درد سن لیا ہوتا — درد کی کچھ دوا نہیں نہ سہی
ترک حاجت بھی ممکنات سے ہے — کوئی حاجت روا نہیں نہ سہی

آہ مجھ سے مرے ارمان بھرے دل کے سکوں — وہ بھی دن ہوں گے کہ ارمان نہ ہوگا کوئی

اے کاش خبر ہوتی تو دل سے بھلا دے گا — اے کاش سمجھ سکتے تو مل کے دغا دے گا
تم جبر کئے جاؤ ہم صبر کئے جائیں — اللہ تو منصف ہے، اللہ جزا دے گا
آزاد گدا مشرب دنیا سے غرض مطلب — کوئی ہمیں کیا دے گا، دے گا تو خدا دے گا

تو اور چشم لطف نئی واردات ہے — میری نگاہ نے مجھے دھوکا دیا نہ ہو

تو اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے، — امید تو نہیں ہے مگر ہاں خدا کرے
قرار نام کی ساعت قریب آپہونچی — کسی کی یاد ذرا اور بے قرار کرے
خدا کے واسطے آ اور اس سے پہلے آ — کہ پاس چارہ تکلف انتظار کرے

دل اور ترے خیال سے راحت نہ پاسکے — شاید مرے نصیب میں راحت نہیں رہی
اک پائمال جور سے امید شکرِ جور، — جا شکر کر، کہ تابِ شکایت نہیں رہی

اگر آزاد سا درویش نظروں میں نہیں جنچتا، — تو جا اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

نگار کے خاص نمبر جو ... ہیں

سالنامہ سنہ ۱۹۴۰ء

[illegible] نمبر جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کیلئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری ۔ مارچ ۱۹۴۴ء

جو نفسیات و رومانیت پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۸ء

پاکستان نمبر، نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت اور قرون اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہو تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی فکر کے وقت اسلام کے دور زرین کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی عمارت کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کیے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیئے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۰ء

نگار کی ۳۰ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں سنہ ۱۹۲۲ء سے لیکر سنہ ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و اقتصادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعرا کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں "ادس ہندس" کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ (اقتباس) ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ مدیر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت دو روپیہ

سال کے بہ[illegible]

یہ [illegible] نفسیات کی اتنا مفید دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اسکو ایکبار ہاتھ میں لینے کے بعد اسوقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کرلیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ "زندہ رہنا بھی ایک فن ہے"

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

سالنامہ سنہ ۱۹۵۲ء

حسرت نمبر جس میں ملک کے تمام اکابر نے ادبی حصہ لیا ہے۔ اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لئے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے قیمت [illegible] روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ سنہ ۱۹۵۳ء

داغ نمبر جس میں داغ کے سوانح حیات بہ [illegible] پیش کیے گئے ہیں جو اسوقت تک سامنے نہ آئے تھے [illegible] حیدرآباد، زمانہ کے علاوہ ان کی حیات [illegible]

قیمت فی پرچہ پاکستان دو روپے

[illegible]

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان

آٹھ روپیہ (۱۲ سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کردینے والی
انجیل انسانیت
من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ مدت تصنیف و صحافت کا ایک غیرفانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبری و اخوت عامہ کے ایک رشتہ میں وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، صحف مقدسہ، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پرزور طریقہ سے بحث کی گئی ہے۔ ضخامت ۸۰۰ صفحات قیمت لو روپیہ [illegible] علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
کا
مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے۔ اصحاب کہف، معجزہ و کرامت، انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب، عقل، طوفان نوح، خضر کی حقیقت، مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں، یونس اور دہان ہی حسن یوسف کی داستان، تعارف، اسلام کا علم غیب، دعا، آدم، لقمان، عالم برزخ، یاجوج ماجوج، ابدیت، درود، حوض کوثر، امام مہدی، تزکیہ، [illegible] [illegible] ضخامت ۶۰۰ صفحات کاغذ سفید، قیمت [illegible]

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان جس شکل میں جس قبول عام حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ اب اس میں ایسے اضافے کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشن میں نہ تھے اور ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

حضرت نیاز کے افسانوں اور مقالات کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ آپ کو اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اور [illegible] متعدد افسانے اور مقالے [illegible] پہلے ایڈیشن میں نہ تھے۔

قیمت مجلد پانچ روپے آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں جذبات نگاری اور انشائے لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنہیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنادیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیرفطری قسموں کے حالات تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے روکنے میں کتنی سعی کی۔ اس کتاب میں آپ کو عجیب و غریب واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

اسے ضرور پڑھ لیجئے

"نگار" کے خریداروں کے لئے نہایت ضروری اعلان

نگار کی تاریخ اشاعت محکمۂ ڈاک کی طرف سے ہر مہینے کی ۷ر مقرر کردی گئی ہے اور اس کے بعد نگار کا جو پرچہ پوسٹ کیا جائے گا اس پر محصول ڈاک ایک پیسہ کی جگہ ڈیڑھ آنہ لگے گا۔

پرچہ نہایت احتیاط سے پوری طرح جانچ کرنے کے بعد ہر خریدار کے نام روانہ کیا جاتا ہے، لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی پرچہ راستہ میں گم ہوجاتا ہے اور خریداران نگار دوبارہ طلب کرتے ہیں۔ اس سے قبل تو ہم ایک پیسہ کا ٹکٹ لگاکر بھیج دیتے تھے، لیکن اب ڈیڑھ آنے فی پرچہ صرف کرنا مشکل ہے۔ اگر آپ نے ٹکٹ نہ بھیجکر پرچہ طلب کیا تو آپ کو لفافہ کی قیمت ملاکر ساڑھے تین آنے صرف کرنا پڑیں گے۔

اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو حضرات دوبارہ پرچہ طلب فرمائیں انھیں بیرنگ روانہ کیا جائے، ہر چند اس طرح انھیں تین آنے ادا کرنا پڑیں گے، لیکن پرچہ انھیں حفاظت سے پہونچ جائے گا۔

مہربانی فرماکر اپنے مقامی ڈاک خانوں اور حلقہ کے ڈاکیوں کو تاکید کرتے رہئے کہ وہ آپ کی ڈاک حفاظت سے پہونچائیں، کیونکہ اس کا امکان ہی نہیں کہ ہمارے یہاں سے کسی کے نام پرچہ روانہ نہ کیا جائے۔ مینجر

من و یزداں کامل

دوسرا اڈیشن

آپ کو معہ محصول آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں روانہ ہوگا، لیکن آپ اسے صرف سات روپیہ میں معہ محصول حاصل کرسکتے ہیں اگر آپ اسی کے ساتھ ذیل کی کتابیں بھی طلب فرمائیں :-

مذہبی مجموعہ استفسار و جواب -------- صہ؍

مذہب ------------ عہ؍

قول فیصل ------------ عا؍

شہوانیات ------------ للعہ؍

آپ کو یہ تمام کتابیں مع "من و یزداں" کے اکیس روپیہ کی بجائے اٹھارہ (۱۸) روپیہ میں، مع محصول کے مل سکیں گی۔

یہ رعایت ۳۰ر دسمبر ۱۹۵۳ء کے بعد ختم ہوجائے گی

مینجر نگار لکھنؤ

پاکستان کے تمام خریداران ہم کو دو طرح اپنا چندہ بھیج سکتے ہیں

(۱) آپ اپنا چندہ سالانہ آٹھ روپیہ (پاکستانی) ذریعہ منی آرڈر ذیل کے پتہ پر روانہ فرمائیں اور رسید منی آرڈر براہ راست ہمارے پاس بھیجدیں:-

ملک دین محمد اینڈ سنز۔ دارالاشاعت پُل روڈ۔ لاہور

منی آرڈر کے کوپن میں اپنا پورا پتہ و نمبر خریداری ضرور لکھدیں تاکہ ملک دین محمد ہمیں اسی کے مطابق اطلاع دیدیا کریں۔

(۲) آپ پاکستان پوسٹل آرڈر آٹھ روپیہ کا براہ راست ہمارے پاس بھیجدیں، لیکن وہ بالکل سادہ ہو۔ اس پر نہ نگار درج ہو، نہ لکھنؤ۔ ہم اس پوسٹل آرڈر کو اپنے ایجنٹ کے پاس پاکستان بھیجدیں گے اور وہ وصول کرے گا، لیکن پہلی صورت زیادہ بہتر ہے۔

پاکستان میں

حضرت نیاز فتحپوری کی جملہ تصانیف

اور نگار بک ایجنسی کی تمام مطبوعات

فیروز سنز۔ بندر روڈ۔ کراچی

سے براہ راست مل سکتی ہیں، ہمارے پاس آرڈر بھیجنے کی ضرورت نہیں

مینجر

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

مئی اور جون کے نگار میں ہم کافی وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ نگار کا آیندہ سالنامہ

"فرمانروایانِ اسلام"

نمبر کیا اور کیسا ہوگا

اور اس کی بعض خصوصیات کو بھی ظاہر کر چکے ہیں، لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے بعض حضرات اسکی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکے ہوں، ہم مکرر اس کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ سالنامہ در اصل "تاریخ اسلامی" کا نچوڑ ہوگا، جس میں عہد رسول اللہ سے لیکر اسوقت تک کی تمام چھوٹی بڑی مسلم حکومتوں کا ذکر ہوگا جو ۱۳ سو سال کے اندر تمام کرۂ ارض پر رونما ہوکر فنا ہوگئیں یا اب بھی باقی ہیں۔ اس میں تمام حکومتوں کے اسباب قیام و عروج و انحطاط و اختتام کے ذکر کے ساتھ تمام حکمرانوں کے نام ان کی حکومت کی مدت بقید سن ہجری و عیسوی درج ہوگی اور یہ بتایا جائے گا کہ ایک ہی خاندان سے اور کتنے خاندان پیدا ہوئے انھوں نے کہاں کہاں حکومتیں کیں اور ان کا کیا حشر ہوا۔

مسلمان اپنے زمانۂ عروج میں یوروپ، ایشیا، افریقہ کے ان بعید ترین گوشوں تک پہونچ گئے تھے جن کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کا علم بہت کم حضرات کو ہے۔ نگار کے اس سالنامہ کے ذریعہ سے "تاریخ اسلام" کی انھیں مفید و دلچسپ معلومات کو پیش کیا جائے گا، اس کے ساتھ دو نقشے ایسے پیش کئے جائیں گے جن کو دیکھکر مسلمانوں کے عروج و زوال کی تصویر آپ کے سامنے آجائے گی۔

یہ پورا سالنامہ خود اڈیٹر نگار مرتب کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ہم پہلی جنوری ۱۹۵۴ء تک اسے شایع کر سکیں گے، اس کی ضخامت کا صحیح اندازہ ابھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی بابت غالباً ہم کچھ کہہ سکیں گے۔ امید ہے کہ آپ اس کی توسیع اشاعت میں ضرور حصہ لیں گے اور اپنے حلقۂ احباب، مدارس کے طلبا و اساتذہ کو بھی اس سالنامہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کریں۔

یہ سالنامہ در اصل ایک مستقل کتاب ہوگی اور کتاب ہی سمجھ کر اس کو حاصل کرنا چاہئے

جو حضرات نگار کے خریدار نہیں ہیں اور صرف سالنامہ ہی لینا چاہیں گے ان کے لئے اس کی قیمت (علاوہ محصول ڈاک) تین روپے ہوگی۔

ایجنٹوں کو اپنا آرڈر جلد دیدینا چاہئے تاکہ اسی حساب سے اس کی کاپیاں زاید طبع کرائی جائیں۔

سالنامہ کی کتابت شروع ہوگئی ہے اور ۲ جنوری سنہ ۵۴ء کو شایع ہو جائے گا۔

ایجنٹ حضرات مطلع فرمائیں کہ انھیں سالنامہ کی کتنی کاپیاں درکار ہوں گی۔ قیمت تین روپیہ فی کاپی (علاوہ محصول) ایجنٹوں سے دو روپیہ چار آنے فی کاپی مع محصول۔

مینجر نگار لکھنؤ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ اکتوبر میں ختم ہوگیا اور نومبر کا "نگار" آٹھ روپیہ سات آنے میں وی پی ہوگا جس میں سالنامہ ۵۴ء کی قیمت بھی شامل ہے

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۴ | فہرست مضامین اکتوبر ۵۳ء | شمار ۴

ملاحظات

ہمارا نصابِ تعلیم

تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کا نصاب تعلیم جن اصول پر مقرر کیا گیا تھا وہ یکسر غیر ملکی تھا، اور ملک و قوم کا کوئی مستقبل واضعینِ نصاب کے سامنے موجود نہ تھا

انگریزوں کے سامنے صرف دو مقصد تھے، ایک یہ کہ انگریزی میں کام کرنے والے کلرک و عمال ان کو میسر آجائیں اور دوسرے یہ کہ ہندو مسلمان دونوں جماعتوں کے درمیان اتفاق و اتحاد نہ ہوسکے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے دونوں مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن اب کہ ملک آزاد ہوچکا ہے اور حکومت خود اپنی ہے، تعلیم کے مسئلہ کو بالکل مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھنا چاہئے، کیونکہ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے تمام اقتصادی مسایل اسی سے تعلق رکھتے ہیں

یہ مسئلہ اپنی جگہ بالکل طے شدہ ہے کہ ملک کے کسی فرد کو جاہل نہ رہنا چاہئے، لیکن یہ کوشش کہ ملک کا ہر ہر بچہ آیندہ چل کر حکیم و فیلسوف، یا ادیب و پروفیسر بنے بالکل بے معنی سی بات ہے جبکہ علمی قابلیت یا واقفیت عامہ کے لحاظ سے اسوقت کا گریجویٹ، انگریزی زمانہ کے گریجویٹ کے مقابلہ میں بھی طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتا ہے، چہ جائیکہ اس سے یہ توقع رکھنا کہ آیندہ چل کر وہ کوئی بڑی اہم ہستی بن سکے گا

نصابِ تعلیم کا یہ انحطاط تقسیم ہند سے پہلے ہی شروع ہوگیا تھا، لیکن اب وہ اپنے انتہائی نقطہ پر پہونچ گیا ہے کیونکہ ہماری حکومت ہر چیز کو قدامت پسندانہ نگاہ سے دیکھتی ہے اور حال و مستقبل کی گتھیوں کو ماضی کی روایات سے سلجھانا چاہتی ہے

سب سے پہلے جو چیز اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ مسئلۂ زبان ہے لیکن اس باب میں ہماری حکومت جس غیر معمولی عجلت سے کام لے رہی ہے اور ہندی کو ذریعہ تعلیم قرار دیکر وہ ملک کو بڑا نقصان پہونچا رہی ہے۔ کیونکہ ہندی ابھی ۵۰ سال تک اس قابل نہیں ہوسکتی کہ وہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش آسکے اور جب وہ اس منزل تک پہونچے گی تو دوسری زبانیں

بہت آگے بڑھ چکی ہوں گی اور اس طرح ہندی ہمیشہ ۵۰ سال پیچھے رہے گی

اصل مقصد ملک کی ذہنی ترقی ہے اور اس کے لئے کوئی ایسی قید لگانا جو حصول مدعا کے منافی ہو حد درجہ حماقت ہے۔ ضرورت تھی کہ انگریزی کو بدستور ذریعہ تعلیم برقرار رکھا جاتا اور ہندی و سنسکرت کو بتدریج ترقی دیجاتی یہاں تک کہ ان میں ذخیرہ علوم و فنون فراہم ہوجاتا اور عوام ان سے بخوبی آشنا ہوجاتے

خیر، یہ تو زبان کا مسئلہ تھا، لیکن اب نصاب کو دیکھئے تو وہ اور زیادہ ناکارہ نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ تعلیم کا مقصد کیا ہے اور لوگ اپنے بچوں کو کالج و یونیورسٹی میں کیوں بھیجتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ پڑھ لکھ کر اپنی روزی کمانے کے قابل ہوسکیں اور یہ مقصد قطعاً موجودہ تعلیم سے پورا نہیں ہوتا

یقیناً نہ حکومت تمام فارغ التحصیل طلبہ کو نوکریاں دے سکتی ہے اور نہ صنعتی اداروں میں ان کی کھپت ہوسکتی ہے کیونکہ وہ اس قابل ہی نہیں کہ وہاں کچھ کام کرسکیں، اس لئے ظاہر ہے کہ اس طرح ہر سال بیکار پڑھے لکھوں میں لاکھوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے جو بڑے خطرہ کی چیز ہے

ملک میں تعلیمی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کمیٹیاں مقرر ہوتی ہیں، ماہرین فن کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں، اصلاحات کی طویل فہرستیں مرتب کی جاتی ہیں، لیکن یہ سب کام اسی دائرہ کے اندر رہ کر ہوتا ہے جو پہلے بن چکا ہے، اس سے باہر قدم نکال کر غور نہیں کیا جاتا۔ وہ امتحانات کے طریقوں میں ردوبدل کی سفارش کرتے ہیں، بعض امتحانات کو حذف کردینے کی رائے دیتے ہیں لیکن اس پر کوئی غور نہیں کرتا کہ جو طلبہ یونیورسٹیوں سے فارغ ہوکر نکلتے ہیں وہ کس مرض کی دوا ہیں

ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اور دنیا کی کوئی چیز معدنی و غیر معدنی ایسی نہیں جو یہاں موجود نہ ہو، لیکن نہ اس سے پورا فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور نہ ملک کے فرزندوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا اہل بنایا جاتا ہے، یہاں تک کہ بیکاری اور اقتصادی بے چینی روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور حکومت و عوام کے تعلقات ناخوشگوار ہوتے جاتے ہیں

اس وقت ترقی کا ذریعہ دنیا میں صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ملک کو یکسر صنعتی بنادیا جائے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ ملک کے فرزندوں میں اسکول و کالج ہی کے زمانہ سے میکانکی و صنعتی ذہنیت پیدا نہ کریں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ امریکہ، روس، چین و جاپان، ہر جگہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اب ادیب و شاعر، فلسفی و پروفیسر کی جگہ صرف انجینیر پیدا کئے جاتے ہیں اور وہاں کے طلبہ کو صرف ان فنون کی تعلیم دیجاتی ہے جو ابتدا ہی سے ان میں خود اعتمادی پیدا کردیتی ہے پھر کس قدر عجیب بات ہے کہ ہم اپنے ملک کو صنعتی ملک تو بنانا چاہتے ہیں لیکن نصاب تعلیم یکسر غیر صنعتی رکھتے ہیں

کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بعض طلبہ میڈیکل لائن میں چلے جاتے ہیں اور بعض انجینیری میں، لیکن اول تو وہ مشکل سے امتحان مقابلہ میں کامیاب ہوتے ہیں اور جو موجود بھی ہیں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر پرائمری درجوں سے ٹکنکل تعلیم کا انتظام کیا جائے اور بچوں کے رجحانات معلوم کرکے انھیں کے مطابق ہائی اسکول اور کالج میں ان کو اپنے ذوق کی تکمیل کا موقع دیا جائے تو وہ آگے چل کر خود اپنے لئے بھی مفید ہوسکتے ہیں اور ملک کے لئے بھی — دوسرے ملکوں میں چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتیں اس قدر ترقی کرگئی ہیں کہ گھر کا کوئی فرد بیکار نہیں رہتا اور ہر شخص کچھ نہ کچھ کمالیتا ہے، لیکن اس میں کامیابی اسی وقت ہوسکتی ہے جب ابتدائی تعلیم اسی نہج سے شروع ہو۔ یقیناً ملک کا ہر فرد ماہر انجینیر نہیں بن سکتا، لیکن ہمارے دنیاوی و معاشی نظام میں جن افراد کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب انجینیر ہی نہیں ہوتے بلکہ کاریگر ہوتے ہیں اور یہی ہم کو پیدا کرنا ہیں

بہرحال ہم سمجھتے ہیں کہ تعلیم کا مسئلہ اسوقت کا اہم ترین مسئلہ ہے اور اگر موجودہ نصاب تعلیم کو بدل کر اسے ملک و قوم کے لئے مفید نہ بنایا گیا تو تعلیمی اداروں کا کام صرف انارکسٹ پیدا کرنا رہ جائے گا۔

مومن کا تغزل

(بہ سلسلۂ ماسبق)

مومن کی غزلیہ شاعری کے بنیادی اور اہم پہلوؤں پر دوسرے ارباب قلم کے جن خیالات سے مجھے اختلاف رہا ہے وہ معرضِ بحث میں آچکے ۔ لیکن یہاں تک جو کچھ لکھا گیا اس سے میرا مقصود نہ تو مومن کے نقادوں کی تنقیص ہے اور نہ خود مومن کی تحقیر۔ ممکن ہے کہ دوسروں کے خیالات کی تردید میں، میں نے جو کچھ کہا ہے وہ بھی غلطیوں سے خالی نہ ہو۔

اس مقالہ میں، میں نے کئی جگہ مومن کی شاعری کے ناقص پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے لیکن اس سے میرا مقصد مومن کی تضحیک و تحقیر ہرگز نہیں، میں مومن کے تغزل کا قایل ہوں ۔ اس مقالہ میں جابجا ان کے تغزل کے محاسن کا اعتراف کیا گیا ہے ۔ اب آپ ان کی غزلیہ شاعری کے اس حصے کو ملاحظہ فرمائیں جس کا حسن اور لطف میرے نزدیک کسی دور میں ختم ہونے کا نہیں کیونکہ اس کی بنیاد خلوص پر ہے اور بقول شیفتہ اس میں "سچی سچی باتیں ہیں پوری پوری حالت ہے"

مومن کا یہ شعر کس نے نہ سُنا ہوگا ؎

تم مرے پاس ہوتے ہوئے گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کے پرستار پروفیسر ضیا نے اپنے مضامین میں جہاں جہاں اس شعر کا حوالہ دیا ہے وہاں اس کے متعلق غالب کا یہ جملہ بھی لکھا ہے :۔ "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دیدیتا" اس میں شک نہیں کہ یہ شعر مومن کے بہترین اشعار میں سے ہے ۔ لیکن اسی زمین میں مومن کے اور بھی جواہر ریزے ہیں جن کی طرف عموماً توجہ نہیں کی جاتی ؎

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا
آہ طول امل ہے روز افزوں گرچہ اک مدعا نہیں ہوتا
دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں سو تمھارے سوا نہیں ہوتا

مومن کی شاعری میں ناصح اور رقیب کا عمل دخل بہت زیادہ ہے ۔ یوں بھی اُردو شاعری میں ناصح اور رقیب کا ذکر اتنی کثرت سے کیا گیا ہے کہ ان دونوں کا نام لیتے وقت ذہن میں صرف ایک روایت کا خیال آتا ہے اور بس۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہماری شاعری میں ناصح اور رقیب سے متعلق جو مضامین باندھے گئے ہیں وہ زیادہ تر رسمی اور روایتی ہیں۔ بایں ہمہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک عاشق کی راہ میں ناصح اور رقیب بھی آتے ہیں لہذا اگر کسی کی عشقیہ شاعری میں ان دونوں سے متعلق اچھے اشعار ملیں تو ان کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں ناصح سے متعلق مومن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

کہنا پڑا مجھے پئے الزام پند گو وہ ماجرا جو لائق شرح و بیاں نہیں

اے ناصحو آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو
ہم کو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

ہوش گئے یاں دل سے پہلے ہووے سمجھ تو سمجھیں بات
یہ تو سمجھئے حضرت ناصح آپ کسے سمجھاتے ہیں،

تو نہ جانے عشق بازی اور ہم نادان ہوں
بے سمجھ کہتا ہے ناصح تو نے کیا سمجھا ہمیں

کیا کروں کیونکر رکوں ناصح رکا جاتا ہی دل
پیش کیا چلتی ہے اُس سے جس پہ آجاتا ہی دل

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آگیا
ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا

ناصح یہ گلہ کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
تو کب مری سنتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

عام طور پر ناصح سے متعلق اشعار اپنے اندر مزاح کی چاشنی لئے ہوتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض تفننِ طبع کے طور پر کہے گئے ہیں لیکن مومن کے مندرجۂ بالا اشعار کا انداز ان سے قطعی مختلف ہے۔ ان سے یہ بات واضح طور پر مترشح ہے کہ یہ اشعار ان جذبات و تاثرات کی ترجمانی کے لئے کہے گئے ہیں جو عشق و محبت سے باز آنے کی نصیحتیں سُن کر ایک عاشق کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان اشعار میں ناصح کی تضحیک کہیں نہیں کی گئی البتہ اس کو محبت آشنا دل کی مجبوریاں سمجھانے کی کوشش ضرور کی گئی ہے اور وہ بھی ایسے پیرائے میں کہ ان اشعار کو پڑھتے وقت عاشق کی دل سوزیوں میں شریک ہونے کے باوجود ناصح سے نفرت نہیں پیدا ہوتی البتہ اُس پر رحم ضرور آتا ہے۔

رقیب سے متعلق بھی مومن کے دو تین شعر سن لیجئے :۔

جان نہ کھا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

یاس دیکھو کہ غیر سے کہہ دی
بات اپنی امیدواری کی

جن لوگوں نے اُردو شاعری کے دواوین کا مطالعہ کیا ہے وہ ان دواوین کے صفحات پر ایسے عاشقوں سے دوچار ہوئے ہوں گے جو محبوب کے جور و ستم ناز و غزور، بے التفاتی و بے وفائی، کم نگاہی و کج ادائی، ان تمام چیزوں کو شربت کی طرح پی جاتے ہیں۔ اور ان کے خلاف لب کشائی کو شانِ عاشقی کے منافی گردانتے ہیں، حالانکہ ایک گوشت پوست کے بنے ہوئے عاشق کے لئے تسلیم و رضا کا مجسمہ بن جانا ممکن نہیں۔ چنانچہ محبت میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب کہ عاشق اپنی تمام چاہت اور محبت کے باوجود محبوب سے روٹھ جاتا ہے، اس سے رشتۂ محبت منقطع کر لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے، اُس کو سخت سُست باتیں کہہ دیتا ہے۔ اُس کو منانے کی بجائے خود منائے جانے کا آرزومند ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس قسم کے جذبات ہنگامی ہوتے ہیں۔ رنجش اور خفگی کے عالم میں عاشق جن باتوں کا ارادہ کر لیتا ہے انکو عمل میں لانے پر قادر نہیں ہوتا اور کچھ ہی دیر میں اپنے دل کے ہاتھوں اس شعر کا مصداق بن جاتا ہے:۔

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں، پھر وہی زندگی ہماری ہے

چونکہ مومن کا عشق بھی ایک گوشت پوست کے انسان کا عشق ہے لہٰذا وہ بھی اپنے عشق کے باوجود محبوب کے سامنے ہمیشہ سرِ تسلیم خم کئے نظر نہیں آتے۔ بلکہ خاموش شکایت سے لیکر برملا طعن و طنز تک تمام مرحلوں سے گزرتے دکھائی دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم
بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

پکھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو
سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

بے وفا کہنے کی شکایت ہے
تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا

جن سے منظور وفا ہے، ہو جفا بھی ان پر
مجھ سے کچھ کام نہیں ہے تو ستاتے کیوں ہو

تڑپنے لوٹنے رونے کا باعث تجھ پہ بھی کھلتا
ترے دل کو بھی میری سی اگر لگ جاتی تو

عیش میں بھی تو نہ جانے کبھی تم کیا جانو
کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے

بخت بد سے یہ ڈرا یا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں
تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

آپ کی کون سی بڑھی عزت
میں اگر بزم میں ذلیل ہوا

جب دل میں جذبات کا طوفان برپا ہوتا ہے تو انسان اظہار تمنا اور عرض مدعا سے قاصر رہتا ہے اور اگر کچھ کہنے کی کوشش کرتا بھی ہے تو الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ بلکہ وفور جذبات کے باعث لبوں سے الفاظ نکلنے کے بجائے آنکھوں سے صرف آنسو نکلتے ہیں۔ مومن نے اس کیفیت کی کتنی عمدہ تصویر کھینچی ہے:۔

نالہ ہی نکلے ہے گو ہم مدعا کہنے کو ہیں
لب نہیں کھنے میں اب کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

مومن نے اس زمین میں اور بھی کئی عمدہ شعر کہے ہیں ؎

دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب برا کہنے کو ہیں

ترجمان التماس شوق ہے تغیر رنگ
جوں زبان شمع عاشق بے صدا کہنے کو ہیں

شکوہ حرف تلخ کا یا شوربختی کا گلہ
ہم جو کچھ کہنے کو ہیں سو بے مزا کہنے کو ہیں

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ
آرزو ہائے دل رشک آشنا کہنے کو ہیں

محبوب نے عاشق کی چشم شوق پر افشائے محبت کا الزام عاید کیا۔ عاشق الزام کی تردید میں کہتا ہے کہ خود تمھاری محجوب نگاہی نے راز محبت کو فاش کرنے میں کون سا دقیقہ اٹھا رکھا تھا جو چشم شوق کو ملزم ٹھہراؤں ؎

میں اپنی چشم شوق کو الزام خاک دوں
تیری نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

دیوان مومن میں کئی مسلسل غزلیں ملتی ہیں۔ ایک غزل میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ اگر ہم دام محبت میں گرفتار نہ ہوتے تو روح و قلب کی کن اذیتوں سے محفوظ رہتے۔ دو چار شعر سے قطع نظر پوری غزل مرصع ہے اور ہر شعر درد و حسرت کا مرقع۔ ملاحظہ ہو ؎

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم
تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم

اگر نہ ہاتھ میں اس دلربا کے دل دیتے
تو دل پہ ہاتھ سدا دھر لیا نہ کرتے ہم

اگر نہ دام میں زلف سیہ کے آجاتے
تو یوں خراب و پریشاں رہا نہ کرتے ہم

اگر نہ لگتی چپ اس بدگماں کی شوخی سے
تو بات بات میں مضطر ہوا نہ کرتے ہم

اگر جلاتے نہ اس شعلہ رو کے عشق میں جی
تو سوز آتش غم سے جلا نہ کرتے ہم

نہ جاتے اس بت ہرجائی کی گلی میں اگر
تو دوڑے دوڑے تلق سے پھرا نہ کرتے ہم

اس آفت دل و جاں پر اگر نہ مرجاتے
تو اپنے مرنے کی ہر دم دعا نہ کرتے ہم

نہ بھرتے دم جو کسی شعلہ رو کی خواہش کا
تو ٹھنڈی سانس ہمیشہ بھرا نہ کرتے ہم

اگر نہ آنکھ تغافل شعار سے لگتی،
تو بیٹھے بیٹھے ہی یوں چونک اٹھا نہ کرتے ہم

نہ ہوش کھوتے اگر اس پری کی باتوں پر
تو آپ ہی آپ یہ باتیں کیا نہ کرتے ہم

اگر نہ ہنستا ہنسنا نا کسی کا سمجھا جاتا   تو بات بات پہ یوں رو دیا نہ کرتے ہم
اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ   تو ایک ایک کے منھ کو تکا نہ کرتے ہم

نظیری نیشاپوری کی ایک مشہور مسلسل غزل ہے ؎

چشمش برا ہے میرو و مژگانِ نمناکش نگر   در سینہ دارد آتشے پیراہنِ چاکش نگر

جیساکہ مطلع سے ظاہر ہے اس غزل میں نظیری نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ اس کا محبوب خودکسی اور کا والہ وشیدا ہوگیا ہے۔ پوری غزل اُن واقعات کی ایک دلکش تصویر ہے جو ایسی حالت میں محبوب کو پیش آسکتے ہیں۔ غالبًا اسی غزل سے متاثر ہوکر غالب نے بھی اسی زمین میں اسی مفہوم کی غزل لکھی ہے جس کا مطلع یہ ہے :-

درگریہ ازبس ناز کی سخ ماندہ برخاکش نگر   واں سینہ سودن از تپش برخاک نمناکش نگر

کیفیت تغزل کے اعتبار سے نظیری کی غزل غالب سے بدرجہا بلند ہے۔ اُردو میں اس انداز اور اس معیار کی غزل جہاں تک مجھے علم ہے مومن کے سوا کسی اور نے نہیں لکھی۔ نظیری کی طرح مومن کی غزل بھی غالب سے برتر و بہتر ہے، مجھے اس غزل کے مطلع کا پہلا مصرع اور ایک شعر (سرمہ دینے لگتے ہو جس وقت رونا آئے ہے) کیونکہ میرے خیال میں مطلع کا پہلا مصرع "محض برائے بیت" کہا گیا ہے اور متذکرہ شعر کا مضمون غزل کے دوسرے اشعار سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اب آپ پوری غزل ملاحظہ فرمائیں اور اس پر مومن کے نقادوں کی خاموشی کا جس قدر ماتم کرسکیں کرلیں ؎

کیوں بنی خوں نابہ نوشی بادہ خواری آپ کی   کس لئے ہے بےخودی، غفلت شعاری آپ کی
کیوں دم جانانہ کے بدلے ہے ازخود رفتگی،   کس لئے شوخی ہوئی ہے بیقراری آپ کی
منفعل ساز دم ناہید سے نغمے کیا ہوئے   کیوں گزرتی ہے فلک سے آہ وزاری آپ کی
آشنا سے ہوگئے بیگانگی جاتی رہی،   ہوگئی کس آشتی دشمن سے یاری آپ کی
بوئے گل سے ہو مکدر کس کی بو آئی ہے یاد   خاک اُڑانے کیوں لگی بادِ بہاری آپ کی
عشقِ مہ رو میں تڑپتے ہو نہیں تو کس لئے   جوں کتاں ہر شب قبا ٹکڑے ہے ساری آپ کی
مجھ کو حیراں دیکھ کر حیراں رہ جاتے ہو کیوں   ایسی محوِ یاس ہے امیدواری آپ کی
جی جلا جاتا ہے کیوں ہر لحظہ کس پر دل گیا   لے گئی قابو سے جاں بےاختیاری آپ کی
کیوں ہے رنگ زرد پر گلگونہ اشک سرخ کا   کس لئے ملنے لگی رنگت ہماری آپ کی
ہائے کیا بیتاب ہوکر دھر لیا سینے پہ ہاتھ   کھل گئی مہوش مجھے سے دلفگاری آپ کی
سُرمہ دینے لگتے ہو جس وقت رونا آئے ہے   بارے ہے اب تک تو باقی شرمساری آپ کی
دل گیا دم پر بنی آنکھیں لڑیں کہتا ہو دل   بیقراری، آہ و زاری، اشکباری آپ کی

کس صنم کی بندگی میں بُت پرستی چھوڑ دی
ہوگئی مومن کی سی کیوں دینداری آپ کی

مومن کی ایک مسلسل غزل ہے جس میں انھوں نے عاشقانہ مجبوریوں اور والہانہ بےاختیاریوں کی طرف بڑے دلکش پیرایہ میں اشارا کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے   وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے
ٹھہری ہے کہ ٹھہرائیں گے زنجیر سے دل کو   پر برہمئ زلف کا سودا نہ کریں گے

گر آرزوئے وصل نے بیمار کیا تو
پرہیز کریں گے پہ دوا دا نہ کریں گے

رکھ لیویں گے پتھر مگر اُن سنگ دلوں کو
چھاتی سے لگانے کی تمنا نہ کریں گے

گر حسن گلو سوز نے پھر آگ لگائی
کیوں آب دم تیغ سے ٹھنڈا نہ کریں گے

جوں قبلہ نما گرچہ تڑپتے ہی کٹے عمر
پر منھ سوئے دیر صنم آرا نہ کریں گے

اے حضرتِ مومن یہ مسلم جو ہے ارشاد
بھولے سے کبھی اب ذکر بتوں کا نہ کریں گے

لیکن جو بتوں نے ہی بھلا آپ سے کی بات
پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کریں گے

اسی زمین میں مومن کی ایک اور غزل ہے جو مسلسل نہیں ہے۔ اس غزل کا ایک شعر ہے :-

کیونکر یہ کہیں منتِ اعدا نہ کریں گے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

نفسیاتِ محبت کا کتنا صحیح مطالعہ ہے اور اس کے اظہار میں کس قدر صداقت سے کام لیا گیا ہے۔

مومن کی ایک اور مسلسل غزل ملاحظہ ہو جو نہ صرف ان کی مسلسل غزلوں بلکہ تمام غزلوں میں سب سے زیادہ مشہور و بول ہے۔ مومن کے متذکرہ نقادوں نے اپنے مضامین میں اس غزل کے متعلق کچھ کہنا تو درکنار کسی عنوان سے اس کا له اور اقتباس تک نہیں دیا۔ حالانکہ اس میں شک نہیں کہ یہ غزل مقبول عام ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول خواص ی ہوگی اور مومن کے نقاد بھی اس سے لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔ اس غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی بنیاد مومن کے فلک پیما تخیل پر نہیں بلکہ اُن تجربات پر ہے جو اُن کو محبت میں پیش آئے یا جو محبت میں کسی کو بھی پیش آسکتے ہیں معاملہ بندی کا اس قدر دل آویز نمونہ دوسرے شعرا کے یہاں مشکل سے مل سکے گا ؎

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامت اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بُری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آں صدا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اب کچھ اور اشعار بغیر کسی تمہید و تشریح کے سنئے اور لطف اٹھائیے ؎

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے
جی بلا سے رہا نہ رہا

شب غم فرقت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا
دم رکے تھا سینے میں کم بخت جی گھبرائے تھا

یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا
تھے غلط پیغام سارے کون یاں تک آئے تھا

ہو گئی دو روز کی الفت میں کیا حالت ابھی
مومن وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

کیا خجل ہوں اب علاج بے قراری کیا کروں
دھر دیا ہاتھ اس نے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اُس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جواب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

یہ کسی سے ہو کہ ان کے لطفوں پہ گستاخی نہ ہو
غیر ہم سا کب ہوا ہر چند ہم سا ہو گیا

شعلۂ دل کو ناز تابش ہے
اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

آنکھیں جو ڈھونڈتی ہیں نگہ ہائے التفات
گم ہونا دل کا وہ مری نظروں سے پا گیا

بے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے
کیا کیجئے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

اے دل وہ شوخ ستمگر تو یک طرف
پیغام لے کے بھی کوئی آیا نہیں ہنوز

کیا دکھ نہ دیکھے عشق میں کیا کیا نہ پائے داغ
زخموں پہ زخم جھیلے ہیں داغوں پہ کھائے داغ

لے شب وصل غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

ڈوبا جو کوئی آہ کنارے پر آ گیا
طغیان بحر عشق ہے ساحل کے آس پاس

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

ہے منتوں کا وقت شکایت رہی وہی
آئے تو ہیں منانے کو پر وہ عتاب میں

اے حشر جلد کر تہہ و بالا جہان کو
یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

اُس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

صبح عشرت وہ نہ شام وصال
ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

عابد فریب شوخی و رغبت فزا نگاہ
میں کیا کسی سے صبر تجھے دیکھ کر نہ ہو

اعجاز سے زیادہ ہے سحر اُس کے ناز کا
آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیاں نہ ہو

اک لحظہ نہیں قرار جی کو
موت آئے بس ایسی زندگی کو

یارب وصال یار میں کیونکر ہو زندگی،
نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

دست جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا
اُلجھا ہے ان سے شوخ کے بند قبا کے ساتھ

حال دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے
سر اُٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے

کہیں تو کیا کہیں اور بن کہے کیونکر دوا ہوئے
بڑی مشکل پڑی کیا چارۂ درد نہاں کیجئے

ہو کے آزردہ پشیماں ہوں کہ میں جس سے کہوں
وہی کہہ دے کوئی ایسے سے خفا ہوتا ہے

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے
میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

گھر تو اس ماہ وش کا دور نہ تھا
لیک طالع نے نارسائی کی

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

کیا کیا جواب شکوہ میں باتیں بنا گیا
لو اب بھی دل درست اُسی دل شکن سے ہے

میں بھی کچھ خوش نہیں دغا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے
کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے

اُردو کی عشقیہ شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس میں عاشق اور محبوب دو الگ الگ خانوں میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ عاشق صرف عاشق ہے اور معشوق صرف معشوق ۔ حالانکہ واقعات کی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا ۔ جو عاشق ہے وہ محبوب بھی ہوتا ہے اور جو محبوب ہے وہ عاشق بھی ۔ مومن کا یہ شعر اسی حقیقت کا اظہار ہے ؎

ہیں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا

لیکن افسوس یہ ہے کہ اُردو کے دوسرے شعرا کی طرح مومن کی شاعری بھی عاشق اور محبوب کے درمیان اُسی فرق کی آئینہ دار ہے جو صید و صیاد کے مابین پایا جاتا ہے ۔ اُن کی شاعری کے مطالعہ سے اس نتیجہ تک پہنچنا ممکن نہیں کہ مومن صرف صید نہ تھے صیاد بھی تھے اور اُن کا محبوب محض صیاد نہ تھا صید بھی تھا ۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ انھوں نے اپنے محبوب کے مرثیے میں اس قسم کے اشعار بھی کہے ہیں ؎

افسوس کوئی پردہ نشیں پردہ در نہیں وہ حسن جس سے عشق ہو رسوا نہیں رہا
دل میں جگہ نہ ہونے کا کس سے گلہ کروں وہ قدر دانِ شکوۂ بیجا نہیں رہا

تو میرے دل میں بے اختیار یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ کاش ! مومن نے اپنی غزلیہ شاعری میں بھی اپنے محبوب کی وہی تصویر پیش کی ہوتی جو مندرجۂ بالا دو شعروں کے آئینے میں نظر آ رہی ہے اگر انھوں نے ایسا کیا ہوتا تو وہ اُردو کی غزلیہ شاعری میں ایک زبردست انقلاب اور روایت کے بانی ہوتے ۔

بہرحال مومن اُردو شاعری کے غیر صحت مندانہ روایات کا شکار ہونے کے باوجود جس حد تک صالح تغزل کا حق ادا کر سکے وہ ان کو اُردو کے چند بڑے غزل گو شعرا کی فہرست میں شامل کرنے کے لئے کافی ہے ۔ اُردو شاعری میں ان کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے کلام سے اُن کے بعد کے کئی شاعر متاثر ہوئے ۔ حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فراق گورکھپوری وغیرہ کی شاعری مومن کے فیضان سے انکار نہیں کر سکتی ۔

نظیر صدیقی

(نگار) جناب نظیر صدیقی کا یہ مقالہ بغیر کسی حذف و اضافہ کے شایع کیا گیا ہے، کیونکہ اول تو مقالہ نگار کی خواہش یہی تھی اور دوسرے اس لئے کہ اس وقت تک مومن کے متعلق جن جن حضرات نے جو کچھ لکھا ہے ان سب کا ذکر اس میں آ گیا ہے اور میں خود بھی چاہتا تھا کہ یہ سب یکجا ہو جائے علاوہ اس کے یوں بھی مناسب نہ تھا کہ اگر کسی کو نقادانِ مومن کی رائے سے اختلاف ہے تو اس کو شایع نہ کیا جائے ۔ خیال تھا کہ نظیر صدیقی کے مضمون پر ایک تبصرہ کیا جائے، لیکن بعد کو یہ خیال ترک کر دیا گیا، کیونکہ یہ بجائے خود ایک مستقل مضمون ہو جاتا اور اس سلسلہ کو زیادہ بڑھانا مناسب نہ تھا ۔ جناب نظیر صدیقی نے مومن کی شاعری کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے، وہ اپنے استدلال کے لحاظ سے بعض جگہ یقیناً قابلِ قبول ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مومن کی جن کمزوریوں کو مقالہ نگار نے ظاہر کیا ہے، کیا مومن کے صحیح ذوقِ تغزل کا تعلق انھیں سے تھا ۔ میر ایسے مسلم الثبوت غزل گو کے کلام میں بھی ہم کو متعدد اشعار ایسے ملتے ہیں، جو واقعتاً میر کے لئے ننگ ہیں، لیکن میر کا صحیح ذوق سمجھنے کے لئے ان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔ یہی حال دوسرے اساتذۂ فن کا تھا کہ انھوں نے جو کچھ کہا وہ بغیر انتخاب کے شایع کر دیا اور لوگوں کو نکتہ چینی کا موقع مل گیا ۔ غالب کا دیوان تو بڑی کانٹ چھانٹ کے بعد شایع ہوا، لیکن وہ بھی سخیف اشعار سے پاک نہ رہ سکا ۔ ایک نقاد کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ شاعر کے حقیقی فن کو معلوم کرے اور نظیر صدیقی نے ایسا نہیں کیا ۔ اس سلسلہ میں یہ بحث ضرور پیدا ہوتی ہے کہ ہم ایک شاعر کے طبعی میلان کا حال کیونکر معلوم کر سکتے ہیں، جبکہ اس کے یہاں رطب و یابس سبھی کچھ پایا جاتا ہے، لیکن یہ مسئلہ زیادہ دشوار نہیں، کیونکہ ایک شاعر کا حقیقی رنگ وہی ہے جس کو وہ زیادہ کامیابی کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اسی کو سامنے رکھ کر اظہار رائے کرنا چاہئے ۔ غالب کے کلام پر جب اظہار رائے کیا جاتا ہے تو کسے "جبھی [illegible]" کو کوئی سامنے نہیں رکھتا، اسی طرح اگر مومن کے رنگ تغزل پر گفتگو کرنا ہو تو "غلس میں ہیں کے تجلی شمع شبستاں جھلے" کو سامنے رکھنا چاہئے ۔ مقالہ نگار نے آخیر میں مومن کے جس رنگ تغزل کو سراہا ہے وہی مومن کا اصلی رنگ ہے اور نظیر صدیقی کو وہی اپنے سامنے رکھنا چاہئے تھا ۔

"دُنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے"

یہ بہت مشہور مقولہ ہے اور بالکل درست ہے۔ آج دُنیا میں بہت سی ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جن کو ہم بالکل نیا سمجھتے ہیں حالانکہ موجودہ علمی و اخلاقی دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پہلے نہ پڑ چکی ہو اور آج کے لوگوں نے اپنا چراغ پچھلے لوگوں کے چراغ سے روشن نہ کیا ہو۔

آجکل بھاپ کی قوت سے بہت سے کام لئے جاتے ہیں اور ریل گاڑیاں سب بھاپ ہی کی قوت سے چلتی ہیں، لیکن یہ کوئی نیا انکشاف نہیں ہے قدیم زمانہ میں بھی بھاپ کی مدد سے پنکھے چلائے جاتے تھے، چھاپہ کے فن نے آج غیر معمولی ترقی کرلی ہے لیکن یہ فن بھی ہمارے اسلاف کو معلوم تھا اور مسیح کی پیدائش سے بہت پہلے روما کے کمہار برتنوں پر اپنا نام ٹائپ سے نقش کر دیتے تھے اور نویں صدی عیسوی میں تو چین میں بلاک کے ذریعہ سے کتابیں چھاپنا بکثرت رائج تھا۔

قدیم اسکندریہ میں سڑکوں پر جا بجا ستون نصب کئے گئے تھے اور لوگ ان پر گوند سے اشتہار چسپاں کرتے تھے۔ اہلِ روما تو اپنے اشتہار بڑے بڑے تختوں پر بھی سُرخ اور سیاہ حرفوں میں دیتے تھے۔

اُر کے کھنڈروں سے پتہ چلتا ہے کہ عراق میں سُمیری لوگ بھی مسیح سے ۳۵۰۰ سال قبل نہ صرف اسفلٹ (ڈامر تارکول) اور اسبسٹوس (Asbestos) سے کام لیتے تھے بلکہ مکانات کی تعمیر میں سیمنٹ اور کنکریٹ سے بھی کام لینا جانتے تھے۔

آگ بجھانے کا انجن سب سے پہلے مسیح سے ۲۰۰ سال قبل ایک یونانی شخص Ctesibius نے ایجاد کیا تھا اور مسیح سے ایک صدی قبل روم میں آگ بجھانے کے لئے ایک پورا عملہ مقرر تھا۔

قدیم زمانہ میں از خود کام کرنے والی مشینوں کا پایا جانا بھی تاریخ سے ثابت ہے، چنانچہ اسکندریہ کے مندر میں ایک مشین ایسی نصب تھی جس کے اندر سکّہ ڈالنے سے مقدس پانی کی ایک مقدار حاصل کی جاسکتی تھی۔ مصر میں طولمی بادشاہوں کے عہد سے پہلے مشینی آدمیوں کا بھی وجود پایا جاتا تھا

نہ ٹوٹنے والا شیشہ بھی قدیم زمانہ میں ایجاد ہو چکا تھا جو چوٹ لگنے سے پچک جاتا تھا اور پھر ہتوڑی کی ضرب سے اس کی پچک دور کر دی جاتی تھی۔ قدیم روما میں ایسا شیشہ بنانے کی صنعت عام تھی لیکن آج تک اس کا راز کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔

مصری مومیاؤں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ سن کے ریشوں سے کپڑا طیار کرنا وہاں کی بڑی اہم صنعت تھی۔ عہد نامۂ عتیق سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیسا کے پردے اور پادریوں کے لبادے اسی کپڑے کے ہوتے تھے تین تین ہزار سال قبل کی جو مومیائی شدہ لاشیں اس وقت دستیاب ہوئی ہیں وہ اسی کپڑے میں لپٹی ہوئی ہیں درانحالیکہ کپڑے کی چمک اور اس کا رنگ جوں کا توں باقی ہے۔

اس وقت پارچہ بافی کے فن نے بڑی ترقی کرلی ہے لیکن قدیم مصریوں میں یہ فن اب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اسوقت

تو مشین کے ذریعہ سے سوت مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ باریک کاتا جا سکتا ہے، لیکن قدیم مصری بغیر کسی مشین کی مدد سے اتنا ہی باریک سوت کات لیتے تھے۔

افلاطون نے ایک الارم گھڑی بنائی تھی جس میں ایک ٹیڑھی نلکی کے ذریعہ پانی تیزی سے آتا تھا اور سیٹی کی سی آواز اس سے پیدا ہوتی تھی۔ افلاطون اس الارم گھڑی کے ذریعہ سے اپنے شاگردوں کو صبح چار بجے جگایا کرتا تھا

قدیم مصر میں بیک وقت سات سات ہزار مرغی کے انڈوں سے گرمی پہونچا کر بچے نکالے جاتے تھے، حالانکہ اس وقت جو incubators اس غرض سے طیار کئے گئے ہیں وہ چند درجن سے زیادہ انڈوں کو گرمی نہیں پہونچا سکتے۔

وٹروویس (Vitruvius) جو ایک صدی قبل مسیح جولیس سیزر کے زمانہ میں پایا جاتا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ ایک برنجی ظرف ہوتا تھا جو تھیٹر کی دیوار کے سوراخوں میں لگا دیا جاتا تھا اور اس سے آواز ٹکرا کر زیادہ بلند ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اسٹیج کے پائیں میں بھی یہ آلات لگے رہتے تھے اور ان کے ذریعہ سے آواز زیادہ بلند ہو کر تماشائیوں کے کانوں تک پہونچتی تھی۔

فولاد میں پختگی اور لچک پیدا کرنے کا فن بھی قدما کو معلوم تھا، چنانچہ اس وقت کی تلواریں اپنی تیزی اور صیقل کے لحاظ سے مشہور تھیں اور ان پر جو نشانات بنائے جاتے تھے وہ بالکل انمٹ تھے۔ قدیم ہندوستان میں بھی زنگ نہ کھا سکنے والا فولاد طیار کیا جاتا تھا، جس کا راز ابتک معلوم نہیں ہو سکا۔

ہاتھی دانت کو اُبال کر نرم کرنے کا راز بھی اب تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا حالانکہ قدیم زمانہ میں یہ بہت عام تھا۔

حماموں اور مکانوں کو گرم رکھنے کے لئے روما میں سنگی فرش کے نیچے گرم ہوا پھیلا دی جاتی تھی اور دیواروں کو بھی اسی طریقہ سے گرم کیا جاتا تھا۔

کلیساؤں کے پادری بھی عوام کو مرعوب کرنے کے لئے طرح طرح کی ترکیبوں سے کام لیتے تھے۔ مثلاً قربانگاہ کی آگ کو نلکیوں کے ذریعہ سے پھیلا دیا جاتا تھا اور دھات کی بنی ہوئی چھڑیوں سے چہچہانے کی آواز پیدا ہونے لگتی تھی۔ بعض کلیساؤں میں اوپر قبہ میں مقناطیس کا بڑا ٹکڑا لٹکا دیا جاتا تھا جو بُت کو اپنی طرف کھینچتا تھا اور اس میں حرکت پیدا ہو جاتی تھی۔

بعض کلیساؤں میں قربانگاہ کے پتھر کے نیچے ایک پوشیدہ حوض رہتا تھا جس میں زمین دوز نلوں کے ذریعہ سے پانی آتا تھا اور جب یہ پانی گرم ہو جاتا تھا تو وہ اُبل کر دوسرے ظرف میں چلا جاتا تھا اور پانی کے دباؤ سے کلیسا کے دروازے از خود کھل جاتے تھے۔

مصری کاہن بھی اپنے مندروں میں اس قسم کے معجزے دکھایا کرتے تھے۔ مندر کی دیواروں میں وہ بڑے بڑے مقعر (Concave) شیشے لگا دیتے تھے، جن پر بُت کا عکس پڑ کر باہر کی طرف سب کو نظر آ سکتا تھا۔

یونان میں اپالو دیوتا کا بُت جب سالانہ تقریب میں باہر نکالا جاتا تھا تو وہ فضا میں بلند ہو کر پھر نیچے آ جاتا تھا اور یہ ایک گیس بھرے ہوئے غبارہ کی مدد سے کیا جاتا تھا۔

اس وقت صنعتی کارخانوں میں جہاں بڑے پیمانہ پر کام کیا جاتا ہے، کام کی تقسیم ہوتی ہے اور ہر کاریگر کے سپرد ایک مخصوص کام ہوتا ہے، یعنی یہ نہیں ہوتا کہ ایک کاریگر پوری چیز کو تنہا بنائے۔ عہد قدیم کے لوگ بھی اس سے

ناواقف نہ تھے، چنانچہ سنٹ اگسٹائن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں بھی یہی رواج تھا۔ مثلاً سنار کو کوئی چیز بنانا ہوتی تو اس کا سانچہ کوئی بناتا ڈھالتا کوئی، صیقل کوئی کرتا اور نقاشی کسی اور کے سپرد ہوتی اس طرح ایک ہی چیز مختلف ہاتھوں سے نکل کر پوری ہوتی۔

روزولٹ صدر امریکہ نے ۱۹۳۵ء میں غلّہ کا اسٹور جمع کرنے کا منصوبہ پیش کیا تھا تاکہ آڑے وقت یہ ذخیرہ کام آئے، لیکن یوسفؑ نے بھی مصر میں یہی کیا تھا جب وہ وہاں کے وزیر تھے۔ قدیم مصر میں نہ صرف غلّہ کا ذخیرہ محفوظ رکھا جاتا تھا، بلکہ مختلف اجناس کا ایک دوسرے سے تبادلہ، تقاوی، کاشت پر بیمہ اور غذائی اشیاء پر کنٹرول سب کچھ وہاں رائج تھا۔

غذائی اشیاء کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بھی ان کے یہاں بڑا مکمل تھا۔ اس زمانہ کی محفوظ کی ہوئی مچھلیاں آج تک اچھی حالت میں پائی گئی ہیں۔ مصری لوگ مچھلیوں کو کسی خاص کپڑے میں لپیٹ کر صحرا کے آیوڈین ملے ہوئے پانی میں رکھدیتے تھے اور اس طرح وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوجاتی تھی

قدیم ہندوستان میں برف کے کھتے رکھے جاتے تھے۔ جاڑوں کی رات میں چھوٹے چھوٹے گڑھے کھود کر پیال کے اوپر کچے پیالے مٹی کے پانی بھر کر رکھدئے جاتے تھے اور صبح کو جو برف پانی کی سطح پر جم جاتی تھی، اسے گڑھوں میں دبا دیتے تھے۔ اسکندر اعظم کے زمانہ میں بھی آسانی برف کو بڑے بڑے تہ خانوں میں دبا دبا کر بھر دیتے تھے اور وہ عرصہ تک قایم رہتا تھا۔ شہنشاہ نیرو سب سے پہلا شخص تھا جس نے شراب میں برف ڈالنے کی جگہ بوتل کو برف کے اندر رکھ کر ٹھنڈا کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔

ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ مصری امرا اپنے ہاتھوں کو سنگ مردہ (Quartz) کے ٹکڑوں سے مل کر ٹھنڈا رکھتے تھے اور جب وہ میانوں میں بیٹھ کر نکلتے تھے تو پہلے ان میں ترپتیاں اور پھول بچھا دئے جاتے تھے اور پھر ان پر ایک باریک چادر بچھا دی جاتی تھی تاکہ گرمی نہ معلوم ہو۔

علاج کے سلسلہ میں بجلی سے قدماء بھی کام لیتے تھے۔ مثلاً درد سر میں ایک خاص مچھلی جس سے بجلی کی رو پیدا ہوتی ہے سر پر رکھدی جاتی تھی اور اس سے اعصابی درد دور ہوجاتا تھا۔ تین چار گھنٹے تک بیہوش رکھنے کے لئے ایک بوٹی مردم گیاہ (mandrake) کھلادی جاتی تھی۔ ایک اور بوٹی Henbane کی مدد سے ہر قسم کا اعصابی درد دور کیا جاتا تھا۔

ساحل دجلہ کھودنے سے جو قدیم گلی تختیاں برآمد ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷۰۰ سال قبل مسیح اسیریا کے ایک بادشاہ کے علاج میں ملہٹھی سے کام لیا گیا تھا۔ ۱۵۰۰ سال قبل مسیح کی جو گلی تختیاں ارض بابل میں میں دستیاب ہوئی ہیں ان میں مچھروں کا ذکر کرتے ہوئے ظاہر کیا گیا ہے کہ ان سے بخار پیدا ہوتا ہے۔

مصری لوگ آبپاشی کی نہروں کو گھاس پات سے صاف رکھنے کے لئے ایک چڑیا لقلق کے قسم کی پالتے تھے جو نہروں کی تہ میں آبی پودوں کو پھیلنے نہ دیتی تھی، اسی طرح اہل یونان میں طاعونی چوہوں کو فنا کرنے کے لئے سانپ پالنے کا رواج تھا۔

بیماریوں کا ٹیکہ لگانا بھی نئی چیز نہیں ہے قدیم ہندوستان اور چین میں اس کا رواج پایا جاتا تھا۔ اس وقت جسے فطری طریق علاج کہتے ہیں، وہ بھی بڑی پرانی چیز ہے۔ ۴۰۰ سال قبل مسیح بقراط ٹھنڈے پانی اور بارش کے پانی میں بٹھا کر اور بالو پر ننگے پاؤں چلا کر اکثر امراض کا علاج کیا کرتا تھا، اور اسی اصول کے پیش نظر موسیٰ طبیب نے

۲۳ سال قبل مسیح شاہ آگسٹس کو ایک سخت مرض سے شفایاب کیا

مصنوعی اعضا استعمال کرنے کا رواج قدیم زمانہ میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ انگلستان کے رائل کالج آف سرجنس میں ایک مصنوعی پاؤں محفوظ ہے جو ۳۰۰ سال قبل مسیح اٹلی کے ایک سپاہی کے لئے بنایا گیا تھا۔ پلاسٹر کے ہونٹ، ناک اور کان بنانا بھی انھیں معلوم تھا۔

یونانی اور رومی قدیم تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ غدود کے علاج و اصلاح سے وہ لوگ بھی واقف تھے اور مریض کو اُبلا ہوا پانی دیتے تھے۔

ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ ایران کا بادشاہ سائرس جب کبھی باہر جاتا تھا تو اُبلا ہوا پانی چاندی کی صراحیوں میں ہمیشہ اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور نیرو نے تو بقول پلنی (Pliny) بغیر جوش دیا ہوا پانی کبھی پیا ہی نہیں۔

پمپائی کے کھنڈروں سے بعض ایسے آلات بھی نکلے ہیں جن سے زمانۂ قدیم میں نسوانی امراض کے علاج میں کام لیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جولیس سیزر کی پیدائش ہی ایک نازک عمل جراحی کے بعد ہوئی تھی۔

آسٹریا میں کلٹی قوم کے بعض کاسۂ سر ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان پر عمل جراحی کیا گیا تھا۔ سکندر کے عہد میں ۳۵۶ سال قبل مسیح، لاشوں کو چیر پھاڑ کر موت کا سبب دریافت کرنے کا رواج عام تھا اور ایک جرمن ماہر مصریات نے لکھا ہے کہ ۲۰۰۰ سال قبل مسیح مصریوں میں آنکھ پر نزول ماء کا آپریشن کیا جاتا تھا۔

مصر قدیم میں فن دندان سازی (   ) کا پایا جانا بعض مومیائی شدہ لاشوں سے ثابت ہوتا ہے، جن کے نہ صرف دانت بلکہ آنکھیں بھی مصنوعی ہیں۔

بال اُگانے کے لئے تیل میں رینڈی کے بیج کچل کر وہ لوگ عام طور پر استعمال کرتے تھے۔ شعاعوں کے ذریعہ سے علاج کرنا بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پلنی کے زمانہ یعنی پہلی صدی عیسوی میں جسمی امراض کا علاج بلور کے شیشوں سے شعاعیں گزار کر کیا جاتا تھا۔

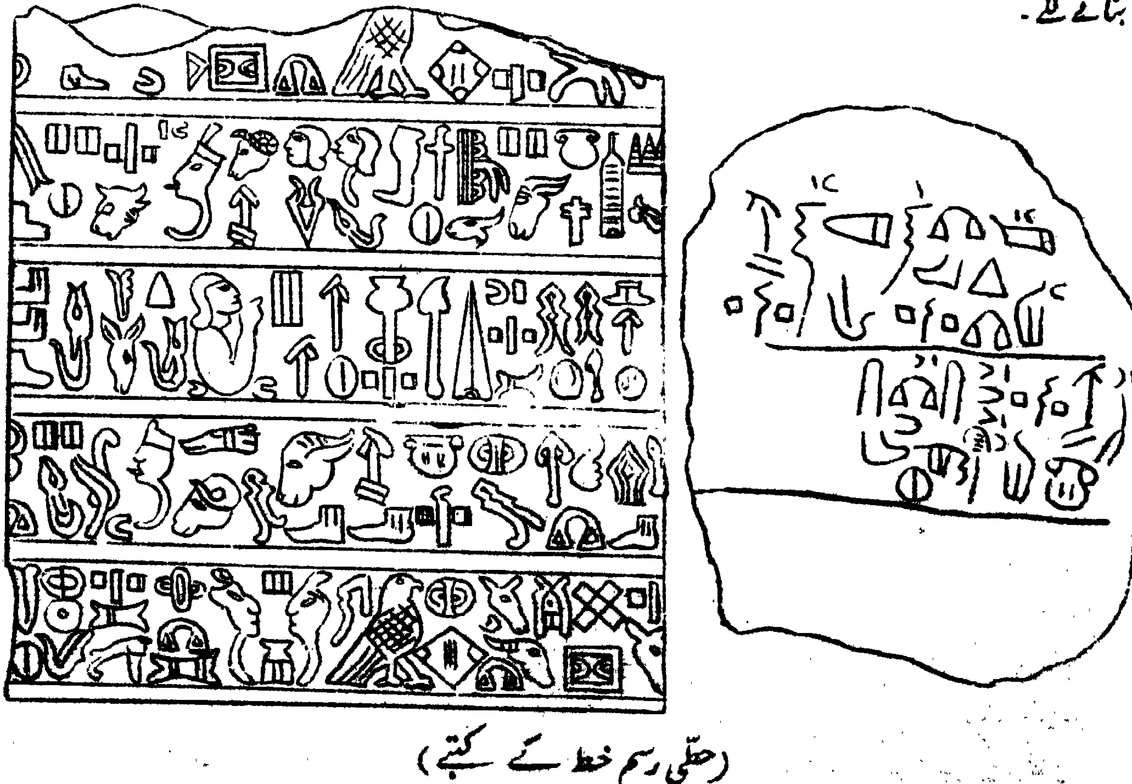
ڈاکٹروں کو فیس دینے کا طریقہ بھی بہت پرانا ہے۔ پلنی لکھتا ہے کہ شاہی ڈاکٹر کی تنخواہ سالانہ ۲۷۵۰ پونڈ مقرر تھی اور پرائیویٹ طور پر اس سے بہت زیادہ آمدنی اس کو ہو جاتی تھی۔ گیلن مشہور رومی ڈاکٹر نے اپنی فیس ۵۰ پونڈ مقرر کی تھی۔

فنِ تحریر کی تاریخ

(بہ سلسلۂ ماہ ستمبر)

حطّی رسم خط حطّی قوم ایشیائے کوچک اور شمالی شام میں تین ہزار قبل مسیح پائی جاتی تھی، اُس کے دارالحکومت دو شہر تھے، ایک کادیش اور دوسرے کارخیمش اہلِ مصر اور آشوریہ والوں سے لڑتے لڑتے حطّی حکومت کمزور ہوگئی - یہاں تک کہ سارگون دوم (آشوری حکمراں) نے ۱۷، ق - م کارخیمش فتح کرکے حطّیوں کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ کر دیا -

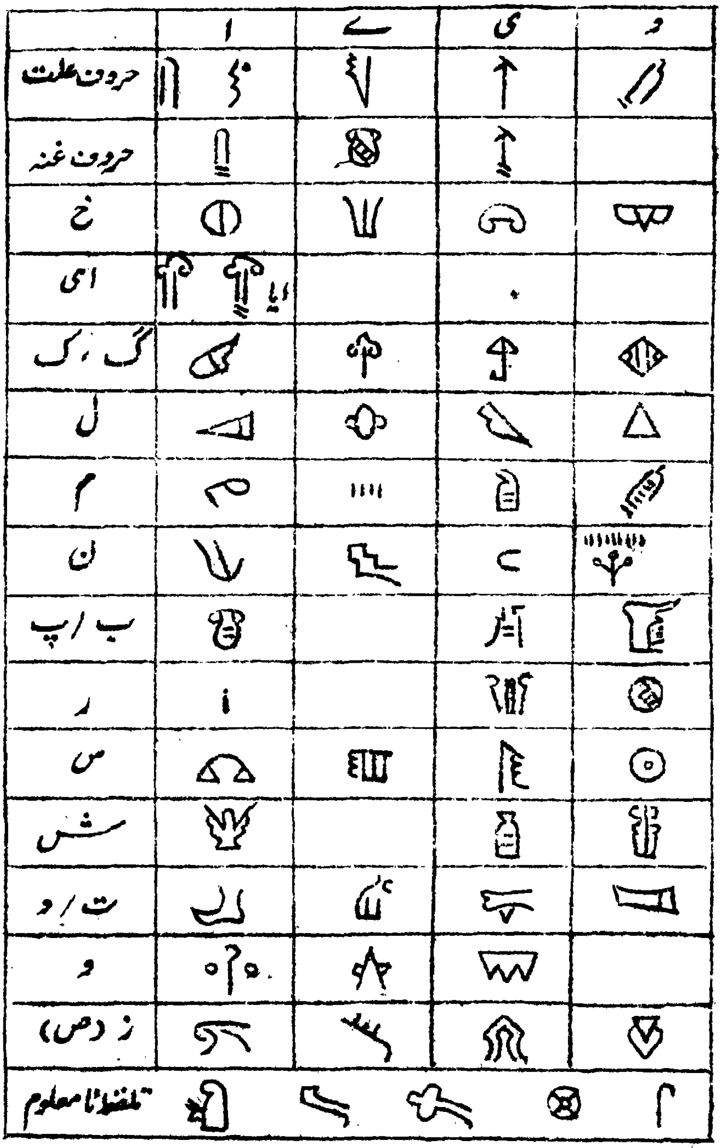
حطّی لوگوں کا تمدن کسی طرح بھی مصری یا آشوری تمدن سے کمتر درجے کا نہ تھا - اُن میں ایک قسم کی تصویری لکھائی کا بھی رواج تھا جس کے کتبے دسویں صدی ق - م سے لیکر چھٹی صدی ق - م تک پائے جاتے ہیں اور زیادہ تر کارخیمش - حماط اور حلب کے شہروں میں ملے ہیں - عموماً وہ پتھر کی سلوں پر اُبھرے ہوئے نقوش میں کندہ کئے گئے ہیں لکھائی کی دو قسمیں ہیں قدیم اور جدید - پرانے زمانے میں ہر چیز کی مکمل تصویر بنائی جاتی تھی لیکن بعد میں اُس کی مختصر صورت بنانے لگے -



(حطّی رسم خط کے کتبے)

حطی رسم خط میں ایک سطر دائیں سے بائیں کو اور دوسری بائیں سے دائیں کو لکھی جاتی تھی (لکھنا دائیں طرف سے شروع کرتے تھے) اور اسی اعتبار سے حروف کے رُخ میں فرق ہوجاتا تھا یعنی جدھر سے لکھنا شروع کرتے اُدھر ہی انسانی اور حیوانی تصاویر کا منہ ہوتا۔

اس لکھائی میں تقریباً ۲۲۰ نشانات کام آتے تھے جن کی دو قسمیں ہیں ایک تو (LOGOGRAMS) یعنی وہ نشانات جو پورے الفاظ کا مفہوم ادا کرتے تھے اور دوسرے ارکان الفاظ (SYLLABLES) ان کی تعداد پروفیسر آئی۔ جے۔ گیلب کے مطابق ۶۰ ہے :-



حطی رسم خط کے پڑھنے میں ابھی تک پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے بہت سے نشانات کی آوازیں اور



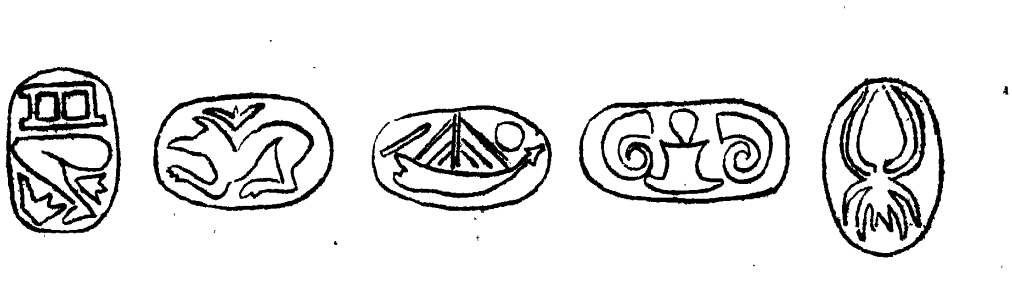
اُن کا مفہوم مشتبہ ہے۔ خوش قسمتی سے بعض ایسے کتبے موجود ہیں جن پر حطّی رسم خط کے ساتھ ساتھ میخی رسم خط بھی پایا جاتا ہے جن کی وجہ سے انھیں کسی حد تک پڑھ لیا گیا ہے۔ ٹارکن ڈیمس بادشاہ کی مہر ہیں جو چاندی کی بنی ہے .... یہ دونوں رسم خط پائے جاتے ہیں بیچ میں بادشاہ کی تصویر ہے جس کے دائیں بائیں جانب ایک ہی حطّی کتبہ ہے۔ اے۔ ای۔ کاؤلی کے مطابق میخی کتبے کا ترجمہ یہ ہے "میں ٹارکن ڈیمس ہوں شہر کی سرزمین کا بادشاہ" لیکن دوسرے عالم اسے اس طرح پڑھتے ہیں۔ "ٹارکن ڈیمس شہر میتان کی سرزمین کا بادشاہ" (میتان سے میتانی قوم کی طرف اشارہ ہے)

حطّی رسم خط کے بعض نشانات کریٹ کی لکھائی سے مشابہ ہیں اور اسی لئے بعض عالموں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کریٹ کی لکھائی سے ماخوذ تھا۔ لیکن یہ مشابہت اتفاقی بھی ہوسکتی ہے۔ علاوہ ازیں کریٹ کی لکھائی کو ابھی تک پڑھا بھی نہیں جاسکا ہے اس لئے اس بارے میں کچھ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا۔ میں ڈاکٹر ڈیوڈ ڈرینگر کے اس خیال سے متفق ہوں کہ حطّی رسم خط مصر کی "خوبصورت لکھائی" سے متاثر ہوکر گھڑا گیا تھا۔

کریٹ کی لکھائی

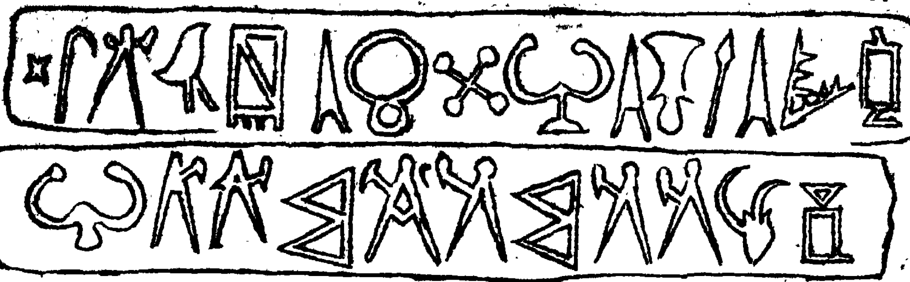
تقریباً ۳۰۰۰ ق-م سے لیکر ۱۱۰۰ ق-م تک کریٹ ایک خاص تہذیب کا مرکز تھا جس کے آثار سر آرتھر ایوانس نے ناسس (KNOSSOS) اور دوسرے شہروں میں کھود کر نکالے تھے۔ یہی تہذیب دوسرے جزایرِ ایجئین اور یونان کے بعض حصّوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اُس کی نمایاں خصوصیت ایک خاص قسم کے تصویری رسم خط کا استعمال تھا جس کی حسب بیان ایوانس چار قسمیں تھیں :-

۱- تصویروں کی لکھائی درجہ الف (PICTOGRAPHIC CLASS A) ۳۰۰۰ ق-م سے کریٹ میں مہروں پر تصویری علامتیں نظر آتی ہیں جو غالباً آرایش یا امتیازی نشانات کے طور پر بنائی جاتی تھیں :-



۲۰۰۰ لغایت ۱۹۰۰ ق-م سے ایک مکمل تصویری لکھائی کا پتہ چلتا ہے جس میں ہر چیز کی پوری تصویر بنائی جاتی تھی۔

نیچے ایک چوپہل مہر کے دو رخ ملاحظہ ہوں :۔

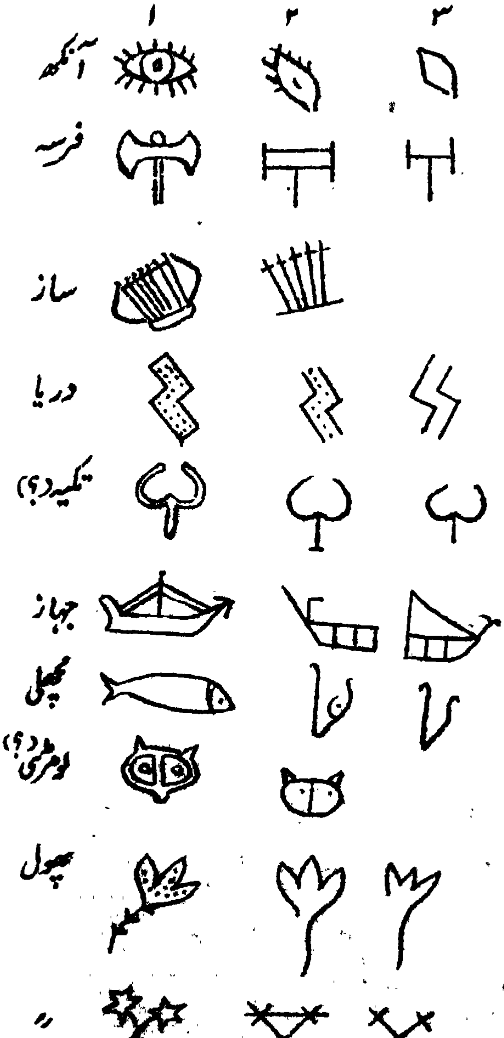


۲۔ تصویروں کی لکھائی درجہ ب (PICTOGRAPHIC CLASS B) جس کا آغاز تقریباً ۱۹۰۰ اور ۱۷۰۰ ق۔م کے درمیان ہوا۔ اس عہد سے تصویری علامتوں کو مختصر طور پر بنانے کا رواج ہوا۔ ایوانس کے بیان کے مطابق اس لکھائی میں تقریباً ۱۲۵ نشانات کام آتے تھے جو انسانوں، اعضائے جسم، آلاتِ حرب وضرب، پالتو جانوروں اور پیڑ پودوں کی تصاویر، مذہبی علامات اور اشکالِ ہندسہ پر مشتمل تھے۔

۳۔ لکیروں کی لکھائی درجہ الف (LINEAR CLASS A) جس کی ابتدا ۱۷۰۰ اور ۱۵۵۰ ق۔م کے درمیان ہوئی۔ تصویروں کو مختصر کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ محض خاکہ ہو کر رہ گئیں اور ہر نشان لکیروں کا مجموعہ معلوم ہونے لگا۔ نشانات کی کل تعداد ایوانس کے بیان کے مطابق ۹۰ اور حسب بیان سنڈوال ۷۷ یا ۷۶ ہے۔ اس رسم خط کے کتبے قیمتی پتھروں، دھاتوں اور مٹی کے برتنوں پر پائے جاتے ہیں۔ لکھائی بائیں سے دائیں کو ہے۔

۴۔ لکیروں کی لکھائی درجہ ب (LINEAR CLASS B) جو ۱۴۵۰ اور ۱۲۰۰ ق۔م کے درمیان وجود میں آئی۔ اس میں تقریباً ۳۷ نشانات کام آتے تھے۔ اس کے کتبے مٹی کی تختیوں پر پائے جاتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ حساب کتاب سے متعلق ہیں۔

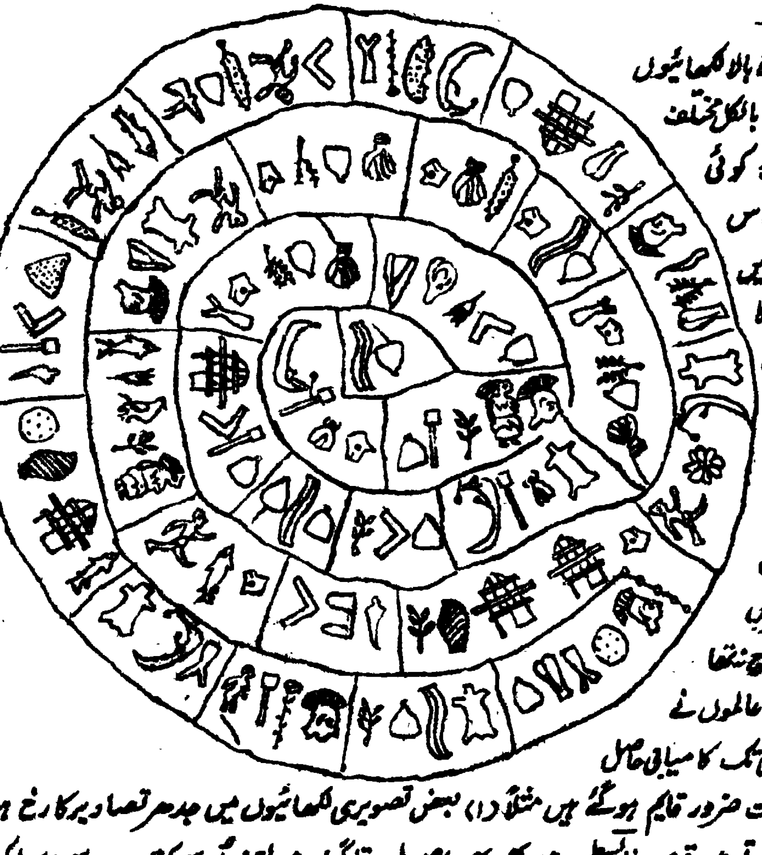
سامنے تصویروں کی لکھائی (۱) لکیروں کی لکھائی درجہ الف (۲) اور لکیروں کی لکھائی درجہ ب (۳) کی بعض علامتیں ملاحظہ ہوں :۔



مذکورۂ بالا رسوم خط کو ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا ہے لیکن قیاس غالب یہی ہے کہ شروع میں کریٹ کی لکھائی تصاویرِ خیالی (IDEOGRAPHS) پر مشتمل تھی اور بعد میں ارکانِ الفاظ کی لکھائی (SYLLABIC SCRIPT) میں بدل گئی۔

جہاں تک اُس کی ایجاد کا تعلق ہے عام رائے یہی ہے کہ کریٹ کے لوگوں نے تصویری رسم خط کا تخیل اہل مصر سے لیا لیکن اُس کے نشانات خود اہل کریٹ کی اپنی ایجاد ہیں وہ مصری ہیروغلیفی رسم خط سے ماخوذ نہیں۔

قرصِ فالیسطس (PHAESTUS DISC) فالیسطس، کریٹ میں ایک مقام ہے۔ ۳ر جولائی ۱۹۰۸ء کو وہاں سے مٹی کی ایک گول تختی برآمد ہوئی جس کا زمانہ ۱۷۰۰ ق م ہے۔ اس تختی کا قطر ۶.۷ انچ ہے اُس کے دونوں طرف ایک ایک چکر بنا ہے جو تختی کے ہر رخ کو پانچ حصّوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس چکر کی لکیروں کے درمیان تصویری لکھائی ہے۔ ایک طرف ۱۲۳ اشکال ہیں اور دوسری طرف ۱۱۸۔ یہ کھڑی لکیروں کے ذریعہ بالترتیب ۳۱ اور ۳۰ کے مجموں میں منقسم ہیں جو الفاظ ہوسکتے ہیں۔

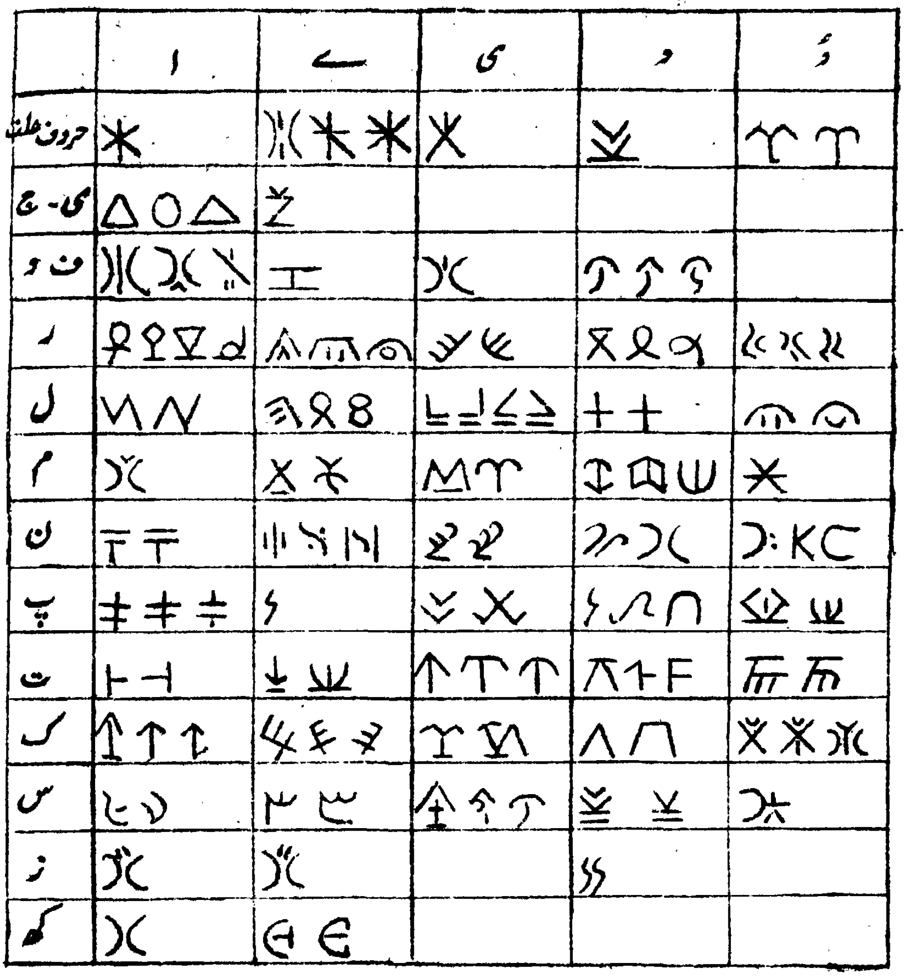


یہ تصویریں کریٹ کی مذکورۂ بالا لکھائیوں میں کام آنے والے نشانات سے بالکل مختلف ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی جداگانہ رسم خط ہے۔ لیکن چونکہ اس لکھائی کا کوئی دوسرا نمونہ کریٹ میں نہیں ملا، اس لئے بعض عالموں کا خیال ہے کہ یہ تختی کسی دوسرے ملک میں بنائی گئی تھی اور وہاں سے کریٹ آئی۔ لیکن اس طرح اس لکھائی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ کسی بھی دوسرے ملک میں (جہاں تک تحقیق ہوسکی ہے) قرصِ فالیسطس سے مشابہ لکھائی کا رواج نہ تھا

قرصِ فالیسطس کو بہت سے عالموں نے پڑھنے کی کوشش کی لیکن ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے، البتہ چند قیاسات ضرور قائم ہوگئے ہیں مثلاً (۱) بعض تصویری لکھائیوں میں جدھر تصاویر کا رخ ہوتا ہے اُدھر ہی سے پڑھنا شروع کرتے ہیں قرصِ فالیسطس میں بھی یہی اصول برتا گیا ہے۔ یعنی اُسے کنارے سے وسطی طرف پڑھا جائے گا۔ (۲) قرصِ فالیسطس میں کل ۴۵ تصاویر کو گھما پھرا کر استعمال کیا گیا ہے۔ چونکہ وہ ایک چھوٹا کتبہ ہے، اس لئے ہم فرض کرسکتے ہیں کہ اس لکھائی میں تقریباً ۶۰ تصویریں کام آتی تھیں۔ (۳) الفاظ کو ایک کھڑی لکیر سے جدا کیا گیا ہے۔ ہر خانے میں ۲ سے لیکر ۸ تک نشانات ہیں جو سکتا ہے ہر نشان رکنِ لفظ (SYLLABLE) ہو۔ قرصِ فالیسطس میں سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اُس پر تصاویر کو کسی نکیلی چیز سے نہیں بلکہ ہاتھی دانت یا لکڑی کے ٹھپوں کے ذریعہ دبا دبا کر بنایا گیا ہے۔

قبرص کا رسم خط چھٹی صدی سے تیسری صدی ق م اور اُس کے کچھ بعد تک جزیرۂ قبرص میں ایک خاص رسم خط رائج تھا جس میں تقریباً ۵۵ نشانات کام آتے تھے۔ چھ حروفِ علت (VOWELS) اور

تھے حروفِ صحیح + حروفِ علت (OPEN SYLLABLES) پر مشتمل تھے جیسے کا۔ کے۔ کی۔ کو اور کُو وغیرہ ذیل کا نقشہ ملاحظہ ہو۔ اسے بائیں طرف کے حروفِ صحیح اور اوپر کے حروفِ علت ملا کر پڑھئے:۔



اس رسم خط کے زیادہ تر کتبے یونانی زبان میں ہیں .... قبرص کی زبان کا علم ہمیں نہیں ہے۔ کتبوں میں لکھائی کا رخ عموماً دائیں سے بائیں کو اور کبھی ایک سطر دائیں سے بائیں کو اور دوسری بائیں سے دائیں کو ہے اور یہ اصول سارے کتبے میں برتا گیا ہے۔ قبرص کے رسم خط کے ماخذ کے بارے میں اختلاف ہے (DR. DEECKE) کے مطابق وہ آشوری سے ماخوذ تھا، (PROF. SAYCE) اُسے حطّی رسم خط سے ماخوذ سمجھتے تھے لیکن اب اُس کا تعلق کریٹ کی "لکیروں والی لکھائی" سے مانا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت ایک نئے رسم خط کا انکشاف ہے جسے دونوں کے درمیان کی کڑی کہہ سکتے ہیں۔ اُس کا نام (CYPRO MINOAN) رکھا گیا ہے۔ اُس کے کتبے ۱۵۰۰ لغایت ۱۱۵۰ ق۔م کے ہیں لیکن قبرص کے رسم خط کا پتہ زیادہ سے زیادہ ۷۰۰ ق۔م سے چلتا ہے۔ دونوں کے بیچ کے زمانے کے کتبے کیوں نہیں ملتے اس کی توجیہ ابھی تک نہیں ہو سکی ہے۔

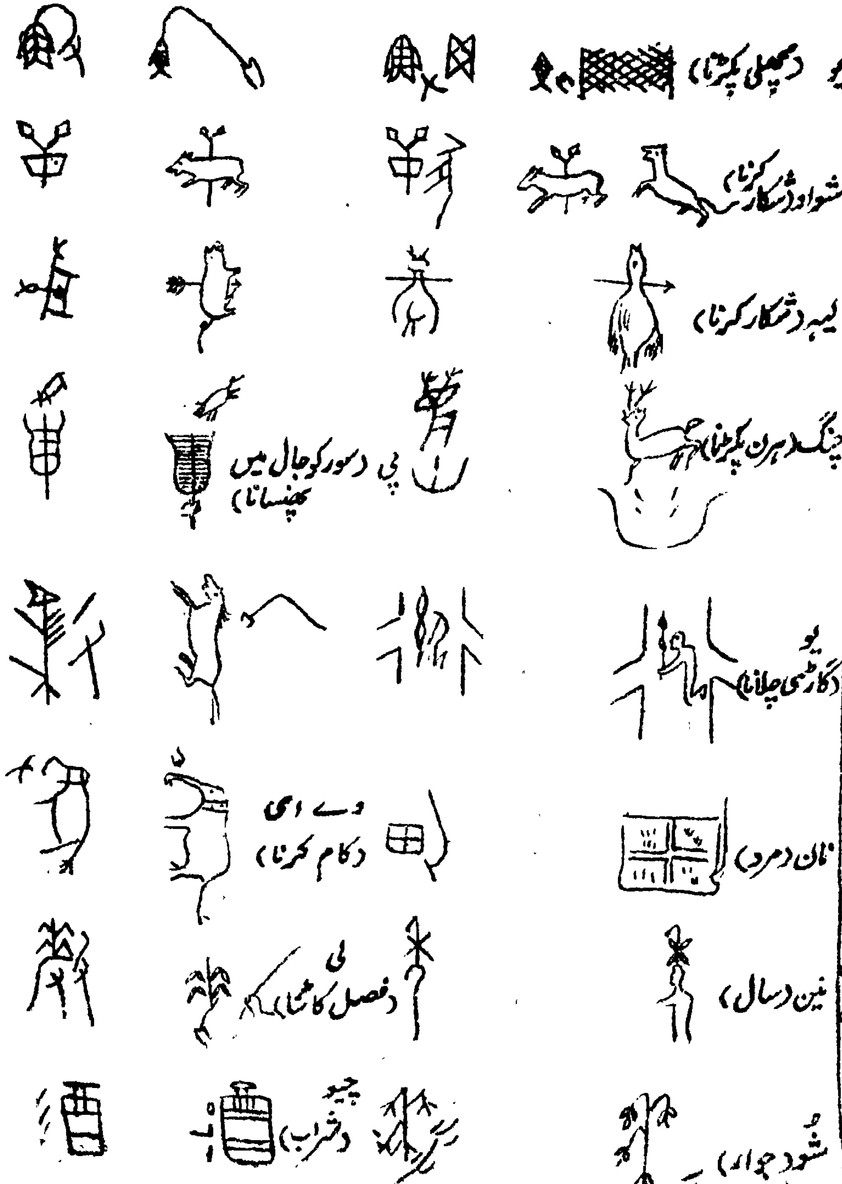
بائبلس کا رسم خط بائبلس، شام کا ایک شہر ہے۔ یہاں پر آثاری تحقیقات کرتے ہوئے (M. DUNAND) کو نو یا دس کتبے ملے جن میں سے چھ کانسے کی تختیوں پر ہیں اور باقی پتھر پر۔ یہ کتبے نیم تصویری رسم خط میں ہیں، اور آسمان، زمین، حیوانات، نباتات، مذہبی علامات، اشکالِ ہندسہ، جہاز رانی اور مختلف آلات وغیرہ کی تصویروں پر مشتمل ہیں ان میں سے تقریباً ۵ مصری ہیروغلیفی کے نشانات سے مشابہ ہیں اور بعض کی مشابہت کریٹ، قبرص وادیٔ سندھ، سینائی یا کنعان وغیرہ کی لکھائیوں کے نشانات سے ہے۔

مشہور فرانسیسی مستشرق (PROF. E. DHROME) اس رسم خط کو پڑھنے میں کامیاب ہوگئے ہیں اُنکا کہنا ہے کہ کتبات کی زبان فنیقی (سامی) ہے اور اُن کا زمانہ فرعونِ مصر امینوفس چہارم کا عہد یعنی تخمیناً ۱۳۷۵ ق - م - ایجاد کی تحریک غالباً مصری ہیروغلیفی رسم خط سے ہوئی جس کے نشانات سے بائبلس کی بہت سی علامتیں مشابہ ہیں نشانات کی آوازیں (SYLLABIC) قسم کی ہیں اور بہت سے نشانات ایک ہی آواز کے مظہر ہیں۔

چینی رسم خط کی تاریخ دنیا کے موجودہ رسوم خط میں بہت طویل ہے وہ تین ہزار سال سے ایک ایسی قوم میں لکھا جاتا رہا ہے جو یورپ سے بڑے ملک میں آباد ہے اور دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے، گو مصری ہیروغلیفی اور بعض دوسری لکھائیوں کے مقابلہ میں اُس کی عمر بہت کم ہے۔

پُرانے کتبے - چینی رسم خط کے قدیم ترین نمونے شنگ خاندان سے ملتے ہیں جسے ین بھی کہتے ہیں (زمانہ ۱۷۶۶ الغایت ۱۱۲۲ ق م) یہی چین کا پہلا حکمراں خاندان تھا اس سے پہلے کی تاریخ محض روایات کا ایک دفتر ہے۔

شنگ زمانہ کے کتبات کانسے کے برتنوں۔ کچھوے اور دوسرے جانوروں کی ہڈیوں پر لاکھوں کی تعداد میں ین کے ٹیلوں سے برآمد ہوئے ہیں جو دریائے زرد کے شمال انیانگ کے قصبے اور ہونان کے صوبہ میں واقع ہے صرف کناڈا کے ایک شخص نے جو خاص کر انکی تلاش میں آیا تھا پچاس ہزار سے اوپر ہڈیاں برآمد کیں شنگ خاندان کے زمانہ میں شگون و فال کا بڑا چرچا تھا علم غیب کے مدعی لوگوں کے سوالات ہڈیوں پر تصویروں میں لکھتے تھے ان تصویروں سے قدیم چینی تمدن پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ہونان کی ہڈیوں پر پائی جانے والی بعض تصویری علامات ملاحظہ ہوں :-



ایجاد

خطِ قدیم کے تصویری رسوم خط سے چینی رسم خط کا کیا تعلق تھا اس باب میں کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض عالموں نے اس کا سمیری رسم خط سے ماخوذ ہونا ثابت کرنا چاہا لیکن ان کے نظریے کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ کیونکہ چینی رسم خط کا کوئی کتبہ ایسا نہیں ہے جو سمیری خط کی قدامت کو پہونچ سکے۔

نشانات کی تعداد

شنگ خاندان کے زمانہ تک چینی رسم خط میں کام آنے والے نشانات کی تعداد کسی طرح بھی ۲۵۰۰ سے زیادہ نہیں تھی لیکن برابر نئے نشانات وضع کئے جاتے رہے یہاں تک کہ دوسری صدی ق۔م انکی تعداد ۱۰۰۰۰ تک پہونچ گئی اور پہلی صدی عیسوی میں ۹۳۵۳ تک اور اب چینی رسم خط میں ۵۰۰۰۰ نشانات کام آتے ہیں لیکن ان کی بیشتر حیثیت سے نشانات مرکب ہیں۔ مفرد نشانات کی تعداد کا صحیح علم نہیں ہے

قدیم صورت

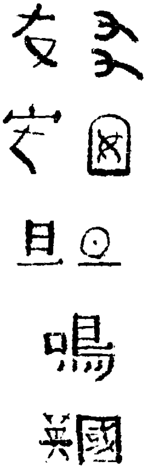
چینی رسم خط کا کوئی نشان ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں تحقیقات کی جائے اور وہ آخر میں تصویر نہ ثابت ہو۔ بعض نشانات کی قدیم صورتیں ملاحظہ ہوں:۔



پہلے چینی رسم خط بانس کے قلموں سے بانس کی تختیوں اور ریشم پر لکھا جاتا تھا - بعد میں موقلم (برش) استعمال کئے جانے لگے جس کی ایجاد منگ ٹی این (متوفی ۲۱۰ ق.م) سے منسوب کی جاتی ہے جس نے دیوارِ اعظم بنوائی تھی لیکن بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا استعمال بہت پہلے سے تھا - آجکل بھی چینی رسم خط برش سے لکھا جاتا ہے - لکھنے کے لئے کالی روشنائی کا استعمال بہت قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے

یہاں پر یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چینی رسم خط اوپر سے نیچے کو لکھا جاتا ہے - لکھنا دائیں طرف سے شروع کیا کرتے ہیں -

نشانات کی قسمیں - چینی رسم خط میں دو طرح کے نشانات کام آتے ہیں مفرد اور مرکب - مفرد نشانات کی مثالیں صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ کیجئے - بعض خیالات کا اظہار مرکب تصاویر سے کیا جاتا ہے مثلاً :-



東東	مشرق + مشرق = ہرجگہ	قدیم / جدید 友	دو ہاتھ = دوستی	
木木	دو درخت = جنگل	安	عورت + گھر = امن وامان	
女女	دو عورتیں = جھگڑا	旦	سورج + افق = سویرا	
女女女	تین عورتیں = سازش	鳴	منھ + چڑیا = گانا	
仙	آدمی + پہاڑ = تارکُ الدنیا	英國	افضل + سلطنت = انگلستان	

ان نشانات کی مدد سے کیسے لکھا جاتا ہے اسے سمجھانے سے پہلے چینی زبان کی بعض خصوصیات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے -

چینی زبان کی خصوصیات چینی زبان قواعد سے معرا ہے - اُس کا ہر لفظ ایک کلمۂ مفرد (MONO SYLLABLE) ہے جس میں تبدیلی نہیں ہوتی - ایک ہی لفظ اپنے محلِ وتوجہ کے لحاظ سے اسم، فعل، صفت سب کچھ ہو سکتا ہے - اور اوسطاً ہر لفظ کے دس معنی ہوتے ہیں جنمیں اندازِ تلفظ یا لہجہ کے آتار چڑھاؤ سے تمیز کی جاتی ہے - یہی نہیں ملک چین میں ہزاروں بولیاں ہیں - ہر لفظ ہر جگہ ایک نئے انداز سے بولا جاتا ہے - ذرا سوچئے لکھتے وقت ان معنوں میں کیسے امتیاز کرتے ہوں گے ؟ اسے ایک مثال سے سمجھئے - انگریزی زبان میں بہت سے الفاظ کا تلفظ ایک ہے مثلاً :- (RITE) معنی رسم (WRITE) معنی لکھنا (RIGHT) معنی صحیح اور (WRIGHT) معنی کاریگر بولتے وقت ان کے معنوں کا پتہ موقع استعمال سے چل جاتا ہے لیکن لکھتے وقت ہجے مختلف طریقوں سے کئے جاتے ہیں مگر چین میں ایسا نہیں کیا جاتا - اُنھوں نے اپنی مشکلات کا ایک دوسرا حل نکالا ہے یعنی ۲۱۴ نشانات ایک خاص طرح سے استعمال کرتے ہیں - اسے یوں سمجھئے کہ نیچے دئے ہوئے کل نشانات کو "چو" پڑھا جائے گا :-

舟　舟羽　火舟　氵舟　言舟

جہاز　　نرم رویئں　　ٹمٹمانا　　تسلا　　بکواس

لیکن اس کے چھ معنی ہیں پہلا نشان (بائیں سے دائیں کو) جہاز کی تصویر ہے۔ دوسرے میں جہاز کی تصویر کے ساتھ "پر" کا نشان ہے۔ اس طرح تیسرے میں "آگ" کا چوتھے میں "پانی" کا اور پانچویں میں "لفظ" کا۔ اور پر کا تعلق رویئں سے، آگ کا ٹمٹمانے سے، پانی کا تسلے سے اور لفظ کا بکواس سے ظاہر ہے۔ گویا ان مثالوں میں ایک نشان سے آواز معلوم ہوتی ہے اور دوسرے سے معنی۔ ان معنی متعین کرنے والے نشانات کو "بنیادی نشانات" (RADICALS) یا کنجی (KEYS) کہتے ہیں۔ ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو۔

مندرجۂ ذیل کل نشانات کو "فنگ" پڑھا جائے گا:۔

方　坊　房　紡　芳　訪　防　妨

روکنا - پُشتہ - حفاظت کرنا - دریافت کرنا - خوشبودار - کاتنا - کمرہ　مقام سڑک - مربع

لیکن اس کے دس معنی ہیں۔ پہلا نشان (بائیں سے دائیں کو) مربع کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ دوسرے میں مربع کے نشان سے پہلے "زمین" کا نشان بنایا ہے۔ تیسرے میں "دروازے" کا۔ چوتھے میں "ریشم" کا۔ پانچویں میں "جڑی بوٹی" کا چھٹے میں "لفظ" کا، ساتویں میں "ٹیلے" کا اور آٹھویں میں "عورت" کا۔ زمین کا مقام اور سڑک سے تعلق ظاہر ہے اسی طرح دروازے کا کمرے سے ریشم کا کاتنے سے، جڑی بوٹی کا خوشبو سے۔ لفظ کا دریافت کرنے سے، ٹیلے کا پشتے اور حفاظت کرنے سے اور عورت کا روکنے سے۔

اس طرح معلوم ہوا کہ چینی رسم خط میں کام آنے والے مرکب نشانات کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ جن میں دو تصاویر کو ملا کر ایک خیال ظاہر کرتے ہیں جیسے روشنی کے لئے سورج چاند کا بنانا اور دوسرے وہ جن میں سے ایک نشان آواز ظاہر کرتا ہے اور دوسرا معنی۔

چینی رسم خط کی بقا کا راز چینی رسم خط کا لکھنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اس کے نشانات کی تعداد (پچاس ہزار) اتنی زیادہ ہے کہ اُنھیں یاد کرنے کے لئے انسان کی عمر نا کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چینی لوگ تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پھر چینی رسم خط کیوں زندہ ہے اُسے وہاں کے لوگ ترک کیوں نہیں کر دیتے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے اور وہ یہ (جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں) ملک چین میں ہزاروں بولیاں ہیں۔ لیکن سارے ملک کی تحریری زبان ایک ہے۔ جسے بین صوبائی حیثیت حاصل ہے۔

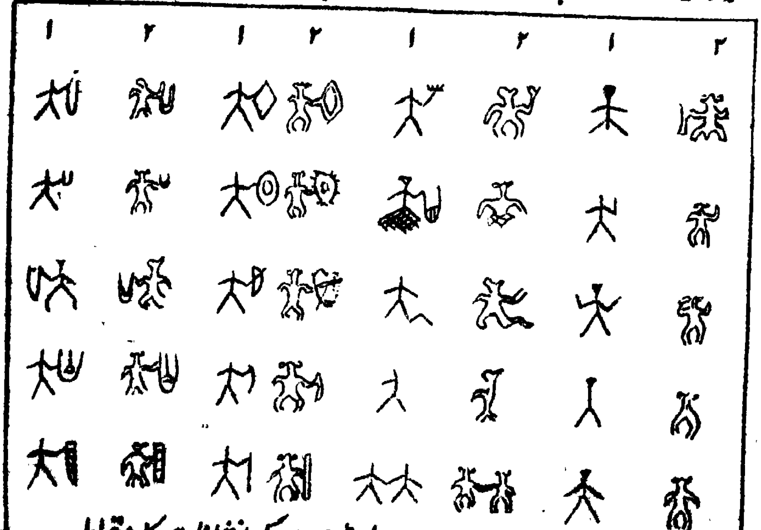
جاپانی رسم خط تقریباً تیسری صدی عیسوی میں بدھ مذہب کی اشاعت کے سلسلہ میں چین کے لوگ جاپان پہونچے اور اس طرح وہاں کے لوگ چینی رسم خط سے واقف ہوئے۔ اہل جاپان نے چینی رسم خط سے اپنی ضرورت بھر کے نشانات چُن لئے جو مختلف الفاظ کو ظاہر کرتے تھے۔ ان نشانات کو اُنھوں نے بجائے چینی کے جاپانی ناموں سے پکارا مثلاً جنوب کو چین میں "نان" کہتے ہیں لیکن جاپانی میں "مینامی" لہذا جنوب کو ظاہر کرنے والے نشان کی آواز جاپان میں بجائے "نان" کے "مینامی" مقرر کی گئی۔ ایسے نشانات کو "کانجی" کہتے ہیں اور ان کی تعداد ہزاروں تک پہونچی ہے (صرف ابتدائی تعلیم میں کم از کم ۱۲۰۰ نشانات کا استعمال سیکھنا پڑتا ہے)

اسی سلسلہ میں چینی اور جاپانی زبانوں کے فرق کو بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، چینی زبان گرامر سے معرا ہے اور اُس کے الفاظ یک رکنی (MONO SYLLABIC) ہیں جن میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے جاپانی زبان کی گرامر ہے اور اُس کے الفاظ (POLY SYLLABIC) ہیں جن میں قواعد کے مطابق تبدیلی ہوتی ہے جیسے افعال کا زمانہ، صنعت کے مدارج، حروفِ جار، تذکیر و تانیث واحد اور جمع وغیرہ ظاہر کرنے کے لئے اصل لفظ میں مخصوص سابقوں اور لاحقوں کا اضافہ جنھیں لکھنے کے لئے جاپان کے لوگوں نے آٹھویں نویں صدی عیسوی میں دو رسوم خط ایجاد کئے جن کے نام ہیں کاٹا کانا اور ہیراگانا۔ ان دونوں میں کچھ فرق ہے۔ کاٹا کانا کے نشانات اُس چینی رسم خط سے ماخوذ ہیں جو بہت بنا بنا کر لکھا جاتا ہے (MODEL SCRIPT) اور ہیراگانا چینی خطِ شکست (CURSIVE SCRIPT) سے کاٹا کانا کے بعض نشانات کا ماخذ ملاحظہ ہو:-

چینی	呂	末	天	毛	奴
تلفظ	لُو	مو	تین	ماؤ	نُو
معنی	ریڑھ کی ہڈی	ختم	آسمان	بال	غلام
جاپانی	ロ	マ	テ	モ	ヌ
تلفظ	رُو	ما	تے	مو	نُو

جزیرہ ایسٹر کا رسمِ خط

جزیرۂ ایسٹر، چلی (جنوبی امریکہ) کے مغربی ساحل سے ۲۵۰۰ میل کی دوری پر بحرِ پیسفک میں واقع ہے اس کا رقبہ صرف ۷۰ مربع میل ہے یہاں کے لوگ رنگ روپ میں پولی نیشیا اور میلانیشیا کے لوگوں سے مشابہ ہیں اور غالباً وہاں سے ہجرت کرکے آئے تھے۔ مقامی حکمرانوں کی فہرست سے حساب لگاکر اُن کی ہجرت کا زمانہ بارھویں، تیرھویں صدی عیسوی قرار دیا گیا ہے۔ اُن میں ایک تصویری رسمِ خط کا رواج تھا جسے "رونگو - رونگو" کہتے تھے۔ اُسے شارک مچھلی کی دانت سے لکڑی کی تختیوں پر کندہ کیا جاتا تھا۔ ۱۸۶۴ء میں جب کیتھولک مبلغین جزیرۂ ایسٹر پہونچے تو انھوں نے بہت سی تختیوں کو جلا ڈالا۔ بہرحال اب بھی ۱۵ تختیاں موجود ہیں جو مختلف ناپوں کی ہیں۔ (اُن کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۲ فیٹ ہے) ان پر پائی جانے والی تصاویر میں انسانوں، مچھلیوں اور پرندوں وغیرہ کو بہ آسانی پہچانا جاسکتا ہے لکھائی کے رُخ میں ایک عجیب بات ہے یعنی ایک سطر کے



وادیِ سندھ (۱) اور جزیرہ ایسٹر (۲) کے نشانات کا مقابلہ

نشانات سیدھے ہیں اور دوسرے کے اُلٹے (معکوس) اور یہی اصول ساری تختی میں برتا گیا ہے جس کی بنا پر ہر ایک سطر ختم ہونے کے بعد دوسری سطر پڑھنے کے لئے تختی کو اپنی طرف گھمانا پڑتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جزیرہ ایسٹر کے نشانات کی آوازیں مقرر نہ تھیں اور اس لئے اُنھیں پڑھا نہیں جاتا تھا بلکہ دیکھا اور سمجھا جاتا تھا اور مذکورہ تختیاں ایک قسم کی یادداشت تھیں جن کا مفہوم وہاں کے لوگوں کو یاد نہیں۔ لیکن کہتے ہیں اُن میں خاندانی شجروں، باہمی لڑائیوں، مذہبی رسومات اور بھجن وغیرہ ہیں روایات کے مطابق جزیرہ ایسٹر کے لوگ سال میں ایک دفعہ یکجا ہوتے تھے اور اُنھیں یہ تختیاں پڑھکر سنائی جاتی تھیں۔ یہ کام ایک خاص طبقے کے سپرد تھا جس کے افراد "ٹنگٹا رونگو رونگو" کہلاتے تھے۔ ۱۸۶۳ء میں پیرو کے بردہ فروش جزیرہ ایسٹر کے کل بڑے بڑے لوگوں کو گرفتار کرلے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی بھی اس رسم خط کا جاننے والا نہ رہا۔

اس سے قبل ہم منگری کے عالم جی۔ ڈی ہیونیری کے اس حیرت انگیز انکشاف کا ذکر کرچکے ہیں کہ وادی سندھ اور جزیرہ ایسٹر کے رسوم خط میں گہرا تعلق ہے اور دونوں کے نشانات بھی مشابہ ہیں (ساتھ کا نقشہ ملاحظہ ہو) لیکن یہ مشابہت اتفاقی معلوم ہوتی ہے۔

(باقی) محمد اسحاق صدیقی

اُڑن طشتریاں روس کی ایجاد ہیں

سوئٹزرلینڈ کے ایک ماہر ریاضی و فلکیات کا خیال ہے کہ تیسری عالمگیر جنگ آٹم بم یا ہائڈروجن سے نہیں لڑی جائے گی بلکہ اُڑن طشتریوں سے لڑی جائے گی، جو ہوا اور پانی کا طوفان پیدا کرکے دشمن کو شکست و پسپائی پر مجبور کردیں گی۔

اس پروفیسر کا نام جین لوئی نکولٹ ہے۔ اس نے ایک انٹرویو میں یقین دلایا کہ "اُڑن طشتریاں" اسی زمین کی چیزیں ہیں اور موسمی حالات میں تغیر پیدا کرنے کے لئے روس نے ایجاد کی ہیں ـــــ اُڑن طشتریوں کا حال اب سے صرف دو سال پہلے معلوم ہوا تھا اور پروفیسر نے جو شہادتیں اپنے نظریہ کے ثبوت میں فراہم کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ پچھلے دو سال کے اندر دُنیا کے موسموں میں جو تغیر پیدا ہوا ہے اس کا باعث یہی ایجاد ہے ـــــ پروفیسر مذکور کا کہنا ہے کہ اس مدت میں عناصر آب و باد کے اندر جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں وہ سخت خطرہ کا پتہ دیتی ہیں ـــــ حال ہی میں جو طوفان برطانیہ، بلجیم اور ہالینڈ میں آیا تھا اور جس نے ہزاروں جانیں لے لیں، اس کا سبب بھی پروفیسر مذکور نے انھیں اُڑن طشتریوں کو قرار دیا ہے ـــ اس نے ظاہر کیا کہ اس دوران میں دُنیا کے اندر غیر معمولی موسمی تغیرات پیدا ہوئے، مثلاً سرما میں تقریباً ہر جگہ بجلی کی کڑک، بحر سیاہ کے ساحلوں پر برفباری، اسپٹزبرجن میں غیر معمولی بارش، اسرائیلی حکومت میں اولوں اور برف کا طوفان، یہ سب انھیں طشتریوں کا نتیجہ تھا۔

پروفیسر مذکور کا بیان ہے کہ یہ طشتریاں روس ہی کی طرف سے آتی ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ خود سوویٹ حکومت میں کسی موسمی تغیر کی اطلاع نہیں ملی ـــ وہ کہتا ہے کہ آیندہ جنگ میں ان طشتریوں کو کافی تعداد میں اُڑا کر سخت طوفان ابر و باد پیدا کرکے دشمن کے جہازوں کی پرواز کو ناممکن بنا دیا جائے گا اور بم گرانے کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی ـــ پروفیسر کا بیان ہے کہ یہ طشتریاں اوپر کی فضا میں ہیجان پیدا کردیتی ہیں اور اس ہیجان سے زمینی فضا میں طوفان ابر و باد پیدا ہوجاتا ہے۔

چند ماہ سے یہ طشتریاں نہیں دیکھی جاتیں اور اس کا سبب پروفیسر مذکور کے خیال میں یہ ہے کہ نیچی فضا کے لحاظ سے بڑی حد تک مکمل ہوچکی ہیں اور اب یہ ۶۰ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر پرواز کرتی ہیں، جہاں تک ہماری نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔

اقبال سُہیل

اقبال احمد خاں سہیل، ہمارے صوبہ کے اُن چند افراد میں سے ہیں، جن کو قدرت نے غیرمعمولی ذہانت عطا کی، لیکن ان سے وہ کام نہ لیا جس کے لئے وہ موزوں تھے۔ سہیل میں ایک بے مثل صحافی اور مصنف و ادیب بننے کی اہلیت تھی، لیکن وہ محض وکیل ہو کر رہ گئے اور اس طرح ہماری دنیائے علم و ادب ایک بڑی جنس گرانمایہ سے محروم ہو گئی۔

ہر چند ان کی ادبی عظمت، شاعرانہ اہلیت اور علمی گرانمائگی طبقۂ خواص سے پوشیدہ نہیں، لیکن عام پبلک ان سے کم روشناس ہے۔ اس لئے ہمیں شکرگزار ہونا چاہیئے، محمد حسن کالج جونپور کا جس نے اپنے میگزین کی ایک خاص اشاعت سہیل کے لئے وقف کر دی اور کوشش کر کے ان کے اُردو و فارسی کلام کو یکجا کر دیا۔ سہیل کیا ہیں اس کی وضاحت کے لئے چند مقالے بھی ابتدا میں شامل کر دئے گئے ہیں۔

ذیل کے مقالہ میں سہیل کی زندگی کے اس پہلو کو پیش کیا گیا ہے، جسے صرف رشید احمد صاحب صدیقی ہی پیش کر سکتے تھے۔ اس کے بعد ہم پروفیسر سرور کا مقالہ شائع کریں گے جس میں سہیل کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ (نیاز)

مولانا سہیل، اقبال احمد خاں ایم، اے، ال، ال، بی (علیگ) سے میری ملاقات ۱۹۱۵ء میں ہوئی، اس زمانہ میں مولانا شاعری کرتے تھے، یونین کا الکشن لڑاتے تھے اور معجون کھاتے تھے، اب سنتے ہیں کہ صرف مقدمے لڑاتے ہیں اور بچے پیدا کرتے ہیں، جس کی ابتدا ایسی ہو اس کا انجام یہ کیوں نہ ہو، ہم دونوں گل منزل (یادش بخیر کچی بارک) میں تھے گرمیوں کا زمانہ تھا، لو چلتی تھی، خاک اُڑتی تھی، آپ نے معلوم نہیں گل منزل دیکھی بھی ہے یا نہیں، یہ بھی نہیں معلوم آپ مولانا سے بھی واقف ہیں یا نہیں، اس لئے اگر آپ کو ایک سے بھی شرفِ نیاز حاصل ہے تو سمجھ لیجئے آپ نے دوسرے کو بھی دیکھ لیا۔

مولانا ساکنِ گلِ منزل   گلِ منزل متحرک، مولانا

جس دن مولانا سے ملا ہوں، مولانا الکشن میں مبتلا تھے، کچی اور پکی بارکوں میں یونہی کیا کم چشمک رہا کرتی تھی جب سے مولانا کچی بارک میں آ گئے تھے، فریقین میں مقابلہ و مسابقت کا جذبہ خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا، الکشن کا زمانہ قریب تھا، ہر طرف اسی کا چرچا تھا، مسجد، ڈائیننگ ہال، یونین، کلاس روم، ہر جگہ، ہر وقت، ہر شخص اسی آشوب میں مبتلا تھا، ایک فریق کے ایجنٹ میرے کمرے میں بھی آ گئے، مولانا کو خبر ہوئی، قاآنی کا ایک شعر گنگناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے، پانوں کی ڈبیا ہاتھ میں، پیک منہ میں اور اس کے دھبے شیروانی پر، کمرے میں بیٹھنے کی جگہ کہاں، بکس پر فریق مخالف کے ایجنٹ بیٹھے ہوئے اپنے امیدوار سے زیادہ میری قابلیت کا خطبہ پڑھ رہے تھے، مولانا بھی داخل ہوئے، کوئی جگہ بیٹھنے کو نہ ملی۔

کچی بارک کے غسل خانے معلوم نہیں آپ نے دیکھے بھی ہیں یا نہیں، نہانے سے پہلے ان غسل خانوں کی ستر پوشی لازمی تھی، ایسی ستر پوشی جس کے ہوتے ہوئے بھی بقول "حکیم حاذق"[1] بے غسلا، ستر شوئی بقدر اشک شوئی ہی کر سکتا تھا اور اس اعتبار سے ان غسل خانوں کا نظریۂ ستر نمائی جہوشانِ عہد حاضر کے تصور ستر پوشی کے قطعًا ہم آہنگ تھا میرے غسل خانے کی آبادی صرف ایک گھڑے پر مشتمل تھی، دوسرے کی جگہ خالی تھی، اس پر مولانا بلا تکلف اس طور پر بیٹھ گئے، گویا مولانا موصوف آج تک صرف اسی قسم کی نشست پر بیٹھنے کے عادی تھے، مجھ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا، یہ البتہ نہیں معلوم کہ اس گھڑے پر اس کا کیا اثر پڑا جس کے رفیق کی جگہ مولانا نے غصب کر لی تھی۔

اب میں تو الگ رہا، مولانا اور ان کے حریف میں گھنپ ہونے لگی، حریف نے آخر اس اعتراف پر بحث ختم کرنی چاہی کہ دونوں امیدوار احمق ہیں، مولانا نے برجستہ فرمایا تو جناب میرا احمق کیوں نہ ووٹ پائے۔

یہاں احمق کے بجائے دونوں بزرگوں نے ایک اور لفظ استعمال کیا تھا جو احمق سے زیادہ چکدار، سریلا اور جامع تھا، لیکن اس کا اعادہ اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ پھر اسی قسم کے لوگ خاکسار کی عافیت میں خلل انداز ہوں گے، اردو میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو اپنی جامعیت و معنویت کے اعتبار سے فقروں اور جملوں پر نہیں، بلکہ پوری داستان پر بھاری ہوتے ہیں، گفتگو میں وہ بے تکلف استعمال بھی ہوتے ہیں، لیکن ان کو تحریر میں لانا میرے بس کی بات نہیں۔

مولانا کا "محاربۂ الکشن" ایک خاص نظام کے تحت ہوتا، امیدوار کا انتخاب اکثر ذوقِ نظر کے تحت کرتے، گو یہ ذوقِ نظر محض رسمی یا شاعرانہ ہوتا اس کے بعد اس کا پروپگنڈا شروع ہوتا، مشاعرہ ہوتا تو غزل طیار کرتے، تقریر ہوتی تو تقریر لکھ دیتے، روپیہ کی ضرورت ہوتی تو اس سے بھی دریغ نہ کرتے، کسی مضمون میں نیاز مندی ہوتی تو درس دیتے، وہ کوئی حماقت کر بیٹھتا تو مولانا ثابت کر دیتے کہ اس سے بڑھ کر لیاقت اور ذہانت اگر کسی میں تھی تو خود ان میں تھی، نتیجہ یہ ہوتا کہ لوگ مولانا کے قایل اور ان کے پٹھو کے دشمن بن جاتے، اس سلسلہ میں مولانا کو اکثر خود ستائی پر بھی مجبور ہونا پڑتا، ایک دفعہ کسی دل جلے نے کہدیا مولانا آپ اپنا پروپگنڈا کرتے ہیں، کیسی شرم کی بات ہے، مولانا نے نہایت استغنا کے ساتھ جواب دیکر اس کو خاموش اور غضبناک تر بنا دیا، فرمایا "نبوت کا دعوے نہ کیا جائے تو آپ لوگ نبی کے کب قایل ہوں"۔

مولانا کالج میں فارغ التحصیل عیال دار کی حیثیت سے داخل ہوئے، ایف، اے پاس کر کے آئے تھے، بی، اے میں داخل ہوئے اور ایم، اے، ال، ال، بی ہو کر نکلے، چار برس کالج میں رہے، بورڈر تھے، لیکن تمام زمانہ دوسروں کے کمروں پر گزرا، دن کا تو کیا ذکر رات ہوئی جس کمرے میں ہوتے وہیں رات گزار دیتے، اب کمرے والے کو یا تو شعر سنا رہے ہیں، یا اس کے لئے کوئی نظم لکھ رہے ہیں یا اس کو اقتصادیات، فلسفہ، تاریخ، الٰہیات، فارسی، عربی، شعر و شاعری پر لکچر دیتے ہوتے، ورنہ پھر آم، پان، زمینداری، مذہب، عورتوں کی اقسام، مردوں کے امراض، مسلمانوں کے انجام پر خطبہ دیتے ہوتے، زائد چارپائی کا انتظام ہوا تو خیر، ورنہ کسی کے ساتھ چارپائی پر شکل بستر بن جاتے

---

[1] پروفیسر محمد حاذق صاحب کے ہم وطن ایک حکیم صاحب اکثر حاذق صاحب کے ہاں بطور مہمان نازل ہو جاتے تھے، بڑے حکیم شحیم، لمبا کرتا، لمبی داڑھی، لمبا عصا، کھانا کھانے اور پکانے کے بڑے شایق، جو کھانے پر مدعو کرتا اسے قرونِ اولیٰ کا مسلمان قرار دیتے تھے، جس سے ناراض ہوتے اسے "بے غسلا" کہتے تھے۔

ناظرین کو کہیں یہ اندیشہ نہ ہو کہ ان مباحث میں مولانا کی صرف بکواس ہوتی، ہرگز نہیں، جس بحث کو اٹھایا یہ معلوم ہوتا تھا گویا ــــــــ عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

انگریزی میں ذرا نیازمند تھے، ریاضی سے دلچسپی تھی، سائنس سے قطعاً نا آشنا، ان کے علاوہ کالج میں درسیات کے سلسلہ میں جتنے مضامین تھے، ہر ایک پر پورا عبور تھا، جدید ترین نظریات سے آشنا تھے، مولانا کی ذہانت اور حافظہ کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ جس چیز کو انھوں نے عمر میں کبھی ایکبار بھی دیکھا یا پڑھا تھا اس پر ان کو اس درجہ عبور ہوتا تھا اور اس کی ادنیٰ جزئیات پر بھی اتنی قدرت ہوتی تھی کہ اس پر نہایت اعتماد کے ساتھ درس دے سکتے تھے، (مرشد ڈاکٹر ذاکر حسین خاں) کے قایل تھے، اکثر فرماتے تھے ڈاکٹر کی ذہانت اور فطانت تک پہونچنا آسان نہیں کیا کروں خرابی صحت نے مجھے برباد کر دیا ورنہ اس عمر میں میں بھی ایسا ہی تھا۔

بی، اے میں ذاکر صاحب کے مضامین، فلسفہ اور اقتصادیات تھے، ایف، اے میں سائنس، انٹرنس میں ریاضی کا نصاب اعلیٰ، مرشد کو پڑھنے لکھنے سے کیا سروکار، بی، اے میں حاضری کم تھی، ٹولی صاحب نے بلاکر دھمکایا تو کتاب لیکر بیٹھے، کچھ دیر تک قرۃ العین کے اشعار ٹھیک اس انداز سے پڑھتے رہتے، جس سے بآسانی اندازہ ہو سکتا تھا کہ ایک پٹھان کے ہاتھوں قرۃ العین اور اس کے اشعار کا کیا حشر ہو سکتا تھا، اس کے بعد اپنے اور قرۃ العین کے انجام پر غور کرنے کے لئے لیٹ جاتے، اتنے میں مولانا کا نزول اجلال ہوتا، فرماتے مولانا اب جان کی خیر نہیں، پڑھنا شروع کیا ہے، لیکن قدم قدم پر مصنف کتاب سے اختلاف آرا ہوتا ہے اور یہ بھی طے نہیں کرسکتا کہ کون حق بجانب ہے، مولانا جواب دیتے، "کوئی مضائقہ نہیں کتاب لاؤ" کتاب لائی گئی، مولانا فرماتے ذرا اصل عبارت کا ترجمہ سناؤ، وہ بھی سنایا گیا، مولانا لاحول ولا قوۃ کہکر فوراً کسی پر اکڑوں بیٹھ جاتے، تبصرہ شروع ہوتا، ثبوت میں مثالیں اپنی زمینداری یا علامہ شبلی مرحوم کی تصانیف سے دیتے، ذاکر صاحب کچھ دیر سنتے اور پھر کہتے بس بس سمجھ گیا، مولانا فرماتے دیکھو خواہ مخواہ جلدی نہ کرو، ابھی تو محض ابتدائی باتیں بیان کی ہیں، مصنف بڑا فریبی ہے، دیکھو اس کا فریب کھولتا ہوں، غرض نوبت یہاں تک پہونچتی کہ ذاکر صاحب بھاگ کھڑے ہوتے اور مولانا خواہ کسی حالت میں ہوتے ان کے پیچھے ہو لیتے، اب وہ آگے چلے جا رہے ہیں اور مولانا پیچھے پیچھے، جتنا فاصلہ دونوں کے درمیان بڑھتا جاتا مولانا اپنی آواز بلند کرتے جاتے، یہاں تک کہ ذاکر صاحب غائب ہو جاتے اور یہ پاس کے کمرے میں گھس جاتے، اب یقین مانئے وہ کمرہ خواہ کسی کا ہوتا، مولانا کا قیام آیندہ بارہ گھنٹے کے لئے وہاں مسلّم ہو گیا۔ یہاں بھی مباحثہ کے لئے کوئی نہ کوئی موضوع اختیار کر لیا جاتا۔

میں کچی بارک کے ۷، نمبر میں تھا، جمعہ کا دن تھا، مولانا بھی موجود تھے، مولانا کے غسل کا انتظام کیا جا رہا تھا مولانا کو غسل اور فیرنی سے ہمیشہ نفرت رہی، لیکن آج لوگ کچھ اس درجہ آمادۂ نقض امن ہوئے تھے کہ مولانا جی کڑا کر کے نہانے پر آمادہ ہو گئے تھے، صرف ایک چھوٹی سی میلی بنیائن اور اس سے زیادہ میلا آڑا پاجامہ فریب ستر بنے ہوئے تھے، کثیف کمر بند صاف پاجامہ میں پڑ چکا تھا اور میلے پاجامہ کے نیفہ کو تہبند کی سی بندش سے گرفتار کر رکھا تھا، جس کو مزید کمک فتق کی کمانی سے پہونچائی گئی تھی، اتنے میں کھانا آگیا، مولانا نے کہا کھانے کے بعد فوراً نہا لوں گا، ابھی مولانا ایک نلی (ہڈی) سے مناظرۂ دنداں نما کر رہے تھے کہ صاحب باغ سے کچھ لوگ آگئے، طہارت کے اسلامی اور غیر اسلامی تصور پر بحث چھڑ گئی، بحث کے انہماک میں مولانا کو یہ خبر بھی نہ ہوئی کہ جس چیز سے نلی ٹھونک کر موصوف گودا نکال رہے تھے، وہ غسل خانہ کا آستان تھا، لوگوں نے غل مچا دیا تو مولانا کو

خبر ہوئی، یہ موقع غنیمت تھا، نوواردوں نے رخصت ہوکر مسجد کا رخ کیا لیکن مولانا کی بحث ختم نہیں ہوئی تھی، اسلئے عالمِ بے خبری میں مولانا تعاقب کرتے ہوئے مسجد کے دروازہ تک پہونچ گئے، گداگر، مرد، عورت بچے سب آفت ناگہانی سے اس درجہ سراسیمہ ہوئے کہ بچوں نے بوڑھیوں کا، بوڑھیوں نے بوڑھوں کا اور بوڑھوں نے اپنے چیتھڑوں کی کی پناہ پکڑی، اتنے میں ہم لوگ بھی دوڑ پڑے اور مولانا کو ایک زخمی فاتح کی حیثیت سے کمرہ پر واپس لائے۔

مولانا کو ہر کھیل سے دلچسپی تھی اور جسے جتنا کم جانتے تھے اتنا ہی اس سے زیادہ شغف تھا، تاش، چوسر، گنجفہ، شطرنج، کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس، پولو، کہیں ہو رہا ہو، مولانا ضرور موجود ہوں گے اور اس تندہی اور دلچسپی کے ساتھ مصروفِ نظارہ ہوتے کہ دنیا و مافیہا کسی کی خبر نہ رہتی تھی، اس میں شک نہیں اس سلسلہ میں مولانا کا رعب اسی وقت تک قایم رہتا تھا، جب تک مولانا خاموش رہتے تھے، موصوف نے اظہارِ خیال کیا اور پکڑے گئے۔

مولانا صرف "اندرون خانہ" قسم کے کھیلوں میں براہ راست حصّہ لیتے تھے، تاش کھیلنے کا بھی شوق تھا، لیکن مولانا کے ساتھ کھیلنا ہر شخص کے بس کا نہ تھا، اول تو خراب کھیلتے تھے، دوسرے خلوص نیت سے نہ کھیلتے، ممکن ہے دوسری کمزوری پہلی کمزوری کی تلافی ہو!

مولانا کی شاعری پر اظہارِ خیال مرشد نے کیا ہے اور خدا جانے کیا اور کس طور پر کیا ہے، کیوں کہ نہ مجھ کو خبر کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں اور نہ ان کو خبر کہ میں کس آفت میں مبتلا ہوں، مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ مولانا کی شعر و شاعری کے بعد ہم سب پر شاعر اور شاعری کا پھر کبھی رعب نہیں پڑا، کسی قسم کی شاعری ہو، مصرعۂ طرح کیسا ہی سنگلاخ کیوں نہ ہو، وقت کتنا ہی تنگ کیوں نہ ہو، اُردو ہو یا فارسی، مولانا کا قلم، بقول مولانا ظفر علی خاں صاحب "ٹھاٹھیں" مارتا چلا جاتا تھا، معلوم نہیں ٹھاٹھیں مارنے کی ترکیب کا یہ محل استعمال صحیح ہے یا نہیں، مفہوم بہرحال وہی ہے جو ظفر علی خاں صاحب کا رہا ہوگا، مولانا دوسروں کو غزل اور نظمیں لکھدیا کرتے تھے، اصلاح نہیں دیسکتے تھے، کہتے تھے جب تک اصلاح دوں پوری نظم کیوں نہ لکھدوں۔

لیکن مولانا سے شعر لکھا کر مشاعرے میں پڑھنا بیحد خطرناک تھا، مشاعرے میں کبھی تو مولانا اپنے یا اس کے کلام پر بآواز بلند سوچنا شروع کر دیتے تھے یا پھر ان کا پیچ و تاب یا اظہارِ جذبات اس درجہ نمایاں اور معنی خیز ہوتا کہ لوگ فوراً تاڑ جاتے کہ فی الاصل مصنفِ کلام کون ہے، اس لئے جو شخص مولانا سے استفادہ کرتا وہ اس کا بھی اہتمام کرتا کہ جس موقع پر وہ کلام پیش کیا جائے وہاں مولانا موجود نہ ہوں، مولانا کا کلام مولانا ہی کے تخلص سے تقریباً نایاب ہے، لیکن دوسروں کے تخلص سے اتنا ہی وافر ہے، جتنا کہ ذوق کا (بقول آزاد)

کالج میں ایک دفعہ غالب اور ذوق کا موازنہ نہایت مقبول عام "ادبی ورزش" تھی، ایک صحبت میں یہی مسئلہ زیر بحث تھا، ذوق کے پرستاروں کی تعداد زیادہ تھی، مولانا بھی گشت لگاتے پہونچ گئے، لوگوں نے مولانا کی رائے طلب کی، اتفاق سے مولانا کی طبیعت بحث پر مایل نہ تھی، حاضرین نے چھیڑنا شروع کیا، لیکن مولانا برابر "غیر حاضر" رہے، ایک صاحب نے ذرا فاتحانہ انداز سے ذوق کا یہ شعر پڑھا ؎

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے ۔۔۔ یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

مولانا چونک پڑے، فرمایا سبحان اللہ! آپ ذوق سے بھی زیادہ کھرے نکلے، اس کے بعد خود شعر پڑھا اور ثانی مصرعہ کے ایک لفظ کو دو حصوں میں تقسیم کرکے پڑھ دیا اور سرنیچا کرکے لاحول ولا قوۃ کہدیا، ذوق کے سارے علمبردار خفیف اور خجل ہوکر اٹھ گئے۔

ہاں تو تذکرہ تھا مولانا کے کلام کی کمیابی اور نایابی کا، حال ہی میں کسی اخبار میں اشتہار دیکھا گیا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ مولانا کا دیوان زیر ترتیب ہے، اس لئے جن صاحبوں کے پاس مولانا کا کوئی کلام ہو وہ مرتب کے پاس بھیجدیں، اس سلسلہ میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں، ایک تو مولانا کی یہ کوشش اور تمنا کہ وہ کلام بھی دیوان میں شامل کرلیا جائے جو مولانا نے اپنی کسی خاص کمزوری کے تحت "وقف علی الاولاد" ساکردیا تھا اور دوسری طرف ان لوگوں کی سراسیمگی جو ان سے مستفید ہوئے تھے اور اب بدحواس ہیں کہ کہیں واقعتاً مولانا ایسا کر نہ بیٹھیں!

ایک صاحب مولانا کے نہایت عزیز دوست تھے، انھوں نے مولانا سے فرمایش کی کہ میں یونین میں ایک تقریر کرنا چاہتا ہوں، آپ ایک نہایت معرکۃ الآراء تقریر لکھدیں، مولانا فوراً آمادہ ہوگئے، تقریر لکھکر حوالہ کی گئی نہایت پرمغز، مدلل اور پرشوکت، الکشن کا زمانہ قریب تھا، اس زمانے میں ہر امیدوار کے لئے یونین میں اپنی تقریر کا سکہ جمانا لازمی ہوتا تھا، کئی ہفتہ بعد اسی مبحث کا نوٹس دیا گیا، جس پر مولانا نے تقریر لکھی تھی، اور محرک کا نام بھی وہی تھا، جس کے لئے مولانا نے تقریر لکھی تھی، مقررہ یوم اور وقت پر ہم سب مولانا سمیت یونین پہونچے، وائس پریسیڈنٹ نے کھڑے ہوکر اعلان کیا کہ بعض وجوہ کی بنا پر محرک تشریف نہ لاسکے، اس لئے فلاں صاحب تحریک پیش کریں گے، یہ بزرگ مولانا کے دوست کے دوست تھے، لیکن مولانا ان کے ازلی دشمن تھے، مولانا کو کچھ تو اپنے دوست کے فرار ہونے پر خفت اور مایوسی تھی، کیونکہ حسب معمول ممدوح نے اپنی تصنیف اور اپنے دوست کی تقریر کا اپنے مخصوص انداز میں کافی پروپگنڈا کر رکھا تھا، دوسرے حریف کی پیشقدمی سے متحیر اور مکدر ہوئے، اب ممدوح نے نو وارد کے خلاف طبع آزمائی شروع کی کہ یہ تقریر کرنا کیا جانیں، دو سطر عبارت تک صحیح لکھنا اور بولنا نہیں آتا، موضوع زیر بحث ان کے فرشتوں کے بھی سمجھ میں نہیں آسکتا، وغیرہ وغیرہ۔

محرک جدید حریف پارٹی کے رکن تھے اور بعض دیگر بنا پر ان کا شہرت پذیر ہونا مولانا کے مقاصد کے منافی تھا، تقریر شروع ہوئی، مولانا یکلخت چونک پڑے، یہ بزرگ نہایت خوبی اور بلند آہنگی کے ساتھ مولانا ہی کی لکھی ہوئی تقریر دہرا رہے تھے، اب مولانا کو معلوم ہوا کہ فریب دیا گیا تھا، ایسا فریب جس کی اہمیت اور نزاکت کو نظر انداز کیا گیا تو الیکشن کا سارا بنا بنایا نقشہ پلٹ جائے گا، تقریر ختم ہوئی اور سارا ہال ابھی نعرۂ تحسین سے گونج ہی رہا تھا کہ مولانا اسٹیج پر نظر آئے۔

سارے حاضرین متحیر تھے کہ مولانا تقریر کرنے پر کیونکر آمادہ ہوگئے، مولانا کی جادو بیانی مشہور تھی، لیکن موصوف کو تقریر پر آمادہ کرنا ہر شخص کا کام نہ تھا، آج جو یہ آمادگی پائی گئی تو سارا مجمع فرطِ شوق سے ہمہ تن گوش بن گیا، مولانا نے تحریک کی مخالفت میں برجستہ کامل ایک گھنٹہ تقریر کی، اس عالمانہ تبحر، لطف بیان اور جوشِ خطابت کے ساتھ کہ لوگ حیرت میں آگئے، بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی، اس کے بعد سے لوگوں پر مولانا کے علم و فضل اور سحر بیانی کا ایسا سکہ جما کہ مولانا جب تک کالج میں رہے مولانا کے حریفوں نے بھی کبھی سرتابی نہیں کی، سرور خاں مرحوم زندہ تھے اور طلبائے کالج کی "جماعتِ اشراف" کے مسلمہ لیڈر تھے اور مولانا سہیل اور ان کے "چوٹی والوں" کے سخت مخالف، ایک دفعہ مولانا کا تذکرہ آگیا، کہنے لگے "فتنہ ہے فتنہ" لیکن کیا کیا جائے کمبخت بڑا قابل ہے بے پناہ ہمہ دان۔۔۔۔

۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے، یونین میں ام الالسنہ عربی پر خواجہ کمال الدین مرحوم کی اُردو میں تقریر تھی، خواجہ صاحب مرحوم نے نہایت بلاغت اور بالغ نظری سے تقریر شروع کی، مولانا سہیل کی آنکھوں میں تکلیف تھی، غالباً سرخیوں کا زمانہ تھا، مولانا کو کچھ لوگ اسپتال لائے تھے، یونین میں مجمع دیکھا تو ساتھیوں نے کہا مولانا تکلیف نہ ہو تو

ذرا تقریر سننے چلیں، مولانا نے کہا اچھی بات ہے، لیکن آنکھوں میں تکلیف زیادہ ہے جلد اُٹھ آئیں گے، سب لوگ یونین میں آئے، مولانا سر سے پاؤں تک بڑے وزنی لبادہ میں ملفوف تھے، سر پہ اونی کنٹوپ تھا، آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس پر ایک ہرے رنگ کا چھجا سا لگا ہوا تھا، خواجہ صاحب نے کم وبیش دو گھنٹے تقریر کی، حاضرین حیرت کے عالم میں وجد کر رہے تھے، تقریر ختم ہوئی تو ڈانس پریسیڈنٹ نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ مولانا سہیل فاضل مقرر کا طلبائے کالج کی طرف سے شکریہ ادا کریں گے، دوستوں اور ساتھیوں نے مولانا کو ہاتھوں ہاتھ منبر تقریر کے پاس کھڑا کر دیا، مولانا کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی، منبر کے پاس کھڑے کئے گئے تو معلوم ہوا کہ تھوڑی سی ناک اس سے ذرا بڑی ٹھوڑی اور ہاتھ کی صرف اُنگلیاں دکھائی دے رہی ہیں، مولانا نے برجستہ تقریر شروع کی اس اعتماد سے گویا موصوف نے تمام عمر اسی مبحث پر طیاری کی تھی، جو لوگ یونین کے مجمع سے واقف ہیں وہ جانتے ہونگے کہ اچھے مقرر کی تقریر کے بعد کسی اور کی تقریر سننے کے لئے کوئی نہیں ٹھہرتا اور صدر کا شکریہ بھی اسی بدنظمی کا ایک سلسلہ ہوتا ہے، مولانا نے بھی ام الالسنہ عربی پر تقریر شروع کی، مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا، مولانا نے پون گھنٹہ تک تقریر کی، نئے نئے پہلوؤں سے موضوع پر روشنی ڈالی، نئی نئی مثالیں پیش کیں، اسلوب بیان حکیمانہ ترتھا تقریر کو اس درجہ دلنشین اور کہیں کہیں اتنا شگفتہ بنا دیا کہ خواجہ صاحب ممدوح بے اختیار ہو کر بغل گیر ہوگئے اور فرمایا "تمھارے ایسا جامع کمالات ساتھ کام کرنے والا مل جائے تو میں اسلام کا جھنڈا یورپ کی سب سے بلند چوٹی پر نصب کر دوں"

مسز سروجنی نائیڈو کالج میں پہلے پہل تشریف لائی تھیں، آج سے کم وبیش سترہ اٹھارہ سال قبل اسٹریچی ہال میں رات کے وقت تقریر ہوئی، وہ رات اُردو ادب اور ہندوستانی سیاست میں یادگار رہے گی، ہماسے "دو اسو بھا" آغا حیدر حسن دہلوی نے بیگماتی زبان میں بیگم نائیڈو پر ایک مضمون لکھا جو اپنی بعض خوبیوں کے اعتبار سے اُردو ادب میں بے نظیر ہے، دوسری نظم مولانا سہیل نے لکھی، معلوم نہیں وہ نظم دستیاب بھی ہوئی یا نہیں، ترکیب ترنم، لطافتِ خیال، تازگیِ تصور، لطفِ بیان، طرفگی تخیل میں وہ خود سروجنی کا پیکرِ شعری تھا اور تیسرے کہا جاتا ہے کہ اسوقت کے سکریٹری کالج کے "حرم بننے" کی شانِ نزول بھی اسی واقعہ سے وابستہ ہے!

مجھے مولانا کے کلام کا جائزہ لینا مقصود نہیں ہے، عام طور پر لوگ خیال کرتے ہوں گے کہ مولانا کی شعر و شاعری صرف اُردو تک محدود تھی، حالانکہ مجھے اکثر کچھ ایسا محسوس ہوا ہے کہ مولانا کے فارسی کلام میں اُردو سے زیادہ طرفگی اور تازگی ہے، اعلیحضرت شہریار دکن کے ورود مسعود پر مولانا نے جو فارسی قصیدہ اسٹریچی ہال میں سنایا تھا وہ مولانا کی فارسی دانی کا ادنیٰ ثبوت ہے، یہ قصیدہ مولانا نے رات بھر میں لکھ ڈالا تھا، اس کے علاوہ متعدد ایسی نظمیں بھی جو ممدوح نے وائس پریسیڈنٹ یونین کی اورنگ نشینی کے موقع پر تصنیف فرمائیں، میں اب تک یہ نہیں طے کر چکا ہوں کہ مولانا فارسی نظمیں جلد لکھ سکتے تھے یا اُردو، بہر حال کچھ بھی ہو، لکھتے بہت جلد تھے، اتنا جلد کہ تصور میں بھی بہ مشکل آسکتا ہے۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ شہر سے کچھ لوگ آئے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے مولانا تک پہونچے، مولانا کہیں جانے پر آمادہ تھیں لوگوں نے ہاتھ پاؤں جوڑنا شروع کر دیا، مولانا کھڑے کھڑے شعر لکھانے لگے، تھوڑی دیر میں نظم مکمل ہوگئی اور لوگ خوشی خوشی چلے گئے، ایک دن کا قصہ یاد ہے، مولانا قضائے حاجت کے بعد لوٹا لئے چینیا آفس یا جواہر منزل سے واپس آرہے تھے، پچی بارک کے کمرہ میں داخل ہی ہورہے تھے کہ کچھ اجنبیوں نے وہیں پکڑ لیا، منظوم رقعۂ دعوت کی التجا تھی، مولانا بھی وہیں لوٹا لئے ہوئے اکڑوں بیٹھ گئے، پہلا مصرعہ لکھایا تھا کہ ایک صاحب بول اُٹھے، حضور اُردو نہیں فارسی

مولانا نے بغیر ایک لمحہ تامل کے فارسی شعر لکھانے شروع کر دئے، فریقین کے نام، گاؤں، تاریخ سب کچھ نظم کر دی، کیسی دلکش اور ستھری نظم تھی، میں نے کہا مولانا اسے علی گڑھ منتھلی میں شائع کراؤں گا، مجھے بھی لکھا دیجئے، فرمایا اب یاد کہاں اور پھر ایسی ویسی نظموں سے کون اپنے آپ کو منسوب کرے!

کتنے تو ایسے تھے جنھوں نے انعامی نظم اور مضامین نثر مولانا سے لکھوائے اور اول درجہ کا انعام حاصل کیا، ایک واقعہ یہاں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے، علی گڑھ کی نمایش قریب تھی، لکھنؤ کا ایک سفر درپیش تھا، اور کالج کے مطالبات مستزاد، ہم لوگ اس فکر میں تھے کہ کہیں سے روپے مل جائیں تو یہ سارے مرحلے کامیابی سے طے پا جائیں، ہم میں سب سے زیادہ مولانا دولت مند تھے، مولانا صرف کپڑے اور معجون پر روپے صرف کرتے تھے، یا ہم لوگوں کو قرض حسنہ دیتے تھے، قرض حسنہ کا مفہوم یہ تھا کہ اگر کبھی مولانا کو ضرورت ہو تو ہم روپئے ادا کریں، ورنہ کوئی ضرورت نہ تھی، مرشد نے اس میں سود کا اضافہ کر دیا تھا یعنی بجائے اس کے کہ اصل پر سود کا اضافہ کر کے مولانا کو واپس کیا جاتا، ادا کرتے وقت اصل میں سے سود اور بھول چوک کی رقم وضع کر لی جاتی تھی، مولانا اس پر بھی اکتفا کرتے اور کہتے کہ جو کچھ مل گیا وہ پورا نفع ہے۔

اب یہ فکر ہوئی کہ روپے کہاں سے آئیں، رقم زیادہ تھی، مرشد نے فرمایا، مولانا کو ٹٹولو، میں نے کہا رقم زیادہ ہے، مولانا تو مان جائیں گے لیکن اس میں خرابی یہ ہے کہ وہ اس کے واپسی کے متمنی ہوں گے اور مولانا نے مانگا تو ہمارے ہاں ان کی ساکھ باقی نہ رہے گی، جو ان کے لئے اہم ہو یا نہ ہو، ہمارے لئے بہت اہم ہوگی، علوی نے کہا دیکھو ترکیب میں بتاتا ہوں، ابھی میں نے ایک نوٹس دیکھا ہے، اردو کا ایک مضمون طلب کیا گیا ہے، اول انعام سو روپے کا ہے، مولانا سے لکھواؤ مضمون میں نام ہم اپنا دیں انعام تو مل ہی جائے گا، سو روپے مولانا سے قرض لے لئے جائیں، انعام ملے تو حق شاگردی وضع کر کے مولانا کو کچھ روپے واپس کر دئے جائیں گے؟ یہ ترکیب پسند کی گئی اور پوری اسکیم مرتب کر کے ہم سب منہ لٹکائے مولانا کے پاس پہونچے۔

مولانا ہم لوگوں کو کبھی افسردہ خاطر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ دیکھتے ہی بولے، خیر تو ہے، سست سست سے کیوں ہو بڑی دیر کے بعد علوی نے کہنا شروع کیا، مولانا وہ اشتہار تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا، جس میں سو روپے کا انعام مقرر ہے، مولانا نے کہا ہاں دیکھا ہے، لیکن موضوع بڑا مبتذل اور پیش پا افتادہ ہے، علوی نے کہا جی ہاں ٹھیک ہے، لیکن سرور صاحب نے آغا صاحب کے لئے ...... صاحب کو لکھنؤ لکھا تھا اور وہاں سے وہ مضمون طیار ہو کر آگیا ہے، نہایت عمدہ لکھا گیا ہے، انعام تو خیر آغا کو مل ہی جائے گا لیکن آپ سمجھئے آیندہ الکشن پر اس کا کیا اثر پڑے گا، ہم لوگ تو کہیں کے نہ رہے، سرور صاحب کہتے تھے کہ انعام ملنے پر سہیل صاحب کی مزاج پرسی کروں گا — سنتے ہی مولانا نے جھرجھری لی، بولے سرور سے کہہ دینا، ستارۂ یمانی علی گڑھ سے بھی طلوع ہو سکتا ہے، اچھا تو ذرا میز پر سے سادی کاپی تو اٹھانا، قلم تو تمھارے پاس ہے ہی، لکھو، اب مولانا نے مضمون لکھانا شروع کیا، بولے "بدو آفرینش سے" ہم لوگوں نے کہا مولانا یہ "بدو" وغیرہ مہمل ہیں، ذرا سیدھا سادھا لکھائیے، ایسا بھی کیا مضمون جس کا پہلا ہی لفظ نہ ٹھیک سے پڑھا جائے اور نہ سمجھا جائے، مولانا مسکرائے اور پھر لکھانا شروع کر دیا، کم و بیش تین گھنٹے تک لکھاتے رہے، اس کے بعد دوسرے وقت کے لئے لکھائی ملتوی ہوئی، دوسرے دن مولانا نے پھر شروع کیا اور بغیر یہ پوچھے ہوئے کہ اوپر کیا لکھ آئے ہو، بولنا شروع کر دیا، مضمون فلسکیپ کے تیس ۳۰ صفحات پر ختم ہوا، نتیجہ جلد معلوم ہو گیا۔ اس لئے ہم لوگوں کو مولانا سے سو روپے نہیں لینے پڑے، انعام کے روپے ملے اور ہمارے پروگرام کی ایک ایک مد پوری ہو گئی۔

مولانا کی گھریلو زندگی اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے، مولانا اپنی تمام رشتہ دار عورتوں میں بیحد مقبول ہیں، عزیزوں کے تمام بیٹے بیٹیوں کی شادی کی بات چیت مولانا ہی کے ذمہ ہے، سال سال بھر کے قصے قضیے اس وقت تک کے لئے ملتوی رکھے جاتے ہیں جب تک تعطیل میں مولانا کا پھیرا نہ ہو جائے، گھر کے ایک معتبر بھید سے روایت ہے کہ مولانا خاندان کی تمام

عورتوں کے ساتھ ایک ہی چارپائی پر بیٹھے ہوتے ہیں اور صبح سے شام تک ان کے قصے قضیے چکایا کرتے ہیں، ان ہی کی زبان میں اور کبھی کبھی ان ہی کے لہجہ اور روزمرہ میں گفتگو کرتے ہیں، اور ان ہی کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں، اسی دوران میں کبھی کبھی ان میں سے کوئی کوئی ایک ساتھ کپڑوں کی فرمائش کر دیتی ہیں تو مولانا جس طرح بیٹھے ہوتے ہیں ویسے ہی اُٹھ کر بازار چلے جاتے ہیں ایک دفعہ میں نے بھی مولانا کو بایں ہیئت کذائی دیکھا کہ دال منڈی (بنارس) میں ننگے سر بزاز کے ہاں سے کم سے کم دو درجن کپڑے کے تھان نوکر کے سر پر رکھوائے چلے آرہے ہیں، ایک ہاتھ میں رشتہ دار عورتوں ہی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی گلوری ہے پاؤں میں سلیم شاہی جوتی بہ شکل سلیپر، راستہ میں ایک بساطی سے اہل حدیث قسم کی بحث کر رہے تھے، بڑے تپاک سے ملے کہنے لگے صدیقی صدیقی خوب آئے، بغل گیر ہونے پر آمادہ ہوئے، تو میں نے کہا، مولانا شیروانی میرے پاس ایک ہی ہے اور نئی بھی ہے، اس پان کو یا تو یہیں کسی بالاخانے پر دے آئیے، یا اسی بساطی کو دیدیجئے، بڑی بحثیں کرتا ہے، آپ کا پان کھا کر گلپھڑوں کو رو دے گا، مولانا پان میں صرف چونا کھاتے ہیں!

ہم دونوں مکان واپس آئے، عورتوں نے باوجود مولانا کی فصاحت و بلاغت کے سارے کپڑے واپس کر دئے اور فرمائش کردی کہ اور لاؤ، مولانا پھر آمادۂ سفر ہوئے اور اس اطمینان کے ساتھ گویا دارالمصنفین میں دعوت کھانے جا رہے ہیں میں نے کہا مولانا یہ نہ ہوگا، کپڑے نوکر سے واپس کرا دیجئے، آپ جس ہیئت سے دال منڈی میں گشت لگاتے ہیں اس کا اثر وہاں کے "بالانشینوں" پر کیا پڑے گا، مولانا نے کہا دال منڈی والیوں کا خیال کروں یا گھر والیوں کا، دال منڈی میں تم جانے نہیں دیتے، گھر والیاں اندر نہ گھسنے دیں گی، میں نے کہا مولانا کچھ پروا نہیں، یہ دیکھئے سامنے کیسے اچھے سیخ کے کباب، پیاز کے لچھے نظر آرہے ہیں، ہم آپ یہی کھائیں گے، آپ شعر سنائیے گا میں سو رہوں گا، اتنے میں آہ خدا بخشے احمد مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے آگئے، کہنے لگے صدیقی تمہارا آنا ہم سب کی نجات کا باعث ہوا، ورنہ اقبال ان عورتوں کے پھیر میں تمام دن دال منڈی میں آسیب گم گشتہ کی طرح چکر لگاتے، ادھر گھر میں عدالت دیوانی کا پورا اجلاس ہو رہا ہے عجیب ضیق میں جان تھی

مولانا سہیل کو فن عمارت میں بھی درک ہے، جس طرح مشکل زمین میں اچھے شعر نکالنا ہر شاعر کا کام نہیں ہے اسی طرح شہر کی چپقلش میں عمارت کا اچھا نقشہ بنانا بھی کچھ آسان نہیں ہے، عجیب عجیب ٹیڑھی میڑھی زمین میں مولانا نے ایسے خوش وضع مکان بنوائے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، معلوم نہیں مولانا اچھا کھانا کھانے کے شایق ہیں یا نہیں، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ مولانا کے گھر میں نہایت اچھا اور ستھرا کھانا پکتا ہے، میں نے اکثر اپنے خرچ سے مولانا کے یہاں ارہر کی دال اور کھڑے مسالے کا گوشت کھانے اور ان کے بالاخانے کے "ہوادار" برآمدے میں سونے کے لئے اعظم گڑھ جیسے مہمل مقام کا سفر کیا ہے، مولانا پان بےحد کھاتے ہیں اور دانت نہیں صاف کرتے، جس طرح بعض لوگ شکر کی چائے پیتے ہیں اسی طرح مولانا چونے کی خاطر پان کھاتے ہیں، فن عمارت کی اصطلاح یا استعارہ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ پان پر کتھے کی صرف کوچی پھری ہوتی ہے اور چونے کا پلاسٹر۔ لیمو کے بڑے دلدادہ ہیں، ایک دن کہنے لگے کہ اللہ میاں نے (اگر عیسائیوں کا عقیدہ صحیح ہی) چھ دن میں ساری دُنیا بنائی اور ساتویں دن لیمو سے دل بہلایا۔ پھر لیمو اور عورت پر ساتھ ساتھ گفتگو شروع کر دی۔

مولانا اعظم گڑھ میں وکالت کرتے ہیں، خوب چلتی ہے جس کا تفصیلی تذکرہ میں نے ایک دوسرے مضمون میں کیا ہے، وکالت کے پیشے سے میں طبعاً متنفر ہوں اور میری دلی خواہش ہے کہ مولانا اس عذاب سے نجات پا جائیں۔ مولانا کا بہترین مشغلہ تصنیف و تالیف یا درس و تدریس ہوگا۔

(پروفیسر) رشید احمد صدیقی، علیگڑھ

جنگ کی ہولناک تاریخ

(ہندوستان وپاکستان دونوں کی خدمت میں)

۱۴۶۹ء قبل مسیح سے ۱۹۳۰ء تک تقریباً چار ہزار سال کے زمانہ میں صرف ۲۸۷ سال نسبتاً امن وسکون کے ساتھ گزرے ہیں ورنہ باقی ۳۱۱۲ سال کا زمانہ جنگ وجدل ہی میں گزر گیا اس دوران میں قیام امن کی جو کوششیں کی گئیں، ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ۱۵۰۰ قبل مسیح سے ۱۸۶۰ء تک مختلف قوموں اور ملکوں کے درمیان آٹھ ہزار عہد نامے دائمی صلح وآشتی قایم رکھنے کے لئے کئے گئے لیکن ان میں کسی معاہدہ کی عمر دو سال سے زیادہ پایدار ثابت نہ ہوئی۔

یوروپ کی مشہور ۳۰ سالہ جنگ کے آغاز (۱۶۱۸ء) کے بعد ۱۷۰۰ اور بڑی بڑی جنگیں دُنیا میں ہوئیں، جن میں سے سب سے زیادہ حصہ فرانس نے لیا، اس کے بعد آسٹریا ہنگری نے اور پھر برطانیہ و پروشیا نے۔

اس زمانہ میں فرانس، برطانیہ سے ۳۷ سال برسرپیکار رہا، پروشیا اور جرمنی سے ۸۰ سال اور اسپین سے ۶۲ سال لیکن موجودہ تاریخ کی سب سے زیادہ طویل جنگ فرانس و برطانیہ کی جنگ تھی جو ۱۳۳۳ء میں شروع ہوئی اور سو سال تک جاری رہی۔

۵۰۰ قبل مسیح سے ۱۹۲۵ء تک یونان، روم، وسطی یوروپ، جرمنی، اٹلی، فرانس، برطانیہ، نیدرلینڈ، اسپین اور روس کے درمیان ۹۰۲ لڑائیاں ہوئیں۔

بارھویں اور تیرھویں صدی میں روس سب سے زیادہ مبتلائے جنگ رہا، چودھویں صدی میں انگلستان، پندرھویں سولھویں، سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں آسٹریا (رومہ کی مقدس حکومت) اور انیسویں صدی میں فرانس کو لڑائی سے زیادہ سابقہ پڑا۔

اس امر کا اندازہ کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ لڑائی کی خونخواریاں برابر بڑھتی رہی ہیں اس سے ہوسکتا ہے کہ ۱۳۷۵ء سے ۱۶۹۳ء تک نبرد آزما سپاہ کی تعداد ۱۵ ہزار سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ اٹھارھویں صدی میں یہ تعداد ۴۰ ہزار تک پہونچ گئی، نپولین کے عہد میں ۱۰۸ ہزار تک اور روس وجاپان کی جنگ میں ایک لاکھ تک۔ اس کے بعد لیپزگ کی جنگ (۱۸۱۳ء) میں یہ تعداد ۵ لاکھ تک پہونچ گئی اور پہلی جنگ عظیم میں صرف اٹلی کے ۱۴ میل کے محاذ پر ۴۸۴۰ توپیں نصب کی گئیں اور ۱۲ دن میں ۳۰ لاکھ فیر کئے گئے جن پر تین کرور پونڈ صرف ہوا۔

لڑائی میں آگ اور دھویں کا استعمال سب سے پہلے گیارھویں صدی میں چین نے کیا تھا، اس کے بعد تیرھویں صدی میں مغلوں نے یوروپ پر حملہ کے دوران میں اس سے کام لیا۔ اسی کے ساتھ منجنیقوں سے غلیظ کے برتن بھی دشمن کی فوجوں میں پھینکے جاتے تھے تاکہ وہ بدبو سے گھبرا کر لوٹ جائیں۔

موجودہ عہد کے میکانکی وکیمیائی آلات حرب کا استعمال پہلی جنگ عظیم میں کیا گیا۔ یہ جدید آلات ۳۰۰ کی تعداد

میں طیار کئے گئے، لیکن ان میں سے بارہ زیادہ کامیاب ثابت ہوئے۔ انھیں میں سے ایک گیس بھی تھی جس کا استعمال واشنگٹن کانگریس نے ۱۹۲۱ء میں ممنوع قرار دیدیا تھا، لیکن اس کی پابندی کسی نے نہیں کی اور ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے حبشہ کے خلاف اور ۱۹۳۷ء میں جاپان نے چین کے خلاف اس کا استعمال بڑی آزادی سے کیا۔

بارود کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے چین نے اسے چھٹی صدی میں ایجاد کیا، لیکن اس کا استعمال صرف آتش بازی تک محدود تھا۔ سب سے پہلے ۱۲۳۲ء میں مغل سردار قبلائی خاں نے لڑائی میں اس کا استعمال کیا تیرھویں صدی میں یہ چیز یورپ کو بھی معلوم ہوگئی چنانچہ جس چیز کو Greek fire کہا جاتا ہے وہ بارود ہی تھی۔

یوروپ میں سب سے پہلے اس کا استعمال ۱۲۴۷ء میں محاصرۂ اشبیلیہ کے وقت کیا گیا۔ بارود کے ساتھ جب توپ بھی بن گئی تو آمنے سامنے کی لڑائی کا طریقہ ختم ہوگیا، توپیں سب سے پہلے ۱۳۳۸ء میں بحری جنگ کے سلسلہ میں استعمال کی گئیں۔ اس کے بعد ۱۵۱۲ء میں جب انگریزوں اور فرانسیسیوں میں لڑائی ہوئی تو دونوں فریق کے جہاز توپوں سے آراستہ تھے۔ اس کے بعد جب ۱۴۵۱ء سے ۱۴۸۱ء تک سلطان محمد ثانی نے ادرنہ کا محاصرہ کیا تو اس نے توپوں سے کام لیا اور تین تین سو پونڈ کے سنگی گولے سر کئے گئے جن کی آواز تیرہ میل تک پہونچتی تھی۔

پیچھے کی طرف سے بھری جانے والی توپ سب سے پہلے کرپ نے ۱۸۵۶ء میں ایجاد کی اور ۱۹۱۰ء تک اس کو اتنا زوردار بنا دیا کہ اس کا گولہ چھ میل تک جاتا تھا۔

پہلی جنگ عظیم میں جرمنی نے جو توپیں استعمال کیں ان کا گولہ میدان میں ۸۰ میل تک اور بلندی میں ۲۸ میل تک پہونچ جاتا تھا۔ اس جنگ کے لئے فرانس کے کارخانوں نے ۱۰،۵۰۰ ہلکے اور ۴۰ ہزار بھاری گولے روزانہ طیار کئے۔ دستی بم ۳۰ کرور کے قریب استعمال کئے گئے اور اس طرح گویا ۱۳ لاکھ ٹن فولاد ایک مہینہ میں آگ اور دھوئیں کی نذر ہوگیا۔

فوجی جوتوں کا استعمال سب سے پہلے مصر میں ۲۰۰۰ سال قبل مسیح شروع ہوا۔ یہ جوتے پیپرس (ایک قسم کی گھاس) سے بنائے جاتے تھے۔ گھوڑوں کی نعل کا رواج بھی سنہ ۵۰۰ء سے پہلے نہیں تھا۔ اس سے قبل سموں پر ایک خول سا چڑھا دیا جاتا تھا۔ ان ملکوں میں جہاں کی زمین نرم تھی یا سبزہ سے ڈھکی رہتی تھی وہاں تو نعلوں کی ضرورت نہ تھی، لیکن جاپان میں گھاس پھونس کی نعل کا رواج پایا جاتا تھا۔ روما کی سڑکیں چونکہ پتھریلی تھیں اس لئے وہاں اسکی ضرورت زیادہ محسوس کی گئی اور انھوں نے چمڑے کی نعلیں طیار کیں۔

رکاب کا رواج بھی قدیم روما و یونان میں نہ تھا۔ اس کو سب سے پہلے یوروپ میں سرمتی قوم نے رائج کیا۔ اس قوم کی اولاد اب روس میں آباد ہے۔ زین البتہ قدیم زمانہ میں بھی پایا جاتا تھا اور اس کی مختلف شکلیں تھیں، چنانچہ قدیم اسیریا کی سوار فوج زین استعمال کرتی تھی اور اہل روما اپنے گھوڑوں کی پیٹھ پر کپڑا، چمڑا یا سمور ڈال دیتے تھے۔

فوجی جھنڈا بھی بڑی پرانی چیز ہے، چنانچہ قدیم مصری فوجیں جب حملہ کرتی تھیں تو جھنڈا ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ اس پر اپس دیوتا کے بیل اور گھڑیال کی تصویر منقوش ہوتی تھی۔ اسیریا کے جھنڈے پر فاختہ بنی ہوتی تھی اور فارس کے نیزوں پر سنہرے عقاب کی جھنڈیاں لگی رہتی تھیں۔ اسپارٹا کے جھنڈے پر ہرکلس کی تصویر ہوتی تھی اور ایتھنس کے جھنڈے پر سرخ رنگ کے اُلّو کی۔ روما کے جھنڈوں پر عقاب، بھیڑئے، سور اور گھوڑے کی تصویریں ہوتی تھیں۔

مصر قدیم میں ۳۰۰۰ سال قبل مسیح ہر ضلع کے اندر ایک فوجی دستہ رہا کرتا تھا اور لڑائی کے زمانہ میں اضلاع کے دستے اکٹھا ہوکر پوری فوج بنا لیتے تھے۔ یہ فوج صرف نیزہ بازوں اور تیر و کمان چلانے والوں کی ہوتی تھی۔ خود، زرہ، تلوار کا وجود اس وقت نہ تھا۔ ۱۵۰۰ سال بعد وہاں مستقل فوجیں رکھی گئیں جن کے سردار مصری ہوتے تھے اور سپاہ

میں دوسری قوموں کے لوگ بھی۔ اب وہ تبر اور تلواروں سے بھی آراستہ تھے اور جنگی رتھ بھی رکھتے تھے۔ افسر اپنے ہاتھوں میں چھوٹے ڈنڈوں کی جگہ (جیسا آج کل رواج ہے) دستی پنکھے لئے رہتے تھے۔

قدیم بابل، اسیریا اور میڈیا میں، پیادہ و سوار دونوں فوجیں پائی جاتی تھیں اور جنگی رتھ بھی تھے۔ سب سے پہلے فارس میں عسکر شاہی قایم ہوا جسے بادشاہ کی ذات کا حلف فرمانبرداری لینا پڑتا تھا۔ اس باڈی گارڈ کا سالانہ ریویو بھی ہوتا تھا۔

اس وقت صرف پارتھا (جو بحر اخضر کے شرق و جنوب کی طرف واقع تھا) ایک ایسا ملک تھا جس کی سوار فوج بہترین قسم کی تھی اور زرہ بھی استعمال کرتی تھی۔ بعد کو یہ افواج روما میں ضم ہوگئی۔

یونانی فوج سِوِل قسم کی مسلح جماعت تھی جسے کوئی تنخواہ نہ ملتی تھی۔ ضرورت کے وقت ان میں غلاموں کو بھی شامل کرلیا جاتا تھا۔ سوار فوج قدیم یونان میں بالکل نہ تھی۔ مقدونیہ میں البتہ ایک مستقل فوج رہتی تھی لیکن ضرورت کے وقت اُجرت پر بھی سپاہی بھرتی کرلئے جاتے تھے۔

دوسری صدی قبل مسیح تک روما کا سپاہی بڑا جری سپاہی سمجھا جاتا تھا اور ۲۳ سال قبل مسیح تک روما کی سپاہ ۴ لاکھ ۵۰ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔

فوجی رتھوں کی ایجاد اسیریا والوں نے کی تھی جس نے رفتہ رفتہ موجودہ بکتر بند موٹروں کی شکل اختیار کرلی۔ سب سے پہلے بکتر بند گاڑی ۱۸۵۵ء میں طیار کی گئی، بعد کو ۱۹۰۲ء میں ڈیلر نے بکتر بند موٹر طیار کئے جن پر توپیں بھی نصب ہوتی تھیں۔ ۱۹۱۴ء میں سب سے پہلے ان موٹروں کا استعمال فرانس نے کیا۔ ۱۹۳۷ء کے آغاز میں روس کے پاس ۶ سے ۱۰ ہزار تک دبابے (ٹینک) پائے جاتے تھے، فرانس کے پاس ۴۰۰۰ اور برطانیہ و پولینڈ کے پاس ۶، ۲ سو۔

جنگ کی تباہکاریاں

تیس سالہ (۱۶۱۸ء ــ ۱۶۴۸ء) جنگ میں جرمنی کے ایک کرور ۲۰ لاکھ آدمی کام آئے اور ورٹمبرگ کی آبادی ۹ لاکھ سے گھٹ کر ۵۰ ہزار رہگئی۔

انقلاب فرانس اور نپولین کی جنگوں میں ایک کرور فرانسیسی کام آئے اور ۱۸۱۲ء میں فرانس کی جو ۶ لاکھ فوج روس پر حملہ کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی اس میں سے صرف ۲۰ ہزار سپاہی واپس آئے اور ایک کرور ۲۵ لاکھ پونڈ صرف ہوئے امریکہ کی سِوِل وار میں (۱۸۵۴ء ــ ۱۸۵۶ء) ۳۰ کرور ۵۰ لاکھ پونڈ صرف ہوئے اور ایک لاکھ ۵۰ ہزار سپاہیوں میں ۲۰ ہزار کام آئے۔

۱۸۵۹ء کے جنگ میں جو فرانس و اٹلی کے درمیان ہوئی ۵۵ ہزار سپاہی مارے گئے۔ آسٹریا پروشیا کی لڑائی (۱۸۶۶ء) میں ۴ لاکھ آدمی کام آئے۔ ۱۸۵۹ء کی روس و ترکی کی جنگ میں ۱۲ لاکھ ۵۰ ہزار سپاہی مارے گئے۔ فرانس اور پروشیا کی جنگ ۱۸۷۰ء میں ۲ لاکھ ۹۰ ہزار سپاہی کام آئے اور علاوہ تاوانِ جنگ کے ۵۰ کرور ۶۰ لاکھ پونڈ فرانس کو خرچ کرنا پڑا۔ اسپین اور امریکہ کی جنگ (۱۸۹۸ء) میں ۵ کرور پونڈ امریکہ کے صرف ہوئے اور ۲۵ ہزار پونڈ روزانہ اسپین کو صرف کرنا پڑا۔

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء ــ ۱۹۱۸ء) میں ۸۰ ارب پونڈ صرف ہوئے۔ ایک کرور سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ ۲ کرور زخمی ہوئے اور ایک کرور آدمی انفلوئنزا میں مرے جو اس لڑائی کے بعد پھیلا اس جنگ سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد سات کرور تھی۔

صنعتی پیداوار کو جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ ۲۴ ارب ۵۰ کرور پونڈ کیا جاتا ہے، جرمنی میں بزمانۂ جنگ شرح ولادت

۳۰ لاکھ کم ہوگئی۔ اس جنگ کے ختم ہونے کے بعد جو ذخائر فروخت کئے گئے ان کی قیمت ۲۶ کرور ۵۰ لاکھ پونڈ تھی۔

۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں اٹلی نے حبشہ پر حملہ کرنے کے لئے ۳ لاکھ ۵۰ ہزار سپاہ روانہ کی، اس کے علاوہ ۵ کرور ۳۰ لاکھ فٹ خیمہ کا کپڑا، ۶ کرور ۲۰ لاکھ فٹ دوسری قسم کا کپڑا، ۷ ہزار گھوڑے، ۱۳۵۰۰ موٹریں، ۱۱۵۰۰ مشین گن، ۲۵۰۰۰۰ رائفل، ۸۰۰ توپیں، ۳۰۰ ٹینک، ۵۵۰۰ ٹیلی فون، دو ہزار میل تار، اور ۱۰۸۱ وائرلیس سیٹ فراہم کرنا پڑے۔ اسی لڑائی میں ۴۳۰ ہوائی جہازوں سے ایک ہزار ٹن وزن کے بم گرائے گئے، ۱۵۵۰۰۰ کارتوس استعمال ہوئے اور ۶۳۴ ٹن غذا ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے محاذ جنگ میں پہونچائی گئی۔

یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو برطانوی فوج کی تعداد ہندوستانی افواج کو ملا کر ۸ لاکھ ۳۱ ہزار تھی (جن میں ۵۵۰۰۰ ہندوستانی سپاہی تھے)۔ ۱۹۳۹ء کے ابتدا میں جنگی ہوائی جہاز ۱۵۰۰ اور ۱۷۵۰ کے درمیان تھے اور ہوائی فوج ۶۲۹۰۰۔ بحری فوج کی تعداد ایک لاکھ ۲۰ ہزار تھی، جہازوں کی ۲۸۰، اور آبدوز کشتیوں کی ۵۲۔

۱۹۳۳ء میں فوجی بجٹ ۹ کرور ۳۵ لاکھ پونڈ تھا لیکن ۱۹۳۸ء میں ۱۷ کرور ۲۳ لاکھ ۴۳ ہزار پونڈ تک پہونچ گیا۔

۱۹۳۸ء میں فرانس کی بری فوج ۶۹۲۸۶۰ تھی، ہوائی فوج ۶۳ ہزار۔ ہوائی فوج کا بجٹ ۶ کرور پونڈ سے ۲۰ کرور پونڈ تک پہونچ گیا اور ۱۹۳۹ء میں ہر مہینے ۵۰۰ جہاز اس نے طیار کئے۔ بحری فوج ۱۹۳۶ء میں فرانس کے پاس ۱۵۷۰۰ تھی اور دو سال بعد بحری جہازوں کی تعداد ۱۷۴ تک پہونچ گئی۔

۱۹۱۳ء میں جرمنی کی بری فوج ۸ لاکھ تھی اور ۱۰ لاکھ ٹن وزن کے بحری جہاز جن پر وہ سات کرور پونڈ سالانہ صرف کرتا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں شکست کھانے کے بعد اس کی فوج صرف ایک لاکھ رہ گئی۔

سوویٹ حکومت کی آبادی ۱۸ لاکھ ہے اس لئے وہ زیادہ فوج رکھتا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں اسکی سپاہ کی تعداد ۱۳ لاکھ تھی، لیکن اب اس میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں اسکے پاس ۵۰۰ ہوائی جہاز تھے لیکن ۵ سال بعد اس میں چار چند اضافہ ہوگیا۔

۱۹۳۸ء میں امریکہ کی بحری و ہوائی فوج ۲۰۴۷۸۱ تھی، اور بری فوج نیشنل گارڈ اور رزرو وغیرہ ملا کر ۵ لاکھ۔ بحری قوت اس کی البتہ بہت زبردست تھی۔ ۱۹۳۸ء میں فوجی بجٹ ۲۰ کرور پونڈ تھا جو بعد کو بہت بڑھ گیا، جاپان نے جب چین پر حملہ کیا تو ۱۹۳۸ء میں خود اسکے ۱۰ لاکھ سپاہی محاذ جنگ پر موجود تھے۔ چینی افواج کی تعداد ۲۵ لاکھ تھی۔

اٹلی کی بری فوج ۵ لاکھ تھی لیکن بعد کو اس میں کافی اضافہ ہوگیا۔

مصارف اسلحہ سازی

۱۹۳۲ء میں مصارف اسلحہ سازی ۱۵ ملکوں میں بڑھ گئے، ۶ ملکوں میں اپنے حال پر قایم رہے اور ۳۷ ملکوں میں گھٹ گئے۔ ۱۹۳۵ء میں یہ مصارف ۵۱ ملکوں میں بڑھ گئے۔

۱۹۳۲ء میں دنیا کے مصارف اسلحہ سازی ۴ ارب ۳۰ کرور طلائی ڈالر سے بڑھ کر ۱۹۳۷ء تک تقریباً سات ارب طلائی ڈالر تک پہونچ گئے — روس نے طیاری اسلحہ میں بہت صرف کیا۔ یعنی ایک ارب ۴۱ کرور ۳۲ لاکھ روبل سے قریب قریب ۲۱ ارب تک پہونچ گیا، اسی طرح جرمنی، اٹلی، جاپان کے مصارف بھی بہت بڑھ گئے اور امریکہ جس نے ۱۹۳۲ء میں ۴۴ کرور ۲۱ لاکھ ڈالر طیاری اسلحہ پر صرف کئے تھے، ۱۹۳۷ء میں ایک ارب ڈالر صرف کئے — الغرض جب سے دنیا آباد ہوئی ہے انسان برابر آپس میں لڑتے ہی رہیں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ جنگ کی خونخواریاں بڑھتی ہی رہیں اور یہی کوشش جاری رہی کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کا خون بہایا جاسکے، چنانچہ آیندہ جنگ کی جو طیاریاں ہو رہی ہیں وہ آٹم بم اور ہائڈروجن بم کی طیاری کی وجہ سے ایک ایسے قیامت خیز زمانہ کی خبر دے رہی ہیں، جو روئے زمین سے انسانی وجود ہی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے والا ہے اور اگر دنیا کے موجودہ اختلافات ختم نہ ہوئے جس کا یقین ہے، تو اس میں شک نہیں کہ وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے۔

"گاہے گاہے باز خواں ــــ"

مذہب و خدا کا تصوّر

(عقل و فکر کے نقطۂ نظر سے)

علم و مذہب کی جنگ کوئی نئی چیز نہیں اور نہ ہم اسے فطرت کے خلاف کہہ سکتے ہیں، کیونکہ مذہب کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اسے بغیر چون و چرا تسلیم کر لینا چاہئے اور اہلِ علم کی حجت یہ ہے کہ جب تک کوئی بات سمجھ میں نہ آجائے اس پر یقین لانا ممکن نہیں۔ اہلِ مذاہب اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ عقل انسانی بہت ناقص ہے اور اس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی کامل شے کا تصور کر سکے۔ فریق ثانی کہتا ہے کہ جس چیز کو تم "شئے کامل" سے تعبیر کرتے ہو اس کا ثبوت تمھارے پاس کیا ہے کہ ہماری عقل ناقص کو اس کے سمجھنے سے باز رکھتے ہو۔ الغرض اہلِ علم و مذاہب کی یہ نزاع بہت قدیم چیز ہے اور باختلافِ نوعیت اب بھی اسی طرح بلکہ زیادہ شدت کے ساتھ نظر آتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے حکومت و مذہب دونوں ایک چیز تھے اور اہلِ مذاہب بزورِ شمشیر اپنے مخالفین کو خاموش کر سکتے تھے، اب ایسا نہیں کر سکتے اور معاندین مذہب کی جماعت بڑھتی جا رہی ہے۔

یورپ اور خصوصیت کے ساتھ امریکہ میں جہاں خدائے قادرِ مطلق کے بجائے Almighty dollar کی پرستش کی جاتی ہے الحاد نہایت تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور اہلِ کلیسہ حیران ہیں کہ "آسمانی بادشاہت" کے وجود کو کیونکر قایم رکھ سکیں۔

ہندوستان میں بھی یہ رو کافی تیزی کے ساتھ دوڑ رہی ہے اور یہاں کے حلقہ ہائے مسجد و خانقاہ میں بھی ان کفر سامانیوں کو نہایت تشویش کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے لیکن اس وقت تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس طوفان سے بچنے کی صورت کیا ہے۔

اہلِ مذاہب کی طرف سے جو تدبیر دفاع اختیار کی جاتی ہے وہ زیادہ تر اس لئے بے اثر رہتی ہے کہ انھیں معلوم ہی نہیں کہ ملاحدہ کہتے کیا ہیں اور وہ کن دلایل کی بنا پر خدا اور مذہب سے انکار کرتے ہیں، امریکہ وغیرہ میں تو اہلِ مذہب اُن کے لٹریچر کو شاید کبھی پڑھ لیتے ہیں لیکن ہندوستان میں تو اس کا دیکھنا ہی گناہ سمجھا جاتا ہے اور اس لئے یہاں کے اہلِ مذہب قطعاً ناواقف ہیں کہ اس زمانہ کا الحاد کس قسم کا الحاد ہے اور اس کے لئے کن نئی طیاریوں کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں میں اس وقت صرف دو چار رسایل ایسے ہیں جنھوں نے اپنا مقصود الحاد کی مخالفت اور اسلام کی حمایت قرار دے رکھا ہے لیکن حقیقتاً ان میں کوئی ایک رسالہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس بیسویں صدی کے منکرین خدا کو خاموش کر سکے اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ جو راہ انھوں نے خدمت اسلام کی اختیار کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ بالکل غلط ہے بلکہ اور زیادہ دہریت پھیلانے والی ہے کیونکہ اگر ہم کسی کی بات نہ سنیں اور اپنی ہی کہے جائیں تو ظاہر ہے کہ ہم کو بُرا ہی سمجھا جائے گا، پھر چونکہ پیروانِ اسلام اپنے مذہب کو سب سے زیادہ مکمل اور عین فطرت کے مطابق کہتے ہیں اسلئے

ان کی طرف سے جب اس قسم کی جاہلانہ کوششیں دیکھتا ہوں تو مجھے سخت حیرت ہوتی ہے۔

علماء اہلِ اسلام کی طرف سے ایک عام طریقہ جواب کا یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ مذہب کے خلاف جو اعتراض کئے جاتے ہیں وہ نئے نہیں ہیں بلکہ بہت پرانے ہیں اور ان کا جواب دیا جاچکا ہے۔ اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ ان پرانے اعتراضات کو بھی کبھی دفع کیا گیا ہے یا نہیں اور اگر اسے مان بھی لیں تو انھوں نے یہ کیونکر جان لیا کہ موجودہ ذہنی انقلاب وہی ہے جو اس سے پہلے پایا جاتا تھا اور اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔

اگر اہلِ مذاہب واقعی الحاد کا سدِ باب کرنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض یہ ہے کہ پہلے ملحدین کے بیانات کو بغیر کسی جذبۂ غیظ و انتقام کے ٹھنڈے دل سے سنیں اور پھر غور کریں کہ ان کے دلایل کا کوئی مسکت جواب اُن سے ممکن ہے یا نہیں۔ صرف گالیاں یا بددُعائیں دینے سے کام نہیں چلتا۔

مذہب کیا ہے؟

"خدا ہی نے تمام چیزیں پیدا کی ہیں اور وہی ان کا مدبّر ہے، اس لئے مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کا مطیع رہے، یعنی اگر اس کی طرف سے کوئی حکم نافذ کیا جائے تو اس کی تعمیل کرنا ہر شخص پر لازم ہے۔"

یہ ہے اصل مفہوم مذہب کا جو صدیوں سے رائج چلا آتا ہے اور تمام قوموں نے اسی اعتقاد کے تحت یقین کر لیا کہ خدا ہم سے قربانیاں چاہتا ہے چنانچہ اول اول لوگوں نے اپنی اولاد تک کو بھینٹ چڑھانے سے عذر نہ کیا اور پھر صرف بیل، بھیڑ، بکری کے خون سے خدا کو راضی رکھنے کی کوشش کی گئی کیونکہ وہ اگر ایسا نہ کرتے تو خدا ان کی فصلیں خراب کر دیتا، پانی برسانا بند کر دیتا، بیماریاں پھیلاتا، زلزلے لاتا اور قحط و وبا کی مصیبت میں مبتلا کر دیتا۔ اس اعتقادِ قربانی کی آخری جھلک عیسوی مذہب میں بھی پائی جاتی ہے اور اسلام میں بھی۔ وہاں خدا اپنے بیٹے کی قربانی قبول کر کے ہمیشہ کے لئے چین سے بیٹھ گیا اور یہاں ابراہیم خلیل اللہ کے تہیۂ قربانی سے خوش ہو کر آیندہ کے لئے۔ صرف جانوروں کی قربانی پر راضی ہو گیا۔

اہلِ مذاہب کا یہ اعتقاد بھی بہت قدیم ہے کہ خدا ہماری التجائیں سنتا اور ان کو پورا کرتا ہے، اس لئے ان اعتقادات کے پیشِ نظر قدرتاً چند سوال پیدا ہوتے ہیں جو اصل بنیاد ہیں لامذہبیت کی اور چونکہ اسوقت تک اہلِ مذاہب کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکے ہیں اس لئے ملحدین خود ہی اس سے ایک نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں اور اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

شبہات ملاحظہ ہوں:-

۱- کیا مذہب کی بنیاد کسی حقیقت معلومہ پر قایم ہے؟

۲- کیا واقعی کوئی ایسی ہستی پائی جاتی ہے جسے خدا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے؟

۳- کیا واقعی خدا ہمارا خالق ہے؟

۴- کیا واقعی اس نے کبھی ہماری دُعاؤں کو سُنا ہے؟

۵- کیا واقعی قربانیوں سے خوش ہو کر اس نے کسی قوم کے ساتھ کوئی خاص رعایت روا رکھی ہے؟

۶- اگر واقعی اسی نے انسان پیدا کیا ہے تو کیوں ایسے افراد اس نے پیدا کئے جو مسخ و قبیح ہیں، مفلوج و محتاج ہیں اور ذہنی حیثیت سے حد درجہ پست۔

۷- مجنون، دیوانوں اور بے عقل لوگوں کو پیدا کرنے میں اس کی کیا مصلحت تھی۔ کیا کسی ایسی قوت کی طرف

سے جسے فراست کل اور قوت مطلق کہتے ہیں، ان نقائص تخلیق کی کوئی معقول توجیہ پیش کی جا سکتی ہے۔

۸- اگر خدا تمام امور عالم کا مدبر و منظم ہے تو کیا وہ ان بادشاہوں کے افعال کا ذمہ دار نہیں ہے جنھوں نے دنیا میں سوائے ظلم کے اور کچھ نہیں کیا؟ کیا وہ ان تمام لڑائیوں کا ذمہ دار نہیں ہے جن میں لاکھوں بیگناہوں کا خون بہایا جاتا ہے۔

۹- کیا وہ دور غلامی اس کی مرضی کے موافق نہ تھا جب صدیوں تک ہزاروں بیگناہ انسانوں کی پیٹھ کوڑوں سے لہولہان بنی رہی اور بے شمار ماؤں کے مضطرب سینوں سے اُن کے بلکتے ہوئے بچے جدا جدا کر کے قتل و ذبح کر دئے گئے۔

۱۰- کیا وہ اُن مذہبی تعذیبات کا ذمہ دار نہیں جو بے گناہ انسانوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونک دینے اور شکنجے میں تان تان کر ایک ایک جوڑ علٰحدہ کر دینے پر مشتمل تھے۔

۱۱- خدا نے کیوں ظالموں اور بدکرداروں کو مہلت دی کہ وہ بہادروں اور نیک کرداروں کو پامال کریں۔

۱۲- خدا نے کیوں کافروں کو اس کا موقع دیا کہ اس کے خاص بندوں کو عذاب میں مبتلا کریں۔ اگر ایک رحم و کرم والا خدا واقعی کائنات کا مدبر ہے تو یہ آئے دن کے طوفانوں، زلزلوں، وباؤں اور خشک سالیوں کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ سل و دق، سرطان و خناق اور اسی طرح کی سیکڑوں بیماریاں پیدا کرنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے جن سے نہ معصوم بچے جانبر ہو سکتے ہیں نہ زاہد و جانبر انسان —— درندوں کا انسانوں کو پھاڑ کر کھاتے رہنا، اور خدا کا کچھ نہ کہنا عجیب معمہ ہے۔

۱۳- کیا اس نے ناخن و چنگال اسی لئے پیدا کئے کہ وہ گوشت کے ریشے جدا کرتے رہیں، کیا اس نے پر و بال اسی لئے بنائے ہیں کہ معذور و بیکس آسانی سے گرفت میں آسکیں، کیا اس نے جراثیم اسی لئے پیدا کئے ہیں کہ وہ انسانوں کو اندھا، کوڑھی، مسلول و مدقوق بنا کر اپنی بھوک مٹائیں۔

۱۴- کیا کائنات کی تنظیم اسی طرح ممکن تھی کہ جاندار کی زندگی دوسرے جاندار کے گوشت و خون پر منحصر ہو اور کیا تدبیر عالم آہ و کراہ کا ہنگامہ پیدا کئے بغیر محال تھی؟

پھر ان واقعات و حالات پر غور کرو اور سمجھو کہ مذہب کیا ہے؟

وہ نام ہے صرف ایک بے بنیاد خوف کا۔ ایک ایسا خوف جو خود ہی ایک قربانگاہ بناتا ہے اور خود ہی اس پر قربانیاں چڑھاتا ہے۔ خود ہی ایک معبد طیار کرتا ہے اور خود ہی وہاں جھک جاتا ہے۔

مذہب ہمیں وہی باتیں سکھاتا ہے جو صرف ایک غلام ہی کے لئے موزوں ہیں۔ اطاعت فرمانبرداری، نفس کشی صبر و تحمل، عدم مقاومت اور اپنے آپ کو مٹا دینا۔

خود مختاری، سرفرازی، خود اعتمادی، جرأت و اقدام کا وہاں کو سوں پتہ نہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ خدا مالک ہے اور انسان اس کا غلام، لیکن مالک چاہے کتنا ہی بڑا ہو غلامی کو خوشگوار نہیں بنا سکتا

اگر خدا کا وجود ہے تو ہم کیونکر جان سکتے ہیں کہ وہ رحم و کرم والا بھی ہے وہ دیکھتا ہے کہ لاکھوں کروڑوں غریب جفاکش انسان ہل چلا رہے ہیں، کھیتیاں بو رہے ہیں اور ان کی زندگی کا انحصار صرف اسی محنت پر ہے لیکن وہ پانی نہیں برساتا، کھیتیاں مرجھا رہی ہیں لیکن پانی کا ایک قطرہ نہیں گرتا، کروڑوں انسان اپنی مایوس و منتظر آنکھوں سے

آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں لیکن سوا جھلسا دینے والے آفتاب کے بادل کا ایک ٹکڑا بھی انھیں کسی جگہ نظر نہیں آتا۔ خدا ان کے دل کے اضطراب کو دیکھتا ہے اور رحم نہیں کھاتا ان کی اشک آلود آنکھوں کو دیکھتا ہے اور خاموش ہے بچے ماؤں کی خشک چھاتیوں سے لگے ہوئے بلک رہے ہیں اور دودھ نہیں پاتے۔ مائیں آنچل پھیلا پھیلا کر اپنے بھوکے بچوں کا واسطہ دے دے کر دعائیں مانگ رہی ہیں، لیکن کوئی سننے والا نہیں، پھر کیا خدا کا رحم و کرم ثابت کرنے کے لئے بادِ سموم کے ان جھونکوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو بستیوں کی بستیاں تباہ کر جاتے ہیں اور میدانوں کو لاشوں سے بھر دیتے ہیں، کیا اس کی شفقت و محبت کے ثبوت میں زلزلوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جب زمین ہزاروں انسانوں کو نگل جاتی ہے کیا آتش فشاں پہاڑوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جن کے شعلے بچے بوڑھے کی بھی تمیز نہیں کرتے۔

کیا اگر یہ تباہکاریاں نہ پائی جائیں تو ہم کو یہ شک کرنے کا موقع ملے گا کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے غافل ہے کیا اگر زلزلہ و طوفان، قحط و وبا کی مصیبتیں نازل نہ ہوں تو ہم کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ خدا مہربان نہیں ہے۔

الٰہیات والے کہتے ہیں کہ خدا نے تمام انسانوں کو یکساں پیدا نہیں کیا، اس نے قد و قامت، رنگ و صورت، ذہن و فراست کے لحاظ سے قوموں کو ایک دوسرے سے متمایز کر دیا ہے، تو کیا بلند قوموں کو خدا کا شکر نہ ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے انھیں پست نہیں بنایا۔ یقیناً شکر کی بات ہے، لیکن اس صورت میں کیا پست قومیں اس بات کا شکریہ ادا کریں گی کہ خدا نے انھیں جانور نہیں بنایا؟

جب خدا نے بلند و پست قوموں کو بنایا تھا تو کیا یہ بات اس کے علم میں نہ تھی کہ بلند قومیں پست قوموں کو اپنا غلام بنائیں گی، ان کو ایذا پہونچائیں گی اور تباہ و برباد کر دیں گی۔

کیا وہ نہ جانتا تھا کہ یہ بلند و پست کا امتیاز دنیا میں کتنا خون بہائے گا نوعِ انسانی کو کن کن مصائب میں مبتلا کرے گا، کتنے میدان لاشوں سے پاٹ دے گا، کتنے غلاموں کے جسم کا گوشت کوڑوں کی ضرب سے پارہ پارہ کرے گا کتنے ماؤں کے دل ان کے بچے جدا کر کر کے تڑپائے گا پھر اگر یہ سب کچھ اس کے علم میں ہوا تو کیا اس کا رحم و کرم اس سے زیادہ دلدوز مناظر کا منتظر تھا۔

وہ قید خانے جن کی سنگین دیواروں سے سر ٹکرا کر دنیا کے بہت سے بلند اخلاق والے انسانوں نے اپنی جانیں دیدیں وہ سولیاں جو مقدس انسانوں کے خون سے رنگین بنائے جانے کے لئے نصب کی گئیں، وہ غلاموں کی جماعتیں جن کی پیٹھ کے زخموں کو خشک ہونے کا کبھی موقع نہیں دیا گیا، وہ مقدس ہستیاں جن کا ایک ایک جوڑ شکنجہ میں تان تان کر علٰحدہ کیا گیا، جن کی کھالیں کھنچوا کھنچوا کر بھس بھروایا گیا، وہ بے شمار انسان جو قحط و وبا کا شکار ہوئے، جن کو زمین نے نگل کر ڈکار تک نہ لی، جن کو سانپوں نے ڈسا، آتش فشاں پہاڑوں نے جھلسایا اور وہ لاتعداد بدکار ظالم انسان جنھوں نے دنیا میں تمام مظالم توڑے اور کامیاب زندگیاں بسر کیں۔ کیا یہ اور اسی طرح کے تمام سمجھ میں نہ آنے والے واقعات رحم و کرم والے خدا کے علم سے باہر تھے اور یہ سب کچھ بغیر اس کی مرضی کے ہوا؟

انسان نے ہمیشہ کسی نہ کسی مافوق الفطرت ہستی کا دامن پکڑنا پسند کیا۔ اگر اس نے پتھر کو پوجنا چھوڑا تو ایک اور غیر معلوم قوت کے سامنے جھک گیا۔ جس کو وہ صحیح راہ دکھانے والا باور کرتا ہے؟

انسان فطرتاً اقدام پسند واقع ہوا ہے، وہ ہمیشہ آگے قدم بڑھاتا ہے اور تجربات اس کو بتاتے ہیں کہ اس نے جو قدم اُٹھایا تھا وہ صحیح تھا یا غلط؟

ایک آدمی کسی جگہ کا ارادہ کر کے چل پڑتا ہے وہ ایک ایسی جگہ پہونچتا ہے جہاں دو راستے پھٹتے ہیں وہ یہاں

راستہ اختیار کرلیتا ہے لیکن اسے کچھ دور چل کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستہ غلط تھا، وہ واپس آتا ہے اور داہنے ہاتھ کا راستہ اختیار کرکے منزل تک پہونچ جاتا ہے اس کے بعد وہ اس جگہ پہونچنے میں غلطی نہیں کرتا اور ہمیشہ سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قوت نے کیا رہنمائی اس کی کی۔

ایک بچہ شعلہ کی چمک دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور جل جاتا ہے، اس کے بعد پھر یہ جرأت وہ کبھی نہیں کرتا۔ تو کیا یہ سبق اس کو اس قوت نے دیا یا خود اس کے تجربے نے۔

حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کے تجربات میں خود وہ قوت پنہاں ہے جو صحیح راستہ بتانے والی ہے، یہ قوت ادراک و ارادہ سے بالکل معرّا ہے اور اس کا نام ہے تجربہ۔

بہت سے لوگ ضمیر اور احساس اخلاق کے وجود کو وجود خدا کی دلیل بتاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان فطرتاً تمدن پسند واقع ہوا ہے اور خانوادوں، قوموں اور قبیلوں کی صورت میں ہمیشہ زندگی بسر کرتا چلا آیا ہے، پھر قبیلہ کے جن افراد نے خاندانی دعائلی مسرتوں میں اضافہ کیا وہ اس کے اچھے اعضاء شمار کئے گئے اور جنھوں نے تکلیفیں پہونچائیں انھیں بُرا سمجھا گیا اور یہیں سے اخلاق کے اچھے بُرے ہونے کا معیار قایم ہوا۔

وحشی قوموں میں ہمیشہ فوری نتایج پر غور کیا جاتا ہے، لیکن ترقی یافتہ قوموں میں نتایج بعیدہ کو سامنے رکھا جاتا ہے اور اس طرح اخلاق کا معیار بلند تر اور فرض شناسی کا احساس قوی تر ہوتا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں کسی مافوق الفطرت قوت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

مذہب کیا ہے؟ ایک شخص عیسوی مذہب کو سامنے رکھ کر پوچھتا ہے کہ عیسویت نے دنیا کو کیا فایدہ پہونچایا جب اس کا اقتدار قایم کیا تھا تو کیا اس نے انسان کو زیادہ بہتر انسان بنایا۔ اس کا اثر اطالیہ، اسپین، پرتگال، اور آئرلینڈ پر کیا ہوا۔ ہنگری اور آسٹریا کو کیا فایدہ اس سے حاصل ہوا۔ انگلستان، امریکہ، ہالینڈ و اسکاٹلینڈ نے کیا تمتع اس سے حاصل کیا۔

اگر ٹورکسمڈ، زردشتی مذہب کا پابند ہوتا تو کیا اور زیادہ خراب انسان ہوتا۔ کیا کالون اور زیادہ خونخوار بن جاتا اگر وہ یہودی ہوتا، کیا ڈچ اور زیادہ احمق ثابت ہوتے اگر وہ تثلیث مسیحیت کے قایل نہ ہوتے۔ کیا جان ناکس اور زیادہ بُرے اخلاق کا ہوجاتا اگر بجائے مسیح کے وہ کنفوشس کا ماننے والا ہوتا۔

مذہب کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں بہت کافی تجربہ ہوچکا ہے اور اب اس کی ناکامی پر مزید حجت پیش کرنے کے لئے کسی اور جدید تجربہ کی ضرورت نہیں ہے۔

مذہب کبھی انسان کے دل میں جذبۂ رافت و الفت پیدا نہیں کرسکا اور اس کے ثبوت میں مذہبی تاریخ کے وہ اوراق پیش کئے جاسکتے ہیں جن کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے۔

مذہب، علم و تحقیق کا ہمیشہ دشمن رہا ہے اور اس نے کبھی ذہنی آزادی کا ساتھ نہیں دیا۔

مذہب کبھی انسان کو محنتی، جفاکش اور ایماندار بنانے میں کامیاب نہیں ہوا، چنانچہ وحشی اقوام کی برائیوں کا سبب صرف ان کی مذہبی واہمہ پرستی ہے۔

وہ لوگ جو فطرت کی یکسانیت کے قایل ہیں ان کے لئے مذہب کا خیال کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ کیا انسان، فطرت اور صفات اور مادہ کو اپنی دعاؤں سے متاثر کرسکتا ہے، کیا ہم طوفانوں کو پوجا پاٹ کے

ذریعہ سے کم وبیش کر سکتے ہیں، کیا ہم قربانیاں پیش کرکے ہواؤں کا رُخ بدل سکتے ہیں، کیا ہم الحاح وزاری سے بیماری کا علاج کر سکتے ہیں۔ کیا عزت و سربلندی ہمیں بھیک مانگنے سے مل سکتی ہے؟

وہ چیز جسے ہم نفس کہتے ہیں کیا وہ قانونِ قدرت کا اسی طرح پابند نہیں جس طرح ہمارا جسم؟

مذہب کی بنیاد اس خیال پر قایم ہے کہ عالمِ فطرت کا کوئی ایک مالک ہے جو دعاؤں کو سنتا ہے، اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے اور جزا و سزا دیتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ واقعات کی دُنیا میں کوئی ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ہمیں ان اعتقادات کی تصدیق ہو سکے۔

جب ہم کوئی نظریہ قایم کرتے ہیں تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی بنیادی حقیقت ضرور ہوا کرتی ہے، محض وہم و قیاس پر کوئی اصول مرتب نہیں ہو سکتا اس لئے اگر ہم لامذہبیت کا نظریہ پیش کرتے ہیں تو اس کے لئے چند بنیادی حقایق بھی اپنے پاس رکھتے ہیں۔

مثلاً ایک یہ کہ مادہ و قوت فنا نہیں ہو سکتے، دوسرے یہ کہ مادہ و قوت ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں ہو سکتے تیسرے یہ کہ جو چیز غیر فانی ہے وہ غیر مخلوق ہے، قدیم ہے۔

دُنیا میں ذہانت و ذکاوت کا وجود صرف قوت کی وجہ سے ہے اور قوت بغیر مادہ کے ممکن نہیں اس لئے معلوم ہوا کہ ذکاوت صرف قوت و مادہ کی ممنون ہے اور اس باب میں کسی ایسی مافوق الفطرت ہستی کے تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے جسے مدبر کائنات کہا جائے!

اگر مادہ و قوت ازلی و ابدی ہیں تو جو کچھ ممکنات میں تھا وہ واقع ہوا جو ممکنات میں ہے وہ ظاہر ہو رہا ہے اور آیندہ بھی رونما ہوتا رہے گا۔ کائنات میں اتفاق کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہوتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور پایا جاتا ہے جس چیز کو ہم حال کہتے ہیں وہ ماضی کی پیداوار ہے اور جس کا نام مستقبل ہے وہ نتیجہ ہوگا حال کا، انسان سے لیکر رینگنے والے کیڑے کی حرکت تک سب اسی قانون کے جکڑے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف کسی بات کا ظاہر ہونا ناممکن ہے۔

ہزاروں سال سے دُنیا کی اصلاح کی کوشش جاری ہے اور اس غرض کے لئے دیوتا، دیویاں، بہشت و دوزخ الہامات و معجزات کلیسا و خانقاہ، قیدخانے اور شکنجے، سیکڑوں چیزیں پیدا کی گئیں، ایک بادشاہ کو تخت سے اُتار کر دوسرے کو بٹھایا، ایک ملکہ کی گردن مارکر دوسری کو تخت نشین کیا، آدمیوں کو زندہ جلایا، فوج کشیاں کی گئیں، دُعائیں مانگی گئیں، ڈرایا گیا، لالچ دی گئی، الغرض مذہب نے سبھی کچھ کیا لیکن مقصد آج تک پورا نہ ہوا۔ کیونکہ مذہب غلامی ہے ذہن و دماغ کی اور جب تک انسان کا ذہن آزاد و بیدار نہ ہو نوعِ انسان کی فلاح مجموعی حیثیت سے ناممکن ہے۔

یہ ہیں وہ خیالات اس زمانہ کے ملحد و لامذہب کے جو اخباروں رسالوں اور لکچروں کے ذریعہ سے تمام دُنیا میں اشاعت پا رہے ہیں اور ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی مقبول ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر ہم دہریت و الحاد کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے ہیں تو ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ہم دنیا کے اس ذہنی تشویش و تذبذب کو دور کریں پھر اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ ہم منطق و فلسفہ کی پیچیدہ باتوں میں اُلجھا کر فریقِ مخالف کو خاموش کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اس طرح اس کی زبان تو بند ہو سکتی ہے لیکن دل مطمئن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ

ضرورت ہے اس مذہبی روح کی تلقین کی جو ظاہری شعائر و مراسم سے بے نیاز ہے اور جس میں سوائے بلند تعلیم اخلاق کے کوئی اور چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو ہمیں الہام و معجزات، بہشت و دوزخ، حشر و نشر، قیامت و آخرت سے تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی وہ تنگ نظری تھی جس نے اہل مذاہب کو ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رکھا اور یہی وہ چیز ہے جو مذہب کے اقتدار کو مٹا کر رہے گی۔ دُنیا میں اب کوئی ایسا مذہب نہیں چل سکتا جو تمدنی ضروریات، بین الاقوامی تعلقات، اقتصادی مشکلات اخلاقی اصول عامہ کو پس پشت ڈال کر صرف "امید فردا" پر اپنی کارگاہ تبلیغ قایم کرے، وہ وقت گزر گیا جب مذہب کسی ایک قوم کے لئے مخصوص ہوا کرتا تھا، اب کہ کرۂ زمین کی ۲۴ ہزار میل کی وسعت کو انسان چند دن میں طے کر لیتا ہے، تخصیص نسل و جغرافیہ کا سوال بالکل لایعنی چیز ہے اور مذہب کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ کوئی ایسا لائحہ عمل پیش کرے جو تمام آبادی کو کسی ایک مشترک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتا ہو اور یہ ممکن نہیں جب تک مذہب کے اعتقادی حصہ کو علٰحدہ کر کے اسے ہیئت اجتماعی کے اصول پر صرف "سوشل ارگنائزیشن" کی حیثیت نہ دی جائے۔

سالنامہ ۱۹۵۴ء

فرمانروایانِ اسلام نمبر

کی طباعت شروع ہوگئی ہے۔ اور امید کی جاتی ہے کہ اخیر دسمبر ۱۹۵۳ء میں طیار ہو جائیگا اس لئے جن حضرات کا چندہ دسمبر ۱۹۵۳ء میں ختم ہو رہا ہے وہ سالانہ چندہ پیشگی ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمادیں، ورنہ وی پی میں انھیں ۷ر کا نقصان ہوگا۔

سالنامہ نہایت احتیاط سے روانہ کیا جائے گا اور اگر وہ کسی کو نہ ملا تو دوبارہ مفت ارسال نہ ہوگا، اس لئے اگر آپ چاہتے ہیں کہ حفاظت کے ساتھ سالنامہ آپ کو پہونچ جائے تو سالانہ چندہ کے ساتھ ۶ر رجسٹری کے بھی روانہ فرمائیے۔

وی پی آٹھ روپیہ آٹھ آنے کا روانہ ہوگا

غیر خریدارانِ نگار کے لئے اس کی قیمت معہ محصول تین روپیہ آٹھ آنے ہے

ایجنٹ حضرات کے لئے دو روپیہ چار آنے

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

جادو ـ ٹوٹکا ـ گنڈا ـ تعویذ وغیرہ

(جناب عبدالحکیم صاحب ـ چمپارن)

مسلمانوں کا یہ عقیدہ مشہور ہے کہ "جادو برحق لیکن اس کا کرنے والا کافر" یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی کہ جب ایک چیز برحق ہے تو اس کا کرنے والا کیوں کافر قرار دیا جائے ـ کتب تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ پر بھی جادو کیا گیا تھا اور سورۂ فلق اسی کے رد کرنے کے لئے نازل ہوئی تھی ـ اگر جادو کو برحق مانا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ خدا کی قوت کے علاوہ کوئی دوسری قوت ایسی بھی موجود ہے جو خدا کے مقابلہ میں مخلوق پر اثر انداز ہوسکتی ہے ـ مہربانی فرماکر اس مسئلہ پر روشنی ڈالئے اور اسی سلسلہ میں بہت سی رسمیں مثلاً تعویذ، گنڈا، فال و شگون وغیرہ جو مسلمانوں میں رائج ہیں ان پر بھی اظہار رائے فرمائیے ـ

(نگار) جو مقولہ آپ نے اپنے استفسار کی ابتدا میں نقل کیا ہے وہ نہ قرآن کا ہے، نہ رسول کا، نہ صحابہ کا، نہ اکابر اسلام میں کسی قابل ذکر ہستی کا ـ یہ روایت بھی منجملہ ان بہت سی روایات کے ہے جو دوسری قوموں سے مسلمانوں میں رائج ہوگئی تھیں ـ اسلام یا تعلیم اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ـ

اس میں شک نہیں کہ آج کل مسلمانوں میں واہمہ پرستی کثرت سے پائی جاتی ہے اور اسی میلان نے گنڈا، تعویذ وغیرہ کے ادارے قایم کئے، لیکن نفس اسلام سے اسے کوئی واسطہ نہیں ـ تاہم یہ سوال ضرور غور طلب ہے کہ انسان میں یہ واہمہ پرستی کیوں پیدا ہوئی ـ اصل یہ ہے کہ انسان پر اس کی تدریجی ترقی کے دوران میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب اسے طبعی مظاہر سے واسطہ نہ پڑا ہو اور اس نے ان طبعی حالات کو کسی غیبی قوت کا کرشمہ جان کر ان کو اپنے موافق بنانے کی کوشش نہ کی ہو ـ

بجلی، کڑک، سیلاب، زلزلہ، کوہ آتش فشاں یہ اور اسی قسم کے بہت سے طبعی مظاہر ایسے تھے جن کو عہد قدیم کا انسان سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اور چونکہ وہ ان کی حقیقت سے بے خبر تھا اس لئے وہ ان کو کسی غیر انسانی قوت کا کام سمجھ کر یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس قوت کو اپنے قابو میں لائے یا خوش کرے اور یہی تھی بنیاد مذہب اور سحر کی ـ ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ مذہب کا مدعا تھا الحاح و نذاری یا قربانیوں کے ذریعہ سے اُس قوت کو خوش رکھنا اور سحر کا مقصود تھا اس قوت کو مجبور کرکے اپنے موافق بنانا ـ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب سحر سے کافی متاثر ہوا اور اب تک بہت سے مذاہب میں اور انسانی معاشرت کے رسم و رواج میں وہی واہمہ پرستی پائی جاتی ہے ـ جادو، ٹوٹکا، جھاڑ پھونک، تعویذ وغیرہ سب اسی عہد جاہلیت کی یادگار ہیں جو مغرب ایسے ترقی یافتہ ممالک میں اس وقت بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہے ـ

سحر کے سلسلہ میں جو مراسم ادا کئے جاتے تھے ان کی ایک قسم وہ تھی جسے ہم نقالی یا ٹوٹکا کہہ سکتے ہیں، یعنی جس امر کی تمنا کی جائے اور حاصل نہ ہو تو اس کا سوانگ رچایا جائے، مثلاً جزیرۂ مرّے (Murray) میں جب پانی نہیں برستا تو وہاں کے لوگ یہ کرتے ہیں کہ ایک پتھر کا بُت زمین میں گاڑ دیتے ہیں اور اسے پتیوں کے ٹکڑوں اور گھونگھوں وغیرہ سے جو پانی کی علامت ہیں چھپا دیتے ہیں، ناریل کے پتے بھی (جو ان کے نزدیک بادلوں کی علامت ہے) چاروں طرف نصب کر دئے جاتے ہیں، اسی کے ساتھ ایک مشعل جلا کر اسے چکر دیا جاتا ہے کیونکہ اس سے مراد بجلی ہوتی ہے اور بانسوں کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر گرج کی صورت پیدا کرتے ہیں اور یہ سب کرنے کے بعد وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے پانی کے دیوتا کو پانی برسانے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ خوفناک ٹوٹکا وہ تھا جو ازتک قوم میں نشو و نما کے دیوتا کو کھیتی اُگانے پر مجبور کرنے کے لئے عمل میں لایا جاتا تھا۔ دشمن قبیلہ کے کسی قیدی کی کھال اتار کر پہن لیتے تھے اور جب تمام مراسم ادا ہو جاتے تھے تو اس کھال کو اُتار کر پھینک دیتے تھے۔

شمالی امریکہ کے قدیم باشندوں اور آسٹریلیا کے بعض قبایل میں ان جانوروں کی افزائش نسل کے لئے جو کھائے جاتے ہیں عجیب و غریب رسمیں اب بھی ادا کی جاتی ہیں، اور یہ سب تمثیلی قسم کے جادو یا ٹوٹکے سے تعلق رکھتی ہیں حد یہ ہے کہ علاج معالجہ کے سلسلہ میں بھی اس کو پیش نظر رکھا جاتا تھا، چنانچہ یوفریشیا کے پھول کو صرف اس لئے آنکھ کے امراض کے لئے استعمال کیا جاتا تھا کہ اس کی شکل آنکھ کی سی تھی اور یرقان میں ہلدی کھلائی جاتی تھی کیونکہ اس کا رنگ زرد ہے یہ گویا ہومیوپیتھی کی نہایت قدیم شکل تھی۔

جادو کی ایک اور قسم ہے جسے چھوت والا جادو کہنا چاہئے۔ یعنی اگر کسی چیز کا کوئی حصہ ہمارے قابو میں ہو تو پوری چیز پر اقتدار حاصل ہو سکتا ہے یا اس کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کے بال یا ناخن ہمارے پاس ہوں تو ہم اس کے ذریعہ سے اس شخص کو متاثر کر سکتے یا نقصان پہونچا سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اب بھی عورتیں اپنے بالوں کو جو کنگھی کرنے سے ٹوٹتے ہیں حفاظت سے جمع کر کے کہیں چھپا دیتی ہیں یا کنویں میں ڈلوا دیتی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ سے ان پر کوئی جادو نہ کر سکے۔ انگلستان کے بعض مقامات میں عورتیں اپنے سر کے بال ٹوٹے ہوئے بال کھڑکی کے باہر نہیں پھینکتیں کیونکہ وہ سمجھتی ہیں کہ چڑیاں ان سے اپنا گھونسلہ بنانے کا کام لیں گی اور اس سے ان کے سر میں درد پیدا ہو جائے گا۔ کٹے ہوئے ناخنوں کی حفاظت کا رواج بھی ہمارے یہاں اسی خیال کے تحت رائج ہوا۔ جزیرۂ ہوائی کے سرداروں کا اگالدان دور پانی کے کنارے صاف کیا جاتا ہے تاکہ اس فضلہ کو دشمن حاصل کر کے جادو نہ کر سکے۔

یہ واہمہ پرستی ناموں سے بھی متعلق ہے، یعنی نام کو بھی بال یا ناخن کی طرح ایک شخص کے وجود کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ یہودیوں کا اعتقاد تھا کہ یہوؔدا (خدا) کا اصلی نام جسے معلوم ہو جائے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ مسلمانوں میں خدا کا اسم اعظم معلوم کرنا بھی اسی قبیل کی چیز ہے۔

ایک مصری روایت ہے کہ آئی سس، خداوند رآ کا اصلی نام معلوم کرنا چاہتا تھا اور بتاتا نہ تھا۔ آئی سس نے رآ کا تھوک جمع کر کے ایک سانپ طیار کیا جس نے رآ کو ڈس لیا۔ رآ کے جسم میں اس سے سخت درد پیدا ہوا تو آئی سس کو علاج کے لئے بلایا، اس نے کہا کہ جب تک تم اپنا اصلی نام نہ بتاؤ گے میں علاج نہ کروں گا اور اس طرح وہ کامیاب ہو گیا۔ نفسیات انسانی کی تاریخ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ کسی کو اس کے نام سے پکارنا، گویا خود اس کی ذات کو پکارنا ہے۔ دشمن کو ہلاک کرنے کے لئے پتلے بنا کر اس میں سوئیاں چبھونا، اب بھی کہیں کہیں رائج ہے۔

قوت غیبی کو راضی کرنے کے لئے بعض روحانی و مادی واسطے بھی تلاش کئے جاتے تھے، چنانچہ بزرگوں کے مزارات

کو بوسہ دینا، ان پر چادر چڑھانا، قوالیاں کرنا، مقبروں کی جالیوں میں منت کے تاگے باندھنا، تعزیوں میں رقعے لکھ کر لٹکانا یہ سب اسی عہد وحشت کی یادگار ہیں۔ انگلستان میں بھی بعض مقدس کنویں ایسے موجود ہیں جہاں لوگ جاکر اندر کوئی چیز پھینک دیتے ہیں اور مرادیں مانگتے ہیں۔

پولی نیشیا میں ایک خاص چیز ہے جسے ٹابو کہتے ہیں۔ اس سے مراد ان کا مذہبی قانون ہے جو خاص مراسم کے تحت مختلف مواقع پر نافذ کیا جاتا ہے، اور جس کے ذریعہ سے جایز و ناجایز افعال کی تحقیق کی جاتی ہے۔ مثلاً جزایر پاسفک میں اس قانون کی رو سے کوئی عورت مچھلی کے جال کے قریب نہیں جاسکتی جو خشک کرنے کے لئے ساحل پر پھیلا دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک شکاری شکار پر جانے سے دو تین دن قبل اپنی بیوی سے ملنا چھوڑ دیتا ہے کیونکہ انکے عقیدہ کے مطابق عورت شکار کو بھگا دیتی ہے۔

ہمزاد قابو کرنا، روحوں کا کسی کے سر آجانا، گنڈے تعویذ لکھنا، جھاڑ پھونک کرنا، انگوٹھیوں یا تختیوں پر کوئی طلسمی نقش بنواکر حفاظت کے لئے اپنے پاس رکھنا، فال نکالنا، شگون لینا، کاغذ یا چینی کی قابوں پر کچھ لکھ کر چاٹ لینا دشمن کی ہلاکت کے لئے سیفی پڑھنا، رو بلا کے لئے خاص خاص نگینوں کی انگوٹھیاں پہننا، یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں عہدِ وحشت و واہمہ پرستی کی یادگار ہیں جن کا رواج بدقسمتی سے مسلمانوں میں اب بھی پایا جاتا ہے۔

ہمزاد یا موکل سے مراد کوئی ایسی غیر انسانی قوت ہے جس کو قابو میں لاکر بہت سی ناممکن باتیں ممکن بنائی جاسکتی ہیں۔ جیسے الف لیلہ میں الہ دین کا چراغ کے ذریعہ سے جن پر قابو پالینا اور اس سے آن کی آن میں بڑے بڑے محل تعمیر کرالینا۔ موکلوں کو قابو میں لانے کے لئے خاص خاص مورتیں بھی طیار کی جاتی تھیں۔ چنانچہ افریقہ میں ایسی بہت سی مورتیں دستیاب ہوئی ہیں۔

ہیرا، نیلم، پکھراج، فیروزہ وغیرہ کے سعد و نحس ہونے کے متعلق جو خیالات بعض جماعتوں میں پائے جاتے ہیں وہ بھی سراسر واہمہ پرستی ہے۔

انسان کے لئے ہمیشہ یہ مسئلہ دلچسپی کا باعث رہا ہے کہ وہ ایسی باتیں معلوم کرسکے جو اس کے علم سے باہر ہیں جیسے کسی کا مال چوری جائے تو وہ جاننا چاہتا ہے کہ کس نے چرایا، یا یہ کہ آیندہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے اور اسی جذبہ نے فال، کہانت، شگون، جوتش، رمل، جفر وغیرہ کی بنیاد ڈالی۔

وسط افریقہ میں رواج ہے کہ جب وہاں کوئی جرم وقوع میں آتا ہے تو لکڑی کا ایک ٹکڑا لیکر اس پر کسی پتی کا عرق مل دیتے ہیں اور اسے دوسرے ٹکڑے سے جس پر کسی جانور کی تصویر کندہ ہوتی ہے رگڑتے ہیں اور اس دوران میں قبیلے کے افراد کا نام لیتے جاتے ہیں، جس کے نام پر رگڑ سے کوئی خاص علامت پیدا ہوجاتی ہے تو اسے مجرم مان لیا جاتا ہے اور اسے مشتبہ سمجھ کر زہر پلایا جاتا ہے اور جب وہ مرجاتا ہے تو اس کے گناہگار ہونے کا یقین ہوجاتا ہے۔ اسکیمو قوم میں مشتبہ شخص کو سمندر میں ڈال دیتے ہیں اور اگر وہ بچکر نکل آتا ہے تو اسے بے گناہ سمجھتے ہیں ورنہ گناہگار۔

فال کے سلسلہ میں جانوروں سے بھی شگون لیا جاتا ہے۔ مثلاً بلی کا راستہ کاٹ جانا منحوس سمجھا جاتا ہے، کوّے کا صبح صبح آکر بولنا مہمان کی آمد کا پیغام تصور کیا جاتا ہے، اُلّو کا کسی جگہ بولنا کسی حادثہ کی پیشین گوئی تسلیم کیا جاتا ہے اسی سلسلہ میں چھینک آجانا یا کسی کا نے کا مل جانا بھی ہے کہ یہ دونوں باتیں بدشگونی سمجھی جاتی ہیں۔ اگر ہاتھ سے شیشہ گرکر ٹوٹ جائے یا سونے کا کوئی زیور کھو جائے تو اسے بھی منحوس خیال کیا جاتا ہے۔

خواب کی تعبیریں بھی اسی واہمہ پرستی سے تعلق رکھتی ہیں۔ خواب کی تعبیریں بیان کرنا بڑی پرانی چیز ہے —

خواب دیکھنے کی وجہ عہدِ قدیم میں یہ قرار دی جاتی تھی کہ خواب دیکھنے والے کی روح جسم سے علٰحدہ ہوکر دُنیا کی سیر کرتی ہے جو اعزہ و احباب مرگئے ہیں ان کی روحوں سے ملتی ہے، اور اس سلسلہ میں خواب کے اچھے یا بُرے ہونے پر حکم لگایا جاتا تھا

ریاضی و اعداد کے سلسلہ میں بھی واہمہ پرستی سے کام لیا گیا اور اسی کا نتیجہ تعویذ نویسی تھا۔ عہدِ قدیم میں بعض اعداد کے اندر بھی طلسمی قوت تسلیم کی جاتی تھی۔ مثلاً تین کا عدد بہت مقدس سمجھا جاتا تھا اور یہی وہ عقیدہ تھا جس نے عیسائیوں میں تثلیث اور ہندوؤں میں تریمورتی (وشنو، شیو، برہما) کو رائج کیا۔ قدیم مصریوں کے یہاں بھی تثلیث کا عقیدہ پایا جاتا تھا۔ اور ہومر و کنفوشش کا قول بھی یہی ہے کہ "ہر چیز تین میں منقسم ہے"۔ "ایک میں تین۔ یا۔ تین میں ایک" کی اہمیت غالباً جنسی جذبہ سے تعلق رکھتی ہے، کیونکہ مرد کو تخلیق کا سبب اولین قرار دیا جاتا ہے اور اس کے عضو کو "تین میں ایک اور ایک میں تین" کہہ سکتے ہیں۔

فیثاغورس اور یونان کے دوسرے ریاضی داں اعداد کو بھی بہت سے پوشیدہ رازوں کا مرکز خیال کرتے تھے اور اس سلسلہ میں بہت سے "طلسمی مربعے" تختیوں پر نقش کرکے گلے میں پہنے جاتے تھے۔ مثلاً ستارۂ مشتری کا طلسمی مربع یہ تھا:۔

۱۶	۳	۲	۱۳
۵	۱۰	۱۱	۸
۹	۶	۷	۱۲
۴	۱۵	۱۴	۱

اس میں افقی و عمودی طور پر ہر چار خانوں کے اعداد کا مجموعہ ۳۴ ہوتا ہے۔

مریخ کا مربع جسے تختی پر نقش کرکے حادثات سے بچنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ ہے :۔

۱۴	۱۰	۱	۲۲	۱۸
۲۰	۱۱	۷	۳	۲۴
۲۱	۱۷	۱۳	۹	۵
۲	۲۳	۱۹	۱۵	۶
۸	۴	۲۵	۱۶	۱۲

اس میں جس طرف سے آپ پانچ خانوں کے اعداد جمع کریں گے تو حاصل جمع ۶۵ نکلے گا۔

تعویذ نویسی کی رسم بھی مسلمانوں میں قدیم یونانیوں سے آئی ہے اور مذہبی نقطۂ نظر سے اس کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔

دعوتِ نقد و نظر

ادبیات میں سب سے زیادہ مشکل فن، شعرگوئی ہے، اور بدقسمتی سے آج اسی کو سب سے زیادہ آسان سمجھ لیا گیا ہے۔ جس حد تک صرف وزن شعری کا تعلق ہے، یقیناً اس میں کوئی اشکال نہیں، ہر شخص چند الفاظ کو جمع کرکے ایک خاص وزن کے ساتھ انھیں پیش کرسکتا ہے لیکن شعر دراصل اس سے ماورا کچھ اور چیز ہے۔ شعر نام صرف عروض و قافیہ کی پابندی کا نام نہیں، بلکہ اس میں ہم کو یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ :-

۱ - زبان و محاورہ کا صحیح استعمال ہوا ہے یا نہیں۔
۲ - مفہوم رکیک و سخیف یا پامال تو نہیں ہے۔
۳ - الفاظ و تراکیب میں غلطی یا ثقل یا تنافر صوتی تو نہیں پایا جاتا۔
۴ - جس مفہوم کو ہم ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ پوری طرح ادا ہوا یا نہیں۔
۵ - اسلوب بیان میں کوئی ندرت و تازگی ہے یا نہیں۔
۶ - اظہار خیال میں تصنع و تکلف تو پیدا نہیں ہوا۔
۷ - کوئی تعبیر و توجیہ بے محل تو نہیں کی گئی۔
۸ - تشبیہ و استعارہ سریع الانتقال الی الذہن ہے یا نہیں۔
۹ - کوئی شاعرانہ ادعا بغیر ثبوت کے تو نہیں رہ گیا۔
۱۰ - غلو و مبالغہ سے اگر کام لیا گیا ہے تو اس میں کوئی طرفگی پائی جاتی ہے یا نہیں۔
۱۱ - کوئی بلند و عمیق جذبہ ظاہر کیا گیا ہے یا نہیں۔
۱۲ - عروض و قافیہ کے لحاظ سے تو اس میں کوئی غلطی نہیں پائی جاتی۔

الغرض شاعری محض الفاظ کا کھیل نہیں، بلکہ اس کے لئے خاص ذوق اور بڑی کاوش و مشق کی ضرورت ہے۔

پہلے لوگ برسوں استادوں سے اصلاح لیتے تھے، فنی تعلیم حاصل کرتے تھے، اساتذۂ قدیم کے کلام کا مطالعہ کرتے تھے، جب کہیں جاکر شعر کہنے کی جرأت انھیں ہوتی تھی۔ اس وقت یقیناً حالات بدل گئے ہیں، زندگی و ماحول کا تقاضہ کچھ اور ہے پھر حالات کے لحاظ سے خیالات تو بدل سکتے ہیں، اصول میں بھی ترمیم ہو سکتی ہے، لیکن بے اصولی کو اصول کبھی قرار نہیں دیا جاسکتا ہے اس وقت رسایل و جرائد میں کلاسکل و غیر کلاسکل شاعری کے نمونے اکثر نظر آتے ہیں، لیکن وہ کس حد تک معیاری ہوتے ہیں اس پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی ۔۔ اس لئے میری رائے میں کبھی کبھی فنی حیثیت سے بھی اس مسئلہ پر غور کرنا چاہئے لیکن اس کی مناسب صورت یہ نہیں ہے کہ کوئی طویل مقالہ یا مضمون اس موضوع پر لکھا جائے، بلکہ نمونہ کے طور پر ــــــــ کسی مستند استاد کے کلام کو پیش کرکے ارباب ذوق کو اس پر اظہار رائے کی دعوت دینا زیادہ دلچسپ طریقہ ہوگا ۔۔ چنانچہ اس اشاعت سے ہم نگار میں یہ سلسلہ شروع کرتے ہیں اور ملک کے ایک نہایت مشہور و مقبول شاعر کے کلام سے چند اشعار پیش کرکے اہل ذوق کو رائے زنی کی دعوت دیتے ہیں ۔۔ ہم نے ان اشعار کو نہیں لیا جو باوجود غلط نہ ہونے کے شعر نہیں ہیں، کیونکہ ان کی تعداد بہت ہے، بلکہ صرف ان اشعار کو لیا ہے جو واقعی ہمارے نزدیک

کسی نہ کسی حیثیت سے ناقص ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ اہلِ نقد و نظر اس سلسلہ کو پسند فرمائیں گے اور اپنی رائے بھیجنے میں عجلت سے کام لیں گے تاکہ آیندہ اشاعت میں ہم اسے شایع کر سکیں - مجھے اگر کسی کی رائے سے اتفاق یا اختلاف ہوگا تو اسے فٹ نوٹ میں ظاہر کردونگا

کچھ داغِ دل سے تھی مجھے امیدِ عشق میں
سو رفتہ رفتہ وہ بھی چراغِ سحر ہوا

یادھر جوشِ مستی، اُدھر چشمِ شوق،
مصیبت میں بندِ نقاب آگیا،

پردہ رکھنا تھا جو منظور، تو عاشق کے لئے
دامنِ یار کو لازم تھا، گریباں ہونا،

سُن کے افسانۂ غم، باغ میں کمھلا گئے پھول
شاق گزرا مجھے بلبل کا غزل خواں ہونا

چاہیئے عشق میں مجھے آپ ہی کا جمال سا
داغ ہر ایک بدر سا، زخم ہر ایک ہلال سا

نگہِ شوق نے سب کھول دئے بندِ نقاب
سہل سمجھے تھے وہ پابندِ حیا ہو جانا

ہر وقت اک خمار تھا، ہر دم سرور تھا
بوتل بغل میں تھی کہ دلِ ناصبور تھا،

جس دل کو تم نے لطف سے اپنا بنا لیا
اُس دل میں اک چھپا ہوا نشتر ضرور تھا

دل نہ تھا، جان نہ تھی، سوز نہ تھا، ساز نہ تھا
میں ہی میں تھا، مرے ہمراہ، کوئی راز نہ تھا

بہت روکا تمھارے وعدۂ دیدار نے ورنہ
وہاں ہوتی نہ میری بیخودی بھی، میں جہاں ہوتا

خلوت میں غمِ فرقت، اس طرح بیاں ہوتا
وہ میری زباں بنتے، میں ان کی زباں ہوتا

تھی سیر اگر میں بھی ساتھ اُن کے وہاں ہوتا
آنسو بھی رواں ہوتے، دریا بھی رواں ہوتا

جنوں میں سینے کو بیٹھے ہیں جیب کے ٹکڑے
خبر نہیں، کہ گریباں بھی تار تار ہوا

زخم کو مرہمِ دل، درد کو درماں سمجھا
چارہ گر، خوب علاجِ غمِ پنہاں سمجھا

عشق کا راز، وہی سوختہ ساماں سمجھا،
جس نے دامن کبھی جانا، نہ گریباں سمجھا

تھا کھیل سا پہلے عشق، لیکن جو کھلیں آنکھیں
ڈوبا ہوا رگ رگ میں، وہ تیرِ نظر دیکھا

اُس چشمِ غزالیں کو سے خانۂ دل پایا،
اُس روئے نگاریں کو، فردوسِ نظر دیکھا

اے نگاہِ یاس! یہ کیا رنگِ محفل ہوگیا
میں نے جس دل کی طرف دیکھا، مرا دل ہوگیا

جب تو کچھ ظرف ہے اے دل ترے پیمانے کا
راز مے خانے سے باہر نہ ہو مے خانے کا

کھلے گا چارہ گر پر رازِ غم، کیا درد کے ہوتے
کہ آتا ہے اسے خود نبض کی رفتار ہو جانا

جس پہ برس گئی کبھی برقِ جمالِ یار
ہر ذرہ آفتاب ہے اُس کے مزار کا

اللہ اللہ، یہ کمالِ جذبۂ پنہانِ عشق
جو گرا آنکھوں سے آنسو حسن کا دریا ہوا

بڑھتے بڑھتے آفتابِ روزِ محشر بن گیا
دل کی خاکستر میں اک شعلہ تھا جو بھڑکا ہوا

رگ رگ میں دل تھا، دل میں نہاں سوز و ساز تھا
وہ دن بھی کیا تھے، جب میں سراپا گداز تھا،

اللہ رے، مجبوری آدابِ محبت
گلشن میں رہے، اور گلستاں نہیں دیکھا

شریکِ نالہ میرا بھی جو اندازِ فغاں ہوتا
چمن میں ہر لبِ خاموش، بلبل کی زباں ہوتا

آج کے حسن بن صباح

تعصبات کی صرصرِ نگاہ و فکر کا حبس — "عقیدتوں" کی جوانی خیال کا بچپن
جبیں پہ نقش نمایاں سجود پیہم کا، — غرورِ سجدہ سے پھولی ہوئی رگِ گردن
خدا کے ہمدمِ دیرینہ جبرئیل کے یار — سفیرِ عرشِ عُلیٰ ایلچیِ خلدِ عدن
نظر میں حضرتِ یزداں کی دوستی کا خمار — نفس میں طنطنۂ وصلِ حور و نہرِ لبن
جھکی جھکی سی کمر موت کی کھلی آغوش — حیاتِ رفتہ کی آواز رعشہ دارِ بدن
یہ کپکپی ہے مسلسل کہ بجھ رہا ہے چراغ — شکن شکن ہے بدن کی کہ زندگی کا کفن
یہ سوچتا ہوں کہوں دل کی بات یا نہ کہوں — عصا بدست کھڑا ہے شباب کا مدفن
وہ "آفتاب" ترے سر سے ہو رہا ہے طلوع — کہ بال بال بنِ مو سے پھوٹتی ہے کرن
جلو میں آئینہ رکھکر خضاب ریش نہ کر — یہ موج دھو نہ سکے گی رخ و جبیں کی شکن

یہ خانہ سازہ اندھیرا نہ کام آئے گا
یہ "آفتاب" تجھے لے کے ڈوب جائیگا!

پروفیسر شور

اکرم دھولیوی :-

پھر محبت داستانِ دل کو دہرانے لگی — پھر مجھے آغوشِ غم میں نیند سی آنے لگی
پھر طبیعت میرے ہاتھوں سے نکل جانے لگی — پھر نظر میں ایک برقِ حسن لہرانے لگی
دل کی فطرت ہی بہت نازک ہے اسکا کیا علاج — ورنہ تیری بے رخی کیوں ٹھیس پہونچانے لگی
کیا اسی کو زندگی کہتے ہیں اے ذوقِ حیات — ہر تمنا دل ہی دل میں گھٹ کے رہ جانے لگی
کونسا فقرہ غمِ دل کا زباں پر آگیا — داستاں گو کیوں تری آواز بھرانے لگی
غالباً کچھ رہ گئی ہیں ٹھوکریں میرے لئے — عزمِ منزل پر طلب پھر مجھکو اکسانے لگی

فصلِ گل آئی تھی اکرم لے کے پیغامِ سکوں
دو ہی دن میں پھر چمن پر برق منڈلانے لگی

رودادِ تنہائی

آہ ! یہ رنگیں فضائیں، یہ بہاریں، یہ سماں　　جھومتی کالی گھٹاؤں سے یہ رنگِ آسماں
ہائے یہ توبہ شکن راتوں میں جورِ آسماں　　کیا قیامت ہے کہ ایسے میں کہاں تو میں کہاں

اے مری وجہ سکوں رودادِ تنہائی نہ پوچھ !

نوعروسِ صبح کی یہ چال اٹھلائی ہوئی　　دوشِ گردوں پر یہ زلفِ شام لہرائی ہوئی
اُف یہ ہر شے کی جوانی جوش پر آئی ہوئی　　میری دُنیا پر اُداسی کی گھٹا چھائی ہوئی

اے مری وجہ سکوں رودادِ تنہائی نہ پوچھ !

قصرِ صبر و آگہی کو اُف یہ ڈھا دینے کے دن　　دھجیاں تا جیب دامن کی اُڑا دینے کے دن
دل کو سیلِ شوق و مستی میں بہا دینے کے دن　　اپنی ہستی تیری ہستی میں مٹا دینے کے دن

اے مری وجہ سکوں رودادِ تنہائی نہ پوچھ !

تو چھٹی ہے جب سے اے آئینۂ بزمِ حیات،　　لرزہ براندام ہے عیش و طرب کی کائنات
بے مزہ شام و سحر بے رنگ دن، بے کیف رات　　تیرے دیوانے کو ممکن ہی نہیں غم سے نجات

اے مری وجہ سکوں رودادِ تنہائی نہ پوچھ !

ایک ناکامِ تمنا کی یہ رودادِ الم !　　ہائے خود وجہ سکوں بن جائے جسکی وجہ غم
پیکرِ حرماں نصیبی، ایک تصویرِ الم !　　اِک مجسم درد، اِک خو کردۂ جور و ستم

اے مری وجہ سکوں رودادِ تنہائی نہ پوچھ !

مختار علی ایم۔ اے شاہ آبادی

نفیس قادری سونگیری :-

کچھ اس ادا سے چلی باغ میں نسیمِ بہار
روش روش پہ تمنا نے پھول برسائے

ترے قریب بھی صورت کہاں تسلّی کی
سکون آنکھ کو آئے تو دل مچل جائے

قدم قدم پہ سہارا امید کا لے کر،
ہر اک نفس میں تمنا کے جال پھیلائے

کسی کی بزم میں پہونچے تھے آرزو لیکر
دلِ غریب کی دُنیا اُجاڑ کر آئے

ترے خیال سے تسکیں نہ مل سکی دل کو
مآلِ کارِ محبت پہ ہم تو پچھتائے

ندیم جعفری :-

بہت شگفتہ و واضح بڑے خلوص کے ساتھ
پیام تیری محبت کے آئے ہیں کیا کیا !

وفا تو ایک طرف، دوستوں نے دانستہ
ہماری راہ میں کانٹے بچھائے ہیں کیا کیا !

یہ کون رات کو آیا نقاب اُلٹے ہوئے
ستارے تا بہ سحر جھلملائے ہیں کیا کیا !

بجا، کہ دین کے تاریک راستوں میں ندیم
چراغ کفر کے میں نے جلائے ہیں کیا کیا !

مری تو عُمر ترے انتظار میں گزری
یہ اور بات ہے دُنیا بھی انتظار میں ہے

مرے نصیب کہ مجھ پر نہیں ہے لطف کوئی
وگرنہ خوئے تلطّف مزاجِ یار میں ہے

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام خطوط جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے ساتھ خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان، تخیل، اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشائے عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک عجیب تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں بھی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

(۲) مادئین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اسکے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری غرض دنیا کی ہر چیز کی صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ادیان طریقت علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اسکو شروع کردینا آخر تک پڑھ لینا ہے یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت

ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی خیالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر سرسری نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی نغمہائے رنگ رنگ، غالب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ ادبیات اور اصول نقد فنون و بیہ حقیقت نگاری

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا۔ اسکے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ [illegible]

[illegible] نمبر [illegible] جس کی مانگ بہت [illegible] دوبارہ شائع کیا گیا ہے [illegible]
[illegible]
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۶۲ء

اس نمبر میں [illegible] کے کلام [illegible] کے مشہور [illegible] نقد و [illegible] شاعری [illegible]
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری، مارچ [illegible]

[illegible] انتقاد [illegible] اور ارباب [illegible]
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۳ء

پاکستان نمبر، نگار کا وہ نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی [illegible] اور حقیقی اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی فکر [illegible] اسلام کے [illegible] قبول [illegible] جائے جس پر [illegible] کی بنیاد قائم ہو سکتی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ [illegible]

نگار کا افسانہ نمبر جس میں تقریباً [illegible] افسانے [illegible] کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے [illegible] آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے [illegible] کا معیار [illegible] قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۰ء

نگار کے [illegible] سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا مجموعہ [illegible] تک کے تمام تنقیدی رجحانات [illegible] کا تذکرہ [illegible] شامل ہے [illegible] اور [illegible] کلام نایاب ہے۔ [illegible] تنقیدی مقالات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔
قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں [illegible] مشہور عالم کتاب [illegible] مستقبل کی [illegible] کا ترجمہ [illegible] ممالک اسلامی کی سیاست [illegible] اور ان کے اسباب [illegible] مستقبل کتنا [illegible] اور اس کے اسباب [illegible]

سالنامہ [illegible]

[illegible]

۵۵ سال کے بعد

یہ کتاب [illegible]
قیمت [illegible] روپیہ [illegible] آنے

سالنامہ [illegible]

[illegible]

نگار

NOV 1953

ے عسی پتہ
ے ذمہ دار

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کردینوالی انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پرزور مجتہدانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہبی استفسارات کے جوابات کا مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل طوفان نوح خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں ہاروت و ماروت حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۳۴۴ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات و افسانوں کا مجموعہ نگارستان جس میں جو درجہ قبول حاصل ہوا ہے اس سے زیادہ اس کے متعدد مضامین ... نہیں کئے گئے ... متعدد افسانے ... کتاب مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشن میں نہ تھے قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنہیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے نیا ایڈیشن قیمت چار روپیہ

علاوہ محصول

پہلے اسے پڑھ لیجئے

(خریداران نگار کے لئے نہایت ضروری اطلاع)

ہر مہینے نگار نہایت احتیاط سے ہر خریدار کے نام روانہ کیا جاتا ہے پھر بھی بعض پرچے ڈاک کی بدنظمی یا مقامی ڈاکیوں کی بے پروائی کی وجہ سے گم ہوجاتے ہیں۔ ہم کو جب اس کی اطلاع ملتی ہے تو ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے لیکن اس کا کوئی علاج نہیں اس لئے ہم اطلاع ملنے پر دوبارہ پرچہ روانہ کردیا کرتے تھے، لیکن اب محکمۂ ڈاک کے جدید قواعد کی رُو سے نگار کی تاریخ اشاعت ہر ماہ کی سات مقرر کردی گئی ہے اور اس کے بعد ایک پیسہ کی جگہ ہم کو ڈیڑھ آنے کا ٹکٹ لگانا پڑے گا۔ یہ صرف بہت زیادہ ہے لیکن اگر اسے برداشت کرلیا جائے تو بھی یقینی نہیں کہ پرچہ دوبارہ آپ کو ملجائے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ پرچہ بیرنگ روانہ کیا جائے جو تین آنے ادا کرنے پر آپ کو ملے گا، اس طرح پرچہ آپ کو یقینی مل جائے گا۔

آپ اپنے مقامی ڈاک خانہ اور پوسٹ مین کو بھی ہدایت کرتے رہئے کہ وہ احتیاط سے آپ کی ڈاک آپ تک پہونچاتا رہے تاکہ اس کی نوبت ہی نہ آئے کہ پرچہ آپ کو نہ پہونچے اور دوبارہ بیرنگ وصول کرنا پڑے۔ — منیجر

پاکستان کے خریدارانِ نگار

اپنا چندہ آٹھ روپیہ چھ آنے (چھ آنے زاید سالنامہ کے رجسٹرڈ بھیجنے کے ہیں) ذیل کے پتوں میں سے کسی پتہ پر بھیجکر سلسلۂ خریداری جاری رکھ سکتے ہیں — اگر آپ نے ۶ر زاید نہ بھیجے تو ہم سالنامہ کے پہونچنے کے ذمہ دار نہ ہوں گے اور دوبارہ مفت روانہ نہ کرسکیں گے۔

۱- ڈاکٹر ہاشمی - ۲۲۲، الہی بخش کالونی کراچی ——— ۲- ملک دین محمد اینڈ سنز بل روڈ لاہور

احباب پاکستان ہماری مطبوعات حاصل کرنے کے لئے

فیروز سنز بندر روڈ کراچی سے مراسلت فرمائیں

منیجر نگار

نگار کا سالنامہ ۵۴ء

(فرمانروایانِ اسلام نمبر)

جن خصوصیات کا حامل ہوگا، ان کو مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ یہ ایک دائرۃ المعارف ہے جس کے مطالعہ کے بعد آغازِ عہد نبوی سے اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے متعلق آپ کو معلوم ہو سکے گا کہ وہ کب، کہاں اور کن حالات میں قایم ہوئیں، ان کے عروج و زوال کے کیا اسباب تھے، ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں کیونکر منتقل ہوئیں، ان کے فرمانرواؤں کے کیا نام تھے اور ان میں سے ہر ایک نے کس سنہ سے کس سنہ تک حکومت کی۔

اس سالنامہ میں دو نقشے ایسے بھی شامل ہوں گے جو پورے سالنامہ کا نچوڑ ہیں اور جن کو دیکھ کر بیک نگاہ اسلامی حکومتوں کے عروج و زوال کی پوری تصویر آپ کے سامنے آجائے گی۔

قیمت فی کاپی علاوہ محصول تین روپیہ - خریدارانِ نگار کے لئے مفت، لیکن چھ آنے زاید مصارف رجسٹری کے لئے آنا ضروری ہیں۔

منیجر

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۵۳ء میں ختم ہو رہا ہے

تو مناسب یہی ہے کہ آپ جنوری ۵۴ء میں سالنامہ کی وی، پی کا انتظار کریں جو سات روپے آٹھ آنے میں روانہ ہوگا، لیکن اگر آپ چندہ پیشگی بھیجنا مناسب سمجھتے ہیں تو از راہ کرم منی آرڈر آٹھ روپیہ چھ آنے کا روانہ فرمایئے تاکہ سالنامہ ذریعہ رجسٹری روانہ کیا جائے، ورنہ گم ہونے کی صورت میں ہم دوبارہ اسے مفت روانہ نہ کر سکیں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۵۳ء میں ختم نہیں ہوتا

تو ایک لفافہ کے اندر چھ آنے کے ٹکٹ رکھ کر سالنامہ کی رجسٹری کے لئے ضرور بھیج دیجئے۔ ورنہ گم ہونے کی صورت میں ہم دوبارہ اسے مفت فراہم نہ کر سکیں گے بلکہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ بذریعہ منی آرڈر بھیجئے کیونکہ دونوں صورتوں میں آپ کے آٹھ آنے صرف ہوں گے اور منی آرڈر کا پہونچنا بالکل یقینی ہے۔ لفافہ کے اندر ٹکٹ رکھے ہوئے ممکن ہے ہمیں نہ مل سکیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

دائرہ میں سرخ صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ نومبر میں ختم ہو گیا اور دسمبر کا
[illegible] سات آنے میں وی پی ہوگا جس میں سالنامہ ۵۴ء کی قیمت بھی شامل ہے

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۴	فہرست مضامین نومبر ۱۹۵۳ء	شمارہ ۵

ملاحظات

مولانا سید سلیمان ندوی اور پاکستانی حکومت کا تصور

پاکستان کے مسئلہ دستور سازی کے سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک بڑا دلچسپ بیان حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ:- (۱) پاکستانی حکومت کا نام "جمہوریۂ شورئ اسلامیہ" ہونا چاہئے۔ (۲) حکومت کا مذہب معلوم قرار دینا چاہئے اور (۳) دستور میں اس امر کا کافی تحفظ ہونا چاہئے کہ آئندہ کسی وقت بھی اسے سیکولر (لادینی) حکومت قرار دیا جاسکے ورنہ دہریت کا سدِ باب نہ ہوسکے گا۔

مولانا نے پاکستان کو صرف "جمہوریت پاکستان" کے نام سے موسوم کرنا غالباً اس لئے پسند نہیں کیا کہ لفظ "جمہوریت" میں وہ کیفیت شامل "شوریٰ" یا "تشاورو روافی الامر" کا مفہوم شامل نہیں ہے اور اسی لئے انھوں نے شوریٰ کا اضافہ ضروری سمجھا لیکن اس اضافہ کے بعد انھوں نے سوچا ہوگا کہ مذہب کی تخصیص تو باقی رہ گئی، اس لئے انھوں نے اسلامیہ کا اضافہ فرمایا ــــ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ یہ نام رکھ کر آئندہ خطرات سے ہمیشہ کیلئے

مخفنا ہوگئے ـــ غالباً نہیں، کیونکہ اسلامیہ کی تخصیص کے بعد بھی یہ سوال قدرتاً پیدا ہوسکتا ہے کہ اسلام سے کیا مراد ہے اور ہم صحیح معنے میں کس کو مسلمان کہہ سکتے ہیں

غیر احمدی جماعت کو چھوڑئیے کہ وہ غریب تو بالاتفاق ہمیشہ کے لئے غیر مسلم قرار ہی دیدی گئی ہے، لیکن اسکے علاوہ بھی تو اسلام میں اور بہت سے فرقے ہیں :۔ حنفی، مالکی، حنبلی، شافعی، شیعی، معتزلی، خارجی وغیرہ، ان میں سے کسی ایک کو معیار قرار دینا پڑے گا اور چونکہ پاکستان میں حنفی جماعت کی اکثریت ہے، اس لئے مولانا کو حنفیہ کا اضافہ بھی کرنا چاہئے تھا۔ اس کے بعد انھیں یہ غور کرنا چاہئے تھا کہ حنفی جماعت بھی مختلف العقاید گروہوں میں بٹی ہوئی ہے اور اس میں اہلِ قرآن، اہلِ حدیث، مقلد، غیر مقلد وغیرہ سبھی شامل ہیں، اس لئے مقلدین کی اکثریت کے پیشِ نظر "تقلیدیہ" کی شرط بھی انھیں بڑھانا چاہئے تھی۔ مگر یہ سلسلہ اسی جگہ ختم نہیں ہوجاتا، کیونکہ مقلدین کے بھی متعدد خانوادے ہیں اور چونکہ ان میں مولانا اشرف علی تھانوی کا خانوادہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور پاکستان میں اس کے تنہا نمایندہ خود مولانا سید سلیمان ہیں، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے حکومت پاکستان کا نام رکھنے میں ذرا انکسارِ نفس سے کام لیا، ورنہ اس کا صحیح نام ہماری رائے میں یہ ہونا چاہئے تھا۔

"الجمہوریت الشورۃ الاسلامیۃ، الحنفیۃ، التقلیدیۃ، الاشرفیۃ، السلیمانیہ" اس کے بعد وہ اگر چاہیں تو "فبایّ آلاءِ ربکما تکذّبان" کا بھی اضافہ فرما سکتے ہیں۔

ڈاکٹر مصدق کا عروج وزوال

اس ماہ کی اشاعت کا سب سے پہلا مقالہ جو "ایران کی سیاسیاتِ حاضرہ" اور ڈاکٹر مصدق کے غیر متوقع سقوط سے تعلق رکھتا ہے۔

میرے ایک عزیز دوست کا عطیہ ہے جو عرصہ سے طہران میں اقامت پذیر ہیں اور وہاں کی سیاسیات پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں، یہ مقالہ اس میں شک نہیں بہت اہم ہے نہ اس لئے کہ وہ ایک ایسے شخص کا بیان ہے جس نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ ایرانی قوم کا سچا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں۔

جن حضرات نے نگار کا سالنامہ ۱۹۵۱ء ملاحظہ کیا ہوگا ان سے مخفی نہ ہوگا کہ مارس ہنڈس نے ایران کی سیاحت کے بعد وہاں کی اقتصادی زبوں حالی کا ذکر کن درد انگیز الفاظ میں کیا تھا اور اس نے یہ پیشین گوئی کردی تھی کہ آج نہیں تو کل یہاں کی آبادی میں اپنی خواری و ذلت کا صحیح احساس پیدا ہوگا اور اس کا ردِ عمل یہ ہوگا کہ موجودہ دورِ ملوکیت" ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے گا۔

ڈاکٹر مصدق کا ظہور اسی پیشین گوئی کی پہلی کڑی تھی اور اس کا سقوط اس کی دوسری کڑی ہے۔

ہوسکتا ہے بعض نفوس، ڈاکٹر مصدق کی ناکامی کو ایران کی "شاہنشاہیت" کی کامیابی قرار دیں لیکن وہ حضرات جو زمانہ کے نبض شناس ہیں جانتے ہیں کہ :ـــ " ایں خستہ اگر دیر زید شام بمیرد " ـــ مصدق کے زوال ہی میں ایرانی قوم کا عروج پنہاں ہے اور اس خاکستر سے اب جو چنگاری بلند ہونے والی ہے وہ نہ صرف ایران بلکہ تمام مشرق وسطیٰ کے نظام جبر و استعمار کو خاک میں ملا کر رکھ دے گی۔

گر غبار آلودہ گشتی باک نیست

اے ہزاراں دیدہ در راہِ تو خاک !

اس مقالہ کا باقی حصہ تمام و کمال آیندہ پرچہ میں شایع کردیا جائے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر مصدق کی قسمت کا فیصلہ جو کچھ ہونا ہے اس کا علم قارئین نگار کو اخبارات کے ذریعہ سے خود ہی ہوجائے گا۔

ایران کی سیاسیات حاضرہ کا اہم ترین پہلو

تیل کے مسئلہ میں برطانیہ کی ریشہ دوانیاں

ایرانی وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق کا عروج و زوال

۱۹ اگست ۱۹۵۳ء کو ایران کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر محمد مصدق کی (۲ سال ۸ ماہ) کی "مضبوط قومی حکومت" کا ناگہاں سقوط تاریخ ایران کا ایسا عجیب و عبرتناک واقعہ ہے جس کی بابت آیندہ کا مورخ معلوم نہیں کن لفظوں میں اظہار رائے کرے گا لیکن راقم کو جس نے اس جمی جمائی ہوئی بساط کو اپنی آنکھوں سے دفعتاً اُلٹے جاتے ہوئے دیکھا ہے، اس کے متعلق صرف یہ کہنا ہے "جیسے کوئی چیز دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے نکل جائے......."

یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ایک ماہر تیراک ہولناک موجوں سے جنگ کرتا، گرداب سے کتراتا، طوفان سے لڑتا جھگڑتا کنارے تک آجاتا ہے کہ دفعتاً پانی کا ریلا آتا ہے اور اُسے بہاکر کہیں سے کہیں لیجاتا ہے.... ڈاکٹر مصدق اور اُس کی قومی حکومت کا حال بھی یہی ہوا... اور ایک بالکل جیتی ہوئی بازی دفعتاً ہار میں بدل گئی —— یہ بازی کیا تھی —— ؟ مختصراً یوں سمجھئے کہ ایران کے مشہور قضیۂ نفت (تیل) کے سلسلہ میں مصدق کی ساری کوشش یہ تھی کہ وہ تیل کے موضوع کو ایک عظیم الشان قومی مسئلہ بناکر اُس کے پردے میں پہلے عوام کو انگریزوں کے خلاف اُبھارے اور بحران کی مدد سے ایران کی چھ ہزار سالہ شخصی حکومت کا تختہ اُلٹ کر ملک میں جمہوریت کی بنیاد ڈال دے —— یہ بازی کس کے ہاتھوں خراب ہوئی —— !

ایران کی اکثریت کے خیال کے مطابق اس کے سبب دو ہیں :-

اوّل مصدقی حکومت کے ۴۴ سالہ ناتجربہ کار وزیر خارجہ ڈاکٹر حسین فاطمی کا ناعاقبت اندیشانہ طرز عمل !

دوم ایران کی تودہ (کمیونسٹ) پارٹی کی احمقانہ جلد بازی !

ڈاکٹر حسین فاطمی ایرانی سیاست کے افق پر حسین فاطمی کا ظہور بھی ایک دلچسپ واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ فاطمی کو زیادہ سے زیادہ ایران کے پڑھے لکھے درمیانی طبقہ کا ایک فرد کہا جاسکتا ہے ڈاکٹر مصدق کے دور حکومت سے پہلے اس شخص کو ایران کے پایۂ تخت طہران میں بھی کوئی شہرت حاصل نہیں تھی۔ یہ ایک ذہین نوجوان تھا جو اخباروں میں مضامین لکھ کر اپنی روٹی کماتا تھا۔ جب مصدق کے آفتاب اقبال کی روشنی زیادہ پھیلنے لگی تو اس موقع پرست پر اسرار آنکھوں والے اڈیٹر نے اپنی طباعی اور فراست سے بوڑھے اور شریف باطن مصدق کا دل کچھ اس طرح ہاتھ میں لے لیا کہ رفتہ رفتہ مصدق کے رفقاء خاص میں اُس کا شمار ہونے لگا۔ پہلے فاطمی نے مصدق کی مالی امداد سے "باختر امروز" نام کا ایک روزنامہ اخبار نکالا۔ یہ اخبار پُرزور لہجہ میں حکومت کی پالیسی کی حمایت کرتا، ملک میں انگریزوں کے خلاف قومی جذبات کو ابھارتا اور ایشیائی ممالک کو اتحاد و یکجہتی کی دعوت دیتا۔ یہ وقت وہ تھا جب ایرانی قومی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ مصدق اور اُنکے چند وطن پرست رفقاء نے مل کر "حزب نہضت ملی" (National Front Party) کے نام سے ایک سیاسی پارٹی قائم

کی۔ اس پارٹی کا پروگرام یہ تھا کہ ایرانی تیل کے کارخانوں کو (جو دنیا میں تیل صاف کرنے کا سب سے بڑا کارخانہ سمجھا جاتا ہے) قومی بنائے اور ایران کی سرزمین سے برطانوی سیاست کے اقتدار کو ختم کر دے۔ فاطمی اس جماعت کا سرگرم ممبر بن گیا۔ ڈاکٹر مصدق اور ایران کے مشہور مجتہد آیت اللہ ابوالقاسم کاشانی دونوں نے انگریزوں کے خلاف محاذ قایم کر دیا — اس وقت یہ دونوں سیاسی اور مذہبی پیشوا فکر و نظر کے اعتبار سے ایک جان دو قالب معلوم ہوتے تھے۔ فاطمی کو دونوں کا اعتماد حاصل تھا۔ بالآخر اعتماد کی بدولت فاطمی کی سوشل اور سیاسی اہمیت روز بروز ترقی پر تھی۔ یہاں تک کہ اس کا تقرر وزیر اعظم مصدق کی سیاسی پارلیمانی سکریٹری اور "سخنگوئے دولت" (Govt. Spokesman) کی حیثیت سے ہوا۔ یہ کافی اہم عہدہ تھا جو فاطمی کو نصیب ہوا۔ لیکن وقت اور قسمت نے اسے آگے بڑھایا۔ ایرانی مجلس (پارلیمنٹ) کا دو سالہ انتخاب شروع ہوا۔ فاطمی اس انتخاب میں مصدق اور آیت اللہ کاشانی کی حمایت سے بھاری ووٹوں سے منتخب ہوا اور مجلس کا ممبر بن گیا۔ لیکن یہ وہ وقت تھا جب ملک میں سیاسی طوفان برپا تھا اور قومیت کا سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس عالم میں فاطمی جیسے عامی اور کم عمر شخص کا اس بلندی پر پہونچ جانا کھلے طور پر تو حسد اور اعتراض کی نظر سے نہیں دیکھا گیا لیکن خواص اور امراء کے طبقہ میں اکراہ اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ ایرانی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں (دارالامراء اور مجلس شورائے ملی کے قدامت پرست حلقوں) میں اس انتخاب کو خطرناک سمجھا جانے لگا اور عوام میں بھی سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ لیکن علانیہ کہنے کی جرأت کوئی نہ کر سکتا تھا۔ مصدق کے جاہ و جلال کا سورج اپنی پوری تابانی پر تھا۔ اس انتخاب میں اور بھی کئی افراد ایسے آ گئے اور اس سے طبقۂ امراء میں جنھیں ایرانی "اعیان و اشراف" کہتے ہیں کھلبلی سی مچ گئی۔ "دربار شاہی" کے حلقہ میں بھی اندیشہ کا اظہار ہونے لگا۔ وہ صاف صاف دیکھ رہے تھے کہ ملک کی حکومت جو ہزاروں سال سے خواص کے زیر اثر تھی، اب عوام کے ہاتھوں میں جا رہی ہے۔ مگر ایسے تمام افراد مصدق کی ہردلعزیزی کے آگے اپنے کو یکقلم بے بس اور مجبور پا رہے تھے۔ مصدق ملک کا "محبوب" اور ملت کا "باپ" تھا۔ اس کے خلاف کوئی حرف سننا "کفر کے برابر" تھا اور اُسے بُرا کہنے والے کی سزا قتل۔ مصدق کے صدقہ میں فاطمی کا شمار بھی نہضت ملی کے لیڈروں میں ہونے لگا۔ لیکن فاطمی جیسے معمولی بساط کے آدمی پر مصدق کے عنایات و اکرام کی بارش بعض حلقوں کے لئے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر ایک جلسہ میں جبکہ وہ تقریر کر رہا تھا، فروری ۱۹۵۲ء میں گولی چلائی گئی۔ مگر وہ اس مہلک حملہ سے اپنی جان سلامت بچا لے گیا۔ حملہ کا ذمہ دار اس نے انگریزوں کو ٹھہرایا۔ دو ماہ کے معالجہ کے بعد جب وہ اسپتال سے باہر نکلا اور تبدیل آب و ہوا کے بعد یورپ کی سیاحت سے واپس آیا تو اس نے اپنے کو ایرانی وزارت خارجہ کی گرانقدر مسند پر متمکن پایا —!

سنجیدہ اور تعلیم یافتہ ایرانیوں کی ایک بڑی تعداد کا عقیدہ ہے کہ مصدق کا یہ انتخاب کسی اعتبار سے مناسب نہ تھا کسی حلقہ میں بھی اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ جس نے بھی یہ خبر سنی اسی نے حیرت کا اظہار کیا۔ مصدق کے دور حکومت کا واقعہ نگار اس کا اعتراف کرے گا کہ یہ ایک بڑی غلطی تھی جو مصدق سے سرزد ہوئی اور جس کی قیمت اسے اپنے خوابوں کی مکمل پامالی کی صورت میں ادا کرنا پڑی۔ معاملہ کا سب سے زیادہ درد انگیز پہلو یہ ہے کہ مصدق کو یہ شکست اس وقت اٹھانی پڑی جب وقت کا ہاتھ اس کے سر پر کامیابی کا تاج رکھنا چاہتا تھا۔

جنگ کے بعد ایران کا قومی اضطراب

نامناسب نہ ہوگا اگر ڈاکٹر مصدق کے ظہور و زوال کی کہانی کو سلسلہ وار پڑھنے کے لئے ایک سرسری نگاہ اس کے برسر اقتدار آنے سے قبل کے حالات پر بھی ڈال لی جائے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے اختتام کے بعد ایران کی سیاسی تاریخ لمحہ بہ لمحہ ملک کی بڑھتی ہوئی اقتصادی بدحالی کی وجہ سے نہایت ہیجانی دور سے گزرتی رہی ہے۔ ایرانی مجلس (پارلیمنٹ) میں ملک کی مالی حالت کی ابتری اور عوام کے ہولناک مصائب و آلام پر اضطراب کا اظہار کیا جاتا، اقتصادی تیرہ بختی سے ملک کو نجات دلانے کے لئے جہاں اور دوسری قسم کی تدابیر تجویز کی جاتیں وہاں سب سے زیادہ زور ایرانی تیل کی آمدنی پر بھی دیا جاتا جس کا بڑا حصہ ۱۹۳۳ء کے ایرانی انگریزی تیل کے معاہدہ کی رو سے انگلستان کی تجوری میں جارہا تھا۔ وطن پرست ممبران مجلس اس معاہدہ کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کرتے اور اسے ملک کی نکبت و خلاکت کا سب سے بڑا سبب بتلاتے۔ انھیں یقین تھا کہ انگریز صرف ایران کے خدا داد منبع طبیعی (تیل) ہی کا مالک حقیقی نہیں بلکہ سارا ملک ان کے سیاسی اقتدار و اثر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس گرفت کی سختی جنگ دوم کے بعد زیادہ بڑھ گئی اور مرحوم رضا شاہ کو جلاوطن کرنے کے بعد صحیح معنوں میں انگریز ہی ایرانی سرزمین کا اصلی آقا و مالک بن گیا۔

تمام وطن پرست اور انقلاب پسند لیڈروں کو یقین تھا کہ حکومت کی بساط پر اسی مُہرہ کو شاہ و وزیر کی جگہ ملتی ہے جو انگریزوں کے اشاروں پر چلتا اور ملکی مفاد کے خلاف اُن کے خود غرضانہ مقاصد کی حمایت کرتا ہے۔

ضمناً یہ بھی ذکر کردینا مناسب ہے کہ ہندوستان، پاکستان، برما، انڈونیشیا وغیرہ کی آزادی نے انگریزوں کے خلاف اس جوش و خروش، بے خوفی اور بغاوت کے جذبہ کو اور بھی زیادہ تیز کردیا تھا۔ ان نو آزاد ممالک کے حریت انگیز افسانے، ایرانی قومی تحریک کی آگ پر تیل کا کام کر رہے تھے سارے ملک کا مزاج مشتعل ہو رہا تھا ہر دل میں انگریزوں کے خلاف بغض و عداوت کا طوفان برپا تھا۔۔۔۔۔۔ نئی نئی سیاسی جماعتیں اور پارٹیاں پیدا ہوتی جارہی تھیں۔

انھیں طوفانی ایام میں دو بہت اہم قومی پارٹیاں وجود میں آئیں۔ ایک مصدق کی حزب نہضت ملی۔ دوسری تودہ پارٹی۔ رفتہ رفتہ دوسری سیاسی یا نیم سیاسی نیم مذہبی پارٹیاں بھی قایم ہوگئیں۔ جن میں حزب پان ایرانسٹ اور حزب فدائیانِ اسلام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ بعد میں ایک اہم پارٹی نیروئے سوم کے نام سے بھی قایم کی گئی۔ اس کا رجحان سوشلزم کی طرف ہے۔ یہ ساری جماعتیں اپنے اپنے جداگانہ داخلی پروگرام رکھتی تھیں لیکن جہاں تک ملک کے جسم سیاست (Body Politics) سے انگریزی رسوخ و اثر کو نکال پھینکنے کا سوال تھا سب کی سب اس مخصوص نصب العین میں متحد و ہم آواز تھیں۔

دُنیا کے تمام کمیونسٹوں کی طرح تودہ پارٹی کا نعرہ بھی یہی تھا کہ انگریزوں کے ساتھ ساتھ امریکی اثر و نفوذ کو بھی ایران سے ہمیشہ کے لئے ختم کردینا چاہیے۔ تودہ پارٹی ایران کی سب سے زیادہ منظم، سرگرم اور جانباز پارٹی سمجھی جاتی ہے عام خیال یہ ہے کہ روسی سفارت اس پارٹی کی سرپرستی کرتی ہے۔ اس کا پروگرام یہ ہے کہ ایران سے شاہنشاہیت کو ختم کرکے کمیونسٹ نظام حکومت قایم کیا جائے جو روسی کنٹرول میں ہو یا اُس سے باہر۔ منجملہ اور باتوں کے اس کا پروگرام یہ تھا چونکہ انقلاب سے ممکن نہیں تو بادشاہ کو گولی کے ذریعہ صفحۂ ہستی سے دور کردیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء کے ایک جلسے میں موجودہ شاہ پر گولی چلائی گئی۔ اُس وقت سے یہ پارٹی قانونی طور پر ناجایز قرار دیدی گئی ہے۔ لیکن اس کی خفیہ سرگرمیاں بدستور باقی ہیں۔

حزب فدائیان اسلام نے اپنا مذہبی وظیفہ یہ قرار دیا کہ وہ ملک کے "خائنوں" اور "غداروں" کو چُن چُن کر ختم کردے اور ایران میں شریعت کے اصول پر ایک خالص قسم کی "عبا و عمامہ" والی اسلامی حکومت قایم کردے۔

پارٹی مغربی تہذیب کی دشمن اور رضا شاہ کے سوشل اصلاحات کی مخالف ہے۔ طہران کے کوچہ و بازار میں شراب اور سور کے گوشت کی علانیہ فروخت اسے پسند نہیں۔ ایرانی عورتوں کی ترقی پسندی اور اُن کی "فرنگیانہ بے حجابی" اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اسی جماعت کے ایک "فدائی" خلیل طہماسپی نے ۱۹۵۱ء میں ایرانی وزیر اعظم علی رزم آرا کو غدار ہونے کے جرم میں طہران کی ایک مسجد میں قتل کر ڈالا جبکہ وہ کسی شخص کی نماز میت پڑھ کر واپس آرہا تھا۔ ملک کے جوش و جنون کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ مصدق کے دور حکومت میں ممتاز سیاسی لیڈروں کے دباؤ اور سفارش سے طہماسپی پر سے قتل کا مقدمہ اُٹھا لیا گیا۔ ایرانی مجلس کی متفقہ رائے میں وہ بے گناہ قرار پایا۔ مقامی اخباروں سے اُسے "قومی مجاہد" کا خطاب ملا۔ وزیر اعظم مصدق نے اسے سراہا۔ مذہبی پیشوا آیت اللہ کاشانی نے اسے رہائی کے بعد مبارکباد دی۔ ملک کے فیاضانہ چندوں سے وہ عتباتِ عالیہ کی زیارت سے مشرف ہوا!!

علی رزم آرا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سلجھا ہوا سیاست داں اور ٹھنڈے غور و فکر کا آدمی تھا۔ اسکا دوٹوک فیصلہ یہ تھا کہ ابھی ایران اپنے تیل کے کارخانہ کے چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اُسے انگریزوں کے سہارے کی بہت ضرورت ہے۔ ایک طرف تو وہ انگلستان کا دوست مشہور تھا۔ دوسری طرف روس سے بھی اُس کے سیاسی تعلقات خاصے گہرے تھے۔

وزیر اعظم کے عہدہ پر مصدق کا انتخاب

رزم آرا کے قتل کے بعد ملک کی سیاسی فضا نے نہایت پراگندہ اور بحرانی صورت اختیار کرلی۔ شاہ کے لئے سب سے بڑا اور پیچیدہ سوال یہ تھا کہ ملک کا وزیر اعظم اب کسے مقرر کیا جائے۔ آشوب اور اختلال ملک کے گوشہ گوشہ میں حکم فرما تھا۔ نہضتِ ملی کے لیڈر اور ان کے ساتھ ساتھ تودہ کی ممنوع جماعت کے غوغائی اس شورش و بدنظمی کی آگ کو اپنی اشتعال انگیز تقریروں سے اور بھی ہوا دے رہے تھے۔ ہر وہ فرد جو اُن کی انجمن کا حامی یا اُن کے گروہ کا فرد نہ ہوتا اُس کے پاؤں جمنے نہ دیتے۔ دہشت انگیزوں (Terrorists) کے خوف سے حکام کے دل لرزتے رہتے تھے۔ امراء کا انگریزوں کے "خاندانِ خاص" میں ہوتا۔ وہ ملک کے بہت بڑے دشمن سمجھے جاتے۔ معروف اور ممتاز سیاسی شخصیتوں میں شاید کوئی ایسا نہ تھا جس کا دامن رشوت خواری اور ملک فروشی کے اتہام سے پاک ہو۔ غرض عوام کی نگاہ میں ایسا کوئی نہ تھا جسے قوم بے غرض اور سچا خادمِ وطن سمجھ کر قبول کرلے۔ اس طرح کی عام بے اعتمادی، شکوک اور بدگمانی کی فضا میں اگر کوئی شخص ایسا موجود تھا جس کا ماضی یکقلم بے داغ اور جس کی پچھتر سالہ زندگی کا دامن خود پرستی اور خیانت کے داغ سے یکسر پاک سمجھا جاتا، تو وہ فقط ڈاکٹر محمد مصدق تھا۔

یہ عام طور پر مشہور ہے کہ خود ایک بڑا زمیندار اور ثروت مند ہونے کے باوجود مصدق نے ہمیشہ سیدھی سادی زندگی بسر کی اور ہر چند وہ کئی بار وزیر اور گورنر کے عہدوں پر مامور ہوا لیکن مادی حرص و ہوس کی آلائش سے اُس کا کیرکٹر ہمیشہ پاک رہا۔ خود اس کے مخالف اس کی دیانت و پاکبازی کے معترف ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ موجودہ ایران میں کسی ایسے شخص کا پایا جانا معجزہ سے کم نہیں۔ ایران کی زبردست اکثریت کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ مصدق وطن کا سچا خیرخواہ اور دردمند ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مصدق کی حزب نہضتِ ملی نے چند ہی مہینوں میں حیرت انگیز فروغ حاصل کرلیا مصدق مجلس کا رکن تھا۔ یہاں بھی اُس کا اثر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ ملک کی اقتصادی اور مالی حالت کو بہتر بنانے کے لئے اُس کی پارٹی نے جو پلان تیار کئے تھے اس کے پسند کرنے والوں کا حلقہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس جماعت کا پروگرام جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا، یہ تھا کہ:- (۱) ایران کے تیل کی صنعت کو قومی بنایا جائے۔ (۲) [illegible] کے ایرانی، انگریزی [illegible]

کو لغو قرار دیا جائے - (۳) انگریز ایرانی تیل کے کاروبار میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو اُن کی حیثیت حقیقی معنوں میں صرف ایک شریک کار کی ہو، مالک اور آقا کی نہیں، جیساکہ اب تک رہا ہے - زمین سے تیل نکالنے اور دُنیا کے بازار میں اُس کے بیچنے کا انتظام براہِ راست ایرانیوں کے ہاتھ میں رہے وغیرہ وغیرہ -

تودہ پارٹی جس کا سیاسی عقیدہ اور پروگرام مصدق کی نہضتِ ملی پارٹی سے بالکل جداگانہ تھا، اس معاملہ خاص میں مصدق جماعت کی ہمنوا بن گئی تھی اس لئے کہ سرِدست دونوں کا مقصود ایک تھا یعنی انگریزی استعمار کو ایرانی سرزمین سے ہمیشہ کے لئے اُکھاڑ پھینکنا ـــ جب کبھی انگریزی یا مغربی استعمار کے خلاف کوئی احتجاج یا مظاہرہ ہوتا تو تودہ افراد جوق در جوق آملتے اور ایک آواز ہوکر نعرے سر کرتے - ان ہنگاموں میں کبھی کبھی "برچیدہ باد سلطنت" کے نعرے بھی سننے میں آجاتے - اس عام قومی بیداری سے تودہ پارٹی اپنے حق میں زیادہ سے زیادہ فایدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھی اور مصدق جماعت ذرا بھی مزاحم نہ ہوتی تھی بلکہ در پردہ ہمت افزائی کرتی .... اور ہمت افزائی اس لئے کرتی کہ تودہ پارٹی حزب نہضت ملی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ منظم، مرتب اور طیار جماعت تھی - یہ جس حزب سے مل جاتی اس کی قدرت و قوت کو دوگنا مضبوط کر دیتی -

ایسے ہنگامہ خیز اور طوفانی دور میں علی رزم آرا کے قتل سے جو سیاسی خلا پیدا ہوگیا تھا اُس کا پر کرنا شاہِ ایران اور اس کے "مشاورین خاص" کے لئے کوئی آسان کام نہ تھا ـــ اس لئے آسان نہ تھا کہ "اعلیٰ حضرت ہمایونی" اور ان کے مقربانِ درگاہ کو مصدق کی جماعت کا اقتدار یکقلم منظور نہ تھا ـــ نہضتِ ملی اور تودہ گروہ کے اخباروں نے شور مچایا کہ یہ تذبذب اس لئے ہے کہ انگریز مصدق کے دشمن ہیں اور "دربار" انگریزوں کے خلاف قدم اُٹھانے کی جرأت نہیں کرسکتا ـــ کہا جاتا ہے کہ اس مشکل گھڑی میں شاہ کی بہن رشدت پہلوی نے جو بڑے ہوش و گوش کی عورت سمجھی جاتی ہے اور اپنے باپ رضا شاہ ہی کی طرح تند اور ڈکٹیٹر مزاج کی واقع ہوئی ہے، شاہ کو مشورہ دیا کہ وہ ہمت سے کام لے اور اپنے مشاور خاص وزیر دربار حسین علاء کو وزیر اعظم کا قلمدان سپرد کردے - چنانچہ مارچ ۱۹۵۱ء میں حسین علاء وزیر اعظم بنا دیا گیا -

حسین علاء کا شمار ایرانی شرفاء کے صفِ اول میں ہوتا ہے - وہ ایران کی نرم و نازک تہذیب کا صحیح نمایندہ ہے، ایک اعتدال پسند سیاست داں کی حیثیت رکھتا ہے - برسوں لندن - پیرس - واشنگٹن میں ایرانی سفیر کے خدمات بھی انجام دے چکا ہے اسے تیل کی صنعت کو قومی بنانے کے جنگجویانہ مطالبہ سے بنیادی اختلاف تھا - اس کی نگاہ میں یہ تجویز اگر جذباتی نہیں تو قبل از وقت ضرور تھی - بعد از جنگ کے بین الاقوامی حالات کے پیشِ نظر ایران کا انگریزوں سے لڑنا جھگڑنا اس کے نزدیک خطرناک بھی تھا اور ملکی مفاد کے خلاف بھی - وہ اس معاملہ میں آہستہ روی کا حمایتی اور بے صبری کا مخالف تھا.

وزیر اعظم کی حیثیت سے حسین علاء کا انتخاب کتنا ہی مناسب اور موزوں کیوں نہ رہا ہو لیکن ملک کا بدلا اور بپھرا ہوا مزاج ایسے افراد کو وزیر اعظم کی مسند پر نہیں دیکھ سکتا تھا ـــ چنانچہ کہا گیا کہ "اگر ہمیں حسین علاء ہی کو قبول کرنا تھا تو علی رزم آرا کا خون کیوں کیا گیا ـــ کیونکہ یہ شخص تو رزم آرا سے بھی زیادہ انگریز پرست ہے"۔

غرض کہ مجلس کے اندر اور باہر ہر جگہ بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی اور اس صورت حال پر ابھی تین ماہ بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ حسین علاء کو وزارتِ عظمیٰ کی کرسی خالی کرنا پڑی -

حسین علاء کے برطرف ہونے کے بعد دُنیا کی کوئی طاقت "محبوب ملت" اور "خادمِ وطن" مصدق کو وزیر اعظم بننے سے نہیں روک سکتی تھی اور نہیں روک سکی ـــ مئی ۱۹۵۱ء کی ۱۰ بجے صبح کو ایرانی مجلس کی تقریباً متفقہ رائے سے اُسے ایران کا پہلا "مخلص، وطن دوست اور ہمدرد ملت" وزیر اعظم چنا گیا ـــ اس تاریخی انتخاب کے بعد مصدق نے مجلس کے

آہنی دروازوں کے آگے ایک زبردست جمعیت کے سامنے آہوں اور آنسوؤں سے بھری ہوئی تقریر کی اور اعلان کیا کہ بہ حیثیت وزیر اعظم کے اس کا پہلا فرض یہ ہوگا کہ ملک کے اقتصادیات کی ٹوٹتی ہوئی کمر کو سیدھا کرے (۲) ایران سے "ہر طرح" کے خارجی نفوذ و اثر کو یکقلم دور کر کے ملک کو "حقیقی طور" پر آزاد بنائے۔

آخر کار شاہ ایران کو عوام اور مجلس کے رجحان کے سامنے سر جھکانا پڑا اور مصدق کے انتخاب کو "بارگاہ ہمایونی" سے قبولیت کی سند حاصل ہوگئی۔

مدتوں کی جد و جہد اور تاریخی نشیب و فراز کے بعد ایرانی قوم کی یہ پہلی "شاندار فتح" تھی اور تمام خاورمیانہ میں انگریزی سیاست کی پہلی شکست ——— انگریز سمجھ گئے کہ ہوا کا رُخ اُن کے خلاف ہے اور مشرقِ وسطیٰ میں ان کے سیاسی اقتدار کے خاتمہ کی ابتدا ہو چکی ہے۔

مصدق اور انگریز حکومت کی باگ سنبھالتے ہی تیل کی صنعت کو عملاً قومی بنانے کے سلسلہ میں مصدق نے انگریزوں کے خلاف جس غیر معمولی جرأت اور حیرتناک تیزی سے کام لیا وہ ہمیشہ ایرانی تاریخ کا ایک یادگار ورق رہے گا۔

ابھی ڈاکٹر مصدق کو وزیر اعظم بنے پورے دو مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ اُس نے ۲۱ جون ۱۹۵۱ء کو ایران کے مشہور شہر آبادان میں جو تیل کا مرکزی کارخانہ انگریزی کمپنی کے تحت کام کر رہا تھا، اُسے ایرانی حکومت کے کنٹرول میں لے لیا اگرچہ ۱۹۳۳ء کے ایرانی، انگریزی معاہدہ کی رو سے ۱۹۹۵ء تک ایرانی حکومت ایسا کرنے کی مجاز نہ تھی۔ اتنے مشکل کام کا اتنی آسانی کے ساتھ انجام پا جانا یقیناً معجزہ سے کم نہ تھا۔ انگریزوں نے ایران کو ڈرانے اور مرعوب کرنے کے تمام ہتھکنڈے استعمال کر ڈالے۔ ایرانی، عراق کی سرحد پر فوجیں بٹھائی گئیں۔ شط العرب میں جنگی جہاز بھیجے گئے۔ یہ افواہ بھی پھیلائی گئی کہ ممکن ہے برطانوی حکومت اپنے چھتر باز سپاہی ایران میں اُتارنا شروع کر دے۔ غرض طرح طرح کی دھمکیاں دی گئیں مگر مصدق پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا ——— بجلی کی سرعت کے ساتھ سارے ملک میں "ایران و انگلیس تیل کی کمپنی" کا نام بدل کر "ایرانی قومی تیل کی کمپنی" ہوگیا ——— اور ونسٹن چرچل نے نہایت غصہ کے ساتھ بیان دیا کہ "ایرانی گورنمنٹ نے ہمارا جایز حق زبردستی غصب کر لیا"۔

ایران و انگلستان کی بڑھتی ہوئی کشمکش کی وجہ سے بین الاقوامی فضا سخت مکدر ہو رہی تھی۔ تیسری جنگ عظیم کا احتمال بڑھتا جا رہا تھا۔ عام طور پر یہ اندیشہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ ممکن ہے برطانیہ اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے جنوبی ایران میں، جہاں تیل کا میدان اور تیل صاف کرنے کا دُنیا کا سب سے بڑا کارخانہ ہے، اپنی فوجیں اُتار دے ——— اور اگر ایسا ہوا تو ۱۹۲۱ء کے ایرانی۔ روسی معاہدہ کے مطابق روس بھی اپنے سپاہی یقیناً ایران میں بھیجدے گا۔ یہ حالت دو نتیجوں سے خالی نہیں ہوگی ——— یا تو اپنے اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے روس و انگلستان میں جنگ ٹھن جائے گی یا پھر ایران دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ شمال کا حصہ روس دبا بیٹھے گا ——— جنوب کا انگلستان ——— پھر بھی دونوں میں جنگ کا چھڑ جانا حتمی ہوگا۔ کیونکہ روس، ایران کے شمالی حصہ کو جس کی جغرافیائی اہمیت مسلّم ہے، اپنے کنٹرول میں لے آنے کے بعد خاموش نہیں بیٹھے گا اور آہستہ آہستہ اپنے نفوذ و اثر کو پھیلانا شروع کرے گا (افغانستان اور پاکستان بغل میں ہیں) اور اگر ایسا نہ بھی کرے گا تو امریکہ کا اس خطرناک صورتِ حال کا خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہنا کسی طرح ممکن نہ ہوگا، لیکن یہ اندیشہ صحیح نہیں تھا۔ جن لوگوں نے مشرقِ وسطیٰ کی ملٹری اسٹریٹیجی (Military Strategy) کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ امریکہ ہو یا انگلستان، ہندوستان کی آزادی کے بعد اب کسی مغربی ملک کا (خصوصاً انگریزوں کا)

ایران میں کوئی بڑی فوج یا لشکر لانا جغرافیائی اعتبار سے گویا ناممکن سی بات ہو کر رہ گئی ہے ۔ ہندوستان غلام ہوتا تو فوج کشی آسان تھی، لیکن اُس وقت ایران انگریزوں کے خلاف اُنگلی اُٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا ۔ رہا عراق تو وہاں حبانیہ کے علاقہ میں، جہاں انگریزوں کا مشہور ہوائی اڈہ ہے، کچھ انگریزی فوجیں ضرور پڑی ہوئی ہیں لیکن ان کی تعداد اتنی نہیں کہ کسی بڑی جنگ میں استعمال کی جاسکیں ۔ ہاں مصر میں البتہ بڑی خاصی تعداد انگریزی فوج کی موجود ہے جو نہر سویز کی دفاع یا دفاع کے بہانہ کی غرض سے وہاں رکھی گئی ہے، لیکن اس فوج کا بھی ایران میں اُتارا جانا بہت دشوار ہے، کیونکہ اول تو ایران و مصر کے درمیان مسافت اتنی طویل اور پیچ در پیچ ہے کہ وہاں سے یہاں فوجیں لانا جوئے شیر کا لانا ہے ۔ مسافت کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ کے وہ ممالک جو مصر و ایران کے درمیان واقع ہیں یقیناً آسانی کے ساتھ برطانوی فوجوں کو اپنی اپنی سرحدوں سے عبور کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے ۔ اور اب کسی کا بہ جبر لشکر کشی کرنا بڑا کٹھن کام ہے ۔ لاکھوں مشکلات ہزاروں دشواریاں ہیں ۔ رہا امریکہ تو اُس کے لئے اس طرح کی فوج کشی اور بھی دشوار ہے ۔ اس کے علاوہ دونوں ممالک باہم مل کر بھی ایران میں روس کے خلاف جنگ کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ۔ کیونکہ روس کا ایران میں فوجیں اُتار دینا چشم زدن کی بات ہے ۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ایک محلہ سے دوسرے محلہ میں داخل ہو جائے ۔ برطانیہ اور امریکہ کو یہ ہمسایہ والی آسانی میسر نہیں ــــ غرض خطرہ عالمی جنگ کا اُتنا نہ تھا جتنا کہ ایران کی اقتصادی بدحالی کی وجہ سے داخلی انقلاب کا ــــ ایران و برطانیہ کی باہمی نزاع کے سبب ایرانی تیل دُنیا کے بازار میں بقدر ضرورت بک نہیں سکتا تھا ۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ایران کے پاس ٹینکر (تیل کے حمل و نقل کا مخصوص آبی جہاز) موجود نہیں ــ ایران ہی کیا، بجز جاپان کے اور کسی ایشیائی ملک کو ٹینکر میسر نہیں ۔ یورپ کے ایسے ممالک جو ٹینکر رکھتے ہیں اور ایران کا تیل بہ آسانی خرید سکتے ہیں وہ "اروپائی اخوت" کی بنا پر برطانیہ کو رنجیدہ کرنا چاہتے نہیں ۔ مزید یہ کہ تقریباً ایسے سارے ملک برطانیۂ عظمیٰ کے مقابلہ میں ایک معمولی ایشیائی ملک، ایران کی حد سے بڑھی ہوئی "گستاخی و جرأت" پر برافروختہ ہوئے تھے ۔ خلاصہ یہ کہ بغیر ٹینکر کے تیل کا خارجی بازار میں بھیجا جانا ممکن نہ تھا اور اگر تیل باہر نہ بھیجا جائے تو ملک کی اقتصادی حالت پر اُس کا ہولناک اثر پڑنا اور داخلی انقلاب کی شکل اختیار کر لینا یقینی تھا ــــ یہ صورتِ حال روس کے لئے جتنی امید افزا تھی، امریکہ کے لئے اتنی ہی تشویشناک ۔

اس لئے امریکہ کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح یہ مسئلہ بہ آسانی حل ہو جائے ۔ لیکن کوئی حل پیدا ہو تو کیونکر ہو، ایران و برطانیہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف غصہ و نفرت کے جذبات سے بھرے ہوئے تھے اور دونوں کے سامنے قومی عزت کا سوال تھا ۔

مصدق کو اس بات پر فخر تھا کہ "ہم نے انگریزوں کی انتہائی مخالفت کے باوجود اپنی تیل کی صنعت کو قومی بنا کر چھوڑا" اُدھر انگریز یہ سوچ کر اینٹھے ہوئے تھے کہ "تم نے ایسا کر لیا تو کیا ہوا ۔ ہم تمھیں ہر طرح کے اقتصادی شکنجہ میں کس کر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیں گے ــ"

پریسیڈنٹ ٹرومن کی وساطت

اس خطرناک تعطل کو دور کرنے کی غرض سے پریسیڈنٹ ٹرومن نے اپنا ایک ذاتی نمایندہ مسٹر ہریمین، ایران بھیجا جو ۱۳ جولائی ۱۹۵۱ء کو یہاں پہونچا ۔ ہریمین امریکہ کے ممتاز سیاست دانوں میں سے ہے اور مشرقِ وسطیٰ کے سیاسی معاملات کا ماہر سمجھا جاتا ہے ۔ ہریمین نے اپنی روند و شب کی کوششوں کے بعد مصدق کو اس بات پر راضی کر لیا کہ اگر برطانوی گورنمنٹ تیل کے قضیہ کو دوستانہ طور پر حل کرنے کے لئے کوئی وفد ایران بھیجے گی تو ایرانی حکومت کی طرف سے اس کا استقبال کیا جائے گا ۔

ہریمین، مصدق سے یہ وعدہ لیکر لندن گیا اور چند دن کے بعد وہاں سے ۴؍ اگست ۱۹۵۱ء کو لارڈ پریوی سیل، مسٹر ریچارڈ اسٹاکس کی قیادت میں ایک برطانوی ڈیلیگیشن کے ساتھ خود بھی ایران واپس آیا۔ ایرانی حکومت نے گرماگرمی کے ساتھ وفد کا خیر مقدم کیا۔ ہریمین کی کوشش یہ تھی کہ وہ اپنی موجودگی اور مشورہ سے اس اہم مذاکرہ کو نازک اور خطرناک سرحدوں سے کامیابی کے ساتھ نکال لے جائے۔

یہ تاریخی گفتگو بظاہر بڑی پُر امید فضا میں شروع ہوئی کیونکہ اسٹاکس نے مصدق کی درخواست پر برطانوی حکومت کی خوش نیتی کا ثبوت دینے کے لئے ایرانی تیل کا قومی بنایا جانا تسلیم کر لیا۔ یہ ایک بڑی ڈپلومیٹک فتح تھی جو مصدق کو برطانیہ پر حاصل ہوئی۔

اسٹاکس کی تجویزیں۔ گفتگو کی ناکامیابی

اسٹاکس نے برطانوی حکومت کی طرف سے سمجھوتہ کے لئے حسب ذیل تجویزیں پیش کیں:-

(۱) برطانوی حکومت ایران کا یہ حق تسلیم کرتی ہے کہ ملک کے اندر اُسے تیل کی فروخت میں پوری آزادی حاصل ہوگی داخلی بکری کا ادارہ بلا شرکت غیرے تماماً ایرانی حکومت کے ہاتھ میں ہوگا۔

(۲) دُنیا کے خارجی بازار میں تیل کی نکاسی کے لئے ایک مشترکہ کمپنی بنائی جائے گی۔ اس کمپنی کا ایک حصہ دار ایران ہوگا، دوسرا انگلستان۔ انگلستان کے علاوہ دیگر ممالک مثلاً امریکہ وغیرہ بھی شریک ہو سکتے ہیں۔

(۳) تیل کی نکاسی سے جو نفع ہوگا اُس کی رقم برابر برابر حصہ داروں میں تقسیم کی جائے گی، لیکن پچاس فیصدی رقم جو ایران کو ملے گی اُس میں سے پچیس فیصدی منہا کر لی جائے گی۔ یہ منہا شدہ رقم سابق انگریزی کمپنی کو بطور معاوضہ کے دیجائے گی جس نے تیل کے صاف کرنے کا کارخانہ بنایا تھا اور جو اب تیل کے قومی بنائے جانے کے بعد ایران کا مال ہو گیا ہے۔

(۴) جہاں تک کمپنی کے انتظامی امور کا تعلق ہے، وہ ایرانی افسروں کے ہاتھ میں رہیں گے۔ لیکن پالائشگاہ[1] (Refinery) کا سارا فنی (Technical) محکمہ انگریزی ماہروں کے ہاتھ میں رہے گا۔

ایرانی نمایندوں نے ان شرائط کے ماننے سے بالکل انکار کر دیا۔ اخباری حلقوں میں ان تجویزوں کو "گہرے دام" سے تعبیر کیا گیا۔ مصدق نے اپنے بیان میں کہا:- "ایران کا پچاس سال کا تجربہ اُسے اجازت نہیں دیتا کہ وہ پھر انگریزوں کو کسی حیثیت میں بھی تیل کے کاروبار میں ساجھی اور ساتھی بنائے، ایسی صورت میں تیل کو قومی بنانے کا اصلی مفہوم ہی فوت ہو جائے گا۔ ایران اپنی اس خداداد ملکیت کا پورا پورا مالک ہے اور اس کا اہتمام کرنے میں ہر طرح آزاد۔ ہاں اگر انگریز تیل خریدنا چاہتے ہیں یا تیل کے کارخانہ میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں تو ایرانی حکومت سے وہ اس بات کی درخواست کر سکتے ہیں۔ رہا سوال معاوضہ کا سو ایران تیل کی شکل میں اُس معاوضہ کو ادا کرنے کے لئے ہمیشہ طیار ہے جو "پالائشگاہ" کے بنانے میں صرف ہوا ہے"۔ بعض ایرانی لیڈروں کا خیال یہ تھا کہ معاوضہ کا مطالبہ قطعاً نامنصفانہ ہے۔ اس لئے کہ جو رقم 'پالائشگاہ' کے بنانے پر صرف ہوئی ہے، سابق کمپنی اُس رقم سے کئی گنا زیادہ منافع اب تک لے چکی ہے۔ تودہ پارٹی اور دیگر قومی جماعتوں کے اخباروں کا نظریہ بھی یہی تھا۔

---

[1] یہ شرط اس لئے لگائی گئی تھی کہ انگریزوں کے خیال کے مطابق ایرانی انجینیروں میں کوئی بھی "پالائشگاہ" کو چلانے کی قابل اعتماد فنی صلاحیت نہیں رکھتا۔

کاشانی - اسٹاکس ملاقات

یہ وقت وہ تھا کہ ڈاکٹر مصدق کے ساتھ ساتھ آیت اللہ کاشانی کی شخصیت بھی عالمی شہرت کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ قومی تحریک کے محاذ پر مصدق اور کاشانی کی باہمی رفاقت و اتحاد ملک کی سب سے بڑی مضبوطی تھی۔ کاشانی سے مشورہ کئے بغیر مصدق کی حکومت تیل کے مسئلہ کے متعلق کوئی اہم قدم اُٹھانا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ گفتگو کے دوران میں برطانوی وفد کا شانی سے بھی ملا۔ اسٹاکس کاشانی کو برطانوی حکومت کی ایران دوستی اور نیک نیتی کا یقین دلانے کی سعی کر رہا تھا۔ تیل کے قضیہ کے سلسلہ میں اپنی تجویزوں کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے کاشانی سے استدعا کی کہ وہ مسئلہ کی نزاکت اور پیچیدگی کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ راویوں کا بیان ہے کہ کاشانی نے اس کے جواب میں پہلو بدل کر تند لہجہ میں انگریزوں کی بُرائیاں شروع کر دیں اور ایران کی ساری تباہی اور تیرہ بختی کا ذمہ دار انگریزی امپیریلزم کو ٹھہرایا۔ اسٹاکس چند لمحہ تو خاموشی کے ساتھ ساری باتیں سنتا رہا لیکن جب زیادہ ضبط نہ کر سکا تو کاشانی سے مخاطب ہو کر بولا:-

"معاف فرمائیے۔ میرے خیال میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ ان بد دعاؤں کے حقدار ایرانی علماء و امراء بھی ہیں۔ ملّا صاحب! گستاخی معاف ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کی بڑھتی ہوئی فلاکت و ناداری کا اصلی سبب خود اس ملک کے خود غرض اور جاہ پرست افراد ہیں۔ جب تک اس ملک کی دولت خواص کے ہاتھوں میں رہے گی، عوام کی اقتصادی حالت کبھی بہتر نہیں ہو سکتی۔ میں دیکھتا ہوں کہ عوام کی حالت سُدھارنے کی مخلصانہ لگن کسی دل میں نہیں۔ ایران کے امراء ہوں یا ملّا سب کے سب اپنی اغراض پوری کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ امیروں اور ملّاؤں کی باہمی سازش غریب طبقہ کا خون چوس رہی ہے۔ جاہل و خوش اعتقاد عوام کو دھوکا دینے اور انھیں "آخرت" کے معاملوں میں اُلجھائے رکھنے کی غرض سے بیسیوں مذہبی جال پھیلا رکھے ہیں۔ کوئی مذہبی پیشوا یہ جرأت نہیں رکھتا کہ اپنے "حجرۂ تقدس" سے نکل کر عیاش رئیسوں اور خود پرست امیروں کو للکارے۔ نہ کوئی سیاسی لیڈر ایسا ہے جو نیم گرسنہ مزدوروں اور کسانوں کی داد کو پہونچے اور بڑے بڑے زمینداروں کے پنجۂ ظلم سے مصیبت زدہ عوام کو نجات دلائے۔ جس ملک کی حکومت "خاندانی ادارہ" کی حیثیت رکھتی ہو۔ جس ملک کے وزراء و حکام آپس میں بھائی بھائی اور رشتہ دار ہوں، وہاں کے ننگے اور فاقہ کش طبقہ کی حالت کیا بدل سکتی ہے۔ ملّا صاحب! آئینہ خانوں میں بیٹھنے والوں کا دوسروں پر ڈھیلے پھینکنا عقل کی بات نہیں۔ فقط انگریزوں کو بُرا کہنا سود مند نہیں ہو سکتا۔ مرض اتنا خارجی نہیں، جتنا کہ داخلی ہے۔ ضرورت ہے کہ توجہ بنیادی اسباب کی طرف کی جائے۔ ایران کا حکمراں اور دولتمند طبقہ اگر حقیقتاً خلوص کے ساتھ، ملک کی ننگی، بھوکی، بیمار اور سسکتی ہوئی جنتا کی حالت سنوارنا چاہتا ہے تو شمع کا رخ پہلے اپنی طرف پھیرے اور اپنے افعال کا سچائی کے ساتھ محاسبہ کرے۔ جس ملک کے سرمایہ دار اور ثروت مند افراد کروروں روپئے غیر ملکی بنکوں میں جمع کریں اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ لندن، پیرس، واشنگٹن وغیرہ کے عالیشان ہوٹلوں میں گزاریں، اُس ملک کی اقتصادی اور معاشی حالت کیونکر بہتر ہو سکتی ہے۔ کیا آپ کی شریعت اور آپ کا مذہب یہ اجازت دیتا ہے کہ اعلیٰ طبقہ کی عورتیں تو پوڈر، کریم، لپ اسٹک اور شاندار کپڑوں پر لاکھوں روپئے ماہانہ خرچ کریں لیکن غریبوں کی بیویاں، بہو، بیٹیاں یا تو در بدر ٹھوکریں کھاتی پھریں یا پھر افلاس کے فشار سے ہولناک امراض کا شکار ہو کر قبل از وقت دُنیا سے گزر جائیں ——!"

کہنے والوں کا بیان ہے کہ کاشانی نے اپنا اونچا سر نیچا کر لیا اور اسٹاکس کی اس تنقید کے جواب میں ایک حرف بھی اُنکے منہ سے نہ نکل سکا —— لیکن ایک دوسرے سیاسی لیڈر جو اُس موقع پر وہاں موجود تھے، اسٹاکس سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:- "آپ نے جو کچھ فرمایا وہ بڑی حد تک صحیح ہے اور ہمیں ان بدمزہ حقایق کا اعتراف ہے —— لیکن مجھے یہ

بجنے کی اجازت دیجئے ــــ " اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست ! " طبقۂ بالا کے مزاج کا یہ تعیش اور خود غرضانہ رجحان آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، ہماری زندگی کی بہت سی بلائیں آپ کی لائی ہوئی ہیں۔ ہمارا ذوق، ہماری تہذیب، ہمارا سیاسی اقتدار، ہماری اقتصادی حالت، غرض ہماری زندگی کا سارا ڈھانچہ آپ کے خود غرضانہ چالوں کا نتیجہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہماری حیاتِ قومی کا کوئی ایسا اہم پہلو نہیں جس پر آپ کے ظالمانہ پنجوں کا نشان نہ ہو۔ آپ نے اپنے ملک کی عظمت و خوشحالی کے لئے ہمارا خون طرح طرح سے چوسا ہے۔ ایران ہی کیا، سارا ایشیا آپ کے بیرحمانہ لوٹ کھسوٹ کا فریادی ہے۔ لیکن ہم بیدار ہو چکے ہیں۔ آپ کی بازیگری اب ہم پر اثر نہیں کر سکتی۔ ہمیں اپنے مغرب زدہ ذوق اور تہذیب میں انقلاب پیدا کرنا ہے "۔

کاشانی نے جوش میں آکر کہا :۔ " اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے تیل کی لڑائی چھیڑ رکھی ہے۔ کامل قومی آزادی کی طرف یہ ہمارا پہلا قدم ہے۔ آپ یقین کریں۔ خارجی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے بعد ہم داخلی مکروہات کی زنجیریں توڑنا شروع کر دینگے "۔
ایکسٹالکس مشن ۲۳ اگست کو لندن روانہ ہوگیا۔ ہریمین مایوسانہ امریکہ واپس گیا۔ برطانوی حکومت نے جو یہ دیکھا کہ مشن ناکامیاب رہا تو اس نے تیل کی صنعت کو قومی تسلیم کرنے کی منظوری واپس لے لی۔ ایرانی اخباروں نے برطانیہ کے اس ردِ عمل پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ " انگلستان کا اس طرح قول سے پھر جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ایسی رذیل قلابازیاں ہمیشہ سے اس ملک کی قومی خصوصیات رہی ہیں ــــ "

دونوں ملکوں کے تعلقات تلخ تو ہو ہی رہے تھے، اس گفتگو کے ٹوٹ جانے کے بعد تلخ تر ہو گئے۔ فوجی طاقت تو ایران کے خلاف استعمال کی نہیں جا سکتی تھی۔ اس لئے اب برطانیہ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی موثر حربہ نہ تھا کہ اقتصادی فشار میں لاکر ایران کو جھکنے پر مجبور کر دے۔ اُس نے اپنی اس گرفت کو طرح طرح سے سخت تر کرنا شروع کر دیا۔ اول تو برطانیہ، ایران کی وہ رقم دینے میں پس و پیش کرنے لگا، جو تیل کے حق الامتیاز (Royalty) کی صورت میں اُس پر واجب الادا تھی۔ پھر برٹش ٹریزری نے وہ تمام تسہیلات واپس لے لئے جو جنگ کے بعد ایران کو ملتے آرہے تھے اگرچہ وہ اسٹرلنگ علاقہ کا ممبر نہ تھا۔ یہاں تک، کہ شکر، اسپات اور لوہا وغیرہ جیسی معمولی معمولی چیزیں بھی ایران کو ملنا بند ہو گئیں ــــ مصدق نے اس کا انتقام یہ لیا کہ ۱۲ ستمبر ۱۹۵۱ء کو آبادان سے جہاں دُنیا کا سب سے بڑا تیل صاف کرنے کا کارخانہ یعنی ' پالائشگاہ ' موجود ہے، انگریز کارکنوں، ماہروں اور کارشناسوں کو ایک ہفتہ کے اندر ایران چھوڑ دینے کا حکم دیدیا۔ یہ دوسری بڑی رسوائی تھی جو ایران میں برطانوی اقتدار کو اُٹھانی پڑی۔ دنیا حیرت میں تھی کہ آخر مصدق کیا کرنا چاہتا ہے۔ صلح و صفائی کی باتیں یوں نہیں ہوا کرتیں۔

جہانی عدالت میں۔ ایران کی جیت برطانوی حکومت نے جب یہ دیکھا کہ ڈپلومیٹک گفت و شنید کے ذریعہ سے تیل کے مسئلہ کا کوئی خاطر خواہ حل پیدا نہیں ہوا اور مصدق اپنی جگہ پر اڑا ہوا ہے تو وہ اس قضیہ کو سلامتی (سیکورٹی) کونسل میں لے گئی۔ اُس کا دعویٰ یہ تھا کہ ۱۹۳۳ء کے معاہدہ کی رو سے ایران ۱۹۹۵ء سے پہلے نہ تیل کو بہ جبر قومی بنانے کا حق رکھتا ہے اور نہ وہ انگریزی کمپنی کو تیل کے کارخانہ کی شرکت سے محروم کر سکتا ہے۔ ایران کا نظریہ تھا کہ انگریزوں کی اپیل قانونی اعتبار سے صحیح نہیں۔ یہ قضیہ سلامتی کونسل کے معاملہ ذمہ داری سے باہر ہے اور کونسل اس موضوع پر بحث کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ مصدق اپنے مقدمہ کی پیروی کے لئے ۸ اکتوبر کو خود نیویارک گیا اور سیکورٹی کونسل میں اس موضوع پر پُر جوش تقریریں کیں۔ سلامتی کونسل نے معمولی بحث و مباحثہ کے بعد ہندوستانی نمایندہ سربنیگل نرسنگھ راؤ کے مشورہ سے اس مسئلہ کو جہانی عدالت (World Court) کے سپرد کر دیا

تاکہ وہ فیصلہ کرسکے کہ آیا سلامتی کونسل اس اپیل کو قبول کرنے کی اہلیت رکھتی ہے یا نہیں"۔ مسٹر راؤ کے اس "غیر جانبدارانہ مشورہ" پر ہندوستانی حکومت کو ایران کی طرف سے مبارکباد پیش کی گئی۔ یہ بھی کہا گیا کہ حقیقتاً راؤ نے ایران کی بھی حمایت کی اور ایک محترم ایشیائی ملک کے نمائندہ کو ایسا ہی لازم تھا۔ جب یہ مقدمہ ۱۹۵۲ء میں جہانی عدالت میں پیش ہوا تو اپنے حق کی دفاع کے لئے مصدق وہاں بھی گیا۔ بلجین قانون داں، پروفیسر رولانڈ نے ایرانی مقدمہ کی بڑی پُرزور وکالت کی۔ ہیگ کورٹ کا فیصلہ ایران کے حق میں ہوا۔ خود ایک انگریز جج نے ایران کی حمایت میں رائے دی۔ کورٹ کا فیصلہ یہ تھا کہ لڑائی چونکہ ایک ملک، اور تجارتی کمپنی کے درمیان ہے نہ کہ دو ملکوں کے درمیان، اس لئے سیکورٹی کونسل برطانوی اپیل کو قبول کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ اس "تاریخی کامیابی" پر سارے ایران میں شادیانے بجائے گئے۔

جہانی بینک کی وساطت

ایران اور انگلستان میں صلح کرانے کی ایک اور اہم کوشش ۱۹۵۲ء کے شروع میں جہانی بینک کے ذریعہ کی گئی۔ دُنیا کا خیال تھا کہ جہانی بینک جو ایک غیر جانبدارانہ ادارہ سمجھا جاتا ہے، اس کی وساطت سے دونوں ممالک اپنے قومی اقتدار کو صدمہ پہونچائے بغیر عزت و آبرو کے ساتھ اس خطرناک قضیہ کو حل کرسکتے ہیں۔ خصوصاً ایران، جس کی اقتصادی مشینری بغیر تیل کی آمدنی کے مشکل سے چل سکتی ہے اور وہ اس نادر موقع سے زیادہ سے زیادہ فایدہ اُٹھانے کی کوشش ضرور کرے گا۔ ایران کو اقتصادی دشواری میں گرفتار دیکھکر بینک جہانی کو وسیلہ بنانے کی تجویز مقامی اخباروں کے بقول حکومت پاکستان کی طرف سے کی گئی تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ تجویز نہایت عاقلانہ اور مناسب تھی۔ چنانچہ قریب ڈیڑھ مہینے تک حکومت ایران اور جہانی بینک مشن کے نمایندوں (گارنر اور پرودھام) کے درمیان گفت وشنید ہوتی رہی۔ لیکن آخر میں اس ادارہ کی مساعی بھی نامشکور رہیں۔

بینک مشن کی ناکامیابی کے دو بڑے سبب تھے:-

(۱) ایرانی نمایندوں کا اصرار یہ تھا کہ "پالایشگاہ" (Refinery) کو چلانے کے لئے بینک انگریز ماہروں اور کارشناسوں کو مقرر نہیں کرسکتا۔ البتہ دُنیا کے اور تمام دوسرے گوشوں سے غیر برطانوی تیل کے متخصصوں اور ماہروں کو لانے میں بینک کو پوری آزادی ہوگی۔

بینک نے اس شرط کو قبول کرنے سے بالکل انکار کردیا۔ اُس کا جواب یہ تھا کہ بینک ایک بین المللی ادارہ ہے جس کا برطانیہ بھی ایک ممبر ہے۔ اس لئے بینک اپنے کاموں کے انجام دینے میں ممبر ممالک کے درمیان کسی طرح کا امتیاز جائز نہیں رکھ سکتا۔ دوسرے یہ کہ جب تیل کے کارخانہ کو چلانے کے لئے کارشناسوں اور ماہروں کی ضرورت ناگزیر ہے تو پھر وہی افراد کیوں نہ بلائے جائیں جو برسوں کام کرچکے ہیں"۔ یہ بات مصدق کو بالکل پسند نہ تھی۔

(۲) ایرانی حکومت کی تجویز یہ تھی کہ خارجی بازار میں تیل کے بیچنے کا انتظام بہ حیثیت ایرانی ایجنٹ کے بینک خود اپنے ہاتھ میں لیلے۔ بینک مشن کا جواب پھر یہی تھا کہ بینک ایک جہانی ادارہ ہے اور ایسی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرسکتا جس کا تعلق جانبداری یا کسی خاص ملک سے ہو۔

بینک کی ایک اور قابل ذکر تجویز جسے مصدق نے قبول نہیں کیا یہ تھی:-

"بینک چونکہ دونوں ملکوں کے مفاد کا ضامن ٹھہرایا گیا ہے، اس لئے اُسے یہ حق حاصل ہوگا کہ دُنیا کے بازار میں تیل کی بکری سے جو مجموعی آمدنی ہوگی اس میں سے پچیس فی صدی رقم کاٹ لیا کرے۔ یہ رقم بطور امانت کے سابق انگریزی کمپنی کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے بینک کے پاس جمع ہوتی رہے گی۔ پالایشگاہ کے قومی بنالینے کے بعد اس معاوضہ کی ادائی ایران پر واجب ہے——"

امریکی سفیر مسٹر ہنیڈرسن اور پاکستانی سفیر مسٹر غضنفر علی خاں نے بینک مشن کی کامیابی کی بڑی کوششیں کیں، مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا - خود ہنڈرسن کا بیان یہ ہے کہ ابھی گفتگو جاری ہی تھی کہ ڈاکٹر مصدق نے بینک کو انگریزوں کا طرفدار اور اُن کا "حلقہ بگوش" کہنا شروع کر دیا تھا ــــ اُس کا خیال یہ تھا کہ بینک "جہانی" نہیں بلکہ "برطانوی" ہے! اس سلسلہ میں پاکستانی سفیر کی سرگرمیاں بھی معترضانہ نگاہوں سے دیکھی جانے لگیں - تودہ (کمیونسٹ) پارٹی اور دوسرے جنگجو اخباروں نے مسٹر غضنفر علی خاں کی مساعی کو "خارجی مداخلت" سے تعبیر کیا اور اُن پر نا ملائم حملے کئے گئے اور پاکستان کو انگریزوں کا حمایتی اور اُن کے مفاد کا ہمدرد کہا گیا۔

مصدق کا غیر صلح جویانہ رویّہ

دُنیا یہ سمجھ رہی تھی کہ مصدق انگریزوں سے بظاہر تیل کی لڑائی لڑ رہا ہے، لیکن اُس کی تمام سیاسی جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ اقتصادی و سیاسی اعتبار سے ایران بالکل آزاد ہو جائے - چنانچہ مصدق کی بعض ایسی سرگرمیوں سے جن کا براہ راست تعلق تیل کے مسئلہ سے نہ تھا، روز بروز یہ نمایاں ہوتا جا رہا تھا کہ اُس کا مقصد ایران کے "تیل" ہی کو قومی بنانا نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایران کے "تخت و تاج" کو بھی "قومی" بنانا چاہتا ہے ــــ یعنی اس کی کوشش یہ ہے کہ ایران کی چھ ہزار سالہ شہنشاہیت کو ختم کر کے اس پر جمہوریت کی نئی عمارت قایم کر دے[1] ــــ اس مقصد کے حصول کے لئے اُسے کافی پیچیدہ راہ اختیار کرنا پڑی - تیل کے مسئلہ میں اُسکی سرگرمیوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ وہ اپنے حقیقی ہدف کی راہ میں ایران کے طول و عرض میں

---

[1] یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب ہے کہ اکثر خارجی و ایرانی اشخاص جو مصدقی دورِ حکومت کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے رہے ہیں اس نظریہ کے موافق نہیں ہیں - ان کا خیال ہے کہ مصدق کی کوشش یہ تھی کہ وہ رفتہ رفتہ شاہ کے وسیع اختیارات کو محدود کر کے اُسے صرف ایک دستوری بادشاہ رہنے پر مجبور کر دے اور بس ــــ لیکن ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کا خیال یہ ہے کہ مصدق شخصی نظام حکومت کی جگہ جمہوری نظام حکومت کا خواہشمند تھا - کیونکہ مصدق ہمیشہ سے شاہ اور دربار کو انگریزوں کا طرفدار اور ایران کے قومی مفاد کے خلاف مغربی سیاست کا دمساز سمجھتا تھا - اس کے علاوہ شاہی دربار کے بے شمار تشریفاتی محکموں، اداروں اور شاہی خاندان کے محکموں کے انتظام پر جو کثیر قومی دولت خرچ ہوتی ہے وہ بھی مصدق کو پسند نہ تھی - سرکاری اعداد و شمار کے مطابق فقط "دربار" کا سالانہ بجٹ چالیس ملین تومان یعنی چار کرور روپے ہے - جس میں شاہپوروں اور شاہ دُختوں (شہزادوں اور شہزادیوں) کے محلوں کے انتظام کا خرچ بھی شامل ہے ــــ اب رہا یہ سوال کہ ایران کو جمہوری بنانے کا خیال اُس کے ذہن میں شروع ہی سے تھا یا بعد میں اپنی بڑھتی ہوئی محبوبیت و اثر کو دیکھ کر اُسے یہ خیال پیدا ہوا، اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے - گمان غالب یہ ہے کہ یہ خیال بعد میں پیدا ہوا - یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کے مشیروں نے اس فکر کا تخم اس کے دماغ میں ڈالا ہو ــــ بہر حال حقیقت جو کچھ بھی ہو، اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مصدق تیل کی لڑائی سے فایدہ اُٹھا کر شاہ کے اختیارات ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتا تھا ــــ لیکن کون جانتا ہے کہ شاہ کی اہمیت کو عوام کی نگاہ میں اس طرح گرا دینے کے بعد مصدق کا دوسرا قدم کیا ہوتا ــــ ایران کے عوام صدیوں سے اپنے شاہ کو طاقت، شکوہ، بزرگی اور عظمت کا مرکز سمجھتے آئے ہیں ــــ خصوصاً قریوں، قصبوں اور دیہاتوں کے رہنے والوں کے نزدیک تو شاہ شاہنشاہ ہے، یعنی "شاہوں کا شاہ" اُس کی حیثیت اُن کی نگاہوں میں خدیو زماں اور مالک الرقاب کی ہے - اگر اولاد نہیں ہوتی تو اُسکی وجہ یہ ہے کہ شاہ کی نگاہیں پھری ہوئی ہیں - اگر قرض ادا نہیں ہوتا تو اُس کا سبب شاہ کی ناراضگی ہے - اگر فصل اچھی نہیں ہوئی تو اُسکی وجہ بھی شاہ کی بے رخی ہی سمجھی جاتی ہے ــــ یہاں تک کہ اگر گائے نے دودھ کم دیا یا مرغی نے بچے کم نکالے تو کہا جاتا ہے کہ "لطف شاہ کم شدہ" یعنی بادشاہ کی عنایتیں اور مہربانیاں کم ہو گئی ہیں۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷ پر ملاحظہ فرمائیے)

سب سے بڑا خطرہ انگریزوں کے وجود کو سمجھ رہا تھا۔

جن لوگوں کو مصدق سے ملنے اور متعدد بار ایرانی معاملات پر اس سے باتیں کرنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ اُسکے ذہن میں یہ بات جمی ہوئی تھی کہ اگر انگریز ایران میں باقی رہے تو وہ شاہ اور "دربار" کے خلاف اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا چنانچہ جب تیل کی صنعت کو زبردستی قومی بنائے جانے کے بعد ایران اور برطانیہ کے درمیان سمجھوتہ کی بات چیت شروع ہوئی تو اس گفتگو کے دوران میں اُس نے جو سخت اور غیر صلحجویانہ رویہ اختیار کیا وہ ساری دُنیا کے سیاست دانوں کے لئے باعث حیرت تھا۔ یہ تو دنیا سمجھ رہی تھی کہ مصدق انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا کر چھوڑے گا اور انگریز بین الاقوامی سیاست کے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر ایران کے خلاف کوئی جارحانہ قدم نہیں اُٹھا سکیں گے —— لیکن یہ بات کہ ڈاکٹر مصدق بجز اپنی عائد کردہ شرائط کے اور کسی دوسری قیمت پر انگریزوں سے صلح کرنے پر راضی نہ ہوگا، شاید دُنیا کے بڑے سے بڑے سیاست داں اور مدبر کے علم میں بھی یہ چیز نہ تھی۔

انگریز بُری طرح پھنسے ہوئے تھے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ تمام مشرق وسطیٰ میں ایران سا معمولی ملک اُن کے خلاف کمر باندھ کر کھڑا ہو جائے گا اور ان کے سیاسی حشم و دبدبہ کو اس حقارت کے ساتھ چیلنج کرے گا وہ تیل کی اُلجھتی ہوئی گتھی کو سلجھانے اور مصدق جیسے بلائے بے درماں کے چنگل سے نجات پانے کے لئے بہ اکراہ بڑی سی بڑی رعایت کرنے کو آمادہ تھے —— مگر مصدق کے تمام شرائط کو بے کم و کاست مان لینا اُن کے بس کی بات نہ تھی برطانیہ کی مشکلات یہ تھیں کہ اگر وہ ایرانی تیل کے متعلق ڈاکٹر مصدق کی شرط قبول کر لیتا، یعنی یہ کہ انگریز تیل کے خریدار اور ملازم کی حیثیت سے تو قبول کئے جا سکتے ہیں مگر شریک کار کی حیثیت سے نہیں —— تو اس کا اثر عراق اور خلیج فارس کے ان منطقوں پر نہایت بُرا پڑتا جو برطانیہ کے کنٹرول میں ہیں۔ ان مقامات پر برطانیہ صرف تیل کا حصہ دار نہیں بلکہ وہاں کی داخلی سیاست کا مالک و مختار بھی ہے۔ وہاں اُس کی فوجیں ہیں، اُس کے ہوائی اڈے ہیں۔ ایران میں جھکنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ حکومتیں بھی سر اُٹھاتیں اور ان علاقوں میں اُس کی سیاست اور تجارت دونوں خطرہ میں پڑ جاتی —— انگریز یہ کسی طرح برداشت نہ کر سکتے تھے۔ مصدق کے سامنے یہ تمام باتیں تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ انگریز تنگ آکر نہ جنگ پر اُتر آ سکتے ہیں نہ اُس کی تمام شرطوں کو بے چون و چرا قبول کر لینا اُن کے امکان میں ہے۔ غرض ایک طرف تو اُس نے انگریزوں سے زیادہ گھبرائے ہوئے ملک، امریکہ کے ذریعہ شاید دنیا کو دکھلانے کے لئے، معمولی گفت و شنید کا دروازہ کھلا رکھا۔ دوسری طرف سے اُن پر طرح طرح کے فشار ڈالنے شروع کئے۔

انگریزی قنصل خانوں کا اخراج

مصدق آبادان سے تیل کے انگریز ماہروں کو، جن کی تعداد دو ہزار سے کچھ اوپر تھی، ایران سے باہر کر ہی چکا تھا، اب اُس نے اپنی توجہ اُن برطانوی اداروں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۶) — اس لئے ایران کے عوام ایک قانونی شاہ یا بعبارت دیگر ایک "مجبور اور محدود" بادشاہ کا تصور نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر یہی عوام یہ دیکھتے کہ اُن کا شاہ مجبور محض ہے اور ظل اللہ اور ید اللہ کے القاب کوئی مفہوم نہیں رکھتے تو پھر کسی مضبوط شخصیت کے لئے ایسے "کھلونہ اور مصنوعی" قسم کے شاہ کو اُٹھا پھینکنا کوئی مشکل بات نہ ہوتی۔ بہرحال یہ اختلاف کہ مصدق کا رجحان ایران کو جمہوری بنانے کی طرف تھا یا یہ کہ وہ شاہ کے اختیارات کم کر کے اُسے محض ایک قانونی بادشاہ بنائے رکھنا چاہتا تھا، مسئلہ کے بنیادی پہلو پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالتا۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ کم و بیش ایک ہی نکلتا، یعنی یہ کہ ایران اگر مستبد نہیں تو شخصی حکومت کی فاسد فضا سے باہر نکل کر مستعدی سے جمہوری حکومت کی تازہ اور حیات پرور ہوا میں سانس لینا شروع کر دیتا اور بلاشبہ مصدق کی ساری سیاسی مساعی کا آخری مقصد یہی معلوم ہوتا ہے۔

اور دفاتر کی طرف مبذول کی جو ایران کے مشہور اور ممتاز صوبوں میں "سیاسی، ثقافتی اور تعلیمی" فرائض انجام دے رہے تھے ۔ شیراز ۔ اصفہان ۔ تبریز ۔ مشہد ۔ خرمشہر جیسے صوبوں میں بڑے بڑے انگریزی قنصل خانے اور مشنری اسکول کام کر رہے تھے ۔ برطانوی مفاد کے علاوہ برطانوی ہند کے سیاسی اور تجارتی مفاد کی ذمہ داری بھی انھیں قنصل خانوں کے سپرد تھی ۔ ہندوستان و پاکستان کے آزاد ہو جانے کے بعد یہ سلسلہ اُسی طرح قایم تھا ۔

سالہا سال سے یہ قنصل خانے بڑے کر و فر کے ساتھ ان صوبوں میں جمے ہوئے تھے ۔ خود ایرانیوں کے قول کے مطابق ان علاقوں کی حکمرانی در اصل انھیں قنصل خانوں کے ہاتھوں میں تھی ۔ ایرانی گورنر محض دکھاوے کے لئے رکھے جاتے ۔ قنصل خانوں کے احکامات سے سرتابی کی وہ جرأت نہیں کر سکتے تھے ۔ بیشتر گورنروں کا انتخاب و تقرر انگریزی سفیر ہی کی ایما اور پسند سے ہوا کرتا تھا ۔ جس طرح ہندوستانی ریاستوں کا حقیقی حکمراں "ریذیڈنٹ" ہوا کرتا تھا، وہی حال کم و بیش ایران میں تھا، چنانچہ طہران کے ایک روزانہ اخبار کیہان کے بقول ایک شیرازی جوان کو صرف اس "گستاخی" پر بے شمار کوڑے لگائے گئے کہ وہ قنصل خانے کے کسی افسر کی کُتیا کو وہ مار بیٹھا تھا ـــــ!

دفعتاً ۱۱ر جنوری ۱۹۵۲ء کو ایرانی حکومت نے برطانوی سفارت کو یہ نوٹس دیدیا کہ ایران کے طول و عرض میں جہاں جہاں قنصل خانے اور دیگر ثقافتی ادارے کام کر رہے ہیں وہ سب کے سب دس روز کے اندر بند کر دئے جائیں ۔ ان دفاتر پر ملک کے داخلی امور میں مداخلت کرنے کا الزام لگایا گیا اور کہا گیا کہ یہ قنصل خانے نہیں بلکہ جاسوسی کے جال ہیں ان قنصل خانوں کو بند کرنے کے دو اور سبب بھی بتلائے گئے :- ایک یہ کہ سیاسی اور کلچرل ادارے متقابل ([illegible]) اصول پر قایم ہوا کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ایسے ادارے وہاں قایم کئے جاتے ہیں جہاں کسی ملک کے ہمقوم باشندے تجارت وغیرہ کے سلسلے میں زندگی بسر کیا کرتے ہیں ۔ جہاں تک اس معاملہ میں ایران و برطانیہ کا تعلق ہے دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی موجود نہیں ـــ برطانیہ کے کسی صوبہ میں ایران کا کوئی قنصل خانہ نہیں، ایران کے کسی صوبہ میں، جہاں جہاں انگریزی قنصل خانے کام کر رہے ہیں، ایک انگریز بھی نہیں رہتا ۔ ایسی صورت میں ان سیاسی اداروں کے قایم رہنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی ـــ رہا سوال ہندوستان اور پاکستان کے مفاد کی نگہداری کا تو اب خیر سے یہ دونوں ممالک آزاد ہیں اور اپنے اپنے قنصل خانے جسوقت چاہیں ان صوبوں میں کھول سکتے ہیں ـــ اس صریح و صاف نوٹس کے باوجود برطانوی سفارت نے ڈاکٹر مصدق کو اس خیال سے ہٹانے کی انتہائی کوششیں کیں، مگر کوئی اثر نہ ہوا ۔ مصدق کا جواب یہ تھا کہ یہ فیصلہ ساری کابینہ کا متفقہ فیصلہ ہے وہ انفرادی طور پر اس فیصلہ کے رد کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا ۔ اس سلسلہ میں برطانوی سفیر شاہ سے بھی ملا ۔ مگر خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا ۔ آخر ۲۱ر جنوری ۱۹۵۲ء کو تمام انگریزی قونصل خانے اور دیگر ثقافتی ادارے بند کر دئے گئے اور اُن کے عملہ کو ایران چھوڑ دینا پڑا ۔

تمام ایران میں اس "بے نظیر قومی کامیابی" پر خوشیاں منائی گئیں ۔ طہران کے گلی کوچوں میں چراغاں کئے گئے ۔ مسرت کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ بس چلانے والے ٹکٹوں کے لئے اصرار نہیں کرتے تھے، پستہ و بادام بیچنے والے ۔ گاہکوں کو دو چار دس دانے ہنس ہنسکر زیادہ دے رہے تھے ۔ آیت اللہ کاشانی کے حکم سے ۲۲ر جنوری کو سارے ایران میں تعطیل عمومی منائی گئی ۔

انگریز دوست ایرانیوں کے علاوہ خارجی سفارت خانوں کے لوگ بھی انگریز افسروں سے آنکھ چرانے لگے تھے ۔ پارٹیوں کے لوگ انگریزوں سے کترا کر گزر جاتے کہ مبادا حکومت کے نزدیک اُن کا شمار انگریزوں کے دوستوں میں ہونے لگے ـــ الغرض برطانوی سفارت خانہ کو اس دم گھونٹنے والی فضا میں سانس لینا دشوار ہو رہا تھا ۔ اور آخر کار برطانوی سفیر سر فرانسس شیپرڈ ۲۸ر جنوری ۱۹۵۲ء کو ایران سے کسی اور جگہ بھیجدیا گیا ۔

(باقی)

(نوٹ) اس مقالہ کا باقی حصہ تمام و کمال آیندہ مہینہ شایع ہو ـــ

ایران دوست (مقیم طہران)

غزلیات حالی کا ایک جائزہ

مسدس، مقدمۂ شعر و شاعری اور یادگار غالب کے مصنف حالی کو کون نہیں جانتا۔ حالی اُردو ادب میں ایک عجیب نیرنگی کے مظہر ہیں۔ انھوں نے مسدس قوم کے لئے لکھا، مقدمہ ادب کے لئے اور غزلیں عاشقوں کے لئے۔

مقدمہ حالی کا لازوال کارنامہ ہے وہ آج بھی اُردو تنقید کا پہلا سانچہ مانا جاتا ہے۔ جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اسی طرح ہر تنقیدی کتاب میں بنیادی طور پر اسی کا فیض نظر آتا ہے۔ کلیم الدین نے اُردو تنقید پر ایک نظر ڈالتے ہوئے حالی کی مجہولیت عیاں کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اگر آپ ان کی اسی کتاب میں سے حالی کی عبارتیں اور ان کے نظریات خارج کر دیں تو چند بے ربط عبارتوں کے سوا اور کچھ نہ بچے گا۔ آج جو ناقد کچھ کہنا چاہتا ہے وہ حالی کا نام لے کر ابتدا کرتا ہے۔ آج اُردو میں فن تنقید کہیں بڑھ چکا ہے، لیکن حالی کے لکھے ہوئے مقدمہ کو پڑھکر ایسا معلوم ہوتا ہے اب تک جو کچھ پڑھا یہ سب اس نقش اولیں ہی کا فیض ہے۔ ان کی عبارت کی سنجیدگی، اعتراضات کی متانت۔ تعریف کی معقولیت اور اندازِ بیان کا سلجھاؤ، یہ وہ چیزیں ہیں جن سے آج کے بہت سے ناقد محروم ہیں۔

جب مسدس عوام کے ہاتھ میں پہونچا تو اس وقت کے عام ملکی حالات کے سبب سے اس کی دھوم مچ گئی۔ دیوان حالی میں کل ۱۱۳ غزلیں ہیں۔ جن میں قدیم و جدید کا بہ آسانی امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ ان میں جدید غزلوں کی اکثریت ہے دیوان کی ترتیب قدیم رسم کے مطابق ردیف وار ہے۔ حالی نے اس رسم کی ادائی میں بزرگوں کی سنت دیرینہ کو ملحوظ رکھا کیونکہ کوئی حرف ایسا نہیں جس میں غزل موجود نہ ہو۔ ان غزلیات میں سے ممکن ہے کوئی غزل کسی مشاعرے کے لئے یا کسی کی فرمایش پر کہی گئی ہو۔ لیکن ایسی شاید دو تین غزلیں ہی ہوں گی۔

ان کے علاوہ کافی تعداد ایسی غزلوں کی ہے۔ جن میں مولانا نے بہ خیال خویش زمانے اور عمر کی رعایت پیش نظر رکھی ہے۔ ان غزلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں لہجہ کے اعتبار سے سنجیدگی و متانت ہے۔ مضامین میں پند و وعظ کی چاشنی ہو لیکن کہیں کہیں طرز ادا میں شوخی و بے ساختگی بھی ہے۔ ایسے چند اشعار دیکھئے:-

ہے وقت رحیل اور وہی عشرت کے ہیں ساماں　　آخر ہوئی رات اور ابھی شام ہے گویا
معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا　　تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا
خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا　　کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں　　گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں
یا کھینچ لا کے دیر سے رندوں کو اہلِ وعظ　　یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مغاں رہے

ان اشعار میں شعریت نہ سہی، لیکن استادانہ پختگی اور ایک قسم کی کرشمہ کاری ضرور ہے۔ اس میں قوم کے لئے ناصحانہ پیغام ہے۔ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی نصیحتیں ہیں اور وہ سارے مصلحانہ خیالات ہیں جو ایک قومی ہمدرد کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ حالی میں غزل کہنے کی بہترین صلاحیت تھی۔ جس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جو غزلیں انھوں نے صحیح رنگ تغزل سے

ہٹ کر بھی ہیں۔ ان میں بھی شعری چستی اور ایک ہلکی سی تاثیر ضرور ہے۔ حالی کے مجموعہ غزلیات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) وہ حصّہ جو ان کے رنگِ تغزل کا مظہر ہے۔ (۲) وہ غزلیں جن میں تغزل کے بجائے قومی تاثرات غالب ہیں مثلاً :۔

ہوگی نہ قدرِ جان کی قرباں کئے بغیر ۔۔۔ دام اُٹھیں گے نہ جنس کے ارزاں کئے بغیر
بگڑی سی ہوئی بہت ہے کچھ اس باغ کی ہوا ۔۔۔ یہ باغ کو رہے گی نہ ویراں کئے بغیر
گو مے ہے تند و تلخ پہ ساقی ہے دلربا ۔۔۔ اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کئے بغیر
تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے دہر کی ۔۔۔ چھوڑے گا وقت انھیں نہ مسلماں کئے بغیر
حالی کٹے گا کاٹنے ہی سے یہ بے ستوں ۔۔۔ حل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آساں کئے بغیر

ایسی غزلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اصلاحی پہلو کے بجائے مرثیت کا رنگ نمایاں ہے۔ قوم کو مخاطب کیا ہے لیکن رفارمر کی حیثیت سے نہیں۔ بلکہ ایک داستانِ پارینہ دہرانے والے کی حیثیت سے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی شخص دلوں میں گداز پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اب ان کا دل نہایت نرم تھا اور اسی نرم دل میں قوم کی تباہ حالی نے سوز و گداز کی دولت بھر دی تھی اس لئے ایسے مواقع پر ان کے ہر لفظ سے وہ درد ٹپکتا تھا جو صداقت کی دلیل ہوتا ہے۔

(۳) تیسرا حصّہ اس کلام پر مشتمل ہے جس میں حالی یکسر ناصح کا روپ بھر کر سامنے آتے ہیں، گو ان غزلوں میں کوئی اثر و کیف نہیں۔ پھر بھی حالی کے دل کی آواز ہے۔ یہ غزلیں عموماً مسلسل ہیں جن میں شروع سے آخر تک پدرانہ نصیحتیں ملتی ہیں۔ مثلاً :۔

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ ۔۔۔ مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
تکلف علامت ہے بے گانگی کی ۔۔۔ نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ
کرو علم سے اکتسابِ شرافت ۔۔۔ نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ
جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے ۔۔۔ نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم ۔۔۔ پر ہر اک خوبی میں داغ اک عیب کا پاتے ہیں ہم
خوف کا کوئی نشاں ظاہر نہیں افعال میں ۔۔۔ گو کہ دل میں متصل خوفِ خدا پاتے ہیں ہم
کرتے ہیں طاعت تو کچھ خواہاں نمائش کے نہیں ۔۔۔ پر نہ چھپ چھپ کے کرنے میں مزا پاتے ہیں ہم

حالی قوم کا مرثیہ اچھا لکھ سکتے تھے، رجز خوانی یا دل میں گرمی پیدا کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس بات کا ثبوت ایک اور طرح بھی ملتا ہے۔ مسدس کے آخر میں انھوں نے ایک حصّہ ایسا بھی شامل کر دیا ہے جس میں قوم کے دل میں رجائیت اور ولولہ پیدا کرنا چاہا ہے۔ لیکن اس حصّہ کو قبولِ عام حاصل نہیں ہو سکا۔

(۴) چوتھا حصّہ ان غزلیات پر مشتمل ہے جو صرف ردیف وار ترتیب کے سلسلہ میں طیار کی گئیں جو اکثر بے رنگ ہیں۔

اب ان کی غزلیات کا صرف حصّۂ اولیں بچتا ہے جس پر تفصیل سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔ لیکن ان پر کسی تبصرہ سے پہلے ان کے مجموعی کلام کی چند عام خصوصیات بیان کرنا ضروری ہے۔

(۱) ان کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کہیں کہیں روزمرہ اور محاورات کی بہتات ہے۔ بعض بعض غزلیں از مطلع تا مقطع اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اگر صرف انھیں کو پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاعر کے پیشِ نظر صرف روزمرہ کا محاورہ بندی ہے۔ لیکن کلام کا زیادہ حصہ اس سے خالی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض غزلیں انھوں نے خاص طور پر

اس رنگ کا لحاظ رکھتے ہوئے کہی ہیں۔ ایسی غزلوں میں معنی آفرینی یا عام دل کشی کے عناصر نہ سہی لیکن زبان کی حد تک وہ دلکش فرود ہیں۔ مثلاً:۔

بری اور بھلی سب گزر جائے گی — یہ کشتی یونہیں پار اُتر جائے گی
ملے گا نہ گلچیں کو گل کا پتہ — ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا — کوئی دن میں گنگا اُتر جائے گی
ادھر ایک ہم اور زمانہ اُدھر — یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی
بناوٹ کی شیخی نہیں رہتی شیخ — یہ عزت تو جائے گی پر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں — یونہیں عمر ساری گزر جائے گی
سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا — یہی ایک دن کام کر جائے گی

(۲) ان کی غزلوں کے اشعار میں تعقید و سستیٔ بندش کے عیوب بھی ملتے ہیں۔ یہ عیب یا تو ان غزلوں میں زیادہ ہیں جو غیر مستعمل ردیفوں میں کہی گئی ہیں۔ یا ان غزلوں میں جو ان کے دورِ آخر کی اصلاحی شاعری سے متعلق ہیں۔ اسی ضمن میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کی جدید غزلیات میں غیر متناسب الفاظ کا استعمال بھی پایا جاتا ہے۔ وہ نصیحت فروشی میں اس حد تک مستغرق ہوئے کہ شعر کی وہ خوبیاں جن کو انھوں نے مقدمہ میں بالتفصیل لکھا تھا خود فراموش کر بیٹھے مثلاً:۔

نشہ زوردں پہ تھا شاید نہ چھپایا جاتا — شب کو ناہد سے نہ مٹ بھیڑ ہوئی خوب ہوا
رات بھر یاروں کو تجویا عبث — جلوۂ صوفی نہ دکھلایا کوئی
آج ویسا کوئی دے ہم کو دکھا ایک ہی شخص — جگمٹے دیکھے ہیں جن لوگوں کے ان آنکھوں نے
آج ہم شہر میں خوں اپنا ہدر کرتے ہیں — راز دل کی سر بازار خبر کرتے ہیں
یہ گل چینی ہے یا لٹس ہے گلچیں یا ہے قزاقی — نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تونے گلشن میں
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے کاہش نہانی — صبر و سکوں سے یہ بھی ہم کو نبیڑنے دے

(۳) ان کے متعدد اشعار ایسے ہیں جن میں دونوں مصرعہ برابر کے نہیں اور کہیں تناسب بیان مفقود ہوگیا۔

حالی کی غزلیں خواہ وہ قدیم ہوں خواہ جدید عامیانہ اور مبتذل اشعار سے پاک ہیں۔ حالی، غالب کے شاگرد تھے اور شیفتہ کے جلیس۔ نیز وہ واقعتاً تغزل کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ درد و سوز جو غزل کی جان ہے۔ ان کے دل میں اس دولت کی فراوانی تھی۔ اسی لئے وہ جب تک دل کی باتیں کہتے رہے حقیقی غزل گو رہے اور جب ناصح مشفق بنے تو نصیحت آمیز باتیں کہنے لگے اور ان دونوں میں ابتذال کی گنجائش کہاں۔ ان کی فطری متانت و سنجیدگی بھی ایسے مضامین کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔

غزل کا حقیقی محور حُسن و عشق ہے۔ جس میں زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کے دوسرے موضوعات بھی شامل ہوتے گئے۔ حالی نے اس دور میں شعر کہنا شروع کیا جب غالب و مومن غزل کے اندر دو مختلف راستے متعین کر چکے تھے۔ یہ راستے اس سے پہلے بھی تھے لیکن ان کو اس قطعیت کے ساتھ کسی نے مسلسل نہیں پیش کیا تھا۔ اس دور میں شیفتہ اپنے سنجیدہ و نیم متصوفانہ تغزل کے ساتھ اردو غزل کے لہجے کو سنجیدگی و متانت بخش رہے تھے اور ذوق اور ان کے استاد شاہ نصیر داد زباں دانی دے رہے تھے، گویا اس وقت شاہ جہاں آباد کی فضائیں غزل کے مختلف اسالیب سے معمور تھیں۔ ایسے میں حالی بھی سامنے آئے۔ وہ روایتاً غالب کے شاگرد ہوئے۔ لیکن ان کو قربت زیادہ تر شیفتہ سے رہی۔ مومن سے انکو اتنی ہی عقیدت تھی جتنی ایک استاد سے دوسروں کو ہوسکتی ہے۔ مگر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان پر شیفتہ و مومن کے اثرات پڑے اور غالب سے شاگردی کے باوجود کچھ دور سے رہے۔ یہ بات بظاہر باعثِ استعجاب ہے۔ لیکن یہی بات درحقیقت ان کے مذاق سلیم کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ حالی کے دل میں جو

فطری گداز تھا اس کی نسبت سے شیفتہ و مومن ہی ان کو متاثر کر سکتے تھے۔

ہر چند مومن کی شاعری دل کی آواز نہیں۔ ان کی شاعری میں داخلی عناصر کم اور بہت کم ملتے ہیں۔ لیکن عشق و تعشق کے وہ مرتعش احساسات ضرور ملتے ہیں جو عشق مجازی کا حاصل ہوتے ہیں۔ حالی صوفیوں سے زیادہ تقدس رکھتے تھے۔ لیکن اس کے علاوہ انھیں تصوف سے کوئی عملی یا ذہنی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ تو محبت کے ان جذبات کی ترجمانی کرتے تھے، جو واقعتاً محبت کا نتیجہ ہوتے ہیں اور اگر محبت اس عالم آب و گل کے کسی فرد سے متعلق ہو تو اس میں ایک منزل وہ ضرور آتی ہے، جو مومن کی شاعری کا محور ہے۔ اسی لئے ان پر مومن کا اثر نمایاں ہے۔

حالی کی غزلیات قدیم و جدید دونوں کا اگر تفصیلی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اس مجموعہ میں حمد و نعت کی ۲ غزلوں (یا نظموں) کو چھوڑ کر اور کوئی ایسی غزل نہیں جس میں اس طرف کوئی اشارہ ہو۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے رسم زمانہ کے مطابق رسمی طور پر بھی ہمہ اوست یا غیب و شہود کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں جب واقعی "غزل" کہتے تھے تو ان کو اس آفاقی صداقت سے دست کش ہونے کی فرصت نہیں ملی۔ وہ اس زمانہ میں ان جذبات سے سرشار تھے جو غزل کے خلاق ہیں۔ پھر جب وہ اس منزل سے نکلے تو اصلاح قوم کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ یہ وہ منزل تھی جہاں پہونچ کر آدمی کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔ اس لئے ان کو صوفی بننے یا ایسے شعر کہنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ انھوں نے ایک قطعے میں اپنے رنگ شاعری کی نسبت خود تفصیل پیش کی ہے۔

ہوئی ریحانِ جوانی کی بہار آخر حیف   طبع رنگیں تھی مئے عشق سے جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں   جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ اُمنگ   سر ہے سودا تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھئے تو کیا لکھئے غزل میں آخر   نہ رہی چیز وہ مضمون سمجھانے والی

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل کو بنیادی طور پر دل کی باتیں بیان کرنے کا وسیلہ سمجھتے تھے اور جب تک وہ جوان رہے حکایت دل ہی بیان کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شاعر کو ماوراء سرحد ادراک کی ان در پردہ حقیقتوں سے کیا کام ہو سکتا ہے جن کو صرف سوچا جا سکتا ہے ——— دیکھا نہیں جا سکتا۔ انھوں نے اس خیال کو ایک شعر میں نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ ان کا شعر ہے :-

ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوق دید بھی   جائے گا دیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں

یہ ذوق دید کا لپکا اور اس سے پیدا ہونے والی کیفیات ہی جان غزل ہیں۔ حالی انھیں سانس لیتی ہوئی حقیقتوں کو پیش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر غالب و شیفتہ کے اس کلام کا کوئی اثر نہیں پڑ سکا جو ہلکی سی متصوفانہ کیفیت رکھتا ہے۔

اسی طرح ان کے یہاں وہ فلسفیانہ دقایق اور بلند تصورات بھی نہیں جو دوسرے بلند مرتبت شعرا کی شاعری کا سرمایہ ہیں۔ جس طرح ان کے یہاں تصوف نہیں۔ اسی طرح ان کے کلام میں فلسفہ کے وہ عام موضوعات بھی شامل نہ ہو سکے جو فارسی اردو شاعری کے بڑے حصہ پر محیط ہیں۔ اور جنھوں نے واقعتاً غزل کے لہجے کو شائستگی و بلندی عطا کی ہے۔

غرضکہ کلام حالی کا (میری مراد ان کی صحیح غزلوں سے ہے) جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ موضوعات شعری کے اعتبار سے مندرجۂ ذیل عناصر ان کے یہاں موجود نہیں۔

فلسفہ، تصوف، معاملہ بندی، خمریات، محبوب کا نیم زنانہ نیم مردانہ تصور، اور عام اخلاقی باتیں، مثلاً خودداری بلند ہمتی وغیرہ۔

مذکورۂ بالا اجزاء وہ ہیں جن پر فارسی و اُردو غزل کی بنیاد قایم ہے۔ ایک پڑھنے والے کے دل میں قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوگا کہ ان بلند موضوعات شریفہ کے بغیر ان کے یہاں کیا ملے گا۔ لیکن نہیں ان سب کے بجائے نفس محبت و کیفیات محبت کی وہ ساری باتیں ان کے یہاں موجود ہیں جن کی مدد سے ایک داستان مرتب کی جا سکے۔

(۱) حالی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں طرز ادا میں کوئی پیچیدگی نہیں ملتی وہ نہایت سادگی و صفائی سے بات کہتے ہیں وہ غزل کی زبان کا ہر قدم پر خیال رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں ایک بے ساختگی و گداز پیدا ہوگیا ہے ایسے اشعار کی بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں نفس مفہوم فطری ہے، وہاں انداز بیان میں بھی سادگی کے باعث شعریت موجود ہے، ناممکن ہے کہ پڑھنے والا ان سے متاثر نہ ہو۔ طرز ادا کی سادگی، مفہوم کی واقعیت اور انداز بیان میں ایک والہانہ کیفیت اس طرح ملتی ہے کہ دل بے حد متاثر ہوتا ہے۔ آیندہ مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔

(۲) حالی کے یہاں بہت سے اشعار میں وہ کیفیت ملتی ہے جسے ہم نفسیاتِ محبت کہہ سکتے ہیں۔ وہ بات اسی انداز سے کہتے ہیں کہ اس میں صداقت و واقعیت کے ساتھ ساتھ ایک ایسا پہلو بھی ہوتا ہے جو نفسیاتی اعتبار سے ہماری توجہ کو اس طرف منعطف کر دیتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس دیار کے اور اس کے مراحل کے نشیب و فراز اور رسم و راہ سے پورا پورا واقف ہے۔ اور کچھ ایسی باتیں بیان کر رہا ہے جن کی سچائی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ حالی کے ایسے اشعار خاص درجہ رکھتے ہیں۔ ان اشعار میں انھوں نے محبت و کاروبار محبت کے مختلف پہلو پیش کئے ہیں اور ہر پہلو اس معصومانہ صداقت اور سلجھی ہوئی واقعیت کے ساتھ کہ پڑھتے ہی اک کیف طاری ہو جاتا ہے۔

راہِ محبت میں قدم رکھ کر جو شخص مشکلات سے گھبرا جائے وہ کبھی محبت کا کیف نہیں حاصل کر سکتا۔ محبت اک کیف مسلسل ہے۔ لیکن اس وقت جبکہ دل میں اتنا گداز پیدا ہو جائے کہ زخم جگر زخم جگر نہ رہے۔ دل کا جزو بن جائے۔ اس مفہوم کو کس سادگی سے ادا کیا ہے:-

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق، رکھی ہے آج لذتِ زخم جگر کہاں

استیلائے عشق عاشق کو کسی دوسری جانب متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ ایک عاشق کی نظر میں کائنات کے حسین ترین مظاہر ہیچ ہوتے ہیں، یہ دنیائے شاعری کا عام خیال ہے۔ فارسی و اُردو میں اس پر خوب خوب زورِ طبع صرف کیا گیا ہے لیکن حالی نے اپنی سادہ بیانی سے ایک بالکل نیا پہلو پیش کیا ہے:-

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

قابلِ غور بات یہ ہے کہ شاعر نے محبوب کو سب سے بہتر کہہ کر ظاہری مبالغہ کا اظہار نہیں کیا، وہ کہتا ہے کہ ممکن ہے دوسرے حسین تم جیسے ہوں، لیکن تم تو نہیں ہو سکتے۔ اس کے ساتھ ساتھ پہلے مصرعہ کا یہ ٹکڑا "وہ ہے بات ہی کچھ اور" اتنا برمحل ہے کہ تعریف نہیں کی جا سکتی۔ حالی کے اس شعر اور دوسروں کے ایسے اشعار میں یہی فرق ہے کہ حالی نے اپنے محبوب کو سب سے بہتر نہیں کہا۔ وہ تو صرف یہ کہتا ہے کہ جو بات تم میں ہے وہ دوسرے میں نہیں مل سکتی کتنی صداقت ہے اور کتنی معصومیت۔ اسی غزل کا ایک شعر ہے:-

ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ عشق کی جی چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

دوسرے مصرعہ کی سادہ پرکار کیفیت قابلِ داد ہے، کبھی کبھی محب صادق بھی گھبرا کر ترکِ عشق کی دعا مانگنے لگتا ہے لیکن چونکہ یہ دل کی سچی آواز نہیں اس لئے دُعا قبول نہیں ہوتی۔ دیکھئے شعر میں کوئی معنی آفرینی نہیں۔ انداز بیان میں "چھل بل" نہیں، بس ایک سادہ سا پہلو ایسا ہے جو تاثیر کی جان ہے:-

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم   ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

دوسرے مصرعہ میں صرف ایک لفظ "بھی" نے شعر میں ایک کیفیت پیدا کر دی۔ کھل کر وفا پرستی کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن "جی چرانے" کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ انتہائے وفا پرستی کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔
جب تک انسان کو مسرتوں سے کسی حد تک بھی تعلق رہتا ہے، اس وقت تک مصیبتیں زیادہ متاثر کرتی ہیں اس بات کو کتایہ کے طور پر کس خوبی سے ادا کیا ہے:۔

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح   لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

اسی غزل کا مقطع ہے۔ جس کی بے ساختگی قابلِ داد ہے:۔

بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر   ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں،

عالمِ ہجر قیامت آخریں ہوتا ہے، لیکن یہی اضطرابِ بے پایاں کچھ دنوں کے بعد کم ہوتے ہوتے یادِ ماضی تک محدود ہو جاتا ہے۔ دل اس وقت بھی پر خون ہوتا ہے۔ لیکن آنکھیں خون آلود نہیں ہوتیں۔ اس کیفیت کو کس واقعیت کے ساتھ بیان کیا ہے:۔

ٹھہرتے ٹھہرتے دل یونہی ٹھہر جائے گا   بات جو آج ہے وہ کل غمِ ہجراں میں نہیں

دوسرے مصرعہ کی سادہ نگاری قابلِ تحسین ہے۔ کتنی سچی بات ہے۔ جو بات آج ہے وہ کل نہیں رہے گی۔ اس سے زیادہ سادہ و پر اثر انداز کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اسی بات کو اسی غزل کے ایک شعر میں اس سے بھی زیادہ اچھوتے انداز کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بات کو اسی غزل کے ایک شعر میں اس سے بھی زیادہ اچھوتے انداز سے پیش کیا ہے ملاحظہ ہو:۔

بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ   اب وہ اگلی سی درازیِ شبِ ہجراں میں نہیں

ان اشعار میں حالیؔ کی دونوں خصوصیتیں ہیں۔ جو حقیقی تغزل کا سرمایہ ہیں۔ اور جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اسی قبیل کے چند اور اشعار دیکھئے:۔

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام   گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم   کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی   پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج
آنے لگا جب اس کی تمنا میں کچھ مزا   کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب
بات ان کو بات بات پہ سو سو دئے جواب   مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا
عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید   خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا
ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں   اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں،
کوئی دل سوز ہو تو کیجے بیاں   سرسری دل کی واردات نہیں
دل رہا پائے بندِ الفتِ دام   تھی عبث آرزو رہائی کی،
کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں   مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

اب تک جو اشعار نقل کئے گئے ان میں سے بیشتر میں شیفتہ کی جھلک صاف صاف نمایاں ہے۔

(۲) کہا جاتا ہے کہ مومنؔ اپنے رنگِ خاص کے خاتم تھے۔ بات بڑی حد تک ٹھیک ہے۔ لیکن حالیؔ کے کلام کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اس میں ایک خاصہ حصہ ایسے اشعار کا ملتا ہے۔ جس پر براہِ راست مومنؔ کا پرتو نظر آتا ہے۔ مومنؔ کی تیغ

خصوصیتیں مشہور ہیں - ایہام، لہجہ میں ایک خاص قسم کا بانکپن، اور ان کا تصورِ عشق محبوب کے وجود بازاری ہونے کے انکا بیان عامیانہ نہیں - ان میں سے اول الذکر خصوصیت حالی کے یہاں موجود ہے اور اس خوبی کے ساتھ کہ اگر کسی کو یہ نہ معلوم ہو کہ غالب کے شاگرد تھے، تو وہ ان کو مومن کا تلمیذِ رشید سمجھے گا - ذیل میں ان کے کچھ ایسے اشعار پیش کرتا ہوں - جن پر وہی کیفیت چھائی ہوئی ہے - جیسے کوئی سعادت مند شاگرد اپنے استاد کے رنگ کو فیضِ باطنی سمجھ کر اپنے اندر جذب کر رہا ہے

سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک، عذاب ہے
تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا

مدعا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تم نے کیوں، وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

مجھ میں وہ تاب ضبطِ شکایت کہاں ہے اب
چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منھ میں زباں ہے اب

درد فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شاداں سے ہم

ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پہ
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے
شکوے کو نے گیا ہے وہ بیدادفن کہاں

کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہولیں
دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں

تھا یہاں دل میں طعنِ وصلِ عدو
عذر ان کی زباں پہ آنے لگے

جان بچتی نظر نہیں آتی
غیر اُلفت بہت جتانے لگے

عدو سے بات محفل میں نہ کرنی
جو سچ پوچھو تو جائے سوئے ظن ہے

کہتے ہیں طبعِ دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

مانعِ گل گشت ہے بیمِ خزاں
موت کرتی ہے نگہبانی مری

قدرِ نعمت ہے بہ قدرِ انتظار
حشر پر ٹھہری ہے مہمانی مری

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے

غالب کو طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا قیامت معلوم ہوا تھا - لیکن حقیقتاً مومن کا رنگ ایک پل صراط ہے - جس پر چلتے ہوئے ہر قدم پر ابتذال کے جہنم میں گرنے کا ڈر رہتا ہے - مومن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو اس لغزشِ بے اختیار سے محفوظ رکھا ہے - حالی نے مومن کے یہاں سے صرف ان کے اندازِ بیان کا اثر لیا ہے - ان کے یہاں جو شوخی ہے اس سے حالی کا کلام پاک ہے اور یہ ان کی سنجیدہ مزاجی کا براہ راست اثر ہے - ورنہ مومن کے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی ان کی بے پناہ شوخ نگاری سے بچنا بڑا مشکل کام ہے -

(۴) جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے - حالی کے یہاں جام و مینا کی داستان بالکل نہیں اور غالب کی شاگردی کے باوصف ان کی شاعری اس فیض سے محروم رہی - لیکن اس کے بجائے انھوں نے صوفی و زاہد کو اپنے طنزیہ تیروں کا ہدف بنایا ہے اور یہ رنگ ان کی غزلیات کے ایک بڑے حصہ پر چھایا ہوا ہے - یہ رنگ قدیم غزلیات میں بھی ہے اور جدید میں بھی فرق صرف اتنا ہے کہ قدیم غزلیات میں ایسے بیشتر طنز شعریت آمیز ہیں - بلکہ بعض اشعار میں تو یہ طنز بہت چمک اٹھا ہے لیکن جدید

حصہ میں ان کا یہ پہلو بھی اصلاحی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ جس کے باعث ان میں صرف استہزا رہ گیا ہے حالی کی قدیم و جدید غزلیات کے تقریباً بیس فیصدی اشعار زاہد و صوفی کے ذکر سے متعلق ہیں۔

حالی کے یہاں ایسے اشعار دو قسم کے ہیں۔ (۱) وہ اشعار جن میں زاہد پر پھبتی کہی گئی ہے لیکن ایسے اشعار میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس سے طنز کا اصل مقصد حاصل ہو سکے۔ ایسے چند شعر مثلاً نقل کرتا ہوں :-

واعظ کی حجتوں سے قایل تو ہو گئے ہم — کوئی جواب شافی پر اس سے بن نہ آیا
عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم — ہم پہ منہ آئے گا منہ کی کھائے گا
لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ — اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا
دیکھئے شیخ مصور سے کھنچے یا نہ کھنچے — صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

اس رنگ کے اشعار نسبتاً بہت زیادہ ہیں۔

دوسری قسم میں وہ اشعار ہیں جن میں انھوں نے ان بزرگوں پر کسی خاص پہلو سے حملہ کیا ہے۔ اور کوئی ایسی دلکش رنگ پکڑی ہے یا کوئی ایسی بات پیدا کی ہے کہ شعر پڑھ کر ایک لطف آجاتا ہے۔ نیز اس کے ساتھ ساتھ زاہد و صوفی کی حقیقی کمزوری بھی سامنے آجاتی ہے۔ ایسے چند شعر دیکھئے :-

مان لیجے شیخ جو دعوے کرے — اک بزرگ دین کو ہم جھٹلائیں کیا

دوسرے مصرعہ کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ پھر لفظ "بزرگ" نے جو تیزی پیدا کی ہے وہ اس طنز کی جان ہے۔

جھگڑوں میں اہل دین کے حالی پڑیں نہ آپ — قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا
گو مے ہے تند و تلخ پہ ساقی ہے دلربا — اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کئے بغیر
شیخ اللہ رے تیری عیاری — کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز
عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید — جنتی جتنے ہیں سب ہم سے حذر کرتے ہیں

اس طبقہ کی کم عقلی کا جس لطیف انداز میں خاکہ اڑایا ہے۔ وہ دیکھنے کی چیز ہے۔ خصوصاً "جنتی" کا لفظ طنز کا بھرپور وار ہے۔

کہیں افطار کا حیلہ تو نہیں یہ حالی، — آپ اکثر رمضاں ہی میں سفر کرتے ہیں

شعر کی بلاغت ادا دیکھنے کے قابل ہے۔ زاہد کو مخاطب کرنے کے بجائے اپنے آپ کو اس طرح مخاطب کرنا گویا اپنی سرگزشت بیان کی جا رہی ہے، اسی انداز بیان میں جو سچائی ہوتی ہے وہ دوسری طرح ممکن نہیں۔

ہیں فصاحت میں مثل واعظ و حالی دونوں — دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے
ہم بھی آداب شریعت سے تھے آگاہ مگر — نہ ہو برتاؤ میں جو رسم وہ کیا یاد رہے
نہ ملا کوئی غارتِ ایماں — رہ گئی شرم پارسائی کی
گو زن و گور ہیں بچپن سے تارک دنیا — نہایت آپ کی ہے ان کی ابتدائے شیخ

مندرجۂ ذیل شعر دیکھئے۔ زاہد اگر کسی مرد آزاد کو نماز نہ پڑھنے پر سخت سست کہدے تو سمجھتا ہے کہ آج جہاد اکبر کا ثواب حاصل ہو گیا۔ حالانکہ اس فہیم العقل کو یہ نہیں معلوم کہ نفسیاتی طور پر اس طرح بر سر عام سخت و سست کہنے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ پھر وہ شخص اس طاعت گاہ سے بھی بری ہو جاتا ہے۔ اس بات کو کس سادگی سے بیان کیا ہے :-

آ نکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم — تو نے زاہد ہم کو شرمایا عبث

(۵) ان کے کلام میں بہت سی غزلیں مسلسل ہیں۔ لیکن ان میں ایسی ایک غزل بھی نہیں جس میں موضوع اتحاد کی طرح

اپنی کسی داستان کو بیان کیا ہو۔ ان میں سے زیادہ تر غزلیں اصلاحی ہیں۔ صرف تین غزلیں ان کے مصلحانہ مضامین سے علٰحدہ ہیں۔ ایک تو ان کی وہ مشہور غزل جس کا مطلع ہے:-

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز ۔۔۔ دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

یہ غزل دلّی کی بربادی کا دردناک مرثیہ ہے۔ چونکہ بات دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے۔ اس لئے اس میں بےحد رقّت و گداز ہے۔ دوسری دو غزلوں کے یہ مطلعے ہیں:-

دل کو درد آشنا کیا تو نے ۔۔۔ درد دل کو دوا کیا تو نے

اے بہارِ زندگانی الوداع ۔۔۔ اے شباب اے شادمانی الوداع

پہلی غزل درحقیقت حمد میں ہے اور اصولاً اس کو شروع دیوان میں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن غالباً ردیف کی مجبوری سے یہ آخر میں رکھی گئی۔

دوسری غزل جوانی کا مرثیہ ہے۔ وہی جوانی جس کے لئے ایک جگہ حالی نے کہا ہے:-

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت ۔۔۔ پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

اور اس میں شک نہیں کہ یہ غزل خوب ہے۔

(۶) حالی کے یہاں تشبیہات و تعبیرات کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ سیدھے سادے آدمی تھے۔ اسی طرح سادی باتیں کہتے تھے۔ لیکن جہاں جہاں انھوں نے اس صفت کو برتا ہے۔ اس میں کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پیدا ہو گیا ہے ان کے دیوان میں گنتی کے شعر ایسے ملتے ہیں جن میں یہ خوبی ہو۔ لیکن جن چند اشعار میں کوئی تعبیری کیفیت ہے وہ بجائے خود مکمل ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر حسنِ تعبیر کا بڑا ملکہ تھا۔ مگر اس کو انھوں نے برتا نہیں۔ اس سلسلہ میں مندرجۂ ذیل شعر پیش کئے جا سکتے ہیں:-

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام ۔۔۔ گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا ۔۔۔ اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے ۔۔۔ مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ ۔۔۔ ایسے الجھاؤ ترے کاکل پیچاں میں نہیں

ہم نے اول سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک ۔۔۔ ہم سے پوچھے کوئی ہوتی ہے محبت کیسی

مانع گل گشت ہے بیم خزاں ۔۔۔ موت کرتی ہے نگہبانی مری

رشید حسن خاں

روس کا سیاسی فکر و شعور

سر برنارڈ پیر ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ:۔

"روسی قوم کی خصوصیت خاصہ اس کی سوچنے کی عادت ہے، سوچتے رہنا اس کا دلچسپ مشغلہ ہے، روسی کسان اسی لئے نہایت دلچسپ ہستی ہے کہ زندگی کے واقعات جس طرح اس کے سامنے آتے جاتے ہیں، اس کا غور و تفکر اپنے لئے نئی راہیں نکالتا جاتا اور پھر اس کے اظہار و بیان کا طریقہ بھی ڈھونڈھ لیتا ہے، وہ اپنے تیئں اپنے خیالات کے اظہار پر مجبور بھی سمجھتا ہے! روسیوں کا یہ غور و فکر کہیں محدود نہیں ہے اور انکا سوچنا اور بیان کردینا نہایت سچا اور مخلصانہ ہوتا ہے!"

سوویٹ مصنف الیکزی ٹالسٹائی نے کہا ہے کہ "روسی کھائے بغیر بہت دیر تک رہ سکتا ہے مگر کہے بغیر ایک منٹ میں رہ سکتا۔"

چنانچہ آج ہم جس ملک کو سوویٹ یونین کے نام سے جانتے ہیں، اور جو کم و بیش ڈیڑھ کرور مربع میل میں پھیلا ہوا، ہوٹے بڑے بارہ سمندروں کے کنارے چھوتا ہے، یہ ملک روسی عوام ہی کے سوچ بچار کا بنایا ہوا ہے۔

روسی تاریخ بتاتی ہے کہ روس ہر زمانے میں بیرونی حملوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ مگر ان حملوں کی مدافعت اور اپنا ...ؤ کرنے کے لئے روسی قوم کسی دوسری قوم کی شرمندۂ احسان نہیں ہوئی۔ خود روس ہی کے فرزندوں نے خون بہاکر اپنے ...ن کو غیر کی غلامی سے آزاد کرایا۔

روسیوں کو اس بات کا پر غرور احساس ہے کہ انھوں نے اپنے وطن کی مدافعت کرکے انسانیت ...بھی خدمت کی ہے۔ تاتاری یلغار کو روک کر اس نے یورپی اقوام کو محفوظ رکھا اور یورپی حملوں کو روک کر مشرقی اقوام کو ...بایا۔

قدیم روس میں داستان گوئی بہت عام تھی، اور یہ داستانیں سینہ بسینہ منتقل ہوتی رہتی تھیں لیکن سترھویں صدی ... سے پہلے ضبط تحریر میں نہ آسکی تھیں۔ یہ داستان گو بوڑھے مرد اور عورتیں ہوتے تھے جن میں نابینا بھی ہوا کرتے تھے ان داستانوں ... مسالہ تلہ آوروں کے معرکوں سے لیا جاتا تھا، رجحان ان داستانوں کا ہمیشہ مذہبی رہا۔

بارھویں صدی میں POLOTSE کے وحشیوں نے روسی علاقے کو روند ڈالا تھا —— چنانچہ اسی عہد میں ... تاریخی داستان لکھی گئی تو اس کے مولف نے مسالا پولوتسی کی جنگ کے واقعات ہی سے لیا۔ اس داستان کو روسی قوم ... رزمیہ (ایپک) کا درجہ حاصل ہے۔

تیرھویں صدی میں ٹیوٹن حملہ ہوا اور دشمن بالٹک علاقے کو روندتا ہوا روس میں گھس آیا۔ اس وقت روسی فوج ... اس مدافعانہ جنگ میں شجاعت اور وطن پرستی کی جو مثال قایم کی اور جس تیزی کے ساتھ دشمن کی قوت کو پاش ...ش کیا، اس نے نیوسکی کو نہ صرف سارے روس میں ہر دلعزیز بنادیا بلکہ اس کی جنگی قابلیت کا شہرہ روم تک پہونچ گیا۔

اس کے بعد منگول حملوں کا دور شروع ہوتا ہے جس کے باعث روس کا ارتقاء کم و بیش دو سو سال تک رکا رہا۔

روسی قوم غلام بنالی گئی، اس کی بستیاں ویران کردی گئیں اور اس کا کلچر مٹا دیا گیا۔ لیکن اس تباہ حالی میں بھی مقامی واقعہ نگاری مفقود نہیں ہوئی۔ نئے نئے عوامی گیت بنتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت جو گانے بنے، ان میں منگول مظالم اور تباہ کاریوں کا ہی بیان ہو سکتا تھا۔ منگولوں کا غلبہ اگرچہ تقریباً دو سو سال تک رہا لیکن روسی قوم نے اس کو دو دن کے لئے قبول نہیں کیا۔

روسی قوم کی اس جدوجہد کو پشکن نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

"روس ایک اعلیٰ مقصد کے لئے مقدر ہوا ہے۔ روس کے وسیع میدانوں میں منگولوں کے جم غفیر یورپ پہونچنے سے پہلے فنا کردئے گئے۔ منگول فوجیں مفتوح روس کو پیچھے چھوڑ کر یورپ میں بڑھ جانے سے ڈرتی تھیں......

یورپ کی ترقی پذیر علمی روشنی کا تحفظ زخمی و ناتواں روس نے کیا"

چودھویں صدی میں ایک زبردست حملہ کر کے منگولوں نے روسی مزاحمت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہا تو روسی حکمرانوں کو ہوش آیا اور مدافعت وطن کے لئے متحد ہوگئے۔ اس متحدہ طاقت نے ماحی (MAMI) منگول جرنیل کو فاش شکست دی اور روس ہمیشہ کے لئے غیر کی غلامی سے محفوظ ہو گیا۔

روسی تاریخ کی اس عظیم الشان جنگ اور فتح کی یاد میں کئی کتابیں لکھی گئیں جن میں "زودنش چینا" اور "واقعات ڈونسکوئی" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہ وہ تاریخی تقاضے تھے جن کی بناء پر سولھویں صدی میں پورا روسی علاقہ ایک قومی اتحاد کے اندر منظم ہوسکا۔ اس اتحاد سے روسی کلچر نے جو ترقی کی اس کی اہمیت کا اندازہ دشوار ہے۔ مختلف بولیاں گھل مل کر ایک روسی زبان وجود میں آئی، نقاشی اور فن تعمیر کی ایک مشترک طرز وضع ایجاد ہوئی اور صناعتی ترقی کا راستہ صاف ہوا۔ سولھویں صدی کے وسط میں پہلا چھاپہ خانہ قایم ہوا۔

روس کا یہ نیا قومی اتحاد جس کا مرکز ماسکو تھا، اتنا طاقتور ثابت ہوا کہ کبھی کوئی حملہ ہوا بھی تو بری طرح پسپا کر دیا گیا اور پڑوسی چھوٹی طاقتیں اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں ماسکو کی امداد پر بھروسا کرنے لگیں۔ شمالی قفقاز اور چرکس وغیرہ نے سرپرستی کی درخواست کی اور سترھویں صدی میں آذربیجان نے بھی ایسی ہی درخواست پیش کی۔

اس اتحاد کا حقیقی سبب وطنیت کا جذبہ تھا۔ چنانچہ سترھویں صدی میں پولینڈ نے روس پر حملہ کیا تو سارا روس متحد ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا اور پولینڈ کو شکست فاش دی۔

روسی اہل فکر سچے عیسائی تھے اور آسمانی بادشاہت کے منتظر اور اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ جمہوریت کا تخیل تھا۔

روسی انداز فکر کی دو صورتیں تھیں۔ ایک مغربی یورپ کا تتبع، دوسرے سلافی نسل کی روایات کو مذہبی بنیادوں پر از سر نو قایم کرنا اور مادہ پرستی سے بیزاری۔ ۱۸۳۰ء سے دونوں تحریکیں ایک ساتھ نشو و نما پاتی رہیں۔ ان تحریکوں کا مرکز ماسکو یونیورسٹی تھا جہاں فلسفیانہ، تاریخی، ادبی اور سماجی موضوعات پر بحثیں ہوا کرتی تھیں۔

بعد کے زمانے میں روسی فکر نے مذہب کی جو مخالفت کی اور آزادی کی جدوجہد جس مقام تک پہونچی، اس کی تہ میں محبت کا جذبہ اور الٰہی حکومت قایم کرنے کی آرزو تھی۔ بولشویکی مادی فلسفے میں مذہبی معتقدات کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے لیکن روس کے تعلیم یافتہ طبقے نے بولشویک انقلاب کے لئے جو راستہ ہموار کیا وہ اصلاً عیسوی تعلیم ہی کا نتیجہ تھا۔ جلاوطنوں کی بپتائیں، دہشت انگیزوں کی جانبازیاں، نہلسٹوں کی قربانیاں ان سب کا سرچشمہ عیسویت کی تعلیم تھی، اور بلاشبہ ان کی قربانیاں پھل لائیں۔ الغرض اس کا مذہبی رجحان اس کو ہمیشہ حقیقی و واقعی انسان اور انسانی سماج پر فکر و غور

کرنے پر مجبور کرتا رہا ہے۔

تمام بڑے روسی مفکر جیسے دوستوئیفسکی و ٹالسٹائی وغیرہ اگر بڑے صناع تھے تو یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی، کیونکہ روس میں سیاسی فکر و شعور ادب ہی کے دروازے سے داخل ہوا۔ اور ان کے سوچ بچار پر عمل کا گوشت پوست بہت جلدی چڑھ جاتا تھا۔ اسی لئے روسی قوم جو بیرونی حملوں کو پسپا کرنے فوراً اٹھ کھڑی ہوتی تھی، اب اپنے مستبد حکمرانوں کے خلاف بھی جد و جہد کرنے لگی۔

اٹھارھویں صدی میں امیلیان بوگاچیف، ایک روسی کازاک نے حکومت کے خلاف جھنڈا اٹھایا اور وولگا علاقے کے زرعی غلام اور جو رال کے مزدور جاگیرداری نظام کا تختہ الٹ دینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوگئے۔ ان انقلابیوں میں یہ انقلاب اگرچہ کامیاب نہیں ہوا مگر اس کے اندر کافی قوت تھی۔

اب روس کے اندر کافی علمی روشنی آ چکی تھی، اور خود اشراف کے طبقے میں جمہوری تصورات پھیل چکے تھے۔ چنانچہ اشراف اور نوابوں ہی کے اندر سے ایسے لوگ نکلنے لگے جنھوں نے زار کی مستبد حکومت کے خلاف احتجاج شروع کر دیا۔ الیگزنڈر رادیشیف اونچے طبقے ہی کا ایک فرد تھا۔

رادیشیف، بلند پایہ ادیب اور فلسفی تھا جو جمہوریت کے اصول پر روسی قوم کی حقیقی سیاسی آزادی کے لئے تمام عمر برسرپیکار رہا۔ اس نے سیاسی آزادی اور انفرادی حقوق کی حمایت میں ایک اپیل کی اور یہی اپیل روس کی پہلی انقلابی جماعت دسمبری (DECEMBERISTS) پیدا کر دی۔ اس جماعت کی تعلیم و تبلیغ کا اثر یہ ہوا کہ ترقی پسندانہ خیالات بہت تیزی سے پھیلنے لگے، استبداد سے تنفر عام ہو گیا اور حریت پرستی کی آبیاری ہونے لگی۔

جب کبھی روسی قوم کو بیرونی دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا ہے، روسی شعراء اور ادباء نے بڑی مدد کی۔ چنانچہ اس موقعہ پر بھی پشکن نے "قصیدۂ حریت" لکھ کر عوام کے جمہوری حقوق کو مقدس چیز بنا دیا۔

یہی تعلیم و تلقین تھی جس نے ۱۸۱۲ء میں نپولین کو شکست دی اور جب ۱۸۲۵ء میں دسمبری جماعت نے انقلاب برپا کیا تو اس کے اندر وہی لوگ تھے جو ۱۸۱۲ء میں نپولین کے خلاف اپنے وطن کی کامیاب مدافعت کر چکے تھے۔ تاریخی اعتبار سے یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ دسمبری جماعت کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے والی چیز یہ نپولین کا حملہ تھا۔

۱۔ پیٹر شادائیف (۱۷۹۴ء سے ۱۸۵۶ء) روس کا پہلا اور ریڈیکل مفکر تھا۔ وہ پاپائے اعظم کا مقلد تھا۔ ہر چند کتابیں تو اس نے چند ہی لکھیں، لیکن جتنا کچھ لکھا اس کا ایک ایک لفظ آنے والی نسلوں کے لئے شمع ہدایت بن گیا۔ اسکی تصنیف "فلسفیانہ خطوط" کا پہلا خط اثر و نفوذ کے لحاظ سے ایک بم پھٹنے کے واقعے سے کم نہ تھا۔ اسی بنا پر وہ رسالہ بند کر دیا گیا اور شادائیف کو مقید کر دیا گیا۔ ہر چند یورپ کے لوگ اس کے مذہبی عقاید کے قایل نہ تھے، لیکن اس کو ایک شہید کا درجہ دیا گیا۔

۲۔ فاریان ہرزن (۱۸۱۲ء سے ۱۸۷۰ء) سوشلزم پر عقیدہ رکھتا تھا لیکن مغربی یورپ کی "فرسودہ تہذیب" اور اسکی "زوال زدہ انسانیت" کو اکھاڑ پھینکنے والا سوشلسٹ نہیں تھا۔ وہ عیسوی تعلیمات کے اندر سماجی انقلاب کے قدرتی ارتقاء کا قایل تھا۔ الحاصل، روسی مفکروں اور جمہوری و سیاسی خیالات کے فلسفیوں میں ہرزن کا پایہ بلند ہے۔

انیسویں صدی کے ساتھ روسی قوم کے اندر اہل فکر و قلم کی ایک جماعت نمودار ہوئی، جس نے رادیشیف کی قائم کی ہوئی جمہوریت کی روایات کو زیادہ عام کیا۔ پشکن، سرانتوف، گوگول، شادائیف، خمیاکوف، ہرزن، چرنی شیفسکی پلاخنوف، دوبرولیوباف، بلینسکی، ٹالسٹائی، دوستوئیفسکی اور پھر چیخوف، گورکی، یہ تمام کے تمام صحیح معنے میں قوم پرست

اور روس کے سماجی مفکر تھے، جن کے افکار نے قوم کی خصوصیت کو پرکھا اور ان خصوصیات کا احساس و شعور بخشا۔

۲ - ویساریان بیلنسکی (۱۸۱۱ء سے ۱۸۴۸ء) "روسی دانشوروں کا باپ" کہا جاتا ہے۔ روس کے بے شمار ادیبوں اور صحافیوں میں یہ پہلا آدمی تھا جس نے روس کے ترقی پسند ذہنوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ بیلنسکی کسی ایسے مذہب کا قائل نہیں تھا جو "عاقبت کی امیدوں پر اس دُنیا کے وجود کو بے معنی بنا دے!"

اس بات کو کہ دُنیا کی قوموں کی تاریخ میں روسی قوم کا درجہ و مرتبہ کیا ہے، بیلنسکی کہتا ہے :-

"ہم روسیوں کو اپنی قومی اہمیت پر ہرگز کسی قسم کا شک نہ ہونا چاہئے، تمام سلافی قبیلوں میں ہم روسی ہی ایک عالی شان اور مضبوط سلطنت قایم کرسکے ہیں۔ بلا شبہ ہماری ایک قومی زندگی ہے، اور ہمارا قومی منصب ہے کہ ہم دُنیا کو اپنا پیغام پہونچائیں! لیکن ہمارا یہ پیغام کیا ہوگا؟ یہ بات ہم آج نہیں بتاسکتے کہ دُنیا کے لئے ہمارا پیغام کیا ہوگا۔ ہمارے اس قومی پیغام کا علم ہمارے پوتے پردوتوں کو ہوگا، اور دُنیا انھیں کی زبان سے ہمارا وہ پیغام سُنے گی ..... مجھے اپنی اس نسل پر رشک آتا ہے جو ۱۹۴۰ء کا زمانہ دیکھے گی! ۱۹۴۰ء میں روشن خیال دُنیا کا رہنما ہوگا اور سائنس و صناعت کے ضابطے اور قاعدے بناکر متمدن دُنیا سے عزت کا خراج اور احترام کا ہدیہ وصول کرے گا۔"

۳ - الیگزی خمیاکوف (۱۸۰۴ء سے ۱۸۶۰ء) ایک بلند پایہ فلسفی اور فلسفۂ تاریخ کا بڑا زبردست عالم تھا۔ انسانی خصوصیات اور اس کی آزادی کو سامنے رکھتے ہوئے خمیاکوف کا کہنا ہے کہ ایک اچھے اور حقیقی سماج کے افراد کو صرف حکومتی اعتبار سے متحد نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس اتحاد میں افراد کی رضا و رغبت اول شرط ہے۔

خمیاکوف کہتا ہے کہ جب فرد یا قوم ایک دوسرے کے لئے وقف نہیں ہوجاتے اور قربانی سے انکار کرتے ہیں تو وہ فرد یا جماعت از خود تاریخ کے دائرے سے نکل جاتی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :-

"جو شخص اپنی زندگی دوسروں کے لئے تج دینے کو تیار رہتا ہے، صرف وہی اپنی اور اپنی قوم کی روح کو محفوظ و سلامت رکھ سکتا ہے!"

خمیاکوف اس ضابطۂ اخلاق اور ضابطۂ قانون کو ناقص کہتا ہے جس کے اندر انسانی محبّت کو جگہ نہیں دی گئی ہے۔ "انسان اگر محبت نہیں کرتا اور صرف اپنی ذات میں جیتا ہے تو آزادی و مساوات جو اس کو اخلاق اور قانون سے ملی ہے اس کے لئے بیکار ہے اور اس کے باوجود اس کی زندگی جہنم ہے! محبت کے بغیر انسانی روح کی تمام قوتیں سماجی تباہی میں لازماً برباد ہوجائیں گی۔ انسان اگر محبت کرنا نہیں سیکھتا اور دوسرے انسانوں سے مل کر مشترک مقصد نہیں بناتا تو اسکے اندر وہ نظر نہیں پیدا ہوسکتی جو اس دُنیا میں نظام راج لانے کے لئے ضروری ہے!"

خمیاکوف کے خیالات نے اس کے ہم عصروں پر گہرا اثر ڈالا، اور اگرچہ کلیسا اس کے مذہبی تصورات سے متفق نہیں ہوسکا مگر روسی مفکرین نے اس کا پورا پورا اتباع کیا۔

۵ - ولادی میر سولوویف (۱۸۵۳ء سے ۱۹۰۰ء) ماسکو کے اونچے کلچر والے طبقے کا فرد تھا، وہ سلافیت کا مبلغ اور پرجوش تھا، گہری مذہبیت اور اخلاق پرستی کا قایل۔ مذہب اس کی نظر میں "انفرادی انسان کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک اجتماعی عقیدہ و عمل ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں یعنے روحانی، سماجی سیاسی اور اقتصادی منطقوں پر محیط ہے!" اس کا عقیدہ تھا کہ انسان کی تمامی حرکت و عمل خواہ وہ جسمانی سنت و مشقت ہو یا تخلیقی صناعت، اگر اس کا نتیجہ انسانی اتحاد کی صورت میں نکلتا ہے اور اس سے انسان کے اندر احتیاج پیدا ہوتی ہے تو ایسی حرکت و عمل ایک لعنت ہے!

اس کا ایک قول یہ بھی ہے کہ خدا پر عقیدہ رکھنے والے انسان پر وہ اعمال فرض ہیں جو جسم اور روح کی محنت سے فطری عناصر کو تخلیقی شکل میں بدل دیں!۔ وہ اس دُنیا میں آسمانی بادشاہت لانا چاہتا تھا! اور اس طرح وہ جتنا بڑا مذہبی مفکر تھا اتنا ہی زبردست سماج سدھار کا بھی حامی تھا۔

۶۔ دوستو یافسکی (۱۸۲۱ء سے ۱۸۸۱ء) کی متصوفانہ جمہوریت پرستی، کئی پہلو سے سولوفیئف کی تعلیمات سے مماثل ہے دوستو یافسکی کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ اس دُنیا میں آسمانی بادشاہت قائم کرنا روسی قوم کا مقدر ہے!۔ دوستو یافسکی کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سخت ہولناک حالات میں بھی وہ اپنے خیال اور عقیدے پر مستحکم رہا۔ وہ کہتا ہے کہ "ہمارا کام یہ دیکھنا ہے کہ سچی سوشلزم کی علمبردار روسی قوم ہو، دوسری نہ ہو!

روسی کردار کے متعلق اس کا فیصلہ یہ تھا:۔

"روسی، پوری نوع انسان سے محبت کرتا ہے۔ انسان کسی رنگ اور نسل کا ہو، کسی ملک کا رہنے والا ہو، روسی کو اس سے ہمدردی ہے، روسی کو ذراسی بھی عقل و حکمت مل جاتی ہے تو وہ اسے دوسرے انسانوں میں بانٹ دینا چاہتا ہے"

۷۔ فیودروف کے یہاں مرکزی مسئلہ موت کا مسئلہ ہے۔ تاریخ انسانیت میں موت کا خیال اس کے لئے نہایت تکلیف دہ چیز تھی۔ وہ انسان کو دعوت دیتا ہے کہ موت تمام بُرائیوں کی جڑ ہے اور اس کے سامنے کبھی ہار نہ مانو! وہ مری ہوئی انسانی نسلوں کو زندہ کرکے موت پر فتح پالینے کا آرزومند تھا!

وہ سمجھتا تھا کہ انسان، حال، ماضی اور مستقبل کی تباہیوں کے بغیر دوامی زندگی پاسکتا ہے۔

۸۔ فیلی روزنوف (۱۸۵۶ء سے ۱۹۱۹ء) کا مرتبہ روسی ادب میں وہی ہے جو انگریزی ادب میں ڈی ایچ لارنس کا ہے، وہ اخلاق، ضبط و نظم اور روایات کا مخالف تھا۔ اس کے بعض اقوال ملاحظہ ہوں:۔

"ہر چیز لافانی، دوامی اور زندہ ہے! جوتے کے تلے کا سوراخ اگر گھٹتا بڑھتا نہیں تو روح کی لافنائیت سے بہتر ہے، اس لئے کہ روح محض خیال اور خشک تصور ہے!"

"جب میں دوسرا جنم لوں تو میری جیب میں رومال ضرور ہونا چاہئے۔ اس سے کم پر میں راضی نہ ہوں گا!"

"(دوسرے عالم میں) میں خدا سے کہوں گا کہ اس نے مجھے دُنیا میں کیا دیکھنے کو بھیجا تھا؟ کیا اس لئے کہ اس کی بنائی ہوئی دُنیا بہت حسین و دلکش ہے؟ نہیں! تو پھر میں اس سے کیا کہوں گا؟ خدا مجھے خموشی سے آنسو بہاتا اور کبھی کبھی مسکراتا دیکھے گا، مگر میرے مونھ سے ایک لفظ نہیں سنے گا!"

اس کے غور و فکر کا مرکزی نقطہ "طبعی انسان" کا نظریہ تھا۔ روزانوف ہمدردی، ترحم اور تلطف کو ہر بات سے اوپر جگہ دیتا تھا۔ سماجی اور اخلاقی خوبی کا منبع اس کی نظر میں فطری و فوری لطف و کرم کے اندر تھا۔ عالمگیر اتحاد و اخوت کی صورت میں اگر عیسویت اس کو لبھاتی تھی تو دوسری طرف وہی عیسویت اس کی جنسی زندگی کے تصورات کے خلاف ہونے کے باعث اس کو ڈھکیل بھی دیتی تھی۔ لیکن خود اس کی پیشگوئی کے مطابق انجام اس کا عیسویت ہی پر ہوا

۹۔ لیوٹالسٹائی (۱۸۲۸ء سے ۱۹۱۰ء) حق و انصاف کے دوسرے جانبازوں کی طرح ٹالسٹائی کو جلاوطن تو نہیں ہونا پڑا لیکن اپنے ماحول کے سماجی جیلخانے میں بند ہوکر اس نے خود گوشہ نشینی کی زندگی گزاری۔ ٹالسٹائی نے بکثرت ادب پیدا کرکے وطن، قوم اور دُنیائے انسانیت کی عظیم الشان خدمت کی، آج دنیا کے کسی حصہ کا فکر و خیال اپنے آپ کو ٹالسٹائی کے تصورات و نظریات سے علٰحدہ نہیں کرسکتا۔ اس نے اپنے ادب کے ذریعہ سے کلیسا کی سخت تنقید کی۔ اس کے باوجود اسے روس کا ایک سینٹ یا ولی مانا گیا۔

بیسویں صدی کے شروع میں جبکہ ایک عظیم الشان سماجی انقلاب کے آثار پیدا تھے، روسی قوم کے مسیحی ضمیر نے ٹالسٹائی کا روپ دھار لیا تھا اور یہ بات اس امر کی شہادت تھی کہ زندگی اور انجیل میں بڑا تضاد ہے! ٹالسٹائی بھی مذہب اور زندگی کے درمیان تفاوت دیکھ کر نہلسٹ بن گیا تھا، لیکن یہ خاص روسی قسم کا نہلزم تھا۔ دُنیا میں دوسری قوم مشکل سے ایسی ملے گی جو حد درجہ صناعت پسند ہونے کے باوجود تہذیبی قدروں اور سماجی روایتوں کی طرف سے اتنی بے پروا ہو جتنی روسی قوم ہے۔ روسی قوم کسی ایسے خیال کے لئے جو انسان کی دوامی نجات کا ضامن ہوسکے یا کسی ایسے انقلاب کے لئے جو کوئی مکمل سماجی نظام بنانے کا ضامن ہوسکے، ہر چیز اور ہر بات کو حقیر اور ہیچ سمجھے گی۔

ٹالسٹائی کی آرزو کسی نئی تہذیب کی نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کی تھی، وہ انسانی وجود کی کایا پلٹ دینا چاہتا تھا۔ وہ موجودہ تہذیب و تمدن کو اپنے پورے صناعتی ذخیرے کے ساتھ ملزم گردانتا تھا۔ جدید تمدن پر ٹالسٹائی کو غصہ در اصل اس تضاد کا نتیجہ تھا جو اس کے تعمیری و تخریبی عناصر کے مابین پایا جاتا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ٹالسٹائی کے سامنے جو حقیقت تھی وہ اتنی ہیبت ناک تھی کہ ٹالسٹائی انسان کی بیمار سیاست سے مایوس ہوگیا تھا وہ صرف اُسکے لئے نہیں بلکہ دنیا بھر کے لئے پیغمبرانہ فیصلہ دینے آیا تھا!

اس میں شک نہیں کہ روسی فکر و خیال کی بنیاد اس کا مذہبی عقیدہ ہے۔ روسی تفکر میں انسانی اخوت و مساوات مسیحی تعلیم محبت ہی کا نتیجہ ہے؛ روسی فکر و احساس کی انتہا یہ ہے کہ وہ کسی کو مبتلائے آفات دیکھ کر آرام نہیں پاسکتا روسی قوم کا اخلاقی شعور انسانیت پرستی کو مجرد قدروں اور تصورات (جیسے اسٹیٹ، تہذیب، سائنس، اخلاق بلکہ صداقت وجمال اور نیکی) سے بھی بلند و برتر مانتا ہے۔

پشکن، روس کا بلند پایہ شاعر و ادیب تھا اور نئے روسی ادب کا بانی کہا جاتا ہے۔ روسی سماجی فلسفے کی تبلیغ و اشاعت میں پشکن کو ہرزن پر بھی فوقیت حاصل ہے جس کی جدو جہد کسانوں کی آزادی کے لئے بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ پشکین کے زمانہ تک روس کے اندر سیاسی تحریک کافی طاقتور ہوچکی تھی۔

پشکین کے دور کے بعد چرنی شیفسکی کا نام آتا ہے۔

انقلابی جدوجہد کو ہرزن نے جس مقام پر پہونچا دیا تھا، چرنی شیفسکی نے اس کو تیز و تند بنا دیا۔ طلباء کی جماعت کو پہلی مرتبہ اُس نے متاثر کیا، اور طلباء کی سیاسی بیداری اتنی تیز تھی کہ انھوں نے ایک زبردست ہڑتال کی اور چرنی شیفسکی کو سائبیریا بھیج دیا گیا۔

چرنی شیفسکی نے ایک اور اعلان شایع کیا جس کا عنوان تھا "گریٹ رشین"۔ اس اعلان میں اس نے دستوری نظام حکومت، آزادی تحریر، اور اقلیتوں کے حقوق کا مطالبہ کیا تھا۔ اس اعلان کے شایع ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس کی چھوٹی قومیں پھر ایک دفعہ بین الملی اتحاد پر مستحکم ہوگئیں، اور بالآخر یہی اعلان قومی آزادی حاصل ہونے کی بنیاد ثابت ہوا۔ ٹالسٹائی کی تصانیف میں حاجی مراد کا کردار ایک مشہور ادبی کردار ہے۔

یہ بات دوہرا دینا شاید بے محل نہ ہو کہ روس کی تحریک جمہوریت اس کے سماجی تفکر کا نتیجہ تھی، اور ان کے سماجی تفکر کی بنیاد ——— دسمبری جماعت روس کی پہلی منظم سیاسی جماعت تھی جس کے اندر سے نراجی فرقہ نکلا، اور جب دسمبری جماعت سوشل ڈیماکریٹ پارٹی میں منتقل ہوگئی تو نراجی فرقہ فنا ہوگیا۔ اس لئے کہ روس کا قومی تفکر تشدد کی حمایت نہ کرتا تھا۔ بالآخر سوشل ڈیماکریٹ پارٹی دو حصوں میں بٹ گئی۔ بولشویک (اکثریت) اور مینشویک (اقلیت) اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد سول وار نے مینشویک پارٹی کو ٹھنڈا کر دیا اور بولشویک جماعت بالآخر کمیونسٹ

پارٹی کہلائی۔ لیکن ان مدارج ارتقاء میں ہر جماعت اپنی پیشرو جماعت کے سیاسی پروگرام اور اعلیٰ تصورات کو آگے بڑھا رہی۔ روسی غور و فکر کا محرک بلاشبہ مذہبی عقیدہ تھا، لیکن جب استبداد کے خلاف جدوجہد شروع ہوئی اور اہل کلیسا نے مذہبی اصول کے خلاف استبداد کی حمایت کی تو روسی اہل فکر مذہب سے بیزار ہوتے گئے، یہاں تک کہ جب لینن کا زمانہ آیا تو اس نے مذہب کو "عوام کی افیون" بتایا۔ اس کے باوجود ان کا سماجی تصور "آسمانی بادشاہت" یعنی انسانیت پرستی رہا، جو نظام نوع انسان میں اخوت و مساوات پر قائم ہو، جہاں بیروزگاری مفقود ہو، جہاں گناہ کی تجارت اور بھیک کا پیشہ جرم ہو، جہاں ہر چیز عوام الناس کی ملکیت ہو، جہاں بغض و نفرت اور حرص و آز باقی نہ رہے اور جہاں فرد سماج کے لئے کام کرے اور سماج فرد کی خیر و بہبود کی ذمہ دار ہو، جہاں علم اور کلچر عوام کی ملکیت ہو کر عام ہو جائے، بلاشبہ "آسمانی بادشاہت" جو آسمانوں سے نہیں اُتری بلکہ زمین پر رہنے والوں کے ہاتھوں نے بنائی ہے۔

۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم نے روسی عوام کے سیاسی شعور کو بالغ بنا دیا اور روس کی تمام قومیں جمہوری آزادی کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ۱۹۱۷ء کا انقلاب کامیاب ہونے کے ساتھ لینن اور اسٹالین کا اعلان حریت شایع ہوا جس نے قوموں کو کلی طور پر آزاد و مختار بنا دیا۔

مغربی یورپی حکومتوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں حق خود ارادیت (سیلف ڈٹرمی نیشن) کا خوب ڈھنڈورا پیٹا اور جنگ ختم ہونے پر اس عالمگیر اصول کو برف خانے کے اندر محفوظ کر دیا۔ لیکن اس کے برخلاف سوویٹ روس نے اس اصول پر حرف بحرف عمل کر کے اسے زندۂ جاوید بنا دیا۔

اسٹالین نے حق خود ارادیت کی تعریف اس طرح کی ہے :-

"مزدور طبقے نے سب قوموں کی آزادی کے لئے جنگ کی اور آیندہ بھی کرے گا۔ قوموں کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہر چھوٹی بڑی قوم کو اپنا مقسوم خود بنانے کا کامل حق حاصل ہے، اور کوئی دوسری قوم اس قوم کی زندگی میں مخل ہونے کی مجاز نہیں ہے : ایک قوم دوسری قوم کے کلچر کو نقصان پہونچانے، زبان کو پابند بنانے اور تعلیم کو مقید کرنے کا بھی حق نہیں رکھتی"

روس کی محکوم قوموں نے سوویٹ طاقت کے اس اعلان کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور سب قومیں سول وار میں روس کے جمہوری انقلاب کی معاون رہیں۔ اور پھر پانچ سال کامل خود مختار رہنے کے بعد ۱۹۲۲ء میں برضا و رغبت روسی وفاق میں شامل ہوگئیں جس کو آج   کے نام سے جانتے ہیں۔

سوویٹ یونین کا یہی وفاق وہ "آسمانی بادشاہت" تھی اور حریت و مساوات کے اُن خوابوں کی سچی تعبیر جو ہرزن سے لیکر چیخوف، گورکی تک روس کے تمام سماجی مفکر دیکھتے آئے تھے!

چیخوف اسی سماجی نظام کا مبلغ تھا۔ وہ ساری عمر ظلم و ناانصافی کے خلاف احتجاج اور انسانی حقوق کی حمایت کرتا رہا۔ سماج کا جتنا مکمل نقشہ چیخوف نے پیش کیا ہے دوسرے اہل قلم سے ممکن نہ ہوا۔ چیخوف کے ادب و انشاء نے روس کو زیادہ پاکیزہ و متمدن بنایا اور انسانی شرافت کا معیار خدمت بنی نوع انسان کو قرار دیا!

میکسم گورکی لبرل روس کی پیداوار تھا۔ روسی فکر میں گورکی کا درجہ کسی سے کم نہیں ہے۔ گورکی کے متعلق وی وی میخا... لکھتا ہے کہ :-

"...... اس کا تخلیقی کام اُنیسویں صدی کے بہترین روسی ادب اور نئے سوویٹ ادب کو جوڑنے والی کڑی ہے"

حالانکہ گورکی خود سوویٹ ادب کا بانی بھی ہے! گورکی کے اندر قدماء کی تمام صفتیں جمع ہوگئی ہیں، پشکن کی جامعیت، سرانتوف کی حریت پرستی، ٹالسٹائی اور دوستووسکی کی شدت احساس اور گہری اخلاقی جستجو، نیکراسوف کی مظلوموں کے ساتھ گہری ہمدردی، چیخوف کی انسانیت اور پرمعنی زندگی کی آرزو، یہ سب اوصاف گورکی کے اندر جمع ہوگئے تھے!"

گورکی کو نوع انسان سے کتنی محبت تھی، اس کے بیان کرنے کو دفتر چاہئے مگر اہل نظر اس کے ایک فقرے سے اندازہ کرسکیں گے:-

"انسان! اس لفظ میں (افتخار و مکرمت کی) کیسی گونج ہے!"

انسانیت پرستی میں گورکی کو اتنا غلو تھا کہ اس کو "جارحانہ" انسانیت پرستی کہنا غلط نہ ہوگا۔ اس کی یہ انسانیت پرستی سوویٹ فکر و ادب کا پرچم بن گئی اور وہ مفکروں اور ادیبوں کی نئی نسل کا معلم اعظم قرار پایا۔

اسٹالین دُنیا میں اگر اور کچھ نہ کرتا تو بھی اس کی "قومیتوں کے متعلق سوویٹ پالیسی" ہمیشہ اس کو دُنیا کا بڑا آدمی ثابت کرنے کو کافی تھی۔ لینن جس طرح مارکس کا شارح تھا، اسٹالین اسی طرح لینن کا مفسر ہے۔ اگر دوسری جنگ عظیم نہ ہوتی تو شاید دُنیا اس حقیقت سے بے خبر رہتی کہ اسٹالین، مارکس و لینن کے فلسفے کو عملی سانچے میں ڈھال سکتا ہے، ایک بلند پایہ سیاست داں ہے، ایک اعلیٰ سپہ سالار بہت بڑا مدبر سلطنت بھی ہے۔

روس کے اندر اگر اسٹالین کے حریف ٹراٹسکی کی یہ پالیسی مان لی جاتی کہ دُنیا بھر میں انقلاب پیدا کرانے کی کوشش جاری رکھی جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ نیا روس آج کسی قعر مذلت میں پڑا ہوتا! اگر اسٹالین کی اس عاقبت اندیشی پر عمل نہ کیا گیا ہوتا کہ ایک اشتراکی حکومت پہلے اس قدر قوی بنالی جائے کہ دُنیا کی تمام سرمایہ داری طاقتوں کے متحدہ حملے کی مدافعت کرسکے، تو کون انکار کرسکتا ہے کہ روسی قوم اور اس کے ساتھ ساری دُنیا آج ہٹلر اور فاشیت کی غلامی میں جکڑی ہوتی۔

اس حقیقت کا اعتراف دُنیا نے کیا ہے کہ روسی اہل قلم و اہل فکر اپنے عوام سے جتنا قریب رہتا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ ایک معیاری دُنیا کیسے بنائی جاسکتی ہے؟ اس دُنیا میں روس کے لئے کون سی جگہ ہوگی؟ ان کے سامنے یہ بھی سوال تھا کہ روس آنکھ بند کرکے مغربی یورپ کے پیچھے ہولے یا ایسا نہ کرے تو کیا روسی قوم بجائے خود ایک کلچر مدون کرسکتی ہے؟

یہ وہ اہم اور بنیادی سماجی مسئلے تھے جن پر روسی مفکر ہمیشہ اور مسلسل دماغ سوزی کرتے رہے۔ روس کی تمام سیاسی تحریکیں اسی غور و فکر کا نتیجہ تھیں۔ اولاً ہر قسم کے خیالات اُبھرے بھرپور اصطلاحی تصورات متشکل ہوئے اور "سلافیت" کا رجحان بڑھا۔ الیگزینڈر دویم کے عہد تک خیالات کی جو تخم ریزی ہوئی اس کا ماحصل زرعی غلامی کا خاتمہ تھا۔

اس کے بعد تعلیم یافتہ طبقے میں سیاسی شعور نمودار ہوا اور طلبہ کی جماعت میں سے نراجی فرقہ پیدا ہوا۔ یہ تحریک انقلاب روس کی ابتدا تھی۔ ٹالسٹائی کا زمانہ "جھٹ پٹے" کا زمانہ کہا گیا ہے، کیونکہ اس دور میں سوشل ڈیماکریٹ پارٹی مرتب ہو رہی تھی جس کے اندر سے بولشویک پارٹی نکلی جو آج کمیونزم پارٹی کہی جاتی ہے۔

انیسویں صدی میں بیلنسکی نے جو پیشگوئی کی تھی وہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پوری ہوئی اور ۱۹۱۷ء کی جس روسی نسل پر بیلنسکی نے رشک کیا تھا وہ نسل ۱۹۴۵ء میں وہی کر رہی ہے جو سو سال پہلے بیلنسکی کی دوربین نظر نے دیکھ لیا تھا

ل - احمد

فنِ تحریر کی تاریخ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

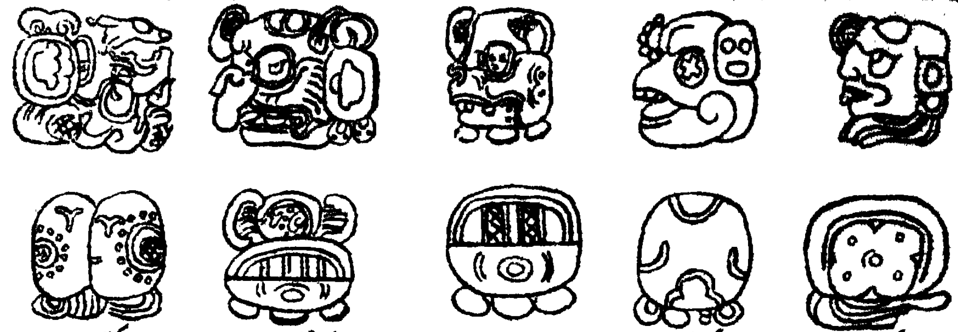
مایا قوم کا رسم خط مایا قوم وسطی امریکہ میں آباد ہے۔ کولمبس کی دریافتِ امریکہ سے پہلے اُس نے بڑا عروج حاصل کیا تھا۔ یوکاتان سے لیکر سیلویڈر تک اُس کا تمدن پھیلا ہوا تھا لیکن ازتیق قوم نے اُسے شکست دی جس کے بعد مایا قوم کے سیاسی اور تمدنی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔

مایا قوم میں ایک تصویری رسمِ خط مستعمل تھا جسے پڑھنے میں ابھی تک مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ جہاں تک پتہ چلتا ہے ان لوگوں میں حروف کا رواج نہ تھا۔ ہر نشان ایک لفظ یا تخیل کو ظاہر کرتا تھا۔ ایسے نشانات میں دیوتاؤں۔ تقویم۔ چہار جہت، سیاروں اور رنگوں وغیرہ کی علامات شامل ہیں۔

مایا قوم کے سال میں ۱۸ مہینے اور ہر مہینے میں ۲۰ دن ہوتے تھے اس طرح اُن کا سال (۲۰ × ۱۸) یعنی ۳۶۰ دن کا ہوتا تھا۔ ہر مہینے اور ہر دن کو ظاہر کرنے کے لئے علٰحدہ علامتیں تھیں، اس سال میں بعدازاں ۵ دنوں کا اضافہ کیا گیا۔ جنھیں منحوس مانا جاتا تھا۔ انھیں "یوآیب" کہتے تھے اور اُن کے لئے بھی ایک علٰحدہ علامت تھی۔ نیچے "مایا مہینوں کی علامتیں" درج کیجاتی ہیں:



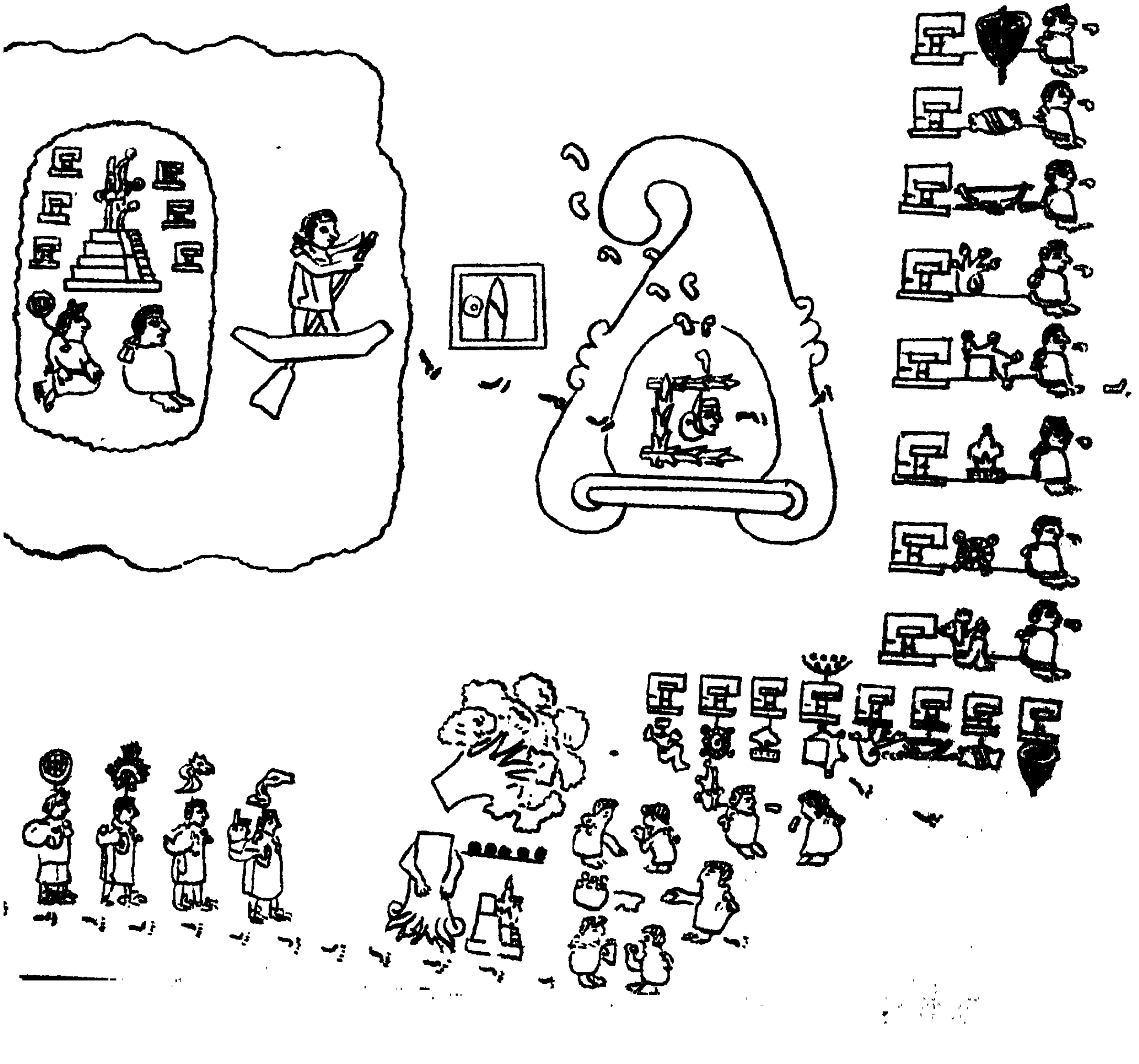
انھوں نے اپنی تقویم کا حساب ۴۰۰ سال کی مدت میں محدود کیا تھا جس کی منزلیں اور اُن کے نشانات یہ تھے۔



کن = ایک دن ۔ یوانیل = ۲۰ دن ۔ تون = ۳۶۰ دن (ایک سال) ۔ کاتون = ۷۲۰۰ دن (۲۰ سال) ۔ باکتون = ۱۴۴,۰۰۰ دن (۴۰۰ سال)

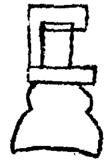
ازتیق قوم کا رسم خط

ازتیق (AZTEC) قوم میکسکو میں آباد تھی۔ اُس کا آخری بادشاہ مانٹی زیوما تھا جسے اسپین کے لوگوں نے اپنی شاطرانہ چالوں سے گرفتار کرلیا اور میکسکو کی سلطنت پر قابض ہوگئے۔ یہ ۱۵۲۱ء کا واقعہ ہے۔ ان کا رسم خط غالبًا مایا رسم خط کی ایک بگڑی ہوئی صورت تھی۔ نیچے دی ہوئی تصویر اس لکھائی کا ایک اہم نمونہ ہے :۔



اس میں "ازتیق قوم کی ہجرت" کو دکھایا ہے - وہ ایک روایتی جزیرے ازتلان (لفظی معنی "مقام ازتیق") سے ہجرت کرکے "چقماق کے چاقو" کے پہلے سال مطابق ۱۱۶۸ء میں "ویت زیلو پوچتلی" نامی غار میں پہونچی اور وہاں سے اُن کے آٹھ قبیلے اپنے اگلے سفر پر روانہ ہوئے (تصویری کا اوپری حصہ) نیچے گرے ہوئے درخت سے "تاموانکان" (منزل) مراد ہے - وہیں پر ایک قربانگاہ بنی ہوئی ہے جہاں وہ کھانا رہے ہیں اور داہنی طرف اُنھیں ایک دوسرے سے رخصت ہوتے ہوئے دکھایا ہے - چلنے کے لئے نقش قدم اور بولنے کے لئے منھ کے پاس "و" کا ایسا نشان بنایا ہے - ہر قبیلے کا مخصوص نشان مکان کے ساتھ بنایا گیا ہے - لوگوں کے نام لکھنے کے لئے اُن کی علامتوں کو ہیروں سے ملا دیا گیا ہے - نام لکھنے کا بالکل یہی طریقہ ہنود احمر (ریڈ انڈین) میں رائج تھا -

نیچے ازتیق رسم خط میں بعض مقامات کے نام ملاحظہ ہوں :-



کال تے پیک = کَلّی (گھر) + تے پیک (پہاڑ)



کوتے پیک = کوتل (سانپ) + تے پیک (پہاڑ)



اتزتے پیک = اتز (گُتا) + تے پیک (پہاڑ)



اتزتلان = اتز (گُتا) + تلانتلی (دانت)

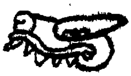
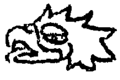


مزتلان = مزتلی (بادل) + تلانتلی (دانت)



مازتلان = مازتل (ہرن) + تلانتلی (دانت)

مایا قوم کی طرح اُن کے سال میں بھی ۱۸ مہینے اور ہر مہینے میں ۲۰ دن ہوتے تھے یہاں پر اُن کے دنوں کی علامتیں نقل کی جاتی ہیں :-

	کی پاکتلی	(گھر)		اوزوماتلی	(بندر)
	ایہے کتل	(ہوا)		مالن الّی	(گھاس)
	کلی	(مکان)		آکتل	(نرکل)
	کویتزپلن	(چھپکلی)		اوکے لتل	(بلی)
	کوتل	(سانپ)		کوآؤہتلی	(عقاب)
	مِکویزتلی	(چہرہ موت)		کوزکاکواوہتلی	(گدھ)
	مازتل	(ہرن)		اولن	(حرکت)
	توچتلی	(خرگوش)		تیک پتل	(چقماق کا چاقو)
	اتل	(پانی)		کوآواتِل	(بارش)
	آتذکوانتلی	(کتا)		شوچتل	(پھول)

نوٹ :- اس مضمون کے ساتھ تصویری رسومِ خط کا بیان ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے آگے ساقی، یونانی، اور ہندوستانی (براہمی) رسومِ خط کا ذکر کرنا ہے۔ جو بہت زیادہ تفصیل چاہتا ہے، علاوہ اس کے سامانِ کتابت، فنِ تحریر کے مستقبل اور اصلاح رسوم خط کے متعلق بھی مجھے بہت کچھ لکھنا ہے۔ اس لئے فی الحال اس سلسلہ کو اسی جگہ ختم کردینا مناسب ہے۔ اس کی دوسری کڑی آیندہ سال سے شروع کی جائے گی۔

محمد اسحاق صدیقی

"گاہے گاہے باز خواں ــــــ"

ہمارے بُت کدے

اور

ان کے لات وہبل

دُنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے بُت پرستی کی شدید مخالفت کی اور جسکے علمبرداروں نے اپنے آپ کو "بت شکن" کہلانے کے لئے نہ ہمالیہ کی بلندیوں کی پروا کی اور نہ بحرِ ہند کی گہرائیوں کی، وہ مور و ملخ کی تعداد میں فوجیں فراہم کرکے اُٹھے، صرصر و سیل کی طرح نہ رُکنے والا عزم لے کر آگے بڑھے اور برق و زلزلہ کے مانند ہر اس بتکدے کو تباہ و برباد کر گئے، جو ان کے سامنے آیا۔ ان کا ہر قدم جو اس غرض سے اُٹھتا تھا "جنّتِ عدن" سے قریب تر کر دینے والا ہوتا تھا اور تیشہ کی ہر وہ ضرب جو کسی بُت پر پڑتی تھی گویا قصرِ فردوس کی تعمیر کی مترادف تھی، وہ مذہب جس کی بنیاد ہی "لات وہبل" کی مسماری پر قائم ہوئی ہو اس کے متبعین میں یہی جوش و خروش ہونا چاہیے تھا اور ہر سومنات کے لئے ان کے اندر ایک محمود کا پیدا ہو جانا ضروری تھا۔ لیکن صبح صادق کی نورانی صباحت میں جب مندر کے کسی گھنٹہ کی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے تو میں دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ ایک "بُت" کا تعلق انسان کے کن جذبات سے وابستہ ہے اور کیوں یہ اختلاف ہے کہ ایک طرف گرزِ گراں اُٹھا ہوا نظر آتا ہے اور دوسری طرف۔ "جُنبد کلیدِ بتکدہ در دستِ برہمن"

یوں تو دُنیا کا ہر پتھر جس کو ہم ٹھوکر لگاتے ہوئے گزر جاتے ہیں، بُت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنے اندر ایک "ناتراشیدہ معبود" چھپائے ہوئے ہے، لیکن نہ بت پرست اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے اور نہ "بُت شکن" اس پر اپنا تیشہ صرف کرتا ہے۔ کیوں؟ آئیے آج کی صحبت میں اسی پر غور کریں۔ شاید تسبیح و زنار کی گتھیوں کو اس طرح سلجھا سکیں۔

کہا جاتا ہے کہ کائنات کی تخلیق "مادہ" سے ہوئی ہے اور مادہ قدیم ہے ہمیں اس دعویٰ کے صدق و کذب پر اس وقت بحث کرنا مقصود نہیں۔ لیکن ہمارا تجربہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ "محض مادہ" کوئی قیمت نہیں رکھتا، اصل چیز جو اس کو باوقعت بناتی ہے وہ انسان کی ذہانت ہے جو اس پر صرف ہوتی ہے۔ مٹی یوں کوئی قیمت نہیں رکھتی لیکن جس وقت اس سے کوئی برتن بنا لیا جاتا ہے تو اس کی قیمت متعین ہو جاتی ہے، لوہا اپنے معدن کے اندر پڑا رہے لیکن جب انسان اسے باہر نکال کر دوسری شکلوں میں تبدیل کر لیتا ہے تو اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ سونا بالکل کسی کام کی چیز نہیں، لیکن چونکہ ذہنِ انسانی نے اس کو معیاری قدر و قیمت کی چیز سمجھ لیا ہے۔ اس لئے وہ گراں ہے الغرض مادہ بذاتِ خود کوئی چیز نہیں اور اگر انسان کی ذہانت خواہ وہ خالص علمی پہلو رکھتی ہو یا جذباتی، اس سے متعلق نہ ہو

وہ بالکل بے کار شے ہے۔

اب اس نظریہ کو سامنے رکھکر ایک "بت" کی حقیقت پر غور کیجئے کہ وہ کیا ہے "بت" فی الاصل ایک پتھر کا ٹکڑا تھا جب تک اس کو انسانی ذہانت نے ایک مخصوص شکل میں تبدیل نہ کیا تھا، وہ ایک حقیر پارۂ سنگ تھا جسوقت تک انسان نے اپنے جذبات کو اس میں مشکل نہ کیا تھا، لیکن ایک "بت تراش" کی چھینی اور ایک "برہمن" کے جذبۂ عقیدت سے مس ہوتے ہی وہ اس قدر مقدس ہوگیا کہ پیشانیاں اس کے سامنے جھکنے لگیں۔ اس لئے اگر "بت شکنی" کا ہدف صرف وہ "پیکر سنگیں" قرار پائے جو مندروں میں رکھا ہوا نظر آتا ہے تو اس سے زیادہ کوتاہ نظری اور کوئی نہیں ہوسکتی، کیونکہ پتھر کو بت بنا دینے والی، حقیر و ذلیل پارۂ سنگ کو "معبود" کی حیثیت دینے والی ذہنیت اس سے بدل نہیں سکتی اور وہ ہزار بت شکنیوں کے بعد بھی بدستور قایم رہ سکتی ہے ہاں اگر کسی مخصوص و متعین "بت" کو توڑنے کے بعد کوئی دوسرا بت اس کی جگہ نہ لے سکے تو بیشک "بت شکنی" مفید ثابت ہوسکتی ہے، لیکن چونکہ بت پرستی کا تعلق صرف انسان کی ذہنیت سے ہے اس لئے جب تک اس بتکدہ کو نہ توڑا جائے جو انسان کے قلب و دماغ میں چھپا ہوا ہے، یہ مادی بربادیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں

اس میں شک نہیں کہ اسلام دنیا کا تنہا وہ مذہب ہے جس نے بت شکنی میں خاص شہرت حاصل کی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصود "لات و ہبل" کی صرف مورتیوں کو مسمار کرکے خاموش ہوجانا نہیں تھا بلکہ اس ذہنیت کو منہدم کرنا تھا جو انسان کے اندر غلامانہ تذلل پیدا کرتی ہے اور اسی لئے جب کسی بت کو توڑا تو اس کا فلسفہ بھی ساتھ ہی ساتھ بتا دیا کہ پرستش کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ اس مادی عالم سے جدا ایک اور چیز ہے جو خود انسان کے اندر ہی موجود ہے اور جس کا اصطلاحی نام "خدا" ہے۔

انسان جسم ظاہری کے لحاظ سے یقیناً فانی ہے، لیکن اپنی معنویت کے لحاظ سے وہ قطعاً غیر فانی ہے، انفرادی حیثیت سے وہ چاہے کتنا ہی بے بود ہو لیکن کلی و اجتماعی حیثیت سے وہ لا زوال مقصودِ آفرینش ہے اور یہی وہ حقیقت تھی جو بعض زبانوں سے "انا الحق" کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

بہرحال "بت پرستی" اگر انسان سے اس جذبۂ بلند کو محو کردینے والی ہے تو یقیناً نہایت مضرت رساں چیز ہے، اور اس کو یقیناً مٹ جانا چاہئے، لیکن سوال یہی ہے کہ کیا اس وقت بھی نزاع کفر و دین کو جاری رہنا چاہئے اور ایک جذبۂ بت شکنی کو دوسرے کے جذبۂ بت پرستی سے متصادم ہونا چاہئے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ وہ ہے جب تمام دنیا سے مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑگئی ہے اور عام طور پر محسوس کیا جارہا ہے کہ وہ عقول انسانی کا ساتھ دینے کے لئے طیار نہیں، میں کہتا ہوں کہ یہی وہ زمانہ ہے جب مذہب کا وہ ارتقائی مفہوم ہمارے سامنے آیا ہے جس پر تمام نوعِ انسانی متفق ہوسکتی ہے، اور یہی وہ دورِ عقل و فراست ہے جس نے حقیقی مذہب کے چہرے کو بے نقاب کرکے اس کے دلکش خط و خال نمایاں کردئے ہیں۔

مذہب ضرورت انسانی کی پیداوار تھی اور ہماری ضرورتوں کے ساتھ ہی ساتھ اس کو بھی چلنا چاہئے، اول اول جب انسان کی "اجتماعی حیثیت" محدود طبقوں اور مخصوص قوموں کے لحاظ سے بہت تنگ تھی تو مذہب کا نقطۂ نظر بھی تنگ تھا، اور ہونا چاہئے تھا، لیکن اب کہ نظام تمدن نے وسیع ہوکر شرق و غرب کے امتیاز کو مٹا دیا ہے اور انسان صحیح معنی میں "خلیفۃ اللہ فی الارض" بن کر سارے کرۂ ارض پر چھاگیا ہے، مذہب کو بھی وسیع ہونا چاہئے، اس کے مقصود کو بھی بدلنا چاہئے اور اس کے اصول میں بھی وسعت پیدا ہونا چاہئے تاکہ امتیازِ نسل و رنگ اور اختلاف مسجد و کلیسہ سے بلند ہوکر تمام نوعِ انسانی کو ایک مرکز پر لایا جاسکے۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ مذہب کو صرف مابعد الطبیعیات تک محدود رکھا جائے، جزا و سزا کا معیار، بہشت و دوزخ یا حور و قصور کی سطح سے بہت بلند ہوگیا ہے اور اب خدا کا نام کسی ایسی قہار و جبار ہستی کا نہیں رہا جو کسی خود مختار فرمانروا کی طرح دنیا میں صرف غلامی کو رواج دینا چاہتا ہے، مذہب کا دور استبداد (Autocracy) ختم ہوگیا اور اگر وہ اپنے آپ کو قایم رکھنا چاہتا ہے تو اس کو بھی زمانہ کا ساتھ دینا پڑے گا جو اس وقت صرف عالمگیر سکون و آزادی چاہتا ہے۔

وہ دور جب انسان نے خدا کے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھے تھے گزر گیا ہے۔ آج جو خدا عیسائیوں کا ہے وہی ہندؤں کا ہے، جو ہندؤں کا ہے وہی مسلمانوں کا ہے جس طرح وہ مسجد کی اذانوں میں چھپا ہوا ہے اسی طرح وہ ناقوس میں پوشیدہ ہے، اس کا سورج سب پر یکساں چمکتا ہے، اس کے الطاف سب کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، اس کی محبت ہر ہر فرد کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے، اس کے حسن نے کائنات کی ہر ہر چیز کو مسحور کر رکھا ہے اس کے نغموں نے ہر ہر شے کو مبہوت بنا رکھا ہے، وہ ذرہ ذرہ کے اندر سمایا ہوا ہے، وہ کائنات کی نبض میں گرم خون کی طرح دوڑ رہا ہے، عالم کون کے سینہ میں قلب بنا ہوا دھڑک رہا ہے وہ گویا ایک "مرکز المراکز" ہے جہاں پہونچکر ماضی، حال و مستقبل سب ایک ہو جاتے ہیں۔

آج کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدا کا مفہوم کوئی علحدہ قرار دے، اس کا کوئی جداگانہ تصور پیدا کرکے اپنے لئے مخصوص کرلے، مذاہب قدیمہ نے عرصہ تک خدا کو اپنا غلام بنا رکھا تھا، لیکن اب وہ اس شکنجہ سے آزاد ہوگیا ہے اور اپنا معبد اس نے عقل انسانی کی اس غیر محدود فضا میں تعمیر کیا ہے جہاں وحوش و طیور، انس و جن سیاہ و سفید، جاہل و عالم، شاہ و گدا سب ایک سطح پر نظر آتے ہیں اور نوع انسانی اپنی تفریق کو محو کرچکی ہے۔

آج کوئی قوم ایسی نہیں جو برگزیدگی کو صرف اپنے لئے مخصوص کرسکے، کوئی جماعت اس کی مستحق نہیں کہ وہ سوا اپنے باقی سب کو گمراہ قرار دے۔ اگر انسان کی قسمت میں نجات لکھی ہے تو وہ اسی دنیا میں حاصل ہوگی اور نوع انسانی کا ہر ہر فرد اس میں برابر کا شریک ہوگا۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک انعام خداوندی کا مستحق قرار دیا جائے اور دوسرا آلام و مصائب کا شکار بنا رہے، اگر معصیت کی بناء پر انسان کو دوزخ میں جانا ہے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ میں جاؤں اور آپ بچ جائیں، اب تو یہاں دوزخ ہی رہے گی یا فردوس۔ اور بلا تفریق سب کو اسی ایک سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ دور اشتراکیت کا ہے، اجتماعیت کا ہے جب ہر چیز ایک کلّی و عمومی حیثیت اختیار کرنا چاہتی ہے اور خدا کی (Universality) حیات انسانی سے ہر ہر پہلو کو "کائناتی" بنا دینا چاہتی ہے، ہمارا خدا ہمارا معبد، ہمارا مذہب، ہماری عبادت، ہماری روحانیت سب کو "کائناتی" رنگ اختیار کرنا ہے اور یہی وہ حقیقی مقصود آفرینش تھا جس کی تکمیل کا زمانہ اب آرہا ہے۔

خدا اب مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں کے اندر مقید نہیں رہنا چاہتا، اس کا مطالبہ اب یہ ہے کہ فطرت کی وسعت میں اسے تلاش کیا جائے اور دل کے اندر اس کا استھان بنایا جائے، وہ اب انسان کے بنائے ہوئے معبدوں میں رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ اس معبد میں جو خود اسی کا بنایا ہوا ہے جہاں بلا تفریق و امتیاز سب کے سر جھک جاتے ہیں اور وہ معبد انسان کا قلب و دماغ ہے۔

مسجد و کلیسا کی تفریق کا وقت گزر گیا۔ زنار و تسبیح کے امتیاز کا زمانہ ختم ہوگیا جن کو ہم بُت سمجھ کر پوجتے تھے وہ خود ہم سے بیزار ہیں، اس لئے ہم کو بُت پرستوں کی جستجو اجودھیا اور کاشی سے باہر کسی اور جگہ کرنا چاہئے اور

دعوتِ نقد و نظر

گزشتہ اشاعت میں "دعوتِ نقد و نظر" کے عنوان سے جو اعلان کیا گیا تھا اس کو دیکھ کر جناب نظیر صدیقی اور جناب اکرم دھولیوی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور انھیں بجنسہ پیش کیا جاتا ہے ــ اکتوبر کا نگار سامنے رکھ کر ان کو ملاحظہ فرمائیے۔
آیندہ مہینے دیگر حضرات کی رایوں کے ساتھ میں اپنی رائے بھی پیش کروں گا۔ نیاز

(نظیر صدیقی)

"دعوتِ نقد و نظر" کا سلسلہ خوب ہے۔ جدید تنقید میں حسن کاری اور فن کاری کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے جاتے ہیں لیکن ان کے مفہوم و مطالبات پر کم غور کیا جاتا ہے بلکہ حسن کاری اور فن کاری کی جو مثالیں پیش کیجاتی ہیں وہ بعض اوقات نقاد کے ذوق و بصیرت کو مشتبہ بنا دیتی ہیں۔ مثلاً عہد حاضر کے ایک نہایت مشہور و ممتاز نقاد نے عہدِ حاضر کے ایک مشہور و مقبول شاعر کا یہ شعر حسن کاری کی مثال کے طور پر پیش کیا ہے

نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

غرض کہ آج کل شعر کی فنی حیثیت پر اچھے اچھوں کی نظر بھی تنقید کا حق ادا نہیں کرتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری شاعری کا معیار پست سے پست تر ہوتا جا رہا ہے۔ بے اصولی اصول بنتی چلی جا رہی ہے اور بد مزاقی مذاقِ سلیم کی جگہ لیتی نظر آ رہی ہے۔

آپ نے جو اشعار رائے زنی کے لئے پیش کئے ہیں وہ خواہ کتنے ہی مشہور و ممتاز شاعر کے نتائجِ فکر کیوں نہ ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ناقص بھی ہیں اور گھٹیا بھی۔ ان اشعار کے رنگ و آہنگ سے شاعر کا پتا چلانے میں ذرا بھی مدد نہیں ملتی۔ اور یہ بھی اِن اشعار کا بہت بڑا عیب ہے۔

ان اشعار کو دیکھ کر سب سے پہلا تاثر جو ذہن میں قایم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے یعنی وہ جذبات و خیالات کے اعتبار سے قطعی نادار ہے۔ نتیجتاً وہ الفاظ سے کھیلنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ ان اشعار میں نہ تو ایک تربیت یافتہ دماغ کی کاوشیں ہیں اور نہ کسی محبت زدہ دل کی دھڑکنیں۔ چند رسمی اور روایتی مضامین کو شعر کی شکل دیدی گئی ہے۔ ان میں سے کوئی شعر ایسا نہیں ہے جس میں خیال یا بیان کی خامیاں موجود نہ ہوں۔ اگر ان تمام اشعار پر عمل جراحی کیا جائے تو یہ تحریر "ماله وماعليه" بن جائے گی۔ لہذا میں چند اشعار کی خامیوں کی طرف سرسری اشارے پر اکتفا کرتا ہوں۔

پہلا شعر مفہوم کے لحاظ سے یکسر مہمل ہے۔ محبت میں عاشق کا اپنے داغ دل سے کوئی امید وابستہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ داغ دل کو چراغ سے تشبیہ دینا بھی درست نہیں۔ اس لئے کہ چراغ روشنی کی علامت ہے

وہ داغ تاریکی کی علامت ۔

دوسرے شعر میں " جوش مستی " کے الفاظ نے شعر میں قدرے ابتذال پیدا کر دیا۔ علاوہ ازیں شعر میں کوئی کیفیت نہیں پائی جاتی ۔

تیسرا شعر میں سمجھ ہی نہیں سکا۔ چوتھے شعر میں پھولوں کے کھلانے کی جو تعبیر پیش کی گئی ہے وہ حسن تعلیل سے خالی ہے ۔ دوسرے یہ کہ غزلخواں ہونا افسانۂ غم سنانے کا مترادف نہیں ۔ " غزلخواں ہونا " نشاط و مسرت کی کیفیت کا اظہار ہے نہ کہ غم و الم کا بیان ۔

پانچواں شعر شاعر کی بدمذاقی کا شاہکار ہے ۔ اول تو یہ کہنا ہی بے تکا پن ہے کہ مجھے محبت میں آپ کا سا حسن چاہیئے ۔ یہ خیال اس وقت لطف دے سکتا تھا۔ جب دوسرے مصرع سے یہ پہلو نکلتا کہ چونکہ آپ کا سا حسن معدوم ہے لہٰذا میرے مطلوب و مقصود آپ ہی ہیں ۔ دوسرے مصرع کا مفہوم یہ ہے کہ محبوب کا جمال بدر آسا داغ اور ہلال آسا زخم سے عبارت ہے ۔ کس قدر مبتذل مضمون ہے یہ ۔ اس شعر کا تیسرا نقص یہ ہے کہ پہلے مصرع میں لفظ " سا " بے محل ہے ۔ اسے " آپ ہی کا " کے بعد آنا چاہیئے تھا۔ یعنی " آپ ہی کا سا جمال "

ساتویں شعر کے دونوں مصرعے مربوط نہیں ۔ پہلے مصرع کا مفہوم یہ ہے کہ شاعر ہر وقت خمار و سرور میں مبتلا رہا کرتا تھا حالانکہ بیک وقت ان دو متضاد کیفیتوں میں مبتلا ہونا ممکن نہیں ۔ جب " خمار " کے پہلے لفظ " اک " استعمال کیا گیا تو " سرور " کے پہلے بھی لفظ " اک " استعمال کرنا ضروری تھا ۔

آٹھویں شعر میں شاعر کا مدعا واضح طور پر ادا نہ ہو سکا۔ پھر یہ کہ اس میں جو تعلیم ہے وہ قطعی غیر ضروری اور بے محل ہے ۔

آٹھویں شعر میں شاعر کا مدعا واضح طور پر ادا نہ ہو سکا۔ پھر یہ کہ اس میں جو تعمیم ہے وہ قطعی غیر ضروری اور بے محل ہے ۔

نویں شعر کو اگر لایعنی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ دل، جان، سوز، ساز، ان تمام چیزوں کو راز سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے بعد شاعر کا یہ ادعا ہے کہ میرے ہمراہ کوئی راز نہ تھا۔ یعنی نہ تو ان کے پاس دل تھا، نہ جان تھی، نہ سوز تھا اور نہ ساز ۔ اس قسم کا " میں ہی میں " نہ کبھی دیکھنے میں آیا اور نہ کبھی سننے میں " نہ تھا " نے یہ الجھن بھی پیدا کر دی ہے کہ آخر یہ شعر شاعر کی زندگی کے کس دور سے تعلق رکھتا ہے ۔

دسویں شعر کو سمجھنے کے لئے صوفی ہونا پہلی شرط ہے اور میں اس شرط کو پورا کرنے سے عاری ہوں ۔

گیارھویں شعر کا مطلب غالبًا یہ ہے کہ میرا غم فرقت وہ بیان کرتے اور ان کا غم فرقت میں بیان کرتا یعنی چہ ؟

بارھویں شعر میں لفظ سیر کا استعمال قطعی مولویانہ اور غیر شاعرانہ ہے ۔ اس شعر میں بھی کوئی کیفیت نہیں ۔

تیرھویں شعر کا مضمون تو رسمی ہے، اس کے انداز بیان میں بھی کوئی جدت نہیں ۔ بلکہ ایک اہم نقص یہ ہے کہ جیب و گریباں کو دو مختلف چیز سمجھ لیا گیا ہے ۔ حالانکہ جیب و گریباں ہم معنی الفاظ ہیں ۔

چودھویں شعر کے پہلے مصرع میں لفظ " دل " صرف وزن پورا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے، ورنہ اس کی ضرورت ہرگز نہ تھی ۔ جس طرح درد کو درماں کہا گیا ہے زخم کو مرہم کہنا کافی تھا ۔ اور اگر مرہم کے ساتھ لفظ دل لانا ہی تھا تو " درماں " کے ساتھ بھی اسی قسم کا کوئی لفظ استعمال کرنا چاہیئے تھا ۔

اٹھارھواں شعر معنوی اعتبار سے ناقص ہے ۔ " میں نے جس دل کی طرف دیکھا " کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا

کیونکہ کوئی کسی کے دل کی طرف دیکھ ہی نہیں سکتا۔ البتہ چہرہ کی طرف دیکھ سکتا ہے۔ آنکھ کی طرف دیکھ سکتا ہے۔
انیسویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں تعقید ہے۔ " راز " اور " میخانے " کے درمیان کا فی بعد پیدا ہو گیا ہے۔
بیسویں شعر کا مطلب میری سمجھ سے بالاتر ہے۔
اکیسویں شعر میں برقِ جمالِ یار کے لئے " برسنا " استعمال کیا گیا ہے۔ برق کے لئے برسنے کے بجائے گرنا استعمال کرنا چاہئے تھا۔ علاوہ ازیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ برقِ جمالِ یار کا نظارہ کسی کے مزار پر کیوں کیا گیا۔ شاعر صاحب یہ بھی تو بیان کرسکتے تھے کہ خود ان کے دل پر برقِ جمالِ یار کا کیا اثر پڑا۔
تیئیسویں شعر میں مبالغہ غلو کی حد تک پہونچ گیا ہے جس کی وجہ سے شعر لایعنی بن کر رہ گیا ہے۔
چوبیسویں شعر میں " سوز و ساز کے ساتھ " تھا " استعمال کیا گیا ہے جو صحیح نہیں۔ سوز و ساز دو مختلف چیزیں ہیں لہذا " تھے " استعمال کرنا چاہئے تھا۔
چھبیسویں شعر میں نہ جانے کس کے " اندازِ فغاں " کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ویسے شعر کا مطلب بھی واضح نہیں۔

(اکرم دھولیوی)

۱۔ داغِ دل سے کیا امید تھی یہ ظاہر نہیں کیا، اگر روشنی کی امید تھی تو پھر مصرعۂ ثانی بے محل ہے۔ کیونکہ چراغ سحری کے گل ہو جانے کے بعد تو روشنی خود ہو جاتی ہے، لہذا استعارہ درست نہ ہوا۔ چراغِ سحری کی جگہ چراغِ سحر بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔

۲۔ شعر اچھا ہے لیکن مصیبت میں آنا محاورہ نہیں، مصیبت میں پڑنا محاورہ ہے، ثانی مصرعہ یوں ہوسکتا تھا " مصیبت کی زد میں نقاب آگیا " بند نقاب یوں بھی یہاں ٹھیک نہیں صرف نقاب چاہئے۔

۳۔ دامن کا گریباں ہونا خود پردہ دری کی بات ہوئی، یہ تو افشائے راز ہوا، پھر پردہ کہاں رہا؟

۴۔ مصرعہ ثانی کے لفظ " مجھے " نے دوسرے مصرع کو پہلے سے الگ کردیا۔ " مجھے " کی جگہ " انھیں " چاہئے۔ غزلخواں کہنے کا بھی یہ محل نہیں نالاں کہنا چاہئے تھا۔

۵۔ جب آپ ہی کا جمال سا چاہئے تو پھر بدر یا ہلال کب جلوۂ محبوب کی ہمسری کرسکتے ہیں؟ ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ گویا معشوق کا جمال بدر سا داغدار اور ہلال سا خمدار ہے۔

۶۔ ردیف " ہو جاتا " یہاں چسپاں نہیں۔ " ہوتا " کا محل ہے۔ " سہل سمجھتے تھے " سے بھی تکلف کی بو آتی ہے اس کے علاوہ یہ کہ بند نقاب کھل جانے کے بعد بھی تو پابندیِ حیا باقی رہ سکتی ہے یہ سراسر معنوی نقص ہے۔ کیونکہ بند نقاب مرئی اور حیا غیر مرئی ہے۔

۷۔ قافیہ سے مجبور ہو کر دلِ ناصبور لکھا گیا جو خمار اور سرور کے مقابل قطعی ناموزوں ہے، ہر وقت کی جگہ ہر لحظہ ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔

۸۔ چھپا ہوا نشتر کی جگہ امید کا نشتر ہوتا تو خیر کوئی بات تھی۔ کیونکہ صرف چھپا ہوا نشتر کہنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر معشوق عاشق کے دل کو لطف سے اپنا نہ بنا لیتا تو اس میں چھپا ہوا نشتر ضرور اس کے خلاف مستعمل ہوتا اور اس خیال کی سبکی ظاہر ہے۔ شعر میں تقابل قوافی کا عیب بھی موجود ہے۔

۹ - "دل نہ تھا جان نہ تھی سوز نہ تھا ساز نہ تھا" یعنی میں ہی میں تھا ۔ تو اک طرح کی راز کی بات ہوئی
پھر "کوئی راز نہ تھا" کیا معنی ؟ زبان کے لحاظ سے "مرے ہمراہ" بھی یہاں ٹھیک نہیں مری ہستی
میں یا مری دنیا میں کوئی راز نہ تھا کہنا چاہئے تھا ۔

۱۰ - اگر دعوئے دیدار کی جگہ انتظار دید ہوتا تو شعر کا مطلب واضح ہوجاتا ۔ بہت روکا پھر بھی اچھا لگتا نہیں

۱۱ - "خلوت میں غم فرقت" کی بجائے "اے کاش غم الفت" ہوتا تو شعر سطح سے بلند ہوجاتا ۔

۱۲ - "آنسو بھی رواں ہوتے" کہنے کے بعد بھی یہ شعر حدود تغزل میں نہ آسکا پھر کس کے آنسو یہ ایک سوال
بھی باقی رہ جاتا ہے ۔ اگر عاشق کے آنسو مراد لئے جائیں (اور مطلب بھی یہی ہے) تو پھر یہ کہ ان کو
دریا کی روانی کے ساتھ کیا علاقہ ہے ؟

۱۳ - جیب عربی اور گریباں فارسی معنی دونوں کے ایک ہیں ۔ ایک طرف دامن ہوتا تو درست تھا ۔

۱۴ - زخم کو صرف مرہم چاہئے ۔ مرہم دل نامناسب ہے خوب کہکر طنز کا بھی یہاں کوئی
اگر طنز سے کام لیا گیا تو پہلے مصرع کی بات ختم ہوجائے گی ۔ یعنی چارہ گر یہ کیا سمجھ
محبت میں عاشق خود درد کو درماں اور زخم کو مرہم سمجھتا ہے لہذا ثانی مصرع یوں
"چارہ گر آج علاج غم پنہاں سمجھا"

۱۵ - یہ عمدہ شعر ہے مگر پہلے مصرع میں سوختہ ساماں کی جگہ بے سروساماں چاہئے

۱۶ - یہاں عشق کا قافیہ بُری طرح گر گیا ۔ "رگ رگ میں تیر نظر دیکھا" غلط ہے پایا جانا چاہئے کیونکہ مقصود بیان
صرف کیفیت کا اظہار ہے ۔

۱۷ - یا اور نون کا اضافہ فارسی الفاظ میں ہوتا ہے ۔ غزال عربی ہے اس لئے چشم غزالیں درست نہیں ۔
اس کے علاوہ پہلے مصرع میں بتخانہ کا ذکر ہے بنابریں ثانی مصرع میں فردوس کی جگہ اسی قبیل سے کوئی
لفظ چاہئے تھا ۔

۱۸ - اگر نگاہ یاس کی جگہ نگاہ شوق ہوتا تو واقعی مصرعۂ ثانی پر پُرلطف ہوجاتا "جس دل کی طرف دیکھا" کی
بجائے "جس شے" کی طرف دیکھا میں معنویت زیادہ تھی ۔

۱۹ - "جب تو کچھ" یہاں زبان کے لحاظ سے ٹھیک نہیں اس کے علاوہ "اے دل" کہنے کے بعد پیمانہ کہنا
بھی تکلف سے خالی نہیں ۔ لہذا مصرعۂ ثانی یوں چاہئے "ظرف عالی ہو جو میکش ترے پیمانے کا"

۱ - "نبض کی رفتار ہوجاتا" میں تصنع ہی تصنع ہے ، شاعر کا مطلب یہ تھا کہ درد ہی خود نبض میں جاری و
ساری ہے اس لئے چارہ گر کو نبض ڈوبی ہوئی نہیں معلوم ہوتی مگر موجودہ الفاظ سے یہ مطلب ادا
نہیں ہوتا ۔ "درد کے ہوتے" نے شعر کو اور خراب کر دیا مطلب یہ کہ اگر درد نہ ہوتا تو راز غم چارہ گر
پر کھل جاتا مگر کوئی یہ پوچھے کہ بغیر درد کے غم کہاں ؟

۱ - برس گئی اتنا ٹھیک نہیں جتنا برس پڑی ۔ اس کے علاوہ زمانہ کے لحاظ سے مصرعۂ ثانی میں "ہے" کی
جگہ "ہوگیا" چاہئے ۔ مزار بھی غلط ہے ۔ اس کی جگہ "خاک" لکھنا چاہئے تھا کیونکہ برق گرنے کے
بعد عاشق کا خاک ہوجانا قرین قیاس ہے ۔

۲ - آنسو کا قطرہ زمین پر گرنے کے بعد مٹی میں مل جائے گا حسن کا دریا نہیں ہوسکتا اگر اس مبالغہ سے

غور کرکے بھی دیکھا جائے تو جذبۂ پنہاں عشق کی جگہ جذبۂ بے تاب عشق اور آنسو کی جگہ قطرہ مناسب تھا۔
۲۳- محشر کے معنی ہیں جائے حشر، اس لئے یہ لفظ یہاں غلط مستعمل ہوا ہے، اس کے علاوہ خاکستر میں دبی ہوئی چنگاری تو ہو سکتی ہے مگر بھڑکا ہوا شعلہ نہیں ہو سکتا۔
۲۴- رگ رگ میں دل تھا یہ ٹکڑا محلِ نظر ہے اگر دل سے مراد سوز و ساز ہے تو پھر دوسرا ٹکڑا بیکار ہو جاتا ہے۔
۲۵- پہلے مصرعہ کو دوسرے سے کوئی لگاؤ نہیں دوسرے کو یوں ہونا چاہئے تھا
"نظروں کو اٹھا کر رخِ جاناں نہیں دیکھا"
۲۶- مطلب شاعر کا یہ تھا کہ نالۂ بلبل میں اگر میرا اندازِ فغاں بھی شامل ہوتا تو سارا چمن بلبل کی ہمنوائی کرتا مگر شعر کے الفاظ اس معنی کو ادا کرنے سے قاصر ہیں "میرا" کے بعد "بھی"۔ درست نہیں "بھی" اندازِ فغاں کے بعد چاہئے تھا۔ صرف بلبل کی زباں کہکر نالہ سرائی مراد لینا درست نہیں۔ "چمن میں ہر لب خاموش" یہ یہ ٹکڑا بھی بے محل ہے۔ مصرعۂ ثانی یوں ہوتا تو شعر درست ہو جاتا۔
"چمن سب ہمنوائے عندلیبِ نوحہ خواں ہوتا"

فضا میں خلاء نہیں ہے جس وقت ہم رات کو آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے لیکر ستاروں تک خلاء ہی خلاء ہے اور فضا بالکل صاف ہے، لیکن در اصل ایسا نہیں ہے، ایک نہایت ہلکا و لطیف مادہ اس خلا میں بھرا ہوا ہے، اس کا کچھ حصہ تو وہ ہے جو سورج اور ستاروں کی انفجاری (EXPLOSIVE) حرارت سے پیدا ہوا ہے اور کچھ حصہ وہ ہے جو فضا کی آتشی ذرات کے باہمی تصادم سے پیدا ہوتا رہتا ہے۔

فضا کی وسعت رات کو جو ستارے ہم کو نظر آتے ہیں، ان کا شمار بڑی بڑی دوربینوں سے کیا جا رہا ہے لیکن ان کی پوری تعداد معلوم کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ پھر آپ جانتے ہیں کہ ان میں ہر ایک ستارہ اپنی جگہ ایک مستقل کرہ ہے ایک مستقل دنیا ہے جس کی روشنی ہم تک پہونچتی رہتی ہے، لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ روشنی ہم تک کتنے عرصہ میں پہونچتی ہے -

روشنی کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ ہے۔ اور ہم سے جو ستارہ سب سے زیادہ قریب ہے، اس کی روشنی بھی ہم تک چار سال تین مہینے میں پہونچتی ہے، چہ جائیکہ دور کے وہ ستارے جن کی روشنی لاکھوں سال بعد ہم تک پہونچتی ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ فضا کی وسعت کتنی ہے جس میں اس قسم کے بیشمار ستارے موجود ہیں۔

سورج کے شعلے سورج ایک مشتعل کرہ ہے جس سے ہر وقت شعلے نکلتے رہتے ہیں، لیکن یہ شعلے کس قدر ہیبت ناک اور کتنے بڑے ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض شعلوں کی بلندی ۸۰ ہزار میل ہے اور یہ جس رفتار سے بلند ہوتے ہیں وہ دو لاکھ میل فی گھنٹہ ہے

سورج سے جو گرمی پیدا ہوتی ہے وہ ایک منٹ میں ۳۷ ہزار ٹن پانی میں ابال پیدا کر سکتی ہے اور اگر زمین کے چاروں طرف ۳۸ گز کی دبیز چادر برف کی بچھا دیجائے تو ایک سال کے اندر سورج کی گرمی اسے پگھلا کر رکھدے۔ اس کی روشنی چاند کی روشنی سے ۵۷۰۰۰۰ گنا زائد ہے۔

جہانِ منتظر

یہ دُنیا کس تباہی میں ہے مصروف
نہ ہو جائے دماغِ عصر ماؤف،
یہ دُنیا یہ سوادِ تشنہ کامی،
دیارِ سازد برگِ ناتمامی،
یہ دنیا یہ کمالِ ناکمل
کہیں اور، ایسی دُنیا سے نکل چل

جہاں کانٹے نہ ہوں پھولوں میں پیوست
فلک جس کا زمیں سے بھی نہ ہو پست
شگوفوں پر نہ لہرائے کڑی دھوپ
نہ سنولائیں گل و گلزار کے روپ
کلی، لطفِ صبا کی ہو نہ محتاج
دبائیں سنگ ریزوں کو نہ پھیراج
خزاں میں ہو نہ پھولوں کی سحر گم،
اندھیرے کو نہ پوجیں ماہ و انجم
نہ سلگیں چاند کے سینے میں ناسور
گل و نسریں نہ ہوں صرصر کے مقہور،
ستارے صبح کی لو سے نہ پگھلیں
شعاعیں خون شبنم کا نہ چوسیں
کرن ایسی نہ ہو خورشید کے پاس
کہ جس سے ٹوٹ جائے صبح کی آس،
اُجالے دیں نہ ظلمت کی گواہی،
نہ رسوا ہو جمالِ صبحگاہی،
کلاہیں اہلِ باطل کی نہ ہوں کج
شفق کی آگ میں جھلسیں نہ سورج
کدورت ہو نہ آئینوں کا مشرب
نہ تلخابی ہو نوشینوں کا مذہب،
نہ کھینچے غم دلوں پر یاس کے خط
نہ ذہنوں پر ہو تاریکی مسلط،
نہ گزریں شرم سے منہ ڈھانپ کر چاند
نہ ہوں روشن ضمیری کے دیئے ماند
نہ توڑے سنگ آئینوں کے فانوس
نہ بازاروں میں بکنے جائیں ناموس
نہ ہوں دین و وطن نیلام کا مال
نہ ہوں دو رکعتیں معراجِ اعمال،
حرم ہو اپنے مُلّا سے نہ نادم
نہ ابراہیم ہوں آذر کے خادم
بنامِ عظمتِ توریت و انجیل،
گناہیں ہوں عبادت میں نہ تبدیل
نہ ہو یہ کائناتِ مرغ و ماہی
ہلاکِ عشوۂ عالم پناہی
جہاں انساں نہ کرتے ہوں خدائی
جہاں ہو دولتِ صلح و صفائی،

جب ایسا اک جہاں تعمیر ہوگا
تو میرے خواب کی تعبیر ہوگا

فضا ابن فیض اعظمی

بر زباں تسبیح و در دل گاؤخر

آرہا ہے سامنے سے دیکھو اک خیر البشر
کچھ نظر محوِ تفکر ہونٹ کچھ ہلتے ہوئے
یہ تنفس کی بے قراری یہ نظر کا اضطراب
"سامریت" "موسیت" کے ساز پر گاتی ہوئی
روشنی کے راستے پر تیرگی چلتی ہوئی
راہزن ہے جادہ پیما رہنما کے بھیس میں
لے رہی ہے شانِ کعبہ کروٹوں پر کروٹیں
کھیل کھیلا جا رہا ہے جانے کیا کیا سوچ کر
بیٹھتے ہیں آگ کے شعلے دھوپ کی چھاؤں میں
زیست سایہ ڈھونڈتی ہے چلچلاتی دھوپ میں

بر زباں تسبیح و در دل گاؤخر
کفر و ایماں زندگی کی راہ میں ملتے ہوئے
زہد و تقویٰ بھی مسلم بنگری بھی کامیاب
ایک جنت جس میں دوزخ پرورش پاتی ہوئی
موت کے پہلو میں شمعِ زندگی جلتی ہوئی
کفر کی ہے سلطنت قدوسیت کے دیس میں
کٹ رہی ہیں آج سلمائے شریعت کی لٹیں
ہنس رہی ہے اب مسرت غم کے گیسو نوچ کر
ایک کانٹا چبھ گیا ہے راستی کے پاؤں میں
اہرمن آکر کھڑا ہے آدمی کے روپ میں

آسی رامپوری

اکرم دھولیوی :

امیدِ التفات نے رسوا کیا مجھے ۔۔۔ حاشا کہ آپ سے نہیں کوئی گلا مجھے،
کھانے دے دشت ہی کی کوئی دم ہوا مجھے ۔۔۔ اے دل کہیں سکون تو آئے ذرا مجھے
ہے کوچۂ جنوں میں وہی کاروبارِ شوق ۔۔۔ اب تک سنائی دیتی ہے آوازِ پا مجھے
یہ بے کسی کہ اپنے سوا کائنات میں! ۔۔۔ آتا نہیں نظر کوئی اب دوسرا مجھے
مجبوریِ چمن کی شکایت سے فایدہ ۔۔۔ راس آگئی قفس کی بھی آب و ہوا مجھے
کیا جانے میری زیست میں کل کیا ہو انقلاب ۔۔۔ کرنے دے اے دل آج کوئی فیصلا مجھے

نظیر صدیقی :

اک دردِ لاعلاج سہی، زندگی مگر ۔۔۔ بنتی نہیں ہے درد کا درماں کئے بغیر
ناکامِ عشق سے بھی زیادہ ہیں بدنصیب ۔۔۔ جو لوگ جی رہے ہیں محبت کئے بغیر
نظیر کچھ ایسے تجربے بھی جہاں میں ہوتے ہیں آدمی کو ۔۔۔ کہ بن پڑے تو وہ ان کو خود اپنے آپ سے بھی چھپا کے رکھے
رہِ حیات کے وہ تجربے معاذ اللہ ۔۔۔ چھپا کے رکھنا پڑا جن کو راز داروں سے
امیدوں کے چراغ ایک ایک کر کے بجھ گئے آخر ۔۔۔ مگر یہ کیا کہ بزمِ آرزو برہم نہیں ہوتی
بے سبب جی نہیں نڈھال اپنا ۔۔۔ پھر کہیں دل نے چوٹ کھائی ہے
کیا کہوں کیا گزر گئی دل پر ۔۔۔ جب کبھی تیری یاد آئی ہے
آخر تمھیں بتاؤ کہ یہ ماجرا ہے کیا، ۔۔۔ نزدیک آکے اور بھی تم دور ہوگئے
وہ مجھ کو غلط انداز سہی، پھر بھی نظیر ۔۔۔ ایک نعمت ہے دلِ تشنۂ الفت کے لئے

قلق کی غیر مطبوعہ رُباعیاں

وہ وقت شباب وہ زمانہ نہ رہا
وہ نشۂ مستی وہ ترانہ نہ رہا
آتا تھا کہانی کا مزہ باتوں میں
اب اپنے سوا کوئی فسانہ نہ رہا

ہاں نفس کی شوخی سے ہے مجنوں لیلا
قانع ہے تو مت بہرِ نفی کہنا لا
کر شرم ذرا قلق دُعا سے پہلے
ہاتھوں کا اُٹھانا بھی تو ہے صورتِ لا

دُنیا کا تمام کارخانہ ہے عبث
اس کشتِ عبث کا دانہ دانہ ہے عبث
اک حرفِ غلط ہے بلکہ یہ بھی ہے غلط
ہر ذکر عبث ہے ہر فسانہ ہے عبث

تیرا ہے جہاں خالقِ یزداں محتاج
دانا محتاج اور ناداں محتاج
حاجت ہے اگر کسی کی تو تجھ سے ہو
لیکن نہ ہو انسان کا انساں محتاج

افسانۂ یار بہرِ وصلت ہے لذیذ
پیمانۂ مے پئے فراغت ہے لذیذ
اے شیخ ہے ہر وقت تو روکھا پھیکا
یہ طرفہ مذاق ہے کہ طاعت ہے لذیذ

ویراں کدۂ دہر میں تعمیر نہ کر
داغِ صد سنگ و خشت سینہ پہ نہ دھر
اس نکتۂ معمار سے کر فکرِ مآل
رکھتا ہے نکلنے کے لئے پہلے در

ہر فصل میں ہوتے ہیں جواں سارے شجر
ہر سال نئے پھولتے پھلتے ہیں ثمر
انساں کی کوئی فصل نہ پھر کر آئے
اول ہی کا جھونکا ہے بہارِ آخر

مسجد کو دیا چھوڑ ریا کی خاطر
کعبہ نہیں جاتا تو حیا کی خاطر
میخانہ میں جاتا ہوں تو رحمت کے لئے
مے پیتا ہوں احسان خدا کی خاطر

کہتا ہوں خدا لگتی عقیدے کے خلاف
ہے تیرا خطاوار سزاوارِ معاف
ہے رحم ہی شایانِ خدائی تجھ کو
انصاف یہی ہے کہ نہ کرنا انصاف

یہ حال بتر رحم فزا ہے کہ نہیں
اس زیست سے مرنا ہی بھلا ہے کہ نہیں
سنتا ہی نہیں، کہئے کسی صورت سے
یارب تو ہمارا بھی خدا ہے کہ نہیں

بد مستیِ دوشینہ جو یاد آتی ہے
خود رفتگی قابو سے نکل جاتی ہے
ہے یادِ شبِ وصل و سحر خواب و خیال
اک لمحہ میں دُنیا ہی بدل جاتی ہے

ایجادیِ خالق کا ثمر ہے ہستی
امید دو عالم کی سحر ہے ہستی
سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں آخر کار
بے خبریٔ مطلق کی خبر ہے ہستی

اے صلِّ علیٰ سوز ترا حسن و جمال
یہ مہر میں خوبی ہے نہ یہ مہ میں کمال[1]
کاہش کے سوا کچھ نہیں افزایش میں
تو بارہ برس کا رہے یارب صد سال

عابد رضا خاں بیدار

[1] عبدالکریم سوز پسر امام بخش صہبائی، ۲۳ سال کی عمر میں ۱۲۷۴ھ میں گوروں کے ہاتھوں شہید ہوئے

مطبوعات موصولہ

نقشہائے رنگ رنگ مجموعہ ہے جناب رادھے شیام رستوگی (انگریزی لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی) کے اُردو و فارسی کلام کا جسے غالباً خود انھوں نے نہایت اہتمام کے ساتھ نفیس کاغذ پر مجلد شایع کیا ہے۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات، سائز ۲۰ × ۲۶ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- کتب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

رادھے شیام صاحب لکھنؤ ایک قدیم معزز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ اس دور کی یادگار ہیں، جب ہندو مسلمان دونوں کی تعلیم ایک ہی مکتب میں ہوتی تھی اور دونوں ملکر ایک مشترکہ زبان و کلچر بنا رہے تھے، چنانچہ رادھے شیام صاحب میں بھی اُردو فارسی کا ذوق بہت کمسنی سے پیدا ہوا اور بی اے تک اختیاری مضمون [illegible] کیا۔ اس لئے تعجب کی بات نہیں اگر اس ذوق کے تحت رفتہ رفتہ ان کے کلام نے دیوان کی صورت اختیار کرلی۔

اس مجموعہ کا پہلا حصہ اُردو غزلوں پر مشتمل ہے اور دوسرا اُردو منظومات، رباعیات وقطعات پر، تیسرے حصہ میں فارسی کی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ ان کی اُردو غزلیں قدیم کلاسکل رنگ کی ہیں، جن میں صحتِ زبان کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے لکھنؤ میں پرورش پائی اور یہیں کی زبان میں انھوں نے اول اول لکھنا پڑھنا سیکھا۔ چنانچہ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"سخن دانوں دانوں سے صحبت ہے، زباں دانوں میں رہتے ہیں"۔ نظموں میں اصلاحی رنگ غالب ہے اور سیاسی نظموں میں وطن پرستی کا وہی جذبہ پایا جاتا ہے جو چکبست مرحوم کے یہاں پایا جاتا تھا۔ ان کے فارسی کلام سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اساتذہ کے کلام کا کافی مطالعہ کیا ہے اور اس سے بڑی حد تک مستفید ہوئے ہیں۔ فارسی میں نوحۂ سردار بھگت سنگھ، ڈاکٹر ٹیگور بڑی اچھی نظمیں ہیں۔ ابتداء میں پروفیسر مسعود حسن رضوی کا تعارف اور پروفیسر سرور کا تبصرہ بھی شامل ہے۔

ترانۂ وحشت حصۂ اول مجموعہ ہے جناب رضا علی وحشت کے کلام کا جسے مکتبۂ جدید لاہور نے نہایت اہتمام سے بہترین کاغذ پر مجلد شایع کیا ہے۔ ضخامت ۲۲۲ صفحات، سائز ۲۰×۲۲/۱۶ قیمت چھ روپیہ وحشت دورِ متوسط کے شاعر ہیں، اور جن کا شمار اسی وقت اساتذۂ سخن میں ہوتا تھا، جب حالی، شبلی اور اقبال زندہ تھے۔ اور نظم طبا طبائی، اکبرالہ آبادی اور ظہیر دہلوی ایسے اساتذہ سے دادِ سخن پاتے تھے۔ کلکتہ میں چونکہ فارسی تعلیم کا رواج فورٹ ولیم ہی کے زمانہ سے شروع ہوگیا تھا۔ اس لئے وحشت کی ابتدائی تعلیم بھی فارسی ہی میں ہوئی اور بعد کو ان کا یہی ذوق اُردو میں بھی منتقل ہوگیا، چنانچہ ایک زمانہ تھا جب رنگ غالب کے شاعروں میں انھیں اور وفا رامپوری کو خاص شہرت حاصل تھی۔ غالب سے استفادہ کرنے کا ذکر خود انھوں نے بھی کیا ہے :-

سخت آموخت غالب از نظیری وحشت از غالب　　چراغ راکہ دودے ہست از سرِ زود درگیرد،

رنگِ غالب کا مفہوم عام طور پر اس کی دقت آفرینی و مشکل پسندی قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ غالب کا اصلی فن صرف انداز بیان کی ندرت و شوخی تھی اور یہی وہ چیز تھی جو وحشت کے ابتدائی کلام میں نہیں نظر آتی تھی۔ بعد کو مشق و ممارست کے بعد اس میں وہ چیز بھی پیدا ہو گئی جسے حلاوت و شیرینی اور دل میں چبھ جانے والی کیفیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

کیا تھا روح غالب سے جو میں نے کسب فن وحشت — سخنور سیکھتے ہیں آج اندازِ بیاں مجھ سے

مجھے ہے ناز اپنی زندگی پر ہے جس کی بنیاد دردِ ہجر پر — بڑی ہی توہین درد ہوگی اگر درد کی دوا سے گی

سرِ محفل چرانا آنکھ کا کہنا، ایک افسانہ — وہ تو نے کہہ دیا خود جو نہ ہو سکتا بیاں مجھ سے

گئے وہ دن جب کہ اس چمن میں ہوائے نشو و نما تھی ہم کو — خزاں کو دیکھ [illegible]

وحشت کا فارسی کلام بھی اپنی جگہ خاص چیز ہے اور اس [illegible]

از دل آشفتۂ خویشم خبر نبود مرا — [illegible]

ہزاراں لطف پنہاں می شود از ہر ستم پیدا — [illegible]

فریاد ز جوشش گریۂ وحشت — [illegible]

اس مجموعہ کے آخیر میں جناب وحشت کے عنوان شباب کا کلام بھی شامل [illegible] میں شائع ہوا تھا اور جس میں رنگ غالب زیادہ نمایاں تھا۔

اس کلیات میں ان کے وہ قطعات و مسدسات وغیرہ بھی شامل ہیں جو انھوں نے مختلف تقریبوں میں اور تہنیت کے طور پر کہے ہیں، حالانکہ ان کی اشاعت ضروری نہ تھی۔

شعلۂ گل مجموعہ ہے احمد ندیم قاسمی کی نظموں اور غزلوں کا جسے قومی دارالاشاعت لاہور نے بڑے اہتمام کے ساتھ نہایت نفیس کاغذ پر مجلد شائع کیا ہے۔ سائز ۲۰ × ۲۶ ضخامت ۱۲۸ صفحات قیمت پانچ روپیہ۔

ندیم قاسمی اس عہد کے جوان شاعروں میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی، قدیم کلاسکل ٹکنک کے بھی شاعر ہیں اور جدید رنگ کے بھی۔ لیکن ان کا کلام پڑھنے کے بعد خواہ وہ کسی رنگ کا ہو، ہم یہ ضرور محسوس کرتے ہیں کہ وہ کچھ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جو پہلے ہمارے کانوں میں نہ پڑی تھیں — وہ ان شاعروں میں سے ہیں جنھیں زمانہ کے اقتضا نے پیدا کیا اور جنھوں نے زمانہ کے اقتضا کا ساتھ دیا۔ وہ یقیناً نوجوان ہیں لیکن فکر و احساس کے لحاظ سے کافی پختہ سال، اور اسی لئے ہمیں ان کی شاعری میں جلال و جمال دونوں کا بڑا اچھا امتزاج نظر آتا ہے۔

عہد حاضر کے دوسرے شاعروں کی طرح اظہار خیال کے لئے وہ بھی نئے زاویوں کی تلاش میں رہتے ہیں، لیکن ان کے زاویے زیادہ تر خطوط مستقیم سے بنتے ہیں، خطوط منحنی سے نہیں اور اسی لئے وہ زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی بعض جدید رنگ کی نظموں کا ٹکنک تو میری سمجھ میں نہیں آیا، لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ فنی اصول سے آزاد رہنے کے بعد بھی ہم ان کے مفہوم سے پورا لطف اٹھا سکتے ہیں اور آزاد شاعری میں اگر محض خیال کی بلندی و ندرت ہی کا التزام ملحوظ رہے تو بھی غنیمت ہے۔ نظموں میں جہاں کہیں انھوں نے کلاسکل ٹکنک کو بھی قایم رکھا ہے وہاں ان کی شاعری انتہائی عروج پر پہونچی ہوئی نظر آتی ہے ان کی ایسی نظموں میں "رفتار زمانہ" اور "جشن چراغاں" بڑی اچھی نظمیں ہیں۔ غزلوں کا حصہ یکسر کلاسکل ٹکنک کا ہے، لیکن کلاسکل خیال کا نہیں اور اس کے ہر ہر شعر میں ہم کو نئی روشنی کی جھلک نظر آتی ہے جو فکر و احساس کے لحاظ سے بڑی دلکش ہے۔